# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

## سورۃ النسآء

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

# مطالب القرآن

فی

# دروس الفرقان

## — سورة النساء —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............ | مطالب القرآن فی دروس الفرقان |
| دروس | ............ | از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ |
| ناشر | ............ | بزمِ طلوع اسلام، لاہور |
| زیر اہتمام | ............ | ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور |
| | ............ | فون نمبر 5753666-5714546 |
| ایڈیشن اول | ............ | جنوری 2007ء |
| مطبع | ............ | باقر پرنٹنگ پریس، لاہور |

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

# انتساب

## رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھراُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

# اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

### محترم ڈاکٹر انعام الحق صاحب (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام لاہور) کے الفاظ میں سورۃ النساء کی اہمیت

''محترم پرویزؒ صاحب ساری عمر قرآن کی تعلیم یا تو حاصل کرتے رہے یا پھر دیتے رہے۔ اُن کی بڑی خواہش تھی کہ پاکستان میں قرآن کی تعلیم کو پرائمری سطح سے لے کر ڈاکٹریٹ کے مرحلہ تک بطورِ نصاب پڑھایا جائے۔ اِس کے لیے وہ خود بھی ساٹھ کی دہائی میں اِس کام کے لیے ایک کالج کی تعمیر کے منصوبہ پر عمل پیرا ہو چکے تھے۔ جو بدقسمتی سے سیاست کی نذر ہو کر ابھی تک کلیئرنس کے لیے عدالتوں میں زیرِ سماعت ہے۔ ہم اگر محترم پرویزؒ صاحب کی خواہش کی تکمیل میں قرآن کی تعلیم کو بطورِ نصاب پڑھانے میں کچھ کر سکیں' تو یہ احسن قدم ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ایم۔اے کا امتحان دے رہا تھا۔ تو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے نصاب میں محترم پرویزؒ صاحب کی تصنیف **''نظامِ ربوبیت''** کے کچھ ابواب کا بطورِ ریفرنس اندراج تھا۔ لہٰذا اسی بناء پر مجھے یقین ہے کہ اگر محترم اشرف ظفرؔ صاحب کا ساجذبہ لیے ہوئے لوگ کوشش کریں' تو سورۃ النسأ پر مشتمل دروس کی یہ تصنیف' ایم اے اسلامیات کے نصاب میں شامل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ سورۃ النسأ کی یہ زیرِ نظر تصنیف بطورِ ریفرنس بُک یقیناً ممد ثابت ہوگی۔

قارئین کرام! اگر آج ہم فکرِ قرآنی کی روشنی میں اپنی ان جامعات کے شعبۂ اسلامیات میں شامل نصابی کتب کو دیکھتے ہوئے ان کا تجزیہ عصرِ حاضر کے علمی معیار کے تقابل میں کریں تو وہاں وہی فرسودہ رِوایات اور مناظرات کا مجموعہ ہی پاتے ہیں جو خالص مذہبی رُجحانات میں ہمیں ملتا ہے۔ اُن کو دیکھ کر دِل میں خواہش مزید شدت حاصل کر لیتی ہے کہ محترم پرویزؒ صاحب کی فکر کو نصاب میں درس و تدریس کی کتنی ضرورت اور اہمیت ہے' جو طلباء کی صحیح سمت میں راہنمائی کر سکے۔ یہاں میں یہی کہوں گا کہ ہماری جامعات کی بدقسمتی ہے کہ اُن میں اگر کہیں بھول کر محترم پرویزؒ صاحب کا ذکر ملتا بھی ہے تو وہ نہایت منفی انداز میں بے سروپا الزامات کی شکل میں ہوتا ہے۔ جس حد تک اُن میں قرآن کے بھی نظریات کو فرسودہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے' اُن سے امید رکھنا ہی فضول ہوگا کہ وہ کبھی اُن کا احیاء کر سکیں گے۔

قرآن تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے تمام زمانوں کی ہدایت اور حق کی راہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اِسے کسی بھی خاص قوم کی اجارہ داری میں دیا نہیں جا سکتا۔ اِس لیے ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کو دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل کر کے اُن کی راہنمائی کے لیے قابلِ حصول بنایا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کے تراجم سبھی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ لیکن کیا وہ جو معیار کے حامل ہیں۔ اُن سے قرآن کا صحیح پیغام اُن کو مل سکتا ہے؟ اِس کا جواب نفی میں پا کر دل میں اُن لوگوں کے لیے دعائے خیر نکلتی ہے جو مستقبل میں محترم پرویزؒ صاحب کی عصرِ حاضر کے

تمام چیلنج قبول کرتی ہوئی قرآن کی تفسیر کو دنیا کی تمام زبانوں اور خصوصی طور پر انگریزی میں منتقل کریں گے۔ محترم اشرف ظفر صاحب کی بھی یہ دِلی خواہش ہے اور ممکن ہے کہ وہ زندگی میں اس کام کا بھی آغاز کر پائیں۔ ان کی موجودہ دروس القرآن کی منتقلی کا کام دیکھ کر دل میں اُن سے اِس امید کا پیدا ہونا ایک فطری بات لگتا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق

چیئرمین طلوعِ اسلام، لاہور

---

سورۃ النساء کی اشاعت کے اس موقع پر بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور کے تمام افراد محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی شخصیت کے دلی طور پر مشکور ہیں کہ جن کی ادبی کاوش دروس القرآن کے پروجیکٹ کی تکمیل میں پوری استقامت کے ساتھ شاملِ حال ہے۔

محمد اشرف ظفر

بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور

اپریل 2012ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# فہرست مشمولات سورة النسآء

# مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورة النسآء!**

(آیت 1: زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی؟)


، نسلِ انسانی کے سلسلہ میں انسانی ذہن کے تراشیدہ قصوں کے احوال ____ 47

، قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے ہمارے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی نوعیت 48

، اپنے اپنے تصورات کے تحت لکھی گئیں یہ تفاسیر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردی گئیں ____ 49

، فکرِ قرآنی پر غور وفکر نہ کرنے والوں کا نتیجہ جہنم ہے اور پہلے انسان کی پیدائش پر ''کتابِ پیدائش'' کی افسانہ سازی _ 50

، ہماری تمام مروجہ تفاسیر امام طبریؒ کی بیان کردہ تفسیر کا پرتو ہیں اور تورات ہی میں بابا آدم اور اماں حوّا کا قصہ ____ 51

، انسانی پیدائش کے سلسلہ میں احتشام الحق تھانویؒ کا درسِ قرآنِ حکیم اور بسیط حقائق پر قرآن کا عملی انداز ____ 52

، قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق کا علمِ انسان کے بلند ہونے سے تدریجاً واضح ہو کر حق ثابت ہوتا چلا جاتا ہے اسی لیے فکر وتدبر کا حکم ہے ____ 53

، آدم کی پیدائش کے سلسلہ میں سائنس کے انکشافات: مٹی اور پانی کے ملاپ سے پیدا ہونے والے جرثوموں کی نوعیت _ 54

، سیل کا دو حصوں میں پھٹنا اور انسان کے ہر سانس میں' ایک سیکنڈ میں' پچاس لاکھ جرثوموں کی ہلاکت کا باعث بننا _ 55

، جرثوموں کے ارتقائی منازل سے استقرارِ حمل تک ____ 56

، زندگی مختلف مراحل ومدارج سے گزرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں نمودار ہوئی: مبداء سے پیکر تک ____ 57

، 14 سو سال پیشتر زندگی کے مختلف مراحل کو تفصیلی طور پر بیان کرنا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہ تھی لیجیے! وہ پہلا لائف سیل آ گیا! 59

، قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد نوعِ انسانی کو نفسِ واحدہ کی طرح ایک عالمگیر برادری کو قائم کرنا تھا اور ہے 60

، قرآنِ حکیم کے نزدیک زوج کا مفہوم ____ 61

، زندگی کی یہ موجودہ سطح کوئی آخری منزل نہیں ہے بلکہ اس کے تو کئی STAGES (مدارج) ابھی باقی ہیں: مبداء سے معاد پر استدلال ____ 62

، انسانی زندگی کی ایک ایک منزل لاکھوں سال کی رہینِ منت ہے ____ 63

، حیوانی سطح کے بعد اختیار وارادہ کی منزل اور حیوانی جبلت _ 64

، خدا کی طرف سے اختیار وارادہ کی نعمت نے حیوانی سطحِ زندگی کے برعکس انسان کو ایک نئی منزل سے متعارف کرایا ____ 65

، ماں باپ کی تعلیم وتربیت بچے کی شخصیت کو متاثر کیے
بغیر نہیں رہ سکتی مگر کیوں؟ ____ 65
، معاشرتی زندگی میں ہرانسان' دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے 66
، قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق وجود میں آنے والے
یونٹوں کی ذمہ داری کی ایک مثال ____ 67
، معاشرتی طور پر کامیاب زندگی کے معیار کو پرکھنے کا انداز ____ 68

دوسرا باب: سورۃ النسآء (آیات 2 تا 3)

، قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ملخص اور سائنسی علوم ____ 69
، اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ کا مفہوم اور بچوں کی تربیت کا سوال ____ 70
، حیوانی سطح پر بچے کی پرورش کی نوعیت اور ایک انسان ہونے
کی جہت سے اس کے تقاضے ____ 70
، انسان کو انسان بنانے میں سائیکولوجی کے علم کی اہمیت
اور بچوں کی نفسیاتی تربیت میں جونز اور ایڈلر کی سائیکولوجی ____ 71
، انسانی زندگی کے سلسلہ میں بچے کی اوائل عمری کی اہمیت'
پرویزؒ کا تحلیلِ نفسی میں درک وتجربہ اور نفسیاتی الجھنوں کا
علاج جن کا ہمارے گھروں میں کبھی انتظام نہیں کیا جاتا ____ 72
، خوف انسانی صلاحیتوں اور شخصیت کو ہمیشہ کے لیے کچل دیتا ہے 73
، Affection دینے سے بچے میں جذبۂ احترام پیدا ہوتا ہے 74
، ہمارے ہاں یتیموں کی پرورش کا اسلوب انہیں ذبح
کرنے کے مترادف ہے ____ 74
، اقتصادی طور پر یتیموں کے حقوق کی حفاظت اور معاشرتی طور پر ان
کے لیے Affection (شفقت ورافت) کی ضرورت ہے 75
، یتیموں کی زندگی کا اصل مسئلہ فیملی لائف سے محرومی کا ہے
اور حقوق وواجبات پورا نہ کرنے کا سوال ____ 75
، چار چار بیویوں کے مسئلہ کی نوعیت ____ 76
، ہمارے ہاں خطبۂ نکاح کے دوران قرآنی آیت میں کی
جانے والی خیانت ____ 77
، ہمارے ہاں کے نکاح فارم میں بھی ''وَاِنْ خِفْتُمْ'' کے
الفاظ درج نہیں ہیں ____ 78
، مروجہ عائلی قوانین کی مخالفت کی وجۂ جواز ____ 78
، قرآنِ حکیم پہلی شادی کے بعد دوسری شادی کے لیے' اپنی
طرف سے دی گئی شرط کو' دومرتبہ بیان کرتا ہے ____ 79
، قرآنِ حکیم میں یتیم (یَتٰمٰی) عورتوں کی تعریف ____ 80
، مدینے کی ابتدائی زندگی کے حالات میں مسلمان مردوں کو
اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت اور اقتصادی مسائل 80
، قرآنِ حکیم نے تو ایک وقت میں ایک بیوی کا ہی قانون دیا ہے 81
، اجتماعی طور پر تمدنی حالات اور وقت کے تقاضوں کے
پیشِ نظر دوسری شادی کی اجازت ____ 82
، تنہائی کا معاشرتی حل یتیم خانے کھولنا نہیں بلکہ اپنی
فیملی کا ممبر بنانے میں ہے ____ 82
، معاشرتی حالات کے تحت بھی قرآنِ حکیم نے یہاں حکم نہیں دیا
بلکہ مشروط اجازت دی ہے ____ 83
، حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت اور
قرآنِ کریم کی آیت کا مفہوم ومقصود ____ 83
، قرآنی تعلیم کے برعکس بلوغت سے پہلے جنسی اختلاط کی
اجازت تو کسی حیوان میں بھی نہیں ہے ____ 84
، بالغ ہونے کی شرط اور پسند وناپسند کے سلسلہ میں
قرآنِ حکیم کا فرمان ____ 84

، شادی کے معاملے میں ہم نے فریقین سے اختیار وارادہ کا حق تو پہلے ہی سلب کرلیا ہوتا ہے اور اب مسائل ہی مسائل ہیں ____ 85

، دوسری شادی کے سلسلہ میں قرآن حمید نے عدل اور جذبات کی بات کی۔ اور یہ مومن مرد اور مومن عورت دونوں سے مخاطب ہے 87

، قرآنِ کریم نے آفت زدہ عورتوں کو سہارا مہیا کرنے کی خاطر دوسری شادی کی گنجائش رکھی ہے ____ 88

، قرآنِ حکیم کی طرف سے دوسری شادی کی صورت میں مرد کے لیے ایک ضروری تاکید اور دوسری شادی کے لیے ایک استثنا _ 89

، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں کیے جانے والے اعتراضات ____ 89

، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے پہلی شادی ____ 90

، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی ____ 90

، حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کی شادی کا ماجرا 91

، حضرت سودہؓ کا معاملہ ____ 92

، حضرت ام سلمہؓ کا ذکر ____ 93

، حضرت ام حبیبہؓ سے شادی کا معاملہ ____ 93

، حضرت زینبؓ کی داستانِ غم ____ 94

، حضرت زینبؓ کی الم انگیز اور حیرت زا داستان ____ 94

، حضرت میمونہؓ کا ذکرِ خیر اور فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ کا اپنی بیویوں سے خطاب ____ 94

، نبی اکرم ﷺ کے اعلانِ عام کے جواب میں ازواجِ مطہراتؓ کا ردِ عمل ____ 95

، ازواجِ مطہراتؓ کے احترام اور اُن کے رتبے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم ____ 96

، ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کی لِم، طریقِ کار اور یو این او میں غلام، لونڈیوں کے معاملے پر خادم الحرمین شریفین کا ردِ عمل 96

، آخر کار زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونا پڑا مگر پھر بھی!! _ 97


## تیسرا باب: سورۃ النسآء ،
## (آیات 3 (مسلسل) اور 4)


، قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر رفیقۂ حیات کے ضمن میں ایک بیوی کا ہی اصول ہے تو پھر یہ ما ملکت کیا ہے؟ ____ 99

، قرآنِ حکیم میں ''مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' کے متعدد معانی __ 100

، لونڈیوں کا تصورِ متواتر اور مباحث ____ 100

، غلاموں اور لونڈیوں کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کے منشور کی مخالفت 101

، ظہورِ اسلام کے وقت ارسطو کے ہاں ستر غلام موجود تھے __ 101

، عربوں کے ہاں غلاموں اور لونڈیوں کی کیفیت ____ 102

، افریقہ میں بسنے والے مرد وزن کا شکار ہوتا تھا، مارکیٹ میں انہیں فروخت کیا جاتا تھا اور عربوں میں بھی یہ چیز موجود تھی __ 102

، انسانیت کی آزادی و مساوات کے لیے قرآنِ حکیم کا ہر نوعِ غلامی کے خلاف اعلانِ عام ____ 103

، جنگی قیدیوں کے متعلق حکمِ خداوندی ہے کہ وہ تمہارے مہمان ہونگے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ ____ 103

، حسنِ سلوک کے تناظر میں جنگِ بدر کے ایک قیدی کا بیان اور ان سے کام لینے کا انداز ____ 104

، دشمن قیدیوں کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک کرو کہ لڑائی خود اپنے ہتھیار رکھ دے اب سوال یہ ہے کہ عرب معاشرے کے اندر موجود غلام اور لونڈیوں کا کیا کیا جائے ____ 105

، قرآنِ حکیم کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہوتا ہے

وہ ناممکن العمل طریق کبھی اختیار ہی نہیں کرتا ________ 106
، ہمارے ہاں لفظ مکاتبت کا وہ مفہوم نہیں لیا جاتا جو
قرآنِ حکیم پیش کرتا ہے ________________ 108
، قرآنِ حکیم نے لونڈیوں کو بیویوں کا سا درجہ دینے کے لیے
احکام نازل کر رکھے تھے ________________ 108
، انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کا سلسلہ ہمیشہ
کے لیے بند کر دیا گیا ________________ 109
، ہندوؤں کے ہاں نیکی یا پُن کے کاموں کی نوعیت کا ایک
عجیب سلسلہ' کیا یہی غلام اور لونڈیوں کا تھا؟ ________ 109
، ایک طرف انسانوں کو قصداً غلام بنانا اور پھر انہیں آزاد کر دینا'
خدا کے ساتھ مذاق ہے ________________ 111
، کسی غلام کو آزاد کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا
کرنا بھی ضروری ہے اور غلاموں نے بادشاہتیں بھی کی ہیں _ 111
، دورِ موجود کی Latest (جدید ترین) تفسیر 'تفہیم القرآن'
کی پہلی جلد میں' ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جنگ میں گرفتار
ہونے والی عورتوں کے بارے میں فرمان ________ 112
، خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے ہاں لونڈیوں کی تعداد
تین تین ہزار تھی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تفسیر ___ 113
، قرآنِ حکیم میں غلامی کے سلسلہ میں ہر مقام پر ماضی کے صیغے
کو استعمال کیا گیا ہے' مگر ہماری شریعت کچھ اور کہتے ہے ___ 114
، حضرت زیدؓ کو غلامی سے آزاد کرنے کا قریش کے ممتاز ترین
بنو ہاشم کی خاتون سے شادی کرانے کا قصہ ________ 115
، روم کی طرف پیش قدمی کرنے والے لشکر کا سپہ سالار
اسامہ ابن زیدؓ کو مقرر کیا گیا ________________ 116
، دوسری شادی کا فیصلہ مملکت یا معاشرے کی صوابدید پر کیا جائے گا 117
، بیویوں اور لونڈیوں کی الگ الگ دو اصطلاحوں کا استعمال کیوں؟ 117
، قرآنِ کریم کے اسلامی نظام میں مجرم کی سزا کے تعین کے لیے
اس کے اختیارات اور اسکی علمی سطح کو پیش نظر رکھنا ہے ____ 118
، کثرتِ اولاد کو قرآنِ حکیم نے بوجھ تلے دبنا کہا ہے ____ 118
، قرآنِ حکیم کے نزدیک نکاح کے معاملے میں عورت کے
ایک زیادہ فائق حق کو تسلیم کیا گیا ہے ________________ 119
، قرآنِ حکیم نے مہر کی بجائے تحفے کا لفظ استعمال کیا ہے
جو نہایت ہی غور طلب ہے ________________ 119
، ہمارے ہاں حق مہر کے مقرر کرنے اور پھر اس سے بچنے
کا طریقِ کار اور قرآنی احکام کی نوعیت ________________ 120

## چوتھا باب: **سورۃ النسآء** '(آیات 5 تا 10)

، معاشرے کا ہر وہ فرد جو خود کو تنہا محسوس کرے' وہ قرآنِ حکیم
کے نزدیک یتیم ہے ________________ 124
، لفظ بلوغت کی حقیقی تعریف ________________ 125
، قومی سطح پر مال و دولت کی اہمیت' اس کی تحویل کا معاملہ اور السفھآء
کا مفہوم ________________ 126
، قرآنی نظام میں مملکت کی بنیادی ذمہ داری ________ 127
، قرآنی راہنمائی نے اپنے ہاں تدریجی مراحل کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے
لیکن ہمارے ہاں اسے سمجھا نہیں گیا ________________ 127
، تدبر فی القرآن کا مفہوم ________________ 128
، سطح بیں نگاہوں نے قرآنِ حکیم کی پانچ صد آیات کو
منسوخ قرار دیدیا ________________ 128
، قرآنِ حکیم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں بلکہ وہ تدریجاً' منزل بہ

منزل اپنی راہنمائی کو واضح کرتا چلا جاتا ہے' مثلاً شراب کی مثال 129
، قرآنِ حکیم کے ہر حکم کے نفاذ کا اپنا مقام ہے۔ اس میں
پنہاں حکمت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ______ 131
، قرآنی احکام کو کس طرح نافذ کیا جاتا ہے؟ اس کا طریق کیا ہے؟
اور مال کس چیز کا ذریعہ ہے؟ ______ 131
، خدا کے آزمانے کے قرآنی معانی' ہمارا غلط تصور اور
بھولے بادشاہ مرشد!! ______ 132
، بلوغت اور پختگی پر زیرِ امانت مال کی واپسی اور انسانی طبیعت
کی حرص ______ 133
، مملکت کے مال میں سے خلیفہ کے حصہ کے متعلق
حضرت عمر فاروقؓ کا سنہری قول ______ 134
، اصلاح کے لیے خدا کے حضور پیش ہونے کا تصور ہی
آخری سہارا ہوتا ہے نہ کہ صرف قانون کی حد بندی ______ 135
، نکاح کی عمر بلوغت ہے اور بلوغت کی عمر؟ ایک سوال! ___ 135
، قرآنِ حکیم کے ہر لفظ کی وضاحت کا طریق تصریفِ آیات ہے 136
، قرآنِ حکیم نے بلوغت کو جوانی کی عمر کہتے ہوئے اسے متعین
کیا ہے: تصریفِ آیات کی ایک مثال ______ 136
، عائلی قوانین کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شریعت کے
تحت بچپن کی عمر میں شادی کو جائز قرار دیا جائے ______ 137
، سارداایکٹ اور تمام فرقوں کے متحد علما کا وفد ______ 137
، قرآن کریم کہتا ہے کہ ''اَشُدَّہٗ'' نکاح کی عمر ہے مگر ہمارے
ہاں اس کی سخت مخالفت ہے اور عجیب دلائل ہیں ______ 139
، حضرت عائشہؓ کے نکاح کی صحیح عمر انیس سال بنتی ہے: پرویزؒ 141
، کم سنی میں نکاح جائز بھی ہے اور نادانی کا پورا پورا ثبوت بھی۔
یہ کیوں؟ ______ 141
، عدت کی مدت کا شمار کرنا ______ 141
، لَمۡ یَحِضۡنَ کا غلط ترجمہ' کم سنی میں شادی کرنے کی بھونڈی
دلیل اور شریعت کے احکام ______ 142
، حقوق حاصل کرنے کا موقعہ اور عورتوں کے حقوق دینے والوں سے
پوچھے جانے والے چند سوالات کی نشان دہی ______ 143
، موجودہ مسلمانوں کو ایک سال کا نوٹس ملے گا ______ 146
، وراثت کے قوانین میں عبوری دور کے احکام اور ساتھ
ہی قانونی پہلو اور اخلاقی پہلو کا تذکرہ ______ 146
، پابندِ شریعت ایک بڑے مولوی صاحب کی ''سنگ دلی''
کا ایک واقعہ ______ 149
، قرآنِ کریم قانونی اور اخلاقی پہلو ساتھ ساتھ چلاتا ہے ___ 150
، سَعِیۡرًا کے قرآنی معانی ______ 150

## پانچواں باب: **سورة النسآء**
## (آیات 11 تا 14)

، شخصی قوانین اور پبلک قوانین کی غیر قرآنی تفریق میں
ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ اور قرآنِ کریم کی تعلیم _ 152
، ہمارے مروجہ قانونِ وراثت کی بنیادی غلطی ______ 153
، وراثت کی تقسیم میں خود ساختہ فارمولے سے پیدا ہونے والی
الجھن اور قرآن مجید کی جامعیت ______ 154
، وراثت کی تقسیم کے لیے وصیت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم
کا 3 مرتبہ ایک تاکیدی حکم ______ 156
، وصیت کرنے والے یا ترکہ چھوڑنے والے کے لیے ضروری

حکم اور اس کی اہمیت ______ 156
، وصیت لکھنے کے متعلق جزئیات تک کی تفصیل کے برعکس
ہمارا خود ساختہ قانونِ شریعت ______ 157
، اڑھائی سو سال کے بعد زبانی روایت کی بنا پر قرآنی آیت
کو منسوخ کرنے کا تصور ______ 158
، قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کے بعد پیدا ہونے والی
مشکلات ______ 158
، قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے تکمیلی مرحلے میں وصیت
وغیرہ کی تو نوبت ہی نہیں آتی ______ 159
، قرآنِ حکیم کے تمام احکام بتدریج اپنی منزل تک پہنچتے ہیں 160
، نبی اکرم ﷺ کی زندگی انسانیت کے لیے بطور اسوۂ حسنہ
قرار پائی ہے جسے انسان بطیبِ خاطر اپنے اوپر لاگو کرتا ہے
یہ بالا کراہ نہیں ہے۔ ______ 160
، تعلیم و تربیت کے لیے نبی اکرم ﷺ کا طریق اور مآل ___ 161
، قرآنِ حکیم کے نظام کی انتہائی منزل کے خدوخال اور عبوری
دَور کے احکام کا غلط انطباق ______ 161
، قرآنِ حکیم کے مطابق یتیموں کے لیے وراثت کا حصہ
اور ہمارے ہاں کے شریعت کے احکام ______ 162
، اسلاف کی صف میں کھڑے ہونے والوں کی اپنی
حالت زار اور قرآنِ کریم کی تنبیہ ______ 164
، وراثت میں بیٹے کا حصہ بیٹی سے دوگنا کیوں؟ کیا عورت پست
درجے پہ ہے؟ ______ 164
، پراپرٹی کی تقسیم کے سلسلہ میں حصوں کی قانونی وضاحت _ 166
، تقسیم کے سلسلہ میں مروجہ قانون قرآنِ حکیم کے خلاف ہے:
مجبوریاں بھی ہیں غیر کے اختیار میں ______ 167
، قرآنِ حکیم کے نزدیک تقسیمِ وراثت کا ملخص ______ 167
، وراثت کے سلسلہ میں کلالہ کی اصطلاح کا مفہوم اور ترکہ کی تقسیم 168
، سورۃ النسآء کی 11ویں آیت کی وضاحت ______ 169
، کلالہ کے حصے کی مزید تفصیلات ______ 170
، ہمارے ہاں وصیت کی آیت کو منسوخ کر دیا لیکن قرض کی
ادائیگی کو بحال کیوں رکھا؟ ______ 171
، وصیت کے اصول میں تاکید کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
یہ حدود اللہ کے اندر رہ کر کرنی ہے۔ ______ 171
، چین کی ترقی کا راز ان کا وہ نظام ہے جس میں عدالتوں کی
ضرورت ہی نہیں اور ذاتی جائیداد کا قانون منسوخ ہے ______ 172
، انسانی معاشرے میں تمام جھگڑوں کا وجود ذاتی ملکیت کی
بنیاد پر ہوتا ہے اور خدا کی راہنمائی اس کا حل ہے ______ 172
، قرآنی نظام کا ماحصل یہ ہے کہ اس میں میری اور تیری کی تفریق
باقی ہی نہیں رہتی' معیارِ زندگی بلند ہو جاتا ہے ______ 173
، غیر قرآنی معاشرے کی اذیت ناکی دل کو آگ کی طرح
لپیٹ لیتی ہے ______ 174

## چھٹا باب: سورۃ النسآء
## (آیات 15 تا 18)

، قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں میں عصمت اور عفت کی
اہمیت اور ہمارے ہاں اس کی نوعیت ______ 176
، بدکرداری کے گھناؤنے ماحول میں حضرت مریمؑ کی پاکدامنی
کا ذکر اور حضرت یوسفؑ کا تذکرہ ______ 177
، قرآنِ حکیم میں قابلِ سزا جرم کا ذکر ______ 177

٭ ہمارے ہاں حفاظتِ عصمت کے سلسلہ میں مرد اور عورت میں پایا جانے والا فرق اور ماں کے خدشات ____ 178

٭ قرآنِ حکیم کے نزدیک عصمت کی اہمیت اور حفاظت کا ایک غور طلب سوال ____ 178

٭ آج کی مغربی سیکولر سوسائٹی میں جنسی شعبہ کی نوعیت، سابقہ دور کے لمعات میں فرق اور انسان کی بدنہادی ____ 179

٭ معاشرتی اقدار کے تعین کے انحصار کو سوسائٹی کی صواب دید پر چھوڑ دینے کے اثرات ____ 180

٭ قرآنِ حکیم کی غیر متبدل اقدار کے معنی اور اپنے طور پر سماجی مسائل کا حل ____ 181

٭ عیسائیت کی بائبل میں سوائے ایک شق کے کہ تم عورت کو طلاق نہیں دے سکتے اور کوئی قانون ہی نہیں ہے اور سوسائٹی نے جنسی تعلقات کو باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا ____ 181

٭ مغربی سوسائٹی کی روش کو اپنانے میں ہماری پرانی نسل کا کردار اور پابندیوں کی فی نفسہٖ قدر و منزلت ____ 182

٭ ہماری آئندہ آنے والی نسل کی سوچ کا معیار اور قرآنِ حکیم کا دعویٰ ____ 183

٭ جنسیات کے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کے اسکالر جے ڈی انون کی ریسرچ کا نمونہ (Sample) ____ 183

٭ انسانوں کی تمدنی زندگی پر جنسیاتی ضوابط کے تین شقوں میں اثرات ____ 184

٭ جنسیاتی قواعد کی پابندی سے قوتِ فکر و عمل میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس نتیجہ رومیوں کی مضمحل حالت میں تاریخ میں درج ہے ____ 185

٭ ڈاکٹر جے۔ڈی۔انون کے نزدیک اسلام قبول کرنے سے پہلے اور اس کے بعد عربوں کی حالت ____ 186

٭ ایک دوسری کیفیت کا نتیجہ: جنسی تسکین کے مواقع اور نرالے انداز ____ 186

٭ جنسی تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرنے والی قوم راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے تقلید پرست ہو جاتی ہے ____ 187

٭ یہ قوم آخر کار اسباب و علل پر غور کرنے کی بجائے کرامات میں الجھ کر زندہ بدست مردہ بن جاتی ہے ____ 187

٭ زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا ہے لیکن حالات کا امتداد ان پر اثر انداز نہیں ہوتا، اس لیے کہ ان کے ہاں وحدتِ زواج کا اصول ہے ____ 188

٭ کسی قوم کو ہر دور میں مقام عروج پر رہنے کے لیے جنسی اختلاط کو کم از کم حد تک محدود رکھنا ہوتا ہے ____ 189

٭ مساوات کی خاطر مرد اور عورت کے لیے بالمعروف کا حکم ہے اور ڈاکٹر اَنوِن کی آزادانہ تحقیق ____ 189

٭ قرآنِ حکیم کی رُو سے بے حیائی کی حرکات کا ارتکاب، چار گواہوں کا ماجرا اور ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی پیدا کردہ الجھن 190

شادی سے پہلے تو دنیا کی ہر عورت تمہاری بہن ہے اور پھر دوسری شادی اور اداؤں کی کیفیات کا معاملہ ____ 192

٭ ہمارے ہاں غزل کی شاعری جنسی بدنہادی کے دور کی پیدا کردہ ہے ____ 194

٭ عصمت کے آبگینے کے تحفظ کے پیشِ نظر زنا کی سزا سو کوڑے تہمت کی سزا اسی کوڑے، قرآن حمید تو بیباکانہ روش کی سزا بیباکانہ آزادی کو ہی روک دینا ہے ____ 194

- مستورات کو بلاقصور گھروں میں بند رکھنا قرآنِ حکیم کے نزدیک جرم ہے' ان کے لیے بھی اسمبلیوں میں نشستیں مخصوص کی گئی ہیں 194
- طلوعِ اسلام کنونشن کے موقع پر ایک سوال کا جواب' نیز درس کے دوران رونما ہونے والا واقعہ 196
- قرآنِ حکیم میں عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا اور حضرت یوسفؑ کی داستان بُرہانِ ربی کی زندہ شہادت ہے اور بے حیائی دُہرا جرم ہے 197
- معاشرے میں بے حیائی کو روکنے کا حتمی علاج سیرتِ یوسفؑ میں پنہاں ہے اور اسلامی معاشرے کا فریضہ بھی یہی ہے 198
- کسی عمل کے دانستہ اور نادانستہ ہونے کی صورت میں ایک نفسیاتی تبدیلی کی نشاندہی 199
- توبہ کے معنی ندامت کے بعد نقصان کی تلافی کرنے کے ہوتے ہیں' زبانی ''میری توبہ' تُو مجھے بخش دے'' کے نہیں ہوتے 199
- فکرِ قرآنی سے پہلے دنیائے عرب کی حالت اور اس کے بعد فتوحات کا دور 200


## ساتواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 19 تا 21)


- قرآنِ حکیم کے نزدیک کسی مرد کو یہ حق نہیں کہ وہ عورتوں کا زبردستی مالک بن جائے 202
- اسلام سے قبل مختلف مذاہب اور ممالک میں نکاح سے آزادی کے بعد عورت کی پوزیشن 203
- بیوہ کے لیے تورات کا بیان اور کمانڈمنٹس (اوامر) 204
- یہودیوں کے ہاں بیوہ کا اپنے دیور یا جیٹھ کے ساتھ شادی کرنا ضروری امر تھا' نکاح میں نہ عورت کی مرضی تھی نہ طلاق کا حق تھا 204
- رومیوں میں عورت کی تمدنی حیثیت اور طبقاتی ضوابط میں عورت کے لیے اشرافیہ کے احکام 205
- عورت باپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے جہنم میں مگر بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے پاؤں تلے جنت! 205
- Matrimony کا مادہ (Root)' عورت کا تمدنی مقام اور یہودیوں کے ہاں عورت کی حیثیت 206
- انجیل میں احکام کے بجائے صرف اخلاقیات کی چند باتیں ہیں اور عورت کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت شے جانا جاتا ہے 207
- عیسائیت میں شادی نہ کرنا ایک مقدس فعل ہے اور مطلقہ عورت شادی نہیں کر سکتی 207
- سینٹ پال کے مذہب کے خدوخال 208
- انقلابِ فرانس مملکت و مذہب میں ثنویت اور ایران میں عورت کی حالتِ زار 209
- ہندوستان میں دھرم شاستر کے اندر پہلی چیز نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی تھی اور وہ بھی اٹوٹ انگ تھی 210
- اسلام کے شروع میں دنیائے عرب میں عورت کے ساتھ کیا جانے والا سلوک 210
- عورت صرف ایک جنس (Commodity) تھی اور بس 210
- جہالت کے اُس دور میں قندیلِ آسمانی کی طرف سے ایک اعلانِ عظیم اور لفظ کرھًا کی وضاحت 211
- قرآنِ حکیم کے نزدیک عورت کی عصمت کی حفاظت اور اس کے جذبات کے احترام کی نوعیت 211
- لفظ کُرھًا اور کَرھًا کے مفہوم میں فرق اور تزویج کے رشتے کی اہمیت اور آج کا معاہدۂ نکاح 212
- نکاح کو قرآنِ حکیم نے معاہدہ قرار دیا ہے جو تراضیِٔ مابین

سے استوار ہوتا ہے 213

، قرآنِ حکیم کی طرف سے نکاح کی عمر کے تعین کے عظیم مقصد کو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے 213

، کھڑے کھڑے تین طلاقوں کے بعد بڑے میاں صاحب کی ندامت کا علاج: 4 بچوں کی ماں حلالہ کرے 215

، ہمارے ہاں کے تراجم میں مرد عورت پر داروغہ ہے' خلع کے جان لیوا مراحل اور اربابِ شریعت کی مخالفت 215

، گھریلو زندگی کے دوران الجھاؤ کی شکل میں قرآنِ حکیم کی طرف سے تجویز کردہ علاج 216

، ناراضگی کی شکل میں مصالحت کی خاطر ایک کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے 217

، ازواجی زندگی میں قوانینِ خداوندی کو Abuse (غلط استعمال) کرنا' مقرر کردہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھنا 218

، طلاق کا فیصلہ تو بہر حال میاں بیوی کو ہی کرنا ہوگا' عدالت اس کی مجاز نہیں ہوسکتی مگر یہاں یہ فتویٰ مولوی صاحب دیتا ہے 218

، فرقہ بندی کی بنا پر باہمی کفر کے فتوے کی وجہ سے بیویوں کی شامت 219

، دورِ ملوکیت میں بادشاہ کی بیعت کے موقعہ پر ایک اقرار نامے کی شرط کے سلسلہ میں اربابِ مذہب کا کردار اور امام مالک یمنی کی مخالفت 220

، مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ جکڑ بندیوں کے باعث یورپ کی بغاوت اور اس کے اثرات 221

، آج یورپ میں ازدواجی زندگی کی حیران کن ناگفتہ بہ حالت 222

، ازدواجی زندگی اور تمدنی زندگی میں مذہبی پیشوائیت کی سوچ اور مغرب کی مادر پدر آزادی کے برعکس قرآنِ حکیم کی راہنمائی 224

، ایک سے زیادہ بیوی کرنے کے مسئلے کا حل اور باہمی رفاقت کی نوعیت 225

، میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بھی حسن کارانہ انداز کی جھلک 226

، قوانینِ خداوندی کے سامنے یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات کا موجب بن سکتا ہے 226

، آزادی بغیر پابندیٔ قانون کا حشر سوائے تصادمات کے اور کچھ نہیں ہوتا 227

، جبر ہے دل پہ کس اختیار کے ساتھ! 227

## آٹھواں باب: سورۃ النسآء

## (آیات 22 تا 24)

، زوجیّت کے لیے رشتوں کے چناؤ میں حلال و حرام کی تمیز اور زوج کا بنیادی اور عملی مفہوم و مقصود 228

، کشیدگی کی بنا پر حفاظتی تدابیر کے لیے قرآنِ کریم کے تجویز کردہ انتظامات کی شکل و صورت اور اہمیت 229

، زوجیّت کے سلسلہ میں دورِ جہالت کی کیفیت اور وحی کی راہنمائی کے باوجود ہماری حالت 229

، شادی کے سلسلہ میں ایران جیسی متمدن قوم میں بادشاہوں کی حالت اور عربوں کا ذکر 230

، ہندوؤں کے ہاں رشتہ ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا 230

، نکاح کے رشتوں کی ممانعت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم: جو ہو چکا' وہ ہو چکا مگر اب نہیں 231

، عدل اور قانون کی ایک بنیادی وضاحت کہ وہ مؤثر بہ

ماضی نہیں ہوتا ____ 231
• ڈکٹیٹر صرف حکم دیتا ہے اس کی وضاحت نہیں کرتا لیکن قرآن حمید
جو حکم دیتا ہے اس کی افادیت اور حکمت بھی بیان کرتا ہے ____ 232
• کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت انسان کے اندر آمادگی
کا جذبہ پیدا کرتی ہے مگر سوچو تو! ____ 232
• انسان پر بصورت نکاح حرام کیے جانے والے رشتے اور پھر
رضاعی ماں کے رشتہ داروں کی وضاحت ____ 233
• ہمارے ہاں فقہ کے قانون کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کی
مزید وضاحت ____ 233
• اسلامی مملکت کی طرف سے بنا ہوا قانون ہی شریعت کا
قانون کہلائے گا ____ 234
• خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی حکومت' اسلامی نہ رہی بلکہ مسلمانوں
کی حکومت بن گئی۔ یوں دین و دنیا میں ثنویت پیدا ہوگئی ____ 235
• اسلامی حکومت کے لوازمات اور طریق کار کو نظر انداز کرنے کا
نتیجہ: فرقہ بندی میں مگن رہنا ____ 235
• قرآنِ حکیم کے نزدیک مشرک کی وضاحت اور ہماری خاموشی 236
• فرقہ بندی سے نجات کے آخری حل کے برعکس ہماری
آئین سازی کے خلاف احتجاج اور ایجی ٹیشن ____ 236
• شخصی قوانین کے متعلق ہر فرقے کو اپنی اپنی فقہ کے مطابق
کتاب و سنت کی تشریح کا حق اور نکاح کی حرمت کے لیے
اسلامی حکومت کی قانون سازی ____ 237
• دودھ پلانے کی مدت یا مقدار کے تعین کا مسئلہ اور مختلف
فقہوں کی تشریح و توضیح میں اختلاف ____ 238
• اگر اجتہاد کے دروازے کو سربہ مہر کر دیا جائے تو پھر انسانی
شعور کی نشوونما رک جاتی ہے ____ 238
• اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے
فقہی اختلافات کی پیدا کردہ پیچیدگیاں اور ان کا علاج ____ 239
• قرآنِ حکیم کا فلسفہ انسان میں پاکیزگی قلب و نگاہ پیدا کرتا ہے 240
• عصمت کا دوسرا نام قلب و نگاہ کی پاکیزگی ہے ____ 240
• منہ بولے بیٹے کی قانونی حیثیت ____ 241
• ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت تو مشروط ہے ____ 241
• ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا ____ 241
• حضرت عمرؓ کے دور میں اہلِ کتاب سے شادی کرنا ممنوع
قرار پا گیا تھا ____ 242
• لونڈیوں کا ذکر صرف ظہورِ اسلام کے عرب معاشرے
کے لیے تھا ____ 243
• ہجرت کے دوران مکہ میں رہ جانے والی مسلمان عورتوں کا مسئلہ'
ان کا حل اور انسانی میں انقلاب ____ 244
• نکاح کی حدود کے بعد مادۂ تولید کی حفاظت کا ذکر ____ 245
• چار شادیوں کے لیے اہلِ یورپ کو ہمارے مفسرین کے دلائل'
قرآنِ کریم کے منتخب کردہ الفاظ کا اعجاز کے ساتھ ایجاز اور
میاں بیوی کا منفعتِ باہمی کا معاملہ ____ 246
• لفظ متعہ کے متعلق پایا جانے والا تصور جو ہزار سال سے شیعہ
حضرات اور سُنّی حضرات کے زیرِ بحث چلا آ رہا ہے ____ 247
• شادی پر مہر کی ادائیگی کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم اور
اس کی نوعیت ____ 249

## نواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 25 تا 28)


، تمدنی لحاظ سے قرآنِ حکیم کے نزدیک عائلی زندگی کی اہمیت 251
، قرآنِ حکیم کے نزدیک ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں زوجین کے باہمی انتخاب کے لیے ضروری ہدایات اور غلاموں اور لونڈیوں کا مسئلہ ____ 252
، عربوں کے معاشرتی ماحول میں پرورش پانے والے غلاموں اور لونڈیوں کی ذہنی، نفسیاتی اور کیفیاتی الجھن! ____ 254
، قرآنِ حکیم کی تعلیم لونڈیوں سے نکاح کی صورت میں جذبات کی بجائے Facts (حقائق) کو پیشِ نظر رکھتی ہے ____ 254
، اگر شادی کا چانس میسر نہ آئے تو اپنے پہ ضبط کرو، پست ترین سطح پر نہ پہنچو ____ 255
، اپنے جذبات کو ابھارنا یا پیدا کرنا انسان کے اپنے کنٹرول میں ہوتا ہے ____ 256
، جنسیات کے سلسلہ میں فرائڈ کی کھائی گئی لغزش کا نتیجہ ____ 256
، فرائڈ کے خیالات کے برعکس ایڈلر اور ژنگ کی تحقیق اور ہمارے نوجوانوں کی تقلید ____ 257
، جنسی جذبے کے برعکس بھوک اور پیاس کی تڑپ کسی خیال اور ارادے کی محتاج نہیں ہوتی ____ 257
، فرائڈ کی غلط فہمی کے برعکس حقیقت کی نشاندہی اور اس کا تعمیری نتیجہ ____ 258
، قرآنِ حکیم کی راہنمائی کی عظمت اور دورِ حاضر کی ریسرچ ____ 259
، زوجیت کے سلسلہ میں خیالات کی ہم آہنگی کی اہمیت کو مقدم جانو ____ 260
، خیالات کے تزکیہ کے بغیر عفتِ قلب ونگاہ پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہی ذہنی تفاوت جنّتی ماحول پیدا کرنے میں ممد ہوتا ہے ____ 261
، زنا کی شکل میں آزاد عورتوں اور لونڈیوں کی سزا میں فرق کی بنیادی وجہ ____ 261
، مجرم کو سزا دیتے وقت اس کی پرورش، تربیت اور ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہوگا ____ 262
، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ اور سزا کے تعین کرنے کا اصول ____ 262
، نبوت کے گھرانے کی عورتوں کے لیے قرآن کریم کا ارشاد: آزاد عورتوں کے مقابلے میں دوگنی سزا کا حکم ____ 263
، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا قرآنی فرمان برائے مساواتِ انسانیہ اور گہری حکمت ____ 264
، باہمی طور پر ذہنی ہم آہنگی کا قائم کردہ معیار اور نکاح کے لیے باقاعدہ ڈنکے کی چوٹ اعلان ____ 265
، ہمارے ہاں معاشرہ کی حالت زار اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ____ 266
، عفت وعصمت کو محفوظ رکھنے کا مقصد اور اس کو بیان کرنے کا طریق ____ 266
، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کا معاملہ اور مغربی معاشرے کو قائل کرنے کے لیے ہمارے ہاں کے دلائل ____ 267
، ملوکیتی دور کا پیدا کردہ تصورِ اسلام، لفظ حرم کا مفہوم اور فطرت کے تقاضوں کی عملی شکل کا سوال ____ 268
، ہم نے قرآنِ حکیم کے دیئے گئے عائلی قوانین کو مذاق بنا رکھا ہے، مگر قرآنِ حکیم کو سامنے رکھ کر خود فریبی نہیں ہو سکتی ____ 269

زندگی کے تین مراحل کا تعین ____ 270
لفظ ہدایت کا لغوی اور قرآنی مفہوم ____ 270
قوموں کے عروج و زوال کے لیے راہنما اصولوں کی نشاندہی ____ 271
قرآنِ حکیم کی طرف سے بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد
ان سے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے ____ 271
انسانیت پر سے زندگی کی ہر قسم کی بوجھل سلوں کو ہٹا دینا صرف وحی
کے ذریعے ہی ممکن تھا اور انسان کے کمزور ہونے کی ایک الجھن 272
کیا انسان کی بھی کوئی فطرت ہوتی ہے؟ شہنشاہ اکبر کی
طرف سے کیا گیا ایک تجربہ ____ 272
تقسیم سے پہلے یوپی میں کیا جانے والا ایک اور تجربہ ____ 273
کیا انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟
ایک اہم سوال۔ ____ 273
الانسان (The Man) کے لیے قرآنِ حکیم کا بیان ____ 274
انسان حیوان ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے مگر فطرت نے
اس پر سے اپنا کنٹرول اٹھا دیا ہے اس لیے یہ الانسان ہی ہے ____ 275
زندگی کا نقشہ تو اس وقت بدلتا ہے جب الانسان مومن بنتا ہے
کیوں کہ وہ کنٹرول وحیِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے ____ 277
آج دنیا بھر میں الانسان کی نفسیاتی کیفیت کی حالتِ زار کیوں
کہ اس نے اپنے اوپر سے وحیِ خداوندی کا کنٹرول اٹھا لیا ہے 277

## دسواں باب: سورۃ النساء

### (آیات 29 تا 33)

مذہب پرست دنیا میں آج بھی عورت کا مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ ہے
عورت کا شمار نوعِ انسان میں ہوتا ہی نہیں تھا ____ 280
آج تک شریعت کے احکام و قوانین بنانے میں کسی عورت
کو شامل ہی نہیں کیا گیا ____ 280
زندگی کا حصول تو سعی و کاوش کا رہینِ منت ہوتا ہے ____ 281
حیوانی سطحِ زندگی سے انسانی سطحِ زندگی کا حصول اور اس کا شعار ____ 282
جنسی گوشے کے سلسلہ میں دیئے گئے اصول و ضوابط کے ساتھ ساتھ
شکم پروری کے لیے الحق اور الباطل کی اصطلاحات کی وضاحت 282
ہمارے ہاں تجارت میں باہمی رضامندی کو اپنانے کا
طریق کار اور شرحِ منافع کا تعین ____ 283
پہلے پہل گاؤں میں بارٹر سسٹم کے طریق کار کی نوعیت،
اس کے بعد سکے کا لین دین اور پھر یہ سکہ پرابلم بنا ____ 284
قرآنِ حکیم میں دولت کا بنیادی مقصد، مفہوم،
اس کا طریق کار اور پھر ہمارا معاشی نظام ____ 285
سودی نظام کی مختلف شکلیں اور اس میں پیدا ہونے
والی مشکلات ____ 286
نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت
اور ایک مزدور کی دن بھر کی مزدوری کا تعین ____ 286
قرآنی نظام میں ضروریاتِ زندگی کو بیچا نہیں جاتا بلکہ سپلائی
کیا جاتا ہے، سرمائے پر منافع ربوٰ ہے اور ربوٰ خدا اور رسول
کے خلاف اعلانِ جنگ ہے ____ 287
غلط نظام میں آخر کار ہر ایک کا گلا کٹنے کی باری آ جاتی ہے ____ 287
ایک دوسرے کا گلا کاٹنے والوں کا ذکر اور پھر نتیجہ ہر سو فساد
اور تباہ حالی ____ 288
مال و دولت کے دلدادؤں کی ذہنی و قلبی کیفیت اور
قانونِ مکافاتِ عمل کی پکڑ اور اس کے معیار کا پلڑا ____ 289
کوئی انسان فرشتہ نہیں، نہ ہی یہ نیکی کا معیار ہے ____ 290

، ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ 291

، ابلیس کے انکار اور آدم کے اقرار میں فرق کی نوعیت ___ 291

، تصوف میں جذبات کی عظمت اور نعمت کو قبول کرنا تو درکنار اُسے تو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا ___ 292

، نبی اکرم ﷺ نے اپنے جذبات کو فنا نہیں کیا تھا' انہیں مسلمان کرلیا تھا' اس سے ناہمواریاں تباہ کن اثرات پیدا نہیں کرتیں 292

، سیأت کے اثرات کو ختم کرنے کا طریق' بیماری اور موت وحیات کا عمل ___ 292

، انسانوں سے لے کر قوموں کی موت وحیات کے لیے یہی پیمانہ ہے ___ 293

، باہمی صلاحیتوں کے فرق کے علاوہ انسانی لحاظ سے مرد اور عورت میں فرق نہیں کیا جاسکتا ___ 293

، آخر مردوں کے نزدیک عورت کو کیوں محکوم تصور کیا جاتا ہے؟ 294

، قرآنی احکامات کے برعکس عورت کی معاشی اور تمدنی حیثیت 295

، قرآنِ حکیم کے نزدیک عہد و پیماں کے رشتوں میں عورت کو وراثت کا حق ___ 296

، لفظ فضلہ یا افضل کا لغوی مفہوم ___ 297

، انسانی بچہ دو جرثوموں کا مرکب ہوتا ہے ___ 297

، قرآنِ حکیم کی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کی آیت کا مروجہ ترجمہ ___ 298

، موجودہ روایات' تراجم اور تفسیروں میں مقامِ عورت کی عکاسی کی ایک جھلک ___ 298

، اولیاء اللہ بننے کے سلسلہ میں رابعہ بصریؒ سے منسوب ایک واقعہ 300

، مقامِ عورت تو قرآن کریم کی نگاہ میں بہت بلند ہے ___ 301


## گیارھواں باب: سورة النسآء

## (آیت 34)


، قرآنی تعلیم کے برعکس (4:34) کا وہ ترجمہ جو ہر جگہ ہزار سال سے مستند سمجھا جاتا ہے ___ 302

، یورپ میں کیے گئے تراجم بھی ہمارے تراجم کی ہی عکاسی کرتے ہیں: یہ بات سمجھنے کی ہے ___ 303

، ہماری مرتب کردہ تفاسیر کا معیار پرکھنے کے لیۓ ایک تفسیر کے تحریر و بیاں کی چند مثالیں ___ 304

، ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق ___ 305

، قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک اعتراض کا جواب ___ 306

، نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے تین سو سال بعد لکھی گئی جامع تاریخ کی حقیقت ___ 306

، دورِ اولیٰ کی پہلی تاریخ اور قرآنِ حکیم کی پہلی تفسیر امام طبری نے لکھی ___ 307

، شانِ نزول کا عقیدہ اور اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں _ 308

، گزشتہ ہزار برسوں میں لکھی جانے والی تمام تفاسیر' امام طبریؒ کے تتبع ہی پر لکھی جارہی ہیں ___ 308

، تاریخ کے ایک موڑ پر قرآنی غور و فکر کے حامل انسانوں کی سوچ کو پامال کرنے کا حشر ___ 308

، نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا 310

، علمی اور فکری طور پر ہزار سالہ تاریکی کی وجہ ___ 310

، بخاری شریف میں دی گئی ایک آیت کی تفسیر حضرت موسیٰ کے غسل کا واقعہ ___ 311

، شانِ نزول کے پیشِ نظر ایک آیت کی تفسیر ___ 312

، کسی حدیث کے صحیح ہونے کا معیار صرف قرآنِ حکیم کی راہنمائی ہے ______ 314
، مستشرقین کی طرف سے پیش کردہ مخالف لٹریچر' ہماری طرف سے پیش کردہ خلافِ قرآن روایات کی بنیاد پر مبنی ہے۔
نیز شانِ نزول کی ایک اور مثال ______ 315
، ''عورتوں کا مردوں اور مردوں کا عورتوں کو مارنا'' کیا یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہوسکتی ہے؟ اور کیا مرد عورتوں پر داروغہ ہیں یا ان کا کفیل؟ ______ 316
، بنو عباس کے دورِ ملوکیت میں عورتوں کی حالتِ زار' لونڈیوں کی نیلامی اور خلیفہ ہارون رشید کا ذکر ______ 317
، دورِ ملوکیت میں لکھی گئی یہ تفسیریں اور یہ تاریخ جو گزشتہ ہزار برس سے پیش کی جارہی ہیں: ''رسولِ خدا نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور'' ______ 317
، دینی سوچ سے پہلے پرویز صاحبؒ کے مذہبی دور کی کہانی اُن کی اپنی زبانی ______ 318
، (Lane) لین کے عربی لغت لکھنے کی جدوجہد بھری داستان 320
، لغت کی تیاری کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی بے سروسامانی کا عالم' اس لغت کی افادیت اور نوعیت ______ 320
، مرد ہو یا عورت' قرآنِ حکیم کے نزدیک ہر بنی آدم واجب التکریم ہے ______ 321
، عورت بھی اپنی محنت کے ماحصل کی خود مالک بن سکتی ہے _ 322
، گھریلو زندگی میں تقسیمِ کار کے فرائض ______ 322
، بیوی کی طرف سے خاوند کی اطاعت گزاری کا ذکر قرآن حمید میں نہیں ہے ______ 323
، قٰنِتٰتٌ کا لغوی اور قرآنی مفہوم ______ 323
، عورت کی اولین ذمہ داری افزائشِ نسل اور اس کی تربیت ہے 324
، یکسوئی کے ساتھ فرائضِ فطرت کو سرانجام دینا ______ 325
، قرآنی تعلیم انسانوں میں یک نگہی پیدا کرتی ہے لہٰذا ازدواجی زندگی کا ماحصل باہمی رفاقت مؤدت' سکینت اور رحمت ہے _ 325


## بارھواں باب: سورۃ النساء
## (آیات 35 تا 42)


، معاشرے میں ہیرو وہ ہے جو گھریلو زندگی کے علاوہ اپنے ماتحتوں کی نظروں میں بھی ہیرو ہو ______ 328
، زندگی میں سب سے بڑا عذاب' گھریلو زندگی میں قدروں کے مشترک نہ ہونے یا تصورات کے متضاد ہونے کا ہے ____ 328
، اختلافات کی شکل میں جذباتی طور پر کوئی فریق اپنا فیصلہ درست نہیں کرسکتا ______ 329
، اختلافات کی شکل میں پھر 'حَکَمْ' کا کردار ایک لازمی جز ہے ______ 329
، موجودہ قوانینِ شریعت میں نکاح کے بعد ون وے ٹریفک ہوتی ہے ______ 330
، طلاق کے معاملے میں عورت کی بیچارگی اور مرد کی بیباکی اور پھر عورت کے لیے اذیت ناک شرائط کے فتوے ______ 330
، مروجہ عائلی قانون کی مخالفت کی تفصیل ______ 331
، پارلیمان میں عورتوں کا آنا اشد ضروری ہے تاکہ وہ اپنا تحفظ خود کرسکیں ______ 332
، میاں بیوی کے تعلقات کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے بعد والدین' عزیز و اقارب اور ہمسائے سے تعلقات کا ذکر ______ 333

، وہ تمام مروجہ عقائد اور نظریات جنہیں ہم نے صدیوں سے
اسلام کا درجہ دے رکھا ہے ______ 333
، اپنے جذبات کو خدا بنالینا ہی سب سے بڑا شرک ہے ___ 333
، خدا تعالیٰ نے دین میں فرقہ بندی اور تفرقہ بازی کو جرمِ عظیم
قرار دیا ہے ______ 334
، آج پاکستان کے آئین میں فرقہ بندی کو قانونی حیثیت
حاصل ہے ______ 334
، توحید کو عملی شکل دینے کا طریق اور ہمارے طرزِ عمل کی
شکل وصورت ______ 335
، پرستش خدا کی اور احکام اپنے' بعدازاں دعائے خیر:
یہ اسلام اور توحید نہیں ہے ______ 335
، فکرِ قرآنی کی روشنی میں احسان کے تصور کے متعلق
ہمارا غلط طرزِ عمل ______ 336
، احسان کا بدلہ سوائے کسی کمی کو پورا کرنے کے اور
کوئی ہے ہی نہیں ______ 336
، ماں باپ کی اطاعت کے غلط تصور کی نوعیت اور اس کی حقیقت 337
، ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا مفہوم نیز بچے کے بچپن
اور بوڑھے کے بچپن میں فرق ______ 337
، خون کے رشتوں کے علاوہ وہ تمام افرادِ معاشرہ جو خود کو تنہا
محسوس کریں' ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ ______ 338
، اسلامی مملکت میں یتیم کا کیا کام! اس سلسلہ میں یسلم'
مسٰکین اور الجار کا لغوی مفہوم قابلِ غور ہے ______ 338
، رزق کی فراہمی کے سلسلہ میں ہمسائیوں کی باہمی ذمہ داری 339
، قرآنی سوسائٹی کے قیام کے سلسلہ میں قدم بہ قدم باہمی
نظم ونسق کی کیفیت ______ 339
، وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا مفہوم اوران کے ساتھ باہمی لین
دین کی نوعیت ______ 340
، معاشی نظام کی اہم شق Wages (اجرت) کا تعین کرنا
ہے جو آج تک حل نہیں ہوا ______ 340
، نبی اکرم ﷺ کی زبانی' وحی کی روشنی میں' Wages (اجرتوں)
کے مسئلے کا حل ''صلاحیت کے مطابق کام اور ضرورت کے
مطابق دام'' میں ہے' اور تاریخ سے اس کی مثالیں ______ 340
، دولت کو سمیٹ کر بیٹھ جانے والوں کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد
اور لفظ فخر اور بخل کا مفہوم ______ 342
، بخل کی بنیاد پر اپنے مفاد کے پیشِ نظر خود پسند نظام کی تشکیل
اور اس کا نتیجہ ______ 342
، بخل کو چھپانے کے لیے زکوٰۃ کا سہارا حاصل کرنا ______ 343
، ''کافر'' کا مفہوم ہے ''چھپانے والا' ڈھانپنے والا'' اور
اس کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے ______ 344
، نمود ونمائش کے لیے خرچ کرنے والے گروہ کا ماحصل ___ 344
، روس میں مروجہ معاشی نظام میں خامی کی نشاندہی ______ 345
، سرمایہ داری کے نظام کا جذبۂ محرکہ حیوانیت ہے' اس میں زیادہ سے
زیادہ محنت کرنا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دینا نہیں ہوتا ___ 346
، اگر مکافاتِ عمل پر ایمان نہ ہو تو لاکھوں کا چندہ بھی کوئی نتائج
مرتب نہیں کرتا ______ 346
، قرآنِ حکیم کا سارا نظام جذبۂ محرکہ کی بنیاد پر استوار ہو کر
نتائج پیدا کرتا ہے ______ 347
، انسان اپنی ذات کی Satisfaction (تسکین) کے

گرد چکر لگانے میں ہی مصروف رہتا ہے ____ 347
، انسانی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ”جبر ہے دل پہ
اختیار کے ساتھ“ ____ 348
، حسنات کو بڑھا دینے کا مفہوم اور اس کی نوعیت ____ 349
، حضرت عمر فاروقؓ کی زبانی خلافت وملوکیت میں فرق
کی وضاحت ____ 350
، اس زندگی کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان کیا نتائج پیدا کرتا ہے 351

## تیرھواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 43 تا 48)

، مذہب انفرادیت کا خوگر، جب کہ دین نوعِ انسانی کے اجتماعی
نظام کا علمبردار، نیز دین ومذہب میں صلوٰۃ کے اجتماعات ___ 353
، عہدِ رسالت ﷺ میں مسجدِ نبوی کا استعمال عدالت کے فرائض
کی انجام دہی اور بطور کمیونٹی سنٹر کے بھی تھا ____ 355
، صلوٰۃ کے اجتماع میں انسانی جسم کی صفائی کی تاکید کا معاملہ 355
، صلوٰۃ کے اجتماع میں شامل ہونے کی دو تین شرائط اور اُن کی
حکمت کی وضاحت ____ 356
، قرآنِ حکیم کو صرف ناظرہ کی حد تک محدود کر دینے کی
گہری سازش اور قرآن کریم کا فرمان ____ 357
، حالت جنابت، مرض، حالتِ سفر، جائے ضروریہ، عورت
سے ہم آغوشی وغیرہ کے بعد صفائی کا مسئلہ ____ 358
، وحی کی بنا پر حضرت نوحؑ سے حضور نبی اکرم ﷺ تک ملنے
والی راہنمائی کی نوعیت اور مخالفین کی کوششیں ____ 360
، بخل کے عمل کی بدنامی سے بچنے کے لیے اختیار کردہ
ترکیب کا سہارا ____ 361
، محمد علی جوہر کے کردار کی ایک جھلک اور دشمنوں کی پست ذہنیت
اور تنگ نظری کچھ ایسی کہ بات صاف اور واضح ہی نہ ہو ___ 361
، دورِ حاضر کی سیاست کی مفلوج کیفیت مبہم اصطلاحات کے
استعمال کی بنا پر ہے ____ 362
، دل کی گھٹن، افسردگی و پژمردگی، انسان کی غلط بیانی کا ہی
فطرتی نتیجہ ہوتی ہے ____ 363
، مذہب کی چند ایک رسومات دین کے راستے میں سب
سے بڑی رکاوٹ ہیں ____ 363
، ”اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ“ کے سلسلہ میں ایک غلط
فہمی کا ازالہ ____ 364
، وحیٔ خالص کی روشنی میں قائم کردہ نظام کا نتیجہ ____ 365
، اصحاب سبت کی تباہی کی وجہ قانون شکنی تھی ____ 365
، توحید کے مفہوم کی محسوس مثال ____ 366
، معاشرتی اور تمدنی طور پر غلامی کی محسوس عملی شکل ____ 367
، تمدنی سطح پر فرعونیت کے دور میں شرفِ انسانیت بک جاتا ہے 367
، دین کا نظام ملائکہ کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے ___ 367
، حق حکومت سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو حاصل نہیں ___ 368
، دین کا نظامِ حیات سراپا شرفِ انسانیت ہے جبکہ شرک
تذلیلِ انسانیت ____ 368
، مذہب تو اپنے اندر شرک کی کئی شکلیں لیے ہوئے ہے ___ 369
، حدیث نبوی ﷺ میں شرک کی جامع تعریف ____ 370
، دین میں کسی انسان کو سندِ تسلیم کر لینا ہی تو شرک ہے ___ 370
، مسلمانوں میں مختلف فرقہ وارانہ شاخوں کی تفصیل ____ 371
، اپنے اپنے جذبات وخواہشات کی پیروی نے اللہ کے قرآنی

مفہوم کو ہی نظر انداز کر دیا ہے ______ 372
، خالصتاً جذباتی زندگی کے قید خانے میں گرفتار انسانی
نفسیات کی حالتِ زار ______ 372
، یورپ میں پرچار کے سلسلہ میں ایک مولوی صاحب کی
ناکامی کی بنیادی وجہ ______ 373
، قرآنِ حکیم کی رُو سے محکومیت فقط قوانینِ خداوندی کی
اختیار کرنا ہے ______ 374
، توحید کی بنیاد پر خدا کو ماننے والی شخصیت حضرت یوسفؑ
کی ذات کا ذکر ______ 374
، قرآنِ حکیم نے ان میں سے کسی کو کوئی سند نازل نہیں کی ___ 375
، کیا آدم یا انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے؟ ______ 375
، میں قرآنی آیات کا مفہوم قرآن حکیم ہی کی سند کے بغیر
پیش نہیں کرتا: پرویزؒ ______ 376
، شرک کا عمل تو انسان کو آسمان سے زمین پر اس طرح گرا دیتا ہے جس
طرح کوئی چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے زمین پر آ گرے _ 376
، شرک کے بعد اسبابِ زوالِ امت پہ انکوائری کمیشن کیوں؟
خدا کے قانونِ حیات کے ماوراء نظام قائم کرنے سے انسان
روٹی کے لیے بھی بھیک مانگتا ہے۔ ______ 377
، کوئی حکومت بھی اپنے استبداد کو مذہبی پیشوائیت کے
بغیر قائم رکھ ہی نہیں سکتی ______ 377
، اثم کا لغوی مفہوم ''اپنی صلاحیتوں کا مضمحل ہو جانا یا کمزور
ہو جانا ہے'' ______ 378

## چودھواں باب: سورۃ النسآء

## (آیات 49 تا 58)

، قرآنِ حکیم میں روحانیت کی اصطلاح کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی
باطنی علم کی کوئی حقیقت ہے ______ 379
، عالمِ انسانیت کی ایک بہت بڑی بدقسمتی کی نشاندہی جس کی
قرآنِ حکیم نے کہیں تائید نہیں کی ______ 380
، قرآنِ حکیم نے نبی اکرم ﷺ کے لیے بھی خلقِ عظیم کا لفظ
استعمال کیا ہے' روحانیت کا نہیں ______ 381
، تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم اہلِ تصوف کے بیان کردہ
تصور کے بالکل برعکس ہے ______ 381
، اہلِ طریقت کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ______ 382
، انسانی ذات کی نشو و نما کا اصول اور لفظ زکوٰۃ کا قرآنی او
رمروّجہ مفہوم و مقصود ______ 382
، قرآنِ حکیم انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے:
انسانی سطحِ زندگی اور حیوانی سطحِ زندگی ______ 383
، دوسری کیٹگری بخل کے خدوخال ______ 384
، روحانیت کے تصور کے تحت کرامتوں کا تصور اور اس کے
برعکس نبی اکرم ﷺ کی زندگی ______ 384
، کیریکٹر یا بلندئ کردار کی پہلی عملی شکل اور اس کا ثبوت ___ 385
، مولانا رومؒ کا قول ہے کہ قرآن کریم کا مغز ہم نے لے
لیا اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں ______ 385
، جو قوم بھی اس قسم کے تصورات کی گرویدہ ہو گی وہ دنیا کی ان تمام
نعمتوں سے محروم ہو جائے گی جو قدرت نے انسان کے لیے
پیدا کی ہیں ______ 386

، دین ایک جیتی جاگتی زندگی کا نام ہے جبکہ مذہب صرف چند حرکات وسکنات کا ہی مجموعہ ہوتا ہے ____ 387
، ہمارے ہاں ''ثواب کے معنی ثواب'' کے علاوہ کوئی عملی محسوس شکل پیش نہیں کرتے حج اور اسرائیل کی مثال ____ 388
، دین اور مذہب میں فرق محسوس نتائج ہی کا ہوتا ہے ____ 389
، قرآنی احکام کو عملی شکل دینے کے برعکس انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی طاغوت کی حکمرانی کہلاتی ہے ____ 389
، پہلا کلمہ لاالٰہ الا اللہ کا یہی عملی مفہوم اور یہی اس کی عملی تفسیر ہے 390
، قرآنِ حکیم کے وسیع تر مفہوم کی بجائے ہمارے ہاں لعنت کے لفظ کا محدود تصور ____ 390
، دنیا بھر میں مسلمان سلطنتوں کی محرومی کی حالت اور باہمی نفرتوں کا نتیجہ ____ 391
، دنیا میں زیادہ خسارے میں وہ قوم ہوتی ہے جن کے اعمال رائیگاں چلے جائیں مدینے میں یہودیوں کی مثال ____ 392
، قرآنِ حکیم میں استعمال ہونے والی چند ایک اصطلاحات کا غور طلب مفہوم اور ان کو سمجھنے کا طریق ____ 393
، باطل کی بار بار کی شکست انہیں تباہ و برباد کردے گی اور حق غالب آجائے گا ____ 394
، کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے فارمولے کی صداقت پر یقینِ محکم ہونا ضروری ہے ____ 395
، حق کی بنیاد پر یقینِ محکم قوموں کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیتا ہے 395
، کشمیر کی وادی میں حضرت بل کی مسجد کے اندر ایک واعظ کا خوبصورت وعظ ____ 396
، ایک اسلامی مملکت کے آئین کی بنیاد اور اس کی اساس نیز لفظ امانت کا غور طلب مفہوم ____ 396
، جس طرح فیصلہ سازی کے لیے عدل ایک لازمی جز ہے اسی طرح بذاتِ خود قانون کا عدل پر مبنی ہونا بھی ضروری ہے: کیا وہ قانون بھی مبنی بر عدل ہے؟ ____ 398
، قانون سازی کے سلسلہ میں قانون سازوں کی اہلیت کا تعین نہایت ضروری ہے ____ 399
، قرآنی آیات کے آخر پر صفاتِ خداوندی کی اہمیت ____ 399
، ذاتِ خداوندی کو بصیر جانے بغیر انسان کا کوئی عمل ثمر بار نہیں ہوسکتا ____ 400
، انسانی معاشرے کی ساری بنیاد مکافاتِ عمل پر ہی استوار ہوتی ہے ____ 400
، خدا کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت اور پھر یہ اُولی الاَمر کون ہوتے ہیں؟ یہ بڑا اہم موضوع ہے ____ 402


## پندرھواں باب: سورۃ النسآء
## (آیت 59: اللہ اور رسول کی اطاعت)


، اسلامی نظام کا سارا دارومدار خدا کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت اور صاحبِ امر کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے پر موقوف ہے ____ 403
، نبی اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام کی بنیاد ہی یہ تھی کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں ____ 404
، حکم اور قانون میں فرق ____ 405
، قانون کی عمل داری کا طریق کار ____ 405
، دین میں اکراہ نہیں ____ 406
، قانون کے نفاذ کے لیے ایک اتھارٹی کی ضرورت لازم ہے ورنہ قرآن کریم کا نظام یا دین مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے ____ 406

، اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کے تحت انتظامات کی نگرانی کرنے والوں (اولی الامر) کا منصب اُن کے اختیارات اور فرائض کا ذکر ______ 407

، ''اقتدار کا سرچشمہ عوام ہے'' یہ مغرب کی نقالی ہے' قرآنی نظامِ حیات اس کی اجازت نہیں دیتا ______ 408

، مذہب انسان کو فریب میں مبتلا کرتا ہے جب کہ دین اسے حقائق پیش کرتا ہے کہ ''اللہ کی کتاب زندہ اتھارٹی ہے'' ______ 408

، مملکت کو قائم کرنے کا طریق اور اسکی شرطِ اول ______ 409

، قرآنی نظام کے تابع قائم کردہ مشینری کے خدوخال اور ان کے کیے گئے فیصلوں کی نوعیت ______ 410

، مملکت کے فیصلوں کے سلسلہ میں اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم یا اس کی نوعیت ______ 411

، نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد نظام کے قیام کے سلسلہ میں اٹھنے والا سوال ______ 412

، مذہب کی شکل میں کسی مذہبی شخصیت کی زندگی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال ______ 412

، حضور ﷺ کے بعد دین کے مرکزی نظام کو قائم رکھنے کے مسئلہ کا حل اور حضرت ابوبکرؓ کا اہم خطاب ______ 412

، خلافت کے بعد دورِ ملوکیت یا سیکولر گورنمنٹ کے دور کا آغاز اور اس کے نتائج ______ 416

، غیر قرآنی نظام کو سہارا دینے والی قوتیں ______ 416

، ہامان اور فرعون کی باہمی طور پر سودے بازی کی شکل ______ 416

، شخصی معاملات کے فیصلے مذہبی پیشوائیت کے سپرد اور ان کی طرف سے بادشاہت کے حق میں فتویٰ ______ 417

، قرآنِ حکیم کی طرف سے ملنے والے اختیارات میں اضافے کے مسئلے کا حل قرآن کریم کے ساتھ مثلہ معہ کا سلسلہ ______ 417

، صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں تو روایات کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا تھا بلکہ تلف کروا دیا گیا ______ 418

، امام مالکؒ کی وفات 179ھجری' امام بخاریؒ کی وفات 256ھجری میں ہوئی ______ 418

، اب صحاحِ ستہ کے علاوہ شیعہ حضرات کے الگ چار مجموعے ہیں 419

، لاکھوں روایات کو اکٹھا کرنے کا طریق اور پھر اُن کو صحیح قرار دینے کا معاملہ ______ 419

، وحی کی دوقسموں ''وحی متلو اور وحی غیر متلو'' کی وضاحت ______ 420

، قرآنِ حکیم کی تفسیر وتشریح روایات کی روشنی میں اور پھر قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا ماجرا ______ 420

، مسلمانوں میں مختلف فرقوں کا وجود اور ان کی نوعیت ______ 421

، احکام القرآن حنفی فقہ کے مطابق اور احکام القرآن شافعی فقہ کے مطابق ______ 421

، قرآنِ حکیم کا حنفی ترجمہ اور قرآنِ حکیم کا شافعی ترجمہ ______ 422

، فرقہ بندی پر اہلِ مغرب کا اعتراض ______ 422

، خلفائے راشدینؓ کے بعد قائم ہونے والی تمام حکومتیں' مسلمانوں کی حکومتیں ہیں' اسلام کہیں موجود نہیں ______ 422

، فقہ کے نفاذ سے اسلامی مملکت تو قائم نہیں ہوتی ______ 423

، تحریکِ پاکستان کا بنیادی تصور خالصتاً ایک قرآنی حکومت کا قیام تھا ______ 423

، پرویزؒ کی اس قدر مخالفت کی وجہ اور اس کا طریق ______ 424

، فرقوں کی موجودگی میں کسی فرقے کی حکومت تو قائم ہوسکتی ہے

لیکن اسلامی حکومت کا تصور سامنے نہیں آ سکتا: پرویزؒ _____ 425
، آخر کار سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اعتراف پر ایک اہم سوال
اور ان کا جواب _____ 425
، اسلامی مملکت کے سلسلہ میں کثرتِ تعبیر کا نتیجہ اور اس کا علاج 426

## سولھواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 60 تا 65)

، زیرِ نظر سورۃ النسآء کی آیت 60 کی اہمیت _____ 429
، اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم اور اس کی عملی شکل _____ 430
، بزعمِ خویش مسلمان سمجھنے والوں کی نفسیاتی کیفیت اور
طاغوتی زندگی _____ 431
، قرآنی اصطلاحات کے خود ساختہ مفہوم کا نتیجہ اور
قرآن حکیم کی اپنی وضاحت _____ 431
، لفظ طاغوت کا لغوی اور قرآنی مفہوم _____ 432
، لفظ کلمہ یعنی لا الہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم اور پرویزؒ کے ہاں
طریقت کے دلچسپ ''وادیاں'' جو وہ چھوڑ چکے _____ 433
، طاغوت کا وہ غیر قرآنی مفہوم جو ہمارے اپنے ذہنوں
میں جاگزیں ہے _____ 433
، چودہ سو سال سے ہماری علمی اور تاریخی پس ماندگی کی حالت زار 434
، مسئلہ تقدیر کی اہمیت _____ 435
، تمام کے تمام مصائب و آلام انسان کے اپنے اعمال
ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں _____ 435
، انسانوں کے ان مصائب و آلام میں صبر و شکر کے غلط
مفہوم کا پرچار _____ 436
، اعراض برتنے والوں کے امراض تک کے لیے حکیمانہ
انداز میں باہمی روابط کا سبق _____ 437
، جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے _____ 437
، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا اسوۂ حسنہ _____ 438
، اسلامی نظام کو متشکل کرنے کے سلسلہ میں راہِ منزل کی
مشکلات اور ''آسانیاں'' _____ 439
، اجتماعی طور پر انسانی معاشرے میں نظامِ خداوندی کے
بنیادی خدوخال _____ 440
، لفظ اطاعت کا لغوی مفہوم اور اس کی اہمیت _____ 440
، قرآنی نظامِ حکومت کی تشکیل کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما
کے سوا اور کچھ نہیں ہے _____ 440
، دین کے نظام کے بالمقابل مذہبی تصورات کے خدوخال _ 441
، قرآنی نظام میں لغزش کے ضمن میں ایک اتھارٹی فیصلہ
صادر کرتی ہے _____ 442
، قرآنی نظام میں مرکزِ ملت کو بھی قرآن حمید کی طرف رجوع
کرنا ہوتا ہے کہ کیا جو قوانین رائج ہیں، لوگ ان پر چلتے بھی ہیں؟
ایک اہم سوال۔ _____ 442
، خدا کی کتاب کے مطابق قوانین کے نفاذ کے باوجود ایک
اہم شق کی تکمیل جو نہایت ضروری ہے _____ 443
، سب کچھ ہونے کے باوجود قرآنی نظام کی ایک بنیادی
شرط کی اہمیت _____ 443
، اور فیصلہ مان لینے کے بعد دل میں کسی قسم کی گرانی تک بھی
محسوس نہ کرنا: یہ دوسری بنیادی شرط ہے _____ 444
، آج اس قدر شدت کے ساتھ وعظ و نصیحت کے باوجود اتنی
اخلاقی کمزوری کیوں؟ _____ 444

، قرآنی تعلیم انسان کی نفسیات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے' یہ قلب ونگاہ کی تبدیلی کا پروگرام ہے ____ 445
، جب میں تصوف کی وادیوں سے نکلا اور علم نفسیات کا مطالعہ کیا: پرویزؒ ____ 446
، رسول کی ہستی انسانی ذات میں پیدا ہونے والے Complexes (الجھنوں) کا علاج Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) کے ذریعے کرتی ہے ____ 448
، نبی اکرم ﷺ کے بعد ماں کی طرف سے ملنے والی Affection (مؤدت وشفقت' رحمت وسکینت) کی لطافت' لوچ اور اس کی نوعیت کے بیان میں ایک عظیم سبق ہے ____ 449
، خالقِ کائنات کی شہادت نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی' لہو کو گرما دینے اور دلوں کو تڑپا دینے والی درخشندہ قرآنی حقیقت 449
، ذاتِ خداوندی اور نبی اکرم ﷺ کی ہستی رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ____ 450
، تغیرِ نفس کے ضمن میں رافت اور رحمت کے الفاظ کا وہ مفہوم جن تک آج کا سائیکولوجسٹ پہنچا ہے ____ 450
، کوئی انسان دوسروں کے لیے جتنا حریص ہوگا' وہ اتنا ہی زیادہ مطمئن اور باوقار بھی ہوگا اور یہ چیز دل کے اندر سے اُٹھتی ہے 451
، مَردوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تربیت کے لیے ازواج مطہرات کا عمل دخل اور اُن کا مقام بلند ____ 452
، اسلام ایک زوجہ کے سوا ہر بیٹی اور ہر عورت کا مقام بطور ماں تصور کرتا ہے ____ 453
، دلی کے محلات اور لکھنؤ کی گلیوں میں الفاظ کی حرمت کو پامال کر دیا گیا: الفاظ کے تصورات بدل دیجیے' قوم کا تصور بدل جائے گا 453
، رافت اور رحمت کے تصور پر زندگی بسر کرنے والا تو شکریئے کا بھی متمنی نہیں ہوتا ____ 454
، تعمیری سوچ کے تحت عمل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی تاکید 455
، صراطِ مستقیم کی نشاندہی کے لیے کتاب اللہ کے ساتھ متمسک رہنا مشروط ہے اور اسے ہی آپ اسلامی نظام کہیں گے ____ 455


## سترھواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 66 تا 76)


، سلسلہ تجدیدِ یادداشت اور ایمان کی بنیادی خصوصیت اور فیصلوں پر گرانی محسوس ہونے کا مسئلہ ____ 457
، آج ہمارے ہاں دین کی بنیاد پر کوئی مرکزی اتھارٹی موجود ہی نہیں ہے تو نظام کیسے قائم ہو؟ ____ 458
، آئینی طور پر اسلامی مملکت کی دو بنیادی خصوصیات ____ 459
، ضمیر کی کہانی' حقائق کی زبانی ____ 459
، ضمیر کی یا دل کی چند ایک مثالیں اور اُن کا معیار ____ 460
، ضمیر کی آواز تو قلب ونگاہ میں سمویا ہوا سماج ہے' حق وباطل کا امتیاز نہیں ____ 461
، مذہب' دین اور فیصلوں میں ضمیر کی آواز کے مفروضے اور مضمرات ____ 461
، مذہب انفرادی فیصلوں کا مجموعہ ہوتا ہے' دین اجتماعی زندگی کا نام ہے اس لیے ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت ہے ____ 462
، قرآنی حکومت کے برعکس سیکولر گورنمنٹ کا خود ساختہ قانون کسی خارجی معیار کو تسلیم ہی نہیں کرتا: یہ دھوکا ہے ____ 463
، قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا آخری ثبوت میدانِ جنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے ____ 464

﴿ جہاد کا فلسفہ دوسروں کی جان لینا نہیں بلکہ جان دینا ہے ___ 464
﴿ لفظ خیر کا لغوی مفہوم ''اختیارات میں وسعتوں کا پیدا ہونا'' ہے ___ 465
﴿ جہاد کے عمل سے انسانی ذات ایک ایسی پختہ شکل اختیار کر جاتی ہے جس طرح دودھ کے بلونے سے مکھن ___ 466
﴿ عظیم' عظمت اور علیؒ کا قرآنی مفہوم ___ 466
﴿ خدا کی ذات عظیم بھی ہے' اس میں ثبات بھی ہے اور وہ علیؒ بھی ہے ___ 467
﴿ صراطِ مستقیم کی روح کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ: مسائل ہی مسائل ___ 468
﴿ آمین کے مسئلہ پر باہمی سر پھٹول' منزل سے دوری کی کیفیت اور سفرِ زندگی کا کارواں ___ 469
﴿ قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ صراطِ مستقیم ہر راہ گم کردہ مسافر کو قافلے کے ساتھ چلنے کے قابل بنا دیتا ہے ___ 469
﴿ اہلِ قافلہ کی باکمال ثمر بار خصوصیات اور پھر اس کے حسین نتائج کہ وہ کاروانِ حیات میں جا ملے ___ 470
﴿ عربوں کے ہاں اسلام کے معنی قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے تھے ___ 470
﴿ زندگی کا مقصود و مفہوم صرف صراطِ مستقیم اور پھر اس کو بروئے کار لانے والی شخصیات کی معیّت ___ 471
﴿ زیرِ نظر قرآنی آیت کے غلط مفہوم کی پیدا کردہ تباہ کاریوں کی کیفیت ___ 472
﴿ معیت کے غلط مفہوم سے پیدا ہونے والے تاثر کا نتیجہ ___ 473
﴿ خدا کا انسان کے ساتھ باہمی تعلق رفاقت کا ہوتا ہے ___ 474
﴿ الفضل اور علیم کی مختصر سی تفصیل ___ 475
﴿ جنت بھی کاروانِ انسانیت کی آخری منزل نہیں ہے ___ 475
﴿ مومن اپنے نصب العین کے تحفظ کی خاطر ہر آن چوکس رہتا ہے ___ 475
﴿ جہاد کے موقعہ پر شمعِ قرآنی کی مخالفت کرنے والوں کا کردار 476
﴿ جہاد کے موقعہ پر مفاد پرستوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد 477
﴿ لفظ خدع کا لغوی مفہوم اور عربوں کی معاشرتی و تمدنی زندگی کی ترجیحات ___ 478
﴿ جنگ کے مقصد سے کفر اور اسلام کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور اسلام میں جنگ کی اجازت کب اور کیوں؟ ___ 479
﴿ ہجرت کے بعد مدینے میں رہ جانے والوں کی حالت زار اور مسائلِ تقدیر و دعا ___ 480
﴿ حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک خلافت کا فریضہ اور جنگ کا مقصد ___ 481


## اٹھارواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 77 تا 81)


﴿ دوسروں کے خلاف جنگ کی ضرورت کیوں' کب اور کیسے؟ 483
﴿ مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت ___ 484
﴿ مکے میں نبی اکرم ﷺ کی تیرہ سال زندگی کا ماحصل اور اسلام سے قبل عرب کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے خدوخال ___ 485
﴿ فرعون کے دورِ غلامی میں بنی اسرائیل کو اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنانے کی ہدایت ___ 486
﴿ مذہبی تصورات کو دین کے رنگ میں رنگنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے: صلوٰۃ کی ایک مثال ___ 487

، مذہب کے اکنامک سسٹم اور دین کے اکنامک سسٹم میں بنیادی فرق ہے ______ 487

، 1857ء کی جنگِ آزادی پر ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے شائع ہونے والا منشور ______ 488

، ملازمت کے دوران پرویزؒ کا ایک ذاتی واقعہ ______ 488

، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ایک تربیتی پروگرام ہے۔ اس کے اپنے لوازمات ہیں ______ 490

، زندگی کی ہر دو منزلوں کی اہمیت اور ان کی سود مندی کا فیصلہ انسان کو خود ہی کرنا ہوتا ہے ______ 490

، مسئلہ تقدیر کا سارا الجھاؤ عجمی تصورات ہی کا پیدا کردہ ہے ______ 491

، مسلمان ہونے سے پہلے اہلِ ایران کی تمدنی اور معاشرتی زندگی، نیز شبِ برات کی حقیقت ______ 491

، تقدیر کے عقیدے میں پایا جانے والا تضاد ______ 493

، تقدیر اور جبر سے متعلق یہ قرآنی حقائق و اقدار کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے ______ 494

، انسان کی انسانیت کا آغاز انسانی اختیار و ارادہ کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر ہوتا ہے ______ 494

، قصۂ ابلیس و آدم کی ساری لم انکار اور اقرار کے مفہوم میں مضمر ہے پھر خوشگواریوں اور مصیبتوں کے لانے میں تضاد کیوں؟ ______ 495

، ''کائنات میں ہر واقعہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے'' کے قرآنی مفہوم کی وضاحت ______ 496

، خدا کا قانون تو ہر لحہ انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں مصروف کار رہتا ہے ______ 496

، ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے ______ 497

، قدرت نے کائنات کی ہر شے کے لیے تقدیر مقرر کر رکھی ہے 497

، ''خدا کی مرضی یا خدا کے چاہنے'' کا مفہوم خدا کا قانون ہوتا ہے ______ 498

، دوسروں کی روٹی کا انتظام کرنے کے سلسلہ میں کافروں کا جواب ______ 500

، تقدیر کے موجودہ تصور کے تحت ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی ذات پر الزام تراشی کی نوعیت ______ 500

، اللہ کی مرضی کا یہ غلط تصور قوم کو جاہل بنانے کا ایک مؤثر حربہ ہے 501

، نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد ______ 502

، نبی اکرم ﷺ کا فریضہ قرآن حکیم کی بنیاد پر قرآنی نظام کی تشکیل کرنا تھا مگر یہ ہیں کہ یہ سازشیں کرتے ہیں ______ 502

، سیکولر نظامِ حیات کے برعکس قرآنِ حکیم کے فلسفہ کے مطابق مکافاتِ عمل کا تصور ______ 503

، توبہ کے سلسلہ میں بھی انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے جبکہ انسان کا نفس ہی اس کا کاتب ہوتا ہے ______ 504


## انیسواں باب: سورۃ النسآء (آیت 82)


، قرآنِ حکیم کے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت کا انداز کیا ہوگا؟ 506

، اگر قرآنِ حکیم کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں یقیناً تضاد ہوتا ______ 506

، غور و فکر کے عربی لفظ کے علاوہ تدبر زیادہ پُر معنی ہے ______ 507

، تدبر سے کام نہ لینے پر انسان اپنے دلوں پہ خود تالے لگا لیتا ہے 508

، قرآنِ حکیم پر تدبر قرآنِ حکیم کے اصولوں کے مطابق کرنا ہوتا ہے ورنہ فرقے جنم لیتے ہیں ______ 509

قرآنِ حکیم پر عملاً تدبر کرنے کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نکلے گا
یہی تو فطرت کا قانونِ یکسانیّت ہے 509
قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کے نتائج میں شرک نام کی کوئی
شے نہیں ہے 511
امتِ واحدہ کا تصور مشرکین کے لیے زہرِ قاتل ہے 511
پوری انسانیت کو ایک مرکز پر صرف ایک ضابطۂ حیات ہی
جمع کر سکتا ہے 512
نبی اکرم ﷺ کے پروگرام میں اختلافات پیدا کرنے کا عملی نتیجہ 513
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ امتِ واحدہ کے نظام میں تفریق
پیدا کرنے والوں کا انجام 514
قرآنی تعلیم کی خصوصیت حقائق کو نکھار کر پیش کرنا ہے کہ اس
میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے 514
قرآن حکیم کی طرف سے ہم نے ہزار سال سے کبوتر کی
طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں' کتاب اللہ کی طرف نہیں آتے 515
خدا کی ذات اپنا قانون دے کر خاموش نہیں بیٹھی رہتی' اس
سے فیصلہ لینے کا ایک عملی نظام ہے 515
قرآنی نظام کو متشکل کرنے کا طریق 516
کتاب وسنت کی اصطلاح کی نوعیت 518
نبی اکرم ﷺ کے دور میں مسجد ضرار کی تعمیر پر قرآنِ حکیم کا
ردِعمل اور ہماری کیفیت 519
جب کسی سرکل کا مرکزی نکتہ ہی مٹ جائے تو پھر سرکل مکمل
ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی امت میں ہوا 520
فرقوں کے اختلافات' خدا کے شریک مقرر کرنا اور اپنی اپنی
شریعت بنالینا ہے۔ اسے مٹانے کا طریق 520
بائیس سال بعد اعترافِ حقیقت 522
لا کے بعد اللہ کی منزل کا حصول اور اس کا طریقہ 522
اصل حقائق سے منہ موڑ کر فرقہ بندی کی بجائے مکاتبِ فکر
کی اصطلاح کا استعمال 523
فرقہ وجود پذیر کس طرح ہوتا ہے؟ 524
توحید تفریق فی العمل نہیں ہونے دیتی کیونکہ دین میں
ایک فیصلہ کن مرکزی اتھارٹی کا وجود لازم ہوتا ہے 525
یورپ کے ہاں مادی ترقی کا راز 526


## بیسواں باب: **سورة النسآء**
## (آیات 84 تا 90)


جہاد وغیرہ سے متعلق سابقہ درس کا خلاصہ اور ایک مرکزی
اتھارٹی کی اہمیت 527
فی سبیل اللہ کا مفہوم اور نظامِ حکومت میں ذمہ داری کے
تعین کا مسئلہ 529
مملکت کا نظم وضبط اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں
قرآنِ حکیم کی راہنمائی اور طریقِ کار 530
لفظ حَرِّضِ کا لغوی اور قرآنی مفہوم 530
فوج میں ماتحتوں کے لیے ذمہ داری پورا کرنے کا طریقِ کار 531
استبداد کی روک تھام کا طریق اور اس کا خوشگوار نتیجہ 531
خیر وشر کا معیار تو قرآنِ حکیم نے متعین کر رکھا ہے 532
لفظ شفاعت کا لغوی مفہوم 533
انسانیت کی نشوونما کے لیے کسی کو قوت فراہم کرنا اصل میں
اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا ہے 534
انسانی برادری میں باہمی تعاون کے ثمر کا نتیجہ لازوال

سرمایہ حیات ہے ______ 534
، قرآن حکیم کے نزدیک باہمی تعاون سے اگلی منزل
شفاعت کی ہے ______ 535
، لفظ مقیتاً کی بنیاد پر اٹھنے والی عمارت کا ہر ہر کونہ اور اُسکی
ہر ہر منزل دیدہ زیب صفات کی حامل ہوتی ہے ______ 536
، کسی کی طرف سے خیر سگالی کا جواب دینے کا طریق محض
ایک رسم بن کر رہ گیا ہے: ایک رسم ''السلام علیکم''
اور دوسری رسم ''وعلیکم السلام'' ______ 536
، باہمی رفاقت سے پیدا ہونے والے فرق کی نوعیت:
اس سے بہتر سامانِ حیات دو ______ 537
، جہاں ہر شخص دوسروں کے لیے جینا سیکھ لے' وہاں زندگی
موت کی بجائے جوئے رواں میں تبدیل ہو جاتی ہے ______ 538
، پوری دل جوئی سے باہمی رفاقت کو قائم رکھنے کا حساب
انسان کی بجائے خدا پر چھوڑ دو ______ 539
، قرآنی معاشرے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی انسان کسی کا
محتاج و محکوم نہ رہے مگر اس معاشرے کے قیام کے لیے ٹکراؤ ہوگا 540
، قرآنِ حکیم تو انسان کی اس زندگی کے لیے ضابطۂ حیات ہے 540
، نوعِ انسانی جہانِ نو کی تشکیل کے لیے نظامِ سرمایہ داری
کے زوال کی منتظر' نیز قانون اور حکم میں امتیاز ______ 541
، خدا کے وعدہ سے مراد خدا کے قانون کی حاکمیت کا ثمر بار
ہونا ہے ______ 542
، تین گروہوں کا ذکر اور کچھ غلط فہمیاں ______ 542
، مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی قوم کی نفسیاتی
کیفیت اور قرآنِ حکیم کا ارشاد ______ 543
، ''چاندی کی انگوٹھی پہ سونے کا جھول'' آخر کار ظاہر
ہو ہی جاتا ہے ______ 544
، تقدیر کے مسئلے کی وضاحت: اللہ' اعمالِ انسانی' گمراہی
اور قانون کی کڑیاں ______ 545
، منافق کی انتہائی کوشش دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے
کی ہوتی ہے ______ 547
، دو جمع دو چار کا کم ہونا اگر باطل ہے تو زیادہ ہونا بھی باطل ہے 548
، لفظ ہجرت کا بنیادی مفہوم ______ 549
، قرآنِ حکیم کے ہاں معاہدہ کی پاس داری کے سنہری
اصول کی اہمیت ______ 549
، دشمن پر اعتماد تو کرو لیکن احتیاط کو ہمیشہ پیش نظر رکھو ______ 550

## اکیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 91 تا 96)

، سابقہ درس کے سلسلہ میں تجدیدِ یادداشت ______ 551
، کسی فتنہ پرور کے ساتھ جنگ کرنے کی مشروط اجازت ______ 552
، فی سبیل اللہ جنگ کا مفہوم ______ 553
، جماعتِ مومنین کی بنیادی خصوصیات اور ان کا پروگرام
جو سرتاپا یک نگہی کا حامل ہو ______ 553
، لفظ لغو کا مفہوم اور قتلِ عمد میں کفارے کا مقصد ______ 554
، قرآنی تعلیم کے برعکس غلامی کے تصور کی آبیاری کے
لیے مذہبی پیشوائیت کا تصور ______ 555
، جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنی احکام اور ہماری متضاد
خیالی اور متضاد عملی ______ 556
، غلامی کے نتیجے میں یو این او کے چارٹر کو تسلیم کرنے سے

انکار اور پھر اقرار 558
کسی کے قتل ہوجانے یا چوری ہونے پر قرآنِ حکیم کا نظامِ عدل 558
ذاتی جرم کی تلافی کے سلسلہ میں ایک دوسری صورت: دو ماہ کے روزے رکھنے ہونگے مگر کیوں؟ 560
خدا کے ہاں توبہ کی قبولیت کی نوعیت اور جرائم کے محرکات کو ختم کرنے کا شافی علاج 560
قتل خطا کے بعد دانستہ قتل کا معاملہ اور اس کی وضاحت 561
قتل عمد کی نوعیت، اس کا تدارک اور پھر قتلِ عمد میں خوں بہا کی وضاحت میں پیدا کی جانے والی الجھن 563
قرآن کریم نے قتلِ عمد میں خوں بہا کی اجازت نہیں دی 563
ہماری تاریخ میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا تذکرہ: 10 ہزار اور 70 ہزار صحابہ کے باہمی قتل کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے 564
مسلمانوں کے دو گروہوں میں اگر الجھاؤ پیدا ہوجائے تو اس کا تدارک 565
ہماری مروّجہ تاریخ کی زبوں حالی کی کیفیت 565
قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابۂ کرامؓ کا کردار اور ان کے درجات کا معاملہ 566
شہادت کے سلسلہ میں علم کی اہمیت 567
میدانِ جنگ میں بھی صلح کے لیے ضروری ہدایات موجود ہیں 569
معاشرتی طور پر دوسرے فریق کے متعلق پہلے ری ایکشن کی وضاحت 569
مالِ غنیمت کے سلسلہ میں نفسیاتی تبدیلی کے لیے جنگ کو فی سبیل اللہ قرار دے دیا گیا 570
جذبہ محرکہ تو انسانی زندگی کے تصور کو بدل دیتا ہے 571
پہلے ردِ عمل کے ساتھ ساتھ تحقیق کے عمل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے 571
مومن کی خصوصیت کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کا قولِ زریں 572
قرآنِ حکیم نے مومن کی ایک خصوصیت خبیر بھی بیان کی ہے 572
جھونپڑی کی ایک بڑھیا نے حضرت عمر فاروقؓ پر کپکپی طاری کردی 572
حضرت عمر فاروقؓ نے خاندانی خلافت کو ختم کر کے رکھ دیا 573
انسانی صلاحیتوں کی بنیاد پر افراد کا تعین اور جہاد کا مفہوم 573
میدانِ جنگ میں قصداً پیچھے رہ جانے والوں کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد نیز سورۃ التوبہ کا ایک واقعہ 574
جدوجہد زندگی میں مختلف افراد کی تگ و تاز کے مطابق درجات کے تعین کا معاملہ 576
خدا کے ہاں درجات کا فرق تو ہوگا لیکن حسنات میں نہیں 576

## بائیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 97 تا 103)

جہادِ زندگی کا راز تکبیرِ مسلسل میں ہے 579
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ 580
تصوف کے نزدیک جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کی نوعیت اور اس کی فضیلت کا خود ساختہ تصور 580
دین میں جہاد کی نوعیت 581
قرآنی نظام کی تکمیل کے لیے ہجرت کا عمل اور اس کے مدارج 581
مذہب کی دنیا میں ہجرت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دین میں ہوتا ہے 582

دین میں حالات کے مطابق ہجرت کرنا لازم قرار دیا ہے _ 582
مسلمان کے نزدیک آزادی اور آزاد میں فرق کی نوعیت _ 584
قرآنی حکومت یا نظامِ خداوندی کے لیے خطۂ زمین کا
حصول ایک لازمی شرط ہے ____ 585
مذہب کے تمکن کے لیے آزاد مملکت ضروری نہیں ہوتی
مگر دینِ اسلام کے لیے ازبس ضروری ہے: پاکستان کی کہانی 586
مسلم اور غیر مسلم مملکتوں میں فرق ____ 587
حضرت شعیبؑ کے نظامِ حکومت میں صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم 588
ہجرت کا بنیادی مقصد باطل نظام کے برعکس حق کے نظام کو
قائم کرنا ہوتا ہے ____ 588
مومن کے لیۓ غیر قرآنی نظام میں سانس لینے کی کیفیت _ 589
غیر قرآنی معاشرے میں مجبور لوگوں کے لیے انتظام کی نوعیت 589
خدا کی طرف سے کمزور وناتواں رہ جانے والوں کی مدد کا طریق 590
ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے
کا ایک بنیادی اصول ____ 591
''تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا'' ورنہ گلشن میں؟ _ 591
قرآنی ہجرت اور دورِ حاضر کی استعماریت میں فرق ____ 592
نوعِ انسانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت بطور
اسوۂ حسنہ ہے ____ 592
مادی نظریۂ زندگی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ انسانی
ذات کے تقاضوں کے حصول کا طریق اور اہمیتِ ہجرت __ 593
قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ صلوٰۃ کا مفہوم اور صلوٰۃ کے لیے
اجتماعات کا مقصد ____ 595
تاریخ کی روشنی میں صلوٰۃ کے لیے اجتماعات کا بنیادی مقصد 595
امام کے بغیر اسی مسجد میں انفرادیت کی دوسری شکل وصورت
نے جنم لیا ____ 597
دین اور مذہب کے انمٹ نقوش کی نشاندہی اور مذہب کی
دیرینہ بیماری کا شافی علاج ____ 597
قصرِ صلوٰۃ کی قرآنی تفصیل ____ 598
خدا اپنے وعدے انسانوں کے ہاتھوں پورے کراتا ہے'
جنگ احد میں غفلت کا نتیجہ اور ذکرِ اللہ ____ 599
ہمارے ہاں کاروبار اور نماز کے باہمی رابطے کی نوعیت __ 600
ذکر اور ہمارا عمل ____ 600
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور ذکر اللہ کی ایک مثال ____ 601
کائنات کی کوئی شے بھی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے
پیدا نہیں کی ____ 602
وقت کی میزان کا دوسرا نام زندگی ہے ____ 602
وقت کا قرآنی تصوّر اور ہماری حالت ____ 602

## تیئسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 104 تا 115)

خود کو ظالم کے ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے شمشیرِ خارہ
شگاف کا ہونا نہایت ضروری ہے ____ 606
مردِ مومن اور کافر کے نصب العین میں فرق کی نوعیت ____ 607
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب وتابِ جاویدانہ ____ 608
جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں 609
لفظ خَصِيمًا کا مفہوم جھگڑنا نہیں بلکہ طرفداری کرنا ہے ____ 609
موجودہ نظامِ عدالت میں شعبۂ وکالت کے کردار کی کیفیت 610
اسلامی نظامِ عدل کی نوعیت جہاں حکومت کی طرف سے

قانون دان ہوتے تھے ________ 610

• خائن کا لفظ بڑا غور طلب لفظ ہے ________ 610

• عربوں کے ہاں خیانت کے مفہوم کو سمجھنے کی ایک عملی شکل _ 611

• خدا کی رسی ایک ایسی رسی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتی ________ 612

• خدا پر ایمان کے بغیر بنیادی صداقتوں پر ایمان رکھنے کا نتیجہ 613

• خدا پر ایمان کا مفہوم کیا ہے اور پھر یہ کیوں ضروری ہے؟ __ 613

• اپنی ذات سے' اپنے آپ سے' خیانت کرنا جرم ہے

مگر یہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں آتا ________ 614

• سب سے پہلے انسان اپنی ذات کے ساتھ خیانت کرتا ہے 615

• ہزاروں انتظامات کے باوجود دنیا بھر میں بڑھتے ہوئے

جرائم کی روک تھام میں ناکامی کی وجہ جواز ________ 615

• قانونِ مکافاتِ عمل کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا _ 616

• دنیا بھر سے جرائم کو مٹانے کا ایک طریق۔۔۔کہ انسان

اپنی ذات سے خیانت نہ کرے ________ 616

• اپنی ذات سے خیانت کا نتیجہ اپنی ذات میں اضمحلال

پیدا کرنا ہے ________ 617

• ذاتِ خداوندی تو بڑی خبیر اور بصیر واقع ہوئی ہے ________ 617

• انسانی ذات ہر انسانی عمل کو ریکارڈ میں محفوظ کر لیتی ہے __ 618

• یومِ مکافاتِ عمل مجرموں کی طرف سے کون پیش ہوگا ____ 618

• قرآنِ حکیم کے نزدیک توبہ اور غفور و رحیم کا مفہوم اور ہمارا عمل

اور پیش کردہ روایات ________ 619

• اصل میں گناہ کا ترجمہ تو جرم ہے اور کرنے والا مجرم ____ 619

• قرآنِ حکیم کے تراجم نے ملت کو تباہ کر دیا ہے' دیکھیے!

اخوت اور استغفار کا قرآنی مفہوم ________ 620

• لفظ غفور کا اور رحیم کا قرآنی مفہوم ________ 621

• ہر وہ شخص جو دوسرے کے خلاف کوئی جرم کرتا ہے

دراصل وہ اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا ہے ________ 622

• خدا کی طرف سے رحمت کا حقیقی مفہوم ________ 623

• جرم خود کرنا اور دوسروں کے گلے ڈال دینا دہرا جرم ہے __ 623

• مجرم کا ساتھ دینے والوں کی حالت ________ 624

• خیر و شر کے سلسلہ میں اس کیوں کا جواب سوائے قرآنِ حکیم

کے اور کوئی نہیں دے سکتا ________ 625

• خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا قانون اور پھر اس کی حکمت

دونوں خدا کی رحمتیں ہیں ________ 625

• باہمی مشوروں کے سلسلہ میں ضروری ہدایات اور پھر لفظ

''صدقہ'' کا مفہوم ________ 626

• لفظ رضی اللہ عنہم کا قرآنی مفہوم ________ 627

• خوش ہونا یا ناراض ہونا تو انسانی نفسیات ہے' خدا کی نہیں ہے

اور لفظ ''ہدایت'' کا مفہوم ________ 627

• مذہب کی دنیا میں قدم قدم پر انفرادیت کی جھلک نمایاں دکھائی

دیتی ہے مگر سبیل المومنین اجتماعی ہے ________ 628


## چوبیسواں باب: سورۃ النسآء

## (آیت 116: شرک کے خدوخال کی وضاحت)


• ہماری وہ مروجہ اصطلاحات جن کا قرآنی تعلیم سے

کوئی تعلق نہیں ہے ________ 631

• بادشاہت میں سب سے بڑا جرم ''سجدے'' کی بجائے

''قیام'' کی شکل اختیار کرنا ہوتا ہے ________ 632

• شرک سے خدا تعالیٰ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ

انسان اپنے مقام سے ناآشنا ہوجاتا ہے ____ 632
، دین کے بنیادی تصورات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر قرآنی تعلیم سے
استفادہ نہیں کیا جاسکتا ____ 633
، انسان کے عہدِ طفولیت میں اشیائے کائنات کے متعلق
انسان کی ذہنی سطح ____ 633
، کائنات کے معاملے میں انسان کا مقام ملائکہ کی سجدہ ریزی
اور پھر جذباتِ انسانی کی سرکشی کا تمثیلی قصہ ____ 634
، قیدخانے میں حضرت یوسفؑ کا کلمۂ حق کے سلسلہ
میں کلمۂ توحید ____ 634
، ایک ملازم اور کئی آقا یا صرف ایک آقا جو تمام ضروریات
پوری کرے؟ ____ 635
، بھوک کی احتیاج شیر کو اشاروں پر ناچنے پر مجبور کردیتی ہے 635
، مذہب سراپا محتاجی ہے، دینِ خداوندی انسان کو اس کے پاؤں
پر کھڑا کردیتا ہے ____ 636
، متضاد احکامات کی عمل داری باہمی تفریق کو جنم دیتی ہے
جو شخصیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے ____ 637
، اگر پرستش کے لفظ کو محکومیت میں بدل دیں تو فرقے
ختم ہوجائیں گے ____ 637
، ملت میں نئے نئے فرقوں کے بتوں کو جنم دینے کے لیے
قوم کا زیور ہی استعمال ہوتا ہے ____ 638
، آج ہم فرقہ بندی کی گرہوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط
کرنے میں مصروف ہیں ____ 639
، نبی اکرم ﷺ کے الفاظ میں شرک کرنے والوں کی نشاندہی 639
، فقہ کے نزدیک ایک دشواری کا حل ____ 639
، شرک کے معاملے میں حق و باطل کی جنگ کے دوران
جذبات کی کیفیت ____ 641
، کائناتی خدا سے ہٹ کر اپنے جذباتی خدا کے سامنے
سرِ تسلیم خم کرنے کا نتیجہ ____ 641
، انسان کی انسانیت کا تحفظ اس میں ہے کہ وہ اپنے سامنے بھی
سرِ تسلیم خم نہ کرے ____ 642
، انسان کا شاہین جب جذبات کے کرگسوں میں الجھ جائے
تو پھر اس کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوجاتی ہے ____ 642
، صدیوں سے دنیا بھر کی لاکھوں مساجد میں پانچ مرتبہ کئی کئی
بار حی علی الفلاح کا مقصدِ عظیم اور ہماری حالتِ زار ____ 643
، غیر قرآنی سوچ انسان کو فکری طور پر نہایت پست سطح پر
لے جاتی ہے ____ 644
، فارمولا اگر صحیح ہو تو اس کا نتیجہ ہر جگہ ایک ہی نکلے گا ____ 645
، ہمارے فارمولے اس لیے نتیجہ خیز نہیں ہوتے کہ ہم نے جگہ جگہ
اس میں فقہی آمیزش کر رکھی ہے ____ 646
، آج کے مسلمان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت کے
اہلِ کتاب کی سی ہے ____ 647
، عملی طور پر یہودیوں کی کیفیت ____ 648
، دوسروں کی کمائی کی بنیاد پر نیک عملی کے نتیجے میں جنت کے
حصول کا تصور ____ 649
، ذاتِ خداوندی پر یہ الزام کہ وہ انسان کو ذلیل کرتا ہے
سب سے بڑا ظلم ہے ____ 650
، درخت کے ایک پتے کا بیمار ہونا پورے درخت کے بیمار
ہونے کی نشاندہی کرتا ہے ____ 650

- شرک کا حقیقی مفہوم اپنے اندر قرآنِ حکیم کا پورا نظام حیات بیان کر رہا ہے ______ 651
- پوری کی پوری کائنات ریاضیات کے تحت وحدت کے غیر متبدل اصول پر قائم ہے ______ 652
- شرک کا ماحصل ہمیشہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217) کی شکل میں نکلتا ہے ______ 653
- آج تک حج کے اجتماع میں لاکھوں مسلمانوں کی دعائیں اسرائیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں ______ 653
- شرک اور توحید کے قرآنی مفہوم کے خلاف کی گئی سازش کا نتیجہ ______ 654


## پچیسواں باب: سورة النسآء
## (آیات 117 تا 126)


- لفظ شرک کی مزید قرآنی وضاحت اور اس کو اختیار کرنے کا نتیجہ ______ 655
- طبعی قوانین کو مادہ پرستی کے روپ میں پیش کرنے کا نتیجہ اور سرسیدؒ کے خلاف نیچری ہونے کا فتویٰ ______ 656
- مادہ پرستی کی تعریف' لفظ آخرت کا مفہوم اور قوانینِ فطرت 657
- ذہنی طور پر خدا کی قوت اور جبروت کا مشاہدہ قوانینِ فطرت کو سمجھے بغیر ہو ہی نہیں سکتا ______ 658
- ہمارے مقابلہ میں کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے والی قوموں کا معیارِ زندگی اور شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ کا مذاق ______ 658
- قرآنِ حکیم نے نگاہوں سے اوجھل دلوں کے اندر چھپے سرکش جذبات کو شیطان کہا ہے ______ 660
- لفظ لعنت کا لغوی اور قرآنی مفہوم تو زندگی میں خوشگواریوں سے محروم ہونے کا ہے ______ 661
- خدا کے نام پر مذہبی پیشوائیت کی شکم پروری کا سلسلۂ دراز ______ 661
- برہمنوں کے ہاں دیوی دیوتا کے نام پر حصے حاصل کرنے کا طریق اور ہماری توہم پرستیاں ______ 662
- کسی کی جیب کا مال اپنی جیب میں ڈلوانے کے لیے دوسرے کی عقل کو ماؤف کرنا پڑتا ہے ______ 662
- معاشرے میں ہر سو پھیلی ہوئی لاقانونیت انسانی عقل کو توہم پرست بنا دیتی ہے جبکہ شیطان کا خدا کو یہی چیلنج تھا ______ 663
- قانون کا احترام کرنے والی کسی قوم کی کوئی مراد ہی نہیں رکتی 663
- عیسائیت میں Protestant (پروٹسٹنٹ) اور کیتھولک تصورات کا تجزیہ ______ 665
- قانون کی قوت کو نظرانداز کر کے مرادیں پوری کرانے کا تصور شیطان کے پروگرام کی تکمیل ہے ______ 665
- پیر اپنی خدمت اسی سے تو کرواتا ہے جو اسے اپنا پیر تصور کرتا ہے ______ 665
- مرید کی طرف سے نیازمندی' عقیدت اور جنت کے حصول کی روایات ______ 666
- جنت کے اندر داخلے کے سلسلہ میں صحاح ستہ کی ایک روایت اور قرآنِ کریم کا انتباہ ______ 668
- جنت میں داخل ہونے کے لیے مختون ہونے یا کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت اور خدائے علیم کا ارشاد ______ 669
- قرآنِ حکیم کے نزدیک جنت میں داخل ہونے کا معیار ______ 670
- نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہوتی ہے ______ 671
- قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کا اپنی ذاتِ خاص کے متعلق اعلان اور جنگِ احزاب کا ذکر ______ 671

، خدا کی طرف سے یہ پوری کائنات تو بغیر کسی معاوضے کے مل سکتی ہے لیکن جنت کی یہ صورت نہیں ہے ______ 672

، اعمال کے بدلے ملنے والی جنت اور مفت میں ملنے والی جنت میں فرق ______ 673

، دینِ خداوندی اگر نظامِ زندگی کو حسن عطا کرتا ہے تو دوسری طرف وہ ذاتِ انسانی کو بھی ایک نئی منزل سے روشناس کراتا ہے اور وہ ہے خدا کو اپنا دوست بنانا ______ 673

، قوانینِ خداوندی کے تحت کائنات کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے: انگور کا دانہ بھی اور ببول کا بیج بھی ______ 674

، کائنات اور انسان میں کرہاً اور طوعاً کے فرق کی وضاحت _ 675

، خارجی کائنات کے قوانین ہوں یا انسانی زندگی کے لیے ضابطہ حیات، ان دونوں کے لیے دین ہی کہا گیا ہے اور خدا کا یہ دین پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے ______ 675

، کائناتی قوانین کے ذکر کے بعد عائلی زندگی کی مزید وضاحت 676


## چھبیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 127 تا 132)


، قرآنِ حکیم کے نزدیک عائلی زندگی کی اہمیت اور اس کے لیے اصولوں کی تدوین ______ 678

، انسان کا حیوانی سطح سے بلند خلقِ جدید کی طرف سفر اختیار و ارادہ سے سرفراز ہونے کی نعمت کا ملنا ہے ______ 679

، پرندوں اور مچھلیوں کا اپنے اپنے ماں باپ سے ملاپ کی خاطر ہزاروں میل کا انوکھا سفر اور انسانی بچے؟ ______ 680

، انسان چھ ہزار سال سے بتدریج شعوری طور پر ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہے ______ 681

، صلاحیتوں کے لحاظ سے انسانوں کے مابین پائے جانے والے فرق کی وجوہات اور پھر نوعِ انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات 682

، آج کا بچہ کل کی قوم اور آج کی قوم کل کی نوعِ انسانی ____ 682

، گھریلو زندگی صرف میاں بیوی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو عالمگیر سطح پر نوعِ انسانی کا معاملہ ہے اور بچوں کی نفسیات ______ 683

، قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ تباہ حال قوموں کی آنکھیں ہمیشہ ماضی کو دیکھتی ہیں، مستقبل ان کے سامنے ہی نہیں آتا ____ 683

، قوموں کی زندگی کا مستقبل ماؤں کے تصورات کو بدلنے پر موقوف ہے ______ 684

، بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے اختیار کردہ معیار کی نوعیت ______ 684

، سورۃ النسآء کی تو ابتدا ہی اُن بچوں سے ہوتی ہے جنہیں قرآن مجید یتیم کہتا ہے اور ان کے لیے کوئی الگ یتیم خانہ نہیں کھولنا پڑتا 686

، اہلِ کتاب عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کا مسئلہ اور حضرت عمرؓ کے ہاں اس اجازت کی منسوخی ______ 686

، جنگ کی شکل میں عورتوں اور بچوں کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل ______ 687

، لفظ یتیم کا قرآنی مفہوم اور اس کا مقام ______ 687

، نسلِ انسانی کو ذہنی طور پر اگر مفلوج کرنا ہو تو اس کے لیے یتیم خانے کھول دو۔ دیکھیے کہ قرآنِ حکیم اس مسئلہ کا کیا حل پیش کرتا ہے 688

، قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا بیان کردہ طریق ایک اعجاز ہے ______ 689

، ''تبویب القرآن'' کی تدوین کے سلسلہ میں پرویزؒ کی

سعی وکاوش اوراس کی افادیت کا ذکر ___ 689
، لفظ فتویٰ کا مفہوم اور عربی زبان کی بلاغت کا ذکر ___ 690
، وقتی طور پر گھریلو کشمکش کا علاج اگر نہ ہوسکے طول پکڑ جائے
تو اس کے متعلق راہنمائی ___ 692
، گھریلو سطح پر ایک بچے کی غلط تربیت پوری انسانیت کو
متاثر کرتی ہے ___ 692
، ایک پتے کے خشک ہونے یا سرسبز رہنے میں پورے کے
پورے درخت کا حصہ ہوتا ہے ___ 693
، آج قوم کے بچوں کی حالت زار نا گفتہ بہ ہونے کی
ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے: گھر کا جہنم ___ 693
، ایک غلط فہمی کی بنا پر عورت کا قرآنِ حکیم پر اعتراض اور
قرانِ کریم کا جواب ___ 694
، تنسیخِ نکاح کے دوران عورت کے راستے میں پیدا کی جانے والی
رکاوٹیں اور نیلام گھر کی طرح تین طلاقوں کی گردان کے عمل
کی نوعیت ___ 695
، مصالحت کے سلسلہ میں دل کا بخل بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے 696
، باہمی تعلقات کی علیحدگی میں بھی خوبصورتی کا رنگ شامل
کرنا ہوگا ___ 697
، ہماری معاشرتی زندگی کا ذکر ___ 697
، قرآنی تعلیم یہ ہے کہ دشمن سے محبت تو نہیں ہوسکتی البتہ عدل
کرنا ضروری ہوتا ہے ___ 698
، معاشرتی عدل اور جذبات کے عدل میں بنیادی فرق ہے _ 698
، قرآنِ حکیم کی بات میں تضاد نہیں بلکہ ہماری سمجھ کا فرق ہے 698
، جذبات کے سلسلہ میں یہاں حرصتم کا لفظ قابلِ غور ہے _ 699
، ہمارے ہاں کی معاشرتی زندگی کی نا گفتہ بہ حالت ___ 699
، خدا تعالیٰ اپنی ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں اپنے نظام کے
تحت پوری کراتا ہے ___ 700
، خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نظام کی شکل یہ ہے کہ خارجی
کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہوتی ___ 700
، خدا کی حاکمیت انسانوں کے سجدوں کی محتاج نہیں بلکہ انسان
ہی اس کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کا محتاج ہے ___ 701
، خدا کا دیا ہوا نظام ہی انسانیت کا آخری سہارا ہے۔ خدا
تو غنی بھی ہے اور رحیم وکریم بھی ___ 701

## ستائیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 133 تا 143)

، قرآنِ حکیم کی طرف سے انسانی عقل وفکر کو جلا بخشنے کے لیے
خارجی کائنات کے نظم ونسق کی محسوس مثال ___ 703
، انسان کے لیے اختیار وارادہ کی نعمت ایک ایسا گوہرِ تابدار ہے
جو کسی اور کو عطا نہیں ہوا ___ 704
، خدا کی طرف سے عطا کردہ نظام، اجتماعی حیات کا آئینہ دار
ہوتا ہے جس میں کسی کے اختیار کو مفلوج نہیں کیا جاتا ___ 704
، اختیار وارادہ پر پابندی انسان میں نفسیاتی طور پر سرکشی کے
جذبات پیدا کردیتی ہے ___ 705
، خارجی کائنات کی مانند انسان کو مجبور پیدا کرنا خدا کی مشیّت
میں نہیں تھا ___ 706
، قرآنی آیات کے آخر میں دی گئی صفاتِ خداوندی بڑی
پُر معنی ہوتی ہیں ___ 706
، خدا کی ذات قادرِ مطلق ہے، وہ اپنے کسی قانون کو بدل سکنے

کے باوجود بدلتی نہیں اور قصہ مفادِ دنیا و آخرت کا ______ 707
، قانونِ شہادت کے متعلق قرآنی آیت کی اہمیت اور جائزہ _ 709
، قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ شہادت صرف خدا کی طرف سے ہو، جذبات کی بات درمیان میں آ گئی تو عدل نہیں کر سکو گے ___ 710
، عدل کا لغوی مفہوم ______ 711
، ذو معنی بات تو پیاز کے چھلکے کی طرح ہوتی ہے، نیچے سے کچھ بھی نہیں نکلتا ______ 711
، سچی شہادت کے لیے بغیر کسی سمن کے خود حاضر ہو جاؤ ___ 712
، سچی شہادت سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ کرتی ہے ____ 712
، ہمارے ہاں مسلمان اور کافر کی پہچان کا معیار اور قرآنِ حکیم کی وضاحت ______ 713
، مسلمان کا لفظ تو قرآنِ حکیم میں ہی نہیں ہے ______ 713
، مومن کہلانے کے لیے پہلے دلی طور پر ایمان لانا ضروری ہے 714
، ایمان لانے والوں کے متعلق ایک تاریخی واقعہ ____ 714
، ایمان لانے والے اپنی شہادت تو خود آپ بن جاتے ہیں _ 715
، انسانی سوچ کے لیے انسانی خود فریبی کی ایک بین مثال انسانی فطرت کا تصور ہے ______ 715
، شروع سے آج تک لکھی گئی ہماری تفسیروں کا بیان ____ 716
، انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی بلکہ اس کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے 716
، لفظ ایمان اور عمل کی حقیقت اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کی ایک محسوس مثال ______ 717
، پہلی شرط ایمان، دوسری اس پر عمل اور پھر عملِ پیہم کی کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پختہ شعور اور بلند ہمتی ______ 718
، آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مثل کوئی فارمولا جزوی طور پر صحیح نتائج پیدا نہیں کرتا اور منافقت بھی درکِ اسفل میں ______ 719
، عزت کے حصول کے لیے انسان کے عمل دخل کی نوعیت اور غیر مسلموں سے تعلقات ______ 720
، تعمیری سوچ سے ہٹ کر ہمارے ہاں کی مخلوط آبادی کی حالتِ زار اور نوجوان نسل کی طرزِ زندگی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان 721
، غیر سنجیدہ محفلوں میں بیٹھنے کا نتیجہ اور قرآنی راہنمائی اور منافقین کا رویّہ ______ 721
، تعلیم و تربیت سے محروم مشرکانہ سوسائٹی کی تصویر کشی ____ 722
، نظریۂ حیاتِ قرآنی پر ایمان نہ لانے والوں کی منافقانہ طرزِ زندگی کا عمل ______ 723
، یقین محکم، عمل پیہم میں مومنین کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد 723
، جغرافیائی افادیت کے لحاظ سے سطحِ ارض پر مسلمانوں کے جم غفیر کے باوجود پس ماندگی کی وجہ ______ 724
، مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ دنیا بھر میں کسی طرح بھی دوسروں کا محتاج نہیں ہوگا ______ 724
، خدا کی ذات کسی انسان کو دھوکا نہیں دیتی بلکہ انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے ______ 725
، اُن نمازیوں کا ذکر جو خدا کو دھوکا دیتے ہیں ______ 725
، صلوٰۃ کی اصل حقیقت ______ 727
، تباہی ان نمازیوں کے لیے جو رزق کے سرچشموں کو روک لیتے ہیں ______ 727

## اٹھائیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 144 تا 155)

، کافر اور منافق کے علاوہ مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت 729

مذہب کی بنیاد سیکولرازم پر استوار ہوتی ہے اور دین کی دوقومی نظریئے پر ___ 730

دوقومی نظریہ کے بنیادی لوازمات جن کو پیش نظر رکھے بغیر اسلامی مملکت کا خواب پورا نہیں ہوسکتا اور بنیاد پاکستان ___ 731

کوئی غیر مسلم جماعتِ مومنین کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں؟ اور مسلم مملکت کے دو لوازمات ___ 731

مملکتِ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہماری نظریاتی زندگی کی زبوں حالی ___ 732

اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی حیثیت کے تعین کی وضاحت 733

دوقومی نظریئے کی قرآنی آئیڈیالوجی کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کو وارننگ ___ 734

منافق کے سلسلہ میں نفسیاتی طور پر ہر آن جہنمی کیفیت میں مبتلا رہنے کی ایک قرآنی مثال ___ 735

ہندوؤں کے بالمقابل آزادی کے بعد نظریاتی طور پر ہم مسلمانوں کی پیچیدہ صورت حال کی بنیادی وجہ اور اس کا حل _ 735

ماڈرن طبقے پر مذہب پرست طبقہ کا اعتراض اور پھر ان کی اپنی کارگزاری کی روداد ___ 736

قرآنی قوانین کی بجائے فرقہ بندی کی بنیاد پر فقہ حنفی رائج کرنے کی تجویز ___ 737

قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن اور کافر کی تخصیص ___ 737

اگر کسی نے دنیا بھر میں اپنے آپ کو بے یارومددگار کرنا ہوتو اپنے قول وعمل میں تضاد پیدا کرلے ___ 738

صحیح منزل پر پہنچنے کا طریق ___ 739

مذہب کی افیون کا علاج دین کو مضبوطی سے اپنانے ہی میں ہے 739

دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا ایک خطرناک نفسیاتی مرض ہے 740

اللہ تعالیٰ کی کبریائی تو ان تصورات سے کہیں بلند ہے ___ 741

دوسروں کے سابقہ Career (پیشے کام) کو معاشرے میں مت پیش کرو ___ 741

اپنی پسند کو دوسروں سے باور نہ کروانے کی شکل میں انہیں بدنام نہ کیا جائے ___ 741

بغیر تصدیق کیے کسی کی بات کو آگے مت پھیلاؤ ___ 742

لفظ عَفُوًّا کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''درگزر کرنا'' ہے اور بابا جی دی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا ___ 743

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کو تو مانتا ہے لیکن وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو تسلیم نہیں کرتا ___ 744

خدا کے ماننے یا نہ ماننے کا تمام تر دارومدار حیات انسانی کے لیے دی گئی راہنمائی پر ایمان لانے پر موقوف ہے ___ 745

برہمو سماجی طریق کا پروگرام اور اس کا نتیجہ ___ 745

قرآنی ضابطۂ حیات پر ایمان زندگی کو دوحصوں میں تقسیم نہیں کرتا ___ 746

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں مخالفت کرنے والے علما کے متعلق علامہ اقبالؒ کا ارشاد ___ 746

ہر امت رسول کی نسبت سے تشکیل پاتی ہے ___ 748

آخر پھر ختم نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے ___ 748

مسلمان ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کو من حیث الکل تسلیم کیا جائے ___ 749

صراط مستقیم کو چھوڑ کر بین بین راستے پر چلنے والا مسافر کبھی

منزل پر نہیں پہنچ سکتا ___ 749
، ایمان کی منزل تک پہنچنے کا طریق اور ایمان کے سلسلہ میں
اکراہ کا مفہوم ___ 750
، حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں کا مطالبہ کہ آسمانوں سے
، خدا کو ہمارے سامنے لاؤ اور آسمانوں سے کتاب اتارو ___ 751
، واضح دلائل اور روشن تعلیم کو ٹھکرا کر کرامات دیکھنے والی قوم کا حشر 752
، قرآن کریم کی تعلیم انسانوں کی ذہنیت کو تبدیل کر دیتی ہے 752
، ہماری پوری تاریخ قومِ بنی اسرائیل سے مماثل دکھائی دیتی ہے 753
، اخلاقی لحاظ سے چھوٹی چھوٹی پابندیوں کے سلسلہ میں
ہماری بدعملی کا تذکرہ ___ 754
، دلوں پر تالے پڑنے کی وجہ جواز اور پھر انہیں کھولنے کا طریق 754

## انتیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 156 تا 159)

، قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرنے کا مقصد 755
، حفاظتِ عصمت میں حضرت مریمؑ کے خلاف بہتان تراشی کا
ذکر اور اس کی اہمیت ___ 755
، عصمت کی حفاظت میں حضرت یوسفؑ کا ذکرِ خیر ___ 756
، کلیسا میں پریسٹ کے اختیارات کی وسعت تھی، انہیں
صرف موت کی سزا کی توثیق کی ضرورت ہوتی تھی ___ 757
، ٹیمپل میں راہبہ (Nun) کے سلسلہ میں خودساختہ
شریعت کی کیفیت اور حضرت مریمؑ کی تربیت ___ 757
، ٹیمپل کے مذہبی پیشواؤں کی گرفت اور حضرت مریمؑ کا کردار 758
، قرآنِ حکیم کے نزدیک حفاظتِ عصمت کی قیمت اور اہمیت 758
، قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کا طریق کہ انسان پہلے سے
ذہنی طور پر کوئی تصور لے کر نہ بیٹھ جائے ___ 759
، قرآنِ حکیم کی حقیقی تعلیم تک پہنچنے کے سلسلہ میں پرویزؒ کی
اپنی کیفیت اور اس کا ماحصل ___ 760
، ''مباحثوں اور مناظروں کے لیے میرے پاس کوئی وقت
نہیں'': پرویزؒ ___ 760
، ''قرآنِ کریم ہاتھ میں لے کر اس کو پیش کرنے کی
ذمہ داری میری کمر توڑ دیتی ہے'': پرویزؒ ___ 761
، حق بات کو سمجھنے اور حق کو پیش کرنے والی قوم کی کیفیت
اور اس کا مقام ___ 761
، حق وہ ہوتا ہے جو حقیقت بن کر محسوس شکل میں سامنے آجائے۔
عہد فاروقیؓ میں بائیس لاکھ مربع میل کا زیرِ کنٹرول علاقہ
دینِ حق کا ثبوت ہی تو تھا ___ 761
، عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے مسلم قوم کو بے عمل کرنے کی
ایک گہری سازش جو آج تک ہم پر پوری طرح اثر انداز ہے ___ 762
، خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے شاہ اسماعیل کی تحریک
اور سرسیدؒ کی ولولہ انگیز سوچ ___ 763
، مسلم تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے انگریزوں کی طرف سے
مناظروں کی خاطر پادریوں کی یلغار: وفات وحیاتِ مسیحؑ
اور پھر نبوت کا دعویٰ ___ 763
، حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں شب وروز ہونے والے مناظروں
کی روداد میں علامہ پرویزؒ کا عمل دخل ___ 764
، علامہ اقبالؒ کی طرف سے پیش کردہ طویل نظم
''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' قابلِ فہم ہے ___ 764
، ابلیس کی نظر میں مسلمانوں کی بیداری کے سدِ باب کی

خاطر ایک موثر ترین نسخہ ________ 766

، ابلیس کا وہ پروگرام جس پر آج بڑی چابکدستی کے ساتھ
بڑے زور شور سے کام ہو رہا ہے ________ 766

، مسلمانوں کے ہاں وضعی روایات کے تحت پیدا ہونے
والے عقائد کے اثرات ________ 767

، عباسیوں کے دور میں مذہبی مناظروں کی نوعیت اور
یہودیوں کے دعوے ________ 767

، ملت اسلامیہ کو الٰہیات کے گرداب میں الجھا دینے کی سازش 768

، کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے اور کیا وہ آسمانوں
پر زندہ ہیں؟ ________ 769

، وہ ایمان جو عمل کے ساتھ منسلک نہ ہو وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا 770

، مسیحؑ کو صلیب کی موت دینے کے متعلق قرآنِ حکیم کا
ارشاد اور موجودہ تحقیق ________ 770

، عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور ان کی تاریخ
میں تضاد ہے ________ 771

، قرآنِ کریم ان کے ان تمام عقائد کی تردید کرتا ہے ________ 772

، صحابہ کرامؓ کے متعلق ایک خود ساختہ حدیث ________ 773

، عیسائیوں کے اپنے گناہوں کے کفارے کا عقیدہ' ان کے
نزدیک خاصی اہمیت کا حامل ہے ________ 773

، قرآنِ حکیم کے بیان کرنے کا تمثیلی انداز نیز بچیوں کو زندہ
درگور کر دینے کا معاملہ ________ 774

، روزِ محشر عیسائیت کے غلط عقائد کے متعلق حضرت عیسیٰؑ
کی تردید کا انداز ________ 775

، اس قسم کے خلافِ قرآن عقائد پیدا کرنے کی وجہ ________ 775

، وقت کے تقاضوں کے تحت ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی
کا علاج اور اس کا طریق ________ 776

، ایک عظیم مقصد کے حصول کی خاطر حج کے پُرشکوہ اجتماع کی
غرض و غایت اور ہماری سوختنی قربانیوں کا تذکرہ ________ 777

، حج کے موقع پر جانوروں کو ذبح کرنے کا مقصد لیکن ہمارے
ہاں اس کی نوعیت ________ 778

، قربانی کے واجب ہونے کا فتویٰ ________ 779

## تیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 160 تا 161)

، لفظ حلال' حرام اور طیّب کا قرآنی مفہوم اور اس کے
استعمال کی وضاحت ________ 781

، کسی انسان کو کسی انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں ________ 782

، پیرو مرشد کی غلامی تو انسان کے دل و دماغ کے اطراف نہیں
ہوتی' بیل کی طرح چھائی ہوتی ہے ________ 783

، کسی انسان کی بجائے خدا کے حضور ربانی بن جانے کا طریق
صرف خدا کی کتاب کی ہی پیروی ہے ________ 783

، خود ساختہ شریعت کی طرف سے وضع کردہ پابندی کی
نوعیت اور اثرات ________ 784

، انسان کی آزادی اور پابندی کی حدود صرف اور صرف
خدا کی کتاب متعین کرتی ہے ________ 784

، قرآنِ حکیم کے نزدیک حرام چیزوں کی تعداد کا معاملہ
اور ہمارا شب و روز کا عمل ________ 785

، علامہ پرویزؒ کے بچپن کی گستاخی کا ایک واقعہ جو نیاز کے
تبرک کی بے حرمتی کا نتیجہ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے ________ 786

، اضطراری حالت میں حرام چیز کے استعمال کی اجازت ___ 786

، چار چیزوں کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی شے کو حرام قرار نہیں دے سکتا ___ 787

، حلال چیزوں میں کسی چیز کا کھانا یا نہ کھانا ہر انسان کی مرضی پر منحصر ہے ___ 787

، کسی چیز کو نہ کھانے کے سلسلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک واقعہ ___ 788

، حلال کے ساتھ طیّب کی شرط کا مقصد ___ 789

، حلال کے ساتھ طیّب ہونے کا تصور ہر جگہ مختلف ہوتا ہے اور طبعی ری ایکشن کا نتیجہ ہے ___ 790

، آنے والے دور میں حلال اور طیّب کی وسعت اور تقاضے ___ 791

، حرام وحلال کے سلسلہ میں ہمارے وضع کردہ فقروں کی نوعیت ___ 792

، قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس جاری کردہ فتوے ___ 793

، خودساختہ فتوؤں کے باعث امت پر وارد ہونے والا عذاب 793

، قرآنِ حکیم کے مقرر کردہ قوانین میں ردوبدل کرنا خدا پر افترا ہو جائے گا ___ 794

، حرام چیزوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی شریعت کا عمل دخل جو سراسر احکامِ قرآنی کے منافی ہے ___ 794

، بیان کردہ چار چیزوں کو حرام قرار دینے کی وجہ جواز ___ 795

، یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی وجہ جواز ___ 796

، قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر انسانیت کے جذبات کی قدرومنزلت کا مقام ___ 797

، باہمی رشتہ داری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت ___ 797

، بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں رومنز اور ایرانیوں کے ہاں استثنا کا معاملہ پایا جاتا تھا ___ 797

، رشتوں کے معاملہ میں قرآن حکیم کا ابدی اصول ___ 798

، امریکا اور یورپ کے اہل دانش اور پادریوں کے استفسارات کی نوعیت اور ہماری حالتِ زار کے پیش نظران کا اعتراض ___ 798

، ہماری نئی نسل میں پیدا ہونے والی مایوسی اور خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ___ 799

، قرآنی حقائق کو عملی شکل دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا معاشی نظام ہے ___ 800

، یہودیوں کے ہاں ربوٰ کی Definition (تعریف) ہمارے ہاں کے سود کی سی ہے ___ 800

، قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا نظام ___ 801

، دین کی جگہ مذہب نے ہمیشہ ہر سطح پر کٹ حجتی سے کام لیا ہے 801

، نماز پڑھانے کا معاوضہ ___ 802

، ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں ذلیل ترین شکست ___ 802


## اکتیسواں باب: سورۃ النسآء

## (آیات 162 تا 170)


، قرآنِ حکیم میں تاریخ کے سابقہ واقعات کو پیش کرنے کا مقصد 804

، قرآنِ حکیم کی طرف سے یہودیوں کے خودساختہ عقائد کی نفی اور پھر صراطِ مستقیم کی نشاندہی ___ 805

، نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ___ 806

، لفظ آخرت کا مفہوم ___ 806

، زندہ قوموں کے نزدیک آخرت اور قانون مکافاتِ عمل کی اہمیت ___ 807

، انسان کے ہر عمل کا نتیجہ انسان کی انتظار میں چوکس رہتا ہے 808

﴾ قدرت کی طرف سے نورِ ہدایت کا سورج تو حضرت نوحؑ سے ہی روشن ہے ____ 809
﴾ آدم کا بت بنانا اور پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی کا پیدا کرنا تورات کا بیان ہے' قرآن کریم کا نہیں ____ 809
﴾ قرآنِ حکیم کی کشادہ نگہی یہ ہے کہ وہ تمام قوموں کے انبیا کو تسلیم کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے ____ 810
﴾ تمام انبیا پر ایمان لانا عالمگیر برادری کی تشکیل کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے ____ 811
﴾ دنیا بھر کو عالمگیر برادری کا سبق دینے والی قوم کی عملی زندگی کی کیفیت ____ 812
﴾ دین میں بغیر کسی تحقیق کے ہر قوم کے ہر بزرگ کا احترام فرض ہے ____ 812
﴾ خدا تعالیٰ نے ہر نبی کو کتاب کی نعمت سے نوازا تھا ____ 813
﴾ نبی کے علاوہ وحی کی ماہیت سے کوئی بھی شخص واقف نہیں ہوسکتا 813
﴾ نزولِ وحی کے تین طریقے ____ 814
﴾ 1۔ پہلا طریقہ ''وحی'' سے: وحی کا آغاز ہمیشہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ نبی سے ____ 815
﴾ 2۔ دوسرا طریقہ ''پردے کے پیچھے سے'': خدا کی ذات کا حضرت موسیٰؑ سے گفتگو کا تمثیلی انداز' تشبیہات کی شکل میں ____ 816
﴾ 3۔ تیسرا طریقہ: خدا کا انسان کے ساتھ بات کرنا ____ 817
﴾ لفظ کلام کے علاوہ لفظ عَلَیًا اور عَلَیۡکُمیں فرق کی نوعیت ____ 818
﴾ انسان تو خدا سے کلام کر ہی نہیں سکتا ____ 818
﴾ کشف' الہام اور بشارات کا تصور تو نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے ____ 818
﴾ خدا تعالیٰ نے اپنی گویائی کی لازوال نعمت کو تو قیامت تک کے لیے عام کر رکھا ہے ____ 819
﴾ انسانوں کے لیے رسولوں یا نبیوں کے آنے کا مقصد ____ 819
﴾ وحی کی تعلیم یہ ہے کہ بدعملیوں کے نتائج ہر وقت جانوروں کی دم کی طرح انسان کے ساتھ چپکے ہوتے ہیں ____ 820
﴾ وحی کی راہنمائی اور عقل کے تجرباتی طریق میں فرق ____ 821
﴾ ڈکٹیٹر شپ میں قانون کی حکمت سے آگاہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا ____ 822
﴾ خدا اگر عزیز کے ساتھ حکیم ہے تو وہ غالب بھی ہے لیکن مستبد نہیں 823
﴾ قانون کی تعریف ____ 823
﴾ خارجی کائنات کا ایک ایک ذرہ حق ہونے کی شہادت فراہم کرتا چلا جائے گا ____ 824
﴾ یہ خالقِ کائنات علیم وخبیر بھی ہے اور بصیر ونظیر بھی' اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہی نتیجہ پیدا کردے جو نتیجہ اس کے اندر مضمر ہے 825
﴾ انسان کا ہر عمل جو خیر کا پہلو لیے ہوئے ہو اس کی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے ہوتا ہے ____ 826
﴾ انسانی ہاتھ کائناتی نتائج کو جلد ظہور پذیر ہونے میں مدد دیتے ہیں ____ 827
﴾ موت کے وارد ہونے کی اطلاع نہ ہونے میں بھی ایک حکمت ہے ____ 828


## بتیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 171 تا 174)


﴾ غلو اور غلاء کا لغوی مفہوم ____ 831
﴾ قرآنی تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے مختلف اجتماعات اور

مساجد میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق مبالغہ آمیزی کا چرچا ____ 832
- مذاہب عالم کی تاریخ میں مبالغہ آمیزی کے سلسلہ میں انبیائے کرامؑ اور دیگر ہستیوں کے متعلق عقائد کی شکل وصورت ____ 832
- معراج انسانیت کے مقامِ بلند پر سرفراز ہستی نبی اکرم ﷺ کے متعلق غلو اور مبالغہ آمیزی کے تصورات ____ 833
- قرآنی تعلیم کے برعکس غلو کے متعلق ہماری تفاسیر کی نوعیت 835
- قرآنِ حکیم کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کا مقام ____ 836
- وہ صفاتِ خداوندی جو انسان میں علیٰ حدِ بشریّت پیدا ہوسکتی ہیں ____ 836
- خدا تعالیٰ کی وہ صفات جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مختص ہیں 837
- کوئی رسول بھی اپنی طرف سے دین نہیں بناتا جبکہ تمام فقہی قوانین کسی نہ کسی انسان پر ختم ہوتے ہیں ____ 837
- فقہی قوانین کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے وارننگ 838
- خدا کے علاوہ دوسروں کے ذکر سے ان کا دل باغ باغ ہوجاتا ہے ____ 840
- اگر کسی کو اس کے مقام سے اونچا لے جانا غلو ہے تو اس کو اس کے مقام سے نیچے لے جانا گستاخی ہے ____ 840
- شرک کے مفہوم کی دوٹوک وضاحت ____ 840
- ہمارے ہاں شرک کے معاملے میں توحید کی عملی شکل ____ 841
- خدا بطور ظہریہ کا مفہوم ____ 841
- مغربی جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ کے ہاتھوں عوام کی کسمپرسی کی عملی تفسیر ____ 842
- انسان کی انسان پر حکومت کا نتیجہ: ہر سُو درندگی ____ 843
- حصولِ پاکستان کا مقصد قائداعظمؒ کے الفاظ میں ____ 843
- قرآن فہمی کے سلسلہ میں قائداعظمؒ سے علامہ پرویزؒ کی رفاقت 844
- قرآنِ حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو انسان کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دو ____ 844
- خدا کی صفت رحمانیت کے سلسلہ میں عیسائیت کی بنیادی غلطی کی وضاحت ____ 845
- خدا کی صفت رحیم کے ساتھ عادل کی صفت: کیا یہ تضاد نہیں ہے؟ ____ 845
- خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا حقیقی مفہوم ____ 846
- یہودی شریعت اور ہندو دھرم میں تلافی کا تصور مفقود ہے ____ 846
- عدل اور رحم کے سلسلہ میں عیسائیت کے غلط عقیدے کی وضاحت ____ 847
- خدا کی صفات الحسنیٰ کا قرآنی مفہوم: توازن کو برقرار رکھنا ہے 848
- خداوندی صفات میں توازن کو پیشِ نظر رکھنے کا نتیجہ ____ 848
- دین میں مبالغہ کرنے کی صورت میں صراطِ مستقیم نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے ____ 849
- خدا کی ذات اور معاشرتی اور تمدنی زندگی میں ہر فرد کو اس کے مقام پر رکھنا نہایت ضروری ہے ____ 849
- جب کوئی انسان کسی کے متعلق غلو سے کام لیتا ہے تو وہ دراصل اپنے مقام سے خود نیچے آجاتا ہے ____ 850
- عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق خدا کا بیٹا ہونے کا تصور ____ 850
- عبدالقادر جیلانیؒ پیر دستگیر کی طرف ایک منسوب کردہ واقعہ 851
- اپنی سوچ کی بناء پر انسان دوسروں کے متعلق غلط تصورات قائم کرلیتے ہیں ____ 852

، قرآنِ حکیم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق متعین کیا ہوا رتبہ زیادہ قابل فخر ہے ______ 852

، روزِ قیامت خدا کے حضور حضرت مسیحؑ کا بیان ______ 853

، صوفیائے کرام کے متعلق بیان کردہ حوالوں کے معاملے کی وضاحت ______ 853


## تینتیسواں باب: سورۃ النسآء
## (آیات 175 تا اختتام)


، غلو کا تمام دارومدار انسانی جذبات پر ہوتا ہے جبکہ دین اپنے ہاں دلائل و براہین کو اہمیت دیتا ہے ______ 855

، ''تاریکی کے پردے'' پر قرآن کریم کی دلیل و برہان کرتی کیا ہے؟ بس دیدۂ بینا کو دیکھنا قرآن کریم کی روشنی میں ہے۔ ______ 856

، انسان کا انسان کے سامنے جھکنے کا تصور انسان کو اس کے اپنے مقام سے گرا دیتا ہے ______ 858

، شمعِ قرآنی تو ہر شے کا مقام متعین کر دیتی ہے ______ 858

، قرآنِ حکیم کی روشنی سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے ہم نے خود کو محروم کر رکھا ہے ______ 859

، فضل کا لفظ اگر رزق کی فراوانی کے لیے ہے تو رحمت کا لفظ انسانیت کی نشوونما کے لیے مختص ہے ______ 860

، لفظ صراطِ مستقیم کا مفہوم اور ذاتِ خداوندی کے مقام کا تعین 860

، تصوف کی دنیا میں انسانی ذات اور خدا کی ذات میں فرق کی نوعیت ______ 861

، اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کا حقیقی مفہوم: خدا کے مقرر کردہ نصب العین کی طرف رجوع کرنا ہے ______ 863

، ہمارے تراجم میں انا للہ وانا الیہ راجعون کے متعلق پایا جانے والا مفہوم ______ 863

، قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نصب العین کی وضاحت کے باوجود ہماری حالت ______ 864

، سیاسی لحاظ سے موجودہ بے لگام جمہوریت کا خاصہ یعنی اکثریت کی حکمرانی کی ساخت ______ 865

، رزق کے معاملے میں فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور زندگی کے رواں دواں رہنے کا تصور ______ 865

، قرآن حکیم کی طرف سے راہنمائی کا طریق ______ 866

، وراثت کے اصولوں کی وضاحت ______ 866

، ہمارے ہاں وراثت کے اصولوں میں پائی جانے والی بے ربطی کی وجہ ______ 867

، کیا وراثت کے قوانین قرآنِ حکیم نے اس لیے دیئے تھے کہ سرمایہ داری نظام کی آبیاری ہوتی رہے؟ ______ 868

# پہلا باب: **سورۃ النسآء** (1)'(آیت 1: زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی؟)

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

عزیزانِ من! آج جون 1970ء کی 14 تاریخ ہے۔ افسوس ہے کہ پچھلے اتوار میری طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے درس نہ ہوسکا۔ آج بھی ابھی طبیعت کلیتاً بحال تو نہیں لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ احباب آجائیں اور اس طرح سے واپس چلے جائیں۔ جتنی ہمت ہوگی اس کے مطابق کچھ قرآن کریم کو پیش کردونگا' خود قرآن نے کہا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس لیے نہیں کرائی جاتی کہ اس سے خدا کا کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔

آج درس کا آغاز سورۃ النسآء سے ہوتا ہے۔ یہ چوتھی سورۃ ہے۔ کہا ہے کہ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (4:1)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ''اے نوعِ انسانی! تم اللہ کے قوانین کی نگہداشت کرو (میں عام لفظی ترجمہ بیان کیے جاتا ہوں) کہ جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے اس کے زوج کو پیدا کیا اور پھر ایک سے کثیر تعداد مرد اور عورت کا سلسلہ آگے چلا۔ خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو' اس قانون کی نگہداشت جس کی رو سے تم ایک تمدنی زندگی میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہو۔ اس کی ابتدا ایک خاندانی زندگی سے ہوتی ہے' باہمی رشتہ داری سے ہوتی ہے۔ خدا تمہارے ہر ایک عمل پر نگران ہے''۔

## نسلِ انسانی کے سلسلہ میں انسانی ذہن کے تراشیدہ قصوں کے احوال

عزیزانِ من! ایک انسانی بچے کی پیدائش آج تو ایک معمول کا واقعہ ہے' اس میں نہ کسی قسم کی حیرت ہوتی ہے' نہ کوئی تعجب۔ مرد اور عورت یا نر اور مادہ کے باہمی اختلاط سے استقرارِ حمل ہوتا ہے' وضع حمل کے بعد بچہ دنیا میں آجاتا ہے اور یوں یہ سلسلہ آگے چلتا رہتا ہے۔ اگر اس سلسلے کو پیچھے کی طرف لوٹایئے تو ذہن کہیں جا کر رک جاتا ہے کہ پہلا جوڑا' جس سے یہ سلسلہ آگے چلا تھا' جس سے قبل کوئی اور جوڑا نہیں تھا' وہ کس طرح وجود میں آگیا۔ ذہنِ انسانی وہاں جا کر رکتا ہے۔

بات دور نکل جائے گی' میں تو یہ کہونگا کہ ذہن انسانی جب پیچھے جاتا ہے تو سارے سلسلۂ کائنات میں جا کر اسے کہیں رکنا پڑتا ہے کہ پہلے یہ کیسے ہوا۔ بات چونکہ یہاں صرف پیدائش کی ہے اس لیے انسانی ذہن یہاں جا کر رکا کہ پہلا جوڑا کیسے وجود میں آیا۔ اگر چوزے انڈے سے بنتے ہیں تو انڈے تو مرغی دیتی ہے' مرغی کہاں سے آ گئی' مرغی انڈے سے پیدا ہوئی تھی تو وہ انڈہ کہاں سے آ گیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ پہلا مرد اور عورت کا جوڑا کہاں سے آ گیا جس سے پھر یہ سلسلہ آگے چلا۔ اگر جوڑے کا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر اگلا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو علم دیا گیا' وہ تو اب ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ علم پہلی بار قرآن کریم میں نہیں آیا' بلکہ تمام انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتا رہا لیکن آج ہماری قسمت یہ ہے کہ انبیائے سلف میں سے کسی کی کوئی آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے' اس میں انسانی ذہن کی آمیزش ہو چکی ہے۔ قرآن کریم اس کے متعلق بار بار کہتا ہے کہ وہ محرف ہیں اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ خود وہ کتابوں والے بھی اب اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں اصل میں وہ نہیں ہیں' جو ان کے انبیائے کرامؑ کو ملی تھیں' ان میں انسانی آمیزش ہے۔ اب ذہن انسانی اس مسئلے کو کیسے حل کرتا کہ پہلا جوڑا کیسے آ گیا؟ چنانچہ انسانی دماغ کے پاس ماسوا اس کے کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ کسی طرح سے کوئی ایک جوڑا پیدا کرتا۔

ہندوؤں نے شیو جی اور پاروتی کا جوڑا پیدا کر لیا کہ صاحب! برہما نے پیدا کر دیا' چلیے صاحب! مسئلہ حل ہوا۔ آپ کے ہاں سامی النسل میں انبیائے کرامؑ ہیں' جن کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے۔ ان کی سابقہ کتابوں کے مجموعے کا نام تورات رکھا جاتا ہے' جسے عہد نامۂ عتیق (OLD TESTAMENT) کہتے ہیں۔ بائبل کا پہلا مجموعہ وہی ہے۔ یہودیوں کی کتابِ مقدس بھی وہی ہے۔ یہ کتابوں کا مجموعہ ہے' عیسائی بھی اس کو مانتے ہیں۔ اس کی ابتدا ''کتاب پیدائش'' (Genesis) سے ہوتی ہے۔ انہوں نے جوڑا پیدا کرنے کے بجائے ایک مرد بنایا۔ یہ تورات میں ہے کہ اللہ میاں نے کچھ مٹی منگوائی' اس کا ایک پتلا بنایا اور اس پتلے میں روح پھونکی تو وہ مرد بن گیا۔ اب اُس بنانے والے نے' اس افسانہ گو نے' مرد بنایا تو آگے پھر اس کی دقت پیدا ہوئی کہ مجھے جوڑا بنانا چاہیے تھا' اکیلے سے تو کام نہیں چل رہا۔ پھر اس نے اس کی پسلی کو چیرا' اس میں سے اس کے جوڑے' یعنی عورت کو نکالا۔ اور جب وہ عورت آ گئی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے شکر کا کلمہ ادا کیا ہوگا۔ تھا کام تو مشکل مگر آسان نظر آیا۔ کسی طرح سے یہ جوڑا بن گیا۔ اور سلسلہ آگے چل پڑا۔ یہ تورات کا قصہ ہے۔

## قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے ہمارے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی نوعیت

یہ قصہ تورات ہی میں رہتا تو ہمارے لیے بہت آسان تھا کہ یہ محرف کتب ہیں' ان میں خدا کی بتائی ہوئی بات تو نہیں ہے' ذہن

انسانی نے اس زمانے میں ایسا سمجھا' اس نے لکھ دیا' ہم پر کونسی پابندی عائد ہوتی ہے کہ ہم بھی اسے صحیح مانیں لیکن مشکل یہ آ گئی کہ آگے قرآن کریم کی جو تفاسیر لکھی گئیں ان میں بھی یہی واقعہ درج کر دیا گیا۔ اس درمیان میں' میں قرآن حکیم کو تو الگ رکھتا ہوں' اس پہ تو ہم بعد میں آئیں گے' ہوا یہ کہ قرآن کی ان آیات کی تفسیر میں' جن میں انسان کی پیدائش کا ذکر ہے' انہوں نے یہ قصہ درج کر دیا۔ ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ صاحب! ٹھیک ہے' اپنے زمانے میں انہوں نے کچھ ایسا ہی سمجھا ہوگا' ہم پہ اسکی کیا پابندی آتی ہے کہ ہم بھی وہی کچھ سمجھیں لیکن اس کے لیے ہمارے راستے میں دو دیواریں کھڑی کر دی گئیں: ایک تو یہ کہ انہوں نے جو کچھ لکھا' یہ نہیں کہا کہ ہم ایسا سمجھتے ہیں' بلکہ کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے اور یہ ہے وہ بنیاد جہاں ہمارا مروجہ اسلام بھی اسی سطح کے اوپر آ کر کھڑا ہو گیا جس سطح پہ وہ دیگر تمام مذاہب تھے جو ذہن انسانی کے تراشیدہ تھے۔ یعنی وہاں خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہ تھی' یہاں اسلام میں خدا کی کتاب موجود ہونے کے باوجود یہ دین' مذہب بن گیا۔ اور دوسرا یہ کہ اگر اسلاف نے اپنی طرف سے بھی کچھ لکھا ہے' تو ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے۔

## اپنے اپنے تصورات کے تحت لکھی گئیں یہ تفاسیر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی گئیں

آپ کے ہاں یہ جو (امام طبریؒ کی) پہلی تفسیر لکھی گئی ہے' اس کے لیے کہا یہ گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ ذرا سوچیے کہ یہ کتنی بڑی پابندی عائد ہو گئی۔ اب اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے تو بہر حال ایک مسلمان کا تو اس کے سامنے سر جھک جائے گا' دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی خیال نہیں ابھر سکتا کہ حضور ﷺ کا سینہ مہبط[1] وحی ہے' سب سے پہلے وحی حضور ﷺ پہ نازل ہوئی' آپ ﷺ نے اس وحی کی یہ تشریح فرما دی۔ اب کس مسلمان میں جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ کہے کہ صاحب! یہ تشریح صحیح نہیں ہو سکتی (معاذ اللہ معاذ اللہ) لیکن ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ رسول ﷺ نے ان الفاظ میں اپنی طرف سے اپنا کوئی ارشاد اُمت کو دیا ہی نہیں ہے۔

یہ جنہیں آپ روایات کہتے ہیں' جیسا کہ کئی دفعہ اس مجلس میں اس کا ذکر آ چکا ہے' اڑھائی سو سال کے بعد' تو بخاری شریف کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا اور وہ بھی بغیر کسی قسم کے پہلے تحریری ریکارڈ (Written Record) کے' تحریر میں کچھ بھی محفوظ نہ تھا' یہ سب زبانی روایتیں چلی آ رہی تھیں۔ اڑھائی سو سال کے عرصے میں مختلف مذاہب کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے: عیسائی' یہودی' ایرانی' مجوسی' اس دور میں وہ سب آ گئے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے پھر یہ افسانے نکلے' کس کس نے بنائے۔ سازش یہ کی گئی کہ جس نے بھی

---

[1] مہبط (ع۔ و۔ مذکر) اُترنے کی جگہ

کوئی افسانہ تراشا' قال رسول اللہ پہلے لکھا' اوکما قال رسول اللہ آخر میں کہا' اور وہ آپ کے ہاں حدیثِ رسول بن گئی صاحب! دشواری پیدا ہوگئی۔ مفسرین نے سب کچھ یہ کہہ کر لکھا کہ حضورﷺ نے یہ فرمایا' فلاں روایت میں یہ آیا' فلاں حدیث میں یہ لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی آگے ایک اور خیال آیا' جہاں کہیں ایسی بات تھی کہ جو کچھ انہوں نے خود لکھا' اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ جو کچھ اسلاف کہہ گئے ہیں' اس سے ہم ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے' اسی کی پابندی ہمارے اوپر لازم ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کو خوب سمجھا' سوچا' احادیث ان کے سامنے تھیں' ان کا دور ہماری نسبت نبی اکرمﷺ کے زمانے سے زیادہ قریب تھا اس لیے انہوں نے جو کچھ کہا ہے' اس کے بعد ہم کچھ سوچ وفکر نہیں کر سکتے۔

میرے ایک دوست نے اگلے دنوں بڑی دلچسپ بات کی۔ کسی ایسے ہی صاحب سے وہ بات کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ قرآن کریم کے اندر کچھ غور وفکر کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے جواباً کہا کہ صاحب! ہمارے اسلاف غور وفکر کر چکے' اب ہم مزید نہیں کر سکتے۔ دوست نے کہا کہ قرآن کریم نے تو قدم قدم پہ ہمیں یہ کہا ہے کہ غور کرو' فکر کرو' تعقل کرو' تدبر کرو' شعور سے کام لو۔ اُس نے کہا کہ یہ ان کے لیے تھا۔ انہوں نے کہا کہ نماز پڑھو' روزہ رکھو' زکوٰۃ دو' حج کرو' یہ تو ہمارے لیے ہے اور غور کرو' فکر کرو' تدبر کرو یہ ان کے لیے تھا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے: ''کھان پین نوں بھاگ بھری' دھون بھنان نوں جمعہ خان''۔ جہاں یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ قرآن کے احکام کے لیے جو غور وفکر' تدبر و تعقل اور شعور تھا' یہ ان کے لیے تھا' ہمارے لیے یہ سب کچھ نہیں ہے تو وہاں یہی کچھ ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ غلط ہے۔

## فکرِ قرآنی پر غور وفکر نہ کرنے والوں کا نتیجہ جہنم ہے اور پہلے انسان کی پیدائش پر ''کتابِ پیدائش'' کی افسانہ سازی

قرآن حکیم قیامت تک کے لیے ہے اور ہر انسان کو دعوت غور وفکر دیتا ہے۔ اور جو غور وفکر سے کام نہیں لیتے' ان کے متعلق کہتا ہے کہ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ❶ (7:179) یہ جہنم میں جانے والے انسان ہیں۔ آخرت کا جہنم تو وہاں جا کر دیکھیں گے' یہاں جہنم تو ہمارے سامنے ہے کہ جو قوم ہزار برس سے غور وفکر چھوڑ دے' وہ کس قسم کے جہنم میں مبتلا ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دو باتیں ہمارے راستے میں حائل ہوئیں: ایک تو یہ کہ انہوں نے جو کچھ لکھا' اس کے متعلق کہہ دیا کہ رسول اللہﷺ نے ایسا فرمایا' اس کے بعد گردنیں جھک جاتی ہیں۔ اور پھر دوسرا یہ ہے کہ اسلاف نے اگر اپنی طرف سے بھی کچھ لکھا ہے' تو ہم ان کے

---

❶ انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ۔۔۔ مہذب اقوام ہوں' یا جاہل بادیہ نشین۔۔۔ وہ زندگی' جہنم میں گزارتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 385 تا 386)۔

خلاف کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔

اب یہ خاص مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ اوّلین انسان کی پیدائش کیسے ہوگئی' میں نے عرض کیا کہ تورات کی کتاب پیدائش (GENESIS) میں یہ لکھا ہے کہ خدا نے مٹی سے آدم کا ایک پتلا بنایا اور اس کی پسلی سے پھر اس کی بیوی پیدا کی۔ ہمارے ہاں آپ دیکھیے کہ جب افسانہ آگے بڑھتا ہے تو اس میں زیب داستاں کے لیے کچھ اور بڑھانا پڑتا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی افسانے کی نقل ہو تو اس دوسرے افسانے کی کچھ قیمت نہیں ہوتی' کچھ تو اس میں زیادہ ہونا چاہیے۔ وہاں اتنا ہی تھا لیکن ہمارے ہاں کی تفاسیر میں یہ بہت کچھ لکھ کر زیبِ داستاں کے لیے بڑھا دیا۔

## ہماری تمام مروجہ تفاسیر امام طبریؒ کی بیان کردہ تفسیر کا پرتو ہیں اور تورات ہی میں بابا آدم اور اماں حوّا کا قصہ

حافظ عماد الدین ابوالغدا اسمٰعیل بن عمر کثیر بن ضوء بن کثیر (774-700ھ) کی تفسیر ابن کثیر (4 جلد) ہمارے ہاں بڑی مشہور تفسیر ہے' اصل میں طبریؒ (ابوجعفر محمد بن جریر الطبری: 923-838ء) کی پہلی تفسیر اسی کا ملخص ہے اور اصل تو یہ ہے کہ ہماری تمام تفاسیر درحقیقت امام طبریؒ کی پہلی تفسیر سے ماخوذ ہیں۔ یہ مفسّرین اپنے اپنے انداز کے مطابق بات کو پھیلاتے چلے گئے ہیں' جب کہ سب نے ان کی نقل کی۔ تاہم انہوں نے یہ انتظام کر دیا کہ اپنے کیے ہوئے کو رسولؐ کے فرمان سے منسلک کر دیا۔ چنانچہ آپ لوگوں کے ذہن اس طرح سے جامد ہو کر رہ گئے۔ تفسیر ابن کثیر سے' میں ایک دو روایتیں آپ کے سامنے پیش کرونگا۔

پہلے تو اس میں لکھا ہے کہ فرشتے بدھ کے دن' جنّات جمعرات کے دن' آدم جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ یہ آپ سوچیے کہ یہ بدھ اور جمعرات اور جمعہ تو انسانوں کے دور کی چیز ہے۔ ہمارے مفسرین سے پوچھیے تو سہی کہ آپ کا ذریعۂ علم کیا ہے کہ فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے اور جنّات جمعرات کے دن پیدا ہوئے' آدم جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ سوال یہ تھا کہ پیدا کیسے ہوئے۔ لکھا ہے کہ پھر آدمؑ کی مٹی اٹھائی گئی۔ یاد رکھیے! ان کے نزدیک حضرت آدمؑ نبی تھے۔ ان کی مٹی اٹھائی گئی' جو چکنی تھی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا' تب اس سے حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ اب تورات میں اضافہ ملاحظہ فرمایئے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا کہ آیا وہ مٹی بجتی تھی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو' پھر اس نے دیکھ لیا کہ یہ اندر سے کھوکھلی ہے۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے نکل جاتا اور اسی طرح سے وہ آتا جاتا تھا۔ پھر جب اللہ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی رہی' خون گوشت بنتا گیا۔ جب ناک تک روح پہنچی تو وہ اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لیے اٹھ نہ سکے۔ جب سارے جسم میں روح پہنچ

گئی اور چھینک آئی تو کہا کہ **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ**۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں کہا کہ یرحمک اللہ۔ یہ مروجہ تفسیر ہے اور ہمارے لیے دقت یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔

پھر اس کے بعد ان کی بیوی کا پیدا کرنا ہے۔ آپ تن تنہا تھے' ایک دن آپ پر نیند کا غلبہ ہوا تو آپ کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جاگ کر انہیں دیکھا تو پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لیے پیدا کی گئی ہوں۔ چلیے' صاحب! تورات نے تو یہاں تک کہنے کے بعد مسئلہ چھوڑ دیا کہ سلسلہ آگے چلے گا۔

## انسانی پیدائش کے سلسلہ میں احتشام الحق تھانویؒ کا درسِ قرآنِ حکیم اور بسیط حقائق پر قرآن کا عملی انداز

اب ہمارے سامنے ایک شرعی مسئلہ آ گیا کہ ان کا نکاح بھی تو ہونا چاہیے۔ اگر یہ سلسلہ بغیر نکاح کے آگے چلے تو ''وہ'' کیا ہو؟ ''وہ'' عیسائیت میں آدم حوّا کا پہلا گناہ (Original Sin) کہا تھا' وہ بھی آدم کے اس (اختلاط) کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! ہم تو ایسا لاینحل مسئلہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس کا خیال کچھ بعد میں پیدا ہوا۔ مولانا احتشام الحق صاحبؒ (1943-1863ء) نے اپنے درس میں یہ فرمایا تھا۔ یاد رہے! اس زمانے میں ریڈیو پہ درس قرآن ہوا کرتے تھے۔ مولانا احتشام الحق تھانویؒ کے نزدیک نکاح کی بڑی اہمیت تھی۔ انہوں نے اس میں کہا کہ حضرت آدمؑ نے جب اس عورت کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے چھو نہیں سکتے جب تک اس کا مہر نہ ادا کیا جائے۔ حضرت آدمؑ نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد ﷺ اور آلِ محمد ﷺ پر دس بار درود بھیجیں۔ حضرت آدمؑ نے دس مرتبہ محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین نکاح قائم ہوا۔ اور اس جمعہ کے آخری حصے میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباسِ زینت سے حضرت حوّا کو آراستہ کر کے' دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔ چلیے' صاحب! جوڑا بھی بنا' نکاح بھی ہوا۔ انسانی نقطۂ نگاہ سے بات طے ہوگئی' شرعی نقطۂ نگاہ سے بھی مسئلہ حل ہوگیا۔ اب آپ گھبرایئے نہیں' نہ ہمیں گھبرانے کی کوئی ضرورت ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بات اگر ان حضرات کے اپنے ہی خیال تک ہوتی تو اس میں ہمارے لیے کوئی دشواری نہیں تھی۔

قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کے متعلق بتایا یہ ہے کہ **سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ** (41:53) ہم اپنی نشانیاں عالمِ انفس اور آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے' جوں جوں کسی پسِ پردہ نشانی کے اوپر پڑا ہوا پردہ اٹھے گا' تو اس سے قرآن کریم کا کوئی ایک دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآن

کریم نے جو کچھ کہا ہے' وہ حق ہے یعنی زمانے کے تقاضوں سے علمِ انسانی جتنا بڑھتا چلا جائے گا' اس علم کی رو سے جو حقائق منکشف ہونگے' ان میں سے ہر حقیقت قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتی چلی جائے گی۔قرآن کریم کسی ایک دور میں سمجھا نہیں جا سکتا۔

میں یہ عرض کردوں کہ ایک چیز تو قرآن کریم کے احکام یا اس سے زندگی کے سفر میں ہدایت یا راہنمائی لینا ہے۔وہ تو ایسی صاف واضح بیّن متعین ہے اور بڑی آسان ہے۔کہا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:22) راستہ چلنے کے لئے' یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم ٹھیک جارہے ہیں یا غلط جارہے ہیں' قرآن کریم کچھ مشکل کتاب نہیں۔کہا کہ یہ بڑی آسان کتاب اور واضح کتاب ہے' یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے۔اس کی ہدایت اس کے احکام ہیں۔اور اس میں سراسر حقائق بیان ہوئے ہیں۔حقائق کی کیفیت یہ ہے کہ یہ علم کی رو سے سمجھے جاسکتے ہیں اور حقائق کی کیفیت یہ ہے کہ اصل چیز تو اس کی ہدایت ہے۔ہدایت کے ضمن میں وہ اس انداز سے کہیں تشبیہات لاتا ہے' کہیں تمثیلات لاتا ہے' اسے جو بسیط صداقت (Abstract Truth) ہیں' وہ بیان کرنے ہوتے ہیں' انہیں تو بہر حال ایک علمی انداز سے ہی بیان کیا جاسکتا تھا۔

## قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق کا علمِ انسان کے بلند ہونے سے تدریجاً واضح ہوکر حق ثابت ہوتا چلا جاتا ہے اسی لیے فکروتدبر کا حکم ہے

اس میں بیان ہونے والے حقائق کے متعلق ہے کہ جوں جوں علم انسانی بڑھتا چلا جائے گا' قرآنی حقائق ابھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔لہٰذا قرآنی حقائق کسی ایک دور میں نہیں سمجھے جاسکتے' ارتقائی طور پر' تدریجاً یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔اور یہ ہے وہ بات کہ ہر دور کے انسان کو غور اور فکر وتدبر وشعور کی تاکید کی گئی ہے۔یہ سلسلہ لامتناہی ہے' قرآن حکیم بھی قیامت تک کے لیے کتابِ محفوظ ہے' کائنات میں بکھرے ہوئے حقائق بھی اپنی اپنی جگہ پر کتاب مکنون ہیں۔علمِ انسانی بلند ہوتا ہوا' ایک ایک حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھاتا چلا جائے گا' قرآن حکیم کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچتا چلا جائے گا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔تدبر اور تفکر کا حکم' دنیا کے آخری انسان کو بھی اسی طرح سے ہے' جیسا کہ صدر اول کے مسلمانوں کے لیے تھا۔اس سے پہلے اگر یہ چیز سمجھ میں نہیں آئی تھی تو اس کے لیے ہمارے یہ بزرگ قصوروار نہیں ہیں' انسانی علم کی سطح ابھی اتنی اونچی نہیں ہوئی تھی۔اور اگر آج یہ حقائق ہماری سمجھ میں آگئے ہیں تو اس میں کوئی ہماری کاریگری نہیں ہے' ہمارے دور میں علم انسانی اتنا بلند ہوگیا ہے کہ کل تک جو چیزیں بالکل سربستہ راز نظر آتی تھیں' آج حقیقتیں بن کر ہمارے سامنے آگئی ہیں۔اس میں اگر کوئی ہماری خوبی ہے تو وہ اتنی ہی ہے کہ قرآن حکیم نے جو ہمیں غور وفکر اور تدبر وشعور

سے کام لینے کا حکم دیا تھا' ہم نے اس سے کام لیا۔علمِ انسانی نے جو کچھ منکشف کیا تھا' ہم نے اس کی روشنی میں قرآن کی آیات پر غور کیا اور حقیقتیں ہمارے سامنے آ گئیں۔اس اعتبار سے ہم اسلاف سے آگے ہیں' ہم آگے کیا ہیں' ہمارا زمانہ وہاں سے آگے ہے' علم انسانی کی سطح اس سے اونچی ہے۔یاد رکھیے! ہر دَور میں علم انسانی کا جو رڈہ ❶ رکھا جاتا ہے تو اس سے علم کی دیوار اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہمیں دیا جانے والا یہ تصور کہ پہلا دور سب سے اونچا تھا' حقیقت نہیں ہے' یہ حقیقت کے خلاف ہے۔جوں جوں زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے' وہ دَور پست ہوتا چلا جاتا ہے۔انسانیت ارتقاء سے گزر رہی ہے' علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور علم کے بڑھنے کی تو کوئی حد بھی نہیں ہے۔وہ ذات اقدس و اعظم ﷺ جو ہمارے ایمان کے مطابق علم کی انتہائی بلندیوں پر تھی' ان حضور ﷺ کی بھی قرآن کریم میں یہ دعا مذکور ہے کہ **رب زدنی علمًا** (20:114) یااللہ! میرے علم میں اور اضافہ کرتا جا۔اگر حضور ﷺ بھی علم کے اضافے کی دعائیں مانگتے ہیں تو اور کون ہو سکتا ہے ان کے بعد' جو یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! اب علم کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ تو یہودیوں کے راہب کرتے تھے کہ ''ہمارے پیالے بھر چکے' اب اس میں ایک قطرہ کی بھی گنجائش نہیں ہے' ہمارے دل لپیٹے ہوئے ہیں' اب اس کے اندر کوئی شے نہیں جا سکتی''۔

قرآن حمید نے ہمیں فکر و تدبر سے کام لینے کا حکم دیا ہے' حضو ﷺ کا جو اعلم الناس ہیں وہ اسوہ یہ ہے کہ زندگی کے آخری سانس میں بھی دعا مانگتے ہیں کہ یااللہ! میرے علم میں اضافہ فرما دے۔مومن کا تو شعار یہ تھا کہ وہ علم کی دنیا میں بھی انسانیت کی امامت کرتا ہے' سب سے آگے جاتا ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ اگر آج ہم اس قسم کے حقائق کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں تو اس میں انفرادی طور پر ہماری کچھ کاریگری نہیں ہے۔علم انسانی آگے بڑھ گیا ہے۔اس کی روشنی میں قرآن حمید کے حقائق خود اجلے' نکھرے ہوئے موتیوں کی طرح سامنے آتے ہیں۔اب دیکھیے کہ یہ جو مشکل ترین مسئلہ تھا کہ پہلا جوڑا کیسے وجود میں آ گیا' اس کی ابتدا کس طرح سے ہوگئی' آج سائنس کے انکشافات دو اور دو چار کی طرح اسے ثابت کر رہے ہیں۔مرد اور عورت یا نر اور مادہ کے اس طرح کے جوڑوں کو' جیسا ہمارے سامنے آج ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ اس طرح سے زندگی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔

## آدم کی پیدائش کے سلسلہ میں سائنس کے انکشافات: مٹی اور پانی کے ملاپ سے پیدا ہونے والے جرثوموں کی نوعیت

یہ بات ذرا مشکل اور لمبی سی بھی ہے۔درس میں' میں اس تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا' اس کا ملخص' جو اس وقت تک ہمارے ہاں

---

❶ رڈہ (ف۔ا۔مذکر) ایک چنائی کے بعد دوسری چنائی کے لیے اینٹ رکھنا۔

سائنس حقیقت ثابتہ کی طرح سامنے لے آئی ہے' یہ ہے کہ ارض پر Inorganic Matter (غیر نامیاتی مادہ) تھا یعنی وہ مادہ تھا جس میں زندگی نہیں ہوتی۔ کہا کہ اس میں زندگی نہیں تھی' پانی کے چھینٹے سے زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ پانی جب مٹی کے ساتھ ملتا ہے اور اس میں حرارت پہنچتی ہے تو وہ خمیر اٹھتا ہے جسے ہم Fermentation (عملِ تخمیر) کہتے ہیں۔ یہ جو ہڑوں کے کنارے پانی جمع ہو جائے تو اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے کنارے پر وہ کیچڑ سوکھتا بھی ہے اس میں بساند ❶ بھی آتی ہے۔ یہ جسے آپ Fermentation (عملِ تخمیر) کہتے ہیں اس سے بساند آتی ہے۔ اس کے اندر اتنے باریک جرثومے ہوتے ہیں جن کو Cells ❷ کہتے ہیں' وہ ابھر آتے ہیں۔ یہ مٹی کا خلاصہ ہوتا ہے یعنی اس مٹی میں سے کچھ وہ سالٹ یا اس قسم کی چیزیں کھینچ کر آتی ہیں' پھر پانی کی نمی اس میں ملتی ہے' سورج کی حرارت سے وہ آگے بڑھتی اور اسے پہلا لائف سیل کہا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا جرثومہ سامنے آتا ہے جس میں زندگی ہوتی ہے۔ یہ خدا کی تخلیق کا پروگرام ہے کہ اس نے ایسا بنایا۔

یہ پہلا جرثومہ جو زندگی یا لائف سیل ہے' آج بھی ہے' اُسے آج بھی اس طرح سے مٹی اور پانی کے امتزاج سے' تھوڑی سی حرارت بہم پہنچا کر' آپ مائیکروسکوپ (Microscope) کے نیچے دکھا سکتے ہیں۔ نہ مٹی الگ چل رہی ہوتی ہے' نہ پہلے سے اس کیچڑ میں کوئی چیز ہوتی ہے لیکن اس کے بعد ''آ جیہڑا کیندے نیں کربُل کربُل کردے سن اودے وچ'' ❸۔ وہ ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ہمارے آپ کے سامنے بھی آ جاتے ہیں۔ یہ جو پھل سڑ جاتے ہیں' یہ ان میں بھی آپ دیکھتے ہیں' گوشت سڑ جاتا ہے آپ اس میں بھی دیکھتے ہیں' ان کی وہ بڑی موٹی ہیئت ہوتی ہے جو یوں آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں حالانکہ آغاز میں وہ جرثومے بڑے ہی باریک ہوتے ہیں۔ ہمارا سارا جسم ان جرثوموں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔

## سیل کا دو حصوں میں پھٹنا اور انسان کے ہر سانس میں' ایک سیکنڈ میں' پچاس لاکھ جرثوموں کی ہلاکت کا باعث بننا

عزیزانِ من! یہ ایک ایسا عجیب سلسلہ ہے' کبھی ارتقا کے موضوع پر آؤنگا تو قرآن مجید سے ایک ایک آیت سامنے لا کر آپ کو بتاؤنگا کہ آج یہ جو ہم انسانوں کی صورت کا سلسلہ ہے' یہ ہم یوں مکمل نہیں ہو گئے ❹۔ آج بھی ہم ہر سانس میں مرتے ہیں' ہم ہر سانس میں

---

❶ بِساند۔ بُو' گوشت یا مچھلی وغیرہ کی بُو۔

❷ خلیہ تخز مایہ سے بنے ہوئے تمام جانداروں کے جسم وعمل کی بنیادی اکائی یا نفسِ واحدہ جس میں ایک مرکزہ اور خلیہ مائی ہوتا ہے اور جو جانوروں میں نیم سرایت پذیر جھلی کے اندر اور پودوں میں خلیاتی دیواروں سے محصور ہوتا ہے۔

❸ یہ وہی ہے کہ جسے کہتے ہیں کہ وہ ڈھیروں کی تعداد میں اس میں متحرک رہتے ہیں۔

❹ وہ سلسلہ مختصر لفاظ میں یہ ہے:

(1) صفحۂ ارض پر زندگی (Life) کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

بنتے ہیں۔ایک سیکنڈ میں قریب پچاس لاکھ جرثومے (Cells) ہمارے اندر تلف ہوتے ہیں اوراس کی جگہ نئے جرثومہ بنتے ہیں۔ یہ جو لائف سیلز ہیں ان کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے۔

وہ سیل ایک ہی ہوتا ہے' اس کے اندر ابھی اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جیسا ایک اور سیل پیدا کر لے۔ یہ واحد ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے اندر وہ ایک جامع چیز ہوتی ہے لیکن اس میں ابھی آگے کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔اس کے بعد وہ کچھ عرصہ اور حرارت وغیرہ سے مزید غذا لیتا ہے' پھر وہ جوشِ نمود سے پھٹ جاتا ہے' اس کے خود دو حصے ہوجاتے ہیں۔ان کو سسٹر سیلز (Sister Cells) کہتے ہیں یا ڈاٹر سیلز (Daughter Cells) بھی کہتے ہیں۔ان میں سے ایک حصے کو آپ مذکر کہیے جبکہ دوسرا حصہ مؤنث ہوتا ہے' ایک نر (Spermatozoon) ہوتا ہے اور ایک مادہ (Ovum) ہوتا ہے۔آج تک کوئی نہیں کہہ سکا کہ وہ پہلا سیل' جس کے اندر مختلف قسم کی خصوصیات نظر نہیں آتی تھیں' جب وہ خود ہی جوشِ نمود سے دو حصوں میں پھٹتا ہے یا بٹتا ہے تو ان دونوں میں الگ الگ خصوصیات کیوں پیدا ہوتی ہیں' بس یہ ہوتا ہے۔ لیجیے زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے پہلا جوڑا وجود میں آ گیا اور اس سے آگے بڑھنا شروع ہوا۔مٹی اور پانی کے امتزاج سے وہ سیل (خلیہ) ❶ تو بنتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ واحد ہوتا ہے' ایک ہوتا ہے' اس کے اندر دو کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ جب پھٹتا ہے تو اس کے اندر جوڑا بنتا ہے' ان جوڑوں (Pairs) سے پھر بات آگے چلتی ہے۔

## جرثوموں کے ارتقائی منازل سے استقرارِ حمل تک

زندگی جرثوموں (Cells) سے شروع ہوئی ہے۔ یہ مختلف ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی' قرآن کے الفاظ میں' ایک ایک دور

---

(بقیہ پچھلے صفحہ کا نوٹ) (2) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اوّلین کو پیکر عطا ہوا۔
(3) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہوکر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔
(4) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔
(5) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے ''تخلیق بذریعہ تناسل'' کہتے ہیں یعنی حیوانی سطحِ زندگی۔
(6) حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس اور طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بہ منزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔
(پرویزؒ: ابلیس وآدم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1983' ص۔4)

❶ Cell (خلیہ) مرکب ہوتا ہے مادہ' خمیر (Nucleus) اور پیکر (Cell-Body) سے۔ان میں ایک لیس دار مادہ (Nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لیے ہوتا ہے۔حیات کا یہ خلیہ (Cell)' نقطۂ آغاز وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں (پرویزؒ: ابلیس وآدم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1983' ص ص۔ 10,9)۔

(Period) جو پچاس پچاس ہزار ❶ سال کا بھی تھا' آگے بڑھتی گئی' پیکر بدلتی گئی۔ پانیوں میں پہلے ابتدا مچھلی وغیرہ ❷ کی شکل میں ہوئی' ان میں سے کہیں پانی نے' کسی کو لہر کے ساتھ بہا کر خشکی پر پھینکا' کہیں پانی پیچھے ہٹ گیا۔ انہوں نے اپنے نئے Environment (ماحول) میں زندہ رہنے کے لیے تگ و دو کی' کچھ پروں والے ہوگئے' کچھ رینگنے والے ہوگئے' اور کچھ پاؤں پر چلنے والے پیدا ہوئے' یہ سارے ❸ بنے' میں قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ کیے جا رہا ❹ ہوں۔ عزیزانِ من! پھر یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ یہ وہی ہے جسے تولید (Procreation) کہتے ہیں' جسے استقرارِ حمل کہتے ہیں' یہ ان میں بھی ہے جنہیں میمل (ممالیہ جانور) دودھ پلانے والے ❸ کہتے ہیں' یہ قرآن مجید کے الفاظ ہیں کہ ان کے ہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہوا۔

## زندگی مختلف مراحل و مدارج سے گزرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں نمودار ہوئی: مبداء سے پیکر تک

اور پھر اس طرح سے جب یہ سلسلۂ نر و مادہ' حیوانات میں آیا تو اگلی بڑھتی ہوئی شکل پیکرِ انسانی میں جلوہ گر ہوگئی اور یہ سلسلہ پھر آگے جاری ہے۔ سائنس کے انکشافات اس حد تک آپہنچے ہیں۔ یہ چیزیں اب ان کے ہاں نظری نہیں رہ گئیں' ٹھوس حقائق بن گئی ہیں۔ اور حق تو کہتے ہی اس کو ہیں جو محسوس طور پر ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے۔ یہ چیزیں حق بن گئی ہیں' دیکھی جا سکتی ہیں' دکھائی جا سکتی ہیں کہ یوں ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ تمام جانداروں کی کڑی در کڑی لیتے چلے جاتے ہیں اور پھر ان پر باری باری تحقیق کر رہے ہیں وہ فاسلز (Fossils) ❺ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو زمین کے نیچے یخ بستہ تہوں کے

---

❶ دیکھیے (70:4)

❷ ماضی کے کسی ارضیاتی دور کے پودے یا جانور کے ڈھانچے یا بقیہ آثار جو زمین کی سطح یا طبقات میں سے دریافت ہوں' متحجر ہو چکے ہوں وہ Fossils (فوصل) کہلاتے ہیں۔

❸ اس کے لیے دیکھیے (24:55)۔ جو اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہیں مثلاً ایسے بہت سے غیر فقری چھوٹے چھوٹے حیوانات جن کے اعضا کے بغیر جسم بڑے نازک اور مطول ہوتے ہیں' ان میں کینچوے' چپٹے کیڑے شامل ہیں؛ بہت سے چھوٹے چھوٹے زمین پر رینگنے یا چھید کرنے والے کیڑے مکوڑے' سنڈیاں' لاروے یا جہازی حشرات' وہ جاندار جو حشرات سے شکل وصورت میں مشابہ ہوں اور ریپٹائلز (Reptiles) وغیرہ۔ رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی۔

❹ اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: ابلیس و آدم (انسان ص ص۔ 2 تا 36)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1983۔

❺ جو قارئین ''شجرِ ارتقا کا گلِ سرسبد'' (Tree-like Pattern of Evolution) سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بڑی ہی دلچسپ بھی ہے اور قرآنِ کریم سے قریب تر بھی لاتی ہے:

Wadud, Abdul: Phenomena of Nature and The Quran, Khalid Publishers, Lahore, 1994.

نیچے آ گئے تھے' یہ ان جانوروں کی ہڈیوں کے ڈھانچے نکال رہے ہیں' ان پر تحقیقات کر رہے [1] ہیں۔ اور ہر تحقیق جب یقین تک پہنچتی ہے تو معلوم ہے کہ وہ کیا کہتی ہے؟ وہ یہ کہتی ہے کہ قرآن حمید کی یہ آیت حقیقت ہے۔

عزیزانِ من! میں نے یہ مختصر طور پر عرض کیا ہے کہ ذہن انسانی کی افسانہ گری نے اس مسئلے کو کیسے الجھایا اور اُدھر سائنس کے انکشافات ہمیں کہاں تک لے آئے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ مجھے سمجھنا ہو' میرے حقائق کو سمجھنا ہو' تو انفس و آفاق میں بکھری ہوئی نشانیوں پہ غور کرو۔ ان سائنسدانوں نے آفاق میں بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کیا' تدبر کیا' تحقیق کی' تجسس کیا' انکشافات کیے' تو اس نتیجے پہ پہنچے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ جب بھی کوئی حقیقت تمہارے سامنے آئے گی تو وہ میرے بیان کردہ دعوے کی تصدیق کرے گی۔ سائنس نے ہم سے کہا کہ زندگی کی ابتدا Inorganic Matter (غیر حیات' غیر نامیاتی مادے) سے ہوئی' اس مادے سے جس کے اندر زندگی نہیں تھی۔ یہ وہی ہے جسے مٹی (Clay) کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ **وَ بَدَ اَخلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ** (32:7) انسانی پیدائش کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ غور فرماتے جایئے! جب آفاق کی نشانیاں بے نقاب ہو کر سامنے آتی چلی جائیں تو وہ کس طرح قرآن کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتی چلی جاتی ہیں۔ زندگی کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔

آپ کے ہاں Theory of Evolution (نظریۂ ارتقا) ہے کہ زندگی کیسے شروع ہوئی اور اس پیکر میں کیسے آئی۔ پہلا Sentence (جملہ) یہ ہوتا ہے کہ Inorganic Matter (غیر نامی مادے) کے اندر تو یہ بات نہیں تھی لیکن اس کی جو ابتدا ہے' وہ Inorganic Matter (غیر نامی مادے) سے ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ بَدَ اَخلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ** (32:7) انسانی پیدائش کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ اب خشک مٹی کو گیلا کر کے اس کا تو پتلا ہی بنایا جا سکتا ہے' ذہن انسانی نے' جب وہ عہد طفولیت میں تھا' مٹی کا پتلا بنایا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ نہیں! یہ پتلے والی بات نہیں ہے بلکہ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ** (23:12) یہ مٹی کا پتلا نہیں بنایا' ''مٹی کے اندر زندگی پیدا کرنے والی چیزوں کا جو نچوڑ تھا ہم نے اس سے زندگی کی ابتدا کی''۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! بہت اچھا! وہ چیزیں تو اس میں تھیں تو پھر کیا از خود اس میں زندگی کی نمود ہو گئی؟ کہا کہ نہیں! یہ از خود نہیں ہو سکتی تھی **وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ** (21:30) زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے: مٹی' مٹی کا خلاصہ (بے جان مادہ)' پانی' یہ ملے۔

ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اتنا کہہ کر کہ **وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ** (21:30) (ہم نے پانی سے زندگی کی نمود کی)'

---

[1] ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم کی کتاب ''قرآن اور مظاہر فطرت'' (Phenomena of Nature and the Quran) کے صفحہ 201 پر دی گئی تصویر Some Fossilized Exitnct Animals مچھلی سے ممالیہ جانور تک شجرِ زندگی کی عکاس ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خالص Scientific Truth (سائنسی حقیقت) ہے جسے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے فوراً بعد کہا ہے کہ **اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ** (21:30) اب بھی ایمان نہیں لاتے ہو! ایمان لانے کے لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ چلیے! مٹی، پانی اور ہوا در آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے کیا ہوا؟ کہا ہے کہ **اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ** (37:11) یہ گوندھی ہوئی جو چپچپی مٹی بنی، اس سے بات آگے چلی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیسے یہ کڑیاں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اسے سامنے رکھیے اور چارلس روبرٹ ڈارون (1809-82ء) کی کتاب "On The Origin of Species" کو لیجیے، وہ تو خیر اس کی ابتدائی کتاب تھی مگر یہ جو Pioneers (**السابقون الاولون**) ہیں ان کا انسانیت پر بڑا احسان ہے۔ ان کی ساری زندگی، آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ ایک ایک چیز کی تحقیق کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں! ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ اور جن نتائج پہ پہنچ رہے ہیں، وہ یہی نتائج ہیں کہ **طِیْنٍ لَّازِبٍ** (37:11) چپچپی مٹی سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔ پانی اور مٹی سے بنی اس چپچپی مٹی میں پھر حرارت ملی۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ **وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ**❶ (15:26) پھر اس کے اندر سڑاندسی پیدا ہوئی، سورج کی حرارت سے یہ مٹی (Clay) کچھ خشک ہوئی۔ اگر اس چیز کو پانی کے اندر ہی رہنے دیا جائے اور اس میں حرارت نہ ہو، تو پھر وہ زندگی کا جرثومہ نہیں بنتا، مٹی اور پانی ملنے کے بعد اس کو حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، حرارت کے لیے سورج کی ضرورت ہے۔ قرآن حمید نے **کَالْفَخَّارِ** (55:14) کہا ہے۔ وہ مٹی (Clay) بالکل خشک تو نہیں ہوگئی، یہ **کَالْفَخَّارِ** (55:14) یوں ہے جیسے ''گویا وہ سوکھی ہوئی ہے''۔ یہ اگر بالکل خشک ہو جائے تو پھر بھی اس میں زندگی نہیں رہتی۔ یہ **الفخار** وہی ہے جو مٹکے کا ٹھیکرا ہوتا ہے۔ پانی اور مٹی سے تو زندگی کی ابتدا ہوئی ہوتی ہے، اس کے اندر تو زندگی نہیں ہوتی۔ پانی اور مٹی کو یوں گھول دیا جائے تو اس میں بھی زندگی نہیں ہوتی۔ اس کو ملا کر جب حرارت بہم پہنچایئے تو پھر اس میں **حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ** (15:26) ہوتا ہے یعنی اس میں سے سڑاندسی پیدا ہوگی اور اس کی ابتدا کے بعد وہ حرارت سے بجنے والی ہوگی لیکن مٹکے کی طرح بجنے والی نہیں، یہ اس سے پہلے کی منزل ہے جب وہ سیاہ کیچڑ سی ہوتی ہے اور حرارت لگتی ہے۔ اب یہاں یہ **کَالْفَخَّارِ** (55:14) آیا ہے یعنی زندگی کی پیدائش کی ابتدا ایسی مٹی سے ہوئی جو سوکھ کر بجنے لگتی ہے۔

## 14 سو سال پیشتر زندگی کے مختلف مراحل کو تفصیلی طور پر بیان کرنا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہ تھی لیجیے! وہ پہلا لائف سیل آ گیا!

عزیزانِ من! ان چیزوں کی داد تو یورپ کے سائنٹسٹ دے سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چودہ سو سال پیشتر کا ایک انسان،

---

❶ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا، سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 583)۔

جس کے زمانے کو ہی Dark Ages (دورِ جہالت) ❶ کہتے ہیں اور وہ بھی عرب کی سرزمین پر جہاں علم کی روشنی ہی نہیں تھی' اس کے اندر ایک انسان جس نے چالیس سال تک لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا یہ کچھ کہہ سکتا تھا؟ دیکھیے! وہ زندگی کی ابتدا کی کڑیاں بیان کر رہا ہے اور یہاں آ کر یہ کہتا ہے کہ اس میں حرارت کی وجہ سے کچھ سوکھا ہے' وہ سوکھنے والی چیز میں فرق پیدا کرتا ہے۔ یہ اس قسم کی سوکھی ہوئی چیز ہے جیسے کہ یہ مٹکے کی ٹھیکری ہوتی ہے' وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی سوکھی ہوئی چیز ہے کہ جو سوکھی ہوئی تو ہوتی ہے لیکن اس میں زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔ یہ ہے كَالْفَخَّارِ (55:14)۔ اب لیجیے صاحب! یہ چیز جو ہمارے سامنے آئی یہ پہلا لائف سیل آ گیا' ابھی وہ ایک سے دو نہیں ہوئے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد نوعِ انسانی کو نفسِ واحدہ کی طرح ایک عالمگیر برادری کو قائم کرنا تھا اور ہے

اب کہا ہے کہ يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) اے نوعِ انسانی! خدا کے اس قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جرثومۂ زندگی ❷ سے کی۔ بات تو اس نے یہ کہنی ہے کہ تم نے تمدنی زندگی میں' آپس میں' مل جل کر رہنا ہے لیکن قرآن حکیم ہے' وہ بات یہاں سے شروع کرتا ہے۔ کیوں اس نے یہاں سے بات شروع کی؟ یہ سائنس کی کتاب تو ہے نہیں۔ اس نے آپ کو اس حقیقت پر لانا ہے کہ پوری انسانیت ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کو وہ یہ کہہ کر لاتا ہے کہ تمہاری Origin (ابتدا) بھی تو ایک نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ یہ مختلف شکلیں جو تم نے اختیار کر لی ہیں' یہ تو ماحول کے اعتبار سے' زندگی کا تقاضا ہوا' Origin (اصل) کے اعتبار سے تو سب کا جو Origin (مخرج و منبہ' مبداء) ہے' وہ ایک لائف سیل (جرثومۂ زندگی) ہے۔ اب نفسِ واحدہ کے معنی ایک لائف سیل (جرثومۂ زندگی) ہو گئے جو ابھی ❸ دو نہیں ہوا۔ کہا ہے کہ تمہاری زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ جن کے Origin (مخرج و منبہ' مبداء) کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ابھی دو (2) بھی نہ ہوں بلکہ ایک جرثومۂ حیات سے بات آگے چلے' اس کے بعد کتنی ہی شاخیں کیوں نہ پھیلیں' میں شاخوں کی بات ابھی بتاتا ہوں' (مثلاً) درخت کی ابتدا ایک ننھے سے بیج سے ہوتی ہے' اس سے کتنی ہی شاخیں پھوٹتی ہیں' اس میں کتنے ہی پتے آتے ہیں' مختلف پھول ہوتے ہیں' مختلف

---

❶ یورپی تاریخ کا تقریباً 476ء سے دسویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا زمانہ یا زیادہ عمومی الفاظ میں' نشاۃ ثانیہ تک کا دور Dark Ages کہلاتا ہے۔

❷ Life-Cell (جرثومۂ زندگی)۔

❸ یہ لائف سیل (جرثومۂ زندگی) بعد میں دو حصوں میں Spermatozoan (جرثومۂ منی) اور Ovum (بیضۂ خلیہ) میں تقسیم ہو گیا۔

پھل ہوتے ہیں تو کیا یہ وحدت نہیں ہوتی؟ کیا اس درخت کے اندر کوئی اختلاف ہوتا ہے؟ اگر جڑ نیچے سے غذا لیتی ہے تو کیا وہ آخری پتی تک نہیں پہنچاتی؟ پتی اگر ہوا سے غذا کو کھینچتی ہے تو کیا وہ ایک ایک ٹہنی کو نہیں دیتی؟ کیا ایک پتہ جو سوکھ کر درخت سے گر جاتا ہے تو اس کی ذمہ دار وہی ٹہنی نہیں ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ لگا ہوا تھا؟ نہیں' سارا درخت اس کا مجرم ہوتا ہے۔ یہ ہے وحدت کی مثال۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے یہ کہنا تھا کہ انسانیت ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس برادری کی بنیاد یہ ہے کہ اس کی بنیاد جو اصلِ وجہ ہے' جو Origin (مخرج) ہے' وہ درخت کے ایک بیج کی طرح' ایک لائف سیل (جرثومۂ زندگی) سے ہوا ہے جس سے اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ یہ ہے خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1)۔ یہاں خَلَقَكُمۡ میں کم دیکھیے! یہ نہیں کہا ہے کہ ہم نے کوئی ایک پتلا بنا دیا تھا۔ یہاں خَلَقَكُمۡ کہا ہے۔ اس سے پہلے الناس کہا ہے۔ یہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (4:1) کہا ہے' یہ پوری انسانیت سے کہہ رہا ہے۔ یہ پوری انسانیت سے خطاب ہے کہ تمہارا Origin (اصل) نفسِ واحدہ ہے۔ نفس واحدہ وہ Original Life Cell (اولین جرثومۂ حیات) ہوا جس میں ابھی دو کی تمیز (Distinction) نہیں ہوئی۔ کہا ہے کہ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا (4:1) وہی لائف سیل (جرثومۂ زندگی) تمہارے ہاں پھر Pair (جوڑا' زوج) بن گیا۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک زوج کا مفہوم

ہمارے ہاں تو زوج صرف بیوی کو کہتے ہیں۔ بیوی اس کا ترجمہ کیا تو وہ نفس واحدہ ہوئے یعنی بابا آدم اور ان کی بیوی (اماں حوا) زوج ہوئی۔ قرآن حکیم نے تو کہا ہے کہ ہم نے اس کائنات کی ہر شے کی زوج پیدا کی ہے اور آج سائنس یہ بتا رہی ہے کہ ہر شے کی زوج ہوتی ہے۔ ''زوج'' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' اُن دو حصوں کو کہتے ہیں جن میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسرا نا تمام رہ جائے۔ یہ جو نفسِ واحدہ تھا' لائف سیل تھا' وہ پھٹ کر دو❶ سسٹر سیلز (Sister Cells) کے اندر الگ الگ ہوا ہے۔ ان میں سے جو ایک سیل ہے' وہ نا تمام ہے' وہ کچھ بھی نہیں ہے یعنی وہ تنہا اب پھٹ کر بھی دو نہیں ہو سکتا۔ اب یہ ایک دوسرے کے زوج ہو گئے Complementary to each other (ایک دوسرے کے متمم) ہو گئے' ایک کے ساتھ دوسرا ملے گا تو پھر یہ ایک مکمل شے بنے گی' ویسے نہیں بنتے۔ زوج اس کو کہتے ہیں۔ وہی اس میں سے' اس کا ایک Pair (جوڑا) بن گیا۔ اس کا ترجمہ بیوی نہیں ہے۔ یہ اس میں سے ایک جوڑا (Pair) بنا ہے' جو اپنی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اب ان دونوں کے ملنے سے بات آگے چلی۔ قرآن حکیم یہاں تو ساری کڑیاں بیان نہیں کر رہا' اس کو ضرورت نہیں' کڑیاں تو اس نے پھیلا دی ہوئی ہیں۔ یہاں تک لانے کے بعد پھر کہا کہ مَا لَكُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ وَقَارًا

---

❶ یہ ہیں (1) Spermatozoan (جرثومۂ منی) اور (2) Ovum (بیضۂ خلیہ)۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (71:13-14)۔

## زندگی کی یہ موجودہ سطح کوئی آخری منزل نہیں ہے بلکہ اس کے تو کئی STAGES (مدارج) ابھی باقی ہیں: مبداء سے معاد پر استدلال

پہلے تو اسے لیجیے کہ یہ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (71:14) آیا ہے۔ تم پہلے ہی دن کسی پتلے کی شکل میں یوں نہیں کہ آدمی بن گئے تھے۔ بہت سی گردشیں دے کر، بڑی بڑی تبدیلیاں کر کے، بڑے مدارج میں سے گزار کر، تمہیں آہستہ آہستہ یہاں اَطْوَارًا تک لائے یعنی یہاں تک تمہیں طور بہ طور بدلتے ہوئے لائے۔ عربی زبان میں اَطْوَارًا کہتے ہیں کہ مختلف مدارج میں سے گزرتے ہوئے، کوئی شے جو آگے بڑھتی ہوئی چلی جائے ❶۔ کہا ہے کہ اس طرح تمہیں پیدا کیا۔ پھر دیکھیے قرآن مجید! بات یہاں یوں نظر آئی ہے کہ جیسے کوئی ایک Scientific Discovery (سائنسی انکشاف) بیان کر رہا ہے کہ تمہیں اس طرح سے مختلف حالات میں سے گزارتے ہوئے، آہستہ آہستہ، ہم یہاں تک لے آئے۔ ٹھیک ہے یہ سائنس ہے اور سائنٹسٹ صرف اتنا ہی کہے گا۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ قرآن حکیم کیا کہہ گیا ہے؟ یہ کہا ہے کہ جب ایک جرثومے سے تم مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے، یہاں تک پہنچے ہو، تو تم نے وہ کیوں سمجھ لیا کہ یہ اس کا آخری درجہ آ گیا، اس کی آخری منزل آ گئی، تمہارے ارتقا کے بعد اور آگے کچھ نہیں ہے۔ بتاؤ! کہ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا؟ کہا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (71:13) میں حیران ہوں کہ تم مجھ سے اور ''وقار'' کی توقع کیوں نہیں کرتے ہو، ابھی تو تم نے اور آگے بڑھنا ہے۔ دیکھا سائنٹسٹ اور قرآن کریم میں فرق کیا ہے! اور یہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ (71:13) میں کیا انداز سے بات کرنے کا! جب کیفیت یہ ہے کہ جرثومے سے یوں آگے بڑھتے ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے اس پیکر میں آئے تو یہاں پہنچ کر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا سے مزید ''وقار'' کی توقع نہیں کر رہے ❷۔ اس کے بعد تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19)۔ لترکبن آیا ہے۔ یہاں سے رکب، مرکب کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ مرکب

---

❶ تاج العروس میں لکھا ہے کہ الطور بار، دفعہ، مرتبہ طورًا بعد طور ایک کے بعد دوسری بار، دوسری مرتبہ یا دوسری دفعہ۔ نیز جو کسی چیز کے بالمقابل یا اس کے برابر ہو۔ طور بھی اس معنی میں آتا ہے۔ اطوار مختلف حدود یا اقسام، مختلف مدارج واحوال یا اندازے۔ محیط المحیط میں ہے کہ طار بہ (یطور) کے معنی ''قریب ہونا'' ہے (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1961، ص۔ 1095)۔

❷ یعنی زندگی کی ایسی حالت، جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد چہارم)، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1961ء ص۔ 1730)۔

گھوڑے کو کہتے ہیں۔ رکب کے معنی ہوتا ہے بلندیوں کی طرف چلنے والا' یہ چلنا بھی ہے مگر اور بلندیوں کی طرف چلے جانا ہے۔ قرآن حکیم نے خدا کو ذِی الْمَعَارِجِ (70:3) کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا' ایک ایک درجے سے بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) ایک اسٹیج سے دوسری اسٹیج کی طرف' بلندیوں کی طرف لے گیا۔ یہاں Verb (فعل) وہ استعمال کیا ہے جس کے اندر یہ چیز موجود ہے' عزیزانِ من! لے گیا نہیں بلکہ یہ لَتَرْكَبُنَّ ہے کہ چڑھاتا چلا گیا یعنی ایک اسٹیج سے دوسری اسٹیج کی طرف تم بڑھتے چلے گئے۔ یہاں پہنچنے کے بعد تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ یہ آخری اسٹیج آ گئی۔ انسانیت کی تو یہاں سے ابتدا ہوئی ہے' اسے حیوانیت کی آخری اسٹیج کہہ لو۔ یہاں سے آگے بڑھنے کے متعلق کیوں تمہارے دل میں کوئی ولولہ نہیں پیدا ہوتا۔

اور اب آگے وہ ہے جو میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے سمجھایا یہ ہے کہ نفسِ واحدہ ایک ننھا سا بیج ہے' جس سے تناور درخت پیدا ہوتا ہے۔ شاخیں مختلف ہیں' پتے الگ الگ ہیں' پھول جداگانہ ہیں مگر اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ سوکھتا ہے تو سارا درخت سوکھتا ہے' سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو سارا درخت سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (71:17) خدا نے تمہیں زمین سے یونہی پیدا کیا' جیسے اپنے سامنے درخت دیکھتے ہو جو پیدا ہوا ہوتا ہے۔ کس طرح سے یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا؟ قرآن کے بڑے خوبصورت الفاظ ہیں! کہا ہے کہ وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (6:98) خدا وہ ہے کہ جس نے تمہیں اَنْشَاءَ كُمْ Develop کرتے ہوئے' نشو و نما دیتے ہوئے' ایک Original Life Cell (اولین جرثومۂ زندگی) سے پیدا کیا۔ یہ **انشاء کم** (6:98) ہے کہ نشو و نما دیتے ہوئے' Develop کرتے ہوئے' آگے پہنچایا۔

## انسانی زندگی کی ایک ایک منزل لاکھوں سال کی رہین منت ہے

اس تک پہنچانے کا طریقہ کیا تھا؟ یہ کہ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (6:98)۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں قرآن حمید کے الفاظ کا! طریقہ یہ تھا کہ ایک منزل میں تم ٹھہرتے تھے یعنی زندگی کا کاروان ایک منزل میں کچھ عرصے کے لیے ٹھہرتا تھا' وہ منزل اس کی مستقر تھی' پھر اس کے بعد مُسْتَوْدَعٌ (6:98) تھا' پھر وہ جو پروگرام تھا یا وہ جو منزل تھی' وہ اس کاروان کو امانت کے طور پہ اگلی منزل کے سپرد کر دیتا تھا کہ تم اس کو آگے لے جاؤ۔ پتہ نہیں کہ ایک منزل میں یہ ''قرار'' کتنے کتنے لاکھوں برس ہوا۔ کسی ایک منزل میں یہ ''قرار'' رک کر نہیں رہ گیا۔ یہاں وَ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) ہے کہ اس نے پھر اس کو اگلی منزل کے سپرد کر دیا' اسے اگلی منزل کو سونپ دیا کہ لو بھئی! میرا کام ہو گیا' اب تم سنبھالو۔

اور اسی طرح اس نے پھر ''قرار'' کے بعد' اسے اگلی منزل کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اب تم اس منزل سے آگے

آ گئے وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِيْنٍ (2:36) اس ارضی آرامگاہ میں بھی تمہیں صرف ایک وقتِ معین کے لیے ٹھہرنا ہے' اس کے بعد پھر مُسْتَوْدَعٌ (6:98) آنا ہے' اس نے تمہیں اگلی منزل کے سپرد کرنا ہے۔ یہ چیزیں جب تم خود دیکھ رہے ہو' سمجھ رہے ہو تو مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (71:13) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم آگے بڑھنے کے لیے' اپنے لیے بلند مقام کی' یا وقار کی (عظمت کی)' خدا سے توقع نہیں کرتے۔ قرآن حمید نے آگے کہا ہے کہ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ (6:98) ہم باتیں بڑی ''نکھیڑ'' کر کرتے ہیں' فصل کے معنی ہوتا ہے الگ الگ کر کے ''جنوں اسی نکھیڑ کے کیندے ہیگے نا'' (جسے ہم نکھیڑ کر بیان کرنا کہتے ہیں) یوں جدا کر کے' الگ الگ کر کے ہم ان چیزوں کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑا ٹھیک ہے لیکن یہ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (6:98) صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو تفقہ سے کام لیتے ہیں' آنکھیں بند کر کے چل کر آنے والوں کے لیے نہیں۔ یہ ہے جو کچھ ہم کرتے چلے گئے۔

آیۂ زیر نظر کے لیے اتنا ہی کافی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اب قرآن حمید پھر آگے لاتا ہے کہ انسانی بچہ رحمِ مادر میں کیسے آتا ہے' وہاں کس طرح سے حیوانی بچے کی طرح پرورش پا کر' ایک مقام پہ پہنچ کر' رحم میں ہی حیوانی بچے سے یہ بالکل ممتاز ہو کر' الگ ہو جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے یہ خلقِ اٰخر کہا ہے کہ یہ ایک جداگانہ مخلوق ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ کہ اس میں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ اب یہ صاحبِ اختیار وارادہ ہوتا ہے' حیوان صاحب اختیار وارادہ نہیں ہوتا۔

## حیوانی سطح کے بعد اختیار وارادہ کی منزل اور حیوانی جبلت

ارشاد ہے کہ یہ ہے وہ روحِ خداوندی جو تمہیں دی جاتی ہے۔ یہ خدا کی توانائی میں سے ایک شمّہ ہے جسے انسان کا اختیار وارادہ کہا جاتا ہے۔ یہ اختیار وارادہ صرف خدا کا شرف ہے' اس کائنات میں انسان کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہے۔ انسان کو بھی اس نے ایک حد تک اختیار وارادہ کا یہ شرف عطا کیا ہے۔ کہا کہ یہاں تم باقی حیوانات سے متمیز ہو جاتے ہو۔ اور اب آگے تمہارے اختیار وارادے کی دنیا شروع ہوئی۔ یہ پچھلی کڑیوں کی آخری کڑی ہے اور اس کے بعد یہ نئی کڑی ہے۔ اس نے اس نئی کڑی سے آگے چلنا ہے۔ آخرت کہتے ہی اس مقام کو ہیں' جہاں پچھلی کڑی ختم ہو کر ایک نئی کڑی شروع ہو جائے۔ یہ بات آگے چلی جائے گی۔

عزیزانِ من! آپ نے غور فرما لیا کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے' ہم کہاں الجھے پھر رہے ہیں؟ نہ وہ آدم کو ایک پتلا کہتا ہے' نہ اس کی پسلی سے اس کی بیوی امّاں حوّا کو نکالتا ہے' اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کو اس طریق سے بتاتا ہے کہ جرثومۂ حیات کس طرح مختلف مدارج سے گزرتا ہوا' دو ٹکڑوں میں بٹ کر آگے بڑھا' وہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) بڑھتا ہوا' مختلف منازل سے گزرتا ہوا' ٹھہرتا ہوا' بڑھتا ہوا' اس پیکر تک آ گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد' کہا گیا ہے کہ اب تمہاری زندگی انفرادی نہیں رہے گی۔ ایک تو

افزائش نسل کے لیے بھی ضروری ہے کہ زندگی متمدن ہو' یہ جوڑا اب حیوان کی طرح نہیں ہوگا کہ اس نے صرف آگے ایک بچہ پیدا کرنا ہے۔ عزیزانِ من! حیوان کا بچہ' جیسا وہ پیدا ہوتا ہے اس کو اگر طبعی پرورش ونشوونما کا سامان کھانے پینے کو دیئے چلے جائیں' تو جو کچھ اس کا ماں باپ ہوتا ہے' وہ آخر میں خود بخود وہی بن جاتا ہے۔ مثلاً بکری کا بچہ ہے' آپ کو اسے صرف چارہ دینے کی ضرورت ہے' کسی اسکول میں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے' اسے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دیکھو بیٹا! ماں باپ کے نقشِ قدم پہ چلو' تم بکری کی اولاد ہو' بکری بنو۔ اسے یہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے' وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتا۔ وہ ازخود وہ کچھ بن سکتا ہے۔ جو اس کی جبلت (Instinct) ہے۔ شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے' بکری کا بچہ ازخود بکری بن جاتا ہے' اس میں ان کے اختیار وارادے کو دخل نہیں ہے۔

## خدا کی طرف سے اختیار وارادہ کی نعمت نے حیوانی سطحِ زندگی کے برعکس انسان کو ایک نئی منزل سے متعارف کرایا

آپ سوچیے تو سہی کہ کیا انسان کے بچے کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اگر اس کو آپ صرف کھانے پینے کو دیئے جائیں اور اس کو اسی طرح چھوڑ دیں تو کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ اس کے ماں باپ تھے' جس انداز کے وہ تھے' یہ بھی وہی کچھ بن جائے؟ اس صورت میں وہ شکل وشباہت تو اپنے ماں باپ کی لے آتا ہے' یہ Purely Physical (خالصتاً طبعی) چیز ہے لیکن اندر جو انسانیت ہے' کیا بکری کے بچے کی طرح اس کو بھی وہ ازخود لے کر پیدا ہو جاتا ہے؟ یہ تو ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ ماں اور باپ دونوں ایم اے ہوں' جو بچہ پیدا ہوتا ہے' وہ بالکل جاہل ہوتا ہے' الف ب بھی اس کو سکھانی پڑتی ہے۔ ایم اے پاس جوڑا تھا' اسے میٹرک تک تو تعلیم ہوگی لیکن نہیں' اسے آپ کو پڑھانا پڑھتا ہے اور پھر تربیت دینی پڑتی ہے۔ جس قسم کے ماحول میں آپ اس بچے کو چھوڑ دیں گے' جو تربیت آپ اس کو دیدیں گے' وہ وہی کچھ بن جائے گا۔ لہٰذا یہاں سے آگے بڑھنے والی زندگی میں حیوانی زندگی کا انداز نہ رہا کہ ایک نر اور مادہ نے اختلاط سے آگے ایک بچہ پیدا کر دینا ہے اور معاملہ ختم ہوا۔ وہاں حیوانی سطحِ زندگی میں تو یہ ہے کہ جب تک وہ خود کھانے کے قابل نہیں' ماں کے تھنوں میں دودھ ازخود پیدا ہوتا ہے' وہ اسے پی لیتا ہے' جب وہ دوسری غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' ماں باپ اُدھر چلے جاتے ہیں' یہ بچہ اِدھر چلا جاتا ہے لیکن انسان کے اس بچے کی تو یہ صورت نہیں ہوگی' اسے تو آپ کو حیوانی پیدائش دینے کے بعد انسان بنانا پڑے گا' اس کے لیے آپ کو گھر یا خاندان کی زندگی کی ضرورت پڑتی ہے۔

## ماں باپ کی تعلیم وتربیت بچے کی شخصیت کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی مگر کیوں؟

انسانی دنیا میں ماں باپ کو ماں باپ کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ وہ بکری بکرے یا گائے بھینس کی طرح نہیں ہیں کہ انہوں نے بچہ پیدا

کیا تو وہ جب خود کھانے پینے کے قابل ہوتا ہے تو اس کے ماں باپ جہاں جی چاہے چلے جائیں' ان کے بچے پر اثر ہی نہیں پڑتا۔ بیل کا بچہ خود بیل بن جاتا ہے' بکری کا بچہ خود بکری بن جاتا ہے' وہ ماں باپ کی تربیت کا محتاج ہی نہیں ہے۔ مگر انسان کا بچہ تو از خود نہیں بنتا۔ اس لیے یہاں یہ نہیں کہ ماں باپ نے اس کو کسی طرح سے پیدا کر دیا اور اس کے بعد پھر وہ جہاں جی چاہے چلتے رہیں' باپ دفتر میں ہو' ماں کلبوں میں رہے اور ''بچہ ڈبے تے پلن ڈیا ہیگا'' (بچہ ڈبے کے دودھ پہ پلتا رہے)۔ وہ پھر کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ یہ کہ جو کچھ اس کا جی چاہے' وہ بن جائے گا۔ یوں ہم ان کی پرورش کرتے ہیں اور جب اس کے بعد یہ نئی جنریشن ایسی قوم بنتی ہے جو آج ہمارے سامنے ہے تو اسے کوستے ہیں۔

برادرانِ عزیز! کوسوا اپنے آپ کو کہ تم نے خود کو حیوان کی شکل میں رکھا کہ صرف ایک بچے کو پیدا کیا' تم نے گدھے اور گھوڑے کی طرح اس بچے کو پھر چھوڑ دیا کہ وہ از خود یہ کچھ بنے گا۔ انسانیت کے اوپر بڑی ذمہ داری ہے عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں' یہ بہت بڑی ذمہ داری اور بوجھ ہے ایک بچے کو اس دنیا میں لانے کا' اس کی پیدائش کے موجب بننے کا۔ آپ اس انسانیت کے اندر کس قسم کا اضافہ کرتے ہیں' اس کے لیے اس چیز کی ضرورت تھی' جو یہاں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ (4:1) خدا کے قانونِ ربوبیت کے ساتھ جو تم اس کی نگہداشت کرو گے' یہ بڑی ضروری چیز ہے۔ یہاں یہ کہنے کے بعد کہا کہ وَ بَثَّ مِنۡھُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً (4:1) (اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے' اُس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلا دی جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے)۔ یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ پھر آگے کہا ہے کہ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ (4:1) تمہیں ان قوانین کی' ان اقدارِ سماوی کی نگہداشت کرنی پڑے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس لیے ہے؟

## معاشرتی زندگی میں ہر انسان' دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے

اب بات آگے آ گئی۔ کہا ہے کہ الَّذِیۡ (4:1) یہ وہ قانونِ ربوبیت ہے' وہ نظامِ تمدن ہے' جو خدا نے مقرر کیا ہے۔ کہا ہے کہ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ (4:1)۔ آپ ان الفاظ کے ترجموں میں بھی دیکھیں گے اور دوسری جگہ تفسیروں میں بھی دیکھیں گے کہ بات کچھ آپ کے پلے نہیں پڑے گی۔ تَسَآءَلُوۡنَ کے معنی ''تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو'' کیا ہے اور وَ الۡاَرۡحَامَ کے معنی ''اور رشتہ داروں سے بھی'' کہا ہے۔ یعنی تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اس سے بات پلے نہیں پڑی۔

عربی زبان میں ''سوال'' کے معنی ''احتیاج'' کے ہوتے ہیں۔ آپ جو دوسرے سے سوال کرتے ہیں' خواہ وہ سوال بچوں کا سا کیوں نہ ہو' مثلاً بچہ جب آپ سے کوئی بات پوچھتا ہے' تو وہ آپ کی انفرمیشن کا 'محتاج'' ہوتا ہے' اسی طرح آپ جو دوسرے سے

سوال کرتے ہیں تو آپ دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے سائل کے معنی مانگنے کے لیے سوال کرنے والا ہی نہیں ہے بلکہ یہ کوئی بھی جو کسی دوسرے سے احتیاج میں ہے' اسے سائل کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تَسَآءَلُوْنَ (4:1) تم تمدنی زندگی کے اندر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہو۔ یہاں کوئی فرد بھی دوسروں سے مستغنی ہو نہیں سکتا۔

تمدنی زندگی کے اندر تعاون کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو احتیاج وہ ہے جو تم خود ہی اپنے طور پہ مقرر کرلو' خود ہی اپنے طور پہ پوری کرلو' مثلاً کچھ روپے کی احتیاج ہے' وہ کسی سے پوری کرلو' روٹی کی احتیاج ہے وہ پوری کرلو۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہاں قرآن حمید نے کیا کہا ہے؟ کہا یہ ہے کہ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ (4:1) ایک دوسرے کے ساتھ تمہاری احتیاجیں' قانون خداوندی سے پوری ہونی چاہئیں اس لیے تمہیں تمدنی زندگی کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ بِہٖ عجیب چیز ہے۔ اس نے عام معاشرے کو' اس قوم کے معاشرے سے' بالکل متمیز کردیا۔ وہ قوم جو قرآن کی رو سے اپنا معاشرہ متشکل کرتی ہے' وہ بھی تَسَآءَلُوْنَ کرتے ہیں یعنی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں' ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں' ان کے درمیان Basically (بنیادی طور پر) کوئی چیز ایسی بنیادی ہوتی ہے جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھے۔ یہاں کہا ہے کہ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ (4:1) خدا کے قوانین کی رو سے ایک دوسرے کی مدد کے تم محتاج ہوتے ہو۔ ڈاکو بھی ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں' شریف انسان بھی محتاج ہوتے ہیں۔ صحیح وہ ہوگا جو قانونِ خداوندی کے انداز سے ایک دوسرے کی احتیاج پوری کرے۔ یہ ہے تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ (4:1)۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق وجود میں آنے والے یونٹوں کی ذمہ داری کی ایک مثال

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوگی؟ کہا ہے کہ وَ الْاَرْحَامَ (4:1)۔ یہاں یہ تفصیل خاندانی رشتوں کی ہوگئی یعنی پہلی ابتدا' جو قرآن کریم اس کا یونٹ بناتا ہے' وہ گھر کو بناتا ہے' جو ''رحم'' سے رشتہ ہوتا ہے اس کی ابتدا ایک یونٹ سے ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ یہاں سے بات شروع کرو لیکن اس کے یہ معنی نہ سمجھو کہ ہم نے تمہارا جو یونٹ بنا دیا' تمہیں باقی انسانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا' یاد رکھو! تم سب کا Origin (منبع' مخرج' مبداء) نفسِ واحدہ سے ہوا تھا' تم ایک درخت کی طرح ہو۔ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (71:17) تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے۔ شادابی اور خوشگواری آئے گی تو سارے درخت کے اوپر آئے گی' سوکھے گا تو سارا درخت سوکھے گا۔ ایسا نہ کرو کہ اس کی چند ٹہنیاں دوسری ٹہنیوں کا خون چوس کر خود تو سرسبز و شاداب رہیں اور باقی سوکھ جائیں۔ یہ بات نہیں ہوگی صاحب! ہمارے قانونِ ربوبیت کے مطابق ایک دوسرے کی احتیاج کو پورا کرو گے' درختوں کی طرح بڑھو پھولو پھلو گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حمید نے جہاں بھی تشبیہ دی ہے' وہ ہمیشہ کھیتی اور درختوں کی تشبیہ دی ہے اور جنت کے معنی ہی سرسبز و شاداب

باغات کے ہیں۔ کہا ہے کہ اس طرح کا معاشرہ بناؤ' ارحام سے یہ بات شروع کرو' ایک چھوٹا سا یونٹ ہو' ہر گھر کے اندر جنت کا نقشہ پیدا کرو۔ اور پھر اس کو اپنی چار دیواری تک محدود نہ کرو۔

اب پھر سوال یہ ہے کہ جس کو تم معاشرہ کہتے ہو' وہ ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ راتوں کو تم اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہوتے ہو تو گھر کہتے ہو' صبح یہاں سے باہر نکل جاتے ہو' وہ چار دیواریاں پیچھے رہ جاتی ہیں تو تم معاشرہ بن جاتے ہو۔ یہ معاشرہ تم صرف خاص مقاصد کے لیے پیدا کرتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ تم اسے عالمگیر انسانیت کی بہبود کے لیے کیوں نہیں پیدا کرتے۔ تم اس حلقۂ گھر کو وسیع کرتے چلے جاؤ تا آنکہ پوری کی پوری انسانیت اس کے دائرہ کے اندر آ جائے۔ یہ بات ہے جو وہ یہاں سے شروع کر رہا ہے۔

## معاشرتی طور پر کامیاب زندگی کے معیار کو پرکھنے کا انداز

عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَ الۡاَرۡحَامَ (4:1) خاندان کا' رشتہ داروں کا ایک یونٹ بناؤ۔ یہاں سے بات شروع کرو۔ اور اس کو ہر وقت نگاہ میں رکھو کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا (4:1) خدا تمہارے اوپر نگران ہے' وہ دیکھتا ہے کہ تم کس طرح باہمی تعاون کرتے ہو' کیسی تمدنی زندگی بسر کرتے ہو' نسلِ انسانی کے اندر کس قسم کا اضافہ کرتے ہو' کیسے انسان پیدا کرتے ہو۔ اور خود اپنے لیے بھی وقار [1] کی توقع کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہو یا تمہاری زندگی یہی ہے کہ حیوانوں کی طرح تم نے کھایا پیا سوئے' کچھ بچے پیدا کیے' پھر مر گئے۔ قرآنِ کریم نے اس طرزِ حیات کو حیوان کے درجے پہ رکھا۔ کہا ہے کہ یہ زندگی تو ہمارے قانون کے تابع نہیں ہے۔ ہمارے قانون کے تابع گھر کے یونٹ سے زندگی شروع کرو اور ہم ہر وقت دیکھیں گے کہ تم کیا کرتے ہو۔

عزیزانِ من! یہاں پہلی آیت ختم ہو گئی۔ اگلی آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

---

[1] تاج العروس' محیط المحیط اور امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ جنان واقر باہمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرا نہ اٹھے۔ یہ ہے ''وقار'' یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان معمولی سی بات سے گھبرا نہ جائے اور ذاتِ انسانی کی ایسی کیفیت ہو کہ موت (Death) کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے۔ یہ ہے مقصودِ حیات۔

# دوسرا باب: **سورۃ النسآء** (1) (آیات 2 تا 3)

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى
اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ
لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَىْءٍ
مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ﴿۴﴾

عزیزانِ من! آج جون 1970ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النس آء کی دوسری آیت سے ہو رہا ہے:( (4:2)۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم کا ملخص اور سائنسی علوم

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ کی پہلی آیت میں قرآنِ کریم نے انسانی پیدائش کے متعلق مختلف مذاہب میں جو غلط تصورات چلے آ رہے تھے ان کی تردید کی تھی۔ اور اس کے ساتھ مثبت طور پر یہ بتایا تھا کہ زندگی کا آغاز کیسے ہوا اور اس زندگی نے پھر مختلف وادیوں سے گزرتے ہوئے کس طرح پیکرِ انسانی میں آ کر اپنا مستقر ڈھونڈا۔ یہ چیز سابقہ درس میں سامنے آ گئی تھی لیکن قرآنِ کریم کوئی سائنس کی کتاب تو ہے نہیں کہ وہ Scientific Theories (سائنسی نظریات) آپ کے سامنے پیش کرے۔ اس کا مقصد تو یہ بتانا ہے کہ وہ جو 'آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا' وہ آدمی کو سطحِ انسانیت کی زندگی بسر کرنا سکھائے۔ اس سلسلے میں جو چیزیں سامنے آتی جاتی ہیں' وہ انہیں ضمناً تشبیہاً' تمثیلاً' استعارۃً' بتاتا چلا جاتا ہے۔ کسی صحیح نہج سے بھی جو چیز سامنے آتی ہے' اس کے متعلق اشارتاً یا وضاحتاً جو کچھ بھی کہتا ہے' ہو نہیں سکتا کہ زمانے کا علم جب کسی حقیقت تک پہنچے تو وہ اسکے خلاف ثابت ہو۔ اس اعتبار سے جن چیزوں کا تعلق مختلف علوم اور مختلف سائنسز سے ہے' وہ جب قرآن حکیم میں سامنے آتی ہیں اور ان کی وضاحت ہوتی ہے تو ان کا مقصد اتنا ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیم کا اس سلسلے میں اصل مقصد کیا ہے اور ان چیزوں کا تعلق کیا ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم نے بتانا تو یہ تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کسی زمانے میں مولانا الطاف حسین حالیؒ

انہوں نے یہ بنیادی نقطہ جو قرآن حکیم کی تعلیم کا ہے' کہا ہے کہ

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

## اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ کا مفہوم اور بچوں کی تربیت کا سوال

یہ شخص بڑے سیدھے سادے سے الفاظ میں سادہ سادہ سی باتیں کر گیا۔ بات اس نے یہ کہنی تھی کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے: **اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ** ۔اور وہ کہتا یہ ہے کہ اس پورے وسیع نظامِ ربوبیت کا آغاز تمہارے گھر کی زندگی سے ہوگا' اسے عائلی زندگی کہتے ہیں' خوانگی زندگی کہتے ہیں۔ یہاں سے وہ ابتدا کرتا ہے اور اس کی بڑی اہمیت بتاتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ جس قسم کا گھر کی زندگی کا نقشہ ہوگا' اسی قسم کا نقشہ وسیع طور پر تمہارے معاشرے کا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ معاشرہ گھروں سے الگ' کہیں آسمان سے اتر کر نہیں آتا۔ شام کو ہم گھروں میں لوٹ آتے ہیں تو گھر بن جاتا ہے' صبح کو باہر نکل جاتے ہیں تو وہ معاشرہ بن جاتا ہے۔ اور جب گھروں کی دیواروں کو آپ دائیں اور بائیں سے' ذرا نیچے کر دیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ فولڈنگ ہیں اور ان کو جب آپ نیچے گرا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک گھر اور دوسرے گھر میں کوئی حدِ فاصل ہی نہیں رہتی' وہ ایک ہی گھر ہو جاتا ہے اور اگر ان دیواروں کو اسی طرح سے گراتے چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے ''کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا''۔ یہاں تک ہمیں قرآن کریم لے جانا چاہتا ہے لیکن اس پروگرام کی ابتدا وہ ایک گھر کی زندگی سے کرتا ہے۔

گھر کی زندگی میں پہلا جوڑا میاں بیوی کا ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر عورت کے متعلق جو غلط خیالات اس دنیائے مذہب اور دنیائے فلسفہ' دونوں میں رائج تھے' قرآن حمید نے ان کی تردید کی اور کہا کہ یہ تصور بالکل غلط ہیں کہ ان میں سے' اس جوڑے میں سے' ایک یعنی عورت کا درجہ کمتر اور مرد کا درجہ اس سے بہتر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ یہ دونوں پہیے ہیں' زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ان کو یکساں ہونا چاہیئے' اس لیے کہ ان کی تخلیق بھی ایک لائف سیل سے ہوئی ہے' ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں' کوئی تمیز نہیں' کوئی تفریق نہیں۔ اس بنیاد سے وہ گھر کی زندگی کی ابتدا کرتا ہے کہ دونوں واجب التکریم ہیں' دونوں ایک دوسرے کے Complements (تکملہ) ہیں۔ اب اس کے بعد جو اگلی چیز ہے وہ بچوں کی تربیت کا سوال ہے۔

## حیوانی سطح پر بچے کی پرورش کی نوعیت اور ایک انسان ہونے کی جہت سے اس کے تقاضے

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اس زمانے تک جب تک بچہ خود اپنی پرورش کے قابل نہیں ہوتا' ہر حیوان بچے کی پرورش کرتا ہے' اس

لیے اگر انسان بھی یہیں تک کچھ کرتا ہے تو یہ تو حیوانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے جسے وہ پورا کر رہا ہے۔ حیوان سے یقیناً یہ بدتر ہو جاتا ہے کہ حیوان کبھی اپنے بچے کو کسمپرسی کے عالم میں نہیں چھوڑتا' کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ خود تو کھا پی کر اپنا پیٹ پال لے اور بچے کو بھوکا چھوڑ دے۔ یہ چیز اس اشرف المخلوقات (بزعمِ خویش) ہی کا حصہ ہے کہ ایسے واقعات آپ کے سامنے آئے ہونگے کہ بچوں کو کسمپرسی کے عالم میں چھوڑا ہوا ہے' آپ گُل چھرّے اڑا رہے ہیں یعنی یہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5) ہے جو قرآن مجید نے کہا تھا کہ جب یہ کم بخت نیچے گرتا ہے تو حیوانوں کی زندگی سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ کوئی حیوان یہ کچھ نہیں کرتا۔ جس طرح کوئی حیوان اپنے ہم جنس مادہ کو کبھی ذلت کی نظروں سے نہیں دیکھتا' یہ انسان ہی کرتا ہے' اسی طرح سے کوئی حیوان اپنے بچوں کو کسمپرسی کے عالم میں نہیں چھوڑتا' یہ انسان ہی کرتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں تک بات تو حیوانی زندگی کی ہے۔ ہمارے ہاں جو کمال سمجھا جاتا ہے وہ ماں باپ کا فریضہ ہے کہ ہم نے بچوں کی پرورش کردی' بڑا کردیا' کمانے کے قابل بنا دیا۔ اس پہ بہت فخر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ چیز تو ہر حیوان بھی کرتا ہے' تم نے تو حیوانی سطحِ زندگی کا ایک تقاضا پورا کیا' انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا یہ تھا کہ تم نے اسے انسان کس قسم کا بنایا۔

## انسان کو انسان بنانے میں سائیکولوجی کے علم کی اہمیت اور بچوں کی نفسیاتی تربیت میں جونز اور ایڈلر کی سائیکولوجی

انسان بنانے کے لیے میں یہ عرض کردوں کہ سائیکولوجی کا علم ہمارے دور کا معرکۃ آراء Discipline (ضابطۂ حیات کا مضمون) سامنے آیا ہے یعنی اس سے پیشتر اس نے اتنی اہمیت حاصل نہیں کی تھی' اس کے متعلق کوئی تحقیقات نہیں ہوئی تھیں' اب اس کے متعلق بڑی تحقیقات ہونی شروع ہوگئی ہیں اور آہستہ آہستہ یہ علم سائنس کے درجے پر پہنچ رہا ہے۔

میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ ان کی تحقیق ہے۔ اس میں اگرچہ سگمانڈ فرائڈ (1939-1856ء) نے ابتدا کی تھی لیکن اس کی نگاہ دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے دو شاگرد تھے۔ انہوں نے اس سے الگ اپنا اپنا مکتبِ فکر قائم کرلیا۔ وہ دو شاگرد الفرڈ ارنسٹ جونز (1958-1879ء) اور الفرڈ ایڈلر (1937-1870ء) ہیں۔ انہوں نے بچوں کی سائیکولوجی کے متعلق بڑی ریسرچ (تحقیق) کی ہے۔ ان کی تحقیق کا ملخص یہ ہے کہ بچے نے اپنی آئندہ زندگی میں سیرت اور کیریکٹر کے اعتبار سے جو کچھ بننا ہوتا ہے' اس کی بنیادیں تین سال کی عمر تک رکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد ان بنیادوں کے اوپر عمارت تو استوار ہو جاتی ہے' ان بنیادوں کا بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے اگرچہ ناممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت تک بچہ سب کچھ بن چکتا ہے جب تک وہ قریباً تین سال کی عمر بلکہ انہوں نے کہا تو یہ تھا کہ جب پہلے وہ ''میں'' کہنا سیکھتا ہے' بات کرنا سیکھتا ہے' اس وقت تک وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے پورے ماحول کو سمو لیتا ہے اور اسی سے اس کی اپنی شخصیت متشکل ہو جاتی ہے۔

## انسانی زندگی کے سلسلہ میں بچے کی اوائل عمری کی اہمیت' پرویزؒ کا تحلیلِ نفستی میں درک وتجربہ اور نفسیاتی الجھنوں کا علاج جن کا ہمارے گھروں میں کبھی انتظام نہیں کیا جاتا

آپ نے غور فرمایا کہ حیوانی بچے اور انسانی بچے میں کتنا فرق ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ حیوانی بچے کے لیے کسی تربیت کی ضرورت نہیں' اُسے کسی اسکول میں بھیجنے کی ضرورت نہیں' بکری کا بچہ ازخود بکری بن جاتا ہے' شیر کا بچہ ازخود شیر بن جاتا ہے۔ انسان کا بچہ ازخود کچھ نہیں بنتا' اسے بنانا پڑتا ہے۔ جو کچھ اسے اس گھر کی زندگی میں بنا دیا جاتا ہے وہ وہی کچھ بن جاتا ہے اور یہ ہے وہ سب سے بڑا فریضہ جو قرآن حمید نے ماں باپ کے اوپر عائد کیا ہے کہ بچے کا پیدا کر لینا تو حیوانی سطحِ زندگی کا ایک تقاضا تھا' اس کو انسان بنانا تمہاری انسانیت کا تقاضا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ اس تقاضے کو تم کہاں تک پورا کرتے ہو۔ اس سلسلے میں' جو بنیادی چیز سامنے آئی ہے اس میں' میں اگر یہ اضافہ کر دوں کہ ذاتی طور پہ بھی جو چیز میرے سامنے آئی ہے کہ Affection (محبت' رافت ورحمت) سے محرومی بیشمار نفسیاتی الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ مجھے بھی اس Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) کے اندر کچھ درک ہے' پڑھا بھی ہے اور کچھ کرتا بھی رہا ہوں۔

عزیزانِ من! وہ بنیادی چیز جس کا ابھی ابھی ذکر کیا ہے' یہ ہے کہ بچہ ابتداً ماں باپ کی Affection (محبت' رافت ورحمت) سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ Affection کے ایسے الفاظ ہیں جن کے مرّادف الفاظ ہمارے ہاں کم ملتے ہیں۔ میں ''پیار'' کہوں تو وہ کچھ بگاڑ کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے' ''محبت'' کہوں تو ہمارے ہاں اس کا مفہوم کچھ آگے چل رہی آتا ہے' لیکن بہرحال Affection (محبت' رافت ورحمت) بڑا عجیب جذبہ ہے۔ ہاں تو کہہ یہ رہا ہوں کہ جو بچہ Affection سے' پیار سے' محبت سے' ابتدائی زندگی میں ہی محروم رہ جاتا ہے' اس کے اندر کتنی ہی نفسیاتی الجھنیں (Psychological Complexes) پیدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ بعد کی زندگی میں وہ کن کن شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں' اس کے کیریکٹر میں' اس کی سیرت میں' خامیاں ہی نہیں رہتیں بلکہ کتنی ہی Perversions (بدنہادیاں) پیدا ہو جاتی ہیں' بہت سے جرائم کا وہ عادی ہو جاتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ ابتدائی زندگی میں اسے Affection (محبت' رافت ورحمت) نہیں ملی تھی۔ اور اس کے تدارک کے لیے اب تو Psycho Analysis (تحلیل نفسی) کے ذریعے سے علاج بھی کرتے ہیں۔

میرا بھی اس میں تجربہ یہ ہے کہ جن بڑوں کے متعلق یہ دیکھا گیا کہ انہیں بچپن کی زندگی میں Affection نہیں مل سکی تھی' ان کے اندر بڑے ہی مذموم قسم کے رجحانات پیدا ہو گئے۔ ان کا علاج یہ نہیں تھا کہ آپ ان رجحانات کے متعلق انہیں وعظ ونصیحت کریں۔

وعظ ونصیحت کی رو سے وہ پڑھے لکھے لوگ یہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ان کی کیفیت یہ تھی جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1869-1797ء) نے کہا ہے کہ 'جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد ❶۔ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے' سمجھ کا تعلق ہے' وہ جانتے تھے' وہ سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جو اس نے کہا ہے کہ 'پر طبیعت ادھر نہیں آتی' اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ان کی زندگی Affection (محبت' رافت ورحمت) سے محروم رہ گئی ہوئی تھی۔اور یہ ایک ایسا خلا (Vacuum) تھا' جسے وہ پر کرنے کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہمیں کیا ہو رہا ہے اور کیا چیز ہے جو ہمیں نہیں مل رہی:

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ان بیچاروں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔اگر انہیں کسی طرح سے ماں کی سی محبت' باپ کا سا پیار دیدیا جائے اور اس میں آپ قطعاً Selfish (خود غرض) نہ ہوں' آپ کے سامنے صرف یہ انسان ہوں جن کی بنیادیں غلط رکھی گئی تھیں' آپ نے انہیں ہلاکت سے بچانا ہے تو اس فریضے کے ماتحت اگر آپ یہ کریں کہ انہیں اس قسم کی محبت اور پیار دیتے چلے جائیں' جیسا میں نے عرض کیا ہے ماں کا پیار' باپ کی محبت دیتے چلے جائیں تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کس طرح ابھرتی ہیں اور ان کی سیرت میں' یہ جو پیچ وخم آ گئے ہیں' وہ کیسے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ ہمارے گھروں کے اندر کبھی بھی اس کا انتظام نہیں کیا جاتا۔

## خوف انسانی صلاحیتوں اور شخصیت کو ہمیشہ کے لیے کچل دیتا ہے

ہمارے ہاں جسے پیار کہا جاتا ہے جسے لاڈ کہتے ہیں' اس میں اچھا بھلا بچہ بھی بگڑ جاتا ہے۔اس کے سنوارنے کے لیے' اسے Disciplined (پابندِ نظم وضبط) کرنے کے لیے' ہمارے ہاں خوف کا جذبہ ہوتا ہے۔ سال بھر کے ہی بچے میں وہی چیز ہے کہ ''او! نیکی آ گئی' او! بھاگ آ گیا'' یعنی وہ ہر قسم کا خوف ہے جو دیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے! خوف کی رو سے انسان کی شخصیت یا اس کی خودی اتنی Crush (خاکستر) ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی اُبھر ہی نہیں سکتی۔ ہمارے ہاں چونکہ تعلیم نہیں ہے اور اِدھر ابھی تک توجہ ہی نہیں دی گئی تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' پیار ہمارے ہاں' لاڈ کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اچھا بھلا بچہ بگڑ جاتا ہے۔اب اُسے سنوارتے ہیں تو خوف کے ذریعے سے سنوارتے ہیں' اس سے اس کی شخصیت ہمیشہ کے لیے کچلی جاتی ہے۔

---

❶ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
(غالب)

## Affection دینے سے بچے میں جذبۂ احترام پیدا ہوتا ہے

Affection نہ تو لاڈ ہوتا ہے' نہ خوف ہوتا ہے۔ اسے سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر آپ کسی دوسرے کی یا بڑوں کی بات احترام سے مانتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس ماننے کے اندر خوف نہیں ہوتا' ایک جذبۂ احترام ہوتا ہے۔ اگر بڑے انسان بچے کے سامنے اپنی صحیح سیرت کا نمونہ پیش کریں اور اس کے ساتھ Affection (شفقت' رافت' رحمت) کریں' یعنی ہر اچھی بات پر اس کی Appreciation (تحسین و آفرین) کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے دل میں آپ کا احترام اور Respect (عزت ووقعت) پیدا ہو جائے گی۔ اور Right of Respect (حق عزت واحترام) سے یعنی احترام کے طور پر وہ بچہ جو کچھ کرتا ہے' اس سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے اس کی تربیت نہیں ہوتی۔ صحیح Affection کے معنی یہ ہیں اور قرآنِ کریم اس پہ زور دیتا ہے۔

## ہمارے ہاں یتیموں کی پرورش کا اسلوب انہیں ذبح کرنے کے مترادف ہے

معاشرے میں ماں باپ کے ہوتے ہوئے جو Affection (شفقت' رافت) سے محروم ہوتے ہیں' انہیں تو آپ چھوڑیئے ایک کیٹگری (شِق) اور آتی ہے جنہیں یتیم کہا جاتا ہے۔ وہ مجبوراً اس Affection (شفقت ورافت) سے محروم ہو جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے یتیموں کی نگہ پرداخت اور تربیت کے متعلق کتنا زور دیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے اور عام طور پہ سمجھا جاتا ہے کہ سوال صرف اقتصادی تھا کہ یہ جو بچے ہیں' یتیم رہ گئے' اقتصادی طور پر ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے والا کوئی نہیں رہا' بیچارے کسمپرسی کے عالم میں گِھر گئے' ان کا کچھ ایسا انتظام کر دینا چاہیے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں جو کیا جاتا ہے' وہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ کسی یتیم بچے کی پرورش کر دی جائے اور آپ تو خوب جانتے ہیں ہمارے یتیم خانوں کا جو طریقہ کار ہے کہ یتیم خانہ بلحاظِ کام تو مذبح کے بالکل پاس ہی ہوتا ہے بلکہ اس فرق کے ساتھ دونوں ایک ہی ہیں کہ وہاں حیوان ذبح ہوتے ہیں' یہاں انسان ذبح ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! اصل چیز تو وہ تھی جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ یہ Affection (شفقت ورافت) سے محروم نہ ہونے پائیں۔ روٹی کپڑا دیدینا اور اس کے بعد ان کی خودی کو اس طرح سے کچل دینا کہ ان کے اندر غیرت اور حمیت کی رمق تک باقی نہ رہے یہ تو انسانیت کی زندگی کا تقاضا نہیں' وہ تو انہیں اس درجے سے بھی بدتر بنا دینا ہے کہ اگر انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا تو وہ یہ کچھ بنتے۔ یتیموں کے متعلق جہاں قرآن کریم زور دیتا ہے' وہاں اصل سوال یہ ہے کہ وہ انسان کس قسم کے بنتے ہیں۔

## اقتصادی طور پر یتیموں کے حقوق کی حفاظت اور معاشرتی طور پر ان کے لیے Affection (شفقت ورافت) کی ضرورت ہے

اب جہاں تک جسمانی پرورش کے انتظام کا تعلق ہے تو اس نے کہا ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:152) اس کا انتظام آپ کی مملکت کرے گی' معاشرہ کرے گا۔ اب مملکت اور معاشرہ Mechanically (میکانکی طور پر) ان کی پرورش کا انتظام تو کر سکتا ہے' باقی جو بات Affection (شفقت ورافت) دینے والی ہے وہ تو وہی انسان دے سکتے ہیں جو ان کے قریب ہونگے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ یتیم اور وہ' جن کے ماں باپ تو ہوں مگر انہیں Affection (شفقت ورافت) نہ مل رہی ہو' تو ان دونوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ ان دونوں کو یکساں طور پہ Affection (رافت ورحمت) ملے۔ جہاں تک اقتصادی معاملے کا تعلق تھا' وہ تو اس نے اگلی آیت میں بات صاف کر دی۔ کہا ہے کہ وَ اٰتُوا الۡيَتٰمٰۤى اَمۡوَالَهُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِيۡثَ بِالطَّيِّبِ وَ لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰۤى اَمۡوَالِكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ حُوۡبًا كَبِيۡرًا (4:2)۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی مال ہے' جائیداد ہے' تم اس کے سرپرست بنے ہو' نگران بنے ہو' تو ایسا کرنے کی کوشش نہ کرو کہ یہ تو اس کی Protection (حفاظت) نہیں کر سکتے' ان کو تو اس کا علم بھی نہیں ہے تو اس کے اندر ایسا خرد برد کرنا شروع کر دو' بلکہ قرآن حکیم نے تو یہ کہا ہے کہ ایسا بھی نہ کرو کہ اپنی ناقص قسم کی چیزوں کو ان کی اچھی چیزوں کے اندر ملا دو اور یوں بھائی چارہ بنا لو۔ بھائی چارے کی ان کی یہ شکل نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تمہاری اولاد ہیں' ان کے ہر مفاد کی نگہ پرداخت کرو' ان کی حفاظت کرو' یہ چیز قطعاً نہ کرو کہ ان کا کوئی ذرا سا بھی' ایک رمق سی بھی' ان کے مال میں سے خود کھا جاؤ یا یہ کہ ان کی اچھی چیزوں کو لے کر اپنی خراب چیزیں اسمیں ملا دو۔ یہ بڑی ہی بے انصافی کی بات ہے۔

## یتیموں کی زندگی کا اصل مسئلہ فیملی لائف سے محرومی کا ہے اور حقوق وواجبات پورا نہ کرنے کا سوال

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ سارا مسئلہ تو اقتصادی نہیں' گو کہ یہ بھی اس کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس کے متعلق بھی قرآن مجید ہمیں ہدایات دیتا چلا جاتا ہے لیکن مسئلے کا اصل حل یہ نہیں۔ اصل حل یہ ہے کہ یہ فیملی کی لائف سے محروم ہو گئے ہیں' انہیں اب گھر کی زندگی میسر نہیں آ رہی' ان کے لیے گھر کی زندگی کا ہونا بڑی ضروری چیز ہے۔ اور یہ ہے جس ضمن میں اب اگلی آیت ہمارے سامنے آئی۔

یہ وہ آیت ہے جس میں ان بے گھروں کو گھر کی زندگی دینی تھی' مگر ہوا یہ کہ ایسا نہ ہونے کے باعث ہمارے ہاں اچھے بھلے گھر اب جہنم کی زندگی بن جاتے ہیں' اسی ایک آیت سے يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّ يَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا (2:26) ہوا ہے یعنی ایک ہی بات سے کس

طرح دو متضاد نتیجے اخذ کیے گئے ہیں' فرق زاویہ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک انداز نگاہ سے دیکھو تو اسی سے گمراہی کے راستے پر جا پڑو اور دوسری نگاہ سے دیکھو تو اسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں وا ہو جائیں۔ قرآن حمید کی یہ آیت اس لیے آئی تھی کہ اس سے کامرانیوں کی راہیں کھل جائیں اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ خانماں خراب' اجڑے ہوئے' بے گھر جن کی زندگیاں Affection (شفقت ورافت) سے محروم ہو چکی تھیں' ان کے لیے کچھ انتظام کیا جائے اور اسی آیت پہ جو ہمارے ہاں عمل ہو رہا ہے' اس سے یہ کچھ ہوا کہ جنہیں اس سے پیشتر کچھ Affection (شفقت ورافت) نصیب تھی' انہیں اس سے بھی محروم کر دیا جائے۔ یہ ہے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کا مسئلہ۔

کہا یہ ہے کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (4:3)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سارا مسئلہ یتٰمٰی کا ہے۔ کہا ہے کہ ''اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں مثلاً جنگ کی وجہ سے معاشرے میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے' لڑکیاں) بالخصوص بے شوہر عورتیں زیادہ رہ جائیں اور اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ' منصفانہ حل نہ ملتا ہو یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق وواجبات [1] کو پورا نہ کر سکو' ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کر سکو' ان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکو' ایسے حالات میں یہ کہا ہے کہ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا(4:3)۔

## چار چار بیویوں کے مسئلہ کی نوعیت

برادرانِ عزیز! آپ کے ہاں یہ چار تک بیویاں کرنے کا مسئلہ ایک ایسا مسلمہ ہے کہ جیسا اس میں نہ کسی غور کی ضرورت ہے' نہ فکر کی ضرورت ہے' ہر مرد کو اجازت ہے کہ وہ دھڑا دھڑ ایک دو تین چار شادیاں کرتا چلا جائے۔ یہ تو ابھی وہ ہیں جو اس مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3) ' سے مراد دو تین چار شادیاں لیتے ہیں۔ یہ تو ابھی تھوڑے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے اور مراد لینے والے بھی ہیں۔ ان کے نزدیک مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3) کے معنی ہوتے ہیں ''دو دو' تین تین' چار چار'' اور اس کا یہ مفہوم لینے والے بھی ہیں کہ ''دو دو چار' تین تین چھ' یہ ہوئے دس' چار چار آٹھ' اب یہ کل ہوئے دس + آٹھ = اٹھارہ ''تے اک تے پہلی [2] آئی'' یہ

---

[1] قسط اور عدل دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھیے کہ عدل کے معنی ہوں گے ''دو آدمیوں میں برابر کا سلوک کرنا'' اور قسط کے معنی ہوں گے ''کسی کے حقوق وواجبات کا پورا پورا ادا کر دینا'' (پرویز: لغات القرآن' جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' ص۔ (1358)۔

[2] ایک بیوی تو پہلے ہی ہے۔

انیس ہوئے۔انہوں نے کہا کہ نہیں کچھ نیچے اترو' تو انہوں نے کہا کہ نہیں! دو تین چار کے معنی ہیں ''دو تے تین ہوئے پنج' پنج تے چار نو ہوئے۔تے اک تے پہلے آئی۔تے اے ہوئے دس' اونے کہیا گل سن آگے اور بھی ہے''❶۔یہ ہیں اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ (4:3) یہ لونڈیاں ہیں' ان کی تعداد ہی کوئی نہیں۔یہ یتٰمٰی کے مسئلے کا حل ہو رہا ہے۔یاللعجب! ''جیہڑے حقیقی بچے ہیگے نیں پہلے اوہناں نوں وی جہنم اچ پادتا جانداا ے'' (جو حقیقی بچے ہوتے ہیں پہلے انہیں بھی جہنم رسید کر دیا جاتا ہے)۔یہ ہے وہ آیت جس کے یہ معنی کیے جاتے ہیں۔سارے قرآن کریم میں یہ ایک ہی آیت ہے' جس سے ایک سے زیادہ بیویوں کا جو مسئلہ ہے' اس کا حل نکالا جاتا ہے۔

اس آیت کا لفظی ترجمہ تو عام ہے اور سب کو معلوم ہے۔کہا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ (4:3) اگر تمہیں اس چیز کا خوف ہو' ڈرہو کہ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡيَتٰمٰی (4:3) تم الۡيَتٰمٰی کے مسئلے کا کوئی منصفانہ حل تلاش نہیں کر سکو گے تو پھر اس صورت میں یہ ہے کہ فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3) جو عورتیں تمہیں ان میں پسند ہوں' ان سے دو تین چار تک شادی کر لو۔اس میں پہلی چیز تو یہ ہے صاحب!

## ہمارے ہاں خطبۂ نکاح کے دوران قرآنی آیت میں کی جانے والی خیانت

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡيَتٰمٰی (4:3)۔یہ آیت 'اگر' سے شروع ہوئی ہے۔یہ عربی زبان کے قاعدہ ہی کی چیز نہیں ہے' آپ بھی یہ جانتے ہیں' ہر زبان میں یہ معلوم ہے کہ اگر وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ (4:3) ہو یعنی ''اگر یہ چیز ہو' اسے شرط کہتے ہیں یعنی ''اگر یہ چیز ہو تو'' فَانۡكِحُوۡا (4:3)۔اس میں ''ف'' ہے' جسے گرامر میں جزا کہتے ہیں' اس کے معنی ہوتے ہیں ''تو یہ بات کرو' اگر یہ ہو تو یہ کرو' اگر یہ نہ ہو تو یہ نہ ہی کرو'۔ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ جو شے مشروط ہوتی ہے اگر وہ شرط نہ ہو تو مشروط والی بات رہتی نہیں ہے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس آیت کے متعلق کیا کہا جاتا ہے؟ آپ حیران ہونگے کہ ہمارے ہاں اس وقت خطبۂ نکاح میں جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں یہ آیت ہوتی ہے اور اس آیت میں وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ (4:3) کی یہ جو شرط ہے 'اگر یہ ہو' نکاح کے دوران اتنے حصے کو پڑھا ہی نہیں جاتا۔بیٹھے ہوئے کہا جاتا ہے کہ فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3) جو پسندیدہ عورتیں ہوں' ان میں سے دو تین چار تک شادی کر سکتے ہو۔یہ تو غنیمت ہے کہ یہ عربی زبان کا ایک فقرہ ہے' اسے نہ تو وہ لڑکا ابھی سمجھتا ہے اور کم از کم لڑکی کا باپ تو سمجھتا ہی نہیں ہے' ورنہ وہ بھی بیٹھے ہوئے یہ کہتا کہ ''چور دیا پترا''❷۔اس کی

---

❶ دو اور تین مل کر پانچ ہوئے' پانچ اور چار مل کر نو (9) ہوئے' ایک بیوی تو پہلے ہی ہے۔یہ کل ہوئے دس۔اس نے کہا کہ (ابھی) بات سنو! آگے اور بھی ہے۔

❷ او چور کے بچے! (یہ کیا کہہ رہے ہو)۔

بیٹی کا نکاح ہو رہا ہے' وہ دولہا بیٹھا ہے اور وہ نکاح خواں اس کے کان میں کہہ رہا ہے کہ یہ ایک ہی کے اوپر اکتفا والی بات نہ اپنے ذہن میں سمجھ لینا' فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (4:3) ۔جو عورت تمہیں پسند آئے' ملاحظہ فرماؤ! یہ تو تم نے اپنے ماں باپ کے کہنے پہ کر لیا اور اس کے بعد جو تمہیں دو دو' تین تین' چار چار پسند آئیں' ان سے بھی کر لینا۔ یہ آیت نکاح کے خطبے میں درج ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ غنیمت ہے کہ وہ یہ آیت سمجھتے نہیں ہیں' کم از کم لڑکی کے گھر والے یہ آیت نہیں سمجھتے ہیں ورنہ وہ لڑکی کا باپ یا کم از کم اس کے جو والی ہیں ''اوہ جُتّی لے کے کھلو جان'' (وہ جوتا نکال کھڑے ہوں)۔ میں کہتا ہوں کہ کسی لڑکی کے باپ کے سامنے نکاح کے وقت' اس بچی کے ہونے والے شوہر کے کان میں یہ افسوں پھونکا جائے کہ یہ ایک کے اوپر ہی اکتفا والی بات نہیں ہے' چلو! یہ تو ایک رسم پوری ہوگئی اس کے بعد تمہیں جو دو دو' تین تین' چار چار پسند آئیں' ان سے بھی نکاح کر لینا' آپ سوچیے کہ اگر اس کی سمجھ میں یہ بات آ جائے تو پھر اس محفلِ نکاح کا نقشہ کیا ہو۔ آپ نے سوچا ہے کہ وہ مُلّا کیوں کہتا ہے کہ قرآن حکیم کبھی سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس میں اس کا کتنا فائدہ ہے!

## ہمارے ہاں کے نکاح فارم میں بھی ''وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ'' کے الفاظ درج نہیں ہیں

یہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ (4:3)' اس نکاح نامے میں نہیں ہوتا۔ اس کے بعد آپ حیران ہونگے کہ اس تحریف اور اس دانستہ بے ایمانی کی کوئی حد نہیں ہے۔ نکاح نامے کا جو فارم چھپا ہوا ہوتا ہے اس میں بھی یہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ کے الفاظ لکھے ہوئے نہیں ❶ ہوتے۔ اس میں یہ آیت' یہاں سے شروع کی جاتی ہے کہ فَانۡكِحُوۡا اور کوئی نہیں پوچھتا کہ شرط کا فقرہ نہ لکھا جائے تو اس کے بعد جو جزا کا فقرہ 'تو' والا ہوتا ہے' وہ بے معنی ہو جاتا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ یہ وہاں زبانی نہیں دہرایا جاتا بلکہ آپ کے جو فارم چھپے ہوئے ہیں' وہ اس سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو خدا کی کتاب کے ساتھ آپ کے ہاں ہو رہا ہے' دھڑلے سے ہو رہا ہے کہ کر لو کیا کرتے ہو!!

## مروجہ عائلی قوانین کی مخالفت کی وجۂ جواز

آپ کو معلوم ہے کہ صدر محمد ایوب خان (1974-1907ء) کی حکومت کا جو پچھلا دور تھا' اس میں سب سے زیادہ شور جس چیز پہ مچا' وہ کیا چیز تھی؟ وہ تھے عائلی قوانین ❷۔ وہ ان Family Laws (عائلی قوانین) پر شور مچا تھا۔ اور ختم ہونے والے دورِ حکومت

---

❶ یاد رہے یہ جون 1970ء کی 21 تاریخ کو کہا گیا تھا۔

❷ حکومتِ پاکستان نے 1961ء میں عائلی قوانین نافذ کیے۔

کے بعداب جو نیا دور آنے والا ہے' اس میں آپ کو معلوم ہے کہ یہ ''اسلام پرست پارٹیاں'' سب سے زیادہ زور یا اپنی سب سے بلند ترین خدمت جو گنا رہی ہیں کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو کیا کریں گے' وہ یہ کہ ہم یہ عائلی قوانین کو منسوخ کر دیں گے مگر آپ کے ہاں جو شراب نوشی کے قوانین ہیں' زنا کاری کے قوانین ہیں' یہ جوا' یہ ریسیں' یہ سٹے ہیں' یہ سارے کے سارے قوانین میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم انہیں منسوخ کریں گے' کہا یہ کہ ہم عائلی قوانین کو سب سے پہلے منسوخ کریں گے۔ گویا یہ کوئی بہت بڑی خطرناک بات ہوگئی ہے۔

ان عائلی قوانین میں کیا ہے؟ اِن میں کہا یہ ہے کہ یہ جو شرط کا فقرہ ہے' یہ اس آیت میں ساتھ ہونا چاہیے' 'اگر' کی بات پوری کرو تو پھر تمہیں یہ دوسری شادی کرنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے جی! اس پہ قیامت برپا ہو رہی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ شریعتِ حقہ کی رو سے مرد کو غیر مشروط حق حاصل ہے کہ وہ چار تک کی شادیاں کر سکتا ہے۔ چار کے بعد حد مقرر ہو گئی' پھر اس کے بعد مرد کا حق محدود ہو گیا کہ نہیں! پھر اس میں سے وہ جو پہلی ہے' اس کو طلاق دے' طلاق کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں' کھڑے کھڑے آپ نے نیلام گھر کی طرح ایک دو تین کہا یعنی طلاق طلاق طلاق کہا' قصہ ختم ہوا' اب تین رہ گئیں' چوتھی پھر پوری کر لو۔ یہ ہے ان کے ہاں شریعتِ حقّہ کی رو سے صحیح صورتِ حال!!

## قرآنِ حکیم پہلی شادی کے بعد دوسری شادی کے لیے' اپنی طرف سے دی گئی شرط کو' دو مرتبہ بیان کرتا ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے حالانکہ قرآنِ کریم نے عائلی قوانین ہی کے متعلق یہ کہا تھا کہ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) او! دیکھنا' ہمارے ان احکام کو کہیں مذاق نہ بنا دینا' ان کے نتائج و عواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ آج ان قوانین میں یہ کیسا مذاق بنایا ہوا ہے! اگرچہ وہ پورے کے پورے قرآن حکیم کے مطابق تو نہیں ہیں لیکن بہرحال' جو آپ کی یہ مجوزہ چیزیں آ رہی ہیں' ان میں' ان عائلی قوانین کی رو سے یقیناً Improvement (بہتری) آئی ہے' اصلاح آئی ہے' قرآن حمید کی طرف ایک قدم اٹھا ہے مگر انہوں نے قیامت مچا دی ہے کہ نہیں' صاحب! ان کو رہنے نہیں دیا جائے گا' سب سے پہلے ان کو منسوخ کیا جائے گا کیونکہ یہ دوسری شادی کرنے پہ پابندی عائد کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! وہ کیا پابندی عائد کریں گے! پابندی عائد کرنے والے نے تو " وَ اِنْ خِفْتُمْ " سے فقرہ شروع کیا ہے' پہلے وَاِنْ خِفْتُمْ آیا ہے اور پھر کہا ہے کہ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (4:3) اگر تمہیں یتمٰی کا کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہ ملتا ہو' اگر تم ان کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کر سکو تو ایسے حالات میں تم فَانْكِحُوْا (4:3) نکاح کر لو لیکن شرط یہی ہے کہ تم ان یَتٰمٰی میں

انصاف کر سکو تو نکاح کر لو تا کہ تم ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کر لو اور اس کے بعد کہا ہے کہ **فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا** (4:3)۔ پھر دوسری شرط خِفۡتُمۡ کی ہے کہ ''اگر تمہیں یہ بھی ڈر ہو کہ ایسا عدل نہیں ہو سکے گا' تو پھر بھی نکاح نہیں کرو'۔

یہ ہیں شرطیں۔ یہ شرطیں کیا ہیں؟ یہ ہیں کہ **وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی** (4:3) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو' خوف ہو کہ یَتٰمٰی کے مسئلہ کا کوئی اور منصفانہ حل نہیں مل سکتا۔ کن کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا؟ کہا ہے کہ یَتٰمٰی کے مسئلے کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا۔ اب ہمارے ہاں تو ''یتیم'' (یتٰمٰی) صرف ان بچوں کو کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ مر جائیں مگر عربی میں یہی معنی نہیں ہیں۔

## قرآنِ حکیم میں یتیم (یتٰمٰی) عورتوں کی تعریف

عربی زبان میں یہ جو لڑکے ہیں' ان کے متعلق تو اتنا ہی ہے کہ ''بالغ ہونے تک''۔ جن کے ماں باپ مر جائیں' انہیں یتیم کہا جاتا ہے۔ اُدھر یہ لفظ یتیم' ان لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جن کی شادی کی عمر ہو جائے مگر ان کی شادی نہ ہو سکی ہو' خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ باکرہ (کنواری) لڑکیاں ہوں۔ قرآنِ کریم نے خود یہ لفظ یَتٰمَی النِّسَآءِ (4:127) اپنے ہاں اسی سورۃ میں استعمال کیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ فِیۡ یَتٰمَی النِّسَآءِ** (4:127)۔ یہاں یَتٰمَی النِّسَآءِ آیا ہے یعنی یتیم عورتیں۔ یَتٰمَی کا لفظ عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے' قرآن کریم نے خود یَتٰمَی النِّسَآءِ استعمال کیا ہے۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کا نکاح نہیں ہو سکا' خواہ وہ جوان لڑکیاں ہوں جن کی پہلے سے شادی نہیں ہوئی' یا بیوہ ہو چکی ہوں' مطلقہ ہوں' یہ سب یَتٰمَی کے اندر آتی ہیں۔ اسی طرح یہ سب یَتٰمَی میں شامل ہیں یعنی وہ بچے جو باپ کی شفقت سے محروم رہ گئے' وہ لڑکیاں' جو بڑی ہو گئیں' کسمپرسی کے عالم میں ان کی شادی کا انتظام نہیں ہو سکا' یا عورتیں ہیں جو بیوہ ہو گئیں' مگر ابھی عمر شادی کے قابل ہے لیکن شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! اب یہ جو گھر ہے' آپ دیکھیں گے کہ ایک تو بنیادی طور پہ اور اقتصادی طور پہ' ان پہ مفلوک الحالی آئی ہے' یہ کسمپرسی کے عالم میں ہیں' بنیادی طور پہ گھر کا نقشہ بگڑ گیا ہے' ان کی گھر والی زندگی نہیں رہی۔ ان کا مسئلہ اقتصادی ہے' پرورش اور حفاظت فراہم کرنے کا ہے۔ اس کا حل کیا ہو؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ اور اس کے نتائج بڑے ہی دور رس ہیں۔

## مدینے کی ابتدائی زندگی کے حالات میں مسلمان مردوں کو اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت اور اقتصادی مسائل

عزیزانِ من! مدینے کی ابتدائی زندگی کے حالات کیا تھے؟ یہ کہ مدینے کی ابتدائی زندگی تھی' یہ مسلمانوں کی کمیونٹی تھی جسے آپ

پوری امت کہتے ہیں۔ بدر کے میدان میں تین سو تیرہ ہی نفوس تھے یعنی ان مردوں کی ساری تعداد کل تین سو تیرہ کے قریب تھی کہ جنگ ❶ شروع ہوگئی۔ لڑائیوں میں تو آپ جانتے ہیں کہ مرد اور پھر وہ بھی جو' جوان مرد ہیں' وہ زیادہ شہید ہوتے ہیں اور مردوں کی تعداد میں کمی آنی شروع ہوگئی۔

عورتوں کے متعلق حکم یہ ہے کہ یہ صرف مسلمان سے شادی کرسکتی ہیں' مسلمان مردوں کے متعلق تو یہ استثنا تھا کہ یہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرسکتے ہیں۔ میں آگے چل کر جب وہ مقام آئے گا' تو عرض کرونگا کہ وہ ایک استثنا تھا۔ جب حالات بدل گئے ہیں' تو حضرتِ عمرؓ(45/644-581ء) کے زمانے (45/644-634ء) میں یہ استثنا ختم کردیا گیا۔ یہ جو آج آپ کے ہاں مصیبتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ چونکہ شریعت نے اجازت دے رکھی ہے' گئے اور ولایت سے ڈگری لی' شادی بھی کی' خود تو وہیں رہ گئی اور ماں باپ کے حصے کی ایک ڈگری ساتھ لے آئے۔ اور پھر یہ جو آپ کے ہاں کی بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہوئی تھیں' وہ انہی عورتوں کی وجہ سے ختم ہوئی تھیں' جو آپ نے ان اہلِ کتاب میں سے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادیاں کی تھیں۔ یہ سب جاسوس بن کر آتی تھیں۔ اور جب یہ چیز شروع ہوئی تو وہاں تو ابتدا ہی ہوئی تھی کہ اسی وقت یہ چیز ختم کردی گئی۔

بہر حال' عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ مسلمان عورتیں غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتیں۔ مسلمانوں کی جماعت کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی تین سو تیرہ کے قریب سارے نفوس تھے۔ ان میں سے جنگ میں بھی شہید ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُدھر مکے میں جو مسلمان عورتیں رہ گئی تھیں' اگرچہ وہ وہاں شادی شدہ بھی تھیں' وہاں سے تنگ آکر انہوں نے ہجرت کر کے مدینے میں آکر پناہ لینی شروع کردی تھی' یہ عورتیں بھی آئیں اور ان کے ساتھ ان کے بچے بھی آئے۔ ان کے خاوند کافر تھے جو مکے میں تھے۔ اب انہیں واپس مکے میں دھکیلنا تو بڑا ظلم تھا۔

اب دیکھیے' مدینے میں پوزیشن کیا ہوگئی تھی؟ یہ کہ یہ نئی نئی جماعت تھی' مردوں کی پہلے ہی کمی تھی' جنگوں میں شہید ہونے سے اور بھی کم ہوتے چلے گئے' عورتیں بیوہ ہوئیں' باہر مکے کی طرف سے یا اطراف سے عورتیں اپنے گھر بار کو' اپنے خاوندوں کو' جو کافر تھے' چھوڑ کر یہاں آنی شروع ہوگئیں۔ یہ چھوٹی سی کمیونٹی تھی اور ابھی مدینہ کے اندر غیر مسلموں کی زیادہ آبادی بھی تھی۔ ان حالات نے بیوہ عورتوں' یتیم بچوں (لڑکے اور لڑکیوں) بالخصوص بے شوہر عورتوں نے گھریلو اور اقتصادی مسائل پیدا کردیئے۔

## قرآنِ حکیم نے تو ایک وقت میں ایک بیوی کا ہی قانون دیا ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے Problems (مسائل) کیا Create (پیدا) ہوگئے۔ ان کے ہاں اصول تو ایک کا تھا یعنی

---

❶ سترہ رمضان 2ھ مطابق 13۔ مارچ 624ء

ایک وقت میں ایک ہی بیوی اور خود قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً (4:3) اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں قائم کر سکو گے تو پھر اسی ایک بیوی والے قانون پر کار بند رہو' یعنی پھر اگر یہ عدل والی شرطیں پوری نہ ہوں تو وہی تمہارے ہاں جو ایک کا قانون ہے وہی رائج ہو گا۔ یہاں فَوَاحِدَةً کہہ کر قرآن مجید نے خود بتا دیا کہ قانون کیا ہے۔ یہ اس قانون وحدتِ زوج میں Exception (استثنا) یا Relaxation (سہولت) تھی۔ قانون تو یہی ایک مرد ایک بیوی کا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اقتصادی اور تمدنی مسئلہ تھا۔

## اجتماعی طور پر تمدنی حالات اور وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر دوسری شادی کی اجازت

عزیزانِ من! یہ بہت بڑا اقتصادی اور تمدنی مسئلہ سامنے آ گیا تھا' معاشرتی مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ یہ بیوہ عورتیں تھیں ان کے ساتھ بچے تھے' مردوں کی کمی تھی' اُدھر سے اور عورتیں چلی آ رہی تھیں۔ قانون یہ تھا اور آج بھی یہ ہے کہ ایک بیوی ہو۔ بہت سوچا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ کہا کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی (4:3)۔ سوچو بچار کرو اور اگر تم دیکھو کہ ان کا کوئی اور منصفانہ حل نہیں ملتا تو پھر وہ جو ایک وقت میں ایک بیوی کا اصول ہے' قانون ہے' اس میں استثنا کیا جاتا ہے۔ حالات کے تقاضے کے مطابق اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تم ایک سے زیادہ شادیاں کر لو۔ یہ شادیاں کیا ہوئیں؟ یہ کہ انہیں اپنی Protection (حفاظت) میں لو' ان کو گھر کی ضرورت ہے' ان کے بچوں کو Affection (شفقت' رافت' رحمت) کی ضرورت ہے۔ یہ ہے وہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی (4:3)۔ یہ شرطِ اول ہے کہ اگر کسی وقت معاشرے کے اندر یہ پرابلم پیدا ہو جائے اور اس کے لیے تمہارے پاس کوئی منصفانہ حل نہ ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ دو دو' تین تین' چار چار شادیاں کر لو تا کہ اقتصادی مسئلہ اور گھریلو مسئلہ حل ہو جائے۔

عزیزانِ من! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے ہاں کی عورتوں کی اتنی تعلیم ہو کہ ان میں سے کوئی ڈاکٹرز بن جائیں' کوئی نرسز ہو جائیں' کوئی ٹیچرز ہو جائیں تو بھی مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن تمدنی و معاشرتی مسائل کا حل یہ چیزیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ تنہائی کا معاشرتی حل نہیں ہے۔

## تنہائی کا معاشرتی حل یتیم خانے کھولنا نہیں بلکہ اپنی فیملی کا ممبر بنانے میں ہے

معاشرے کا حسنِ انتظام تو یہ ہو کہ کوئی شخص میلی نگاہ اٹھا کر کسی عورت کی طرف دیکھ بھی نہ سکے اور ان کے بچوں کو یتیم خانوں میں نہ دیا جائے بلکہ گھروں کی فیملی کے اندر ان کو Absorb (ضم) کیا جائے' ان کو ماں باپ کی Affection (شفقت و رافت) دی جائے۔ اگر اس قسم کا آپ کے ہاں کوئی جنتی معاشرہ بنتا ہے جس جنت کے اندر بچوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ بچے گوہرِ آبدار

ہیں جو اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں پھر اس کا ایک حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ان کو اپنے خاندان کے اجزا بنالو' ان کو جزوِ خاندان بناؤ لیکن اس سے تمہارے گھر کا جنّتی انداز متاثر نہ ہو۔ اس میں اس طرح گھر کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر ایسا ہونے کا ڈر یا اندیشہ ہوتو پھر کیا کیا جائے؟

## معاشرتی حالات کے تحت بھی قرآنِ حکیم نے یہاں حکم نہیں دیا بلکہ مشروط اجازت دی ہے

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ ان کے مسئلہ کا کوئی اور حل نہیں مل سکتا تو پھر تمہیں اس کے متعلق اجازت دی جاتی ہے کہ چار تک شادیاں کرلو۔ یہ وحدتِ زوج کے قانون میں Exception (استثنا) ہے۔ یہ اجازت ہے' یہ حکم نہیں ہے' اس شرط کو پورا کیے بغیر اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے کسی دوسری جگہ کوئی اور آیت نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد کہا ہے کہ **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3)۔ ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر' تم ان بے شوہر عورتوں سے حسبِ پسند (جو تمہارے نکاح میں آنا چاہئیں 4:19) نکاح کرلو۔

آپ کو پتہ ہے کہ جب یہ (4:3) آیت پیش کی جاتی ہے یا پڑھی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے' یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر تم دیکھو کہ یتیموں کے ساتھ تم انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر تم جہاں جی چاہو' دو تین چار شادیاں کرلو۔ ان سے پوچھو کہ ذرا اس فقرے کو دہراؤ جو آپ نے ابھی فرمایا ہے' کیا اس میں کوئی وجہِ جواز بھی ہے۔ کیا یہ حل ہے اس کا کہ اگر یتیم بچوں کے مسئلے کا حل نہ ملتا ہو تو ان یتیموں کو تو ایسے ہی چھوڑ دو' اور جو تمہارا گھر مطمئن اور پرسکون چلا آتا ہے' اس کا سکون بگاڑو' جا کر دو دو' تین تین' چار چار شادیاں کرلو؟ ان دونوں میں یعنی اس شرط میں اور اُس شادی میں جو اس کے بعد کی گئی ہے کوئی ربط نہیں ہے۔

## حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت اور قرآنِ کریم کی آیت کا مفہوم ومقصود

آپ دیکھیے! بڑے دھڑلے سے یہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کے لیے حضرتِ عائشہؓ کی طرف منسوب ایک روایت دی جاتی ہے کہ ایسا ہوا تھا کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تھا تو یہ کہا گیا کہ جاؤ' شادیاں کرو۔ عزیزانِ من! قرآن حمید کی آیت سامنے ہے' کوئی لمبی چوڑی عربی ادب میں جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے' اس کے لیے کوئی اٹھارہ علوم پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے' اگر کسی کو ابتدائی عربی بھی آتی ہو تو یہ قرآن حمید تو اتنی آسان زبان میں ہے' بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ **وَاِنْ خِفْتُمْ** (4:3) اگر تمہیں خوف ہو تو۔۔۔۔ آپ دیکھیے تو سہی' عربی نہ جاننے والا بھی غور کرے تو کچھ نہ کچھ تو ٹٹول لیتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰی** (4:3) تم **يَتٰمٰی** کا کوئی منصفانہ حل تلاش نہیں کرسکتے تو **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3) پھر

تم ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں شادی کر سکتے ہو۔ اب یہ دیکھیے قرآن مجید نے بات تو صرف اتنی سی کہی تھی' درمیان میں ایسی چیزیں وہ لاتا چلا جارہا ہے' جہاں اور احکام بھی ساتھ آجاتے ہیں۔

## قرآنی تعلیم کے برعکس بلوغت سے پہلے جنسی اختلاط کی اجازت تو کسی حیوان میں بھی نہیں ہے

یہاں کہا ہے کہ **فَانۡكِحُوۡا** (4:3) نکاح کرو ' **مَا طَابَ لَكُمۡ** (4:3) ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں۔ اب پہلی چیز یہ ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق نکاح کرو۔ اب آپ کے ہاں اگلا مسئلہ یہ ہے کہ بچپن میں بھی شادی کی جاسکتی ہے یعنی شادی کے لیے بالغ ہونا شرط نہیں ہے۔ میں ابھی آگے چل کر اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ یہ دو ہی آیات کے بعد آئے گا تو میں عرض کرونگا کہ اس کے لیے بالغ ہونا خود قرآن حکیم نے شرط لگائی ہے۔ اور عزیزانِ من! آپ سوچیے تو سہی کہ بلوغت کے بغیر Marriage یا شادی یا نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے کبھی حیوانوں میں بھی یہ مسئلہ دیکھا ہے؟ یہ چیز تو اپنے ہاں ہی ہے کہ چھ چھ برس' سات سات برس کی بچیوں کے ساتھ آپ کہتے ہیں کہ شادیاں کی جائیں' اور صرف شادی نہیں کہ نکاح ہی پڑھا دیا جائے' بلکہ اس کے بعد یہ ہے کہ ان کے ساتھ اختلاط بھی ہو (توبہ توبہ توبہ)۔ میں وہاں آؤنگا تو عرض کرونگا کہ آپ کے ماڈرن دَور کے بھی کون سے مفکر ہیں' جو اس پر زور دیتے ہیں کہ جی ہاں! یہ ٹھیک ہے' چھ سات برس کی لڑکی کے ساتھ شادی بھی کی جاسکتی ہے اور اس کے ساتھ اختلاط بھی کیا جاسکتا ہے۔

## بالغ ہونے کی شرط اور پسند و ناپسند کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان

وہ تو میں آگے چل کر عرض کرونگا کہ قرآن حکیم نے خود بالغ ہونے کی شرط عائد کی ہوئی ہے۔ یہیں **مَا طَابَ لَكُمۡ** (4:3) کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ شادی اپنی پسند کے مطابق ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چھ برس کا بچہ بھی اپنی پسند کے مطابق اپنی دلہن لے آئے گا؟ پسند کا سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ Choice (اختیار) اور انتخاب کی عمر کو اس طرح پہنچے ہوئے ہوں کہ آپ کے پاس اتنی صلاحیت ہو کہ آپ صحیح Choice (اختیار) کر سکیں۔ یہاں تو یہ کہا گیا ہے کہ **مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3)۔ مردوں کے لیے یہ چیز آئی ہے کہ عورتوں میں سے تمہیں جو پسند ہوں' کیا عورتوں کے لیے بھی یہ بات ہوگی؟ یا یہ پسندیدگی صرف انہی مردوں کے واسطے ہے؟ جیسے انتخاب اور پسند کا حق خریدار کو ہوتا ہے' جو شے خریدی جاتی ہے اسے تو اس کا یہ حق نہیں ہوتا۔ مثلاً بازار میں جا کر آپ کوئی پھل خریدیں' خریدنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ وہ خربوزہ یہ کہدے کہ ''نئیں صاحب! میں تے نئیں ایہدے نال جاندا'' (نہیں جناب! میں تو اس کے ساتھ نہیں جاتا)۔ یہ پسندیدگی کا حق مرد کو ہی نہیں' عورت کو بھی ہے' ذرا اور آگے چلیے' (4:19) میں وہ آیت ہے جس کو کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔

## شادی کے معاملے میں ہم نے فریقین سے اختیار و ارادہ کا حق تو پہلے ہی سلب کرلیا ہوتا ہے اور اب مسائل ہی مسائل ہیں

کہا ہے کہ **يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا** (4:19) اے مومنین! یہ تمہارے اوپر حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت سے اس کی مرضی کے خلاف' کرھاً شادی کرلو۔ وہ نکاح حلال ہی نہیں ہوتا' حرام ہوتا ہے۔ قرآن حمید کے یہ الفاظ ہیں کہ **لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ** (4:19) تمہارے لیے یہ جائز نہیں۔ آگے اس آیت میں ''**كَرۡهًا**'' آتا ہے۔ **كَرۡهًا** میں صرف ''جبر'' ہی نہیں ہوتا' اس کے اندر ''ذرا سی کراہت'' بھی آتی ہے۔ کہا ہے کہ جہاں کسی عورت کو ذرا سی بھی کراہت ہو' ناپسندیدگی ہو تو یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کرو۔ یہاں اول تو وہ شادیاں ہی' میں نے کہا ہے کہ' اس عمر میں ہوتی ہیں' جہاں ان کا سوال ہی نہیں ہے اور جو بڑی عمر میں بھی ہمارے ہاں شادیاں ہوتی ہیں وہاں بھی یہ انتظام ہوتا ہے کہ

بوٹا بوٹا پتا پتا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے

جب رشتے کی باتیں ہو رہی ہوتی ہیں تو اس کا انتظام کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے کان میں بھنک تک نہ پڑ جائے کہ ہم اس کا گھر کہاں تلاش کر رہے ہیں' چوری چھپے' خفیہ طور پہ' سرگوشیاں کر کے' یہ معاملہ طے کیا جاتا ہے تاکہ اسے پتہ ہی نہ چلنے دیا جائے۔ وہ بیچاری ادھر اُدھر سے کہیں اڑتی ہوئی یہ بات کبھی کسی سہیلی سے سن لے یا کسی اور سے' کچھ بات سن لے' تو سن لے' اور سننے کے بعد اگر وہ زبان پہ لے آئے تو قیامت گزر جاتی ہے۔ شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی اب یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ اپنے رشتے کے متعلق اپنی سہیلیوں سے باتیں کرنے لگی ہیں: ہاں! یہ زمانہ بھی ہم نے دیکھنا تھا' یہ قربِ قیامت کی گھڑی ہے۔ اور اب سارا کچھ کر چکنے کے بعد دن مقرر ہو گئے' برات چلی آ رہی ہے' برات آ بھی گئی' سب کچھ طے ہو چکا' ڈھول ڈھمکا آتش بازی یہ سارا کچھ ہو رہا ہے' یہ سب کچھ کرنے کے بعد ارے وہ میاں جی کہاں ہیں؟ چلیے اندر' دو اپنے ساتھ لیجیے' وہاں جا کر اس بیچاری کو دیکھیے تو اس کو بہو بنا کر بٹھایا ہوا ہوتا ہے۔ ''اے بہو تہانوں پتہ اے نا اے بچیاں نوں ڈران والی گل ہوندی ہیگی'' (یہ ''بہو (بلا)'' آپ کو معلوم ہے کہ یہ بچوں کو ڈرانے والی بات ہوتی ہے)۔ اور وہاں جا کر' اب آخری وقت میں' اس سے یہ پوچھا جاتا ہے' اس کی رضامندی لینے کے لیے یہ شرط پوری کی جاتی ہے۔ اب وہ بیچاری کچھ نہیں کہتی تو فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر وہ خاموش ہو تو رضامندی سمجھو۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3) ان عورتوں میں سے اپنی پسند کے مطابق شادی کرو اور دوسری طرف سے یہ کہا ہے کہ **لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا** (4:19) (یہ تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے ملک بن جاؤ)۔

اس باب میں یہ بڑی اہم آیت ہے۔ کہا ہے کہ اگر لڑکی یا عورت کو ذرا سی بھی ناگواری ہو تو حلال ہی نہیں ہے کہ تم اس کے اس طرح سے مالک بن جاؤ۔ پسندیدگی کے مطابق اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ پرابلم کتنی بڑی ہے اور ایسی عورتوں کی کتنی زیادہ تعداد ہو گئی ہے۔ یہ انفرادی سوال نہیں ہے کہ ہر شخص اس کا فیصلہ کر لے' طے کر لے اور اٹھ کر دو دو' تین تین' چار چار سے شادیاں کرتا پھرے۔ یہ مسئلہ اجتماعی ہے' معاشرے کا ہے' مملکت کا ہے وہ فیصلہ کرے کہ آیا ایسی Situation Arise (حالت پیدا) ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں Monogamy (وحدتِ زوج) کا Law (قانون) ہے' ایک بیوی کا Law (قانون) ہے' اس میں Exception (استثنا) یا Relaxation (سہولت) کرنے کا' تقاضا آ گیا ہے کہ اس میں یہ کیا جائے۔ اس میں قانوناً Relaxation (سہولت) کی جائے گی اور پھر اس اسٹیٹ کی' اس مملکت کی' اجازت سے' بلکہ اس کے اہتمام سے' یہ شادی یا نکاح کیا جائے گا۔

عزیزانِ من! اسے پھر کہہ دوں کہ یہ مسئلہ اجتماعی ہے' انفرادی نہیں ہے۔ اگر ملت میں یہ پرابلم Arise (پیدا) ہو گئی ہے تو اب ملت ہی اس کو حل کرے گی۔ اس کے بعد اگلی چیز یہ آئی کہ صاحب! ایک بستا رستا گھر ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس گھر کے اندر اگر سوکن آ جائے اور ساتھ اس کے بچے بھی آ جائیں' تو اس گھر میں قیامت گزر جاتی ہے۔ وہاں مسئلہ ان دونوں (عورت اور اس کے بچوں) کو کچھ دینے کا تھا جس سے یہ بیچارے محروم ہو گئے تھے' یہ عورت بھی کچھ چیزوں سے محروم ہو گئی تھی' اور اس کے بچے اس Affection یعنی شفقت اور رافت اور رحمت اور محبت سے محروم ہو گئے تھے جو ماں باپ سے مل سکتی ہے۔ یہ سب تو Provide (مہیا) کرنے کا سلسلہ تھا۔ اور اب اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ یہ عورت اور اس کے بچے اس گھر میں آ جائیں' وہ اچھا بستا رستا گھر بھی جہنم بن جائے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اس جہنم کو ختم کرنے کے لیے اس پر یہ دوسری شرط لگا دی۔ اس کے بعد بھی ایسے لوگ ہیں جو ایسا انتظام کر سکتے ہیں لیکن اگر ان کے ہاں بھی یہی صورت ہو تو وہ عدل کی بات نہیں ہو سکے گی تو پھر بھی اس دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اب یہاں سوال عدل کا آ گیا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں پھر ایک بڑی پرلطف چیز آتی ہے۔ اس مقام پہ تو قرآن کریم نے نہیں بتایا کہ عدل سے مقصود کیا ہے؟ یہ عدل کس قسم کا ہو؟ آگے چل کر وہ آیت آتی ہے' اسے دیکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن کریم کی آیات کے ساتھ' جو اس نے کہا تھا کہ مذاق نہ بنا لینا' یہ کیا مذاق بنایا ہے؟ اُس آیت میں یہ کہا ہے کہ وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ (4:129) تم عورتوں کے درمیان عدل کر ہی نہیں سکتے خواہ کتنا ہی کرنا چاہو۔ اب جہاں تک محبت اور جاذبیت کا تعلق جذبات سے ہے اور جذبات میں یکسانیت ممکن نہیں۔ اب اس سے دوسری شادی یا شادیوں کے مسائل نے جنم لیا ہے۔

## دوسری شادی کے سلسلہ میں قرآن حمید نے عدل اور جذبات کی بات کی۔ اور یہ مومن مرد اور مومن عورت دونوں سے مخاطب ہے

لوگوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کے افراد یہ کہتے ہیں کہ قرآن حمید میں کسی حالت میں بھی ایک سے زیادہ شادی کی اجازت ہی نہیں ہے۔ اُن سے کہا جاتا ہے کہ دیکھیے! وہاں یہ ہے کہ ایک سے زیادہ' دو تین چار شادیاں کرو' اس طبقہ کا کہنا ہے کہ وہاں شرط یہ بتائی ہوئی ہے کہ عدل کرسکو جب کہ (4:129) میں یہ کہا ہے کہ تم کتنی ہی کوشش کرو' ان میں عدل کرنہیں سکو گے' لہٰذا اس آیت کی رو سے تو یہ بات ہوگئی کہ اُدھر پچکارنے کے لیے یہ کہدیا ''کوئی گل نئیں' کوئی گل نئیں'' (کوئی بات ہی نہیں) کرلو دو دو تین تین چار چار شادیاں۔ ''شرط اے ہیگی اے کہ کج پانی نال پیالہ بھریا ہویا ہووے' اوہنوں وِنگا وی کرو تے پانی گرے نئیں۔ جے نہ گرے تے سارا تہاڈا پیالہ'' (شرط یہ ہے کہ کچھ پانی سے پیالہ بھرا ہوا ہو' اسے ٹیڑھا کرو تو پانی نہ گرے۔ اگر نہ گرے تو تمام پیالہ تمہارا ہوا) یعنی شرطیں عائد کی جارہی ہیں کہ عدل کرو اور کہا یہ جارہا ہے کہ تم عدل کرہی نہیں سکتے۔ کہتے ہیں کہ دیکھا! قرآن حمید میں اللہ میاں نے کس طریقے سے اجازت دی!!! اجازت دی تو پھر چھین بھی لی' سبحان اللہ! کیا قانون لانے والا خدا ہے! یعنی اندازہ لگایئے آپ کے ہاں کوئی اس قسم کا قانون بنائے تو اسے کیا کہا جائے گا!!! مگر یہ فخر سے کہتے ہیں کہ اجازت بھی دیدی اور ساتھ شرط بھی ایسی لگادی جو کبھی قابلِ عمل ہی نہ ہو' عملاً اجازت منسوخ' قولاً اجازت اپنی جگہ موجود۔ بات یہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حمید نے وہیں بات کہدی کہ ایک چیز جذبات کی ہوتی ہے اور دوسری چیز معاملات کی ہوتی ہے۔ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے' وہ ہم جانتے ہیں کہ ان کے اندر مساوات مشکل ہے۔ عدل کے معنی مساوات ہوتا ہے۔

عدل کہتے ہیں[1] کہ یہ جو گدھوں گھوڑوں' اونٹوں کے اوپر بوریاں لادی جاتی ہیں وہ دونوں طرف ہوتی ہیں۔ بوریوں کا وہ بوجھ' ان کے آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر ہوتا ہے' عرب اسے عدل کہتے ہیں۔ آپ ذرا اس میں دیکھیے گا کہ اگر کبھی کسی ایک طرف کا بوجھ ذرا سا بھی زیادہ ہوجائے' تو وہ جو لدا ہوا بوجھ ہوتا ہے' وہ بوجھ بھی نیچے گرجاتا ہے اور جانور بھی بیٹھ جاتا ہے۔ عدل اس قسم کے برتاؤ کو کہتے ہیں جس میں یوں مساوات کی کیفیت ہو۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے' معاملات کی دنیا تک تو یہ چیز کی جاسکتی ہے' جذبات کی دنیا کے اندر یہ بات ہے کہ اس قسم کا عدل نہیں کیا جاسکتا لہٰذا جب ہم نے عدل کی شرط لگائی تھی تو یہ چیز نہیں تھی کہ ہم تم سے اس کی توقع کرتے تھے۔ کرنا

---

[1] **العدل** ۔ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک **عِدل** کہلاتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں ''برابر ہونا'' (حوالہ تاج العروس' نیز پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم (1961)' ص۔1139)۔

صرف یہ ہے کہ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (4:129) کہیں تمہاری یہ کیفیت نہ ہوجائے کہ تم پورے کے پورے ایک ہی طرف جھک جاؤ' تمہارا بوجھ ایک ہی طرف جھک جائے اور اس بیچاری کو جسے تم Protection (حفاظت) دینے کے لیے' شفقت اور رافت کے لیے' لائے بھی تھے' اس کی کیفیت یہ ہوجائے کہ نہ یہ بن بیاہی رہے' نہ یہ بیاہتا ہی ہو' بیچ میں لٹکی ہوئی ہو۔ یہ معلقہ ❶ جو علقہ ہے' اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ کسی کو درمیان میں لٹکا دیا جائے' وہ بھی معلقہ اور دوسرا یہ کہ کانٹوں میں چادر کو الجھا دیا جائے تو وہ بھی معلقہ ہو۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کیا لفظ لایا ہے قرآن! دوسری چیز یہ ہوئی۔

اب سیدھی سی بات ہے کہ یہاں جو اُسے لایا جا رہا ہے' یہ گھر خالی تو ہے نہیں' پہلی شادی تو یہ کر نہیں رہا' گھر میں تو پہلی بیوی موجود ہے۔ آپ سوچیے کہ اگر اس باب میں اس بیوی کی رضامندی نہ ہو تو کیا اس گھر کے اندر کسی قسم کا بھی عدل ہوسکتا ہے؟ نہیں' اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جو عائلی قوانین ہیں جن کے متعلق میں نے عرض کیا ہے کہ انہیں منسوخ کرانے کے لیے بہت بڑا اجہاد ہو رہا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں شرط یہ لگائی گئی تھی کہ اگر تمہارے ہاں ایسی کوئی Situation (صورت) پیدا ہوجائے' جو دوسری شادی کرنی ہے تو پہلی بیوی کی رضامندی اس کے اندر شرط ہے۔ اس میں بڑی حد تک ایک Protection (حفاظت) دی گئی ہے۔ وہ اسے توڑنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اب یہ کہا جائے گا کہ صاحب! یہ تو پھر وہی چیز ہوئی کہ گھر کے اندر جو بیوی یا عورتیں ہیں' یہ کہاں اس کی رضامندی دیں گی' آپ کہہ لیجیے کہ جبراً ہی راضی ہوجائے گی جیسے ہمارے ہاں اب یہ کرایا جاتا ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بات مومنین سے ہو رہی ہے اور مومنین میں مومن مرد بھی ہوتے ہیں' مومن عورتیں بھی ہوتی ہیں اور ایمان (Conviction) سے انسان کے اندر جو ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے' ہم اس سے لذت آشنا ہی نہیں ہیں کہ وہ کیا چیز پیدا کر دیتی ہے۔

## قرآنِ کریم نے آفت زدہ عورتوں کو سہارا مہیا کرنے کی خاطر دوسری شادی کی گنجائش رکھی ہے

جب کبھی ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ مومن عورتیں بھی یہ بات دیکھیں کہ ہماری بہنیں بغیر اپنے کسی قصور کے' محض ایمان لانے کی وجہ سے' اس پوزیشن کے اندر آ گئی ہیں کہ ان کو کوئی Protection (حفاظت) بھی نہیں ملی' معیشت کا سامان بھی نہیں رہا' رافت اور

---

❶ المعلقة ۔ وہ عورت جو شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے نہ شادی شدہ کی طرح ہو' نہ مطلقہ کی طرح۔ ازھری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ اس کے ساتھ انصاف کرے' نہ اسے چھوڑے اور اس طرح اس کی حالت شادی شدہ اور بے شوہر والی عورت کے درمیان ہوجائے اور وہ درمیان میں لٹکتی رہے (حوالہ محبّ الدین کی تالیف تاج العروس' پطرس بستانی کی محیط المحیط اور امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' نیز پرویزؒ کی لغات القرآن جلد سوم' ص۔1185)۔

محبت بھی ان کے بچوں کو نہیں مل رہی' وہ بے گھر' بے در' خانماں خراب' خستہ اور ویران صورتِ حال سے دوچار ہیں' ان کی یہ کیفیت ہے تو ایک مومن عورت کے دل کے اندر بھی اس کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھر آئیں گے۔ یہ وجہ تھی کہ ان حالات میں' جو میں نے عرض کیا ہے' مدینے میں پہلے دور میں' اس اجازت یا Relaxation (سہولت) کے بعد' جہاں جہاں ایک سے زیادہ شادیاں ہوئیں' آپ حیران ہونگے کہ گھر کی جو پہلی بیوی تھی' وہ چراغ جلا کر اس نئی آنے والی کا Reception (استقبال) دروازے پہ جا کر کیا کرتی تھی کہ آؤ بہن! بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم پہ یہ ایک آفت آ پڑی تھی' اس کا حل مل گیا ہے' آؤ! یہ تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔ مومن بننے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم ایک ہی طرف جھکے رہو۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے دوسری شادی کی صورت میں مرد کے لیے ایک ضروری تاکید اور دوسری شادی کے لیے ایک استثنا

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اب یہ رواج ہے کہ جو دوسری آتی ہے وہ پہلی کے اوپر سوار ہو کر' سر چڑھ کر آتی ہے اور اسے لانے والے کی کیفیت بھی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس نئی آنے والی کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم نے یہ چیز اس سے الٹ کہی ہے جو ہمارے ہاں دیکھنے میں آتی ہے کہ گھر کے اندر بیوی بچے ذلت کی زندگی میں ہیں۔

قرآن حکیم نے جسے گھر کے اندر سکینت' مودّت اور رحمت کی زندگی کہا ہے' وہ زندگی' اس بیوی کے ساتھ بھی ہو' جو چلی آ رہی ہے۔ اب ان حالات میں دوسری طرف وہ لائف (زندگی) ہے جس کے لیے ہماری معاشرت کا صرف ایک ضروری تقاضا ہے جس کو پورا کرنے کے لیے' اس آنے والی کو Protection (حفاظت) دی جا رہی ہے' اس کے بچوں کو لایا جا رہا ہے' یقیناً پہلی کے مقابلے میں دوسری کا یہ مقام نہیں ہو سکتا۔ ان کو کہا بھی یہ گیا کہ اسے لے جا رہے ہو تو وہاں اس کی کیفیت یہ نہ ہو جائے کہ نہ یہ بیچاری اس حالت میں رہے کہ وہ بن بیاہی ہے اور نہ ہی اس حالت میں رہے جہاں تمہاری پہلی بیاہتا ہے۔ کہا کہ ایسی کیفیت نہ پیدا کر دینا۔ عزیزانِ من! یہ ہیں وہ حالات جن میں قرآن کریم نے اس اہم معاشرتی مسئلے کا یہ حل تجویز کیا ہے۔ یہ حکم نہیں ہے۔ صرف کہا ہے کہ ایسی صورت Arise (پیدا) ہو جائے تو تمہارے ہاں چونکہ ''ایک بیوی اور ایک خاوند'' کا قانون ہے' اس میں اس قسم کی استثنا کی جا سکتی ہے۔ اور یہ ہے وہ استثنا جس پہ نبی اکرم ﷺ نے پہلے عمل کیا۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں کیے جانے والے اعتراضات

حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق عام طور پہ اعتراضات ہوتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اتنی بیویاں ہیں۔ پہلے تو آپ یہ دیکھ

لیجیے کہ قرآن مجید یہ چیز کہیں نہیں ہے کہ ایک وقت میں رسول اللہ ﷺ کے گھر میں کتنی بیویاں تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن میں جمع کا صیغہ آتا ہے کہ ایک سے زیادہ تھیں۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فلاں امہات المؤمنینؓ اس میں شامل تھیں لیکن یہ کہ ایک وقت میں کتنی تھیں' وہ کہیں نہیں ہے۔ کتنی بھی ہوں آپ یہ دیکھیے کہ وہ جو آئی تھیں' وہ حالات کیا تھے اور وہ کس قسم کی تھیں؟

## حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے پہلی شادی

نبی اکرم ﷺ کی پہلی شادی جب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی تو حضور ﷺ کی عمر پچیس سال کی تھی' وہ بھی بیوہ تھیں' بچوں والی تھیں' چالیس سال کی عمر تھی۔ اس ایک بیوی سے اُن کی پوری زندگی یعنی پچیس سال تک کے لیے نباہ کیا۔ خود حضور ﷺ کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگئی ہوئی تھی' پندرہ سال پہلے نبوت کے اور دس سال بعد کے بھی اس میں شامل ہیں اور جب ان کا انتقال ❶ ہوا ہے تو گھر میں کوئی اور نہیں تھا' نبوت' معاشرے اور حکومت کی' اتنی زیادہ ذمہ داریاں آ گئی ہوئی تھیں' گھر میں بچیاں بھی تھیں' یقیناً شادی کی ضرورت تھی۔

## حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی

پھر ہوئی ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی۔ یہ ہے وہ شادی جو یوں کہیے کہ آپ ﷺ نے ایک Unmarried Girl (غیر شادی شدہ لڑکی) سے کی۔ یہ حضرتِ عائشہ صدیقہؓ کی شادی ہوئی۔ بہترین گھر کو سنبھالنے والی یہی لڑکی ہوسکتی تھی۔ یہ صدیقِ اکبرؓ (573-634ء) کی بیٹی تھیں۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس بیٹی کی تربیت و پرورش کس طرح سے ہوئی ہوگی۔ خود حضرت عائشہؓ نے یہ کہا ہے کہ میں جس زمانے میں گھر میں کھیلا کرتی تھی تو یہ آیتیں ہوتی تھیں یعنی ہم گیت نہیں گایا کرتے تھے' ان آیتوں کو پڑھ پڑھ کر شاد ہوتے تھے۔ یہ اس گھر کی پرورش یافتہ بچی تھی۔ اور انؓ کے ساتھ بھی جو کچھ قیامت گزری ہوئی ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ آپ کے ہاں متفقہ طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی جب ان کا نکاح ہوا ہے' بڑی رعایت برتتے ہیں تو یہ ہے کہ نو سال کی تھی جب رخصتی

---

❶ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا انتقال 10 نبوی میں ہوا۔ آپؓ حضرت اسماءؓ (بنت حضرت ابوبکرؓ) کی چھوٹی بہن تھیں۔ حضرت اسماءؓ کے متعلق صاحبِ مشکوٰۃ شریف شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی کتاب ''اکمال فی اسماء الرّجال'' میں لکھتے ہیں کہ ''حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں' انہوں نے ایک سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت 73ھ تھا یعنی (1) حضرت اسماءؓ کی عمر 73ھ میں سو سال تھی۔ (2) لہٰذا ہجرت کے وقت ان کی عمر 27 سال تھی (100-73=27) اور (3) حضرت عائشہؓ ان سے 10 سال چھوٹی تھیں۔ (4) اس لیے ہجرت کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر 17 سال تھی اور (5) چونکہ حضرت عائشہؓ کی شادی 2ھ میں ہوئی تھی اس لیے شادی کے وقت ان کی عمر 19 سال تھی' نہ کہ 9 سال (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1968 (ترمیم شدہ ایڈیشن)' ص۔ 379)۔

ہوئی ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ محض اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے مطابق نابالغ کی شادی ہوسکتی ہے' تو اس کے لیے انہیں کہیں اور سے اس کی دلیل نہیں ملتی تھی' یہ ایک چیز وضع کر لی ۔ بہر حال' عزیزانِ من ! میں یہ فخر سے تو نہیں کہتا' خدا کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے یہ بطور تحدیثِ نعمت ہے کہ یہ سعادت اس فقیر ❶ کو ہی حاصل ہوئی' اور تو کوئی ذریعۂ علم ہمارے پاس ہے نہیں' یہی تاریخ کی کتابیں' یہی حدیث کی کتابیں' ہمارے پاس آ رہی ہیں اور کہاں سے معلوم کریں گے ۔ یہ چیز کتنی مسرت اور خوشی کی ہے کہ انہی کتابوں سے میں نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت عائشہؓ کی عمر انیس سال کی تھی جب آپؐ کی شادی ہوئی ہے۔ میرے ہاں ''طاہرہ کے نام خطوط'' کے اندر بھی یہ چیز موجود ہے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ میرے خلاف جو کفر کا فتویٰ لگا تھا' اس میں ایک یہ چیز بھی تھی کہ یہ حضرتِ عائشہؓ کی عمر انیس سال بتاتا ہے جب آپؐ کی شادی ہوئی ❷۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ کفر نہیں تو اور کیا ہوسکتا ہے ۔ بہر حال یہ تھی آپ کی یہ شادی' جو ہوئی۔

مدینے کی زندگی شروع ہوئی' دوسرے ہی سال جنگِ بدر ❸ ہوئی' تیسرے سال جنگِ احد ❹ ہوئی اور اس پر مزید یہ کہ پے در پے یہ ہنگامے ہوئے۔ مکے سے جو مہاجر عورتوں کی آمد شروع ہوئی' مدینے میں بیوہ عورتیں ہیں' ساتھ بچے ہیں' چھوٹی سی یہ کمیونٹی ہے' یوں کہیے کہ ہر دوسرے دن جنگ ہے' یہ تھی کیفیت جس سے نبرد آزما ہونا تھا۔ان خاندانوں میں اس قسم کی عورتیں بھی تھیں' بوڑھی بھی تھیں اور بیوہ بچوں کے ساتھ بھی تھیں۔ اب کیا کیا جائے ؟ کہاں جائیں ؟ کوئی اور جگہ نہیں تھی' انہیں حضورﷺ اپنی Protection (حفاظت) میں لے آئے تھے۔ یہ تھے عام حالات۔

## حضرت عمرِ فاروقؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کی شادی کا ماجرا

اسلام سے پہلے بھی حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) کی شخصیت' ایک بہت ممتاز شخصیت تھی ۔ یہ بہت بڑا گھرانہ تھا۔حضرتِ عمرؓ فاروق کی بیٹی حضرتِ حفصہؓ ہیں ۔آپ کو معلوم ہے کہ مدینے میں ہی اس کمیونٹی پر پہلی افتاد پڑی ہے۔ ہوا یوں کہ ان میں کچھ گروہ تھے جنہیں حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑ گئی تھی ۔اس گروہ میں مسلمان عورتیں اور ان کے خاوند بھی تھے۔حضرتِ حفصہؓ ' حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی' اپنے خاوند (حضرت خنیسؓ بن حذافہ) کے ساتھ' حبشہ میں ہجرت کر کے گئی تھیں ۔حالات بہتر ہوئے تو مدینے میں واپس آ ئیں' احد کی جنگ(4) میں خاوند شہید ہو گیا۔ہوا یوں کہ جنگِ احد میں زخمی ہوئے اور مدینہ میں وفات پائی۔حالات ایسے تھے کہ حضرت

---

❶ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔
❷ اور اسی طرح ایک یہ بھی کہ جب یہ شخص ہنستا ہے تو اس کے دانت نظر آتے ہیں۔
❸ جنگِ بدر (17 ۔رمضان 2ھ مطابق 13۔ مارچ 624ء)
❹ جنگِ احد (14۔شوال 3ھ مطابق 29۔ مارچ 625ء)

عمر فاروقؓ جیسی شخصیت کو حضرت حفصہؓ کی شادی کے لیے درخواست پیش کرنا پڑی۔ جو قریبی دوست تھے' آپؓ انہی سے کہہ سکتے تھے۔ ان میں ایک حضرتِ ابوبکر صدیقؓ (634-573ء) تھے۔ آپؓ نے انکار کر دیا کہ یہ بوجھ نہیں اٹھایا جا سکتا' دوسرے حضرتِ عثمانؓ (656-573ء) تھے' اُنہوںؓ نے بھی انکار کر دیا۔ ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ Situation (صورتِ حال) کیسی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ اور ان کی اس بیٹی (حضرتِ حفصہؓ) کے اوپر' کیا گزرتی ہوگی کہ جس نے ان حالات میں حبشہ جیسے مقام پہ ہجرت کی۔ آپ سوچیے کہ حضرت عمرؓ کی اس بیٹی نے وہاں کس طرح سے دن گزارے ہونگے۔

عزیزانِ من! آپ سوچ سکتے ہیں کہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے انہوں نے غیر مسلموں کے ملک میں جا کر پناہ لی ہوئی ہے۔ یہ بیچاریاں وہاں نامساعد زندگی بسر کر کے آئیں۔ انہیں تو خدا خدا کر کے پھر واپس آنے کی مہلت ملی' دوسرے ہی سال جنگِ احد (14۔ شوال 3ھ) میں خاوند (حضرتِ خنیسؓ) شہید ہو گیا اور کیفیت یہ ہے کہ ممتاز گھرانے کی یہ خاتون ہیں' باپ ان سے Request (درخواست) کر رہا ہے' ان سے شادی کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہو رہا۔ (حضرت عمرؓ نے اس مشکل کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا)۔ ان حالات میں حضور ﷺ نے یہ کہا کہ ''جسے کہیں اور پناہ نہیں ملتی' کاشانۂ نبوی ﷺ اس کے لیے پناہ ہے' عمرؓ! حفصہؓ کو یہاں بھیج دو''۔ کہتے ہیں حضور ﷺ نے شادیاں کی تھیں' کیا یہ شادیاں ہیں!!!

## حضرت سودہؓ کا معاملہ

عزیزانِ من! یہ حضرت سودہؓ ❶ بھی انہی میں سے تھیں جنہوں نے حبشہ میں ہجرت کی تھی۔ یہ وہاں گئیں' وہاں خاوند (سکران بن عمر) مر گیا۔ یاد رہے میاں بیوی دونوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ سوچیے تو سہی کہ اس کسمپرسی کے عالم میں' دیارِ غیر میں' وہاں خاوند مر گیا' کوئی مکان نہیں ہے جہاں جا سکیں' کوئی جگہ نہیں ہے جہاں Protection (حفاظت) مل سکے' یہاں کے حالات آپ دیکھ چکے ہیں کہ کیا صورت تھی۔۔۔ کوئی جگہ ان کے لیے نہیں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ پھر کاشانۂ نبوی ان کے لیے پناہ ہے (آپ ﷺ نے انہیں اپنی زوجیّت میں لے کر ان کے سکونِ دل جمعی کا سامان مہیا کر دیا)۔

سنیے' عزیزانِ من! غور سے سنیے! یہ معمر عورتیں تھیں' دو دو تین تین دفعہ کی بیوہ ہوئی تھیں' بچوں والی تھیں' کتنی کتنی ہی ان کی عمریں تھیں' بس یہ سب بڑھاپے کے ہی زمانے میں تھیں۔

---

❶ حضرت سودہؓ سے نکاح کس وقت ہوا تھا' اس کے متعلق یقینی طور پر معلوم نہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام شادیاں 3ھ سے 7ھ تک کے زمانہ میں ہوائیں۔ (پرویزؒ: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1968' ص۔ 377)

## حضرتِ ام سلمہؓ کا ذکر

سنیے! یہ حضرتِ ام سلمہؓ ہیں۔ یہ بھی انہی میں سے تھیں جنہوں نے حبشہ کی طرف (اپنے خاوند کے ساتھ) ہجرت کی تھی' وہاں سے واپس آئیں' خاوند (حضرت ابوسلمہؓ) جنگِ احد ❶ کے اندر شہید ہوگیا۔ ان کے لیے پھر وہی Situation (صورتِ حال) Arise (پیدا) ہوگئی۔ پھر وہی بیوہ ہے' بچوں والی ہے' خانماں خراب ہے' Protection (حفاظت) کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور ان کی تمام عمر اسلام کی خاطر اندوہ و مصائب میں گزری تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر حضورؐ نے اس کنبہ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔

## حضرت ام حبیبہؓ سے شادی کا معاملہ

ایک ام حبیبہؓ ہیں۔ یہ مکہ کے سردار ابوسفیان جیسے ممتاز قریش کی بیٹی ہیں۔ آپ سوچیے کہ یہ کتنی ممتاز تھیں! اسلام لے آئیں' ابو سفیان جیسا باپ اور بیٹی اسلام لے آئی ہوگی تو گھر میں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ بہرحال' انہیں بھی اپنے خاوند (عبداللہ بن جحش) کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ وہاں جا کر خاوند نے شراب پینی شروع کی' حبشہ عیسائیوں کا ملک تھا' اب اسے ایتھوپیا ❷ کہتے ہیں' وہاں وہ خاوند عیسائی ہوگیا (لیکن حضرت ام حبیبہؓ مسلمان رہیں)۔ پیچھے باپ ہے' جس کی مرضی کے خلاف یہ سارا کچھ ہوا ہے' یہ شادی ہوئی ہے' ایسا دیارِ غیر ہے' جہاں کوئی باقی نہیں رہا۔ حبشہ سے ام حبیبہؓ کی یہ پکار حضورﷺ کی طرف آئی کہ ''میرے لیے تو اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے''۔ حبشہ سے بہرحال واپس آنا ہے' باپ کے گھر میں جا نہیں سکتیں' (وہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن ہے) خاوند ہے نہیں' کوئی اور رشتہ دار ایسا نہیں ہے' (یہ تمام غیر مسلم ہیں' ایک' خاوند کا سہارا تھا' وہ اس طرح ختم ہوگیا)۔ یہ بھائی (امیر) معاویہؓ ہے' یہ بھی تو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے' یہ تو فتح مکہ ❸ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں۔ اب یہ کہاں جائیں؟ حضورﷺ نے ایک پیغامبر کی زبانی اس شاہِ حبش کی وساطت سے یہ پیغام بھیجا تھا کہ ''گھبراؤ نہیں' کوئی اور مقام نہیں ہوگا' تمہارے لیے یہ گھر موجود ہوگا' تم اس گھر میں آ سکتی ہو''۔ (یہی حضرت ام حبیبہؓ ہیں کہ جب ان کا باپ (ابوسفیان) ملنے کے لیے آیا ہے تو انہوں نے بستر لپیٹ کر ایک

---

❶ جنگِ احد (14 شوال 3ھ مطابق 29۔ مارچ 625ء)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپؓ جنگِ بدر میں شریک ہوئے اور جنگِ احد میں زخمی ہو کر شہید ہوگئے

❷ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ایتھوپیا (Ethiopia) کو ابے سینیا (Abyssinia) یعنی حبشہ یا حبش کہتے تھے۔

❸ سن 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا۔

طرف کر دیا کہ اس پر نہ بیٹھے۔اس نے کہا کہ بیٹی! مجھ سے بستر الگ رکھتی ہو؟ فرمایا کہ یہ وہ بستر ہے جس پر رسول اللہ ﷺ استراحت فرماتے ہیں' ایک مشرک اسے نہیں چھوسکتا)۔

## حضرت زینبؓ کی داستانِ غم

عزیزانِ من! اب یہ حضرتِ زینبؓ ہیں' دو دفعہ پہلے بیوہ ہو چکی تھیں یا مطلقہ تھیں' (ان کا پہلا نکاح طفیل سے اور دوسرا عبیدہ سے ہوا تھا)' ان کے بعد تیسرا خاوند (عبداللہ بن جحش) تھا۔ وہ جنگِ احد میں شہید ہو گئے' یہ بھی اس کاشانۂ نبوی ﷺ کے اندر آئیں' یہ اتنی مضمحل تھیں کہ نکاح کے تین چار (اور بعض کے نزدیک 2 یا 3) مہینے کے بعد انتقال کر گئیں۔اب اور آگے بڑھیے!

## حضرت زینبؓ کی الم انگیز اور حیرت زا داستان

ان میں ایک حضرتِ زینبؓ ہیں' وہ آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ یہ وہی ہیں جن کی حضرتِ زیدؓ کے ساتھ شادی ہوئی تھی جو نبھ نہیں سکی تھی' حضرت زیدؓ آپ ﷺ کا آزاد فرمودہ غلام تھا اور منہ بولا بیٹا بھی۔ جب میں وہاں (33:37) پہ آؤنگا تو وہ واقعات پیش کرونگا لیکن وہ Situation (صورتِ حال) ایسی تھی کہ حضور ﷺ نے وہ شادی کرائی تھی۔ اب ایک غلام کی مطلقہ کے ساتھ' قریش میں سے کون تھا جو شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اور اس زینبؓ کے ساتھ کیا بیتی ہوگی کہ قریش بنو ہاشم کی اتنی بڑی ممتاز گھرانے کی خاتون کی شادی ایک غلام کے ساتھ کی گئی اور اس نے بھی طلاق دیدی۔ کیسا دل نہیں ٹوٹا ہوگا! ایک یہ ام المؤمنینؓ تھیں۔

عزیزانِ من! یہ تھا وہ گھرانہ جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! حضور ﷺ کی یہ اتنی شادیاں ہوئیں! یہ شادیاں کن سے کی تھیں؟ ان سے جو دو دو تین تین دفعہ کی بیوائیں تھیں' بچوں والی تھیں' معمر تھیں' خاوند جنگوں میں شہید ہو گئے ہوئے تھے' کوئی بیچاری حبشہ کے اندر کسمپرسی کے عالم میں رہ گئی ہوئی تھیں۔

## حضرت میمونہؓ کا ذکرِ خیر اور فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ کا اپنی بیویوں سے خطاب

یہ حضرتِ میمونہؓ ہیں۔ یہ مکے میں تھیں' پہلے مسعود کے نکاح میں تھیں۔ اس نے طلاق دیدی تو عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں' یہ ہجرت کر کے بھی نہیں آسکی تھیں' اتنی مصائب میں گھری ہوئی تھیں۔ جب نبی اکرم ﷺ نے 7ھ میں عمرہ فرمایا تو اس وقت وہ بیوہ ہو گئی تھیں' جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی (حضرت عباس نے نبی اکرم ﷺ سے ان کی شادی کی تحریک کی اور آپ ﷺ نے اسے قبول فرما

لیا)۔اور یہ تھی نبی اکرم ﷺ کی آخری شادی ❶۔

عزیزانِ من! سن آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہوا' حالات بدل گئے' جنگیں ختم ہوگئیں' معاشرے میں خوشحالی آ گئی' تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے اس گھرانے کے اندر کیا بات ہوئی؟ سب سے پہلے جب حالات پرسکون ہوگئے' نارمل ہوگئے' اعتدال پہ آ گئے' خود قرآن (29-33:28) میں ہے۔اندازہ لگایئے کہ یہ سب حالات کے تقاضے کے ماتحت ہوتا تھا جسے یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اتنی شادیاں کیں۔ جب حالات کے پرسکون ہونے کی اور معاشرے میں خوشحالی کی یہ کیفیت ہوگئی تو قرآن کریم میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان ازواجِ مطہراتؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ جن حالات میں آپ اس گھر میں آئیں تھیں' آپ کو معلوم ہے' اللہ کا شکر ہے' کہ اب وہ حالات بدل گئے ہیں' معاشرے کے حالات اچھے ہوگئے ہیں' خوشحالی کی زندگیاں بسر کی جاسکتی ہیں' میرا گھر کہنے کو تو ایک سربراہِ مملکت کا گھر ہے لیکن پوری مملکت میں سب سے غریب تر گھر یہ گھر ہوگا' تم آئی تھیں تو اس زمانے میں مجبور تھیں' میں اب تمہیں مجبوری کی حالت میں نہیں رکھنا چاہتا' میری طرف سے اب اجازت ہے' تم میں سے جو سمجھے کہ اسے اس گھر سے بہتر گھر کہیں اور مل سکتا ہے تو میں خود اُسے خوشی سے رخصت کر دونگا۔ یہ تھا آپ ﷺ کی اپنی ازواج مطہراتؓ سے خطاب۔

## نبی اکرم ﷺ کے اعلانِ عام کے جواب میں ازواجِ مطہراتؓ کا ردِعمل

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ یہ کیا ہی ارفع واعلیٰ اعلان تھا! قرآن حمید اس کی شہادت دیتا ہے کہ جب ان سے یہ کہا گیا تو انہوںؓ نے کہا کہ حضور ﷺ! آپ ﷺ نے یہ کیا فرمایا! اس گھر کی چھت کے سوا دنیا کی کوئی اور چھت بھی ہوسکتی ہے جہاں یہ سکون اور جنت کی زندگی میسر آئے! آپ ﷺ تو کہتے ہیں کہ یہاں کچھ عسرت کی زندگی ہوگی' اس گھر کے فاقے تو دوسرے گھروں کی آسودہ حالی

---

❶ نبی اکرمؐ کی دو شادیاں مصلحت کے تحت عمل میں آئیں۔ایک ہے حضرت جویریہؓ اور دوسری ہے حضرت صفیہؓ سے شادی۔حضرت جویریہؓ قبیلۂ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں۔انؓ کا شوہر غزوۂ مریسیع میں قتل ہوگیا اور یہ خود اسیر ہوگئیں۔انہوںؓ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔آپؐ نے آزاد کر دیا۔اس وقت اس قبیلہ کے سات سو جنگی قیدی مسلمانوں کے پاس تھے۔حضرت جویریہؓ حضورؐ کے ساتھ عقد پر رضامند ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جنگی قیدی رہا ہوگئے اور اس قبیلہ سے خوشگوار تعلقات وابستہ ہوگئے۔

جنگِ خیبر کے قیدیوں میں سے حضرت صفیہؓ بھی تھیں۔باپ بنی نضیر کا رئیس اور ماں بنو قریظہ کے رئیس کی بیٹی۔یہی یہودیوں کے ممتاز ترین قبائل تھے جن سے جنگ تھی۔حضرت صفیہؓ کا پہلا خاوند سلام بن مشکم تھا۔اس نے طلاق دیدی تو دوسرا نکاح کنانہ سے ہوا۔اس جنگ میں کنانہ اور حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی سب مارے گئے۔اتنی بڑی ممتاز خاتون کے لیئے' ان حالات میں' کاشانۂ نبویؐ سے بڑھ کر اور کون سا مقام رفیع ومنیع ہوسکتا تھا۔اس رشتہ سے یہودیوں اور مسلمانوں میں باہمی رابطہ کی راہ نکل آئی (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' 1949' ص۔747)۔

سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ وہ کون بدنصیب ہے جو اس گھر کے سائے سے نکل کر کسی دوسرے گھر کے سائے میں چلی جائے!

## ازواجِ مطہراتؓ کے احترام اور اُن کے رتبے کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم

آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ اسے بھی سمجھ لو کہ اس گھر میں رہو گی تو تم امہات المؤمنینؓ ہو جاؤ گی' تمہاری حیثیت امت کے مردوں کی ماؤں کی سی ہو جائے گی' حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی تم سے کوئی شادی نہیں کر سکے گا' اس کو سوچ لو۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ اس کے بعد کسی اور جگہ شادی کا سوال ہی نہیں ہے' یہ بھی سب قبول ہے۔ یہ درجہ کسے حاصل ہو سکتا ہے! اور اس کے بعد اس مردؓ سے' یعنی حضورِ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ اب آپ ﷺ بھی سن رکھیے' یہ نہ ہو کہ حالات بہتر ہو گئے ہیں' خوشحالی ہو گئی ہے' زندگی کسی اور نہج کی ہو گئی ہے' تم بھی اب کوئی شادی نہیں کر سکتے حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی کو طلاق دے کر الگ کرنے کی بھی حالت پیش آ جائے تو اس کی جگہ بھی تم کوئی بیوی نہیں لا سکتے۔ یہ ہیں نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق سرگزشت۔

## ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کی لِم' طریقِ کار اور یوا ین او میں غلام' لونڈیوں کے معاملے پر خادم الحرمین شریفین کا ردّعمل

عزیزانِ من! یہ ہیں قرآنِ کریم کی وہ پابندیاں جو اس نے ایک سے زیادہ شادی کے لیے عائد کی ہیں۔ اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ یتٰمیٰ کے مسئلہ کا کوئی منصفانہ حل نہ مل سکتا ہو' معاشرہ اِسے طے کرے کہ حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں' مملکت اس قانون کے اندر' جو وحدتِ زوج (Monogamy) کا ہے' Relaxation (سہولت) کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس میں Exception (استثنا) کرے۔ دوسرا یہ کہ اس اجازت کے بعد پھر اپنے حالات دیکھے جائیں کہ گھر کے اندر ایسی صورت پیدا ہو گی کہ عدل اور انصاف' شفقت اور محبت' راحت و رحمت کی زندگی بسر ہو جائے۔ جہاں یہ کیفیت پیدا ہو کہ میاں بیوی دونوں اس صورت کے اندر راضی ہوں' تو وہ شادی کر کے لائیں۔ یہ گھر کے اندر آ کر گھر والی کی بہن بنے' یہ بچے ان کے بچے بنیں' وہ چیز جس سے یہ محروم ہو گئے ہوئے تھے' وہ چیز اس چھت کے نیچے ان کو میسر آئے۔ کہا ہے کہ اگر سمجھو کہ تم یہ کچھ کر سکو گے تو پھر اجازت دی جا سکتی ہے کہ ایک کی موجودگی میں دوسری شادی ہو اور اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوتی تو فَوَاحِدَةً (4:3) ہے' قانون تو وہ ایک کا موجود ہے۔

اب آگے اس کے بعد کہا ہے کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:3) یا جو کہا جاتا ہے کہ پھر اور غلام اور لونڈیاں ہیں۔۔۔ تو یہ اور بات سامنے آ گئی۔ اسلام میں غلام اور لونڈیاں' بالخصوص لونڈیوں کی کیا پوزیشن ہے؟ یہ کیا بات ہے؟ پھر وہ سوال آ گیا جو وضاحت

چاہتا ہے۔ آپ کے ہاں کا مسئلہ تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ نہ نکاح کی شرط ہے' نہ تعداد کی شرط ہے' نہ طلاق کی شرط ہے۔ جنگی قیدیوں میں سے جتنی قابو آئیں' وہ بانٹ دی جائیں۔ سپاہی گھروں میں رکھیں' استعمال کے بعد جس کو جی چاہے تحفۃً دیدیں' بازار میں جا کر بیچ دیں' وہاں سے خرید کر نئی لے آئیں۔ ان کے ہاں عورت کی یہ وقعت ہے۔

یہ قوم انکوائری کمیشن بٹھاتی ہے کہ ہمارے اوپر خدا کا یہ عذاب کیوں ہے۔ اس کے لیے انکوائری کمیشن بٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ عزیزانِ من! جس قوم میں انسان کو کھڑا کر کے نیلام کیا جاتا ہو' اس پہ آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا تو اور کیا ہوگا۔ اس قوم کی اب تک یہی صورت رہی' وہ تو غنیمت ہے کہ کفار نے آپ پر اتنا دباؤ دیا' یو این او کے اندر یہ مسئلہ سامنے آیا' اُنہوں نے غلامی کے مسئلہ [1] پر بات کی' اپنے چارٹر کے اندر یہ چیز رکھی۔ اندازہ لگائیے' شرم کے مارے ڈوب مرنے کا مقام ہے' اُنہوں نے اپنے ہاں اوریجنل چارٹر بنایا۔ جب یہ ہیومن رائٹس کا چارٹر بنا جس میں یہ تھا کہ غلامی Abolish (ختم) کی جاتی ہے' غلامی نہیں رہے گی تو دنیا کی کافر مشرک فاسق و فاجر قوموں نے اس چارٹر کے اوپر دستخط کیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دستخط نہ کرنے والوں میں تو وہ خادم الحرمین شریفین ہیں' دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت' سعودی عرب' نے یہ کہہ دیا کہ نہیں صاحب! ہمارا دین اس کی اجازت نہیں دیتا' ہم دستخط نہیں کرتے۔ اور کل تک مکے کے اندر غلام اور لونڈیاں نیلام ہوتی تھیں۔

## آخر کار زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونا پڑا مگر پھر بھی!!

وہ تو آج زمانے کا تقاضا ہے' شرافت سے کوئی کچھ نہیں کرتا تو زمانے کا تقاضا مار مار کر وہ کچھ کرا دیتا ہے۔ اب تو ماتحت مزدوروں اور ماتحت ملازموں کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا ہوا ہے چہ جائیکہ آپ غلاموں اور لونڈیوں کو اس طرح سے قابو رکھیں۔ ان حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہاں یہ صورت ہے کہ یہ نیلامی کی شکل تو نہیں لیکن ان کے حرموں کے اندر اب بھی وہ سب کچھ چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں لونڈیوں کا احوال۔ اور پھر وہی قیامت ہے کہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن مجید سے غلام اور لونڈیوں کا تصور ثابت ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! آگے یہ چیز آئی ہے کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:3) ۔ یہ چیز ہم آئندہ درس پہ اٹھار کھتے ہیں۔ یہ مستقل موضوع ہے اور بات صاف کرنے کی ہے۔ چودہ سو سال سے آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے کہ یہ کیا چیز ہوگی۔

قرآنِ کریم میں فَوَاحِدَةً (4:3) ایک ہی بیوی کا قانون ہے۔ یہاں میں یہ اتنی سی بات کہہ دوں کہ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا

---

[1] یاد رہے کہ 1800ء میں بنجامن فرینکلن ویڈ (Benjamin Franklin Wade) نے پہلا غلامی کی منسوخی کا بل پیش کیا تھا۔

تَعُوۡلُوۡا (4:3) یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں تاکہ تم کسی طرح سے ناانصافی نہ کرسکو۔ اور اس کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بھی یاد رکھو! اس طرح کرنے کے بعد اتنے کثیر العیال بھی نہ ہوجانا کہ تمہیں یہ بوجھ ہی لے ڈوبے۔ اس آیت کے یہ بھی معنی ہوتے ہیں۔ یہ جو فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) کے خلاف لٹھ لے کر پھر رہے ہیں' قرآن مجید نے تو یہ کہا ہوا ہے لیکن میں یہ بات آگے چل کر بیان کروں گا۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ النسآء کی تیسری آیت تک ہی لے سکے اور وہ بھی پوری نہیں ہوسکی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایک موضوع جو سامنے آیا' اس کے متعلق میں قرآن مجید سے اپنی بصیرت کے مطابق وضاحت کرچکا ہوں۔ آگے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

# تیسرا باب: **سورۃ النسآء** (1) ، (آیات 3(مسلسل) اور 4)

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴

عزیزانِ من! آج جون 1970ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں کہیے کہ سورۃ النس آء کی تیسری ہی آیت سے ہوتا ہے: (4:3)۔

## قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر رفیقۂ حیات کے ضمن میں ایک بیوی کا ہی اصول ہے تو پھر یہ ماملکت کیا ہے؟

تیسری آیت کو ہم نے پچھلے درس میں لے لیا تھا لیکن اس کا صرف ایک حصہ سامنے آ سکا تھا۔ اس پہلے حصے میں یہ کہا گیا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے قانون' اصول' ایک وقت میں ایک بیوی کا ہے' واحدۃ کا ہے' جسے Monogamy (وحدتِ زوج) کہتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم نے ایسا صرف ان خصوصی حالات سے نپٹنے کے لیے استثنا کیا ہے جن میں یتیم بچوں' بالغ لڑکیوں' بیوہ (اور مطلقہ) عورتوں کا' اس کے سوا کوئی دوسرا منصفانہ حل نہ ہو کہ انہیں حفاظت (Protection) کے لیے گھر کی ضرورت ہو اور جو قانونِ وحدت یعنی ایک بیوی کا قانون' کی رو سے یہ چیز ممکن نہ رہی ہو۔ ایسے ہنگامی حالات کے لیے جسے آپ ایمرجنسی کو Meet (تسلیم کر کے اس کے تقاضا کو پورا) کرنا کہتے ہیں' اس کے لیے قرآن حمید نے اس قانون کے اندر ایک Relaxation (سہولت) یا ایک Exception (استثنا) کی ہے۔ یہ چیز پچھلے درس میں سامنے آ چکی تھی۔ اور میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں ایک سے زائد بیویوں کے سلسلے میں صرف یہ ایک آیت ہے اور اس آیت کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ اگر تم میں خوف ہو کہ اس مسئلہ کا کوئی اور حل نہیں ہے تو اس میں یہ جو استثنائی صورت ہے' اس سے کام لیا جا سکتا ہے ورنہ ایک ہی بیوی کا قانون ہے۔ اور اس سے آگے کہا تھا کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ( (4:3۔ یہ تھا اس آیت کا وہ ٹکڑا جسے ہم نے آج پر اٹھا رکھا تھا کیونکہ اس سے ایک نیا موضوع سامنے آتا ہے۔

## قرآنِ حکیم میں ''مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' کے متعدد معانی

عزیزانِ من! مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (4:3) کا لفظی ترجمہ ہوتا ہے ''جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے ہوں یا جو معاہدہ کی رو سے تمہاری ملکیت میں آ چکے ہوں''۔ اور عام طور پہ اس سے مفہوم غلام اور لونڈیاں لیا جاتا ہے اور اس آیت میں کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ تم ایک بیوی کرو' اس کے بعد چار تک بیویاں رکھ سکتے ہو اور ان کے علاوہ لونڈیاں' جن کی کوئی تعداد نہیں ہے' وہ بھی رکھ سکتے ہو۔ درس میں' میں نے چار بیویوں تک کا کیا قصہ لیا ہے اور قرآن حکیم نے اس کے متعلق کیا کہا ہے' عرض کیا تھا اور اب میں یہ عرض کرونگا کہ اس کے علاوہ جو کہا جاتا ہے کہ اتنی لونڈیاں رکھ سکتے ہو تو یہ کیا مسئلہ ہے؟

قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ آیا ہے۔ بعض آیات میں تو اس کے معنی ہیں: ''وہ لوگ جو تمہاری ماتحتی میں کام کرنے والے ہوں''۔ یہ بھی اس کے معنی ہوتے ہیں۔ بعض آیات میں بیویوں کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں' معاہدے کی رو سے جو آپس میں میاں بیوی بن چکے ہوں۔ اُن آیات سے ہمیں اس وقت تعلق نہیں ہے' جب وہ آئیں گی تو میں عرض کرونگا کہ یہاں ان کے یہ معنی ہیں۔ اور بعض آیات میں ان کے معنی واقعی غلام اور لونڈیوں کے ہیں اور یہیں سے یہ چیز آپ کے ہاں آئی کہ اسلام میں غلامی کی اجازت ہے۔

## لونڈیوں کا تصورِ متواتر اور مباحث

غلامی میں غلام تو یونہی برائے وزنِ بیعت کہا جاتا ہے اصل زور لونڈیوں کے متعلق دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں لونڈیاں رکھنے کی اجازت ہے۔ لونڈیوں کی تعداد کوئی نہیں ہے ان کے ساتھ نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ معاف رکھیے گا میرے لیے بڑی دقت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹیاں اور بہنیں مجلس میں ساتھ ہوتی ہیں' برہنہ گفتگو نہیں کی جاسکتی' اس واسطے ایمائیت اور کنائیت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان لونڈیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں استعمال کے بعد منتقل کیا جاسکتا ہے' بیچا جاسکتا ہے' کسی اور کو دیا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ استعمال کی شے ہو جاتی ہیں جن کے آپ مالک ہو جاتے ہیں اور جس طرح سے ہر مملوکہ مستعملہ شے کے ساتھ کیا جاتا ہے' یہی کچھ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کے ہاں ہزار برس سے مسلسل چلی آ رہی ہے اور اگر آپ فقہ کی کتابوں میں دیکھیں تو ان کے متعلق اتنے قوانین' اتنے ضوابط' اتنے Discussions (مباحث) ہیں کہ 'ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے'۔ میں نے شاید پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ یہ چیز اس حد تک آپ کے ہاں متواتر چلی آ رہی ہے اور ایک ایسے مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ سر سیدؒ احمد خاں (1898-1817ء) سے پہلے شاید ہی کسی نے اس کے خلاف کوئی لفظ[1] کہا ہو' معتزلہ کے زمانے میں کچھ باتیں ہوئیں تو وہ ہم تک پہنچ نہیں سکیں۔

---

[1] البتہ امریکا میں بنجامین فرینکلن ویڈ (Benjamin Franklin Wade) نے 1800ء میں کہا۔

## غلاموں اور لونڈیوں کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کے منشور کی مخالفت

اس مسئلہ کی حیثیت کتنی زیادہ گہری اور اہم ہوگئی ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی کل کی بات ہے' غالباً 1948ء میں United Nations(اقوامِ متحدہ) نے' اقوامِ متحدہ کی اسمبلی میں' جو ہیومن رائٹس (بنیادی حقوقِ انسانیت) کا منشور یا چارٹر تیار کیا تھا' اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ غلامی کو منسوخ کیا جائے گا' انسان کا بنیادی حق آزادی ہے اور کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو اپنا غلام بنالے اور غلامی (Slavery) میں غلام اور لونڈیاں دونوں آتی تھیں۔ یونائیٹڈ نیشنز (اقوامِ متحدہ) کی جتنی ممبر اقوام تھیں' انہوں نے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے' اس چارٹر' اس منشور کے مسودے پر' دستخط کیے لیکن مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت جو حجاز کے والی تھے' انہوں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے' یہ دین کے معاملے میں مداخلت ہے' ہم غلامی کو منسوخ کرنے کے چارٹر پر دستخط نہیں کر سکتے۔

ساری دنیا کی ان اقوام میں جو یونائیٹڈ نیشنز (اقوامِ متحدہ) کی ممبر ہو چکی تھیں یہ واحد مثال تھی کہ صرف انہوں نے انکار کیا اور انکار یہ کہہ کر کیا کہ یہ ہمارے دین کے معاملے میں مداخلت ہے' ہم اس پر دستخط نہیں کر سکتے اور پھر ان کے اس انکار پر آپ کے ہاں' کہیں سے' صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی کہ آپ بھری محفل میں یہ کیا بات کہہ رہے ہیں' اس لیے کہ آپ کے ہاں جتنے بھی مروجہ قوانینِ شریعت ہیں' ان سب میں غلام اور لونڈیوں کے قصوں کی بھرمار ہے۔

میں ابھی آپ سے عرض کرونگا کہ یہ آپ کے ہاں کے متاخرین کی بات نہیں ہے' جنہیں کہا جاتا ہے کہ خیر صاحب! وہ تو عہدِ جہالت تھا' اس میں لوگوں نے لکھ دیا ہوگا' آج تو یہ بات کوئی نہیں کہتا۔ آج بھی یہ بات سب کہتے ہیں حتیٰ کہ جو آج بڑے ماڈرن مفسر کہلاتے ہیں' وہ بھی بڑی شد و مد سے اس مسئلہ پہ کہتے ہیں کہ لونڈیاں شریعت میں جائز ہیں' وہ رکھی جائیں گی اور کوئی شریعت کے اس حق کو ہم سے چھین نہیں سکتا۔ انا لله و انا الیه راجعون۔ عزیزانِ من! یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید میں یہ الفاظ ملتے ہیں' پھر سوال یہ ہے کہ بات کیا ہوئی؟

## ظہورِ اسلام کے وقت ارسطو کے ہاں ستر غلام موجود تھے

جب اسلام آیا تو ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا' اسے یوں کہیے کہ یہ رواج ہی نہیں تھا بلکہ مرورِ زمانہ سے آہستہ آہستہ اس چیز نے گویا ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی کہ انسانی معاشرے کا انداز ہی یہ ہے کہ اس میں کچھ مالک ہوں' کچھ اس میں سے مملوک ہوں حتیٰ کہ یونان کے حکما' فلاسفرز جن کا درجہ علم و حکمت میں بڑا ہی بلند ہے' آج تک ان کے مسلمات جو جاری اور رائج ہیں' ان کے مطابق

یہ کیفیت ہے کہ ارسطو (384-322 B.C.) کے ہاں ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے حق میں ستر دلیلیں دیا کرتا تھا اور ایک دلیل اس میں یہ تھی کہ اگر آپ ٹیڑھے پاؤں والے کو سیدھا جوتا پہنا دیں تو اس سے ٹیڑھے پاؤں والے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے' اس کے لیے ٹیڑھا جوتا ہونا چاہیے' جو غلام پیدا ہوتا ہے وہ ٹیڑھا پاؤں ہے' وہ خوش ہی غلامی کی حالت میں رہ سکتا ہے' اگر آپ اسے آزادی کی زندگی دیدیں گے تو اسے بڑی تکلیف ہوگی۔ آپ دلائل ملاحظہ فرمائیے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہی چیز قریب قریب ساری دنیا میں رائج تھی' عربوں کے ہاں بھی تھی۔

## عربوں کے ہاں غلاموں اور لونڈیوں کی کیفیت

عربوں کے معاشرے میں بڑی کثرت سے غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ ابتداًیہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدیوں سے بنائی جاتی تھیں۔ ان کے معاشرے کا یہ معمول تھا اور یہ باقی دنیا میں بھی مسلمہ تھا کہ ان قیدی مردوں کو غلام بنالیا جاتا تھا' قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ اور پھر جب ایک دفعہ یہ غلام آگئے اور لونڈیاں آگئیں تو پھر سمجھیے کہ ''جھاگ لبھ پینڈی سی اگے واسطے'' (آئندہ کے لیے دہی کا جامن ❶ مل جاتا تھا) پھر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ پھر ان کے ہاں خرید و فروخت ہوتی تھی تو خرید و فروخت میں وہ جو قانوناً جائز یا سیدھا سیدھا طریق تھا وہ تو یہی تھا کہ جنگ کے قیدیوں میں پکڑی ہوئی جو عورتیں تھیں وہ غلام بنائی جاتی تھیں لیکن بلیک تو ہر جگہ ہوتی ہے تو پھر باقاعدہ ان کی تجارت ہوتی تھی۔

## افریقہ میں بسنے والے مردوزَن کا شکار ہوتا تھا' مارکیٹ میں انہیں فروخت کیا جاتا تھا اور عربوں میں بھی یہ چیز موجود تھی

عام طور پہ افریقہ کے علاقوں میں ایسا ہوتا تھا کہ عورتیں پکڑی جاتی تھیں۔ انہیں یہ وہاں سے پکڑ کر لاتے پھر آکر ان کو بیچتے تھے۔ اول تو کوئی اس کے خلاف اعتراض ہی نہیں کرتا تھا' معاشرے میں اعتراض تو اوپر کا طبقہ کیا کرتا ہے اور جو چیز اوپر کے طبقے کے فائدے کی ہو یا اس کے ہاں مقبول ہو تو اس پہ اعتراض کون کرے۔ اگر کبھی کہا جاتا تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ انہی غلاموں اور لونڈیوں کی اولاد ہے جسے حقیقت میں ہم لاتے ہیں حالانکہ جن کا غلامی کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ ہے وہ جانتے ہیں کہ خاص طور پر افریقہ کے ان علاقوں سے جانوروں کی طرح کس بری طرح سے ان بچوں' بڑوں' عورتوں' مردوں' کا شکار کیا جاتا تھا۔ انہیں یوں گرفتار کیا جاتا تھا جیسے جال میں پکڑا جاتا ہے۔ انہیں باندھ کر جہازوں میں لادا جاتا اور جا کر دنیا کی منڈیوں میں بیچا جاتا تھا۔ خدا نہ کرے کہ ہم یوں کسی کو بیچیں لیکن سینما کی تصویروں میں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پھر ان غلاموں کے ساتھ کیا ہوتا تھا' لونڈیاں کس طرح سے مارکیٹ میں نیلام ہوتی تھیں' بیچی جاتی تھیں۔ عربوں میں بھی یہ چیز موجود تھی' ان کے معاشرے میں غلام اور لونڈیاں موجود تھے۔

---

❶ وہ دہی یا چھاچھ جسے دہی جمانے کے لیے استعمال کرتے ہیں

## انسانیت کی آزادی و مساوات کے لیے قرآنِ حکیم کا ہر نوعِ غلامی کے خلاف اعلانِ عام

اسلام آیا اور قرآن حکیم نے آ کر یہ اعلان کیا کہ وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) تمام نوعِ انسانی میں پیدائش کے اعتبار سے ہر انسانی بچہ یکساں تکریم واحترام کا مستحق ہے' کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے یہ کہے کہ تم میرے غلام بن جاؤ۔ قرآنِ کریم نے تو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و مساوات کا سبق دیا تھا' اس کے ہاں اس قسم کی شرمناک اور باعثِ لعنت رسم یا تصور یا نظریہ یا خیال کیسے آ سکتا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا غلام بن سکتا ہے؟ وہ تو ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم نہیں بناتا' وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا محتاج نہیں بناتا۔ دین کا ماحصل تو یہ شرف اور اکرامِ انسانیت ہے' اس کے ہاں تو انسانیت کی عزت' انسان ہونے کی جہت سے ہے۔ وہ تو مجرم سے بھی نفرت نہیں سکھاتا۔ وہ کہتا ہے کہ جرم سے نفرت کرو' مجرم سے نفرت نہ کرو' مجرم بھی تو انسان رہتا ہے۔ اس کے ہاں غلامی کا تصور کہاں؟ اس قدر باعثِ تذلیل نظریہ کی تائید کہاں؟ قرآن حکیم کی رو سے وہ تو اس کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ یہ بہت بڑا انقلابی پیغام تھا: موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے اور یہ تو غلامی کی بڑی ہی محسوس اور بدترین سطحی شکل تھی کہ انسان کو واقعی غلام بنا لیا جائے۔

ایک غلامی تو یہ ہے کہ آپ کسی کو سیاسی غلامی میں جکڑ لیتے ہیں' جیسے وہ ہیں جنہیں آپ محکوم قومیں کہتے ہیں' اس میں بظاہر تو وہ انسان آزاد پھرتے ہیں مگر سیاسی رو سے وہ محکوم ہوتے ہیں۔ غلامی میں یہ غلام تو سچ مچ جانوروں کی طرح غلام بنائے جاتے تھے' انہیں زنجیروں میں جکڑا جاتا تھا۔ عربوں کے معاشرے میں ان کی کثرت تھی' ان کا سارا کاروبار ان غلاموں کے سر پہ چلتا تھا' لونڈیاں گھروں میں موجود تھیں۔

## جنگی قیدیوں کے متعلق حکمِ خداوندی ہے کہ وہ تمہارے مہمان ہونگے' ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ

میں نے عرض کیا ہے کہ غلام اور لونڈیوں کا جو اولیں سرچشمہ تھا جہاں سے یہ آتی تھیں' وہ جنگ کے قیدی تھے۔ قرآنِ کریم نے شرفِ انسانیت کے متعلق مختلف آیات کے بعد یہ جو اس غلامی کا Source (منبع و سرچشمہ) تھا اس کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ یہ سورۃ محمدؐ کی چوتھی آیت ہے اور جسے ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے' اس میں جنگ کے متعلق یہ کہا ہے کہ فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَہَا (47:4)۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے! کہا ہے کہ تمہیں جنگ کرنا پڑے گی' ان سے تصادم ناگزیر ہے۔ سو جب میدانِ جنگ میں ان سے آمنا سامنا ہو

توتم بھی انہیں قتل کرو۔ یہ تو موضوع ہی دوسرا ہے۔ جب میں اس پہ آؤنگا کہ قرآن مجید نے جہاد کی اجازت کن حالات میں دی ہے تو اس وقت' میں اس کی تشریح کرونگا۔ کہا ہے کہ جنگ میں جب مقابلہ ہو تو پھر تمہیں ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا' یہ کچھ کرنے کے بعد' جب فریقِ مخالف کی قوت توڑ دو' تم ان پر غالب آ جاؤ تو اس کے بعد جو جنگ کے قیدی تمہارے ہاتھ آئیں انہیں مضبوطی سے باندھ کر جنگی قیدی بنالو۔ اب ظاہر ہے کہ جنگ کے ان قیدیوں سے ہی غلام اور لونڈیاں بنائے جاتے تھے' تو کہا ہے کہ انہیں جنگی قیدی بنا کر یا تو تم فدیہ لے کر چھوڑ دو' قیدیوں کے تبادلے میں یہ قیدی چھوڑ دو' یا وہ حکومت اگر چاہے تو ان کے بدلے میں وہ آپ کو ویسے ہی Ransom دیدے' تاوانِ جنگ دیدے اور تم انہیں چھوڑ دو۔

عزیزانِ من! اس آیت میں فـدآء کا لفظ آ گیا۔ اس میں یہ ساری چیزیں آ جائیں گی کہ کسی شے کے تبادلے میں' قیمت کے تبادلے میں' قیدیوں کے تبادلے میں' ان کو چھوڑ دو۔ اور اگر حالات ایسے ہوں کہ Ransom (تاوان) دینے والی وہ قوم ہی باقی نہ رہے مثلاً آپ کسی علاقے کو فتح کر لیتے ہیں' اب وہ علاقہ آپ کے قبضے میں آ جاتا ہے' ان کے جو قیدی آپ کے پاس ہیں' ان کا Ransom (تاوان) کون دیگا' ان کا فدیہ کون دے گا؟ وہ تو قوم ہی باقی نہیں رہی' مملکت ہی باقی نہیں رہی' حکومت ہی باقی نہیں رہی' تو پھر کیا کیا جائے گا؟ یہ قرآن حمید ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ فَـاِمَّـا مَنًّـا (47:4) ان کو احساناً چھوڑ دو کہ یہ انسان ہیں۔ قرآن حمید میں ایک ہی آیت ہے' اس میں قیدیوں کو چھوڑنے کی دو ہی متبادل شکلیں بتائی ہیں ❶ یا تبادلے میں یا Ransom (فدیہ) ❶ لے کر اور یا (2) احسـانـاً ' ان کو چھوڑ دو۔ انہیں چھوڑ ہی دینا ہے ❷۔ یہ جتنے دنوں تک تمہارے پاس رہیں' ان کے متعلق ہماری تاریخ میں یہ آیا ہے کہ ان کو مہمانوں کی طرح گھر میں رکھا جائے گا۔

## حسنِ سلوک کے تناظر میں جنگِ بدر کے ایک قیدی کا بیان اور ان سے کام لینے کا انداز

اس زمانے میں ابھی انتظام اتنا وسیع تو نہیں تھا کہ ان کے لیے کوئی الگ Concentration Camps (ارتکازی کیمپ)

---

❶ اس فدیہ (Ransom) میں اور تبادلے میں ایک ہی چیز روبہ عمل ہے کہ قیدیوں کے عوض قیدی لو یا مال لو۔ ابنِ فارس نے کہا ہے فـدآء کے بنیادی معنی یہی ہیں کہ ''کسی چیز کی حفاظت اور بچاؤ کے لیے اس کی جگہ دوسری چیز کو دے دینا''۔ (حوالہ پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم (1961)' ص۔ 1268)۔ یہ ایک شکل ہوئی اور دوسری متبادل شکل یہ ہے کہ بطور احسان چھوڑ دو۔ اس طرح قرآنِ کریم نے قیدیوں کو چھوڑنے کی یہ دو ہی متبادل شکلیں بتائی ہیں۔

❷ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا خیال قرآنِ کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا اسے قرآنِ کریم نے اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

بناتے اور انہیں وہاں رکھا جاتا۔ ہوتا یہ تھا کہ انہیں مہمانوں کی طرح گھروں میں رکھنے کے لیے تقسیم کیا جاتا تھا۔ اب یہ مہمان کس طرح رکھے جاتے تھے' اس کے لیے ایک واقعہ موجود ہے کہ جنگِ بدر ❶ کے ایک قیدی تھے' وہ جب چھوٹ کر یہاں سے گئے ہیں تو وہاں جا کر اپنوں سے یہ کہا کہ سنو! میں تمہیں یہ اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں کہ تمہاری آزادی سے ان کی قید ہزار درجے بہتر ہے۔ میں واپس جانے کے لیے' یہاں تمہارے پاس' یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ مجھے انہوں نے زبردستی باندھ رکھا تھا۔ اُنہوں نے پوچھا کہ تم نے ان میں کیا چیز دیکھی جو یہ کہتے ہو؟ کہنے لگے کہ میں قیدی کی حیثیت سے تو کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں تو ان کے گھر میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اس میزبان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دن بھر محنت کرتے تھے' کسی باغ میں پانی دیتے تھے' وہاں سے ان کو کھجوریں ملتی تھیں' ان کھجوروں میں سے جو ایک حصہ تھا وہ اسکا آٹا لاتے تھے اور مجھے گھر میں آٹے کی روٹی ملتی تھی' وہ اور اس کے بچے کھجوروں پہ گزارہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ دیکھتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی کہ وہ' میرا آقا' اور اس کے بچے کھجور کھا رہے ہیں' مجھے گھر میں آٹے کی روٹی دے رہے ہیں۔ میں ان سے کہتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ بھائی! تم ہمارے مہمان ہو' مہمان کا حق فائز ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! جتنے دنوں تک یہ قیدی گھر میں رکھے جاتے تھے وہاں ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47:4) (انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا ان کا معاوضہ لے کر' قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لے کر' چھوڑ دو بہر حال انہیں چھوڑنا ہوگا)۔ کہا یہ ہے کہ وہ جو فدیہ وہاں سے آتا تھا' تو اس فدیہ میں کیا لیا جاتا تھا؟ سنیے! کہ وہ فدیہ میں کیا لیا جاتا تھا؟ وہاں بدر کے قیدیوں سے یہ کہا گیا تھا کہ بھئی! کیا تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا کہ ہاں۔ اس پر اِنہوں نے کہا تھا کہ ہمارے بچوں کو الف ب کا قاعدہ پڑھا دو' تمہارا فدیہ اتنا ہی ہو جائے گا۔

## دشمن قیدیوں کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک کرو کہ لڑائی خود اپنے ہتھیار رکھ دے اب سوال یہ ہے کہ عرب معاشرے کے اندر موجود غلام اور لونڈیوں کا کیا کیا جائے

یہ تھی قرآنِ کریم کی یہ آیت اور یہ تھا وہ فدآء کے علاوہ مَنًّاۢ کہ انہیں احساناً چھوڑ نا ہے۔ کہا ہے کہ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ❷ (47:4) تآنکہ دشمن نے تو اس سے پہلے ہتھیار رکھ دیئے تھے' اب یہ کچھ کرو گے تو لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے گی' اس کے بعد خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے گی۔ تم انسانوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کر کے دیکھو تو سہی۔ یہ قرآن مجید کا عجیب فقرہ ہے' صاحب!

---

❶ جنگِ بدر سترہ رمضان 2ھ مطابق 13۔ مارچ 624ء کو بدر کے میدان میں لڑی گئی۔

❷ تآنکہ خود لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

دشمن ہتھیار رکھا کرتا ہے۔ ہر جگہ یہ آیا کرتا تھا لیکن قرآن مجید کہتا ہے کہ دشمن نے تو پہلے ہی ہتھیار رکھ دیئے تھے' جب تم نے فتح حاصل کر لی' اب اس کے بعد جنگ خود اپنے ہتھیار رکھ دے گی۔ یہ تھا قرآن مجید کا حکم جنگ کے قیدیوں کے متعلق۔ آئندہ کے لیے تو غلام اور لونڈیوں کا وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ سوال ہی نہیں ہے کہ کسی کو غلام بنایا جائے یا ان میں سے کسی کو لونڈیاں بنایا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو معاشرے کے اندر غلام اور لونڈیاں موجود تھے' ان کا کیا کیا جائے؟

## قرآنِ حکیم کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہوتا ہے' وہ ناممکن العمل طریق کبھی اختیار ہی نہیں کرتا

قرآن حکیم جو احکام بھی دیتا ہے' ان میں ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ حکم کس طرح سے ممکن العمل ہو سکتا ہے۔ میں مثال عرض کرتا ہوں کہ شراب جیسی ملعون چیز جسے ام الخبائث کہا جاتا ہے' قرآنِ کریم نے اسے ممنوع قرار دیا۔ کب اور کیسے ممنوع قرار دیا؟ سنیے! آپ کو معلوم ہے کہ یہ عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی' جیسے آج کل یورپ میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا' بعینہٖ یہ شکل ان کے ہاں تھی کہ اسے قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا' قرن ہا قرن' نسلاً بعد نسلاً' یہ اس طرح اس کے عادی ہو چکے تھے۔ شراب پینے والے جانتے ہیں کہ وہ بچپن سے متوارث نہ بھی خون میں حلول کر کے آئی ہو تو اگر کوئی شراب پینے کا عادی ہو اور اس کو شباشب یہ کہہ دیا جائے کہ کل سے یہ شراب بند ہے تو وہ نہیں چھوڑ سکتا' کوئی استثنائی بات ہو تو اور چیز ہے کہ ہزاروں لاکھوں میں کوئی ایسا صاحبِ عزم نکل آئے جو اپنے آپ پر اتنا کنٹرول رکھتا ہو ورنہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ جب پہلا نشہ اترتا ہے تو اس اترنے کے خمار میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب تک دوسری بار اسے پی نہ لیا جائے' اس وقت تک انسان چین سے نہیں بیٹھ سکتا اور پھر جب وہ اس کا عادی ہو جائے' یہ اس کے خون میں حلول کر جائے' تو یہ ایک رات میں نہیں چھڑائی جا سکتی۔

آپ دیکھیے کہ ایک ایسی چیز ہے جو ام الخبائث میں سے ہے' اسے چھڑانے کے لیے پہلے مکے کی تیرہ سال کی زندگی ہے' پہلی آیت (2:219) میں یہ کہا گیا کہ ٹھیک ہے میسرہ اور خمر میں کچھ فائدے نظر آتے ہیں' لیکن ان کے نقصانات ان کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ محض تلقین کی بات کہی گئی۔ آگے بڑھے تو (4:43) میں یہ کہا کہ دیکھو بھئی! کم از کم صلوٰۃ کے اجتماعات میں تو حالتِ نشہ میں نہ آیا کرو' اب یہ دوسری چیز آ گئی کہ جس جس وقفے سے بھی صلوٰۃ کے اجتماعات میں آنا تھا' اس حصہ میں کہا گیا کہ حالتِ نشے میں نہ آؤ تو ایک پابندی اور عائد کی۔ جنہوں نے تو اس پہلی تلقین کے بعد سمجھ لیا تھا کہ قرآن حکیم کے نزدیک یہ چیز معیوب ہے' انہوں نے اسی وقت سے چھوڑنے کی کوشش کر لی ہو گی' جن پہ اگلی پابندی عائد کی' انہوں نے اس کے بعد اس پابندی کے ماتحت صلوٰۃ کے اجتماعات میں تو جانا تھا' تو اتنے وقت کے لیے آپ دیکھیے یہ پابندی خود عائد ہوئی۔ تیرہ سال مکے کی زندگی کے ہیں اور کم از کم چار یا پانچ سال

مدینے کی زندگی کے بھی ہیں اس کے بعد آخری حکم آیا کہ یہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (5:90) ہے(اس میں قباحت اور ناپسندیدگی بھی ہے اور اضطرابی کیفیت بھی۔اس سے قلب ودماغ کی صلاحیتیں ماؤف ہوجاتی ہیں اور معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے)۔تمہیں اس سے رکنا ہوگا۔اب بتاؤ کہ اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ مے نوشی ایک ایسی چیز ہے جسے معاشرے میں سب سے پہلے ختم کرنا چاہیے تھا۔قرآن حکیم نے دیکھا کہ یہ ممکن نہیں ہے' اس نے اس کو ختم کرنے کے لیے پندرہ برس لے لیے۔وہ جو کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مدینے کی گلیوں کے اندر شراب کے ٹوٹے ہوئے مٹکے بہہ رہے تھے تو ذہن میں یوں آتا ہے کہ صاحب! بس فوراً اُدھر سے حکم آیا اور اِدھر مٹکے توڑ دیئے۔ عزیزانِ من! ان مٹکوں کو تڑانے میں پندرہ سال لگے تھے' یہ ہے قرآن حکیم کا انداز اور طریق کار۔جو چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کے چھوڑنے میں اس طرح سے کوئی نفسیاتی یا طبیعاتی اثر نہیں ہوتا' اُن کو تو ٹھیک ہے' ایک حکم دے کر بند کرایا جاسکتا ہے لیکن جن احکام کے عواقب واثرات اتنے دوررس ہوں تو قرآن حمید کبھی ناممکن العمل طریقے سے ایسا نہیں کراتا۔وہ معاشرے کی موجودہ حالت کو لیتا ہے' یہاں سے بتدریج وہ اپنے نصب العین یا Goal یا منزل کی طرف لے جاتا ہے۔یہ بڑی عجیب مصلحت ہے جسے قرآن حمید نے کہا کہ کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے۔یہ وہ حکمت ہے کہ کس حکم کو' کس انداز سے' نافذ کیا جائے کہ فی الواقعہ وہ ممکن العمل ہوجائے۔

غلامی' میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں قرن ہا قرن سے رائج تھی' ان کے معاشرے میں غلام موجود تھے' معاشی دارومداران غلاموں پر تھا' یہی باہر کام کاج کرتے' کھیتی باڑی کرتے تھے' گھروں کے اندر لونڈیاں موجود تھیں۔اگر ایک ہی رات میں حکم دیدیا جاتا کہ اپنے غلام اور لونڈیوں کو آزاد کردو تو صبح اٹھتے ہی یہ اتنی آبادی کہاں جاتی اور اِدھر ان کی Economy (معاشیات) اور اقتصادی حالت کس طرح سے Upset (ابتر) ہوجاتی۔وہاں دوسرے مزدور تو تھے نہیں بلکہ مزدور ہی یہ تھے' جن کو ہم غلام کہتے ہیں' یہ گھروں کے اندر ملازم تھے' ان کی کیفیت یہ ہوچکی تھی کہ ان کے ساتھ زن آشوئی جیسے تعلقات موجود تھے۔یہ اتنی لڑکیاں' یہ اتنی عورتیں' یہ اتنے مرد' انہیں جو فوراً اس معاشرہ سے نکال دیا جاتا' تو نہ وہ گھروں میں رہتیں' نہ یہ باہر غلامی میں رہتے' معاشرہ اپ سیٹ (ابتر) ہوجاتا۔

اسے ختم کرنے کے لیے قرآن حکیم نے کیا کیا؟ یہ کہ سب سے پہلے تو اس Source (سرچشمہ) کو بند کیا جہاں سے یہ غلام اور لونڈیاں آتی تھیں۔اُسے آئندہ کے لیے روک دیا۔اب یہ جو آپ قرآن حکیم میں احکام دیکھتے ہیں کہ (مثلاً) فلاں کو چھینک آئی' فلاں نے قسم اٹھالی اور پھر توڑ دی' تو کہا کہ غلام آزاد کرو' لونڈی آزاد کرو' اگر فلاں چیز کا صدقہ دینا ہے تو اس کے لیے' ان کو آزادی کی

شکل دو۔ یہ غلام اور لونڈیاں منسوخ کرنے کا سلسلہ Gradually (آہستہ آہستہ) ہوا۔ پھر اس کو بہت بڑا کارِ خیر بتایا گیا جسے فَکُّ رَقَبَةٍ (90:13) کہا گیا ہے کہ انسان صرف اپنی فکر ہی نہ کرے بلکہ جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے تو اسے اس سے آزاد کرائے۔ کہا ہے کہ یہ چیزیں کرو، پھر مکاتبت کی صورت پیدا کی۔

## ہمارے ہاں لفظ مکاتبت کا وہ مفہوم نہیں لیا جاتا جو قرآنِ حکیم پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! میں عرض کروں کہ یہ مکاتبت بھی کیا چیز تھی۔ ہمارے ہاں اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اگر تم سے کوئی غلام کہے کہ مجھے آزاد کردو، تو اسے کہو کہ اتنے روپے لاؤ، پھر میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ اب وہ بیچارہ اتنے روپے کہاں سے لائے تو اُسے کہا کہ ٹھیک ہے اتنا عرصہ ہماری کمائی کرو، محنت کرو اور اس دوران میں ہم سے پیسے نہ لو، ہمارے پاس جمع کراتے رہو، جب وہ جمع ہوجائیں گے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ اسے ہمارے ہاں مکاتبت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ جس غلام میں تم یہ صلاحیت دیکھو کہ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوجائے گا تو اسے آزاد کرو اور ساتھ ہی اسے اتنا دو کہ وہ اپنا کاروبار شروع کرسکے اور یہی صحیح طریق ہوسکتا ہے۔ جو کاریگر یا ہنرمند ہے، وہ کام جانتا ہے، اُسے کام کو Start (شروع) کرنے کے لیے ابتداً کچھ سرمائے کی ضرورت ہوگی۔ آپ نے اس کو آزاد تو کردیا، کام بھی وہ جانتا ہے لیکن وہ دوسرے دن بغیر سرمائے کے کیا کرے گا؟ قرآنِ کریم نے اسے مکاتبت کہا تھا۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے یہ احکام نازل کیے، ان کے متعلق یہ کہا۔

## قرآنِ حکیم نے لونڈیوں کو بیویوں کا سا درجہ دینے کے لیے احکام نازل کر رکھے تھے

انہوں نے اپنے گھر میں اس طریق سے جو لونڈیاں رکھی تھیں اس کے متعلق کہا کہ اگر تو ان کے اس طرح سے باہر Absorb (ضم) ہونے کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں تو ہونگی، لیکن گھر کے اندر انہیں رکھو گے تو ان کا درجہ بیویوں کا سا ہوجائے گا، ان کی اولاد تمہاری اولاد ہوجائے گی، وہ تمہاری وراثت کی حق دار ہوجائے گی۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ Past Tense میں ہے، ماضی کے صیغے میں ہے، یہ کہیں مستقبل (Future) کے صیغے میں نہیں ہے، یہ کہیں نہیں ہے کہ وہ تمہارے غلام بن جائیں گے، وہ تمہاری لونڈیاں بن جائیں گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت یا اس سے پہلے، جو غلام اور لونڈیاں آچکی ہیں، ہم ان کے متعلق یہ احکام دے رہے ہیں۔ اسی لیے بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی ایک چیز کرو تو اس کا کفارہ یہ ادا کرنا پڑے گا کہ ایک غلام آزاد کرو، اس کے بعد ہے کہ اگر غلام نہ ہوں تو پھر یوں کرلو۔ گویا اس نے خود دیکھ لیا تھا کہ جس طریق سے آہستہ آہستہ ان کو آزاد کیا جارہا ہے یا خاندانوں کا جزو بنایا جارہا ہے، تو اس سے ایک وقت آئے گا کہ غلام ملے گا ہی نہیں۔

## انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا

عزیزانِ من! قرآن حمید نے اس کفارہ کے لیے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ غلام آزاد کرو اور اگر غلام نہ ملیں تو اس کے لیے اتنے روزے رکھو' اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ یہ مستقبل میں رہنے کے لیے کوئی مستقل Institution (رِیت) نہیں تھی کہ اب قیامت تک کے لیے تمہارے ہاں غلام اور لونڈیاں آتے چلے جائیں گے اور تم ان کے متعلق' جو احکام ہم دیتے ہیں ان پر عمل پیرائی کرتے چلے جاؤ گے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ یہ کیسے مستقلاً کیا جا تا رہے گا! میں کہتا ہوں کہ جب تقلید کی پٹی آنکھوں پہ بندھ جائے تو انسان کو کوئی شے نظر ہی نہیں آتی۔ قرآنِ کریم میں غلاموں کو چھوڑنے کے متعلق اتنے احکام ہیں کہ اگر اس قسم کی ایک چیز کرو تو اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے غلام آزاد کرو' اگر یہ کرو تو غلام آزاد کرو' اگر وہ کرو تو غلام آزاد کرو' اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں بظاہر یہ چیز بڑی مشکل سی نظر آئے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں جو ملازم تنخواہ دار ہے' وہ ہر وقت ملازمت چھوڑ سکتا ہے۔ وہ اگر کسی وقت آپ کی ملازمت چھوڑ کر چلا جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ گھر کے اندر کتنی دقت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر یہی سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلا آ رہا ہو' اور وہ آپ کے ہاں باقی نہ رہیں تو واقعی بڑی دشواری پیش آنے کا معاملہ ہو گا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم نے' جو اِن کو چھوڑنے کا کہا ہے تو یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کے مترادف ہو گا۔ یہ ہم جانتے ہیں لیکن تم یہ نہیں سمجھتے کہ جو فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) ہے' یہ کسی جھکائی ہوئی گردن کو دنیا کے اندر سرفراز کر دینا ہے۔ یہ کتنی بڑی نیکی ہے! اس عمل کے لیے قرآن حمید کا لفظ فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن مجید میں ایک طرف تو اس عمل کو اسقدر کارِ خیر اور مستحسن کام بتایا گیا ہے کہ اگر یہ چیز کرو تو اس کے کفارہ کے لیے 'غلام آزاد کرنا' اور اگر یہ کرو تو بھی غلام آزاد کرنا' تو کیا قرآن حکیم پھر یہ حکم دے گا کہ ایک طرف غلام بناتے جاؤ' غلام بناتے جاؤ' اور اُدھر دوسری طرف یہ کہے کہ یہ بڑا نیکی کا کام ہے' غلام چھوڑتے جاؤ' چھوڑتے جاؤ۔ کیا یہ بناتے جاؤ اور چھوڑتے جاؤ' نیکی کا کام ہے؟

## ہندوؤں کے ہاں نیکی یا پُن کے کاموں کی نوعیت کا ایک عجیب سلسلہ' کیا یہی غلام اور لونڈیوں کا تھا؟

یہاں تو میں نے نہیں دیکھا' البتہ بچپن میں ہم (انڈیا میں) یہ دیکھتے تھے کہ ہندوؤں کے ہاں پرندوں ورندوں کو چھڑانا' یا اس قسم کے کام کرنا' بڑے نیکی کے کام ہوتے تھے۔ یہ ان کے ہاں پُن کا کام ہوتا تھا۔ ان کے بڑے تو بہت سیانے تھے' وہ کرتے یہ تھے کہ انسانوں کا خون تو چوستے چلے جاتے تھے اور ان کے ضمیر میں اگر اس سے کوئی خلش پیدا ہوتی تو اس کے لیے وہ یہ کرتے تھے۔ اب

ہمارے ہاں یہ نظر نہیں آئے گا۔ ہم نے انڈیا میں دیکھا ہے کہ ہندو علی الصبح اٹھتے‘ اشنان کیا‘ باہر گئے تو کہیں کسی کے ہاتھ میں تھوڑے سے چاول ہیں‘ کسی کے ہاتھ میں آٹا ہے۔ جہاں سے وہ چیونٹے نکلتے‘ ان کو دیکھتے‘ ذرا سا آٹا یہاں اور وہاں پہ رکھ دیتے‘ چڑیوں کے لیے انہوں نے چاول رکھے۔ ان کے ہاں چھینکے لٹکے ہوتے تھے‘ ان میں کہیں پانی کی کلھیا تھی‘ کہیں تھوڑے سے چاول تھے‘ گائے بھینسوں کے لیے نمک کے بڑے بڑے ڈلے رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ پیاؤ جو آپ دیکھتے ہیں‘ یہ ان کے زمانے کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ اس قسم کے دان پُن کے کام کرتے تھے۔ یہ سب اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لیے ہوتے تھے۔ دوسری طرف صرف پنجاب کے مسلمانوں سے یہ دس کروڑ روپیہ سالانہ سود کا لے لیتے تھے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جو سود لینے کے لیے آتا تھا اس نے چھوٹی سی ایک ڈبیا بھی رکھی ہوتی تھی‘ جاتے وقت اس ڈبیا کی طرف اشارا کر کے کہتے کہ کچھ دان ’’کچھ دان پُن واسطے وی پا دے ایہد ے وچ‘‘ (کچھ دان پُن کے لیے بھی اس میں ڈال دو)۔ وہ اس میں ڈلوا لیتے تھے۔ اس ڈبیا میں سے لیتے تھے ’’چڑیاں دا چوگا‘ تے گاواں واسطے لون دے ڈلے‘‘ (چڑیوں کے لیے کھانا اور گائیوں کے لیے نمک کے ڈلے)۔ یہ فریبِ نفس ہے ❶۔ آپ سوچیے تو سہی کہ کیا قرآن حمید ایسا کرتا کہ ایک طرف تو یہ حکم دیتا کہ دھڑا دھڑ غلام اور لونڈیاں بناتے چلے جاؤ اور پھر اس کے بعد یہ کہتا کہ صاحب! ان کا جو چھوڑنا ہے‘ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ یہ بھی کرتے چلے جاؤ!!!

عزیزانِ من! بات میں نے اور شروع کی تھی کہ ہندو ان چیزوں کو دان پُن کا کام سمجھتے تھے جبکہ ہمارے مسلمانوں کو وہاں چڑی مار کہا جاتا تھا۔ وہ صبح اٹھتے‘ باہر چلے جاتے‘ یہ شارکیں‘ طوطے‘ یہ اس قسم کے پرندے‘ جنہیں مسلمان ذبح کر کے کھاتے نہیں تھے‘ وہ ان کو پکڑ لاتے تھے۔ یہ جو بٹیر تیتر تھے یہ تو مسلمان خرید کر لے جاتے‘ وہ تو انہیں کھاتے ہیں‘ اور یہ جو ’’طوطے شاہ‘‘ کا تختۂ مسجد تھا‘ وہ اسے پنجرے میں ڈال لیتے اور بازار چلے آتے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ وہ ہندو کہتا کہ ٹھہرنا بھئی! ٹھہرنا بھئی! یہ کتنے کا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک آنے کے دو ہیں‘ وہ ایک انی دیتا‘ وہ ہندو اس پنجرے میں سے اُسے اپنے ہاتھ سے یوں چھو کر چھڑا دیتا‘ پھر آگے جاتے‘ کوئی دوسرا ہندو ملتا‘ وہ اسے انّی دیتا اور ان کو چھڑا دیتا‘ یہ روز ان کو چھڑواتے‘ دوسری صبح جا کر یہ پھر پکڑ لاتے‘ پھر جا کر ان کے ہاں سے انی دونی لیتے اور یہ ہندو پھر انہیں چھوڑ دیتے۔ یہ بڑا عجیب سلسلہ تھا۔ ان کا پُن کا کام بھی ساتھ رہا اور اُن کا معاش کا سلسلہ بھی بنا رہا۔ ان کے ہاں یہ چیز تھی کہ ایک طرف پکڑتے چلے جایئے‘ دوسری طرف نیکی کا کام سمجھ کر ہندو انہیں چھڑاتے چلے جاتے۔ کیا قرآن حمید نے یہ حکم دیا تھا؟ کہ ایک طرف تو جنگ میں ان قیدیوں کو پکڑ کر لے آیا کرو‘ پھر ان کا چھوڑنا بڑا نیکی کا کام ہے‘ غلام کو چھڑانا بڑا نیکی کا کام ہے۔ یہ چھڑاتے رہو اور نیکی کماتے رہو۔ می نہ سزد خدائے را۔

---

❶ یہ Wrong notion of morality تھی۔

## ایک طرف انسانوں کو قصداً غلام بنانا اور پھر انہیں آزاد کردینا' خدا کے ساتھ مذاق ہے

یتیم کے ساتھ مذاق کرتے ہو اور سوچتے نہیں ہو کہ خدا کے ساتھ کس طرح سے مذاق کر رہے ہو۔ کہا ہے کہ **اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ** (2:15) خدا سے مذاق کرتے ہو! اس کا قانونِ مکافاتِ عمل' تم سے ایسا مذاق کرے گا کہ ان تاریکیوں کے اندر بھٹکے ہوئے پھروگے' کبھی صحیح راستہ تمہارے سامنے نہیں آسکے گا۔ اب ہزار برس سے یہ چیز تمہارے ہاں آئی ہوئی ہے کہ جنگ میں جو قیدی آئیں گے تم ان کو غلام اور لونڈیاں بناتے چلے جاؤ گے اور دوسری طرف غلاموں کو چھڑانے کے متعلق جو احکام ہیں' وہ انہیں بڑے فخر سے بیان کریں گے کہ دیکھیے! قرآنِ کریم میں خدا نے کیسے احکام دیئے ہیں کہ 'غلاموں کو چھڑاؤ' غلاموں کو چھڑاؤ۔ اور غلام بنانے والی بات اپنی طرف سے ہے' وہ خدا کا حکم نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کا تذکرہ کبھی نہیں کریں گے۔

## کسی غلام کو آزاد کردینا ہی کافی نہیں بلکہ اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا بھی ضروری ہے اور غلاموں نے بادشاہتیں بھی کی ہیں

عزیزانِ من! میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ غلامی کا ایک ہی Source' ایک ہی سرچشمہ اور ایک ہی منبع تھا' جہاں سے غلام بنائے جاتے تھے اور وہ جنگ کے قیدی تھے۔ ان کے متعلق جیسے دوٹوک کہتے ہیں' ایک آیت میں' دو لفظوں سے بات صاف کردی' تیسری متبادل شکل قرآن مجید نے نہیں بتائی۔ کہا کہ انہیں چھوڑنا ہوگا اور جو موجود ہیں انہیں پھر اسی حکمتِ عملی کے طریقے سے' تدریجاً' جزوِ خاندان بناتے چلے جایئے' جن میں خود کما کر کھانے کی اہلیت و صلاحیت ہو' ان کو بنیادی طور پہ کچھ Financial (مالی) مدد دیجیے' ان کو اس قابل بنا دیجیے کہ وہ اپنا کما کر کھائیں' ان کو لکھایئے پڑھایئے۔

صلاحیتیں تو فطرت نے ہر انسانی بچے میں دی ہوئی ہوتی ہیں' ہم ان کو Crush (کچل) کر کے رکھ دیتے ہیں' یہ ہم ہیں جو کسی کو غلام اور کسی کو جاہل اور کسی کو بیوقوف بناتے ہیں اور عورتوں کو یہ کہہ کر ذلیل کرتے ہیں کہ یہ پسلی سے پیدا ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ معاشرہ ہے جو ان کو ایسا بناتا ہے' خدا ایسا بنا کر نہیں بھیجتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہی غلاموں کو جب تعلیم و تربیت دی گئی' ان کی صلاحیت کو بیدار کیا گیا تو آپ کو معلوم ہے کہ غلاموں نے بادشاہتیں ❶ بھی کی ہیں۔ یہ تو فخر سے بیان کریں گے کہ اسلام کی تعلیم کے تحت غلاموں نے بادشاہتیں بھی قائم کیں لیکن ساتھ ہی آپ نے یہ کہا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ غلام بناتے چلے جاؤ' بناتے چلے جاؤ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ

---

❶ غلام (مملوک) سلطنت 1206ء تا 1290ء قائم رہی۔ قطب الدین ایبک (1206 تا 1211ء) اس مملوک سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا جس نے برصغیر میں پولیس کا نظام متعارف کرایا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا جانشین التمش 1211ء تا 1236ء بنا اور 1290ء میں اس سلطنت مملوک کا خاتمہ ہوگیا اور پھر 1290ء تا 1320 خلجی سلطنت کا چراغ روشن رہا۔

بات کوئی پرانے زمانے کے قصے کہانیاں نہیں ہیں' یہ جو اقبالؒ (1938-1877ء) نے جل کر کہا ہے [1] کہ 'آہ' بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!' پوچھیے نہیں کہ اس نے ہمیں کہاں تک پہنچا دیا ہے!

## دورِ موجود کی Latest (جدید ترین) تفسیر 'تفہیم القرآن' کی پہلی جلد میں' ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے بارے میں فرمان

ہمارے زمانے کی Latest (جدید ترین) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1979-1903ء) کی تفہیم القرآن ہے۔ آپ کو معلوم ہے عزیزانِ من! میں نہ تو فرقہ بندیوں میں جایا کرتا ہوں' نہ میں ذاتیات یا شخصیات میں الجھا کرتا ہوں لیکن جب کسی چیز کی کوئی مثال دینا ہوگی تو وہاں کوئی نہ کوئی شخصیت بھی آ جائے گی' کوئی فرقہ بھی آ جائے گا' وہاں میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ پرانے زمانے کے قصے کہانیاں نہیں ہیں' یہ آج کے وہ لوگ ہیں جو اس چیز کے مدعی ہیں کہ ہم اسلاف کی روش کے اوپر آنکھیں بند کر کے نہیں چلتے' ہم خود اپنی فکر' غور اور بصیرت سے' معاملات کو طے کرتے ہیں اور شریعت کے احکام پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کی بات ہے کہ وہ اس باب میں کیا احکام پیش کرتے ہیں؟

اس وقت میرے سامنے ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب (1979-1903ء) کی تفسیر 'تفہیم القرآن' ہے' اس کی پہلی جلد 1951ء کا ایڈیشن اور 340 صفحہ ہے' سورۃ النسآء کی جو 23ویں آیت ہے جس میں یہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:23) آیا ہے' اس کی تشریح میں یہ لکھتے ہیں کہ ''جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑتے ہی'' یعنی جو مرد گرفتار ہوں' ان سے تو کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے' جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں' ان کے لیے تو خاص طور پہ مسالہ چاہیے جی' حالانکہ یہ تو کچھ بہت کم تعداد میں ہونگی' مرد زیادہ ہوتے ہیں' سپاہی تو وہ ہوتے ہیں' یہ تو سویلین آبادی میں سے کہیں کوئی آئیں گی' اور سویلین آبادی میں سے جو پکڑے جائیں میرا خیال ہے' ان کو Prisoner of war (جنگی قیدی) کی کیٹگری (شِق) میں بھی نہیں لایا جا سکے گا' ان میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ بہر حال لکھا یہ ہے کہ ''جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں' ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کرنے کا مجاز نہیں ہے'' ٹھیک ہے جی! انہوں نے یہ بڑی پتے کی بات بتا دی۔ آگے لکھا ہے کہ ''بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے' چاہے ان سے فدیہ لے' چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دُشمن کے ہاتھ میں ہوں' اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے''۔ یہ 'دو چاہے' یعنی رہا کر دے اور فدیہ لے لے تو خدا کے تھے' اور اسی طرح یہ

---

[1] ہند کے شاعر وصُورت گر و افسانہ نویس — آہ' بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!
(اقبالؒ: ضربِ کلیم (ہنروانِ ہند)' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد 1996' ص۔150)

'تیسرا چاہے' (کہ انہیں مسلمان قیدیوں کے تبادلے سے رہا کردے) بھی اور بقول ان کے جو پہلے 'دو چاہے' اور یہ 'تیسرا' چاہے ہے وہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہیں' عمل یہ چوتھے چاہے' پر ہو رہا ہے (کہ انہیں سپاہیوں میں تقسیم کردے)۔ ہاں تو لکھا یہ ہے کہ ''چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کردے۔ ایک سپاہی صرف اس عورت سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہو''۔ اچھا جی! نکاح کے معاملے میں تو شرط یہ ہے کہ عورت مسلمان ہو یا زیادہ سے زیادہ اہلِ کتاب میں سے ہو' انہی کو قرآن حمید نے حلال قرار دیا ہے' نکاح کے ذریعے حلال قرار دیا ہے۔ اب یہ جو جنگ میں پکڑی ہوئی عورتیں آئیں' ان کے متعلق بھی اگر وہی شرط ہو یعنی نکاح کے لیے تو وہ شرط ہے' اور ان کے متعلق اگر یہ شرط ان پہ بھی عائد کردی جائے تو یہ اس میں بڑا Limited Scope (محدود دائرہ کار) ہو جائے گا۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ ''جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں'' یہ لفظ تمتع جو ہے' آپ اس کے معنی سمجھتے ہیں کہ کیا ہوتے ہیں' یہ وہی ہے جسے ہم جنسی اختلاط کہتے ہیں ''یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو' بہرحال جب وہ تقسیم کردی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں' وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں''۔ یعنی باقاعدہ نکاح کے سلسلے میں تو قرآن حمید میں یہ آیت دی ہے کہ اس عورت کا مسلمان ہونا یا زیادہ سے زیادہ اہلِ کتاب ہونا شرط ہے۔ لیکن ان کے سلسلے میں' یہ قید بھی اٹھ گئی۔ اچھا جی! نکاح والی عورتوں کے سلسلے میں تو کسی شرط کے ساتھ سہی' زیادہ سے زیادہ چار تک کی حد تو یہ بھی مانتے ہیں' لیکن اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے' اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی''۔ اب نہ ان کے مسلمان یا اہلِ کتاب ہونے کی شرط ہے' نہ چار تک پابندی کی شرط ہے۔

## خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے ہاں لونڈیوں کی تعداد تین تین ہزار تھی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تفسیر

اور برادرانِ عزیز! یہی وجہ ہے کہ ان کے وہ ایسے خلفا' جن کے متعلق یہ کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے' ان کو تو چھوڑیئے' یہ آپ کے خلیفہ ہارون الرشید ❶ اور مامون الرشید ❷ کو یہ لوگ بہت اچھے ماڈل کے طور پہ پیش کرتے ہیں' ان کے حرم میں بھی کم از کم تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔ اور اسی طرح سے ان کے لیے ''حکومت کی طرف سے حقوقِ ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا' وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتع میں کراہت محسوس کرے' اور کہے کہ نکاح ہونا ضروری ہے' ''نئیں! کوئی کراہت والی گل نئیں ہیگی ایہدے وچ'' (نہیں'

---

❶ ہارون الرشید کا پورا نام ہارون بن مہدی الرشید ہے۔ ان کا دورانیہ حکومت 193-170ھ مطابق 809-786ء ہے۔

❷ مامون الرشید کا دورِ حکومت 218-198ھ مطابق 833-813ء ہے۔

اس میں کوئی کراہت والی بات نہیں ہے ) نکاح بھی ضروری نہیں ۔ دیکھتے چلے جایئے کہ آپ کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ بہت اچھا جی! لونڈی ملکیت میں آ گئی تو چلیے یہی سہی کہ وہ ملکیت میں رہے گی' کہا کہ نہیں! ''ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی' جولونڈیوں کو حاصل ہیں' ''قابلِ انتقال❶ ہیں'' یعنی یہ مالکانہ حقوق منتقل کیے جاسکتے ہیں۔آپ سوچتے ہیں' اگر لائٹ موڈ میں ہوں تو کہیے کہ راوی عیش لکھتا ہے اوراس کے بعد رویئے۔ یہ پرانے دور کی کوئی اساطیر الاولین' پرانے زمانے کی کہانیاں نہیں ہیں' یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہماری پرانی تفسیروں کے اندر اسرائیلیات کے خرافات آ گئے ہوئے ہیں' آپکے دور کے' سب سے بڑے ماڈرن مفسر (سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کہلوانے والے' عورت کے معاملے میں ان کی بھی یہ کیفیت ہے۔یہ ان کی تفسیر ہے' آج بھی آپ کے ہاں یہ چیز موجود ہے۔

عزیزانِ من! جب میں نے یہ چیز 1965ء کی پاک و ہند جنگ کے سلسلہ میں لکھی کہ حضرت! اگر آپ کے اس مجوزہ اسلامی قانونِ شریعت پر کافر بھی عمل کرنے لگ گئے اور آپ کی جو بیٹیاں اور بہنیں ان کے قبضے میں آ گئی ہیں' انہوں نے اُن پر بھی یہی قانون لاگو کردیا تو اس کے بعد کیا کہو گے؟ کہا کہ اُسے تو کچھ نہیں کہیں گے' تمہیں ہم کافر کہیں گے' کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ میں نے کہا کہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ ایک کافر قوم نے تمہاری شریعت کے ''اسلامی قانون'' پہ عمل شروع کیا' تمہیں تو خوش ہونا چاہیۓ کیا خیال ہے جناب کا؟

## قرآنِ حکیم میں غلامی کے سلسلہ میں ہر مقام پر ماضی کے صیغے کو استعمال کیا گیا ہے' مگر ہماری شریعت کچھ اور کہتے ہے

عزیزانِ من! یہ ہے اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ یہ الفاظ سارے قرآن حکیم میں' ماضی کے صیغے (Past Tense) میں ہیں یعنی جو اس طرح سے ہو چکے ہیں' غلام اور لونڈیوں کے زمرے میں آ چکے ہیں۔ان کے متعلق یہ سارے احکام ہیں کہ انہیں آزاد کرتے چلے جاؤ' جزوِ خاندان بناتے چلے جاؤ' تدریجاً یہ کچھ کرتے چلے جاؤ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (97:5) تا آنکہ پوری انسانیت غلامی کی لعنت سے آزاد ہو جائے ۔قرآن حکیم تو دوسری مملکتوں کے اندر بھی اگر کہیں غلامی کی سوچ ہو تو ان کے لیے فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) کہہ کر اسے جہاد فرض قرار دیتا ہے۔اس نے یہ فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) صرف مومنین کی رہائی کے لیے نہیں کہا تھا کہ مسلمان اگر کہیں غلام بنائے گئے ہوں' تو ان کے لیے ضروری ہے۔اس نے انسان کی گردن کے لیے کہا تھا کہ کسی جگہ کسی انسان کی گردن غلامی کے جوئے کے

---

❶ واوین میں دی گئی اِن تمام عبارات کا حوالہ ہے: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن (جلد اوّل) مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' اگست 1993ء ص ص۔ 340 تا 341۔

اندر گرفتار ہے' تم مسلمان ہو' شرفِ انسانیت کے دعویدار ہو' تم پہ فرض قرار دیا جاتا ہے کہ جا کر اس کی غلامی کی زنجیریں کاٹو' خواہ اس کے لیے تمہیں اپنا سر ہی کیوں نہ دینا پڑے۔

اس قرآن حکیم کے حامل آج بھی ہمیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ اسلام میں غلام اور لونڈیاں جائز ہیں' حلال ہیں۔عزیزانِ من! اس کے برعکس امریکا کے اندر کسی زمانے میں غلامی کو چھڑانے کے لیے جو War (جنگ) ہوئی ہے' یورپ کے اندر غلامی کے خلاف جو چیزیں ہوئی ہیں' پوچھو نہیں کہ ان لوگوں نے کس قدر مسلسل جہاد کیے۔اور میں نے عرض کیا ہے کہ بالآخر یو این او کا جو چارٹر ہے' جس مجلس کے اندر بیشتر وہ مشرکین اور کفار ہیں' انہوں نے یہ بنیادی حقِ انسانیت رکھا کہ غلامی منسوخ کی جائے گی۔آپ کے ہاں آج بھی یہ چیز کہی جا رہی ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ تو کفر کے نظام میں ہوگا' جب ہمارا نظام آئے گا' جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا' وہ جو' اب اتنے زور سے سارا اقتدار ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں' تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پھر کیا نقشہ ہوگا۔یاد رکھیے! یہ نقشہ ہوگا آپ کے ہاں عورت کا۔

## حضرت زیدؓ کو غلامی سے آزاد کرنے کا قریش کے ممتاز ترین بنو ہاشم کی خاتون سے شادی کرانے کا قصہ

عزیزانِ من! قرآن مجید نے اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کہا ہے کہ یہ یا اس سے پیشتر' جو کچھ ہو گیا ہے' اس کے متعلق اب آگے آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں قدم قدم پر یہ چیز آئے گی کہ ان کو کسی طرح سے آزاد کیا جائے یا آزادی کی پوزیشن کا Status (رتبہ) دیدیا جائے۔دیا' صاحب! آزادی کا اسٹیٹس (رتبہ) اور اس انداز سے دیا کہ اپنا جو غلام حضرت زیدؓ تھا' جو حضرت خدیجہؓ نے کام کرنے کے لیے دیا تھا' سب سے پہلے اُسے آزاد کیا' یہ بہت بڑی چیز تھی کہ آزاد کیا۔آزاد کرنے کے بعد کیفیت کیا تھی؟ یہ کہ حضرتِ زیدؓ کے باپ کو اطلاع ملی کہ بیٹا آزاد کر دیا گیا ہے' بڑی خوشی سے آئے ہونگے۔بیگار کیمپ میں سے اگر کوئی بچہ پولیس کی تحویل میں آجائے' اشتہار ہو جائے کہ ہم نے اس کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے' ان کے پنجۂ ستم سے چھڑا لیا ہے' ماں باپ کس خوشی سے نہیں بھاگے جائیں گے اور بچہ کس طرح لپک کر وہاں نہیں جائے گا۔باپ آیا' یہ بیٹا ملا' ان سے ملنے کے بعد باپ نے کہا کہ چلو بیٹا ! گھر چلیں' بیٹے نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا کہ ابا جان! اِس گھر سے بہتر دنیا میں کوئی گھر نہیں ہو سکتا' میں نہیں جانا چاہتا۔باپ چلا گیا' زیدؓ ' بن باپ کے رہ گیا۔محمدﷺ نے کہا کہ زیدؓ اس کے بعد محمدﷺ تمہارا باپ ہوگا' تم اس کے بیٹے ہو گے۔یہ ہے مقام ! اللہ اکبر! عملی مثالیں قائم کر دی تھیں اور پھر آپؐ کا نکاح قریش کی' بنو ہاشم کی' ممتاز تریں خاتون' خود اپنی پھوپھی زاد بہن (حضرت زینبؓ) سے کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ قریش کے ہاں' حسب' نسب اور خون کی کتنی اہمیت تھی! ہندوؤں کے ہاں برہمنیت کھشتریت کی بھی وہ اہمیت نہیں ہے۔ان کی کیفیت یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں ایک اُدھر سے آ تا تھا' ایک اِدھر سے جاتا تھا۔تو پہلے وہ تعارف کراتے تھے۔وہ پوچھتے تھے کہ کون ہے؟ نام کیا ہے؟ پوچھتے تھے کہ قبیلہ کونسا ہے اور اگر قبیلہ وہ ہوتا جسے قریش اپنے ہاں' خود سے کمتر جانتے' تو کہتے کہ واپس جاؤ' تمہارے ساتھ لڑائی کرنا ہمارے لیے باعثِ ہتک ہے' ہمارے برابر کا دشمن بھیجو۔ان کی کیفیت یہ تھی چہ جائیکہ شادی کے معاملات ہوں۔

اب ہوا یہ کہ قریش کے ممتاز ترین بنو ہاشم کی ایک خاتون' اپنی پھوپھی زاد بہن' سے حضرت زیدؓ کی شادی کی۔اور اُدھر حضرت بلالؓ بھی ہیں۔انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔وہ حبشی غلام تھے۔یہ جو قریش کے بلند ترین نسب والے مسلمان تھے' یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سفارشیں لاتے تھے کہ بلالؓ سے کہو کہ ہماری بہن یا بیٹی کو قبول کرلے۔

## روم کی طرف پیش قدمی کرنے والے لشکر کا سپہ سالار اسامہ ابن زیدؓ کو مقرر کیا گیا

عزیزانِ من! اسی زیدؓ (جس کی شادی آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن سے کی تھی اور جو نبھ نہیں سکی تھی) کا بیٹا اسامہؓ تھا۔یہ اُس اصطلاح میں ہے جسے غلام ابنِ غلام کہیے۔نبی اکرم ﷺ کا اپنے حیاتِ ارضی میں' یہ آخری کام تھا کہ آپ ﷺ نے روم کی طرف سپاہ بھیجنی تھیں' لشکر بھیجنا تھا۔یہ آخری لشکر تیار کرلیا۔یہ بہت بڑا لشکر تھا۔اس لشکر کی سپہ سالاری یعنی کمانڈر ان چیف کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔مومنین کے لشکر کا سپہ سالار ہونا بہت بڑا اشرف ہوا کرتا تھا۔اس کے ہاتھ میں حضور ﷺ جھنڈا دیا کرتے تھے۔اس کی بڑی شہرت تھی۔بڑے بڑے اولوالعزم صحابہؓ کے دل میں یہ آرزو موجزن تھی کہ یہ جھنڈا آج انہیں ملے گا۔نبی اکرم ﷺ تشریف لے گئے' صفیں تیار تھیں' جھنڈا ہاتھ میں تھا' ان سب کو انتظار تھا' نگاہیں اس پہ لگی ہوئی تھیں یا کان لگے ہوئے تھے کہ کس کو آواز پڑتی ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسامہ ابنِ زیدؓ کہاں ہے؟ آج کی اصطلاح میں یوں ہے کہ غلام کا بیٹا غلام کہاں ہے؟ وہ باہر آیا' وہ عمر کے اعتبار سے بھی نوجوان ہی تھا' ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانِ غنیؓ بھی تو ان صفوں میں موجود تھے' عبدالرحمٰن ابن زیدؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ بھی ان کے اندر موجود تھے' خالد بن ولیدؓ بھی ان کے اندر موجود تھے۔یہ حضور ﷺ کی زندگی کا آخری کارنامہ' آخری جھنڈا' تھا جو آپ ﷺ نے دنیا کو یہ بتانے کے لیے اسامہؓ کے ہاتھ میں دیا ہے کہ دیکھو! غلاموں کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے' اب جو **اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ** موجود ہیں ان کے ساتھ یہ سلوک کرو' یوں ان کو Absorb (ضم) کرو:

تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تُو دیگری

یہ ہیں‘ عزیزانِ من! غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن مجید کے احکام‘ اور دوسری طرف وہ مروجہ شریعت کے فیصلے ہیں جو میں نے ابھی عرض کیے ہیں۔

## دوسری شادی کا فیصلہ مملکت یا معاشرے کی صوابدید پر کیا جائے گا

قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ ازواج کا وحدت کا قانون (Monogamy) ہے یعنی ایک بیوی کا۔ معاشرہ کے ہنگامی حالات میں کسی اور وجہ سے یہ الجھا ہوا مسئلہ نہ سلجھ سکتا ہو تو مملکت یا معاشرے کو یہ کہا گیا ہے کہ تم اس کا فیصلہ کر سکتے ہو‘ اس وحدتِ زوج کے قانون میں Relaxation (سہولت اور نرمی) دی جا سکتی ہے لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور دوسری یہ کہ جہاں وہ جائیں‘ اس گھر کے اندر عدل کی کیفیت باقی رہے‘ اگر یہ نہیں ہے تو پھر فَوَاحِدَةً (4:3) ایک ہی بیوی کا اصول کارفرما رہے گا۔ اور اس کے ساتھ یہ ہے کہ ہاں! یہ امتیاز کر دیا جائے کہ اس سے پیشتر‘ غلامی کے زمانے میں‘ لونڈیوں کی کیفیت یہ تھی۔ وہ ان سے الگ چیز رہی تھی اور بیویوں کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں۔ ان لونڈیوں کے متعلق تو احکام دیئے جا رہے تھے کہ ان کو کس طرح سے Absorb (ضم) کرنا ہے اور اس کی کیا صورتیں ہوتی ہیں۔ اب اس کے لیے بیویوں اور لونڈیوں کی دو الگ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

## بیویوں اور لونڈیوں کی الگ الگ دو اصطلاحوں کا استعمال کیوں؟

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر قرآن مجید نے یہ دو اصطلاحیں کیوں باقی رکھیں؟ عزیزانِ من! اس کی بڑی ضرورت تھی۔ ایک تو یہی کہ اگر تعداد کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو وہ یوں بڑھتی تھی‘ اِسے الگ کر کے رکھنا صرف اس غرض کے لیے تھا کہ ایک امتیاز رہے‘ فرق رہے۔ اس کے ساتھ ایک بات اور بھی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید کی نگاہ قانون کی نسبت سے تعزیرات اور سزا دینے کے معاملہ میں‘ کہاں تک پہنچی ہے۔ آج آپ اپنے گھروں میں ہی دیکھ لیجیے‘ اگرچہ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ پھر بھی گھروں کے اندر کام کاج کرنے والے لڑکے یا لڑکیاں‘ جس انداز کی ان کی تربیت ہوتی ہے‘ اس کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف ہماری اپنی بیٹیاں ہوتی ہیں‘ ان کی تعلیم و تربیت جس انداز سے ہوتی ہے‘ اسے بھی سامنے رکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ آج بھی ان میں کتنا فرق ہے چہ جائیکہ ایک لڑکی غلامی کی حیثیت میں کہیں سے پکڑی ہوئی لائی جائے‘ بازار سے خریدی ہوئی ہو‘ گھر میں اسے غلام کی حیثیت سے رکھا ہوا ہو۔ سوچیے! کہ اس کی ذہنی سطح کیا ہوگی‘ اس کی تربیت کیا ہوگی‘ اخلاقیات کے اندر پہچاننے میں اس تمیز کا معیار کیا ہوگا؟ اس پہچان کے لیے قرآنِ کریم میں بیویوں اور لونڈیوں کی الگ الگ اصطلاحات رکھی گئیں۔

## قرآنِ کریم کے اسلامی نظام میں مجرم کی سزا کے تعین کے لیے اس کے اختیارات اور اسکی علمی سطح کو پیش نظر رکھنا ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ الگ الگ دو اصطلاحات کیا چیز ہے۔ آپ غور کیجیے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زنا کی سزا میں آزاد عورتوں کی یہ سزا ہے لیکن اگر یہی جرم لونڈیوں میں سے' کسی سے سرزد ہو تو ان کو آدھی سزا دینا کیونکہ تم نے ان کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں کی کہ یہ اس فرق کو ملحوظ رکھے جو کہ ایک آزاد عورت رکھ سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں یہ اصطلاحی فرق ان چیزوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ قرآن بار بار **اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ** کہتا چلا گیا ہے تآنکہ یہ معاشرے کے جزو بن گئے۔ اس کے بعد تو یہ اصطلاح ہی ختم ہو گئی' پھر یہ فقہ کے مسائل کے اندر اور روایات میں باقی رہی اور پروان چڑھی۔ قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ **اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا**(4:3) ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ وہی ایک رکھو تا کہ تم ایک بوجھ کے تلے دب نہ جاؤ۔ اس **تَعُوْلُوْا** (4:3)) کے یہ معنی ہیں اور ایک معنی یہ ہیں کہ ''تم ناانصافی نہ کرنے لگ جاؤ''۔

## کثرتِ اولاد کو قرآنِ حکیم نے بوجھ تلے دبنا کہا ہے

ایک سے زیادہ بیویوں کے سلسلہ میں اولاد کی بھی تو کثرت ہوگی۔ اس کو قرآن حکیم نے بوجھ کے تلے دبنا کہا ہے۔ کثرتِ اولاد کے لیے وہاں یہ چیز کہی گئی ہے۔ اور آج اگر اس کثرتِ اولاد کو روکنے کے لیے' نہایت عمدہ طریقے تجویز کیے جاتے ہیں' جسے آپ یہ خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) کہتے ہیں تو اس کی سب سے پہلی مخالفت علمائے کرام کی طرف سے ہوتی ہے۔ عائلی قوانین کی رو سے ایک سے زیادہ بیوی کی کچھ حد بندی کی جاتی ہے اور وہ حد بندی بھی کیا تھی' وہ بھی قرآن حمید کا کوئی ایسا قانون نہیں لگایا تھا' اتنی سی بات کہی گئی تھی کہ بھئی! کم از کم اس پہلی بیوی کی رضا مندی تو لے لو۔ اس پہ طوفان مچ گیا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے صاحب! اس کا تختہ الٹ کر رکھ دیں گے جس نے یہ قانون نافذ کیے۔ وہ جو محمد ایوب خاں (1974-1907ء) بیچارہ مارا گیا تھا اس میں یہ عذر بھی اس کے خلاف تھا۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہ فیملی پلاننگ شروع کر دی۔ عزیزانِ من! یہ موضوع الگ ہے۔ میں جب اس پہ آؤنگا تو آپ سے عرض کرونگا کہ اس باب میں قرآن مجید کیا چاہتا ہے۔ یہاں ہے کہ **ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا**(4:3) یہ ہم اس لیے بھی چاہتے ہیں کہ تم کہیں بہت زیادہ عیال داری کے بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ' اگر تمہیں یہ بھی خطرہ ہو تو پھر بھی ایک سے زیادہ بیویوں کا حکم نہیں ہے' اس لیے قرآن مجید نے یہ قانون دیدیا۔ سورۃ النسآء کی یہ چوتھی آیت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس میں عام طور پہ جو احکام ہیں' یہ ازواجی زندگی یا گھر کی زندگی کے متعلق زیادہ ہیں۔ آگے چل کر تو پھر یہ عام احکام بھی اس میں آ جائیں گے لیکن شروع میں عام طور پہ اس میں

ازواجی زندگی کے متعلق ہی احکام آئے ہیں۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک نکاح کے معاملے میں عورت کے ایک زیادہ فائق حق کو تسلیم کیا گیا ہے

نکاح کے معاملے میں قرآنِ کریم مرد اور عورت کو یکساں حقوق دیتا ہے' یکساں ذمہ داریاں سپرد کرتا ہے' دونوں کو ایک وزن دیتا ہے لیکن ایک معاملہ ایسا ہے جس میں وہ عورت کا پلڑا جھکاتا ہے اور وہ یہ کہ وہ مرد سے کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ایک پلڑے میں تم ہو' ایک پلڑے میں عورت ہے' اس کا پلڑا جھکنا ہے' اس کے لیے تم نے اسے کچھ تحفتاً ساتھ دینا ہے' تمہیں کوئی تحفہ دینا ہوگا۔ اور مرد کی طرف سے جو تحفہ پیش کیا جاتا ہے' اسے آج کی اصطلاح میں ''مہر'' کہا جاتا ہے۔ ''آ حق مہر جنوں کیندے نیں' اک تے آ مہر ہوندے نے' اے نئیں مراد'' (جسے ''حق مہر'' کہتے ہیں' اور ایک یہ مہر لوگ ہوتے ہیں' اس سے یہ مراد نہیں)۔

## قرآنِ حکیم نے مہر کی بجائے تحفے کا لفظ استعمال کیا ہے جو نہایت ہی غور طلب ہے

''مہر'' کا لفظ قرآن حکیم میں نہیں آیا' اگرچہ یہ عربی زبان کا ہی لفظ ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لیے فَرِیْضَة (14:24) تو کہا ہے کہ یہ تحفہ پیش کرنا ایک نہایت ضروری چیز ہے لیکن یہ کیا ہے؟ اس کے لیے قرآن حمید نے ایک لفظ صَدُقٰتِهِنَّ (4:4) کہا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی سچائی کا ثبوت دیں کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس کا جو ایک محسوس ثبوت ہوتا ہے وہ دوستوں کا تحفہ ہوتا ہے۔ کوئی دوست جب چھوٹا سا تحفہ لے کر آئے' (مثلاً) بیمار کو دیکھنے جائے تو پھول لے جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ چیز ایک محسوس شے ہے جو اس کے دل کی کیفیت کے اظہار کا ایک ثبوت ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ (4:4) کہا ہے۔ ذہن میں یہ چیز تھی کہ کیا یہ وہی خریداری والی بات تو نہیں کہ یہ دے کر اس سے کچھ خرید لیا جائے گا؟ یہ صَدُقٰتِهِنَّ (4:4) تو ایک طرف رہا' اس لفظ کے فوراً ہی بعد آگے لفظ نِحْلَةً (4:4) آیا ہے۔

وجد آ جاتا ہے' عزیزانِ من! جب انسان لفظ پہ غور کرتا ہے۔ قربان جائیں اِن الفاظ کے انتخاب کرنے والے خدا پہ کہ کیا بات کہی ہے! یہ نحل شہد کی مکھی ہے' جب میں سورۃ النحل پہ آؤنگا تو وہاں میں عرض کرونگا کہ قرآن کریم نے کیا بتایا ہے کہ اس نظام میں جوان مکھیوں نے اپنے ہاں بنایا ہوا ہے' انسانیت کی بہت سی بیماریوں کا علاج موجود ملے گا۔ اس میں یہ ایک حکمت ہے کہ ایک مکھی ہزاروں میل کا سفر کرتی ہے' عام اندازہ یہ ہے کہ ایک چمچی شہد کی خاطر ایک مکھی کو 37 ہزار میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال وہ مختلف جگہ جا کر خوبصورت تریں پھولوں کا عمدہ تریں رس چوستی ہے۔ وہ ہوتا ہی کتنا ہے! بہر حال وہ اسے اپنے منہ میں لیتی ہے' وہاں سے اڑتی ہے' امین اتنی ہے کہ راستے میں خواہ اس کی جان چلی جائے' اس میں ذرا سی بھی خیانت نہیں کرتی۔ وہ جو قرآن حمید نے کہا تھا کہ ہماری امانت

کے سلسلہ میں ارض وسما میں سے کسی نے بھی خیانت نہیں کی تھی‘ یہ اس کی مثالوں میں سے ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ وہ آیت آئے گی تو میں عرض کرونگا۔ وہ بڑی بلند آیت ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ قطعاً راستے میں اس میں خیانت نہیں کرتی‘ آتی ہے تو اس چھتے میں اسی طرح نہایت ایمانداری سے اپنے اس حصہ کو رکھ دیتی ہے اور الگ ہو کر بیٹھ جاتی ہے‘ اس میں بانٹنے والے اور ہوتے ہیں۔ اس میں سے جو بہترین شہد ہوتا ہے‘ وہ بانٹنے والی کوئین یا اس کا جو نظام ہے‘ وہ اسے پہلے بچوں کو دیتا ہے‘ پھر جو اور زیادہ کام کاج کرنے والے ہیں ان کو دیتا ہے۔ یہ جو شہد اکٹھا کر کے لانے والی ہوتی ہیں‘ انہیں تو اس میں سے موم ملتا ہے۔ یہ جو اس طرح تگ وتاز کر کے‘ وہ جسے شہد کا ننھا سا قطرہ ہی کہا جائے گا‘ لاتی ہے‘ پھر جس انداز سے لا کر‘ بلا اس خیال کے کہ اس کا کوئی مزد یا معاوضہ مجھے ملے گا‘ چھتے میں رکھ دیتی ہے‘ اسے نِحْلَة کہتے ہیں۔ قطعاً احساس نہیں ہوتا گویا یوں کہیے کہ جس طرح سے وہ شہد کا قطرہ لا کر چھتے میں رکھ دیتی ہے اسے نِحْلَةً کہتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ جو تحفہ دیا ہے‘ یہ ایک تو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تمہارے دل میں واقعی اس کی محبت ہے‘ اور دوسرا یہ کہ یہ تحفہ دیا ہے تو یوں دیا ہے‘ جیسے وہ مکھی شہد کا قطرہ چھتے میں دے جاتی ہے اور الگ ہو کر بیٹھ جاتی ہے:

یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو

عزیزانِ من! یہ ہے نِحْلَةً (4:4) اور اس کو یہ مل گیا۔

## ہمارے ہاں حق مہر کے مقرر کرنے اور پھر اس سے بچنے کا طریقِ کار اور قرآنی احکام کی نوعیت

آپ کو معلوم ہے کہ یہ مہر کیسے مقرر ہوتا ہے‘ کیسے دیا نہیں جاتا اور مقرر کیے ہوئے کی شرائط سے نکلنے کے لیے کیا کچھ کیا جاتا ہے۔ پہلے تو اس تحفہ کو‘ جو نِحْلَةً (4:4) کی صورت میں دیا جاتا ہے‘ مقرر کرتے وقت جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے‘ کبھی اسے بھی دیکھیے۔ بسا اوقات تو برآتیں ہی اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ اور یہ پھر ان کی کم بختی کی کیفیت کہ اسے کہیں پہلے سے طے کر لیں‘ سارا کچھ کر لینے کے بعد عین نکاح کے وقت‘ آخر میں‘ جب (نکاح خواں) پوچھتا ہے کہ ''جی! حق مہر کی لکھنا؟ او (لڑکی والے) کیندے ہیگے نیں پنجی ہزار لکھو‘ او کیندے نئیں! ساڈی کڑیاں دا بتیس روپے شرعی مہر رکھیا ہویا سی۔ آ اک شرعی مہر وچوں آ گیا ہیگا'' (جی! حق مہر کتنا لکھنا ہے؟ وہ (لڑکی والے) کہتے ہیں پچیس ہزار۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں جی! ہماری بچیوں کا بتیس روپے شرعی مہر رکھا ہوا ہے۔ اب یہاں یہ ایک شرعی مہر آ گیا)۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا (4:20) اگر تم اس کو سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ قرآن حمید نے اس کی کوئی حد متعین نہیں کی۔ کیا تحفہ اور ہدیہ کی کوئی حد مقرر کی جایا کرتی ہے؟ نہیں‘ بالکل نہیں۔ کیا کبھی آپ کسی دوست سے یہ کہتے ہیں کہ میرے ہاں عید ملنے کے لیے آنا تو دس سیر مٹھائی لے کر آنا

''پونے دس سیر ہوئی تے اندر نئیں وڑن دیاں گا!'' (اگر پونے دس سیر ہوئی تو اندر نہیں آنے دوں گا)۔قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔وہ کہتا ہے کہ تم سونے کا ڈھیر دے سکتے ہو' اپنی خوشی سے دو' تم نے ایک تحفہ دینا ہے۔اور آپ کے ہاں یہ ایک چیز آ گئی کہ بتیس روپے شرعی مہر ہے ''جے اوتیتیس (33) ہو جائے تے غیر شرعی آ۔آ جنے ہوئے نیں' اے سارے غیر شرعی ہوئے نیں۔پتہ نئیں آ بتّیاں (32) آ لا کیہڑا اتہاڈے وچوں آ'' (اگر وہ 33 ہو جائے تو غیر شرعی ہوا۔یہ جتنے ہوئے ہیں یہ غیر شرعی ہیں۔معلوم نہیں کہ آپ میں سے بتیس والا کونسا ہے؟) اور جس زمانے میں وہ بتیس (32) تھے' اس زمانے میں بتیس (32) کی بھی کچھ قدر و قیمت ہوگی۔''اے ہُن ایس زمانے اچ تے بتّیاں (32) دی تے جُتّی نئیں اونی کڑی دی'' (اب اس زمانے میں 32 میں تو لڑکی کی جوتی بھی نہیں آتی)۔ یہ شرعی مہر بتیس روپے ہے یاللعجب! پتہ نہیں ہم کہاں سے کہاں چلے گئے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ قطعاً شرعی ورعی نہیں ہے۔یہ آپ کے ہاں ایک رسم ہے۔آپ کے ہاں جب مہر طے ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! پچاس ہزار' وہ کہتا ہے صاحب! ہماری یہ ہمت نہیں ہے' توفیق نہیں ہے' اِدھر سے آواز آتی ہے ''لکھن دے' دیندا کوئی نئیں۔لکھیا جاندا ہوندا اے۔لکھن دے تاں کی ہویا!'' (اسے لکھنے دو۔اسے دیتا کوئی نہیں' یہ لکھا جاتا ہے۔لکھنے دو تو بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے!) یہ آوازیں سنی جاتی ہیں کہ ''او لکھن دے' کوئی گل نئیں ہیگی' کوئی بات نئیں ہیگی'' (ارے لکھنے دو' کوئی بات نہیں' کوئی معاملہ نہیں)۔لکھا گیا۔اس کے بعد جناب! پہلے ہی جھگڑے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ''میں بخشوالیا ہیگا سی'' (میں نے معاف کروالیا تھا)۔

عزیزانِ من! قرآن حمید نے ان عائلی قوانین کے متعلق کہا تھا کہ وَ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) ان احکام کو کہیں مذاق نہ بنالینا۔یعنی اس کو کیا کہا جائے' وہ تو خبیر و علیم ہے' ہم نے اس کے متعلق جو بھی کرنا تھا اس نے بتادیا کہ ''چلو! پتہ اے سانوں کہ تسی کی کرنا اے'' (بیوقوفو! ہمیں پتہ ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے)۔ہمارے قوانین کو کہیں مذاق نہ بنالینا۔کیا لفظ ہے قرآن کریم کا! یہ استہزاء ہے۔استہزاء وہ مذاق ہوتا ہے کہ اس میں Humour (مزاح) کی بات نہیں ہوتی بلکہ تذلیل ہوتی ہے۔جس Humour (مزاح) میں دوسرے کی تذلیل مقصود ہو' اسے عربی والے استہزاء کہتے ہیں۔اس کے برعکس مزاح تو بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔یہاں یہ استہزاء ہے۔کہا کہ کہیں ایسا نہ کر لینا۔یہ دیکھیے! اس کہنے میں احکام کی تذلیل نظر آ رہی ہے کہ ''ٹھیک ہے' او لکھن دیؤ کنے دینا ہیگا'' (ٹھیک ہے' اسے لکھنے دو۔یہ کس نے دینا ہے!)۔بہر حال یہ ہے اس مہر کی حقیقت جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ دینا ہے اور یہ دے کر صَدُقٰتِهِنَّ (4:4) تم اپنی صداقت کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔یہ نِحۡلَةً (4:4) تم نے دینا ہے۔اس میں کسی قیمت یا بدل کا خیال تک بھی نہیں آتا۔اس لیے کہ مہر تو ایک تحفہ ہے' نہ کہ کسی چیز کا بدل۔یہ اسے دیدیا۔اِس کی بات تو ختم ہوئی۔

آگے کہا ہے کہ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ (4:4)۔ برابر میں بھی تو آگے دوست ہے۔ اگر یہ اپنی رضامندی سے کہے کہ ہاں بھئی! تم نے یہ دیا ہے' بہت اچھی بات ہے' میں اپنی طرف سے تمہیں اتنا چھوڑتی ہوں' دوستی ہے۔ کہا ہے کہ طِبۡنَ لَکُمۡ (4:4) اس کی طرف سے' رضامندی سے' مہر کی یہ بات ختم ہوگئی ہے' یہ اس کے حق کی کوئی چیز نہیں رہی۔ یہ اب عورت کے متعلق کہا ہے کہ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا (4:4)۔ عجیب الفاظ ہیں صاحب! پہلے تو طِبۡنَ ہی لیجیے۔ طاب کے معنی ہوتا ہے ''دل کی رضامندی اور خوشگواری سے' اس میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے''۔ یہاں طِبۡنَ لَکُمۡ آیا ہے کہ ''دل کی رضامندی سے' خوش ہو کر' دوستانہ حیثیت سے' برابر کے تعلقاتِ محبت سے' پیار اور ازدواجی زندگی کی رفاقت کے تعلقات قائم ہوگئے۔ وہ اگر اس انداز سے تمہیں کہے کہ نہیں' یہ لے لو اور آگے ہے کہ مِّنۡهُ نَفۡسًا (4:4) اس میں کسی دوسرے کا کوئی اشارہ تک بھی نہ ہو' وہ خود فیصلہ کرے۔ فَکُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا (4:4) تو ٹھیک ہے' پھر تم نہایت خوشگواری سے' ایک دوست کی طرف سے آئی ہوئی ریٹرن (مزد و معاوضہ) کے تحت بلا تامل اپنے تصرّف میں لا سکتے ہو۔ ٹھیک ہے' تم نے عید کے دن ان کے ہاں تحفہ بھیجا تھا' شیر خورمہ بھیجا تھا' وہاں سے زردہ آیا ہے' ٹھیک ہے' وہ بھی خوشی سے کھائیں گے' تم بھی دوست کے ہاں کے تحفہ کی چیز خوشی سے کھاؤ۔ یہاں هَنِیۡٓـًٔا مرِیۡٓـًٔا (4:4) کہا ہے کہ نہایت خوشگواری سے یہ جو چیز ہے' اسے اپنے تصرّف میں لا سکتے ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کی آیات کا جہاں تک ان کے احکام کا تعلق ہے' درس میں ان کی مزید وضاحتی ضرورت نہیں رہے گی۔ مہر کے متعلق ہے کہ یہ یوں طے ہو جائے اور اس کے بعد ہے کہ یہ تو دیا جانا ہے' قرآن حکیم نے صرف Exception (استثنا) کی کوئی صورت ایسی بتائی ہے کہ جس میں اگر ایسی شکل پیدا ہو جائے کہ اسی وقت نہ دیا جائے تو اس کے بعد یہ انہیں دے دیا جائے' یہ تمہارے سر قرض ہے' اسے ادا کرنا ہوگا ورنہ یہ اسی وقت دیا جانا ہے۔ اگر اس وقت طے نہ ہو تو بعد میں ادا کیا جائے۔

اب اگر اختلاط ❶ سے پہلے ہی نکاح کی تنسیخ کی نوبت آجائے تو اس وقت کیا کیا جائے؟ عورت اگر اپنے نکاح کو منسوخ کرنے کے لیے چاہتی ہے تو اس وقت کیا کیا جائے؟ قرآن کریم میں مختلف مقامات پہ یہ احکام ہیں' میں سمجھتا ہوں آپ احباب کو ان کی یوں ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ تفاصیل معلوم کرنی ہوں' کسی کو ضرورت پڑ جائے یا تو مجھ سے پوچھ لے یا یہ میری ایک بڑی چھوٹی سی کتاب ہے 'قرآنی قوانین' اس میں سارے قرآن حکیم کے تمام معاملات کے متعلق قوانین ہیں بلکہ جتنے بھی معاملات کے متعلق قرآن حمید نے قوانین

---

❶ باہمی رابطے سے پہلے تنسیخِ نکاح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: قرآنی قوانین' ادارۂ طلوعِ اسلام' لاہور

اوراحکام دیئے ہیں' وہ اس کے اندر میں نے درج کر دیئے ہیں۔ آپ احباب کو اگر اس قسم کے معاملات میں یہ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت پڑے کہ قرآن مجید کیا کہتا ہے تو اس کو یہاں ادارے ❶ سے ہی لے کر Consult کر لیجیے' اس میں دو صفحوں کے اندر یہ ساری بات دیدی گئی ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک معاملے کے متعلق مثلاً مہر کے متعلق' عدت کے متعلق' نکاح کے متعلق' عمر کے متعلق' یہ ساری چیزیں' دیدی ہیں۔

بہرحال ہمارے سامنے یہ آیت آ گئی جسے آپ مہر کہتے ہیں' یہ ہے اس کی ادائیگی کی شکل' یہ ہے اس میں سے وہ جو پھر عورت از خود تحفتاً تمہیں واپس دیدے' چھوڑ دے' یہ ہے اس کی شکل۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی چوتھی آیت ہمارے سامنے آ گئی' پانچویں آیت سے ہم آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

---

❶ یہ اشارہ ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف ہے۔

# چوتھا باب: **سورۃ النسآء** (1)' (آیات 5 تا 10)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ
وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۶ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ
مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ
نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۷ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۸ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ
وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۱۰

عزیزانِ من! آج جولائی 1970ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 5ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:5)۔

## معاشرے کا ہر وہ فرد جو خود کو تنہا محسوس کرے' وہ قرآنِ حکیم کے نزدیک یتیم ہے

جیسا کہ میں نے اس سورۃ کے آغاز میں عرض کیا تھا' اس میں بیشتر عائلی زندگی' گھر کی زندگی' خاندانی زندگی' کے متعلق احکام اور ہدایات آئی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس بات پہ تاکید کی جارہی تھی کہ جو یتیم رہ جائیں' ان کا منصفانہ حل کیا ہو اور یتیموں کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک بڑی جامع (Comprehensive) سی اصطلاح (Term) ہے۔ اس میں وہ بچے بھی آجاتے ہیں جن کے ماں باپ مرجائیں' ان میں اگر لڑکا بالغ ہوجائے تو وہ اسے یتیم نہیں کہتے تھے لیکن لڑکی یا بیوہ عورت کو وہ اس وقت تک یتیم کہتے تھے' جب تک اس کی شادی نہ ہوجاتی۔ وہ ہر اس فرد کو یتیم کہتے تھے جو دنیا میں بے سہارا رہ جائے' جس کا کوئی آسرا نہ ہو' وہ تنہا رہ جائے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ آج ہمارا معاشرہ تو ایسا ہو چکا ہے کہ اس میں کم وبیش ہر کوئی یتیم ہوتا ہے۔ اس یتیمی کا احساس اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب کسی پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ وہ مصیبت تنہا اسی کی ہے' کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوتا

حالانکہ معاشرے کا تو لفظ ہی عربی زبان میں عشرہ سے ہے' دس سے ہے' جب تک ایک کے ساتھ دوسرا نہیں ملے گا' تو اس کو معاشرہ کہیں گے ہی نہیں۔ تنہا فرد کو عشر کہہ ہی نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کھڑا ہو تو یہ پھر اسے معاشرہ کہیں گے۔ انہوں نے معاشرہ کا لفظ یہیں سے نکالا تھا کہ جو تنہا رہ گیا ہو' وہ معاشرے میں نہیں ہوتا بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس کا کوئی معاشرہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور یہی چیز ہے کہ قرآنِ کریم نے جو یتیم کی اصطلاح اختیار اور استعمال کی ہے تو اس میں ہر وہ فرد آ جاتا ہے جو معاشرے میں کسی طرح سے بے سہارا اور بے آسرا رہ جائے۔

یتیموں کے سلسلہ میں اس نے یہ بتا دیا تھا کہ اگر کسی وقت معاشرے کی ایسی شکل بن جائے کہ اس میں بیوہ عورتیں' جوان لڑکیاں' یتیم بچے' بڑی کثرت سے رہ جائیں' ان کا کوئی منصفانہ حل نہ ملتا ہو تو ایسی ایمرجنسی کے عالَم میں ''ایک بیوی ایک میاں کے قانونِ ازدواج'' میں اس ایمرجنسی کو Meet (تسلیم کر کے اس کے تقاضا کو پورا) کرنے کے لیئے' ان ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے' اس نے ایک سے زیادہ شادیوں کا استثنا کیا تھا۔ اس سے آگے پھر اس سورۃ کی پانچویں آیت میں یتیموں ہی کے متعلق ہے کہ تم ان کے نگران ہو جاؤ۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** (4:5)۔ اس آیت کو اگر ہم یتیموں تک محدود رکھیں تو پھر تو بات اتنی ہی رہتی ہے کہ ''اگر وہ بالغ بھی ہو جائیں تو اس وقت یہ دیکھو کہ ان میں اتنی سمجھ بوجھ ہو گئی ہے' اس قدر وہ سمجھدار ہو گئے ہیں کہ اپنے معاملات کو آپ ہی سنبھالیں''۔

## لفظ بلوغت کی حقیقی تعریف

عزیزانِ من! اپنے معاملات کو آپ ہی سنبھالنے کے لیے ایک چیز تو عمر کی ہوتی ہے۔ بالغ ہونے سے پہلے تو بچپن ہوتا ہے' اس میں بچہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اپنے معاملات کو سمجھ بوجھ کے ساتھ خود سنبھال لے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ بالغ ہونے کے بعد ہر بچے میں اس قدر سمجھ اور عقل وشعور اور پختگی آ جائے کہ وہ اپنے معاملات کو سنبھال لے۔ اس لیے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے اگر آپ قانوناً لیں گے تو بلوغت کی شرط ہو گی لیکن ساتھ یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ اپنے معاملات سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے۔ ایسی صورت ہے تو اس کا جو کچھ بھی آپ کی نگرانی میں تھا وہ انہیں دیدو' اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر ان کی پرورش کرتے چلے جاؤ اور ان کی تربیت بھی کرتے چلے جاؤ۔

یہ جو قرآنِ کریم میں **قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** (4:5) کہا ہے' اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ ان سے ذرا نرمی سے' اچھی طرح سے' بات کرو بلکہ یہ ہے کہ ان کی تربیت اس انداز سے کرو کہ ان میں پختگی آ جائے' ان کا عقل وشعور بیدار ہو جائے' یہ اپنے معاملات سنبھالنے کے قابل ہو جائیں۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے کا یہ مفہوم اس حد تک رہا۔ اب جہاں تک یتیموں کی نگرانی' پرورش

اور تربیت کا تعلق ہے' اس آیت کے الفاظ اس مفہوم سے زیادہ جامع ہیں۔

## قومی سطح پر مال و دولت کی اہمیت' اس کی تحویل کا معاملہ اور السفہآء کا مفہوم

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (4:5)۔ یہاں یہ نہیں کہا ہے کہ یتیموں کا مال' جو تمہاری تحویل میں ہے' انہیں اس وقت واپس دو جب وہ صاحبِ عقل و شعور ہو جائیں۔ اس میں ارشادِ خداوندی یہ ہے کہ ''تمہارا مال خدا نے تمہارے لیے وجہِ قیام بنایا ہے' یہ قومی معیشت کے متعلق ہے' قوم کی دولت کے متعلق ہے کہ مال تمہاری قومی معیشت کا ذریعہ یعنی قیام کا موجب بنے''۔ یہ اَمْوَالَكُمْ (4:5) قوم کی دولت (National Wealth) ہے اور اسی لیے کہا ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (4:5) یہ تمہارے لیے قیام کا موجب ہے۔ تمہاری نیشنل ویلتھ' تمہاری قومی دولت' تمہارے لیے وجہِ قیام ہے' تم اس کے سہارے اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گے۔ یہ اگر نہیں ہو گی تو دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے' اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکو گے۔ آپ دیکھیے یہاں مال کی اہمیت کتنی ہے! قومی دولت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے سہارے ایک قوم اپنے پاؤں پہ آپ کھڑی ہو سکتی ہے اور اگر وہ صورت نہ ہو تو وہ قوم پھر محتاج رہتی ہے' دوسری قوموں کی دست نگر رہتی ہے۔ مال وہی مال ہے جو یہ شرط پوری کرے کہ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (4:5) قوم کا قیام باقی رہے' وہ اپنے پاؤں پہ آپ کھڑی ہو جائے۔ اور یہ جو نیشنل ویلتھ ہے' یہ آپ کا مال ہے' یہ ان لوگوں کی تحویل میں نہ دو جو صحیح طریق پر اس کا انتظام نہ کر سکیں۔

عزیزانِ من! یہ السُّفَهَآءَ (4:5) صرف بیوقوف کو نہیں کہتے بلکہ انہیں بھی کہتے ہیں جو لاپرواہی برتیں۔ بنیادی طور پہ اسکے معنی ہوتے ہیں ''وہ لوگ جو معاملات کو Seriously (سنجیدگی سے) نہ لیں''۔ اب اس میں دونوں چیزیں آ گئیں کہ ایسے لوگ جن میں اس کی اہلیت اور صلاحیت ہی نہ ہو کہ وہ قوم کی دولت کو صحیح مصرف میں لا سکیں' اس کا صحیح انتظام و انصرام کر سکیں' اور وہ لوگ بھی آ گئے جو عقل و فکر کی رو سے تو ایسے ہوں لیکن قوم کے معاملے میں اتنے سنجیدہ (Serious) نہ ہوں' اس سے لاپروائی برتیں' اپنا تو ایک ایک پیسہ صرف کرتے وقت دس مرتبہ خیال کریں کہ کس مقام پہ صرف ہو رہا ہے' اس کا نتیجہ کیا نکلے گا' اس سے فائدہ کیا ہو گا لیکن جب قومی دولت ہاتھ آئے تو اس کے متعلق پھر بڑی لاپرواہی برتیں۔ یہ دونوں چیزیں سُفَهَآء میں آ جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم کے ہاں یہ السُّفَهَآءَ بڑی جامع چیز ہے۔ قرآن حمید میں مستعمل الفاظ کے کیا کہنے! اس کے الفاظ بڑے ہی محیطِ کل ہوتے ہیں۔ ہاں تو السُّفَهَآءَ ایسے لوگ ہیں کہ جن میں یا تو اس کی صلاحیت نہ ہو کہ وہ قوم کی دولت کا صحیح طور پر انتظام کر سکیں اور یا صلاحیت تو ہو لیکن وہ اس کو اتنا Seriously (سنجیدگی سے) نہ لیں۔ کہا ہے کہ وہ تمہارا مال' وہ تمہاری قومی دولت کہ جسے تمہارے لیے

قوم کے لیے وجہ قیام بنتا ہے' اسے ان لوگوں کے سپرد مت کرو جو اس کی اہلیت نہیں رکھتے یا جو اس معاملے کو Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے' اس میں لاپروائی برتتے ہیں' اس میں Carelessness (بے احتیاطی) ہو جاتی ہے' ان چیزوں کو Lightly (ہلکے پھلکے انداز میں' غیر سنجیدگی سے) لیتے ہیں' یہ ان کے سپرد نہ کرو۔

## قرآنی نظام میں مملکت کی بنیادی ذمہ داری

قرآن مجید کے معاشی نظام کی رو سے مملکت کے ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کے ذمہ ہوگا۔ اس میں **السُّفَهَآءَ** بھی آئیں گے' اس میں عقلاء بھی آئیں گے' اس کے اندر بالغ بھی آئیں گے' اس میں یتیم بھی آئیں گے لیکن یہ اس وقت ہوگا جب آپ کا قرآنی نظام قائم ہوگا۔ اس میں تو یہ چیز خود مملکت کی ذمہ داری میں آجائے گی کہ کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس لیے وہاں **وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ** (4:5) ان کے لیے روٹی' کپڑے اور صحیح تربیت کے لیے' یہ بھی قوم کا فریضہ ہو جائے گا' افراد کا الگ الگ فریضہ نہیں رہے گا۔ ہاں البتہ اس سے پہلے تک ایسے لوگوں کے روٹی' کپڑے اور صحیح تربیت کا انتظام کر دیا کرو۔

## قرآنی راہنمائی نے اپنے ہاں تدریجی مراحل کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے لیکن ہمارے ہاں اسے سمجھا نہیں گیا

اس چیز کو یاد رکھیے! کہ قرآنِ کریم اپنے نظام کی ابتدا آہستہ آہستہ بتدریج کرتا ہے پھر اسے اپنی انتہا تک لے جاتا ہے' اپنی آخری منزل تک لے جاتا ہے اور اس پورے پروگرام کے' ہر درجہ' ہر منزل کے لیے' ہدایات' راہنمائی' احکام واصول اور اقدار قرآن کریم نے دیئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دقت کیوں پیش آتی ہے؟

اس لیے دقت پیش آتی ہے کہ اول تو ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب! محتاجوں کی نگرانی کرو' انہیں اس کی ضرورت ہے' ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرو' سائل کو جھڑکو نہیں' صدقہ دو' خیرات دو' یہاں یہ چیز آئی ہے' آگے چل کر کہیں یہ آگیا ہے کہ تمہاری دولت' صرف تمہاری دولت نہیں ہے بلکہ اپنی ضرورت سے زائد جتنا ہے' وہ تمام کا تمام مملکت کے حوالے کرو تاکہ وہ ان چیزوں کا انتظام کرے۔

''سردار فتح جی'' تو وہ ہیں جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! قرآن مجید میں عجیب ایک دوسرے سے مختلف قسم کے احکام آتے ہیں' کہیں یہ لکھا ہوا ہے' کہیں وہ لکھا ہوا ہے' کہیں وراثت کے احکام ہیں' کہیں لکھا ہے کہ یاد رکھو! جو مال تمہیں مل جائے' وہ وراثت تنہا ہی نہ کھا جایا کرو۔ انہیں اس قسم کے احکام میں اختلاف نظر آتا ہے' تضاد نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ چیز کہتے ہیں کہ قرآن

کریم کے اندر اس قسم کے متضاد احکام ہیں' پھر دوسرے لوگ وہ ہیں جو یہ نہیں دیکھتے کہ کونسا حکم کس درجہ کے اندر آتا ہے' وہ ابتدا ہی میں آخری احکام کو لے آتے ہیں۔ معاشرے کی یہ حالت ہے اور اس میں وہ اس چیز کو لے آئیں گے کہ صاحب! جو کچھ کسی کے پاس ہے' اسے چاہیے کہ سب کا سب دیدے اور پھر دوسرے دن خود کیا کرے؟ یہ کہ پھر دے جا اللہ واسطے میاں (اللہ کے لیے مجھے دے جا بابا!)۔ اسے سمجھا ہی نہیں گیا۔

## تدبر فی القرآن کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے قدم قدم پہ غور اور تدبر کہا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک پورا پروگرام دیتا ہے۔ پہلے قدم سے لے کر آخری منزل تک مختلف مدارج میں سے گزارتا ہوا لے جاتا ہے اور ہر منزل کے متعلق اس میں ہدایات' راہنمائی اور احکام موجود ہیں۔ تدبر فی القرآن کے معنی یہ ہیں کہ آپ دیکھیے معاشرہ کس حالت میں ہے' کہاں سے بات شروع کرنی ہے' کس طرح اس کو بتدریج وہاں تک لے جانا ہے اور پھر جس مقام پہ آپ کا معاشرہ ہے' وہ جس اسٹیج میں ہے' جس منزل میں ہے' اس سے متعلق قرآن مجید میں کیا احکام اور راہنمائی ہے' اسے وہاں Apply (استعمال) کرو۔ آپ آگے چلے گئے ہیں' یہ پچھلی منزل کے احکام رہ گئے ہیں مثلاً وضو کا حکم پانی کے ملنے کی صورت میں ہے' اگر پانی نہیں ہے تو وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا' تیمّم کا حکم آگے بڑھ جائے گا' اب اس پہ عمل کیا جائے گا اور آپ آگے بڑھے ہیں پھر پانی مل گیا ہے' پھر تیمّم کا حکم پیچھے ہٹ گیا' پھر وضو کا حکم آگے آ گیا۔ میں نے مثال کے طور پہ یہ بات سمجھائی ہے۔ یہ تیمّم اور وضو کی ہی بات نہیں ہے' زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبہ کے متعلق قرآن مجید کے احکام اسی قسم کے ملیں گے۔ اور ان پر تدبر کرنا ہوگا کہ کونسا حکم کس وقت روبہ عمل ہوگا۔

## سطح بیں نگاہوں نے قرآنِ حکیم کی پانچ صد آیات کو منسوخ قرار دیدیا

جیسا میں نے ابھی کہا ہے' سطح بیں نگاہیں تو کہیں گی کہ ان میں باہمی بڑا تضاد ہے صاحب! اور یہی عدمِ توجہ یا تدبر تھا جس کی بنا پر ہمارے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن حکیم کے بعض احکام' دوسرے احکام سے منسوخ ہو چکے ہیں۔ اس قرآن حکیم کے متعلق یہ عجیب عقیدہ تھا جس نے قرآن حکیم کو عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا۔ ابتدا میں ہمارے ان مفسرین نے کم از کم پانچ سو آیات کو منسوخ قرار دیدیا۔ یعنی یہی چیز کہ کہیں کہا گیا ہے کہ تم ذاتی طور پہ محتاج کی مدد کرو' کہیں کہا گیا ہے کہ تمہارے پاس اپنی ضروریات سے زائد جتنا بھی ہے وہ سارے کا سارا لاکر مملکت کے سپرد کر دو۔ ان کو نظر آیا کہ یہ تو دو متضاد حکم ہیں۔ جب یہ سارا دیدیا جائے گا تو یہ خیرات اور صدقات اور سائل کو دینے کے احکام' محتاج کو دینے کے احکام' کہاں چلے جائیں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ احکام اس سے منسوخ ہیں' کسی نے کہا کہ

وہ حکم ان سے منسوخ ہے۔اوراس طرح یہ ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ وضع کیا گیا۔

## قرآنِ حکیم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں بلکہ وہ تدریجاً' منزل بہ منزل اپنی راہنمائی کو واضح کرتا چلا جاتا ہے' مثلاً شراب کی مثال

برادرانِ عزیز! قرآن حکیم میں نہ نسخ ہے' نہ منسوخ ہے۔قرآن حکیم کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں ہے' اس کا ایک ایک نقطہ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اٹل ابدی حقیقتیں لیے ہے مگر

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا

(غالب)

قرآن مجید نے زندگی کے ہر مرحلہ' ہر منزل کے لیے' ہدایات دی ہیں۔انسان جب اس معاشرے سے ابتدا کرے گا تو اس معاشرے کی کیفیت کو دیکھ کر انفرادی طور پر' ان ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی ترغیب دے گا' تحریک کرے گا' ذرا اور آگے بڑھے گا۔جب مومن کا مقام آئے گا کہ اس نے سب کچھ خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہے' تب مملکت دیکھے گی کہ کس حد تک اجتماعی طور پر ان سے لیتے جانا چاہیئے' کس حد تک انفرادی طور پر ان کے پاس چھوڑنا چاہیے۔ایک طرف آیات ہیں جن میں صاف نظر آتا ہے کہ وہ ملکیت تسلیم ہی نہیں کرتا اور دوسری طرف آپ دیکھتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ لین دین کے معاملات کرو تو ان کو اس طرح سے لکھ لیا کرو' یہ وراثت کے احکام ہیں' جس پر سطح بیں نگاہیں رکھنے والے جھٹ سے کہتے ہیں کہ صاحب! اگر یہ صورت ہے کہ ملکیت تسلیم نہیں کرتا تو یہ احکام کس کے لیے ہیں۔انہیں پتہ نہیں کہ پہلا دور ہے اس کے اندر یہ چیزیں دی جائیں گی۔وہ رفتہ رفتہ' آہستہ آہستہ اس کو آخری منزل تک لے جائے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ صرف شراب کے متعلق ہے کہ اسے چھڑانے کے لیے کیسے آہستہ آہستہ بتدریج احکام دیئے گئے۔میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔اس سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآن حمید کی نگاہ انسانی نفسیات پر کتنی گہری ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ بعض احکام تو ایسے ہیں جو آپ فوری کہہ سکتے ہیں کہ بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ' دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔آپ فوری کہہ دیجئے' ان پہ فوری عمل بھی ہو جائے گا۔قوموں کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو آپ یوں چھڑا سکتے ہیں' عقلی دلائل سے منوا سکتے ہیں۔خدا کی توحید کے متعلق آپ نے دلائل دیئے' سمجھایا اور اس کے بعد کسی کی سمجھ میں بات آ گئی تو وہ اسی دن باقی خداؤں سے انکار کر کے بت پرستی کو چھوڑ دے گا لیکن جس قوم

میں پشت ہا پشت سے مثلاً شراب' گھٹی میں پڑ چکی ہو' ان کے خون کے ذرات میں حلول کر چکی ہو' بچپن سے ہی نہیں بلکہ کتنی پشتوں سے' آباؤ اجداد سے' یہ چیز وراثتاً لے رہے ہوں' یہ ان کی پیدائش کے اندر داخل ہو چکی ہو' اس پوری قوم کو اگر ایک دم کہہ دیا جائے کہ شراب حرام ہے' شام کو کوئی شخص شراب نہیں پیئے گا تو اس پہ عمل کرنا ناممکن ہوگا۔ شرابی ہی نہیں بلکہ ان سے شراب چھڑانے والے بھی جانتے ہیں کہ اس میں کتنی دقت پیش آتی ہے' طبعی دقت بھی پیش آتی ہے' مزاج کے اعتبار سے بھی دقت ہوتی ہے' نفسیاتی طور پر اس میں دقت ہوتی ہے۔

آپ دیکھیے کہ قرآن حمید نے کیا کیا؟ تیرہ سال مکے کی زندگی میں شراب کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ پہلا حکم یہ تھا کہ ٹھیک ہے اس میں کچھ فائدے بھی ہیں لیکن اس کا نقصان اس سے کہیں زیادہ ہے (2:219)۔ قرآن مجید انہیں ایک طرف لا رہا ہے۔ آگے چل کر یہ کہہ رہا ہے کہ وَلَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی (4:43) نشہ کی حالت میں کم از کم نماز کے اجتماعات میں تو نہ آیا کرو۔ اب وہ اس طرح سے چھڑا رہا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اگر تم نے کچھ پی لی ہے تو اتنی پیو جیسے کہ ظہر سے پہلے پہلے اس کا نشہ ختم ہو جائے۔ اس طرح سے اگر دن کے اندر Intervals (وقفے) ہی وہ اتنے دے گا تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے عادت گھٹتی چلی جائے گی' کچھ ضبط ہوتا چلا جائے گا' کنٹرول ہوتا جائے گا۔ یاد رکھیے! یہ پوری قوم ہے اور ٹھیک ہے کہ جیسے یورپ میں ممنوع نہیں' وہ ساری قوم پیتی ہے لیکن ان یورپین کے پینے میں اور اُن عربوں کے پینے میں فرق ہے۔ وہ تو مٹکے پی جاتے تھے' بدمستیوں کی حالت تک چلے جاتے تھے۔ اس قوم سے شراب چھڑانا اتنا آسان نہیں تھا۔

عزیزانِ من! میں مثال دے رہا ہوں کہ قرآن کرتا کیا ہے؟ قرآن حمید کا پہلا حکم یہی ہے کہ اس کے اندر نقصان زیادہ ہے (2:219)' دوسرا حکم یہ ہے کہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں نشے کی حالت میں نہ آیا کرو (4:43)۔ اب یہ ایک پابندی عائد کی ہے۔ مکے کی تیرہ سال زندگی پوری ہوگئی ہے' مدینے کی ابتدائی زندگی کے بھی تیسرے یا چوتھے سال میں جا کر یہ کہا کہ ہاں بھئی! یہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (5:90) ہے' رکو' اس سے باز آجاؤ' اس قصہ کو ختم کر دو۔ جو ہماری تاریخ میں آیا ہے کہ شراب کے متعلق حکم آیا تو مدینے کی گلیوں میں شراب کے مٹکے ٹوٹے ہوئے تھے' شراب نالیوں میں بہہ رہی تھی' ایسا نہیں تھا کہ وہ فوری حکم آ گیا تھا۔ اسے اس طرح بتدریج حکم دیتے ہوئے کم از کم پندرہ سولہ برس لگ گئے تھے۔ یہ ہیں قرآن حمید کے احکام۔

اب یہ کہنا کہ آخری حکم نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا' غلط ہے۔ قرآنِ کریم میں تنسیخ کا سوال ہی نہیں ہے۔ یورپ کی قومیں جن کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی ہے' وہاں اگر آپ یہ احکام نافذ کریں گے یا وہ اقوام اگر اپنے ہاں اسلام کے یہ احکام نافذ کرنا چاہیں گی تو اسی طرح کیے جائیں گے جیسے مکی اور مدنی زندگی میں قرآنِ کریم نے احکام نافذ کیے تھے۔

## قرآنِ حکیم کے ہر حکم کے نفاذ کا اپنا مقام ہے۔اس میں پنہاں حکمت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے

برادرانِ عزیز! ہر حکم اپنے اپنے درجہ پر' اپنے اپنے مقام پر نافذ ہونے والے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ جب وہ مقام ذرا آگے پہنچتا ہے تو سابقہ حکم ساکت العمل ہو جاتا ہے اور اگلا حکم آ جاتا ہے۔ جب معاشرے کی حالت پھر وہی ہوتی ہے' جو پہلے حکم کے لیے زیادہ موزوں تھی تو پھر پہلا حکم اس میں نافذ ہو جاتا ہے۔قرآن حکیم کا ہر حکم' اپنے مقام پہ اٹل ہے' یہ ہمارا قصورِ فہم ہے کہ ہم دیکھتے نہیں کہ معاشرے کی کس حالت میں کونسا حکم نافذ ہونا چاہیے۔اس میں کوئی تضاد نہیں' کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں' کوئی اختلاف نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ احکام جو اس وقت آپ کے سامنے آ رہے ہیں' یہ اُس ابتدائی دور کے احکام ہیں' جن میں ابھی انفرادی طور پر یتیموں کی تولیت' ان کی نگہ پرداخت' ہو رہی ہے۔ جب آگے چلے جائیں گے' جب اجتماعی نظام آ جائے گا تو اس وقت کے لیے قرآن حمید نے اور احکام دیئے ہیں۔جس درجہ سے بھی ہم اپنے معاشرے میں' مسلمان ہونا شروع ہونگے' اس کے مطابق قرآن مجید کے احکام ہم پہ نافذ العمل ہونگے اور جب معاشرہ مسلمان ہو گا ہی نہیں تو اس میں اسلام کے احکام کیا نافذ ہونگے۔

## قرآنی احکام کو کس طرح نافذ کیا جاتا ہے؟ اس کا طریق کیا ہے؟ اور مال کس چیز کا ذریعہ ہے؟

یہ جو آپ کو دقتیں پیش آ رہی ہیں صاحب کہ قرآن حمید کے احکام تو یہ ہیں' انہیں کس طرح سے نافذ کیا جائے؟ ہر روز کہتے ہیں کہ سود حرام ہے' بتایئے اس کا تدارک کیا ہو؟ یہاں تو ایک ایک قدم پر ضرورت پڑ رہی ہے۔ ہمارا معاشی نظام اس قسم کا ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ بین الاقوامی معاملات کیسے حل ہونگے؟ یہ ساری دقتیں ہیں۔ یہ دقتیں موجودہ غیر اسلامی' غیر قرآنی نظام کی پیدا کردہ ہیں اور اس کے لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا حکم کیسے نافذ ہو گا؟

عزیزانِ من! قرآن مجید کا حکم قرآن مجید کے معاشی نظام کے اندر نافذ ہو گا' غیر قرآنی نظام کے اندر' قرآن مجید کے احکام نافذ ہو ہی نہیں سکتے' ان پہ عمل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پیوند سازی نہیں' یہ زندگی کا ایک پورا نظام بدلنا ہے اور بتدریج بدلنا ہے۔آہستہ آہستہ اسے آخری منزل تک لے جانا ہے' جو اس کی مکمل ترین شکل ہے البتہ یہ نمونہ کی شکل ہے جو رسول پیش کر دیتا ہے۔ وہ پہلے دن سے یہ کہتا ہے کہ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:164) سب سے پہلے' میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بطور ایک نمونہ پیش کرتا ہے' وہ پہلے دن ہی سے مال جمع نہیں کرتا' وہ وراثت کے لیے کچھ نہیں رکھتا' وہ جاگیر نہیں بناتا' اس کے پاس دولت نہیں ہوتی۔ آخر میں معاشرے پر جو احکام نافذ ہونے تھے' وہ انہیں پہلے دن سے اپنے اوپر نافذ کر لیتا ہے اور معاشرے کو اسی طرح بتدریج اس مقام تک لے جاتا ہے۔ یوں قرآن حمید اپنے احکام کو کُلی طور پر معاشرے کے اندر نافذ کرتا ہے۔اسے یاد رکھیے کہ جب قرآن حمید کے احکام

آئیں تو یہ نمونہ ہمیشہ سامنے رہے۔

یتیموں کے متعلق یہ احکام انفرادی طور پہ آئے ہیں۔ جب تک معاشرہ ان یتیموں کو اپنی تحویل ونگرانی میں نہیں لیتا' ان کا یہ انتظام انفرادی طور پر کیا جائے گا تب جا کر یہ معاشرتی صورت ہو جائے گی۔ آخر معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ افراد مل کر یہ طے کر لیتے ہیں کہ اس کا انتظام اکٹھے مل کر یوں کیا جائے' اس کو معاشرہ کہہ دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (4:5) یاد رکھو! کہ مال کو' خدا نے' تمہاری قومی معیشت کا ذریعہ یعنی قیام کا موجب بنایا ہے۔ اس سے قومیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک ہی آیت میں دونوں ہدایات ہیں۔ تم نے انفرادی طور پر' انفرادی یتیموں کا انتظام کرنا ہو تو کہا ہے کہ وہ بالغ ہو جائیں تو ان کو مال دو اور اس وقت بھی دیکھو کہ ان میں اتنی سمجھ بوجھ آ گئی ہے کہ اپنے مال کا انتظام خود کر سکیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ان کی پرورش کرو' تربیت کرو' ان کا مال سنبھال کر رکھو۔ اور اسی آیت میں جب ہم آگے پڑھیں گے تو یہ اَمْـوَالَـكُـمْ قومی دولت ہو جائے گی۔ اس کے لیے کہا ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (4:5) اس سے اجتماعی قیام ہو جائے گا اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قوم کی یہ دولت ان کے سپرد نہ کرو جو اس کا حسنِ انتظام نہ کر سکیں۔ اب آگے ان یتیموں کے متعلق بات آئی۔

## خدا کے آزمانے کے قرآنی معانی' ہمارا غلط تصور اور بھولے بادشاہ مرشد!!

عزیزانِ من! اب یتیموں کے متعلق کہا ہے کہ وَ ابْتَـلُـوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَـلَـغُوا النِّكَاحَ (4:6) ان یتیموں کو پہلو بدل بدل کر دیکھتے رہو' ان یتیموں کے اوپر نگاہ رکھو کہ ان کی ذہنی حالت کیا ہے؟ تربیت کی کیا صورت پیدا ہو گئی ہے؟ آیا ان میں پختگی آ گئی ہے' وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنا انتظام کر لیں' نظم ونسق سنبھال لیں۔ یہ وَ ابْتَـــلُـوا کا لفظ قرآن مجید نے عجیب استعمال کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ابتلا کا لفظ آ گیا' جس کے معنی ہی ''آزمائش'' کے آ گئے اور قرآن مجید کی وہ آیات جن میں یہ آیا ہے کہ خدا تمہاری آزمائش کرتا ہے' ان آیات کا مطلب کیا ہے؟ اب دیکھیے اس ابْتَـــلُـــوا کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا آزمائش کرتا ہے۔ خدا کیوں آزمائش کرنے لگا؟ کسی دوست سے آپ نے کہا کہ صاحب! مجھے سو روپیہ دیجیے اور اس نے وہ نہیں دیا' اس کے بعد کہا کہ ''میں تے تینوں آزموندا ساں پیاں کہ تُوں سچا دوست ہیں یا نئیں'' (میں تو تمہیں آزما رہا تھا کہ تُو سچا دوست ہے یا نہیں)۔ تو کیا انسانوں کو اللہ میاں آزماتا ہے؟ وہ علیم وخبیر وسمیع وبصیر ہے' دلوں کے اندر گزرنے والے خیالات' نگاہوں کی خیانتوں تک سے واقف ہے۔ کیا وہ دوسرے کو آزماتا ہے کہ یہ کیا کرتا ہے؟ نہیں' بالکل نہیں۔ اس کا ترجمہ ''آزمانا'' نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اس ابتلا کے معنی ''پہلو بدلنا'' ہوتے ہیں مثلاً ایک قسم کے حالات آتے ہیں تو اس میں تم دیکھو کہ تمہارا ردِعمل کس

طرح ہوتا ہے' پھر دوسری قسم کے حالات آتے ہیں تو اس میں دیکھا جائے گا کہ کیسا ردِعمل ہے۔ خوشحالی کی زندگی اور عسرت کی زندگی میں تمہارا طریقہ کار کیا ہے' تم خوددست نگر ہوتے ہو تو تمہارا کیا ہے' صاحبِ اقتدار ہوتے ہو تو تمہارا تاثر کیا ہے۔ یہ جو مختلف حالتیں آتی ہیں' ان کو ابتلا کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ کہا ہے کہ جو مختلف حالتوں میں یَتٰـمٰی ہیں' ان پر نگاہ رکھو کہ ان کے تاثرات کس قسم کے آتے ہیں۔ کبھی یہ دیکھو کہ ان کو کچھ پیسے دیئے ہیں تو وہ کیسے خرچ کرتے ہیں' کبھی یہ دیکھو کہ ان کے پاس کچھ نہیں تو ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے' کیا چوری تو نہیں کرتے؟ اس میں تمام وضاحتیں سامنے آ جائیں گی۔ کہا ہے کہ پہلی چیز تو یہ دیکھو کہ اِذَا بَـلَـغُوا النِّکَاحَ (4:6)۔ ابھی میں اس پہ آتا ہوں' یہ بڑی جامع چیز ہے اور قرآن مجید بڑے دوررس نتائج کی بات کہہ گیا ہے۔ کہا ہے کہ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) یہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو دیکھو کہ فَـاِنْ اٰنَسْـتُـمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (4:6) یا ان میں عقل کی پختگی نظر آتی ہے۔ یہاں بھی وہی بات آ گئی کہ محض عمر نہیں ہے کہ اتنی عمر ہو جائے' بلکہ یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے عمر اتنی ہو جائے اور دوسری یہ کہ فَـاِنْ اٰنَسْـتُـمْ مِّـنْهُمْ رُشْدًا (4:6) ان میں عقل کی اتنی پختگی آ گئی ہے۔ یہ رشد ہے' عقل کی پختگی ہے۔ جسے آپ مرشد کہتے ہیں' یہ رشد ہی سے تو ہے لیکن آپ کو پتہ ہے کہ یہ پیر صاحب اور یہ مرشد صاحب کون ہوتے ہیں؟ جو سب سے زیادہ گھگھو (گھگو) بنا ہوا ہوتا ہے' وہ سب سے زیادہ مکمل پیر ہوتا ہے' اس کے ماننے والے اس طرح اس کی شہرت کو چار چاند لگاتے ہیں کہ ''بڑے بھولے بادشاہ ہیگے نیں جی' تسی سنیاں اے ناجی کس طرح بچیاں والیاں گلاں کردے ہیگے سن' معصوم جو ہوئے جی یہ''❶۔

## بلوغت اور پختگی پر زیر امانت مال کی واپسی اور انسانی طبیعت کی حرص

عزیزانِ من! قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ مرشد صرف خدا ہو سکتا ہے' کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی اپنی عقل سے کام لو اور اگر تم نے کسی انتہائی پختہ عقل سے کام لینا ہے تو خدا کی ہدایت کو دیکھو کہ وہ کیا کہتی ہے۔ یہ ہے رشد و ہدایت' خدا ہی ہادی ہے' خدا ہی مرشد ہے مگر ہمارے ہاں یہ صورت نہیں ہے۔ یہاں تو ہر روز قدم قدم پہ ان کا نام ہادیٔ طریقت رکھا ہوتا ہے' آپ قدم قدم پہ انہیں مرشد کہتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ یہ کتنا بڑا شرک ہے جو ہم کر رہے ہیں! مگر یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔

یہاں کہا ہے کہ اگر تم ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو فَادْفَعُوْٓا اِلَـيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (4:6) پھر تمہاری زیرِ نگرانی جو مال امانت میں رکھا ہوا تھا وہ ان کو دیدو۔ کہا یہ ہے کہ وَ لَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (4:6) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دیکھو کہ اب وہ بلوغت کی عمر

---

❶ یہ ''بڑے بھولے بادشاہ'' ہیں جی! آپ نے یہ سنا ہے کہ جی! یہ کس طرح بچوں کی سی باتیں کرتے تھے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ معصوم جو ہوئے۔

کو پہنچنے والے ہیں اور سال چھ مہینے باقی ہیں تو لپالپ کھانا شروع کر دو کہ وہ کہیں عدالت سے ڈگری لے کر اپنے مال کا مطالبہ نہ کر دے اور یہ سارا مال چلا جائے گا تو اس زمانے میں جھٹا جھٹ کھانا شروع کر دو، ہڑپ کرنا شروع کر دو۔ تم کہیں یہ طریقہ اختیار نہ کر لینا۔ دیکھا! قرآن کریم انسانی طبیعت کی Temptation (حرص) کو کیسے روک رہا ہے!

اگر معلوم ہو کہ جب یہ سولہ برس کی عمر کا ہو گیا تو یہ مال اسے دینا پڑے گا تب بد نیتی کی رفتار کم رہے گی لیکن جب لوٹانے کا وقت قریب آ رہا ہو تو پھر تو جیسے اسٹیشن قریب آنے والا ہو تو بستر باندھنا شروع کر دیتے ہیں اور کپڑے سنبھالنے شروع کر دیتے ہیں کہ صاحب! وقت قریب آ رہا ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ جو کچھ سمیٹا جا سکتا ہے سمیٹو۔

عزیزانِ من! قرآن مجید دور تک جاتا ہے۔ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ **وَ مَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ** (4:6) یہ ان کی نگرانی کرنے والے، ان کی پرورش کرنے والے، اگر خود مستغنی ہیں، اللہ نے انہیں اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ ان کو ضرورت نہیں ہے تو پھر وہ اس میں سے کچھ بھی نہ لیں۔ **وَ مَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ** (4:6) اور اگر یہ خود محتاج ہیں اور اسے اپنا وقت دے رہے ہیں تو قانون کے مطابق، قاعدے کے مطابق، کم از کم اپنے اس وقت کا معاوضہ اس کی دولت سے لے سکتے ہیں۔ بس اس میں ان کا اتنا ہی حصہ ہو سکتا ہے۔ کیا بات ہے یتیم کے متعلق صاحب!

## مملکت کے مال میں سے خلیفہ کے حصہ کے متعلق حضرت عمر فاروقؓ کا سنہری قول

حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا کہ مملکت کے مال میں سے خلیفہ کا کتنا حق ہے؟ آپؓ نے کہا کہ جتنا یتیم کی رکھوالی کرنے والے کا حق، اس کی دولت میں ہوتا ہے۔ آپؓ نے **وَ مَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ** (4:6) کی آیت پڑھی کہ اگر اپنے پاس اتنا ہے، روٹی چل سکتی ہے، تو پھر اس میں سے کچھ نہیں لے سکتا، **وَ مَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ** (4:6) اور اگر اس کے پاس نہیں ہے تو جو وقت اس نے دیا، قاعدے کے مطابق، اتنا ہی لے سکتا ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔ عزیزانِ من! یہ لوگ جانتے تھے کہ خلافت کسے کہتے ہیں اور اسلامی مملکت کا سربراہ کیا ہوتا ہے۔ کیا بات تھی ان کی نگاہ کی! چار لفظوں میں بات بتا دی۔ یہ بھی نہیں کہا کہ کچھ نہیں لے سکتا، یہ بھی نہیں کہا کہ سب سے زیادہ لے سکتا ہے۔ کہا کہ بس اتنا ہی لے سکتا ہے جتنا یتیم کے مال میں، اس کے والی کا حق ہوتا ہے۔ اور آگے کہا کہ **فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا** (4:6) جب ان کا مال ان کے حوالے کرنے لگو، تو اس پر گواہی لے لیا کرو، چار آدمی گواہ رکھ لیا کرو (اور حساب فہمی کے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لیے ٹھیک ٹھیک حساب کرنے والا ہے)۔

## اصلاح کے لیے خدا کے حضور پیش ہونے کا تصور ہی آخری سہارا ہوتا ہے نہ کہ صرف قانون کی حد بندی

عزیزانِ من! اگلی بات یہ ہے کہ قانون کی شق تم نے پوری کردی' گواہوں کی موجودگی میں یتیموں کا مال انہیں دیدیا اوراس کے بعد یہ بھی یادرکھو کہ ابھی ایک حساب تم نے خدا کے ہاں بھی جا کر دینا ہے۔اس حساب کو بھی پیشِ نظر رکھو۔قرآن حکیم صرف قانون کی رو سے اصلاحات نہیں کرتا۔قانون کی رو سے تو حد بندیاں ہوتی ہیں' اصلاح نہیں ہوتی۔اصلاح تو دل کی تبدیلی سے ہوتی ہے' نگاہوں کی تبدیلی سے ہوتی ہےاوروہ صرف اس طرح ہوتی ہے کہ ''وہ بھی ہے جس کے سامنے مجھے یہ حساب دینا ہےاوروہ بھی ہے کہ جو صرف یہ نہیں دیکھے گا کہ میں نے رجسٹر میں Enteries (اندراجات) کس قسم کی کررکھی ہیں' وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اس کے اندر نیّت کس قسم کی تھی''۔کہا ہے کہ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا (4:6) اس پر گواہ لے لیا کرواور حساب کتاب کے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے' اس لیے ٹھیک ٹھیک حساب کرنے والا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن حمید یہ دونوں ٹکڑے کس طرح ساتھ لاتا ہے کہ قانون کی شق یوں پوری کرو' تقویٰ کی شق یوں پوری کرو۔یادرکھو کہ اس کے بعد ابھی مجھے اور حساب دینا ہے۔ایسا کرنے سے تم صحیح طور پہ امانتیں اپنے پاس رکھ سکو گے ورنہ امانت میں خیانت ہوجائے گی۔

## نکاح کی عمر بلوغت ہے اور بلوغت کی عمر؟ ایک سوال!

برادرانِ عزیز! میں نے کہا تھا کہ اس آیت میں ایک اہم چیز ہے۔قرآنِ کریم نے نکاح کے متعلق' دیگر مقامات میں' صرف یہی کہا ہے کہ وہ ایک معاہدہ ہے' پھر اس میں یہ کہا ہے کہ اس میں جبر نہیں ہوسکتا' نہ لڑکے سے مجبوراً کسی عورت کے ساتھ اس کا نکاح کیا جاسکتا ہے' نہ کسی لڑکی کا مجبوراً کسی ایسے مرد سے نکاح کیا جاسکتا ہے جس کے لیے وہ رضامند نہ ہو۔یہ معاہدہ ہے۔اس میں رضامندی شرط ہے۔یہ جسے استنباط کہتے ہیں' جسے By Implication (دلالت یا معنویت سے قبول کرنا) کہتے ہیں' اس سے تو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ معاہدہ ہمیشہ بالغ کریں گے۔رضامندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اپنے عقل و ہوش میں بھی ہوں اور قانون کی رو سے بلوغت تک پہنچ چکے ہوں۔قرآن حکیم نے عمروں کا تعین خود نہیں کیا۔وہ اصول بیان کرتا ہے۔عمر کے تعین کا' مختلف آب و ہوا میں' مختلف ملکوں میں' تھوڑا بہت فرق ہوسکتا ہے۔اس نے یہاں یہ بات کہی ہے کہ وَ ابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) یتیموں کی دیکھ بھال کرتے رہو تا آنکہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو گویا یہ نظر آگیا کہ نکاح ہر عمر میں نہیں کیا جاسکتا۔نکاح کی وہ عمر ہے جسے آپ بلوغت کہتے ہیں۔اب یہاں یہ چیز واضح نہیں ہے۔کہا کہ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔اب سوال یہ ہے کہ نکاح کی کونسی عمر ہے؟

## قرآنِ حکیم کے ہر لفظ کی وضاحت کا طریق تصریفِ آیات ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے خود اپنے سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات بتایا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ایک مقام پہ ایک بات کہتا ہے، دوسرے مقام پہ اسی ضمن میں جو بات کہتا ہے اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے، اس کی تشریح کر دیتا ہے، تفسیر کر دیتا ہے، اضافہ کر دیتا ہے، استثنا کر دیتا ہے۔ آپ قرآن حکیم کا جو حکم بھی لیں، جو ہدایت بھی لیں، یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات میں اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ ان آیات کو سامنے رکھیے، ساری بات متعین ہو کر آپ کے سامنے آ جاتی ہے۔ قرآن حکیم کی کوئی بات، کوئی حقیقت، کوئی حکم، کوئی ہدایت، ایسی نہیں ہے کہ اگر اس طریق سے قرآن حکیم کے دیگر مقامات کو سامنے رکھا جائے تو وہ واضح طور پہ، متعین طور پہ، آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ قرآن حکیم کی کوئی ایسی آیت باقی نہیں رہتی کہ جس سے بات آپ کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ کوئی مشکل پیش آئے تو قرآن حکیم کا تصریفِ آیات کا طریق اختیار کیا جائے، بات متعین طور پر سمجھ میں آ جائے گی۔

## قرآنِ حکیم نے بلوغت کو جوانی کی عمر کہتے ہوئے اسے متعین کیا ہے: تصریفِ آیات کی ایک مثال

عزیزانِ من! اب اس کی ایک مثال لیجیے۔ وہاں کہا ہے کہ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6)۔ اب دیکھیے قرآن حکیم کس طرح اس کی وضاحت کرتا ہے؟ یہاں اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) کہا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس کا دور رس نتیجہ سامنے آتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (6:152)۔ یہ وہی یتیموں کے متعلق حکم آ رہا ہے کہ ان کے مال کو چھوؤ نہیں حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (6:152) تاوقتیکہ وہ اَشُدًّا ہو جائیں۔ اَشُدَّهٗ کے معنی ہوتے ہیں ''جوانی کی عمر کو پہنچ جائے''۔ کہا ہے کہ جب تک وہ جوانی کی عمر کو نہ پہنچ جائیں، اس وقت تک ان کے مال اپنی تحویل میں رکھو۔ وہاں بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) کہا، یہاں اَشُدَّهٗ (6:153) کہا ہے تو معلوم ہو گیا کہ جسے ہم بلوغت کہتے ہیں وہ جوانی ہے۔ یہی اَشُدَّهٗ (17:34) میں آیا ہے۔ بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) تو نکاح کی عمر ہے۔ یہاں (17:34) میں کہا کہ اسے جوانی کہتے ہیں۔

سوال یہ ہوا کہ اَشُدَّهٗ کے متعلق قرآن مجید نے کیا کہا ہے یہاں ایک لفظ اور آ گیا۔ دیکھیے! قرآن مجید جو دعویٰ کرتا ہے کہ تصریفِ آیات سے معنی متعین کرو تو کس طرح اس دعوے کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ آئے ہیں بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6) اور اَشُدَّهٗ (6:153) کے۔ اب اَشُدَّهٗ کیا ہوتا ہے؟ بَلَغُوا النِّكَاحَ تو نکاح کی عمر ہے۔ اَشُدَّهٗ کے کیا معنی ہیں؟ کہا کہ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (40:67) اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی پھر زندگی کو مختلف مراحل میں سے گزارتے ہوئے، اسے اس منزل تک لے آیا جہاں پیدائش نطفہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ پھر اس نطفہ کو

رحمِ مادر میں ایک جونک کی قسم کا لوتھڑا بنایا۔ پھر وہ تمہیں انسانی بچہ کی شکل میں دنیا میں لے آیا۔ یہ پیدائش کی بات ہے کہ یہ کیا' پھر بچپن آیا' تمہارا طفولیت کا زمانہ آیا' طفل تو ہم جانتے ہی ہیں۔ ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ثُمَّ لِتَكُوۡنُوۡا شُيُوۡخًا (40:67) پھر تم اپنی جوانی کی عمر تک پہنچے ہو پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ یعنی بچپن کی عمر آئی' اس کے بعد اشدہ کی عمر آئی' پھر بڑھاپے کی عمر آئی۔ اب اَشُدَّہ متعین ہو گیا یعنی بچپن کے بعد مگر بڑھاپے سے پہلے۔ یہ ہوئی نکاح کی عمر' اسے ہی بلوغت کہتے ہیں۔ بچہ کو بالغ کہا ہی نہیں جا سکتا' بوڑھے کو جوان کہا ہی نہیں جا سکتا۔ غور فرمایا کہ قرآن حمید کس طرح بات کو متعین کر دیتا ہے۔ یہ نکاح کی عمر' جوانی کی عمر' بلوغت کی عمر قرآن حمید نے معین کر دیا۔

## عائلی قوانین کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شریعت کے تحت بچپن کی عمر میں شادی کو جائز قرار دیا جائے

آپ کو پتہ ہے کہ قانونِ شریعت میں نابالغ لڑکیوں کی شادیاں جائز ہیں۔ یہ جو عائلی قوانین (1961ء میں) نافذ کیے گئے تھے' اربابِ شریعت کی طرف سے ان کی اس قدر مخالفت ہوئی تھی۔ بہر حال مخالفت کے باوجود وہ ذرا سخت جان واقع ہوئے تھے' وہ ابھی تک باقی ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ جب ہمارے ہاتھ میں اقتدار آ جائے گا تو عائلی قوانین کو سب سے پہلے منسوخ کیا جائے گا۔ پتہ ہے اس کے اندر وہ کونسی ایسی ''خلافِ شریعت'' چیزیں رکھی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ان سے دین کے ستون منہدم ہو گئے۔ وہ جو محمد ایوب خاں (1974-1907ء) کے خلاف کچھ ہنگامہ برپا ہوا تھا' ان کے جرائم کی فہرست میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اس شخص نے عائلی قوانین نافذ کر دیئے۔ ان میں کیا چیز تھی؟ یہ کہ بچوں کی شادیاں نہیں ہو سکتیں' ان کے لیے بلوغت کی عمر ضروری ہے' بالغ ہو جائیں تو پھر شادی کی جا سکتی ہے۔ دہائی مچا دی گئی کہ یہ چیز خلافِ شریعت ہے۔ کہتے ہیں کہ اب اقتدار ہاتھ میں آئے گا تو سب سے پہلے بلوغت کی یہ شرط اڑا دی جائے گی۔

## ساردا بل اور تمام فرقوں کے متحد علما کا وفد

یہ بات بہت پہلے' تقسیم ہند سے قبل' ہندوستان کی مملکت کے زمانے میں' شروع ہوئی تھی' غالباً یہ 1929ء کا ذکر ہے۔ ایک قانون تھا' اسے ساردا ایکٹ کہتے تھے۔ اِس زمانے کے بوڑھوں کے کان میں شاید یہ لفظ ساردا موجود ہو' اس لیے کہ اس نے بھی بڑا ہنگامہ برپا کیا تھا۔ یہ ساردا❶ ایک ہندو تھا۔ اس نے مرکزی حکومت کی پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا تھا کہ بلوغت سے پہلے کی شادی قانوناً ممنوع قرار دی جائے۔ ہندوؤں کے دھرم شاستر میں یہ چیز ہے کہ لڑکی کو اگر ماں باپ کے گھر میں ایام آ جائیں تو باپ کی مکتی ہو ہی نہیں سکتی'

---

❶ یہ ساردا غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز کا ایک ہندو ممبر تھا۔

دوسری جگہ یہ ہے کہ لڑکی کو باپ کے گھر میں ''ایام'' آ جائیں تو باپ اس لڑکی کے ہاتھ سے پانی نہیں پی سکتا یعنی ان کے دھرم کی رو سے ایام سے پہلے کی حالت میں' اس کی شادی ضروری ہے۔ اس دھرم کا پیروکار ہندو' یہ بل لایا کہ بالغ ہونے سے پہلے کی شادی قانوناً ممنوع قرار دی جائے' ہندوؤں نے بھی اس کی تائید کی۔ اب ہوا یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اس ساردابل کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے۔ کہا یہ گیا کہ اگر یہ ایکٹ بنتا ہے' تو باقی قوموں کے اوپر تو اس کا اطلاق ہو جائے' مسلمانوں کو مستثنٰی قرار دیا جائے کیونکہ یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے۔

اُن دنوں میں دلی میں تھا' قرول باغ' وہاں کی ایک بستی ہے' جو اس ہنگامے کا مرکز بنا۔ یہ کس چیز کا مرکز تھا؟ جہادِ عظیم کا تھا۔ بھئی! تمہاری فوج کہاں چلی ہے؟ کس مقصد کے لیے اکٹھا ہوئے ہو؟ یہ جہادِ عظیم ساردابل کے خلاف تھا۔ سارے ہندوستان کے علمائے عُظّام وہاں جمع ہوگئے۔ میرے ایک بزرگ استاد علامہ اسلمؒ جیراج پوری (1955-1879ء) کہا کرتے تھے کہ ہماری تاریخ عجیب ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے علما کا اجتماع جب بھی کبھی ہوا' باطل پہ ہوا' کبھی حق پہ آج تک ان کا اجتماع نہیں ہوا۔ چنانچہ اس سارداایکٹ کے خلاف جو جہادِ عظیم کا محاذ قائم ہوا' تمام فرقوں کے علما اس میں جمع ہوگئے۔ وہ (علامہ اسلمؒ جیراجپوری) فرماتے تھے کہ میں نے تو تمہیں بتایا تھا کہ تم جا کر دیکھ لو تو پتہ لگ جائے گا کہ نماز کے وقت تو یہ الگ الگ کھڑے ہوتے ہیں' سارداایکٹ کی مخالفت میں یہ سب اکٹھے تھے اور پھر جناب! ایک جلوس وہاں سے چلا۔ تصور میں لائیے کہ یہ جلوس کس انداز کا ہوگا۔ وائسرائے ہند کے حضور میں گئے تھے صاحب! کیا کہنے کے لیے گئے تھے؟ کہ یہ قانون کہ شادی صرف بالغ کی ہونی چاہیے' اس سے ہمیں مستثنٰی رکھا جائے۔ عقل ماتم کر رہی تھی' علم ہنس رہا تھا' دنیا ان کا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ وائسرائے ہند کیا کہتا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا کہتا تھا' مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کیا کہتا ہے لیکن یہ ایک Deputation (وفد) تھا۔

پتہ ہے کہ یہ Deputation (وفد) کس نے Lead (لیڈ) کیا تھا؟ آپ حیران ہونگے کہ مذہب کی دنیا میں آ کر انسان کو کیا ہوتا ہے۔ آپ نے ایک نام (مولانا) محمد علی جوہر مرحوم (1931-1878ء) بی اے آکسفورڈ سنا ہوگا۔ یہ اس زمانے کے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ' ''کامریڈ'' کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے مولانا محمد علی جوہر اور بعد میں شوکت علی سنا ہوگا۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ تو یہ مولانا محمد علی اس وفد کو Lead (لیڈ) کر رہے تھے کیونکہ جو باقی علمائے کرام تھے یہ تو وہاں جا کر انگریزی میں بات ہی نہیں کر سکتے تھے' تو گویا یہ گُنگ محل کا ایک Deputation (وفد) جا رہا تھا' اور یہ اسے Lead (لیڈ) کر رہے تھے۔ کتنی قیامت ہے صاحب! وہاں گئے' وہاں جا کر یہ کچھ کیا مگر وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تو انہوں نے یہ جو سول Disobedience (نافرمانی) ہے جو (موہن داس) گاندھی (1948-1869ء) نے 1920ء میں شروع کی تھی' اس طرز پر Civil Disobedience (سول نافرمانی)

شروع کی تھی کہ یہ اچھی بات ہے' تم قانون بناؤ اور ہم اس قانون کو Defy (توڑنے کے لیے للکار) کریں گے صاحب! یہ تھا جہاد۔

اب اگلی بات سنیے۔ قانون شکنی کے لیے انہوں نے قرول باغ میں محاذ قائم کیا۔ وہاں ہم دیکھتے تھے کہ ایک میاں صاحب نے بچہ اٹھایا ہوا ہے "اللہ اللہ کہہ رہا ہے' چوسنی اوہدے منہ اچ دتی ہوئی ہیگی اے۔ چاچے دے پت بھرا نے کڑی چکّی ہوئی ہیگی اے۔ اے دوویں لئی اون ڈئے نیں تے نکاح ہون ڈیا اے۔" (ایک اس بچے کو اللہ اللہ کررہا ہے۔ اس کے منہ میں چوسنی دی ہوئی ہے۔ چچازاد بھائی نے لڑکی اٹھائی ہوئی ہے۔ یہ دونوں ہی لیے چلے آرہے ہیں اور نکاح ہورہے ہیں)۔ انہوں نے سینکڑوں نکاح کردیئے۔ یہ تھی قانون شکنی اور یہ تھا جہادِ عظیم۔ عزیزانِ من! خون کے آنسو رویئے' اس چیز کے متعلق کہ دنیا تمہارا یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ کس مقام پہ پہنچا دیا گیا ہے ہمیں! قرآن مجید ہاتھ میں ہے اور ہو یہ کچھ رہا ہے۔

## قرآن کریم کہتا ہے کہ "اَشُدَّہ" نکاح کی عمر ہے مگر ہمارے ہاں اس کی سخت مخالفت ہے اور عجیب دلائل ہیں

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4:6)۔ بلوغت اس کی نکاح کی عمر ہے' اَشُدَّہ کی عمر نکاح کی عمر ہے' اَشُدَّہٗ کا خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ "یہ بچپن کے بعد اور بڑھاپے سے پہلے کا زمانہ" ہے۔ یہ ہے نکاح کی عمر۔ قرآن مجید یہ کہتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اُس زمانے میں تو ایسا ہوا' آج پھر یہی ہوا کہ یہاں (پاکستان میں) انہوں نے ایسا کیا۔ ان کے خلاف تو یہاں تک ہی تھا کہ قہرِ درویش برجانِ درویش' بالآخر ہمارا ابھی تو ہاتھ اٹھتا ہے گریباں تک' وائسرائے ہند نے کہا کہ صاحب! تم پیدائش سے پہلے نکاح کردو' مجھے کیا ہے' جھک مارو۔ اس نے اس چیز کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ کہا کہ یہ پاگلوں کی قوم ہے' ان سے کیا الجھا جائے! یہ چیز اب یہاں (پاکستان میں) آکر ہوئی ہے کہ (عائلی قوانین میں) نکاح کی عمر قانوناً متعین کی گئی ہے اور اس کے خلاف آج پھر یہ احتجاج بپا ہے اور اب پھر وہی اس جہادِ عظیم کی تیاریاں ہورہی ہیں کہ جونہی اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے تو پھر دیکھیے: ہم کرتے کیا ہیں!

مخالفت کی یہ آوازیں کہاں سے اٹھ رہی ہیں؟ اس دن بھی میں نے کہا تھا کہ مجھے نہ شخصیتوں سے کوئی واسطہ ہے' نہ کسی فرقہ سے کوئی تعلق ہے۔ عزیزانِ من! میں تو کسی فرقہ سے متعلق ہی نہیں ہوں' شخصیتوں سے کچھ واسطہ نہیں کہ میں نے کہیں کسی سے اپنے مفادات کا بٹوارہ نہیں کرنا' میں سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔ قرآن مجید کی بات آتی ہے تو پھر میری نگاہوں میں نہ کوئی فرقہ رہتا ہے' نہ شخصیت رہتی ہے۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس مخالفت کی یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ یہ سب سے بڑے ماڈرن' آپ کے ہاں کے شریعت کے علمبردار'

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب (1979-1903ء) یہ کہہ رہے ہیں کہ نکاح کی وہ عمر ہے جس میں ابھی لڑکی کو حیض نہیں آیا' یہ بچپن کی عمر ہوگئی۔ ان کے ہاں سورۃ الاحزاب کی یہ تفسیر ہورہی ہے' نیز ماہ نامہ ترجمان القرآن بابت اکتوبر 1969ء میں ان کے ہاں یہ چیز آئی ❶۔ تفسیر قرآن کی ہورہی ہے' کہتا ہے کہ قرآن مجید ان لڑکیوں کے متعلق بیان کرتا ہے ''جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو''❷۔ یہ لفظ یاد رکھیے گا (کہ جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو)۔ قرآن مجید میں یہ کیسی تحریف ہورہی ہے کہ 'جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو' نظر آ گیا کہ یہ عمر اس سے پہلے کی ہے۔ یہ ''صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عمر میں'' سنیئے' عزیزانِ من! شرم سے نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں ''کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کردینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے''۔ کوئی حیوان بھی آج تک ایسی پستی میں نہیں پہنچا ہوگا۔ برادرانِ عزیز! آپ کوئی مثال حیوانوں کی زندگی کی نہیں دے سکتے کہ ان کے ہاں' اگر مادہ میں جنسی بلوغت نہیں ہوئی ہے' تو ان کے نر نے کبھی یہ گستاخی کی ہو۔ مگر یہاں تو نہ صرف نکاح ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ آپ سوچیے! یہ لکھتے وقت ان کو کبھی اپنی بیٹیاں یاد نہیں آئیں۔ میں کہتا ہوں کہ خود جھک مارنی ہے تو جو جی میں آئے کہو (مگر اسے ذاتِ پاک رسول اکرم ﷺ سے منسوب نہ کرو)۔ اگر اتنا ہی تمہارے ہاں Sex Perversion (جنسی بدنہادی) ہے تو اسے اپنی ذات تک محدود رکھو' اس چیز کو خدا کا حکم کہنا اور اس کے بعد' عزیزانِ من! اس کی تائید میں پھر یہ کہنا کہ رسول اکرم ﷺ نے چھ سال کی لڑکی سے نکاح کیا تھا' نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی ❸ ہوگئی تھی' انتہائی ڈھٹائی کا عالم۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

اے محمدؐ گر قیامت را براری سر زخاک !

سر بر آرد ایں قیامت درمیانِ خلق بیں !

(طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء' ص 61)

تیرے ناموس اور تیری عصمت پر حملے کس طرف سے ہورہے ہیں! یہ غیروں کی طرف سے نہیں ہورہے ''اپنوں'' کے ہیں۔

---

❶ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: ''نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے''۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن' بابت اکتوبر 1969ء)۔

❷ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن' جلد پنجم' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' ص۔ 571۔

❸ یہ اشارہ حضرت عائشہؓ سے نکاح اور رخصتی سے متعلق ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے پرویزؒ کی تحقیق بعنوان ''حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت''۔ یہ مکمل تحقیقی مضمون اس کتاب میں شامل ہے: پرویزؒ: طاہرہ کے نام خطوط (نیا ایڈیشن) طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1993' ص ص۔ 202 تا 213۔ نیز اسی کتاب کا دوسرا باب' ص۔ 43 کا فٹ نوٹ 1۔

## حضرت عائشہؓ کے نکاح کی صحیح عمر انیس سال بنتی ہے: پرویزؒ

میں نے پچھلی ❶ دفعہ بھی شاید عرض کیا تھا کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئی۔ میں نے انہی کی تاریخوں سے' انہی کی روایات سے' یہ ثابت کیا کہ حضرتِ عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت قریب سترہ (17) سے انیس (19) سال کی ہوتی ہے[1]۔ بجائے اس کے کہ ان میں سے کوئی اس چیز کا شکر یہ ادا کرتا کہ جو اعتراض ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے خلاف مستشرقین اور غیر مسلم اتنے عرصے سے لگاتے چلے آئے تھے' کسی نے تحقیق کی اور اس سے حضور ﷺ کا جو دامن ہے' اس کو دھویا حالانکہ وہ دامن تو پہلے ہی سپیدۂ سحر کی طرح صاف تھا' بے داغ تھا' اسے کسی نے کیا دھونا تھا! ہم نے اپنی طرف سے جو داغ منسوب کر رکھے تھے' ان کو دھویا۔ بجائے اس کے کہ امت شکر گزار ہوتی' اس شخص کے اوپر کفر اور الحاد کے فتوے لگا دیئے گئے کہ دیکھیے! یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ کہہ رہا ہے کہ نہیں' چھ سال کی عمر میں نکاح نہیں کیا جا سکتا۔

## کم سِنی میں نکاح جائز بھی ہے اور نادانی کا پورا پورا ثبوت بھی۔ یہ کیوں؟

عزیزانِ من! ان کے ہاں تو چھ سال کی' نو سال کی' عمر میں نکاح ہے اور صرف نکاح ہی نہیں ہے بلکہ شوہر کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ یہ ہیں وہ احکام جو آپ کے ہاں اب نافذ ہونگے لیکن ان لوگوں کا عجیب تماشہ ہے' خود ہی بھول جاتے ہیں۔ اس سے بہت پہلے انہی سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ صاحب! ایک جوان لڑکا ہے' اس کی نسبت ایک نابالغ لڑکی کے ساتھ کر دی گئی ہے اور وہ لڑکی کا باپ ابھی اس کو رخصت نہیں کرتا' نکاح کے بعد وہ کہتا ہے کہ ابھی لڑکی بالغ نہیں ہے۔ وہ لڑکا جوان ہے' اپنی خواہشات پر تو وہ ضبط نہیں رکھ سکتا' تو اس مسئلہ میں کیا کیا جائے؟ انہی کا جواب ملاحظہ فرماؤ۔ لکھتے ہیں کہ اس لڑکے کے خاندان نے ایک جوان آدمی کو' ایک کمسن لڑکی کے ساتھ منسوب کر کے اپنی نادانی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ اب ان کے ہی عقیدے کے مطابق خدا اس کی اجازت دیتا ہے' یہ نبی اکرم ﷺ کی مثال پیش کر رہے ہیں اور اب خود ہی یہ کہہ رہے ہیں کہ جس نے ایسا کیا ہے کہ کمسن کے ساتھ ابھی نسبت کی' نکاح بھی نہیں کیا' اُس نے اپنی نادانی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ یہ ہے کیفیت آپ کے ہاں کے ان اربابِ شریعت کی۔

## عدت کی مدت کا شمار کرنا

اب سوال یہ ہے صاحب! یہ سب کچھ کہاں سے لے آئے ہیں؟ کہتے ہیں کہ اس کے لیے (65:4) دیکھیے۔ مگر اس آیت میں تو عدت کا سوال آ رہا ہے۔ عدت کا شمار (2:228) میں قرآن حمید نے بتایا ہے کہ حیض سے شروع کیا جائے اور یوں گنا جائے کہ اتنے

---

❶ اس کے لیے دیکھیے جون 1970ء کی 21 تاریخ کا درس' دوسرا باب' ص 44

حیض ہوئے' بجائے اس کے کہ اس میں اتنے مہینے ہوئے۔قرآن حمید نے یہ کہا تھا کہ مدت کے تعین میں حیض شمار کرلیا جائے' یہ ٹھیک ہے۔اس کے لیے حکم آ رہا ہے۔اب یہ کہا کہ وَّالّٰٓیْٔ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ (65:4) وہ عورتیں بھی ہیں جو اتنی زیادہ عمر رسیدہ ہوگئی ہوں کہ حیض کے آنے کی طرف سے مایوس ہو چکی ہوں' اب ان کی عدت کا شمار حیض سے تو ہو نہیں سکتا' تو کہا کہ اگر اس میں تمہیں شبہ ہو کہ حیض سے حساب صحیح نہیں ہوگا' تو پھر تم عدت کی مدّت تین مہینے رکھ لیا کرو۔یہ ان عورتوں کے لیے ہے جو اس عمر کی حد میں پہنچ چکی ہوں' جہاں وہ حیض سے مایوس ہو چکی ہوں۔اب ایسی عورتیں بھی ہیں جنہیں کسی عارضہ کی وجہ سے حیض نہ آ سکا ہو ان کے لیے آگے کہا ہے کہ وَّالّٰٓیْٔ لَمْ یَحِضْنَ (65:4) یا وہ عورتیں ہیں کہ جو حیض کی عمر میں تو ہیں مگر کسی بیماری کی وجہ سے ان کو حیض نہیں آ سکا' Irregular (بے قاعدہ) ہوگیا ہے' باقاعدہ نہیں آ رہا۔ایسے بھی کیسز موجود ہوتے ہیں' ڈاکٹر صاحبان بتائیں گے کہ بلوغت کی عمر کے باوجود لڑکی کو حیض نہیں آتا ہے۔قرآن حمید نے دونوں کو Cover (ملفوف) کرنا تھا: ایک وہ ہے کہ حیض آ تا رہا ہے' اب پوری عمر گزر گئی ہے' عمر آگے بڑھ گئی ہے' اب وہ آئندہ حیض آنے سے مایوس ہوگئی ہیں' دوسری صورت یہ ہے کہ عمر تو حیض آنے کی ہے' آتا بھی ہے' مگر بے قاعدگی سے آتا ہے' نہیں آ سکا' بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکا' کہا ہے کہ ایسی صورتوں میں تم عدت مہینوں سے گن لیا کرو۔

## لَمْ یَحِضْنَ کا غلط ترجمہ' کم سنی میں شادی کرنے کی بھونڈی دلیل اور شریعت کے احکام

لیجیے صاحب! ''یہ جو ہے کہ جنہیں حیض نہیں آ رہا'' انہوں (علما) نے اپنی اس چیز کو جائز قرار دینے کے لیے کہ کم سنی میں نکاح بھی جائز اور اختلاط بھی جائز ہے' اس کا ترجمہ یہ کیا کہ جنہیں حیض آنا شروع نہیں ہوا۔ان سے پوچھو کہ یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے کہ 'انہیں حیض شروع نہیں ہوا'۔انہوں نے یہ ترجمہ کیا اور اس کے بعد کہہ دیا کہ دیکھیے! قرآن نے بتا دیا ہے کہ یہ ایسی عورت یا ایسی لڑکی کی عدت ہے جس کو ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا' تو کہا کہ اس کا نکاح ہوا تھا' پھر اس کی عدت شروع ہوئی' حیض آنا شروع نہیں ہوا تھا' تو حیض سے قبل نکاح ہو سکتا ہے۔یعنی دلیل ملاحظہ فرماؤ' کہاں سے لا رہے ہیں۔یہ لوگ صرف اس سے دلیل لاتے ہیں جس کا یہ ترجمہ غلط ہے۔یہ لَمْ یَحِضْنَ (65:4) ہے کہ کسی وجہ سے حیض نہ آ سکا ہو' آنہ رہا ہو۔

اب بلوغت کی عمر قرآن مجید نے اشدہ بتادی' اس کی تفسیر کر دی۔اشدہ کا بتا دیا کہ یہ ''طفولیت کے بعد بڑھاپے سے پہلے'' کی عمر ہے۔اس کے باوجود میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ساتھ کس قدر مذاق ہو رہا ہے! یہ قرآن حمید کی آیات ہیں جہاں سے دلیل لائی جاتی ہے اور نبی اکرم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے شادی کی دلیل لائی جاتی ہے۔یہ ہیں بلوغت سے پہلے ہی بچپن کی شادی کی دلیلیں اور

یہ ہے ان کا حکم کہ نکاح ہی نہیں بلکہ ان سے خلوت بھی جائز ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید نے یہ بات تو یہاں یتیموں کے متعلق کہی تھی کہ حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ (4:6) حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر تک پہنچ جائیں لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کتنا بڑا ایک قانون مستنبط ہوتا ہے! اس میں قرآن حکیم بَلَغُوا النِّکَاحَ کہہ کر کتنا بڑا اکلیہ بیان کر گیا ہے! اس کے برعکس وہ قوانین جنہیں شریعت کے نام سے نافذ کیا جاتا ہے اور پھر اس کے خلاف اگر کوئی تنقید کرتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! شریعت کے خلاف تنقید کا حق کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔ یوں شریعت مرتب ہوتی ہے۔ میں اب آگے چلتا ہوں۔ یہ بات یتیموں کے مال کے متعلق ہو رہی تھی، ضمناً یہ آیت آئی اور بڑی اہم آیت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ کتنا دور رس ہے۔ اس سے یہ کس کس قسم کے استنباط کرتے ہیں، پھر کیسے شریعت کا قانون بنتا ہے۔

## حقوق حاصل کرنے کا موقعہ اور عورتوں کے حقوق دینے والوں سے پوچھے جانے والے چند سوالات کی نشان دہی

ضمناً میں اپنی بہنوں کے لیے عرض کر دوں کہ آج کل عورتوں کے حقوق کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ ووٹنگ کا سیزن آ رہا ہے اور رائے دہی کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہماری قریباً آدھی آبادی عورتوں کی ہے، عورتوں کے ووٹس بھی حاصل کیے جانے ہیں۔ عورتوں سے ووٹس (Votes) لینے کی بات ان لوگوں کی طرف سے پہلے نکل چکی ہے۔ آجکل اسلام پسند جماعت کی طرف سے ایک نئی اصطلاح نکلی ہے، یعنی مسلمان دو قسم کے ہیں۔ ایک اسلام پسند ہیں اور ایک اسلام ناپسند ہیں، دونوں مسلمان ہیں۔ کیا بات ہے ان کی! سیاست کیا کچھ کرتی رہتی ہے! ارے یہ مسلم اور غیر مسلم تو ہوا، یہ اسلام پسند اور اسلام ناپسند کیا ہے؟

یہ دو ایک سال پہلے کی بات ہے۔ ایک غیر مسلم عیسائی ہمارے چیف جسٹس [1] ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی بیانات دیئے، کئی جگہ جا کر تقریریں کی تھیں اور وہ اسلام کے حق میں تھیں۔ اس قسم کے کئی اور بھی مستشرق گزرے ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی بڑی اچھی سیرتیں لکھی ہیں۔ اسلام کی تائید میں وہ بہت کچھ کہتے ہیں۔ یہ تھے تو غیر مسلم لیکن انہوں نے اسلام کے حق میں باتیں کہی ہیں۔ اب ان کے متعلق کیا کہا جائے؟ تو ان کے متعلق 'اسلام دوست غیر مسلم' کی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔ وہ دور چلا گیا۔

عزیزانِ من! یہاں جو پارٹیوں کی تقسیم ہو رہی ہے اس میں تو وہ چیز ہے جو کہا ہے کہ ''ساڈے وَل؟ تے ساڈے وَل تے بھیڑ ہوئی، تہاڈے وَل؟ جو تہاڈے وَل او مری ہوئی بھیڑ''۔ اب مسلمانوں میں یہ تفریق کیسے پیدا کی جائے؟ کفر کا فتویٰ لگایا، وہ بھی نہیں چپکا۔

---

[1] یہ ہیں پاکستان کے چوتھے چیف جسٹس ایلوِن روبرٹ کارنیلیس (Justice A.R. Cornelius) (1903-1991ء)۔ ان کا چیف جسٹس ہونے کا دورانیہ 1960ء تا 1968ء ہے۔

چناں چہ 'اسلام دوست یا اسلام پسند اور اسلام غیر پسند' ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی ہے یعنی جو ہمیں ووٹ دے' وہ مسلم اسلام پسند ہے' جو دوسرے کو ووٹ دے' وہ مسلم اسلام ناپسند۔ اب جو اسلام پسند ہیں' انہیں عورتوں کے ووٹس بھی لینے ہیں۔ میں اپنی عورتوں اور بہنوں کی توجہ خاص طور پہ مبذول کرا رہا ہوں۔ بات یہ کہہ چکے کہ جو عائلی قوانین ہیں' ان کو منسوخ کیا جائے گا۔ ان عائلی قوانین میں بہر حال کسی حد تک' ان کے قوانینِ شریعت کے مقابلے میں' کچھ حقوق ان بیچاریوں کو دیئے گئے ہیں۔ اس میں بھی قرآن حمید کے پورے حقوق نہیں ہیں بہر حال ایک قدم تو آگے ہیں لیکن یہ شریعت پسند مرد تو اتنا بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کو اتنا سا حق بھی مل جائے۔ وہ یہ کہہ چکے ہیں کہ ان عائلی قوانین کو ختم کرو۔ عورتوں کی طرف سے یہ بات آئی کہ صاحب! ہمیں اتنی سی رعایت ملی تھی' آپ اس کے بھی خلاف ہیں کہ ہم انہیں منسوخ کر دیں گے اور اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ ہمیں ووٹ دیجیے۔ اُنہوں نے کہا کہ واہ! تم نے سوچا ہی نہیں ہے' اسلام نے تمہیں وہ حقوق دیئے ہیں جو عائلی قوانین سے کہیں آگے چلے جاتے ہیں' ہم انہیں منسوخ کر کے تمہیں اسلام کے حقوق دیں گے مگر اے میری بیٹیو اور بہنو! یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ وہ حقوق کیا ہیں۔ پوچھو کہ وہ حقوق کیا ہیں تو کہیں گے کہ وہ اسلام کے حقوق ہیں۔ آپ پوچھیں کہ صاحب! اسلام کے کیسے؟ تو کہیں گے کہ بتاؤ مسلمان ہو یا نہیں؟ آپ کہیں گی کہ ہاں جی تو اس پر وہ کہیں گے کہ ''تے تینوں اے وی نئیں پتہ اسلام دے حقوق کی ہوندے ہیگے نیں' لے دس'' (پھر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلام کے حقوق کیا ہوتے ہیں۔ لو بات کرو بھئی!)۔ سن لو! یہ کبھی متعین بات نہیں کریں گے۔ سیاست کہتے ہی اسے ہیں کہ بات مبہم رکھو۔

قرآن حمید نے کہا ہے کہ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (53:23) کچھ نام ہیں جو یہ رکھ لیتے ہیں۔ کچھ ان کے باپ داداؤں نے رکھے۔ کبھی بتاتے نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں اسلامی حقوق دیں گے اور اس کے بعد تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ پھر جو حقوق خدا اور اس کا رسول دے سکتا ہے' دنیا کا کونسا قانون ہے جو اس قسم کے حقوق دے سکتا ہے! ساری دنیا کے مذاہب کے قانون ایک طرف ہو جائیں' رومن لاء ہو جائے' یونان کا قانون ہو جائے اور یہ ہو جائے وہ ہو جائے مگر جو حقوق اسلام تمہیں دیتا ہے' وہ کبھی گردِ پا کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ اُن کی بڑی شاندار تقریر ہے۔ ''اوس توں بعد اے آ کہ سٹ ووٹ'' (اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ ووٹ دو)۔

میری بیٹیو اور میری بہنو! ذرا سنو' اور دوسروں تک یہ پہنچاؤ۔ ان ووٹس مانگنے والوں سے صرف یہ پوچھو کہ صاحب! کیا آپ اس چیز کو مانتے ہیں کہ مرد کو حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے' بغیر کسی شرط کے' ایک دو تین چار بیویاں کر سکتا ہے؟ ان سے یہ متعین سوال کیجیے' آپ کے حقوق متعین ہو جائیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہاں جی! مرد کو تو یہ حق حاصل ہے۔ پوچھو کہ کیا آپ کے ان حقوق کی رو سے جو آپ ہمیں دلانا چاہتے ہیں مرد کو یہ حق حاصل ہے؟ کیا مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے وہ بیوی کو ون ٹو تھری کہے' ایک دو تین

طلاق کہے اور وہ پھر مطلقہ ہو جائے' روتی دھوتی ہوئی گھر جا بیٹھے؟ کیا یہ ٹھیک ہے' کیا آپ اسے صحیح مانتے ہیں؟ ان سے متعین طور پر پوچھو۔ آپ کو حقوق مل رہے ہیں۔ پوچھو کہ کیا بیوی کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ جس مرد کے ساتھ وہ نہ رہنا چاہے' اسی طرح سے اس کو طلاق دے کر الگ ہو جائے؟ یہ ان سے پوچھو' اس کا جواب یہ ہے کہ بیوی کو کوئی حق نہیں ہے۔ پوچھو ان سے کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ جسے اس نے غصے میں آکر ایک دو تین کہہ کر یوں گھر بھیج دیا' اس بیچاری کا سر سفید ہوا ہے' گھنٹہ بھر کے بعد جب میاں صاحب کا غصہ ذرا فرو ہوا' پارہ نیچے آیا' اپنے کیے پر ندامت ہوئی تو اس کے بعد کیا آپ اسے اس کی بیوی مانتے ہیں؟ میری بیٹیو! مجھے معاف رکھنا' شریعت کے معاملے میں یہ باتیں اس انداز میں کہنی پڑتی ہیں۔ پوچھو کہ کیا پھر اس کے بعد آپ یہ مانتے ہیں کہ یہ مطلقہ بیچاری' جس کا کوئی قصور نہیں تھا' وہ دوبارہ اس مرد کے نکاح میں اس صورت میں آسکتی ہے کہ ایک رات کے لیے کسی غیر مرد کے پاس چلی جائے اور دوسری صبح اس سے طلاق لے کر پھر اس کے پاس آئے؟ پوچھو کہ کیا آپ اس کو مانتے ہیں؟ ان سے یہ سوال پوچھیے گا۔ یہ حقوق دیئے جا رہے ہیں تو پوچھیے گا کہ کیا آپ یہ حق دیتے ہیں کہ جو ایک نابالغ لڑکی ہے' اس کا جو ولی بن جائے' وہ جہاں جی چاہے اس کی شادی کر سکتا ہے؟ کیا آپ ان حقوق کو مانتے ہیں؟

میری بہنو اور بیٹیو! ان سے یہ سوالات پوچھیے گا' زبانی بات نہ مان لیجیے گا۔ ان کو کہیے گا کہ اس چیز کی تحریر دیں کہ کیا آپ یہ سب کچھ مانتے ہیں جو سوالوں میں پوچھا گیا ہے اور اس کے بعد کہیے گا کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ عائلی قوانین میں یہ لکھا ہے کہ مرد جب جی چاہے کھڑا ہو کر ایک دو تین (طلاق) نہیں کر سکتا؟ میری بیٹیو اور بہنو! بہرحال کسی حد تک سہی' اسے مصالحتی کونسل کے اندر جانا پڑتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ عائلی قوانین میں یہ لکھا ہے کہ عورت نکاح کے وقت اپنا یہ حق نکاح کروانے میں وہاں محفوظ کرا سکتی ہے کہ کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اس کے ساتھ نباہ نہ ہو تو میں بھی اسی طرح سے نکاح کو تنسیخ کر سکتی ہوں؟ کہو کہ عائلی قوانین میں یہ ہے یا نہیں؟ کہو کہ یہ عائلی قوانین میں لکھا ہے کہ کوئی مرد جب جی چاہے ایک سے زیادہ بیوی نہیں کر سکتا' اس کے لیے اس کو کونسل میں جا کر وجہِ جواز دینی پڑے گی اور پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنی پڑے گی' کہو کہ کیا اس میں یہ لکھا ہوا ہے؟ کہو یہ اس میں لکھا ہے کہ نابالغ لڑکی کی شادی کوئی شخص نہیں کر سکتا' وہ اپنی مرضی سے بالغ ہونے کے بعد اپنی شادی کرے گی' کہو کہ کیا یہ اس میں لکھا ہوا ہے؟ اور پھر ان سے کہو کہ ان دونوں' چاروں شقوں کو آمنے سامنے رکھ کر بتایئے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت یہ قوانین زیادہ کر رہے ہیں یا آپ کے قوانین جنہیں آپ کہتے ہیں کہ اسلام کی رو سے ہمیں حقوق دیئے ہوئے ہیں؟ اور اس کے بعد ان سے کہیے کہ اگر آپ ہمیں یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ ہم عائلی قوانین کی مدافعت کریں گے اور اگر کبھی ایسا وقت آیا' کسی نے ان کے منسوخ کرنے کی بات اٹھائی تو ہم مخالفت کریں گے۔ اگر لکھ کر دیتے ہو تو تمہیں ووٹ دیتے ہیں ورنہ ہم تمہیں ووٹ نہیں دیتے۔ کچھ تو میری بیٹیو بہنو! اپنے

حقوق کی آپ حفاظت کرو ورنہ قانونِ شریعت آ رہا ہے' ڈرو اس وقت سے جو آنے والا ہے۔

## موجودہ مسلمانوں کو ایک سال کا نوٹس ملے گا

برادرانِ عزیز! آپ اس طرح ہنس رہے ہیں جیسے راوی بڑا عیش لکھ رہا ہے۔ پتہ ہے اس قانونِ شریعت کے اندر آپ کے متعلق کیا لکھا ہوا ہے؟ آپ ان پہ ہنس رہے ہیں کہ ''صاحب! کوئی گل نئیں' مارا یاناں نوں پیندی پئی ہیگی اے۔ سنو! تہاڈا تے رہنداای لکھ نئیں۔'' (صاحب! کوئی بات نہیں' مار تو انہیں پڑ رہی ہے۔ آپ بھی سن لیں' آپ کا تو کچھ بھی نہیں بچتا)۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب (1903-1979ء) نے لکھا ہوا ہے کہ یہ جو موجودہ مسلمان ہیں' انہیں ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا کہ ''یا تے بندے دے پتر بن جاؤ'' (یا تو انسان بن جاؤ ورنہ) جسے ہم اسلام کہتے ہیں' اس اسلام کو قبول کرو اور اگر یہ (قبول) نہیں ہے تو یہ کہتے ہیں کہ (ہمارے لیے یہ) ہے تو بڑا بادلِ ناخواستہ لیکن حق کی خاطر کرنا پڑتا ہے کہ پھر سال کے بعد ان تمام کو قتل کر دیا جائے گا' جو ہمارا اسلام قبول نہیں کرے گا۔ عزیزانِ من! کیا یہ سب کچھ ہنسی کا مقام ہے؟ جو کوئی اپنے طور پہ کہے' اس پہ تو آپ تنقید کر سکتے ہیں' اس کی مخالفت کر سکتے ہیں' اسے مسترد کر سکتے ہیں لیکن اگر کوئی اسے خدا اور رسول کے نام پہ کہے تو اس پہ آپ تنقید نہیں کر سکتے' اسے مسترد نہیں کر سکتے۔ سن لیجیے! آپ کے ہاں خدا اور رسول کے نام پہ یہ کچھ کیا جانے والا ہے۔

## وراثت کے قوانین میں عبوری دور کے احکام اور ساتھ ہی قانونی پہلو اور اخلاقی پہلو کا تذکرہ

عزیزانِ من! بات بلوغت کی چلی تھی' میں نے وہ چیز واضح کر دی۔ اس کے بعد قرآنِ کریم وراثت کے احکام لاتا ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ معاشرہ ابھی ابتدائی درجہ میں' ابتدائی منزلوں سے گزر رہا ہے' آہستہ آہستہ اُدھر قدم اٹھا رہا ہے کہ دولت جمع ہونے ہی نہ پائے' بٹتی چلی جائے' ٹکڑے ہوتے چلے جائیں' تھوڑے تھوڑے حصے ہوتے چلے جائیں۔ آپ دیکھیے کہ اس کا ہر قدم اُس طرف جا رہا ہے۔ یہ عبوری دور (Interim Period) ہے۔ اِس دور میں وراثت کے قوانین سے مراد یہ احکامات ہیں۔ وراثت کے ان قوانین و احکامات کے لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ **لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا** (4:7)۔

عزیزانِ من! یہ قانون چلا آ رہا تھا کہ عورت کو پراپرٹی سے حصہ ہی نہیں دیتے تھے اور یہ عہدِ جاہلیت کی بات نہیں بلکہ ابھی کل تک' یورپ کی مہذب ترین قوم میں بھی Inheritance (وراثت) میں عورت کا حصہ نہیں ہوتا تھا' عورت کی اپنی ذاتی پراپرٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ابھی کل تک تھا۔ اور اُس دور میں تو آپ پوچھیے نہیں' کسی Law (قانون) کے اندر بھی عورت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے قریب

یہ ہندو ہوتا تھا' ان کے ہاں کنیا دان ❶ ہوتا تھا یعنی لڑکی کو خیرات کے طور پہ کچھ دے سکتے تھے' وہ حصہ کے طور پہ کچھ نہیں لے سکتی تھی۔ پہلی چیز قرآن حمید نے یہ کی کہ جو مروجہ طور پر چیز چلی آ رہی تھی اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ کہا ہے کہ **لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ** (4:7) مردوں کے لیے حصہ ہے اُس مال میں سے جو اُن کے والدین یا دوسرے قریب ترین رشتہ دار چھوڑ کر مریں۔ اسی طرح عورتوں کے لیے حصہ ہے اُس مال میں سے جو اُن کے والدین یا قریب ترین رشتہ دار ❷ چھوڑ کر جائیں۔ قرآنِ کریم نے مردوں اور عورتوں کو ایک ترازو میں رکھ دیا کہ جو کچھ بھی ان کے والدین یا دوسرے قریب ترین رشتے دار چھوڑیں گے' اس میں ان کا حصہ ہے۔ یہ غلط قانون ہے کہ مرد سارا کچھ ہڑپ کر کے لے جائیں' اور اس کے اندر عورت کا کوئی حصہ نہیں۔ کیا یہ انسان نہیں ہے؟ قرآن مجید نے کہا ہے کہ والدین یا اقرباء جو کچھ بھی چھوڑیں' اس میں ان (عورتوں) کا اپنا حصہ ہے' مردوں کا اپنا حصہ۔ اور آگے کہا ہے کہ **مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ** (4:7) خواہ یہ حصہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ سوال ہی کیا ہے کہ جی! وہ زمین کا اتنا سا ٹکڑا ہے' اس میں سے ان لڑکیوں کو دیدیا جائے تو وہ یہ حصہ لے کر کہیں چلی جائیں گی۔ اس نے کہا کہ اس تھوڑے یا زیادہ حصہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے' کتنا بڑا انقلابی قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے! ابھی وہ نظام اپنی مکمل شکل میں نہیں آیا' ابھی اس کی طرف قدم اٹھ رہا ہے' اٹھتے ہوئے پہلے قدم کے اندر اتنا بڑا انقلابی نکتہ اٹھا دیا گیا کہ باطل کے سارے قوانین' جنہوں نے عورت کو اس چیز سے محروم کر رکھا تھا' ختم کر کے رکھ دیا۔

عزیزانِ من! اتنا ہی نہیں۔ اسے دوسری جگہ ❸ ساتھ ملا کر رکھیے تو اس میں یہ چیز بھی ہے کہ مرد جو کچھ کماتے ہیں' جس طرح وہ ان کی ملکیت ہوتا ہے' عورت بھی اگر اس طرح سے کماتی ہے تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گا' تم اس کو جھپٹ کر نہیں لے جا سکتے۔ وراثت میں جو کچھ ملتا ہے وہ دونوں کو ملے گا۔ کمائی میں جو چیز اپنا حصہ ہے وہ اس کا بھی ہے۔ یہ اپنی پراپرٹی کی آپ مالک ہو سکتی ہے' خود اپنی مرضی کے مطابق اس کو Dispose of (استعمال) کر سکتی ہے' (فروخت کر سکتی ہیں' کسی کے حوالے کر سکتی ہیں)۔ یہ اس کے لیے ابھی پہلا قانون آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ **مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا** (4:7) خواہ وہ حصہ تھوڑا سا مال ہو یا زیادہ ہو۔ اس میں

---

❶ کنیا دان۔ جہیز۔ بیٹی کو بیاہنے کے لیے لوگوں سے کچھ مانگنا۔

❷ "اقــرب" کے معنی ہیں وہ متوفی جس کے' اور اُس کے وارث کے درمیان' اُن کی لائن میں' کوئی اور حصے دار حائل نہ ہوں مثلاً زید۔ بکر۔ عمر میں زید' بکر کا اقرب ہے لیکن اگر بکر (اپنے باپ' زید' کی زندگی میں) فوت ہو چکا ہو' تو زید (اپنے پوتہ) عمر کا اقرب ہو جائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 177' فٹ نوٹ 1)

❸ یہ دوسری جگہ (4:32) میں کہا ہے۔

ہر ایک کا حصہ مقرر ہے۔ یہ فرض کیا گیا حصہ ہے' خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ جسے آپ فرض کہتے ہیں' یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہوتا ہے صاحب! کوئی اس کو بدل نہیں سکتا' توڑ نہیں سکتا' رعایت نہیں دی گئی' پُن اور دان نہیں دیا گیا' یہ اس کا حصہ ہے' **نَصِيبًا مَّفْرُوضًا** (4:7) یہ خدا کا مقرر کردہ تمہارا حصہ ہے۔ لہٰذا عورتیں اپنا حقِ ملکیت الگ رکھتی ہیں' یہ نہیں ہے کہ ہر چیز کا مالک مرد ہوتا ہے' عورت مالک ہی نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! یہ کتنا بڑا انقلابی قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ قرآن حمید کو سمجھنا ہو تو اس کے پس منظر میں' اس سے پہلے یہ جتنے' سیاست' تمدن' معیشت اور معاشرت کے متعلق قوانین چلے آ رہے تھے' ان کو سامنے رکھیے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآن حمید کیا کہہ گیا ہے۔ یہ بہت بڑا انقلابی قدم تھا جو اٹھایا گیا۔ اصولاً یہ بات پہلے کہہ دی اور آگے ایک چیز اخلاقاً آئی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** (4:8) اگر تقسیمِ وراثت کے وقت ایسے رشتے دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو یا دوسرے یتیم اور مساکین' تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو' اور سمجھا دو کہ ترکہ کی تقسیم' قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی' جس کی رو سے انہیں بطور حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دیا گیا ہے محض ان کی دل جوئی کی خاطر ہے۔ اب یہ حصے تقسیم کر رہے ہیں جو مقرر ہوئے ہیں۔ کہا ہے کہ اس میں تمہیں ایسے ایسے بھی نظر آ جائیں گے جن کا حصہ تو متعین نہیں' ضرورت مند ہیں' مسکین ہیں' یتیم ہیں۔ ان کا حصہ مقرر نہیں ہے۔ یہاں کہا کہ کچھ ایسا کرو کہ ان کی روٹی کا بھی انتظام ہو جائے۔ یہ جن کا حصہ متعین نہیں ہے' ان کے متعلق بھی یہ چیز ہے اور اس کے بعد یہ کہ **وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** (4:8) ان کو پہلے بات سمجھا دو کہ بھئی! یہ قانون کے مطابق ایک تقسیم ہو رہی ہے' قانون کی رو سے اس میں تمہارا حق نہیں ہے۔ قرآن حمید جہاں بھی معروف کہتا ہے' اس کے معنی ''قرآنی قانون'' ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ان کو قرآنی قانون سمجھا دو کہ قانون کی رو سے تو یہ صورت ہے' بُرا نہ منانا' یہ نہ کہنا کہ صاحب! ہمیں برابر کا حصہ کیوں نہیں دیا' حصہ کے اعتبار سے قانوناً اس میں تو تمہارا حق نہیں بنتا لیکن تمہارے لیے' تمہاری پرورش کے لیے' تمہاری حفاظت کے لیے' اس میں سے کچھ دیا جا سکتا ہے تو وہ اتنا ہی ان کو دے دو۔

عزیزانِ من! اس کے فوراً بعد کہا کہ یہ جو تم تقسیم کرنے والے ہو' تم اس بات کو سوچ لو کہ وہ مر گیا ہے' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے ہیں' ان کا کوئی نگران نہیں ہے۔ یہ اپنے حقوق کی حفاظت خود نہیں کر سکتے' اسے سوچو کہ اگر تم نے ذرا سی بھی اس میں کسی قسم کی بدنیتی کی' جس سے ان کی حق تلفی ہوگئی۔ یہاں دیکھیے! کس انداز میں سمجھایا ہے! کہا ہے کہ **وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا** (4:9) ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیے' اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاؤ' تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ اُن سے بے انصافی ہو۔

لہٰذا تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو' اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف' سیدھی اور محکم ہو۔ یہاں دوسرے لفظوں میں بات یہ کہی ہے کہ ہم تو تمہیں اتنی بات کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سوچو کہ اگر تم مر جاؤ اور تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جائیں اور ان کے ساتھ ناانصافی ہو تو تم پہ کیا گزرے گی۔ کیا بات ہے صاحب! کہا ہے کہ اپنے آپ کو ان کی پوزیشن میں رکھ لو اور پھر بتاؤ کہ اگر ان کے ساتھ بےانصافی ہو تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا۔ بس اتنی سی چیز کو سمجھنے کے لیے کہا ہے کہ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ (4:9) لہٰذا قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ کیا طریق ہے سمجھانے کا! آپ نے دیکھا کہ قرآن حمید صرف Legal Aspect (قانونی پہلو) ہی نہیں سامنے لاتا' Ethical Aspect (اخلاقی پہلو) بھی فوراً سامنے لاتا ہے۔ جہاں قانون کی حیثیت یا منفعت سامنے لاتا ہے' وہاں ساتھ ہی اخلاقیات کو بھی Appeal (اپیل) کرتا چلا جاتا ہے۔

## پابندِ شریعت ایک بڑے مولوی صاحب کی ''سنگ دلی'' کا ایک واقعہ

خالص قانون کی رو سے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ قانون اور وہ بھی قانونِ شریعت کے مطابق ایک لٹھ کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج تک وہ بات میرے ذہن میں ہے' ساری عمر نہیں بھولتی۔ یہ بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ دلی شہر کے ایک محلّہ میں' میں رہتا تھا۔ مکان ایسا کہ سیڑھیاں مشترک تھیں۔ وہاں ایک بہت بڑے مولوی صاحب رہتے تھے۔ یہ دلی کے بہت بڑے مولوی تھے اور اِدھر میں رہتا تھا۔ چونکہ وہ بڑے مولوی تھے' اس واسطے چار بیویاں تھیں۔ اُن میں سے ایک یہاں بھی تھی۔ وہ ہمارے پڑوس کے مکان میں رہتی اور بیچاری اکثر بیمار رہتی تھی۔ ایک دن یہ ہوا کہ میں جا رہا تھا' مولوی صاحب دروازے کے قریب کھڑے تھے' جبکہ بیوی بیچاری اندر تھی' کوئی بات ایسی ہو رہی تھی جس سے یہ نظر آتا تھا کہ ان کا غصہ بہت تیز ہو رہا ہے اور جب غصہ میں' شریعت اور حق باہم مل جائیں تو پھر تو پوچھو نہیں کہ وہ کہاں چلا جاتا ہے۔ یہ باآوازِ بلند اُسے کہہ رہے تھے کہ سن رکھو! نکاح نامہ کی رو سے ''میرے ذمہ تمہارا نان ونفقہ تو آتا ہے' علاج کی قیمت نہیں آتی' اس کے لیے اپنے بھائی کو بلاؤ''۔ یہ میں نے سنا۔ یہ کون بڑے مولوی صاحب تھے؟ یہ وہ تھے جن کے فتوے پورے ملک میں چلتے تھے۔ یہ اتنے بڑے علامہ تھے لیکن آپ دیکھیے کہ قانون کی رو سے یہ بالکل صحیح ہے' نکاح نامہ کی رو سے اس میں نان نفقہ ہی لکھا ہوتا ہے۔ شریعتِ حقہ کی رو سے تمہارے نان نفقہ کی ذمہ داری تو میرے اوپر عائد ہوتی ہے لیکن ''علاج معالجہ کی ذمہ داری میرے اوپر عائد نہیں ہوتی اس کے لیے اپنے بھائی کو بلاؤ'' اور پھر وہ مطمئن ہو کر چلے گئے کہ خدا اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق میں نے یہ صحیح صحیح بات اس سے کہہ دی۔ یہ ہے قانون کی چارہ جوئی۔

## قرآنِ کریم قانونی اور اخلاقی پہلو ساتھ ساتھ چلاتا ہے

اب قرآن کریم کی طرف آیئے۔ قرآن کریم قانون بیان کرتا ہے تو فوراً ساتھ ہی' Ethical Aspect (اخلاقی پہلو) لے آتا ہے۔ یہاں (4:9) میں کہا ہے کہ قانون کی رو سے یہ ترکہ تقسیم کرنے لگے ہو تو سوچ لو' تم پہ بھی کبھی یہ وقت آ سکتا ہے کہ تم مر جاؤ' چھوٹے چھوٹے بچے رہ جائیں اور اس کے بعد ہے کہ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ (4:9) اسے ذہن میں رکھ کر پھر تم قانون کی نگہداشت کرو' جو اللہ نے مقرر کیا ہوا ہے۔ وَ لۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا (4:9) اور لگے ہو یہاں معاملہ طے کرنے تو یاد رکھو کہ بات ٹھیک ٹھیک کرو' بات دوٹوک' سیدھی ہونی چاہیئے' ذومعنی بات نہیں ہونی چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے' آپ کو پتہ ہے کہ قانون کی Terminology (فنّی اصطلاح) کیا عجیب ہوتی ہے۔ ایک لفظ یوں لکھ دیا جائے۔ اس وقت کچھ نہیں معلوم ہوتا' انسان مطمئن ہوتا ہے کہ ہاں صاحب! میں نے لکھت پڑھت کر لی ہے' سب کچھ لکھوا لیا ہے' اسٹیمپ پیپر پہ سب کچھ لکھوایا ہوا ہے۔ اس اسٹیمپ پیپر کو جب کسی وقت عدالت میں لے جاتے ہیں' پیش کرتے ہیں' تو ایک ایک لفظ کے اوپر بحث ہوتی ہے اور پھر اس میں نظر آتا ہے کہ او ہو! یہ جو لفظ لکھا گیا ہے صاحب! قانونی رو سے تو اس کے یہ معنی بنتے ہیں۔ اس لیے کہا ہے کہ ذومعنی بات نہیں کرو۔ یہی نہیں کہا کہ مبہم بات نہیں کرو' یہ بھی کہا ہے کہ وَ لۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا (4:9) ایسا کرنے لگے ہو تو تم نے جو بات بھی کرنی ہے وہ ایسی دوٹوک ہو کہ جس کے دو معنی نہ نکل سکیں۔ طرحدار بات نہیں ہونی چاہیئے' پیچ دار نہیں ہونی چاہیئے' ذومعنی نہیں ہونی چاہیئے' بالکل صاف صاف بات ہو۔ اور یاد رکھو! پھر وہی بات ہوئی' کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَ سَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا (4:10) یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں' ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس مزید بھڑک اٹھتے ہیں' ان کی نیت نہیں بھرتی اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اِس سے ان کی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ اسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جن کا کوئی نہیں رہ گیا' جو اپنے حقوق کی حفاظت آپ نہیں کر رہے' تم ان کے حقوق کے محافظ بن کر کھڑے ہوئے ہو' کسی طریق سے بھی اگر تم نے ان کے مال میں سے کچھ بھی کھا لیا تو یوں سمجھ لیجیے کہ تم نے اپنے پیٹ میں آگ کے شعلے بھر لیے۔ یہاں سَعِيۡرًا عجیب لفظ آیا ہے۔ کیا بات ہے اس کی!

## سَعِيۡرًا کے قرآنی معانی

ہمارے ہاں تو بھڑکتی ہوئی آگ کہا جاتا ہے' سَعِيۡرًا ''اس قسم کی بھوک ہوتی ہے کہ کھاتا چلا جائے مگر بھوک مٹے ہی نہیں'' یعنی یہ بدنیتی سے دوسرے کا مال کھانے والی بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ ذرا سا بھی اس کا چسکا پڑ گیا تو

پھر اس کے بعد بدنیتی کی حد ہی نہیں ہوتی۔ سَعِیرًا وہ بھوک ہوتی ہے۔ ایک تو سچی بھوک ہوتی ہے، دو روٹیاں کھالے گا، تین کھالے گا، چار کھالے گا، اس کے بعد تو ایک نوالے کی گنجائش نہیں ہوتی، اس کی تو حد ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ نیک اور حلال کمائی جو آپ نیک نیتی سے کرتے ہیں اور دوسری وہ کمائی ہے جو آپ کے ہاں چار سو بیسی (جعل سازی، دھوکا بازی) سے آتی ہے، اس کی حد ہی نہیں ہوتی۔ کھائے چلا جائے، بھوک نہیں مٹتی۔ اسے سَعِیرًا کہتے ہیں۔ اور پھر یہ اس قسم کی کیفیت کو کہتے ہیں جس میں آدمی کے اوپر دیوانگی کا عالم طاری ہو جائے۔ کیا نقشہ کھینچا ہے قرآن حمید نے!

عزیزانِ من! جائز طریق پر کچھ کمانا ہو تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں آدمی نہایت سکون سے، تدبر سے، معاملہ فہمی سے، قانون کے مطابق صحیح طریقے پر چلتا ہے اور جب اس میں کچھ اس قسم کی ہیرا پھیری کرنی ہوتی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ شخص کچہریوں میں، دفتروں میں، وکیلوں کے ہاں، دستاویز مٹانے بنانے والوں کے ہاں، مجلسوں میں، رشتہ داروں میں پاگل بنا مارا مارا پھر رہا ہوتا ہے۔ اس پہ ایک دیوانگی کا عالم ہوتا ہے۔ عرب سَعِیرًا کا لفظ اس کے لیے بھی استعمال کرتے تھے جس پہ اس قسم کی دیوانگی چھا جائے۔ کہا یہ ہے کہ بدنیتی سے کچھ لے تو جاؤ گے لیکن یاد رکھو! یہ اگر تمہیں چٹ (عادت) پڑ گئی تو پھر دیوانگی کا یہ عالم ہو جائے گا۔ یہی الفاظ قرآن حمید نے ربوٰ کے متعلق بھی کہے ہیں کہ اس قسم کی آمدنی جب شروع ہوتی ہے تو اضطراب کی کیفیت یہ ہوتی ہے، جیسے سانپ نے کسی کو ڈس لیا ہو۔ یہاں سَعِیرًا کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی دسویں آیت تک آ گئے، آگے وراثت کے حصے آتے ہیں، انہیں ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# پانچواں باب: **سورۃ النسآء** (1)، (آیات 11 تا 14)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1970ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النس آء کی 11 ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:11)۔

## شخصی قوانین اور پبلک قوانین کی غیر قرآنی تفریق میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ اور قرآنِ کریم کی تعلیم

جیسا کہ میں نے اس سورۃ کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اس میں بالخصوص شروع کی آیات میں عائلی زندگی کے متعلق، گھر کی زندگی کے متعلق، یتیموں کے متعلق، میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق، احکام اور رہنمائی دی گئی ہے۔ یہ وہی ہیں جنہیں بعد میں شخصی قوانین (Personal Laws) کہہ دیا گیا ہے۔ اسلام کے قوانین کو Personal (شخصی) اور پبلک قوانین میں تقسیم کرنا، یکسر غیر قرآنی

تصور ہے اور یہ اس زمانے میں پیدا ہوا جب اسلامی حکومت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی اور اس نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پبلک یا تمدنی قوانین حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور Personal Laws (شخصی قوانین)' جنہیں بعد میں قوانینِ شریعت کہا گیا' مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیئے۔ اس سے اختیارات واقتدارات کے دو الگ الگ دائرے وجود میں آ گئے' دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مذہبی پیشوا خوش ہوئے کہ ان کے ہاتھ میں اقتدار رہے' ملوکیت مطمئن ہو گئی اور اس اقتدار کے صلہ میں منبر و محراب سے' بادشاہوں کے حق میں' خدا کے حضور دعاؤں اور خوشنودی کی آرزوؤں کے اعلان ہونے شروع ہو گئے۔ یہ اچھا سودا تھا۔ برہمن نے راجہ کا سواگت کیا' اس کے ماتھے پہ تلک لگایا' سر پہ تاج رکھا' راجہ نے اس کی رکھشہ کا سامان کیا' وقف میں جائیدادیں دیں' بس اس طرح سے اس ملی بھگت میں یہ سلسلہ آگے چلا۔ ہر جگہ یہی ہوا۔ یورپ میں آپ وہ دور دیکھیے جب چرچ اور اسٹیٹ دو الگ الگ شعبے تھے تو چرچ وہاں کیا کرتا تھا۔ یہی چیز میں نے ابھی عرض کی ہے کہ ہندوؤں کے ہاں تھی۔ وہیں سے یہ آپ کے ہاں آئی' آج تک چلی آ رہی ہے اور کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ نام تو اسلامی نظام کا ہو' اسلامی حکومت کا ہو لیکن یہاں بھی اسی کفر کی شکل کا نظام قائم رہے' دیوداس کا نام عبداللہ رکھ دیا جائے لیکن رہے وہ دیوداس کا دیوداس ہی' اور خوش ہوں' چراغاں کیا جائے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔

عزیزانِ من! خدا کے نام پہ دنیا میں جتنے فریب دیئے گئے ہیں' اتنے فریب شیطان کے حصے میں بھی نہیں آئے۔ شیطان کے نام پہ کوئی کھلا ہوا فریب نہیں کھاتا۔ فریب تو کھاتا ہی اس وقت ہے جب شیطان کو خدا کا نقاب اوڑھا کر سامنے پیش کیا جائے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جنہیں یہ الگ الگ شخصی قوانین اور Public Laws (تمدنی قوانین) کہا گیا' یہ وہ ثنویت تھی جسے مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا تھا۔ یہ الگ الگ نہیں ہیں۔ یہ قرآنی ضابطۂ قوانین کا ایک حصہ ہے' ایک گوشہ ہے اور ان سب کو جمع کیا جائے گا تو پھر اسلامی نظام یا اسلامی ضابطۂ قوانین بنے گا۔

اب اس سورۃ النسآء کی 11 ویں آیت سے درس کا آغاز ہوتا ہے۔ 11 ویں اور 12 ویں آیت میں وراثت کے متعلق قوانین ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ترکہ کہتے ہیں۔

## ہمارے مروجہ قانونِ وراثت کی بنیادی غلطی

یہ قانونِ وراثت ایک بڑی فنی (Technical) سی چیز ہے۔ عام طور پر یہ سمجھ میں بھی نہیں آتی اور عام لوگوں کو اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ وہ تو کسی کے مرنے کے بعد اگر کوئی جائیداد چھوڑے اور جھگڑے کھڑے ہوں تو پھر ان جھگڑوں کی خاطر ضرورت پڑتی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ قانونِ وراثت کیا ہے۔ اور معلومات جاننے میں قرآن حمید کا تو کوئی حصہ آتا ہی نہیں' یہ اس لیے ہے کہ قوانینِ وراثت

جو قرآن حمید نے دیئے تھے' وہ تو منسوخ ہو چکے ہیں۔ یہ جو مروجہ قانونِ وراثت ہے' یہ اس سے بالکل مختلف ہے جو قرآن حمید کے اندر ہے۔اور اب یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔

یہ سیدھی سی بات ہے کہ مال کو آپ ایک یونٹ یا ایک اکائی کہیں گے۔ جب اس کی تقسیم ہوگی تو تقسیم میں جسے حصہ کہتے ہیں' اُسے بٹہ کہتے ہیں مثلاً ایک بٹہ تین (1/3)' ایک بٹہ چار (1/4)' ایک بٹہ چھ (1/6)' ایک بٹہ دو (1/2)۔ مال کی تقسیم کے لیے یہ جتنے بھی ''بٹے'' آپ کریں گے' ان کا حاصل جمع ایک آنا چاہیے۔ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے۔ یہ تو تیسری جماعت کا طالبعلم بھی بتا دے گا کہ ایک کے جب مختلف حصے کیے جائیں' جتنے جی چاہے آپ بٹوں (کسور :Fractions) میں کر لیجیے' جب اس کا حاصلِ جمع ہوگا تو وہ ایک آنا چاہیے۔ اگر ایک نہیں آتا تو بچہ پٹتا ہے' سوال غلط ہوتا ہے' فیل کر دیا جاتا ہے لیکن آپ کے ہاں کے مروجہ قانونِ وراثت میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان بٹوں (کسور :Fractions) کا حاصل جمع کبھی ایک نہیں آتا۔

عزیزانِ من! اس قانونِ وراثت کو یہ کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ خدا نے وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو ''بٹے'' (کسور :Fractions) ہیں' ان کی حاصل جمع ایک نہیں آتی۔ کیا کہا جائے صاحب! اور کیا ان سے پوچھا جائے! آدمی سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

جس چیز کو بھی اٹھایئے' جس چیز کو سامنے لایئے' اس میں آپ کو یہ تماشا نظر آتا ہے۔ یہ ہیں آپ کے شرعی قانونِ وراثت جن کے ''بٹوں'' کی حاصل جمع ایک نہیں آتی مگر کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آپ کو ملے ہیں۔

## وراثت کی تقسیم میں خودساختہ فارمولے سے پیدا ہونے والی الجھن اور قرآن مجید کی جامعیت

اب جب وہ ''بٹوں'' (مثلاً 1/6' 1/2 وغیرھم) کی حاصل جمع ایک نہیں آتی تو پھر اس کے لیے انہوں نے ایک قاعدہ تجویز کیا ہے۔ اُسے عدل کہتے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ کسی کے حصے میں کچھ تھوڑا کرتے ہیں' کسی کے حصہ میں ذرا بڑھا دیتے ہیں تا کہ کسی طرح سے یہ جو بٹے ہیں' یہ جمع ہو کر ایک ہو جائیں اور جو پہلے ان کے اندر جھول پڑی ہے' وہ کسی طرح سے نکالیں۔ پہلے ان بٹوں کی یہ کیفیت کر دی کہ ان کا حاصلِ جمع ایک نہیں آتا۔ جب یہ کیفیت پیدا کر لی ''تے فیر منجی دی کان کڈن واسطے بیہہ جاندے نیں۔ تہانوں پتہ اے کان کی ہوندی ہیگی اے؟ اگلے بچیاں نوں تے منجی دا وی نئیں پتہ ہونا۔ کان کی ہوندی اے' اے تے بڑی گل اے۔ او کان ایہوں نکلدی ہیگی اے'' (پھر وہ چارپائی کی کان (ٹیڑھا پن) نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کان (ٹیڑھا پن) کیا ہوتی

ہے؟ اس نسل کے نوجوان کو تو منجی (چارپائی) کا ہی معلوم نہیں ہے' اسے اس کان کا کیا خاک معلوم ہوگا! یہ تو بڑی بات ہے۔اب وہ اس طرح سے کان (ٹیڑھاپن) نکالتے ہیں)۔ذرا سوچیے! کتنا مضحکہ انگیز ہے یہ قصہ کہ کہیں ذرا سا جمع کرتے ہیں' کسی میں سے تھوڑا سا نکالتے ہیں' یوں کھینچا تانی سے اس کی حاصل جمع ایک کرتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ خدا نے مثلاً یہ کہا ہے کہ اسے 1/6 ملے گا' اس میں سے آپ ذرا بھی نکال دیں گے تو وہ 1/6 تو نہیں رہے گا۔خدا کہتا ہے کہ اُسے 1/6 ملے گا ''ایہ کیندے نیں پونے چھ دے دتا' تاں کی ہوگیا'' (یہ کہتے ہیں کہ پونے چھ دے دیا تو بھی کیا فرق ہوا)۔یہ خدا کے قانون سے مذاق ہورہا ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ وہی ہے جو میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید نے کہا تھا کہ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) خدا کے قانون کو تم کہیں مذاق نہ بنالینا۔کیا اس سے بڑا بھی کوئی مذاق بن سکتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ریاضی کا ایک ادنیٰ سا قاعدہ یہ ہے کہ اگر ''ایک'' کے مختلف ''بٹوں'' (کسور :Fractions) کو جمع کرو تو حاصل جمع ''ایک'' آئے۔اب وہ اس میں اس قسم کی ڈنڈی مارتے ہیں۔جو کچھ میں عرض کررہا ہوں' یہ ساری انسانی ذہن کی آمیزشیں ہیں جس کی وجہ سے یہ مروجہ قانون بنا۔یہ اس مروجہ قانون کی رو سے ہے' (معاذاللہ) قرآن مجید کی رو سے یہ صورت نہیں ہے۔اگر قرآن مجید کی رو سے یہ صورت ہو اور' وہ چار پانچ تو اس میں کل ''بٹے'' ہیں' اور ان کی حاصل جمع ایک نہ آئے اور آپ کہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں' خدا کا کلام ہے' تو سوائے اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ صاحب! وہ خدا تو ''بے نیاز'' ہے' اَللّٰهُ الصَّمَدُ ہے ''اوحسابی قاعدے داوی مقید نئیں ہیگا'' (وہ حساب کے قاعدے کلیے کا بھی پابند نہیں ہے)۔اس کے علاوہ آپ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔آپ دنیا کو کیا کہتے ہیں؟ یہی کہ یہ خدا کی آخری وحی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی جگہ ذرا سا حسابی قاعدہ آیا ہے اور اس میں بھی یہ فرق ہے۔کیا یہ اصلیت ہے جو آپ دنیا کے سامنے لاتے ہیں؟ سچ کہا تھا کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (37:159) خدا ان کی ذہنی آمیزشوں سے بہت بلند ہے' بہت بلند ہے ان توہم پرستیوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔اور پھر وہ آمیزشیں بھی کی ہیں تو آپ دیکھیے کہ اس زمانے کے لوگوں کی ذہنی سطح کیا تھی۔ آپ ''ایک'' کے حصوں کو کسی طرح بھی کیجیے' بہر حال حاصل جمع ''ایک'' ہی آجائے۔یہ ایسا بھی دشوار تو نہیں تھا' کسی حساب جاننے والے کو بتادیتے تو وہ یہ مشکل آسان کردیتا لیکن آپ کے ہاں یہ مسئلہ چلا آرہا ہے۔وراثت پر اتنی اتنی موٹی کتابیں ہیں اور یہ فن اتنا مشکل ہے کہ ان کے ہاں بھی جو علمائے کرام ہیں' ان میں بھی خال خال ہی ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس فنِ وراثت پہ عبور ہو۔پہلی چیز تو یہ دیکھیے گا کہ اس ''ایک'' کا حاصل جمع ''ایک'' ہوتا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ Technical (فنی) سا ایک Subject (موضوع) ہے' شاید آپ احباب کے لیے دلچسپی کا موجب نہ ہو' نہ ہی اس کی کوئی عام ضرورت پڑتی ہے لیکن اس سے جو مضمرات نکلتے ہیں' ان کو تو ذہن میں رکھیے صاحب! ایک چیز تو یہ

دیکھیے کہ جب خدا کے قانون میں انسانی ذہن نے آمیزش کی تو اس کا نتیجہ آپ کے ہاں اب یہ ہے اور یہ آنکھیں موندھے اس پر چلے آ رہے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ 11 اور 12 دو آیتوں کے اندر سارا قانونِ وراثت آ گیا ہے۔ عزیزانِ من! آپ اس قانون کی جامعیت دیکھیں کہ یہ سارا قانون دو آیتوں کے اندر دیدیا گیا ہے اور جب بصیرت اس پہ غور کرتی ہے تو روح وجد میں آ جاتی ہے کہ یہ چیز خدا ہی کر سکتا تھا۔

## وراثت کی تقسیم کے لیے وصیت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا 3 مرتبہ ایک تاکیدی حکم

اب آپ 11 اور 12 آیات دیکھیے۔ جہاں قرآن حکیم نے کوئی حصہ مقرر کیا ہے' وہاں کہا ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:11) یہ وصیت پوری کرنے کے بعد ہے یا متوفی جو قرضہ چھوڑ گیا ہے اس کی ادائیگی کے بعد' جو باقی بچے' اسے اس طرح سے تقسیم کرو۔ ان دو آیتوں میں اسے تین مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ ان دو آیتوں کے اندر' آپ دیکھیں گے کہ جہاں حصہ آتا ہے' وہاں لکھا جاتا ہے کہ وصیت اور قرضے کے بعد جو باقی بچے' اسے اس طرح تقسیم کرو۔ قرضہ تو ایک بیّن چیز ہے۔ وصیت ایک ایسی اہم چیز تھی کہ وصیت پوری کرنے کے بعد اگر کچھ بچے تو اس کے متعلق یہ قانون ہے۔ اگر یہ وصیت پورے کے پورے ترکے کو محیط ہو جائے تو پھر تقسیم کا سوال ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں ہنگامی طور پہ ایسی صورت واقع ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا' حادثے سے کوئی ایسی موت ہو گئی ہے تو اس صورت میں پھر یہ ہو گا کہ یوں تقسیم کردو' ورنہ سارا اختیار اس میں اس شخص کو دیا گیا ہے جو یہ ترکہ چھوڑ رہا ہے۔

## وصیت کرنے والے یا ترکہ چھوڑنے والے کے لیے ضروری حکم اور اس کی اہمیت

برادرانِ عزیز! وصیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی میں وہ یہ طے کر جائے کہ کس کو کتنا ملنا چاہیے۔ یہ بات بڑی صاف ہے۔ (مثلاً) ایک شخص کے دو بچے ہیں۔ بڑے بیٹے کو اس نے لکھایا پڑھایا' یہاں سے ایم اے کرایا' وکالت پاس کرائی' ولایت بھیجا' بیرسٹر بن کر آیا۔ اب وہ ہائی کورٹ کا جج ہے۔ دوسری بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ یہ شخص جانتا ہے کہ بیٹے کو اس کی ضرورت نہیں' اس پہ یہ پہلے ہی اتنا کچھ خرچ کر چکا ہے۔ مگر دوسرا بیٹا یا بیٹی' جو آج پیدا ہوئے' ان پہ ابھی ساری عمر خرچ ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی ایفا ہی نہ کرے تو وہ اپنی اس مصلحت کو دیکھ کر یہ وصیت کر سکتا ہے کہ میں نے اس پہ سب کچھ خرچ کر دیا تھا۔ یہ جو تھوڑا بہت میں چھوڑ کر مر رہا ہوں' یہ اس بیٹی کو یا اِس بیٹے کو دیدیا جائے۔ یا (مثلاً) اس کی بیوی ہے جو اس کی موت کے بعد بیوہ ہو گی' وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ تھوڑا سا اثاثہ' جس پہ اس کی زندگی کا دارومدار ہے' وہ اپنی وصیت میں یہ چیز لکھے گا کہ میرے بیٹے بیٹیاں اپنے اپنے گھر میں خوشحال ہیں' ان کو ضرورت نہیں البتہ میری بیوہ کسمپرسی کی حالت میں رہ جائے گی' اس کا کوئی دوسرا سہارا نہیں

ہے' لہٰذا وہ اس کے لیے لکھ کر جائے کہ یہ جو کچھ میں چھوڑ کر مرونگا' یہ اسے دیا جائے۔ یہ کتنی اہم چیز ہے!

وہ شخص ہی بہتر طور پہ جان سکتا ہے کہ اس کے ان متعلقین میں سے کون زیادہ ضرورت مند ہے' کون ایسا ہے جس کو ضرورت نہیں یا اُسے کتنی ضرورت ہے۔ اس کے مطابق قرآن مجید نے کہا ہے کہ تم خود یہ کر کے جاؤ۔ اور دیکھو کہ یہ حکم ہے' آپ اس حکم کے الفاظ دیکھیے! کہ قرآنِ کریم نے وصیت کو کتنی اہمیت دی ہے! کہا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ (2:180) یہ تمہارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ابھی پیچھے تھا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183) روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ جس چیز کو قرآن حمید کتب کہتا ہے' فرض قرار دیتا ہے' اس کی اہمیت کتنی ہے! کہا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (2:180) تمہارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے کہ اگر تم کچھ چھوڑ کر مر رہے ہو تو قاعدے کے مطابق اپنے والدین اور اقربین کے لیے وصیت کر کے جاؤ۔ اور اس کے فوراً بعد یہ ہے کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) یہ متقیوں کے لیے بڑا ہی ضروری ہے۔ یعنی کتب سے آیت شروع ہوتی ہے' آخر میں کہا جاتا ہے کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) ایسا کرنا تمام متقین پر فریضۂ خداوندی ہے۔ کیا اس سے زیادہ کسی حکم کی اہمیت بھی ہو سکتی ہے کہ اس آیت کے اول اور آخر میں یہ دو كُتِبَ اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ اتنے اتنے بڑے انجن لگائے ہوئے ہوں' یہ كُتِبَ اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ سارے چار الفاظ ہیں باقی آیت ان کے اندر آتی ہے۔ یہ کتنا اہم تھا اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ تمدنی زندگی کے اندر یہ بڑی اہم چیز تھی کہ اس کو اس چیز کا یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی مصلحت کو تم خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہو' یہ کر کے جاؤ' ایسا کرنے کا حکم ہے۔ کہا ہے کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180)۔ ایسا مت سمجھو کہ یہ یونہی اجازت ہے' راہنمائی ہے' کوئی Suggestion (تجویز) ہے' جو قرآن حکیم نے دیدی ہے' یہ تو فرض قرار دیا ہے صاحب!

## وصیت لکھنے کے متعلق جزئیات تک کی تفصیل کے برعکس ہمارا خودساختہ قانونِ شریعت

قرآنِ کریم میں بہت کم ایسے احکام ہے جن کی آگے تفصیل بھی دی ہوئی ہے مگر وصیت کے متعلق (5:106) میں تفصیل دی ہوئی ہے کہ وصیت کیسے لکھائی جائے گی' کس طرح سے گواہ بلائے جائیں گے' عبارت کس قسم کی ہوگی۔ (5:106) میں یہ ساری تفصیل دی ہوئی ہے۔ یہ حکم ہے۔ قرآن حمید نے خود تفصیل دی ہے' اب اس سے زیادہ بڑی واضح بات' کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ اور قانونِ شریعت اب یہ ہے کہ وصیت صرف 1/3 مال میں کر سکتا ہے اور وہ بھی حصہ داروں کے لیے نہیں۔ قرآن حمید نے لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (2:180) کہا تھا۔ یہی ماں باپ اور رشتہ دار حصہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کہا تھا کہ پوری کی پوری وصیت کرنا فرض ہے مگر آپ کے ہاں کا قانون یہ ہے کہ نہیں' وہ ایک تہائی میں وصیت کر سکتا ہے اور وہ بھی اپنے ان رشتہ داروں یا وارثوں کے حق میں نہیں کر سکتا' کسی غیر

کے حق میں کرسکتا ہے۔

## اڑھائی سو سال کے بعد زبانی روایت کی بنا پر قرآنی آیت کو منسوخ کرنے کا تصور

آپ سوچیے کہ قرآن حکیم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے' کہاں سے یہ چیز آئی؟ یہ ایک روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ قریباً چودہ لاکھ حدیثیں مروج ہیں' یہ صرف ایک روایت میں ہے اور وہ بھی صرف اتنی کہ ایک صحابیؓ غالباً سعد بن وقاص بیمار تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لیے گئے۔ انہوںؓ نے کہا کہ میرے پاس یہ مال ہے' ایک ہی بیٹی ہے' میں چاہتا ہوں کہ یہ مال میں رفاہ عامہ کے لیے دے جاؤں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں' سارا نہ دے جاؤ' گھر والوں کے لیے کچھ چھوڑ جاؤ۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ میں آدھا (1/2) دے جاؤں' آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں' یہ بھی زیادہ ہے۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ اچھا! ایک تہائی (1/3) دیدوں آپ ﷺ نے کہا کہ خیر۔ صرف یہ ایک روایت ہے جس سے یہ حکم بن گیا کہ وصیت صرف ایک تہائی (1/3) کی کرسکتا ہے اور وہ بھی غیر وارثوں کے لیے۔ اب آپ کہیں گے کہ قرآن حمید کی آیت میں تو اس طرح سے نہیں ہے۔ اس کے متعلق یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس روایت نے قرآن حمید کی آیت کو منسوخ کردیا۔ چل بھئی! بات ختم ہوئی۔

عزیزانِ من! یہ خدا کی آخری کتاب ہے' میں لفظ آخری پہ زور دے رہا ہوں۔ یہ مکمل' غیر متبدل' آخری کتاب ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:116) یہ مکمل' غیر متبدل ہے' خدا نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہوا ہے لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ وہ ایک روایت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے اڑھائی سو سال بعد' کسی شخص نے زبانی سنی اور کتاب میں درج کردی۔ وہ قرآن مجید کے اس حکم کو منسوخ کر رہی ہے جس سے پہلے "کتب" ہے اور آخر میں حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) لکھا ہے۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

## قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کے بعد پیدا ہونے والی مشکلات

آپ کو معلوم نہیں کہ چرچ کے اختیارات کتنے بڑے ہوتے ہیں! ان کے مذہبی پیشوائیت کے اختیارات دنیا والوں کے لیے ہی نہیں ہوتے' وہ خدا سے بھی بالا ہیں۔ انہی (مذہبی پیشوائیت کے اختیارات) سے ان کے بقول قرآن حمید کا حکم منسوخ ہے اور وصیت کے متعلق یہ کچھ کیا ہے۔ اب آپ سمجھے کہ یہ جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں' اور جائیدادوں کی تقسیم کے اندر جو اتنے جھگڑے نکلتے ہیں' ان کی وجہ سے دیوانی عدالتوں کے اندر ہزار ہا کی تعداد میں مقدمات' انہی قصوں کی مد میں ہیں اور وہ دس دس' بیس بیس' تیس تیس سال

چلتے ہیں' عمریں ختم ہو جاتی ہیں مگر مقدمے ختم نہیں ہوتے۔ بیوہ بیچاری مظلوم بے سہارا' جس کی زندگی اسی ایک اثاثے کے اوپر تھی' وہ اس سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایک Stay Order (حکم امتناعی) لے لیا جاتا ہے۔ اور وہ بیچاری اس میں سے کچھ لے ہی نہیں سکتی۔ مقدمہ چلتا ہے' وہ بیچاری کہاں جا کر مقدمے لڑے اور جو مقدمے ہیں' وہ دیوانی کے مقدمے ہیں۔ وہ تو دیوانہ مقدمہ ہوتا ہے' پاگل پن کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمے یوں چلتے ہیں کہ یہ رُل کھپ کر مر جاتی ہے مگر بات طے نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! قرآن حمید نے یہ کہا تھا کہ وصیت کر کے جاؤ' معاملہ ختم کرو۔ اور اگر اس وصیت میں سے کچھ حصہ رہ جائے تو کہا ہے کہ پھر اس طرح تقسیم کرو جس طرح ہم مقرر کر دیتے ہیں مگر ان کے ہاں وصیت یوں منسوخ ہے اور جو حصے اس نے مقرر کیے تھے' ان حصوں کے اندر خود ایک جھول ڈال کر یہ کیفیت کر دی ہے کہ اب ان حصوں کے بٹوں (Fractions) کی حاصل جمع ایک نہیں آتی۔ اب قانونِ وراثت پہ شیرازی وغیرہ کی اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود ہیں۔ وہ دیوانی والے مقدمے تو بس چلتے رہتے ہیں صاحب! ان مقدموں میں اتنی دیر کیوں لگتی ہے؟ اس لیے کہ یہ جو وراثت ہے یہ شخصی قانون (Personal Laws) کے اندر آ گیا ہوا ہے اس لیے قانونِ شریعت کے مطابق اس نے طے ہونا ہے۔ ارے! کہیں Secular Law کے مطابق یہ طے ہونا ہوتا تو جب بھی قصہ نپٹ جاتا۔ یہ ہونا ہوتا ہے شریعت کے لاء (Law) کے مطابق اور شریعت کا لاء (Law) میں نے بتا دیا ہے۔ وہی ہے جو وراثت میں ہے' اس میں کچھ طے ہی نہیں ہو پاتا۔ آپ کے ہاں یہ کیفیت ہو گئی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے تکمیلی مرحلے میں وصیت وغیرہ کی تو نوبت ہی نہیں آتی

اصل چیز تو آگے آتی ہے جو میں ابھی عرض کرنے لگا ہوں۔ یہ وصیت' یہ وراثت' اور اسی قبیل کی یہ تمام چیزیں' کس دور کی پیدا کردہ ہیں؟ پہلے بھی یہ چیز بارہا آ چکی ہے اور آتی رہے گی۔ قرآنِ کریم اسلامی نظام کا ایک پورا پروگرام دیتا ہے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے اس پروگرام کی انتہا یہ ہے کہ اس میں کوئی جائیداد' کوئی بینک بیلنس' کوئی دولت' کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتی۔ اس نظام کا آخری تکمیلی دور یہ ہے۔ اس میں فاضلہ دولت (Surplus Money) کسی کے پاس نہیں ہوتی' ذرائع پیداوار (مثلاً) زمین وغیرہ کسی کی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔ فاضلہ دولت نہیں ہوتی' زمین ذاتی نہیں ہوتی تو وہ جائیداد کہاں کھڑی کرے گا۔ اب فضا کے اندر کچھ نئے سیٹلائٹس (Satellites) بننے لگے ہیں' وہاں کوئی جائیداد بنا لے تو بنا لے' ویسے نہ زمین پہ کسی کی ملکیت ہے' نہ فاضلہ پیسہ ہے' اب اپنے پاس جائیداد کہاں کھڑی کی جائے گی۔ یہ ہے اسلامی نظام کا منتہا لیکن وہ اپنے اس منتہا تک آہستہ آہستہ بتدریج لے جاتا ہے تاکہ معاشرے کے اندر کوئی Disruption (انتشار) پیدا نہ ہو' یہ Gradually (بتدریج) اس منتہا تک لے جاتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کے تمام احکام بتدریج اپنی منزل تک پہنچتے ہیں

قرآن حکیم کے ان چیزوں کے متعلق جتنے احکام ہیں' یہ اس تدریجی دور سے متعلق ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کا قدم اُدھر ہی اٹھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے اندر بھی وہ روپے کو جمع نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کو بانٹتا (Circulate کرتا) ہے' بکھیرتا (Circulate) ہے کیونکہ اس نے تو اسے بکھیرتے بکھیرتے' اس حد تک لے جانا ہے جہاں کسی کے پاس فاضلہ کچھ نہ رہے۔ اور رسولؐ کی زندگی اس نظام کے منتہا کے لیے ایک نمونہ ہوتی ہے کہ یہ ہے وہ منتہا جہاں تم نے پہنچنا ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کی زندگی انسانیت کے لیے بطور اسوۂ حسنہ قرار پائی ہے جسے انسان بطیبِ خاطر اپنے اوپر لاگو کرتا ہے' یہ بالاکراہ نہیں ہے۔

یہ حضرات خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق متفق علیہ طور پر بتاتے ہیں کہ ساری عمر رسول اللہ ﷺ کے پاس گھر میں ایک پیسہ بھی زائد نہیں ہوتا تھا' آپ ﷺ نے کوئی جائیداد نہیں بنائی اور کچھ ترکے میں نہیں چھوڑا۔ جب جائیداد ہی نہیں بنائی' پیسہ ہی کوئی نہیں ہے' تو ترکے میں کیا چھوڑا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو انبیاء کی زندگی ہوئی گویا مومن کی زندگی اس کے خلاف ہونی چاہیے جو ایک نبی کی زندگی ہے (معاذ اللہ)۔ اتباعِ رسالت ﷺ یا جو نبی اکرم ﷺ کا اتباع ہے وہ قرآن حمید کی رو سے فرض ہے۔ اُسے قرآن حمید نے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے یعنی بہترین نمونہ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں جی! یہ تو ان کی زندگی تھی' مومنین کی یہ زندگی نہیں ہوتی۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہے سوچنے کا مقام۔

میرِ کارواں ﷺ خود دکھا دیتا ہے کہ یہ روشنی کا مینار ہے' یہاں تم نے پہنچنا ہے اور اپنے اس کارواں کو پھر وہ ان وادیوں سے بتدریج' زمانے کے تقاضے اور مصالح کے مطابق' ان کی تربیت کرتا ہوا' ذہنی اصلاح کرتا ہوا' آگے لے آتا ہے۔ یہ اتنا بڑا انقلاب لے آنا کہ کوئی شخص ذاتی ملکیت میں کچھ رکھے ہی نہیں' کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ اس مقام پہ لے آنا ہے جہاں کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ** (9:111) مومن وہ ہے جو اپنا جان اور مال اس نظام کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے [1]۔ یہ چیز اگر مجبوراً لائی جائے' سختی سے لائی جائے تو چل ہی نہیں سکتی۔ رسول ﷺ پہلے دن سے اس نظام کو نافذ کر سکتے تھے' کیونکہ جو رسول اللہ ﷺ

---

[1] جماعت مومنین کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے کہا گیا ہے کہ خدا مومنین سے ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ محض ذہنی اور اعتقادی نہیں کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیا اور خدا نے آپ کو جنت دیدی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں' نظامِ خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے متشکل فرمایا تھا۔ اور جسے حضورؐ کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور مستحکم رہنا تھا۔ اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہونا تھا (اُخروی جنت کی کیفیت اور ہے)۔ مزید تفصیل کے لیے (48:10)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن۔ ص۔ 449 فٹ نوٹ 1)۔

کی اطاعت ہے' وہ تو فرض ہو جاتی ہے' اس کی معصیت تو جہنم میں پہنچا دیتی ہے' اس لیے وہ پہلے ہی دن یہ کر سکتے تھے لیکن اس طرح سے بالاکراہ' اس قسم کی جو اصلاح یا Change (تغیر) یا انقلاب ہے' یہ زیادہ عرصے تک آگے نہیں چل سکتا اور جب تک چلتا بھی ہے اس میں ہمیشہ ایک Duality (ثنویت) ہوتی ہے۔ اور اس ثنویت میں دل کے تقاضے اور ہوتے ہیں' باہر کی مجبوریاں کچھ اور کرواتی ہیں۔ تو یہ ایمان نہیں ہوتا' یہ اسلام نہیں ہوتا۔

## تعلیم و تربیت کے لیے نبی اکرم ﷺ کا طریق اور مآل

عزیزانِ من! اسلام اور ایمان تو یہ ہے کہ یہ دونوں انسان کے دل کے تقاضے اور دل کی آرزوئیں بن جائیں۔ اس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے' تعلیم کی ضرورت ہے۔ رسول کا یہ فریضہ کہا گیا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ (2:129) قرآن حکیم کی تعلیم دیتا ہے' پھر Reason کی تعلیم دیتا ہے' عقل و فکر کی رو سے ان چیزوں کو سمجھاتا ہے اور پھر ان کی ذات کی نشوونما اس طرح سے کرتا ہے کہ ان احکام کی اطاعت ان کے دل کی آواز ہو جائے' ایسی کیفیت ہو جائے کہ اگر کہیں کسی کے پاس زائد آ گیا ہے تو وہ لیے لیے پھر رہا ہو' صاحبِ ضرورت کو ڈھونڈ رہا ہو کہ میں اس کو کیسے دوں' میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ رسول کیونکہ اس طرح سے اپنی جماعت کو تیار کرتا ہے' اس لیے وہ اس منتہا تک بتدریج لے کر جاتا ہے۔ یہ وہ منتہا ہوتا ہے جہاں "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ" ہو جاتا ہے' یہ اس مقام پہ آ کر "راضی" ہو جاتے ہیں۔ یہ نظام ان کی رضامندی سے طے ہوتا ہے' یہ بالاکراہ نہیں ہوتا۔

## قرآنِ حکیم کے نظام کی انتہائی منزل کے خدوخال اور عبوری دَور کے احکام کا غلط انطباق

برادرانِ عزیز! یہ وجہ ہے جو رسول اللہ کو Gradually (بتدریج) وہاں تک لے جانا پڑتا ہے لیکن منتہا' رسول دکھا دیتا ہے اور پھر قرآن حکیم کے اندر اس منتہا کے احکام موجود ہیں۔ قرآن حکیم نے یہ چیز اعتراض کے قابل قرار دی ہے کہ تم لوگ وراثت کو تنہا ہڑپ کر جانا چاہتے ہو۔ قرآن حکیم میں' جو کچھ وراثت میں آئے' وہ اگر اس طرح سے اُس منتہا تک پہنچنے کے لیے ہے تو حلال وطیّب ہے' قرآن حکیم کا دیا ہوا ہے۔ اس وقت وہ چیز قابلِ اعتراض نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ قابلِ اعتراض کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ اس مقام پر جا کر بھی اگر کسی کے دل میں یہ سوچ آئے کہ جو کچھ وراثت میں ملتا ہے' وہ تو میرا ہی ہے' دوسرے کا نہیں تو قرآن حمید نے کہا ہے کہ یہ تم غلط کہتے ہو۔ اس انتہائی مقام پہ پہنچنے کے بعد کوئی وراثت والی چیز بھی تنہا کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ میں آگے جب اس نظام کے منتہا پہ آؤں گا تو آپ دیکھیے گا کہ قرآن مجید کیا نظام دیتا ہے؟ وہ یہ نظام دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمارے سامنے آتا ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں۔

حضورﷺ کی زندگی کے متعلق آپ جب بھی ان کا وعظ سنیں گے تو وہ یہی بتائیں گے کہ ایک پیسہ گھر میں نہیں تھا‘ کوئی جائیداد نہیں تھی‘ کوئی ورثہ نہیں تھا‘ کوئی ترکہ نہیں تھا۔ اور اِدھر جب آپ کے ہاں آئیں گے تو دیکھیے کہ پھر کیا کچھ کہیں گے؟ یہ کہ ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حد قائم کرنا خلافِ اسلام ہے‘ وہاں کوئی وراثت نہیں ہوتی اور یہاں وراثت پر حد بھی قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ وراثت پر اس حد کے قائم نہ ہونے کے حق میں کیا چیز دی جاتی ہے؟ ان کے مطابق اس کے حق میں صدقہ اور خیرات کے قوانین دیئے جاتے ہیں اور پھر ان کے تصور کے مطابق جو زکوٰۃ ہے‘ اس کے لیے وراثت کی یہ چیزیں سامنے لا کر کہا جاتا ہے کہ دیکھیے! ذاتی ملکیت نہ ہو تو یہ زکوٰۃ کے احکام کس کے لیے ہیں‘ صاحب! ان احکام پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ذاتی ملکیت ہو اور جس غریب کے پاس یہ نہ ہو جی‘ تو وہ ان پہ کیسے عمل کرے گا‘ اور کہاں سے زکوٰۃ دے گا؟ ابھی کل ہی ان حضرات کا یہ فتویٰ میری نگاہ سے گزرا ہے۔

عزیزانِ من! کیا عرض کروں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہا یہ گیا ہے کہ صاحب! ذاتی ملکیت کی نفی کرنے سے تو آدھے قرآن مجید کی نفی ہو جاتی ہے۔ ان سے پوچھو کہ نبی اکرمﷺ کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے؟ کسی کو کچھ شرم حیا ہو تو کچھ بات بھی کرے۔ یہ آپ کا حکم تو پھر ہر ایک کے اوپر Apply (لاگو) ہوگا۔ آپ کیا کہیں گے؟ غریب کو تو آپ نے کہہ دیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے‘ وہﷺ‘ جو ایک مملکت کا سربراہ ہے‘ وہ تو مجبور نہیں کہ اپنے لیے کوئی ذاتی جائیداد نہ بنائے‘ اگر جائیداد کے نہ بنانے سے آدھے قرآن کی نفی ہوتی ہے تو فرمایئے کہ رسول اللہﷺ کی سند کو آپ کیا کہیں گے۔ یہ دوسری بات ہے جو میں نے عرض کی ہے یہ اس دور کے تدریجی احکام ہیں جب قرآنِ حکیم کا آخری تکمیلی معاشی نظام متشکل نہیں ہوا۔ اب ایک بات سامنے آ گئی۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وصیت مقدم ہے۔ دوسری بات میں نے عرض کی کہ یہ قوانین تدریجی دور کے ہیں‘ انہیں آخری تکمیلی دور تک لے جانے کے لیے ہیں۔ اگلی تیسری بات میں آپ نے یتیموں کی حفاظت کے لیے‘ ان کی پرورش کے لیے‘ نگہ پرداخت کے لیے‘ دیکھا تھا کہ ان کے متعلق اتنا زور دیا گیا ہے۔ اس قانون کی رو سے آپ کو پتہ ہے کہ پھر کیا ہوتا ہے؟ اور کیا کیا جاتا ہے؟

## قرآنِ حکیم کے مطابق یتیموں کے لیے وراثت کا حصہ اور ہمارے ہاں کے شریعت کے احکام

اس تیسری بات کے لیے آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک شخص ہے‘ اس کا نام آپ زید رکھ لیجیے۔ اگر یہ ذہن میں رکھیں تو نقشہ سامنے آجائے گا❶۔ اب آگے زید کے دو بیٹے عمر اور بکر رکھ لیجیے‘ جو اس کی اولاد ہیں۔ بڑے بیٹے عمر کا آگے اپنا بیٹا انور ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ یہ

---

❶ یہ نقشہ کچھ اس طرح سے لیجیے:

انور' زید کے پوتے ہوگئے۔ زید یعنی ان پوتوں کا دادا' صاحبِ جائیداد ہے۔ دادا کی زندگی میں دو بیٹوں میں سے ایک بیٹا عمر مر گیا تو اس کے بیٹے یتیم رہ گئے۔ یہ اس دادا زید کے یتیم پوتے ہو گئے۔ دوسرا بیٹا بکر زندہ ہے اور دادا فوت ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ قرآن حمید نے جو یتیموں کے متعلق اتنا حکم دیا ہے اور عقل کا بھی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے بچوں کا تو باپ (بکر) موجود ہے' ان کا نگران' ان کا پرورش کرنے والا' سنبھالنے والا' موجود ہے۔ عمر کے بچے یتیم ہیں اس لیے تقاضا یہ ہے کہ اس دادا کی جائیداد ان یتیم بچوں کو مل جائے۔ یہ چیز معقول نظر آتی ہے۔

برادرانِ عزیز! کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس بارے میں ان کی شریعت کا قانون کیا ہے؟ قانون یہ ہے کہ یہ جو یتیم بچے ہیں' وہ اپنے دادا کی جائیداد سے بالکل محروم ہونگے۔ یہ ایک پائی تک نہیں لے سکتے۔ وہ لے گا جن کا باپ موجود ہے۔ عائلی قوانین جن کے پیچھے یہ لٹھ لے کر پھر رہے ہیں' ان میں جہاں یہ چیزیں بقول ان کے بڑی خلافِ اسلام تھیں' کفر اور فسق کی تھیں' ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ یتیم پوتوں کو اپنے دادا کی جائیداد سے وہ حصہ مل جائے جو ان کے باپ کو ملنا تھا کیونکہ ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں ہے کہ دادا کی زندگی میں ان کا باپ فوت ہو گیا۔ میں نے یہ لکھا تھا۔

میں اس کے لیے' عزیزانِ من! کوئی بیس سال تک کوشش کرتا رہا۔ یہ اس لیے نہیں کہ مصلحت کا تقاضا تھا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ قرآن حمید کا فرمان ہے کہ یہ محروم نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایک مثال دے کر یہ کہا کہ باپ اور اس کے جو دو بیٹے تھے' وہ ساتھ جا رہے تھے کہ جنگل میں ڈاکو آ گئے۔ ایک بیٹے نے اپنی جان پہ کھیلا اور باپ اور بھائی کو بچا لیا' خود جان دیدی۔ اس کا باپ اور جو دوسرا بھائی تھے' یہ بچ گئے۔ اب اس کے بعد آپ اس کو صلہ یہ دے رہے ہیں کہ اس کے بیٹے' اپنے دادا کی جائیداد سے محروم ہو گئے اور جو بھائی بھاگ گیا تھا' وہ سارا کچھ لے گیا۔

خیر! میں کہہ یہ رہا تھا کہ شریعت کے قانون میں یہ چیز بھی ہے کہ 'مرے کو مارے شاہ مدار'۔ ان بچوں کا باپ فوت ہو گیا' یہ یتیم رہ گئے' کسمپرسی کے عالم میں رہ گئے' دادا کی جائیداد میں سے مل سکتا ہے' تو نہیں دیا جائے گا جن کا باپ موجود ہے' ان کا کوئی حق نہیں جن کا باپ دادا کی موجودگی میں ہی مر گیا۔ اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ جب ہمارا نظامِ شریعت یہاں قائم ہوگا تو سب سے پہلے اس قانون کو رائج کیا جائے گا۔

عزیزانِ من! آپ کے سامنے بھی مثالیں ہونگی۔ گھر کے اندر کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ نہایت خوشحال گھرانہ ہے' دادا موجود ہے' نظم و نسق اس کے ہاتھ میں ہے' جائیداد ہے' مشترکہ خاندان ہے' دونوں شاخوں کے بچے اس کے پوتے وغیرہ' اچھی اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں' دونوں کا ایک قسم کا اسٹینڈرڈ ہے' ایک قسم کا رہنا سہنا ہے۔ اچانک ان میں سے' ایک کا باپ مر جاتا ہے' یہ بیچارے دوسرے

ہی دن محروم' لاوارث ہوجاتے ہیں' ایک پائی تک باقی نہیں رہتی' کوئی آمدنی کا سہارا نہیں' جائیداد میں کچھ حصہ نہیں۔ تیسری چیز میں نے یہ عرض کی تھی کہ قرآن حمید کے قانونِ وراثت کو چھوڑنے سے کیا کیا چیزیں آپ کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔

## اسلاف کی صف میں کھڑے ہونے والوں کی اپنی حالت زار اور قرآنِ کریم کی تنبیہ

صاف نظر آتا ہے کہ ملوکیت کے زمانے میں کچھ خاص خاص Cases (مقدمے) سامنے آئے' جہاں کسی بڑے آدمی کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ یوں ہوجائے۔ اس تقاضے کے مطابق فتویٰ دیا گیا۔ فتویٰ آپ کا قانون بن گیا۔ فتویٰ اسلاف میں سے کسی نے دیا تھا۔ اسلاف جو کچھ کہہ گئے ہیں اس کو تو کوئی Touch (مَس) تک نہیں کرسکتا۔ یہ اسلاف کیا ہوتے ہیں؟ یہ جو آپ کے موجودہ مولوی صاحب ہیں' جب یہ مرجائیں گے تو اسلاف ہوجائیں گے' یہ سارے رحمتہ اللہ علیہ ہوجائیں گے۔ آج یہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں' کفر کے فتوے لگاتے ہیں' کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے' جب تک زندہ ہیں' یہی کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جونہی یہ مرے' تنقید کی حد سے بالا ہوئے' اسلاف کی صف میں شامل ہوگئے۔ اب ان کی کسی بات پر آپ تنقید نہیں کرسکتے۔ کیا اس کے لیے کوئی دلیل ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی سند ہے؟ دلیل وسند اس کے خلاف ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ میاں! جو مَاۤ اَنزَلَ اللّٰہُ ہے' جو خدا نے نازل کیا ہے' اس کا اتباع کرو' یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (43:22) ہم نے اپنے باپ دادا کو اس ایک روش پہ چلتے ہوئے پایا ہے' ہم تو اسی روش پہ چلتے چلے جائیں گے۔ اور قرآن حمید کہتا ہے کہ ''ان کو شیطان خواہ جہنم میں کیوں نہ لے جائے' یہ چلیں گے اسی روش کے اوپر''۔ یہ ہے قرآن حمید کی موجودگی میں اسلاف کی روش۔

## وراثت میں بیٹے کا حصہ بیٹی سے دوگنا کیوں؟ کیا عورت پست درجے پہ ہے؟

آپ قانونِ وراثت کے یہ مبادیات سمجھ لیجیے کیونکہ اب آگے قانونِ وراثت کی بات آتی ہے۔ پہلی چیز جس پر عام طور پہ اعتراض کیا جاتا ہے یہ ہے کہ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (4:11) جو مذکر ہے' یا یوں کہا جاتا ہے کہ بیٹے کا حصہ' بیٹی سے دوگنا ہے یعنی لڑکی =1/3 اور لڑکا 2/3۔ اس پہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! دیکھیے آپ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے مساوات قائم کی ہے مگر یہاں تو بیٹی کا حصہ آدھا دیا گیا ہے حالانکہ بیٹی تو زیادہ مدد کی محتاج ہوتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر فی الواقعہ بیٹی کی ایسی پوزیشن ہے کہ وہ زیادہ مدد کی محتاج ہے تو وصیت کا قانون پہلے موجود ہے' سارے کا سارا بیٹی کو دے جایئے۔ پہلے تو انہوں (صاحبانِ شریعت) نے قانونِ وصیت منسوخ کیا۔ اب وہ یہاں آئے' جو آدھا ہے۔

قرآن حمید نے یہ بتایا ہے کہ گھر کی زندگی کا نقشہ یہ ہوگا کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ ❶ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) تقسیمِ کار کی رو سے مردوں کے ذمے یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں' ان کی ضروریات کو پورا کریں۔ میں اس آیت پہ آؤنگا۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے گھروں کا جو نقشہ دیا ہے' اس میں انتظام یہ رکھا ہے کہ عورت چونکہ فطرت کی طرف سے متعین کردہ جو زندگی کے وظائف ہیں یعنی بچہ کا حمل' تربیت' پرورش' ان میں اس کا بڑا وقت صرف ہوجاتا ہے اور وہ بڑا اہم فریضہ ہے۔ مرد کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ عورت آنے والی انسانیت کی تربیت کی ضامن ہوتی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی بغیر کسی قسم کی پریشانیوں کے پوری ہوتی رہیں۔ قرآن حمید نے عورت کی کفالت کا یہ انتظام کیا تھا۔ مرد چونکہ Handicap (معذور) نہیں ہے' وہ سارا وقت کام کرسکتا ہے' وہ کام کرے۔ اس لیے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری بالعموم مرد کے اوپر ہوتی ہے۔ میں جب (4:34) پہ آؤں گا تو وہاں یہ عرض کروں گا کہ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت کو اس نے منع کردیا ہے کہ وہ کمائی میں حصہ ہی نہ لے۔

عزیزانِ من! بالعموم یہ نظام اس نے قائم کیا ہے۔ اس کے تحت جب تک لڑکی گھر میں ہے' باپ کے ذمہ ہے' اس کی شادی ہوجاتی ہے تو اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں' وہ بیوہ ہوجاتی ہے بہر حال اس کی اولاد اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ چونکہ خرچ اٹھانے کی اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی اس لیے جہاں اس قسم کے مرد اور عورت یا بیٹے اور بیٹی میں آ کر حصہ کی بات ہوگی تو ایک وہ مرد ہے جس کے ذمہ اس کی پرورش بھی ہے' تو اس اعتبار سے قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ اُس کو اِس سے دوگنا حصہ دیا جائے لیکن اگر حالات ایسے ہوں جس میں یہ پرورش کی' سہارے کی' زیادہ محتاج ہے تو وصیت کی رو سے آپ اُسے سارے کا سارا دے سکتے ہیں۔

اور یہ بھی جو قرآن حمید نے کہا ہے کہ عورت کے لیے آدھا حصہ ہے' یہ اصول نہیں کہ عورت کے لیے آدھا حصہ ہی ہے۔ صرف یہ حالات ہیں جہاں اس نے کہا ہے کہ آدھا حصہ ہے ورنہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے' اسی آیت کو ذرا آگے چلایئے۔ کہا ہے کہ وَ لِاَبَوَیۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ (4:11) ماں اور باپ دونوں میں سے ہر ایک کا یکساں حصہ 1/6 ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مساوات قائم ہورہی ہے یعنی جہاں وہ ضرورت حائل نہیں وہاں مساوات موجود ہے۔ آپ اور آگے چلیں گے تو یہاں بھی دیکھیں كَلٰلَةً (4:12) کے متعلق یہ ہے کہ وَ لِاَبَوَیۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ (4:11) بہن بھائیوں میں سے بھی ہر ایک کا برابر کا چھٹا حصہ (1/6) ہے۔ تو گویا مساوات کی جو بات ہے' وہ تو قرآن حمید یوں دیئے آرہا ہے۔ یہ تو ایک ایسی انتظامی صورت ہے جس میں وہ

---

❶ تاج العروس میں لکھا ہے کہ قام الرجل المرأة و قام علیها۔ مرد نے عورت کی کفالت کی' اس کی ہر ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار رہا' اس کے لیے رسد لایا۔ قوام۔ سامانِ رزق مہیا کرنے والا کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے۔

(پرویزؒ: لغات القرآن' جلد سوم' ادارۂ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔ 1399 تا 1405)

یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری چونکہ مرد پہ آتی ہے' عورت پہ نہیں آتی' اس لیے اس کو اس سے آدھا بھی دیدیا جائے' اس نے آدھا بھی کیا کرنا ہے' یہ تو وہ بھی اس کو دیدے گی کہ تم گھر کا کاروبار چلاؤ۔ یہ اس مقصد کے لیے ہے ورنہ یہ دلیل نہیں ہے کہ عورت کو قرآن حمید نے مرد کے مقابلے میں کچھ ''نیوار کھیا جنوں کیندے نیں'' یعنی پست درجے کے اوپر رکھا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔

عزیزانِ من! جب وہاں آئیں گے جہاں کہتے ہیں کہ صاحب! شہادت میں بھی دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں' وہاں میں عرض کروں گا کہ یہ تصور بھی غلط ہے۔ بہرحال تقسیمِ وراثت میں بیٹے کو بیٹی سے دوگنا دینے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کنبے کے اخراجات کا کفیل مرد ہے' عورت نہیں ہے۔ دیکھیے (4:34)۔

## پراپرٹی کی تقسیم کے سلسلہ میں حصوں کی قانونی وضاحت

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بڑا Technical (فنی) سا موضوع ہے کہ قرآن مجید نے کیا حصے دیئے ہیں؟ اگر آپ کو اتنی سی دلچسپی ہے کہ یہ جو حصے ہیں وہ یوں سامنے آجائیں تو اور بات ہے اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی بڑی اہمیت ہے تو پھر یوں کیجیے کہ میں اس پورے قانون کو' حصوں کے ساتھ' بیان کرتا چلا جاتا ہوں۔ آپ چاہتے ہیں تو کہیں لکھ رکھیے یا میں اس کو کہتا ہوا آگے گزر جاتا ہوں۔ جب کسی کو قرآن حمید کے ان حصوں کی ضرورت پیش آئے تو میری کسی کتاب میں دیکھ لے یا مجھ سے پوچھ لے۔ یہ چیزیں آپ کو لکھی ہوئی مل جائیں گی۔ بہرحال جو بھی بات ہے وہ حصوں کی ہوگی اور ان دو آیتوں میں قرآنِ کریم نے یہ حصے بتا دیئے ہیں۔

تقسیم کرنے کے متعلق میں بتا دوں کہ طریقہ کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں بعض وارث ایسے ہیں جن کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ مثلاً ماں کو چھٹا حصہ' باپ کو اُتنا ہی حصہ' بیوی کو آٹھواں حصہ' خاوند کو چوتھا حصہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن کے حصے قرآن حمید نے مقرر کر دیئے ہیں' وہ حصے تو پہلے دیدیئے جائیں گے اور جو باقی بچے گا' وہ ان پہ تقسیم کیا جائے گا جن کے حصے قرآن حمید نے مقرر نہیں کیے مگر یہ الٹا کرتے ہیں اور بات یہاں سے شروع کر دیتے ہیں کہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (4:11) لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے یعنی لڑکی =1/3 اور لڑکا =2/3۔ لڑکے اور لڑکی کے حصے پہلے نکالنے شروع کر دیتے ہیں کہ لڑکے کا دوگنا' لڑکی کا آدھا اور اس کے بعد پھر چلتے ہیں کہ باپ کا چھٹا حصہ (1/6)' ماں کا اتنا ہی حصہ (1/6)' خاوند کا اتنا' بیوی کا اتنا۔ وہ پورے بیٹھتے نہیں ہیں یعنی پہلے' جہاں مقرر حصے نہیں ہیں' وہاں سے بات شروع کرتے ہیں۔ ارے بات شروع کرو جہاں حصے مقرر ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ اس میں آپ کو کوئی دقت ہی پیش نہیں آئے گی۔ جو مقرر حصے ہیں انہیں نکالتے چلے جایئے' جو باقی بچ رہے اس کو اس نسبت سے تقسیم کر دیجیے کہ مرد کو عورت سے دوگنا' لڑکے کو لڑکی سے دوگنا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں اولاد کا حصہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ پہلے جن کے

حصے مقرر ہیں' ان کو مل جاتے ہیں اور اس میں کہیں نہ جھول پڑتی ہے نہ بھول ہوتی ہے۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے' ان کا حاصل جمع یا تو پورا ہو جائے گا یعنی ایک آ جائے گا' ورنہ جو باقی بچے گا' وہ یوں تقسیم ہو جائے گا۔

اور برادرانِ عزیز! تیسری بات یہ ہے کہ جہاں کوئی وارث نہ ہو' جہاں ایسی صورت ہو کہ جو حصہ مقرر ہے' وہ دیا گیا ہے' اس کے بعد دوسرا اوارث ہی کوئی نہیں ہے' وہ جو باقی بچتا ہے' وہ سارا رفاہِ عامہ کے لیے ہے' جسے آپ بیت المال کہتے ہیں' وہ حکومتِ اسلامی کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہاں سے رفاہِ عامہ کے لیے تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں یہ مصیبت پڑی رہتی ہے کہ جو باقی بچتا ہے' وہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا کریں' پھر اس کو پیچھے کی طرف جا کر بانٹنا شروع کرتے ہیں۔ عجیب الجھن میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ بہر حال پہلا اصول یہ ہے کہ جو باقی بچے' اس میں سے لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ہے۔ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں مخلوط ہوں تو لڑکوں کو دوگنا کر کے لڑکیوں کی تعداد میں ملا دو۔ آپ نے کہیں فتوے نہیں دینے ہیں۔ اپنی تقسیم جو آپ کی ہونی ہے' وہ مروجہ قانون کی رو سے ہونی ہے۔

## تقسیم کے سلسلہ میں مروجہ قانون قرآنِ حکیم کے خلاف ہے: مجبوریاں بھی ہیں غیر کے اختیار میں

آپ حیران ہونگے کہ آپ قرآن حکیم کی رو سے تقسیم نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا بنایا ہوا یہی قانون اب ملک کا قانون بھی ہے۔ آپ نے اگر قرآنِ کریم کے قانون کے مطابق تقسیم کیا تو کوئی وارث بھی عدالت میں جا کر دعویٰ دائر کر دیتا ہے تو وہ آپ کی تقسیم باطل قرار پا جاتی ہے۔ پھر تقسیم ان کے قانون کے مطابق کروانی پڑتی ہے۔ قرآن حمید سے جو کچھ میں عرض کرونگا' وہ محض درس کی خاطر ہوگا یا اس کے بعد (عرفِ عام میں) ثواب کی خاطر ورنہ آپ پہ کیا' مجھ پہ بھی اگر یہ چیز آئے گی تو اس وقت قرآن حمید کے مطابق تقسیم کوئی نہیں مانے گا' ہم کر بھی لیں تو کوئی نہیں تسلیم کرے گا۔ اللہ کرے کہ کسی کے ایسے وارث ہوں جو قرآن حمید کو قرآن حمید سمجھیں تو وہ اس پہ اعتراض نہ کریں تو الگ بات ہے ورنہ ان میں سے اگر ایک بھی جا کر عدالت کے دروازے کھٹکھٹا دے گا' درخواست دیدے گا' آپ کی کی ہوئی یہ ساری تقسیم رکھی کی رکھی رہ جائے گی اور وہی قانونِ شریعت آپ کے اوپر بھی نافذ ہو جائے گا جس کو آپ ساری زندگی میں قطعاً غیر اسلامی مانتے تھے:

مجبوریاں بھی ہیں غیر کے اختیار میں

## قرآنِ حکیم کے نزدیک تقسیمِ وراثت کا ملخص

غلط نظام میں انفرادی طور پہ آپ قرآن حکیم کے مطابق چل ہی نہیں سکتے۔ قرآن حکیم کے مطابق چلنا بھی چاہیں تو آپ کا یہ قانون

وراثت اس پہ چلنے نہیں دے گا۔ ان دونوں آیتوں (11 اور 12) میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اس کا ملخص آپ کو بتا دیتا ہوں۔ سب سے پہلے میاں بیوی کے حصے ہیں۔ بیوی کے ترکے میں سے خاوند کا حصہ اس طرح ہے کہ اگر بیوی کی اولاد ہو تو خاوند کا حصہ ایک چوتھائی (1/4) ہے۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو تو خاوند کا حصہ آدھا (1/2) ہے۔ اور خاوند کے ترکے میں سے بیوی کا حصہ اس طرح ہے کہ اگر اولاد ہو تو بیوی کا حصہ 1/8 اور اگر اولاد نہ ہو تو بیوی کا حصہ 1/4 ہے۔ ماں باپ کا حصہ بھی قرآن حکیم نے مقرر کیا ہے۔ متوفی اگر صاحبِ اولاد ہے تو ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (1/6) ہے بشرطیکہ متوفی کی اولاد بھی ہو۔ اگر متوفی کی اولاد نہیں ہے اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کو 1/3 حصہ اور باپ کو 2/3 حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا (1/6) ہے۔ یہ حصے پورے دینے کے بعد جو باقی بچتا ہے وہ اولاد میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ اگر اولاد میں ایک سے زیادہ لڑکے ہیں تو وہ آپس میں برابر حصے لے لیں گے اگر ایک لڑکا ہے تو وہ سارا لے جائے گا۔ لڑکے اور لڑکیاں مخلوط ہوں تو لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہے اور اگر صرف لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے ترکہ کا 2/3 حصہ ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو وہ آدھا لے جائے گی دو یا دو سے زیادہ ہوں تو 2/3 لے جائیں گی۔

## وراثت کے سلسلہ میں کلالہ کی اصطلاح کا مفہوم اور ترکہ کی تقسیم

عزیزانِ من! اب ایک شکل یہ رہ گئی کہ اولاد نہ ہو اور بہن بھائی ہوں۔ اسے اصطلاح میں کلالہ کہتے ہیں۔ کلالہ کے متعلق انہوں نے بڑی ''کلال چھانٹی ہوئی ہیگی اے کہ پوچھو نہ'' (کلالہ کے متعلق انہوں نے وہ کانٹ چھانٹ کی ہے کہ نہ پوچھو تو بھلی!) اس کی Definition (تعریف) ہی نہیں ہو پاتی۔ قرآن حمید نے خود بتایا ہے کہ کلالہ کسے کہتے ہیں۔ اس کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ اولاد نہ ہو مگر بہن بھائی ہوں۔ اب اس کی دو شکلیں ہونگی: (1) اولاد نہ ہو، بہن بھائی ہوں اور ماں باپ بھی ہوں۔ یہ ہوئی ایک شکل (2) اولاد نہ ہو بہن بھائی ہوں اور ماں باپ نہ ہوں۔ یہ ہوئی دوسری شکل۔ قرآن حمید نے کلالہ میں یہ دونوں شکلیں بیان کر دی ہیں صاحب! اب پہلی شکل پہ آیئے کہ ماں باپ بھی ہوں اور بہن بھائی بھی ہوں تو اس میں ترکہ کی تقسیم اس طرح سے ہے کہ اگر صرف ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر بھائی اور بہن ایک ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے اور بقایا ماں باپ کو اس طرح مل جائے گا کہ ماں کو 1/6 اور باقی سب باپ کو ملے گا۔ دوسری شکل میں یہ ہے کہ کلالہ کے بہن بھائی ہوں اور ماں باپ نہ ہوں تو اس میں ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ اگر مرنے والا مرد ہے اور اس کی صرف ایک بہن ہے تو اسے ترکہ میں سے آدھا مل جائے گا اگر ایک سے زیادہ بہنیں ہیں تو انہیں ترکہ کا دو تہائی مل جائے گا دو سے زیادہ بہنوں کے لیے بھی یہی اصول ہوگا اگر بہن

بھائی ملے جلے ہیں تو وہی بھائی کو دوگنا' بہن کو آدھا ملے گا۔اس کے مطابق تقسیم ہو جائے گی۔اگر متوفی عورت کلالہ ہے تو اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا اور اگر زیادہ بھائی ہیں تو وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیں گے۔یہ ہیں عزیزانِ من! اِن دو آیتوں (11 اور 12) اور 177 ویں آیت کے اندر قرآن حمید کے دیئے ہوئے حصے۔اب دنیا کا کوئی نقشہ آپ لے آیئے' وہ ان سے باہر جاتا ہی نہیں ہے اور کہیں جھول پڑتی ہی نہیں ہے۔یہ ہے قرآن حمید کا قانونِ وراثت۔

## سورۃ النسآء کی 11 ویں آیت کی وضاحت

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' ان کے ہاں وراثت کی تقسیم پر اتنی اتنی بڑی کتابیں ہیں مگر پھر بھی ان کے ہاں یہ مسئلہ طے ہی نہیں ہوتا۔قرآن حکیم نے کہا ہے کہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (4:11) لڑکے لیے دولڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔یعنی لڑکی=1/3 اور لڑکا=2/3۔اس لیے کہ کنبے کے اخراجات کا کفیل مرد ہے' عورت نہیں (4:34)۔عزیزانِ من! میں نے ابھی دوگنا حصہ عرض کیا ہے یعنی لڑکے کے لیے دولڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔آگے کہا ہے کہ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (4:11) اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ترکہ میں ان کا دوتہائی حصہ ہے جو چھوڑا گیا ہے۔وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (4:11) اور اگر ایک ہی لڑکی ہے تو آدھا حصہ ہے۔وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ (4:11) اگر متوفی کے ماں باپ ہوں اور اس کے اولاد بھی ہو تو پھر ترکہ میں سے ہر ایک کا چھٹا (1/6) حصہ ہے فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ (4:11) لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کے وارث ہوں تو فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (4:11) ماں کا ایک تہائی (1/3) حصہ ہے اور فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ (4:11) اگر اس کے بہن بھائی بھی ہوں تو فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (4:11) ماں کے لیے چھٹا (1/6) حصہ ہے۔یاد رکھو! مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ (4:11) یہ وصیت پوری کرنے کے بعد یا قرضہ دیدینے کے بعد ہے یعنی ترکہ سے سب سے پہلے مرنے والے کا قرض ادا کرو۔پھر دیکھو کہ اس کی وصیت کیا ہے۔اگر وصیت پورے مال پر حاوی نہ ہو یا وہ وصیت کر ہی نہ سکا ہو تو اس صورت میں ترکہ کی تقسیم مذکورہ بالا حصوں کے مطابق کرو۔اب آگے کہا ہے کہ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:11) یہ اس لیے ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کونسا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے۔اس لیے یہ حصے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں کیونکہ اس کا ہر فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہے۔اب اس کی وجہ یہی ہے کہ وصیت تم نے کی نہیں' مال باقی بچ گیا ہے' تقسیم تم کر نہیں سکے' اب یہ چیز ہے کہ اگر تم خود حصے مقرر کرنے لگو گے تو اس میں کچھ گڑبڑ ہو جائے گی' سمجھ نہیں سکو گے کہ کون زیادہ قریبی ہے' کون زیادہ دور ہے۔اس لیے ہم نے

حصے مقرر کر دیئے ہیں کہ اس میں جھگڑے کی شکل نہ رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا** (4:11) وہ جانتا بھی ہے، حکمت والا بھی ہے اس لیے اس نے یہ تمہارے حصے مقرر کر دیئے ہیں۔

## کلالہ کے حصے کی مزید تفصیلات

اب اگلی آیت میں کہا ہے کہ **وَ لَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَکَ اَزۡوَاجُکُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہُنَّ وَلَدٌ** (4:12) اب عقدی رشتوں (میاں بیوی) کے متعلق سنو۔ جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ مریں، اُس میں سے تمہارا حصہ نصف (1/2) ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو۔ **فَاِنۡ کَانَ لَہُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ** (4:12) لیکن اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تمہارا حصہ چوتھا (1/4) ہے۔ یہ تقسیم اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہوگی جو انہوں نے کی ہو یا ان کے قرضہ کی ادائیگی کے بعد۔ آگے کہا ہے کہ **وَ لَہُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّکُمۡ وَلَدٌ** (4:12) تمہارے ترکہ میں، تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ (1/4) ہے بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو۔ **فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ وَلَدٌ فَلَہُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ تُوۡصُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ** (4:12) اور اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہاری بیویوں کا حصہ آٹھواں (1/8) ہے لیکن یہ تمہاری وصیت پوری کرنے یا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگا۔ لہٰذا قاعدہ یہ ٹھہرا کہ پہلے قرضہ اور وصیت کو دیکھ لیا جائے۔ اس کے بعد اگر کچھ بچے تو پہلے عقدی رشتوں (میاں بیوی) کے حصوں کی تقسیم کر دی جائے (4:33) اور باقی ماندہ نسبی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔ ''اولاد'' میں اولاد در اولاد، اور والدین میں دادا، نانا، دادی، نانی سب شامل ہیں، جب مرنے والا ان کا اقرب ہو۔ آگے کہا ہے کہ **وَ اِنۡ کَانَ رَجُلٌ یُّوۡرَثُ کَلٰلَۃً اَوِ امۡرَاَۃٌ وَّ لَہٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا السُّدُسُ** (4:12) اگر متوفی لاولد ہو اور اس کے بھائی بہن بھی ہوں اور ماں باپ بھی۔ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو، تو دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ (1/6) ہے۔

عزیزانِ من! ٹیپ پہ سننے والوں کے لیے میں عرض کر دوں کہ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے بجلی فیل ہوگئی تھی۔ اس دوران میں نے صرف میاں اور بیوی کے حصے بیان کیے تھے۔ وہ میں پہلے بھی چونکہ مختصراً بیان کر چکا ہوں، اس لیے درمیان کا حصہ ریکارڈ نہیں ہو سکا، اس سے درس میں کچھ کمی نہیں آئے گی، اب درس مسلسل آگے چلے گا[1]۔

کلالہ کے متعلق میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس آیت (4:12) میں ہے اور آگے (4:177) میں اس کا دوسرا حصہ ہے۔ آپ دونوں کو ملائیں گے تو کلالہ کے حصے نکل آئیں گے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہوں تو ان میں سے ہر

---

[1] یہ حصہ مفہوم القرآن سے اوپر دے دیا گیا ہے تاکہ قارئین کے دل و دماغ میں یہ تسلسل قائم رہے۔

ایک کا چھٹا حصہ (1/6) ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ (4:12) اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں یعنی بہن بھائیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہونگے۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:12) یہ حصے، یہ تقسیم وصیت کے بعد جو اس نے کی ہوئی ہو گی یا قرضے کے بعد ہوں گے بشرطیکہ یہ غَيْرَ مُضَآرٍّ (4:12) یعنی یہ وصیت کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ کی گئی ہو۔ اس کا فیصلہ نظامِ معاشرہ کرے گا۔

## ہمارے ہاں وصیت کی آیت کو منسوخ کر دیا لیکن قرض کی ادائیگی کو بحال کیوں رکھا؟

عزیزانِ من! میں پھر دہرا دوں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان دو آیتوں میں جہاں مقرر حصہ بیان ہو رہا ہے، اس کے ساتھ میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ وصیت کے بعد یا قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگا، یہ ان حصہ داروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ وصیت کے بعد یا قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگا۔ اور آپ کے ہاں یہ ہے کہ اس ایک حدیث نے یہ آیتِ وصیت منسوخ کر دی ہے مگر بعد میں یہ بھی کہتے ہیں کہ وراثت کی آیتوں میں، جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وصیت کے بعد اور قرضہ کے بعد یہ تقسیم ہوگی تو اگر یہ آیت منسوخ ہوئی ہے تو وہ قرضے والی بھی پھر منسوخ ہوئی ہے۔ اب جس نے قرضہ لینا ہے اس سے کہیے کہ ''جا اوئے جا آیت منسوخ ہوئی ہیگی اے'' (جاؤ بھائی! یہ تو آیت ہی منسوخ ہو چکی ہے)۔ کئی ایک تو بیچارے ایسے رہ جاتے ہیں کہ روز اس کے اندر آ کے پٹتے ہیں صاحب! کہا ہے کہ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ (4:12) یہ اللہ کی طرف سے بڑا تاکیدی حکم ہے کہ وصیت نقصان پہنچانے کے لیے نہ کی گئی ہو۔

## وصیت کے اصول میں تاکید کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حدود اللہ کے اندر رہ کر کرنی ہے۔

جب وصیت آئے گی تو اس میں، میں عرض کرونگا۔ وہاں بھی خدا نے اس کی Provision (گنجائش) رکھی ہوئی ہے کہ اگر کہیں یہ نظر آتا ہے کہ وہ کسی کے اوپر صریحاً ظلم کر رہا ہے تو اس کے لیے بھی اپیل کی شکل میں قرآن مجید نے گنجائش رکھی ہے۔ عدالت کے ہاں جا کر اس چیز کو ثابت کرا سکتا ہے مگر انفرادی طور سے یہ چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کی بھی قرآن مجید نے Provision (گنجائش) رکھی ہے لیکن وصیت کا یہ حکم بڑا تاکیدی ہے۔ قرآن حمید کی کسی آیت کو کوئی روایت منسوخ نہیں کر سکتی۔ کسی آیت کو منسوخ کرنے کا تو قرآن حمید کے اندر سوال ہی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (4:12) اللہ سب کچھ جاننے والا ہے، جذبات میں بہہ جانے والا نہیں ہے۔ اس نے خود یہ کہا ہے۔ اگلی آیت میں کہا کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (4:13) یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ دیکھیے کتنی متعین چیز ہے۔ کہا ہے کہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (4:13) جو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے یوں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، تو یاد رکھیے! اس کی یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بنے گی، آخرت کی زندگی

بھی جنت کی زندگی بنے گی۔

## چین کی ترقی کا راز ان کا وہ نظام ہے جس میں عدالتوں کی ضرورت ہی نہیں اور ذاتی جائیداد کا قانون منسوخ ہے

دنیا کے تمام جھگڑے زر' زمین اور زن سے منسلک ہیں۔ بیشتر جھگڑے' جیسا کہ آپ نے دیکھا' جائیدادوں کی تقسیم کے مقدمات ہیں' ان مقدمات میں پوچھیے نہیں کہ ہوتا کیا کچھ ہے۔ یہاں یہ بات یاد آ گئی۔ چین سے جو دوست ہو کر آئے' اُنہوں نے ان چینیوں سے یہ بھی پوچھا کہ تمہاری زراعت کی پیداوار اتنے عرصے میں اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے' اس کی وجوہات کیا ہیں؟ انہوں نے باقی وجوہات تو بعد میں بیان کیں' پہلے یہ کہا کہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہاں عدالتوں کو منسوخ کر دیا ہے' ختم کر دیا ہے۔ وہاں عدالت ہی نہیں ہے۔ میرے ان دوستوں نے پوچھا کہ صاحب! کھیتی باڑی سے عدالتوں کی منسوخی کا کیا تعلق؟ کیا اس سے پیداوار زیادہ ہوگئی ہے؟ وہ چینی کہنے لگے کہ تم لوگوں نے کبھی اپنی عدالتوں میں دیکھا ہے کہ صبح سے شام تک کتنے زمیندار اپنی کھیتی باڑی کو چھوڑ کر وہاں دھکے کھا رہے ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاں ہزاروں کی تعداد میں' روزانہ مہینوں سالوں تک' ان کا قیمتی وقت کچہری میں ضائع ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ قصہ ہی ختم کر دیا۔ اب ان کا سارا وقت بچ گیا' وہ اپنا سارا وقت کھیت کو دیتے ہیں۔ اس پر ان دوستوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ عدالتیں کیسے منسوخ کر دیں' یہ جھگڑے کیسے نپٹتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے ذاتی جائیداد کا قانون ہی منسوخ کر دیا یوں عدالتوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہ تو وہ ہے کہ 'نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'۔

## انسانی معاشرے میں تمام جھگڑوں کا وجود ذاتی ملکیت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور خدا کی راہنمائی اس کا حل ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ کڑیاں کیسے عمدہ طریق پر مل رہی ہیں۔ زراعت کی پیداوار اتنی بڑھ گئی' عدالتیں منسوخ کر دیں۔ عدالتیں اس لیے خود بخود ختم ہوگئیں کہ ذاتی جائیدادوں کے تمام باہمی جھگڑے ختم ہو گئے۔ ذاتی جائیداد انہوں نے ختم کر دی۔ عزیزانِ من! قرآن حمید نے یہ نظام دیا تھا:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

آپ دیکھیے کہ ایک تبدیلی سے معاشرے میں کہاں کہاں دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ خاندانوں کے اندر باہمی عداوتیں ہیں' کدورتیں ہیں' بغض ہے' کینہ اور انتقام چلتا ہے' جس سے زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر قتل ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھائیوں میں جھگڑا ہے اور قتل و غارت گری ہے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ (20:123)

تمہاری انفرادی مفاد پرستیاں تمہارے درمیان حائل ہو کر تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہیں۔ جب تک ان انفرادی مفاد پرستیوں کا ٹکراؤ نہیں تھا' وہ جنت کی زندگی تھی' اس جنتی زندگی میں قرآن حمید نے یہی کہا تھا کہ ''یہ میری اور تیری کا سوال نہیں ہے'' وہاں تو یہ ہے کہ **وَ كُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا** (2:35) جہاں کسی کو بھوک لگے' پیٹ بھر کر کھالے' اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ یہ میری ہے' یہ تیری ہے۔ اسے جنت کی زندگی کہا تھا۔ اور اس کے بعد یہ کہا تھا کہ تیرے کان میں' ابلیس Selfishness (خود غرضی) کا افسوں پھونک رہا ہے کہ تُو اپنی فکر کر' اپنی اولاد کی فکر کر۔ تمہارے کان میں پھونکے جانے والے افسوں سے ہوگا کیا؟ ہوگا یہ کہ **فاهبطوهم** تم اس مقامِ بلند سے نیچے گر جاؤ گے اور **بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ** (2:36) ایک دوسرے کے درمیان میری اور تیری کی Wedges (پچریں) آ جائیں گی اور پھر **مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَ يَسۡفِكُ الدِّمَآءَ** (2:30) پھر فساد بھی ہونگے' خوں ریزیاں بھی ہونگی' یہ سب کچھ ہوگا۔ (اس پر) مایوس آدمی نے یہ کہا کہ کیا پھر میری زندگی ہمیشہ اسی طرح سے گزرے گی؟ یہ تو بڑا الم انگیز منظر ہے' یہ تو بڑی مایوس کن زندگی کا نقشہ ہے تو کیا ہمیشہ یہ ہوتا رہے گا؟ کہا کہ نہیں' ہمیشہ نہیں۔ سنو! **فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ** (2:38) ہماری طرف سے' ہمارے رسولوں کی معرفت (7:35) تمہاری طرف راہ نمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (20:123-24)۔

## قرآنی نظام کا ماحصل یہ ہے کہ اس میں میری اور تیری کی تفریق باقی ہی نہیں رہتی' معیارِ زندگی بلند ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن مجید کہتا ہے کہ اپنی عقلِ فتنہ ساز کے پیچھے نہ چلنا' یہ ہر ایک کو ذاتی مفاد سکھاتی ہے' ہماری راہنمائی کے پیچھے چلنا جو رب العالمین کی طرف سے دی گئی ہے' جس کے نزدیک ساری خلقت اس کا اپنا کنبہ ہے۔ اس کا اتباع کرو گے تو پھر کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا' کوئی حزن نہیں ہوگا۔ جو بھی اس راہ نمائی کے مطابق چلے گا' اس کے لیے نہ خوف ہے نہ حزن۔ سیدھی سی بات ہے' عزیزانِ من! ملیریے میں جو بھی کونین کھائے گا' ملیریا اتر جائے گا' سنت سنگھ کھائے' عبداللہ کھائے' رام داس کھائے' ملیریا بخار اتر جائے گا۔ یہ فطرت کے قوانین ہیں۔ وہ تو رب العالمین ہے' جو جس حد تک ان کا اتباع کرے گا' اس حد تک ان کے ثمرات سے بہرہ ور ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نظام کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ اگر آپ کلی انسانیت کے لیے جنت کا معاشرہ بنانا چاہیں گے تو پھر قرآن حمید کا کلی نظام لینا پڑے گا' ساتھ ہی اس نے کہہ دیا کہ اس کے اتباع سے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' تمہیں جنت کی زندگی مل جائے گی اور **وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ** (4:13) یہ بہت بڑی Achievement (فوز) ہے۔ یہ عذاب سے چھوٹنا ہی نہیں ہے' یہ بہت

کچھ Achievement (فوز) ہے۔ جو کچھ ہم تم سے کہہ رہے ہیں' یہ مبنی برحق ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ آدم کی جنت کی زندگی میں' جس کا قرآن حمید نے تعارف کرایا ہے ''میری اور تیری کی'' کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ جنت کی زندگی' جو قرآن حمید بتا رہا ہے' آپ دیکھیے گا کہ اس میں کوئی طبقات نہیں' کہیں یہ نہیں لکھا ہوا کہ جنت میں ایک طرف تم نکل جاؤ گے تو دیکھو گے کہ ''اے محلا جھگیاں والیاں دا ہیگا'' (یہ محلّہ جھگی والوں کا ہے) یعنی وہ بیچارے ننگے دھڑنگے ہیں' نہ کھانے کو روٹی ہے' نہ پہننے کو کپڑا ہے' نہ بیماری میں علاج ہے' سیلاب آیا تو مصیبت ہوئی' بارش برسی تو ان کے اوپر عذاب آ رہا ہے۔ اس گلی سے نکل کر اُدھر آ نکلے ہیں' وہاں سر بفلک عمارتیں ہیں' موٹریں ہیں' آسائشیں ہیں۔ سنیے! جنت میں کہیں یہ نہیں ہے' اس نے ساری جنت کا ایک ہی نقشہ دیا ہے۔ ہر شے جو کسی ایک فرد کو جنت میں میسر ہے' دوسرے کو بھی میسر ہے۔ وہاں ایسی تقسیم نہیں ہے۔ جنت تو کہا ہی اسے جائے گا۔ معیارِ زندگی یہ نہیں کہ دال روٹی ملتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ صاحب! سب کو یکساں طور پہ دید یا جائے گا تو پھر بنے گا کیا؟ آدھی آدھی روٹی سب کے حصے میں آئے گی' وہ تو اس صورت میں آتی ہے جب آپ پیداوار کے لیے آدھے سے زیادہ مخلوق کو ان چیزوں میں الجھائے رکھتے ہو' پیداوار آپ کی نہیں ہو رہی' ان چیزوں سے ان کو فارغ کر دیجئے' آپ دیکھیے تو معاشرے کا معیار زندگی کتنا اونچا ہو جاتا ہے!

## غیر قرآنی معاشرے کی اذیت ناکی دل کو آگ کی طرح لپیٹ لیتی ہے

جنت کی زندگی جھونپڑیوں اور گدڑیوں کی زندگی نہیں ہے۔ تم خود کہتے ہو کہ وہاں موتیوں کے محل ہونگے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ وہاں اعلیٰ درجے کے قالین ہیں' حریر و اطلس کے پردے ہیں' لبِ جُو سبزہ ہے' جھکے ہوئے درخت ہیں' وہاں پھل ہیں' لحمِ طیور ہے' چاندی اور سونے کے برتن ہیں' بلوری کنٹر ہیں' اعلیٰ درجے کے صوفے ہیں اور ایسا نہیں کہ ایک طبقے کے لیے ہے' دوسرے کے لیے نہیں۔ یہ سب جنت میں داخل ہونے والوں کے لیے ہے۔ یہ ہے جسے آپ مساوات کہتے ہیں۔ باقی رہی جہنم' سو جہنم کے کسی گوشے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ وہاں جنت کا نقشہ ہوگا۔ جہنم جہنم ہوتی ہے' جو کھا کر سوتا ہے وہ مختلف قسم کی آگ میں جلتا ہے۔ اور جو بھوکا سوتا ہے وہ دوسری قسم کی آگ میں جلتا ہے۔ جلتے دونوں ہیں' آگ کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ وہاں کی آگ کے متعلق کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ** [104:6] **الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ** (104:6-7) وہ جس آگ میں جل رہے ہوتے ہیں' وہ دلوں کو لپیٹ رہی ہوتی ہے' یہ جسموں کو لپیٹ رہی ہوتی ہے۔

کہا ہے کہ **وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ** (4:14) اور جو اس

نظام کی' اس قانون کی' معصیت کرے گا جو خدا نے دیا اور اس کے رسول نے متشکل کیا ہے' تو یاد رکھیے! اُسے ایسی آگ میں' ایسے جہنم کے اندر' داخل کیا جائے گا' جس کے اندر وہ رہیں گے اور وہ ہوگا **عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ**۔ یہ عذاب دیکھیے! یہاں عذاب کی صفت کیا آئی ہے؟ یہ کہ **عَـذَابٌ مُّهِيۡنٌ** (4:14) ذلت آمیز عذاب' دردناک عذاب' الم انگیز عذاب' عبرت ناک عذاب ہوگا۔ یہ ذلت کا نقشہ ان قوموں سے پوچھیے' اُن سے کیا' اپنے آپ سے پوچھیے جو اپنی روٹی کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کتنا ذلیل ہونا پڑتا ہے! یہ ہے وہ جہنم جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس ذلت کے بعد جہنم میں جو کھانے کو ملے گا' اس سے نہ بھوک مٹے گی' نہ موٹاپا آئے گا' تندرستی نہیں آئے گی۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی آیت 14 تک ہم آ گئے' آگے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے۔ مال کی حفاظت کے بعد قرآنِ حکیم عصمت کی حفاظت کی طرف آتا ہے اور وہ بڑی اہم چیز ہے۔ یاد رکھیے! جو قرآن حکیم کی بنیادی اقدار ہیں' ان میں عصمت کی حفاظت بنیادی قدر ہے' یہ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز چیز ہے۔ اسے ہم آئندہ پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی 15 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ**

❀......❀......❀

# چھٹا باب: **سورۃ النسآء** (1)، (آیات 15 تا 18)

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ ۚ فَاِنْ شَہِدُوْا
فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا
مِنْکُمْ فَاٰذُوْھُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی
اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ
عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ
اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَھُمْ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۸﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1970ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 15 ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:15)۔

## قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں میں عصمت اور عفت کی اہمیت اور ہمارے ہاں اس کی نوعیت

اس سے پہلے عائلی زندگی کے متعلق ہدایات اور قوانین ہمارے سامنے آئے۔ قرآنِ کریم عصمت کی حفاظت پر بڑا زور دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی مستقل و غیر متبدل اقدار میں عصمت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں عفت اور عصمت کا لفظ تو صرف عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس باب میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ دونوں کی عصمت کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اس نے ایک طرف حضرتِ مریمؑ کو جو اتنی اہمیت دی ہے' بار بار ان کی اس خصوصیت کو وہ سامنے لایا ہے کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ وہ خانقاہیت اور مذہبی پیشوائیت کے ایسے ماحول میں تھیں جو میں آگے چل کر یا کسی دوسرے موقعہ پر عرض کرونگا' جسے سائیکولوجی کی اصطلاح میں Sex Perversion (جنسی بدنہادی) کہتے ہیں۔ یہ جو اس قسم کے خدائی اڈے بنے ہوئے ہوتے ہیں ان میں Sex Perversion (جنسی بدنہادی) بڑی گھناؤنی شکل میں ہوتی ہے۔ Perversion (بدنہادی) اس لیے ہوتی ہے کہ وہ ظاہرداری میں بڑے مقدس بنتے ہیں مگر ان کے اندرونی خیالات بڑے ہی گھناؤنے ہوتے ہیں اور جب اس قسم کی کشمکش پیدا ہو جائے تو اس میں Perversion (بدنہادی) پیدا ہوتی ہے۔

میں نے دانستہ کبھی فقہ کے متعلق اپنے درس میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ یونہی ہماری فقہ کا ایسا کوئی قانون آ جاتا ہے جو قرآن حکیم کے ساتھ ٹکراتا ہے تو ضمناً اس کا ذکر کر دیا کرتا ہوں ورنہ ہماری فقہ کی کتابیں بلا مبالغہ نصف سے زیادہ جنسی مسائل سے بھری ہوتی ہیں اور اس انداز سے مسائل سامنے آتے ہیں' جن میں Perversion (بدنہادی) نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ بات تو یہ بڑی حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم سی دکھائی دے گی لیکن آپ میں سے جن حضرات کو ان کتابوں کے دیکھنے کا کبھی اتفاق ہوا ہے تو وہ ذاتی طور پر جانتے ہونگے' وگرنہ کبھی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیے کہ ان میں جنسی مسائل کو کس انداز میں بیان کیا ہوتا ہے۔

## بدکرداری کے گھناؤنے ماحول میں حضرت مریمؑ کی پاکدامنی کا ذکر اور حضرت یوسفؑ کا تذکرہ

میں نے Sex Perversion (جنسی بدنہادی) کا لفظ دو تین دفعہ دہرایا۔ اس سے پہلے بھی جہاں میں نے لکھا ہے' وہاں بھی مجھے اس کے لیے کوئی مرادف لفظ ایسا نہیں ملا جو صحیح معنی میں اس کے مفہوم کو سامنے لے آئے۔ Perversion (بدنہادی) کا جو مفہوم ہوتا ہے' میں نے اپنی کتابوں میں اس کا ترجمہ 'جنسی بدنہادی' کیا تھا لیکن جو بات Perversion (بدنہادی) سے بنتی ہے' وہ کسی اور لفظ سے سامنے نہیں آتی' Perverted ذہنیت ہوتی ہے یہ ایک الٹی ہوئی ذہنیت ہوتی ہے لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے حضرتِ مریمؑ کا ذکر نمایاں طور پہ کیا اور یہ کہہ کر کیا کہ اس نے اس گھناؤنے ماحول کے اندر اپنی عصمت کی حفاظت کی جس میں وہ پاکباز دوشیزہ' گھری ہوئی تھی۔ یہ اس کے لیے واقعی بڑا اہمت طلب مرحلہ تھا جس میں اس نے حفاظت کی۔ قرآن حمید نے ان کی داستان کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس نے مقبولیتِ دوام کے صفحات پر اس کو محفوظ کر دیا ہے لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن حمید کے نزدیک عصمت عورت ہی کی نہیں ہے' ایک اور قصہ بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ ایک اور قصہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک قصہ ہے جسے قرآن کریم نے مسلسل سورۃ یوسف میں بیان کیا ہے۔ وہاں حضرتِ یوسفؑ کی خصوصیت یوں نمایاں ہے کہ انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ قرآنِ کریم نے جہاں عام ہدایت اور عام تاکید کی ہے وہاں عصمت کی حفاظت کی دو داستانیں بیان کی ہیں: ایک عورت کی اور ایک مرد کی۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہوں نے ایسے Adverse Circumstances (بدترین حالات) میں' ایسے نامساعد ماحول میں' اپنی عصمت کو برقرار رکھا۔

## قرآنِ حکیم میں قابلِ سزا جرم کا ذکر

قرآنِ کریم میں چار ہی جرم ہیں جن کی قرآن حکیم نے خود تعزیر مقرر کر دی ہے۔ اُسے حد کہتے ہیں۔ ان جرائم کی سزا بھی مقرر کر دی ہے۔ یہ ہیں جان کی حفاظت' مال کی حفاظت' عصمت کی حفاظت اور چوتھی چیز ریاست یا مملکت یا اسٹیٹ کی حفاظت کے خلاف بغاوت کی سزا۔

## ہمارے ہاں حفاظتِ عصمت کے سلسلہ میں مرد اور عورت میں پایا جانے والا فرق اور ماں کے خدشات

جہاں جہاں قرآنِ کریم نے مومنین اور مومنات کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے' وہاں عصمت کی حفاظت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ یہ ہر جگہ' ہر مقام پر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ Rational (استدلالی) طور پر' ذہنی طور پر یا ایک عقیدہ جو متوارث چلا آ رہا ہے' اس کی بنا پر' ہمارے ذہنوں میں بھی عصمت کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' یہ اہمیت سمٹ کر عورت کے متعلق رہ گئی ہے' مرد کے متعلق نہیں ہے۔ یہ وہی ہے جو ہمارے ہاں متواتر ایک چیز چلی آ رہی ہے' اسی کے تحت مردوں کے متعلق عام طور پہ گھروں میں آپ دیکھیں گے کہ میاں بیوی میں ایک گفتگو ہوتی ہے۔ بیوی شوہر سے کہہ رہی ہے کہ اس بیٹے کی کوئی خبر لیجئے' آپ دیکھتے نہیں ہیں کتنا آوارہ ہوتا چلا جا رہا ہے' راتوں کو باہر رہتا ہے' سوسائٹی بڑی خراب ہوگئی ہے' عجیب عجیب قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں' لڑکیوں کے ساتھ پھرتا رہتا ہے یعنی وہ کوئی خاص بات ہی نہیں' زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی شادی کی فکر کرنا چاہیے لیکن اسی گھر میں' اگر لڑکی کے متعلق یہ پتہ چلے کہ آج اس نے دو لفظ کسی چٹ پہ لکھ کر کہیں بھیجے ہیں تو قیامت برپا ہو جائے گی' خواہ اس نے وہ اپنے بھائی کو ہی کیوں نہ بھیجے ہوں' تحقیق کے بعد پتہ چل رہا ہو کہ اپنی استانی کو ہی کیوں نہ کچھ لکھ کر بھیجا ہو لیکن ان دونوں میں فرق ہمارے گھروں کے اندر اتنا ہوتا ہے۔ بیٹے کے متعلق اس زمرے میں عام گفتگو ہو رہی ہے لیکن بیٹی کے متعلق ان سے پوچھیے کہ بہن مدت ہوئی تم کہیں آئی نہیں' کیا بات ہے' تمہیں دیکھا ہی نہیں' تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گی کہ بہن! اب میں کہاں آ جا سکتی ہوں' تم جانتی ہو کہ وہ بانو اب بڑی ہوگئی ہے' اب ایسی عمر میں لڑکیوں کی کیفیت کہ ''ایہہ تے آٹے دا دیوا ہوندیاں نیں' اندر رکھوتے چوہیاں دا ڈر' باہر کڈو تے کاواں دا ڈر' تے میں ماں ہن کتھے آ جا سکدی ہیگی آں'' (یہ تو آٹے کا دیا ہوتی ہیں۔ اندر رکھو تو چوہیوں کا ڈر' باہر نکالو تو کووں کا خوف' اب میں' ایک ماں' کہاں آ جا سکتی ہوں)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری ذہنیت کہاں چلی گئی ہے۔ اور پھر جب رشتے کی بات آتی ہے تو لڑکی کے متعلق یہ تحقیقات ہوتی ہیں اور ذرا سا شبہ پڑ جائے کہ اس کا کالج جاتے ہوئے' کہیں سر ننگا ہو گیا تھا' کسی لڑکے کی طرف دیکھا بھی تھا' تو پھر وہ Condemned (مطرود) ہے۔ اور صاحبزادہ کے متعلق عیاں ہے کہ کس طرح یہ آوارہ گردیاں کرتے پھرتے ہیں' یہ محاورہ ہو گیا ہے۔ یہ سوسائٹی میں مہذب ہونے کی ایک شرط ہو گئی ہے۔ یہ فرق ہے دونوں کے اندر لیکن قرآنِ کریم دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک عصمت کی اہمیت اور حفاظت کا ایک غور طلب سوال

عزیزانِ من! قرآن حکیم نہ صرف ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ وہ تو جب سزا دیتا ہے تو دونوں کو یکساں دیتا ہے۔ سزا میں

ایک کوڑے کا فرق نہیں ہے' تاکید میں کہیں فرق نہیں کہ اس نے مومنین کہا ہے اور مومنات ساتھ نہیں کہا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' جہاں ایک مثال اس نے تاریخ سے حضرتِ مریمؑ کی دی ہے' تو پوری داستان حضرتِ یوسفؑ کی ہے اور قرآن حمید میں کسی نبی کا قصہ اس طرح سے مسلسل مذکور نہیں جس طرح سے حضرتِ یوسفؑ کی بات ہے اور بات اتنی سی ہے کہ ایسے ماحول میں اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیز محض ذہنی اہمیت کی حامل ہے؟ یا اس قصے کو جسے ہم جنسی اختلاط کہتے ہیں کوئی تقدیس Attach (منسلک) کردی ہے یا فی الواقعہ یہ کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے ذہن میں ہی کسی چیز کو اہمیت دے رکھی ہو اور اس کے لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مذہب نے یہ بات کہی ہے اس لیے ہم اس کو اہمیت دیتے ہیں یا یہ فی الواقعہ ایسی چیز ہے جو قوموں کی زندگی کے اندر کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بڑا غور طلب سوال ہے۔

## آج کی مغربی سیکولر سوسائٹی میں جنسی شعبہ کی نوعیت' سابقہ دور کے لمعات میں فرق اور انسان کی بدنہادی

مغرب کی سیکولر سوسائٹی نے تو اس کے متعلق یہ کہا کہ جنسی اختلاط افزائشِ نسل کا ایک ذریعہ ہے' ایک طبعی امر ہے' نیچر کا ایک تقاضا ہے اور بالکل حیوانات کی طرح ہے۔ حیوانات میں جنسی اختلاط کا یہ تقاضا پورا ہوتا ہے' اس کا نتیجہ افزائشِ نسل ہوتا ہے۔ چونکہ وہاں بھی انسان کو حیوانی سطح پہ رکھا گیا ہے' جسے سیکولر نظام کہتے ہیں' جسے مغرب کی مادی تہذیب کہا جاتا ہے' اس میں Permanent Values یا مستقل اقدار نہیں ہوتیں' انسان کی زندگی حیوانی زندگی کی بڑھی ہوئی شکل قرار دی جاتی ہے' اس سے آگے کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ اُنہوں نے اس مسئلہ کو بڑا Lightly (ہلکے پھلکے انداز میں) لیا ہے لیکن یہ اِسی دور کی بات ہے ورنہ اس سے ذرا پہلے تو صورت یہ تھی کہ Victorian Age (وکٹوریہ عہد) میں ٹانگ کو پردے میں رکھنے کی سخت پابندی تھی۔ آپ نے اب سینما کی تصویروں میں دیکھا ہوگا کہ اس زمانے کا یورپ کی عورتوں کا جو لباس ہوتا تھا' وہ یہی نہیں کہ ٹخنے تک ڈھکا ہوا ہوتا تھا' بلکہ ان کا گھیرا اتنا زیادہ پھیلا ہوا ہوتا تھا کہ گویا ٹینٹ کا ٹینٹ ساتھ جا رہا ہے۔ یہ تو ان کا لباس ہوتا تھا۔ اور ان کی کیفیت یہ تھی کہ Leg (ٹانگ) تک ڈھکی ہوئی ہونی چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میز کی ٹانگیں بھی وہ پردہ رکھ کر اور کرسی کی ٹانگوں کے اوپر بھی غلاف چڑھا کر رکھتے تھے۔ جس کو انہوں نے Leg (ٹانگ) کہہ دیا ہے' اُسے ڈھکا ہوا ہونا چاہیے خواہ وہ میز اور کرسی کی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ابھی Victorian Age (وکٹوریہ عہد) یعنی کل کی بات ہے۔ اس کے بعد جب وہاں ذہنیت نے پلٹا لیا ہے' زندگی نام رہ گیا صرف Physical Life (طبعی زندگی) کا' تو آہستہ آہستہ دوسرے شعبوں پہ بھی اثر پڑا' جنسی اختلاط پہ بھی یہ اثر پڑا گویا ہر روز ان کے یہ قوانین بدلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک جوان لڑکے اور ایک جوان لڑکی کا باہمی رضامندی سے اختلاط تو ان کے ہاں جرم ہی نہیں تھا' شادی شدہ عورت کا بھی کسی غیر کے ساتھ اختلاط یا

شادی شدہ مرد کا کسی غیر عورت کے ساتھ اختلاط قانونی جرم نہیں تھا۔ اگر اُس عورت کا خاوند یہ کہے کہ مجھے نقصان پہنچا ہے تو وہ اپنے Damages Claim (نقصانات طلب) کر سکتا تھا اور اس کے بعد انہوں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی زیادتی ہے؟ جن کو حرامی بچے کہا جاتا ہے' یہ مسئلہ ان کے ہاں تھا۔ انہوں نے قانوناً یہ کیا کہ سوسائٹی کو انہیں اسی طرح Accept (قبول) کرنا چاہیے جیسا کہ حلال بچوں کو Accept (قبول) کرتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ یہ معاملہ آگے بڑھا۔

عزیزانِ من! جنسی موضوع پہ گفتگو کرتے ہوئے' بہت سی چیزیں میرے عنان گیر ہو جاتی ہیں' بالخصوص میری بیٹیاں اور بہنوں کی موجودگی میں' اس لیے بڑے دبے ہوئے الفاظ میں مجھے بات کرنا پڑتی ہے۔ چناں چہ آپ کو معلوم ہو گا کہ یورپ میں اب لواطت کو بھی قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اور جب انسان حیوانیت میں آگے بڑھتا ہے تو حیوان کی تو ایک حد ہوتی ہے۔ حیوان کے جنسی تقاضے کو آپ نے دیکھا ہے کہ جب فطرت کا تقاضا نہ ہو' بیل بھی وہیں ہوتا ہے' گائیں بھی وہیں ہوتی ہیں' سال بھر اکٹھا رہتے ہیں' کبھی ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تاوقتیکہ خود جنس کا تقاضا ایسا نہ ہو' فطرت کا تقاضا ایسا نہ ہو۔ وہ جو مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869ء) نے کہا تھا' سچ تھا کہ

چاک مت کر جیب' بے ایّامِ گُل
کُچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

حیوانات میں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اُدھر کا اشارہ ہوتا ہے وگرنہ یہ حِس بیدار ہی نہیں ہوتی' وہاں فطرت نے خود کنٹرول رکھا ہے۔ اور انسان جب بدنہاد ہوتا ہے' تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں Sodomy یا لواطت اب قانوناً جائز قرار پا گئی اور امریکا میں' (میری بیٹیاں معاف رکھیں) بات کرنا پڑتی ہے' آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ لڑکوں کی آپس میں شادی ہونی شروع ہو گئی ہے یعنی انسان کی بدنہادی کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔

## معاشرتی اقدار کے تعین کے انحصار کو سوسائٹی کی صواب دید پر چھوڑ دینے کے اثرات

مغرب کی سیکولر سوسائٹی میں اس جنسی بدنہادی کی برائی کو بُری نگاہ سے دیکھنے کا سوال ہی نہیں رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض سوسائٹی کا مسئلہ ہے اور سوسائٹی جس چیز کو قابلِ قبول قرار دیدے' معیوب قرار نہ دے' وہ قابلِ قبول ہونی چاہیے۔ اور جب کسی بھی قدر (Value) کا انحصار سوسائٹی کی قبولیت اور عدمِ قبولیت پر ہو تو سوسائٹی آسمان سے نہیں آیا کرتی ہے' انہی افراد کے مجموعہ کا نام تو سوسائٹی ہوتا ہے۔ ذہن میں ہر وقت یہ بات ہوتی ہے کہ ذرا سی پابندی کے لیے تھوڑی سی Publicity (تشہیر) کرو' تھوڑا سا پروپیگنڈا کرو' اور اس

کے بعد اس کو بدلوا لو۔ اور بدلوانے کا پتہ ہے ان کے ہاں طریقہ کیا ہے؟ کہ جرم کو اتنا عام کرو کہ Uncontrolable (نا قابلِ کنٹرول) ہو جائے' جب ریاست کنٹرول نہ کر سکے تو اس کے بعد خود بخود وہ اس جرم کو قانوناً جائز قرار دیدیتی ہے۔ چنانچہ Sodomy (لواطت) کے متعلق جو قانون بنا ہے' وہ اس حالت پہ پہنچ کر بنا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب اس کو روکنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں تو بجائے اس کے کہ قوم میں اس قسم کی منافقت پیدا کی جائے' اس کو کھلے بندوں اجازت کیوں نہ دی جائے۔ جس سوسائٹی کی یہ کیفیت ہو کہ اسے معلوم ہو کہ جب جی چاہے' اس قانون کو بدلا جا سکتا ہے اور یوں بدلوایا جا سکتا ہے تو ذہنی طور پہ تو وہ پہلے سے ہی اس بدنہادی یا آزادی کے مرتکب ہونے شروع ہو جائیں گے۔

## قرآنِ حکیم کی غیر متبدل اقدار کے معنی اور اپنے طور پر سماجی مسائل کا حل

کیا آپ نے یہ سمجھا ہے کہ جب قرآن حکیم اپنے کسی حکم یا قدر کو غیر متبدل کہتا ہے تو اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا کہ اگر سوسائٹی سو فیصد بھی اس کے خلاف جائے گی تو بھی یہ جائز قرار نہیں پا سکے گا۔ اسے ایمان کہتے ہیں ۔کسی قدر یا کسی راہنمائی کے غیر متبدل (Unchangeable) ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کو ماننے والی جو بھی سوسائٹی ہے' اس میں جرم خواہ سو فیصد عام ہو جائے' ذہن کبھی اس طرف نہیں جائے گا کہ 'کوئی بات نہیں' کل کو یہ چیز جائز قرار پا جائے گی' وہاں ذہن ہر وقت یہ کہے گا کہ نہیں! یہ ناجائز ہے کیونکہ اس نے اس کو غیر متبدل قدر کے طور پر تسلیم کر لیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے تو اس کو سوشل پرابلم تسلیم کیا اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ جوان لڑکا' جوان لڑکی اپنے طور پہ جس طریق سے بھی چاہیں' راضی ہوں' ٹھیک ہے' تم درمیان میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔ تم اس میں دخل انداز نہیں ہو سکتے۔ اُنہوں نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا۔

## عیسائیت کی بائبل میں سوائے ایک شق کے کہ تم عورت کو طلاق نہیں دے سکتے اور کوئی قانون ہی نہیں ہے اور سوسائٹی نے جنسی تعلقات کو باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا

ان کے ہاں مذہب Christianity (عیسائیت) ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت میں قانون نہیں ہے۔ وہ صرف مذہب ہے' اس میں عقائد ہیں۔ عیسائیت کی ساری بائبل میں صرف ایک قانون ہے اور وہ یہ کہ تم بیوی کو طلاق نہیں دے سکتے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس کے ہاتھوں وہ ایک عرصہ تک مصیبت میں مبتلا رہے اور اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ زنا کی شکل میں طلاق دی جا سکتی ہے یعنی جو عورت زنا کی مرتکب ہو' اسے طلاق دی جا سکتی ہے اور اس کے ساتھ اگلا قانون یہ ہے کہ مطلقہ عورت سے شادی نہیں کی جا سکتی۔

ساری بائبل میں صرف یہ ایک Law (قانون) ہے جو مدت ہوئی ٹوٹ چکا ہے' اس کے علاوہ عیسائیت میں تو کوئی قانون نہیں تھا اس لیے اس سوسائٹی کا یہ فیصلہ ہے کہ جس طرح کسی کا جی چاہے وہ کرلے۔ جس طرح جی چاہے Regulate کر دیا جائے یعنی جوان لڑکا اور لڑکی جس طرح سے بھی رضا مند ہوں' باہمی جنسی اختلاط کرلیں اور سوسائٹی اس کو قابلِ تسلیم قرار دے لے اور مذہب نے چونکہ اس قسم کی کوئی گرفت نہیں کی اس واسطے مذہبی طور پر ذہن میں اس کے خلاف کوئی شکوک نہ ابھریں۔ اب باقی مسئلہ اخلاق کا رہ جاتا ہے۔

برادرانِ عزیز! ان کے ہاں جتنے اخلاق تھے' وہ سوسائٹی کی قبولیت اور عدم قبولیت کے تھے یعنی جس چیز کو سوسائٹی نے معیوب قرار دیا ہے' وہ چیز Ethical (ضابطۂ اخلاق کی) ہوگئی' Moral (اخلاقی) ہوگئی اور جسے سوسائٹی نے کہا کہ یہ معیوب ہے' اسے اُنہوں نے Immoral (غیر اخلاقی) قرار دیدیا۔ روز سوسائٹی کے قانون بدلتے رہتے ہیں' روز Morality (اخلاقیات) کے Standard (معیار) بدلتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ سوسائٹی جس طرح جی چاہے' اس کو رائج کرلے اور اس کا کوئی اور اثر نہ ہو۔ اگر ہم ان کے اس معیار پر تنقید کریں تو وہ کہیں گے بھئی! تم مذہبی لوگ ہو' تمہارے ہاں چونکہ تمہارے مذہب نے اس چیز کو جرم اور گناہ اور عیب قرار دیا ہے' معیوب قرار دیا ہے' اس لیے تم تو مجبور ہو کہ تم اس آزادی کے خلاف آواز اٹھاؤ اور صرف اُس طریقے کو Defend (دفاع) کرو جو تمہارے ہاں رائج ہے اس لیے تم عقل وفکر کی رو سے' علم وبصیرت کی بنا پر' اس مسئلہ کو جانچ نہیں سکتے' تم اپنے مذہب کی رو سے پابند ہو' ہم نہیں ہیں۔

## مغربی سوسائٹی کی روش کو اپنانے میں ہماری پرانی نسل کا کردار اور پابندیوں کی فی نفسہٖ قدر ومنزلت

خود ہماری سوسائٹی کے اندر ان کی دیکھا دیکھی یہ روش عام ہوتی چلی جارہی ہے' یہ سیلاب اُمڈتا چلا آرہا ہے' یہ بے باکیاں عام ہو رہی ہیں۔ چونکہ ابھی ہماری پرانی نسلیں موجود ہیں' ان کی موجودگی میں ہماری سوسائٹی کا کچھ بین بین برزخ کا سا عالم ہے۔ یہ ہے جسے Transitory (عبوری) دور کہتے ہیں کہ جو پرانے لوگ ہیں' وہ اپنے ماضی سے بندھے ہوئے ہیں' کچھ ان کے عقائد بھی ہیں' وہ مذہب پرست بھی ہیں اور جو آنے والی نسل ہے وہ یورپ کی تقلید میں بالکل بیباک ہونا چاہتی ہے' ابھی بالکل بیباک نہیں ہوسکتی' تھوڑی سی رکاوٹ ان کے راستے میں یہ پرانے لوگ ہیں۔ یہ اٹھتے چلے جائیں گے تو اگلی نسلیں آپ دیکھیں گے کہ بالکل اسی رنگ میں رنگی ہوئی آگے چلی جائیں گی۔ اس لیے میرے مخاطب مغرب کے لوگ نہیں ہیں' میرے مخاطب یہاں کے لوگ اور بالخصوص نوجوان طبقہ ہے' جنہیں یہ بات سمجھانی ہے کہ چونکہ مذہب نے اس چیز کو ناجائز قرار دیا ہے اور یہ پابندیاں ضروری قرار دی ہیں اس لیے ہم تمہیں روکتے ہیں یا فی الواقع ان کے اندر کوئی نقصان ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔

## ہماری آئندہ آنے والی نسل کی سوچ کا معیار اور قرآنِ حکیم کا دعویٰ

عزیزانِ من! ہماری جو اگلی نسل ہے وہ ہماری بات کو سند تسلیم نہیں کرتی ۔اس نسل کے نوجوانوں کی سند مغرب والوں کی تحقیق ہے۔ میں اس تھوڑے سے وقت میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خود اہلِ مغرب کی تحقیق کیا کہتی ہے۔کیا وہ کہتی ہے کہ جنسی تعلقات کے اوپر کوئی مستقل پابندیاں عائد ہونی چاہئیں یا ان کو محض ایک طبعی یا فطری جذبے کی تسکین کا ذریعہ قرار دے کر اس کے متعلق یہ ہونا چاہیے کہ جیسے جی چاہے تم کرتے رہو؟ اس باب میں خود ان لوگوں کی تحقیق کیا ہے؟ کیا اس تعلق کا اثر صرف Sex (جنس) پر ہی پڑتا ہے یا سیکس کے متعلق جو پابندیاں یا آزادیاں ہیں' ان کا اثر قوم کی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی پڑتا ہے؟ قرآن مجید نے جہاں جہاں یہ ذکر کیا ہے' جب میں اس موضوع پہ آؤنگا تو عرض کرونگا کہ اس نے محض پابندی عائد کرکے ڈکٹیٹر کی طرح حکم نہیں دیدیا' وہ تو کتاب کے ساتھ حکمت کہتا ہے۔اس نے کہا تھا کہ یلق اثامًا (25:68) اگر تم یہ پابندیاں Loose (ڈھیلی) کردو گے' کھول دو گے تو یاد رکھو! تمہاری قومی توانائیوں کے اندر اضمحلال پیدا ہوجائے گا' آہستہ آہستہ وہ کم ہوتی چلی جائیں گی' کمزور ہوتی چلی جائیں گی تا آنکہ اس کے بعد پھر تباہی آجائے گی۔سوال یہ ہے کہ قرآن حمید کا یہ جو دعویٰ ہے' کیا مغرب کے اسکالرز اور سائنسدانوں نے جو اس چیز کو بطور عقیدہ مانتے تھے' خالص Scientific Basis (سائنسی بنیاد) پر آزادانہ تحقیق کی ہے کہ دیکھیں ہماری تحقیق ہمیں کس نتیجے پہ پہنچاتی ہے' کیا وہ قرآنِ حکیم کے اس دعویٰ کو ثابت کرتی ہے کہ اس کا قوموں کی تمدنی زندگی پر اثر ہوتا ہے؟ دیکھیے کہ ان کی تحقیق انہیں کس نتیجے پہ پہنچاتی ہے؟

## جنسیات کے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کے اسکالر جے ڈی انون کی ریسرچ کا نمونہ (Sample)

ہمارے ہاں تو جنسیات کے متعلق ابھی کوئی لٹریچر ہی نہیں' یورپ سے جنسی بدنہادی کے متعلق جو آیا ہے وہ ایک سیلاب کی طرح چلا آرہا ہے لیکن سائنٹفک طریقے پہ جنسیات کے متعلق جو تحقیقات وہاں ہوئی ہیں' ان کا وہ لٹریچر ہمارے ہاں بہت کم آیا ہے۔ہمارے ہاں تو جنسیات کے متعلق گفتگو ہی نہیں کی جاسکتی۔اسے شجرِ ممنوعہ قرار دیا جاتا ہے لیکن وہاں سے جو کتابیں آئی ہیں' ان میں ایک کتاب ایسی تھی جسے میں نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مفید اور جامع پایا۔میں اس کے متعلق لکھ بھی چکا ہوں اور یہ موضوع ایسا ہے کہ بار بار اس کے متعلق لکھنا بھی چاہیے' کہنا بھی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ جنسی بدنہادی کا قوموں کی تمدنی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کا ایک بہت بڑا اسکالر ہے' جے ڈی انون (J.D.Unwin) اس کا نام ہے۔اس نے اسے اپنا ایک خاص موضوع بنایا اور اپنے رفیقوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر یہ لوگ ایسے قدیمی قبائل کی ریسرچ کرتے ہیں جن پہ ابھی تہذیب کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ Original (اصلی) Natural (فطری) شکل میں ہوتے ہیں' فطرتی زندگی بسر کرتے ہیں' ان

کے اوپر ابھی کسی قسم کے عقائد کا' کسی قسم کی تہذیب وتمدن کا اثر نہیں ہوتا' تحقیق کی خاطر یہ پہلے ان قبائل میں جا کر وہاں تحقیق کرتے ہیں۔اس شخص نے یا اس جماعت نے' ساری دنیا میں پھیلے ہوئے' اَسی (80) Primitive (قدیمی) قبائل میں جا کر' خود ان کے اندر رہ کر' اس ایشو پر تحقیق کی کہ ''جنسی پابندیوں کا کیا اثر ہوتا ہے اور جنسی آزادیوں کا کیا اثر ہوتا ہے''۔ان اَسی قبائل میں سے کوئی قطبِ شمالی میں تھا تو کوئی افریقہ کے صحراؤں میں' کوئی آسٹریلیا میں تھا تو کوئی جنوبی امریکا میں۔اس کے بعد انہوں نے سولہ مہذب اقوام کا مطالعہ کیا۔کیا بات ہے ان لوگوں کی تحقیق کی! تحقیق کے لیے یہ جس چیز کے پیچھے پڑتے ہیں تو اسے اپنے حالات اور ذہنی سطح کے مطابق ایک انجام تک لے جاتے ہیں۔اس جے۔ڈی۔انون نے بھی ایک عمر صرف کردی ہوگی۔اور پھر اپنی اس تحقیق کے ماحصل کو اپنی کتاب [1]"Sex & Culture" (جنس اور تمدن) میں منضبط کیا۔یہ اس موضوع پر ایک بڑی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

## انسانوں کی تمدنی زندگی پر جنسیاتی ضوابط کے تین پشتوں میں اثرات

اس شخص (ڈاکٹر اَن وِن) نے' کتاب کے شروع میں' پہلے فقرہ میں' وہ کلیہ' جو اس کے سامنے مصدقہ حالت میں ہے' ان الفاظ میں بیان کیا کہ ''کوئی گروہ' کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو' اس کی تمدنی سطح کا انحصار (میں نے اس میں کلچر کا ترجمہ تمدن کیا ہے' سوشیالوجی نہیں کیا) صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے''۔آپ اس کے اِس کلیہ کا اندازہ لگائیے! اس نے اَسی (80) غیر مہذب اقوام اور سولہ (16) مہذب اقوام اپنی اس تحقیق کے لیے منتخب کیں۔اس نے جس طرح ان کا انتخاب کیا' اس میں ساری دنیا آجاتی ہے۔یہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر بات نہیں کر رہا' ان کے اندر رہ کر' ان کے اطوار واخلاق وکردار وگفتار دیکھنے کے بعد' ریسرچ کے بعد' وہ اس نتیجہ پہ پہنچ رہا ہے۔اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی' تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی' جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا''۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کی اہمیت کتنی ہے! قرآن حمید کی یہ تاکید ہمارے سامنے ہوتی تو یہ مان رہے ہوتے کہ ٹھیک ہے جی! سوسائٹی یا معاشرے کا' ایک مسئلہ ہے' اس نے یہ تاکید کی ہے۔آپ دیکھیے کہ یہ شخص تحقیق کرتا چلا جاتا ہے۔

وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں' یعنی قریب سو سال' میں جا کر نمودار ہوتے ہیں۔وہ جو قرآن حمید کا قانونِ امہال ہے' جسے وہ مہلت کا وقفہ کہتا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ Gradually (بتدریج) پہلے جوان کا ضابطہ ہوتا ہے' اس کے اثرات مٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ جو بدنہادیاں اور بے باکیاں آتی ہیں' ان کے اثرات مرتب ہونے شروع

---

❶ Unwin, J.D.(1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press (Humphrey Milford).

ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت زیادہ سے زیادہ سو سال تک اس قوم کو زندہ رہنے دیتی ہے۔ اس کے بعد اس کے اثرات نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اس نے ان تمام قبائل اور اقوام کا' جو مطالعہ و مشاہدہ کیا' اس کے بعد جس نتیجہ پہ وہ پہنچا اس کا نچوڑ خود ہی اس کتاب میں تین شقوں کے اندر لکھ دیا۔

وہ کہتا ہے کہ ہم جس نتیجے پہ پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ (1) جس گروہ یا قوم نے شادی سے پہلے کنوارپن (Pre-Nuptial) کے زمانے میں' جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی' وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھی۔ یاد رکھیے! یہ صرف لڑکیوں کے متعلق نہیں ہے۔ وہ جنسی اختلاط کہہ رہا ہے۔ اس نے مرد اور عورت دونوں کے متعلق یہ لکھا ہے۔ (2) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں' وہ تمدنی سطح کے درمیانے درجے پہ تھے اور (3) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (Chastity) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ آپ غور فرمائیے کہ قرآن حمید کی جو تاکید ہے اور اس پہ جو حدود عائد کی ہوئی ہیں' اس کی اُس حکمت کو کون بیان کر رہا ہے اور کس انداز میں یہ حکمت بیان ہو رہی ہے! آگے چلیے۔

## جنسیاتی قواعد کی پابندی سے قوتِ فکر و عمل میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس نتیجہ رومیوں کی مضمحل حالت میں تاریخ میں درج ہے

ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ اَن وِن بتاتا ہے کہ یہ جو جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کی جاتی ہیں' ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ جس قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں اسے اور کیا چاہیے۔ اس کے برعکس جو قوم اپنے مرد اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں' اس میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ رومیوں نے ایسا ہی کیا' وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پاس کسی اور کام کرنے کے لیے توانائی باقی نہ رہی۔ خود فرائیڈ (Freud: 1856-1939A.D.) نے' جس کے متعلق ہمارے ذہنوں میں یہ ہے کہ وہ گویا جنسی بدنہادی کا امام ہے' اس کے متعلق یہ گمان غلط ہے' اس نے بھی یہی کہا کہ اگر اس پر کنٹرول کیا جائے' تو اتنی توانائیاں اور قوتیں بڑھ جاتی ہیں کہ ان کو پھر فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ فرائیڈ نے دیا ہے کہ اس قسم کی زائد قوت کو' کسی دوسری طرف کر دینا ہے' اس کا دھارا موڑ دینا ہے' تاکہ وہ دوسرے شعبوں کے اندر سُود مند کام کر سکے۔ اسے وہ Sublimation (عملِ تصعید) کہتا ہے۔ ڈاکٹر انون نے بھی یہ چیز اپنی تحقیقات کے بعد کہی اور وہ اس نتیجے پہ

پہنچا ہے کہ ہم نے یہ چیزیں اس طرح سے پَرکھیں۔

## ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ انون کے نزدیک اسلام قبول کرنے سے پہلے اور اس کے بعد عربوں کی حالت

اس نے اپنی کتاب Sex and Culture میں ضمناً مسلمانوں کا بھی ذکر کیا ہے' عربوں کا ذکر کیا ہے اور ان خصوصیات کا بھی ذکر کیا جو اسلام لانے کے بعد' انہی عربوں کے اندر پیدا ہوئی ہیں' اس نے کہا کہ اس وجہ سے وہ ایران اور روما جیسی سلطنتوں پر چھا گئے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ میں زندگی کے دیگر شعبوں کا طالبعلم نہیں ہوں' میں انہیں تو Touch (مَس) نہیں کرتا' میں صرف اپنے شعبے کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عربوں کے ہاں اسلام سے پہلے کی جو زندگی تھی' اس میں جنسی اختلاط کی آزادیاں بہت زیادہ تھیں' اگرچہ طریقے وہ تھے جو سوسائٹی نے اپنے ہاں مقبول قرار دیئے تھے لیکن بہر حال وہ جنسی اختلاط کی بیبا کانہ آزادیاں ہی تھیں۔ لیکن قبولِ اسلام کے بعد ان میں جو خصوصیات پیدا ہوئیں انہوں نے ایران اور روم کی اقوام کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ ان جنسی پابندیوں کو عائد کرنے اور نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ صاحب! نکاح کر کے پھر اُسے جائز قرار دیدیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس خودفریبی سے کام نہیں چلتا۔ اسلام کی سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نے ان کی جنسی آزادیوں پر پابندی عائد کردی۔ ان کے دائیں اور بائیں ایرانی اور رومن دو قومیں تھیں' جن کے ہاں یہ آزادیاں اور بدنہادیاں چلی آ رہی تھیں' انہوں نے اپنے ہاں کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ دیگر عناصر کے علاوہ' اسلام لانے کے بعد جنسی آزادیوں پہ پابندیاں لگانا عربوں کی بنیادی خاصیت تھی جس کی وجہ سے یہ اُن قوموں کے اوپر چھا گئے اور جب تک ان میں یہ صِفت رہی' دنیا کا کوئی تمدن ان کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ پھر جب یہ چیز ختم ہوئی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

## ایک دوسری کیفیت کا نتیجہ: جنسی تسکین کے مواقع اور نرالے انداز

برادرانِ عزیز! اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے لیے یہ Opportunities (مواقع) کی ایک اگلی Term (اصطلاح) ہے۔ یہ محقق کس طرح بات کو صاف کر جاتے ہیں! اس نے کہا ہے کہ میں اس پہ گفتگو نہیں کرونگا کہ کتنی شادیاں جائز ہیں' کتنی لونڈیاں رکھتے ہو' کیا صورت پیدا کرتے ہو۔ میں اس پہ بات کروں گا کہ آپ کو جنسی خواہش کی تسکین کے کتنے مواقع نصیب ہوتے ہیں؟ یہ بات اہم ہے۔ ان مواقع کے اوپر اس چیز کا دارومدار ہے اور کم از کم مواقع کی شکل یہ ہے کہ 'ایک بیوی اور ایک میاں' عمر بھر کے لیے ایک ہونے اور رہنے کا عہد کریں۔ اس نے مواقع (Opportunities) کہہ کر بڑی عجیب بات کہی ہے۔ اب ہماری یہ منطق کہ صاحب! چار تک بیویاں وہ ہیں جسے ہم جائز کہتے ہیں اور اس کے بعد بیشمار لونڈیاں ہیں۔ اس نے ایک واقعہ بتایا کہ آیا یہ جو چیز جو میں نے کہا کہ ایک

وقت میں ایک بیوی ہو' اسے کس طرح Abuse (غلط اور بُرے کام میں استعمال) کیا جاتا ہے۔جس قوم میں اس قسم کے قوانین یا معاشرے کے ضوابط آ جائیں' وہ اپنی جنسی تسکین کے کیسے مواقع پیدا کرتے ہیں۔اس نے اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ ہم نے ایک کردیکھا' ساری عمر اس کی ایک بیوی رہی لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے قریباً چالیس مرتبہ طلاق دے دے کر اور بیویاں بدلی تھیں۔یہ پابندی جو وہ کہتا ہے کہ بنیادی پابندی ہے کہ ایک بیوی' ایک میاں ہو' عہد کرلیں کہ ہم زندگی اس طرح سے نبھائیں گے۔وہ کہتا ہے کہ یہ بہترین شکل ہے۔

## جنسی تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرنے والی قوم راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے تقلید پرست ہوجاتی ہے

عزیزانِ من! جب کسی قوم کی سوسائٹی خواہ چار چار بیویوں اور بے شمار لونڈیوں کو جائز قرار دیدے یا اس کے مذہبی عقائد انہیں جائز قرار دیدیں تو وہ اس جائز وناجائز کے موضوع کو Touch (مَس) نہیں کرتا۔وہ کہتا یہ ہے کہ مجھے اس سے واسطہ نہیں' میں تو ایک سائنٹسٹ ہوں' مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ کوئی سوسائٹی جنسی مواقع کی جتنی زیادہ گنجائش نکالتی چلی جائے یا کوئی قوم جب اس قسم کی معاشرت اختیار کرلے اور اسے جائز کرلے تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ''اس قوم میں علم وبصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی''۔اور یہی قرآن حکیم کہتا ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (7:179) صلاحیت ہوتی ہے' رہنمائی حاصل نہیں کرتی۔''وہ واقعات کے اسباب وعلل (Causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔جو کچھ ہوتا ہے اُسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے''۔آپ غور کیجیے کہ یہ کس قوم کی داستان بیان کررہا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ''زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ اسلاف سے اسلاف تک چلتے چلے جاتے ہیں)'' تقلید کے بندھنوں میں جکڑے جانے سے ہوتا رہے گا: نہ کھڑے ہوکر Causes یعنی اسباب وعلل پہ غور کرنا' نہ عقل وفکر کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ان سے کام لینا' یہ ہوتا ہے ان کا وتیرہ۔

## یہ قوم آخر کار اسباب وعلل پرغور کرنے کی بجائے کرامات میں الجھ کر زندہ بدست مردہ بن جاتی ہے

عزیزانِ من! ڈاکٹر اَن وِن کہتا ہے کہ ''وہ اُس ہر غیر معمولی واقعہ کو' جو ان کی سمجھ میں نہ آئے' کسی عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کردیتے ہیں'' اور پھر اُسے کرامات قرار دیدیتے ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ بات جنسی آزادیوں کی ہورہی ہے اور نتائج اس قوم کے کیا مرتب ہو رہے ہیں۔اور پھر وہ کہتا ہے کہ ''اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں

اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے'' اور اس کی پرستش جاری رکھتے ہیں۔ یہ ہیں جنسی آزادیوں کے اثرات۔ بتائیے آپ اپنے ہاں کمیشن۔ اب انکوائریوں کی ضرورت کیا ہے! 'صورت ببیں حالش مپرس' (صورت دیکھ لو حال پوچھنے کی ضرورت نہیں)۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس بیسویں صدی میں اتنی توہم پرستیاں ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ وہ پتھروں کو محیر العقول قوتوں کے حامل سمجھتے ہیں اور آگے کہا کہ چونے' مٹی اور اینٹ کی ان قبروں کو وہ جو کچھ سمجھتے ہیں' پتھروں کو جو کچھ سمجھتے ہیں' پتھروں پہ جو نشان لگے ہوتے ہیں انہیں جو کچھ وہ سمجھتے ہیں' درختوں کو جو کچھ وہ سمجھتے ہیں' مزاروں کے اوپر لگی ہوئی جالیوں کو جو کچھ وہ سمجھتے ہیں' مُردوں کو جو کچھ وہ سمجھتے ہیں' یہ ایک ایک چیز کہتا چلا جاتا ہے' اور ان کی تفصیل بتاتا چلا جاتا ہے کہ یہ زندہ بدست مردہ بنے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ کس کا اثر ہے؟ اور پھر جواباً خود ہی کہتا ہے کہ یہ وہ ہیں جو اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے طریقے جائز قرار دے لیتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر' نیاز' گنڈہ تعویذ' اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوموں سے ظہور میں آتی ہیں۔ یہ پتہ نہیں کہ اس نے مسلمانوں کی تحقیق Primitive (قدیمی) قبائل میں رہ کر کی یا مہذب اقوام میں رہ کر کی تھی۔ بہرحال اس نے تو ساری دنیا کی اقوام کا محاسبہ کیا تھا۔

## زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا ہے لیکن حالات کا امتداد ان پر اثر انداز نہیں ہوتا' اس لیے کہ ان کے ہاں وحدتِ زواج کا اصول ہے

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''اس قسم کے معتقدات' اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرے میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بالکل حیوان ہوتے [1] ہیں''۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179)۔ یہ قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ کیے چلے جا رہا ہے صاحب! یہ ہوتا ہے اثر' عزیزانِ من! جنسی اختلاط کی پابندیوں میں ڈھیل دینے کا اور پابندیوں میں ڈھیل کے معنی ہیں ''زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانا''۔ میں پھر عرض کر دوں کہ اس کے نزدیک یہ بات نہیں ہے کہ آپ کی سوسائٹی نے یا آپ کے اعتقادات نے ان مواقع کے متعلق کہہ دیا ہے کہ صاحب!

---

❶ واوین میں دی گئی یہ تمام عبارت ڈاکٹر جے۔ڈی اَنوِن کی کتاب Sex and Culture (صفحات 345 تا 346) کا اردو رواں ترجمہ ہے جو دیا گیا ہے۔

اب یہ جائز ہو گیا۔ پابندی کی ایک ہی شکل ہے اور یہ وہی Monogamy (وحدتِ زوج) کی صورت میں ہے کہ انہوں نے ایک میاں، ایک بیوی کا عہد استوار کیا ہوا ہو۔

## کسی قوم کو ہر دور میں مقام عروج پر رہنے کے لیے جنسی اختلاط کو کم از کم حد تک محدود رکھنا ہوتا ہے

اس کے بعد اس کتاب کے آخر میں وہ جو کہتا ہے، پڑھنے والے تو اس کے اصل الفاظ ہیں لیکن بہر حال اس کا ترجمہ یہ ہے ''اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے''۔ کیا بات ہے! کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کیا کرے؟ سنیے عزیزانِ من! ''یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم از کم حد تک محدود رہیں''۔ مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حقوق دیں۔

## مساوات کی خاطر مرد اور عورت کے لیے بالمعروف کا حکم ہے اور ڈاکٹر انوِن کی آزادانہ تحقیق

قرآن کریم نے جہاں بالمعروف کہا ہے تو بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ جب یہ لوگ اس پہ زور دیتے ہیں کہ بات تو اتنی تھی جہاں اس نے یہ کہا ہے کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2:228) مساوی حقوق اور مساوی ذمہ داریاں عورتوں کی بھی اتنی ہیں جتنی مردوں کی ہیں۔ عام طور پہ ذہن میں نہیں آتا تھا کہ قرآن کریم یہ بالمعروف کی قید کیا لگا رہا ہے۔ ڈاکٹر انوِن کہتا ہے کہ یہ محض ذہنی اور اعتقادی مساوات نہیں ہے، یہ جو قانوناً مساوات ہے تمہیں اس کی ضمانت دینی ہوگی۔ اس چیز کو قرآن کریم بالمعروف کہتا ہے، ورنہ ہمارے ہاں یہ ذہنی اور اعتقادی مساوات تو آپ ہر محراب و منبر سے سنتے ہیں کہ اسلام نے جتنے حقوق عورت کو دیئے ہیں دنیا کا کوئی معاشرہ، کوئی تمدن، ایسے حقوق نہیں دے سکتا صاحب! آپ کے ہاں جو انسانی مساوات ہے، وہ اسلام میں آ کر انسانوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ ٹھیک ہے جی! مسجد میں تو ایک صف میں کھڑے ہو گئے لیکن عملی طور پر یہ ہے کہ ''اوایاز نال ایس واسطے جاندا سی، پئی اے محمود دی جوتی چک کے نال لے آوے باہر'' (وہ ایاز اس لیے ساتھ جاتا تھا تاکہ محمود کا جوتا اٹھا کر باہر لے آئے)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ آپ اس کے متعلق شاعری کرتے رہیں، قانوناً آپ کو یہ چیز دینی پڑے گی تاکہ دونوں کو معلوم ہو کہ میرا مقام کیا ہے اور پھر اپنے معاشرے میں یہ تبدیلی پیدا کرے، ہمیشہ کے لیے نہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک مدت کے لیے یہ اطمینان ہو کہ یہ جنسی اختلاط کے مواقع ایک میاں ایک بیوی کے درمیان قائم رہیں گے۔ آگے کہا ہے کہ ''اس طرح اس معاشرے کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا، اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل

ہونگی' وہ تمدن اور تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی چلی جائیں گے جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا[1]'' یہاں وہ اپنی اس کتاب کا خاتمہ کرتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے جو عصمت کی حفاظت پہ اتنا زیادہ زور دیا تھا' وہ محض یہ نہیں تھا کہ ایک معاشرے کے اندر وہ کچھ پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا تا کہ معاشرے کی وہ جو بندھنیں ہیں' وہ Loose (ڈھیلی) نہ ہوجائیں بلکہ اس لیے تھا کہ اس کا اثر قوموں کی موت اور حیات پر جا کر پڑتا ہے' ان کے عروج وزوال پر پڑتا ہے' ان کی تمدن اور جہالت کی زندگی پہ اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ کتنا بنیادی ہے! یہ کسی مذہب پرست کا لکھا ہوا نہیں ہے' یہ قرآن حمید پر ایمان لانے والے کا لکھا ہوا نہیں ہے' یہ ہماری اپنی بات بھی نہیں ہے' وہ تو بالکل غیر ہے' اُس نے آزادانہ تحقیق کی ہے اور یہ کوئی Solitary Instance (یک وتنہا مثال) نہیں ہے' جو میں نے عرض کیا ہے' یہ ایسا نہیں کہ یہ ایک ہی کتاب ہے' اس قسم کی بہت سی تحقیقات ہوئی ہیں' میں نے اسے اس لیے پیش کیا ہے کہ یہ بڑی جامع تحقیق ہے جو اس شخص نے کی ہے۔

## قرآنِ حکیم کی رُو سے بے حیائی کی حرکات کا ارتکاب' چار گواہوں کا ماجرا اور ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی پیدا کردہ الجھن

عزیزانِ من! اب قرآنِ کریم کی طرف' سورۃ النسآء کی 15 ویں آیت پر آیئے' جہاں سے آج درس کا آغاز ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم جسے زنا کہتا ہے' وہ تو جنسی اختلاط کی عملی شکل ہوتی ہے۔ اس سے تو بڑی شدت سے روکتا ہے۔ اس کی سزا بھی اس نے خود مقرر کر دی ہے۔ مرد اور عورت دونوں کی ایک ہی سزا (24:2) میں دی ہے۔ یہ جو آیت ہے' اس میں کہا ہے کہ **وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا** (4:15)۔ یہاں میں پھر یہ عرض کرونگا کہ ہماری فقہ والوں نے جو ایک بنیادی غلطی کی' اس کی وجہ سے اس آیت کا مفہوم بھی سامنے نہیں آیا اور پھر ان میں اتنی الجھنیں پیدا ہوئیں۔ خدا کے کلام میں تو انسانی ذہن کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو اس سے اتنے الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں کہ پھر اس سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ میں پہلے یہ عرض کروں کہ آیت میں کہا کیا گیا ہے۔

اس آیت (4:15) میں کہا یہ ہے کہ ''اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہے تو ان کے خلاف اپنے چار گواہ لاؤ اور پھر اگر گواہی کے بعد یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اِن عورتوں کو باہر

---

[1] Unwin, J.D.(1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press (Humphrey Milford).

آنے جانے سے روک دو' ان کی آزادی کو سلب کرلو' ان کو گھروں میں روکے رکھو' تا آنکہ انہیں موت آجائے یا خدا کا قانون اُن کے لیے ایسی صورت پیدا کردے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رُک جائیں۔۔۔مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہیں ہیں تو اُن کی شادی ہوجائے''۔اب ہماری فقہ نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد زنا کا ارتکاب ہے اور اس کے بعد آپ دیکھیے کہ پھر کس قسم کی پیچیدگیوں میں الجھ گئے: یہ کہ اس کے لیے چار عینی گواہ چاہئیں' زنا کے فعل کے ارتکاب کے چار عینی گواہ' کیا کہیں یہ ممکن بھی ہے؟ جب پوچھا گیا کہ صاحب! یہ تو ممکن ہی نہیں تو کہا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ اس کا روکنا چونکہ بہت مشکل ہے اس لیے بس کچھ ایسی شکل پیدا کی ہے کہ جرم کا جرم بھی رکھا جائے اور ثابت بھی نہ ہو۔

عزیزانِ من! سنیے۔''مولوی صاحب پُل صراط دی تعریف کردے سن پئے کہ دوزخ دے اتوں دی اوپل ہووے گا' وال نالوں باریک ہووے گا' تلوار نالوں تیز ہووے گا' جیہڑا پیر رکھے گا او کٹ کے جہنم دے وچ جا گرے گا' ایس طراں نال لنگھا کے جنت اچ اوہنوں پہنچایا جائے گا۔میراثی بیٹھا ہویا سی' کہن لگا: نہ جان دین دے بہانے ہیگے نیں' سیدھی کہو جنت اچ میں کسے نوں جان نئیں دینا''(ایک مولوی صاحب پل صراط کی تعریف کررہے تھے کہ وہ دوزخ کے اوپر ایک پُل ہوگا۔وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا اور تلوار سے زیادہ تیز۔جو بھی اس پر اپنا پاؤں رکھے گا' وہ کٹ کر جہنم میں جا گرے گا۔اس طرح سے اس پُل پر سے گزار کر' اسے جنت میں پہنچایا جائے گا۔قریب ہی ایک میراثی بیٹھا ہوا تھا' کہنے لگا کہ یہ سب نہ جانے دینے کے بہانے ہیں۔سیدھی بات کہو کہ جنت میں کسی کو بھی نہیں جانے دینا ہے)۔ان اہلِ فقہ کے ہاں بھی یہی چیز ہے۔ایک کے ہاں وہ ہے کہ تم دوسری اس صورت میں لاؤ کہ جب تم عدل کرسکو اور دوسری جگہ ہے کہ صاحب! تم عدل کر نہیں سکو گے۔''کہن لگے دیکھو نا اللہ میاں نے کس طرح جھُل دتا اے'' (کہنے لگے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے کس طرح جُل دیا ہے!) ایک جگہ تو تمہیں اجازت دیدی کہ دوسری شادی کرلو بشرطیکہ تم عدل کرسکو اور تم خوش ہوگئے کہ اجازت ہوگئی' مگر دوسری جگہ کہا ہے کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے۔یہ خدا کے کلام سے مذاق ہے' عزیزانِ من! اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہے جو ہم بھگت رہے ہیں۔

یہاں بھی یہ صورت پیدا کی کہ صاحب! چار عینی شاہد ہوں۔اور میں نے عرض کیا ہے کہ میں کبھی فقہ کی بات نہیں کرتا۔اگر میں اس کے متعلق آپ کو فقہی جزئیات بتاؤں کہ یہ جو چار عینی شاہد کہتے ہیں' میں وہ بتا نہیں سکتا' آپ سن نہیں سکتے' بہنیں اور بیٹیاں نہیں' شریف مرد بھی یہ نہیں سن سکتے۔بہرحال آپ یہ دیکھ لیجیے کہ اگر یہ قانون آپ کے ہاں نافذ ہو تو سوچ لیجیے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔پھر اس کے بعد جب چار عینی گواہوں سے یہ ثابت ہوجائے' قرآن کریم نے خود (24:2) میں کہا ہے کہ زنا کی سزا متعین طور پر سو کوڑے ہیں مگر یہاں (4:15) میں لکھا ہوا ہے کہ ان کو گھروں میں روک دو' ان کی آزادی پہ پابندی عائد کردو۔کہا گیا ہے کہ صاحب! قرآن کریم تو

سوکوڑے کہتا ہے اور یہاں صرف ان کی آزادی روک دو‘ ان کو گھروں میں بند کردو‘ تو یہ کیا ہوا؟ دیکھا آپ نے کہ ایک بات اپنی طرف سے ملائی اور قدم قدم پہ الجھنیں پیدا ہوئیں‘ بات سمجھ میں نہ آئی‘ تو کہا کہ وہ آیت منسوخ ہوگئی۔ چلیے صاحب! آیت ہی منسوخ ہوگئی۔ ایک ہی خدا کی طرف سے‘ ایک ہی قرآن حکیم میں‘ قیامت تک کے لیئے‘ یہ رکھا گیا ہے کہ یہ غیر متبدل محفوظ کتاب ہے مگر بقول ان کے یہ منسوخ ہی ہوگیا۔

برادرانِ عزیز! بات صاف ہے کہ یہ جو زنا کا‘ یہ جو جنسی اختلاط کا‘ Actual (واقعی) عمل ہوتا ہے‘ وہ تو آخری درجہ ہوتا ہے۔ اس سے بہت پہلے یہ بے حیائی کی چیزیں شروع ہوجاتی ہیں۔ قرآن مجید تو ایسی ہدایات اور راہنمائیاں دیتا ہے کہ وہ انتہا تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ تاکید کرتا ہے کہ باہر نکلو تو اپنی نگاہوں کو بیباک مت ہونے دو۔ دیکھتے ہیں وہ کہاں سے بات شروع کرتا ہے؟ عورتوں سے کہا کہ جب غیر مردوں سے بات کرنی ہو تو تمہاری آواز میں ایسا لوچ نہ پیدا ہوجائے جو دوسرے کے دل میں کسی قسم کی کوئی ایسی چیز پیدا کردے۔ دیکھتے ہیں آپ کہ قرآن حمید معاشرے میں پہلے سے کتنی پابندیاں عائد کرتا چلا جاتا ہے کہ باہر نکلو تو اپنی زینت کی چیزوں کی نمود اس طرح سے نہ کرو کہ دیکھنے والوں کے سینے کے اندر ”جس طراں مدھانی رڑھکی جاندی اے ایہ کیفیت نہ پیدا ہوجائے“ (یہ کیفیت نہ پیدا ہونے پائے جس طرح کہ مدھانی دودھ رڑھکتی ہے) یہ قرآن حمید کا تبرج لفظ ہے‘ کوئی ایسی چیز دونوں میں مرد اور عورت میں نہ ہو‘ جو ایک دوسرے کے‘ ان جذبات کے ابھار اور اشتعال کا موجب بن جائے۔ حتیٰ کہ کہا یہ ہے کہ تم چلو اور پاؤں میں اگر ایسی جھانجر ہے‘ ایسا زیور ہے‘ جس کی آواز آسکتی ہے‘ تو پاؤں ایسے زور سے نہ مارو کہ ان کی آواز اس طرح سے باہر نکلے۔ یاد رکھو! یہ عورتوں کے لیے غلافوں میں چھپا کے‘ صندوق میں تالا لگا کے‘ اندر بند کرکے‘ رکھنے کی بات نہیں ہے۔ یہ قرآن حکیم کے ”پردے (Veil)“ کی بات نہیں ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں‘ حرکات ہیں‘ انداز ہیں‘ روش ہے‘ قرآن حکیم ان کے اوپر پابندیاں عائد کرتا چلا جاتا ہے تاکہ اختلاط کا وہ آخری درجہ آنے ہی نہ پائے۔

## شادی سے پہلے تو دنیا کی ہر عورت تمہاری بہن ہے اور پھر دوسری شادی اور اداؤں کی کیفیات کا معاملہ

یہ تمام چیزیں کس لیے ہیں؟ اس لیے کہ یہ چیزیں رفتہ رفتہ‘ آہستہ آہستہ‘ جذبات میں اشتعال پیدا کرتی ہیں‘ سوائے ایک سراسر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے شخص کے کہ جو فوری طور پر اس فعل کے ارتکاب کے لیے تیار ہوجاتا ہے‘ اس کے لیے بہت پہلے سے یہ غلط خیالات اس ذہن کو متنفر کرتے ہیں۔ اور خیال کی روک کا تو قرآن کریم نے بہت خوب انتظام کیا ہے۔ عزیزانِ من! جب تک انسان شادی کے بندھن میں نہیں بندھتا‘ اس وقت تک دنیا بھر کی لڑکیاں آپ کے نزدیک بہنوں کی طرح ہیں‘ جب اس نے کہا ہے کہ

تمام مومن بھائی ہیں تو تمام مومن عورتیں بھی تو بہنیں ہیں۔

''جب ایک عورت سے شادی ہوتی ہے تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کی موجودگی میں' (بجز ان استثنائی حالات کے) جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں جنہیں آپ کا معاشرہ اس زمانے کی ہنگامی ضرورت کو پوری کرنے کے لیے طے کرے گا'' ایک بیوی کی موجودگی میں' باہر کی کوئی عورت آپ کی بیوی بننے کی حقدار نہیں رہی۔ ذہن پر خود بخود ایک پابندی عائد ہو جاتی ہے' اسی طرح عورت کے اوپر بیوی بننے کے بعد یہ پابندی عائد ہوگی۔ اور ہر عورت شادی شدہ مرد کے نکاح میں جانے کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں آج کی بات نہیں کر رہا' قرآن حکیم کی بات کر رہا ہوں۔ اسکے برعکس آپ ذہن میں یہ بات رکھیے کہ ایک بیوی کے بعد جو آپ کو پسند آئے' اُسے آپ بیوی بنا سکتے ہیں اور یا باہر کی عورتوں کو یہ معلوم ہو کہ ہم میں سے جو بھی پسند کی جائے' یہ اس مرد کے نکاح میں جا سکتی ہے' عملی طور پہ نہیں تو ذہنی طور پر تو ہر وقت آپ زنا کے اندر مبتلا ہوتے ہیں۔ عملی کیفیت تو باہر کی ایک محسوس شکل کا نام ہے۔ یہ چیز تو بہت پہلے انسان کے جذبات میں آنی شروع ہو جاتی ہے اور قرآن حمید تو ان چیزوں کے اوپر کنٹرول کرتا ہے تا کہ بات اور معاملہ وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔ یہاں جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ (4:15) اگر تمہاری عورتوں میں' کسی سے بے حیائی کی حرکت سرزد ہو جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہو تو یہ وہ ابتدائی چیزیں ہیں۔

نہ تنہا عشق از گفتار خیزد

بسو ایں آتش از رفتار خیزد

کہتا ہے بات کرنا تو ایک طرف' یہ تو جذبات کی وہ آگ ہے کہ اسے ذرا رفتار سے بیباک کر دیجیے فوراً پتا چل جاتا ہے۔

من اندازِ قد آور می شناسم

''برقعہ لے کے نکلی ایں تاں کی ہو گیا' سانوں تے تر دیاں پتہ لگ جاندا ہیگا'' (اگر برقعہ پہن کر نکلتی ہو تو پھر کیا ہوا۔ ہمیں تو چال سے ہی معلوم ہو جاتا ہے)۔ اندازہ لگائیے یہ ہے آپ کے ہاں کی چیز' وہ تو چھپنے میں بھی ادائیں دیکھتا ہے۔

وہ چاہتے تھے کہ نہ دیکھے کوئی ادا میری

''ٹھیک ہے بیچاری لُکدی پھردی سی'' (ٹھیک ہے' بیچاری چھپتی پھرتی تھی)۔

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

وہاں تو چھپنا بھی ایک ادا ہو جاتا ہے۔

## ہمارے ہاں غزل کی شاعری جنسی بدنہادی کے دور کی پیدا کردہ ہے

یاد رکھیے! آپ کے ہاں کی شاعری' خاص طور پہ غزل کی شاعری' جو فارسی سے شروع ہوئی اور یہاں آ کر اردو میں پروان چڑھی' یہ ساری آپ کے جنسی بدنہادی کے زمانے کی پیداوار تھی۔ یہ ایران کی تاریخ کا بدترین دور ہے اور اس سے بھی بدتر دور ہمارے زوال کا وہ زمانہ ہے جس میں ہماری ادبی تاریخ معرضِ وجود میں آئی۔ ہمارے اس دور کا معاشرہ جنسیات میں ڈوبا ہوا ہے' اس میں بدنہادی کی یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

## عصمت کے آبگینے کے تحفظ کے پیشِ نظر زنا کی سزا سو کوڑے' تہمت کی سزا اسی کوڑے' قرآن حمید تو بیباکانہ روش کی سزا بیباکانہ آزادی کو ہی روک دینا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں جو قرآن حمید نے (4:15) میں فاحشہ کہا ہے تو یہ ابتدائی مبادیات کی چیزیں ہیں' جہاں سے یہ جذبات ذرا سی کروٹ لینا شروع کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ اگر تمہیں کسی لڑکی میں یہ چیز نظر آئے کہ اس میں بہت آزادی ہے تو۔۔۔۔۔ مگر ٹھہریئے! یاد رکھیے کہ یہاں آزادی کے معنی بیباک آزادی کہا ہے۔ معاشرے میں آنے جانے کی' کام کاج کرنے کی' عورت کو پوری آزادی ہے لیکن اگر کہیں اس میں کوئی چیز ایسی نظر آئے جہاں سے بیباک جذبات کروٹ لینا شروع کرتے ہیں جس کے لیے آپ کو گواہ مل سکتے ہیں۔ مگر یہ خاصہ حساس مسئلہ ہے خواہ مخواہ تہمت بھی لگائی جاسکتی ہے۔ یاد رکھیے! عصمت کا آبگینہ اتنی قیمتی چیز ہے کہ قرآن حمید نے (24:2) میں زنا کی سزا تو سو کوڑے مقرر کی مگر ایک باعصمت خاتون کے خلاف تہمت لگانے کی سزا (24:2) میں اَسی کوڑے مقرر کی ہے۔ یہ زنا کی سزا سے ذرا سا ہی کم ہے' اس لیے کہ عصمت بڑی قیمتی متاع ہے۔ اس کے متعلق جو کہا کہ بے حیائی کا ذرا سا بھی شائبہ کہیں نظر آئے تو اس کے لیے اتنی بڑی تاکید کی ہے کہ کم از کم چار گواہ ہوں اور معاشرے کے اندر باہر پھرنے والی جو عورت ہے تو اس کے لیے باآسانی مل سکتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر اس کے لیے کیا کیا جائے؟ وہ سزا ہے جو مبادیات کی چیز کے لیے ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن حمید کس طرح سے چور کی ماں کو مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ جو باہر آزادی سے' چل پھر رہی ہیں' اُن کی آزادی کو روک دو اور فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ فِى الۡبُيُوۡتِ (4:15) انہیں گھر میں پابند کر دو۔

## مستورات کو بلاقصور گھروں میں بند رکھنا قرآنِ حکیم کے نزدیک جرم ہے' ان کے لیے بھی اسمبلیوں میں نشستیں مخصوص کی گئی ہیں

اب یہیں سے ہمارے ہاں ایک بات آئی ہے۔ یہ جو ہم نے اپنی مستورات کو گھر میں بند کیا ہوا ہے' قرآن حکیم تو اس کو جرم بتاتا

ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ فِى الۡبُيُوۡتِ (4:15) ان (بیباک) عورتوں کو باہر آنے جانے سے روک دو۔ یہاں سے یہ پتہ چل گیا کہ اگر کسی عورت میں اس چیز کی نمود نہ ہو یا اس کا ثبوت نہ ہو' تو یہ جو پابندِ مسکن کرنا ہے' یہ چیز خود جرم ہو جائے گا کیونکہ جس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوتا' اسے وہ سزا دیدینا' جو جرم کی سزا ہے' بذاتِ خود جرم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اب تو سب مجرم ہیں بھائی صاحب! ''مصیبت اے ہے پئی قانون مرداں دے ہتھ اچ اے' ایناں دا زمانہ آ جان دیو سہی'' (مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ قانون مَردوں کے ہاتھ ہے۔ ان کا زمانہ آ جانے دو پھر سہی)۔ میں نے اس مرتبہ اپنی ان بہنوں اور بیٹیوں کے لیے لکھا ہے کہ اسمبلیوں کی نشستوں کے لیے کوئی پابندی نہیں کہ ان پر صرف مرد ہی ممبر منتخب ہو سکتے ہیں' عورت ممبر نہیں ہو سکتی' قانوناً اس میں کوئی ایسی پابندی نہیں ہے' یہ بھی کھڑی ہوں' ووٹ لیں اور وہ سیٹیں حاصل کریں۔ ان بیچاریوں کو معلوم نہیں ہے اور ہم نے بھی کچھ ذہن میں ایسا ڈالا ہوا ہے کہ ''تُوں جا کے فلانے نوں ووٹ دے دویں تے اوہنوں جا کے ووٹ دیے دویں اووی مرداں نوں ای آ'' (تم جا کر فلاں کو ووٹ دے آنا اور وہ بھی یہ ہے کہ فلاں مرد کو دے آنا)۔

برادرانِ عزیز! ہم نے ان عورتوں پر یہ بات افشا ہی نہ ہونے دی کہ تم بھی اسمبلیوں کی ان سیٹوں کی ممبر ہو سکتی ہو۔ ان کی آبادی آدھی سے کہیں زیادہ ہے تو آدھی سیٹوں کے اوپر جا کر یہ بیٹھ سکتی ہیں۔ اور اگر ان کے دلوں میں یہ جذبہ ابھر آئے کہ جتنا ظلم ہم پہ ہوا ہے' ہمیں اس کا انتقام لینا ہے تو یہاں ان کی ایسی ون پارٹی گورنمنٹ بن سکتی ہے کہ تمہیں بھک سے اڑا دے ''ٹھہر جاؤ سہی تسی'' (تم ذرا انتظار تو کرو)۔ کیوں میری بیٹیو! میں نے ٹھیک کہا ہے! اب آئین بنانے والے مردان عورتوں کو رعایتِ خصوصی دے رہے ہیں صاحب! ''دس سیٹیں ان کو اللہ واسطے دی ہیں۔ کنہیا دان جنوں کیندے سن ہندو' خیرات'' (انہیں اللہ واسطے کی دس سیٹیں دی ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہندو کنیا دان ❶ کہتے تھے' خیرات کہتے تھے)۔ اب یہ خوش ہیں کہ ہمیں دس سیٹیں مل گئیں۔ ''او کنجڑے دا طوطا اوہنوں جس دن ذرا جنی چُوری دیدیونا' تے ایناں خوش ہوندا ہیگا وے'' (وہ کنجڑے کا طوطا ہے۔ اسے اگر کسی دن ذرا سی چُوری دیدو تو وہ بہت خوش ہو جاتا ہے)۔ اس کو ہم نے اتنا عادی بنا دیا کہ دس سیٹوں کے اندر خوش ہیں۔ اور ان سیٹوں کی قیمت مرد لگائیں گے یعنی وہ جو پارلیمنٹ کے ممبر ہونگے وہ انہیں چن کر لائیں گے حالانکہ آدھی سیٹیں یہ اپنے خالص ووٹوں سے لے سکتی ہیں۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس وقت تک ہم نے عورتوں کے ساتھ یہ کچھ کیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے بے حیائی کی حرکت سرزد ہو جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہے تو اُن کے خلاف اپنے میں سے چار

---

❶ کنیا دان: جہیز' بیٹی کو بیاہنے کے لیے لوگوں سے کچھ مانگنا۔

گواہ لاؤ۔ اگر وہ اس کی شہادت دیں اور جرم ثابت ہو جائے تو اس جرم کی سزا یہ ہے کہ عورت کو پابندِ مسکن کر دو مگر ہمارے معاشرے نے اس کے ساتھ یہ ہاتھ کر دیا۔

میں یہ عرض کرونگا کہ جب معاشرے کے اندر چوریاں عام ہو جائیں تو آپ کو واقعی اپنے گھر کے متاع کی' اپنے گھر کی قیمتی چیزوں کی' بہت زیادہ حفاظت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرہ کی نگاہوں میں جب اتنی آوارگی پیدا ہو جائے تو بہنوں اور بیٹیوں کی حفاظت ہمارے لیے نہایت ضروری ہو جاتی ہے۔ گھر کے اندر ہی نہیں' بلکہ واقعی ان کو صندوقوں کے اندر بند کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ ہمارا مرد اتنا بیباک اور بے حیا ہو گیا ہے ورنہ اگر یہ بے باکی معاشرے میں نہ رہے تو پھر چین (China) کی طرح ہو' جیسے وہاں تالا نہیں لگایا جاتا' بعینہٖ ہمارے معاشرے میں ایسی خرافات نہ ہوں گی۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ صاحب! معاشرے میں بے حیائی بڑی عام ہو گئی ہے اس کا علاج سوچیے تو کہتے ہیں کہ کیا ہوا جی؟ ہماری عورتیں اور لڑکیاں بڑی بیباک ہو گئی ہیں اس لیے معاشرے میں بے حیائی بڑی عام ہو گئی ہے۔ ''جی ہاں! اے مرد فرشتے دے فرشتے ای ہیگے نیں'' (یہ مرد تو فرشتوں کے فرشتے ہی ہیں)۔ یہ ہے عورتوں کے خلاف مردوں کا Bias (یک طرفہ رُجحان)۔

## طلوعِ اسلام کنونشن کے موقع پر ایک سوال کا جواب' نیز درس کے دوران رونما ہونے والا واقعہ

میری بیٹیاں معاف رکھیں' آپ کو یاد ہو گا' میں نے ایک دفعہ کنونشن کے سوال میں یہی کہا تھا۔ سوال یہ ہوا تھا کہ ہم نے جو ریڈ لائٹ ایریاز' جن کو چکلے کہتے ہیں' وہاں سے اٹھا دیئے ہیں اور وہ روگ کے چوہے' ہم نے سارے شہر کے اندر' مختلف محلّوں میں بکھیر دیئے ہیں' اور اس کے باوجود شکوہ کرتے ہیں کہ صاحب! اس جرم میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی۔ کوئی علاج بتایا جائے کہ ان عورتوں کے متعلق کیا کیا جائے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ مرد حضرات یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ وہاں جانا بند کر دیں' علاج ہو جائے گا ''سیدھی جی گل ہیگی اے'' (سیدھی سی بات ہے)۔ یعنی آپ کہتے ہیں کہ عورتیں بے حیائی پھیلاتی ہیں'' کی او سڑک اتے سُٹ دیاں جاندیاں نیں؟'' (کیا وہ سڑک پر پھیلاتی جاتی ہیں؟) بے حیائی کن میں پھیلاتی ہیں؟ کیا یہ مردوں میں پھیلاتی ہیں؟

برادرانِ عزیز! پتہ نہیں' آپ کو یاد ہے یا نہیں مگر یہ جو درس میں پرانے آنے والے ہیں' انہیں تو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ یہاں درس میں ایک بہت مقدم بزرگ آ گئے تھے۔ وہ دور کے رہنے والے تھے۔ وہ پرانے دَور کے ایک مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے دو تین مرتبہ یہ چیز کہی کہ عورتیں بے حیائی پھیلاتی ہیں اور بالآخر انہوں نے بیٹھے بیٹھے کہہ دیا کہ پرویز صاحب! یہ جو آپ نے بے پردہ عورتیں بٹھا

رکھی ہیں' ان کو کہیں اندر بٹھا دیجئے' اس طرح مجھ سے درس نہیں سنا جاتا' بار بار نگاہ اُدھر جاتی ہے"یعنی توں نظر نہ نیویں اپنی کریں' ایناں نوں اندر بٹھادؤ" (یعنی تم اپنی نگاہیں نیچی نہ کرنا' بس انہیں اندر بٹھا دو)۔ میں نے کہا کہ مولانا صاحب! یہ بیچاریاں تو مدت سے اس کی عادی ہیں' یہاں بیٹھ بھی رہی ہیں' آپ آج آئے ہیں' میرا کمرہ خالی ہے' آپ وہاں تشریف لے جائیے۔ اب ان کے پاس جواب کچھ نہیں تھا۔ وہ اندر کمرے میں چلے گئے۔ ابھی دو تین ہی منٹ گزرے ہونگے کہ وہ مولوی صاحب بمعہ داڑھی چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے"اوتھے بیہہ کے تو کوئی سواد نئیں اوندا ہیگا" (وہاں بیٹھ کر تو کوئی مزہ ہی نہیں آتا)۔ میں نے کہا جی! "سواد کناں نوں نئیں اوندا کہ اکھاں نوں نئیں اوندا" (جی! مزہ کانوں کو نہیں آتا یا آنکھوں کو نہیں آتا)۔

عزیزانِ من! مردکم بخت نے یہاں کیا کچھ نہیں کر رکھا اور پُر زور طریقے سے کہتا ہے کہ "یہ بے حیائیاں پھیلاتی ہیں"۔ اندازہ لگائیے' ان کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تم اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو' یہ بھلا کیا بے حیائی پھیلائیں گی؟

## قرآنِ حکیم میں عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا اور حضرت یوسفؑ کی داستان بُرہانِ ربی کی زندہ شہادت ہے اور بے حیائی دُہرا جرم ہے

کیا کچھ نہیں کر دکھایا زلیخا' عزیزِ مصر کی بیوی نے! قرآن حکیم نے آپ کو پتہ ہے' حضرتِ یوسفؑ کے قصہ کو اس نمایاں حیثیت سے کیوں بیان کیا ہے؟ یہ بیان کرنے کے لیے کہ مرد جو اس قسم کا بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ "عورتوں کو روکیے صاحب! یہ ہمارا ایمان خراب کرتی ہیں' یہ بے حیائیاں پھیلاتی ہیں" اس نے صرف اس غرض کے لیے کہا ہے کہ تم دیکھو تو سہی' عورت جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے' اگر مرد اپنی عصمت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو عزیزِ مصر کی بیوی یوسفؑ کا کچھ نہ کر سکی' سامنے یوسفؑ ہونا چاہیے۔ کہیں جو انتہائی مواقع ہو سکتے ہیں' اس نے وہ پیدا کر دیئے' اس بیچارے کی پوزیشن گھر کے اندر ایک ملازم کی تھی' عزیز کی بیوی جاہ وحشمت اور حسن و جمال میں ایک دیوی تھی۔ اس نے Threat (دھمکی) بھی دی' ترغیب بھی دی' گھر میں کوئی نہیں ہے' دروازہ بھی بند کیے ہوئے ہے' خود ہاتھ بڑھا رہی ہے۔ اندازہ لگائیے! یہ قرآن حکیم بتا رہا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ فقط قصہ بیان کر جاتا ہے؟ اس نے ہمیشہ کے لیے مردوں کا منہ بند کر دیا جو کہتے ہیں کہ "صاحب! انہیں روکیے' یہ ہمارا ایمان خراب کرتی ہیں"۔ اس سے زیادہ بھی ایمان کے خراب ہونے کا کوئی اور موقعہ ہو سکتا ہے جو قرآن حکیم نے سامنے بیان کر دیا ہے۔

عزیزانِ من! وہ کونسا جذبہ تھا جس نے یوسفؑ کو روکا؟ ایک برہانِ ربی سامنے آئی کہ نہیں' خدا نے عصمت پر زور دیا ہے۔ زلیخا نے کہا ہے کہ قید خانے بجھوا دونگی۔ یوسفؑ نے کہا کہ پھانسی پہ لٹکوا دو۔ حضرتِ یوسفؑ کے یہ الفاظ ہیں کہ "میرے اللہ! میں اس چیز کے

مقابلے میں قید کی سزا بھگتنا زیادہ پسند کرونگا''۔عزیزانِ من! مرد اپنے اندر سیرتِ یوسفیؑ پیدا کرلیں تو اسکے بعد یہ شکایت ہی نہیں ہوتی۔ کیا کرلیں گی یہ بیچاری عورتیں؟ نہ تو عزیز کی بیوی سے زیادہ یہ صاحبِ اقتدار ہوجائیں گی' نہ اس قسم کے مواقع آپ کو بہم پہنچیں گے۔ ہماری تو اپنی کیفیت یہ ہے اور الزام ہمیشہ ان بیچاریوں کے اوپر دیا جاتا ہے۔قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ وَ الَّـذٰنِ یَـاْتِیٰنِهَـا مِـنۡـكُمۡ فَاٰذُوۡهُمَا فَاِنۡ تَابَا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا (4:16) اگر مرد اِس قسم کی حرکت کے مرتکب ہوں تو اُنہیں مناسب سزا دو لیکن اگر وہ اپنے کیے پر نادم ہوں' اس سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کرلیں' تو ان سے درگزر کرو۔اللہ کے قانون میں معافی کی گنجائش بھی ہے جو اکثر حالات میں جرم کی روک تھام کا موجب بن کر باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔اس چیز کو میں یوں بھی کہوں گا کہ اگر مرد یہ چیز کریں' والـذٰن کے اندر عربی قاعدے کی رو سے مرد اور عورت دونوں آسکتے ہیں۔اگر کہیں ان میں یہ برائی نظر آئے' اگر دو مردوں میں بھی ذرا سی بھی بے حیائی نظر آئے' ان عورتوں کے متعلق تو صرف یہ کہا ہے کہ ان کی آزادی کو روک دو' اِن کے متعلق کہا ہے کہ ان کو اذیت دو' یہ دہرا مجرم ہوتا ہے۔

## معاشرے میں بے حیائی کو روکنے کا حتمی علاج سیرتِ یوسفیؑ میں پنہاں ہے اور اسلامی معاشرے کا فریضہ بھی یہی ہے

عزیزانِ من! میں پھر یہ دہرادوں کہ مرد اگر یوسفؑ کی سی عصمت رکھتا ہے' تو عورت جو جی میں آئے کرلے' معاشرے کے اندر بے حیائی پھیل ہی نہیں سکتی۔اگر مرد اپنے آپ پہ کنٹرول رکھ لیں تو ایسا ممکن ہے۔اس لیے قرآن کریم نے عورت کے متعلق تو صرف یہ کہا ہے کہ اس کی آزادی کو ذرا روک دو اور مرد جنہوں نے یہ سارا الزام ان کے سر دھرا تھا' یہ خوش ہوگئے ہونگے کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے' دیکھا! ہم نے یہ کردیا' اُن کے متعلق کہا ہے کہ فَـاٰذُوۡهُـمَا (4:16) انہیں مناسب سزا دو۔وہاں (4:15) میں عورتوں کے لیے یہ چیز ہے کہ ان کی آزادی کو روک دو۔یہاں (4:16) میں قرآن کریم نے خود ''اذیت'' کا لفظ دیا ہے مگر اس سزا کا تعین نہیں کیا۔قرآن کریم ایسی چیزوں کو اسلامی معاشرے پہ چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اس کی سزا خود متعین کرے' جرم عام نہیں' استثنائی ہے تو اس کے لیے یہ فَـاِنۡ تَـابَـا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَاؕ اِنَّ الـلّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا (4:16) استثنائی شکل پیدا ہوئی کہ یونہی جذبات کے اشتعال میں آکر ذرا سی لغزش ہوگئی' فوراً اس کو ندامت ہوئی' ندامت کے بعد تم نے دیکھا کہ وہ واقعی اس قسم کا عادی نہیں' بس ذرا سی لغزش ہوگئی تھی' تو کہا ہے کہ پھر ٹھیک ہے لعنت ملامت کرکے' تم اصلاح کے لیے اس کو ایسے ہی چھوڑ سکتے ہو۔ اِنَّـمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ (4:17) لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ

یہ معافی ان کے لیے ہے جو غلطی سے کوئی جرم کر بیٹھیں اور پھر فوراً اس کا احساس بیدار ہو۔ اس میں دو باتیں دیکھیے! ایسا ہرگز نہیں کہ دیدہ دانستہ سب کچھ کرتے پھرو' اس کے بعد یہ کہہ دو کہ یا اللہ! میری توبہ' یا وہاں جا کر عدالت میں کہہ دیا کہ جی! مجھے معاف کر دیجیے۔ یہاں پہلی شرط تو یہ ہے کہ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (4:17) وہ جانتے ہوں کہ وہ غلطی سے یہ جرم کر بیٹھے ہیں۔

## کسی عمل کے دانستہ اور نادانستہ ہونے کی صورت میں ایک نفسیاتی تبدیلی کی نشاندہی

برادرانِ عزیز! (4:17) میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ دانستہ نہ کیا ہو بلکہ نادانستہ عمل سرزد ہو گیا ہو۔ اب جس سے یہ نادانستہ ہوا ہے' اس پہ اگلی چیز یہ ہوگی کہ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ (4:17) اس میں ارتکابِ جرم کے فوری بعد ندامت کا جذبہ پیدا ہو جائے کہ او ہو! یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ جبکہ دانستہ کرنے والے کے دل میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ قرآن حمید کیسی نفسیاتی چیزیں کہتا ہے! کہتا ہے کہ توبہ اس کی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا اپنے کیے پہ نادم ہو جائیں' آئندہ کے لیے اصلاح کا وعدہ کر لیں' تو ان کو تو چھوڑ دو' ایسا ہرگز نہیں کہ جو اس طرح کرتا چلا جائے' آتا چلا جائے' تم چھوڑتے چلے جاؤ' وہ پھر کرتا چلا جائے اور تم چھوڑتے چلے جاؤ۔ یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ

جامِ مے توبہ شکن' توبہ مری جام شکن
سامنے اک ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

''اک توبہ ایہو جئی وی ہوندی ہیگی اے'' (ایک توبہ اس جیسی بھی ہوتی ہے)۔

## توبہ کے معنی ندامت کے بعد نقصان کی تلافی کرنے کے ہوتے ہیں' زبانی ''میری توبہ' تو مجھے بخش دے'' کے نہیں ہوتے

قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ (4:17)۔ کیا بات ہے قرآن حکیم کی' عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین بنایئے۔ یہ دیکھیے! یہ کیا کیا چیزیں نہیں دے جاتا! کہا ہے کہ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ (4:17)۔ یہاں کہا ہے کہ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (4:17)۔ وہ تو بیشک توبہ کرتے رہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام یا عدالت کی طرف سے توبہ کس کی منظور ہوگی؟ کہا ہے کہ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ (4:17)۔ توبہ دو طرف سے ہوگی۔ توبہ کے معنی ہیں ''لوٹ آنا''۔ ایک تو اس کی طرف سے غلط روش سے وہ لوٹ آیا' اور دوسری اِدھر سے ہے جس نے جو سزا دینی تھی' وہ اس سزا دینے کے فیصلے سے لوٹ آیا۔ وہ جو لوٹ آیا ہے اس کے متعلق دیکھیے کہ یہ ایسے ہی نہیں ہے کہ گیا اور لوٹ آیا۔ وہ لوٹتا پھرے' سو دفعہ ایسا کرے '

یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ (4:17)اسی صورت میں ہوگا کہ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا (4:17) معافی ان کے لیے ہے جو غلطی سے کوئی جرم کر بیٹھیں اور پھر اس کا احساس بیدار ہونے پر فوراً اصلاح کی طرف لوٹ آئیں۔ خدا کے قانون میں معافی انہی کے لیے ہے۔ اس لیے کہ اس کا قانون علم وحکمت پر مبنی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ معافی کن کے لیے نہیں ہے؟ اس کے لیے کہا ہے کہ وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَ ہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا (4:18) ان کے لیے معافی نہیں ہے جو عادی مجرم ہوں اور اپنی حرکات پہ اس وقت نادم ہوں جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہو۔ نہ ہی ان کے لیے ہے جو قانون کو سرے سے تسلیم ہی نہ کریں اور ساری عمر اسی سرکشی میں بسر کر دیں۔ انہیں دردناک سزا دینی چاہیے۔

عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے! توبہ یہ نہیں ہوتی کہ جرم کرتے گئے' لوٹتے گئے' اس کے بعد ساری عمر یہ کچھ کرتے گئے' جب موت سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو کہا کہ یا اللہ! میری توبہ' اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔ کہنے لگے کہ یہ بات نہیں ہے! توبہ کے معنی ''ندامت'' ہیں جس کے بعد آپ کے پاس ابھی وقت ہے کہ آپ اپنا جو نقصان کر بیٹھے ہیں اس کی تلافی کر لیں۔ تلافی کا موقعہ اگر موجود ہے تو پھر توبہ کے معنی ہیں۔ توبہ دو لفظوں کے دہرا دینے کا نام نہیں ہے۔ توبہ ایک عمل ہے' ایک کام کرنا ہے' جو غلطی ہوگئی ہے اس کے ازالے' اس کی مدافعت' اس کی تلافی کے لیے' اس سے زیادہ بہتر کام آپ نے کرنا ہے۔ اس کے لیے تو آپ کے پاس وقت اور موقعہ ہونا چاہیے۔ اسے توبہ کہتے ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ جب سامنے موت آ گئی تو انہوں نے کہا کہ یا اللہ! میری توبہ اور استغفر اللہ یہ دہراؤ' اس سے توبہ نہیں ہوتی' نہ ہی اس کی توبہ ہے جو قانون کو قانون نہیں مانتا۔ کیا بات ہے! یہ قانون کو قانون ہی نہیں مانتا' کفار کے معنی یہ ہو گئے۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے کہا کہ بڑی دردانگیز سزا ہے۔

## فکرِ قرآنی سے پہلے دنیائے عرب کی حالت اور اس کے بعد فتوحات کا دور

آپ دیکھیے کہ مبادیاتِ زنا' خواہش یا بے حیائی کی ذرا سی لغزش کو روکنے کے لیے قرآنِ کریم کیا ابتدائی اقدام کرتا ہے' کیا احتیاط برتتا ہے تا کہ یہ آگ پھیل کر آگے نہ چلی جائے! قرآن کریم نے ابتدأً یہ بات بیان کی ہے۔ آگے جوں جوں آیتیں آتی جائیں گی' میں عرض کرتا جاؤں گا کہ اور کون کون سے Steps (اقدام) لیتا چلا جاتا ہے تا کہ اس کی روک تھام ہو سکے جب اس سوسائٹی نے حقیقتاً قرآن حمید کی ان ہدایات پر عمل کیا تو یہ وہی عرب تھے جو اسلام سے پیشتر اتنے ناجائز طریقے تھے جن کو سوسائٹی نے جائز

قرار دے رکھا تھا کہ آج یورپ میں ایسے جائز طریقے نہیں ہیں۔ اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ زنا تو ایک طرف رہا' اس سوسائٹی کے اندر بے حیائی کا ایک واقعہ بھی نہیں ہوا۔ عزیزانِ من ! ڈاکٹر انون ٹھیک کہتا تھا کہ عرب وہاں سے نکل کر ایران وروما کی سلطنتوں اور ان کے کلچرز پر چھا گئے تو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے مواقع پر اس قسم کی پابندیاں لگا دیں کہ پھر یہ جرم ان کے ہاں کبھی سرزد نہیں ہوا' جس سے ان کا کلچر بھی اتنا بلند ہوا اور قوم کو انتہائی درجے کا ارتقا بھی نصیب ہو گیا۔

سورۃ النسآء کی آیت 18 تک ہم آ گئے' عزیزانِ من ! آگے آیت 19 سے ایک اور مضمون شروع ہوتا ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

# ساتواں باب: **سورۃ النسآء** (1)' (آیات 19 تا 21)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ‌ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًـا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ۞١٩ وَاِنۡ اَرَدْتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـئًـا ‌ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۞٢٠ وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۞٢١

عزیزانِ من! آج جولائی 1970ء کی 26 تاریخ ہے۔ درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 19 ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:19)۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک کسی مرد کو یہ حق نہیں کہ وہ عورتوں کا زبردستی مالک بن جائے

اس آیت کے الفاظ تو چار پانچ ہی ہیں لیکن انہی الفاظ نے انسانی' تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ایک اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ جب چشمِ بصیرت اس پہ غور کرتی ہے تو وجد میں آ جاتی ہے اور وہ انقلاب یہ ہے جس کی طرف دنیا اپنے ہزار ناکام تجارب کے بعد' رفتہ رفتہ آئی اور آتی چلی جا رہی ہے اور شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ہم مسلمان اسی نسبت سے اس سے دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ النسآء کی ان ابتدائی آیات میں عائلی زندگی' گھر کی زندگی' خاندانی زندگی' کے متعلق احکام اور ہدایات دی گئی ہیں' مرد اور عورت کے تعلقات میں نکاح' طلاق' عدت' مہر' یہ تمام چیزیں' ان آیات میں آ گئی تھیں۔ قرآنِ کریم انسانی معاشرے میں بہت بڑی تبدیلیاں لایا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے یا Appreciate (پسند) کرنے کے لیے کہ قرآن حمید ان سے انسانی زندگی کے اندر کتنا بڑا انقلاب لے آیا کیونکہ اس سے پہلے انہی معاملات کے متعلق دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا' اسے اگر سامنے رکھا جائے تو اس کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کیا کہہ گیا ہے اور اتنی سی بات سے کتنا عظیم انقلاب برپا کر گیا ہے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) ’’اے جماعتِ مومنین! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ‘‘ لیکن آپ دیکھیے کہ ان چار لفظوں میں دنیا میں عورت کے متعلق جو کچھ ہوتا چلا آ رہا تھا' اس ظلم وستم کی یکسر بیخ کنی کر کے کتنے بڑے عظیم انقلاب کا اعلان کر دیا گیا۔

## اسلام سے قبل مختلف مذاہب اور ممالک میں نکاح سے آزادی کے بعد عورت کی پوزیشن

یوں تو یہ موضوع بڑا ہی تفصیل طلب ہو جائے گا کہ دنیا میں عورت کی حیثیت کیا تھی' قلتِ وقت کی بنا پر میں اسے مختصر کرونگا' بلکہ کہیے کہ صرف ان قوموں یا ان مذاہب تک محدود کردونگا جن کا اس وقت براہِ راست تعلق عرب سے اور بعد ازاں مسلمانوں سے ہوا۔ سوال یہ تھا کہ نکاح یا نکاح کے بعد' نکاح سے آزادی کے معاملے میں' عورت کی پوزیشن کیا تھی۔ سب سے پہلے اسلام کے قریب تر دَور میں یہودیت اور عیسائیت تھی۔ مذاہب سے آگے بڑھیے تو تمدن کے اعتبار سے ایک طرف رومنز تھے' دوسری طرف ایران تھا۔ ذرا سا اور آگے بڑھ آیئے تو پھر ہندو تھے۔ آپ دیکھیے کہ اس باب میں ان ممالک میں' ان تہاذیب میں' ان مذاہب میں' عورت کی پوزیشن کیا تھی؟ فلسطین میں یہودی آباد تھے' وہاں کے رسم ورواج کے مطابق یہودیوں کا مذہب میں تشکل ہوا۔ میں اس دین کے متعلق گفتگو نہیں کر رہا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے بنی اسرائیل کو ملا تھا بلکہ وہ مذہب جو وہاں کی مذہبی پیشوائیت نے خود وضع کیا تھا اور اسے اپنے انبیاء کی طرف منسوب کر دیا تھا' اس کی بات کر رہا ہوں۔

اس زمانے میں فلسطین میں تمدنی عائلی زندگی یہ تھی کہ مرد گھر کا سچ مچ حاکم ہوتا تھا۔ عورت کو وہ بیوی بنانے کے لیے خرید کر لاتا تھا۔ جب تک جی چاہتا' اسے اس حیثیت سے رکھتا اور جب کبھی اس سے ناراض ہو جاتا تو یہ جو بیع وشراء' خرید وفروخت' کا اس عورت کے گھر والوں کے ساتھ معاملہ طے پاتا اس کے تحت اکثر اوقات یہ شرط ہوتی کہ جب اس کا جی چاہے' یہ اس جنسِ کاسد کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا کہ جب وہ اس سے ناراض ہوا تو جن کے ہاں سے خریدی تھی' انہیں واپس کر آتا اور اگر یہ صورت نہ بنتی تو پھر اسے ویسے ہی گھر سے نکال دیتا تھا۔ اسے طلاق کہہ دیجیے' جو جی میں آئے کہہ دیجیے۔

فلسطینی زندگی کے اندر عورت کی یہ پوزیشن تھی' جہاں یہودی آباد ہوئے اُن کے مذہب میں بھی عورت کی کچھ یہی پوزیشن تھی' نکاح کے معاملے میں اس کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور نکاح کے بعد وہ اس نکاح کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اگر کسی عورت کا خاوند مر جاتا اور اس کی اولاد اس کی پرورش کے قابل نہ ہوتی یا اولاد نہ ہوتی' تو پھر وہ مجبور تھی کہ خاوند کے بھائی کے ساتھ نکاح کرے۔ نہ پہلے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کو کوئی دخل ہوتا نہ بیوہ ہونے کے بعد اسے اس معاملے میں کسی قسم کا اختیار رہتا تھا۔ اُسے

ایسا ہی کرنا پڑتا۔ اسے Law of Levirate کہتے تھے۔ ان کے ہاں Levir ❶ دیور کو کہتے تھے۔ جب سے ان کے ہاں یہ قانون بنا ہے تو ایک مسلمہ قانون سمجھا جاتا تھا' اس میں کوئی استثنیٰ نہیں پائی جاتی تھی۔

## بیوہ کے لیے تورات کا بیان اور کمانڈمنٹس (اوامر)

تورات جسے Old Testament (عہد نامہ عتیق) کہا جاتا ہے' اس کی کتابِ استثناء میں Law of Levirate ہے کہ بیوہ کو خاوند کے بھائی کے ساتھ شادی کرنا پڑتی تھی' یہ تورات کے اندر موجود ہے اور اس کی تفصیل بھی دی گئی ہے کہ ایسا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ طلاق کا حق صرف خاوند کو حاصل تھا اور جب وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیتا تھا تو پھر وہ کسی صورت میں بھی اس خاوند کے ساتھ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھی تورات کی کتابِ استثناء میں حکم کے طور پہ موجود ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ تورات میں Commandments ❷ ہیں' Guidance (ہدایت) نہیں ہے۔ Commandments (اوامر) وہ ہیں جن میں استثناء نہیں ہوتا اور اسی کے مطابق ہر حال میں' ہر زمانے میں' کرنا پڑتا ہے۔ ہدایت میں اور Commandments (اوامر) میں فرق یہ ہوتا ہے کہ ہدایت کسی منزل کی طرف راہنمائی کا نام ہوتا ہے' جس میں آپ اپنے زمانے' اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق' اس منزل تک پہنچنے کے لیے ذرائع اور اسباب' خود تجویز کر سکتے ہیں' خود اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ چیزیں بدلتی رہتی ہیں مگر ہدایت کا اصول اپنی جگہ پر اٹل رہتا ہے۔ Commandments (اوامر) پر ہر صورت میں عمل کرنا ہوتا ہے۔

## یہودیوں کے ہاں بیوہ کا اپنے دیور یا جیٹھ کے ساتھ شادی کرنا ضروری امر تھا' نکاح میں نہ عورت کی مرضی تھی نہ طلاق کا حق تھا

برادرانِ عزیز! قرآن مجید چند احکام کے علاوہ ہدایات دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اور یہودیوں کے ہاں کی شریعت میں یہ ایک بڑا بنیادی اصولی فرق ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ Ten Commandments (اوامرِ عشرہ) کسے کہتے ہیں۔ ویسے تو ہم نے نہ بھی سنا ہو مگر ایک Picture (فلم) یہاں آتے آتے رک گئی تھی' اُس میں تھے۔ یہودیوں کی کتاب خروج (Exodus) کے Ten Commandments (اوامرِ عشرہ) مشہور ہیں' Commandment (امر) ہوتا ہے جس کے مطابق ہر حال میں عمل کرنا پڑتا

---

❶ LĒVIR لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ''دیور'' کے ہیں۔ اسی سے یہ لفظ LEVIRATE ہے۔ یہ قدیم عبرانی قانون (Ancient Hebrew Law) تھا کہ بیوہ کی شادی دیور (LĒVIR) سے کردی جاتی تھی۔ اس کا حوالہ حسب ذیل ہے:

Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P.885.

❷ بابِ خروج (Exodus) 20:1-17 میں ان کے متعلق یہ ہے کہ یہ اوامرِ عشرہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے طورِ سینا پر حضرت موسیٰ کو دیئے تھے۔

ہے۔ یہ ان کے Commandments (اوامر) میں سے ایک Commandment (امر) تھا جس کے مطابق اس بیوہ کا دیور کے ساتھ شادی کرنا لازمی تھا یعنی خاوند کے بھائی کے ساتھ شادی کرنا' ضروری نہیں کہ وہ دیور ہی ہو' یہ جیٹھ بھی ہو سکتا تھا۔ اور طلاق یافتہ عورت دوبارہ خاوند سے شادی نہیں کر سکتی تھی' اس نکاح میں عورت کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا' طلاق کا حق بھی اسے خود حاصل نہیں ہوتا تھا' یہ حق صرف خاوند کو حاصل ہوتا تھا۔

## رومیوں میں عورت کی تمدنی حیثیت اور طبقاتی ضوابط میں عورت کے لیے اشرافیہ کے احکام

تہذیب کے اعتبار سے رومنز آگے تھے۔ اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ اس دور میں رومنز تہذیب وتمدن میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں قوانین کے ضابطے تھے' ان کی زندگی اس زمانے کی ہم عصر اقوام کے مقابلے میں زیادہ مہذب سمجھی جاتی ہے۔ وہاں نکاح ایک معاہدے کا نام تھا لیکن اس معاہدے میں عورت کو مرد اپنی Protection (حفاظت) میں لیتا تھا اور اس کے لیے دلیل یہ دی جاتی تھی کہ یہ لڑکی اپنے گھر میں' اپنے باپ کی حفاظت میں ہے اور اس کو چونکہ حفاظت کی ضرورت ہے اس لیے یہ خاوند کے گھر میں آکر خاوند کی حفاظت میں رہے گی۔ یہ اس قانون کی حفاظت میں رکھی جانے والی بنیاد تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رومنز کے ہاں عورت کی عزت کی جاتی تھی۔

یہ بات یاد رکھیے کہ جب ہم Romans (رومیوں) یا Greeks (یونانیوں) جو تہذیب وتمدن میں بہت آگے تھے' کے آداب وضوابط یا احکام کو لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اوپر کا طبقہ' جسے آپ Aristocrats (اشرافیہ) کہتے ہیں' جسے امراء یا حکمرانوں کا طبقہ' بالا دست طبقہ کہتے ہیں' یہ احکام ان کے لیے تھے۔ وہاں عوام کی حیثیت بالکل غلاموں کی سی ہوا کرتی تھی۔ ان کے ہاں عورت کی حیثیت ہوتی تھی' اس کی عزت کی جاتی تھی لیکن اس عزت کی ایک وجہ بیان کی جاتی تھی اور وہ ہے ''عورت ماں کی حیثیت سے''۔

## عورت باپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے جہنم میں مگر بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے پاؤں تلے جنت!

آپ کو یاد ہوگا اور میں نے کئی دفعہ آپ سے یہ کہا ہے کہ ہمارے ہاں بھی جب کہیں عورت کی عزت کی جاتی ہے تو ماں کی حیثیت سے کی جاتی ہے' بیوی کی حیثیت سے نہیں۔ اسے پھر دہرا دوں جو میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے ہاں یہ روایات موجود ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے معراج میں دیکھا کہ جہنم میں عورتیں زیادہ تھیں اور اس کے ساتھ دوسری حدیث یہ ہے کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ آپ دیکھیے کہ ایک پوزیشن تو عورت کی یہ ہے کہ خود جنت میں ہونا تو ایک طرف رہا' اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے اور

دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ ان کی اکثریت جہنم میں ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کیا متضاد چیزیں ہیں! اگر عورت بیوی کی حیثیت سے ہے تو جہنم میں ہے۔ اور عورت ماں کی حیثیت سے ہے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے اربابِ شریعت کا ان دونوں چیزوں کو نہ ملانے سے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ عورت جو وہاں جائے گی آیا یہ خاوند کی بیوی ہوگی' یا بیٹے کی ماں ہوگی۔ بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوگی اور بیٹے کے باپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے جہنم میں ہوگی۔ یہ عجیب متضاد کیفیتیں ہیں۔

اُدھر ہمارے مصلحین بھی عورت کے متعلق جب گفتگو کرتے ہیں تو بتاتے یہ ہیں کہ اسلام نے جو عزت وعظمت کا درجہ عورت کو دیا ہے' وہ کسی دوسرے مذہب نے نہیں دیا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ سارا باب عورت بحیثیت ماں کے ہوتا ہے اور 'امومت' (Motherhood) اس کا عنوان ہوتا ہے۔ وہی عورت جب بیوی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے تو اس کے متعلق پھر وہی چیز ہوتی ہے کہ اس کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہوتی ہے' سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی' یہ سیدھی نہیں ہوگی۔ یہ ہے ہمارے ہاں تضاد کی انتہا۔

عزیزانِ من! وہ قول تو آپ کو یاد ہے جو حضرتِ عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ایک رات ان کے ہاں ایک شخص مہمان تھا' انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ (581-644/45ء) بیوی کی پٹائی کر رہے ہیں' وہ باہر نکلے تو اُنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ کیا قصور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہ ہوا؟ دیکھیے! ایک جھوٹ بولنے کے بعد کتنے اور کہاں تک جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ آپؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ تین باتوں میں کسی شخص کو کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ باقی تو چھوڑ یئے ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ اس سے کبھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ وہ عورت کو کیوں مارتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ Romans (رومیوں) کے ہاں بھی عورت کی عزت ہمیں ملتی ہے لیکن ان کے ہاں وہ عزت بحیثیت ماں ہے۔

## Matrimony کا مادہ (Root)' عورت کا تمدنی مقام اور یہودیوں کے ہاں عورت کی حیثیت

آپ کو شاید علم ہو کہ انگریزی زبان میں شادی کے لیے Matrimony کا لفظ ہے۔ آپ نے Matrimonial تو دیکھا ہوگا کہ شادی سے متعلق جو چیزیں ہیں انہیں Matrimonials کہتے ہیں۔ یہ جو Matrimony [1] ہے' Latin (لاطینی زبان) میں اس کا مادہ Matrimonium ہے اور اسکے معنی Motherhood یعنی ''ماں کے فرائض'' ہوتا ہے۔ یہ Matrimony کا

---

[1] Matrimony کا یہ لفظ اینگلو۔فرانسیسی زبان میں matri-monie تھا اور لاطینی میں matri-monium تھا اور ان دونوں زبانوں میں (اس کے معنی) motherhood یعنی امومت یا ماں کے فرائض تھے۔ یہاں سے یہ انگریزی زبان میں آ کر matrimony بنا۔

لفظ بعد میں استعمال کی رو سے' شادی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ رومنز (رومیوں) کے ہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو Matrimonium کے معنی ماں کے فرائض (Motherhood) ہیں۔

اس اصطلاح کے مطابق جو شادی کی جاتی تھی' اس میں عورت کو دیا جانے والا مقام صرف اس لیے تھا کہ وہ اس کے بچوں کی ماں ہوگی اور بچوں کی ماں کی حیثیت سے اس کی عزت ہوتی تھی' بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کے ہاں یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ جہاں تک طلاق کا تعلق تھا تو زنا کی صورت میں' طلاق مرد بھی دے سکتا تھا' عورت بھی طلاق لے سکتی تھی۔ ان کے ہاں اگر چہ تعدادِ ازواج نہیں تھی لیکن لونڈیوں (Concubines) کی عام اجازت تھی اور ان کی تعداد پہ کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔

اب یہاں دو چیزیں ہمارے سامنے آ گئیں۔ ایک تو یہ کہ یہودیوں کے ہاں عورت کی حیثیت' جو میں نے ابھی عرض کیا تھا' (فلسطین) Palestine کی زندگی میں خرید کرلائی ہوئی ایک جنس (Commodity) کی ہوتی تھی۔ جب تک جی چاہا اسے رکھ سکتے تھے' جی بھر گیا تو جس سے خریدی تھی' اسے واپس لوٹایا جاسکتا تھا۔ اور دوسری یہ کہ طلاق کا حق مرد کو تھا' عورت کو نہیں تھا' بیوہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ خاوند کے بھائی سے شادی کرے اور عورت کو اس باب میں گھر میں کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا تھا' خاوند کی حیثیت ایک داروغے کی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ہی رومنز (رومی) بھی تھے' ان کے ہاں میں نے بتایا ہے کہ عورت کی حیثیت ماں کی ہوتی تھی' عزت کی جاتی تھی اور طلاق کا حق مرد اور عورت دونوں کو زنا کی شکل میں حاصل تھا۔

## انجیل میں احکام کے بجائے صرف اخلاقیات کی چند باتیں ہیں اور عورت کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت شے جانا جاتا ہے

آپ دیکھیں گے کہ عیسائیت کی انجیل میں احکام نہیں ہیں' اس میں صرف اخلاقیات ہیں کہ (مثلاً) دشمن سے بھی پیار کرو' ہمسایہ سے بھی محبت کرو۔ یہ اخلاقیات کی باتیں ہیں' اس کے اندر شریعت یا احکام نہیں ہیں۔ ساری انجیل میں' جسے عہد نامۂ جدید کہا جاتا ہے' صرف ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے عورت کی طلاق کے متعلق۔ پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجیے۔ میں نے اس سے پہلے بھی رہبانیت کے سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ عیسائیت میں عورت کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت شے سمجھا جاتا ہے یعنی یہ دنیا میں گناہوں کا سر چشمہ ہے' آدمی کو بہکانے کا ذریعہ ہے' شیطان کے فریب میں آ جانے والی ہے' یہ آدم کی پسلی سے نکلنے کا قصہ بھی وہیں سے آیا ہوا ہے۔

## عیسائیت میں شادی نہ کرنا ایک مقدس فعل ہے اور مطلقہ عورت شادی نہیں کرسکتی

عیسائیت میں تجرد کی زندگی (Celibacy)' بغیر شادی شدہ رہنے کی زندگی' کو اعلیٰ ترین اور مقدس تر زندگی تصور کیا جاتا ہے۔

پادری کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی شادی نہیں کی جاسکتی' Nuns (راہبیں) بغیر شادی کے ہوتی ہیں' Saints (اولیاء) ہوتے ہی وہ ہیں' جو شادی نہ کریں اور اس کے لیے وجہ جواز بتاتے ہیں کہ ایک تو حضرتِ عیسیٰؑ نے خود شادی نہیں کی تھی اور دوسری ان کے تقدس کی صورت یہ ہے کہ گو حضرتِ مریمؑ ان کی والدہ تھیں مگر حضرت عیسیٰؑ بھی ان کے اعتقاد و ایمان کے مطابق مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا نہیں ہوئے تھے' کیونکہ مرد اور عورت کا اختلاط تو ان کے نزدیک بہت بڑے گناہ کی ایک قابلِ نفرت چیز ہے۔

شاید آپ کو یاد ہو' جو میں نے عرض کیا تھا کہ دوسری تیسری صدی میں ان کے ہاں جو Monasticism (خانقاہیت)' رہبانیت کی زندگی تھی' وہ اتنا تشدد اختیار کر گئی تھی کہ ان کے ہاں ایک فرقہ ویریلیشنز (Virilisciens) کا بنا' اس فرقہ کے اندر سب پیدائشی ہیجڑے ہوتے تھے۔ اور اس کے اندر جو داخل ہونا چاہتا تھا' اسے Castration (خصّی کرنے کے عمل) کے ذریعہ سے مُـخـنـث کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک مکمل فرقہ تھا۔ اس لیے بھی مرد اور عورت کا اختلاط ان کے ہاں روحانیت کی زندگی میں سب سے بڑا سنگِ گراں تھا۔ اس لیے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عیسائیت میں مرد اور عورت کے اختلاط یا نکاح وغیرہ کے متعلق کیا ذکر ہو سکتا ہے۔ البتہ ایک مقام پہ وہاں Divorce (طلاق) کے متعلق یہ ذکر ہے اور اس میں' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک ہی حکم ہے اور متی کی انجیل[1] میں دو مقام پہ اس کے متعلق ذکر آیا ہے اور ان دونوں میں حکم کے اعتبار سے کچھ باہمی تضاد ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ عورت اگر زنا کے جرم کی مرتکب ہو تو اس صورت میں اسے طلاق دی جاسکتی ہے اور اس قسم کی مطلقہ عورت سے جو شادی کرنے والا ہے اس کے متعلق بھی سمجھا جائے گا کہ وہ زنا کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے یعنی اس سے شادی نہیں کی جاسکتی۔ اس حکم میں مرد کے متعلق جس نے طلاق دی ہے' کچھ نہیں آیا۔ یعنی اُس کو تو اجازت ہوگی کہ وہ دوسری جگہ شادی کر لے مگر یہ جو مطلقہ عورت ہے اس کے ساتھ کوئی عیسائی شادی نہیں کر سکتا۔ اُسی متی میں دوسری جگہ یہ ہے کہ طلاق جرمِ زنا کی صورت میں نہیں دی جاسکتی ہے اور اس میں نہ مطلقہ عورت شادی کر سکتی ہے' نہ طلاق دینے والا مرد شادی کر سکتا ہے۔ یعنی آپ دیکھتے ہیں یہ کس قسم کی پابندیاں ہیں۔ انجیل میں یہی ہے۔

## سینٹ پال کے مذہب کے خدوخال

عیسائیت ذرا آگے بڑھتی ہے تو سینٹ پال کا جو مذہب ہے' وہ عیسائیت کا مذہب بن جاتا ہے۔ سینٹ پال (5-67A.D.) نے یہ چیز کہی کہ مذہب کا اختلاف نہیں' یہ بھی طلاق کا باعث بن سکتا ہے یعنی اگر عورت یا مرد دونوں میں سے کوئی اپنا مذہب تبدیل کر لے تو

---

1. نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ 325ء) میں 34 اناجیل اور حواریوں کی طرف منسوب کیے گئے قریب 113 خطوط کے اس تمام لٹریچر کو سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متی' مرقس' لوقا' یوحنا) منتخب کی گئیں۔ متی کی یہ انجیل 61ء اور 100ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔

اس صورت میں یہ نکاح بھی ٹوٹ سکتا ہے لیکن ان کی جو اصل شریعت مرتب ہوتی ہے' وہ تو کونسل آف ٹرینٹ ❶' جو چوتھی صدی میں منعقد ہونے والی کونسل آف نیقیہ (The Council of Nicoea) کی طرح سولھویں صدی (1545ء لغایت 1563ء میں Trent) کے مقام پر ہوئی تھی' اس میں جا کر مرتب ہوئی ہے۔ اُنہوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تھی وہ جکڑ بندی جس کے خلاف Protestant (پروٹسٹنٹ) فرقہ نے صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ Protestant ہیں ہی اس لیے کہ انہوں نے گرجا کے خلاف' کلیسا کے خلاف' مذہبی پیشوائیت کے خلاف' Protest (احتجاج) کیا تھا' انہوں نے اپنے ہاں انجیل کے حکم کے مطابق یہ چیز رائج رکھی کہ زنا کی صورت میں طلاق ہو سکتی ہے' کسی دوسری صورت میں نہیں۔

## انقلابِ فرانس مملکت و مذہب میں ثنویت اور ایران میں عورت کی حالتِ زار

میں عرض کر دوں کہ یہ چیزیں زندگی میں اتنی ناقابلِ برداشت اور ناممکن العمل تھیں کہ اس کے خلاف جو سب سے بڑی بغاوت اٹھی ہے' وہ اُن کا (1789) French Revolution انقلابِ فرانس ہے۔ یہ صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی پیشوائیت کے خلاف بھی ایک بہت بڑا انقلاب تھا چنانچہ انہوں نے اس French Revolution (انقلابِ فرانس) کے بعد یہ بات طے کی تھی کہ مذہب کو' پادریوں کو' دنیاوی معاملات کے اندر دخل نہیں دینا چاہیے۔ ان کے ہاں یہ جو مذہب اور ریاست میں ثنویت (Dualism) پیدا ہوئی ہے' یہ (1789) French Revolution (انقلابِ فرانس) کے بعد پیدا ہوئی تھی اس میں انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ جو نکاح ہے' یہ ایک معاہدہ کی صورت ہے اور یہ جو معاہدہ ہے اسے تراضی مابین سے' باہمی رضامندی سے' توڑا جا سکتا ہے اس لیے اس میں کسی قسم کی ایسی کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی جسے آپ کہیں کہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہے' یہ توڑی نہیں جا سکتی یعنی ان بندھنوں کو انہوں نے آ کر توڑا' مذہب کو گرجوں کی چار دیواری میں بند کر کے' دنیاوی معاملات کو ان سے آزاد کرا کر' اپنے قانون بنائے' تب کہیں جا کر اِس موجودہ مقام پر پہنچے ہیں۔

ایران میں عورت کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ وہاں تو بیٹی اور بہن سے بھی شادی کی جا سکتی تھی اور طلاق وہاں بھی مرد کے ہاتھ میں تھی' عورت کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

---

❶ اس کونسل آف ٹرنٹ (منعقدہ 1545ء تا 1563ء) میں ذیل کی تین اہم باتیں بھی زیرِ بحث آئیں:
(1) اپوکریفہ (Apocrypha: وضعی) کی حیثیت کیا ہے؟ (2) کیا روایات اور اناجیل ہم پلّہ ہیں؟ (3) اناجیل کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات ہیں' انہیں کس طرح رفع کیا جائے۔ (پرویزؒ: مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1996 (بلا ترمیم' ص۔ 46)

## ہندوستان میں دھرم شاستر کے اندر پہلی چیز نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی تھی اور وہ بھی اٹوٹ انگ تھی

اب یہاں Arians (آریا) کی ایک دوسری شکل تھی جو یہاں ہندوستان میں آئے۔ ان کے دھرم شاستر میں آپ دیکھیں گے کہ سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ لڑکی کی شادی ہی نابالغی کی عمر میں کی جاتی تھی۔ ان کے رواج کے مطابق اگر لڑکی کو باپ کے گھر میں ایام شروع ہو جائیں تو وہ باپ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا تاوقتیکہ وہ لڑکی کی شادی کر کے اس کو اس کے گھر نہ بھیج دے۔ یعنی بالغ ہو کر لڑکی باپ کی چھت کے نیچے رہ نہیں سکتی' باپ اور لڑکی دونوں نہیں رہ سکتے' اور نہ ہی باپ اس گھر کا پانی پی سکتا تھا تو گویا پہلی چیز یہ کہ شادی ہی نابالغی کی شکل میں کی جاتی تھی۔ اب جو نابالغ کی شادی کی جائے گی تو اس میں اس کی رضامندی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ان کے ہاں جو شادی تھی' وہ آج کی اصطلاح میں اٹوٹ انگ تھا' جو ٹوٹ سکتا ہی نہیں تھا' زندگی بھر الگ ہونا تو ایک طرف رہا' وہاں تو خاوند کے مرنے کے بعد بھی عورت کو جل کر' بھسم ہو جانا پڑتا تھا تا کہ وہ اس کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ بعد ازاں کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر سکے۔ وہ اس دنیا کے اندر باقی ہی نہ رہے۔ ان کے ہاں یہاں تک سختی تھی۔ لڑکی کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا' نہ باپ کی وراثت سے' نہ خاوند کی وراثت سے' نہ بیٹے کی وراثت سے' صرف دان مل سکتا تھا یا خیرات مل سکتی تھی اس لیے ان کے ہاں کنہیا دان کا لفظ ہے۔ لڑکی کو کنہیا (جہیز) کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی۔

## اسلام کے شروع میں دنیائے عرب میں عورت کے ساتھ کیا جانے والا سلوک

خود عرب میں' جہاں اسلام آیا' عجیب قسم کی سختیاں تھیں۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ عورت کی شادی اس کے ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی خواہ وہ عورت نابالغ ہو یا بالغ ہو' صرف اس کے Guardian (ولی) کی مرضی سے شادی ہو سکتی تھی۔ طلاق کا حق مرد کے ہاتھ میں تھا' وہ جب جی چاہے طلاق دے سکتا تھا' عورت طلاق نہیں لے سکتی تھی البتہ بعض شکلوں میں عورت کے رشتہ دار اس خاوند کو یا اس کے رشتہ داروں کو راضی کر کے کچھ دے دلا کر اس نکاح کے بندھن کو تڑوا سکتے تھے لیکن وہ اختیار بھی مرد ہی کا تھا' عورت یا عورت کے رشتہ داروں کے اختیار کی بات نہیں تھی' اُسی مرد کے ہاتھ میں یہ چیز ہوتی تھی۔

## عورت صرف ایک جنس (Commodity) تھی اور بس

میں نے مختصراً عرض کیا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت ان مذاہب میں جو اس کے گرد و پیش تھے' یہودیت میں' عیسائیت میں' ان تہاذیب میں' جو اس زمانے کی مہذب اور متمدن قوموں کے اندر رائج تھیں' رومنز کے اندر' ایرانیوں کے اندر' ہندوستان کے اندر' ان تمام میں نکاح یا طلاق کے معاملے میں عورت کی پوزیشن کیا تھی۔ ان سب میں ایک ہی چیز آپ کو مشترک نظر آئے گی اور وہ یہ کہ عورت کو

نہ نکاح کرنے کے معاملے میں کوئی اختیار تھا' نہ گھر کے اندر کسی قسم کا کوئی اقتدار اور نہ اس نکاح کے بندھن کو توڑنے کے معاملے میں وہ کچھ کرسکتی تھی۔ وہ ایک جنس تھی' ایک شے تھی جسے خریدا جاسکتا تھا اور اس خریدنے کے بعد جس طرح کہ وہ شے مملوک ہوجاتی ہے' خریدنے والے کی پراپرٹی ہوجاتی ہے' یہ اس کی پراپرٹی ہوجاتی تھی' اس سے زیادہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

## جہالت کے اُس دور میں قندیلِ آسمانی کی طرف سے ایک اعلانِ عظیم اور لفظ کَرھًا کی وضاحت

یہ ہے وہ پس منظر' یہ ہے اس زمانے کی تمدنی تہذیب اور مذہب کی دنیا کی حالت جس میں قرآن کریم آیا۔ احکامات اور راہنمائیوں کو تو آپ الگ رکھیے' اس باب میں اس نے آکر اعلان کیا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19)۔ آپ دیکھیے کہ یہ کتنا عظیم انقلاب آفریں اعلان ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ (4:19) اے جماعتِ مومنین! یہ تم پہ حلال ہی نہیں ہے۔ غور فرمایئے کہ الفاظ کیا ہیں! کہ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) عورت کے مالک بن جاؤ یا مالک بنے رہو۔ یہاں لفظ كَرْهًا (4:19) ہے درآں صورت کہ یہ کام زبردستی سے کیا جائے یعنی كَرْهًا کا جو لفظ ہے' ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''زبردستی' جبر سے'' کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے اگرچہ کئی دیگر الفاظ تھے' مگر یہاں كَرْهًا آیا ہے کہ ''دل میں ذراسی' کسی قسم کی بھی' ناپسندیدگی ہو' نارضامندی ہو' اسے بادلِ ناخواستہ کوئی کام کرنا ہو'' تو اسے کراہت کہتے ہیں۔ اس كَرْهًا سے یہ لفظ کراہت نکلا ہے۔ جبر کی بات کہ اگر ذراسی بھی کراہت ہو' اس کے دل میں ذراسی عدمِ رضامندی ہو تو وہ كَرْهًا ہے۔ کہا ہے کہ لَا یَحِلُّ لَكُمْ (4:19) وہ عورت تمہارے اوپر حلال ہی نہیں ہوتی۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک عورت کی عصمت کی حفاظت اور اس کے جذبات کے احترام کی نوعیت

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس پس منظر کے اندر یہ اعلان آرہا ہے' یہودیوں کے Commandments (اوامر)' عیسائیت کے وہ فیصلے' رومن کی تہذیبیں' ایران اور Arians (آرین) کے ہاں کا تمدن' ان سب میں عورت کی یہ ناقابلِ بیان حیثیت تھی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان تمام احکام کو سامنے رکھنے سے تو پوچھیے ہی نہیں کہ عورت کا کس قدر ابتر مقام سامنے آتا ہے۔ اس ایک آیت سے آپ دیکھیے کہ كَرْهًا کے لفظ کہنے سے یہ بات نمایاں ہوکر سامنے آگئی ہے کہ اگر تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ تو یہ تمہارے اوپر حلال ہی نہیں ہے۔

پوچھا جاتا ہے کہ کون کون سے رشتے حرام ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے لَا یَحِلُّ لَكُمْ (4:19) سے کیا بات کہہ دی ہے؟ کہا ہے کہ آؤ! سنو! جو حلال رشتے ہیں' ان میں بھی یاد رکھو کہ اگر کسی صورت میں بھی عورت کو ذراسی ناپسندیدگی ہے' تو تمہارے

رسم و رواج' تمہارے چھ کلمے' تمہاری رسمِ نکاح' ان سب کے باوجود وہ عورت تمہارے اوپر حلال ہی نہیں ہوسکتی۔ اور اس بات کا اطلاق شروع میں نکاح کے وقت تک نہیں بلکہ یہ شرط زندگی بھر کے لیے ہے۔ یہ شروع میں ہی رضامند ہونے کا سوال نہیں ہے بلکہ اس دوران جب بھی ایسا ہو کہ یہی کرھًا کی صورت پیدا ہوجاتی ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورت کے مالک بن بیٹھو۔

## لفظ کُرھًا اور کَرھًا کے مفہوم میں فرق اور تزویج کے رشتے کی اہمیت اور آج کا معاہدۂ نکاح

ارے زبان کے بھی کیا کہنے ہیں' عزیزانِ من! ان عربوں کے ہاں کُرھاً اور کرھًا دو الفاظ ہوتے ہیں۔ کُرھاً بھی ایک ناگواری ہوتی ہے لیکن وہ ناگواری اپنے اندر سے پیدا کی ہوئی ہوتی ہے۔ مثلاً میں آرام سے بیٹھا ہوں' وہاں کوئی چیز پڑی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ میں اسے اٹھا کر لاؤں' جی اٹھنے کو نہیں چاہتا لیکن اس چیز کو لینے کے لیے اٹھنا پڑتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس اٹھ کر اس شے کو لانے میں بھی ذرا سی ناگواری ہے۔ یہ ناگواری کہیں باہر سے عائد نہیں ہوئی' یہ اپنے ہی اندر کی ناگواری ہے۔ اسے تو وہ عرب کُرھاً کہتے تھے لیکن جس ناگواری میں باہر سے' کسی کی طرف سے' کسی قسم کی کوئی ایسی چیز آئے' تو اُسے کَرھاً کہتے تھے۔ یہاں کَرھاً ہے۔ یہ خارجی اسباب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے جس سے ذرا سی ناگواری پیدا ہو رہی ہے۔ عزیزانِ من! یہ اس لیے ہے کہ وہ تو اس رشتے کو ہی تزویج کا رشتہ کہہ رہا ہے' رفاقت کا رشتہ کہہ رہا ہے کہ یہ برابر برابر کی دو چیزیں ہیں جن سے ایک سے دوسرے کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اگر ایک کے دل میں دوسرے کی طرف سے ذرا سی بھی کراہت ہو تو آپ سمجھتے ہیں کہ کیا اس میں رفاقت پیدا ہوسکتی ہے؟ کیا اس میں ازواجیت پیدا ہوسکتی ہے؟ کیا اس سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے جس کے لیے تزویج کا یہ رشتہ قائم کیا گیا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

برادرانِ عزیز! یہ جسے آپ جوڑی کہتے ہیں' یہ اس کا بڑا صحیح ترجمہ ہے۔ یہ ہے ''سیّاں دی جوڑی' کدی بھراواں دی وی جوڑی سندے ہوندے ساں'' (یہ ہے سیّاں کی جوڑی۔ کبھی بھائیوں کی جوڑی بھی سنا کرتے تھے)۔ یہ جو چیز ہے' اسے قرآن مجید آخر تک نبھانا چاہتا ہے اور اگر کسی وقت بھی ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ ان میں سے کسی ایک کے دل میں یہ کیفیت نہ رہے' تو وہ کرھاً کی بات ہوجائے گی اور ان دونوں میں سے' کسی ایک میں بھی جونہی یہ کرھاً کی شکل پیدا ہوئی تو پھر یہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ (4:19) ہے۔ تزویج کے اس رشتے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے' پھر یہ جوڑی نہیں رہتی' ''فیر او جوڑیاں جگ تھوڑیاں تے نرڑ بہتیرے۔ اے نڑے ہوئے تہانوں پتہ اے کیہڑے ہوندے نیں؟ اوہ بیل جیہڑا امر یا ٹُر یا جائے' اوہنوں زبردستی لیا کے' بَن کے' تے ہل وچ جوئے دے نال' جس طراں جوندے نیں نا' تے کٹھا رسہ بندھ دے دواں دا' کہ نٹھنا کتھے ہیگا ایں' اینوں کیندے نیں تہاڈا معاہدۂ نکاح'' (پھر وہ

جوڑیاں کم ہوتی ہیں اور اُن جوڑ بندھے ہوئے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ اُن جوڑ سے کس کر بندھے ہوئے کون سے ہوتے ہیں؟ وہ بیل جو مُردوں کی طرح چلے' اسے زبردستی لاکر' ہل کے جُوئے سے باندھ کر جس طرح جوتتے ہیں۔ اُسے نڑے ہوئے کہتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ ان دونوں بیلوں کو ایک ہی رسّے سے باندھ دو کہ بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ اسے کہتے ہیں آپ کے ہاں کا معاہدۂ نکاح)۔

## نکاح کو قرآنِ حکیم نے معاہدہ قرار دیا ہے جو تراضیٔ مابین سے استوار ہوتا ہے

عزیزانِ من! پہلی چیز ہی یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے معاہدہ قرار دیا ہے۔ ابھی یہاں آتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا** (4:21) یہ پختہ سا معاہدہ ہے' تمہارے لیے اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ معاہدہ تو تراضیٔ مابین سے ہوگا' دونوں کے Consent (رضامندی) سے ہوگا' Consent (رضامندی) میں تو سیدھی سی شکل ہے کہ عمر کے اعتبار سے بھی ہے جسے قانون مانتا ہے۔ بلوغت سے پہلے کا معاہدہ' معاہدہ ہی نہیں ہوسکتا' یہ تو کسی کے Behalf (دوسرے کی طرف) سے کوئی کرے تو کرے' وہ خود تو کر ہی نہیں سکتا اور یہاں یہ جو فریقین ہیں' صرف ان کے معاہدے کی ضرورت ہے۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے نکاح کی عمر کے تعین کے عظیم مقصد کو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے

میں کہتا ہوں کہ آپ اور چیزوں کو تو چھوڑ دیجیے یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم نے نکاح کی عمر کیا مقرر کی ہے؟ یہ قرآن کے اندر موجود ہے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہے' میں نے پچھلے دو درسوں میں بیان کیا تھا کہ قرآن حکیم میں بالتصریح نکاح کی عمر بلوغت ہے۔ کہا ہے کہ **حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ** (4:6) حتیٰ کہ وہ سنّ بلوغت تک پہنچ جائیں۔ بلوغت کا لفظ ہی یہاں قرآن حکیم کی آیت سے نکالا ہے' اور Consideration (لحاظ و ملاحظہ) چھوڑ دیجیے' صرف یہ بات دیکھیے کہ یہ جو معاہدہ ہے' یہ تراضیٔ مابین سے ہوگا' یہ نابالغ سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر جو معاہدہ ہے' یہ Consent (رضامندی) سے ہوگا' اس میں **کرھاً** کی شکل ہو ہی نہیں سکتی' اگر ہوگی تو یہ معاہدہ ہی نہیں ہوسکتا' یہ سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا اس عورت کی طرف سے آکر اس کا نکاح کردے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی Consent (رضامندی) دیدے جیسے کسی کو مختار بنادیتے ہیں۔ Consent (رضامندی) کے بغیر نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نکاح کے بعد یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ اس نے معاہدے کی Consent (رضامندی) دیدی تو باقی زندگی میں اس کی کوئی رضامندی رہے یا نہ رہے وہ معاہدہ قائم رہے گا۔ مگر آپ کے ہاں یہ نہیں ہے۔ اُس کی باقی زندگی میں آپ کو معلوم ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے معاہدے میں تو دونوں کی Consent (رضامندی) ضروری ہے خواہ آج وہ بات رسماً ہی رہ گئی ہے لیکن بہرحال اس رسم

میں بھی آپ اس کو ایجاب وقبول کہتے ہیں' وہ لڑکی سے پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حمید کے ضوابط اب سانپ کی لکیریں بن کر باقی رہ گئے ہیں' اس کی اصل روح باقی نہیں رہی۔ چونکہ Consent (رضامندی) کی ضرورت ہے اس لیے سب کچھ ہونے کے بعد برات بھی آ گئی' باجے بھی بج گئے' ڈھول بھی بج گئے' پٹاخے بھی چل گئے' اس کے بعد ''اوہو! لینا دو بندے نال جی' اندر جانا' تھوڑا جیا جی اوتھے آ تے گل رہ گئی سی' سیاپا وڈو' اے وی نال جاکے'' (اوہو! دو بندے ساتھ لینا جی! پھر اندر جانا' تھوڑی سی یہ بات تو رہ ہی گئی رضامندی کی۔ اسے بھی ساتھ جا کر پورا کرآ و)۔ وہ اندر چلے گئے ''او دلہن بنا کے بٹھائی ہوئی ہوندی اے بیچاری'' (اُس بیچاری کو دلہن بنا کر بٹھایا ہوا ہوتا ہے)۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا یہ تمہیں منظور ہے؟ وہ بیچاری چپ ہو کر بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ آ گیا کہ جو سکوت ہے وہ رضامندی ہے یعنی اگر یہ ہاں نہ کرے' چپ رہے تو سمجھ لیا کہ ٹھیک ہے ''کم کرو' سیاپا مکاؤ''۔ بہر حال رضامندی یہاں تک تو ہے اور جونہی اس نے ہاں کہا' یا انہوں نے ہاں سمجھ لیا' رضامندی کے سارے اختیارات اِدھر سے باطل ہوئے اور اُس شوہر کے ہاتھ میں جا تھمے۔ اب اس معاہدے کی تنسیخ کا اختیار اس بیچاری کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی معاہدہ ایسا نہیں دیکھا کہ وہ باندھا تو دونوں کی رضامندی سے جائے اور اس کے ٹوٹنے کی صورت یہ ہو کہ جیسے عیسائیت میں تھا کہ طلاق دی ہی نہیں جا سکتی یا ہندومت میں تھا کہ طلاق ہی نہیں ہے یا یہودیت کی فلسطینی زندگی کے مطابق کہ مرد حاکم ہے' طلاق کا اختیار صرف اس کو حاصل ہے' عورت کو نہیں ہے۔ آپ دیکھیے! آپ کے ہاں یہ چیز در آئی ہے۔ قرآن مجید اس کو معاہدہ ہی نہیں کہتا' اس رفاقت کی زندگی میں جب بھی یہ کرھاً کی شکل پیدا ہو' سوال ہی نہیں ہے کہ یہ معاہدہ باقی رہ سکے۔ یہ تھا قرآن مجید۔

اس کے بعد آپ کے ہاں فقہ بنی۔ اس فقہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ مرد کے اختیارات کی وسعتیں یہاں تک ہیں کہ کھڑے کھڑے تین دفعہ زبان سے یہ لفظ طلاق طلاق اور طلاق نکل جائے' بغیر کسی وجہ کے' بغیر کسی عذر کے تو یہ طلاق ہوئی اور طلاق بھی ان کے ہاں بائن❶ پڑھی۔ یہ کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ میاں صاحب غصے میں آئے' سالن میں ذرا نمک زیادہ ہو گیا تھا' بلڈ پریشر ذرا تیز تھا' غصہ میں آئے' طلاق طلاق طلاق یا ''تینوں تین طلاقاں'' (تجھے میں تین طلاق دیتا ہوں)۔ یہ آپ کے ہاں لفظ چلا آ رہا ہے۔ یہ تین دفعہ طلاق ہے۔ یہ نیلامی والا حساب ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ بولی لگانے والا کہتا ہے کہ 25 ون' 25 ٹو' یہاں تک تو دوسروں کو اختیار حاصل ہے کہ 25 سے آگے جو مناسب کہہ دیں اور جونہی اس نے 25 تھری کہا تو چل بھئی بولی ٹوٹی اور قصہ ہوا ختم۔ یہ تین طلاق ہوئیں' بیچاری دودھ پوت والی ہے' میاں کی اس طرح سے تلخی پر شادی کا قصہ ختم ہوا۔ یہ ہے صورت حال۔

---

❶ ایسی طلاق جس کے بعد رجوع نہ ہو سکے۔

## کھڑے کھڑے تین طلاقوں کے بعد بڑے میاں صاحب کی ندامت کا علاج: 4 بچوں کی ماں حلالہ کرے

اب گھنٹے بھر کے بعد ہی میاں صاحب کا بلڈ پریشر Low (کم) ہوگیا۔ اپنے کیے پہ ندامت ہورہی ہے۔ وہ بیچاری بال بچوں والی رورہی ہے۔ اس کے بعد پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! کوئی ایسی شکل ہے کہ یہ جو کچھ کر بیٹھا ہے اسے Undo (ختم) کیا جاسکے۔ آپ کو معلوم ہے اور میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' بار بار بیٹیوں' اور بہنوں کے سامنے کہنا پڑتا ہے۔ ان کے بقول کہ جی! اس کی شکل یہ ہے جسے حلالہ کہا جاتا ہے کہ وہ مظلوم و معصوم جس نے غصے کے تاؤ میں بھی کچھ نہیں کہا تھا' وہ ایک رات کے لیے کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔ اندازہ لگائیے کہ آپ کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ ان کے اعلانات سنیئے کہ صاحب! جو حقوق عورت کو قرآن مجید نے دیئے ہیں' وہ دنیا میں کہیں نہیں مل سکتے ''تُسیں آ حقوق دی لسٹ ویکھدے ترے جاؤ'' (حقوق کی یہ فہرست آپ دیکھتے چلے جائیں)۔ اس مقصد کے لیے وہ یہ کرتے ہیں۔

## ہمارے ہاں کے تراجم میں مرد عورت پر داروغہ ہے' خلع کے جان لیوا مراحل اور اربابِ شریعت کی مخالفت

قرآن کریم کہتا ہے کہ لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡهًا (4:19) تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔ میں کہتا ہوں اور باتیں تو چھوڑ دیجیے' کیا اس (مثلاً) اوپر دی گئی مثال سے بدتر کــرهــاً کی شکل کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟ اب آگے آپ کے ہاں پھر فقہ چلی ہے۔ یہ جو لامحدود اختیارات تھے' وہ تو ان کے ہاتھ میں دیئے کیونکہ قرآن مجید کی ایک آیت (4:34) کا ترجمہ کردیا کہ مرد گھر کے اندر داروغہ (Darogah) [1] ہیں۔ داروغہ تھانیدار کو کہتے ہیں' اس کے ساتھ حوالات ہوتی ہے اور اس کے پاس لامحدود اختیارات ہوتے ہیں۔ اس کے لیے اب کیا کریں؟ قرآن مجید سے کیسے نکلیں؟ میں ابھی عرض کرونگا کہ وہ جو اس سے نکلنے کی شکلیں ہیں' یعنی عورت کو بھی کسی قسم کی اجازت دو' اس کے لیے اب ایک اصطلاح اپنی طرف سے وضع کی۔ اسے خلع کہا جاتا ہے۔ مرد کے لیے تو طلاق ہے' جب کہ عورت کے لیے خلع کی صورت ہے۔ عورت کو عدالت میں جا کر خلع حاصل کرنا پڑتا ہے۔ خلع کا حاصل کرنا کس قدر دشوار گزار مرحلہ ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے کے بعد جب آپ کے ہاں کی فقہ اتنی مدون ہوگئی' اس پہ اس طرح عمل ہورہا ہے تو بھی اس پہ بڑی بڑی تفصیلیں اور بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اب بھی اگر خلع کا کوئی

---

[1] فارسی میں ''سب انسپکٹر پولیس'' یا ''تھانیدار'' کو کہا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دور (1857-1526ء) میں یہ کثیر الاغراض و مطالب افسر ہوا کرتا تھا جس کے ذمے بنیادی طور پر ایک مخصوص علاقے میں قیامِ امن اور محافظت کا کام ہوتا تھا اور وہی امنِ عامہ اور محافظت کا انچارج ہوا کرتا تھا۔
During the Mughals, every Faujdari district was further sub-divided into Thanas and Chowkis and each was put under a Darogah or Thanedar (Shah, Giriraj; History and Organisation of Indian Police, Anmol Publications Pvt. Ltd. New Delhi, 1999, P.58).

کیس کسی ہائی کورٹ میں چلایا جاتا ہے تو اس میں کس قدر پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور پھر اس خلع کے کیس کے اوپر سو سو صفحے کے فیصلے ان ججز کو لکھنے پڑتے ہیں۔ اُدھر یہ کیفیت ہے کہ کھڑے کھڑے طلاق طلاق طلاق کہا اور قصہ ختم ہوا جبکہ اُن کے اعلان کی یہ کیفیت ہے کہ صاحب! حقوق برابر کے دیئے ہوئے ہیں!!! کہ مرد اور عورت دونوں کو برابر کے حقوق دیئے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کے مقابل میں ایک حق' مرد کے برابر کا حق' اس کو ملے گا' بالعروف کہہ کر اس نے کہا ہے کہ ہم یہ صرف اخلاقی چیز نہیں رہنے دینا چاہتے' بلکہ قانوناً یہ کیفیت ہوگی۔ یہ جو **لھنا** اور **علیھنا** ہے' اس کو بالمعروف دیکھیے۔ آج عملاً آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ خلع حاصل کرنے میں' میں نے ابھی عرض کیا کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ ان دشواریوں کو سامنے رکھیے جو اس بیچاری کو کورٹ میں پیش آتی ہیں۔ جج کی دشواری کو بھی ملاحظہ فرمائیے' ایک خلع کا کیس Decide (فیصلہ) کرنے کے لیے ان کو سو سو صفحے کے Judgments (فیصلے) لکھنے پڑتے ہیں۔ اور اگر اس پہ بھی وہ فیصلہ عورت کے حق میں چلا جاتا ہے تو اربابِ شریعت کی طرف سے احتجاج کی صدائیں اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عدالت کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ یہ چیزیں اس طرح سے کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہاں حکومت شریعت کی نافذ ہوگی تو سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ عائلی قوانین کو منسوخ کیا جائے گا۔ عائلی قوانین میں بھی عورت کو معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کا حق نہیں دیا گیا' ان میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ نکاح کے معاہدے کے وقت' اس میں ایک خانہ ہوتا ہے' اس میں یہ لکھا جائے کہ خاوند بیوی کے حق تنسیخِ نکاح کو تسلیم کرتا ہے' یہ حق اس کو تفویض کر دیا ہے' ازراہِ کرم اس کو یہ حق بخش دیا ہے۔ اس میں صرف اتنا لکھا ہے۔ ان کو یہ بھی گوارہ نہیں ہے۔ عائلی قوانین میں اتنی سی بات بھی برداشت نہیں کی جا رہی کہ خاوند نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے۔ اب یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس حق کو منسوخ کیا جائے' یہ کیا حق ہے؟

کبھی آ جاتے تھے ہنسنے کو مرے رونے پر
تم کو یہ عیش بھی میرا گوارہ نہ رہا

انہیں یہ بھی گوارہ نہیں ہے۔

## گھریلو زندگی کے دوران الجھاؤ کی شکل میں قرآنِ حکیم کی طرف سے تجویز کردہ علاج

عزیزانِ من! قرآن حکیم ہے' یہ انسانی جذبات کو جانتا ہے' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ غصہ بھی آ سکتا ہے' یہ بھی معلوم ہے کہ گھر میں رہتے ہوئے ''او جیہڑا کہندے نیں پئی دو بھانڈے رکھے ہون تے اوو ی بعضے بعضے ٹکرا جاندے نیں'' (وہ جو کہتے ہیں کہ اگر دو برتن رکھے ہوں تو وہ بھی بعض اوقات آپس میں ٹکرا جاتے ہیں)۔ کبھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگر اس چیز کو ضابطے

کے اندر نہ رکھا جائے تو اس کے نتائج بڑے ناخوشگوار نکلتے ہیں اس کے لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو یہ معاملہ اس میاں بیوی کے درمیان میں نہیں رہتا بلکہ یہ معاشرے کا مسئلہ بن جاتا ہے اور معاشرے کا اس لیے ہے کہ سوال بچوں کا ہے۔ اس سے ان پہ بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ حق دونوں کو دیا گیا ہے لیکن تیزی میں آ کر اس حق کو یونہی استعمال کرنا شروع کر دیا جائے تو اُس سے بہت الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فیصلہ تو اپنے متعلق یہ خود کریں گے کوئی دوسرا مرد یا عورت یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ دل میں کراہت پیدا ہوگئی یا نہیں، کراہت کا فیصلہ تو کوئی جج بھی نہیں کر سکتا۔''اے تے جس تن لاگے، اوتن جانے'' لیکن کیا واقعی کراہت کی بنا پہ ایسا ہوا ہے یا یونہی جذبات مشتعل ہو جانے پر ایسا ہوا ہے، قرآن حمید اس کے لیے ایک ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت معاشرے کے لیے ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا (4:35)۔ یہاں اِنۡ خِفۡتُمۡ آیا ہے۔ اب یہ ان دونوں کا معاملہ نہیں رہا، یہ معاملہ معاشرے سے متعلق ہے، یہ نظام سے کہا گیا ہے، یہ حکومت سے کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ایسا محسوس کرو کہ ان دونوں میں کوئی ناچاکی کی شکل پیدا ہونے لگی ہے تو چپکے نہ بیٹھے رہو، بات بڑھتی جائے گی''رُسے نوں منایئے نہ، پاٹے نوسیویئے نہ، تے گل کیوں چلے''(اگر ناراض کو منائیں نہیں اور پھٹے ہوئے کو سیئیں نہیں تو پھر کیسے بنے)۔ وہ تو اور پھٹتا چلا جاتا ہے۔

## ناراضگی کی شکل میں مصالحت کی خاطر ایک کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے

آپ دیکھیں کہ اس معاملے میں قرآن مجید کی کیا راہنمائی ہے؟ کہا ہے کہ مسئلہ اگر ان دونوں کے درمیان رہے گا تو جذباتی رہے گا، باہر کا ہی کوئی Objectively (معروضی طور پر) حل کر سکے گا۔ کہا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ (4:35) اگر کسی میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو، مصالحت کی کوشش کرو۔ یہ مصالحت کی کوشش کیسے کی جائے؟ اس کے لیے کہا ہے کہ باہر کے آدمی گھر کے حالات کو زیادہ نہیں جان سکتے۔ اس لیے خاوند کے گھر والوں میں سے اور عورت کے گھر والوں میں سے، ایک ایک نمائندہ لے کر بیٹھو۔ ان سے پوچھو اور اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا (4:35) اس طرح، اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کر لیں یا دونوں ثالث ان میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں تو قانونِ خداوندی ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اس طرح ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرو، مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ آپ نے دیکھا کہ جو کچھ تیزی سے ہونا تھا، اس کی روک تھام کیسے کر دی۔ اب یہ ثالث Objectively (خارج سے) جذبات سے الگ ہو کر، معاملے کا جائزہ لے رہے ہیں اور کہا ہے کہ اس کے بعد اگر یہ دیکھیں کہ واقعی

اکراہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے' نباہ نہیں ہوسکتا تو ٹھیک ہے' پھر اس باندھے رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے' تب علیحدگی کرادو۔

## ازدواجی زندگی میں قوانینِ خداوندی کو Abuse (غلط استعمال) کرنا' مقرر کردہ حدود اللہ کو قائم نہ رکھنا

یاد رکھیے! قرآن حکیم نے یہ خِفْتُمْ (4:35) کی جو شکل معاشرے کو دی ہے' نظام کو دی ہے' حکومت کو دی ہے' ایک تو یہ کہ مصالحت کی شکل ہے۔ دوسری شکل بھی ہے۔ قوانین کو Abuse (غلط استعمال) بھی کیا جاسکتا ہے۔ ٹھیک ہے مومنین کی شکل میں تو وہ ایسا نہیں کرتے لیکن یہ بھی تو ہے کہ قوم تو ہمارے جیسی رہتی اور یہ احکام رہتے تو پھر ہر وقت یہ فکر ہوتی ہے کہ گریز کی راہیں کیسے نکالی جائیں۔ یہ شکل بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ نکاح کے معاملے میں مرد کو عورت کو کچھ دینا پڑتا ہے' ان زیورات وغیرہ کو اگر رواج بھی کہیں' تو مہر تو ایک ایسی چیز ہے' جسے ادا کرنا ہوتا ہے۔ بات اگر یونہی رکھی جائے کہ ہاں صاحب! جب مرد کا جی چاہے' معاہدے کو توڑ کر الگ کردے' اسی طرح جب عورت کا جی چاہے' وہ بھی توڑ کر الگ کردے۔ مرد توڑ کر الگ کردے تو اس صورت میں تو کوئی ایسی بات نہیں اور اگر عورت کوئی Abuse (غلط استعمال) کرنا چاہے تو معاملاتِ حیات خراب ہوتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کی عورتیں پیدا ہوجائیں کہ آج نکاح کیا' دس ہزار روپیہ مہر وصول کیا' آٹھویں دن یہ کہہ دیا کہ صاحب! کراہت پیدا ہوگئی' طلاق لی' اس کے بعد کہیں دوسری جگہ ایسا سلسلہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانین کے Abuse (غلط استعمال) کی یہ شکل بھی ہے۔

عزیزانِ من! قوانین کے Abuse (غلط استعمال) کی اس شکل کو روکنے کے لیے بھی قرآن مجید نے یہ بات کہی ہے کہ دیکھنا! یہ چیز یونہی مذاق نہ بنتی جائے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ** (2:229) اگر ذرا سا اندیشہ پیدا ہو کہ نکاح کے لیے جو قرآن نے یا خدا نے حدود مقرر کی ہیں ہم وہ قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اس معاہدۂ نکاح کو توڑا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس کی اجازت نہیں ہے کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔ قرآن کی وہ مقرر کردہ حدود مؤدت' سکینت اور رحمت ہیں۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ اس ازدواجی زندگی کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے۔ مؤدت' محبت سے بھی اگلا درجہ ہوتا ہے' سکون کی زندگی ہونی چاہیے' رحمت کی زندگی ہونی چاہیے۔

## طلاق کا فیصلہ تو بہرحال میاں بیوی کو ہی کرنا ہوگا' عدالت اس کی مجاز نہیں ہوسکتی مگر یہاں یہ فتویٰ مولوی صاحب دیتا ہے

اگر صورت حال یہ ہو کہ مصالحت کی شکل پیدا نہیں ہوسکتی تو پھر کوئی بات نہیں' معاہدہ ہی تو تھا' جکڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں' اسے توڑا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ** (2:229) اگر تمہیں میاں بیوی کی حیثیت سے

رہنے میں خدشہ ہو کہ تعلقات کی کشیدگی کی وجہ سے خدا کے مقرر کردہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے تو۔۔۔۔اس کے لیے **خِفۡتُمۡ** آیا ہے' معاملہ دونوں کا نہیں رہا۔ کہا کہ اگر تم محسوس کرو کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے اور یہ شکل ہو کہ ہو سکتا ہے کہ جو مہر کی رقم لی ہے' یہ محض اس کی خاطر ہو **فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ** (2:229) تو پھر عدالت اس چیز کا جائزہ لے کر فیصلہ کر سکتی ہے کہ نہیں' خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیے تو عورت کو اپنے حق میں سے کچھ نہ کچھ دینا ہوگا۔ یاد رکھیے! ایسا نہیں ہے کہ عدالت یہ فیصلہ کرے گی کہ طلاق ہو سکتی ہے یا نہیں؟ عدالت کو یا کسی اور کو یہ حق نہیں ہے کہ دونوں کو باندھ کر میاں بیوی بنا رکھیں' یہ Civil Suit (دیوانی مقدمہ) ہے جس میں عدالت نے Damages (نقصانات) کا فیصلہ کرنا ہے کہ خاوند کو اس سے جو نقصان پہنچ رہا ہے' اس کی تلافی کس طرح سے کی جائے' عدالت اس کی ڈگری دے گی' معاملہ اس طرح سے سنورتا چلا جاتا ہے لیکن جکڑ کر رکھنے کی جو شکل ہے' قرآن حکیم اسے پیدا نہیں ہونے دیتا۔

آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہاں عورت کو جکڑنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کو حق نہیں تاہم اگر وہ معاہدہ فسق کرنا چاہے تو اس کا سوال ہی نہیں اور اگر معاہدے کو فسق کرانا چاہتی ہے تو اس کے لیے موجودہ فقہ کی رو سے عدالت میں کن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف میں نے عرض کیا ہے کہ مرد کو اتنی بڑی چھوٹ ہے۔ اس میں مصالحت اور ثالث والی بات صرف مرد کے لیے ہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم کا یہ حکم دونوں کے متعلق ہے۔ عائلی قوانین میں ایک بات یہ بھی رکھی گئی ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ایک مصالحتی کونسل کوشش کرے کہ اُن میں مصالحت ہو جائے۔ اس پر مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مرد کے حقوق میں دخل اندازی کا کسی دوسرے کو حق حاصل نہیں۔ ٹھیک ہے اس کا حق اتنا بے اختیار ہے۔

اور یہ مرد کا ہی حق نہیں' عزیزانِ من! اور آگے بڑھیے۔ یہ حق تو کہیں اور جا کر آگے پہنچتا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہاں پہنچتا ہے؟ یہ فتویٰ ہے جس پہ آپ کے ہاں سارا زور ہوتا ہے۔ انہوں نے جو عقائد بنا رکھے ہیں' ان کی رو سے فتویٰ یہ ہے کہ یہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور ان کی بیویوں کے اوپر طلاق پڑ گئی۔ کہتے تھے کہ ''میاں بیوی راضی' تے کی کرے گا قاضی۔ اِتھے میاں بیوی بیشک راضی رہن'' (میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہاں میاں بیوی بیشک راضی رہیں مگر وہ مولوی صاحب راضی نہیں ہیں)۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا فیصلہ دیدیتا ہے۔ اور کسی ایک کے لیے نہیں' قوم کی قوم کے متعلق فیصلہ دیدیتا ہے کہ ان کی بیویوں پہ طلاق پڑ گئی۔

## فرقہ بندی کی بنا پر باہمی کفر کے فتوے کی وجہ سے بیویوں کی شامت

معاف رکھیے گا اگر ایک بات کر دوں کہ آپ کے ہاں اسلام کی تاریخ میں کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جسے دوسرے فرقہ والوں نے کافر

قرار نہ دیا ہوا ور کافر قرار دینے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان کی بیویوں پہ طلاق پڑگئی۔ اب ہر فرقے کے مسلمان کے ساتھ ایسا ہوا کہ ان کی بیویوں پہ طلاق پڑی ''آجیہڑی اے نسل جمی ہوئی اے تے فیراے کی اے'' (اب یہ جو نئی نسل پیدا ہوئی ہے تو پھر یہ کیا ہے)۔ تکفیر کا یہ تماشا اب بھی روزانہ ہوتا ہے۔ جب الیکشن میں صلح ہو جاتی ہے' تو کفر کا فتویٰ بھی چلا جاتا ہے اور ''طلاق وی مڑ کے جڑ جاندی اے آپے ای'' (طلاق بھی خود بخود جڑ جاتی ہے)۔ قرآن حمید نے یہ احکام دیتے ہوئے کہا تھا کہ ﴿لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ (2:231) دیکھنا! ہمارے احکام کو مذاق نہ بنالینا۔ آپ کو شاید اس تاریخ کا پتہ نہیں کہ ایک تو یہ کہ شوہر نے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہا اور بیوی کو ہمیشہ کے لیے چھٹی ہوئی اور دوم یہ کہ کوئی غیر متعلقہ شخص اس قسم کی شرط عائد کرے کہ تمہاری بیوی پہ لاگو ہوگی۔ یہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی' یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔

## دورِ ملوکیت میں بادشاہ کی بیعت کے موقعہ پر ایک اقرار نامے کی شرط کے سلسلہ میں اربابِ مذہب کا کردار اور امام مالک یمنی کی مخالفت

آپ کے ہاں جب ملوکیت شروع ہوئی تو بادشاہ اپنی بیعت کے لیے ایک معاہدہ لیتا تھا' اپنی رعایا سے اقرار لیتا تھا۔ وہ جو اقرار لیتا تھا' اس میں یہ لکھا ہوا ہوتا تھا کہ اگر میں اس سے پھر جاؤں تو میں خدا کے ہاں ملعون ہو جاؤں' خدا اور رسول کی مجھ پہ لعنت ہو۔ اس کے باوجود لوگ پھر جاتے تھے۔ بادشاہ سلامت نے ان اربابِ مذہب سے مشورہ کیا کہ صاحب! کیا کریں؟ اُنہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں' ہم بتاتے ہیں کہ کیا کیا جائے؟ چنانچہ معاہدے کی ایک نئی شکل' ایک نئی Form (صورت) مرتب ہوئی۔ یہ دوسری صدی ہجری کی بات ہے۔ اسے عباسیوں کا دور (750-1258ء) سمجھ لیجیے۔ اس معاہدے کے الفاظ یہ تھے' جس پہ دستخط کرنے پڑتے تھے۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ اربابِ مذہب نے بتایا تھا کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ معاہدے میں کیا شرط ہونی چاہیے' جس سے وعدہ خلافی میں رکاوٹ ہوگی' ان کی جو کیفیت ہے کہ آج اس پارٹی کے ساتھ اور کل Floor کراس کیا تو دوسری پارٹی کے ساتھ' ایسا نہیں ہوگا۔ چنانچہ آپ کے ہاں بیعت کی یہ Form (صورت) ایک مسلمہ بنا۔ اب بیعت کی Form (صورت) یہ تھی کہ اوپر تو سب کچھ وہی لکھا ہوتا تھا کہ میں یہ بھی مانتا ہوں' اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں' میں یہ بھی کرونگا' وفادار رہونگا' عہد شکنی نہیں کرونگا اور اس کے آخر میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ اگر میں نے اس میں عہد شکنی کی یا کوئی تبدیلی کی تو خدا سے' اس کی ولایت سے' اس کے دین سے' اور محمد رسول اللہ ﷺ سے' بَری ہو گیا یعنی میں ان کی ان تمام شرائط سے نکل گیا' ختم ہوا قصہ اور قیامت کے دن خدا سے کافر اور مشرک ہو کر ملونگا۔ یہاں تک یہ بات ہوگئی مگر جو بات پہلے چلی آرہی تھی' وہ یوں بدل کر یہاں تک ہی نہیں رہی بلکہ آگے بھی چلی ہے۔

عزیزانِ من! ان کی طرف سے یہ جو کہا گیا تھا کہ ہم بتاتے ہیں کہ طریقہ کیا ہے؟ وہ طریقہ آگے آتا ہے' اُس میں تو اضافہ ہوا تھا اور بعدازاں اس بیعت نامہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ آج میرے پاس جو عورت ہے یا اگلے تیس سال تک جس عورت سے میں نکاح کرونگا' اس کو اکٹھی تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ ''چل کتھے چلنا ایں'' (چلو' کہاں تک چلو گے اور بچو گے)۔اس بیعت نامہ پہ دستخط کرنے پڑتے تھے کہ جو آج بیوی ہے اس پر تو یہ طلاق پڑی مگر آنے والے تیس سال تک جو نکاح ہوگا' اس پہ بھی طلاق پڑے گی۔اس بادشاہ کی مدت قریباً تیس سال سے بھی کم ہوتی تھی' دوسرا بادشاہ آتا تھا تو وہ اپنے لیے بیعت نامہ میں لکھوا لیتا تھا کہ تیس سال تک جس عورت سے شادی کرونگا' بیعت سے پھرنے کی صورت میں اسے طلاق پڑے گی یعنی شادی سے پہلے ہی یہ طلاق کا معاہدہ ہو رہا ہے۔امام مالک یمنیؒ مدنی (179-93ھ) نے اس پہ اعتراض کیا تھا کہ صاحب! جو آنے والی ہے جس کے ساتھ ابھی نکاح ہی نہیں ہوا' اس کے اوپر بھی طلاقوں والی بات کا کیا جواز؟ تو آپ کو پتہ ہے کہ ان کو بیت لگے تھے۔یہ تھی اس بیچاری عورت کی حالتِ زار۔

## مذہبی پیشوائیت کی خودساختہ جکڑ بندیوں کے باعث یورپ کی بغاوت اور اس کے اثرات

طلاق کے بارے میں عورت پہ زد پڑنے کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔اب وہ سلطنتیں بھی ختم ہوگئیں' وہ بادشاہ بھی ختم ہوگئے' وہ قصہ بھی ختم ہوگیا' سانپ نکل گیا ہے اب لکیر پیٹا کریں لیکن شریعتِ حقہ کے احکام ہنوز باقی ہیں۔آج وہی اقتدار و اختیار مفتی صاحب نے لے لیا ہے کہ جس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر دیں کہ یہ دائرہ اسلام سے خارج ہوا ہے' اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی کو طلاق پڑ گئی۔یہاں سے یہ بات شروع ہوئی۔یہ ہیں' عزیزانِ من! مذہبی پیشوائیت کی خود تراشیدہ' غیر فطری' جکڑ بندیاں جن سے انسان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ یورپ میں بھی ایسا ہوا اور اس کے ردِعمل کے طور پر وہ آج تک خدا' وحی' عاقبت اور قانونِ مکافات' ان سب چیزوں سے' انکار انکار انکار کرتے ہیں۔سنیے! وہ یونہی انکار نہیں کر رہے' یہ چیزیں ان کے اوپر لاگو ہوئی تھیں۔کبھی❶ آپ یورپ کی Freedom of Thought (آزادیٔ فکر) کی History of Rationalism (تاریخِ عقلیت) پڑھیں تو پتہ چلے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے' آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دور میں مذہب پرست طبقے نے ان مخالفت کرنے والوں کے اوپر کس قدر عذاب مسلط کر رکھا تھا۔بس یوں کہیے کہ ذرا سا عقیدے میں فرق آیا تو وہ زندہ جلا دیئے جاتے تھے' کھالیں کھنچوا دی جاتی تھیں' بھسم

---

❶ آج ہمیں اپنی ہی اُس ہسٹری پر غور کرنا ہے جو ہر آن قدم قدم پہ رقم ہو رہی ہے

کردیا جاتا❶ تھا' طلاقیں پڑ رہی تھیں' ان پہ عذاب نازل ہوا تھا' صدیوں تک یہ ہوتا رہا تا آنکہ یورپ نے پھر ایک کروٹ لی۔ تنگ آمد بجنگ آمد لیکن وہ کیا کرتے' آنے والی نسلوں کے سامنے کوئی دوسرے ضوابط تو ایسے تھے نہیں جو اعتدال پہ رکھتے' انہوں نے مذہب کی طرف سے جو عائد کردہ پابندیاں تھیں' ان کے لبادے کو اتارا تو دین اور خدا کو بھی ساتھ ہی تیاگ دیا صاحب! اور اس کے بعد پھر ان کو آزادی ملی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ آزادی نہیں تھی' یہ توری ایکشن ہوتا ہے' اس کا ردِعمل ہوتا ہے جس کے نتائج بھی کچھ اچھے نہیں ہوتے۔

## آج یورپ میں ازدواجی زندگی کی حیران کن ناگفتہ بہ حالت

یورپ میں اس ردِعمل کے بعد جو آزادی ملی ہے تو اس کے نتیجے میں آج وہاں یہ کیفیت ہے کہ نکاح اور طلاق ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے نکاح کی رسم بھی اڑانی شروع کردی۔ پہلے یہ ہوا کہ صاحب! کوئی بات نہیں' نکاح کے بغیر بھی بالغ لڑکا اور لڑکی جنسی اختلاط پیدا کرلیں تو معاشرتی قانونی اعتبار سے یہ جرم ہی نہیں تھا' نہ ہی یہ چیز معیوب تھی۔ ایسا ہوجاتا تھا کہ اس دوران میں لڑکی کو حمل قرار پا گیا' بچہ پیدا ہوا تو وہ جو بچہ تھا وہ معاشرے کے لیے ایک پرابلم بن جاتا تھا' انہوں نے قانون پاس کردیا کہ اگر یہ لڑکا' اس لڑکی کے ساتھ بعد میں شادی کرلے تو اس بچے کو بھی جائز اولاد تسلیم کیا جائے۔ اس سے بھی پرابلم ہوگئی کہ وہ لڑکا شادی نہیں کرتا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ چلو قصہ ختم کرو صاحب! ہر بچہ قانوناً جائز بچہ ہوتا ہے۔ چلیے وہاں یہ قصہ ختم ہوا۔

وہاں طلاق کا معاملہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ روز یہ چیزیں ہیں کہ صاحب! میں آئی تھی اور میں نے کیسا عمدہ ہیٹ لیا ہے مگر ''اس'' کے چہرے پر مسرت کے آثار نہیں آئے تھے' اس لیے میں طلاق مانگنا چاہتی تھی۔ (یا مثلاً) ''اس'' نے میرے کتے کو پیار نہیں کیا تھا' طلاق مانگنا چاہتی ہوں۔ ''بلی نوں گھوریا سی اینے' طلاق دینی چاہیدی ہیگی اے'' (''اس'' نے بلی کو گھورا تھا' طلاق دینی چاہیے) یعنی وہاں اس ردِعمل کا نتیجہ ایک مذاق بن گیا ہوا ہے۔

آج نوجوان نسل اس کے لیے دلیل یہ دیتی ہے کہ جو شادی ہے' وہ لومیرج ہونی چاہیے' رومانس کی شادی ہونی چاہیے' اس کے بغیر شادی کیا ہوتی ہے صاحب! کچھ نہیں۔ لیکن یہ رومانس' محبت کی شادیاں' اس کے بعد نتائج' یہ Divorces (طلاقیں) وغیرہ' عام ہیں۔ ذرا بتائیے کہ وہ کیا چیز پیدا کررہے ہیں؟ اس کے لیے میں انہی لوگوں کی ایک شہادت پیش کردینا چاہتا ہوں۔

---

❶ اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ البقرۃ (3)' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2011' ص ص۔ 99 تا 100' اور ص۔ 100 کا فٹ نوٹ 1۔

عزیزانِ من! یہ شہادت کسی صاحبِ زُہد کی نہیں' کسی ملاّ کی نہیں' کسی پادری کی نہیں' یہ شہادت ایک ایسے شخص کی ہے جو ملحد ہے' خدا کو ہی نہیں مانتا' وہ ایسا شخص ہے جو خود کہتا ہے کہ جنسی اختلاط کے اوپر اتنی اتنی اخلاقیات کی بندشیں تم نے لگا رکھی ہیں' یہ غلط ہیں' ان میں ڈھیل دینی چاہیے۔ وہ اس کے اوپر ایک کتاب تک لکھتا ہے۔ یہ شخص برٹرنڈ رسل (1970-1872ء) ہے۔ حال ہی میں (2 فروری 1970ء میں) اس کا انتقال ہوا ہے۔ اس کی کتاب کا نام ہے "Marriage and Morals"۔ وہ اس کتاب کے اندر یہاں تک Advocate (وکالت) کر رہا ہے کہ یہ ناروا پابندیاں ہیں' جو مذہب نے' سوسائٹی نے' قانون نے' جنسی اختلاط کے متعلق عائد کر رکھی ہیں۔ یہ غلط ہیں' یہ اُٹھا دینی چاہئیں۔ اس کے باوجود جب وہ لومیرج یا رومانس کی شادی کہتے ہیں' اس کے عواقب اور نتائج پر وہ پہنچتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے۔

امریکہ میں اس قبیل کی شادیاں زیادہ ہوگئیں ہیں یا شاید یہ بھی ان کی نیشنل ازم تھی کہ مثال وہ امریکہ کی دیتا ہے اگرچہ خود انگریز ہے لیکن بہرحال جس ملک میں یہ بہت زیادہ ہوگئیں ان کے متعلق لکھتا ہے اور یہ یاد رکھیے! کہ یہ آج کی بات نہیں ہے جو وہ اپنی کتاب میں کہہ رہا ہے ❶۔ اس کی وہ کتاب 1929ء میں پہلی دفعہ چھپی ❷۔ اف میرے اللہ! اس زمانے میں یہ کچھ ہے تو ان چالیس ❸ سالوں کے عرصے میں' تو پوچھو ہی نہیں' وہاں ندیاں طوفان بن گئی ہیں' دریا سمندر بن چکے ہیں۔ آج تو پوچھیے ہی نہیں کہ کیا حال ہے۔ اُس زمانے میں یہ کیفیت تھی۔ وہ یہ بیان کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اسی کے الفاظ دہرانے چاہئیں۔ اقتباس لمبا ہے لیکن نہایت ضروری ہے اور خاص طور پہ ہماری جو موجودہ جنریشن (نسل) آ رہی ہے' جو ان کی تقلید کا نام آزادی رکھتی ہے' ان کے لیے خاص طور پہ' میں چاہتا ہوں کہ یہ انہی کے الفاظ دہرا دوں۔ انگریزی نہ سمجھنے والے احباب سے معذرت کے ساتھ' وہ لکھتا یہ ہے:

"In America where the romantic view of marriage has been quoted more seriously than anywhere else, and where law and custom alike are based upon the dreams of spinsters, the result has been an extreme prevalence of divorce and an extreme rarity of happy marriage. Marriage is something more serious than the pleasure of two people in each other's company; it is an institution which, through the fact that it gives rise to children, forms part of the intimate texture of society, and has an importance an extending far beyond the personal feelings of the husband and wife. It may be good - I think it is good - that romantic love should form the motive for a marriage, but it should be understood

---

❶ یہ آج سے 80 سال پیشتر کی بات ہے۔

❷ Russel, Bertrand (1929). Marriage and Morals. London: George Allen & Uwin.

❸ یاد رہے کہ یہ بات جولائی 1970ء کی 26 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

that the kind of love which will enable a marriage to remain happy and to fulfill its social purpose is not romantic but is something more intimate, affectionate, and realistic. In romantic love the beloved object is not seen accurately, but through a glamorous mist; undoubtedly it is possible for certain type of woman a remain wrapped in this mist even after marriage provided she has a husband of a certain type, but this can only be achieved if she avoids all real intimacy with her husband and preserves a sphinx-like secrecy as to her inmost thoughts and feeling, as well as a certain degree of bodily privacy. Such maneuvers, however, prevent a marriage from realizing its best possibilities, which depend upon an affectionate intimacy quite unmixed with illusion.

(Reference: Russel, Bertrand: Marriage and Morals, George Allen & Unwin, 1929, PP. 75-76) .

## ازدواجی زندگی اور تمدنی زندگی میں مذہبی پیشوائیت کی سوچ اور مغرب کی مادر پدر آزادی کے برعکس قرآنِ حکیم کی راہنمائی

میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں Extreme (انتہائی) چیزوں کو سامنے رکھ لیا جائے۔ ایک طرف وہ جکڑ بندیاں ہیں جس میں مذہبی پیشوائیت نے باندھ رکھا تھا' دوسری طرف یہ آزادیاں ہیں جنہیں مادر پدر آزادیاں کہنا چاہیے تو اس کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن حکیم نے اس باب میں جو راہنمائی دی' جو ہدایات دیں' جو احکام دیئے' جو ضوابط دیئے' وہ کس طرح سے ایک اعتدال کی راہ پر انسانیت کو چلاتے چلے جاتے ہیں۔

ایک طرف یہ کیفیت ہے کہ قرآن حکیم کہتا ہے کہ **لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا** (4:19) تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔ تمہیں صرف یہ اجازت ہے کہ **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3) خوشگوار حیثیت سے' باہمی رضامندی سے' رشتۂ رفاقت کو استوار کرو۔ اس کے بعد یہ ہے کہ باہمی مؤدت سے رہو' سکینت سے رہو' رحمت سے رہو۔ بچوں کے معاملے میں اس نے راہنمائیاں دے کر گھر کو جنت کا نقشہ بنایا' نکاح کو ہم آہنگیٔ فکر ونظر کی بنیاد قرار دیا۔ یہ سارا کچھ کرتے ہوئے اگر ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں کہ نباہ نہیں ہو سکتا' تو کہا ہے کہ اس صورت میں بھی کوئی جکڑ بندی نہیں ہے لیکن اس چیز کو دونوں کے جذبات کی مرضی کے اوپر نہیں رکھا۔ یہاں آ کر معاشرہ دخل انداز ہوتا ہے' وہ Objectively (معروضی طور پر) ان کے معاملے کو Study (گہرائی میں جا کر غور) کرتا ہے' مصالحت کی شکلیں پیدا کرتا ہے' تجویزیں دیتا ہے' کسی پارٹی کو بھی معاہدے کی شرطیں Abuse (غلط استعمال) نہیں کرنے دیتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ **وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ**

یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ (4:19) اور دیکھو ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ مردوں سے کہتا ہے کہ یہ شکل پیدا نہ کرو کہ تم ان کو کسی طرح سے اس لیے روکے رکھو کہ وہ کچھ دے دلا کر تم سے پھر نجات حاصل کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر کہیں کھلی ہوئی بے حیائی کی کوئی شکل پیدا ہو جائے ورنہ یہ شکل نہ پیدا کرو کہ محض اس سے کچھ بٹورنے کی خاطر' تم اس کو جکڑے رکھو۔ کہا ہے کہ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (4:19) قاعدے قانون کے مطابق اس سے حسنِ معاشرت سے کام لو۔ اور پھر یہ کہتا ہے کہ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا (4:19) کوئی ناگواری کی بات بھی ہو تو فوری فیصلہ نہ کر لیا کرو' تیزی سے فیصلہ نہ کر لیا کرو' ٹھنڈے دل سے خود سوچو' مصالحت کے لیے بورڈ مقرر کرو' ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں بظاہر ناگوار سی نظر آئے' حقیقت میں وہ تمہارے لیے بڑے فائدے کی بات ہو' تم خود فیصلہ نہیں کر سکتے' تمہاری قوتِ فیصلہ پر جذبات غالب آ گئے ہوئے ہیں' معاشرے کے ثالثوں کو اس معاملے کے اندر فیصلہ کرنے دو۔

## ایک سے زیادہ بیوی کرنے کے مسئلے کا حل اور باہمی رفاقت کی نوعیت

قرآن مجید کہتا ہے کہ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (4:20) اور اگر تم یہ فیصلہ کر لو کہ ایک بیوی کو طلاق دے کر' کسی اور جگہ نکاح کرنا ہے۔ دیکھیے! یہاں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کے متعلق بات ہوئی ہے۔ یہ چیز شروع میں آ چکی ہے۔ وہاں میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید کن حالات میں ان کی اجازت دیتا ہے اور اس ایک مرد ایک بیوی کے قانون میں استثنٰی کرتا ہے۔ یہاں (4:20) میں یہ ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ نباہ نہیں ہو رہا' معاہدۂ نکاح فسخ کیا ہے' طلاق ہو گئی ہے۔ اگر تم پھر اس عورت کی جگہ کوئی دوسری عورت لانا چاہتے ہو یا اس کی جگہ دوسری عورت آ رہی ہے' یہ اس کی موجودگی میں نہیں ہے تو کہا ہے کہ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا (4:20) اور اگر تم اس کو سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہوئے ہو تو اس صورت میں اس سے واپس نہ لو۔ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا (4:20) اس کے لینے کی یہی شکل ہو گی کہ تم اس کے خلاف بہتان تراشی کرو۔ وہ جو کہا تھا کہ بے حیائی کی صورت میں یہ ممکن ہے تو یہ کتنی بڑی بات ہے۔ کہا ہے کہ وَ كَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (4:21) یہ اس قسم کے باہمی معاملے کرتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے سے باہم ندیوں کی طرح ملے ہوئے تھے۔ کیا لفظ ہے قرآن کریم کا! کہ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (4:21) باہم ندیوں کی طرح مل گئے ہوئے تھے' ذرا سوچو کہ تعلقات کیا تھے' اس کے بعد اس قسم کے کاروبار اور اس قسم کے معاملے کرتے ہو' انہیں سوچو۔ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا (4:21) اور وہ تو تم سے ایک بہت بڑا عہد بھی لے چکی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایسی ذہنیت نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں! اگر وہ اس چیز کو Abuse (غلط استعمال) کرتی ہے کہ مہر

وصول کیا جائے' محض اس غرض سے کہ وہ مہر کی رقم اس کے ہاتھ میں آ جائے' وہ تم سے چھٹکارا حاصل کرتی ہے تو ٹھیک ہے وہ جو ثالثی کمیٹی بیٹھی ہے' وہ اس کے معاملے میں عدالت سے رپورٹ کرے گی' عدالت فیصلہ کرے گی کہ آیا اس عورت کو یہ کچھ دینا ہوگا یا نہیں۔ میں پھر عرض کروں کہ اس میں جکڑ بندی کی شکل تو کہیں بھی پیدا نہیں ہوگی۔

## میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بھی حسن کارانہ انداز کی جھلک

نکاح کا معاہدہ اگر تراضیِ مابین نہ رہے اور اس کے رکھنے کی کوئی شکل باقی نہ رہے' تو وہ ختم ہوگا۔ اس میں کوئی تیسرا دخل نہیں دے سکتا' عدالت یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ طلاق ہونی چاہیے یا نہیں ہونی چاہیے۔ اگر مصالحت کی صورت نہیں ہوگی تو طلاق کی صورت پیدا ہوگی' وہ یہ فیصلہ کرے گی کہ اس کی وجہ سے کسی پارٹی کو جو نقصان پہنچا ہے' اس کی تلافی کس طرح سے ہوگی۔ اس میں بھی قرآن حمید اخلاقی پہلو کو مقدم رکھتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ کل تک تمہارے باہمی تعلقات کیا تھے۔ یہ وہ تعلقات تھے جو کسی دوسرے جوڑے کے ہو ہی نہیں سکتے' اتنے تعلقات کے بعد اگر الگ ہونے لگے ہو تو پھر حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ۔ **وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا** (73:10) آپس میں اکٹھے ہوئے تھے تو حسن کارانہ انداز سے ہوئے تھے' اب الگ ہو رہے ہو تو پھر بھی حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ اس کے بعد باہمی جھگڑے شروع ہو جائیں' تم تماشہ بنالو' معاشرے کے اندر کھیل بن جاؤ' ساری دنیا تمہارا مذاق اڑائے' ہنسی اڑائے' بے عزتی ہو' ناموس چلا جائے' طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ یہ بات پیدا نہ کرو۔ یہ نہ کرو جو اس نے کہا تھا کہ ''میری لگدی کسے نے نہ ویکھی' تے ٹٹدی نوں جگ جاندا' ایویں نہ کرو کہ سارا جگ تہاڈی جگ ہنسی کرے'' (جب میری دل لگی ہوئی تو کسی کو کان و کان خبر نہ ہوئی اور اب جب یہ تان ٹوٹی ہے تو دنیا جہاں دیکھ رہا ہے' ایسے نہ کرو کہ ساری دنیا میں تم سامانِ اضحوکہ بن جاؤ)۔ وہاں بھی **وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا** (73:10) حسن کارانہ علیحدگی ہے۔ اور اس کے لیے ایک باہر کی خارجی طاقت کو کہا ہے کہ تم درمیان میں آؤ' جذبات سے معاملے حل نہیں ہونگے' تم اس معاملے کو سلجھا دو۔

## قوانینِ خداوندی کے سامنے یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات کا موجب بن سکتا ہے

عزیزانِ من! اس پس منظر میں جو میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہودیت کے قوانین ہیں' عیسائیت کی بے بسی ہے' فلسطینی زندگی کے اندر مرد کی داروغیّت ہے' اور رومنز کے رومانس ضرور ہیں لیکن اس کے بعد عورت کی حیثیت صرف بچوں کی ماں کی تھی' اس سے زیادہ کی نہیں۔ ہندوؤں کے ہاں کی وہ پابندیاں ہیں' ایران والوں کی مباحات کی صورتیں ہیں کہ بیٹی اور بہن سے بھی نکاح کے رشتے ہیں' عربوں کے ہاں کی صورتیں کہ عورت بالغ ہے تو بھی ولی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی' یہ تمام چیزیں ایک طرف رکھیے اور اس پس منظر میں

قرآنِ کریم سے عائلی زندگی کے متعلق جو کچھ اس نے کہا ہے' اسے سامنے رکھیے' اس کے بعد دیکھیے کہ مذہبی پیشوائیت کی جکڑ بندیاں' آپ کے ساتھ پھر کیا کر رہی ہیں' یورپ میں کیا ہوا تھا' اس کا نتیجہ کیا ہے؟ وہی امریکہ میں ہوا جس کو برٹرنڈ رسل (1970-1872ء) نے بیان کیا ہے اور جو روزمرّہ ہمارے سامنے چیزیں آ رہی ہیں۔ نہ اس قسم کی جکڑ بندیاں رکھیے' نہ اس قسم کی بے مہابہ آزادیاں رکھیے' ہر آزادی اس وقت تک آزادی رہتی ہے جب تک یہ پابندی کے ماتحت رہے۔

## آزادی بغیر پابندئ قانون کا حشر سوائے تصادمات کے اور کچھ نہیں ہوتا

آزادی بغیر پابندی کے وہی ہوتی ہے جو سڑک کے اوپر Keep to the left (بائیں چلو) کے قانون کو توڑ کر ہوتا ہے۔ آپ ذرا بائیں چلو کے قانون کو آزاد ہو کر چھوڑ دیجیے' جائیے جس کا جی چاہے Right (دائیں) پہ' جس کا جی چاہے Left (بائیں) پہ' آدھے گھنٹے کے بعد دیکھیے پھر سڑک پہ ہوتا کیا ہے۔ آزادی بغیر پابندئ قانون کا نام نہیں ہے۔

## جبر ہے دل پہ کس اختیار کے ساتھ!

آزادی بغیر پابندئ قانون کے نتائج کس قدر تباہ کن ہوتے ہیں! اس لیے یہ پابندیاں نہیں ہیں جو قرآن حکیم نے عائد کی ہیں' یہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے باہمی معاہدے کی شرطیں ہیں۔ انہیں قائم کرتے وقت غور و فکر سے کام لو' چھوڑتے وقت بھی یہ چیز نہ کرو کہ محض جذباتی طور پہ ان چیزوں کو چھوڑ کر' توڑ کر' الگ ہو جاؤ' اس وقت بھی قرآن حکیم کہتا ہے کہ حسن کارانہ انداز سے' یہ کچھ کرو۔

سورۃ النسآء کی آیت 21 تک ہم آئے' آگے قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ کون کون سے رشتے ایسے ہیں جن کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ انہیں ہم آئندہ اتوار پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

# آٹھواں باب: **سورۃ النسآء** (۱)' (آیات 22 تا 24)

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 2 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ النسآء کی 22ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:22)۔

## زوجیّت کے لیے رشتوں کے چناؤ میں حلال وحرام کی تمیز اور زوج کا بنیادی اور عملی مفہوم ومقصود

جیسا کہ میں نے اس سورۃ کے ابتدا میں عرض کیا تھا' اس کی ابتدائی آیات میں بالخصوص عائلی زندگی کے متعلق احکام اور ہدایات دی گئی ہیں اور آج جو آیات ہمارے سامنے آ رہی ہیں' ان میں یہ حکم بڑے متعین طور پر سامنے لایا گیا ہے کہ وہ رشتے کون کون سے ہیں جن سے نکاح حرام ہے۔ پہلے تو یہ کہا گیا تھا کہ جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی شکل جائز یا حلال ہے اور وہ ہے نکاح کی صورت۔ نکاح کے حدود اور قیود بھی قرآن حمید نے خود متعین کیے کہ اس سے مقصد نہ تو محض جذباتِ جنسی کی تسکین ہے' نہ ہی محض افزائشِ نسل بلکہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے زوج ہوتے ہیں اور زوج کے معنی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی تکمیلِ ذات کا ذریعہ بننا۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ تزویج کے لیے یعنی زوج بننے کے لیے مقدم چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ فکر اور نظر کی ہم آہنگی ہو' خیالات اور معتقدات کی یک رنگی ہو' قلب اور دماغ کی موانست ہو' مزاج اور طبائع کے اندر یگانگت ہو' اس سے جو رشتہ استوار ہوگا قرآن حمید نے کہا ہے کہ اس سے باہمی مؤدت' سکینت اور رحمت پیدا ہوگی۔ اور جب میاں بیوی میں یہ کیفیت ہوگی تو ان کی اولاد کی پرورش اور تربیت بھی اسی ماحول میں ہوگی اور اس طرح سے یہ گھر اس دنیا میں جنّتی معاشرے کا نمونہ پیش کرے گا۔ یہ تھا قرآن مجید کی رو سے نکاح کا مقصد یا عائلی زندگی بسر کرنے کا مقصود۔

## کشیدگی کی بنا پر حفاظتی تدابیر کے لیے قرآنِ کریم کے تجویز کردہ انتظامات کی شکل وصورت اور اہمیت

پھر قرآن کریم نے یہ بتایا تھا کہ اتنی حفاظتی تدابیر کے باوجود ہوسکتا ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ میاں بیوی میں مناقشت ہو جائے' ان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوجائے تو اس کی پہلی شکل تو اس نے یہ بتائی تھی کہ یہ بات پھر میاں بیوی تک نہ رہنے دو کیونکہ جن کے تعلقات کشیدہ ہوجاتے ہیں وہ خود ان کو استوار نہیں کرسکتے کیونکہ اس وقت جذبات پر شدت کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی تیسری پارٹی ہو' کوئی ثالث ہو جو معاملات کو غیر جانبدارانہ حیثیت سے دیکھ سکے' Objectively (معروضی طور پر) ان کا مطالعہ کرسکے۔ انہیں آگے بڑھنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان میں مصالحت ہوجائے لیکن اگر کبھی ایسی شکل پیدا ہو کہ نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو بجائے اس کے کہ اس اَن جوڑ جوڑے کو زبردستی باندھ کر رکھا جائے' اس نے کہا ہے کہ نہایت حسن کارانہ انداز سے علیحدہ ہوجانا چاہیے۔

اس علیحدگی کے لیے بھی اس نے شرائط مقرر کیں' حدود و قیود مقرر کیے' آئین وضوابط مقرر کیے۔ عائلی زندگی یا گھر کی زندگی کو قرآنِ کریم کے نزدیک اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں زندگی کے کسی گوشے کے متعلق بھی قوانین اور احکام اتنی تفصیل اور تدوین سے نہیں دیئے جتنے عائلی زندگی کے متعلق دیئے ہیں' بات ہے بھی اتنی اہم۔ جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں' یہ گھروں ہی کی حاصل جمع کا ایک نام ہوتا ہے۔ ہماری گھریلو زندگی جس قسم کی ہوتی ہے' اسی قسم کا ہمارا معاشرہ بنتا ہے۔ گھروں کی دیواروں کو اگر درمیان سے ہٹا دیا جائے تو وہ معاشرے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ معاشرے کو ایک خاص قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے تو اس کی ابتدا گھروں کی زندگی سے کرتا ہے کہ جیسی زندگی گھروں کے اندر ہوگی' اسی قسم کی اس معاشرے کی کیفیت ہوگی۔ یہ وجہ ہے کہ وہ عائلی زندگی کے متعلق قوانین کو اتنی تفصیل سے' اتنی تدوین سے' بیان کرتا ہے۔ یہ کچھ کرتے ہوئے ہم وہاں آگئے جہاں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اب اس نے یہ کہا ہے کہ کون کونسے رشتے ایسے ہیں جن میں نکاح نہیں ہوسکتا' ان کے اندر نکاح کی صورت حرام ہے۔

## زوجیّت کے سلسلہ میں دورِ جہالت کی کیفیت اور وحی کی راہنمائی کے باوجود ہماری حالت

اس میں شبہ نہیں کہ مختلف قوموں' اور مختلف قبائل میں بھی' شروع سے ہی نکاح کے بارے میں کچھ پابندیاں تھیں یعنی ان کے ہاں ایسے رشتے تھے جن سے وہ نکاح نہیں کرتے تھے۔ یہ چیز شروع سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ملنے کا تعلق ہے' یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے نبی کی وساطت سے جو ہدایت ملی ہوگی' وہ بھی اسی انداز کی ہوگی' یقینی طور پہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابتدائی قبائل کے اندر جو رسوم ورواج نظر آرہے ہیں' وہ بالضرور وحی کی تعلیم پر ہی مبنی ہیں۔ وہ تو خیر وحشی قبائل تھے۔ یہ زمانہ قبل از تاریخ کی بات

ہے' جہالت تھی' بربریت تھی' تمدنی زندگی نہیں تھی۔ہم تاریخی حیثیت میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس ان کے نبی کی تعلیم موجود تھی۔رسم و رواج کی کیفیت تو یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی قوم' جس میں سب سے آخری نبی ﷺ آئے' جس کے پاس اس نبی ﷺ کی رو سے دی ہوئی کتاب حرفاً حرفاً غیر محرف شکل میں آج تک موجود چلی آ رہی ہے' خود اس قوم کے اندر بھی آپ کو ایسے رسم و رواج ملتے ہیں' آپ دیکھیے گا کہ وہ اس تعلیم سے' اس قرآن کریم سے' کتنے مختلف ہیں۔جن قوموں کے متعلق ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے پاس خدا کی روشنی تھی' اور جو آج مدعی بھی نہیں ہیں کہ ان کے پاس کوئی ایسا ضابطہ تھا' رسم و رواج کے اعتبار سے ہی سہی' ان میں بھی نکاح کے معاملہ میں کچھ پابندیاں ضرور تھیں۔قرآنِ کریم نے جو ان رشتوں کی فہرست دی ہے جن سے نکاح حرام ہے' ان میں بھی وہ رشتے موجود ہیں جو انسانوں میں شروع سے ہی حرام چلے آتے تھے' ایسے بھی ہیں جس میں قرآن کریم نے خود اصلاح کی ہے' کچھ حق واضافہ کیا ہے۔

## شادی کے سلسلہ میں ایران جیسی متمدن قوم میں بادشاہوں کی حالت اور عربوں کا ذکر

انسانوں میں قرآنِ حکیم سے پہلے جو رشتے حرام چلے آتے تھے' وہ یہ نہیں تھا کہ تمام دنیا کے انسانوں میں ایک ہی قسم کی فہرست تھی' مثلاً ذہن میں آ سکتا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ تو کبھی بھی لوگ نکاح نہیں کرتے ہونگے۔یہ بھی غلط تھا۔عرب کے ساتھ دیوار بہ دیوار ایران کی سلطنت تھی۔یہ وحشیوں کی نہیں بلکہ دنیا کی دو سب سے بڑی متمدن قوموں میں سے ایک متمدن قوم تھی۔دنیا کی دو سب سے بڑی تہاذیب میں ایک رومی تہذیب اور دوسری ایرانی تہذیب تھی۔میں سمجھتا ہوں چائنا (چینی) تہذیب کے ساتھ یا کم از کم اس سے ذرا بعد' دنیا کی قدیم ترین تہاذیب میں سے ایران کی تہذیب تھی اور اس ایران میں چھوٹے موٹے لوگ تو ایک طرف رہے' خود بادشاہ بہنوں اور بیٹیوں سے شادی کرلیا کرتے تھے' عربوں میں سوتیلا بیٹا سوتیلی ماں سے شادی کر لیتا تھا' شادی ہی نہیں کر لیتا تھا بلکہ وہ وراثت میں آ جاتی تھی۔ورثہ کی طرح ان بیٹوں میں وہ بانٹ لی جاتی تھی اور بڑا بیٹا عام طور پر اس کو ورثہ میں لے لیتا تھا۔ایک طرف تو یہ صورت تھی کہ بیٹیوں اور بہنوں سے بھی نکاح کرلیا جاتا تھا' دوسری طرف انہی ایرانیوں کی وہ شاخ جو ہندوستان میں آ کر بس گئی اور جنہیں آریا (Arians) کہا جاتا ہے ان کی کیفیت بھی غور طلب تھی۔

## ہندوؤں کے ہاں رشتہ ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا

معلوم نہیں آپ لوگوں نے اس زمانے میں دیکھا یا نہیں کہ ہندوؤں کے ہاں رشتہ کیسے ڈھونڈا جاتا تھا۔یہ وہ تھا جسے جوئے شیر کا لانا کہتے ہیں۔یہ باپ کی طرف سے پتہ نہیں کہ دس یا سو رشتے چھوڑتے تھے' ماں کی طرف سے بھی اتنے ہی چھوڑتے تھے' وہ ذات برادری

گوت در گوت میں اتنی دور تک جاتے تھے کہ ان کے لیے رشتہ ڈھونڈنا کوہ کنی کے برابر تھا' یہ چیز رشتے کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی۔ گویا ایک طرف اگر تفریط کا یہ عالم' کہ بہنوں اور بیٹیوں سے بھی شادی کر لیتے تو دوسری طرف افراط کی یہ کیفیت کہ سو سو رشتے ان کو چھوڑنے پڑتے تھے' تب کہیں جا کر آپس میں وہ جوڑے کو ملاتے تھے۔ اس افراط و تفریط میں سے قرآن حکیم نے نکالا ہے۔ اس نے جو رشتے حرام قرار دیئے ہیں اگرچہ انسانوں میں کہیں کہیں استثنا نظر آتی ہے لیکن یہ وہی تھے جو بالعموم حرام چلے آتے تھے۔

## نکاح کے رشتوں کی ممانعت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا حکم: جو ہو چکا' وہ ہو چکا مگر اب نہیں

اس میں قرآن حکیم نے کچھ اصلاح کی ہے مثلاً یہ کہ حقیقی ماں' بیٹی اور بہن میں آپ دیکھیے کہ عام طور پہ ان کا احترام اتنا ہے کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ ان کے ساتھ بھی نکاح کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ تھا' وہاں استثنائی شکل تھی اور معلوم نہیں ان انسانوں نے کیسے اس چیز کو اپنے ہاں رائج یا گوارہ کیا تھا۔ بہرحال یہ احترام کی بات تھی اور یہ چیز تو آپ کو معلوم ہے کہ جسے عربی زبان میں حرام کہا جاتا ہے' مادے کے اعتبار سے جو حرام اور احترام ہے' اس کا ایک ہی مادہ ہے۔ آپ کعبہ کو مسجد الحرام کہتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے۔ جب میں حرام اور حلال پہ آؤنگا تو اس وقت عرض کرونگا کہ اس کی بنیادی علت کیا ہے۔

جن چیزوں کو قرآن حمید نے حرام قرار دیا ہے' میں اس وقت صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ دیکھیں گے کہ ماں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں واجب الاحترام ہیں۔ اور ایک چیز یہ بھی ہے کہ عربوں کی زبان کے اندر' یہ حرام کا لفظ دونوں شکلوں میں بولا جاتا ہے: احترام کی بنا پر کسی چیز کا ایسا ہونا کہ اسے چھوا نہ جائے' اس چیز کو قرآن حمید نے حرام قرار دیا ہے۔ پہلی چیز اس نے یہ کہی ہے کہ وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) جن عورتوں کے ساتھ تمہارے باپ نے نکاح کیا تھا' ان سے نکاح نہ کرو' انہیں اپنے نکاح میں مت لاؤ۔ جو کچھ تم' اس سے پہلے کر چکے ہو' وہ کر چکے۔ اب ایسا نہ کرنا۔ یہ وہی جو عربوں کے ہاں ایک مذموم اور نہایت معیوب رسم' رواج کے طور پہ چلی آ رہی تھی' قرآن حمید نے اس کو منسوخ کر دیا۔ دیکھیے الفاظ کی رو سے' ماں کو کس طرح سے سوتیلی ماں سے الگ کیا ہے! کہا ہے کہ مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ (4:22) جن عورتوں سے تمہارے باپ نے شادی کی ہو۔ جو کچھ پہلے ہوا اس کے متعلق کہا کہ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) جو کچھ پہلے ہو گیا' وہ تو ہو گیا' وہ اس ہدایت سے پہلے تھا' تمہیں معلوم نہیں تھا' تم اپنے رسم و رواج کی بنا پر یہ کرتے تھے لیکن اب اس چیز کو تم آئندہ ختم کر دو تو اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) سے واضح ہے کہ پہلے وہاں ایسا ہوتا تھا۔

## عدل اور قانون کی ایک بنیادی وضاحت کہ وہ مؤثر بہ ماضی نہیں ہوتا

اور پھر یہ جو چیز ہے کہ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) جو کچھ تم' اس سے پہلے کر چکے ہو' وہ کر چکے' اب ایسا نہ کرنا۔ یہ یہاں ہی نہیں

آیا اور مقامات میں بھی آیا ہے۔ اس سے عدل یا قانون کی ایک بنیادی چیز سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون بننے سے پہلے جو اس قسم کے افعال کا ارتکاب ہو چکا ہو' وہ قابلِ گرفت نہیں ہوتے۔ قانون بننے کے بعد وہ قابلِ گرفت ہونے چاہئیں۔ قانون کو اس معنی میں بھی With Retrospective Effect (مؤثر بہ ماضی) نہیں دیا جا سکتا کہ اس سے پیشتر بھی اگر اس قسم کا کوئی جرم کسی سے سرزد ہو گیا ہو تو اس قانون کی رو سے اسے قابلِ گرفت سمجھا جائے۔ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:22) وہ پہلے کی بات ہے۔ آپ دیکھیے چھوٹی سی بات میں قرآن کتنی بڑی اصولی بات کہہ جاتا ہے کہ جو پہلے ہو گیا وہ تو ہو گیا' وہ تمہاری جہالت تھی' اس وقت یہ قانون نہیں تھا' آئندہ کے لیے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقۡتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيۡلًا (4:22) وہ بڑی بے حیائی کی بات تھی' مکروہ اور مردود رسم تھی اور بہت بُرا دستور تھا جو تم میں رائج تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔

## ڈکٹیٹر صرف حکم دیتا ہے اس کی وضاحت نہیں کرتا لیکن قرآن حمید جو حکم دیتا ہے اس کی افادیت اور حکمت بھی بیان کرتا ہے

آپ کو معلوم ہے' جیسا میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن حمید نے کہا ہے کہ ہم نے کتاب اور حکمت نازل کی۔ کتاب تو قانون کو کہتے ہیں اور حکمت اس قانون کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ کیوں ایسا کہا جا رہا ہے؟ اور ضمناً میں عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں جو قانون کا عام طور پر احترام نہیں ہوتا' اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے' اس کی حکمت سے لوگوں کو آگاہ نہیں کرتے۔ اگر اس کی غرض و غایت سمجھا دی جائے' اگر یہ بتا دیا جائے کہ یہ جو پابندی عائد کی جا رہی ہے' یہ تمہارے ہی فائدے کی چیز ہے اور شد و مد سے اس کو دہرایا جائے' بتایا جائے کہ اس کی اہمیت دلوں کے اندر راسخ ہو جائے' اس سے قانون کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ ایک آمر یا ڈکٹیٹر کے حکم یا فیصلے اور ایک قانون و حکمت میں فرق ہی یہ ہونا چاہیے اور قرآن مجید کی رو سے فرق ہی یہ ہے کہ وہ آمر یا ڈکٹیٹر حکم دیتا ہے تو اس کی غرض و غایت نہیں بتاتا۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا حکم ہے' تم کو ماننا ہوگا۔ جونہی وہ ایسی بات کہتا ہے انسان کے دل کے اندر سے ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ مجھ سے یہ زبردستی منوایا جا رہا ہے' وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس سے یا تو گریز کی راہیں نکالے اور اگر ایسا نہ ہو تو قانون شکنی کے اوپر اتر آئے۔

## کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت انسان کے اندر آمادگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے مگر سوچو تو!

اس کے مقابلے میں قانون وہ ہونا چاہیے جس کی غرض و غایت اس طرح سے سمجھائی جائے کہ ہر شخص یہ سمجھے کہ ایسا کرنا میرے فائدے کی چیز ہے' پھر آپ دیکھیں گے کہ صرف ایسے لوگ Incredible (ناقابلِ یقین) رہ جائیں گے جو قانون شکنی کرنا چاہیں'

وہی قانون شکنی کریں گے۔ عام طور پہ جو قانون شکنی ہے‘ وہ بند ہو جائے گی۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت نہایت ضروری ہے اور قرآن مجید یہ کرتا چلا جاتا ہے اس لیے کہ اگرچہ یہ احکام اس خدا کے ہیں جسے ہم قادرِ مطلق مانتے ہیں۔ آمر کا لفظ تو بعد کی ایجاد ہے‘ قادرِ مطلق تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے‘ جس کی قوت اور اقتدار کے اوپر کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ اس اعتبار سے تو خدا نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ تم سے تو تمہارے فیصلوں اور اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا‘ ہم سے نہیں پوچھا جا سکتا لیکن جس سے نہیں پوچھا جا سکتا وہ خود یہ کہتا ہے اور اس کی پوزیشن یہ ہے کہ اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ ایک حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی غرض وغایت سمجھاتا ہے۔ حکم یہ دیا کہ ایسا نہ کرو۔ کہا ہے کہ اِنَّـهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا (4:22) سوچو تو سہی‘ غیر شعوری طور پر تم رواج کی لکیر کے اوپر چلے آ رہے تھے۔ یہ اور بات ہے۔ کھڑے ہو کر سوچو تو تمہیں نظر آئے گا کہ یہ بڑی ہی بے حیائی کی بات تھی‘ بڑی ہی مذموم حرکت تھی۔ وَ سَآءَ سَبِيْلًا (4:22) اتنی بڑی بری روش اور رسم تھی‘ اتنا بڑا برا رواج تھا جس کے اندر تم چلے جا رہے ہو۔ یہاں سبیلًا جو کہا ہے‘ یہ روش رسم یا رواج کا نام ہے۔

## انسان پر بصورت نکاح حرام کیے جانے والے رشتے اور پھر رضاعی ماں کے رشتہ داروں کی وضاحت

اب آگے نکاح کے لیے حرام کیے جانے والے رشتوں کی فہرست آتی ہے۔ کہا ہے کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ (4:23) حرام کی گئیں تمہارے اوپر تمہاری مائیں (یہ بات بالکل صاف ہے‘ وضاحت کی ضرورت نہیں)‘ تمہاری بیٹیاں‘ تمہاری بہنیں‘ تمہاری پھوپھیاں‘ تمہاری خالائیں۔ آگے کہا کہ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ (4:23) بھائی کی بیٹیاں‘ بہنوں کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں بھانجیاں۔ اب قرآن حکیم ماں کی ایک اور شکل سامنے لاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ (4:23) وہ ہے دودھ پلانے والی‘ جس کا تم نے دودھ پیا ہو‘ تمہاری مائیں جو دودھ کے رشتے سے ماں بنیں یعنی اَرْضَعْنَكُمْ (4:23) جس نے تمہیں دودھ پلایا ہو۔ یہ وہ ہے جس کو رضاعی رشتہ کہتے ہیں یعنی دودھ شریک کا رشتہ۔ ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں تا کہ دونوں باتیں اکٹھی آ جائیں۔ کہا ہے کہ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (4:23) اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ بات تو صاف ہے لیکن ہمارے ہاں اس میں کچھ الجھاؤ سے پیدا کر دیئے گئے ہیں۔

## ہمارے ہاں فقہ کے قانون کی نوعیت اور قرآنِ حکیم کی مزید وضاحت

پہلی چیز تو یہ کہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ صرف وہ عورت‘ جس کا بچے نے دودھ پیا ہو‘ یہ رشتہ حرام ہے لیکن ہمارے ہاں فقہ میں جسے اب عام شریعت کہا جاتا ہے‘ اس میں کہا گیا ہے کہ نہیں! صرف یہ عورت ہی نہیں بلکہ اسے ماں تسلیم کیا جائے اور ماں کے اعتبار سے

جو رشتے حرام ہوتے ہیں' وہ سارے رشتے اس پہ حرام ہو جائیں گے۔ یعنی ماں کے اعتبار سے پہلے آیا کہ خالائیں حرام ہو جائیں گی گویا اس عورت کی جو بہنیں ہیں وہ اس کی خالہ ہو جائیں گی وہ بھی حرام ہو جائیں گی' اب اس عورت کی لڑکیاں ہیں وہ اس کی بہنیں ہو جائیں گی' وہ حرام ہونگی' ان لڑکیوں کی لڑکیاں' یہ بھانجیاں ہو جائیں گی' اس عورت کے بیٹے' اس کے بھائی ہو جائیں گے' ان لڑکوں کی لڑکیاں اس کی بھتیجیاں ہو جائیں گی۔ یعنی اگر اسے تسلیم کیا جائے تو اس اعتبار سے جس کا دودھ پیا ہے' وہ سارے رشتے جو اصلی ماں تھی' جو حقیقی ماں تھی' اِس ماں کے اعتبار سے جتنے رشتے تھے' وہ بھی سارے رشتے اس پہ حرام ہو جائیں گے۔ آپ کی فقہ یہی کہتی ہے کہ اسے ماں تصور کیا جائے گا اور وہ سارے رشتے' جو ماں کی جہت سے ہوتے ہیں' وہ بھی حرام قرار دیئے جائیں گے۔ قرآن حکیم نے صرف وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىٓ اَرْضَعْنَكُمْ (4:23) کہا ہے یعنی وہ عورتیں جن کا تم نے دودھ پیا ہے اور اس اعتبار سے وہ تمہاری رضاعی مائیں ہو جائیں گی حالانکہ اس نے جب پہلے اُمَّهٰتُكُمْ کو حرام کہا ہے تو پھر وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ الگ الگ کہا' اس میں اس ماں کی بہنیں' ماں کے بیٹے کی بیٹیاں' اس کی بیٹی کی بیٹیاں' یہ ساری ہیں لیکن یہاں قرآن حکیم نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ عورتیں جو دودھ پلانے کی جہت سے تمہاری مائیں ہو چکی ہوں۔ ایک چیز یہ ہے۔

اگلی چیز ہے کہ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (4:23) تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ اسی سے آپ یہ غور کیجیے کہ جس عورت کا دودھ پیا ہے' یہ اگر واقعی ماں کی حیثیت اختیار کر جائے تو آگے یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی' اس کی بیٹیاں تو بہنیں ہو گئیں' غور فرمایا آپ نے اس کی تو ساری بیٹیاں اس کی بہنیں بن گئیں' جب اس نے دودھ پیا ہے اس سے پہلے بھی جو اس کی بیٹیاں ہوئیں' وہ بھی بہنیں ہوئیں' اس کے بعد بھی جو اس کے گھر بیٹیاں پیدا ہوں وہ اس لڑکے کی بہنیں بن گئیں۔ تو اگر جس عورت کا دودھ پیا ہے اس کی ساری بیٹیاں اس کی بہنیں ہو گئیں تو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (4:23) تمہاری صرف وہ بہنیں جو دودھ شریک ہیں۔ ذرا سے غور سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس کے بعد اگر وہ معنی لیے جائیں تو اس کے کہنے کی پھر ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ تمہاری بہنیں رضاعت سے ہیں' اب یہاں رضاعی بہنوں کا ذکر ہے

## اسلامی مملکت کی طرف سے بنا ہوا قانون ہی شریعت کا قانون کہلائے گا

ہمارے ہاں کی فقہ میں جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ کسی لڑکی کی جو رضاعی بہن ہے کہ ایک لڑکے اور لڑکی نے ایک عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ بہنیں بھی ان کے نزدیک حقیقی بہن کی طرح ہو جاتی ہیں جو رشتے حقیقی بہن پر پھر حرام ہوتے ہیں وہ سارے رشتے اس کی رو سے بھی حرام قرار دیئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (4:23) کہا ہے' جیسے پہلے وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىٓ

اَرۡضَعۡنَکُمۡ (4:23) کہا ہے تو اَخَوٰتُکُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (4:23) تمہاری جو دودھ شریک بہنیں ہوں وہ رشتۂ نکاح میں حرام ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' اس قسم کی Interpretation (تشریح) جو قرآن مجید کا مفہوم سمجھنے کے لیے ہے' ہم کہتے ہیں کہ یہ انفرادی طور پر کسی کا حق نہیں ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دے' نہ مجھے' نہ زید' بکر عمر کو' نہ آج' نہ اس سے پہلے کسی کو یہ حق حاصل ہے۔ یہ قانون کی چیز ہے اور قانون کے لیے صرف اسلامی مملکت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان اصولوں کے مطابق جو قانون بنائے' اس کو قوم پر نافذ کرے اور وہ جو بنائے ہوئے قوانین ہونگے' انہیں قانونِ شریعت کہا جائے گا۔ قرآن مجید کے اصول اپنے مقام پر ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گے' ان اصولوں کی روشنی میں جن فروعی قوانین یا By Laws یا ان کی Interpretation (تشریح) کے ماتحت ضابطوں کا تعین کیا جائے گا یہ اسلامی حکومت کرے گی اور وہی وقتاً فوقتاً اس کا جائزہ لیتی رہے گی کہ فلاں قانون کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہے' فلاں میں اضافے کی ضرورت ہے' فلاں میں استثنا کی ضرورت ہے۔ وہ یہ چیز کرتی رہے گی' کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔

## خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی حکومت' اسلامی نہ رہی بلکہ مسلمانوں کی حکومت بن گئی۔ یوں دین و دنیا میں ثنویت پیدا ہوگئی

اب اسلامی حکومت' خلافتِ راشدہ کے بعد' باقی نہ رہی' پھر وہ مسلمانوں کی حکومتیں ہوگئیں' بادشاہوں نے ریاست کے متعلق امور سنبھال لیے اور یوں سیاست اور مذہب الگ الگ ہوگئے۔ حکومت نے سیاست سے متعلق' تمدن سے متعلق' قوانین سنبھال لیے اور مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں جنہیں آپ Personal Laws (شخصی قوانین) کہتے ہیں وہ دیدیئے گئے۔ وہ دن تھا جب دین ختم ہوگیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ دین میں یہ ثنویت شرک ہے' وہاں Personal Laws (شخصی قوانین) اور Private Laws (پرائیویٹ قوانین) اور Public Laws (حکومتی قوانین) میں کوئی تفریق نہیں ہے' نہ ہی وہاں دو الگ الگ اتھارٹیز ہیں کہ سیاست کے معاملات کے اندر حکومت کا اختیار ہوگا اور اس قسم کے امور جنہیں مذہبی یا شخصی کہا جاتا ہے' وہ مذہبی پیشواؤں کے اختیار میں ہونگے۔

## اسلامی حکومت کے لوازمات اور طریق کار کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ: فرقہ بندی میں مگن رہنا

اسلامی حکومت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ وہاں صرف حکومت ہوتی ہے' مملکت ہوتی ہے۔ وہ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گورنر مسجد میں آ کر نماز پڑھاتا ہے' وہ امام ہوتا ہے۔ خلیفہ جمعہ کا خطبہ دیتا ہے اور وہی نماز پڑھاتا ہے' اور چیزیں تو ایک طرف رہیں وہاں تو ان کے لیے بھی دو چیزیں نہیں تھیں۔ اور یہ الگ الگ امام جو آج آپ دیکھ رہے ہیں' یہ کوئی اسلامی چیز نہیں' یہ مذہب کی سطح پر

آپ کے ہاں ہوا ہے۔ وہاں تب یہ چیز پیدا ہوئی کہ حکومت یا سلطنت ان امور میں دخل نہیں دیتی تھی' چنانچہ انفرادی طور پر اس کے متعلق فتوے دیئے جاتے تھے۔ اس سے ایک فقہ مرتب ہوتی تھی اور امت میں سے کوئی اس فقہ کو مانتا' کوئی اُس فقہ کو ماننے سے انکار کرتا' کوئی اس مفتی کے فتوؤں کو صحیح سمجھتا تھا' کوئی اس سے اختلاف کرتا۔ اس طرح سے آپ کے ہاں یہ فرقے پیدا ہوئے اور انہی By Laws (فروعی قوانین) کے ماتحت یہ فرقے بنے اور وہ اتنے پکے مضبوط اور محکم ہیں کہ اب ان فرقوں کا توڑنا کہتے ہیں کہ ناممکن ہو گیا ہے اور جب فرقوں کا توڑنا ناممکن ہے' عزیزانِ من! تو اس صورت میں اسلام کا احیاء ناممکن ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ [30:31] مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) مسلمانو! ایک خدا کو ماننے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور پھر ہر فرقہ اس میں مگن ہو گیا کہ وہی حق پر ہے' باقی سب غلط ہیں۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک مشرک کی وضاحت اور ہماری خاموشی

سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایک خدا کو ماننے والا مشرک کیسے ہو جائے گا؟ کیا ہم بتوں کو پوجنے لگ جائیں گے؟ کہا کہ نہیں! صرف بتوں کو ہی پوجنا شرک نہیں ہے' آؤ تمہیں ہم بتائیں کہ شرک کیا ہے؟ (30:31) میں کہا ہے کہ ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے' خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ اور پھر اس کے بعد فرقہ پرستی میں ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں' دوسرے سب باطل پر ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے فرما دیا گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ (6:159) جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیں' اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک فرقہ پرستی کا رسول ﷺ کی طرف نسبت کا تعلق ہے' قرآن حکیم نے کہا ہے کہ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پھر ان فرقوں کی موجودگی میں توحید پرستی اور محمد ﷺ کی طرف نسبت' کسی طرح سے بھی جائز ہو سکتی ہے؟ قرآن حکیم کے ترجمہ میں آج تک کسی نے اختلاف کیا ہے' نہ اس کی کوئی دوسری تفسیر ہو سکتی ہے لیکن آپ نے کہیں خطبوں میں' وعظوں میں' مسجدوں میں' کسی جگہ' ان آیات کو نہیں سنا ہو گا۔ ان آیات کو سامنے لانے کے بعد جو ایک شکل سامنے آتی ہے' اس کا کوئی حل نہیں ہے' شترمرغ کی طرح آپ ریت میں سر دے کر بیٹھ جایئے اور کہہ دیجیے کہ جو مسائل ہیں' وہ ختم ہو گئے' حل ہو گئے' اس طرح تو مسائل حل نہیں ہوتے۔ آپ قرآن حکیم کی ان آیات کو کیا کریں گے۔

## فرقہ بندی سے نجات کے آخری حل کے برعکس ہماری آئین سازی کے خلاف احتجاج اور ایجی ٹیشن

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب تک اسلامی حکومت قائم تھی' کسی فرقہ کے بننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جب

آپ کے ہاں ثنویت پیدا ہوئی تو یہ جو احکامِ شریعت یا فقہ ہیں' آپ نے انہیں انفرادی بنا دیا۔ اس کے بعد پھر جس کا جی چاہے ایک فقہ کو مانے' جس کا جی چاہے دوسری فقہ کو مانے اور یہ جتنے فرقے آپ کو نظر آتے ہیں' وہ انہی بنیادوں پر ہیں۔

یہ گوسالے کی محبت ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں کتنی اتر چکی ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ 1962ء میں جو یہاں آئین بنا تھا' اس آئین میں فرقہ بندی کے لیے گنجائش نہیں رکھی گئی تھی' 1956ء کے آئین میں یہ چیز موجود تھی۔ 1962ء کے آئین میں یہ چیز نہیں تھی۔ یہ بڑی خوش آئند علامت تھی۔ اگرچہ سارا آئین قرآنی یا اسلامی نہیں تھا لیکن بہرحال جو چیز بھی اسلام سے قریب لانے کی تھی' وہ علامت اس کے اندر خوش آئند تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کہ دین کے اجارہ داروں کی طرف سے اس کے خلاف ایک ایجی ٹیشن کی گئی کہ آئین کے اندر فرقوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی' یہ اسلامی کیسے ہوسکتا ہے۔ اور پھر اس ایجی ٹیشن کے بعد جب تک اس آئین میں ترمیم کرا کر فرقوں کی شق نہیں داخل کی گئی' اس وقت تک چین سے نہیں سوئے۔ جب یہ شق آ گئی تو پھر کہا کہ الحمدللہ! اب آئین اسلامی ہو گیا ہے

## شخصی قوانین کے متعلق ہر فرقے کو اپنی اپنی فقہ کے مطابق کتاب وسنت کی تشریح کا حق اور نکاح کی حرمت کے لیے اسلامی حکومت کی قانون سازی

اس آئین میں اب یہ چیز ہے کہ قوانین تو کتاب وسنت کے مطابق بنیں گے لیکن ہر فرقہ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ شخصی قوانین کے متعلق اپنی فقہ کے مطابق' قانونِ کتاب وسنت کی تشریح کرلے۔ وہ جو بندھی ہوئی گرہیں چلی آرہی ہیں ان کو اور کس دیا گیا۔ پہلے تو وہ انفرادی چیز تھی اب فرقوں کو آئینی سند حاصل ہوگئی' اب فرقہ بندی کے خلاف کہنا آئین کے خلاف تھا۔ وہ آئین آگے نہیں چلا ورنہ اگر قانون اس کے مطابق بنتا تو پھر جو فرقہ بندی کے خلاف کہتا تھا' وہ قانوناً جرم ہو جاتا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ تمہاری مائیں' جو دودھ پلانے کی بنا پہ مائیں بنتی ہیں' صرف ان عورتوں سے رشتہ حرام ہے یا حقیقی ماؤں کی طرح جن اور رشتوں کے متعلق بھی حرمت آتی ہے وہ بھی حرام ہیں' وہ بہنیں جو دودھ شریک ہیں' ان میں صرف وہ لڑکی حرام ہوگی جس نے اس لڑکے کے ساتھ مل کر اکٹھے اس عورت کا دودھ پیا ہے۔ کیا اس عورت کی جو ساری لڑکیاں ہیں' وہ حرام ہونگی' اس کی حقیقی بہنیں بنیں گی اور ان کی بھی جو آگے اولاد ہے وہ بھانجیاں بن جائیں گی اور پھر جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ کیا وہ بھی حرام ہوجائیں گی؟ یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق اسلامی حکومت قانون بنائے گی' وہ بتائے گی کہ یہ کیا چیز ہے۔

## دودھ پلانے کی مدت یا مقدار کے تعین کا مسئلہ اور مختلف فقہوں کی تشریح وتوضیح میں اختلاف

آگے یہ ہے کہ دودھ پیا ہو۔ پھر اس کی تفسیر چلی کہ صاحب! کتنا عرصہ اس ماں کا دودھ پیا ہو۔ کسی نے یہ کہا کہ قرآن حمید میں دودھ کے متعلق عام طور پہ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ (2:223) کہا ہے۔ یہ دو سال تک کے لیے عام طور پہ دودھ پلانے کا عرصہ ہے' دوسری جگہ بھی یہ چیز آئی ہے' اگرچہ ایک جگہ حمل اور دودھ کی پوری مدت تیس مہینے بھی بتائی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دو سال تک دودھ پینے سے ہوتا ہے اور دوسری طرف آتے ہیں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک گھونٹ پینے سے بھی ہو جاتا ہے یا تین گھونٹ پینے سے بھی وہ ہو جاتا ہے' بعض نے کہا ہے کہ بھوک کے عالم میں جس طرح سے پرورش ہوتی ہے' ویسے اضطراری طور پر یونہی اگر کسی نے کوئی ایک گھونٹ پلا دیا تو اس سے یہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک دوسرے کی فقہ کی Interpretation (تشریح وتوضیح) میں خود اتنا فرق ہے۔

## اگر اجتہاد کے دروازے کو سر بہ مہر کر دیا جائے تو پھر انسانی شعور کی نشو ونما رک جاتی ہے

یہ جتنے بھی فرق چلے آ رہے ہیں ان پر تو کوئی چیں بہ جبیں نہیں ہوتا لیکن اگر آج ان کی کوئی اور ایسی Interpretation (تشریح وتوضیح) دیتا ہے جو ان سے الگ ہے' تو سب اس کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ جی! یہ بدعت ہے۔ یہ بدعت قرآن حکیم کے خلاف نہیں' یہ بدعت رسول اللہ ﷺ کے خلاف نہیں بلکہ یہ جو پہلے سے فیصلے چلے آ رہے ہیں' یہ ان کے خلاف ہے انہوں نے اپنے طور پہ اس کی Interpretation (تشریح وتوضیح) دی مگر اس کے بعد تو آپ کے ہاں اس Interpretation (تشریح وتوضیح) کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ یہ وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ اجتہاد اسے کہتے تھے کہ جدوجہد سے' کوشش سے' غور وفکر سے' یہ دیکھنا کہ اس اصول کے ماتحت کس قسم کا ایک By Law (فروعی قانون) بن سکتا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند چیز تھی۔ اسی سے فکری صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں' اسی سے قومیں آگے بڑھتی ہیں' اسی سے تمدن وتہذیب پروان چڑھتے ہیں' اسی سے زمانے کے تقاضے کے مطابق قومیں چل سکتی ہیں۔ آپ کے ہاں یہ دروازے بند ہو گئے۔ اب اگر ایسی بات کہی جائے جو پہلے کسی نے نہیں کہی' یہی چیز اس کو Condemn (مطرود) کر دینے کے لیے کافی ہے کہ کیا پہلوں میں سے بھی کسی نے ایسی بات کہی یعنی فکر کے' غور کے' تدبر کے' جتنے احکام قرآن کریم میں آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ 'تم کیوں فکر نہیں کرتے' کیوں غور نہیں کرتے' کیوں تدبر سے کام نہیں لیتے' وہ سب کے سب پہلے دور تک تھے' اس کے بعد اب آگے قرآن کریم جو ہمارے لیے ہے' وہ تلاوت کے لیے' ثواب کے لیے یا مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے ہے۔ غور وفکر کی راہیں امت کے اوپر مسدود ہو چکی ہیں۔

## اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے فقہی اختلافات کی پیدا کردہ پیچیدگیاں اور ان کا علاج

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز انفرادی نہیں ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' دین اجتماعی ہوتا ہے' دین میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے طور پر جو Interpretation (تشریح) چاہے' کر کے اس پر چلے۔ یہ تو غلط بات ہوتی ہے۔ دین نہیں تو اس کو نظامِ مملکت کہیے۔ اس کو تو اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ اگر مملکت Keep to the left (بائیں طرف چلو) کہتی ہے تو وہ اپنے طور پہ کہے کہ نہیں صاحب! میں تو دائیں طرف چلونگا' مجھے اس میں بڑی آسانی ملتی ہے' سہولت حاصل ہوتی ہے' راستہ جلدی کٹتا ہے۔ اس کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا' چھوٹی چھوٹی چیز میں بھی انفرادی حق نہیں دیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ صاحب! پھر آج تو اسلامی حکومت نہیں' کیا کیا چاہیے؟ اسلامی حکومت قائم کی جائے اور کیا کیا جائے۔ یہاں تو شارٹ کٹ ہے ہی نہیں' یہاں کوئی اور متبادل راستہ ہے ہی نہیں۔ یا مذہب پہ چلتے جایئے' اور اگر دین قائم کرنا ہے تو اس کی بنیادی شرط وہ ہے' وہ کیجیے' رفتہ رفتہ کیجیے' بتدریج کیجیے۔

میں کہہ رہا تھا کہ یہ قرآن کریم نے جو رضاعی مائیں یا رضاعی بہنیں کہا ہے اس کے متعلق اس کی تشریح میں ہمارے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی کی بنا پر ہمارے ہاں مختلف فقہیں ہیں۔ اب اس کا حل یہ نہیں۔ کوئی شخص اپنی فقہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا' کوئی شخص اپنے فرقہ کی چھوٹے سے چھوٹی خصوصیت کو چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ اسلامی حکومت اس کا علاج تھا۔ اس کا Concept (تصور) آپ نے یہاں دیکھ لیا۔ مذہب پرست طبقے نے کہا کہ شخصی معاملات میں اسلامی حکومت کو بھی دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یعنی آپ کے ہاں تب وہ حکومت اسلامی بنے گی جس میں یہ ثنویت (Dualism) اسی طرح سے قائم رہے گی جیسی آپ کے ہاں چلی آرہی ہے اور فرقوں پر Consitutional (آئینی) مہر لگ جائے گی۔ اس کا نام اسلامی حکومت ہوگا۔

اب ہم یہاں تک آگئے کہ وہ عورتیں حرام ہیں جن عورتوں کا دودھ پیا ہو اور وہ لڑکیاں حرام ہیں جو دودھ شریک بہنیں ہیں۔ آگے کہا ہے کہ وَ اُمَّھٰتُ نِسَآئِکُمۡ (4:23) اور بیویوں کی مائیں بھی حرام ہیں۔ اس کے آگے کہا ہے کہ وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ (4:23) نکاح کے لیے حرام ہیں تمہاری بیویوں کی سابقہ شوہر سے لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں پرورش پاتی ہیں اس لیے بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہیں' اس میں شرط یہ ہے کہ تم ان بیویوں سے خلوت کر چکے ہو۔ اگر خلوت نہ کی ہو تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ بیوہ عورت سے شادی کی' اس کی پہلے خاوند سے ایک لڑکی ہے' اس بیوہ عورت سے نکاح کیا اور نکاح کے بعد جسے خلوت

کہتے ہیں' یہ بھی ہوا۔ یہ جولڑکی ہے' اس نے تمہارے گھر میں پرورش پائی اسے بھی حرام قرار دیدیا ہے۔ اب دیکھیے کہ اس کے ساتھ ویسے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے' اس لڑکی کے ساتھ اس مرد کا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن یہ گھر میں آئی ہے' اب اس کے تصور میں باپ کی سی حیثیت آ گئی کہ یہ بھی بیٹی کی حیثیت سے گھر کے اندر رہے گی۔ دیکھیے! کہاں تک قرآن کریم جاتا ہے! اسے بھی حرام قرار دے دیا۔ ہاں اگر خلوت نہیں کی تو پھر اس لڑکی سے شادی کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔

## قرآنِ حکیم کا فلسفہ انسان میں پاکیزگیٔ قلب ونگاہ پیدا کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم بڑی ہی پاکیزگیٔ قلب ونگاہ سکھاتا ہے۔ دودھ پیا ہے' ماں ہوگئی' ایک بچی دودھ میں شریک ہے' اکٹھا دودھ پیا ہے' بہن ہوگئی۔ کسی کی لڑکی گھر میں آئی' پرورش پا رہی ہے' بیٹی ہوگئی۔ اور اس سے آگے چلیے جب تک کسی عورت سے شادی نہیں ہوتی' ساری دنیا کی عورتیں عصمت کے لحاظ سے مائیں بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔ وہ تو جس کے ساتھ قرآن کریم نے کہا کہ رشتہ حلال ہے' جب اسے اس طرح سے نکاح کے رشتہ میں' ازدواجی حیثیت سے' لائے گا تو وہ اس کے لیے حلال ہوجائے گی' باقی ماندہ پھر اس کے لیے حرام کی حرام رہیں گی۔ کتنی بڑی پاکیزگی ہے نگاہ کی! ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ جو پھرنے والی ہیں آپ ان کو صندوقوں میں باندھ کر رکھیں۔ بیٹیوں اور بہنوں کو آپ صندوقوں میں تو نہیں رکھ سکتے۔ سوال تو یہ ہوتا ہے کہ جب ذہن کے اندر یہ چیز ہوجائے کہ یہ حرام ہے تو بات ختم ہوگئی۔ وہ عصمت اور عفت کو اس طرح سے مستحکم کرتا ہے جو قلب ونگاہ کی پاکیزگی سے ہوتی ہے۔

## عصمت کا دوسرا نام قلب ونگاہ کی پاکیزگی ہے

عزیزانِ من! وہ جو کہا ہے کہ باہر نکلو تو نگاہوں کو جھکائے رکھو' اس کے معنی (آنکھیں نیچی کر کے) چلنے کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔ بیٹی اور بہن گھر کے اندر پھرتی رہتی ہے' ہماری نگاہیں وہاں کبھی بیباک نہیں ہوتیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ کہ باہر نکلو تو ہمسائے کی بیٹی کی طرف نگاہ اٹھا کر جو آپ دیکھتے ہیں تو وہ ویسی نگاہ کیوں نہیں ہوتی جیسی اپنی بیٹی کے متعلق آپ کی نگاہ ہے۔ اگر ان دونوں نگاہوں میں فرق آ گیا ہے تو عصمت باقی نہیں رہی۔ عزیزانِ من! عصمت قلب ونگاہ کی پاکیزگی کا نام ہے۔ آخر میں جہاں آپ جاتے ہیں' وہ تو حیوانیت کی چیز ہے' انسانیت کے Level (سطح) پر عصمت قلب ونگاہ کی پاکیزگی کا نام ہے' وہ تو گھر کے اندر کی لڑکی نے جب آ کر اس کو ابا کہہ دیا تو وہ اس کی بیٹی ہوگئی۔ قرآن کریم بڑی دور تک جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ (4:23) تمہارے جو حقیقی بیٹے ہیں' ان کی بیویاں بھی تم پہ حرام ہیں حالانکہ اس لڑکی کے ساتھ جو بیٹے کی بیوی بن کر آئی ہے وہ حرام کی فہرست میں بھی نہیں آتی۔ یعنی غیروں کے ہاں سے ایک لڑکی آپ بہو بنا کر لے آتے ہیں' یہ بہو بن کر آئی'

اس نے بھی تو تمہیں ابا ہی سمجھا ہے۔ جب اس نے ابا کہا ہے تو وہ بھی بمنزلہ تمہاری بیٹی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بھی نکاح کے لیے حرام ہے۔

## منہ بولے بیٹے کی قانونی حیثیت

قرآن کریم نے ایک استثنا کی ہے اور وہ ہے جسے متبنیٰ بنانا کہتے ہیں' جسے منہ بولا بیٹا کہا جاتا ہے۔ منہ بولا بیٹا بنانے کی یہ ایک رسم چلی آتی تھی۔ قرآن کریم نے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ حقیقی بیٹے کا درجہ اختیار کرلے۔ یہ وہی ہے جسے آپ انگریزی میں Adopted (قانوناً متبنیٰ بنانا) کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں قرآن کریم کی رو سے اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے اور یہی چیز تھی کہ جس کو توڑنے کے لیے قرآنِ کریم میں صحابۂ کبارؓ کا ایک واقعہ ہے جس میں نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ حضرتِ زیدؓ کا ہے اور اس میں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ انہیں قانون کی رو سے حقیقی بیٹے کا درجہ نہیں دیا گیا اور جب قانون کی رو سے اسے حقیقی بیٹے کا درجہ نہیں تھا تو اس کی بیوی وہ حیثیت نہیں رکھتی جو اپنے صلبی بیٹے کی بیوی کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔ اس کے لیے دیکھیے (33:37)۔ اب چونکہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کا درجہ نہیں رکھتا اسی لیے حقیقی بیٹوں کی بیویوں کے لیے کہا ہے کہ وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ (4:23) تمہارے لیے تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں نکاح کے لیے حرام ہیں۔

## ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت تو مشروط ہے

اب اگلی چیز اور ہے کہ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ (4:23) یہ بھی حرام ہے کہ جب (4:3) کے مطابق ازواج کی ضرورت پڑ جائے تو تم بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔ شروع سورۃ النسآء میں' ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کا ازدواجی زندگی کا قانون Monogamy (وحدتِ زوج) ہے کہ ایک وقت میں ایک بیوی ہو۔ وہ صرف استثنائی حالات ہیں جن کا ذکر اس وقت تک ہم تشریح سے کر چکے ہیں' وہ ہنگامی حالات ہیں کہ جس میں یتیم بیوائیں کثرت سے ہوں' ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو' وہ کسمپرسی کے عالم میں رہ جائیں کہ انہیں کہیں کوئی Protection (حفاظت) نہ ملے' کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے' جیسے جنگ کے عالم میں ہوتی ہے' صرف اس ہنگامی حالت کا ایک علاج قرآن حکیم نے یہ بتایا تھا کہ ان کو Protection (حفاظت) دینے کے لیے ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی یہ شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔ قرآن حکیم نے صرف ایک ہی جگہ یہ اجازت دی ہے اور وہ بھی ان شرائط کے ساتھ ہے کہ بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں نہیں لا سکتے۔

## ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں نہیں رکھا جاسکتا

اگر ایسی ہنگامی صورت پیدا ہو جائے تو اس میں بھی ایک چیز قرآن کریم نے کہی ہے کہ ایک ہی وقت میں دو بہنیں اکٹھی نہ کرو' یہ بھی

حرام ہے لیکن ہمارے ہاں' ہماری فقہ میں آگے اضافہ ہوتا ہے کہ خدا نے تو صرف دو بہنیں کہا ہے' مگر انہوں نے کہا ہے کہ یہ بات نامکمل رہ گئی ہے' صرف بہنیں ہی نہیں بلکہ بیوی کی پھوپھی' بھتیجی' خالہ' بھانجی' یہ بھی اکٹھی نکاح میں نہیں لی جاسکیں گی۔قرآن کریم نے صرف یہ کہا تھا کہ دو بہنیں اکٹھی نہیں کی جاسکتیں' یہاں صرف یہی نہیں کہ کوئی Interpretation یا اس کی جو تفصیل یا تشریح ہے وہ مختلف ہوگئی بلکہ اس فہرست کے اندر یہ اضافہ ہوگیا ہے۔

## حضرت عمرؓ کے دور میں اہلِ کتاب سے شادی کرنا ممنوع قرار پاگیا تھا

میں پھر عرض کردوں کہ اگر اسلامی حکومت ہوگی' کوئی خاص ہنگامی حالات پیدا ہوگئے ہیں' تو وہ اس قسم کے قوانین رائج کرسکتی ہے کہ عام حالات میں ایک چیز کی اجازت ہے' اس پہ کوئی پابندی عائد کردے مثلاً یہی چیز کہ گوشت ہمارے لیے حلال ہے وہ سات دن کے لیے روز حلال ہوتا ہے۔حکومت نے پابندی عائد کردی کہ دو دن اس میں ناغہ ہوگا' ہنگامی حالات میں اس قسم کی پابندی اِس کو حرام نہیں قرار دیتی یا یہ چیز کہ آپ کے ہاں قرآن کریم میں یہ تھا کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کی جاسکتی ہے لیکن تھوڑے ہی وقت کے بعد آگے چل کر جب مسلمانوں کی سلطنتیں بڑھی ہیں' خلع ملع زیادہ ہوا ہے' تو حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45ء) میں یہ دیکھا گیا کہ خاص طور پہ یہودی عورتیں جب ان کے گھروں میں آئیں تو اس سے بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوگئی تھیں۔اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کی عورتیں جب ان معاشروں میں حرم کے اندر آتی ہیں تو پھر کس قسم کی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوا کرتی ہیں' خاص طور پہ یہودیوں کے بارے' تو ایسا نظر آتا ہے جو شروع سے ان کا ایک شیوہ ہی چلا آرہا تھا۔آج بھی اس ذریعے سے کچھ کم آپ کے ہاں سازشیں نہیں ہوتیں۔تو یہ چیز جب اس زمانے میں حضرت عمرؓ نے دیکھی حالانکہ قرآن حکیم نے اس کی اجازت دی ہے' آپؓ نے کہا کہ یہ اجازت موجود ہے لیکن ان سے اس قسم کی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوگئی ہیں کہ ہم اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔اسلامی مملکت یہ کرسکتی ہے' افراد یہ نہیں کرسکتے۔یہ فرق سامنے رکھا جائے تو یہ ساری پیچیدگیاں حل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

کہا ہے کہ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (4:23) یہ بھی حرام ہے کہ جب (4:3) کے مطابق تعداد ازواج کی ضرورت پڑجائے تو تم بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں لے آؤ۔ان احکام سے پہلے جو بات ہوگئی' وہ ہوگئی۔اب ان کی خلاف ورزی نہ کرنا۔اس سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ پہلے ان لوگوں کے ہاں یہ رواج تھا' جبھی کہنے کی ضرورت پڑی کہ جو پہلے ہوگیا وہ ہوگیا۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا (4:23) خدا تمہاری حفاظت بھی چاہتا ہے' سامانِ نشو ونما بھی دینا چاہتا ہے۔تمہاری ذات کی حفاظت اور نشو ونما صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہوسکتی ہے۔

عزیزانِ من! اس فہرست میں آگے اضافہ چلا آ رہا ہے۔کہا ہے کہ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (4:24)۔یہ لفظ جو مُحْصَنٰتُ ہےاس کا مادہ (Root) ح ص ن ہے۔ان کے ہاں مادے سے معنی ہوتے ہیں' اس کے معنی ہیں کہ ''جو قیود و شرائط عائد کی گئی ہوں ان کی پابندی کرنا'' اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں۔یہ لفظ قرآنِ کریم میں اور خود عربوں کے ہاں بھی دو تین معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ایک تو باعصمت عورت کے لیے' جس نے اپنے آپ کو خود قلعہ میں رکھا ہو۔یہ بڑا خوبصورت لفظ تھا۔دوسرے شادی شدہ عورت کے لیے' جو نکاح کی حفاظت میں آ کر قلعہ بند ہو۔یہ اس کی دوسری شکل تھی۔یہاں قرآن حکیم نے وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (4:24) کہا ہے کہ یہ محصنات بھی حرام ہیں۔ظاہر ہے کہ اس کے معنی باعصمت' باعفت تو نہیں ہوسکتے۔یہاں اس کے معنی ہونگے ''وہ عورتیں جن کی پہلے شادی ہوچکی ہے''۔اب اس میں آگے کہا ہے کہ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ (4:24)۔اس کی تشریح کئی دفعہ آ چکی ہے کہ ''جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہوئے ہوں''۔یہ ایک اصطلاح (Term) ہے' یہ عربوں کے ہاں رائج تھی۔ مختصراً عرض کردوں کہ کسی کی ماتحتی میں کام کرنے والے اس میں آتے تھے' خود بیویوں کے لیے بھی وہ یہ لفظ استعمال کرتے تھے جو ان کے لیے عہدِ نکاح میں آ کر مِلک میں آ گئی ہوں اور غلاموں اور لونڈیوں کے لیے تو عام طور پہ یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔اب یہاں یہ محصنات شادی شدہ عورتیں ہیں جو حرام ہیں بجز ان کے جو اس سے پہلے تمہارے نکاح میں آ چکی ہوں۔اِن میں اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ (4:24) وہ لونڈیاں بھی شامل ہوسکتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جن کی اجازت (60:10) میں دی گئی ہے۔

## لونڈیوں کا ذکر صرف ظہورِ اسلام کے عرب معاشرے کے لیے تھا

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ لونڈیوں کے تمام احکام' اُن لونڈیوں کے سلسلہ میں ہیں' جو اس زمانے میں عرب معاشرے میں موجود تھیں۔ظہورِ اسلام کے وقت غلام اور لونڈیاں عربوں کے گھروں کے اندر تھیں' غلام باہر کام کرتے تھے' لونڈیاں گھروں کے اندر کام کرتی تھیں' جنگ میں گرفتار عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاتا تھا۔قرآنِ کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق تصریحی حکم دے کر کہا ہے کہ انہیں چھوڑنا ہوگا' خواہ فدیہ لے کر چھوڑو' خواہ احسان کے طور پر چھوڑ دو' ان کے علاوہ کوئی تیسری شکل اسلام میں جنگ کے قیدیوں کی جائز نہیں ہے۔یہاں سے اس نے غلاموں اور لونڈیوں کے دروازے آئندہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردیئے۔جو اس زمانے کی موجود تھیں' ان لوگوں کے گھروں میں بھی تھیں' کاروبار میں بھی یہ لوگ ہوتے تھے' ان کو آہستہ آہستہ ان خاندانوں کا جزو بنایا' یا آزاد کرتا چلا گیا' جو ان کے گھروں کے اندر تھیں انہیں اس نے بیویوں کا درجہ دیدیا' ان کی اولاد کو اولاد کا درجہ دیدیا' جزو خاندان بنالیا۔یہ ہیں وہ لونڈیاں جو اس سے پیشتر ان کے ہاں آ چکی تھیں۔ان میں شادی شدہ بھی ہونگی یعنی جن کی پہلے شادی ہوئی ہوا اور اب وہ جنگ میں

گرفتار ہو کر آئیں۔

## ہجرت کے دوران مکہ میں رہ جانے والی مسلمان عورتوں کا مسئلہ' ان کا حل اور انسانی میں انقلاب

اب دیکھیے کہ قرآن حکیم کہاں تک جاتا ہے۔ جب کہا گیا کہ جو شادی شدہ عورت ہے' وہ حرام ہے تو اس میں یہ بھی آسکتی تھیں لیکن کہا یہ ہے کہ جو پہلے ہو چکا ہے سو ہو چکا۔ قرآن حکیم نے شادی شدہ کی ایک اور بھی استثنا کی ہے' وہ جیسا کہ ابھی اور (60:10) میں ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ہجرت کے بعد ایسی عورتیں مکہ میں رہ گئیں تھیں جو اسلام لے آئی تھیں اور ان کے خاوند اسلام نہیں لائے تھے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اسلام کی کشش کی بنا پر اپنے گھر بار کو' اپنے خاوندوں کو' ہو سکتا ہے کہ اپنی اولاد کو بھی' چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کر کے آ گئیں' یہ بڑا مستحسن جذبہ تھا۔ مسلمان عورت کی شادی کافر کے ساتھ جائز نہیں' اس وجہ سے یہ یہاں آئیں۔ اب ان کو زبردستی واپس بھیجا جاتا تو یہ اُن پہ بڑا ظلم ہوتا۔ انہیں یہاں رکھ لیا گیا۔ یہ وہ خواتین ہیں جن کی شادی پہلے ہو چکی ہے' جسے آپ قانونی طلاق کہیں گے وہ تو انہوں نے حاصل نہیں کی' ان کے لیے خاص طور پہ وہ (60:10) کے اندر حکم آیا کہ یہ ایک استثنائی شکل ہے' ان عورتوں کی شادی یہاں کے مردوں سے ہو سکتی ہے لیکن قرآن حمید کا عدل ملاحظہ فرمائیے' اسے نہیں چھوڑا۔ اس کی تفصیل نیچے درج کی گئی ہے۔

عزیزانِ من! اب حالات یہ ہیں کہ وہ کفار ہیں جن کے ساتھ ان مدینے والوں کی جنگ ہوتی رہتی ہے' یہ اتنے کھلے ہوئے دشمن ہیں' عورتیں وہ ہیں جن کا نکاح اسلامی احکام کی رو سے ان کے ساتھ ہو نہیں سکتا تھا' وہ جذبۂ اسلام کی بنا پر مکے سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر' یہاں آ گئی ہیں' یہاں ان کو پناہ دی گئی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان کو یہاں رہنے دو' زبردستی واپس نہ بھیجو لیکن انہوں نے جو کچھ ان کے نکاح پر خرچ کیا تھا' وہ ان کو واپس بھیج دو۔ برادرانِ عزیز! کہاں لے جاتا ہے یہ قرآن کریم! اور کیا چیزیں انسان کے اندر پیدا کرتا ہے! دنیا نے کہا ہے کہ Every thing is fair in love and war (محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے) مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ جن کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے' ان حالات میں ان کی طرف سے وہ عورتیں آ رہی ہیں' ان کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ ٹھیک ہے' یہ نہیں جانا چاہتیں' شادی بھی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی' انہیں رکھ لو لیکن انہوں نے ان پر جو خرچ کیا ہے' وہ انہیں واپس بھیج دو۔

اور اس سے بھی آگے قرآن حکیم کی وہ آیت میرے سامنے آ گئی کہ جن کے ساتھ تمہاری جنگ ہے' مخالفت ہے' مناقشت ہے' ان کا کوئی آدمی اِدھر اُدھر سے بھولا بھٹکا یا ویسے ہی دشمنوں کا ستایا ہوا تمہارے ہاں آ جائے اور کہے کہ مجھے پناہ دو تو اسے پناہ دو' مہمان کی

طرح رکھو' قرآن حمید کی تعلیم اس کے سامنے پیش کرو' بتاؤ کہ ہم تو یہ کہتے ہیں بھئی! ہمارے متعلق غلط پروپیگنڈہ ہو رہا ہے' ہمارا اسلام تو یہ ہے' اس کو سامنے رکھو۔ پھر اس کے بعد اس سے پوچھو کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر وہ کہے کہ میں اپنے گھر اپنوں کے ہاں واپس جانا چاہتا ہوں جو تمہارے دشمن ہیں' وہاں واپس جانا چاہتا ہوں تو اپنی حد تک اس کو اپنی حفاظت میں اس کے گھر کی طرف پہنچا کر آؤ اس لیے کہ اختلاف تو تم سے دین کا ہے' انسانی حیثیت سے تو وہ حقوق رکھتا ہے جو انسان کو حاصل ہونے چاہئیں اس لیے اپنی حفاظت میں اپنی سرحد تک پہنچاؤ۔

میں کہہ رہا تھا کہ یہ ان عورتوں کے متعلق ہے جو مدینے میں یوں آ گئی تھیں اور ان کے متعلق کہا کہ یہ ٹھیک ہے یہ تو رہ جائیں گی یا وہ لونڈیاں جن کے پہلے خاوند تھے ان کے متعلق کہا کہ ان کے جو خاوند ہیں' ان کو وہ روپیہ بھیج دو جو انہوں نے ان پر خرچ کیا تھا۔ کہا ہے کہ کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ (4:24) اسے یونہی مذاق نہ سمجھ لینا' یہ تمہارے لیے خدا کا قانون ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ اُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (4:24) اِن عورتوں کے علاوہ' باقی سب تمہارے لیے حلال ہیں لیکن صرف اسی صورت میں کہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کرو اور اس طرح زوجین اُن پابندیوں میں گھِر جائیں جو میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ تم ان سے محض شہوت رانی کے لیے تعلقات پیدا کر و خواہ اس کے لیے نکاح کی رسم بھی کیوں نہ ادا کر لی جائے۔ الغرض یہ کہ حرام کی گئی عورتوں کی فہرست کے علاوہ باقی تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ مہر کی شرط ادا کرو مُّحۡصِنِيۡنَ (4:24) نکاح کی ساری حدود و قیود عائد کرو۔ غور فرمایئے کہ جو باقی' حلال عورتیں ہیں' ان کے متعلق یہ حکم ہے۔

## نکاح کی حدود کے بعد مادۂ تولید کی حفاظت کا ذکر

اب سوال یہ ہے کہ یہ حدود و قیود کیا ہیں؟ تفصیل تو دوسرے مقامات میں دی ہے' یہاں ایک لفظ مُّحۡصِنِيۡنَ (4:24) آیا ہے' عزیزانِ من! یہ لفظ مُّحۡصِنِيۡنَ کافی تھا۔ یہ قیدِ نکاح میں لاتے ہوئے' نکاح کی پابندیوں میں لا کر' یوں تمہارے لیے حلال ہیں۔ آگے کہا ہے کہ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (4:24)۔ سفح کہتے ہیں ''پانی کو یا خون کو یا کسی بہنے والی چیز کو' یوں بہا دینا''۔ یہ چیز غور طلب ہے کہ نکاح کی شرائط و حدود کے ساتھ' مادۂ تولید بہانے کے لیے نہیں ہے' جذباتِ شہوت کی تسکین کے لیے نہیں ہے۔ قرآن حمید کیا لفظ استعمال کر گیا ہے! نکاح کے بعد بھی ایک شرط یہاں عائد ہوئی ہے کہ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (4:24)۔ یہ بات بڑی دور تک چلی جاتی ہے' کہا تھا کہ تزویج اور نکاح کا اصل مقصد تو ایک جنّتی انداز کا گھر قائم کرنا ہے' یہ جو افزائشِ نسل ہے یہ ایک ضمنی چیز ہے اور اتنی سی چیز تو حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ افزائشِ نسل تو سب حیوان کرتے ہیں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ کہا ہے کہ

یہاں اس سے جنسی اختلاط مقصود نہیں ہے' یہ ایک سیکنڈری (ثانوی) چیز ہے' یہ بھی نکاح کا اصل مقصد تھا کہ باہمی رفاقت کی زندگی ہو' تزویج کی زندگی ہو' گاڑی کے دو پہیے ہوں' یوں کاروانِ انسانیت کو آگے لے جانے کے اس پروگرام کو ذہن میں رکھو۔ اس سے یہی مقصد نہیں ہے کہ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4:24) جنسی خواہشات کی تسکین کرتے چلے جاؤ۔

## چار شادیوں کے لیے اہلِ یورپ کو ہمارے مفسرین کے دلائل' قرآنِ کریم کے منتخب کردہ الفاظ کا اعجاز کے ساتھ ایجاز اور میاں بیوی کا منفعتِ باہمی کا معاملہ

بڑی حکمت و غایت اور فلسفہ بیان کیا جاتا ہے صاحب! یورپ میں جا کر بھی اب ہمارے جدید مفسرین کہتے ہیں اور ان کو چار بیویاں کرنے پہ قائل کرآتے ہیں۔ قائل کیسے کرآتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ بتاؤ تمہارے ہاں ایک میاں ہوتا ہے تو کیا وہ شادی کے بعد حرام کاریاں نہیں کرتا؟ کہا کہ جی ہاں' کرتا ہے' تو گویا حرام کاری کو روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس طریقے سے حلال کاری کراتے چلے جائیں' ایک اور دیدو بیوی بھئی! اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! ایک اور بیوی دیدو۔ سوچیے کہ کیا یہ صرف شہوت رانی کا مقصد ہے؟ اس مرد کو وہاں یہ کہہ کر قائل کرایا جاتا ہے کہ ایک بیوی کے تجربے سے تم نے دیکھ لیا۔ معلوم نہیں سننے والے نے بات کو آگے بڑھایا یا بس چھوڑ دیا۔ کم از کم اس سے پوچھتا حضرت صاحب! آپ کی کتنی بیویاں ہیں تو اس مفسر کی تو ایک ہی بیوی تھی۔ وہ کہتے ایک' تو پھر وہ پوچھتے کہ جی! تو کیا پھر آپ بھی وہی کچھ کرتے پھرتے ہیں جو یہ یورپ والے کرتے پھرتے ہیں؟ اور اگر آپ اس کے باوجود اپنے آپ پہ ضبط رکھ سکتے ہیں تو پھر دوسرے انسان کیوں نہیں رکھ سکتے۔ یہ حکمت اور فلسفہ بیان ہو رہا ہے چار شادیوں کا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4:24) اس کی یہ غایت نہیں' غایت تو مُّحْصِنِيْنَ ہے۔ یہاں غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ کہہ کر قرآن کیا بات کر گیا ہے!

عزیزانِ من! میں نے اسی لیے عرض کیا ہوا ہے کہ قرآن مجید پہ چلیے تو ایک ایک لفظ پر کھڑے ہو جائیے' گھنٹوں دنوں مہینوں سالوں گزار دیجیے ایک لفظ کے اوپر۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید ایک ایک لفظ کے اندر کیا کیا کہتا چلا جاتا ہے۔ اعجاز تو اس کا' اسی ایجاز میں ہے' یہ خدا کے منتخب کردہ الفاظ ہیں۔ اور وہ مصنف جس نے یہ آخری کتاب لکھی ہو 'تو را کشید او دست از قلم کشید'[1] اس کے بعد اس نے کوئی اور کتاب ہی نہیں لکھی۔ کیا بات ہے صاحب! جسے ایک مصنف کی فکر کا ماحصل کہتے ہیں' وہ اس کی عمر کے آخری حصے میں ہوتا ہے۔ میں

---

[1] تیری تصویر کھینچی تو اُس مصور نے قلم رکھ دیا کہ اس کے بعد میں کوئی اور تصویر نہیں کھینچوں گا۔

مثال کے طور پہ عرض کر رہا ہوں۔ یہ خدا کی آخری کتاب ہے' اس کے الفاظ تو پوچھیے نہیں کہ کیا چیزیں کہہ جاتے ہیں! یہاں مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (4:24) کہا ہے اس لیے نہیں کہ تم ان سے محض شہوت رانی کے لیے تعلقات پیدا کر لو۔ اس کی غایت یہ نہیں ہے مگر یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایک بیوی والے حرام کاری سے رکتے نہیں ہیں اس واسطے چار شادیاں ہیں۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم نے خود یہ چیز کہی ہے کہ اگر ایسی صورت ہو تو ضبطِ نفس سے کام لو۔ یہ قرآن کریم کا حکم ہے' ابھی آگے آتا ہے۔

برادرانِ عزیز! جنسی معاملات میں تو قرآن مجید اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں کرتا' یوں کہیے کہ اس میں اضطراری حالت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ میں وہاں عرض کرونگا جہاں یہ آیت آئے گی۔ کہا ہے کہ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً (4:24)۔ پھر یہ ایک ایسی آیت آ گئی جس میں آپ کے ہاں ابہام پیدا کیے گئے ہیں یا موجود ہیں جبکہ قرآن کریم میں نہیں ہیں۔ قرآن میں تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایسی آیت ہو جس سے کسی قسم کی پیچیدگی پیدا ہو۔ کہا ہے کہ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ (4:24)۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ استمتع کا مطلب فائدہ اٹھانا ہے' جن عورتوں سے تم نے یہ فائدہ اٹھانا ہو' ان کے ساتھ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً (4:24) جو مہر مقرر کیا ہوا ہے' وہ مہران کو دیدو۔ یہ جو لفظ اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ ہے' اس کا مادہ (Root) ''م ت ع'' ہے۔ اس کے معنی ''ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا'' ہیں۔ میاں بیوی منفعتِ باہمی کی بنا پر میاں بیوی بنتے ہیں' اس میں ایک دوسرے کا فائدہ ہوتا ہے' اس میں منفعت ہوتی ہے۔ قرآن حمید نے یہ لفظ استعمال کیا' اس میں مہر کی ادائیگی فَرِيۡضَةً (4:24) ہے یعنی جو چیز تم نے طے کر لی ہے' تم پہ واجب ہو گیا کہ اسے ادا کرو۔

## لفظ متعہ کے متعلق پایا جانے والا تصور جو ہزار سال سے شیعہ حضرات اور سُنّی حضرات کے زیرِ بحث چلا آ رہا ہے

ایک لفظ ہے جسے متعہ کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کے دو فرقوں میں' ایک بڑی امتیازی سی حدِ فاصل ہے۔ شیعہ حضرات کے ہاں متعہ جائز ہے' سنّی حضرات اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ متعہ کے معنی ہوتے ہیں ''کسی عورت کے ساتھ جنسی اختلاط' مدت کے تعین کے ساتھ کرنا''۔ وہ ایک مرتبہ کے لیے بھی طے کر کے ہو سکتا ہے' وہ ایک دن کے لیے بھی ہو سکتا ہے' وہ ہفتہ بھر کے لیے ہو سکتا ہے' مہینہ بھر کے لیے ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ پیسے طے کر لیے جاتے ہیں۔ میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' بات آ جاتی ہے تو ذکر کرنا پڑتا ہے' میری مجبوری ہے' چونکہ مخلوط مجمع ہوتا ہے۔ یہ جنسی اختلاط ہے یعنی اس کے لیے پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ مدت متعین کر لی جائے اور اس کی اجرت متعین کر لی جائے۔ اس مدت کے بعد پھر طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ عورت اس مرد کی وراثت میں بھی حصہ نہیں پاتی جیسے بیوی حصہ پاتی ہے۔ اگر اس سے اولاد ہو جائے تو اس کی پرورش کی ذمہ داری بھی اس مرد پر نہیں ہوتی جیسی باپ پہ ہوتی ہے۔ یہ چیزیں متعہ

کے اندر ہیں' شیعہ حضرات کے ہاں یہ چیز جائز ہے۔ سُنّی حضرات اسے ناجائز قرار دیتے ہیں اور یہ بحث آپ کے ہاں کم از کم ہزار سال سے چلی آ رہی ہے۔ یہ جو لفظ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ (4:24) ہے' اس سے بھی وہ حضرات سند لاتے ہیں۔ یہ متعہ کا جو لفظ ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ اگر آپ اس لفظ اسْتَمْتَعْتُمْ پر غور کریں گے تو نظر آ جائے گا کہ اصل کیا ہے۔ اس کا مادہ ''م ت ع'' ہے۔ ان شیعہ حضرات اور سُنّی حضرات کی یہ بحث آپس میں چلی آئی ہے۔

عزیزانِ من! آپ کہیں گے کہ اتنی لمبی چوڑی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے جب کہ قرآن حمید اتنا کچھ کہتا چلا آ رہا ہے۔ ابھی ابھی اسی آیت میں یہ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4:24) کے الفاظ آئے ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی تو یہ آیت ہے تو اس کے بعد یہ بحثیں ہزار برس سے کیوں نہیں طے ہو پاتیں؟ ہمارے ہاں قرآن مجید سے نہ بات چلتی ہے' نہ قرآن مجید سے بات طے کی جاتی ہے' اس کے لیے روایات ہیں جن کو احادیث کہتے ہیں۔ ان میں متعہ کی اجازت ملتی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ شیعہ حضرات اپنی احادیث سے اس کو ثابت نہیں کرتے' وہ سنّیوں کی احادیث سے اس کو ثابت کرتے ہیں اور اس کے متعلق آپ کے ہاں اس کے جواز میں بھی اتنی احادیث ہیں۔ ادارہ طلوعِ اسلام نے ''مقامِ حدیث'' ایک کتاب شائع کی ہوئی ہے اس میں متعہ کا عنوان ہے کہ یہ سنّیوں کی احادیث ہیں جن کو شیعہ حضرات ان کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں۔ خود سنّی حضرات کے ہاں یہ طے نہیں ہوا کہ صاحب! پہلے یہ جائز تھا' بعد میں یہ منع کیا گیا۔ کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ خیبر ❶ کی جنگ میں منع کیا' تیرہ سال مکے کے پھر مدینے کی زندگی کے ابتدائی 7 سال اسے منع کرنے میں لگے' کبھی کہتے ہیں کہ نہیں' آخری حج ❷ کے زمانے میں یہ منع کیا گیا' ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45ء) میں جا کر یہ منع کیا۔ اس دوران میں یہ ساری احادیث موجود ہیں۔ یہی نہیں کہ ان کے لیے زبان زیب نہیں دیتی بلکہ جگر شق ہو جاتا ہے اگر میں ان میں سے کچھ حدیثیں آپ کے سامنے پیش کروں کہ کتنی کتنی باعصمت خواتین ہیں جن کے متعلق ان میں ذکر ہے کہ وہ بھی اس کی مرتکب ہوئیں۔ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

میرے نزدیک' عزیزانِ من! قرآنِ خالص سے اگر ان چیزوں کو لیا جائے تو یہ مطالب سامنے نہیں آ سکتے۔ جب یہ عقیدہ وضع کیا جائے کہ قرآن کریم کی تفسیر صرف روایات کر سکتی ہیں اور اگر کبھی کوئی حدیث قرآن کریم کے خلاف جائے تو حدیث قرآن کریم کو منسوخ کر سکتی ہے' تو قرآن کریم باقی نہیں رہتا۔ اب یہ عقیدہ پہلے وضع کیا گیا' اس کے بعد پھر قرآن کریم لایا گیا تو قرآن کریم کہاں باقی رہتا ہے۔ آج تو روایات کو قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں پرکھنا ہوگا۔ اس لیے یہ اتنی لمبی چوڑی گنجائش چلی آ رہی ہے۔

---

❶ یہ غزوہ 7ھ میں ہوا۔

❷ 10ھ' نویں ذی الحجہ' جمعہ کا روز' قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمع نبوت ﷺ کے گرد تھا۔

## شادی پر مہر کی ادائیگی کے متعلق قرآنِ حکیم کا حکم اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے یہاں یہی کہا ہے کہ جب میاں بیوی بنتے ہوں' تو یہ منفعتِ خویش کی چیز ہے' مہر طے کیا گیا ہے' اسے ادا کرو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مہر وہ تحفہ ہے جو مرد اپنی محبت اور رفاقت کے جذبہ کے اظہار کے لیے بیوی کو پیش کرتا ہے' کہا گیا ہے کہ یہ دینے کی چیز ہے' دیا کرو' مذاق کی چیز نہیں ہے' رواج کی بات نہیں ہے کہ جی ''مہر سوا لاکھ روپیہ ہے۔ اوہناں نے کہیا کہ چور دیا پتر! سوا لاکھ روپیہ تے سارا محلّہ ویچ دیئے' تاں وی نئیں کٹھا ہونا۔ اوکہن لگا کہ دینا کینے ہیگا! اے لکھاندے کیوں ہو؟ نک رہ جاندا اے برادری وچ۔ ساڈے ایناں ای لکھیا جاندا اے۔ دوئے پاسے برادری جیہڑی کہندی اے کہ مہر شرعی ہو۔ اوشرعی کی؟ بتی روپئے تے خورے نال کجھ''❶۔ ان سے پوچھو کہ قرآن حمید تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے قنطار بھی دیدیا ہو' سونے کا ڈھیر دیدیا ہو' پھر بھی واپس نہ لو' یہ بتیس روپے والا مہر تم نے کہاں کہاں سے گھسیٹ لیا' اگر چھوٹا منہ ''تے سوا لکھ دی' جے سمٹوندے نے پئے تے بتی روپئے''(اگر چھوٹا منہ ہے تو سوا لاکھ' اگر اسے سمٹاتے ہیں تو بتیس روپے)۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ تو ایک تحفہ ہے جو مرد اپنی محبت کے اظہار میں اس بیوی کو پیش کر رہا ہے' اس پہ پابندیاں کون عائد کرسکتا ہے! کبھی تحفہ پہ بھی پابندیاں عائد ہوا کرتی ہیں!

آگے کہا ہے کہ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:24) نکاح کی ایک شرط مہر بھی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو تم نے محبت کے اظہار پر تحفہ کی صورت میں دیا ہے' یہ میاں بیوی کے ساتھ تعلقات کی خوشگواری ہے۔ اب تم نکاح کر کے منفعت کے طالب ہو یعنی بہ حیثیت میاں بیوی رہنا چاہتے ہو تو اُن کے جو مہر مقرر کر لیے ہیں وہ انہیں دیدو۔ البتہ اگر تم باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی کرلو تو اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں ہے اسے عام زبان میں یوں کہیے کہ مثلاً اس مہر پر بیوی نے یہ کہا کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے' آپ کو ضرورت ہے' آپ لے لیجئے' اس مہر میں سے رکھ لیجئے' اتنا سا لے لیجئے' آپس میں کچھ محبت کی بنا پر ایک دوسرے کے رفیق بن گئے' تزویج کی زندگی بن گئی' اب دونوں میں کونسی چیز ایسی ہے جو مشترک نہیں ہے مگر قرآنِ کریم میں تو قانون کی بات ہو رہی ہے۔ وہ قانون میں اٹل ہے ''ذرا جناں لحاظ نئیں کردا''(ذرہ برابر بھی رو لحاظ نہیں کرتا)۔ اور قانون کے بعد جب محبت کی بات آتی ہے تو کہتا ہے کہ اس کے اندر قانون کیا ہوتا ہے! سارا دیدو' آدھا دیدو' یہاں تک محبت کی بات

---

❶ جی! مہر سوا لاکھ روپیہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابے پاگل! سوا لاکھ روپیہ تو اگر سارا محلّہ بھی بیچ دیں تو بھی اکٹھا نہیں ہوگا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ دینا کس نے ہے! پھر یہ لکھاتے کیوں ہو؟ صرف اس لیے کہ برادری میں ناک نہ کٹے۔ ہمارے ہاں اتنا ہی لکھا جاتا ہے۔ دوسری طرف جو برادری ہے وہ کہتی ہے کہ یہ شرعی مہر ہو۔ یہ شرعی کتنا؟ 32 روپے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی۔

ہے۔کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا** (4:24) ہمیں علم ہے اس لیے ہم نے قانون کی بات کر دی اور **حَکِیۡمًا** (4:24) حکمت بھی ہمیں آتی ہے۔حکمت کی بات یہ ہے کہ آگے قانون کی جکڑ بندی نہیں ہوتی' محبت کی بناپۂ باہمی رضامندی سے' یہ کرنا چاہتے ہو تو اس میں یہ کمی بیشی کرلو' اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔

سورۃ النسآء کی آیت 24 تک ہم آ گئے' عزیزانِ من! 25 ویں آیت سے ہم آگے لیں گے۔آگے اسی سلسلہ میں یہ آیات آتی چلی جاتی ہیں۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

# نواں باب: **سورۃ النسآء** (1)' (آیات 25 تا 28)

وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ
فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ
اَہۡلِہِنَّ وَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ
اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیۡہِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ
خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ ؕ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾ یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ
وَیَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَیَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ
یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ۟ وَیُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّہَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا ﴿۲۷﴾ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ
یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ ۚ وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 25 ویں آیت سے ہوتا ہے:( (4:25۔

پچھلے اتوار میری غیر حاضری کی وجہ سے درس نہیں ہو سکا تھا۔ ایک دوست نے کہا ہے کہ تمہاری (یعنی میری) بخیر وخوبی مراجعت پر سامعین تمہارا دلی استقبال کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تم نے یہ چھٹی انجوائے (Enjoy) کی ہوگی۔ میں آپ احباب کا شکر گزار ہوں۔ پہلا شکریہ تو یہی تھا کہ آپ نے میری چھٹی منظور کر لی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں بخیر وخوبی واپس آیا۔ اور یہ جو چھٹی تھی' وہ انجوائے (Enjoy) تو میں نے کی لیکن پچھلے اتوار کو آپ احباب سے دلی طور پہ الگ نہیں تھا۔ وہ اتوار میں نے ایسے ہی گزارا جیسے اتوار کی صبح درس میں ہوتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ پھر ہمیں جمع ہونے کا موقع مل گیا۔ میں آپ احباب کا ان حسین تمناؤں اور مقدس دعاؤں کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں جو میرے لیے آپ کے دل سے نکلتی ہیں۔

## تمدنی لحاظ سے قرآنِ حکیم کے نزدیک عائلی زندگی کی اہمیت

سلسلۂ کلام عائلی زندگی کے متعلق چلا آ رہا تھا اور جیسا میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے تمدنی زندگی کے بڑے اہم

مسائل کے متعلق اصول ہی دیئے ہیں' زیادہ تر جزئیات نہیں دیں لیکن عائلی زندگی کے متعلق آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر تفصیلات اور جزئیات دیتا چلا جاتا ہے۔ گویا اس کے نزدیک اس مسئلہ کو انسانی تمدنی زندگی میں بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے اور بات ہے بھی ٹھیک۔ گھر کے اندر کی زندگی اگر جنت کی ہو تو انسان باہر کی زندگی میں بھی پھر بہت کچھ کر سکتا ہے اور اگر اس کا دامن انہی خار دار جھاڑیوں میں الجھا رہے تو ساری عمر چادر کو ان کانٹوں سے چھڑانے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔ چادر بھی پھٹتی ہے' انگلیاں بھی زخمی ہوتی رہتی ہیں' جھاڑیاں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اہمیت اس خدا کی طرف سے ہے جس نے یہ کہا ہے کہ دیکھیے! میری بیوی بھی نہیں ہے' بچے بھی نہیں ہیں' اس کے باوجود اسے ہماری بیوی بچوں کا اتنا خیال ہے کہ اس کے لیے بڑی تفصیل سے وہ احکام دے رہا ہے۔ اس سے انسان کی خانگی زندگی کی جو اہمیت ہے' وہ واضح ہو جاتی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں زوجین کے باہمی انتخاب کے لیے ضروری ہدایات اور غلاموں اور لونڈیوں کا مسئلہ

بات نکاح کے متعلق چلی آ رہی تھی۔ ہم فکر' ہم خیال' قلب و نگاہ کی ہم آہنگی' یک رنگی' سے سلسلہ ازدواج قائم ہوتا ہے۔ زوج ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (4:25)۔ اس آیت میں دو تین چیزیں بڑی اہم اور بنیادی آ گئیں۔ کہا یہ تھا' جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ شادی کے لیے جب اپنے جوڑے کا انتخاب کرو تو اس میں مقدم چیز یہ دیکھو کہ مزاج' طبیعت' معتقدات' تصورات' نظریات' قلب و نگاہ کی ہم آہنگی' یک رنگی' ہم مزاجی' نہایت ضروری ہے۔ اسی سے یہ جوڑا جوڑا بنتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی کی ذہنی قلبی سطح ایک ہو۔ کہا یہاں یہ ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا (4:25) اگر تم میں سے کسی ایک میں اس قسم کی استطاعت و فراخ دستی نہ ہو کہ اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (4:25) وہ ایسی آزاد مومن عورت سے شادی کرے' تو فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (425) تو وہ کسی ایسی مومن عورت سے شادی کر لے جو کسی کی لونڈی ہو۔ یعنی اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو کہ میاں بیوی کی ذہنی اور قلبی سطح ایک نہ ہو' اس ذہنی و قلبی سطح کی ہم آہنگی ایک امرِ دشوار ہو جائے' تو سنو! قرآنِ کریم نے اس معاشرے کی دو

کیٹگری (شقیں) کی ہیں جن کا ذکر چلا آ رہا ہے اور جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے ہاں' عورتوں میں' عام تھیں۔ اس نے کہا کہ ایک تو مُحْصَنٰتِ (4:25) ہیں یعنی ایک طرف گھروں کے اندر آزاد عورتیں ہیں' Cultured Families (متمدن خاندانوں) کی بیگمات ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:25) گھروں کے اندر لونڈیاں اور غلام ہیں۔ معاشرے کے اندر یہ دو شقیں ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حمید میں جہاں جہاں اس مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:25) کا ذکر آتا ہے' اس سے مقصود اس زمانے میں غلام اور لونڈیاں جو موجود تھے صرف وہ ہیں۔ آئندہ کے لیے قرآنِ کریم نے غلامی کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔

ہاں تو اس زمانے میں جو غلام اور لونڈیاں موجود تھیں' معاشرے کے اندر ان کا بڑا اہم مسئلہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر کے افراد مثلاً ہم دس بارہ ہوتے ہیں' ایک ملازم یا ایک ملازمہ ہوتی ہے' ان کی کیفیت یہ تھی جیسے ہماری گاؤں کی زندگیوں میں عام طور پر اور شہروں میں' خاص طور پر وہ جو پرانے دور کے نواب چلے آتے ہیں' ان کے ہاں ان ملازمین کی ایک لمبی قطار ہوتی ہے۔ ان نوابوں کے گھر میں میاں بیوی خواہ اکیلے ہی کیوں نہ ہوں مگر دس دس بیس بیس نوکر ہوتے ہیں اور گاؤں کی زندگی کے اندر تو فخر اور بڑائی کا معیار ہی یہ ہوتا تھا کہ ان کے ڈیرے پہ ایک ''لانگ'' لگی ہوئی ہو۔ عربوں کے ہاں بھی یہ بات مفاخرت کے لیے تھی' کسی کے ہاں جتنے زیادہ غلام اور لونڈیاں ہوں' اتنا ہی بڑا وہ سردار گنا جاتا تھا اور ویسے ان کی معیشت کا دارومدار بھی اس پہ تھا کہ یہ غلام ان کے مزدور ہوتے تھے جو ان کے تمام باہر کے کاروبار کرتے تھے' کاشتکاری بھی کرتے تھے' کام کاج میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور یہ لونڈیاں گھروں میں ملازموں کی طرح کام بھی کرتی تھیں' داشتاؤں کی طرح رکھی بھی جاتی تھیں اور ان کی خاصی بھرمار تھی۔ یہ تھے وہ غلام اور لونڈیاں جن کا مسئلہ قرآن مجید کے سامنے تھا۔ اب قرآن حمید کی رو سے جو خود اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل تھے' وہ انہیں آہستہ آہستہ آزاد کرتا گیا' ان کی آپس میں شادیاں کرتا چلا گیا اور جو ایسے نہیں تھے' ان کو خاندان کا جزو بناتا چلا گیا۔ انہی لڑکیوں کو جو گھر کے اندر خادمائیں تھیں' لونڈیاں تھیں' تھوڑے سے وقت کے بعد اس طرح سے انہیں یا تو خاندانوں کے اندر Absorb (ضم) کر لیا' یا انہیں آزاد کر دیا لیکن ایک چیز کو سامنے رکھنے کی ضرورت تھی اور میں سمجھتا ہوں یہ مقامات ایسے ہیں جن پہ غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ واقعی یہ کلام انسانوں سے اوپر کے کسی سرچشمۂ علم کی طرف سے آیا ہوا ہے۔

عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ جب ہمارے ہاں ریفارمرز (مصلحین) اٹھیں گے تو وہ جذبات سے کام لیں گے۔ یہاں بھی اگر خالص جذباتی چیز ہوتی تو جب یہ کہا گیا تھا کہ غلام اور لونڈیاں آزاد انسان ہیں اور انسان ہونے کی وجہ سے یکساں واجب التکریم ہیں' ان میں مساواتِ انسانیہ ہے تو اس کے بعد کسی معاملے میں بھی ان میں فرق نہیں رکھنا چاہیے تھا' جذبات کا یہی تقاضا تھا لیکن جب آپ Facts (حقائق) کو Face (سامنا) کریں گے' جذبات کی جگہ حقائق کو سامنے لائیں گے' تو پھر آپ کو اس مسئلہ کے مختلف

پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ قرآن مجید کے سامنے یہ چیز تھی کہ ازدواجی انتخاب کے لیے ذہنی و علمی سطح کا یکساں ہونا نہایت ضروری ہے۔

## عربوں کے معاشرتی ماحول میں پرورش پانے والے غلاموں اور لونڈیوں کی ذہنی' نفسیاتی اور کیفیاتی الجھن!

یہ سیدھی سی بات ہے کہ اس معاشرے میں بھی ایک طرف یہ آزاد عورتیں تھیں' اور ان کے مقابلے میں دوسری طرف یہ غلام لڑکیاں تھیں' یہ خادمائیں تھیں' ان دونوں شقوں میں کتنا ہی ذہنی' علمی اور تمدنی فرق تھا! ہم لونڈیوں یا غلاموں کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ان کی ذہنی سطح کیا ہوتی تھی اور کیا ہو سکتی تھی۔ یہ نہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کے اندر کوئی تفاوت تھا ان خادماؤں کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ کتنی ہی نسلوں سے' کتنی ہی صدیوں سے' غلام ابنِ غلام تھیں اور اُس دَور میں' اس ماحول میں وہ پرورش پا رہی تھیں کہ نہ تعلیم ہے' نہ ان کی تربیت ہے' نہ ان کی ذہنی سطح بلند ہے۔ وہ نفسیاتی طور پہ اپنے آپ کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کو سمجھنے دیا ہی نہیں جاتا تھا کہ وہ انسان ہیں۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ان کی جو ذہنی ثقافتی سطح تھی' وہ اس آزاد معاشرے کی عورتوں سے بہت پست تھی۔ اب یہ آزاد مرد' جب قرآن حکیم نے ہم آہنگیِ فکر و نظر کہا ہے' تو انتخاب میں یقیناً وہ اسی عورت کو اپنے لیے چنے گا جو کم از کم ذہنی طور پہ اس سے یکساں سطح پر ہو اور یہ جو لونڈیاں تھیں یہ تو ذہنی طور پر اس سطح پہ نہیں تھیں۔ یہ تھی ایک بڑی نفسیاتی الجھن!

## قرآنِ حکیم کی تعلیم لونڈیوں سے نکاح کی صورت میں جذبات کی بجائے Facts (حقائق) کو پیشِ نظر رکھتی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ اگر خالص جذباتی طور پہ ریفارمر (مصلح) اٹھتا تو وہ یہ کہتا کہ نہیں' کوئی بات نہیں' سب انسان یکساں ہیں' مساواتِ انسانیہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب یہ چیز کہہ دی گئی ہے کہ یہ غلام غلام نہیں رہیں گے' لونڈیاں لونڈیاں نہیں رہیں گی تو زندگی کے کسی شعبہ میں ان میں اور اُن میں کوئی تمیز نہیں کی جائے گی' یہ ایک دھواں دار تقریر ہوتی اور اس کے بعد تین چار اشعار ہوتے لیکن یہ قرآن حکیم ہے' کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسانیت کے سارے حقوق میں تکریم و احترام دیا جا رہا ہے لیکن حقیقت ہے کہ غلام اور لونڈیاں موجود ہیں' ان کی ذہنی قلبی نگاہ کی جو سطح ہے' وہ اتنی اونچی نہیں ہے کہ ایک زوج کی حیثیت سے گھر کے اندر تم Easy (بہ سہولت) رہ سکو اور ان کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داشتہ یا لونڈی کی حیثیت سے ان کو رکھنا بھی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اس نے اس معاملے میں یہ کہا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ یہ جو آزاد مرد اور آزاد عورتیں ہیں' یہ ایک گروہ ہے اور یہ جو غلام اور لونڈیاں ہیں' یہ معاشرے کا ایک دوسرا گروہ بن گیا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے پھر عرض کر دوں کہ ان میں مساوات ہے اور احترام یکساں ہے مگر جو مدارج ہیں' وہ مختلف ہیں۔ وہ تو قرآن حکیم نے خود بھی کہا ہے کہ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا

عَمِلُوۡا (6:132)انسان ہونے کی حیثیت سے ہر فردِ انسانیہ یکساں احترام کے قابل ہے لیکن جو مدارج ہیں وہ اعمال اور جوہرِ ذاتی کی بنا پر قائم کیے جائیں گے۔سوسائٹی کے اندر مدارج کا تفاوت ضرور رہے گا۔تو کہا یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ان کی سطح بڑی پست ہے اس لیے یہ دیکھو کہ اپنی سطح پر جو ہم فکر' ہم مزاج' ہم آہنگ عورتیں ہیں' ان کو Preference (ترجیح) دو' یہ شادیاں کامیاب رہیں گی لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نکاح کی یہ شکل نہیں بن سکتی اور اگلی چیز یہ کہی کہ تمہاری اپنی کیفیت ایسی ہو کہ تم خود پر شاید ضبط نہ رکھ سکو تو پھر یہ ہے کہ ان میں جو خادمائیں یا لونڈیاں ہیں' ان سے حسبِ پسند شادی کرلو' ان کے ساتھ نکاح کرلو لیکن ان کے جو مالک ہیں ان کی اجازت سے شادی کرو' بیوی کی طرح' اسی طرح سے' مہر ادا کرو' یہ بالکل بیوی کی حیثیت ہوگی' بالکل جیسے آزاد عورت سے شادی کی ہے' اس معاملے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اس انتخابِ زوج کے وقت اتنا سوچ لو کہ تمہاری جو ذہنی سطح ہے' یہ اس کے ساتھ Compatible (موافق) ہو سکے گی۔یہ ایک ابتدا ہے جسے برسبیلِ تنزل کہتے ہیں' یہ ایک Incompatible (ناموافق) صورت نہ ہو۔یہاں قرآن مجید نے دو شرطیں عائد کر دی ہیں۔ایک یہ کہ Preference (ترجیح) تو اُسے ہی دو جو عورت تمہاری سطح کے برابر ہے' اسی کے ساتھ شادی کرو۔دوسرا یہ کہ اگر ایسی صورت نہیں ہے اور تمہاری یہ کیفیت ہے کہ شادی نہ کرنے کی صورت میں تمہیں اپنے متعلق یہ خدشہ ہے کہ شاید تم سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے' تو پھر ان میں سے تم کسی کے ساتھ شادی کرلو۔اس کے بعد کہا ہے کہ وَ اَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ (4:25) یاد رکھو کہ آیا تم انفرادی طور پر اپنے متعلق یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم ضبطِ نفس کر سکتے ہو لیکن ہم تمہیں یہ بتاتے ہیں کہ اس کے باوجود اگر تم اپنے آپ پہ ضبط کر کے عفت رکھو اور نکاح نہ کرو' تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔اب یہاں بھی قرآنِ کریم نے' یہ کہنے کے باوجود کہ جو انفرادی Cases (صورتیں) ہیں' ان میں تم خود ہی فیصلہ کر سکتے ہو کہ آیا ابھی اسلام نے تمہارے اندر اتنی تربیت پیدا کی ہے یا نہیں کہ تم ان جنسی جذبات پر کنٹرول رکھ سکو۔قرآن حمید کی تربیت تو وہ شے ہے کہ اس کے بعد مومن مرد اور عورت لغزش میں مبتلا نہ ہوں۔جب قرآنِ کریم نے مومن مرد اور عورت کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے ہیں تو اس نے بتا دیا کہ اس تربیت سے ضبطِ نفس کی یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان کبھی لغزش کے اندر مبتلا نہ ہو لیکن یہ بات تو ابتدائے اسلام کی ہو رہی ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اس کا فیصلہ خود کرو۔

## اگر شادی کا چانس میسر نہ آئے تو اپنے پہ ضبط کرو' پست ترین سطح پر نہ پہنچو

عزیزانِ من! اصول یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ نکاح کے لیے اگر Compatibility (موافقت) میسر نہیں ہے یعنی ہم آہنگی کی صورت میسر نہیں ہے تو پھر' اگر تم اپنے آپ پہ کنٹرول رکھو' ضبط رکھو' تو یہ زیادہ بہتر ہے۔یہاں یہ بات بڑی اہم آ گئی۔قرآن حمید نے

اتنا ہی کہا ہے کہ اَنْ تَصْبِرُوْا (4:25) ضبطِ نفس رکھو' سورۃ النور کے اندر بھی یہ بات آئی ہے۔کہا ہے کہ وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا (24:33) جن کے لیے نکاح کی صورت نہ پیدا ہوسکتی ہو' وہ اپنی عفت کو محفوظ رکھیں' ضبطِ نفس سے کام لیں' اسکے اوپر کنٹرول کریں۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے جو قرآن مجید نے بیان کی ہے اور آج کے دور میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ بدقسمتی سے مغرب کا مادی تصورِ حیات (Materialistic Concept of Life) بالکل Animal (حیوانی) سطح کی زندگی سکھاتا ہے۔انہوں نے جنسیات کو اتنا بدلگام کر دیا ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ حیوانات کے اوپر تو فطرت نے خود کنٹرول رکھا ہوا ہے' وہاں تو یہ چیز بدلگام ہو نہیں سکتی' انسانوں پر قانون کی رو سے ایک ضابطہ' ایک کنٹرول' ایک حد' متعین کی گئی۔اُنہوں نے جب ان حدود کو اٹھا دیا تو یہ کہنا میں سمجھتا ہوں' حیوانات کی تذلیل ہے' ان کی تحقیر ہے کہ وہ حیوانی سطح پہ پہنچ گئے۔حیوانی سطح تو ان سے بہت اونچی ہوتی ہے' انسان کی اس سطح کے لیے تو کوئی نام ہی نہیں ہے کہ یہ کس سطح پر پہنچ گئے۔

## اپنے جذبات کو ابھارنا یا پیدا کرنا انسان کے اپنے کنٹرول میں ہوتا ہے

جنسی تسکین کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ صاحب! یہ جذبہ بہت شدید ہے۔غالب (1797-1869ء) کہتا ہے کہ ''لگائے نہ لگے'' وہ تو جب جی چاہے' ماچس سے جلا لیتے ہیں لیکن اس کا جو اگلا حصہ ہے اس کو وہ بڑے زور سے بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''بجھائے نہ بنے''❶ ٹھیک ہے''دوجے دی لائی ہوئی نوں تے بجھاندا' اپنے ہتھ دی لائی ہوئی نوں کیویں بجھاوے''(دوسرے کی لگائی ہوئی کو تو بجھاتا ہے مگر اپنے ہاتھ کی لگائی ہوئی کو کیسے بجھائے)۔اس جذبے کو ابھارنا یا بیدار کرنا انسان کے اپنے کنٹرول میں ہے۔ اس کی تسکین نہ ہونے سے کچھ ہرج واقع نہیں ہوتا۔اس میں اضطراری حالت کا سوال نہیں ہے۔

## جنسیات کے سلسلہ میں فرائڈ کی کھائی گئی لغزش کا نتیجہ

عزیزانِ من! اس عنوان پہ بدقسمتی سے ایک اور تازیانہ لگا ہے۔ہمارے ہاں Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) کا ایک بہت بڑا امام جو پیدا ہوا ہے اس کو Sigmund Freud (فرائڈ :1856-1939ء) کہتے ہیں۔اس نے ایک لغزش کھائی۔ہوتا یہ ہے کہ جس کا فکر بلند ہو' اس کی لغزش بھی بڑے دور رس نتائج پیدا کیا کرتی ہے۔یہ بڑی بلند فکر کا انسان تھا۔اس نے جنسیات کے معاملے پر بقول ان لوگوں کے' جو تحقیق کی تھی' اس کے متعلق یہ خیالات عام کیے کہ صاحب! یہ جذبہ ہے' اس کی Satisfaction (تسکین) نہایت ضروری ہے' اس پہ کسی قسم کا کنٹرول نہیں ہونا چاہیے' کسی قسم کا کوئی ضابطہ نہیں ہونا چاہیے' کوئی تحدید (Limitation) نہیں

---

❶ غالب کا اصل شعر یہ ہے: عشق پہ زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ہونی چاہیے' اگر کہیں ذرا سی بھی رکاوٹ پیدا ہوئی تو اس میں پیچیدگیاں (Complexes) پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) کی ساری بنیاد اس پہ ہے۔ اگر کہیں کسی نے کہہ دیا کہ صاحب! دیکھیے اس نے جھوٹ بولا ہے تو اس پر فوراً کہا کہ اس میں جنسیاتی جذبے کی تسکین پر کوئی پیچیدگی آ گئی ہے' اگر یہ کہہ دیا کہ یہ ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس پر جھٹ سے کہا کہ اس کے جنسی جذبے کی تسکین نہیں ہوئی۔ اگر میں کسی دن آپ کو فرائڈ (1939-1856ء) پہ لیکچر دوں تو میں بتاؤں کہ وہ شخص کیا کر گیا ہے۔ ایک بڑے دماغ اور ٹیڑھی گردن والا انسان کیا کر جاتا ہے! وہ سارے معاشرے کو جنسی تسکین بہم پہنچا گیا۔

## فرائڈ کے خیالات کے برعکس ایڈلر اور ژنگ کی تحقیق اور ہمارے نوجوانوں کی تقلید

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کہنا کہ آج کا انسان جنسی جذبے کی تسکین کے لیے حیوانی سطح پہ پہنچا ہے' غلط ہے' حیوانات تو اس سے لاکھ درجے بہتر ہیں' جب کہ اس کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے' اس کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ صاحب! اگر اس جذبے پر ذرا سی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے نفسیاتی بیماریاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں کے نوجوانوں میں بھی' مغربی لٹریچر پڑھنے کے بعد' یہ باتیں آ گئی ہیں کہ صاحب! اس سے نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں' اعصابی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں' انسان پاگل ہو جاتے ہیں۔ اف! پوچھو نہیں کہ پھر ہمارے ہاں کیا کیا چیزیں چلتی ہیں۔

اطلاعاً عرض کر دوں کہ فرائڈ کی جو یہ تھیوری ہے' یہ مدت ہوئی Explode (ریزہ ریزہ) ہو چکی' خود اس کے اپنے ساتھی الفرڈ ایڈلر (1939-1870ء)' جون (1958-1879ء) اور بالخصوص ژنگ (1961-1875ء) تھے' انہوں نے اس سے اختلاف کیا ہے' انہوں نے اپنے الگ سائیکولوجی کے مکتبِ فکر قائم کیے ہیں اور اس کی اس تھیوری کی دھجیاں اڑا دی ہیں' اسے انہوں نے بالکل Explode (ریزہ ریزہ) کر کے رکھ دیا ہے' وہ کہنے لگے کہ یہ بکتا تھا۔ یہ لوگ بھی فکری طور پہ اس سے کم درجے کے بلند نہیں تھے بلکہ جون (1958-1879ء) تو بہت اونچا چلا جاتا ہے۔ ہماری مصیبت تو یہ ہے کہ نئی تحقیقات کے نتائج جلدی سے آتے نہیں ہیں۔ آپ نے وہ دور دیکھا ہو گا کہ اگر کوئی شخص ہتھوڑے سے کوئی چیز کوٹتا ہو' تو وہ پہلے نظر آتا ہے لیکن اس کی آواز بہت بعد میں پہنچتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ ہوتا ہے کہ وہاں جو تھیوری Explode (ریزہ ریزہ) ہوتی ہے' اس کی آواز بڑی دیر میں یہاں پہنچتی ہے اور ہم اسی پہ چلتے رہتے ہیں۔

## جنسی جذبے کے برعکس بھوک اور پیاس کی تڑپ کسی خیال اور ارادے کی محتاج نہیں ہوتی

عزیزانِ من! یہاں جو فرائڈ کی تھیوری ہے' وہ تو عام ہو رہی ہے مگر ابھی ژنگ اور ایڈلر نے جو کچھ کہا ہے' وہ عام نہیں ہو رہا یا شاید

یہ طبقہ اس کو قبول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے آ کر یہ چیز ثابت کی ہے کہ فرائڈ بالکل غلط کہتا ہے' یہ جنسی جذبہ بھوک اور پیاس کی طرح نہیں ہے۔ پیاس کی تو یہ کیفیت ہے کہ اگر انسان کسی کام کے اندر بھی جذب ہو تو بھی پیاس از خود لگنی شروع ہو جاتی ہے' پیاس لگانے کے لیے آپ کو کوئی خیال نہیں کرنا پڑتا کہ مجھے پیاس بھی لگنی چاہیے۔ بھئی! وہ از خود لگتی ہے۔ آپ پیاس بجھانے کا انتظام نہیں کرتے' کام میں جذب ہیں تو وہ اور تیز ہوتی چلی جاتی ہے تا آنکہ آپ میں یہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے کہ آپ وہ کام نہیں کر سکتے' آپ کو اسے چھوڑنا پڑتا ہے' اس سے بھی آپ متاثر ہوتے ہیں' آپ کی صحت پہ اثر پڑتا ہے اور اگر دو تین دن تک پانی نہ پیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ بھوک کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ چیزیں از خود لگتی ہیں اور جب تک ان کی تسکین نہ کی جائے' یہ بجھتی نہیں ہیں۔ یہ ہے کہ ''لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے''۔ انہوں نے کہا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جنسی جذبے کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ یہ بھوک اور پیاس کی طرح اضطراری نہیں ہے۔ اگر آپ اس طرف خیال نہیں لے جاتے' تو یہ از خود بیدار ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس میں اضطراری کیفیت (Involuntary State) کے پیدا ہو جانے کا سوال ہی نہیں ہے۔

## فرائڈ کی غلط فہمی کے برعکس حقیقت کی نشاندہی اور اس کا تعمیری نتیجہ

الفریڈ ایڈلر (1939-1870ء) اور جون (1958-1879ء)' فرائڈ (1939-1856ء) سے کہیں زیادہ Practical Cases (عملی صورتیں) اپنے سامنے لائے ہیں اور انہوں نے یہ چیز ثابت کی ہے کہ وہ شخص یہاں بڑی غلطی کر گیا ہے کہ اُس نے اس Instinct (جبلت) کو بھوک اور پیاس کی طرح فطری سمجھا اور اس نتیجے پہ پہنچا کہ جس طرح مثلاً پیاسا پانی نہ پیے تو اس کو کوئی بیماریاں لگ جاتی ہیں حتیٰ کہ آخر میں جا کر وہ مر بھی جاتا ہے' اس نے جنسی جذبے کو بھی اسی طرح سمجھا۔ یہ کہتے ہیں کہ فرائیڈ بالکل غلط سمجھا ہے۔ جنسی جذبے کی بیداری خیال کے بغیر از خود بیدار ہو ہی نہیں سکتی اور یہی چیز ہے جو اس جذبے کو کنٹرول میں رکھتی ہے' خیالات کو بیباک ہونے دیجیے تو یہ آگ بھڑکتی چلی جائے گی۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ اسے خیالات کی رو سے بھڑکاتے جائیں اور پھر اس کو Healthy (صحت مندانہ) تسکین کا سامان بہم نہ پہنچائیں تو بیماریاں بھی لگیں گی' اعصابی کمزوریاں بھی پیدا ہو جائیں گی' Neuroses (امراضِ اعصاب) بھی ہو جائیں گے' آپ میں نفسیاتی Complexes (الجھاؤ) بھی پیدا ہو جائیں گے لیکن یہ چیز کہ اس پہ کنٹرول نہیں رکھا جا سکتا' انہوں نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے' یہ خیالات کی چیز ہے اور اگر خیالات پر کنٹرول رکھا جائے تو یہ جذبہ کبھی بیدار ہی نہیں ہوتا اور اگر یہ چیز کنٹرول میں رہے تو اس کی تسکین نہ کرنے سے' نہ کسی قسم کی کوئی بیماری لگتی ہے' نہ نفسیاتی عوارض پیدا ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ تو اتنا قیمتی جذبہ ہے' اتنی بڑی توانائیاں انسان کے اندر پیدا کرتا ہے کہ اگر اس قوت کو محفوظ رکھا جائے اور جسے

Sublimation (تظامت) کہتے ہیں' ان توانائیوں کو تعمیری مقاصد کی طرف Divert (موڑ) دیا جائے' تو وہ انسان اتنا کچھ کر سکتا ہے کہ آج آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایسی توانائیاں ہیں جو انسان کے مثل ایک انسان پیدا کر سکتی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس توانائی کو' اس حیوانی سطح سے بلند انسانی سطح پر لے جایئے اور اس کے بعد دیکھیے کہ انسان کس قسم کے تخلیقی مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ وہ خود نہیں سوچ سکتا کہ اس ایک توانائی کے ضبط کرنے سے میں یہ کچھ کر سکتا تھا۔ وہ لوگ یہاں پہنچتے ہیں۔

ہماری مصیبت یہ ہے کہ جو چیز از خود وہاں سے سیلاب کی طرح آتی ہے' وہ ہمارے نوجوانوں کو بہا کر لے جاتی ہے' نہ یہاں ان کی صحیح تعلیم کا انتظام ہوتا ہے' نہ تربیت کا انتظام ہوتا ہے' نہ یہ کہ ان کو بتایا جائے کہ بابا! یہ بڑی پرانی بات ہو چکی ہے' اب دیکھیے وہاں کیا ہے۔ میں نے اپنے ہاں کے نوجوانوں کو فرائڈ کے متعلق تو باتیں کرتے ہوئے بے شمار بار سنا مگر کسی سے ابھی تک میں نے جون' جنگ اور ایڈلر کی بات نہیں سنی۔ آج سائیکولوجی کی تحقیق یہ کہہ رہی ہے کہ یہ جو جذبہ ہے' اس پہ کنٹرول کیا جا سکتا ہے' یہ خیالات کے تابع ہے۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن کریم نے یہ بات کہی۔ بھوک اور پیاس کے لیے تو اس نے کہا ہے کہ اضطراری کیفیت ( Involuntary State) پیدا ہو جائے تو تم حرام کھا کر جان بچاؤ' جنسی جذبے کے متعلق اس نے قطعاً اس کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے برعکس کہا ہے کہ اگر تمہاری یہ صورت ہو تو وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ (24:33) تمہیں ضبطِ خویش سے اپنی عفت کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ عفت کا یہ لفظ یہیں يُسْتَعْفِفِ سے آیا ہے۔ کہا ہے کہ ضبطِ نفس سے کام لو۔ اگر اس ضبطِ نفس سے واقعی یہ عوارض پیدا ہوتے' نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن یہ کہتا کہ ضبطِ نفس سے کام لو؟ یہاں پیاس اور بھوک کے متعلق اس نے کہا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو حرام تک کھا لینے کی اجازت ہے' اِس جنسی جذبے کی تسکین کے لیے بھی وہ اس قسم کا کوئی راستہ بتاتا۔ ان دونوں (بھوک/ پیاس اور جنسی جذبے) کے اندر کیوں Exception (استثنا) ہے؟ اس نے یہاں کیوں اضطراری حالت ( Involuntary State) بیان نہیں کی؟ اس لیے کہ بھوک اور پیاس پہ اختیار (Control) نہیں ہے۔ جب انسان کو پیاس اور بھوک لگتی ہے تو اس پہ اختیار نہیں کہ یہ نہ لگے' اور جب تک آپ اس کی تسکین کا انتظام نہ کریں وہ بھڑکتی چلی جائے گی' بیماریاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی' بالآخر موت واقع ہو جائے گی۔ قرآن کریم نے خود اُن جذبات میں اور اِن جذبات میں Exception (استثنا) کر دی ہے۔ یہاں جنسی جذبے کی تسکین کے لیے کہا ہے کہ اگر جائز طریق پر اس کی Satisfaction (تسکین) کا سامان میسر نہیں آتا تو عفت سے کام لو' ضبطِ نفس سے کام لو' کنٹرول کرو۔ کس چیز پہ کنٹرول کرو؟ خیالات پر۔ دیکھا! یہ کتنی عظیم چیز ہے!

## قرآنِ حکیم کی راہنمائی کی عظمت اور دورِ حاضر کی ریسرچ

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے گا' میں نے کہا تھا کہ آپ قرآنی حقائق اور انسان کے دورِ حاضرہ کے علوم کو سامنے رکھیں تو پھر آج

قرآن حکیم کی عظمت سامنے آتی ہے۔ آپ کے ہاں کی افراط وتفریط میں یا تو خدا پرستوں نے یہ کہا کہ جنسی جذبہ شجرِ ممنوع ہے' آدم کو بہشت سے نکالنے کی وجہ ہی یہ بات تھی' ساری برائیوں کا سرچشمہ یہی جنسی جذبہ ہے لہٰذا تجرد (Celibacy) کی زندگی خدا پرستوں کی زندگی ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے سورۃ الحدید کے اندر کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے' یہ بات ان لوگوں کے اپنے ذہن کی اختراع تھی جوانہوں نے کہا کہ خدا پرستی کا یہی راستہ ہے۔ پہلے تو یہ غلطی کی اور اس کے بعد اسے نبھا نہ سکے تو منافقت شروع ہوگئی۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر ہزار عوارض پیدا ہوئے۔ اس نے کہا کہ دیکھنا! کہیں راہبانیت اور خانقاہیت کی زندگی کو فطری زندگی نہ سمجھ لینا۔ وہ ادھر لایا ہے۔ اِدھر لانے کے بعد کہا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ جذبہ بھی بھوک اور پیاس کی طرح ہے کہ اس میں اضطراری حالت پیدا ہوسکتی ہے کہ جائز اور حلال' میسر نہیں لہٰذا جو ناجائز اور حرام ہے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ جذبہ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو' عفت سے کام لو' کنٹرول سے کام لو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ خیالات کے اوپر کنٹرول رکھو' اس جذبہ پر خود کنٹرول ہوجائے گا۔ 'لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے' والی بات یہ ہے جو اس[1] نے کہی ہے کہ خیالات کے اوپر کنٹرول رکھو۔

## زوجیت کے سلسلہ میں خیالات کی ہم آہنگی کی اہمیت کو مقدم جانو

اس لیے یہ کہا' یہ اجازت بھی یہاں تک دیدی ہے کہ جنسی تقاضے کی تسکین جائز طریقے سے ٹھیک ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ نہیں' مجھے نکاح کی ضرورت ہے تو ذہن میں رکھ لو کہ تمہارے مزاجوں کے اندر Incompatibility (ناموافقت) ہوگی۔ آپ ایک Cultured (مہذب) اور Educated (تعلیم یافتہ) لڑکے کی شادی ایک گنوار لڑکی کے ساتھ کر دیجیے تو کتنی ہی Pious Intentions (مقدس نیتیں) کیوں نہ ہوں' اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں کے اندر زندگی کا ایک تفاوت رہے گا' یہ زوج نہیں بن سکیں گے۔ یہ مساوات نہیں ہے۔ یاد رکھیے! قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ علم والا اور بے علم دونوں برابر نہیں ہوسکتے' یہ ایک واقعہ ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے تو شریف اور بدمعاش دونوں ہی انسان ہوتے ہیں۔ کیا کبھی ان دونوں کو آپ نے یکساں سمجھا ہے؟ ان کے اندر ایک تفاوت رکھنا پڑتا ہے' عالم اور جاہل میں فرق رکھنا پڑتا ہے' Cultured (مہذب) اور گنوار میں رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن حمید وہ Caution (احتیاط) کیسی عمدہ دیتا ہے کہ انتخاب کے وقت جو ذہنی Culture (تمدن) ہے جسے آپ ثقافت کہتے ہیں' جسے آپ ذہنی اور قلبی سطح کہتے ہیں' جسے خیالات کی ہم آہنگی کہتے ہیں' اسے ذہن میں رکھو کہ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ (4:25) اگر تم میں انفرادی طور پہ ایسی صورت ہو' اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے ابھی خود پہ اتنا اختیار نہیں ہے یعنی خَشِیَ الْعَنَتَ (4:25)

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1896ء) کی طرف ہے۔

اگر اسے اس کے متعلق خدشہ ہے کہ شاید مجھ سے لغزش ہو جائے تو پھر یہ توقع نہ کرے کہ اس شادی کا نتیجہ وہم آہنگی ہوگی' اس کا تمہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا اور اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ **وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ** (4:25) اگر تم خیالات کی بلندی بھی چاہتے ہو تو پھر ضبط سے کام لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ کیا بات ہے قرآن حکیم کی! ارے بھئی! کچھ مشکل نہیں ہے' ناممکن نہیں ہے اگر اپنے آپ پہ ضبط رکھو گے تو تمہارے لیے یہ بہت بہتر ہوگا۔

## خیالات کے تزکیہ کے بغیر عفتِ قلب و نگاہ پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہی ذہنی تفاوت جنّتی ماحول پیدا کرنے میں ممد ہوتا ہے

خیالات کی تربیت کرو اور یہ جو تم عدمِ توازن کی مستقل زندگی پیدا کر رہے ہو' اس سے جو مشکلات تمہارے ہاں آئیں گی' دشواریاں پیدا ہونگی' وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (4:25)۔ کیا بات ہے صاحب! یہ کرو گے اور ہم نے جو کہا ہے کہ اپنے خیالات کا تزکیہ' جسے وہ عفتِ قلب و نگاہ کہتا ہے' رکھو گے تو تمہاری حفاظت کا سامان بھی ہوگا' تمہاری نشوونما کا سامان بھی ہوگا۔ اس میں یہ چیز آ گئی۔

آپ کہیں گے کہ ٹھیک ہے' یہ جو لونڈیاں تھیں' ان کی یہ سطح نہیں تھی' اس سطح کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو معاشرے میں Disadvantage (نقصان) رہا' ٹھیک ہے' پھر یہ کہا کہ ان کی شادیاں' ان کی سطح کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کرو۔ ذہنی تفاوت کی وجہ سے ان کی وہاں شادیاں نہ کرو۔ تو بظاہر وہی جذباتی نقطۂ نگاہ سے نظر آیا کہ صاحب! یہ دیکھیے اس میں تفاوت ہو گیا' آپ نے تفریق پیدا کر دی' ان کو آپ نے Disadvantageous Position (نقصان دہ حالت) کے اندر رکھا۔ کہا کہ نہیں' یہ بات نہیں ہے۔

## زنا کی شکل میں آزاد عورتوں اور لونڈیوں کی سزا میں فرق کی بنیادی وجہ

آپ کو معلوم ہے کہ آگے کیا بات کہی ہے؟ کہا کہ **فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ** (4:25) جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آ جائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا (24:2) سے نصف ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوئی اور ان کی پہلی زندگی میں' اس قسم کی حرکات معیوب تصور نہیں کی جاتی تھیں اس لیے ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو شریف گھرانوں کی عورتوں سے متوقع ہوتا ہے۔ سزا کے تعین میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی عورت بے حیائی کا کام کرتی ہے' عورت یا مرد سے زنا کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو قرآنِ کریم میں سورۃ النور کے اندر (24:2) میں اس کی سزا مقرر کی ہے۔ سو کوڑے زنا کی سزا ہے اور یاد رکھیے کہ Adultery (بدکاری) اور اس کے اندر کچھ فرق نہیں ہے' اس میں رضامندی کا بھی سوال نہیں ہے۔ خیر یہ بات اور ہے۔ زنا کاری میں سو کوڑے عورت کو بھی اور مرد کو بھی ہیں اور یہاں یہ کہا کہ یہ جو لونڈیاں ہیں' اگر ان میں کسی سے اس جرم کا ارتکاب ہو جائے تو ان کی سزا آزاد عورتوں کے مقابلے میں آدھی ہے اس لیے کہ اُن آزاد عورتوں کی ذہنی تربیت اتنی ہو چکی تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ یہ چیزیں معیوب ہیں اور وہ اپنے آپ کو کنٹرول بھی کر سکتی تھیں' ان بیچاری لونڈیوں کی تربیت ابھی نہیں ہوئی' یہ جس ماحول سے گزری ہیں' اس میں یہ چیزیں موجود نہیں تھیں اس لیے ان کی ذہنیت ابھی ایسی نہیں ہوئی ہے اس لیے اُن کے مقابل میں اِن کو آدھی سزا دی جائے گی۔

## مجرم کو سزا دیتے وقت اس کی پرورش' تربیت اور ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہوگا

میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! ایک ایک نقطہ پہ غور کیجیے تو انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ یہ ہے جسے خدا کی طرف سے دیا ہوا ضابطہ ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے اذہان میں تفاوت کا ذرا سا بھی خیال آئے تو قرآن حمید خود ان دو کیٹگریز (شقوں) کے اندر تفریق کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس تفریق میں' یہاں تفریق کی کیا بات آ گئی! اس بات کا کتنا خیال رکھا جا رہا ہے! اور یہیں سے ایک اصول ہمارے ہاں آ گیا کہ مجرم کو سزا دیتے وقت' یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی پرورش' تربیت' کس ماحول میں ہوئی ہے اور اتنی سی بات نہیں! یہ بھی کہ خود معاشرے کے حالات کیا ہیں جن کے اندر وہ مجرم اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ معاشرے کے حالات اگر یہ ہیں کہ ایک مزدور جائز طریقے سے' دیانتداری سے' محنت کرتا ہے' کوشش کرتا ہے' جستجو کرتا ہے' تجسس کرتا ہے' اس کے باوجود اس کو کھانے کو نہیں ملتا اور وہ اس مجبوری کے عالم میں کھانے کے لیے کہیں سے کوئی چیز چرا لیتا ہے' تو چوری کا جو جرم ہے یہ اس پر عائد ہو گیا لیکن قرآن مجید کہتا ہے کہ اس کو بھی تو سوچو کہ اس کی یہ حالت اضطراری (Conpoulsive) تو نہیں تھی؟ اس ارتکاب کا اصل سبب ڈھونڈو۔ تاریخ نے اس قسم کے ایک واقعہ کو اپنے ہاں رکارڈ کیا ہے۔

## حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ اور سزا کے تعین کرنے کا اصول

جب حضرت عمرؓ (581-644/45ء) کے سامنے ان غلاموں کو' ملازموں کو پیش کیا گیا جنہوں نے کسی دوسرے کی اونٹنی کو ذبح کر کے کھا لیا تھا' تو چوری کا جرم ثابت تھا' انہوں نے اقرار کیا ہوا تھا' اس کی سزا بھی آنی تھی تو آپؓ (حضرت عمرِ فاروقؓ) نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ وہ کہنے لگے کہ صاحب! کیا کریں' ہمارے مالک کی کیفیت یہ ہے کہ صبح سے شام تک کوڑے سے

مشقت لیتا ہے اور کبھی پیٹ بھر کر کھانے کے لیے نہیں دیتا' ہم اس مقام پہ پہنچ گئے تھے کہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا کہ کسی طرح سے اپنا پیٹ بھریں۔ ہم نے اس لیے یہ کیا۔ آپؐ نے انہیں تو بغیر سزا کے چھوڑ دیا اور ان کے مالک کو بلایا اور اسے کہا کہ اس اونٹنی والے کو اس کا جرمانہ اس کی قیمت کی صورت میں ادا کرو' اسے یہ کہہ کر سزا دی کہ تم نے انہیں اس بات پر مجبور کیا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کریں۔

یہ قانون اور سزا کا بڑا اہم اصول ہے کہ آپ معاشرے میں کیا حالات پیدا کر رہے ہیں؟ ان کی ذہنی تربیت کا کیا انتظام کر رہے ہیں؟ کس ماحول میں اس بچے نے پرورش پائی تھی؟ آج اس کی کیفیت کیا ہے؟ کن حالات سے وہ گزر رہا ہے؟ قرآن کریم نے یہ ایک اصول دے کر کہ ایک جرم کا ارتکاب ایک Cultured (متمدن) عورت اور Educated (تعلیم یافتہ) عورت' اونچے گھرانے کی عورت' کرتی ہے' اسی جرم کا ارتکاب ایک گنوار جسے آپ چھوکری لونڈی کچھ کہہ لیجیے' بہرحال ذہنی اعتبار سے جو کم تر سطح پر ہے' اسی جرم کا ارتکاب اس سے ہوتا ہے' قرآن کریم کہتا ہے کہ اس کو آدھی سزا دو کہ وہ ذہنی طور پر تربیت کے اعتبار سے اس قابل نہ تھی کہ وہ دونوں میں موازنہ کر لیتی' اس بیچاری کو تم نے اس حالت میں رکھا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! غور فرمایا آپ نے کہ اگر ایک طرف نکاح کے مسئلہ میں یہ بات کہی کہ یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتیں' انتخاب کرتے وقت اس کو سوچ لینا' وہاں ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ صاحب! بات تو مساوات کے خلاف ہوگئی' جذباتی طور پہ یہی کہا' میں کہتا ہوں اس آیت میں اس کا ذکر کرنا' کتنی اہم بات ہے ورنہ اس کا ذکر وہاں ہونا چاہیے تھا جہاں جرمِ زنا کی سزا تجویز کی گئی ہے' وہاں کہنا چاہیے تھا کہ ان کی سزا یہ ہے اور لونڈیوں کی سزا یہ ہے! اس کا ذکر اس لیے یہاں کیا گیا کہ ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ مساواتِ انسانیہ کی تسکین کرنے والا یہاں ازدواجی معاملہ کے اندر یہ کہہ رہا ہے کہ Preference (ترجیح) ان کو دو۔ یہاں کہا کہ یہ سوال پیدا نہ ہوجائے کہ ہم نے یہاں کہہ کر ان کی تحقیر کی ہے بلکہ یہ دیکھو کہ ان کی ذہنی سطح ایسی ہے کہ دونوں میں تفاوت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے پہلے یہ تفاوت قائم رکھا ہے تو سزا کے معاملے میں ان کو دیکھو' ان کو دوگنی سزا دی گئی ہے۔ اور یہ آزاد عورتوں کے متعلق ہے کہ یہ ان کی سزا ہے۔

## نبوت کے گھرانے کی عورتوں کے لیے قرآن کریم کا ارشاد: آزاد عورتوں کے مقابلے میں دوگنی سزا کا حکم

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق کہا ہے' بلکہ نسآء النبی ﷺ کہا' رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کی جتنی عورتیں ہیں' ان کے متعلق کہا کہ اگر تم سے ایسے جرم کی بات بھی سرزد ہوگی تو تمہیں دوگنی سزا ملے گی۔ آ ہاہا! Uncultured (غیر متمدن) اور Uneducated (غیر تعلیم یافتہ) غلط ماحول میں پرورش یافتہ لونڈیوں کی سزا آزاد سے آدھی

اور نبی اکرم ﷺ کے گھرانے کی تربیت یافتہ عورتوں کی سزا' اگر لغزش ہو جائے' آزاد سے دوگنی ۔ یہ صرف نبی نہیں تھے' یہ ایک عظیم مملکت کے سربراہ بھی تھے' ہیڈ آف دی اسٹیٹ تھے ۔ یہاں تو کہا جاتا ہے کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ وہ ہے جو غلطی نہیں کر سکتا' نہایت مہذب تریں جمہوریت کے بہت بڑے علمبرداران بھی یہ کہتے ہیں کہ جرم تو ایک طرف رہا بادشاہ غلطی بھی نہیں کر سکتا مگر یہاں اس سربراہ' اس ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی ازواج کی سزا' اگر لغزش ہو جائے' تو آزاد عورت سے دوگنی رکھی گئی ۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا قرآنی فرمان برائے مساواتِ انسانیہ اور گہری حکمت

آپ کے ہاں بھی جب ملوکیت آئی ہے' اس ملوکیت میں جو سلطان خلیفہ تھا جس کو بعد ازاں بادشاہ کہا گیا' تو اس کو کسی جرم کی سزا نہیں دی جاتی تھی ۔ یہ اس کے متعلق تھا کہ وہ جرم کر ہی نہیں سکتا ۔ اور پھر جو سربراہِ مملکت کے گھرانے کے افراد ہیں وہ تو بس یوں کہو کہ اللہ اکبر 'ایک کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا' بڑے میاں تو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ ۔ تباہیاں اس سے آتی ہیں مملکتوں پر ۔ اگر قرآنی قوانین سربراہِ مملکت کے بنائے ہوتے تو وہ ان میں اپنے لیے رعایت رکھتا' اپنے گھر والوں کی رعایت رکھتا' ساری دنیا میں جو معمول تھا' کوئی اس پہ اعتراض ہی نہ کرتا مگر وہ تو اپنے متعلق یہ کہتا ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (39:13) اگر میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرونگا تو مجھ پہ عذابِ عظیم آجائے گا یعنی عام سزا نہیں ملے گی' مجھے سزائے عظیم ملے گی ۔ خود سربراہ اپنے متعلق یہ کہتا ہے اور اس کے جو متعلقین ہیں ان کے متعلق قرآن کریم کے اندر ہے کہ یہ اگر اسی جرم کا ارتکاب کریں تو ان کو دوگنی سزا ملے گی ۔

عزیزانِ من! یہ کس کے بنائے ہوئے قوانین ہیں اور کیسا پُر زور اعلان کیا گیا ہے! یہ چھپا کر کہیں نہیں رکھے گئے ۔ اب ذہن میں یہ بات آ گئی کہ جو ذرا سا خیال پیدا ہو رہا تھا کہ نہیں' یہ جو آزاد معاشرے کی عورتیں ہیں' انتخاب کے وقت آزاد مردان کو Preference (ترجیح) دیں' اور اگر ضبطِ نفس نہ ہو سکے تو پھر ان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کریں ۔ اس سے ذہن میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ یہ مساواتِ انسانیہ کے خلاف ہے' آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے کس قدر گہری حکمت کو اس طرح سے واضح کیا ہے کہ یہی بات نہیں ہے کہ ان کی اتنی تربیت نہیں ہوئی' یہ بیچاریاں ابھی اس سطح پر نہیں آئیں اس لیے ان سے جرم بھی ہو جائے تو ان کو آدھی سزا دو ۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ اس ایک آیت (4:25) کے اندر مساوات کے متعلق کتنے اہم اصول آ گئے! جب یہ کہا کہ وَ مَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ (4:25) اگر تم میں اِس کی استطاعت نہ ہو کہ مومن عورت سے شادی کرے' تو کہا ہے کہ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ (4:25) وہ اس عورت سے' جو مومن ہو شادی کر لے جو کسی کی لونڈی ہو' تا کہ وہ لونڈیاں

جواس وقت تمہارے معاشرے میں موجود ہیں' رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنتی جائیں اوراس طرح غلامی کا خاتمہ ہوجائے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ لونڈی سے شادی کرنا باعثِ ذلت ہے۔ جب وہ ایمان لے آئی اور تمہارے نکاح میں آ گئی تو مرتبہ میں برابر ہوگئی۔

## باہمی طور پر ذہنی ہم آہنگی کا قائم کردہ معیار اور نکاح کے لیے باقاعدہ ڈنکے کی چوٹ اعلان

باہمی طور پر ذہنی ہم آہنگی کی صلاحیت کے لیے مماثلت یا یکسانیت ضروری ہے' یہ ایمان کی بنیادی چیز ہے' ان میں سے جو ایمان لے آئی ہیں کم از کم تمہارا اتنا اشتراک تو ان کے ساتھ پیدا ہوگیا' اس لحاظ سے تو مرتبہ میں برابر ہوگئی۔ آگے کہا کہ **وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ** (4:25) ایمان کی بنا پر جو تم میں اشتراک پیدا ہوا ہے' ہم اسے جانتے ہیں اس لیے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سے ایک حد تک تو تمہارے اور ان کے درمیان کچھ ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر وہ لونڈی ہو اور ہو وہ مشرکہ تو آپ دیکھیے پھر اس کے ساتھ تو ایک دن بھی نباہ نہیں ہوسکتا۔ آج کی طرح نہیں کہ آپ نے مذہب کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رکھی' اس میں آگے تو یہ بات ہوگئی کہ لوگ Indifferent (لاتعلق) ہوگئے ہیں۔ اگر مذہب پرست طبقہ ہو' مشرک اپنے شرک میں مذہب پرست ہو' مومن اپنے دین کے اندر جسے ہم مذہب پرست کہتے ہیں' وہ ہو' اور ان دونوں کو آپ ملالیں تو اس کا نتیجہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ اس لیے یہ شرط لگا دی کہ مومن ہونا ضروری ہے اور کہا ہے کہ **وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ** (4:25) اللہ کی نگاہ تمہارے ایمان پر ہے۔ یہی معیارِ فضیلت ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ **بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ** (4:25) اسی کی بنا پر تم ایک دوسرے کے اجزا بنتے ہو۔ کوئی غیر نہیں رہتا۔ بھئی! تم مومن ہونے کی حیثیت سے ایک ہی ہو لیکن اس کے باوجود وہ ذہنی تفاوت جو تربیت کا تفاوت ہے' اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا کہا ہے کہ **فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (4:25) ان کے موجودہ مالک کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو' اور قاعدے اور قانون کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں ایک اور اہم نقطہ آیا کہ نکاح بھی کیا گیا۔ کہا کہ کس لیے کیا ہے؟ قرآن حمید کا جواب **بِالْمَعْرُوْفِ** (4:25) ہے کہ قاعدے اور قانون اور عرف کے مطابق کرو' اعلان کے ساتھ نکاح کرو ''کھڑک کے' ڈنکے نال جنوں کیندے نیں' گج وجا کے' واجا وجا کے' پٹاخے چلا کے کرو' (علی الاعلان' ڈنکے کی چوٹ' گج وج کر' باجے پٹاخے کے ساتھ نکاح کرو)۔ سو آدمی کے مجمع میں اعلان کر کے اس نکاح کو کرو' یہ نہ تو کوئی شرمانے کی چیز ہے' اور نہ کوئی ایسی باعثِ ذلت چیز ہے۔ نکاح تو اس کا نام ہے' اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی جوان لڑکا اور جوان لڑکی آپس میں یہ طے کرلیں کہ بھئی! ٹھیک ہے' اسی کا نام ایجاب وقبول ہے کہ اس نے کہا قبول ہے تو اُس نے جواباً کہا ہاں قبول ہے۔ یہ بھی ایک طریق تھا۔ کیا آپ اس پر اعتراض کرسکتے ہیں؟ اس میں تو یہی چیز تھی کہ

میاں بیوی راضی' تو کیا کرے گا قاضی! قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح خاموشی سے ایجاب وقبول کرلیا جائے۔ یہ ایک تمدنی مسئلہ ہے' یہ بالمعروف ہو یعنی ضابطہ قانون رواج کے مطابق یہ چیز اعلانیہ کرنے کی ہے تاکہ معاشرے کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے درمیان میاں بیوی کا تعلق قائم ہوا ہے۔ قانوناً ایک دوسرے پر کوئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تو اس چیز کو دنیا جان لے۔ اب آگے اولاد کا مسئلہ آتا ہے اور یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ جو دونوں نے اندر ہی اندر اقرار کیا ہے' باہر کسی کو اس کا علم نہیں ہوا اور اس کے بعد اولاد ہوتی ہے' تو یہ معصوم بچے' جنہوں نے کوئی غلطی نہیں کی' کوئی جرم نہیں کیا' آپ سوچتے ہیں کہ ان کی ساری عمر اس معاشرے کے اندر کیسے گزرے گی۔ اس لیے یہ نکاح باقاعدہ اعلان کر کے کرو۔ یہ ہیں قرآن مجید کے سامنے وہ حکمتیں جس کے لیے وہ کہتا ہے کہ بالمعروف' قاعدے قانون کے مطابق' نکاح کرو' دھڑلے سے نکاح کرو' ساری دنیا کو معلوم ہو کہ یہ ایک نیا رشتہ ہے جو تمہارے درمیان قائم ہو رہا ہے' اس کے Consequences (عواقب) بڑے دور رس ہوں گے۔

## ہمارے ہاں معاشرہ کی حالت زار اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں اس کے بالکل الٹ چیز آجاتی ہے' وہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ ''میری لگدی کسے نے نہ ویکھی' ٹُٹدی نوں جگ ویکھدا' تے ٹھیک تے ہے' جیہو جی لگی اوس ٹُٹدی نوں تے جگ ویکھے گا'' (جب میری لگی تو کسی نے نہ دیکھی لیکن جب ٹوٹی تو خوب چرچا ہوا۔ ٹھیک ہے جیسی لگی تو اس کے ٹوٹنے کو تو دنیا جہان نے دیکھا)۔ یہ ''لگدی'' والی بات نہیں ہے ''ایتھے تے لگدی نوں وی سارا معاشرہ جانے گا' ٹُٹدی نوں وی سارا جگ جانے گا'' (یہاں تو لگتی کو بھی پورا معاشرہ جانے گا اور جب یہ ٹوٹے گی تو بھی دنیا جہان جانے گا)۔ کہا کہ ایسا بالمعروف کیا کرو۔ کیا الفاظ ہیں قرآن حمید کے! اس میں قانون ہی شامل نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر عرف بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کے اعلان کا جو طریقہ بھی تمہارے معاشرے کے اندر مستحسن سمجھا جاتا ہے' قاعدہ قانون سمجھا جاتا ہے' اس کے مطابق کرو' دھوم دھڑکے سے کرو تاکہ سارے معاشرے کو پتہ چلے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس مقام پر ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شادی کے موقعہ پر دف بجانے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ تاکید کی تھی۔ اس زمانے میں باجا ہوتا ہی یہی تھا' یہ ہے بالمعروف تاکہ دنیا جانے۔

## عفت وعصمت کو محفوظ رکھنے کا مقصد اور اس کو بیان کرنے کا طریق

اب آگے یہ کہا ہے کہ مُحْصَنٰتٍ (4:25)۔ یہ دیکھیے صاحب! اس رشتے کے متعلق قرآنِ حکیم کیا باتیں کہہ گیا ہے! یہاں نکاح کا رشتہ اور اس کا مقصد بتایا جا رہا ہے۔ ''حصن'' کے معنی ہیں ''کسی چیز کو قلعہ کی دیواروں میں محصور کر لینا''۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ

آپ نے عفت وعصمت کو اس چار دیواری کے اندر محفوظ کرلیا' پھر آپ کے جنسی تعلقات کا جو رشتہ ہے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے مادہ تولید کو افزائش نسل کے لیے محفوظ کرلیا۔ یہ بڑی گہری بات ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس سے تو یہ بات نہیں ثابت ہوتی' یہ استنباط کچھ وزنی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے قانون دینے والے کو اس کا علم تھا۔ اس نے کہا ہے کہ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25)۔ یہاں مُحۡصَنٰتٍ کی خود تشریح ہی نہیں کی بلکہ اس کے معنی بھی بیان کردیئے کہ مادہ تولید محض بہا دینے کے لیے نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! قرآن حمید کس Suggestiveness (ایمائیت) سے بات کرتا ہے! آپ دیکھیے! یہ وہ طریق ہے جسے بات کرنے کا مہذب طریق کہتے ہیں کہ یہ ذکر ہو رہا ہے۔ قانون میں یہ چیز بالکل کھلے بندوں یونہی ہونی چاہیے لیکن اسے پتہ ہے کہ شریکِ مجلس شریف زادیاں بھی ہونگی' بہو بیٹیاں بھی ہونگی' ویسے بھی یہ چیز اس قسم کی نہیں ہوتی کہ اُسے کھلے بندوں ان الفاظ میں بیان کیا جائے۔ نہایت Suggestiveness (ایمائیت) سے بات کی جاتی ہے۔ کہا کہ مُحۡصَنٰتٍ (4:25) وہ ایک پاکباز' منکوحہ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لیے نکاح کرے۔ اس نے نکاح کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25) یہ محض تمہاری شہوت رانی کا ذریعہ بننے کے لیے نہیں ہوگا۔ مقصد محض جنسی جذبے کی تسکین نہیں ہوگا۔ یہاں تو ذمہ داریوں کے قلعہ کے اندر بند ہونے والی بات ہے۔ جنسی جذبے سے مقصد افزائشِ نسل ہے اور افزائشِ نسل صرف مُحۡصَنٰتٍ کے طریقے سے ہوسکتی ہے یعنی یہ اس طریق سے ہوگا' جب مادۂ تولید رحم کے قلعہ کے اندر محفوظ رکھا جائے۔ جسے زنا کہتے ہیں' اس میں پہلی چیز تو یہی ہے کہ یہ مُحۡصَنٰتٍ نہیں ہوتا' افزائشِ نسل نہیں ہوتا' استقرارِ حمل نہیں ہوتا۔ یہی نہیں کہ مقصد نہیں ہوتا بلکہ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ استقرارِ حمل نہ ہو' وہاں صرف مسٰفِحٰتٍ کی صورت ہوتی ہے۔ اس میں مُحۡصَنٰتٍ کی صورت نہیں ہوتی' اس میں استقرارِ حمل کی خواہش نہ مرد کو ہوتی ہے' نہ عورت کو ہوتی ہے بلکہ جیسا میں نے عرض کیا ہے استقرارِ حمل Avoid (حذر) ہی نہیں کیا جاتا' بلکہ اس کو روکنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نکاح میں کہنا ہے کہ اس کا یہ جذبہ نہ ہو' یہ ایک گہری حکمت کی بات ہے۔

## ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کا معاملہ اور مغربی معاشرے کو قائل کرنے کے لیے ہمارے ہاں کے دلائل

آج بڑے فخر سے کہا جاتا ہے صاحب! کہ اگر ایک مرد یہ محسوس کرے کہ اس مسٰفِحٰتٍ کی جو شکل ہے' میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' بات آتی ہے تو کرنا پڑتی ہے کہ وہ اس ایک عورت سے تسکین نہیں پا رہی ہے' تو کہا جاتا ہے کہ دیکھیے اسلام نے آپ کو کیسا فطری دین دیا ہے کہ وہ اجازت دیتا ہے کہ دوسری بیوی کرو' تیسری عورت لے آؤ' چوتھی عورت لے آؤ صاحب! اس کے اوپر ''جے ایہو جیا ہووے جیہڑا چوتھی دے بعد وی کہے جی ہجے نئیں' تاں فیر؟'' (اس پر اگر وہ مرد اس قسم کا ہو جو چوتھی پر بھی تسکین نہ پائے' کہے کہ

(اس تسکینِ ناتمام کے لیے) اور بھی چاہیے تو پھر؟) یہ کیا دلائل دیتے ہیں!!! یورپ میں جا کر یہ باتیں کہتے ہیں' اُن لوگوں سے فخریہ بیان کرتے ہیں کہ صاحب! بڑے کامیاب ہوئے ہیں' ہم نے اس اسپتال کی نرس کو قائل کر دیا جو کہتی ہے کہ ''ہاں صاحب! بڑا ٹھیک آپ نے کہا ہے''۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو مرد ہے اس کا فطری جذبہ ہے مگر تم نے اپنے ہاں اس کی تسکین کے لیے وحدتِ زوج کا قانون (Monogamy) بنایا ہوا ہے۔ یہ ایک بیوی کا قانون ہے۔ اس کے بعد ان سے پوچھا کہ ''تمہارے مرد' دیکھتے ہو کہ کتنی بے حیائی کے اندر الجھے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہیں کہ تم نے ایک سے زیادہ عورتوں کی ان کو اجازت نہیں دی' تو وہ نکاح نہیں کرتے' یوں وہ بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسلام کی حکمتِ بالغہ یہ ہے کہ اس نے ایسا کرنے کے لیے کہہ دیا کہ صاحب! ''دو پھیرے وی لے لیا کرو نال'' (اس کے ساتھ دو چکر بھی کاٹ لیا کرو)۔ اسلام دینِ فطرت ہے!'' یہ فخر محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دیکھا تم نے! ایک بیوی پر اکتفا کرنے والی بات تمہارے ہاں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس پابندی کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ مردوں نے بے راہ روی اختیار کر لی۔''

میں عرض کرتا ہوں کہ اگر یورپ کی عورت پوچھ بیٹھتی کہ جناب کی کتنی بیویاں ہیں اور پھر یہ پوچھا جاتا کہ تقاضائے فطرت آپ کے ہاں کس طرح سے پورے ہوتے ہیں' آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا یہاں بھی ویسا نہیں ہے جو یورپ کے مرد کرتے ہیں؟ تو پھر بات کہاں تک جاتی! فطرت کا تقاضا تو وہی ہے' خواہ مشرق میں ہو' خواہ مغرب میں ہو ''نئیں جی! ایدھرتے فطرت ہور تیز ہو جاندی اے آ کے'' (نہیں جی! یہاں (مشرق میں) آ کر تو فطرت اور بھی تیز ہو جاتی ہے)۔

## ملوکیتی دور کا پیدا کردہ تصورِ اسلام' لفظ حرم کا مفہوم اور فطرت کے تقاضوں کی عملی شکل کا سوال

میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! کہ ان کا بھی قصور نہیں ہے۔ ہزار برس سے آپ کے ہاں' جب سے ملوکیت آئی' جب سے حرم معرضِ وجود میں آنے لگے' یہ کچھ ہونے لگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی میں حرم کس کو کہتے ہیں۔ جو کوئی بھی یہاں سے جائے' اس سے پہلے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کون ہیں؟ کہ جی مسلمان ہوں۔ اس سے اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں حرم کتنے ہیں؟ اندازہ لگائیے کہ چار تو حرم کے اندر بیویاں ہوتی ہیں' پھر لونڈیوں کی تعداد ہی کوئی نہیں ہوتی۔ اس کا نام آپ کے ہاں حرم ہوتا ہے۔ یہ حرم وہاں ملوکیت سے چلا اور اس کے لیے یہ دلیل اس زمانے کی دی ہوئی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے' اس نے اس مرد کے لیے پابندی یوں نہیں لگائی ہے۔ پھر اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے معافی کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ان حضرات کے نزدیک فطرت صرف مرد کے ہی اندر ہے' عورت اگر یہ تقاضا کرنے لگ جائے تو کیا کرو گے!!!

## ہم نے قرآنِ حکیم کے دیئے گئے عائلی قوانین کو مذاق بنا رکھا ہے' مگر قرآنِ حکیم کو سامنے رکھ کر خود فریبی نہیں ہوسکتی

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے عائلی قوانین دینے سے پہلے کہا ہے کہ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (2:231) یاد رکھو! خدا کے قوانین کو مذاق نہ بنالینا۔ آج ان قوانین کو مذاق بنایا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنا مذاق اڑوائیں' یہ کم بخت اسلام کا نام لے کر' وہاں جا کر' اسلام کا مذاق اڑواتے ہیں۔ الفرڈ ایڈلر (1939-1870ء) اور جون (1958-1879ء) جو غیر مسلم ہیں' وہ تو ساری عمر اپنی تحقیق یہ ثابت کرنے کے لیے صرف کر دیتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے کہ جس پر کنٹرول نہ کیا جا سکے' یہ صرف خیالات کے کنٹرول کی بات ہے۔ اسلام کے یہ نام لیوا وہاں جا کر کہتے ہیں کہ ''یہ قطعاً غلط ہے صاحب! اس پہ کوئی کنٹرول نہیں ہوسکتا' اسی لیے جو ہمارا دینِ فطرت ہے' اس میں بے محابہ مسٰفِحٰتٍ کی اجازت دیدی ہے' مادہ تولید بہاتے چلے جاؤ۔ یہ ہے ان کے ہاں مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25)۔

اب ایک تیسری چیز ہے۔ کراچی ہیڈکوارٹر میں ایک بڑے افسر تھے۔ ہر چوتھے دن ان کا لاہور کا دورہ نکل آتا تھا۔ یوں کہیے کہ انہیں لاہور کا دورہ پڑ جاتا تھا حالانکہ پورا ''ویسٹ پاکستان'' ان کے منصبی فرائض میں داخل تھا کہ وہ وہاں تک جائیں لیکن جب دورہ پڑتا تھا تو لاہور کا ہی پڑتا تھا۔ ٹوہ رکھنے والے لوگ بھی تھے' پتہ کیا کہ کیا بات ہے۔ معلوم ہوا کہ معروف کے مطابق تو بیوی کراچی میں ہے مگر ایک منکوحہ لاہور میں بھی ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ وہ بڑے دیندار تھے' بڑے نمازی پرہیزگار تھے' اس لیے کہ جب منکوحہ کہہ دیا تو سارے مسئلے حل ہو گئے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں یہ بھی تو ایک شکل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کس طرح ضمیر کو' میں یہ تو نہیں کہونگا کہ تسکین دی جاتی ہے' فریب دے لیا جاتا ہے کہ منکوحہ ہے۔ قرآن مجید نے پہلی دو باتیں کہیں کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرو۔ اس کا مقصد افزائشِ نسل ہو' محض جنسی جذبے کی تسکین نہ ہو جو اختلاط محض حصولِ لذت کے لیے ہو' وہ منشائے فطرت کے خلاف ہے' خواہ معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ اور تیسری بات یہ کہی ہے کہ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ (4:25)۔ وہ داشتہ نہیں ہوگی کہ کہا جائے یہ بچے اس کی اولاد نہیں ہیں۔'' اور یہ کہ کسی سے اس کی آشنائی بھی نہ ہو یعنی وہ ناجائز تعلقات نہ رکھتی ہوں''۔ اب اگر وہ داشتہ ہوگی تو پھر یہ ہوگا کہ یہ بچے اس کی اولاد نہیں ہے۔ اب یہ کس طرح سے ثابت کیا جائے' اس نے تو علم ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ انسان اپنے آپ کو جتنا جی چاہے فریب دے لے' قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر خود فریبی نہیں ہوسکتی۔

## زندگی کے تین مراحل کا تعین

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے وہ تین ٹکڑے بتا دیئے ہیں۔ پہلے کہا ہے کہ یہ مُحْصَنٰتٍ (4:25) ہوں۔ صحیح طریقہ بِالْمَعْرُوْفِ (4:25) ہے یعنی جو رسم و رواج ہے وہ قاعدے قانون کے مطابق' دھڑ کے سے' کھڑ کے سے' قانوناً اعلان کر کے' معاشرے میں بھی اعلان کر کے' مرد و عورت کا یہ رشتہ ازواج قائم ہو۔ نفسیات کا طالبعلم جانتا ہے کہ اتنی سی چیز سے دل پر سے کتنا بڑا بوجھ اٹھ جاتا ہے' اس سے Complexes (پیچیدگیاں) پیدا ہی نہیں ہوتے۔ پھر اس کا یہ مقصد بتایا کہ یہ نکاح غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25) ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ نکاح کر کے لے گئے بلکہ یہ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ بھی ہے یعنی یہ محض جنسی تسکین اور لذت کشی نہیں ہے۔ اگلی چیز یہ بتا دی کہ خود کو فریب نہ دے لو کہ میں نے اس کے ساتھ چپکے سے' اندر ہی اندر' پوشیدہ طور پر نکاح کیا ہوا ہے۔ کہہ دیا کہ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (4:25) اور وہ ناجائز تعلقات نہ رکھتی ہوں۔ آگے کہا ہے کہ فَاِذَآ اُحْصِنَّ (4:25) پھر جب وہ عورتیں نکاح کر لیں یعنی تم ان لونڈیوں سے نکاح کر لو اور فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ (4:25) اگر ان لونڈیوں سے' کوئی اس قسم کی بے حیائی کی بات سرزد ہو جائے تو فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (4:25) ان کی سزا آزاد عورتوں سے آدھی ہے اس لیے کہ ان کی تربیت' ان کی پرورش' ان کی ذہنیت' اس ماحول میں ہوئی ہے جو اچھا نہیں ہوتا اور ان کی پہلی زندگی میں اس قسم کی حرکات معیوب تصور نہیں کی جاتیں تھیں اس لیے ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو شریف گھرانوں کی عورتوں میں متوقع ہوتا ہے۔ اس لیے یہ صحیح طور پہ اس فرق کو Appreciate (پسند) نہیں کر سکتیں' ایسا وہ کہے جو سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے کچھ لغزش ہو جائے اس لیے کہا ہے کہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ (4:25) یاد رکھو کہ جس انداز سے لونڈیوں کی تربیت ہوتی ہے اس سے ان کی ذہنیت پست رہتی ہے۔ لہٰذا لونڈیوں سے شادی انہی کو کرنی چاہیے جو سمجھتے ہوں کہ نکاح کے بغیر وہ ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے کہا ہے کہ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (4:25) اگر تم خیالات کی بلندی بھی چاہتے ہو تو پھر ضبط سے کام لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ خدا کا قانون جو تمہیں عفت و پاکبازی کی تعلیم دیتا ہے' تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہاری سیرت کی نشو و نما کا ذریعہ بنے گا۔

## لفظ ہدایت کا لغوی اور قرآنی مفہوم

عائلی زندگی کے یہ احکام کتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیے جا رہے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ (4:26) خدا یہ چاہتا ہے کہ زندگی کا راستہ ابھر کر تمہارے سامنے آ جائے۔ کیا لفظ استعمال کیا ہے! یہ ہدایت کا لفظ صرف راہنمائی نہیں ہوتا بلکہ دور سے کسی چیز کا اُبھر کر جو سامنے آنا ہے' اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عربوں کے ہاں ایسی شاہراہیں نہیں ہوتی تھیں

جیسے مثلاً کلکتہ سے پشاور تک ایک سڑک چلی جا رہی ہے‘ آنکھیں بند کر کے جاؤ‘ عرب میں تو صحراؤں میں راستے ہی نہیں ہوتے تھے۔ نشانات کیا ہوتے تھے؟ یہ کہ اگر ریت کے ٹیلے سے نشان مقرر کیا جائے‘ صبح ٹیلا یہاں ہوتا تھا‘ دوپہر کو ہوا چلتی تھی‘ وہ ٹیلا وہاں پہنچ جاتا تھا‘ تو عام طور پہ اگر کہیں کوئی چٹان ہوتی اور وہ راستے سے ابھری ہوئی بھی ہوتی‘ مستقل ایک ڈگر پہ رکھی ہوئی ہوتی تھی‘ جو ہلتی نہ تھی اور دور سے بتا دیتی کہ اس طرف کو آؤ‘ یہ ہے راستہ۔ یوں جو ابھری ہوئی چیز ہوتی تھی‘ اسے ہدایت کہا جاتا تھا۔ کہا کہ اس لیے ہم یہ احکام تمہیں اس تفصیل سے دے رہے ہیں۔

## قوموں کے عروج و زوال کے لیے راہنما اصولوں کی نشاندہی

اور اگلی چیز وہ ہے‘ عزیزانِ من! جو میں کہتا ہوں کہ آج کے دور سے پہلے‘ کون اس کو Appreciate (پسند) کر سکتا تھا! کہا ہے کہ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (4:26) ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اقوامِ سابقہ کی تاریخ پر غور کرو‘ جس قوم نے جنسی تعلقات کو ضوابط کے اندر رکھا‘ حدود کے اندر رکھا‘ وہ قوم ہمیشہ عروج کی طرف گئی‘ اس کی توانائیاں اس کو خیر و برکت کی طرف لے گئیں‘ جنہوں نے ان حدود کو توڑ کر فحاشی اختیار کی‘ وہ قومیں ذلیل و خوار ہو گئیں۔ ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اقوامِ عالم کی تاریخ پہ غور کرو اور سوچو کہ اس جذبے اور اس تعلق پر حدیں قائم کرنا‘ پابندیاں لگانا‘ کتنا ضروری ہے! یہ انفرادی مسئلہ نہیں ہے‘ یہ محض جذبے کی تسکین نہیں ہے‘ اس کے ساتھ قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کا راز وابستہ ہے۔ اور آپ کو یاد ہوگا‘ میں نے شاید پچھلے سے پہلے درس میں[1] انون Dr.J.D.Unwin کی کتاب Sex and Culture سے آپ کو یہ اقتباسات دیئے تھے جس میں اسی (80) قدیمی قبائل اور سولہ (16) مہذب قوموں کا صرف اس مسئلے پہ ساری عمر تجزیہ کر کے‘ وہ اس نتیجے پہ پہنچا تھا کہ دنیا میں جس قوم نے جنسی تعلقات پر‘ اس قسم کی پابندیاں عائد کیں‘ وہی قوم تھی جو عروج و تہذیب میں آگے چلی گئی‘ جس قوم نے ان پابندیوں کو توڑا‘ اس نے تحقیق کے بعد بتا دیا کہ وہ قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک باقی رہی‘ پھر وہ ختم ہو گئی‘ اس کا نام و نشان مٹ گیا۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد ان سے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ ہم اس لیے یہ باتیں ابھار کر‘ نکھار کر‘ بیان کر رہے ہیں تا کہ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (4:26) جو قومیں پہلے گزر گئی ہیں‘ ان کی تاریخ تمہارے سامنے آ جائے کہ کس نے کیا کیا تھا۔ یہ کوئی ایسا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے‘ یہ قوموں کا مسئلہ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس قسم کے انفرادی زوال کو قوموں کا مسئلہ بنا دیا۔ کہا ہے کہ وَ یَتُوْبَ عَلَیْكُمْ (4:26) خدا لوٹ کر تمہاری طرف آتا ہے‘ تم کسی دوسری طرف بھاگتے چلے جا رہے ہو۔ کیا بات ہے! انہیں آنا تو اس کی طرف چاہیے لیکن کہا کہ جب تک تمہیں یہ احکام و اصول نہیں دیئے تھے‘ تم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ تم پلٹ کر آؤ گے۔ تمہیں علم ہی نہیں تھا‘ ایسے میں ہمارا ذمہ تھا کہ ہم

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اس سورۃ کا چھٹا باب‘ جولائی 1970ء کی 19 تاریخ کا درس۔

تمہاری طرف پلٹ کر آتے۔ یہ ہے **وَ یَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ** (4:26) ۔آ گے کہا ہے کہ **وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ** (4:26) وہ علیم اور حکیم ہے' جاننے والا ہے اور حکمت پر بھی اس کی نگاہ ہے۔ پھر سُن لو کہ **وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ** (4:27) یہ خاص طور پہ کیا ضرورت پیش آئی کہ خدا خود پلٹ کر تمہاری طرف آ کر تمہیں آواز دے کر' بلا کر' کہے کہ ادھر نہ جانا' راستہ خطرناک ہے تم تباہ ہو جاؤ گے' اِدھر آ ؤ تم تباہیوں سے بچ جاؤ گے۔اس لیے کہ **وَ یُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا** (4:27) وہ لوگ جو ان جذبات کے اندر شدت اختیار کر کے' ایک ہی رخ اختیار کر کے' بہے چلے جاتے ہیں' وہ چاہتے یہ ہیں کہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ۔ ہمارا فرض تھا کہ ہم تمہیں روکتے اور کہتے کہ ایسا بالکل نہ کرنا' تباہ ہو جاؤ گے۔

## انسانیت پر سے زندگی کی ہر قسم کی بوجھل سلوں کو ہٹا دینا صرف وحی کے ذریعے ہی ممکن تھا اور انسان کے کمزور ہونے کی ایک الجھن

عزیزانِ من! آ گے کہا ہے کہ **یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ** (4:28) خدا یہ چاہتا تھا کہ تم جو اپنے خود ساختہ قوانین سے یا انسانوں کی بنائی ہوئی پابندیوں سے یا غلط انسانیت ساز شریعتوں کی مقرر کی ہوئی حدود سے' جن بوجھوں کے نیچے دبے ہوئے تھے' جن تباہیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے' وہ ان بوجھوں کو تمہارے اوپر سے ہلکا کر دے۔ نہ تو رہبانیت کی غیر فطری زندگی ہو اور نہ **تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا** (4:27) تم ایک طرف جھک جاؤ' خدا یہ چاہتا تھا کہ یہ بوجھ تمہارے اوپر سے ہلکے ہو جائیں اور ایسا صرف ہم ہی کر سکتے تھے' تم خود یہ چیزیں نہیں کر سکتے تھے۔اور **وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا** (4:28) انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے' اس پہ جذبات غالب آ جاتے ہیں۔

یہاں ایک اور اہم بات آ گئی۔ بات آ گئی ہے تو عزیزانِ من! بڑا ہی ضروری ہو گیا کہ اس کو واضح کیا جائے۔ کہا یہ ہے کہ **وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا** (4:28) انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کمزور ہے' اس پر جذبات غالب آ جاتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا مظہر ہے' اس کے پس منظر میں کیا چیز کام کرتی ہے' کیوں کہا گیا ہے کہ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے؟

## کیا انسان کی بھی کوئی فطرت ہوتی ہے؟ شہنشاہ اکبر کی طرف سے کیا گیا ایک تجربہ

جہاں آپ کے ہاں اور سینکڑوں بنیادی غلطیاں' غلط معتقدات' غلط تصورات' وراثت میں چلے آ رہے ہیں' ان میں ایک یہ چیز بھی آ رہی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ صاحب! 'دینِ فطرت ہے' کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی دینِ فطرت ہے صاحب! جی پھر بھی بات کیا ہوئی؟ کہ یہ باہر کے خارجی اثرات ہیں جو انسان کے اوپر مؤثر ہو جاتے ہیں تو پھر یہ اس

کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اگر اس کے اوپر خارجی اثرات نہ رہیں' ایسا انتظام کر دیا جائے کہ باہر کا کوئی اثر اس کے اوپر نہ پڑے تو پھر جس قسم کا وہ انسان بنتا ہے' وہ ہے جو صحیح فطرت کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ بات شہنشاہ اکبر (1556-1605ء) سے کہی گئی۔ اس کی طبیعت بڑی متجسس واقع ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ دیکھنے کی بات ہے کہ اگر ایک بچے کو ایسی جگہ رکھ دیا جائے کہ باہر کا کوئی اثر اس پر نہ پڑے تو کہتے یہ ہیں کہ وہ جو بنے گا' وہ انسانیت کا ماڈل بنے گا۔ اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ ایک بچے کو ایسی جگہ رکھ دیا کہ اس کی حفاظت کا انتظام دور دور سے کیا تا کہ اس کے قریب کوئی نہ آئے۔ اس کو دودھ پلانے کا بکریوں وکریوں کا کچھ انتظام کیا' ایسا طریقہ کار اپنایا گیا کہ اسے دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ کر کے خارجی اثرات سے محفوظ کر دیا گیا۔ جب اسے دیگر انسانوں سے بالکل الگ رکھا گیا تو جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اب اس کے متعلق کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کیا تھا یعنی بکری کا بچہ ہوتا تو بکری بن جاتا' شیر کا ہوتا شیر بن جاتا لیکن وہ عجیب قسم کا بنا تھا' نہ وہ بول سکتا تھا' نہ کچھ سمجھ سکتا تھا۔ وہ چلتا بھی اسی طرح سے تھا جس طرح اس نے حیوانوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ چل رہے ہیں۔ اس کی کیفیت میں نہ عقل' نہ دماغ' نہ گفتگو' نہ زبان' نہ کوئی سمجھ' نہ بوجھ' نہ فہم۔ ان چیزوں کا تو اس میں سوال ہی نہیں تھا۔ خیر اور شر کی تمیز تو ایک طرف رہی' یہ جو انسانیت کا ماڈل بن رہا تھا' اس کی کیفیت یہ ہوگئی تھی۔

## تقسیم سے پہلے یوپی میں کیا جانے والا ایک اور تجربہ

عزیزانِ من! پاک و ہند تقسیم سے پہلے یوپی ❶ میں ایک تجربہ ہوا تھا۔ انہیں جنگل سے ایک بچہ ملا تھا۔ وہ پیدائش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح سے وہاں رہ گیا۔ یہ خانہ بدوشوں کا بچہ ہوگا۔ خاصا بڑا ہو چکا تھا۔ وہ جانوروں کی طرح چلتا تھا۔ وہ اسے ہسپتال میں لے آئے' یہاں لا کر انہوں نے اس کی Psychologically (نفسیاتی طور پر) اسٹڈی (Study) کی کہ انسان کا بچہ اگر انسانی اثرات سے دور ہو تو وہ کیا بنتا ہے۔ یہ تقسیم پاک و ہند سے دو تین برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس کی پروگریس (ترقی) کو Watch (مشاہدہ) کرتا رہا۔ ان بیچاروں نے اپنا پورا زور لگا لیا کہ جس طرح سے عام انسانی بچہ کھاتا پیتا' اٹھتا بیٹھتا اور بولتا چلتا ہے یہ بچہ بھی ویسا ہی ہو جائے' ابھی دو ایک برس ہوئے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ صاحب! اس میں کوئی Improvement (ترقی و بہتری) نہیں ہو سکی اور بالآخر فطرت پر پیدا کیا گیا وہ بچہ مر گیا تھا۔

## کیا انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟ ایک اہم سوال۔

فطرت ہی نہیں یہاں تو یہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے ''اے لو! جے

---

❶ یوپی (UP)=اترپردیش

کسے رب ویکھنا ہووے نا' تے اوس منڈے نوں ویکھ لوے جاکے'' (یہ لو! اگر کسی نے رب دیکھنا ہو تو وہ اس بچے کو دیکھ لے)۔اور بڑے زور سے وہ یہاں سورۃ الروم کی یہ آیہ جلیلہ لاتے ہیں کہ **فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ** (30:30) ۔یہ ہے دینِ قیم۔یہ ان کا ترجمہ ہے کہ اللہ کی فطرت جس کے اوپر اس نے انسان کو پیدا کیا' یہ دینِ قیم ہے' یہ تبدیل نہیں ہوسکتی جو خلق اللہ ہے لیکن اکثر لوگ اس کو سمجھتے نہیں ہیں صاحب! یہ تبدیل نہیں ہوسکتی والا تجربہ تو ہمارے سامنے ہوگیا' ان بچوں میں کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔بات پہلی سوچنے کی ہے' عزیزانِ من! کہ اگر اسے انسانی اثرات سے دور رکھا جائے تو انہوں نے تو کہا تھا' فطرت کے اوپر پیدا کرتے ہیں' مگر یہ کہتے ہیں کہ فطرت اللہ پہ پیدا ہوتا ہے۔تو اصل کیا ہے؟ یہ ہے ان کے لیے ایک اہم سوال۔

## الانسان (The Man) کے لیے قرآنِ حکیم کا بیان

ان تجربوں کو آپ چھوڑیئے قرآن حکیم کی طرف آیئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ انسان یا جب اس نے الانسان (The Man) کہا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ فطرت اللہ پہ پیدا کیا گیا ہے؟ جہاں قرآن حکیم انسان کہے گا تو اس کے معنی ہونگے کہ وہ جو اپنی صحیح فطرت کو لیے ہوئے آرہا ہے اور جب وہ کافر' مومن' مشرک اور منافق کہے گا' تو اس میں دوسری خصوصیات آئیں گی۔جب صرف الانسان کہے گا تو اس میں تو صرف وہ چیز آئے گی جو Human Being (نوعِ انسانی) کے اندر آنی چاہیے۔قرآن حکیم کا الانسان کہنا تو اس کے متعلق ہوگا جو نہ مومن ہے' نہ کافر ہے' نہ مشرک ہے' نہ منافق ہے' صرف ''نہاتا دھوتا ہویا انسان'' (نہایا دھویا ہوا انسان) بالکل کھرا ہوگا' اس میں باہر کا اثر نہیں ہے تو کیا اسے آپ کہیں گے کہ وہ اللہ کی فطرت کے اوپر پیدا ہوا ہے؟

آؤ ذرا دیکھیں کہ یہ جو الانسان قرآن مجید کہتا ہے' اس کی کیا خصوصیات بتاتا ہے۔پہلے تو یہاں کہا کہ **خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا** (4:28) الانسان بہت کمزور واقع ہوا ہے۔پہلی صفت تو یہ آئی۔یہ فطرت اللہ والی بات ذہن میں رکھیے گا جو کہتے ہیں کہ خدا نے اس کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا تو یہ نہایت کمزور پیدا کیا۔اگلی بات یہ کہی ہے کہ **وَ كَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا** (17:11) الانسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے' نہ سوچتا ہے' نہ سمجھتا ہے' جذبات کے اوپر آتا ہے' جھٹ سے قدم اٹھاتا ہے' وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔اور جہاں یہ آیت آئی کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ چیزیں جو آخر میں اس کو نقصان پہنچانے والی ہوتی ہیں' ان کے لیے اس طرح سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہے' بھلائی کے لیے نہیں' اس طرح سے اپنی تباہی کے لیے جلدی کرتا ہے۔اور اس کے لیے ہے کہ **وَ كَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا** (17:11) یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔جو پیش پا افتادہ مفاد (Immediate Gains) ہیں' جنہیں قرآن حمید نے مفادِ

عاجلہ کہا ہے' یہ ان کے پیچھے لپکتا ہے یعنی دوسری بات الانسان کی یہ کہی کہ یہ **عجولًا** واقع ہوا ہے' بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ایک اور جگہ کہا ہے کہ **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا** (17:100)۔"قَتُوْرًا" وہ ہوتا ہے جو "بےحد تنگ نظر ہو' بات بات کے اوپر تیوریاں پڑی ہوئی ہوں' سینہ کھنچا ہوا' نگاہیں چڑھی ہوئی ہوں"۔انسان کی یہ انتہائی تنگ نظری کی کیفیت ہوتی ہے اور یہی کہا ہے کہ "الانسان بڑا ہی تنگ نظر واقع ہوا ہے"۔پھر کہا ہے کہ **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا** (18:54) الانسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے' چھوٹی چھوٹی سی بات پر اتنی جلدی کرتا ہے' بعد میں ذرا سوچو' تو یہ ہوتا ہے کہ صاحب! کچھ بات نہیں تھی' دیکھیے! آپ ایک دوّنی پر قتل کر دیتے ہیں۔پھر کہا ہے کہ **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ کَفُوْرًا** (17:67) یہ بےحد ناشکر گزار واقع ہوا ہے۔اس کی یہ کیفیت ہے۔ایک جگہ کہا ہے کہ **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا** (70:19) وہ جسے جوع الکلب یعنی کتے کی بھوک کہتے ہیں کہ پیٹ ہی نہیں بھرتا' پیٹ تو بھرتا ہے مگر نیت ہی نہیں بھرتی' اس قدر لالچی ہے کہ اس کی نیت ہی نہیں بھرتی' بےصبرا واقع ہوا ہے۔ھلوعًا یہ کیفیت ہے۔پھر کہا ہے کہ **اَنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا** (33:72) بڑا ہی ظالم' بڑا ہی جاہل' واقع ہوا ہے۔

عزیزانِ من! الانسان کے متعلق تو قرآن کریم نے یہ بتایا ہے اور اگر ہم نے الانسان سے یہ متعین کرنا ہو کہ فطرت اللہ کیا ہے تو فطرت اللہ کا تو نقشہ کچھ ایسا ہمارے سامنے آتا ہے۔کیا یہی ہے خدا کی فطرت' جس کے اوپر اس نے انسان کو پیدا کیا؟ کہا ہے کہ **ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ**(30:30) یہی ہے وہ دینِ قیم جو اس نے دیا۔اور جو یہ ساری چیزیں ہیں ان پہ تو قرآن حمید نے Criticize (تنقید) کی ہے کہ اس کی کیفیت یہ ہے۔پھر بات کیا ہوئی؟ وہ تو میں وہاں جا کر بتاؤنگا جب **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا** (30:30) والی آیت آئے گی کہ جو قرآن مجید نے کی' وہ بات کیا ہے۔یہاں میں یہ عرض کرونگا کہ اگر کوئی الانسان کے متعلق ایسا کہتا چلا جائے تو آپ دیکھیے کوئی بدترین سی مخلوق ہوگی' کوئی حیوان بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کچھ کرتا ہو۔کوئی حیوان اپنی ہلاکت کے لیے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا صاحب! چھوٹی سی چیونٹی کی بھی کیفیت یہ ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ اس بیچاری سے ہوسکتا ہے وہ کرتی ہے۔اس کے سامنے ذرا تنکا رکھ کر دیکھیے وہ کس طرح سے تڑپتی ہے۔قرآن مجید کہتا ہے کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنی تباہی کے لیے ناچتا گاتا ہوا' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔حیوان بھی ایسے نہیں کرتا' آپ سوچیے تو سہی کہ الانسان کے متعلق کیا تصور ہے؟

## انسان حیوان ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے مگر فطرت نے اس پر سے اپنا کنٹرول اٹھا دیا ہے اس لیے یہ الانسان ہی ہے

انسان کیا ہے؟ یہ کہ اگر زندگی کی (انسان کی زندگی کی نہیں بلکہ زندگی کی) ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھیں تو یہ

حیوان ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے' جو Physical Man (طبعی انسان) ہے اور طبعی طور پر اس کے دماغ کے اندر سوچنے کی' فکر کرنے کی' چیزوں کی' صلاحیت آئی ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ طبعی پرورش کے ساتھ ہی بچے کی تعلیم و تربیت کی جائے تو یہ فطری صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر اِن کو چھوڑ دیا جائے تو باقی جتنا بھی یہ 9/10 ہے' یہ سارا وہی ہے جو حیوانی جذبات ہیں' یہ اس فرق کے ساتھ اس کے اندر آتے ہیں کہ حیوانات کے اوپر تو Nature (فطرت) نے خود ایک غیر محسوس Control (کنٹرول) رکھ لیا ہوا ہے مثلاً یہ کہ بکری گوشت کھا ہی نہیں سکتی' سیدھی سی بات ہے کہ کوئی جانور آگ میں کودتا نہیں ہے لیکن انسان کا بچہ کودتا ہے۔ یہ ان حیوانات پہ فطرت کا کنٹرول ہے۔

انسان کی صورت یہ ہے کہ اگر چہ یہ حیوان کی ہی بڑھی ہوئی ایک شکل ہے مگر فطرت نے اس پر سے اپنا کنٹرول اٹھا دیا ہے' خدا اس کو مجبور نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا' اسے صاحبِ اختیار رکھنا چاہتا تھا۔ اگر فطرت کا کنٹرول اٹھا دیا جائے اور اس کے اندر حیوانات کی ساری Instincts (جبلتیں) ہوں مثلاً یہ جھپٹنے والا ہو' شکار کرنے والا ہو' خون پینے والا ہو' سب کچھ لے لینے والا ہو' یہ ساری کیفیتیں اس کے اندر ہوں اور فطرت کنٹرول اٹھا دے تو اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ وہی جو آج دنیا کے اندر ہو رہا ہے۔ یہ سارے وہ الانسان ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے اوپر کہا ہے۔ اس کا علاج کیا تھا؟ اس کا علاج یہ تھا کہ خدا کی طرف سے اس کو راہنمائی اور ضابطۂ ہدایت ملے اور اسے یہ کہا جائے کہ حیوانات اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہیں لیکن تم شرفِ انسانیت کے حامل ہو' اپنے اختیار اور ارادے سے' یہ راستہ اختیار کرو گے۔

اب یہ بات ہوگئی کہ وحی الٰہی کے تابع چلنے والا جو الانسان ہے' وہ المومن ہے اور جب وہ وحی سے الگ ہو جائے تو خالص الانسان ہے اور اس میں وہ سب کچھ ہے جو قرآن کریم نے الانسان کے حوالے سے کہا ہے۔ عزیزانِ من! سوچ لیجیے کہ وہ Human Being (نوعِ انسان) جو انسان کی شکل تو اختیار کیے ہوئے ہے لیکن خدا کے دیئے ہوئے ضابطہ کے تابع نہیں چلتا' وہ حیوانی Instincts (جبلتوں) اور جذبات کے تابع بغیر کسی کنٹرول کے چلتا ہے' فطرت کا کنٹرول اس پہ تھا نہیں' اس نے کنٹرول خدا کی راہنمائی میں اپنے اوپر از خود عائد نہیں کیا تھا ''اوسی مادر پدر آزاد جنوں کیندے ہیگے'' (تو وہ وہی کچھ ہے جسے آج مادر پدر آزاد کہتے ہیں)۔ آج جو کچھ ساری دنیا میں ہو رہا ہے' یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ یہ الانسان ہے۔ اور اس نے اپنے اوپر خدا کی وحی سے دی گئی رہنمائی کی پابندیاں عائد نہیں کیں۔

## زندگی کا نقشہ تو اس وقت بدلتا ہے جب الانسان مومن بنتا ہے کیوں کہ وہ کنٹرول وحیِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے

الانسان جب المومن بنتا ہے تو کیا لفظ قرآن حمید استعمال کر گیا ہے! المومن ایک تو یقین رکھتا ہے کہ صحیح راستہ' جن پابندیوں کے اندر ہے' میرے لیے ہے اور المومن کے معنی یہ ہیں کہ پھر وہ پوری انسانیت کے لیے امن کا ضامن بن جاتا ہے' المومن کے معنی ہیں ''امن کا ضامن''۔ وہی انسان جب الانسان تھا' حیوانی جذبات کی تسکین ہی اس نے اپنی زندگی کا مقصد سمجھ رکھا تھا' آپ سوچیے تو سہی کہ پابندی کوئی نہ ہو اور فطرت کی قوتوں کو اس طرح سے مسخر کر رہا ہو کہ ایک بم سے پورے ہیروشیما کو اڑا دے اور وہ تو پرانی بات ہوگئی اب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ایٹم پورے کرۂ ارض کو تباہ کر دے گا' اسی لیے چاند پہ جا رہے ہیں کہ وہاں سے بیٹھ کر چلائیں گے۔ اندازہ لگائیے اتنی بے پناہ قوتوں کا مالک' فطرت کا کنٹرول اُدھر سے ہے نہیں اور اس نے اپنے اوپر بھی کوئی کنٹرول عائد نہیں کیا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اسے یوں سمجھیے کہ بچے کے ہاتھ میں چاقو دید یجیے' نتیجہ پتہ چل جائے گا۔ بلا کنٹرول آپ نے اُسے ایک چیز دی ہے پھر دیکھیے کہ وہ کرتا کیا ہے۔ دوسرے بچوں کو تو چھوڑ دیجیے' وہ اپنے آپ کو ہی ہلاک کر لیتا ہے۔

## آج دنیا بھر میں الانسان کی نفسیاتی کیفیت کی حالتِ زار کیوں کہ اس نے اپنے اوپر سے وحیِ خداوندی کا کنٹرول اٹھا لیا ہے

آج دنیا میں الانسان بستا ہے اور اگر قرآن کریم سے آپ الانسان کی Characteristics (خصوصیات) متعین کریں گے تو ساری دنیا کا نقشہ سامنے آجائے گا۔ عزیزانِ من! یہ ضَعِیۡفًا (4:28) ہے' یہ چھوٹی سی جو Temptation (حرص) ہے' اس کو Resist (مزاحمت) نہیں کر سکتا۔ یہ عَجُوۡلًا (17:11) ہے' اتنا جلد باز ہے کہ چار قدم آگے جانے کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ وہ چیز میرے لیے کس قدر خطرناک تھی لیکن یہ جلد بازی میں اسی مفادِ عاجلہ کی طرف لپکتا ہے جو سامنے پڑا ہوا ہے۔ یہ کَفُوۡرًا (17:67) ہے' جتنی چیزیں ملی ہوئی ہیں' ان کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کو دیکھ نہ پائے' کسی کو پتہ نہ چلے' یہ کفرانِ نعمت ہے۔ یہ اکثرَا شیءٍ جدلًا (18:58) ہے' جب مفاد کا یوں Clash of Interest (مفاد کا ٹکراؤ) ہوتا ہے تو جھگڑتا ہے' نہ قاعدہ ہے' نہ قانون ہے' نہ انصاف ہے' کچھ نہیں ہے' ایسے کتے بھی نہیں لڑتے ہڈیوں کے اوپر' جس طرح سے انسان ذرا سے مشترک مفاد کی خاطر آپس میں لڑتا چلا جاتا ہے۔ یہ هَلُوۡعًا (70:19) ہے' ارے ایک بیل کا جب پیٹ بھر جائے تو خواہ کتنا ہی چارہ کیوں نہ پڑا ہو' وہ ایک طرف بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے نہایت مزے سے جگالی کرتا رہتا ہے' باقی چارے کے متعلق اس کو فکر ہی نہیں ہوتی کہ وہ

کون کھا گیا اس لیے کہ وہ هَلُوْعًا (70:19) نہیں ہے' اس کا پیٹ بھر گیا ہے' نیت کی بات ہی نہیں ہے' اس کم بخت الانسان کا پوچھو نہیں یہ پیٹ بھرنے کی تو بات ہی نہیں' نیت ہی نہیں بھرتی۔ کبھی ان سے پوچھو کہ یہ جو اتنے Millionaires (کروڑ پتی) بنے پھرتے ہیں' کوٹھیاں موٹریں ہیں' بینک بیلنس ہے اور ہوس کی کیفیت کہ باؤلے کتے کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں صاحب! یہ ہے اَلْـهٰكُمُ التَّكَاثُرُ . حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ہوس ان کو پاگل بنا رہی ہے' بھاگے جا رہے ہیں۔ کہا ہے کہ اگر کوئی ریس کرنے والا ہو اور کوئی Destination (منزل) مقرر ہو جائے تو وہ تو بھاگ کر Destination (منزل) پہ پہنچ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جب کوئی Destination (منزل) ہی نہ ہو اور ہو ریس' ایک دوسرے سے آگے چلنے کی' تو اس کے بعد وہ کیا کہتا ہے؟ کہ اس کے بعد الانسان جا کر قبر کے گڑھے میں گر جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن مجید نے جو الانسان کے متعلق کہا ہے' وہ خدا کی فطرت تو ایک طرف' سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (23:91) وہ اس سے بہت اونچا ہے یہ لوگ جو اس کے متعلق کہتے ہیں۔ یہ خدا کی فطرت تو ایک طرف' یہ تو حیوان کی فطرت بھی نہیں ہے۔ جب قرآن مجید الانسان کہے گا تو اس کے معنی ہونگے کہ انسان جو وحی کی راہنمائی میں اپنے اوپر پابندیاں عائد نہیں کرتا' فطرت کی قوتوں کو خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق صرف نہیں کرتا' اس کے جی میں جو آیا وہ کرتا چلا جاتا ہے' فطرت نے کنٹرول پہلے سے اٹھایا ہے' لیکن اس نے اپنے اوپر کنٹرول عائد نہ کیا چناں چہ اس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہوگئی۔

یہ ہے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے جو کہا تھا کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے مثلاً پانی کی فطرت ہے کہ نیچے نشیب کی طرف بہے گا' یہ مجبور ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ حرارت دے' یہ مجبور ہے۔ سنکھیے کی فطرت میں ہے کہ ہلاکت بہم پہنچائے' یہ مجبور ہے۔ بکری کی فطرت ہے کہ گھاس کھائے' گوشت نہ کھائے' یہ مجبور ہے۔ شیر کی فطرت ہے کہ گوشت کھائے' یہ مجبور ہے۔ اسی لیے شیر جب کسی انسان کو بھی پھاڑ کھاتا ہے تو کبھی اس کو پھانسی نہیں دی جاتی۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے' یہ صاحبِ اختیار ہے' یہ چاہے گوشت کھائے' چاہے سبزی کھائے' چاہے اپنے لیے حیات آفریں چیزیں پیدا کرے' چاہے ایک دن میں اپنی ہلاکت کر لے۔

آپ کو معلوم ہے کہ خودکشی کوئی جانور نہیں کر سکتا' خودکشی کوئی حیوان نہیں کر سکتا' یہ جسے اشرف المخلوق کہتے ہیں' اپنی تباہی یہی کرتا ہے اور Suicide (خودکشی) میں تو ایک فرد اپنی تباہی کرتا ہے' ساری انسانیت Suicide (خودکشی) کر رہی ہے' قوموں کی قومیں Suicide (خودکشی) کر رہی ہیں' ایک دوسرے کو قتل کر رہی ہیں۔ کیا ہوا؟ فطرت نے کنٹرول رکھا نہیں تھا' اس نے اپنے اوپر کنٹرول عائد نہیں کیا' اور اس کے بعد الانسان ان حیوانی جذبات کو بغیر حدود و قیود کے' پورا کرتا چلا جاتا ہے۔ جنسی جذبات کے سلسلے میں کہنا کہ

انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے' Temptation (حرص وہوس) کو Resist (مزاحمت) نہیں کر سکتا' اس کو کہیں یوں نہ چھوڑ دینا کیونکہ فطرت نے کنٹرول عائد نہیں کیا۔ وہ بیل سارا سال گائیوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا' فطرت کا کنٹرول ہے۔ جب فطرت اجازت دیتی ہے اس وقت وہ اس چیز کو پورا کرتا ہے۔ یہ کتنی بڑی عفت ہے لیکن اس کے لیے اس کو کریڈٹ نہیں دیا جاتا۔

فطرت کا یہ کنٹرول انسان سے اٹھا' تو اس نے اپنے اوپر کنٹرول عائد نہیں کیا' پورا مغرب آپ کے سامنے ہے اور اس کے تتبع میں ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ سیلاب ادھر بھی چلا آ رہا ہے یعنی مرد عورت کے تعلقات تو ایک طرف رہے' آپ کو معلوم ہے کہ وہاں ان کم بختوں نے Homo Sexuality (ہم جنسیت و شہوانیت) کو قانوناً جائز قرار دے لیا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ **وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا** (4:28) انسان Temptation (حرص) کو Resist (مزاحمت) نہیں کر سکتا۔ یہ چیز سامنے ہے جو حضرتِ یوسفؑ کے قصہ میں قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی Temptation (حرص) ہو سکتی ہے' تحدید بھی اس کے اندر ہے' یعنی تخلیق بھی اس کے اندر' ترغیب بھی اس کے اندر ہے۔ ترغیب تو یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ ہے بہر حال وہ اگر ملکہ نہیں تھی تو اس سے کم بھی نہیں تھی' وہ ترغیبات دیتی چلی جا رہی ہے' تحدید کی یہ کیفیت کہ ساتھ ہی کہتی ہے کہ اگر نہ مانو گے تو کل جیل خانے کے اندر ہو گے۔ دونوں چیزیں بڑی ہیں۔ اب انسان ضعیف واقع ہوا ہے' پتہ ہے پھر قرآن کریم نے وہاں کیا کہا کہ یوسفؑ نے کیوں اپنے آپ پر وہ ضبط رکھا۔ کہا ہے کہ اس نے سامنے برہانِ رب دیکھ لیا تھا کہ نہیں' میرے خدا نے یہ کہا ہے کہ ایسے وقت پہ یہ کرنا ہے۔ وہ رک گیا۔ عزیزانِ من! انسان یوں اپنے اوپر کنٹرول رکھتا ہے۔ یہ جو قرآن کریم نے کہا ہے' اس کو بغیر وحی کے یوں چھوڑ دیجیے گا تو یہ ہے کہ **وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا** (4:28) انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو بدلگام چھوڑ کر اپنے لیے سامانِ ہلاکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی 28ویں آیت تک ہم آ گئے' 29ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ**

❀......❀......❀

# دسواں باب: **سورۃ النسآء** (1)' (آیات 29 تا 33)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا
اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝٢٩ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيْرًا ۝٣٠ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝٣١ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا
فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝٣٢ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ
عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝٣٣

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ سورۃ النسآء کی 29ویں آیت سے شروع ہوتا ہے: (4:29)۔

## مذہب پرست دنیا میں آج بھی عورت کا مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ ہے' عورت کا شمار نوعِ انسان میں ہوتا ہی نہیں تھا

جیسا کہ آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں سورۃ النسآء میں عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات بڑی ہی شرح و بسط سے بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ جسے آپ مسئلۂ زن کہتے ہیں یعنی عورت کے متعلق مسئلہ' اس کے لیے احکام اور ہدایات بڑی تفصیل سے دیئے جارہے ہیں۔ اگرچہ مذہب پرست دنیا میں تو آج بھی یہ مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ ہے لیکن نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں' ساری دنیا میں گویا یہ کوئی پرابلم نہیں تھا' اس کے برعکس یہ ایک Settled چیز تھی' ایک فیصلہ شدہ بات تھی کہ عورت کا شمار نوعِ انسان میں ہوتا ہی نہیں تھا' اسے انسان شمار ہی نہیں کیا جاتا تھا' انسان کہلانے کا حق صرف مرد کو تھا۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے انگریزی میں جو لفظ ہے' وہ Mankind ہے۔ خود عربی زبان میں بھی یہ جو قوم کہتے ہیں' اس سے مراد مردوں کی جماعت ہوتی ہے' طبعاً اس کے اندر عورتیں شامل ہوجاتی تھیں تو اور بات ہے لیکن یہ قوم کا لفظ مردوں ہی کی جماعت کے لیے بولا جاتا تھا۔

## آج تک شریعت کے احکام و قوانین بنانے میں کسی عورت کو شامل ہی نہیں کیا گیا

یہ تھا عورت کے متعلق عام تصور جس کے ازالے کے لیے قرآنِ کریم نے اتنی تفصیل سے اس مسئلہ کی جزئیات تک بیان کی ہیں۔

# دسواں باب: **سورۃ النسآء** ((1)' آیات 29 تا 33)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ
يَسِيْرًا ۝۳۰ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا
فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔـلُوا
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۳۲ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ
عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 23 تاریخ ہے اور درس قرآنِ کریم کا سلسلہ سورۃ النسآء کی 29ویں آیت سے شروع ہوتا ہے:((4:29۔

## مذہب پرست دنیا میں آج بھی عورت کا مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ ہے' عورت کا شمار نوعِ انسان میں ہوتا ہی نہیں تھا

جیسا کہ آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں سورۃ النسآء میں عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات بڑی ہی شرح و بسط سے بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ جسے آپ مسئلۂ زن کہتے ہیں یعنی عورت کے متعلق مسئلہ' اس کے لیے احکام اور ہدایات بڑی تفصیل سے دیئے جارہے ہیں۔ اگرچہ مذہب پرست دنیا میں تو آج بھی یہ مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ ہے لیکن نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں' ساری دنیا میں گویا یہ کوئی پرابلم نہیں تھا' اس کے برعکس یہ ایک Settled چیز تھی' ایک فیصلہ شدہ بات تھی کہ عورت کا شمار نوعِ انسان میں ہوتا ہی نہیں تھا' اسے انسان شمار ہی نہیں کیا جاتا تھا' انسان کہلانے کا حق صرف مرد کو تھا۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے انگریزی میں جو لفظ ہے' وہ Mankind ہے۔ خود عربی زبان میں بھی یہ جو قوم کہتے ہیں' اس سے مراد مردوں کی جماعت ہوتی ہے' طبعاً اس کے اندر عورتیں شامل ہو جاتی تھیں تو اور بات ہے لیکن یہ قوم کا لفظ مردوں ہی کی جماعت کے لیے بولا جاتا تھا۔

## آج تک شریعت کے احکام و قوانین بنانے میں کسی عورت کو شامل ہی نہیں کیا گیا

یہ تھا عورت کے متعلق عام تصور جس کے ازالے کے لیے قرآنِ کریم نے اتنی تفصیل سے اس مسئلہ کی جزئیات تک بیان کی ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے اہم مسائل کے متعلق وہ اصولاً گفتگو کر کے آگے بڑھ جاتا ہے لیکن اس سوال کے متعلق بڑی ہی تفصیل سے گفتگو کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر رکھی تھی۔ آج اس کی اہمیت اس لیے ہے۔ میں نے جو کہا تھا کہ مذہب پرست طبقے میں آج بھی یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے' باقی مذاہب میں تو ہوا کرے' ان کے ہاں تو خدا کی کتاب موجود نہیں ہے' انسانوں کی خود ساختہ شریعت ہے۔ اور جب میں انسانوں کی شریعت کہتا ہوں تو اس کے معنی مردوں کی بنائی ہوئی شریعت ہیں آج تک شریعت کا کوئی حکم' کسی عورت نے تو بنایا ہی نہیں' عورت کو تو اس کی اجازت ہی نہیں دی جا سکی تھی۔ مردوں کے بنائے ہوئے احکام و قوانین جب عورتوں کے متعلق ہونگے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نوعیت کیا ہوگی۔ ہمارے ہاں بھی یہ ساری پیچیدگیاں اسی وجہ کی پیدا شدہ ہیں۔ اور جو چیز وجۂ تعجب ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں' بلکہ یوں کہیے کہ اس کے علی الرغم جو احکام چلتے ہیں' وہ وہی ہیں جو مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں عورت کو جو پوزیشن دی جاتی ہے' وہ وہی ہے جو نزولِ قرآن کریم سے پہلے تھی۔ قرآن حمید سے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور مذہبی دنیا کے اندر عورت کو اسی مقام پر رکھا ہوا ہے جس مقام پہ یہ دورِ جہالت کے اندر تھی۔ بہر حال آخری آیت میں آیا تھا کہ وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا (4:28) الانسان بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ اور میں نے یہ تفصیل سے عرض کیا تھا کہ جب قرآن کریم میں الانسان کا لفظ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جب زندگی' حیوانات کی سطح سے آگے بڑھی تو وہ انسانی پیکر میں نمودار ہوئی۔ الانسان میں کوئی 9/10 حصہ' وہی حیوانی Instincts (جبلتوں) کا ہے اور اس سے اوپر ایک انسانی سطحِ زندگی شروع ہوتی ہے۔

## زندگی کا حصول توسعی و کاوش کا رہینِ منت ہوتا ہے

انسان پیدائش کے اعتبار سے حیوانی جبلّتیں لیے ہوئے ہی پیدا ہوتا ہے' انسانی سطح پر اسے خود آنا پڑتا ہے۔ وہ چیزیں' وہ صلاحیتیں اس کو پیدائش سے ملتی ہیں اور اس میں انسانی سطحِ زندگی Dormant (خوابیدہ) ہوتی ہے۔ وہ جو اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا تھا کہ ''زندگی جہد است و استحقاق نیست'' یعنی زندگی کوشش سے حاصل ہوتی ہے' یونہی بطور حق کے کسی کو نہیں مل سکتی۔ اس کے معنی انسانی زندگی ہی تھی ورنہ جو عام زندگی ہے جسے ہم حیوانی کہتے ہیں' اس میں تو پیدا ہونے والا جو بچہ ہے' اس کی کوشش تو ایک طرف رہی' اس کے اختیار و ارادے کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جو حصہ پیدائشاً اس کو ملتا ہے' وہ حیوانی سطحِ زندگی ہوتی ہے تو قرآن حمید یہاں انسان کہتا ہے' وہ حیوانی سطحِ زندگی کا انسان ہوتا ہے اور پھر جب وہ انسانی زندگی کو حاصل کرتا ہے تو اسے مومن کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں کفر اور ایمان کے امتیاز میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَیَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ (47:12) کفر کی زندگی یہ ہے کہ

حیوانات کی سطح پر کھایا پیا جائے' انسان مر مرا جائے۔ وہ ایمان کی زندگی جو انسانی سطح سے شروع ہوتی ہے' اسے حاصل کیا جاتا ہے۔

## حیوانی سطحِ زندگی سے انسانی سطحِ زندگی کا حصول اور اس کا شعار

میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں قرآنِ کریم انسان کے متعلق کہتا ہے کہ وہ بڑا کمزور واقع ہوا ہے' بڑا ناشکرا واقع ہوا ہے' بڑا بے صبرا واقع ہوا ہے' اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا' اس کی نیت ہی نہیں بھرتی' وہ چھینا جھپٹی کرتا ہے' سب کچھ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے' تو یہ اس انسان کے متعلق ہے جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ مومن کا شعار اس سے مختلف ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب کہا ہے کہ انسان ضعیف واقع ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بڑی جلدی Temptation (حرص) میں آ جاتا ہے۔ اس کے اندر جو حیوانی سطحِ زندگی کی Instincts (جبلتیں) ہیں' جو جذبات ہیں' وہ جب ابھرتے ہیں تو ان کو صرف انسانی سطحِ زندگی کا تصور ہی روک سکتا ہے ورنہ اس سے فوراً لغزش ہو جاتی ہے۔

## جنسی گوشے کے سلسلہ میں دیئے گئے اصول وضوابط کے ساتھ ساتھ شکم پروری کے لیے الحق اور الباطل کی اصطلاحات کی وضاحت

عزیزانِ من! پیچھے سے جنسی تعلق کی بات چلی آ رہی تھی۔ اس سلسلے میں کہا ہے کہ انسان کمزور واقع ہوا ہے' جب یہ جذبہ اس پہ غالب آتا ہے تو یہ از خود نہیں رکتا' اسے برہانِ خداوندی کی رو سے' مستقل اقدار کی اہمیت کو سامنے لانے سے' روک سکتے ہیں' اس کو حدود کا پابند کر سکتے ہیں۔ یہی بات آگے کہی ہے لیکن اس اعتبار سے کہ یہاں انسان کو ضعیف کہا' اس کا دوسرا گوشہ جو مال و دولت سے متعلق ہے' اس میں بھی یہ Temptation (حرص) کو Resist (مزاحمت) نہیں کرتا' جائز و ناجائز ہر طریقے سے دولت سمیٹنے کی فکر کرتا ہے۔ درمیان میں ایک آیت اس کے متعلق بھی آ گئی۔ یہ سلسلہ پھر اس کے بعد آگے چلے گا۔

ضَعِيۡفًا کی نسبت سے قرآن حمید میں مال کے متعلق یہ آیت تھی کہ یٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ (4:29) اے جماعتِ مومنین! وہ جو انسانی سطحِ زندگی ہے' اس میں آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھایا کرو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حمید کی یہ دو اصطلاحات 'الحق اور الباطل' بڑی جامع ہیں۔ جائز و ناجائز تو اس کے لیے یونہی ایک مختصر سا ترجمہ ہے ورنہ ہر وہ شے باطل ہے جو حق کے خلاف ہوتی ہے' جس سے یا تو تخریبی نتائج پیدا ہوتے ہیں یا نتائج پیدا ہی نہیں ہوتے۔ یاد رکھیے! حق کسی Abstract Truth (بسیط حقیقت) کا نام نہیں ہے' غیر مرئی سی بات نہیں ہے کہ محض عقیدے یا نظریئے کی ذہنی تصوری بات ہو۔ الحق کہتے ہیں وہ فارمولا جو اپنے ٹھوس نتائج سامنے لے آئے' اپنے مقام کے اوپر محکم بھی رہے اور زمانے کے تقاضے کو

پورا بھی کرتا چلا جائے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ جس طرح استعمال ہوتا ہے' قرآن مجید اس کا مفہوم بڑی وضاحت سے پیش کرتا ہے ۔وہ یوں ہے کہ یہ دروازے ہیں' آج تو ان کے قبضے ہوتے ہیں' جو پرانے دروازے ہوتے تھے ان میں یہ تھا کہ ساکٹ کے اندران کی چول ہوتی تھی۔ان کے ہاں وہ دروازہ اس طرح سے تھا کہ جو چول تھی' وہ ساکٹ کے اندر اس طرح سے فٹ ہو جائے کہ جب ضرورت پڑے دروازہ کھل جائے' جب ضرورت پڑے بند ہو جائے تو دروازہ اپنا مقصد پورا کرتا چلا جائے۔اگر وہ جام ہو گیا ہے' کھلتا نہیں ہے' تو وہ دروازہ نہیں دیوار ہو جائے گی۔اگر وہ کھلنے کے بعد عندالضرورت بند نہیں ہوتا تو وہ دروازہ نہیں رہے گا' شگاف ہو جائے گا' دروازہ صرف اسی صورت میں ہے کہ اپنے مقام پہ محکم بھی رہے اور جب آپ کو ضرورت پڑے' وہ بند ہو جائے اور جب ضرورت پڑے' وہ کھل جائے تو اسے وہ حق کہا کرتے تھے۔ٹھوس نتائج جو اپنے مقام پہ مستقل اقدار کی طرح محکم بھی ہوں اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضے کو بھی پورا کرتے چلے جائیں۔ باطل اسکے خلاف تخریبی نتائج پیدا کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔کہا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔

## ہمارے ہاں تجارت میں باہمی رضامندی کو اپنانے کا طریق کار اور شرح منافع کا تعین

آگے کہا ہے کہ اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (4:29) ۔یہاں ایک دلچسپ چیز آتی ہے۔کہا کہ بجز اس کے کہ وہ تجارت کے ذریعے سے ہو یعنی عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (4:29) باہمی رضامندی سے ہو۔

قرآن حکیم نے یہ طریقہ جائز بتایا ہے جو باطل نہیں ہے اور یہیں سے غلط معاشرے میں' غلط نہج زندگی میں' تمام خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔تجارت باہمی رضامندی سے ہو تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ رضامندی کس طرح سے ہمارے ہاں ہوتی ہے۔جب چیزیں بازار میں کم سپلائی ہوتی ہیں' کم ہو نہیں جاتیں ان کی Shortage (کمی) پیدا کی جاتی ہے' جب کمی پیدا کی جاتی ہے تو اِدھر یہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ انہیں خریدا جائے مثلاً آپ کو معلوم ہے ایک زمانے میں یہاں دوائیاں کم ہوئی تھیں' ڈاکٹر لکھ کر دیتا تھا کہ یہ دوائی فوراً لاؤ تو بچے کی زندگی بچ سکتی ہے ورنہ موت واقع ہو جائے گی۔آپ سوچیے کہ اس باپ کی ضرورت کا تقاضا کیا ہے' وہ مارے مارے پھرتا ہے' اول تو وہ کسی کے ہاں سے ملتی نہیں ہے اگر ملتی ہے' موجود ہے اندر رکھی ہوئی ہوتی تھی' جسے وہ کہتا تھا کہ اچھی بات ہے جی! اسے ہم اسٹور سے لے آئیں گے' تو وہ دس روپے کی چیز کے پچاس روپے مانگتا ہے۔اب اس کی ضرورت اتنی شدید ہے' کہیں سے مل نہیں رہی' اس کے پاس موجود ہے' وہ دیتا ہے' وہ کہتا ہے کہ صاحب! پچاس میں دونگا' کہ جی! یہ تو بڑی زیادہ قیمت ہے۔یہ

تراضی کا لفظ دیکھیے کہ وہاں کیسے استعمال ہوتا ہے؟ ''آپ کی مرضی ہے لیجئے' نہ مرضی ہو نہ لیجیے صاحب!'' اور وہ جو پچاس دے جاتا ہے تو یہ باہمی مرضی سے تجارت ہوئی صاحب! میں نے اس کی جیب تو کاٹی نہیں' زبردستی کچھ چھینا نہیں' میں نے کہہ دیا تھا کہ ''پچاس میں دونگا' مرضی ہے لیجئے' مرضی آئے نہ لیجئے''۔ وہ اپنی مرضی سے پچاس روپے دے کر گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (4:29) ۔

میں نے دیکھا ہے کہ اس آیت اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (4:29) کو Quote (نقل) کرتے تھے کہ یہ تجارت باہمی رضامندی سے ہے۔ اب اگر یہ باہمی رضامندی سے ہے تو اس کے بعد ڈکیتی کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ باہمی رضامندی سے تجارت کرنا کیا چیز ہے؟ یہ اکنامکس میں بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ چیزوں کی قیمت کیسے مقرر کی جائے؟ ایک تو اس چیز کے اوپر لاگت آتی ہے۔ وہاں تک تو معاملہ بالکل ٹھیک ہے۔ آگے اس کے اوپر منافع آتا ہے۔ مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ منافع لاگت کے اندر نہیں آتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جو بنارس کے پانڈے ہیں وہ یوں کرتے ہیں کہ ہر قدم پر کہتے ہیں کہ یہ ایک روپیہ تیرے باپ کے سانس نکلنے کا' یہ دو روپے اس کے مردہ بننے کے' یہ چار روپے اس کے شمشان بھومی میں جانے کے' تو اُس نے دس روپے وہاں رکھے' دو روپے یہاں رکھے۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا دان پورا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں سے جو چیز چلتی ہے' تجارت پیشہ حضرات واقف ہوتے ہیں کہ راستے میں کس کس مقام پر' بنارس کے ان پانڈوں کی طرح' یہ چیزیں رکھنی پڑتی ہیں' یہ ٹیکس ہے' یہ ڈیوٹی ہے' اس سطح پر آنے کے بعد پھر اس کا منافع شروع ہوتا ہے۔

## پہلے پہل گاؤں میں بارٹر سسٹم کے طریق کار کی نوعیت' اس کے بعد سکے کا لین دین اور پھر یہ سکہ پرابلم بنا

سوال یہ ہے کہ اکنامکس میں جنس کی قیمت کیسے مقرر کی جائے؟ یہ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (4:29) کی صورت کیسے پیدا ہو؟ یہ باہمی رضامندی سے' مبادلۂ اشیاء' تجارت کیا ہے؟ یہ چیزوں کے تبادلے کا نام ہے۔ پہلے بارٹر سسٹم ہوتا تھا' جنس کا تبادلہ ہوتا تھا' مثلاً ایک کے ہاں گیہوں ہے' دوسرے کے گھر میں تیل ہے۔ اُسے گیہوں کی ضرورت ہے' اِسے تیل کی ضرورت ہے۔ یہ گیہوں لے گیا' وہاں سے تیل لے آیا۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں یہ اس قدر Compact System (منضبط نظام) تھا۔ ہم گاؤں کے رہنے والے تھے۔ گاؤں کے لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ صاحب! ہمیں تو صرف نمک لینے کے لیے شہر جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بالکل ٹھیک بات تھی۔ اناج اپنے گھر کا' دالیں اپنے گھر کی' ساگ پات اپنے گھر کا' گنا بویا ہے اس سے گڑ اور شکر اپنے گھر کا' سرسوں اور تل بوئے ہیں اس سے تیل اپنے گھر کا' کپاس سے کپڑا اپنے گھر کا۔ وہیں جولاہا ہوتا تھا' وہیں مٹی کے برتن بنتے تھے' وہیں لکڑی

کاٹ لی جاتی تھی زراعت کے آلات بن جاتے تھے‘ ڈھور ڈنگر ذبح ہوتا تھا گوشت کھا لیتے تھے‘ چمڑے کا جوتا بن جاتا تھا‘ ساری ضرورتیں باہمی بارٹر سسٹم سے پوری ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس میں یہ دقت نہیں آتی تھی کہ فاضلہ شے کو کوئی شخص کب تک رکھے گا‘ کتنی رکھ لے گا۔ اس کو وافر چیز دینی پڑتی تھی۔

اب ہوا یوں کہ یہ سکہ (Coin) ❶ رائج ہو گیا۔ تھی تو یہ ضرورت کی چیز کہ اپنے گاؤں میں اگر وہ شے نہیں مل رہی‘ جس کی اسے ضرورت ہے تو وہ اتنا گیہوں کا بوجھ اٹھا کر شہر لے جائے‘ وہاں سے پھر یہ چیز لائے‘ اس کی Communication (ترسیل) کے لیے انہوں نے یہ سکہ رائج کر دیا کہ تم یہ لے جاؤ اور وہاں سے اس سکے کے بدلے میں وہ چیز لے آؤ‘ یہاں گیہوں بیچ کر سکہ لے لو‘ وہ سکہ لے کر شہر چلے جاؤ‘ وہاں سے یہ چیز لے آؤ۔ اس مقصد کے لیے یہ طریقہ بنا تھا لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ شیطان نے اس سے کتنا کام لیا ہے! آج اس دنیا کی سب سے بڑی پرابلم اسی سکے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔

## قرآنِ حکیم میں دولت کا بنیادی مقصد‘ مفہوم‘ اس کا طریق کار اور پھر ہمارا معاشی نظام

بہرحال اس سکے کی وجہ سے اتنی Convenience (سہولت) ہے کہ آپ اس کو آج ترک بھی نہیں کر سکتے۔ اسے رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم میں آپ غور کریں گے گو کہ آج وہ موضوع نہیں ہے لیکن جوں جوں معاشی موضوع آئے گا‘ آپ دیکھیں گے کہ قرآن حکیم نے سکے (Coin) کی حیثیت ہی یہ رکھی ہے کہ وہ اس کو کہیں ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیتا‘ وہ اسے ہر وقت گردش (Circulation) میں رکھتا ہے۔ عربی زبان میں ''دولت کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو گردش کرتی رہے''۔ لغات کے اعتبار سے اس کے معنی ''گردش کرنے والی چیز'' کے ہیں۔ پہلی بات اس نے دولت کے متعلق کہا ہے کہ جہاں اس کی گردش رک جائے‘ وہاں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ اگر دولت کو کہیں جامد کر کے‘ رکھ لو گے تو یہ جہنم پیدا کر دے گی جس میں یہ سکے تپائے جائیں گے اور ان سے تمہیں داغا جائے گا۔ 'وہ داغا جائے گا' کی بات ہمارے ذہن میں تو مرنے کے بعد کے متعلق آتی ہے جبکہ یہیں وہ داغنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی گردش (Circulation) رہنی چاہیے۔ گردش کے متعلق اس نے کہا کہ یہ اس طرح سے نہ ہو کہ جو اوپر کا طبقہ ہے‘ یہ اسی میں پھرتی رہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن حمید کیا چیزیں کہہ جاتا ہے! اب سوال یہ ہے کہ تجارت میں جو صورت ہے اس میں کسی شے کی قیمت کیا مقرر کی ہے۔

---

❶ لیڈیا (ترکی) میں سکے کی تاریخ کا آغاز 560 ق م سے ہوا ہے۔ پہلے سکے خالص سونے اور چاندی سے بنائے گئے تھے‘ بعد میں الیکٹرم (Electrum) کے تھے جو قدرتی طور پر پائے جانے والے قدرے زرد رنگ کے سونے اور چاندی کے بھرت سے بنائے گئے تھے اور پھر تانبے اور چاندی کے بھرت سے بنے۔ قدیم ترین سکے روم اور یونان کے ہیں۔ پہلے قدیم ترین لیڈین سکے پہ شیر کی تصویر تھی۔ 600 ق م میں چین نے پہلا سکہ جاری کیا۔ یہ کانسی کا بنا تھا اور درمیان میں چورس سوراخ تھا۔ (http://en.wikipedia.org/wiki/history_of_coins)

## سودی نظام کی مختلف شکلیں اوراس میں پیدا ہونے والی مشکلات

قرآن حمید کا اصول یاد رکھیے۔ اگر وہ اصول سامنے رہے تو اکنامکس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ ''معاوضہ محنت کا ہے' سرمایہ کا نہیں ہے''۔ جسے قرآن مجید ربٰوا کہتا ہے اور جس کا ترجمہ ہم نے سود کر لیا اور پھر Simple Interest (سادہ سود) سے سود مرکب ہوا' اور مزرعی سود ہوا اور پھر اس قسم کی چیزوں میں امتیاز شروع کیا 'خواب پریشاں را از کثرتِ تاویل ہا' اور ہمارے ہاں پھر مسئلہ چلا کہ صاحب! انفرادی سود تو حرام ہے لیکن وہ Commercial Interest (تجارتی سود) بالکل جائز ہے اور پھر اس کی بیسیوں شکلیں در آئیں مثلاً مزارعت اور مضاربت اور کہا گیا کہ یہ تمام چیزیں جائز ہیں۔ نقد روپیہ دے کر اس کے ساتھ کچھ بڑھوتی لے لینا تو سود ہے لیکن وہی روپیہ کسی تاجر کے پاس Invest (سرمایہ کاری) کرے' اس کے منافع میں سے آدھا لے لے' یہ شیرِ مادر ہے۔ کسی غریب کو ہزار روپیہ دینا کہ زمین کا ٹکڑا خرید کر اس پہ کاشت کر لے' اس ہزار کے اوپر دس روپے لے لینا تو حرام ہے لیکن خود زمین خرید کر اسے بٹائی پہ دے کر آدھی بٹائی لے جانا' یہ بالکل حلال وطیّب ہے۔ انھی میں تجارت ہے' کہ صاحب! تجارت میں جو کچھ وہ لیتا ہے' وہ سود نہیں ہے' وہ منافع ہے' وہ ہری داس نہیں عبدالرحمٰن ہے۔ منافع کس چیز کا ہے؟ یہ تجارت کا منافع ہے' اسے کبھی سود نہیں کہا جاتا' اسے منافع کہا جاتا ہے' پھر اس منافع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے' شرعاً اس منافع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ حد کے تو معنی ہیں کہ آپ مقرر کریں کہ چیزوں کی قیمتیں کیسے ہوں۔ یہ ان کے بس کی تو بات نہیں ہے' بڑے بڑے اکانومسٹ اس مسئلہ میں حیران و سرگرداں پھرتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے۔ یہ سارا کیپٹل ازم کا نظام' سرمایہ داری کا نظام اسی چیز پر تو چل رہا ہے' خواہ انڈسٹری ہو جس میں چیز تیار کی جاتی ہے کہ تیار کرنے کے بعد اس کی قیمت کیا لے' خواہ آگے جا کر Commerce (تجارت) ہو کہ جو بیچی جاتی ہے' بیچنے والا کتنے میں بیچے۔ سارا مسئلہ ہی یہ ہے' ان بیچاروں کے بس کی بات ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تجارت میں جو کچھ لیا جائے اس کی کوئی حد نہیں گویا جو کچھ لیا جائے گا وہ منافع ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت اور ایک مزدور کی دن بھر کی مزدوری کا تعین

عزیزانِ من! پھر اس قسم کی روایات گھڑی گئیں' اور انہیں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا کہ گاہک اور دکاندار قیمت لینے اور دینے میں اتنا جھگڑیں کہ دونوں کو پسینہ آ جائے۔ کسی زمانے میں تو یہ اتنے ٹھنڈے ہوتے ہونگے کہ پسینہ آنے تک کچھ نہ ہو' یہاں تو اب دوسری ہی بات میں جھگڑا ہوتا ہے صاحب! یعنی مقرر کی ہوئی وہ قیمت کہ جس پر اتنا جھگڑا ہو' وہ اتنے جھگڑے کے بعد راضی ہوں کہ دونوں کے پسینے چھوٹ جائیں۔ جھگڑا جس چیز پہ ہو رہا ہے' یہ کونسی چیز ہے؟ یہ ہے جو فرمائش پر منافع مانگ رہا ہے ورنہ بات تو

بڑی آسان ہے' اس لاگت کے بعد یہ شخص جو اس چیز کو بیچ رہا ہے' اس کی پورے دن کی مزدوری محنت کتنی ہے' لاگت کی لاگت تو دینی ہے' اس شخص کی دن بھر کی جو مزدوری ہے' وہ ہے اس کا منافع' اس سے اگر ذرا زیادہ دیا جائے گا تو سرمائے کے اوپر منافع ہوگا' وہ ربوٰ ہو جائے گا۔ مقرر کرنے کی ساری بات یہ ہے کہ صبح سے شام تک یہ دکاندار جو وقت دے رہا ہے' ایک دن کی اس کی مزدوری کیا ہے۔ جیسے ایک مزدور کی مزدوری آپ Determine (مقرر) کرتے ہیں' Wages (اجرتیں) مقرر کرتے ہیں ان کی دن بھر کی مزدوری مقرر کر دیجئے' اشیاء کی قیمتیں مقرر ہو گئیں۔

## قرآنی نظام میں ضروریاتِ زندگی کو بیچا نہیں جاتا بلکہ سپلائی کیا جاتا ہے' سرمائے پر منافع ربوٰ ی ہے اور ربوٰ خدا اور سول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے

جب اسلامی نظام آ جائے تو اس کے اندر ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا نظام سے متعلق ہو جائے گا صاحب! وہاں یہ بھی سوال نہیں ہوگا کہ اس کی دن بھر کی مزدوری کیا ہے' وہ نظام تو چیزوں کو بنائے گا' وہی لا کر اس کو بیچے گا' بیچے گا کیا لوگوں کی ضرورتوں کے لیے سپلائی کرے گا۔ اور اس کے بعد یہ جتنے بھی بیچنے والے یا سپلائی کرنے والے ہیں' ان کی ضروریات زندگی وہاں سے پوری ہوتی چلی جائیں گی' سوال حل ہو جائے گا۔ وہ جو عَنۡ تَـرَاضٍ مِّـنۡكُمۡ (4:29) ہے' باہمی رضامندی صرف اس بات پہ ہے کہ آپ کے ہاں کا نظام اس شخص کی دن بھر کی محنت کی مزدوری کیا ہونی چاہیے' یہ Determine (مقرر) کر دے گا' بات ختم ہوگئی۔ ''لاگت جمع اس کی مزدوری'' بس یہ ہے مزدوری کا تعین جسے قرآن لَّيۡـسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) کہتا ہے کہ ''کسی انسان کا اپنی محنت سے زائد کچھ لینے کا حق نہیں' جتنا منافع ہے' وہ اس محنت پر ہے''۔ یہ ہے اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (4:29)۔ اور وہ جو سرمائے پر منافع ہے وہ قرآن مجید کی رو سے ربوٰ ہے اور ربوٰ اتنا سنگین جرم ہے کہ قرآن حکیم نے ایک ہی جرم ہے جس کو کہا ہے کہ یہ مملکتِ اسلامیہ کے خلاف بغاوت ہے' خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ سرمائے پر منافع کی کوئی بھی شکل ہو' آپ اس کا کوئی بھی نام رکھ لیں' وہ قرآن مجید کی رو سے ربوٰ ہے' خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

## غلط نظام میں آخرکار ہر ایک کا گلا کٹنے کی باری آ جاتی ہے

دیکھیے! یہ جو تَـرَاضٍ مِّـنۡكُمۡ کا غلط مفہوم ہے' اس کی وضاحت کے لیے ساتھ ہی ایک بات کہی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ تَـرَاضٍ مِّنۡكُمۡ کی کیفیت یہ نہ ہو کہ وَ لَا تَـقۡتُـلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ (4:29) ایک دوسرے کو ذبح کرنا شروع کر دو۔ کیا بات ہے صاحب! آگے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰـهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا (4:29) ہم تمہیں سامانِ ربوبیت دینا چاہتے ہیں' رحمت دینا چاہتے ہیں' نشوونما دینا

چاہتے ہیں' ایسا نظام نہیں دینا چاہتے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے پھرو' بیچنے والا خریدنے والے گاہکوں کا گلا کاٹے' ان کی جیبیں کاٹے اور اس طرح سے تجوریاں بھرے اور جب یہ معاملہ Crises (بحرانوں) پر پہنچے تو پھر یہ انقلابی اٹھیں اور ان تجوریوں والوں کا گلا کاٹیں۔غلط نظام کے اندر ہر ایک کا گلا کٹنے کی باری آجاتی ہے۔کسی کی جلدی آتی ہے' کسی کی دیر میں آتی ہے۔یہ تو تراض منکم (4:29) کی وہ کیفیت ہوگی کہ جس میں کوئی گلا نہیں کاٹے' نہ انفرادی طور پہ بیچنے والا گاہک کا گلا کاٹے' اور نہ اس کے بعد جب یہ سب کچھ جمع کر کے رکھ لے تو جن کی یہ ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہورہیں' وہ ان کا گلا کاٹیں۔

## ایک دوسرے کا گلا کاٹنے والوں کا ذکر اور پھر نتیجہ ہر سو فساد اور تباہ حالی

آگے کہا ہے کہ وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (4:29) اس اصول کے مطابق کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے (53:39) یہ نہیں کہ ایک شخص' محض سرمایہ کے زور پر زیادہ سے زیادہ بٹورنے کی کوشش کرے (2:275)۔اگر ایسا کرو گے تو تم اپنے آپ کو تباہ کرلو گے۔خدا یہ چاہتا ہے کہ تم سب کی نشوونما ہوتی رہے۔لہٰذا جس معاشی نظام میں یہ مقصد فوت ہوجائے' وہ جائز نہیں قرار پاسکتا۔کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (4:30)۔واہ واہ! یہاں دو چیزیں آئیں کہ جو تجارت میں ایک دوسرے کو ذبح کرنے کی بات کرتا ہے عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا (4:30) وہ اپنی حد سے بڑھتا ہے' دوسرا اس میں کمی کرتا ہے۔یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب شام کا وقت ہوجائے اور اس بیچارے خوانچے والے کا تھوڑا سا فالسہ اور انگور' جو بیچ رہا ہے' اسے پتہ ہے کہ رات کو پڑا رہا تو صبح کوڑی کا نہیں رہے گا' اس وقت یہ خریدنے والے کے لیے قیمت خرید سے بھی کم دیتا ہے' بہت سے ایسے خریدار ہیں جو شام کے وقت پھل خریدتے ہیں۔عزیزانِ من! آپ دیکھیے قرآن کریم پہ غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔یعنی جو دو شکلیں ہیں' ان میں عدوانًا یہ سارا دن کرتا ہے کہ جو لینا چاہیے اس سے زیادہ لیتا چلا جاتا ہے' آگے ظلمًا کمی کرنا کہا ہے ' یہ کمی کرنے والا ہے' یہ جو شام کے وقت اس کی اس ضرورت سے فائدہ اٹھاتا ہے کہ اس کا سودا ضائع ہورہا ہے تو یہ جو ذہنیت ہے' اس سے معاشرے کے اندر ایک معاشی بحران پیدا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا (4:30) اس میں فساد کے شعلے بھڑکتے ہیں۔پھر وہ نہ کمی کرنے والے کو چھوڑتا ہے' نہ تجاوز کرنے والے کو چھوڑتا ہے' دونوں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا کرتا ہے۔اس دور سے پہلے تو ان آیات کی یہ کیسے شعلہ فشانیاں ہوتی ہیں' بات سمجھ میں نہیں آتی تھی' اس لیے ان کو ہم نے آخرت پر اٹھا کر رکھ دیا۔آخرت برحق ہے' وہاں کے جہنم اور جنت پر ہمارا ایمان ہے لیکن ہر بات آخرت پہ ہی تو قرآن کریم اٹھا کر نہیں رکھتا۔آج یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو باطل نظام تھے' جو غلط معاشی

نظام ہے' اس کے انجام میں کس طرح سے پوری دنیا جہنم میں پڑ چکی ہے۔قرآنِ کریم نے نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ. الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡئِدَۃِ (104:6-7) کہا ہے کہ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔

## مال و دولت کے دلدادا ؤں کی ذہنی وقلبی کیفیت اور قانونِ مکافاتِ عمل کی پکڑ اور اس کے معیار کا پلڑا

اِن ظُلۡمًا والوں کو تو چھوڑیئے' جنہوں نے عدوانًا سے اتنی اتنی تجوریاں بھری تھیں اور اتنے سرمائے اکٹھے کیے تھے' کوئی ان میں سے شاید ایسا ہو جس کو رات کو سکون کی نیند آ جاتی ہو' یہ محلات اور یہ عیش اور آسائش کے سارے سامان نظر تو آتے ہیں' ان پیکروں کے اندر جو دل ہیں' ان سے پوچھیے کہ کس طرح وہ ہر وقت آگ کے اندر تپتے رہتے ہیں۔اِدھر محتاجوں کے دل میں انتقام کی آگ ہوتی ہے اُدھر اُن کے دل میں عدمِ تحفظ کی آگ ہوتی ہے۔دونوں آگ میں ہوتے ہیں۔کہا ہے کہ فَسَوۡفَ نُصۡلِیۡهِ نَارًا (4:30) وہ معاشرہ بہت جلد تباہیوں کی آگ سے جھلس کر رہ جائے گا اور جو یہاں جہنم کا معاشرہ ہے وہ مرنے کے بعد بھی جہنم کے اندر رہے۔کہا ہے کہ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا (4:30) تمہیں شاید مشکل نظر آئے کہ اتنے بڑے حفاظت کا سامان رکھنے والے معاشرے میں یہ پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے ہیں' ان کو کون اپنی جگہ سے ہلا سکے گا۔کہا کہ تمہیں یہ بات بظاہر اس وقت بڑی مشکل نظر آتی ہے مگر خدا کے قانونِ مکافات کے نزدیک بڑی آسان ہے۔وہ جو اس [1] نے کہا تھا کہ 'مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی' تو غلط نظام کی بنیاد میں ایک خرابی ہوتی ہے' اس جس کے نتائج کے سامنے آنے کے لیے وقت چاہیے' اس کے لیے مہلت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد اس کے گرداب کے اندر آنے کے لیے' قرآن مجید کہتا ہے' کہ کچھ مشکل ہی نہیں پیش آتی۔قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے اس لیے کہ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا (4:30) ایسا ہونا بڑا آسان ہے جو کچھ بھی تم کہتے ہو اس لیے کہ جو نظام' منفعتِ عامہ کے خلاف ہو' اس کی تباہی کے سامان خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے بعد کہا ہے کہ یہ وہی ضَعِیۡفًا کی چیز ہے کہ اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ نُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا (4:31) لگتا یہ ہے کہ جو نظام تم قائم کرتے ہو' اس میں بہت سی چیزیں اصولی ہوتی ہیں' بنیادی ہوتی ہیں' اگر تم ان بنیادی چیزوں کی احتیاط برت لو اور جن چیزوں سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ تو اس کے بعد جو چھوٹی چھوٹی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں' یہ اپنے ایسے تباہ کن اثرات نہیں پیدا کیا کرتیں۔آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کے لیے جو اصول مقرر کیا ہے وہ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ (101:6) اور خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ (101:8) کا ہے۔جھکتا ہوا پلڑا آگے بڑھ سکتا ہے یعنی

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

آ ج کی اصطلاح میں جسے آپ امتحانوں کی بات کہتے ہیں کہ 50% مارکس' پاس مارکس ہوتے ہیں حالانکہ جو باقی 50% ہیں' وہ اس پرچے کی غلطیاں ہیں لیکن اگلی جماعت میں جانے کے لیے انہوں نے معیارِ صلاحیت 50% مقرر کیا ہے' جو 49% ہے وہ آگے نہیں جاسکتا حالانکہ 49% حصہ تک تو اس کے جواب صحیح تھے۔ یہ معیار ہوتا ہے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کا۔ قرآن کریم نے بھی اسی لیے جھکتا ہوا پلڑا اور اٹھتا ہوا پلڑا کہا ہے اور جھکتے ہوئے پلڑے کے متعلق کہا ہے کہ جو کَبَآئِرَ (4:31) ہیں' بنیادی اصولی چیزیں ہیں' جن سے روکا جاتا ہے' ان سے رک جاؤ' چھوٹی چھوٹی چیزیں تباہ کن اثرات پیدا نہیں کیا کرتیں۔

## کوئی انسان فرشتہ نہیں' نہ ہی یہ نیکی کا معیار ہے

دوسری جگہ قرآن مجید نے یہ چیز کہی ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) یہ وہ لوگ ہیں جو کبائر سے اجتناب کرنے والے یعنی جو بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں جن سے انسانی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جائے یا جن سے فواحش پھیلیں۔ ہاں البتہ اگر کبھی کسی کے دل میں یونہی معمولی سی لغزش پیدا ہو جائے اور اس کے بعد وہ اس کی اصلاح کر لے تو ایسی باتیں قابل گرفت نہیں ہوتیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں جو ملامت کے قابل ہوتی ہیں ان پہ گرفت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے حسنِ عمل کے نتائج ایسے وزنی ہوتے ہیں کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے انسان کی حفاظت کر دیتے ہیں۔ یہ انسان کوئی پتھر تو نہیں ہے' عام اصطلاح میں کہیے کہ فرشتہ نہیں ہے' لیکن ہمارے ہاں آپ کو معلوم ہے کہ نیک انسان کی مثال ہی وہ یہ دیتے ہیں کہ جی! وہ انسان نہیں ہے' فرشتہ ہے جناب! قرآن حمید نے کہا ہے کہ فرشتوں میں غلطی یا لغزش کرنے کا امکان ہی نہیں ہوتا' جیسے پتھر میں امکان نہیں ہے' اس کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اختیار و ارادہ سلب کرنے کے بعد کسی کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بڑا مومن ہے' بڑا نیک ہے' وہ تو 'عصمت بی بی از ❶ بیچارگی' والی بات ہے۔ یہ مومن اور نیک ہونے کی بات ہی نہیں ہے۔ نیک تو وہ ہے جو بدی کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود نیک ہے' سر جھکانا اس کے لیے مستحسن ہے جس میں سرفرازی کی ہمت ہے ورنہ 'گدا اگر تواضع کند نیست' اگر سائل اور گداگر آ کر جھکتا ہے وہ تو اس کی خو ہے' جس میں سرکشی اور تکبر کی صلاحیت ہے وہ اگر سجدہ ریزہ ہوتا ہے' اس کا سجدہ وہ ہے جو ماتھے میں اس کے عرش کی تجلیات کو لے آتا ہے' جس میں اٹھنے اور سرکشی کرنے کا امکان ہی نہیں ہے' صلاحیت ہی نہیں ہے وہ تو ہمیشہ جھکا ہی رہے گا صاحب! اس نے اٹھنا کیسے ہے! لہٰذا فرشتہ ہونا کوئی خوبی نہیں ہے۔

---

❶ (مثل) بے سروسامانی کی وجہ سے پارسا بنا رہنا۔

## ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ

خوبی وہی ہے جو حضور ﷺ کی حدیث سامنے لاتی ہے۔ جو چمکتے ہوئے ہیرے کی مانند ہے' عزیزانِ من! یقین مانیے! میں جب بھی اس پہ غور کرتا ہوں' وجد میں آ جاتا ہوں کہ حضور ﷺ کے صحیح ارشاد کسی سند کے محتاج نہیں ہوتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں ہر شخص کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے کہا کہ کیا آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ آپ ﷺ نے کہا کہ ہاں' میرا بھی ابلیس ہے۔ کہنےؓ لگے پھر؟ آپ ﷺ نے کہا کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے۔ ابلیس کے بغیر کوئی فرد ہے ہی نہیں' ابلیس اختیار وارادے کا نام ہے' اپنے اختیار وارادے سے اس نے کہا تھا کہ نہیں! میں سجدہ نہیں کرونگا۔

## ابلیس کے انکار اور آدم کے اقرار میں فرق کی نوعیت

اگلی بات جو پہلے بھی کئی دفعہ آ چکی ہے' ضمناً جب بات آتی ہے تو یوں کہیے بغیر آگے گزرنے کو جی نہیں چاہتا۔ آدم نے بھی معصیت کی تھی۔ اسے کہا گیا تھا کہ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2:35) تم نے باہمی اختلافات نہیں کرنے۔ اس کے بعد ابلیس نے بھی معصیت کی۔ اب اس کے بعد دونوں میں فرق کیا ہے کہ ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود ہوگیا' راندۂ درگاہ ہوگیا۔ آدم سے کہا گیا کہ ہم نے تمہاری توبہ قبول کرلی' کوئی بات نہیں۔ کیا فرق تھا؟ دونوں نے معصیت کی تھی۔ فرق یہ تھا کہ جب ابلیس سے کہا گیا کہ تُو نے یہ کیوں کیا؟ اُس نے کہا کہ یہ میں نے نہیں کیا' تُو نے مجھ سے کرایا ہے۔ کہا کہ کم بخت! اپنے اختیار وارادے کو چھوڑتا ہے۔ اس چیز کے بدلے میں' اس معصیت سے بچنے کے لئے' اپنے آپ کو مجبور قرار دیتا ہے۔ آدم سے پوچھا گیا۔ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) یا بارِالٰہا! ہاں' ہم سے غلطی ہوگئی' میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں۔ جس نے اپنی غلطی کو تسلیم کرلیا اور اس کی ذمہ داری قبول کرلی' اس کے لیے کہا کہ تیرے لیے اصلاح کا دروازہ کھلا ہے اور جس نے کہا کہ میں اس کا ذمہ دار ہی نہیں ہوں' مجھ سے کرایا گیا ہے' اس سے کہا کہ اصلاح کا دروازہ تیرے لیے بند ہے۔ ابلیس وآدم کی اتنی سی بات ہے لیکن جو میں بات کہہ رہا تھا' وہ یہ ہے کہ ابلیس سرکشی کا مجسمہ ہے' اختیار وارادہ رکھنے کا مالک ہے' جس نے کہا تھا کہ میں نہیں کرتا۔ فرشتوں کے متعلق کہا کہ ان میں اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ انکار کریں وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (16:50) جو کچھ کہا جاتا ہے' وہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جس کو نہایت حسین' ذرا سے شوخ انداز میں' اقبالؒ (1877-1938ء) نے ابلیس ہی کی زبان میں یہ کہا ہے کہ

میں کھٹکتا ہُوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہ ھُو' اللہ ھُو' اللہ ھُو!

بالِ جبریل (جبریل وابلیس)

## تصوف میں جذبات کی عظمت اور نعمت کو قبول کرنا تو در کنارا سے تو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا

حضورﷺ نے جو فرمایا ہے کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے تو اس بات نے تصوف کی جڑ کاٹ کر رکھدی۔انہوں نے کہا کہ تصوف میں آپ کے ہاں انسانی جذبات کو فنا کیا جاتا ہے' نفس کو مارا جاتا ہے۔سنو! یہ مر سکتا ہی نہیں:

پری رو تاب مستوری ندارد

چوں دربندی سراز روزن برآرد

اگر دروازہ بند کردو گے تو یہ روشندان سے سر باہر نکال لیں گے۔جب ان جذبات سے نکلنے کے یہ فطری طریقے ہیں تو اگر آپ ان کو بند کریں گے تو Perversion (بدنہادی) پیدا ہو جائے گی' یہ غیر فطری طریقے اختیار کرلیں گے۔

## نبی اکرمﷺ نے اپنے جذبات کو فنا نہیں کیا تھا' انہیں مسلمان کرلیا تھا' اس سے ناہمواریاں تباہ کن اثرات پیدا نہیں کرتیں

یہ بات نہیں ہے کہ آپ ان جذبات کو فنا کر سکتے ہیں۔حضورﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اپنے ابلیس کو فنا کرلیا ہے بلکہ یہ کہا کہ اپنی قوتِ ارادی' اختیار وارادے کی قوت کو' میں نے قوانینِ خداوندی کے تابع کرلیا ہے' بس یہ ہے مومن کی شان۔وہ جو کہا ہے کہ جب تم کَبَـآئِـرَ (4:31) بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہو تو چھوٹی چھوٹی جو لغزشیں ہیں' وہ اپنا اثر نہیں پیدا کرتیں' اس کے معنی یہ ہیں کہ اختیار وارادے کی جو قوتیں آپ کے ہاں ہیں' ان کو قرآن کریم کے محکم بنیادی اصولوں کے تابع رکھیے۔چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں' سہو' لغزشیں ہو جاتی ہیں' وہ تباہ کن اثرات نہیں پیدا کرتیں نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَيِّاٰتِکُمْ (4:31) پھر جو ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کے یہ اثرات مرتب نہیں ہوتے کہ وہ معاشرے کو تباہ کردیں۔

## سیاٰت کے اثرات کو ختم کرنے کا طریق' بیماری اور موت وحیات کا عمل

سوال یہ ہے کہ یہ جو چیز قرآن حمید نے کہی ہے کہ وہ ایسے نقصاں رساں اثرات نہیں پیدا کرتیں' نتیجہ تو ہر عمل پیدا کرتا ہے' وہ بھی اپنے نتائج پیدا کرتی ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہوا؟ اور یہ جن کو آپ سَیِّــــــاٰتِ کہتے ہیں' ان کے اثرات کیسے زائل ہو جاتے ہیں؟ دوسرے مقام پہ قرآن حمید نے اس کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ الْـحَسَـنٰـتِ یُـذْهِـبْـنَ السَّیِّاٰتِ (11:116) یادرکھو! ہمواریاں پیدا کرنے والے' حسن پیدا کرنے والے اعمال کی تم اتنی زیادتی کرو کہ جو درمیان میں ذرا ذرا سی ناہمواریاں پیدا کرنے والی چیزیں ہیں' ان کے جو تعمیری نتائج ہیں' ان کے مقابلے میں ان کے تخریبی نتائج مٹتے جائیں گے۔یہ جو توبہ ہے ''مصلے تے بیٹھ کے استغفراللہ ربی'

سَو دی تسبیح، فیر ہزار دی تسبیح، تے لکھ دی تسبیح پھیرو، (مصلے پہ بیٹھ کر استغفر اللہ کی سوکی، ہزار کی، لاکھ کی تسبیح پھیرو) یہ باتیں الفاظ کے دہرانے کی نہیں ہیں، یہ عملاً کرنے کی ہیں۔ کہا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:116) حسن پیدا کرنے والے جو کام ہیں ان کی بہتات اور کثرت ہو جائے، ان کے نتائج ایسے زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی لغزشوں، کوتاہیوں کی جو چیزیں ہیں، وہ مٹ جاتی ہیں۔ عام طبعی زندگی میں ہمارے اندر ہر آن موت اور حیات کی کشمکش جاری ہوتی ہے، یہ طبعی زندگی کے اصول جاننے والے جانتے ہیں کہ انسان کے اندر Cells (خُلیے) ہر آن کروڑوں کی تعداد میں تلف ہوتے رہتے ہیں، کروڑوں ہی کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، آپ کے ایک سانس میں پتہ نہیں کتنی زہریلی چیزیں آپ کے اندر جاتی ہیں۔ صحت کسے کہتے ہیں؟ قوتِ مدافعت کا اتنا زیادہ ہونا کہ یہ اس قسم کی جو ہلاکت آمیز چیزیں انسان کے اندر جاتی ہیں، وہ ان کے ہلاکت آفریں اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ بیماری کسے کہتے ہیں؟ اس قوت کا کمزور ہو جانا کہ یہ جو ہلاکت آفریں اثرات ہیں، یہ غالب آ جائیں۔ علاج کسے کہتے ہیں؟ اس قوتِ مدافعت کو زیادہ کرتے جانا۔ زندگی کسے کہتے ہیں؟ جب تک وہ قوتِ مدافعت زیادہ رہتی ہے، زندگی ہوتی ہے اور جب وہ اس حد تک کم ہو جاتی ہے کہ کسی طرح سے بھی اس کو بڑھایا نہیں جا سکتا تو اسے موت کہتے ہیں۔

## انسانوں سے لے کر قوموں کی موت و حیات کے لیے یہی پیمانہ ہے

یہ ہے قرآن حمید نے جو اصول دیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:116) جب آپ معاشرہ صحیح اصولوں پر قائم کریں گے، اس میں چھوٹی چھوٹی سی کوتاہیاں ہونگی، لغزشیں ہونگی، غلطیاں ہونگی، وہ تباہ کن اثرات پیدا نہیں کریں گی۔ اس نے معاشرے کا اصول یہ بتایا کہ یہ کرو گے تو وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (4:31) پھر ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں رزقِ کریم ملے گا۔ "كَرِيْمًا" عربی زبان میں بڑا ہی جامع لفظ ہے، اس میں خوشگواریوں کی بہتات بھی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ جسے آپ باعزت روٹی کہتے ہیں وہ بھی ملتی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے کہ ملے اور عزت کی ملے، اسی لیے قرآن کریم نے رزق کریم کہا ہے، یہاں کریمًا کا لفظ آیا ہے۔ روٹی تو ملتی ہے لیکن روٹی اور روٹی میں فرق ہوتا ہے۔ کبھی جہنم کے موضوع پہ آؤنگا تو پھر میں عرض کرونگا کہ قرآن کریم نے کیا بتایا ہے؟ یہ کہ دوسروں کے پھینکے ہوئے ٹکڑے اہلِ جہنم کی خوراک بتائی ہے۔

## باہمی صلاحیتوں کے فرق کے علاوہ انسانی لحاظ سے مرد اور عورت میں فرق نہیں کیا جا سکتا

اس کے بعد پھر ایک اصول آ گیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:32)۔ پیدائش کے اعتبار سے پہلے تو یہ ہے کہ مختلف افراد میں صلاحیتوں کا کچھ فرق ہوتا ہے، اور دوسرا پھر یہ ہے کہ مرد اور عورت میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک

کے مقابلے میں دوسرے کے اندر کوئی نقص ہے۔ عورتوں میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذمہ آگے چل کر زندگی کے ایسے فرائض عائد ہونے ہیں جو مردوں میں نہیں۔ ان فرائض کے اعتبار سے بعض قسم کی صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہوتی ہیں اور بعض قسم کی صلاحیتیں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ہم نے مردوں کو افضل پیدا کیا ہے' عورتوں کو ان کے مقابلے میں ناقص پیدا کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں آپ دیکھیں کہ ان کا ذکر یہ کہہ کر کیا ہے کہ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض مرد بعض معاملات میں عورت سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض میں عورت ان مردوں سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ جو فرائض عورت کے ذمہ دیئے گئے ہیں' ان کی بجا آوری کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے' آپ دیکھیے کہ ایک بچے کی پرورش کے لیے اتنا Passion (جذبہ)' اتنی سہار (Tolerance)' اتنا ایثار درکار ہے۔ وہ سارا دن کام کرتی ہے' اس کے ساتھ رات بھر جاگتی ہے' سردی کے موسم میں وہ پیشاب کرتا ہے تو اُس گیلی جگہ سے اسے خشک جگہ پر لٹاتی ہے اور خود اس گیلی جگہ پر سوتی ہے۔ آپ اس دور کے سائیکولوجی کے انکشافات دیکھیں مثلاً آپ خاص طور پہ الفرڈ ایڈلر (1870-1937ء) کے نظریات دیکھیں تو وہ بتاتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں کیریکٹر کے اعتبار سے بچے نے جو کچھ بننا ہوتا ہے' وہ تین سال کی عمر تک بن جاتا ہے' جب ماں جھولا جھلا رہی ہوتی ہے۔ یہ بڑی صلاحیتیں ہیں صاحب! یہ ہے فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ (4:32) ان فطرتی فرائض کے لحاظ سے بعض باتوں میں مَردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔

## آخر مردوں کے نزدیک عورت کو کیوں محکوم تصور کیا جاتا ہے؟

عزیزانِ من! اب وہ سوال آیا کہ مرد نے عورت کو اس لیے ناقص و محکوم مقام پہ رکھا ہے کہ اس فطری فرائض کی سرانجام دہی میں بہت سا وقت ایسا آتا ہے جس میں وہ رزق نہیں کما سکتی' وہ روٹی نہیں کما سکتی' وہ محتاج ہو جاتی ہے' اس کا خاصا وقت حمل سے لے کر بچے کی اس وقت تک کی پرورش اور تربیت میں لگ جاتا ہے جب تک وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ مرد کو ان وظائفِ حیات سے مبّرا رکھا گیا ہے کہ وہ کام کاج کرے۔ بات تو تقسیم کار کی اتنی سی تھی لیکن انسان جب حیوانی سطح پہ ہوتا ہے تو جو بھی اس کے رزق کا محتاج ہو جائے' وہ اس کا محکوم ہو جاتا ہے۔ یوں یہ محکوم بنائی گئیں۔

ایک دوسری بات یہ ہوئی کہ اس غلط تصور کی بنا پر کہ یہ ناقص العقل ہوتی ہے اس کو زندگی کے کسی معاملے میں دخل نہیں لینے دیا گیا' اس کو جاہل رکھا گیا۔ اب جو دس بیس' سو پچاس' پشتوں سے جاہل ہی رکھتے چلے جائیں گے تو اس کے بعد وہ جاہل نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا! اس کے بعد یہ کہا گیا کہ 'عورتیں جاہل ہوتی ہیں' یہ نہیں کہا کہ ہم نے عورتوں کو جاہل رکھا ہے۔ اب ان کا دور آیا ہے۔ آپ ذرا

نتائج Examination (امتحان) کی لسٹیں اٹھا کر دیکھیے کس طرح ان لڑکیوں نے بدلا لینا شروع کیا ہے کہ اوپر کی ساری پوزیشن ان کی آ رہی ہیں۔ یہ جاہل تو نہیں تھیں' یہ ناقص العقل نہیں تھیں 'می نہ سزد خدائے را' کہ پیدائشاً پوری کی پوری ایک جنس کو ایسا پیدا کرتا چلا جائے اور انسان کو یہ کہے کہ انسان نے ایسا کیا ہے۔ اس کے بعد یہ قانون بنائے کہ عورت جائیداد کی' روپے پیسے کی' مالک ہی نہیں ہوسکتی اور یہ بھی کہ عورت کمائی نہیں کر سکتی۔ اس غلط تصور کے ازالے کے لیئے' آپ اس بیک گراؤنڈ میں' قرآن حمید کی ان آیات کو دیکھیے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہا ہے کہ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (4:32) مرد اور عورت دونوں اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔

## قرآنی احکامات کے برعکس عورت کی معاشی اور تمدنی حیثیت

عزیزانِ من! ایک تو یہی غلط بات ہے کہ جو اکتساب یا کمائی ہے' یہ صرف مرد ہی کرسکتا ہے' عورت نہیں کر سکتی۔ اصل یہ ہے کہ اگر اس کے پاس فارغ وقت ہے' تو وہ اس فارغ وقت میں کام کاج کر سکتی ہے۔ پھر دوسری غلط بات یہ ہے کہ اگر وہ کرے بھی تو صاحب! وہ اپنی پراپرٹی کی مالکہ نہیں ہوسکتی۔ یورپ میں' جو اتنا مہذب ملک ہے' کل تک عورت اپنے نام کی پراپرٹی رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ نام تو خیر وہ آج بھی اپنا نہیں رکھ سکتی۔ بیٹی ہوتی ہے تو وہ مِس فاؤل (Miss Foule) ہوتی ہے' بیوی بنتی ہے تو پھر وہ مسز آدم Mrs.Adam ہوتی ہے لیکن پراپرٹی رکھنے کا انہوں نے ابھی کل حق دیا ہے۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن حمید کہتا ہے کہ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (4:32) جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے اور جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ اور کہا ہے کہ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (4:32) خدا سے اس کی توفیق طلب کیا کرو کہ وہ زیادہ سے زیادہ رزق حاصل کرنے کی صلاحیتیں دے۔ عورت کو بھی کہا گیا ہے اور مرد کو بھی کہا گیا ہے۔

برادرانِ عزیز! آج عورت کے لیے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ صاحب! اس کی تو دنیا ہی گھر کی چار دیواری ہے' یہ اس سے باہر آ ہی نہیں سکتی' یہ کسی معاملے میں حصہ ہی نہیں لے سکتی' یہ زندگی کے تمدنی معاشی معاشرتی معاملات میں رائے تک نہیں دے سکتی' وراثت سے حصہ نہیں لے سکتی' یہ اسلام کا تقاضا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ضرورت پیش آئی تو عورت کے متعلق کہا کہ یہ صدرِ مملکت[1] بھی بن سکتی ہے۔ کہا ہے کہ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (4:32) انہیں چاہیے کہ اللہ سے زیادہ سے زیادہ فضل طلب کرتی رہیں یعنی معاشی

---

1. یہ اس طرف اشارہ ہے جب 1965ء میں محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ (1967-1893ء) کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (1974-1907ء) کے مقابلے میں پانچ سیاسی جماعتوں کی مشترکہ امیدوار کی حیثیت سے صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے کھڑا کیا تھا۔

اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (4:32) ہم جانتے ہیں کہ کس میں کتنی صلاحیتیں ہیں' اور وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ تو ہے اکتسابی طور پہ۔

اب اگلا غلط تصور یہ دیا گیا کہ وراثت میں تو عورت کا حق ہوتا ہی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے اس غلط بات کی جڑ کاٹتے ہوئے ساتھ ہی کہا ہے کہ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ (4:33) مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوقِ ملکیت کا فطری تقاضا ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو' صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں ہم نے اس کے لیے حصے دار مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ وراثت کے احکام ہیں جو پہلے آ چکے ہوئے ہیں [1]۔ اسی سلسلہ میں یہ کہا ہے کہ جو کچھ بھی ان کے والدین یا اقربا چھوڑیں' ہم نے انہیں اس ترکے کے وارث بنایا ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک عہد و پیماں کے رشتوں میں عورت کو وراثت کا حق

آگے کہا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ (4:33) ۔کیا بات کہی ہے! باپ کے ترکے میں سے اولاد کو ملنا تو ہر جگہ مسلم ہے۔ چیز تو یہی تھی کہ خاوند کے ترکے میں سے بیوی کو کچھ نہیں دیتے تھے' باپ کے ترکے میں سے لڑکی کو نہیں دیتے تھے' بھائی کے ترکے میں سے بہن کو نہیں دیتے تھے۔ قرآن حکیم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ وراثت کی تقسیم کے وقت یہ جو عقدی رشتے ہیں' آپس میں تم جو عہد و پیمان سے رشتے قائم کرتے ہو' جن میں یہ بیوی کا رشتہ تو عہد و پیمان کا رشتہ ہوتا ہے' نسبی تو نہیں ہوتا' ہاں تو یہ جو عہد و پیمان سے تم رشتے مقرر کرتے ہو' پہلے ان کا حق دو اور اس میں سے جو بچے پھر نسبی رشتے کو دو۔ جس جنس کو محروم تصور کیا جاتا تھا' اس کے متعلق یہ بات ہے۔ اسی میں وصیت بھی آ جاتی ہے۔ یہ عقدی رشتہ میں نے عرض کیا ہے۔ قرآن حکیم نے نَصِیْبَهُمْ (4:33) کہا ہے: اور ان کا حصہ خدا نے مقرر کر دیا۔ کہا ہے کہ پہلے ان کا یہ حصہ ادا کرو اور ادا کرتے وقت ڈنڈی نہ ماری جائے۔ اس طرح بیوہ کو اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ سے سب سے پہلے حصہ ملے گا۔ اور آگے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا (4:33) اسے اچھی طرح سے یاد رکھو کہ ایک ایک چیز ہماری نگاہ کے اندر ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم' اس مسئلہ کو' جس نے انسانیت کے سر میں اتنا درد پیدا کر رکھا تھا' کس خوش اسلوبی سے حل کرتا چلا جا رہا ہے! کیا مقام دیتا چلا جا رہا ہے! یہ بھی نہیں ہے کہ ان عورتوں کو وہ مرد ہی بناتا چلا جا رہا ہے کہ وہ جتنے نسائیت کے فرائض ہیں' وہی سارے کے سارے ترک ہونے شروع ہو جائیں' یہ بھی نہیں کر رہا اور اس کے ساتھ یہ بھی نہیں ہے کہ ان کو جاہل اور ناقص العقل بنا رہا ہے اور انہیں مرد کے تابع فرمان اور محکوم بھی کرتا چلا جائے۔ خدا انہیں مساوات کا ایک مقام دیتا ہے۔

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اس کتاب کا پانچواں باب (آیات 11 تا 14)

## لفظ فضلہ یا افضل کا لغوی مفہوم

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2:228) جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں' اتنے ان کے حقوق بھی ہیں۔ قرآن انہیں اپنی کمائی کا مالک قرار دیتا ہے اور وراثت میں حصہ دار قرار دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ وہ صلاحیتیں جو ان میں ہیں' وہ تم میں نہیں ہیں لہٰذا ان صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت مرد سے افضل ہے' ان صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ اُس سے افضل ہے۔ افضل کے معنی کوئی Superiority (تفوّق' برتری' فائق ہونے) والی بات نہیں ہے' کہتا ہے کہ اِس میں وہ زیادہ ہیں' اُس میں وہ زیادہ ہیں' بات یہ آ گئی ہے۔ فَضَّلَہٖ (4:32) کے معنی ''کسی شے کا زیادہ ہونا ہوتا ہے''۔ عزیزانِ من! جوں جوں انسان ان الفاظ میں جائے' جوں جوں انسانی علم انکشافات کرتا چلا جائے' قرآن کریم کے حقائق نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ جو کہا ہے کہ مرد میں یہ صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں' عورت میں وہ زیادہ ہوتی ہیں' اس کے یہ معنی ہیں کہ مرد میں اگر جسے مردانگی کی صلاحیتیں کہتے ہیں' زیادہ ہوتی ہیں تو دوسری طرف عورتوں میں دوسری صلاحیتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔

## انسانی بچہ دو جرثوموں کا مرکب ہوتا ہے

قرآنِ کریم عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ پوچھیے آج کے ڈاکٹروں سے یا بائیالوجی کے ماہرین سے کہ جو بچہ بنتا ہے یہ مرد اور عورت دونوں کے جرثومۂ حیات سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ جو دو جرثومے ہیں' وہ مرکب ہوتے ہیں۔ اسے استقرارِ حمل کہتے ہیں۔ تنہا ایک جرثومے سے نہیں' دو جرثومے مرکب ہوتے ہیں۔ ان دو جرثوموں میں اگر Male (نر) کا جرثومہ' مرد کا جرثومہ' زیادہ توانا ہے تو اس سے لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ یہ توانا ہے تو دوسرے جرثومے کا بھی تو اس کے اندر حصہ آیا ہوا ہے اور اگر عورت کے جرثومے کا حصہ' زیادہ توانا ہوتا ہے تو لڑکی ہوتی ہے۔ لڑکی ہوتی ہے تو مرد کے جرثومے کا بھی تو حصہ آیا ہوا ہوتا ہے۔ نہ لڑکا یکسر مرد ہوتا ہے' نہ لڑکی یکسر لڑکی ہوتی ہے' جسے آپ Male (نر) کہتے ہیں اس میں مرد یا Male (نر) کے جو جوہر ہوتے ہیں' وہ زیادہ ہوتے ہیں' عورت کے جوہر اس میں کم ہوتے ہیں اور جسے آپ عورت کہتے ہیں اس کے اندر عورت کے جوہر زیادہ ہوتے ہیں' مرد کے جوہر کم ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:32) ایک میں ایک قسم کے جوہر زیادہ ہوتے ہیں' دوسرے جوہر کم ہوتے ہیں' دوسرے میں دوسری قسم کے جوہر زیادہ ہوتے ہیں' اس کے وہ جوہر کم ہوتے ہیں۔ نہ تنہا مرد اکیلا مرد ہوتا ہے' اس کے اندر عورت مضمر ہوتی ہے' نہ عورت تنہا عورت ہوتی ہے اس کے اندر مرد مضمر ہوتا ہے۔ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:32) قرآن کریم نے کہا ہے تم جو ایک فرد ہو' تو ایک دوسرے کا جزو ہو۔ کیا باتیں ہیں قرآن مجید کی! کس طرح سے باتیں کر جاتا ہے! کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ

شَهِيْـــــدًا (4:33) ہر بات کے ہم نگران ہیں' جانتے ہیں کہ کیا چیز کہاں ہونی چاہیے' کیسی ہونی چاہیے' ان کے مقام کیا ہونے چاہئیں۔ یہ مقامات ہیں' عزیزانِ من! جو قرآن کریم نے متعین کیے ہیں۔

## قرآنِ حکیم کی اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کی آیت کا مروجہ ترجمہ

اس کے بعد ایک آیت آتی ہے جو بڑی ہی کشمکش کی ہے۔ سارا قرآن کریم چھوڑ چھاڑ کر اس آیت کو سامنے لایا جاتا ہے۔ آیت تو میں ابھی پیش کر دیتا ہوں اگرچہ ہم نے یہ درس دیر میں شروع کیا تھا لیکن وقت ہو گیا ہے اور یہ جو بات سامنے آ رہی ہے اس کے لیے تو شاید ایک پورا درس بھی کافی نہیں ہوگا۔ اب بات چھیڑ دیتا ہوں' مکمل آگے چل کر کریں گے۔ اور وہ آیت ہے کہ اَلـرِّجَـالُ قَوّٰمُوْنَ عَـلَى النِّسَآءِ (4:34) ''نسو جی! پرویز صاحب! کتھے جاندے او تسی'' (بھاگو جی! اب پرویز صاحب! دیکھیں کہ کہاں تک چلے جاتے ہو!) ایسا قطعاً نہیں کہ قرآن کریم پرویز صاحب نے بنایا ہوا ہے! کہا یہ ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) اور جب ترجمہ اٹھاؤ تو اس میں لکھا ہوا ہوگا کہ 'مرد عورتوں پر حاکم ہیں'۔ انہوں نے بھی تھوڑا سا کرم کیا ہوتا ہے۔ دوسرا ترجمہ ہوتا ہے کہ 'مرد عورتوں پر داروغہ ❶ (Darogah) مقرر کیے ہوئے ہیں' ''دسو جی ہن پرویز صاحب!'' (اب بتائیے جی! پرویز صاحب!)۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اَلـرِّجَـالُ قَـوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:34) مرد عورتوں پر داروغہ مقرر کیے ہوئے ہیں اس لیے کہ خدا نے ایک کو دوسرے پر غالب قائم کیا ہے' داروغہ کیا ہے؟ یہ کیوں داروغہ ہے؟ اس لیے کہ وَّبِـمَـآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (4:34) مال خرچ کرتے ہیں' عام بازاری محاورے میں بھی ''مال کھوانے آں'' (مال کھلاتے ہیں): بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (4:34) اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر صرف کرتے ہیں۔ سوچیے ہر ترجمے میں آپ کو یہ چیز ملے گی۔

## موجودہ روایات' تراجم اور تفسیروں میں مقامِ عورت کی عکاسی کی ایک جھلک

آگے کہا ہے کہ فَـالـصّٰـلِـحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34) عورت تو صالحہ عورت ہے ہی' وہ اطاعت شعار ہے' تابع فرمان ہے' جھکی ہوئی ہے' سامنے اطاعت شعار ہونا تو ایک طرف رہا' وہ تو غیب میں بھی عصمت کی حفاظت کرنے والی ہے یعنی کام ہی اس کا یہ ہے۔ جس چیز کو خدا نے کہہ دیا کہ تم حفاظت کرو' اس کا کام ہی یہی ہے کہ یہ عورت کی عصمت' جو مرد کی شے ہے'

---

❶ Darogah: The Persian version of a 'Sub-Inspector of Police or Thanedar'. During Mughal times (1526-1857A.D) he was a multi-purpose officer, primarily incharge for peace and security in a specified area (Ref. Shah, Giriraj: History of Organisation of Indian Police, Anmol Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999, P.451).

کی حفاظت کرے' اپنے لیے نہیں مرد کے لیے اس کی حفاظت ضروری ہے۔اور صالحات وہ ہیں جو قٰنِتٰتٌ ہیں' حٰفِظٰتٌ ہیں ' لِّلْغَیْبِ ہیں۔یہ ہے عورت کی پوزیشن۔میں نے کہا ہے کہ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے اور جا کر دیکھ لیجیے گا' یہی لکھا ہے۔کہا ہے کہ وَ الّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ (4:34) اگر اس معاملے میں کوئی عورت ذرا سا بھی سر اٹھائے تو فَعِظُوۡھُنَّ (4:34) پہلے تو یہ بات ہے کہ اسے سمجھاؤ ''بی بی تینوں شرافت نال کہناں باز آ جا'' (بی بی! تمہیں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ باز آ جاؤ)۔وَ اھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ (4:34) باز نہ آئے تو کمرے سے الگ کر دو' پھر بھی باز نہ آئے تو وَ اضۡرِبُوۡھُنَّ (4:34) چھینٹا دو' ان کو مارو۔کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے یہی ہے۔کہا ہے کہ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡھِنَّ سَبِیۡلًا (4:34) اور جب وہ اطاعت شعار ہو جائیں تو پھر کہو کہ اچھا چلو جانے دو۔اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا (4:34) تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ کتنا بڑا اور کتنا بڑا زبردست ہے! ''تسی تے اللہ دے چھوٹے بھراہو'' (تم تو گویا اللہ کے چھوٹے بھائی ہو)۔

عزیزانِ من! آپ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجئے' آپ کو اس میں یہی ملے گا۔یہ ترجمہ ہے' پھر تفسیریں اٹھا کر دیکھیے سبحان اللہ!! ایسی ایسی روایتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ سینہ پھٹ جاتا ہے۔میں نے کہا ہے کہ اس مقام پہ میں آتا ہوں تو مجھ سے نہیں رہا جاتا' دل خون کے آنسو روتا ہے۔تم جو جی میں آئے کہہ دو' اپنی کہی ہوئی بات کی ذمہ داری تمہاری اپنی ہوگی' مگر یہاں تو وہ بات منسوب کی جاتی ہے اس ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف' اس سے سینہ شق ہو جاتا ہے۔اس کے لیے ایسی ایسی روایتیں اور ایسی ایسی حدیثیں کتابوں میں در آئی ہیں۔یہی ہے وہ آیت جس کی تفسیر میں آپ کے ورقوں کے ورقے بھرے ہوئے ہیں کہ اسے مارو' یہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے' پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے' ٹیڑھی پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو کبھی سیدھی نہیں ہوگی' ٹوٹ جائے گی ''تے مارن دا فائدہ کی ہیگا' جے سیدھی نئیں ہونی'' (تو پھر مارنے پیٹنے کا کیا فائدہ ہے جب یہ سیدھی ہی نہیں ہونی ہے)۔

ان منسوب شدہ روایات میں سے چند ایک یہ ہیں کہ معراج شریف میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی' خاوند کا ایک حکم نہ مانا ہوا ہو تو ساری نیکیاں برباد ہیں' حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے شرک کا ڈر نہ ہوتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کیا کرو۔''خداوندِ مجازی تے ساڈے ہن وی کیندے نیں'' (مجازی خداوند تو ہمارے ہاں اب بھی کہتے ہیں)۔اور اگر وہ نہ بھی کہیں' آپ دیکھیے کہ زبانوں کے اندر الفاظ کیسے ہیں: ''میرا میاں آیا سی' تے پتہ اے اک اللہ میاں ہوندا اے' او میاں تے کوٹھے توں نئیں اتردا' آ میرے گھر والا میاں روز آوندا اے' مجازی خدا'' (میرا میاں آیا تھا۔آپ کو پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو میاں ہوتا ہے وہ تو آسمان سے نہیں اترتا مگر یہ میاں (شوہر) میرے گھر والا' میرا مجازی خدا' روز آتا ہے)۔

## اولیا اللہ بننے کے سلسلہ میں رابعہ بصریؒ سے منسوب ایک واقعہ

اطاعت کی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے ہاں کے تصور میں اللہ کے جتنے مقرب ہیں' وہ تمام کے تمام مرد ہیں' اس میں ایک ''پتہ نہیں' کس طراں نال دال دا دانہ آ گیا سسری اچ'' (معلوم نہیں کہ کس طرح دال کا دانہ سسری میں آ گیا) یعنی رابعہ بصریؒ کا نام آتا ہے جو کہ اولیا اللہ کے قصوں میں ہے ''اولیائن ہوگئی نا پنجابی اچ'' (پنجابی میں یوں کہیے کہ اولیا ہوگئی)۔اور معلوم ہے کہ ان کو اولیا بننے کے لیے کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں! میں یہ عرض کردوں کہ یہ جو اولیا ہے' یہ واحد کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن یہاں 'نظام الدین اولیا ہیں ''ورنہ تے اولیا جمع ہے ولی دی'' (ورنہ اولیا تو ولی کی جمع ہے)۔کسی مرد کے اولیا بننے کے لیے تو صاحب! ساری عمر چلّے کاٹنے پڑتے ہیں' غاروں میں جانا پڑتا ہے' ایک ٹانگ پہ کھڑا رہنا پڑتا ہے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ رابعہ بصریؒ کیسے اولیا بن گئیں؟

سنیے عزیزانِ من! کہ رابعہ بصریؒ کیسے اولیا اللہ بنی۔سردی کی ایک رات تھی' خاوند نے پانی کے لیے آواز دی' انہوں نے پانی کا کٹورہ بھرا' ہاتھ پہ رکھا' سرہانے جا کر کھڑی ہوگئیں' میاں صاحب کو نیند آ گئی' سو گئے' اب یہ چیز کہ ان کو آواز دے کر کہنا کہ پانی پی لیجیے' تو بڑی گستاخی ہے' وہ ساری رات کٹورہ ہاتھ میں لے کر کھڑی رہی' پانی یخ ہوگیا' ہتھیلی سن ہوگئی' صبح کے وقت جب بیدار ہوئے تو انہوں نے یہ دیکھا۔اس پر کہا کہ تم یوں کھڑی رہیں؟ کہنے لگی کہ آپ نے کہا تھا' اطاعت گزار ہوں' کس طرح سے سرکشی اختیار کرسکتی تھی' انہوں نے پانی لیا' اللہ کے ہاں سے حکم آیا' آپ اولیا کی صف میں ہوگئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنی گہری سازشیں ہیں! یہ اس لیے (4:34) میں کہا ہے کہ جب وہ تمہاری اطاعت کرلیں تو پھر جانے دو' کچھ نہ کہو کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا (4:34) یاد رکھو! نظامِ خداوندی میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ قانون سے سرکشی برتنے والوں کو سزا دے سکے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں اتنی بلند نگہی بھی ہوتی ہے کہ سرکشی چھوڑ دینے والوں کے خلاف انتقام کے جذبات نہ ابھریں۔ان سے درگزر کرلیا کرو۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جو پیش کی جاتی ہے' یہ ہیں وہ ترجمے' یہ ہیں ان کی تفسیریں اور اس کے بعد پھر کہا جاتا ہے کہ لائیے صاحب! اب پرویز صاحب کو سامنے' وہ عورتوں کے حقوق کے بہت بڑے نمائندے اور وکیل آ گئے ہیں۔اب **الرجال قوامون علی النسآء** (4:34) کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔میں نے عرض کیا ہے کہ اب دس بج گئے ہیں' درس کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے اور یہ بات بڑی اہم ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا۔

## مقامِ عورت تو قرآن کریم کی نگاہ میں بہت بلند ہے

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں' میری بیٹیو بہنو! دیکھو ''آ مارکھان نوں تہانوں جیہڑی چیز ہے' او کنّی دلچسپ ہیگی اے!'' (یہ تمہیں مارنے کے لیے جو چیز ہے وہ کتنی دل چسپ ہے!) میں یہ کہونگا کہ قرآن کریم کا شکر کرو جب حکم سامنے آئے گا تو پھر تو انہیں گالی بھی نہیں دی جا سکے گی' پھر تو ماتھے کے اوپر شکن بھی نہیں لایا جا سکے گا۔ کہا ہے کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) عورت کے دل میں اگر ذرا سی بھی تمہاری طرف سے نفرت کی بات پیدا ہوگئی تو وہ عورت تمہارے اوپر حرام ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم یہ کہتا ہے۔ اس لیے ''آٹھ دن ہور موج لے لو' {آٹھ دن مزید موج اڑاؤ' (اس لیے کہ درس آٹھویں دن آئے گا)}۔ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں برادران عزیز! یہ بات ایسی ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے' یہ پتہ لگنا چاہیے کہ یہ ترجمے کیوں ایسے ہوئے' ترجمہ کرنے والے جاہل تو نہیں تھے معاذ اللہ' کہا جاتا ہے کہ صاحب! وہ تو تم سے زیادہ عربی جانتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب خود یہ ترجمہ کرتے ہیں' جن کی مادری زبان عربی ہے' پہلے دن سے جو تفسیر آپ کے ہاں آتی ہے' اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ قَوّٰمُوْنَ کا مفہوم مسیطرین❶ (داروغہ) اور متسلّطین ❷ (غلبہ و تسلط کے مالک) ہے۔ یہ چیزیں عربی زبان کے اندر موجود ہیں' یہ روایات اور احادیث میں موجود ہیں' یہ چیزیں تفاسیر میں موجود ہیں۔ اب اس کے بعد تم اس کے متعلق اور کیا کہتے ہو!

میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ ان چیزوں کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے۔ اب میں یہ چاہوں گا کہ آپ کو عربی زبان کی رو سے' ان روایات اور احادیث کو سامنے لا کر' ان کی تنقید کی رو سے' ان تفسیروں کے متعلق عرض کروں کہ وہ کیا چیزیں ہیں' کیسے پیدا ہوئیں' پھر قرآنِ خالص کی رو سے میں عرض کرونگا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اچھا ہے کہ ہم ان چیزوں کو اطمینان سے لیں اس لیے ہم اسے آئندہ درس میں لیں گے۔ شکریہ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

---

❶ اور ❷ تفسیر کشاف کے مصنف علامہ زمخشری نے یا تفسیر جلالین میں التزام یہ کیا گیا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم کو قرآن کریم کا صحیح مفہوم سمجھا۔ مثلاً زمخشری نے تفسیر کشاف میں ''قوامون'' کا مرادف ''مسیطرین'' یعنی داروغے لکھا اور تفسیر جلالین میں اس کا مرادف ''مسلّطین'' یعنی عورتوں پر مسلّط لکھا۔ اب ہمارے مترجمین نے ''قوّامون کا مفہوم مسیطرین اور مسلّطین'' لے لیا۔

# گیارھواں باب: **سورۃ النسآء** (1) (آیت 34)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 34 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:34)۔

## قرآنی تعلیم کے برعکس (4:34) کا وہ ترجمہ جو ہر جگہ ہزار سال سے مستند سمجھا جاتا ہے

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ بڑی اہم آیت سامنے آ رہی ہے۔ اہم اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے جو معنی کیے جاتے ہیں' اس کی رو سے جو پوزیشن سامنے آتی ہے' وہ قرآنِ کریم کی اس موضوع پر ساری تعلیم کے خلاف ہے لیکن ان معنی اور اس مفہوم کو ایسا مستند اور متفق علیہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ کوئی ہٹ سکتا ہے' نہ سوچ سکتا ہے' نہ کوئی اور مفہوم لے سکتا ہے اور یہ چیز ہمارے ہاں ہزار برس سے چلی آ رہی ہے۔ آیت یہ ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)۔ اب جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' کوئی سا ترجمہ اٹھا کر دیکھیے' اس میں یہ لکھا ملے گا کہ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں بلکہ داروغہ (Darogah) ہیں'' کیونکہ اس قوامون کے لیے عربی زبان کی تفاسیر میں دو الفاظ متسلّطین اور مسیطرین [1] ملتے ہیں اس پر ہمارے مترجمین نے ترجمہ کر دیا کہ مرد عورتوں پر حاکم بھی ہیں اور داروغہ بھی یعنی 'مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ قسم کے حاکم ہیں'۔ آگے کہا ہے کہ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:34) اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ میں آپ کو وہ ترجمہ دے رہا ہوں جو آپ کو قرآنِ کریم کے ہر ترجمہ میں ملے گا 'مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں' اس لیے کہ خدا نے انہیں عورتوں پر فضیلت دی ہے' ان کو عورتوں سے افضل بنایا ہے اور اس لیے کہ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (4:34) وہ ان کے اوپر اپنا مال خرچ کرتے ہیں لہٰذا فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

---

[1] تفسیر کشاف کے مصنف علامہ زمخشری نے قوامون کے لیے مرادف مسیطرین یعنی داروغے اور تفسیر جلالین میں اس کے لیے مرادف متسلّطین یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط کے مالک مسلّط لکھے ہیں۔ اس سے ہمارے مترجمین نے قوامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلّطین بتایا۔

**بِـمَا حَـفِظَ اللّٰهُ** (4:34) نیک عورتیں وہ ہیں جو خاوندوں کی اطاعت گزار ہیں اور جس چیز کا خدا نے انہیں حفاظت کرنے کے لیے کہا ہے' وہ شوہروں کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اور پھر آگے کہا ہے کہ **وَ الّٰتِیۡ تَـخَـافُـوۡنَ نُشُـوۡزَهُـنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَ اهۡـجُـرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَ اضۡرِبُوۡهُنَّ** (4:34) اور اگر تم ان کی طرف سے دیکھو کہ وہ ذرا بھی سرکشی کرتی ہیں تو ان کو پہلے سمجھاؤ بجھاؤ پھر ان کو خوابگاہوں سے الگ کردو اور پھر ان کو مارو پیٹو۔ **فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا** (4:34) ہاں جب وہ اطاعت اختیار کرلیں تو بس پھر اس کے بعد کچھ نہیں کہنا۔ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا** (4:34) بے شک اللہ بہت ہی بالادست اور احکم الحاکمین ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جہاں سے درس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ کوئی سا ترجمہ اٹھائیے' یہی ترجمہ ملے گا اور کوئی سی تفسیر لیجیے وہ اسی کی تشریح میں آپ کو ملے گی۔ آپ کو محراب و منبر سے دہراتے ہوئے ملیں گے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں وہ اسے کہیں اور نہیں مل سکتے' جتنا بلند مرتبہ اس نے عطا کیا ہے' نہ اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں اس کی مثال ملتی ہے' نہ اس کے بعد آپ کو اس کی مثال ملے گی اور بڑے فخر سے اس چیز کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک متفق علیہ چیز ہے' ہر جگہ آپ انہیں یہ کہتے ہوئے سنیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسی عورت کے متعلق یہ چیز بھی ان کے ہاں متفق علیہ ہے کہ مرد ان پر داروغہ مقرر ہوئے ہیں' حاکم مقرر ہوئے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان میں ذرا سی سرکشی نظر آئے' انہیں سمجھاؤ بجھاؤ۔ یہ بات نہ سُنیں تو مارو پیٹو۔ یہ بھی اس کے ساتھ ہی کہا جا رہا ہے۔ اب وہ جو اسلام نے حقوق دیئے ہیں' جو بلند مرتبہ دیا ہے' ایک طرف اس دعوے کو سامنے رکھیے' دوسری طرف قرآن حمید کی یہ آیت ہے' یہ کوئی مسئلہ مسائل والی بات نہیں' جسے کہتے ہیں کہ کوئی ہدیٰ اور قــــــکی 09
بات نہیں ہے' یہ قرآن حمید کی ایک آیت ہے اور اس کا یہ ترجمہ لیا جاتا ہے۔

## یورپ میں کیے گئے تراجم بھی ہمارے تراجم کی ہی عکاسی کرتے ہیں: یہ بات سمجھنے کی ہے

جب آپ کے ہاں یہ ترجمہ کیا جاتا ہے تو پھر یورپ میں جتنے ترجمے ہوئے ہیں' ان میں بھی یہی کچھ ہے۔ عزیزانِ من! آپ سوچیے قبل اس کے کہ میں اس پہ آؤں کہ یہ آیت کیا ہے' اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ سوچیے کہ یہ دو باتیں جب آپ اپنے ہاں' اپنی مسجد اور حجرے میں بیٹھ کر کہیں گے' تو ہم جو جی میں آئے کہہ لیں' ساری دنیا کے سامنے کہہ لیں' جب ہم ایک طرف اسلام پہ کتاب شائع کریں گے' اس میں Women (عورت) کے متعلق Chapter (باب) آجائے گا تو اس میں ہم ساری دنیا سے یہ کہیں گے کہ اسلام نے جو مقام ان کو عطا کیا ہے' جو حقوق ان کو دیئے ہیں' وہ کہیں اور نہیں مل سکتے اور اس کے ساتھ ہی جب ہم ان کو قرآن مجید دیں گے' وہ اس میں یہ لکھا پائیں گے' خود انہوں نے بھی جو ترجمے کیے ہیں' ان میں بھی یہی کچھ کیا ہے' انہوں نے تو آپ کے ہاں سے یہ چیز

لے کر ترجمہ کر دیا۔ تو کہاں زوج اور مؤدت کا مفہوم اور کہاں حاکم اور محکوم اصولاً تو آپ اس چیز کو سوچیے۔

ابھی ذرا پہلے سورۃ البقرۃ میں آ گیا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2:228) جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں' ہر ذمہ داری کے مقابلے میں ان کا ایک حق ہے۔ سارے قرآن مجید میں ان کے لیے زوج کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس کے معنی ہیں Complementary to each other (جو ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی چیز ہو)۔ آپ داروغے کا تصور ذہن میں رکھیے اور پھر قرآن مجید کی ان آیات کو سامنے لائیے۔ یہ کس قدر تضاد ہے قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ میاں بیوی کا جو تعلق ہے' وہ باہمی مؤدت' سکینت اور رحمت کا ہے۔ مؤدت تو محبت سے بھی اگلا درجہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا درجہ ہوتا ہے جسے یہ کہیے کہ 'تا کس نہ گوید بعد ازیں' من دیگرم تو دیگری' ❶ اس طرح سے ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جانے کی جو کیفیت ہوتی ہے' وہ ہے مؤدت اور سکینت۔ گھر کے اندر' باہمی تعلقات کے اندر' کوئی چیز اضطراب انگیز نہیں' اس میں سکون ہے اور رحمت ہے۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ رحمت تو آپ جانتے ہیں کہ خدا صاحبِ رحمت ہے' رحیم ہے' رسول ﷺ رحمت ہے' قرآن مجید رحمت ہے' اور میاں بیوی کے تعلقات کا نتیجہ رحمت ہے۔ ذرا سوچیے کہ کبھی حاکم اور محکوم کا بھی ایسا تعلق ہو سکتا ہے؟ کبھی کسی جیل خانے کے داروغہ اور قیدی کا آپس میں یہ تعلق ہو سکتا ہے؟ می نہ سزد خدائے را۔

یہ یہیں کھڑے ہو کر سوچنے کی بات آ جاتی ہے لیکن سوال تو پھر ہمارے سامنے وہی ہے کہ صاحب! ہزار برس سے یہ چیز تواتر سے' چلی آ رہی ہے۔ تفسیر لکھنے والے بہرحال عربی زبان بھی جانتے تھے' عالم تھے' ایسا بھی نہیں کہ کسی ایک نے لکھ دیا ہو' جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیے یہی کچھ لکھا ہوا ہے۔ تفاسیر کے بعد جو ہمارے ہاں ترجمہ کرنے والے بزرگ تھے' وہ عربی زبان کے بھی عالم تھے' اسلام کے بھی بہت بڑے عالم تھے' اُنہوں نے بھی ہمارے ہاں یہی ترجمہ کیا۔ عرب اپنے ہاں عربی زبان میں یہ پڑھ رہے ہیں اور یہی الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اردو والے اس کا ترجمہ کر رہے ہیں' وہ بھی یہی کچھ کہہ رہے ہیں۔ تفسیریں اٹھا کر دیکھیے' ان میں بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ تو ٹھیک ہے' اس کے بعد اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ پیش کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ انوکھی سی بات آ گئی صاحب! یہ چیز اس آیت کے ضمن میں ہی نہیں' بلکہ پورے قرآن حکیم کے ضمن میں ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ پھر یہ مفہوم کیسے مرتب ہوتا ہے۔

## ہماری مرتب کردہ تفاسیر کا معیار پرکھنے کے لیے' ایک تفسیر کے تحریر و بیاں کی چند مثالیں

یہ جسے آپ آگے چل کر ترجمہ کہتے ہیں' میں عرض کر دوں کہ تفاسیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے' آگے اسی سے ترجمہ بنتا ہے۔ اس کی

---

❶ تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور ہوں اور تم اور ہو۔

مثال یہ (زمخشری کی) کشاف تفسیر لے لیجیے۔ وضاحت کرنے کے بعد اس میں یہ چیز ہے کہ **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ** (4:34) میں **قوامون** وہ ہیں جو متسلّطین' تسلط جمانے والے' تغلب جمانے والے ہیں۔ یہ اس **قوامون** کا لفظ ''متسلّطین'' ہے۔ ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے' اسے جلالین کہتے ہیں' چوں کہ لکھنے والے باپ اور بیٹا تھے' دونوں جلال الدین۔ لہٰذا اسے جلالین کہتے ہیں۔ اس میں انداز یہ ہے کہ یہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن حمید کے یہ جو الفاظ ہیں وہ ان کے مرادف' عربی کے دوسرے الفاظ' ساتھ ساتھ دیتے جا رہے ہیں۔ ہم تو اردو میں ترجمہ کریں گے۔ یوں کہہ لیجیے کہ انہوں نے قرآنِ کریم کے الفاظ کا عربی میں ترجمہ کیا ہے' قرآن کریم کے لفظوں کے مرادف الفاظ' انہوں نے دیئے ہیں اور وہ قوسین میں دیتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ سمجھنے کے لیے کہ قرآن کریم کے اس لفظ کے معنی کیا ہیں' اس کے مرادف عربی کا ایک دوسرا لفظ دیدیا تو گویا اس سے سمجھ لو کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس میں بھی جہاں ''**قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ**'' لکھا ہے' اس کے آگے انہوں نے اس کا مرادف ''**مسیطرین**'' لکھا ہے۔ **مسیطرین** اردو میں داروغے (Darogah) کو کہتے ہیں۔ بات صاف ہوگئی کہ صاحب! وہ تفسیر لکھ رہے ہیں' اس میں وہ یہ بتا رہے ہیں کہ **قوامون** ' متسلّطین ہیں' یہ اس کا عربی مرادف دے رہے ہیں' تو اس میں وہ مسیطرین کہہ رہے ہیں۔ اب ہمارے ہاں جنہوں نے ترجمہ کیا ہے' وہ یہاں سے دیکھیں گے۔ کسی نے متسلّطین لیا تو حاکم کہا' کسی نے مسیطرین لیا' تو داروغہ کیا۔ ان لفظوں کا یہ ترجمہ ٹھیک ہے۔ بات یہ ہوئی کہ پھر یہ الفاظ کیسے آ گئے اور یہ چیز' میں نے کہا ہے' کہ ہمارے سامنے اس آیۂ جلیلہ کے ضمن میں تو آ گئی۔

## ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

سارے قرآن حکیم کے ساتھ یہ ہوا ہے۔ پہلے تفسیروں میں ہوا ہے اور ان تفاسیر کی رو سے جو دوسرے مرادف الفاظ قوسین میں یا ان کے نیچے لکھے گئے ہیں' پھر ان کا ہمارے ہاں اردو میں ترجمہ ہوا تو وہ چیز آ گئی۔ اب ہم جو عام طور پر قرآن حکیم کو سمجھتے ہیں یا تو ان تراجم کی رُو سے سمجھتے ہیں اور یا پھر اگلی بات یہ ہوتی ہے کہ نہیں صاحب! عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ٹھیک ہے ہم میں سے جو عربی زبان سے واقف ہو وہ اس طرح سے اسے سمجھے۔ اور وہ جن کی زبان ہی عربی ہے' وہ جو ان کے عربی زبان میں مرادف لیے ہوئے ہیں' وہ جو عربی زبان میں ان کی تفسیریں لکھی ہوئی ہیں' سوال یہ ہے کہ وہ کس سے سمجھیں۔ بات یہاں آ گئی کہ یہ تفسیریں کیسے لکھی گئیں کیونکہ یہ چیز سمجھ میں آئے گی' تو بات آگے چلے گی کہ اس تفسیر میں یہ مفہوم دیا ہوا ہے' پھر اس مفہوم کے مرادف لفظ کے لیے انہوں نے وہ لفظ دیا ہے' یہ ساتھ لکھا ہوا ہے۔ اُدھر مرادف الفاظ کے ترجمے ہمارے ہاں' اہلِ زبان کے ہاں' عربی جاننے اور نہ جاننے والوں کے ہاں' اسی طرح ہوئے ہیں اور اس طرح قرآن حکیم کو سمجھا جا رہا ہے۔

## قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک اعتراض کا جواب

معاف رکھیے گا' مجھے زیادہ وضاحت میں جانے کی ضرورت ہے' بات بڑی بنیادی ہے اور اُسی آیت کے اوپر نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی آپ آگے دیکھیں گے کہ ان تفاسیر' ان تراجم' کے خلاف کوئی بات کہے گا' تو فوراً اعتراض سامنے آجائے گا کہ صاحب! کیا یہ ہزار برس قبل کے لوگ جانتے نہ تھے؟ عرب جن کی زبان عربی ہے' ان کو کیا ہوگیا تھا؟ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھیے' یہ اتنے اتنے بڑے عالم' اتنے اتنے بڑے ادیب ہیں' اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے۔ یہ اعتراض وزنی نظر آتا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیات کا مفہوم تفاسیر نے سمجھایا ہوا ہے۔ اب تو ہم تفاسیر کہتے ہیں۔ بہت سی تفسیریں ہیں' جب ہم بنیادی بات کہیں گے تو تفسیر کہیں گے اور سب سے پہلی مکمل وضاحت والی تفسیر' ہمارے ہاں امام طبری (225-311H/838-923 A.D.) کی ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے امام ہیں۔ جب ہم امام کا لفظ لے لیں تو ایک امام تو شیعہ حضرات کے ہاں ہے' وہ بالکل الگ چیز ہے' وہ ان کے آئمہ ہیں۔ سنّی حضرات کے لیے امام کا لفظ تعظیماً استعمال ہوتا ہے جیسے عالم مفسر محدث' اور اصل میں کسی مخصوص دور کے اندر بھی' کوئی شخص جو ذرا آگے بڑھتا ہوتا تھا' اسے امام کہہ لیا جاتا تھا' اسے یوں سمجھیے کہ یہ لفظ Pioneer (پہل کار) کے معنی میں بھی استعمال ہوجاتا ہے۔ اس لیے جب نام کے ساتھ امام آئے تو اس سے کسی قسم کی وحشت نہیں طاری ہوجانی چاہیے کہ ان کی بات حرفِ آخر ہے' اس کے بعد تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے' امام طبری (ابوجعفر محمد بن جریر الطبری) نے یہ کہہ دیا ہے۔ عزیزانِ من! الفاظ کا بڑا جادو ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اگر وہ ہوتے اور انگریزی میں لکھتے تو ہم ان کو مسٹر طبری کہتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یوں پکارنے سے ذہن میں وہ تصور نہیں آتا جو امام کہنے سے ذہن میں آتا ہے۔ الفاظ اس طرح سے' اپنا خاص تصور قائم کردیتے ہیں' ذہن اس سے مسحور ہوجاتا ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے تین سو سال بعد لکھی گئی جامع تاریخ کی حقیقت

یہ ٹھیک ہے کہ وہ بہت بڑے عالم' بہت بڑے مفسر' بہت بڑے مورخ تھے اس لیے تو سب سے پہلے انہوں نے جامع تفسیر اور جامع تاریخ لکھی۔ یاد رکھیے گا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت فرمانے کے تین سو سال بعد یہ تفسیر اور تاریخ لکھی جارہی ہے اور اس تین سو سال کے اندر کوئی تحریری مواد نہیں ہے۔ یہ جتنی چیزیں چلی آرہی ہیں انہیں روایات کہتے ہیں۔ یہ زبانی سلسلہ ہے کہ اُس نے ایک بات کہی' اس کے آگے دوسرے نے سنی' اس سے آگے تیسرے نے سنی' یہ سلسلہ پانچ چھ نسلوں تک چلا کہ اُس نے اِس طرح سے کہی' تین سو سال تک جتنے بھی سلسلے ممکن تھے وہ بنے۔ آپ کے ہاں جنہیں مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے' ان میں امام (محمد اسماعیل) بخاری(60/256-194ھ) کا سب سے پہلا مفصل مجموعہ ہے' وہ بھی تیسری صدی ہجری کے ہیں' ان میں بھی ہر حدیث کے ساتھ یہ

ہے کہ مجھ سے فلاں نے یہ کہا' اُنہوں نے فلاں سے یہ سنا' انہوں نے فلاں سے یہ سنا اور اس طرح سے پانچ چھ سلسلوں سے' تین سو سال میں جتنے سلسلے ہو سکتے ہیں' کچھ باتیں صحابہؓ تک پہنچیں کچھ رسول اللہ ﷺ سے جا منسوب ہوئیں۔ اسی طرح تاریخ کے اندر بھی یہ چیز ہوئی۔ ہمارے تمام تاریخی واقعات یوں سنے ہوئے آگے چلتے آئے۔ اس میں کتنا عرصہ ہو گیا؟ یہ صرف اڑھائی تین سو سال کہنے سے ذہن کچھ صحیح بات نہیں سمجھتا۔ اسے یوں کہیے کہ جیسے اورنگ زیب (1707-1618ء) کے زمانے کی تاریخ آج لکھی جائے اور اس درمیان میں کوئی تحریری چیز نہ ہو۔

ہاں تو امام طبریؒ (ابو جعفر محمد بن جریر الطبری) (225-311H/838-923 A.D.) نے تفسیر لکھی اور ہر آیت کی تفسیر میں یہ کہا کہ روایت میں یہ آیا ہے' یا تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا' اس آیت کی تشریح میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا' یا کسی صحابہؓ کی طرف منسوب کیا کہ انہوں نے اس کے متعلق یہ کہا۔ غور فرمایئے کہ جس چیز کو امام (ابو جعفر محمد بن جریر) طبریؒ نے لکھا یا امام (محمد اسماعیل) بخاریؒ نے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا' حضور ﷺ کا یہ جو ارشادِ گرامی ہے' یہ زبانی روایت سے' تین سو اڑھائی سو سال بعد' زبانی ان تک پہنچا ہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ احتیاط برتی کہ لکھنے کے بعد اس نے ہم سے کہا کہ فلاں نے کہا' اُس نے اس سے کہا' اُس نے اس سے کہا اور اس کے بعد سب سے آخر میں آ کر کہا کہ قال الرسول اللہ ﷺ کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا۔ یوں لکھنے کے بعد آخر میں احتیاطاً' وہ لکھ دیتے ہیں ''او کما قال رسول اللہ ﷺ'' یا جیسا کہ بھئی رسول اللہ ﷺ نے کہا ہو۔ خود یہیں یہ بات آ گئی لیکن جو اگلا حصہ ہے ''او کما قال رسول اللہ ﷺ'' یہ جو چیزیں ہیں' یہ تو نظر انداز ہو جاتی ہیں جونہی کوئی حدیث آپ کے سامنے آئے۔ وہ اب یہی تصور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ آپ ذرا سوچیے کہ کسی آیت کے متعلق اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی تفسیر نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمائی تھی' اس کے بعد کسے یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ نہیں' اس کی یہ تفسیر نہیں ہو سکتی ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

## دورِ اوّلیٰ کی پہلی تاریخ اور قرآنِ حکیم کی پہلی تفسیر امام طبری نے لکھی

اگر قرآن حکیم کی پوری تفسیر لکھی جائے اور اس میں ہر آیت کے متعلق یہ لکھا جائے' تو اس کے بعد پورے قرآن حکیم کے متعلق' سوچنے سمجھنے' اور غور و فکر کرنے کی' گنجائش ہی باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ تاریخ میں کوئی چیزیں ایسی آ جاتیں کہ وہ اس کے خلاف جاتیں جو اس تفسیر میں آئیں۔ ہوا یہ کہ پہلی تاریخ بھی امام (ابو جعفر محمد بن جریر) طبریؒ نے لکھی۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ تاریخ اور تفسیر کا باہمی تعلق کیا ہے۔

## شانِ نزول کا عقیدہ اور اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں

تفسیر کے لیے ہمارے ہاں ایک چیز ہے' اسے شانِ نزول کہتے ہیں مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ہے' اس کا شانِ نزول کیا ہے۔ شانِ نزول یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ہوا تھا اور اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ تو اب اس آیت کا مفہوم' اس واقعہ سے متعلق ہو کر رہ گیا۔ او بھئی! اس آیت کے معنی کیا ہیں؟ معنی کے لیے وہ واقعہ سمجھ لیجیے کہ کیا ہوا تھا۔ ''وہ واقعہ یوں ہوا تھا' اس پہ یہ آیت نازل ہوئی''۔ تو اب تفسیر میں دو قسم کی چیزیں آئیں یا تو یہی کہ اس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے یوں فرما دی یا یہ کہ اس قسم کا ایک واقعہ ہوا تھا' اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اس واقعہ سے اس آیت کا مفہوم متعین ہوا۔ یہ جو سب سے پہلے تفسیر لکھی گئی' اس میں اور وہ جو ساتھ ہی تاریخ میں ان کے جو واقعات لکھے گئے یعنی ان آیات کی شانِ نزول لکھی گئی کہ فلاں آیت اس لیے نازل ہوئی کہ یوں جو ایک واقعہ ہوا تھا' اس کے متعلق خدا کا حکم چاہیے تھا تو یہ حکم اس کے متعلق نازل ہوا' یا یہ چیز ہے کہ اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے یہ تفسیر فرمائی تھی۔ یہ پہلی تفسیر اور پہلی تاریخ جو آپ کے ہاں' مرتب ہوئی' دونوں ایک شخص نے مرتب کیں۔ یہ تیسری صدی ہجری کی بات ہے اور زبانی روایات کی مدد سے یہ چیز مرتب ہوئی تو اس میں یہ چیز آ گئی۔

## گزشتہ ہزار برسوں میں لکھی جانے والی تمام تفاسیر' امام طبریؒ کے تتبع ہی پر لکھی جا رہی ہیں

جیسا میں نے عرض کیا کہ جب یہ چیز ہو جائے کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے یا اس واقعہ کے تابع یہ آیت آئی تھی گویا خدا نے خود اس واقعہ سے متعلق یہ حکم نازل کیا ہے تو جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے' اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر کوئی نہیں ہٹ سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد یہ جتنی آپ کے ہاں تفاسیر ہیں' وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں' لوگوں نے ہر دور میں لکھی ہیں' وہ اسی پہلی تفسیر کی طرح کے اوپر کہیے کہ غزلیں لکھی ہوئی ہیں' جسے کہتے ہیں کہ اسی کو Extend (وسیع) کیا ہے' اس کی زیادہ تفصیل دیدی ہے' کسی نے اس تفسیر کی حکمت اور غرض و غایت بتا دی ہے' کسی نے ان سے الگ احکام مستنبط کر لیے ہیں تو وہ اسی تفسیر کے احکام کی چیزیں آ گئیں۔ یہ جو انہوں نے اسی تفسیر سے معنی سمجھ کے مرادفات دیئے' تو انہوں نے کہا ہے کہ اس کے لیے دوسرا عربی زبان کا لفظ یہ ہو سکتا ہے۔ جتنی آپ کے ہاں اردو تفسیریں لکھیں' جب عربی کی تفاسیر کی یہ کیفیت ہوگی تو وہ تو بہر حال ہوگا ہی' ان کا وہ ترجمہ بھی اسی نہج پر ہوگا۔

## تاریخ کے ایک موڑ پر قرآنی غور و فکر کے حامل انسانوں کی سوچ کو پامال کرنے کا حشر

درمیان میں ایک دور آیا جب لوگوں نے کہا کہ صاحب! قرآنِ کریم کے تو ایک ایک صفحہ پہ لکھا ہوا ہے کہ غور کرو' فکر کرو' شعور سے کام لو' سمجھ سے کام لو' تفقہ سے کام لو تو یہ غور و فکر اور تفقہ کسی ایک دور سے تو مخصوص نہیں ہو سکتا' یہ تو ہر دور کے مسلمان کو' ہر دور کے

انسان کو' قرآن کریم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ **افلا یتدبرون القراٰن** (4:82) قرآن میں تم تدبر نہیں کرتے یعنی یہ فکری چیز' باہر کی دنیا سے متعلق ہی نہیں ہے' قرآن کریم میں تدبر کے متعلق' قرآن کریم نے خود تاکید کی ہے تو ہمیں اتنا تدبر کرنا چاہیے جو ہمیں ایک چیز ملتی ہے۔ یہ وہ گروہ تھا' جن کے متعلق ایک لیبل لگا۔ میں تاریخ میں نہیں جا رہا' کسی کو Defend (دفاع) نہیں کر رہا' یہ موضوع دوسرا ہے۔انہیں معتزلہ کہا گیا کہ یہ قرآن کریم میں عقل وفکر سے کام لینے کی تعلیم دیتے ہیں۔اور پھر ان کے خلاف جو تحریک اٹھی' اس تحریک کی بنیاد یہ تھی' یہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ امام شافعی ❶ اس تحریک کے Pioneer (پہل کار' امام) تھے یعنی بنیاد یہ تھی کہ جب ایک آیت کی رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سامنے آ جائے' پھر اس کے بعد کسی کو کیا حق رہتا ہے کہ کہے کہ ہم اس میں مزید غور اور فکر اور تدبر سے یہ معنی سمجھے ہیں لہٰذا ان کا یہ کہنا شانِ رسالت ﷺ کے خلاف ہے' اس بات کا انکار ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر حرفِ آخر ہو سکتی ہے۔

عزیزانِ من! پھر ہوا یہ کہ اس تحریک کے بعد انہیں مرتد قرار دیا گیا اور پھر آپ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ بغداد کی گلیوں کی نالیوں [2] میں کتنا خون بہا۔فقط اس لیے کہ اس تفسیر میں جو بات آ گئی ہے اس کے خلاف سوچا نہیں جا سکتا' کچھ کہا نہیں جا سکتا' تاریخ میں اس شدت سے واقعہ ہوا اور اس کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوئیں' انہوں نے اسی نظریہ کو اپنے لیے قرینِ مصلحت سمجھا کہ حکومت Popular Will (عوام میں مقبول قوتِ ارادی) کے تابع چلتی ہے۔یہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! ہزار برس میں پھر کسی نے اس کے خلاف کہا ہی نہیں' یہ غلط ہے۔جنہوں نے آواز اٹھائی تاریخ میں تو ❷ وہ ہے مگر ان کی تصانیف کا ایک ایک ورق ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلا دیا گیا' تلف کر دیا گیا۔ان کا اگر کہیں آپ کو ذکر ملتا ہے یا یہ چیز کہ انہوں نے کیا کہا تھا' اعتراض کے طور پر بعد میں جنہوں نے لکھا' وہ یہ ہے کہ دیکھیے!

---

❶ امام شافعی ابوعبداللہ محمد بن ادریس عسقلانی مکی (150-204/767-820)

❷ اس خونِ ناحق بہنے کی چند ایک مثالیں دیکھیے:

(1) امام نفیس شیرستانی آف عربیہ (461-395ھ) کو سولی پر لٹکا دیا۔

(2) امام الشیخ محمد طاہر المکی (460-417ھ) کو زندہ جلا دیا

(3) امام معین الدین العش عربی عراقی (363-313ھ) کو سولی پر لٹکا دیا۔

(4) امام شارق الوی معتزلی فلسطینی (457-407ھ) کو پھانسی دیدی۔

(5) امام عبداللہ زنجانی آف عربیہ (610-459ھ) کو پھانسی دیدی۔

(6) امام راغب الاصفہانی آف فارس (1409-1327ء) کا سر کاٹ کر تن سے جدا کر دیا

(7) امام احمد امین طاہر المصری (1953-1883ء) کو جیل میں تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس کی تفسیر تو یہ تھی اور یہ فلاں صاحب تھے' وہ اس کے متعلق یہ کہتے تھے۔ وہاں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی ایسے صاحب تھے اور انہوں نے ایسا کہا تھا۔ اور کسی کسی موقعہ پر آپ کو ان کی کوئی چیز اعتراض کے طور پہ ملتی ہے ورنہ اس کے بعد یہی دور رہا۔ یہ ہے وہ چیز جس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! پھر اس کے بعد ہزار برس آپ کے ہاں گزر گئے اور کسی نے اس کے متعلق مزید کہا ہی نہیں ہے۔ وجہ یہ تھی کہ کہنے ہی نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اور بات وہی ہے' اس کے لیے دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تفسیر ہے' اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کچھ اور کہے۔ یہ بات جی لگتی تھی۔ درمیان میں اتنی سی جو بات تھی' وہی حذف ہوئی ہے کہ ہر بات کے بعد جو اوکما قال تھا' یا جیسا کہا ہو' تو اس کا کہنے والے کو حق دینا چاہیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا ہوگا۔ آپ خود یہ مانتے ہیں 'یہ یا جیسا حضور ﷺ نے فرمایا ہو۔ یہ اقوال ''منسوب الی الرسول'' ہیں۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی اصطلاح ہے کہ حضور ﷺ کی طرف ان چیزوں کی نسبت کی گئی ہے۔

## نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا

اگر نبی اکرم ﷺ اپنی تفسیر کا کوئی ایک مرتب و مدون مجموعہ آپ کو دے جاتے تو بات صاف ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جرأت کرنا تو ایک طرف رہا' خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کا کوئی اور بھی مفہوم ہوسکتا ہے۔ حضور ﷺ نے تفسیر تو ایک طرف رہی' اپنی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا' صحابہ کبارؓ نے مجموعے مرتب نہیں کیے' انہوں نے تفسیر مرتب نہیں کی۔ یہ اِس زمانے میں آ کر یوں ہوا یعنی یہ جتنی چیزیں بھی کی گئی تھیں' اگر ان کے متعلق یہ چیز ہوتی کہ چھان بین کی جاسکتی ہے' یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہو اور کونسی ایسی ہے جس کے متعلق کہا جائے گا کہ نہیں' یہ حضور ﷺ نے نہیں فرمائی ہوگی' ایسی بات حضور ﷺ نے نہیں کہی ہوگی' یہ آپ ﷺ کی حدیث نہیں ہوسکتی' یہ آپ ﷺ کی تفسیر نہیں ہوسکتی' یہ چیز بھی اگر ہوتی تو پھر بھی بڑی حد تک بات صاف ہوتی چلی جاتی لیکن اس کے بعد یہ حق سلب کرلیا کہ جو کچھ ان کتابوں کے اندر لکھا جاچکا ہے اب اس پہ تنقید نہیں کی جاسکتی۔

## علمی اور فکری طور پر ہزار سالہ تاریکی کی وجہ

میں یہ بیک گراؤنڈ (پس منظر) آپ کو اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ کے ذہن میں آجائے کہ پھر ہزار برس میں یہ چیز کیوں نہ ہوئی۔ میں نے دو چیزیں کہی ہیں: (1) شانِ نزول کے مطابق کسی آیت کی تفسیر یا (2) براہِ راست ایسا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک میں اس کے متعلق مثال نہ دوں۔ مثال ایک دو نہیں' اس کے متعلق سینکڑوں مثالیں ہیں لیکن ایک مثال سے بات واضح ہوجائے گی کہ حضور ﷺ نے فلاں آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا۔ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ اے جماعتِ مومنین! تم اپنے رسول کو اس طرح سے نہ ستانا' یہاں اذیت کا لفظ ہے' جس طرح بنی اسرائیل نے اپنے رسول کو ستایا۔ قرآن کریم کی طرف آئیے تو

اس ستانے کی ساری تفصیل قرآن حمید نے خود دی ہے۔قدم قدم پہ صحرائے سینا کے اندر آ کر وہ دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے' قرآن مجید یہاں سے بات شروع کرتا ہے۔آپ اندازہ لگایئے کہ اتنا بڑا محسن ہے' اتنا بڑا انقلابی پیغامبر ہے' وہ فرعون جیسے جابر کی غلامی سے' ان کو نجات دلا کر آزادی سے یہاں لایا ہے' وہاں کے شرک سے' وہاں کے کفر سے' بھی نجات دلائی ہے' توحید کا سبق بھی دیتا ہے۔

قرآن حمید بتاتا ہے کہ یہ چلے جا رہے ہیں' راستے میں دیکھا کہ ایک گاؤں میں کوئی دیوی کی پوجا کر رہے ہیں' بیٹھ گئے کہ موسیٰؑ ! ہمیں بھی ایک ایسا بُت بنا دیجیے' اوستیاناس تمہارا! بس چلے جا رہے ہیں۔وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں تمہاری زندگی اس قسم کی سپاہیانہ ہوگی مگر وہ کہتے ہیں کہ نہیں موسیٰؑ ! روز ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر ہم تو تنگ آ گئے ہیں۔مصر میں کیسے اچھے تھے' ٹھیک ہے بیٹھے ہوئے ان کی ہنڈیا پکایا کرتے تھے لیکن ان کی ہنڈیا میں سے ہم کھایا بھی کرتے تھے' وہاں چٹ پٹے قسم کے کھانے ملتے تھے۔یہاں لے آئے تو ہمیں مارنے کے لیے! ذرا پانی کی دقت ہو رہی ہے' دہائی مچا دی ہے کہ موسیٰؑ ! کیا کر دیا' ہم پھر واپس مصر کو جا رہے ہیں۔موسیٰؑ چار دن کے لیے ان سے دوسری جگہ گئے' پیچھے سے بچھڑے کا ایک بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔آپ دیکھیے قرآن حمید ساری تفصیل دے رہا ہے کہ یہ قوم اپنے اتنے عظیم رسول کو' اتنے بڑے محسن کو' کس طرح ستاتی تھی' کس طرح اذیت دیتی تھی' تنگ کرتی تھی؟ یہ بات کتنی صاف ہے۔

## بخاری شریف میں دی گئی ایک آیت کی تفسیر حضرت موسیٰؑ کے غسل کا واقعہ

بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل حضرتِ موسیٰؑ کو ستاتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرتِ موسیٰؑ عام طور پر نہانے کے لیے ایسی جگہ چلے جاتے تھے جہاں پردہ ہو' وہ تو میدان میں' صحرا میں' تھے' ندیاں کھلی ہوئی ہوتی ہیں تو وہ لوگ تو اسی طرح سے نہا لیتے ہونگے لیکن بہر حال آپ ستر کی جگہ جایا کرتے تھے' اس کے لیے دور نکل جانا پڑتا ہوگا۔اب بھی گاؤں کی زندگی میں جب باہر جانا ہوتا ہے تو جانے والے ایسے دور نکل جاتے ہیں جہاں پردہ ہو' جہاں ستر ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرتِ موسیٰؑ اس طرح سے نہانے جایا کرتے تھے لیکن قوم میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ ان کے ستر کے مقام کے اوپر کوئی عیب ہے' جس کی وجہ سے یہ سامنے نہیں نہاتے' چھپ کر نہاتے ہیں۔یہ بات مشہور کرا دی۔یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا کی طرف سے انتظام یہ کیا گیا کہ آپؑ ایک دن اُس ندی میں نہا رہے تھے آپؑ نے کپڑے اتار کر کنارے پہ ایک پتھر پہ رکھے ہوئے تھے' نہانے کے بعد جب آپؑ کپڑے پہننے کے لیے باہر تشریف لائے تو پتھر کپڑوں کو لے کر چل پڑا۔بخاری شریف کی حدیث ہے' اس میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کی یہ

تفسیر فرمائی۔اب پتھر آگے آگے جا رہا ہے' حضرتِ موسیٰؑ پیچھے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔اور پتھر اس طرح سے بھاگتا بھاگتا بنی اسرائیل کے اس کیمپ میں آ گیا اور اس کے پیچھے حضرتِ موسیٰؑ اسی طرح سے آ گئے تو انہوں نے جب دیکھا تو کہا کہ نہیں' او! وہ تو کسی نے یونہی بات پھیلائی تھی' یہ تو اچھا بھلا ہے' پھر آپؑ نے وہ کپڑے لیے' پہنے' اور اس پتھر کو پانچ سات دفعہ مارا۔حضرتِ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس پتھر پہ نشان پڑ گئے ہوئے ہیں۔یہ اس آیت کی تفسیر آئی ہے جسے کہا گیا ہے کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی تھی۔

اب آپ غور کیجیے کہ جب عقیدہ یہ پیدا کر دیا جائے کہ یہ حضور ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے' اس کے بعد کس کی جرأت ہے کہ اس کے اوپر ذرا سی تنقید تو ایک طرف' وہ تو آپ خاموش بیٹھے ہیں' نہیں کر رہے' یہ جو آپ کے ہونٹوں پہ ہنسی تیر گئی ہے' اس کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔جب یہ عقیدہ مان لیا جائے کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی فرمائی ہوئی ہے' تو آپ نے غور فرمایا کہ پھر یہ ہزار برس میں اس آیت کی یہی تفسیر' آج تک کیوں ہوتی گئی۔اذیت کا مفہوم یہ ہوا۔یہ میں نے آپ کو ایک مثال دی ہے۔یہ جو آپ کے ہاں کی کتبِ تفاسیر ہیں انہوں نے ان کے ترجمے بھی کر دیئے ہیں' انہیں آپ اٹھا کر دیکھیے۔بخاری شریف کے بھی ترجمے ہو گئے ہوئے ہیں' اس میں بھی آپ دیکھیے کتنا کچھ آپ کو اس قسم کا ملتا ہے۔

## شانِ نزول کے پیشِ نظر ایک آیت کی تفسیر

دوسری چیز میں نے شانِ نزول کی کہی کہ شانِ نزول کے اعتبار سے آیت نازل ہوا کرتی تھی لہٰذا اس آیت کے جو الفاظ ہیں' جو ان کے معنی اس واقعہ کی رو سے متعین کیے جائیں گے' اس کی ایک مثال یہ عرض کیے دیتا ہوں۔قرآنِ کریم میں ہے کہ **وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ** [15:24] **وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ** (15:25) ہم انہیں بھی جانتے ہیں جو پہلے گزر گئے ہوئے ہیں' ہم انہیں بھی جانتے ہیں جو مستاخرین ہیں' پیچھے رہ جانے والے ہیں' اگلے جو چلے گئے انہیں بھی جانتے ہیں' آنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور ان سب کو ایک دن جمع کرنے والے ہیں اور **اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ** (15:24) علیم خود بتا رہا ہے کہ قرآن کریم کیا بات کہہ رہا ہے۔قرآن حمید کی یہ آیت ہے۔میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی ایک آیت کی' ایک حکم کی' تشریح اور تفسیر دوسرے مقامات پر خود کرتا چلا جاتا ہے۔دوسرے مقام پہ ہے کہ **قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ** [56:49] **لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ** (56:50)۔آپ دیکھیے گا کہ قرآن دو الفاظ مرادف لے آیا' وہاں **مُسْتَقْبِلِیْنَ** اور **مُسْتَاْخِرِیْنَ** (15:24) تھا' یہاں **اَوَّلِیْنَ** اور **اٰخِرِیْنَ** (56:50) لے آیا: پہلے گزرے ہوئے بھی' اور بعد میں

آنے والے بھی' مرادف دے کر اس نے معنی متعین کر دیئے۔ اس آیت کی تفسیر میں' جامع ترمذی ❶ میں' حضرتِ ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ لکھا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مسجدِ نبوی میں' میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے تحریماً معذرت چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں تشریحاً مجھے کہنی پڑتی ہیں' یہ حدیث ہے جو بیان کر رہا ہوں' حضورﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے ایک بڑی حسین عورت صف میں آ کر کھڑی ہوتی تھی' عورتوں کی صف پیچھے ہوتی تھی مردوں کی آگے ہوتی تھی' تو ان میں سے صحابہؓ ہیں جو مسجدِ نبوی میں رسول اللہﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ بہر حال مسجد نبوی کے نمازی تو ہیں۔ تو ان میں سے کچھ لوگ جو نیتوں کے نیک تھے' وہ تو آگے چلے جاتے تھے اور کچھ لوگ مردوں کی آخری پچھلی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے اور جب رکوع میں جاتے تھے تو اپنی بغل کے نیچے سے اس عورت کو جھانکا کرتے تھے۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی کہ ''چور دیو پترو!'' (اے چور کے بچو!) ہم جانتے ہیں جو تم میں سے آگے جا کر کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں بھی جانتے ہیں جو پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہنسیے نہیں' خون کے آنسو بہایئے۔ اس آیت کی یہ شانِ نزول ہے۔ اب اس شانِ نزول کے بعد مستقبلین اور مستاخرین کے معنی پھر آپ نے متعین کر لیے: اگلی صف میں جا کر کھڑے ہونے والے اور پچھلی صف میں کھڑے ہونے والے' پھر ان کے مرادف بھی عربی زبان میں آ گئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ قرآن تو ان مرادفات کو صحیح سمجھتا ہے جس میں اولین اور آخرین کہا تھا۔ اس شانِ نزول کی رو سے یہ تفسیر بھی ہو گئی کہ انہوں نے ان چیزوں کو دیکھا' بات کی۔ امام احمد بن حنبلؒ (164-241H/780-855A.D) نے یہ اپنے ہاں لکھا ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین چیزیں قابلِ اعتماد نہیں ہیں: ملاحم' مغازی اور تفسیر یعنی پیشن گوئیوں کے متعلق جو روایتیں آئی ہیں' جنگوں کے متعلق جو آئی ہیں وہ' اور تفسیر کے متعلق جو روایتیں آئی ہیں وہ' لیکن ان چیزوں کو کوئی نہیں سنتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی نسبت معتزلہ سے نہیں ہے۔ ان کا تو اپنا احادیث کا ایک مجموعہ ہے' وہ ان سب سے بڑا ہے اور پھر ہمارے ہاں کے فقہ کے جو آئمہِ اربعہ ❷ ہیں ان میں سے یہ بھی ایک امام ہیں۔ ان کا یہ قول ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ان کے باوجود یہ ساری چیزیں آپ

---

❶ ترمذی۔ آپ امام ابوعیسیٰ ترمذی (290/279-209ھ) ہیں۔ آپ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے مجموعہ احادیث کا نام جامع ترمذی ہے۔

❷ آئمہ اربعہ میں یہ امام آتے ہیں: (1) امام اعظمؒ کوفی' امام ابوحنیفہؒ کوفی (150-80ھ) (2) امام مالکؒ یمنی' مدنی (179-93ھ) (3) امام شافعیؒ عسقلانی' مکی (204-150ھ) اور (4) امام احمد بن حنبلؒ بغدادی (241-164ھ)۔

انہیں آئمہ فقہا بھی کہتے ہیں۔ چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی' مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے انہی چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اہلِ تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے (ادارہ طلوعِ اسلام: فقہی قوانین کی دینی حیثیت (پمفلٹ)' لاہور' ص۔ 9)۔ نیز رشید احمد یعقوب: اللہ' رحمۃ اللعلمین ریسرچ سنٹر' کراچی' 2009' ص۔ 86۔

کے کتبِ احادیث میں ہیں، تاریخ میں ہیں، ان کی بنا پر طبری کی تفسیر میں ہیں۔ تفسیر میں لکھا یہ ہے کہ قرآن حمید کی اس آیت کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی یا اس کا شانِ نزول یہ تھا۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی چیز عدالت کے اندر بھی متنازع فیہ ہو جائے تو اس میں Case Law کو دیکھا جاتا ہے، Circumstancial Evidence (واقعاتی شہادت) کو دیکھا جاتا ہے یعنی جو واقعہ ہوتا ہے، اس سے مقدمے کی بات چلتی ہے کہ صاحب! ہوا کیا تھا۔ وہ کہتا ہے اس نے مجھے گالی دی تھی۔ وہ یہ بات پوچھتا ہے کہ صاحب ! بات کہیے کہ ہوا کیا تھا۔ اس ''ہوا کیا'' کے اوپر اس چیز کا یہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ''یہ ہوا کیا تھا'' اس کو کہتے ہیں ان آیات کا شانِ نزول۔ اب جو شانِ نزول بھی متعین کر کے دیدیئے جائیں اور جہاں شانِ نزول کی یہ بات نہ ہو، جیسے حضرتِ موسیٰ کے متعلق وہ آیت آئی، اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے ایک تفسیر آ جائے، پھر کون اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ ایسا نہیں ہے۔

## کسی حدیث کے صحیح ہونے کا معیار صرف قرآنِ حکیم کی راہنمائی ہے

سمجھانے کی بات صرف اتنی سی تھی کہ یہ تفسیر اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہے، یہ حضور ﷺ کی طرف منسوب کی گئی باتیں ہیں، ان میں صحیح بھی ہو سکتی ہیں، غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک قرآن کریم کی تفسیر کا تعلق ہے اس کے لیے ہمارے سامنے بالکل واضح معیار ہے۔ وہ یہ کہ اِن میں سے کوئی چیز جو قرآن کی تعلیم، اس کی روح، اس کے حکم کے، خلاف جائے، ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا، یہ حضور ﷺ کی حدیث نہیں ہو سکتی، جو اس کے مطابق ہے، آپ کہیے گا کہ سر آنکھوں کے اوپر یہ حضور ﷺ کی حدیث ہو سکتی ہے۔ جو شخص ایسے مقام پہ کہتا ہے کہ میں اس حدیث سے انکار کرتا ہوں، یہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔ یہ کہنا کہ یہ احادیث کا انکار کرتا ہے، غلط ہے۔ وہ انکار یہ کرتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی، وہ حضور ﷺ کی حدیث کا انکار نہیں کرتا، اس خاص حدیث کی جو نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، یہ اس سے انکار کرتا ہے۔ انکار کی بنیاد یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کے خلاف جاتی ہے اس سے حضور ﷺ کی سیرت پر طعن پڑتا ہے، اس سے صحابہ کبارؓ کی سیرت پر اعتراض اٹھتا ہے، اس لیے یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ حدیث کہ قیامت میں نبی اکرم ﷺ یہ دیکھیں گے کہ ایک گروہ ہے، جس کو فرشتے جہنم کی طرف لیے جا رہے ہیں اور آپ ﷺ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو میرے صحابہ ہیں، ان کو جہنم کی طرف کیوں لیے جا رہے ہو تو خدا کی طرف سے آواز آئے گی کہ جب تک تُو ان میں تھا تو یہ ٹھیک ایمان پہ رہے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد یہ مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ)۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ کوئی ایسی حدیث جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف جائے، کوئی ایسی حدیث جس میں کسی نبی یا خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پہ کوئی طعن پڑتا ہو، کوئی ایسی حدیث جس سے صحابہٴ کبارؓ کی سیرت پر طعن پڑتا ہو، جو مشاہدات کے

خلاف ہو' جو علمی تحقیق کے خلاف ہو' فکر وتدبر کے خلاف ہو۔ عزیزانِ من! اس کے متعلق یہ کہہ دینے سے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتی نہ زمین پھٹ جائے گی' نہ آسمان گر جائے گا۔

## مستشرقین کی طرف سے پیش کردہ مخالف لٹریچر' ہماری طرف سے پیش کردہ خلافِ قرآن روایات کی بنیاد پر مبنی ہے۔ نیز شانِ نزول کی ایک اور مثال

اگر یہ معیار کسی وقت مقرر کر لیا جاتا تو یہ دشواریاں' جو آج آپ کو اس طرح پیش آ رہی ہیں' پیش ہی نہ آتیں اور نہ ہی آپ کے ہاں مستشرق نبی اکرم ﷺ' صحابہ کبارؓ اور قرآن کریم کے خلاف کچھ لکھتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جو وہاں کے مستشرق ہیں' وہ نبی اکرم ﷺ' صحابۂ کبارؓ اور قرآن کریم کے خلاف جو کچھ لکھتے چلے جا رہے ہیں' وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتے۔ آپ کی ان کتابوں کے اندر وہ سب موجود ہوتا ہے جو وہ لکھتے ہیں۔ آپ کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں کی کوئی کتاب آئے' جس میں یہ کچھ ان کتب میں سے لکھا ہوا ہو تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ صاحب! اس کو Ban (ممنوع) کر دیجیے' اس کو Proscribe (خلافِ قانون) کر دیجیے' اس کو جلا دیجیے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جن کتابوں سے' جن سرچشموں سے' پانی کا یہ کوزہ لے کر گئے ہیں ارے' ان کو بند کیجیے یا ان پر کسی طرح سے تنقید کیجیے۔ وہ تو بدستور بہے چلا جا رہا ہے' بدستور نہیں بلکہ اس کے لیے ان کو پھیلانے میں' طبع کرانے میں' نشر و اشاعت میں' تو اتنی کوششیں ہوتی ہیں' جہاد ہوتے ہیں۔ اگر وہ مستشرق ان میں سے دو چار باتیں اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے تو دہائی مچا دی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! ایک دفعہ میرے پاس بھی ایک ایسی کتاب آئی تھی۔ وہ ولایت کے ایک مستشرق کی' سیرتِ نبوی ﷺ کے متعلق لکھی ہوئی تھی۔ اُس میں ایسی دل آزاری کرنے والی چیزیں تھیں۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے' کیا اس کتاب کو Ban (ممنوع) کرنا چاہیے؟ میں نے اس پر انہیں لکھ کر بھیجا تھا کہ یقیناً اس کو Ban (ممنوع) کرنا چاہیے' اس میں اس قسم کا مواد ہے لیکن Ban (ممنوع) کرتے وقت آپ یہ لکھا کرتے ہیں کہ یہ کتاب بھی Ban (ممنوع) کی جاتی ہے' اسی کتاب میں جو جو لکھا ہے اگر کسی دوسری کتاب میں اس کا کوئی اقتباس ہوگا تو وہ بھی Ban (ممنوع) ہوگی' اس کا ترجمہ کہیں کیا ہوگا' تو وہ بھی Ban (ممنوع) ہوگا۔ اس کو آگے اس طرح سے Quote (نقل) کرنا' اس کا اقتباس کرنا' وہ بھی جرم ہوگا۔ آگے میں نے کہا اور لکھا کہ جب یہ بھی آپ ساتھ لکھتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے گزارش کر دوں کہ میں نے اس کتاب کے ایک ایک اقتباس کو لے کر اس کے مقابلے میں بخاری شریف کی ایک ایک حدیث نقل کر دی ہے کہ یہ اس کا ترجمہ ہے تو جب آپ نوٹیفکیشن جاری کریں تو اس میں مبہم رکھنے کی بجائے یہ کہہ دیجیے گا کہ یہ بھی Ban (ممنوع) کی جاتی ہے اور جس کتاب سے یہ مواد لیا گیا ہے' اسے بھی Ban (ممنوع) کیا

جاتا ہے ''ہن تیکر مڑ کے نئیں گل آئی ایدھر'' (وہ بات اب تک مڑ کر ادھر نہیں آئی)۔ بات آئی تو یہ آئی کہ اس کو پھانسی پہ لٹکا دو' یہ منکرِ حدیث ہے۔

عزیزانِ من! یہ بیک گراؤنڈ' یہ پسِ منظر اور اس کی وضاحت نہایت ضروری تھی کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34)۔ اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے جو ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ احادیث میں یہ چیزیں موجود ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں' تفاسیر میں یہ چیزیں موجود ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں' طبری میں یہ موجود ہیں' طبری پر موجود جو آگے تفاسیر چلتی ہیں' ان میں موجود ہیں۔ شانِ نزول یہ لکھ دیا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرم ﷺ سے آ کر شکایت کی کہ اس کا خاوند اس کو مارتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا' تم اس کا بدلہ لے سکتی ہو۔ جونہی آپ ﷺ نے یہ فرمایا تو آیت نازل ہوگئی کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ نے دیکھا کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ اس کی شانِ نزول دوسری جگہ لکھی ہے۔

## ''عورتوں کا مردوں اور مردوں کا عورتوں کو مارنا'' کیا یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہوسکتی ہے؟ اور کیا مرد عورتوں پر داروغہ یا ان کا کفیل ہے؟

شانِ نزول میں بھی کئی کئی روایتیں ہوتی ہیں۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خود ہی مردوں سے یہ کہا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو' یہ نہایت بری بات ہے۔ اس کے بعد حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) حضور ﷺ کے پاس آئے۔ معاف رکھیے گا اگر میں یہ عرض کروں کہ حضرتِ عمرؓ کی کچھ ایسی سیرت بتائی ہوئی ہے کہ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں' کچھ ایسا کرتے ہیں تو وہ ہاتھ میں اپنا کوڑا لیے ہوئے جھٹ آ جاتے ہیں کہ آپؐ نے یہ کیا کہہ دیا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ کیا کچھ میں عرض کروں کہ کیا کچھ نہیں ہے۔ ہاں تو روایت میں یہ ہے کہ حضرتِ عمرؓ ' آپ ﷺ کے پاس آئے اور آن کر کہا کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو یہ کیا کہہ دیا' وہ مردوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔ اس قسم کے ''حضرتِ عمرؓ'' میرے پاس بھی آیا کرتے ہیں کہ صاحب! تم نے اپنے درس میں یہ کیا کہا کہ عورت واجب الاحترام ہے' مساوات کا حق رکھتی ہے' اس کے بڑے حقوق ہیں' ان کو ہمارے مقابل میں بڑا دلیر بنا دیا ہے۔ بہرحال حدیث میں ہے کہ حضرتِ عمرؓ آئے اور آپؓ نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے یہ کیا کیا' عورتیں بہت دلیر ہوگئی ہیں' آپ ﷺ نے مردوں کو پھر کہہ دیا کہ نہیں بھئی! انہیں مارا کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسے احکام دے رہے ہیں کہ مارا کرو۔ اور مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار شروع ہوگئی تب عورتیں آئیں اور کہا کہ انہوں نے تو پہلے سے بھی زیادہ انتقام لینا شروع کر دیا ہے' آپ ﷺ نے پھر عورتوں

سے کہا کہ نہیں! جاؤ پھر تم بھی بدلہ لو۔اس پہ یہ آیت نازل ہوگئی کہ نہیں! اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)۔یہ ساری وضعی چیزیں یونہی قائم رکھنے کے لیے ان میں سے کسی کو بعد میں یہ خیال آیا ہوگا۔

## بنوعباس کے دورِ ملوکیت میں عورتوں کی حالتِ زار؛ لونڈیوں کی نیلامی اور خلیفہ ہارون رشید کا ذکر

اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری وہ ہے جس میں آپ کے ہاں ملوکیت کی شدت ہے' بنوعباس کا زمانہ (132-656/750-1258A.D ھ) ہے اور اس دور کے اندر عورتیں تھیں' یہ تو بیچاری الگ رہیں' عوام کے ساتھ جو کچھ ہوتا تھا' پوچھو تاریخ سے کہ استبدادِ ملوکیت کے اندر عورت کی پوزیشن کیا تھی۔آپ کو معلوم ہے کہ جہاں حکومت کے ڈیپارٹمنٹ (اداروں) تھے' ان میں ایک معتبر ترین ڈیپارٹمنٹ لونڈیوں کی خرید و فروخت کا تھا۔بغداد کے اندر' جو سب سے زیادہ بستی ہوئی مارکیٹ تھی' وہ لونڈیوں کی خرید و فروخت کی تھی ۔ جس میں شام کو لونڈیاں نیلام ہوا کرتی تھیں اور کیفیت یہ تھی ۔ ہارون رشید کے دور (170-193H/786-809A.D) کا Heroes of Islam (مشاہیرِ اسلام) کے سلسلہ میں نام لیا جاتا ہے۔اس نام کے سامنے آنے پر ذہن میں یہ آتا ہے کہ صاحب! کیا بات تھی' ہمارے ہاں کے ان خلفاء کی' سلاطین کی' کہ تین ہزار لونڈیاں تو ان ہارون یا مامون کے حرم میں بھی موجود تھیں۔

## دورِ ملوکیت میں لکھی گئی یہ تفسیریں اور یہ تاریخ جو گزشتہ ہزار برس سے پیش کی جا رہی ہیں: ''رسولِ خدا نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور''

اِس دور میں آپ کے ہاں یہ تاریخ لکھی گئی' اس دور میں یہ تفسیر لکھی گئی اور اس دور میں یہ روایات لکھی گئیں۔ہاں تو بات عورتوں کی پٹائی کی ہو رہی تھی۔پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو صاحب! عورتوں کو دھڑا دھڑ مار شروع ہو جاتی ہے' وہ عورتیں بیچاری آپ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آتی ہیں اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں' تم بدلہ نہیں لے سکتیں۔تو یہ چیز ذہن میں آتی ہے کہ یہ بڑی زیادتی اور ظلم ہے۔یہ ذہن میں آیا تو آپ دیکھیے کہ اب اس بات کی تلافی کیسے ہو رہی ہے۔وہ یوں ہو رہی ہے' کہ یوں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **ارضنا امرًا و اراد الله غیر** کہ بھئی! ہم نے تو کچھ اور بات سوچی تھی' اب میں کیا کروں' خدا نے اس کے خلاف حکم دیدیا ہے۔تم بھی ماتھا پیٹو' میں بھی پیٹتا ہوں (یا اللہ یا اللہ!)

اے محمدؐ گر قیامت را براری سر زخاک!
سر بر آرد ایں قیامت درمیان خلق بیں!

ہزار برس سے تیری امت ان چیزوں کو سینے سے لگائے ہوئے' انہیں تیری طرف منسوب کیے چلی جا رہی ہے۔ اِسے قطعاً احساس نہیں ہے کہ ایک دن تیرے ﷺ سامنے بھی جانا ہے' خدا کے سامنے بھی جانا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ میں کیا کروں' مجھے قابلِ اعتراض کیوں مانتے ہو' میں نے تو کچھ اور چاہا تھا' خدا نے کچھ اور کر دیا۔ اُس نے کہہ دیا ہے کہ یہ عورتوں کے اوپر حاکم ہیں۔ عزیزانِ من! اس شانِ نزول کے بعد تفسیر طبری کے اندر یہ بات آئی کہ مرد حاکم ہیں' داروغے ہیں' ان کو حق حاصل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو اس طرح سے مار پیٹ کا حق ہے یہ تو جیل خانے کے داروغے کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی چھپ چھپا کر یہ کچھ کرتا ہوگا۔ یہ تو ہوئے الطبری اور اس کی تفسیر۔ اب اس کے بعد آپ کے ہاں شریعت کا حکم آ گیا کہ یہ مرد حاکم اور داروغے ہیں' یہ مار پیٹ سکتے ہیں' اس کی فریاد کہیں بھی نہیں کی جا سکتی' شریعت کا حکم ابدی ہے' غیر متبدل ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو اس کی تفسیر میں آیا ہے۔

## دینی سوچ سے پہلے پرویز صاحبؒ کے مذہبی دور کی کہانی اُن کی اپنی زبانی

اب آگے چلیے مجھ سے کہا جاتا ہے کہ تم جو یہ چیز بیان کر رہے ہو' یہ کس طرح سے بیان ہو رہی ہے۔ میں نے گزارش کی ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پہ میں جتنا بھی سجدۂ شکرانہ بجالاؤں' کم ہے کہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ قرآن کریم کی آیات کا مفہوم قرآن کریم کے اندر سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہ پہلی بات تھی جو علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے میرے کان میں پہلی دفعہ ڈالی۔ میں متشدد قسم کا مُلاّ تھا۔ یہ جتنی احادیث اور تفاسیر ہیں اور یہ ساری تاریخ ہے' انہیں میں اسی طرح سے پڑھا کرتا تھا' ان پہ اسی طرح سے عقیدہ بھی رکھتا تھا۔ جب مجھ میں شکوک اور اعتراضات کا دور شروع ہوا ہے تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکلی۔ علامہ اقبالؒ کا بہت بڑا احسان تھا جس نے یہ کہا کہ ان چیزوں کو چھوڑ دو۔ میں یہ بھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کہاں سے آئیں اور پھر یہ بھی بتاتا ہوں کہ کشتی کا لنگر صرف قرآنِ کریم ہے' قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ (1) تصریفِ آیات اور (2) محاورۂ عرب ہے۔ میری دعا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی لحد پر آسماں شبنم افشانی کرے۔

عزیزانِ من! میں اپنے متعلق یہ عرض کر رہا ہوں کہ مجھ پہ جو علامہ اقبالؒ کا احسان ہے' اس میں دو چیزیں ہیں۔ اب یہ چیزیں آئیں کہاں سے؟ اس کے لیے انہوں نے تاریخ میں میری راہنمائی کی' پھر دس سال کا میرا وہ دور جس میں' میں نے ایک ایک چیز کو جو اسلام کے اندر آئی ہوئی ہے' اس کا اصلی سرچشمہ' ان تاریخوں سے' اور ان چیزوں سے' خود نکالا۔ تصریفِ آیات کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم نے ایک جگہ جو کہا ہے' سارے قرآن کریم میں دیکھو کہ اس کے متعلق کیا کچھ کہا گیا ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سے پڑھنا شروع کیا۔ اللہ کا احسان ہے' یوں سمجھ لیجیے کہ چالیس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے اس انداز سے قرآن کریم پہ غور کیا ہے۔ اور اگلی چیز محاورۂ عرب تھی یعنی یہ دیکھو کہ اس دور میں جو زبانِ عربی تھی' اس میں ان الفاظ کے معنی کیا تھے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے اس لیے کہ خدا

نے کہا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو عربی مبین میں نازل کیا ہے تو وہ بڑی ضروری چیز ہے کہ وہ بھی دیکھی جاتی۔ اب وہ کیسے دیکھی جائے؟ یہ سب کچھ میں نے اس دوران میں کیا تھا۔

عزیزانِ من! یہ جو محاورۂ عرب والی بات تھی' یہ آگے ہے۔ اس سے پیشتر یہ چیزیں مجھے کہیں کہی ہوئی نہیں ملی تھیں' بہت تلاش کیا' جب نہیں ملیں تو قرآن کریم کی وہ تصریف کی چیز بھی میں نے خود کی۔ یہ وہ تبویب ہے جو میرے ہاں رجسٹروں کے رجسٹر لکھے ہوئے ہیں۔ میں یہ عرض کروں کہ اب آخری چیز' میں اس وقت آخری کہہ رہا ہوں' پتہ نہیں اللہ اور توفیق دے گا تو قرآن کریم کے متعلق کیا کرونگا' اس وقت مجھے چار پانچ برس ہوگئے ہیں' جسے 'تبویبِ قرآن' کہتے ہیں یعنی قرآن کریم کو Classify کرنا' میں وہ کر رہا ہوں' اس میں لگا ہوا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایک موضوع آپ کے ذہن میں آئے تو سارے قرآن کریم کی تعلیم اس کے نیچے آپ کو مربوط شکل میں مل جائے۔ اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں۔

اگلی چیز تھی جسے میں نے محاورۂ عرب کہا ہے کہ عربوں کے ہاں ان الفاظ کے معنی کیا تھے۔ یہ چیز غنیمت ہے کہ ہمارے پاس کچھ تو جاہلیتِ عرب کے زمانے کے شعرا کا کلام موجود ہے۔ اس زمانے میں کتاب تو کوئی لکھی ہوئی ہوتی نہیں تھی' عربی زبان میں قرآنِ کریم سب سے پہلی کتاب ہے' اس سے پہلے کوئی کتاب ان کے ہاں نہیں تھی۔ ان کے ہاں شعرآء کا جو کلام تھا' وہ عربی زبان کے اندر متداول چلتا تھا' وہ آگے منتقل ہوکر آیا اور شعر میں یہی بات ہے کہ وہ آگے سے آگے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نثر میں بھی تحریف ہو جاتی ہے اور بہت سے لوگ خود الفاظ بنا کر کسی کی طرف منسوب کرتے ہیں' لیکن شعر جو منتقل ہوکر آتا ہے وہ بالفاظہٖ منتقل ہوکر آتا ہے' وہ لفظوں میں منتقل ہوکر آتا ہے۔ ایک تو ہمارے ہاں یہ چیز بڑی Advantageous (سودمند) رہی کہ وہ جو قبل از اسلام کی عربی زبان کے شعرا کے کلام کا ایک ذخیرہ تھا' وہ منتقل ہوکر آگے آیا اور اس کے بعد جو ان کی بنیادوں پر ہمارے ہاں لغت مرتب ہوئے' ان میں سے ہر ایک نے تو نہیں البتہ جو زیادہ مبسوط لغت تھے' اس میں یہ کیا کہ زمانۂ جاہلیت کے اندر کی جو چیزیں ان کو سند میں ملیں' ان کے اعتبار سے بھی ان الفاظ کے معنی اس میں دے دیئے اور یہ بھی لکھا کہ تفسیر میں اس کے متعلق یہ آیا ہے' روایت میں اس کے متعلق یہ آیا ہے۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کا ایک ایسا لغت ہونا چاہیے جس میں یہ جو چیزیں ہیں' جن کو آپ تفسیر میں' یا روایت میں' تاریخ میں' شانِ نزول میں' جو کچھ آیا ہے' یہ تو اس کے اندر نہ ہو' لیکن اس میں یہ ہو کہ زمانۂ نزولِ قرآن کریم میں ان الفاظ کے معنی وہ عرب کیا لیتے تھے اور قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت کس طرح کی گئی ہے۔ اس لیے تصریفِ آیات اور محاورۂ عرب کی بنیادوں کے اوپر ایک لغت ہونا چاہیے۔

## (Lane) لین کے عربی لغت لکھنے کی جدوجہد بھری داستان

عزیزانِ من! میں اس کی بارگاہ میں پھر سرِ نیاز جھکاتا ہوں کہ یہ لغت مرتب کرنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے لیکن میں نے وہ لغات القرآن مرتب کیا۔ ذرا سنیے! ایڈورڈ ولیم لین (Edward William Lane) نے جب اپنا An Arabic-English Lexicon (عربی۔انگریزی لغت) لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میرے پاس فنڈز نہیں ہیں' لارڈ پرڈھو (Lord Pardhoe) جس کا نام الجرنان (Algernon) تھا' وہ وہاں کا ایک نواب تھا' اس نے اپنی ریاست اس کو دیدی۔ یہ کس لیے دی؟ انگریزی میں عربی کے لغت لکھنے کے لیے۔ یہ تو فنانسز تھے وہ گروہ ایڈورڈ ولیم لین مصر میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ کم از کم چالیس پچاس اسکالرز (علما) کا ایک گروہ تھا' اسے تیس سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ زمانے کی بدقسمتی دیکھیے کہ وہ حرفِ 'ک' تک پہنچا تھا کہ اس کی Death (موت)❶ ہوگئی۔ وہ لوگ تو ایک طرف رہے' اِدھر ہم میں سے بھی کسی کو توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ انہی لائنز کے اوپر' اس کا باقی حصہ بھی مکمل کر دیا جائے' باقی حصے کے متعلق وہ جو نوٹ (شذرات) چھوڑ گیا تھا' صرف وہی ہیں جو ایک جگہ دیئے❷ ہوئے ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان میں سے وہ لوگ جن کو علم کے ساتھ دلچسپی یا شوق یا جنون ہوتا ہے' وہ کیا کرتے ہیں؟ اب یہ لغت لکھا تو اس کو چھپوانے کے لیے اس نے یہ انتظام کیا کہ کوئی اور چھاپہ خانہ اس طرح سے نہیں چھاپ سکتا' اس کے لیے اس کا جو بھتیجا❸ تھا' یہ وہی ہے جو (Poole) پول Historian (مورخ) ہے۔ یہ اس کا بھتیجا تھا۔ اگر کسی نے پول کی History (تاریخ) پڑھی ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ شخص کتنا بڑا اسکالر (عالم) ہے۔ اُس نے اپنے اس بھتیجے کے ذمہ صرف یہ کام لگایا کہ اس لغت کو چھاپنے کے لیے جو ٹائپ ہے وہ مرتب کرو۔ اس نے اپنی نگرانی میں اس سے وہ ٹائپ مرتب کرایا' ایک چھاپہ خانہ بنایا' اس میں بہرحال یہ کام سرانجام دیا۔

## لغت کی تیاری کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی بے سروسامانی کا عالم' اس لغت کی افادیت اور نوعیت

میں کہہ رہا ہوں کہ لغت کا لکھنا کیا ہوتا ہے؟ سنیے! عزیزانِ من! یہ ایک فقیرِ بے نوا❹ دفتر کا ایک کلرک تھا لیکن میں محسوس کر رہا

---

❶ ڈاکٹر ایڈورڈ ولیم لین کی موت 1876ء میں واقع ہوئی۔

❷ اس کی مکمل توضیح کے لیے دیکھیے:

Lane, Edward William(1968). An Arabic-English Lexicon. Lebanon-Beirut: Librairie DU Leban.

❸ اس کا نام ہے: Mr.Edward Stanley Poole

❹ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے جب انہوں نے 1927ء میں انڈیا کی مرکزی حکومت (Central Sectariat) میں اپنی سروس کا آغاز کیا تھا۔

تھا کہ یہ لغت ہونا چاہیے۔ سارے ہندوستان میں قبل از تقسیم بھی یہ چیز رہی کہ میں نے ایک ایک سے یہ کہا کہ ایسا لغت تیار کرنے کی ضرورت ہے' کسی نے بھی ہمت نہ کی۔ میں بطورِ تحدیثِ نعمت یہ عرض کر رہا ہوں' کسی فخر کی بنا پہ نہیں کہ پھر آپ کو معلوم ہے کہ میں نے یہ لغت مرتب کیا' عربی زبان کی جتنی مستند کتب ہیں ان کے حوالے سے' ایک ایک لفظِ قرآن کریم کے وہ معنی متعین کر کے اس میں دیئے جو انہوں نے اس زمانے کی عربی زبان کی رو سے کیے تھے' جو نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں رائج تھی' اور ہر لفظ کے متعلق پھر یہ بتایا کہ قرآن کریم میں اس کی تفسیر کیا آئی ہے۔ یہ ہے **'لغات القرآن'**۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ جس نے آج قرآن کریم کے متعلق کچھ کرنا ہو' اسے کس نہج سے یہ کرنا چاہیے۔ میں نے بہرحال ایک بنیاد رکھ دی ہے' ایک طرح ڈالی ہے' آنے والے جو علم و فضل میں مجھ سے زیادہ آگے ہونگے وہ اس پر مزید عمارتیں استوار کریں گے۔ بنیاد ہے یہ جو میں نے عرض کیا ہے۔ یہ وہ لغت ہیں' ان کے اندر یہ چیز موجود ہے' جس کا جی چاہے 'لسان العرب' اٹھالے 'تاج العروس' اٹھالے' یہ کتابیں مستند ہیں' میرے لغت میں حوالے موجود ہیں۔

یہ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) اس لغت کے اندر دیا ہوا ہے۔ ان مرتبینِ لغت نے کہا ہے کہ قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ وَ قَامَ عَلَیْھَا کے معنی ہوتے ہیں ''مرد نے عورت کی کفالت کی' اس کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا' اس کے لیے رسد لایا۔ قوام کے معنی ہیں ''سامانِ رزق مہیا کرنے والا کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے''۔ قَامَ عَلَیْھَا ''وہ اس کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار ہوا' وہ اس کے رزق پہنچانے کا کفیل بنا'' اور پھر انہوں نے اس کی شانِ نزول وغیرہ بھی دی ہیں کہ شانِ نزول تو اس کی یہ آئی ہے' تفسیر میں یہ آیا ہے اور محاورۂ عرب میں اس کے لیے جو مرادف لفظ تھے' وہ آئے۔ بات صاف ہوگئی کہ تقسیمِ کار کی رو سے مَردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس کے معنی حاکم یا داروغہ (Darogah) نہیں ہیں۔ نیز قوم الشیء کے معنی ہیں ''کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا''۔

## مرد ہو یا عورت' قرآنِ حکیم کے نزدیک ہر بنی آدم واجب التکریم ہے

قرآنِ کریم نے پہلے' عورتوں اور مردوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (4:32) یاد رکھیے! Biologically' فطری طور پر' پیدائش کے اعتبار سے' ساخت کے اعتبار سے' مردوں کے اندر کچھ ایسے جوہر ہیں اور عورتوں میں بھی جن کے لیے بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ کہا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر تفضیل ہے۔ قرآن حکیم نے عورتوں اور مردوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے اور کہا یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر' اُس کو اِس پر' افضلیت ہے یعنی کچھ باتیں وہ ہیں جن کے اندر

مردوں میں یہ جوہر زیادہ ہیں' کچھ وہ باتیں ہیں جن میں عورتوں کو تمہارے اوپر افضلیت ہے۔اس لیے کسی طرح سے' اے عورتو! یہ نہ تصور کرلو کہ مرد ہم سے افضل ہیں' ہم تو کمتر ہیں۔عورت اپنے ذہن میں یہ بات تصور نہ کرلے جو پتہ نہیں کتنے ہزار سال سے اس کے دل میں راسخ کر کے رکھ دی گئی ہے کہ تم کمتر ہو' تم ذلیل تر ہو' تم حقیر تر ہو' تم بے وقوف ہو۔اور جب روٹی دینا اپنے ہی ہاتھ میں رکھ لیا جائے تو پھر تو وہ سب کچھ ہوتا ہے کہ یہ کم عقل ہے' کم تر ہے' ذلیل ہے' حقیر ہے' بے وقوف ہے۔اس کے بعد ظاہر ہے کہ ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'' (جس کے گھر اناج سے بھرے ہوں اس کے فاتر العقل بھی دانشور ہوتے ہیں)۔**مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ** (4:32) اس لحاظ سے نہیں ہے۔یہ فطری لحاظ سے ہے' یہ صلاحیتوں کے لحاظ سے ہے' یہ تقسیم کار کے لیے ہے۔

## عورت بھی اپنی محنت کے ماحصل کی خود مالک بن سکتی ہے

آگے پھر یہ کہا ہے کہ یہ اکنامک پرابلم (معاشی مسئلہ) ہے۔تم یہ کہتے ہو کہ جو عورتیں ہیں' یہ کچھ نہیں کما سکتیں' مرد ہی کمانے والے ہیں' ان کی ہی پراپرٹی ہوسکتی ہے سنو! کہا ہے کہ **لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبُوۡا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبۡنَ** (4:32) عورتیں کما کیوں نہیں سکتی ہیں؟ یہ کما سکتی ہیں' بشرطیکہ ان کے پاس فاضل وقت بچتا ہو' وہ اپنے جو فطری وظائف ہیں' تقاضے ہیں' ان کو پورا کرنے کے بعد کما سکتی ہیں' افزائشِ نسل کے بعد' ان کی پرورش اور تربیت' کے بعد' اگر وقت ہے تو ٹھیک ہے یہ اکتساب کرسکتی ہیں۔وہ اپنے اکتساب کی آپ مالک ہیں' تم ان کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔اور اس سے آگے یہی چیز ہے جو ہم نے کہی ہے کہ **مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ** (4:32) یہ تقسیمِ کار ہے' کچھ جوہر ان میں ہیں' کچھ جوہر اُن میں ہیں' گھر کی زندگی کے اندر تقسیمِ کار ہوگی' عورت اپنے فرائض کو سرانجام دے گی تو اس کا بہت سا وقت اس کے اندر صرف ہوجائے گا اور وہ ایسے فرائض ہیں جو تم چاہو بھی تو سرانجام نہیں دے سکتے اس لیے اس کے شکر گزار بنو۔وہ چاہے تو تمہارے فرائض کو سرانجام تو دے سکتی ہے لیکن اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ Indispensable (ناگزیر) ہے۔جب اس کو یہ سارا وقت دینا پڑے گا تو سوال یہ ہے کہ گھر کی زندگی میں تقسیمِ کار کیا ہو۔

## گھریلو زندگی میں تقسیمِ کار کے فرائض

عزیزانِ من! تقسیمِ کار یہ ہو کہ **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ** (4:34) عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت مردوں کے ذمہ ہوگی تاکہ عورتیں اپنے ان فرائض کی سرانجام دہی کے لیے فارغ ہوجائیں' مطمئن ہوجائیں۔یہ گھر کی زندگی میں تقسیمِ کار ہوگی جو قرآن حکیم نے کہی ہے۔یہ میں نے عمومی کہا ہے۔پہلے جب کہا ہے کہ عورت کما بھی سکتی ہے تو وہ یہ نقشہ نہیں ہے۔ٹھیک ہے وہ

Economically Independent (اقتصادی طور پر آزاد) بھی ہے لیکن گھر کی زندگی میں کہا کہ عمومی نقشہ یہ ہوگا تاکہ وہ اپنے فرائض کی تکمیل میں مطمئن ہو جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرد اس کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہو جائیں۔ اس لیے کہا ہے کہ بِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ (4:34) اور اس کے لیے بہرحال وہ جو کچھ کما کر لاتے ہیں ان کو صرف کرنا پڑے گا تاکہ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34)۔ اب ہم ان الفاظ کو الگ الگ لیتے ہیں کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔

## بیوی کی طرف سے خاوند کی اطاعت گزاری کا ذکر قرآن حمید میں نہیں ہے

عزیزانِ من! یہاں (4:34) میں کہیں نہیں لکھا کہ نیک عورتیں وہ ہیں جو اپنے خاوندوں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ یہ اس میں نہیں ہے' یہ ان کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ یہاں فَالصّٰلِحٰتُ کہا ہے یعنی جو اس عورت کے اندر صحیح صلاحیتیں ہیں' ضرورت اس کی ہے کہ یہ صلاحیتیں' جتنی بھی اس کے اندر بحیثیت عورت ہیں' یہ ان فرائض کی سرانجام دہی کے لیے صرف کرے جو یہی سرانجام دے سکتی ہے' مرد سرانجام نہیں دے سکتے۔

## قٰنِتٰتٌ کا لغوی اور قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن مجید کا لفظ دیکھیے اور جھوم جائیے۔ لفظ ہے قٰنِتٰتٌ۔ ہمارے ہاں اس لفظ کا ترجمہ فرمانبردار ہو گیا۔ عربی محاورے کی رو سے وہ لوگ لفظِ قٰنِتٰتٌ ان معنوں میں استعمال کرتے تھے کہ وہ صحراؤں میں جاتے' وہاں پانی کی بڑی کمی ہوتی تھی' ان کے ہاں مشکیزہ ہوتا تھا' مشکیزے میں پانی بھرتے تھے' ان کے ہاں سقاء قٰنِتٰتٌ لفظ تھا' کہ یہ ایک ایسا مشکیزہ ہے جسے پانی بھرنے کے بعد اس طرح سے بند کیا جائے کہ راستے میں جہاں ضرورت نہیں' وہاں تو اس میں سے ایک قطرہ نہ ٹپکے اور جہاں اس کی ضرورت ہو' وہاں اس کا منہ کھول دے' نہ ایسا ہو کہ راستے میں ٹپکتا چلا جائے' نہ ایسا کہ پیاس لگی ہوئی ہے منہ نہ کھلے' جہاں ضروری نہیں محفوظ رہے جہاں ضرورت ہے سحابِ کرم بن کر سامنے آئے۔ یہ ہے قٰنِتٰتٌ اور ایسا کرنے والی ہیں قٰنِتٰتٌ یعنی اس مقصد کو پورا کریں جس کے لیے انہیں وہ صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ وہ عورتیں اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کر کے' انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانینِ خداوندی کی رو سے ملے۔

ہمارے ہاں ایک تو یہ صالح کا لفظ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! کہ ان تصورات کو Reconstruct (از سرِ نو تشکیل) کرنا پڑے گا۔ آپ کو قرآن مجید کے تصورات کو' ترجموں کی رو سے نہیں لینا ہوگا' آپ کو متداول معنی کی رو سے نہیں لینا ہوگا' انہیں Reconstruct (از سرِ تشکیل) کریں گے۔ ''صلاحیت'' کا یہ لفظ تو آپ بولتے ہیں اور جب عملِ صالح آتا ہے تو ذہن میں

کچھ اور نقشہ آجاتا ہے' آپ کے ہاں صالح ایک خاص ٹائپ بن گیا ہے۔ میں اس دور کی بات نہیں کرتا جو اس سے ذرا پہلے صالحین ہوتے تھے۔ اس کے معنی صلاحیت بخش کیوں نہیں لیے جاتے' مثلاً اس کی صلاحیتیں (Potentialities) ۔صلاحیتیں تو ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں' کافر و مومن کے اندر ہوتی ہیں' آگے ان کا مصرف ہے' یہ مصرف قٰنِتٰتٌ ہے کہ یہ عورت کی صلاحیتیں ہیں' جہاں ان کے صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ انہیں وہاں صرف کرے۔ اور جہاں ضرورت نہیں ہے' وہاں وہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34) ہو یعنی خدا نے ان کے تحفظ کا یہ کہہ کر انتظام کر دیا ہے کہ وہ اَلرِّجَالُ (4:34) مرد تو قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) ہیں' وہ عورتوں کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائیں گے۔ جب یہ کچھ بھی ہم نے کر لیا' تمہارے اندر فطرت نے پیدائش میں خاص صلاحیتیں دی ہیں' وہ خاص فرائض کی سرانجام دہی کے لیے ہیں لہٰذا ان کی محافظت کرو کیونکہ اس تقسیمِ کار کی رو سے خدا نے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا اور اس لیے تمہیں قٰنِتٰتٌ ہونا چاہیے۔

## عورت کی اولین ذمہ داری افزائشِ نسل اور اس کی تربیت ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حمید یہ کہہ کر کیا کہتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34) دیکھ لیجیے یہ صلاحیتیں وہ ہیں جو تمہاری جگہ کوئی دوسرا سرانجام نہیں دے سکتا' جو Opposite Group (جنس مخالف) ہے' وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکتا' تم ہی نے دینا ہے' افزائشِ نسلِ انسانی نہایت ضروری ہے' بچوں کی تربیت نہایت ضروری ہے کہ امت تم سے بنتی ہے' تم نے آنے والی امتوں کو' قوموں کو' متشکل کرنا ہے' تم میں یہ صلاحیتیں دی گئی ہے' مرد کا کام تو صرف باہر جا کر کمانا ہے' یہ افزائشِ نسل کے' پرورش کے' تربیت و تعلیم کے فرائض تمہیں سرانجام دینے ہیں' کہا ہے کہ ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ (4:34) اس طرح سرکشی اختیار کرنے کی تحریک تمہارے اندر جاری ہو جائے کہ نہیں صاحب! یہ افزائشِ نسل والی بات غلط ہے' ہم مردوں کے کام کریں گی۔ اگر تم مردوں کے کام کرو گی تو فطرت کے پروگرام کی رو سے تمہارا کام کون کرے گا۔ کہا ہے کہ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ (4:34) جس عورت سے تمہیں سرکشی کا تخافون ہو یعنی اس نے تمہیں یہ اختیار نہیں دیا' ذرا اس کا احساس ہوا' ڈر ہوا کہ ہاں کچھ تیور ایسے نظر آتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ چیز فطرت کی تقسیمِ کار کی ہو رہی ہے اور اس کے بعد معاشرے کو یہ حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ میاں بیوی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ اَلرِّجَالُ اور النِّسَآءِ کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ایک تقسیمِ کار کا ذکر ہے' ایک معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے تو اس کے باوجود اگر کسی سے بغیر کسی قسم کے عذر کے یہ کیفیت ہو' اگر کہیں یہ چیز پیدا ہو تو آگے آئی ہے اس کی تفصیل۔

## یک سوئی کے ساتھ فرائضِ فطرت کو سرانجام دینا

کہا ہے کہ وَ لَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (4:32) اور جو دوسرے کے جوہر ہیں' خواہ مخواہ ان کی تمنا نہ کرو' نہ اس طرح کی ہوس لے آیا کرو۔ فطرت کے فرائض سرانجام دیا کرو۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو کہ یہ چیز کچھ اس قسم کی چلی جا رہی ہے' رجحان اس طرف سے آ رہا ہے کہ عورتیں بلا کسی معقول وجہ کے افزائشِ نسل سے سرکشی اختیار کر رہی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ فَعِظُوۡهُنَّ (4:34)۔ یہ معاشرے کو حکم دیا جا رہا ہے' یہ ایک خاوند کو حکم نہیں ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ عورتوں کے متعلق یہ حکم ہے۔ معاشرے سے کہا گیا ہے کہ فَعِظُوۡهُنَّ (4:34) انہیں سمجھاؤ بجھاؤ' انہیں دلائل دو۔ اگر وہ اس سے سرتابی کریں تو وَ اهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ (4:34) ان کو ان کی خوابگاہوں کے اندر الگ چھوڑ دو۔ وہ تو خاوندوں کو ساتھ لائیں گے' خاوندوں کی شمولیت ہوگی تو پھر یہ چیز ہوگی ان سے اس قسم کا جنسی تعلق قطع کر لو۔ یہ جو چیز ہے' یہ محبوس کر دینے کی بات ہے جسے قرآن حمید نے پہلے بھی کہا ہے کہ جن سے تمہیں کسی قسم کا خطرہ ہو کہ کچھ بے حیائی کی بات نہ ہو جائے' تو ان کو گھروں میں روک لیا کرو' آگے کہا ہے کہ وَ اضۡرِبُوۡهُنَّ (4:34) ۔ یہ اگلا Step (قدم) ہے' معاشرہ جو بھی اس کے لیے مناسب سمجھے' وہ کرے۔ اور کہا ہے کہ اگر یہ بات بھی نہ ہو اور یہ برائی سر بھی چڑھتی جائے تو معاشرے کو' عدالت کو' حکومت کو' یہ کہا گیا ہے کہ پھر تم بدنی سزا بھی دے سکتے ہو۔ آگے کہا ہے کہ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ (4:34)۔ یہ اَطَعۡنَکُمۡ کس کے لیے ہے؟ یہاں خاوند کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آ رہا۔ جب وہ اس پر آمادہ ہو جائیں کہ نہیں! ٹھیک ہے' اس کے لیے آ جائیں' وہ قانون کی اطاعت کریں تو فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡهِنَّ سَبِیۡلًا (4:34) خواہ مخواہ محض اس لیے کہ وہ عورتیں ہیں' ان پر ہاتھ نہ اٹھاؤ' پھر تم قطعاً ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا (4:34) یاد رکھو! خدا کے قوانین غالب ہیں' وہ بالا دست ہیں' وہ اس نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق اس کی شکل یہ ہے' قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے' یہ ہیں ان الفاظ کے معنیٰ' جس کا جی چاہے کتبِ لغت میں اٹھا کر دیکھ لے۔

## قرآنی تعلیم انسانوں میں یک نگہی پیدا کرتی ہے لہٰذا ازدواجی زندگی کا ماحصل باہمی رفاقت مؤدت' سکینت اور رحمت ہے

اب سوال یہ ہوگا کہ ان لغات کے اندر جب یہ معانی دیئے ہوئے ہیں کہ یہ ہیں ''لسانِ عربی'' کی رُو سے ان کے معانی' اور دوسرا یہ کہ وہ معنی جو کسی روایت کی رو سے' کسی شانِ نزول کی رو سے' ہیں تو میں نے لسانِ عربی کی رو سے جو معانی ہیں' انہیں کیوں ترجیح

دی؟ میں کیوں تصریفِ آیات کو ترجیح دیتا ہوں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ مفہوم وہ درست ہوگا جو قرآن حمید کی دوسری تعلیم اور آیات کے مطابق ہوگا کیونکہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ میرے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں یہی نہیں کہ دو اختلافی حکم نہیں ہیں بلکہ قرآن حکیم کے اندر تعلیم کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ ایک جگہ تو ایک قسم کی ذہنیت پیدا کرے' دوسری طرف کچھ ایسی تعلیم دے کہ اس کے خلاف دوسری ذہنیت پیدا ہو رہی ہو۔ قرآن کریم یہ کبھی بھی نہیں کرے گا۔ اس لیے قرآن حکیم کی ان چیزوں پہ کھڑے ہو کر پہلے یہ دیکھیے اور جب آپ یہ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے اور لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) اگر اس میں ذرا سی بھی کراہت ہو تو وہ جو عورت ہے' وہ تمہارے لیے حلال نہیں رہ جاتی کہ تم اس کے مالک بن بیٹھو۔

عزیزانِ من! یہ ازدواج کا باہمی رشتہ ہے' رفاقت کا ہے اور اس کا نتیجہ مؤدت ہے' سکینت ہے' رحمت ہے۔ جب قرآن کریم یہ چیز کہتا ہے' اور پھر قانوناً کہتا ہے کہ ان کے حقوق اور ذمہ داریاں مساوی ہیں تو اس ساری تعلیم کو سامنے رکھیے' ان الفاظ کے معنی کتب میں دیکھیے کہ ''لسانِ عربی'' کی رو سے یہ معنی اس زمانے میں متداول تھے' وہ عرب اس لفظ کو یا ان دو لفظوں کو' ان معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اور اس کے بعد جو تفاسیر یا روایات رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں' اگر یہ روایات قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف جاتی ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتیں[1]۔

اس لیے اس نگاہ سے جو قرآن کریم پہ غور کرنے والا ہے' وہ کہے گا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتی۔

عزیزانِ من! یہ ہے میری بصیرت کے مطابق اس آیت کے معانی اور یہ ہے اس کا مفہوم۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**

❀......❀......❀

---

[1] اس درس کی ریکارڈنگ یہیں تک ہے (محمدؐ ہارون ریاض: سی ڈی۔ CD۔ سے Transcribe 'ریکارڈ' کرنے والا)۔

# بارھواں باب: **سورۃ النسآء** ((1)' آیات 35 تا 42)

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝٣٥ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۝٣٦ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝٣٧ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝٣٨ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝٣٩ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا
وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝٤٠ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝٤١ يَوْمَىِٕذٍ
يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝٤٢

عزیزانِ من! آج ستمبر 1970ء کی 6 تاریخ ہے۔ 6 ستمبر کی نسبت سے' سب سے پہلے میری طرف سے' آپ تمام احباب کو استقلالِ پاکستان مبارک ہو۔ اس وقت میں صرف اس ہدیۂ تبریک کے پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں کیونکہ آج شام کو ساڑھے سات بجے' جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے' Y.M.C ہال لاہور میں ہم ایک اجتماع منعقد کر رہے ہیں' جس میں جنگِ ستمبر کے شہداء اور غازیوں کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا۔ اس مبارکباد کی تفصیل میں وہاں عرض کرونگا۔ آج درس کا آغاز سورۃ النسآء کی 35 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:35)۔

جیسا آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ النسآء کی ان ابتدائی آیات میں عائلی زندگی کے متعلق احکام اور ہدایات دی گئی ہیں اور جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا' قرآنِ کریم نے زندگی کے بڑے بڑے اہم معاملات کے متعلق بھی عام طور پر اصولی راہنمائی پر اکتفا کیا ہے لیکن عائلی زندگی اس کے نزدیک ایسی اہم ہے کہ اس کے متعلق احکام دیئے اور احکام کی جزئیات اور تفاصیل بھی خود دیں۔ اسے پھر دہرا دوں کہ جسے آپ معاشرہ' اس کے بعد قوم' اس کے بعد انسانیت کہتے ہیں' اس کی اولیں منزل گھر کی زندگی ہوتی ہے' جس قسم کی گھر کے اندر کی زندگی ہو' اسی قسم کا معاشرہ ہوتا ہے۔ صبح کے وقت جب ہم باہر نکل جاتے ہیں تو اس وقت ہمیں معاشرہ کے افراد کہا جاتا ہے اور

شام کو جب ہم گھروں میں آ جاتے ہیں تو پھر ہم گھر کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ جو ہم نے گھروں کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں' یہ تو پرائیویسی کے لیے ہیں' ان دیواروں کو اگر درمیان سے ہٹا دیا جائے تو اسی کا نام معاشرہ ہوتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ گھروں کی زندگی جہنم کی زندگی ہو اور معاشرے کی زندگی جنتِ ارضی کا نمونہ پیش کرے۔

## معاشرے میں ہیرو وہ ہے جو گھریلو زندگی کے علاوہ اپنے ماتحتوں کی نظروں میں بھی ہیرو ہو

جنت کی زندگی گھروں سے شروع ہوتی ہے اور انسان کی اصل سیرت' کردار اور کیریکٹر کی پہچان بھی گھر کے اندر کی زندگی سے ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ ہیرو وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی یا اپنے نجی ملازم کی نظروں میں ہیرو ہو اور دنیا کے عظیم ترین' سب سے بڑے ہیرو' حضورِ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ اقدس کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کے دعوے پہ سب سے پہلے بیوی ایمان لائی تھی۔ عائلی زندگی قرآن حمید کے نزدیک بڑی اہم ہے اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' وہ اس کی جزئیات تک خود بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی کے لیے جس کا ترجمہ ہی رفاقت کی زندگی ہے' قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ اس میں ہم آہنگیِ فکر و نظر' مزاج اور طبائع کی یک رنگی' خیالات کی یک نگہی' نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی اس گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں اور زوج کے تو معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ ایسی دو چیزیں کہ جن میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسری ناتمام اور نامکمل رہ جائے۔ اس کے لیے انتخاب ایسا ہونا چاہیے کہ یہ دونوں پہیے جیسا کہ وہ گاڑی بنانے والا دیکھتا ہے کہ اگر اس میں ایک سُوت ❶ کے برابر بھی فرق ہو تو گاڑی میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے' انتخاب اس قسم کا ہونا چاہیے' پھر گھر کا نقشہ باہمی مؤدت' سکینت اور رحمت کا ہوتا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح آپ کے سامنے کئی مرتبہ آ چکی ہے۔

## زندگی میں سب سے بڑا عذاب' گھریلو زندگی میں قدروں کے مشترک نہ ہونے یا تصورات کے متضاد ہونے کا ہے

اس کے باوجود قرآن مجید انسانی طبائع کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ بہر حال سب کچھ دیکھ بھال کر لینے کے باوجود' ہو سکتا ہے کہ ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ باہمی اختلاف ہو۔ ایک ازدواجی زندگی تو ہندومت اور عیسائیت کی تھی کہ ایک دفعہ کا یہ بندھن اٹوٹ ہو جاتا ہے' ٹوٹ نہیں سکتا یعنی اختلافات ہوں' مناقشات ہوں' لڑائی اور جھگڑے بھی ہوں' نظر آ جائے کہ کوئی شے ایسی نہیں جو دونوں میں رفاقت و مؤدت کے تعلقات پیدا کر سکے لیکن یہ رشتہ ایسا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ آپ سوچیے تو سہی' آپ کسی ایسے ہمسائے کی ہمسائیگی میں دن بسر نہیں کر سکتے جس کے ساتھ آپ کی نبھ نہ رہی ہو' سفر میں مسافر گاڑی کے ایک ڈبے میں' آپ دو گھنٹے تک ایسے مسافر کے ساتھ نہیں

❶ سُوت۔ (ہ۔ا۔ مذکّر) تُسُو (ڈیڑھ انچ) کا سولھواں حصہ۔

چل سکتے جس کے ساتھ کسی طرح سے آپ کو مناقشہ پیدا ہوگیا ہو' آپ سڑک پہ کسی ایسے شخص سے آمنا سامنا کرنا Avoid (اجتناب) کرتے ہیں جسے آپ پسند نہ کرتے ہوں لیکن اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود تمہیں اس رفیقِ زندگی کے ساتھ پوری زندگی نبھانی ہوگی' بسر کرنی ہوگی جس میں کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں ہے تو اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ قرآن حمید ہے جس نے اتنی تاکید اور اہمیت کے ساتھ انتخاب کے باوجود اس امکان (Possibility) کو نظر انداز نہیں کیا کہ پھر بھی اختلاف پیدا ہوسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اختلاف کی شکل میں کیا کیا جائے؟

## اختلافات کی شکل میں جذباتی طور پر کوئی فریق اپنا فیصلہ درست نہیں کر سکتا

آپ دیکھیے کہ انتخاب کی صورت میں تو وہ معاشرے کو درمیان میں نہیں لایا' بالکل ذاتی چیز ہے' انفرادی چیز ہے لیکن جب آپس میں مناقشہ یا افتراق ہوا ہے تو یہ جذباتی چیز ہے' کوئی بھی دو ہوں' ان میں اگر اختلاف پیدا ہوتا ہے تو کوئی تیسرا ہونا چاہیے جو Objectively (معروضی طور پر) اس چیز کو دیکھے۔ ایک چیز ہے' جسے Subjectively (داخلی طور پر) کہتے ہیں یعنی جذباتی طور پہ کہ انسان خود ہی اپنے متعلق کسی معاملے کا کوئی فیصلہ کرے۔ جس معاملے میں انسان کے جذبات الجھے ہوئے ہوں' اس میں وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا' ایسا فیصلہ جذبات کے تابع ہوتا ہے' عقل اور فکر و ہوش اور تدبر کے تابع نہیں ہوتا۔ اسی لیے جب جذباتی اختلاف پیدا ہو یا کوئی ایک فرد ہی شدتِ جذبات میں ہو' تو پھر اُس کو کوئی فیصلہ خود نہیں کرنا چاہیے' اپنے فیصلے کے متعلق کسی دوسرے سے کہنا چاہیے جس پہ بھروسہ ہو' وہ اسے Objectively (خارج سے) دیکھتا ہے' باہر کھڑا ہوا دیکھتا ہے' وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس معاملے میں اسے کیا کرنا ہوگا۔ آنکھوں کے ساتھ اگر آپ کاغذ لگا لیتے ہیں تو آپ پڑھ نہیں سکتے' اُسے کچھ دور رکھنا پڑتا ہے' یہ تیسرا شخص اس کاغذ کو دور رکھتا ہے' یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں اختلاف کیوں ہوا' شدت کیوں اختیار کر رہا ہے' مصالحت کی شکل کس طرح سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ دونوں از خود نہیں کر سکتے' جن میں تکرار اور اختلاف پیدا ہوگیا ہے' انہیں تو اگر اپنے معاملے خود سلجھانے کے لیے کہیں گے تو یہ اور الجھاتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے قرآن کریم جس مقام کے اوپر وہ کہتا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا (4:35) اگر تم محسوس کرو کہ ان کے درمیان مناقشہ پیدا ہو رہا ہے' شقاق کی حد تک اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ ایک اختلاف تو یونہی چھوٹے سے معاملے میں ہوتا ہے کہ آج کیا پکایا جائے اور ایک شقاق کی یہ صورت ہے' شق ہو جانے والی یہ بات ہے کہ کپڑا اپھٹ رہا ہو۔

## اختلافات کی شکل میں پھر 'خِفۡتُمۡ' کا کردار ایک لازمی جز ہے

اگر تم محسوس کرو کہ ایسی صورت پیدا ہونے والی ہے' یہاں خِفۡتُمۡ ہے کہ تمہیں احساس ہو' اور ڈر ہو' خطرہ ہو' کہ ایسی صورت نہ

پیدا ہوجائے تو اس معاملے کو ان دونوں کے درمیان نہ رہنے دو کہ دونوں ہونگے تو کشاکش ہونگی' ایک دوسرے کے قریب نہیں آئیں گے' دن بدن دور ہٹتے چلے جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ خفتم جو قرآن حکیم نے کہا ہے' یہ تیسری پارٹی ہے' ثالث ہے' باہر کے ہیں' معاشرہ ہے' نظام ہے' حکومت ہے' عدالت ہے۔ نظام یا معاشرے کو کہا گیا ہے کہ جب تم یہ محسوس کرو تو **فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا** ج (4:35) تم ایسا کرو کہ ثالث مقرر کرو: ایک نمائندہ بیوی کے خاندان کا' ایک نمائندہ خاوند کے خاندان کا ہو **فَابْعَثُوْا** تم یہ کچھ کرو' اس سے باہمی مصالحت کی امکانی شکل نکل آئے گی۔

## موجودہ قوانینِ شریعت میں نکاح کے بعد ون وے ٹریفک ہوتی ہے

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں جنہیں آپ قوانینِ شریعت کہتے ہیں یا فقہ کہتے ہیں' اس کی رو سے ان دو فریقوں میں' جنہوں نے اپنی کامل رضامندی سے اس معاہدہ' جسے نکاح کہتے ہیں' کو طے کیا تھا۔ اس نکاح کے بعد ون وے ٹریفک کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ خاوند کو پورا حق اور اختیار ہوتا ہے' جب جی چاہے کھڑے کھڑے طلاق طلاق طلاق کہے' اور قصہ ختم کردے۔

## طلاق کے معاملے میں عورت کی بیچارگی اور مرد کی بیباکی اور پھر عورت کے لیے اذیت ناک شرائط کے فتوے

آپ غور فرمایئے۔ جو دوسرا فریق ہے' جسے بیوی کہا جاتا ہے' جس کی رضامندی کے بغیر یہ معاہدہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' اس معاہدے پر دستخط کرنے یا ہاں کرنے کے بعد اس کی کیفیت یہ ہوگئی کہ اگر اس کو واقعی کوئی جائز شکایت بھی ہے' یہ اس مقام پہ پہنچ چکی ہے کہ یہاں نباہ نہیں ہوسکتا تو یہ مرد کی طرح سے اس معاہدے کو نہیں توڑ سکتی' اسے اس کے لیے ہزار جتن کرنے پڑیں گے۔ اور عورت کی پوزیشن تو ویسے ہی نازک ہوتی ہے۔ مرد تو اس کو Afford (فراہم) کرسکتا ہے کہ جب جی چاہے وہ کہے ''طلاق طلاق طلاق'' معاملہ ختم ہوا' عورت کو تو ہزار باتیں سوچنا پڑتی ہیں' وہ بے سہارا رہ جاتی ہے۔ عام معاشرے کے اندر بچوں کا مسئلہ اس کے سامنے ہوتا ہے کہ کہاں جائے؟ شادی کے تھوڑے عرصے کے بعد' وہ شادی کی عمر سے بھی آگے چلی جاتی ہے یعنی وہ تو اگر اس معاملے پہ پہنچے گی تو کچھ سوچ سمجھ کر پہنچے گی۔ اس کے لیے راستے میں اتنے موانعات ہیں کہ وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی جبکہ مرد کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ جب جی چاہے یہ کہہ لے اور معاملہ ختم ہوجائے۔

اور پھر عزیزانِ من! اس کے بعد جسے میں کئی دفعہ دہرا چکا ہوں' بیٹیوں اور بہنوں کے سامنے دہراتے ہوئے شرم بھی آتی ہے' اس نے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہا' دو ہی گھنٹے کے بعد ہوش آجاتا ہے' میاں صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے لیکن آپ کی اس تیزی کا اسے جو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور جس شکل میں ہے' اس سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس بیچاری بے گناہ کو جس کے اب بال

بھی شاید سفید ہو چکے ہوئے ہیں' جب اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ دوبارہ اس کے نکاح میں اس صورت میں آ سکتی ہو کہ ایک شب کہیں اور کسی کے ساتھ بسر کرو' جسے حلالہ کہا جاتا ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ یہ ہے وہ جسے ہمارے ہاں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے' کہ یہ ہے قرآن حمید کا وہ حکم جو بہ نصِ صریح موجود ہے کہ اس سے پہلے یہ کرنا ہوگا مگر قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر اختلاف پیدا ہوا ہے تو ثالث مقرر کرو' وہ مصالحت کی شکل پیدا کریں اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا (4:35) اگر وہ مصالحت کے لیے ارادہ رکھیں' کوشش کریں یہ دونوں بھی اور وہ ثالث بھی' تو کہا ہے کہ خدا اس میں ایسی توفیق دیدیگا کہ کسی طرح سے نبھا ہو جائے یعنی خود خدا چاہتا ہے کہ ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا (4:35) یہ بات ہم نے یونہی نہیں کہدی' ہم جانتے ہیں' ہم اس چیز سے آگاہ ہیں کہ جذبات کیسے بھڑک اٹھتے ہیں' پھر بھڑکے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کیسے کیا جاتا ہے' مصالحت کی شکلیں کیسے نکلا کرتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں' جان بوجھ کر' یہ چیز دیدہ دانستہ علم رکھتے ہوئے' خبر رکھتے ہوئے' ہم نے یہ قانون دیا ہے مگر یہ ہیں کہ کہیں گے کہ ان اللہ میاں کو کیا خبر ہے ''نہ کدی ویاہ کرایا' نہ کدی بیوی گھر آئی' قانون دین لگ پئے'' (نہ کبھی شادی کرائی' نہ کبھی بیوی گھر آئی مگر وہ ہیں کہ قانون دینے لگے ہیں)۔ یہی کہتے ہیں (معاذ اللہ)۔ وہ تو ہم جانتے ہیں کہ مرد کو یہ حق حاصل ہے۔

## مروجہ عائلی قانون کی مخالفت کی تفصیل

ہمارے ہاں ایک عرصے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا سی کوشش ہوئی تھی کہ عائلی قوانین کو قرآن کریم سے ذرا قریب لایا جائے۔ جنہیں آپ Family Laws کہتے ہیں جن کا نام عائلی قوانین تھا' یہ 1961 میں نافذ ہوئے تھے' ایک کہرام مچ گیا تھا۔ کس بات کے خلاف؟ کہ اس میں کہا یہ گیا تھا کہ بھئی! یونہی اس کو کھڑے ہو کر طلاق طلاق طلاق نہ کہہ دیا کرو' ایسی صورت اگر اختلاف کی' تنازعہ کی' شقاق کی' مناقشہ کی' پیدا ہو جائے تو اس کے لیے ایک نمائندہ تم میں موجود ہے' جسے مصالحتی کونسل کا چیئرمین کہا جاتا ہے۔ اپنے اس ارادے سے اس کو اطلاع دیدیا کرو۔ اس کا فریضہ تھا کہ وہ پھر ایک نمائندہ میاں کی طرف سے' ایک نمائندہ بیوی سے لیتا اور ان دونوں نمائندوں کو بلا کر کوشش کراتا تھا کہ ان میں مصالت کی شکل پیدا ہو جائے۔ تین مہینے تک اس کی یہ کوشش جاری رہتی۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا کہ کوئی صورت نباہ کی نہیں ہے تو پھر یہ نکاح' یہ معاہدہ' منسوخ ہوتا تھا' جسے طلاق کہتے ہیں۔ یہ اس میں ایک شق رکھی ہوئی تھی۔ میں پوچھتا ہوں آپ احباب سے اور جسے جی چاہے آپ پوچھیے کہ قرآنِ کریم کی یہ جو آیت ہے کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ج (4:35) کیا یہ اس کی ہی عملی شکل نہیں تھی جو اس میں تجویز کی گئی تھی۔ اس کی بھی مخالفت ہو رہی تھی اور آج جو سب سے بڑا کارنامہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سرانجام دیں گے' اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے' تو وہ یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے ان عائلی قوانین کو

منسوخ کریں گے۔

## پارلیمان میں عورتوں کا آنا اشد ضروری ہے تاکہ وہ اپنا تحفظ خود کر سکیں

جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مشکل یہ ہے کہ ہماری بہنوں بیٹیوں' ہماری خواتین' ہماری عورتوں بیچاریوں کے ذہن میں تو یہ رکھا گیا ہے کہ ''چولہے چوکے'' کے باہر ان کی دنیا ہی نہیں ہے ورنہ اگر یہ بھی اپنی آبادی کے تناسب سے پارلیمان میں چلی جائیں اور وہاں ان کی اکثریت بھی ہو سکتی ہے اور اگر نہ بھی ہو تو کُل کا برابر تو ہو سکتا ہے تو پھر ان سے پوچھا جائے کہ وہاں پہنچنے کے بعد آپ کیا قانون رکھ سکتے ہیں اور کونسا قانون منسوخ کر سکتے ہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ وہاں بھی نمائندگی ساری مردوں کی ہوتی ہے' ان بیچاریوں کی وہاں نمائندگی نہیں ہوتی۔ اب بھیک کا ٹکڑا پھینکا گیا ہے کہ صاحب! پارلیمان میں ان کو دس سیٹیں Nomination (نامزدگی) سے دیدی جائیں گی۔ ان کے متعلق قوانین بنانے والے تمام مرد ہیں' منسوخ کرنے والے بھی پھر وہی مرد ہیں' جو یہ عزم لے کر جا رہے ہیں کہ ان عائلی قوانین کی دو ہی چیزیں ہیں' جن پر ان کو بڑا رنج اور بڑا غصہ ہے۔ ایک یہ ہے کہ مرد کے حقوقِ طلاق پر اس قسم کی مداخلتِ بے جا' کسی صورت میں روا نہیں رکھی جا سکتی (یا اللہ!!!) اور دوسری چیز یہ ہے کہ مرد کا جب جی چاہے چار تک بیویاں کر سکتا ہے۔ ان عائلی قوانین میں اتنا ہی کہا گیا تھا کہ عدل کا تقاضا یہ ہے اور کچھ نہیں تو جو پہلے گھر میں ہے' کم از کم اس کی رضامندی تو ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ تم ہمارے حقوق کے اندر دخل اندازی کرنے والے کون ہوتے ہو۔

بات یہاں یہ ہو رہی تھی کہ اگر اختلاف پیدا ہو جائے اور آپ نے غصے میں آ کر تین دفعہ طلاق کہا تو مروجہ قوانینِ شریعت سے تو طلاق ثلاثہ پڑ گئی۔ اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ ''آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر''۔ اِن عائلی قوانین میں اس مسئلے کے حل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو کہا گیا ہے کہ تم اس کے اندر دخل دو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کسی حکومت کا فریضہ تھا جو اپنے آپ کو اسلامی کہے یا اسلام کے قوانین کو نافذ کرنا چاہے۔ یہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ ایسی شکل پیدا کرے کہ جہاں کہیں بھی میاں بیوی میں اختلاف اور شقاق کی صورت نظر آئے' فوراً ثالث مقرر کرے' ان میں اصلاح کی صورت پیدا کرے۔ اس کے بعد اگر دیکھا جائے کہ نباہ کی شکل نہیں ہے تو ٹھیک ہے' پھر یہ صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

برادرانِ عزیز! اس آیت کے ساتھ یہ جو عائلی قوانین تھے' جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ یہاں تک مسلسل چلے آ رہے تھے۔ اس موضوع کے لیے یوں سمجھیے کہ یہ آخری آیت ہے' شدہ شدہ مزید باتیں آگے بھی آئیں گی' جوں جوں آئیں گی وہ ہم سامنے لاتے چلے جائیں گے۔

## میاں بیوی کے تعلقات کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے بعد والدین' عزیز و اقارب اور ہمسائے سے تعلقات کا ذکر

اب میاں بیوی کا جو معاملہ ہے' قرآن کریم اس سے آگے بڑھا ہے اور اب عزیز اور اقربا تک چلا ہے۔ یوں کہیے کہ گھر کی دیواروں کو ذرا اِدھر اور اُدھر سے ہٹا کر معاشرے میں ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا پروگرام کس طرح درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا ہے۔ قرآن کریم کی آیات کے اندر جو تسلسل ہے' اس میں بھی جو تدریج ہے' یہ قابلِ غور ہوتا ہے۔ خالص میاں بیوی کے بعد آگے ماں باپ' عزیز و اقارب' ہمسائے اور معاشرے کے لوگ آتے ہیں۔ بنیاد یہ تھی۔ اس بنیاد کو محکم کرنے کے بعد' ضروری ہدایات دینے کے بعد' الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی تدبیریں بتانے کے بعد' اب وہ میاں بیوی سے آگے اقربا تک آیا ہے۔ اس میں ایک یہ بنیادی چیز دی کہ وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا (4:36) اس چیز کو یاد رکھو کہ تم نے اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کرنی ہے۔

## وہ تمام مروجہ عقائد اور نظریات جنہیں ہم نے صدیوں سے اسلام کا درجہ دے رکھا ہے

میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے' سورۃ الفاتحہ میں تو ایک پورا درس [1] اس پر تھا کہ قرآن حکیم کی رو سے عبادت' پرستش نہیں ہے' پوجا پاٹ نہیں ہے' یہ عبدیت کسی کے احکام و قوانین کی کامل اطاعت کا نام ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ (4:36)۔ ہمارے ہاں اس اطاعت کو جب پرستش میں بدلا تو نماز تو ہم نے اللہ کی پڑھی' قوانین اپنے رائج کیے' عبادت خدا کی اختیار کی' اطاعت اپنی یا طاغوت کی شروع کر دی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب قوموں سے فکر اٹھ جاتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے یعنی یہ دو الگ الگ شعبے مقرر کر دیئے: (1) خدا صرف Object of Worship (مجسمۂ پرستش) رہ گیا ہے' عبادت اس کی کی اور (2) اطاعت ان احکام و قوانین کی کی جو یا تو اپنے بنائے ہوئے ہیں یا دوسروں سے مانگے ہوئے ہیں' یہ اطاعت ہے انسانوں کی۔ بہرحال عبادت انسانوں کی اور پرستش خدا کی۔ اس کا نام ہو گیا اسلام لانا۔ یہاں کہا ہے کہ وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا (4:36) اللہ کے قوانین کی محکومیت اختیار کرو اور اس محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔

## اپنے جذبات کو خدا بنا لینا ہی سب سے بڑا شرک ہے

ہمارے ہاں شرک صرف بت پرستی کا نام رہ گیا ہے اور قرآن حمید شرک کو کھینچ کر یہاں تک لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا تُو نے اس شخص کی حالت پہ بھی غور کیا جس نے مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَهٗ هَوٰىهُ (45:23) اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ یہاں یہ باہر کا بت تو ایک

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ' ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' پانچواں باب' ص ص۔ 138 تا 156۔

طرف رہا' باہر کے انسان تو ایک طرف رہے' وہ تو خود انسان کے اپنے جذبات جو قوانینِ خداوندی کے تابع استعمال یا صرف نہیں ہوتے' ان کو بھی شرک کے اندر لاتا ہے' خدا کے برابر کا کہتا ہے اور اس طرح ایک خدا قرار دے رہا ہے۔سب سے بڑا شرک تو اپنے اندر کا ہوتا ہے۔یہیں سے آپ کی بے جا آرزوئیں' غلط تمنائیں ابھرتی ہیں۔یہی وہ جذبات ہوتے ہیں جوان کو پورا کرنے کے لیے آپ کو محرک بہ عمل کرتے ہیں۔پھر آپ جائز و ناجائز اور حلال وحرام میں تمیز نہیں کرتے' آپ خدا کی بات نہیں مانتے' اپنے اندر کی بات مانتے ہیں اور اسی کا نام سب سے بڑا شرک ہے۔قرآن کی آیہ جلیلہ موجود ہے کہ ''جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الہ بنالیا''۔شرک کی وسعتیں تو یہاں تک جاتی ہیں' عزیزانِ من! یہ بت پرستی کی بات نہیں ہے' بت پرستی تو جہالت کا مظاہرہ ہے۔

## خدا تعالیٰ نے دین میں فرقہ بندی اور تفرقہ بازی کو جرمِ عظیم قرار دیا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی اور تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ خدا کا ایک اولوالعزم نبی' حضرتِ موسیٰؑ' جب کچھ دنوں کے لیے قوم سے الگ ہوا تو دوسرا نبی حضرتِ ہارونؑ قوم میں موجود تھا۔قوم نے ایک بچھڑا بنالیا' ایک بت بنالیا اور اس بت کی پرستش شروع کردی تھی' حضرتِ ہارونؑ اس قوم کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔جب حضرتِ موسیٰؑ واپس آئے' قرآن مجید میں یہ سارا قصہ مذکور ہے' تو انہوں نے پہلے حضرت ہارونؑ' اپنے بھائی سے کہا کہ تم موجود تھے' تمہارے سامنے یہ کچھ یہ کرتے رہے' ایک بت کی پرستش کرتے رہے' تو تم نے ان کو روکا نہیں۔خدا کا نبیؑ خدا کے نبیؑ سے یہ بات کہہ رہا ہے۔اس کا جواب اُنہوںؑ نے یہ دیا تھا کہ میں ڈرتا تھا کہ اگر ان کو میں سختی سے روکتا تو ان میں تفرقہ پیدا ہو جاتا' میں ڈرتا تھا کہ تم آکر مجھ سے یہ کہو گے کہ تم نے ان کے اندر تفرقہ کا شرک برپا کردیا' میرا انتظار بھی نہ کیا' میں نے گوسالہ کی پرستش کو روا رکھا' تفرقہ پرستی کے شرک کو میں نے پیدا نہیں ہونے دیا۔

## آج پاکستان کے آئین میں فرقہ بندی کو قانونی حیثیت حاصل ہے

آج آپ کے ہاں اسلامی حکومتیں بنانے کے جو مدعی ہیں' وہ قانون وآئین کے اندر یہ شق رکھ رہے ہیں کہ Personal Laws (شخصی قوانین) کی جو تعبیر ہے' وہ ہر فرقہ کی اپنی اپنی تعبیر ہوگی' فرقے کو مسلمہ آئینی حیثیت دی جارہی ہے' اس کا نام اسلامی مملکت' اقامتِ دین' اسلامی نظام رکھا جارہا ہے۔اُس نے کہا ہے کہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا** (30:31-32) توحید پر ایمان لانے کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا۔یہ نہیں کہا کہ بت نہ پوجنے لگ جانا بلکہ یہ کہا کہ فرقوں میں نہ بٹ جانا۔یہاں 1962ء کے آئین کے اندر شخصی قوانین کی اپنی اپنی تعبیر کرنے کا یہ ایک فقرہ نہیں تھا۔اس آئین کے بعد اس جملے کے نہ ہونے پر اس کی سب سے پہلے مخالفت ہوئی۔اس آئین کے تحت آپ کے ہاں جو پہلی اسمبلی ہوئی' اس میں یہ پہلی ترمیم پیش کی گئی اور

اِن اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے یہ ترمیم پیش کی گئی کہ اس میں یہ فقرہ Add (داخل) کرو۔ یہ جملہ دوبارہ اس آئین میں داخل کرایا گیا کہ ہر مسلمہ فرقے کی تعبیر اپنی اپنی ہوگی۔ اس لیے کہ اس قوم کا ایک قدم بھی توحید کی طرف نہ اٹھنے پائے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (4:36) تم نے صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہے۔ اس کے ساتھ نہ اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنا ہے' نہ کسی دوسرے انسان کے فیصلے کو۔

## توحید کو عملی شکل دینے کا طریق اور ہمارے طرزِ عمل کی شکل وصورت

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) توحید یہ ہے کہ حکم صرف اس کا ہے' اس کے علاوہ کسی اور کا حکم نہیں ہے اس لیے وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (4:36) اس محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اصولی بات پہلے بیان کی کہ احکام تو ہم بعد میں دیں گے' پہلے یہ سمجھ لو کہ یہ معاملات اس صورت میں سنوریں گے کہ کسی اور کا فیصلہ اپنے ہاں نافذ نہ ہونے دو' کسی اور کا حکم نہ چلنے دو' حتیٰ کہ اپنے جذبات کے جو فیصلے اور حکم ہیں' ان کو بھی نہ چلنے دو' وہ بھی شرک ہو جائے گا۔ آپ کے ہاں روز صبح سے شام تک وعظ ہوتے ہیں۔ ان میں پہلے سارے نقائص بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ خرابیاں ہیں' یہ نقائص ہیں' یہ عیوب ہیں' معاشرہ بگڑ گیا' تباہ ہو گیا۔ پھر اس کے بعد وعظ ہوتا ہے کہ یہ ہونا چاہیے' ایسا ہونا چاہیے' خدا نے یہ کہا ہے' اس کا یہ حکم ہے۔ اور اس کے بعد نہ وہ جرائم ختم ہوتے ہیں' نہ یہ خوبیاں کہیں سے آتی ہیں۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ عملاً شرک ہو رہا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہاں وعظ کہنے کی بات نہیں ہے' نصیحتیں کرنے کی بات نہیں ہے' پہلی چیز تو اس چیز کا اقرار کرنا ہے کہ کیا یہ مانتے ہو کہ خدا کے حکم کے علاوہ کسی اور کا حکم نہیں مانوں گا اور اُس کا حکم بالضرور مانوں گا۔ یہ جو اقرار کرنے والے ہیں' ان کے سامنے یہ احکام لائیے' پھر دیکھیے کہ اصلاح ہوتی ہے یا نہیں۔

## پرستش خدا کی اور احکام اپنے' بعد ازاں دعائے خیر: یہ اسلام اور توحید نہیں ہے

یہاں تو مشکل یہ ہے کہ اپنے آپ کو تسکین ہی نہیں بلکہ فریب دے لیا جاتا ہے کہ پرستش خدا کی ہے اور احکام اپنے ہیں جو چلیں گے۔ ان کا نام اسلام قرار دے لیا صاحب! قرآنِ حکیم تو یہاں تک کہتا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی شخص کو اس کا حق نہیں پہنچتا' خواہ خدا اسے کتاب' نبوت' رسالت' حکومت کیوں نہ دیدے' کہ وہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم میرے احکام کی اطاعت کرو' خدا کی نہیں کرو۔ عزیزانِ من! یہ ہے توحید۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہنے والے اور جن سے یہ کہا جاتا ہے' کیا ان میں سے کوئی اس ایمان پر کھڑا ہے کہ یہ ہے توحید' یہ ہے خدا کا ماننا۔ اگر یہ نہیں ہے تو یہ شرک ہے' کفر ہے' اسلام نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اگر مانا جائے گا تو اس کا حکم مانا جائے گا' اس کی اطاعت کی جائے گی اور جونہی اس سے انحراف ہوگا تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ٹھیک ہے' اب توحید اور اسلام نہیں رہا۔ اس میں تو خدا کے علاوہ کسی اور کی نہیں مانو گے' کسی بھی باہر والے کی نہیں مانو گے' اپنے دل کی مانو گے تو بھی شرک ہو جائے گا۔ کہا ہے کہ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا (4:36) کسی شے کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔ یہاں تو کفر نہیں' شرک کی بات ہے' شرک تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے بھی مانو' کسی اور کو بھی مانو۔ یہاں تو یہ بھی گوارہ نہیں ہو سکتا: یہ ہے **ولا تشرکوا به شیئًا** (4:36)۔

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

## فکرِ قرآنی کی روشنی میں احسان کے تصور کے متعلق ہمارا غلط طرزِ عمل

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اسلام اب گھر کی چار دیواری اور میاں بیوی کے تعلقات سے ذرا آگے بڑھ رہا ہے اور حکم ہے کہ وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (4:36) والدین کے ساتھ احسان کرو۔ احسان وہ نہیں ہے کہ جو ایک دفعہ کیا تو پھر ساری عمر انتظار کرتے رہے کہ اس کا بدلہ ہمیں وہاں سے ملے گا اور پھر ساری عمر اس کو کوستے رہے کہ جہاں کہیں اس نے آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو آپ نے وہیں اسے لتاڑا کہ ''او احسان فراموش' طوطا چشم! یاد ہے کس طرح سے اس دن گڑگڑاتے ہوئے مدد مانگنے کو آئے تھے اور آج آنکھیں دکھا رہے ہو اور کہہ رہے ہو کہ نہیں' صاحب! ووٹ تو میں اسے دونگا جسے اہل سمجھونگا' ٹھیک ہے' لوگ مجھے کہتے تھے کہ اس کے ساتھ مت ایسا احسان کرو''۔ ایک احسان تو یہ ہے جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ وہ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ پھر جس پہ احسان کیا گیا ہے' وہ ساری عمر کے لیے بے دام غلام ہے' اس کا بدلہ تو اسی صورت میں اتر سکتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ یا اللہ! اس پہ بھی ایسا ہی وقت پڑے' یہ بھی گڑگڑاتا ہوا آئے' پھر میں بھی اس کی مدد کروں تو احسان کا بدلہ احسان سے اترے۔ عزیزانِ من! احسان کے یہ معنی نہیں ہیں۔

## احسان کا بدلہ سوائے کسی کمی کو پورا کرنے کے اور کوئی ہے ہی نہیں

احسان کے معنی ہوتے ہیں ''کسی میں جو کمی واقع ہو جائے' اس کی اُس کمی کو پورا کر دینا''۔ ہمارے ہاں احسان کے بدلے کے لیے ایک فقرہ قرآنِ کریم کا لیا ہوا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) احسان کا بدلہ احسان ہے یعنی خدا کا ایسے حکم ہے جیسے کہ منوا رہے ہوں۔ اس خدا کا حکم' جو یہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے جو کسی کی مدد کرنے کے بعد کہتا ہے کہ **لا نرید منکم جزآء و الا شکورًا** (76:9) ہم تم سے اس کا بدلہ تو ایک طرف رہا' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ کیا جس کو یہ حکم دیا جائے گا' اس کو یہ کہا جائے گا کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) احسان کا بدلہ احسان ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ ہم شکریہ تک کے بھی

متمنی نہیں ہوتے۔

احسان کے معنی یہ ہیں کہ کسی میں کمی واقع ہوگئی' اس کا توازن بگڑ گیا' افراد کے توازن بگڑنے سے معاشرے کا توازن بگڑ گیا۔ یہ کہا ہے کہ توازن نہ بگڑنے دو۔ کسی کے اندر جو کمی واقع ہوگئی ہے' اس کمی کو پورا کردو۔ اس کے بعد کہا ہے کہ اس کے بدلے یا معاوضے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ **احسانًا** کمی پوری کرنا تھا' کمی پوری ہوگئی' معاملہ ختم ہوگیا' احسان کا کوئی اور بدل نہیں ہے۔ احسان کے معنی ''کمی پوری کرنا ہے'' بس کمی پوری ہوگئی۔ یہ جو ہے کہ **وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا** (4:36) بڑھاپے کے اندر والدین میں کمزوری آجاتی ہے' ضروریاتِ زندگی کی کمی ہوجاتی ہے' بعض اوقات صحت جواب دیدیتی ہے۔ احسان کے معنی ہیں ''جس جس چیز کی ان میں کمی ہوگئی ہو' اس کمی کو پورا کردیجیے''۔

## ماں باپ کی اطاعت کے غلط تصور کی نوعیت اور اس کی حقیقت

اِدھر تو یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف وہ غلط تصور ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ اطاعت تو خدا کے علاوہ کسی کی بھی فرض نہیں ہے۔ اور پھر کیا ان کی اطاعت کے متعلق قرآن حمید کہے گا جن کے متعلق خدا نے خود کہا ہے کہ **نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ** (36:68) جوں جوں عمر زیادہ بڑھ جایا کرتی ہے تو پھر عقلیں اوندھی ہوجایا کرتی ہیں' جو کچھ پہلے یاد ہوتا ہے' وہ بھی بھول جایا کرتا ہے۔ قرآن حمید نے اس کو **اَرْذَلِ الْعُمُرِ** (22:5) عمر کی نکمی حالت کہا۔ تو کیا پھر قرآن حمید یہ پابندیاں عائد کرے گا کہ یہ جوابھرنے والی عقلیں ہیں' اس دور کی فکر کے نوجوان ہیں' اپنے معاملات کو وہ سمجھتے ہیں' یعنی جب وہ اس قابل ہوجائیں کہ اپنے معاملات کو خود سمجھیں' سنبھالیں' انہیں اس چیز کا پابند کردیا جائے کہ وہ ان کے فیصلوں کی اطاعت کریں جن میں اب اپنے متعلق فیصلے کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے؟ عزیزانِ من! یہ قرآن حمید ہے۔ یہ اس قرآن مجید کی تعلیم کے برعکس ہے' یہ دوسروں سے مانگے ہوئے خیالات ہیں' چونکہ جذبات سے متعلق ہیں' اس واسطے بڑے پیارے لگتے ہیں' یہ طوطے کی طرح رٹے ہوئے چلے آرہے ہیں کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ یہ قرآن مجید میں کہیں نہیں کہا گیا۔

## ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا مفہوم نیز بچے کے بچپن اور بوڑھے کے بچپن میں فرق

یہ کہا ہے کہ ان کی کمی پوری کرو' ان سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ حسنِ سلوک کے معنی یہ ہیں کہ ان کو جھڑکو نہیں۔ وہ ایسی حالت میں پہنچ گئے ہوئے ہیں کہ ان کی حرکات کچھ اس قسم کی بھی ہوتی ہیں' جن سے آدمی کو غصہ آجاتا ہے' بچہ اور بوڑھا برابر ہوجاتے ہیں لیکن بچے کا بچپن تو حسن پیدا کرتا ہے' بوڑھے کا بچپن آدمی میں کچھ غصہ پیدا کردیتا ہے' اس لیے کہا کہ ان کو اُف بھی نہ کہو' ڈانٹا نہ کرو۔ یہ مجبور ہیں'

معذور ہیں' احساناً ان میں کمی پوری کرو۔

## خون کے رشتوں کے علاوہ وہ تمام افرادِ معاشرہ جو خود کو تنہا محسوس کریں' ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ

اب قرآن کریم آگے آیا۔ کہا ہے کہ **وَّ بِذِی الْقُرْبٰی** (4:36)۔ قرآن کریم درجہ بہ درجہ آگے چل رہا ہے کہ یہ حسنِ سلوک والدین تک ہی نہیں ہے' تمہارے جتنے بھی گرد و پیش ہیں' یہ **ذِی الْقُرْبٰی** (4:36) ہیں' یہ ان کے ساتھ بھی ہے۔ یہ لفظ عام طور پہ رشتہ داروں کے لیے کہا جاتا ہے' ان کو خون کے رشتوں کے ساتھ ہی محدود کیا جاتا ہے حالانکہ یہ جو بھی تمہارے گرد و پیش ہیں' جو بھی تمہارے قریب ہیں' یہ **ذِی الْقُرْبٰی** ہیں۔ ان کی تشریح تو آگے آتی ہے' میں ابھی عرض کرونگا۔ آگے کہا ہے کہ **وَ الْیَتٰمٰی** (4:36) جو معاشرے کے اندر تنہا رہ جائیں' ان کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کرو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یتیم صرف اُسی کو نہیں کہتے جس کے ماں باپ مر جائیں بلکہ جو بھی معاشرے میں تنہا رہ جائے' جس کا کوئی ساتھی نہ ہو' وہ یتیم ہے۔ اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ تو اُٹھو اور اس کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ یاد رکھیے! جس معاشرے میں کوئی فرد بھی مصیبت کے وقت اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے' اسلام تو دور کی بات وہ تو انسانوں کا معاشرہ کہلا ہی نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! یہ حیوان ہیں کہ ایک بیل کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے تو دوسرے بیل کو اس کا پتہ بھی نہیں ہوتا اور وہ اپنا چارہ چرتا چلا جاتا ہے۔ وہ افراد ہوتے ہیں' جو تنہا ہوتے ہیں۔ انسان تو ہے ہی انس سے' باہمی طور پر اگر انس نہیں ہے تو اس کا انسانیت کا درجہ بھی نہیں ہے۔

## اسلامی مملکت میں یتیم کا کیا کام! اس سلسلہ میں **یسلم** ' **مسٰکین** اور **الجار** کا لغوی مفہوم قابلِ غور ہے

یہ میں نے یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ ایسا معاشرہ انسانیت کا نہیں ہوتا' اسلام کی تو بات ہی آگے چل کر آتی ہے۔ اسلام تو نام ہی اس طرح سے ہمقدم چلنے کا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ چار گھوڑوں کی گاڑی ہوتی تھی' اس میں چار چار گھوڑے ہوتے تھے۔ اگر وہ اس طرح سے چلیں کہ ان کا قدم یکساں اٹھے' یکساں پڑے تو عرب اس کو **یسلم** کہتے ہیں۔ یوں زندگی کے اندر چلنا' یوں قدم ملا کر چلنا' ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی سے چلنا کہ قدم یکساں اٹھیں اور یکساں پڑیں۔ اس کا نام اسلام کی زندگی تھا۔ بھلا! اس میں یتیم کا کیا کام! کیوں اپنے آپ کو کوئی تنہا محسوس کرے! یتیم کے لیے یہی نہیں ہے کہ اس میں مال و دولت کی کمی آ جائے گی' اس کا تنہا ہو جانا اس کی بہت بڑی کمی ہے۔ اس کا احسان یہ ہے کہ اس کو تنہا محسوس نہ کرنے دو' ساتھ جا کر کھڑے ہو جاؤ

اب آگے کہا ہے کہ **وَ الْمَسٰکِیْنِ** (4:36)۔ ہمارے ہاں تو وہ ''مسکین ہیگا جی اے فقیر ہیگا'' (وہ مسکین ہے' یہ فقیر ہے جی!) قرآن کریم کے الفاظ دراصل قرآن کریم کی اصطلاحیں ہیں مثلاً حرکت اور سکن دو متضاد الفاظ ہیں۔ حرکت ہے چلتا کاروبار' ساکن ہے

کہ وہ کاروبار رک جائے' کسی کی گاڑی کہیں آ کر رک جائے۔ ٹھیک ہے یتیم بھی نہیں ہے' چیزیں بھی ہیں' کچھ حادثہ ایسا ہو گیا ہے کہ رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے' کچھ موانعات پیدا ہو گئے ہیں' جس کی زندگی کی گاڑی کے اندر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے' اس کا احسان کیا ہے؟ یہ کمی ہو گئی ہے' اس رکاوٹ کو دور کر دو تا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ چلے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ** (4:36)۔ یہ ہمسائے ہیں۔ اب یہاں دو قسم کے ہمسائے گنا دیئے' ہمسایہ رشتہ دار بھی ہو' ہمسایہ غیر از رشتہ دار بھی ہو' جب بھی گھر سے آگے بڑھیں گے تو معاشرے میں سب سے پہلے ہمسایہ آئے گا۔ وہاں بھی اگر دیکھتے ہو کہ کوئی کمی آ گئی ہے تو اسکی کمی کو پورا کر دو۔

## رزق کی فراہمی کے سلسلہ میں ہمسائیوں کی باہمی ذمہ داری

عزیزانِ من! جس معاشی نظام کی ابتدا نبی اکرم ﷺ نے فرمائی تھی' اس کی پہلی اینٹ تو یہ کہہ کر رکھی کہ جس شخص کا ہمسایہ رات کو بھوکا سویا' اس کے اوپر جنت کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ اپنے گھر والوں کو تو ہر شریف انسان دے رہا ہے ورنہ اب تو یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ اپنے گھر والوں کی ذمہ داریاں بھی لوگ بھول رہے ہیں' اُدھر یہ کیفیت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ دائیں بائیں دونوں طرف دیکھو' دونوں ہمسائے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح اس تنظیم کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اگر ہر رات جس نے خود کھایا یا گھر میں موجود ہے' سونے سے پہلے اس کا یقین کر لے کہ دائیں اور بائیں کے دونوں ہمسائیوں کے بچوں کو مل گیا ہے تو معاشرے سے بھوک خود ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسی کی بڑھی ہوئی شکل وہ تھی جو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نظام اور معاشرے میں کیفیت یہ ہو کہ اس بستی میں رات کو ایک شخص بھوکا سو گیا ہو' اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔

## قرآنی سوسائٹی کے قیام کے سلسلہ میں قدم بہ قدم باہمی نظم و نسق کی کیفیت

یہاں ہم قرآنِ کریم کی روشنی میں میاں بیوی سے آگے بڑھے' پھر والدین آئے ہیں' **ذِی الۡقُرۡبٰی** آیا ہے' **یَتٰمٰی** آئے ہیں مساکین آئے ہیں' دائیں بائیں کے ہمسائے آئے ہیں' وہ ہمسائے رشتہ دار ہوں' غیر از رشتہ دار ہوں' اب کہا ہے کہ **وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ** (4:36) کوئی بھی' جس کے ساتھ کچھ تعلق ہے' اس کی حالت پہ بھی نگاہ رکھو کہ کوئی کمی تو نہیں ہو گئی' اس کا پورا کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اور آگے بڑھو' کہا ہے کہ **وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ** (4:36) اپنا بھی نہیں' رشتہ دار بھی نہیں' ہمسایہ بھی نہیں' راستہ چلتا ہوا مسافر آ گیا ہے۔ عرب ابن السبیل اس مسافر کو کہتے ہیں جس کا زادِ راہ ختم ہو جائے یا کسی طرح سے بھی وہ تمہاری مدد کا محتاج ہو جائے' کچھ بھی ہو جائے' راستے میں کسی کا موٹر فیل ہو جائے' وہ اس مسافر کو ابن السبیل کہتے تھے۔ یعنی دیکھیے! قرآن کریم کہاں تک لے جاتا ہے! اس مسافر کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہے' میاں بیوی کا نہیں' عزیز داری کا نہیں' ہمسائیگی کا نہیں' دوستی کا نہیں' رفاقت کا

نہیں' تعارف کا نہیں' وہ اس ملک کے اندر یکسر اجنبی ہے' راستہ چلتے ہوئے اس کو ضرورت پڑ گئی ہے' تمہارا فریضہ ہے کہ اس کی کمی کو پورا کرو۔

## وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کا مفہوم اور ان کے ساتھ باہمی لین دین کی نوعیت

آگے کہا ہے کہ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (4:36)۔ اس کا ترجمہ صرف غلام اور لونڈیاں نہیں ہے۔ عربی محاورے میں بھی ہر وہ شخص جو تمہاری ماتحتی میں کام کرتا ہے۔ کہا کہ اس کی کمی کو پورا کرو۔ ہمارے ہاں انتہائے عدل یہ ہے کہ صاحب! مزدور کی جو مزدوری ہے' اس کو دیدو' بڑا تیر مارتے ہیں کہ وہ اس کو دیدو۔ کئی دفعہ درس میں اس موضوع پہ گفتگو ہوچکی ہے کہ (مثلاً) مزدور کی مزدوری تین روپے روز ہے' یہ تین روپے کون مقرر کرتا ہے؟ آپ عدل کا تقاضا پورا کر کے مطمئن ہوجاتے ہیں کہ شام کو میں نے اسے تین روپے دیدیئے اور خواہ تین روپے میں اس کے بیوی بچوں کا آٹا بھی نہ چلے' یہ جو کمی ہے' اسے پورا کرنے کی ذمہ داری معاشرے میں کوئی بھی اپنے سر پہ نہیں لیتا۔ کیا یہ کمی نہیں ہے' کیا عدل اسی کو کہتے ہیں جو کر دیا گیا ہے؟

## معاشی نظام کی اہم شق Wages (اجرت) کا تعین کرنا ہے جو آج تک حل نہیں ہوا

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا' جب قرآن معاشی پروگرام پہ آیا تھا تو سب سے مشکل مسئلہ جس میں آج کے اکنامسٹ الجھے ہوئے ہیں' اور 'ڈور کو سلجھا رہے ہیں' سرا ملتا نہیں' اس چیز کا حل نہیں ملتا کہ Wages (اجرتیں) کس طرح سے Fix (مقرر) کی جائیں' مزدور کی مزدوری کس معیار کے مطابق Fix (مقرر) کی جائے' کس کو کتنا ملنا چاہیے اسے کیسے Fix (مقرر) کیا جائے' مزدور کو تین روپے یا چار روپے' انجینئر کو تیس روپے روز کس معیار کے مطابق Fix (مقرر) کیے جائیں[1]' آج یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو علمِ معاشیات کی اتنی ترقی کے باوجود اب بھی ان سے حل نہیں ہو پاتا۔

## نبی اکرم ﷺ کی زبانی' وحی کی روشنی میں' Wages (اجرتوں) کے مسئلے کا حل ''صلاحیت کے مطابق کام اور ضرورت کے مطابق دام'' میں ہے' اور تاریخ سے اس کی مثالیں

چودہ سو سال پیشتر جسے عام طور پہ دورِ جہالت کہا جاتا ہے عرب کی سرزمین' جس میں یہ مسائل کبھی زیرِ بحث نہیں آئے تھے' اس کے اندر ایک اُمی ہے جس نے کہیں سے بھی یہ مسائل نہیں پڑھے تھے' اس مسئلہ کا حل وہ دے رہے ہیں۔ یہ حضورِ نبی اکرم ﷺ ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ یاد رکھو! ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لو' اس کی ضروریات کے مطابق اسے Pay (ادا) کرو۔ یہ

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات ستمبر 1970ء کی 6 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

ہے وہ صلاحیت۔ وہ تمہیں اپنا وقت دیتا ہے' محنت دیتا ہے' سب کچھ دے رہا ہے' اس کی ضروریات پوری کرنی ہیں' یہ ہے احسان جسے آپ کہتے ہیں کہ اس کی ہر کمی کو پورا کیا جائے گا۔ کیا کبھی کسی نے سوچا کہ قرآن کریم نے **اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ** (16:90) دونوں چیزیں اکٹھی کیوں کہیں؟ قانونی تقاضے اور ہوتے ہیں' انسانی تقاضے اور ہوتے ہیں۔ احسان انسانیت کا تقاضا ہے کہ کمی پوری کی جائے گی۔ یہاں کہا ہے کہ **وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ** (4:36)۔**مَامَلَکَتْ** کے ساتھ احسان کے معنی آپ نے سمجھ لیے تھے۔ کہا کہ جس نے بھی تمہارے ساتھ کام کرنا ہے' اس کی کمی پوری کرنی ہے۔ اس سے معاشیات کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب مالِ غنیمت بانٹتے تو اس زمانے میں بھی غیر شادی شدہ مجاہد اور سپاہی کو ایک حصہ دیتے' جبکہ شادی شدہ اور بچوں والوں کو اس کے مطابق دوگنا دیتے تھے' کام صلاحیت کے مطابق ہے' اس کی جو ادائیگی ہے وہ ضرورت کے مطابق ہے۔ جب وظائف مقرر کیے گئے ہیں تو وظائف کا معیار یہ تھا۔ حضرتِ ابوبکر صدیقؓ (634-571ء) سے یہ سوال کیا گیا کہ صاحب! یہ لوگ جنہوں نے اسلام کی اتنی خدمات کی تھیں اور سابقون الاولون تھے' انہوں نے اتنے جہاد کیے' اس قدر قربانیاں کیں' اس قدر ایثار کیے' اس قدر مشقتیں اٹھائیں' تکلیفیں برداشت کیں' آج اگر اس حالت سے ہم آگے آ گئے ہیں' تنگی کی حالت سے خوشحالی آ گئی ہے' معاشرے کو اُن کی خدمات کا صلہ دینا چاہیے' اس لیے ان وظائف میں ان کا حصہ زیادہ ہونا چاہیے' یہ معیار مقرر کرنا چاہیے۔ غور فرمایئے کہ تربیت یافتگانِ نبوی ﷺ کس طرح سے یہ روح سمجھے تھے' آپؓ کا یہ فقرہ قیامت تک کے لیے سورج کی کرنوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ جو خدمات اور ایثار انہوں نے قرآن کریم کے لیے کیے ہیں یہ انہوں نے معاوضے کی خاطر نہیں کیے بلکہ ان کا بدلہ تو ان کو خدا کے ہاں سے ملے گا' ہم معاشی مسئلہ کا حل تلاش کر رہے ہیں' وہ یہی ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا۔ آہاہا! ٹکریں مار رہے ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہوگا؟ کوئی سوشل ازم پکڑ رہا ہے' کوئی کمیونزم کی طرف جا رہا ہے' کوئی کہتا ہے یہ چیزیں زکوٰۃ اور خیرات پوری کر دیں گی۔ ان کے سامنے قرآن کریم کا حکم نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ **وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا** (11:6) ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری نظام کے اوپر عائد ہو جاتی ہے۔ آج حضورِ نبی اکرم ﷺ کی یہ عملی تشکیل سامنے ہے کہ صلاحیت کے مطابق ہر شخص کام کرے' ضرورت کے مطابق اس کو پیش کیجیے صاحب! معاشی نظام حل ہو گیا۔

## دولت کوسمیٹ کر بیٹھ جانے والوں کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد اور لفظ فخر اور بخل کا مفہوم

عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:36) میں' میں بات یہ کہہ رہا تھا۔اور اس کے بعد دکھتی ہوئی رگ پکڑی کہ ٹھیک ہے معاشرے کے اندر دولت کو سمیٹ کر بیٹھ جانے والے ہیں۔ان کے لیے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (4:36) خدا ان مُخْتَالًا اور فَخُوْرًا کو پسند نہیں کرتا۔کیا دو الفاظ لے آیا ہے قرآن حمید! مُخْتَالًا یہ ہے کہ اپنے خیال میں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو اپنے ہی ذہن میں بڑا تصور کر لینا۔وہ کہتا یہ ہے کہ یہ جو بڑا بننا ہے اس کا معیار یہ ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) سب سے واجب العزت یہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے۔اور یہاں اس کی کیفیت یہ ہے کہ دولت اکٹھی کر لی' محلے کا چوہدری بن بیٹھا' اب اس کے بعد صورت یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے ہیں' اپنے خیال میں ہی بڑے بن رہے ہیں صاحب! مُخْتَالًا یہ ہے اور دوسرا لفظ فَخُوْرًا ہے ۔آپ نے دودھ دینے والے مویشی بھینسیں گائیں دیکھے ہونگے' ان میں ہوا نا ہوتا ہے جس میں تھن ہوتے ہیں' وہ ہوا نہ ہوتو اتنا بڑا پھولا ہوا اور دودھ دو پیے تو اس میں سے پاؤ بھر ہی ٹپکے۔یہ جو ہے اسے عرب فخر کہتے تھے' فَخُوْرًا اسے کہتے تھے کہ یوں تو بڑا بنا ہوا ہوا اور اس میں سے صرف چند دھاریں دودھ کی دے۔مُخْتَالًا تو یہ ہے کہ بالکل اپنے ہی دل میں یہ کچھ کرے' فَخُوْرًا میں یہ ہے کہ کچھ اس میں دے ضرور' وہ جو''دیگاں کھڑ کدیاں ہوندیاں ہیگیاں نیں'' (بس وہی جو دیگوں کی جھنکار ہوتی ہے) جمعرات کو وہ پیسے چوہدری صاحب بانٹ رہے ہیں' یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔یہ کیا ہوتا ہے؟ کہ جی! یہ سب کچھ بڑے بننے کے لیے ہوتا ہے۔دیتا اس میں سے کتنا ہے؟ دو الفاظ کہنے کے بعد قرآن کریم نے خود تشریح کر دی' اگلے الفاظ سامنے آ گئے' تشریح ہوگئی کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ (4:37) یعنی وہ لوگ يَبْخَلُوْنَ (4:37) بُخْلِ ہوتا ہے' ساری دولت اپنے ہی لیے سمیٹ کر رکھتے چلے جانا۔اسے قرآن کریم نے وہاں کہا ہے کہ جب یہ دولت تپائی جائے گی اور اسے کہا جائے گا کہ چکھو' تم اس کا عذاب مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (9:35) جسے تم صرف اپنی ذات کے لیے جمع کرتے تھے۔بخل اسے کہتے ہیں کہ اپنے ہی لیے سمیٹتے چلے جانا۔یہ بخیل ہونا' سوسائٹی میں معیوب گنا جاتا تھا۔یہ بھی چار دن پہلے کی بات ہے۔اب تو معیار ہی دولت ہو گیا' کسی طریقے سے لی جائے' کسی طریقے سے سنبھال کر رکھی جائے' وہی صاحبِ عزت ہو جاتا ہے ورنہ اس سے پیشتر بخیل ذرا معیوب سا نظر آتا تھا۔

## بخل کی بنیاد پر اپنے مفاد کے پیشِ نظر خود پسند نظام کی تشکیل اور اس کا نتیجہ

عربوں کے ہاں تو پوچھیے نہیں' یہ لفظِ فحش جو آپ کے ہاں ہے' جواب بے حیائی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' فحش کے معنی ان کے ہاں بخل تھا۔کہا ہے کہ یہ لوگ يَبْخَلُوْنَ ہیں۔اب وہ جو بخل ہے یہ معیوب چیز نظر آئی' اس عیب کو ہنر میں بدلنے کے لیے

کیا طریقہ اختیار کیا گیا؟ عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جایئے کہ پھر کرتے یہ ہیں کہ اس دولت کے بل بوتے پہ' کچھ اختیار ان کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو کرتے یہ ہیں کہ یَـاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (4:37) پھر اس قسم کے قوانین' اس قسم کا نظام' بنا لیتے ہیں کہ ہر شخص بخل کرنے لگ جائے لہٰذا بخل معیوب ہی نہ رہے۔ وہ معیوب تو اس صورت میں رہتا ہے کہ معاشرے کا جو عام انداز ہے' وہ دوسرا ہو' اس انداز کو شرافت کا' عزت کا' معیار بنایا جائے اس میں افراد یہ کچھ کرے تو وہ تو نکو بن جاتے ہیں۔ تو کرتے یہ ہیں کہ بخل تو خود کرنا چاہتے ہیں' اپنی ذات کے لیے خود سمیٹنا چاہتے ہیں لیکن اس سے بچنے کے لیے دیکھیے یہ' یہ کچھ کرتے ہیں' معاشرے میں انداز ہی یہ پھیلا دیتے ہیں اور یَـاْمُرُوْنَ یہ اربابِ اقتدار ہیں' قوانین اس قسم کے بنانے لگ جاتے ہیں۔ یہ جو آپ کے ہاں Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری) میں قوانین بن جاتے ہیں کہ ان طریقوں کے مطابق کوئی جتنا جی چاہے دولت سمیٹتا ہے تو کوئی معیوب بات نہیں ہے اور اس پر اگر انکم ٹیکس ادا کر دیتا ہے تو باقی سارا کچھ اپنے پاس رکھتا ہے۔ یہ انتہائی بخل ہے لیکن معاشرے میں ایسا کرنا معیوب نہیں رہا۔ کیا ہوا ہے؟ کہ وَ یَـاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (4:37) معاشرے نے جو قوانین بنا دیئے' اب کوئی اسے مطعون نہیں کرسکتا۔ اس سے پہلے بخیل کم از کم مطعون تو ہوتا تھا۔ اب مطعون بھی نہیں ہے' بس جو Dues (واجبات) ہیں وہ ادا کرتے رہیے۔

## بخل کو چھپانے کے لیے زکوٰۃ کا سہارا حاصل کرنا

شریعت کی طرف آ جایئے تو ان کے اڑھائی پرسنٹ ادا کر دیجیے' جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے' حکومت کی طرف آیئے تو ان کا مقرر کردہ انکم ٹیکس ادا کرتے چلے جایئے' اس کے بعد جتنا روپیہ ہے آپ کی اپنی ذات کے لیے ہے' اسی کو تو بخل کہا گیا ہے۔ قرآن نے تو کہیں روپے کو جمع ہونے ہی نہیں دیا' وہ تو انفاق ہے کہ آئے اور چلا جائے۔ یہاں کہا ہے کہ یَـاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (4:37) وہ لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں' ایسے قوانین بناتے ہیں جن میں سب کچھ سمیٹ کر اپنے لیے رکھ لیا جائے۔ پھر وہ اس طرح سے کرتے کیا ہیں؟ کہا ہے کہ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (4:37) خدا نے رزق میں سے جو مال و دولت دیا ہوا ہوتا ہے یَکْتُمُوْنَ (4:37) وہ اس کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ آپ کے اس نظام کے اندر انتہائی اہتمام یہ ہوتا ہے کہ کسی کو کسی دوسرے کی دولت کا پتہ نہ ہونے پائے' یہ انکم ٹیکس کے ڈیپارٹمنٹ والے کرید کرید کر' ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ دولت کتنی ہے' پھر بھی کام نہیں بنتا۔ یہ چودہ سو سال پہلے کہا جا رہا ہے' اس زمانے میں تو اسے چھپانے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ اول تو یہ ہنڈیاں ہوتی تھیں' بینک بیلنسز ہوتے ہی نہیں تھے کہ کروڑوں روپیہ بھی ہے' ایک روپیہ تک کہیں جیب میں نظر نہیں آتا' پتہ نہیں کہاں ہے۔ اس زمانے میں تو اسکی شکل Coin (سکہ) کی ہوتی تھی پھر چھپا کر بھی کہاں رکھتے۔ اُس دور میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس قسم کا نظام قائم کرتے ہیں اور نظام میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے لیے

جمع کرتے ہیں' انداز اس کا یہ ہوتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے۔ کہا ہے کہ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا (4:37) یہ نہ سمجھو کہ یہ چیز **مُخۡتَالًا** اور **كَفُوۡرًا** جو بنا ہے' اپنے ہی ذہن میں بہت بڑا چوہدری بنا کہ ایسا ہی ہوتا رہے گا اور ایسا ہی رہے گا' ان کے لیے یہاں لفظ ''کافرین'' آیا ہے۔

## ''کافر'' کا مفہوم ہے''چھپانے والا' ڈھانپنے والا'' اور اس کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے

ہمارے ہاں تو کافر کا ایک خاص مفہوم ہو گیا ہے۔ بنیادی طور پہ لفظِ کفر کے معنی ''چھپانے'' کے ہوتے ہیں ''ڈھانپنے'' کے ہوتے ہیں۔ یہ جو کہا تھا کہ يَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ (4:37) اسی کی تفصیل ''کافرین'' نے کی ہے کہ وہ رزق جس کو کھلا رکھنا چاہیے تھا' وہ جسے چشمے کی طرح بہتے ہوئے رہنا چاہیے تھا' قرآن حمید کی اصطلاح میں وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) رزق کو بہتے ہوئے چشمے کی طرح' ہر ایک کے مکان کے سامنے چلنا چاہیے تھا' سلسبیل کی طرح سے آواز دے کر پوچھتا ہوا کہ کس کو کتنی ضرورت ہے' اس میں سے لے لو اور چلتا چلا جائے۔ قرآن حمید نے یہ انداز دیا تھا۔ یہ جو جمع کرنے ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا (4:37) ان کے لیے عذاب ہے' ذلت آمیز سزا ہے۔ وہ فخر سے بڑا بنتا تھا اسی اعتبار سے یہ کہا کہ یہ ذلت آمیز عذاب ہے' اس کا انجام ایسا ہوتا ہے۔

## نمود ونمائش کے لیے خرچ کرنے والے گروہ کا ماحصل

آگے کہا ہے کہ وَ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ (4:38)۔ اب ایک اور کیٹگری (شق' قسم) آئی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے' عزیزانِ من! کہ وہ لوگ بھی ہیں جن کو تم دیکھو گے کہ خرچ کرتے ہیں' عطیات دیتے ہیں' Donations (نذرانے) دیتے ہیں۔ کہاں دیتے ہیں؟ جنابِ کمشنر نے ایک ہسپتال بنانے کے لیے اپیل کی ہوئی ہے' اس پر Tablet (تختی) لگے گی' اس پہ نام لکھے جائیں گے۔ اس کے برعکس ہمسائے میں غریب بیوہ ہے اور اس کے بچے بھوکے مر رہے ہیں' ان کے کتوں کو وہ کچھ مل رہا ہے جو اس کے بچوں کو نصیب نہیں ہے مگر وہاں کچھ نہیں دیا جائے گا' دیا وہاں جائے گا جہاں نمود ہوگی' نمائش ہوگی' نام ہوگا' لوگ دیکھیں گے' چرچا ہوگا' پروپیگنڈہ ہوگا' آنرز لسٹ میں یہ چیز چھپے گی۔ عزیزانِ من! جہاں تک اس روپیہ دینے کا تعلق ہے' کوئی شخص جو نمائش کے بغیر بھی دوسرے کی مدد کے لیے دیتا ہے' اس روپے کے بھی سو ہی ٹیڈی پیسے بنتے ہیں' کوئی شخص جو اس طرح سے دیتا ہے' روپے کی قیمت تو اتنی ہی ہوتی ہے' تو یہ فرق کہاں آ کر پڑتا ہے؟ قرآن مجید بتاتا ہے کہ وہ جو روپیہ ہے' اس پہ شجرِ طیب اُگے گا' یہ جو روپیہ ہے' یہ گلے کا طوقِ لعنت بن جائے گا۔ کیا فرق ہے؟ جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! اصل چیز یہ ہے اور بنیاد یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔

## روس میں مروجہ معاشی نظام میں خامی کی نشاندہی

آج آپ کے ہاں سوچا جاتا ہے کہ معاشی نظام کونسا ہونا چاہیے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ایسے معاشی نظام بھی سامنے لائے جاتے ہیں' کسی حد تک یہ ایسے پروگرام بھی ہوتے ہیں' جن میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جن کی رو سے دولت جمع نہ ہونے پائے' یہ پھیلا دی جائے' معاشرے میں عام لوگوں کی ضرورتیں بھی پوری ہونے لگ جائیں۔ اس کو ایک نظام کہا جاتا ہے۔ یہ نظام جس زمانے میں پہلے پہل روس❶ میں رائج ہوا ہے' ایک دنیا نے اس کی مدح وستائش میں قصیدے پڑھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے یہ ایک Agitation (مشتعل ہونے کی حالت) تھی' یہ اٹھی اور اسلام کا ایک کام کرگئی' یہ کرسکتی تھی کیونکہ اسلام بھی نظامِ سرمایہ داری کو مٹاتا ہے۔ وہ تو صرف ترغیب نہیں دیتا' وہ مکان کو صرف ڈھاتا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ ایک نئی عمارت بھی بناتا ہے اور اس کے یہ دونوں پروگرام ایک وقت میں چلتے ہیں' اس کی تخریب تعمیرِ نو کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے اتنے حصے کی تعریف کرنے کے بعد اقبالؒ (1877-1938ء) نے یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! یہ جو نظام تم لے کر آرہے ہو' یہ بڑا پرکشش اور جاذب ہے لیکن اس کے لیے کوئی جذبہ محرکہ' کوئی محکم بنیاد' ''اساسِ محکمے'' ❷ بھی تم نے کہیں سے تلاش کی ہے؟ اس کے لیے تمہارے پاس بنیاد نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص کیوں صبح سے شام تک جان مار کر محنت کرے' محنت کرنے کے بعد اس میں سے اپنے لیے صرف دال روٹی کا حصہ رکھے' باقی سارا دوسروں کے لیے دیدے۔ کیوں دیدے؟ کہ جی' اس سے تو حکومت زبردستی لے لے گی تو یہ استبداد ہوگیا' قانون بنادے گی' یہ وہی بات ہوگئی۔ وہ کیوں دیدے؟ اس ''کیوں'' کا جواب اس نظام میں نہیں ہے۔ آج بھی اگر اس نظام کی اس قسم کی کچھ کڑیاں پیش کی جاتی ہیں مگر اس کیوں کا جواب' ان کے پاس اب بھی نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک نظام ہے۔ پروگرام کے اعتبار سے تو آپ اسے کہیے گا کہ یہ اسلام کا معاشی نظام ہوجائے گا' ایسا ہی ہوجائے گا جیسے یہ آپ کے ہاں کی نمازیں' اسلامی کہلا رہی ہیں۔ اس کی جزئیات' اس کے ارکان' اس کی تمام نقل وحرکت' جتنی بھی ہے' وہ صلوٰۃ ہی تو ہے لیکن اس کے بعد اس کے نتائج تو ویسے مرتب نہیں ہورہے۔

---

❶ 7 نومبر 1917ء

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اصل الفاظ (بصورت شعر) یہ ہیں:

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جُستۂ اورا اساسِ محکمے؟　　(جاویدنامہ)

## سرمایہ داری کے نظام کا جذبۂ محرکہ حیوانیت ہے' اس میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دینا نہیں ہوتا

سوال یہ نہیں ہوتا کہ کسی نظام کا پرگرام کیا ہے' اس کی کڑیاں کیا ہیں' اس کے الفاظ کیا ہیں' اس کی شقیں کیا ہیں۔سوال یہ ہے کہ اس کے اندر جذبۂ محرکہ کیا ہے جس کی بنیادوں پہ آپ وہ نظام قائم کر رہے ہیں۔سرمایہ داری کے نظام کا جذبۂ محرکہ حیوانیت ہے یعنی اپنی ذات کے لیے لینا۔یہ ہر حیوان کرتا ہے۔اس سے اونچا جذبۂ محرکہ اس میں ہوتا ہی نہیں' نہ ہی اس کے لیے کسی جذبۂ محرکہ کے تحت دینے کی ضرورت ہے۔انسان کو حیوانی سطح پر چھوڑ دیجیے' وہ زیادہ سے زیادہ سمیٹتا چلا جائے گا' اُسے کسی وعظ کی ضرورت نہیں' کسی قانون کی ضرورت نہیں' قانوناً جو کچھ کوئی سمیٹتا چلا جاتا ہے اُسے جائز قرار دینے کے لیے ہوتا ہے کہ دوسرا نہ لے جائے لیکن یہ چیز کہ زیادہ سے زیادہ محنت کرواور زیادہ سے زیادہ دوسرے کو دیدو' کچھ اور ہی ہے۔جس چیز کو ڈاکو لے جائے گا' اسے ڈاکا کہیں گے' وہ قانوناً دلوا دیں گے' یہ بھی دوسرے کا استبداد ہو جائے گا' اس پر نظام نہیں چل سکے گا۔نظام یہ ہے کہ اس کی بنیاد کیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور یہ زائد از ضرورت دوسرے کو دیدے۔

## اگر مکافاتِ عمل پر ایمان نہ ہو تو لاکھوں کا چندہ بھی کوئی نتائج مرتب نہیں کرتا

قرآن حکیم نے یہاں اس کی ایک شق گنائی ہے کہ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ (4:38) وہ لوگ بھی ہیں جو مال و دولت خرچ تو کرتے ہیں مگر یہ نمود و نمائش کے لیے ہوتا ہے۔وہ دیتے ہیں' صرف بھی کرتے ہیں۔آپ نے دیکھے ہونگے کہ وہ بڑے بڑے Dotanations (نذرانے) لاکھوں کے دیتے ہیں لیکن جذبۂ محرکہ رِئَـآءَ الـنَّـاسِ ہوتا ہے' محض نمود ہے۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔اب سوال یہ ہے کہ کیوں اس کا نتیجہ مرتب نہیں ہوگا؟ اس لیے کہ اس کا جذبۂ محرکہ رِئَـآءَ الـنَّـاسِ ہے' محض نمود و نمائش ہے۔آگے کہا ہے کہ وَ لَا يُـؤْمِـنُـوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (4:38) اس کے لیے جذبۂ محرکہ قانونِ مکافاتِ عمل ہوگا یعنی یہ جذبۂ محرکہ ہوگا کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے' قانون کچھ بھی بنا ہوا ہو' خواہ معاشرہ بھی اسے جائز ہی کیوں نہ قرار دیدے لیکن جو چیز خدا کی متعین کردہ مستقل قدر کے خلاف جاتی ہے' اس سے میری ذات کو نقصان پہنچتا ہے' میں یہ نہیں کرونگا۔اسے اللہ اور آخرت پر ایمان کہتے ہیں کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' زندگی نے آگے بھی بڑھنا ہے۔خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اور اس کا بھی نتیجہ مرتب کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ چونکہ یہ جذبۂ محرکہ نہیں ہے' اس لیے یہ خرچ کی ہوئی دولت بھی وہ نتائج نہیں پیدا کرسکتی۔یہ وہی ہے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ دولت کا' لاکھ روپے کا' اینٹ چونا پتھر اتنا ہی آئے گا جتنا دوسری

طرح سے دیئے ہوئے لاکھ روپے کا آئے گا Materially (مادی طور پر) تو اس میں فرق نہیں پڑے گا۔

## قرآنِ حکیم کا سارا نظام جذبۂ محرکہ کی بنیاد پر استوار ہو کر نتائج پیدا کرتا ہے

دیکھتے ہیں یہاں Concept (تصور) کیا آیا ہے۔ یہ Concept (تصور) میٹریل (ساز وسامان) کا آیا ہے۔ ان روپوں کا میٹریل (ساز وسامان) اتنا ہی آ جائے گا لیکن اس کا جذبۂ محرکہ وہ نہیں ہے۔ قرآنِ مجید اس جذبۂ محرکہ کے اوپر اپنا نظام استوار کرتا ہے۔ لہٰذا اگر آج آپ کے یہ نماز' یہ روزے' یہ حج' یہ زکوتیں' جن کی شکل وشباہت وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یا صحابہؓ کے دور میں تھی' یہ سارا کچھ وہ نتائج نہیں پیدا کر رہا جس کے لیے ہم یوں تڑپ رہے ہیں تو یہ سوچنے کی چیز ہے۔ یاد رکھیے! کوئی معاشی نظام بھی' اگر اس کی شکل وشباہت بیشک اس قسم کی ہو' اگر اس کی بنیاد وہ نہیں ہے جو قرآن مجید کہتا ہے تو وہ آپ کے ہاں کبھی وہ نتائج نہیں پیدا کرے گا۔ قرآن حکیم کا معاشی نظام صرف Super-Structure (ماورائی ڈھانچہ) کا نام نہیں ہے کہ اوپر عمارت کھڑی کر دی ہے۔ نیچے بنیاد کیا ہے؟ بنیاد ہے کہ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (4:38) وہ خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی صداقت' قانونِ مکافاتِ عمل اور موت کے بعد زندگی کے مسلسل آگے بڑھنے پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس میں یہی بات نہیں ہے کہ صاحب! روس یا چین والے خدا کا انکار کرتے ہیں' یہ Atheists (دہریئے) ہیں۔ یہاں اس اصطلاح کا سوال نہیں ہے' سوال یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن کیا وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر یقینِ محکم رکھتا ہے؟ کیا اس کا یہ ایمان ہے کہ حرام کی کمائی کا ایک گھونٹ میرے لیے زہرِ قاتل ہے' کیا وہ ایمان رکھتا ہے کہ زندگی یہیں کی نہیں' آگے بھی چلنی ہے' کیا وہ ایمان رکھتا ہے کہ یہاں کوئی حساب لینے والا بھی نہ ہو' میں نے کسی اور کو جا کر حساب دینا ہے؟ کیا وہ اس چیز پر ایمان رکھتا ہے؟ چونکہ یہ چیزیں نہیں ہوتیں اس لیے اس کے وہ نتائج نہیں مرتب ہوتے۔ یہ ہے اس نظام کی بنیاد۔

## انسان اپنی ذات کی Satisfaction (تسکین) کے گرد چکر لگانے میں ہی مصروف رہتا ہے

وہ کہتا ہے کہ رِئَآءَ النَّاسِ پہ خرچ کیا ہوا یہ مال و دولت وہ نتائج پیدا نہیں کرے گا۔ کیوں نہیں پیدا کرے گا؟ اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (4:38) جس عمل کی بنیاد پست جذبات ہوں' اس کا نتیجہ کس طرح خوشگوار ہو سکتا ہے۔ اب اس خرچ کرنے والے نے اتنا کچھ دیا بھی ہے۔ یہ فعل بظاہر بڑا مستحسن ہے۔ اہلِ شریعت سے بھی پوچھو تو کہیں گے کہ یہ بڑا نیکی کا کام ہے' پھر یہ وہ نتیجہ کیوں نہیں پیدا کرتا؟ شیطان تو اب آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے؟ یہ انسان کے بے باک جذبات ہیں جو خدا کے قوانین کے خلاف جانے والے ہیں' تو یہ کہا ہے کہ یہ جو دے رہا ہے' یہ اُن جذبات کے تابع دے رہا ہے جو خدا کے قانون کے تابع نہیں

ہیں' یہ اپنا Ego (پندارِ نفس)❶ ہے جس کی Satisfaction (تسکین) کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے اس کو اس کا یہ نتیجہ مل گیا۔ یہ چاہتا تھا کہ اس سے اُس کے اپنے Ego (پندارِ نفس) کی Satisfaction (تسکین) ہوجائے' سو ہوگئی۔ اب یہ خدا سے اس کا کیا معاوضہ مانگ رہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ **وَ مَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ** (4:39) کیا ان پہ قیامت ٹوٹ پڑتی اگر یہ خدا کے قانونِ مکافات اور زندگی کے تسلسل پہ ایمان رکھنے کے بعد خرچ کرتے جو خدا نے دیا تھا۔ ''موت پے جاندی!'' (موت آ جاتی!) یہ انداز ہے۔ لیکن وہ تو اس لیے ہے کہ وہ ایمان صرف اس معاشی نظام تک ہی محدود نہیں رہے گا' وہ تو زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہوجائے گا' عزیزانِ من! اس میں تو کوئی ایک نقل وحرکت بھی ان جذبات کے تابع نہیں ہوگی جو انسان کو خدا کے قوانین کی حدود سے باہر لے جائیں۔ یہ محض نگاہ کا پھیر اور پست ذہنیت کا مظہر ہے۔

## انسانی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ''جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ''

زندگی پر یہ پابندیاں عائد کرنا پڑیں گی اور یہ پابندیاں ہیں جن سے گھبرانے کے لیے انسان خدا اور آخرت پہ ایمان نہیں رکھتا۔ یہ کیا عجیب چیز کہی ہے کہ **مَاذَا عَلَيۡهِمۡ** (4:39) کیا ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی' موت پڑ جاتی' او! کیا ہوتا اگر یہ جو چیز تھی وہ اس پہ ایمان رکھتے! کہا ہے کہ **وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ** (4:39) انہوں نے خرچ تو پھر بھی کرنا تھا' یوں خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق خرچ کرتے' نہ کہ اپنی نمود کی خاطر' تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہا ہے کہ **وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا** (4:39) اور خدا جانتا ہے' وہ ان محرکات پہ نگاہ رکھتا ہے جو اس انصاف کے لیے جذبۂ محرکہ بنتے ہیں' ہم جانتے ہیں کہ تمہاری نگاہ کس جذبہ پہ ہے' تم کس جذبہ کے ماتحت کوئی کام کرتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ** (4:40) ذرا سا بھی ہم ظلم نہیں کرتے۔ ''ظلم'' کے معنی کمی کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ ہم تو کسی کے اجر میں کمی نہیں کرتے۔ اور اُن کے متعلق یہ کہا ہے کہ **فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا** (18:105) ان کے لیے قیامت کے دن میزان بھی نہیں کھڑی کی جائے گی۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ واقعی یہ کچھ متضاد سی بات کہدی ہے کہ ہر ایک کا عمل تُلے گا' سامنے آئے گا' اس کا اجر ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ اس کے لیے میزان بھی نہیں کھڑی کی جائے گی' یہ کہا ہے کہ **لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ** (4:40) ہم تو کسی کا ذرہ بھی کم نہیں کرتے تو یہ کیا بات ہوئی؟ پہلے تو یہ بات کہہ گیا ہے کہ انہوں نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ایک کام کیا' جذبات کی تسکین ہوگئی' معاملہ ختم ہوا' اب ہمارے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہے جس کے لیے (تکڑی)

---

❶ حیوانی سطح زندگی کے جذبات کو ہم نے ایغو (Ego) سے تعبیر کیا ہے' اور جو جذبات خدا کی متعین کردہ مستقل اقدارِ انسانیت کے لیے بروئے کار آئیں تو ان سے انسانی ذات (Human Personality) کی نمود ہوتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 191' فٹ نوٹ 1)

ترازو اٹھاتے پھریں؟ ترازو تو اس کے لیے ہوگا جس کا معاملہ ہمارے ساتھ ہوگا۔ جس نیک کام میں' نیک کام کو میں Quoted (تمثیلاً) کہتا ہوں جسے بظاہر نیک کام سمجھا جائے' جذبۂ محرکہ خود اپنی ذات کی تسکین ہوگی' رِئَـآءَ النَّاسِ کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ لوگ خوش ہو جائیں' تعریف ہو جائے' انسان کا جو Ego (پندارِ نفس) ہے' اس کی Satisfaction (تسکین) ہو جائے۔

یاد رکھیے بات دوسری طرف نکل جائے گی' Personality (شخصیت) اور Ego (ایغو) میں فرق ہوتا ہے۔ قرآن کریم جو انسان کا نفس کہتا ہے' وہ انسان کی ذات ہے۔ یہ وہ شے ہے جو مستقل اقدار کے تابع نشو و نما پاتی ہے اور اس طبعی زندگی کے بعد آگے بڑھتی ہے' اس کے لیے تو میزانوں کی ضرورت ہے' پیمانوں کی ضرورت ہے' یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ طالبعلم آگے بڑھنے' اگلی کلاس میں جانے کے قابل ہو گیا ہے یا نہیں اور جو طالبعلم Compulsory Subjects (لازمی مضامین) کے اندر فیل ہو جاتا ہے' اس کے باقی پرچے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ ہر عمل نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے عمل کا جو نتیجہ چاہا تھا' وہ نتیجہ ان کو مل گیا۔ یہ نمود چاہتے تھے' نمائش چاہتے تھے' تعریف چاہتے تھے' اپنی Ego (ایغو) کی Satisfaction (تسکین) چاہتے تھے' وہ ان کو مل گیا۔ اب ہمارے ہاں "آ کے نکڑ تے کاہدے لئی کھلوتے ہوئے نیں" (اب یہ ہمارے ہاں کونے پہ کس لیے منتظر ہیں؟)

## حسنات کو بڑھا دینے کا مفہوم اور اس کی نوعیت

کہا ہے کہ وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَةً یُّضٰعِفۡهَا وَ یُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا(4:40) ۔ یہ حسنات کی کیفیت ہے۔ کیا بات قرآن حمید کہہ گیا ہے! بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ قرآن حمید نے کہا کہ جو حسنات ہیں' ہم ان کو بڑھاتے ہیں۔ یوں ہوتا ہے صاحب! کہ بدلہ تو اس کا ایک جیسا' اتنا ہی ملنا چاہیئے' 'ہم اسے بڑھاتے ہیں' یہ کیا بات ہوئی؟ "پنجابی اچ ایوں جس طراں کسے دی رعی کرن ڈیا ہوندا اے" (پنجابی میں یوں ہے کہ جس طرح کسی کی رعایت کر رہا ہے)۔ یہ لفظ تو رعایت سے ہی ہے لیکن "رعی جیہڑی ہے نا پنجابی دی اوہدے اچ بڑا فرق ہیگا اے۔ اورعی کردا اے" (یہ جو پنجابی زبان میں "رعی" ہے' اس میں اور رعایت میں بڑا فرق ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ "رعی" کرتا ہے)۔ یہ "رعی" یعنی ممتحن ایسے ہی زیادہ مارکس دیدیا کرتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن حمید نے جو کہی ہے!

حسنات کیا چیز ہیں؟ ایک تو یہ کہ آپ کے ہاں کچھ اناج رکھا ہے' آپ نے اس کو پیس لیا' اس کی روٹی پکا لی' ٹھیک ہے سیر بھر اناج تھا' سیر بھر روٹی پک گئی' ایک سیر برابر مل گیا اس میں کمی نہیں ہوئی۔ ایک یہ ہے کہ اس اناج کے دانوں کو آپ نے جا کر زمین میں بو دیا' پھر اس پہ خدا کے قانونِ زراعت کے مطابق محنت کی' ثبات و استقلال سے اس کے ساتھ ساتھ چلے' ایک ایک دانہ سات سات سو دانے دیتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآن مجید کہتا ہے کہ ہم حسنات کو بڑھاتے ہیں۔ حسنات وہ بیج ہوتے ہیں جن میں شجرِ ثمر دار بن جانے کی

صلاحیت ہوتی ہے۔اور وہ جو اسی وقت اس کا Materially (مادی لحاظ سے) بدلہ چاہتا ہے' اس کو سیر بھر دانوں کی' سیر بھر روٹی کا' اتنا ہی بدلہ ملتا ہے۔کہتا ہے کہ ہم اس میں کمی نہیں کرتے' یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جو سیر بھر دانے بنائے ہیں' ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا نہیں کرتا کہ اس میں ہم کمی کرلیں' یہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے' اس میں ہم یہ نہیں کرتے۔ٹھیک ہے اس نے Materially (مادی طور پر) اس کا معاوضہ چاہا تھا' اس کے مطابق وہ اس کو مل جائے گا۔جو معاملہ' اس نے' ان جذبات سے' دل سے' ان نیتوں سے کیا تھا' جس کو آپ نے ذات کی نشوونما کہا ہے اس کی مثال قرآن کریم ہمیشہ کھیتی سے دیتا ہے کہ کسان ایک دانہ بوتا ہے' پھر اس کے لیے صبر وتحمل اور استقامت اور ثبات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔اپنے گیہوں کے دانوں کے پراٹھے تو آدھے گھنٹے میں پک جاتے ہیں' ایک دانے سے سو دانہ لینے کے لیے چھ سات مہینے مسلسل محنت کرنا پڑتی ہے۔یہ ہے **وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا وَ یُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا** (4:40) اگر اس کا مقصد قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے تو یہ ایسا حسنِ عمل ہے جس کا بدلہ' اُن کے صرف کردہ مال سے' کئی گنا زیادہ ملتا ہے۔اس سے معاشرہ میں خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔اجرِ عظیم ہے جو ہم دیتے ہیں' ہم اس کو بڑھاتے ہیں۔

## حضرت عمرِ فاروقؓ کی زبانی خلافت وملوکیت میں فرق کی وضاحت

عزیزانِ من! آگے بڑی عجیب آیت ہے۔کہا کہ یہ لوگ جو سب کچھ سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور معاشرہ کے اندر اس قسم کا نظام ہے' خواہ وہ نظام حکومت کا ہو یا معاشرتی نظام ہو' جسے آپ رسم ورواج کا نظام کہتے ہیں' یا معاشرے کا نظام کہتے ہیں' جو اس طرح کا نظام قائم کیے ہوئے ہیں' کہ سمیٹتے چلے جاتے ہیں' اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ کوئی اسے معیوب بھی قرار نہیں دیتا' تو کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا' کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا؟ کہا کہ یہ غلط ہے۔قرآن کریم کہتا ہے کہ **فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا**(4:41) پوچھو ان سے' کیا کیفیت ہوگی ان کی' اس دن جب ان کے گروہ کا ایک ایک نمائندہ بلایا جائے گا اور اے رسول! تیری پوزیشن اس میں یہ ہوگی کہ تم ان سب کے اوپر' سربراہ کی حیثیت سے' کھڑے ہوگے۔پوچھو کہ اس دن ان کی کیفیت کیا ہوگی۔اس دن قرآن کریم کے الفاظ میں پوچھا جائے گا کہ ''تم نے کہاں سے لیا اور کہاں صرف کیا تھا''۔حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے خلافت کی یہ Definition (تعریف) بیان کی تھی۔آپؓ سے پوچھا گیا تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔کہا کہ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب خدا کو کیا دیا جائے گا کہ ''کہاں سے لیا تھا اور کیسے صرف کیا تھا''۔یہ ہے جو کہا گیا کہ جس دن مجمع میں سے سب گواہ اکٹھے ہونگے اور رسول اللہ ﷺ اس پہ گواہ ہونگے۔اب ہمارے ہاں تو ہر قصہ کو محض اس لیے قیامت پہ اٹھا

رکھتے ہیں کہ کہیں ہمارے سامنے آئینہ نہ آجائے' لہٰذا آنکھیں بند رکھتے ہیں۔اور ایسی روش اختیار کر رکھی ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ معاشرہ کا نقشہ ہمیشہ اسی انداز پر رہنا ہے جس میں فریب اور تصنع سے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ان کا یہ خیال خام ہے۔

## اس زندگی کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان کیا نتائج پیدا کرتا ہے

عزیزانِ من! قیامت برحق ہے' مرنے کے بعد کی زندگی پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن حکیم کے یہ نتائج وہیں تک تو قرآن حکیم نہیں اٹھا کر رکھتا۔ہم نے ایسا اس لیے کیا ہے کہ ہمیں یہاں نہ دکھایا جائے۔رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت آپ ﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ میں قائم ہو کر سامنے آئی۔کیا فتح مکہ سے یہ کیفیت سامنے نہیں آئی تھی کہ اس نظام کے مخالفین' جنہوں نے بائیس برس تک اتنی مخالفت کی اور یہ کہا کہ کون ہے جو ہمیں راستے سے اٹھا دے گا' کون ہے جو اس نظام کو گڑ بڑ کر دے گا' ہم پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے ہیں۔قرآن حمید نے کہا تھا کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے' ریت کے ذروں کی طرح بکھر جائیں گے۔وہ سردارانِ مکہ یہ پہاڑ تھے۔یہ جتنے نمائندے تھے یہ سامنے آئے۔اور سربراہی کی سعادت اور شرف اسے نصیب ہوئی کہ جس دن وہ اٹھا' تنہا اٹھا تھا' وہ یتیم بھی تھا' غریب بھی تھا لیکن ان پہاڑوں سے ٹکر لے رہا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ روئی کے گالوں کی طرح اڑ جاؤ گے۔فتح مکہ پر یہ سب اس حالت میں سامنے آئے کہ گردنیں جھکی ہوئی ہیں' گلے میں طوق پڑے ہوئے ہیں' زنجیریں پڑی ہوئی ہیں یہاں تک کہ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ (4:41) ہر قبیلے کا ایک ایک سردار موجود تھا۔وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (4:41) اور تُو اُن کے اوپر پھر سب سے بڑا نگران تھا اس لیے ایسی شکل اختیار کر کے رہنا ہے جس میں مختلف جماعتوں کے سربراہ نمائندے اکٹھے ہونگے اور رسول اللہ ﷺ اُن سب پر نگرانِ کار ہونگے۔

اب کہا جا رہا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس دن پھر کیا کیفیت ہوگی۔قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ (4:42) اس دن یہ لوگ جنہوں نے وہ چھپانے والا نظام قائم کیا تھا' رسول دعوت دیتا چلا جاتا تھا' یہ اس کی سرکشی کرتے چلے جاتے تھے' معصیت کرتے چلے جاتے تھے' کہتے تھے کہ ہم نہیں مانیں گے۔پوچھو اس دن' ان کی کیا کیفیت ہوگی۔اس کے لیے کہا ہے کہ يَوَدُّ (4:42) یہ چاہیں گے' ان کی تمنا یہ ہوگی کہ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (4:42) اے کاش! آج ایسی کیفیت ہوتی کہ ہم زمین میں گڑ جاتے اور اوپر سے روڈ رولر پھر جاتا' ہماری قبر کا کہیں نشان تک نہ ہوتا۔دوسری جگہ کہا ہے کہ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (78:40) اس دن یہ کہیں گے کہ اے کاش! ہم مٹی کا ڈھیر ہوتے' انسان نہ ہوتے۔کہا کہ اس دن ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ جو بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو محکم سمجھتے ہیں' جو جھوٹی عزتوں میں مُخْتَالًا اور فَخُوْرًا بنے

پھرتے ہیں' اسی معاشرے کے اندر' عزیزانِ من! وہ پابجولاں سرنگوں سامنے کھڑے ہوں۔ اس دن پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہیں کہ ہمارے جرائم کی جو سزا ہے ہم اس کے مستحق ہیں اور کہنے والا جودوکرم کا پہاڑ یہ کہے کہ **لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92) مجھے تمہارے خلاف کوئی دشمنی نہیں تھی' اس نظام کے خلاف دشمنی تھی جس کے تم ارکان تھے۔ آج وہ نظام ٹوٹ گیا ہے' میں تم سب کو معاف کرتا ہوں۔

عزیزانِ من! یہ بات ذہن میں رکھیے کہ وہ ان کے گھر نہیں جلاتا' ان کا گھیراؤ نہیں کرتا تھا' ذاتی انتقام نہیں لے رہا تھا' غلط نظام کچل رہا تھا۔ ان کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہمارے جرائم کی جو سزا ہے' ہم اس کے مستحق ہیں۔ لیکن وہ تو اتنی بڑی بڑی عزتوں والے چوہدری بنے ہوئے اس دن یہی تمنا کیے ہوئے تھے کہ **لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا** (4:42) اے کاش! ہم اس سے پہلے نسیاً منسیاً ہو چکے ہوتے اس لیے کہ آج یہ لوگ جو سب کچھ چھپا کر رکھ رہے ہیں' اُس دن تو ایک پائی بھی چھپائی نہیں جائے گی صاحب! سب کچھ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔ اگر ان میں سے کسی پر یہ وقت یہاں نہیں آیا تو موت کے بعد ایسا ہوگا۔ اس لیے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا سلسلہ یہاں سے وہاں تک برابر پھیلا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! اتفاق سے وقت بھی ہو گیا اور یہاں تک یہ مضمون بھی ختم ہو گیا۔ اگلے مضمون میں قرآن کریم یہ بتائے گا کہ اس کے لیے اجتماعاتِ صلوٰۃ ضروری ہیں اور ان کا نظام کیا ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**

❀......❀......❀

# تیرھواں باب: **سورۃ النسآء** (1)(آیات 43 تا 48)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى
تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا
نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ
غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ
خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا
نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ
السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1970ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 43ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:43)۔

## مذہب انفرادیت کا خوگر، جب کہ دین نوعِ انسانی کے اجتماعی نظام کا علمبردار، نیز دین و مذہب میں صلوٰۃ کے اجتماعات

سابقہ آیات میں اس نظام کا ذکر تھا جو اس انقلابِ عظیم کے نتیجے میں قائم ہونا تھا، جس کی دعوت حضورِ نبی اکرم ﷺ دیتے چلے آ رہے تھے اور جس کا نقطۂ ماسکہ وہ تھا کہ اطاعت صرف خدا کے، اکیلے خدا کے، احکام وقوانین کی ہو سکتی ہے، اس کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ یہ نظام ایک اجتماعی زندگی چاہتا ہے۔ ہر نظام اجتماعی زندگی چاہتا ہے۔ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب یکسر انفرادی شے ہوتا ہے جس میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر گیان دھیان اور پوجا پاٹ کی ان چیزوں سے اپنی نجات کی فکر کرتا ہے لیکن دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جس میں ہر وہ قوت جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو، اسے ہٹایا جاتا ہے اور پوری

نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ اور دین چونکہ اجتماعی نظام کا نام ہے اس لیے اس میں اجتماعات نہایت ضروری ہیں' اس کی بنیادی چیز ہی اجتماعات ہیں اور یہ جو دین کے اجتماعات ہیں' انہیں صلوٰۃ کے اجتماع سے تعبیر کیا گیا ہے' جس کے معنی ہوتے ہیں: ''مسلسل اور پیہم کسی کا اتباع کرتے چلے جانا' کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا''۔

عزیزانِ من! یہ صلوٰۃ کے جو اجتماعات ہیں انہیں اسلامی معاشرے کے قیام و استحکام کے لیے بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن مذہب میں آ کر تو یہ صرف پرستش اور بندگی کی چیز ہیں جو ہمارے ہاں عبادت کا غلط مفہوم ذہن میں لاتے ہیں۔ انفرادی طور پر مذہب میں تو ان کی یہ حیثیت ہے لیکن دین میں ان اجتماعات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اس لیے منعقد کیے جاتے ہیں کہ سب سے پہلے اس چیز کا اقرار' یا اعتراف کیا جائے کہ ہم جھکیں گے تو صرف ایک خدا کے قانون کے سامنے جھکیں گے' دنیا کی کسی طاقت کے سامنے ہمارا سر نہیں جھکے گا۔ یہ ہے وہ عملاً اعتراف اور وہ اعلان جو آپ کے ہاں صلوٰۃ میں کبھی رکوع اور کبھی سجود کی شکل میں محسوس طور پر سامنے آتا ہے لیکن یہ عملِ محسوس ایک روح کا مظہر ہے اور وہ روح یہ ہے کہ جھکنا خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے جائز نہیں ہے۔ دل میں ان آرزوؤں کا بیدار کرنا' ان کے بے ساختہ اظہار کے لیے ان محسوس حرکات کا عمل میں آنا اور اس اقرار و اعتراف اور دل کے جھکاؤ اور آمادگی کے بعد پھر اگلی بات یہ ہے جس کی تمہید میں' میں نے عرض کیا ہے کہ مذہب میں یہی تمہید مقصود بالذات بن جاتی ہے یعنی اتنا ہی کچھ ہوتا ہے۔

اب ہمارے ہاں نماز میں حتیٰ کہ مسجد میں دنیا کی کوئی بات بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ کے ہاں دنیا اور دین میں اس قدر ثنویت یا Dualism ہی نہیں بلکہ تفاوت ہوگیا ہے کہ مسجد میں دنیا کی کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ اور جس نے صلوٰۃ کے یہ اجتماعات فرض قرار دیئے تھے' جس نے ان اجتماعات کو نظام کا رکن بنایا تھا' اس نے یہ کہا تھا کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38) جماعتِ مومنین کے لوگ اپنے خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے نظامِ ربوبیت کے قیام کے مقصد کے لیے آگے بڑھتے ہیں' اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38) نظامِ صلوٰۃ کا قیام کرتے ہیں' اس کی اقامت کرتے ہیں' اسے قائم کرتے ہیں۔

یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظامِ صلوٰۃ ہی کا ایک حصہ ہیں۔ یہاں مذہب میں تو یہ ہے کہ جب نماز پوری ہو جاتی ہے تو اس کے بعد آپ گھروں کو آجاتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ دین میں یہ اجتماعات ایک آنے والے مقصد کے لیے تمہید ہے اور وہ مقصد کیا ہے؟ یہ کہ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) وہ نظامِ صلوٰۃ انہیں یہ سکھاتا ہے کہ تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں۔ یہ اجتماعات تو معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرنے کے لیے تھے جن کا آغاز اور تمہید اس اعتراف اور اعلان کے ساتھ ہوتا تھا کہ ہم اطاعت اس کے قوانین کی کریں گے اور اس کے علاوہ کسی اور کی نہیں کریں گے۔ قرآنِ

حکیم نے شروع میں ہی کہا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے۔ یہ کتنا بڑا اعلان ہے!

عزیزانِ من! یہ بڑا ہی انقلاب آفریں اعلان ہے کہ 'ہم تیرے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے'۔ اور اس اقرار کے بعد جو مشاورت ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ اسی محور کے گرد گھومے گی' وہ انہی حدود کے اندر رہے گی۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ باہمی طور پر سوچا کیا جائے گا؟ سوچا یہ جائے گا کہ وہ کیا عملی طریقے اختیار کیے جائیں کہ دنیا میں سب سے پہلے ہماری کیفیت یہ ہو کہ ہم اس کے قوانین کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کریں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دعوت کو ایسے آگے بڑھائیں کہ پھر کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم رہے' نہ محتاج رہے۔ یہ ہیں وہ عملی طریقے جن کو باہمی مشاورت سے طے کرنے کے لیے یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ منعقد ہوتے تھے۔

## عہدِ رسالت ﷺ میں مسجدِ نبوی کا استعمال عدالت کے فرائض کی انجام دہی اور بطور کمیونٹی سنٹر کے بھی تھا

آج کے گئے گزرے زمانے میں بھی' جہاں تک وعظ کا تعلق ہے' وہاں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسی مسجدِ نبوی ﷺ کے اندر عدالت قائم ہوتی تھی' وہی آپ کی سیکرٹیریٹ تھی' وہیں باہر کی مملکتوں کے سفیر آتے تھے' وہیں مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے' وہیں ایک گوشے میں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور یہاں تک بھی ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جو حبشیوں کا ناچ ہوا تھا' وہ بھی صحنِ مسجد میں ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے ہاں تو مسجد ایک ایسا کمیونٹی سنٹر تھا' جو ملت سے متعلقہ تمام امور کے حل کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام کا مرکز قرار پایا تھا۔ اس کو مسجد کہتے تھے۔ جس مسجد میں آج دنیا کی کوئی بات بھی کرنا جائز نہ رہا اس لیے کہ جو تمہید تھی وہ مقصود بالذات ہوگئی اور وہ بھی ایک رسم سے آگے نہ بڑھی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب بھی کسی کو پیچھے سے آواز آتی ہے کہ تیری نماز نہیں ہوئی تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تیرے ہاتھ یہاں کان کی لو کو نہیں چھوئے' تیرے ہاتھ سینے پہ نہیں بندھے تھے یا زیرِ ناف نہیں باندھے گئے' تیرے پاؤں میں اتنا فاصلہ نہیں تھا' سجدے میں جسم کا فلاں فلاں حصہ زمین کے اوپر نہیں لگا تھا' یہ چیزیں اس میں ہونگی کہ جس سے نماز نہیں ہوئی اور جو ان ارکان کو اس طرح سے پورا کردے اس کی نماز ہوگئی۔ یہ ہو کیا گیا؟ اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ (42:38) اجتماعاتِ صلوٰۃ کا یہ مقصد تھا کہ باہمی معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں' اور یہ بھی تھا کہ رزقِ خداوندی کو اِس طریق سے بانٹا جائے کہ دنیا میں کوئی ایک بھی بھوکا باقی نہ رہے۔ اس مقصد کے لیے آپ کا یہ نظامِ صلوٰۃ تھا اور صلوٰۃ کے یہ اجتماعات تھے۔ بہر حال یہ چیز تو شروع میں بھی' جب الصلوٰۃ آئی تھی تو میں عرض کر چکا تھا' جب آگے چل کر پھر نظامِ صلوٰۃ کی بات آئے گی' اس وقت بھی میں تشریح کرتا چلا جاؤں گا۔

## صلوٰۃ کے اجتماع میں انسانی جسم کی صفائی کی تاکید کا معاملہ

اس وقت تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو 43ویں آیت سامنے آرہی ہے اس میں اس اجتماع میں شرکت کے لیے ایک معاشرتی

بات کہی گئی ہے۔قرآنِ کریم جہاں قلب و دماغ کی تطہیر اور پاکیزگی پر زور دیتا ہے‘ وہ معاشرے کے اندر انسانی جسم کی صفائی پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔صلٰوۃ کا اجتماع خاص طور پر آج کل‘ برسات کے دنوں میں‘ جب حبس ہو رہا ہو‘ کسی جماعت کے اندر کسی اجتماعِ صلٰوۃ میں ذرا کھڑے ہو کر بتایئے‘ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت اس صفائی کی کتنی ضرورت ہے حالانکہ یہ ایک عام انسانی چیز ہے لیکن قرآنِ کریم تو ان چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا‘ جسمانی صفائی اور کپڑوں کی صفائی کو بھی بڑا ضروری قرار دیتا ہے کہ ایک اجتماع کے اندر بیٹھے ہوئے اگر وہاں تعفن کی یہ کیفیت ہو کہ آپ سارا وقت اسی کے اندر الجھے رہیں‘ آپ کا دماغ کیا Concentrate (ارتکاز) کرے گا‘ کیا فیصلے قبول کرے گا۔اس لیے اس آیہ میں اور اس کے بعد بھی اس قسم کی آیات آئیں گی جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے لیے بدن کی صفائی نہایت ضروری ہے‘ کپڑوں کی صفائی بھی بڑی ضروری ہے۔

## صلٰوۃ کے اجتماع میں شامل ہونے کی دو تین شرائط اور اُن کی حکمت کی وضاحت

کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (4:43) اے جماعتِ مومنین کے لوگو! جب تم ہوش کی حالت میں نہ ہو یعنی تمہیں معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہے ہو‘ خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو تو اجتماعِ صلٰوۃ میں شریک نہ ہو۔اس صلٰوۃ سے کیا فائدہ جس میں تم سمجھو ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہو! یہاں زور اس نسبت سے نہیں کہ صلٰوۃ میں کس طرح سے‘ کس حیثیت سے‘ داخل ہونا ہے۔زور اس پہ ہے کہ ان حیثیتوں میں اجتماعِ صلٰوۃ کے اندر شرکت مت کرو۔اس میں دو تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی (4:43)۔عام طور پہ اس کے معنی کیے جاتے ہیں کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو۔یہ اس کا ایک مفہوم ہے کہ نشے کی حالت ہو‘ نیند کی حالت ہو‘ اونگھ کی حالت ہو۔اور اس سے آگے قرآن حمید نے ایک اور حالت بتائی ہے‘ ساتھ ہی اس کی علت بتا دی کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ اس حالت میں اجتماع میں شریک نہ ہو تو اس سے مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (4:43) تا آنکہ تمہیں یہ علم ہو‘ یہ معلوم ہو کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔وہاں تو یہی چیز بتانے کی تھی کہ اونگھ میں یا نیند میں بھی‘ ایک عرب یہ کچھ کہہ دے گا کہ جسے اس کا علم نہیں لیکن قرآن حمید نے تو اس کی حکمت اور علت بتائی ہے۔کہا ہے کہ حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (4:43) تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

اور آج کل ہم جو نمازی ہیں‘ ان میں سے کتنے ہی ایسے ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔دیکھ رہے ہیں قرآن مجید نے یہاں سُکٰرٰی کے معنی کیا دیئے ہیں! جہالت کا نشہ تو اس میں سب سے پہلے آئے گا‘ شرط یہ پوری کرنی ہے کہ حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (4:43) تمہیں معلوم تو ہو کہ ”ہم کیا کہہ رہے ہیں“۔میں سمجھتا ہوں کہ یہاں شاید نوے فیصد یا اس سے

بھی زیادہ ہمارے ہاں کے یہ نمازی ہونگے جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ایک تو یہ حالت ہے۔

اب اس کے لیے تجویزیں اور تدبیریں ہوتی ہیں کہ ایک صف ٹیڑھی ہو تو اس کے بعد ہر صف ٹیڑھی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ صاحب! امام پھر اردو میں کبھی تو نماز کی حالت میں ہی اور کبھی اس کے بعد یا اس سے پہلے بتا دیا کرے کیونکہ اس نماز کے اندر یہ کتنا لمبا چوڑا ہے کہ نمازی پر یہ شرط اتنی زیادہ گراں گزرے کہ صاحب! اس کو اس کا مفہوم یا ترجمہ معلوم نہ ہو۔ وہ ایک آدھ سورۃ یا دو چار کلمے تو اسی طرح سے کہتے رہیں یعنی انہیں کچھ علم نہ ہو مگر دو چار کلمے کہتے رہیں۔اب اس کے لیے یہ تجویزیں اور یہ تدبیریں کی جائیں گی۔

## قرآنِ حکیم کو صرف ناظرہ کی حد تک محدود کر دینے کی گہری سازش اور قرآن کریم کا فرمان

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ کے دین کی بنیاد کس چیز پہ ہے؟ وہ ضابطۂ حیات قرآن کریم ہے جس پہ دین کی بنیاد ہے۔قرآن کریم عربی زبان میں ہے' مسلمان کے لیے یہ فریضہ کیوں نہ ہو کہ عربی زبان جانتا ہوتا کہ اس کی زبان میں قرآن کریم کو از خود سمجھے لیکن قرآن سے مسلمان کو دور ہٹانے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا گیا ہے کہ ناظرہ قرآن مجید کے ثواب میں آپ دیکھیے صاحب! کہ جلدوں کی جلدوں میں زور ہی ناظرہ قرآن مجید پہ دیا جاتا ہے۔یہ بچے ہی ناظرہ نہیں پڑھتے' بڑے بڑے آپ کے ہاں کے جو جیّد حافظ ہیں' ان کے ہاں پورا قرآن حمید ایک شب میں' ایک شبینے میں' ختم ہو رہا ہے۔اب نہ قرآن حمید پڑھنے والے کو پتہ ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں' نہ سننے والوں کو پتہ ہے کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔اور قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) ''مت جاؤ صلوٰۃ کے اندر''۔یہی نہیں کہ یہ تنبیہ تھی کہ جاؤ یا نہ جاؤ' یہ حکماً کہا ہے کہ ''قطعاً نہ جاؤ''۔ارے مقصد کیا ہے؟ یہ کہ ''ایسے الفاظ زبان سے ادا کرنا' جن کے معنی ہی تم نہیں جانتے''۔کہا یہ ہے کہ اس صورت میں صلوٰۃ کے اندر مت جاؤ۔

عزیزانِ من! اب ثواب کے لیے تو ان کو مزید پختہ سے پختہ تر کیا جاتا ہے کہ اگر ناظرہ بھی نہ آتا ہو تو اس پہ انگلیاں ہی پھیر چھوڑو۔ ایک ایسا ضابطۂ قوانین' قرآنِ کریم' جس کے مطابق آپ نے دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے اس سے آپ کو کیوں دور رکھا جا رہا ہے؟ یہ یونہی نہیں ہے کہ ایک بات چلی آ رہی ہے' یہ بڑی گہری سازش ہے' یہ برہمنیت (Priesthood) ہے تا کہ تم ہر معاملے کے اندر ان کے محتاج رہو' مولوی صاحب سے جا کر پوچھو۔قرآن کریم اگر ہر ایک کے سامنے آ گیا تو یہ مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہ سکتی۔اور قرآن حکیم کو یوں اس انداز سے رکھیے تو آدمی محنت سے جی چراتا ہے۔انہوں نے اس سے کیا خوب فائدہ اٹھایا ہے کہ او! کوئی بات نہیں' جو

قرآنِ کریم ہے اس سے تمہیں ثواب ہوتا ہے' ایک ایک حرف سے دس دس نیکیوں کا ثواب ہے مثلاً آپ نے ال م (الٓمّٓ) کہا تو جو تیس نیکیوں کا ثواب ہے' یہ ہو گیا اور آپ اس کو ساری عمر پڑھتے رہیے اور ثواب کماتے رہیے۔

آج دنیا میں یہی کتاب ہے جو اتنی پڑھی جاتی ہے' کوئی اور کتاب اتنی زیادہ نہیں پڑھی جاتی اور دنیا کی کوئی کتاب اتنی مظلوم نہیں' کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو انسان پڑھ رہا ہو اور سمجھ نہ رہا ہو کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ آپ کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھیے' ایسا نہیں ہے کہ اس کی زبان سے واقف نہیں' اگر اس کی زبان آپ کی قابلیت سے ذرا اونچی ہے' ایک آدھ صفحہ پڑھ کر آپ اسے رکھ دیں گے کہ صاحب! سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے اگر اسے سمجھنا ہے تو آپ کو پھر اپنا معیار اور قابلیت بلند کرنا پڑتا ہے' آپ کرتے ہیں۔ یہ کس لیے کرتے ہیں؟ آپ نوکریاں ڈھونڈنے کے لیے تو یہ کرتے ہیں مگر کسی کو یہ فکر نہیں کہ مسلمان بننے کے لیے بھی مجھے کچھ محنت کرنا پڑے گی لیکن اس کی ضرورت کیا ہے جب اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ ناظرہ پڑھ لیجیے' تب بھی آپ پاس ہو جائیں گے۔ ''مت ماری ہوئی اے اگلے دی جیہڑا اے کم کرے'' (اس کی عقل پہ پتھر پڑے ہیں جو یہ کام کرے)۔ یہ تجوید القرآن اور ناظرہ قرآن پڑھانے کے لیے مدرسوں کے مدرسے کھلتے چلے جاتے ہیں' پڑھاتے چلے جاتے ہیں' پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کو قرآن حمید کے معانی سمجھنے سے دور رکھو' قرآن حمید تو اس اجتماعِ صلوٰۃ میں' اس صورت میں' شرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ اس وقت اجتماعِ صلوٰۃ میں جاؤ جب حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (4:43) تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ ''ہم کیا کہہ رہے ہیں''۔

## حالت جنابت' مرض' حالتِ سفر' جائے ضرور یہ' عورت سے ہم آغوشی وغیرہ کے بعد صفائی کا مسئلہ

اس کے بعد اگلی بات وہ آئی ہے جو جسمانی صفائی سے متعلق ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا (4:43) (جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو۔ البتہ ایسی حالت میں اگر تمہیں اس اجتماع میں سے یونہی گزر جانا پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے)۔ یہاں حالتِ جنابت کا ذکر ہے جسے مباشرت کہتے ہیں۔ قرآن کریم کا انداز بھی یہی ہے کہ وہ ان چیزوں کو اشاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے' ایسے ہی بیان کرنا چاہیے' میں بھی اسی طرح سے ہی بیان کرتا ہوا آگے چلا جاؤں گا۔ حالتِ جنابت کے بعد کہا ہے کہ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا (4:43) تاوقتیکہ تم نہا نہ لو۔ درمیان میں ایک چیز ع الۡعَابِرِیۡ[1] سَبِیۡلٍ (4:43) آئی ہے کہ ہاں' مگر یہ ہے کہ اس اجتماع میں اگر تم نے شرکت نہیں کرنی' یونہی گزر جانا ہے تو کہا ہے کہ جب تم جنابت

---

[1] امام راغب نے کہا ہے کہ عَبَرَ سَبِیۡلٍ کے معنی ہیں ''اس نے راستہ قطع کیا' طے کیا''۔ اسی سے عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ (4:43) آیا ہے' جس کے معنی ہیں ''راستے کو پار کرنے والے'' (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961ء ص۔ 1127)

کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم اس حالت میں یونہی گزر جاؤ' اجتماع میں شریک نہ ہو۔ تو گویا اجتماعات ایسے تھے' جن میں بیٹھنا بھی تھا' شریک بھی ہونا تھا' اس میں آنا جانا بھی تھا' خود قرآن کریم نے یہ بات بتادی کہ اس حالت میں شریک نہ ہونا۔ ایک تو یہ چیز ہوگئی۔

آگے کہا ہے کہ **وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً** (4:43) (اگر تم مریض ہو اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے یا (1) حالتِ سفر میں ہو یا (2) جائے ضرور یہ سے فارغ ہو کر آئے ہو یا (3) عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور (1)' (2)' (3) کے لیے پانی نہیں ملتا تو ان حالات میں' وضو کرنے کے بجائے (5:6) تیمّم کر لیا کرو یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے ہی پونچھ لیے)۔ وہاں تو یہ تھا کہ غسل کرو۔ پانی ہوگا تو غسل کیا جائے گا۔ یا اب پہلی چیز یہ ہے کہ پانی ہے مگر مریض ایسا ہے جسے پانی کے استعمال سے کچھ نقصان کا اندیشہ ہے۔ دیکھیے! قرآن حمید کتنی جزئیات تک پہنچتا ہے! کہتا ہے کہ اگر یہ صورت ہے تو پھر غسل نہ کرو یا کسی جگہ پانی نہیں ہے اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم رفع حاجت کے بعد آئے ہو' یا وہی پہلی چیز ہے کہ عورت سے جنابت کی ہے اور پانی نہیں ہے تو اس صورت میں ایک تو یہ ہے کہ جہاں جہاں جسم کے اوپر غلاظت لگی ہوئی ہے' اس کے لیے کہا ہے کہ **فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا** (4:43)۔ یہ جو ہمارے ہاں لفظ ہے کہ تیمّم کرلو۔ تیمّم کے معنی ہوتا ہے ''ارادہ کرنا' کسی چیز کا قصد کرنا''۔ یہ کسی چیز کا قصد کرنا ہے کہ اگر تمہارا قصد اور نیت ان اجتماعات میں شرکت کا ہے تو اس کے لیے کہا ہے کہ **صَعِیۡدًا طَیِّبًا** (4:43) اس مٹی سے یہ جو غلاظت ہے' اس کو صاف کرو۔

اب یہ جو یوں ہاتھ دھونا تھا' جسے وضو کہتے ہیں' پانی تو ہے نہیں' کچھ گرد و غبار پڑا ہوا ہوگا کچھ پسینہ آیا ہوا ہوگا۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِکُمۡ وَ اَیۡدِیۡکُمۡ** (4:43) اپنے ہاتھوں کو' اپنے چہرے کو' پونچھ لیا کرو۔ یہ نہیں کہا کہ مٹی مل لیا کرو۔ ''مسح'' کے معنی ''پونچھ لینا'' ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے ذرا گرد و غبار کو جھاڑ لیا' کپڑوں کو پسینہ آیا ہوا ہے پونچھ لیا' پانی جو نہیں ہے' یہ کیفیت پیدا کر لیا کرو۔ اب یہاں تک یہ بات ہوئی کہ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو۔ اگر تم مریض ہو اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے یا حالتِ سفر میں ہو یا جائے ضرور یہ سے فارغ ہو کر آئے ہو یا عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور ان تمام حالتوں میں پانی نہیں ملتا تو ان حالات میں' وضو کرنے کے بجائے تیمّم کر لیا کرو یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے ہی پونچھ لیے۔

عزیزانِ من! یہ رعایت اس لیے دی ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا** (4:43) (یہ رعایت اس لیے دی گئی ہے کہ خدا کا قانون' مجبوری کی حالت پہ نگاہ رکھتا ہے۔ اس لیے ان مخصوص حالات میں' عام حکم کی پابندی سے درگزر کر دیتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اجتماعات میں شریک نہ ہونے سے تمہیں جو نقصان پہنچ سکتا تھا' اس سے تمہاری حفاظت ہو جائے)۔ ان قوانین کا دینے والا ایسا نہیں ہے کہ ذرا سی' چھوٹی چھوٹی سی بات پر' تمہارا پلہ پکڑ کر بیٹھ جائے۔ اس کی کشادہ نگہی ایسی ہے کہ ان چیزوں میں وہ آگے گزر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں' پانی نہیں' یا پانی کے استعمال سے کچھ ضرر پہنچتا ہے' تو وہ آگے گزر گیا' درگزر کر گیا' یہ ہے **غَفُوۡرًا**۔

اوران چیزوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جوایک کمی آنی تھی' اس کووہ پورا کردے گا اس لیے کہ تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ تم نے اس چیز کی نیت کرلی ہوئی تھی اور جو کچھ تمہارے لیے ممکن ہے وہ بھی تم نے کرلیا ہے۔ اگر چہ وہ چیز پورے طور پہ ہو نہیں پائی' اس کے باوجود اس سے یہ مقصد پورا ہو جائے گا لیکن یہ ان شرطوں کے ساتھ ہے کہ پانی نہ ملے۔

اجتماعِ صلوٰۃ درمیان میں لاکر بات وہیں آ گئی' جہاں سے چلی تھی۔ اس سورۃ کی 41ویں آیت میں ان لوگوں کی کیفیت کو سامنے لاؤ جو اس نظام کے مخالف تھے' ان کے ساتھ ایک ٹکراؤ تھا' اس ٹکراؤ کی صورت میں قرآن مجید پھر انہی کو سامنے لایا ہے اور یہ تھے جنہیں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔ یہودی اس میں سب سے زیادہ مخالفت کرتے تھے۔ کہا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ (4:44) ۔

## وحی کی بنا پر حضرت نوحؑ سے حضور نبی اکرم ﷺ تک ملنے والی راہنمائی کی نوعیت اور مخالفین کی کوششیں

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ (4:44) ان میں اُن لوگوں کی حالت خاص طور پر قابلِ غور ہے' جنہیں اس ضابطہ ہدایت کا' جس کی تکمیل اب قرآن کریم میں ہوئی ہے' ایک حصہ دیا گیا تھا۔ الکتاب مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ تو قرآنِ کریم کے اندر آیا ہے۔ اس سے پہلے مختلف انبیائے کرامؑ آئے' انہوں نے مختلف اقوام کو اپنے اپنے زمانے' اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایات دیں' اس کی بنیاد اور اصل تفہیم وہی تھی جو حضرتِ نوحؑ کے زمانے سے رسول اللہ ﷺ تک مسلسل چلی آئی' دین کی اصل وغایت تو وہی رہی۔ جہاں تک احکام کا تعلق تھا' وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تھوڑے تھوڑے ملتے رہے۔ یہاں کہا ہے کہ نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ (4:44) وہ ضابطۂ قانون' الکتاب کا کچھ حصہ' جو ان کو دیا گیا تھا' مکمل نہیں تھا۔ یہ ہے جسے قرآن کریم نے تکمیلِ دین کہا ہے یعنی اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ (5:3) یہ وہی دین ہے جو چلا آ رہا تھا' اسی کی تکمیل قرآنِ کریم نے آ کر کی۔ پہلے جن جن کو ملا' اس کا کچھ حصہ تھا کہ انہیں یہ عطا کیا گیا۔ ان نظامِ خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ (4:44) یہ ہدایت اور صحیح راہنمائی بیچتے ہیں اور اس کی قیمت میں گمراہی خریدتے ہیں۔ ان کی ساری کوششیں اسی گمراہی خریدنے میں صرف ہوتی ہیں۔ یہ باتیں بہت دفعہ آ چکی ہیں' اب ہمیں آگے چلنا چاہیے۔ یہ خود بھی ایسا کرتے ہیں اور وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ (4:44) چاہتے یہ ہیں کہ تم بھی صحیح راستے سے بھٹک کر ایسے ہی ہو جاؤ۔ سنو! یہ اپنے طور پہ خود کرتے ہو تو جاؤ کرو' ہم تمہیں دعوت دیں گے لیکن یاد رکھو کہ ہر غلط راستے پر چلنے والے کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ باقی لوگ بھی غلط راستے پر چلیں تا کہ انہیں مطعون کرنے والا کوئی نہ ہو۔

## بخل کے عمل کی بدنامی سے بچنے کے لیے اختیار کردہ ترکیب کا سہارا

وہ جو پہلی آیتوں میں آیا تھا کہ خود کی کیفیت یہ ہے کہ یَبۡخَلُوۡنَ (4:37) سب کچھ سمیٹ کر اپنے پاس رکھتے ہیں' سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور اب اس پہ خیال آتا ہے کہ معاشرے والے یہ بات کہیں گے کہ صاحب! یہ تو بڑی بات ہے جو یہ کر رہا ہے' اس کے بعد یہ ہے کہ قانون اس قسم کا بنا دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ سمیٹ لینا جائز ہے' اس میں کوئی حرج نہیں۔ قانون یہ بنا دیتے ہیں کہ اسلام نے زمین' دولت' موٹریں' محلات' ان چیزوں کی ذاتی ملکیت پر کوئی حد قائم نہیں کی' یہ شرعاً جائز ہیں۔ یہ کچھ قرآن مجید کہتا ہے۔ یہ پھر قانون ایسا بنا دیتے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ صاحب! یہ کیا ہے جو لوٹ کھسوٹ کر سب کچھ لیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ کہا کہ غلط راستے پر چلنے والا خود ہی غلط راستے پر نہیں چلتا' نکو بننے سے بچنے کے لیے چاہتا یہ ہے کہ سارے ہی ایسے ہو جائیں' یہی ان کی خواہش ہے کہ تم بھی ان کی طرح صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر چل دو۔

کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ (4:45) یہ تمہارے بڑے سخت دشمن ہیں۔ خدا انہیں جانتا ہے کہ یہ تمہارے کتنے بڑے دشمن ہیں! تم ان سے مت ڈرو۔ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا ۫ وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا (4:45) کسی کی بات مت سنو' وہ تمہاری دوست داری کے لیے' تمہاری مدد کے لیے کافی ہے لہٰذا اس خیال سے کہ ان سے ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا' مت ڈرو۔ اس نقصان کا سوال ہی نہیں ہے۔ حق کا راستہ تو ایک ہی ہوتا ہے' باقی جو تائید کرتا ہے' وہ تمہارا ساتھی ہے' جو اس کی مخالفت کرتا ہے ''ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا' جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں''❶۔

## محمد علی جوہر کے کردار کی ایک جھلک اور دشمنوں کی پست ذہنیت اور تنگ نظری کچھ ایسی کہ بات صاف اور واضح ہی نہ ہو

اس لگاؤ کی حد تو وہ ہے جسے مولانا محمد علی جوہرؒ مرحوم (1931-1878ء) نے' جو ایک بڑے بیباک اور بڑے جرأت مند انسان تھے اور واقعی ان کی اپنی زندگی بھی یہی تھی' کہا ہے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندا دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

---

❶ یہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے' جو ''بانگِ درا'' میں ہے کہ
یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

یہ تو دو عالم سے خفا ہونا پڑے گا لیکن اس کے لیے بڑی انقلابی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (4:45)۔ کتنی عظیم آیتیں ہیں! اللہ تمہارے ان دشمنوں سے واقف ہے۔ ان سے ڈرنے کی بات کیا ہے! تمہارے لیے قانونِ خداوندی کی سرپرستی اور نصرت کافی ہے۔ آگے کہا ہے کہ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (4:46) ان کی تو پست ذہنیت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ان کو اگر کوئی چیز دی جاتی ہے' ان کے پاس لکھی ہوئی کتاب ہے' یہ کوئی ایسے الفاظ اس طرح باہر لا کر بیان کریں گے کہ وہ الفاظ ان موقعہ محل سے جدا کر کے' الگ کر کے' کہیں اور لے جائیں' مطلب ہی کچھ اور ہو جائے۔ ایک دشمن بلند ذہنیت کا ہوتا ہے جو ایسا نہیں کرتا بلکہ وہ دھڑلے سے دشمنی کرتا ہے' جھوٹ نہیں بولتا' اس کی مصلحتوں کے تقاضے اسے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ''زندگی کی ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے''۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ جو پست سطح پر آ جاتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ یوں مخالفت نہیں کرتے بلکہ تمہاری باتیں الٹ پلٹ کر باہر بیان کریں گے۔ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ (4:46) باتیں کریں گے تو اس طرح سے زبان کو توڑ مروڑ کر کہ الفاظ کچھ ہیں اور نکلیں کچھ' یعنی کتنی پست ذہنیت ہے' کتنے تنگ نظر ہیں' یہ اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں! بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (4:46) ہم نے سنا' ہم اطاعت کریں گے' وہ اَطَعْنَا کا جو لفظ ہے' اس کو ذرا بگاڑ کر چپکے سے عَصَيْنَا کہہ دیں گے کہ ہم نے سنا اور ہم مانیں گے نہیں۔ وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (4:46) تُو ہماری بات سن' اگرچہ تیری بات نہیں سنی جائے گی یا طنزاً کہیں گے کہ تُو بہرہ ہو جائے۔ وراعنا (4:46) بات تمہاری اس وقت مانیں گے جب کچھ ہماری رعایت کرو گے۔ حق کے ساتھ سودے بازی ہو رہی ہے' اس صورت میں ہم تمہاری بات سنیں گے' زبان سے موڑ توڑ کر باتیں کریں گے۔ قرآن حکیم نے اسی لیے دوسری جگہ جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) بات کرو تو ایسی صاف واضح پختہ نکھری ہوئی جیسے تمہارے سامنے ہموار دیوار کھڑی ہو' ذرا سی بھی کہیں کجی نظر نہ آئے' ایسی بات کرو۔

## دورِ حاضر کی سیاست کی مفلوج کیفیت مبہم اصطلاحات کے استعمال کی بنا پر ہے

دورِ حاضرہ کی سیاست کا راز ہی اس میں ہے کہ کبھی صاف بات نہ کرو' جو آج بیان دو' کل ہی یہ کہہ دو کہ یہ میرا مطلب تھا ہی نہیں۔ یہ ہم پہ عجیب قسم کے دَور آئے ہوئے ہیں کہ اصطلاحات مبہم ہیں۔ کہا کہ کبھی ان کا مقصد واضح کر کے نہ بتاؤ' یہ کبھی نہ بتائیں کہ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے' یہ اقامتِ دین' شریعتِ حقہ' اسلامی نظام' اسلامی قوانین کی اصطلاحات عام ہیں۔ مقصد واضح نہیں ہے۔ اُدھر سے اگر ہمارے ہاں معاشیات آئی ہے' تو اس میں بھی ابہام ہی ابہام ہے' مثلاً سوشل ازم' اسلامی سوشل ازم' محمدی مساوات'

قرآنی نظام۔ او! کوئی کسی کو بتائے تو سہی کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ قرآن حمید قُولُوا قَولًا سَدِیدًا (33:70) کہتا ہے: صاف واضح نکھری ہوئی بات' دوٹوک' کبھی ذومعنی بات نہیں' یہ کچھ کہو۔ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ (4:46) او! سیدھی طرح سے تم کہو کہ ہم نے سنا' ہم اطاعت کریں گے' ہماری بات سنیے اور ہماری طرف نگاہ التفات رکھیے' تم شریفوں کی طرح' بھلے مانسوں کی طرح' صاف صاف' سیدھی سیدھی بات کرو' تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا۔ یہ تمہارے لیے تمہاری روح کی افزودگی کا باعث بنتا۔ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (4:46) لیکن ان کے ہاں انکار و سرکشی ہے۔ قرآن مجید اس کو کفر قرار دیتا ہے۔

## دل کی گھٹن' افسردگی و پژمردگی' انسان کی غلط بیانی کا ہی فطرتی نتیجہ ہوتی ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اس میں دل کی گھٹن ہوتی ہے۔ اس میں دنایت اور کمینگی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ کفر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جو صاف صاف بات کرنے کی جتنی خوشگواریاں آنی تھیں' تم ان سے محروم ہو جاؤ گے۔ لعنت کے معنی ہوتا ہے ''اچھی چیزوں سے محروم ہونا''۔ کہا ہے کہ فَلَا يُؤْمِنُونَ اِلَّا قَلِيلًا (4:46) جن کی ذہنیت ایسی ہو' یہ ایمان کیا لائیں گے۔ اور واقعی اہلِ کتاب کو آپ دیکھیے' بہت کم تھے' یونہی انگلیوں پہ گنے جانے والے تھے' جو ایمان لائے تھے۔ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ دین کو چھوڑ کر جو بھی مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے' وہ پھر دین کی طرف نہیں آتا۔

## مذہب کی چند ایک رسومات دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں

دین کی طرف تو وہ آ سکتا ہے جو پہلے سے کسی مذہب کا قائل نہ ہو۔ دہریہ اگر اسلام قبول کرے گا تو وہ تو دین پر آ جائے گا' مذہب پرست جنہیں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے' وہ دین کی طرف کبھی نہیں آئیں گے۔ اس لیے کہ دین کی طرف آنے کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256) ہر غیر خداوندی نہج' تصور' عقیدہ' عمل' رسم سے پہلے انکار کرو' لا اله لا اله لا اله کرو' جب یہ سلیٹ دھل جائے تو اس کے بعد پھر آ گے ایمان باللہ آتا ہے۔ یہ لکھی ہوئی سلیٹ پر نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ بڑا غیور ہے' یہ گھر کے باہر کھڑا رہتا ہے کہ یہ جو اندر بیٹھا ہوا ہے پہلے اس کو نکالو' پھر داخل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ فَلَا يُؤْمِنُونَ اِلَّا قَلِيلًا (4:46) یہ لوگ جو اسی چیز کو' مذہب کو اور رسومات کو صحیح دین اور حق سمجھے ہوئے ہیں یہ اس انقلابی پروگرام پر کیسے آئیں گے۔ یہ نہیں آئیں گے اور اہلِ کتاب نے کبھی بھی اسلام قبول نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے جو آج آپ کو اتنی دشواری پیش آ رہی ہے۔ آواز اتنی بلند ہو رہی ہے جتنی شاید اس سے پیشتر کبھی کسی دور میں نہیں ہوئی: ''اسلام اسلام' اسلام

کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لو' اسلام کے مطابق زندگی بنالو' اسلامی نظام قائم کرو''۔ ہر شخص یہ کہتا چلا آ رہا ہے اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ جہاں کھڑے تھے' وہیں کے وہیں ہیں' کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو رہی۔ یہ کیا ہے؟ یہ کہ آج بھی ہم اس سطح پہ ہیں جہاں اہلِ کتاب تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ ٹھیک ہے' دین ان کے سامنے آنے ہی نہ پائے۔

## ''اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ'' کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا** (4:47) اے اہلِ کتاب! اس کے اوپر ایمان لاؤ۔ پہلے بھی میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو قرآن کی اصطلاح ہے کہ **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** (4:47) اس کے غلط مفہوم نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ ہم نے اس کا مفہوم یہ لیا اور لوگوں کو بھی یہ بتایا کہ ''جو تصدیق کرتا ہے ان چیزوں کی جو تمہارے پاس ہیں'' تو وہ اہلِ کتاب یہود و نصارٰی یہ کہتے ہیں کہ تمہارا قرآن مجید تصدیق کرتا ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے تو پھر ہم اس پہ ایمان کیوں لائیں۔ وہ جس کی تصدیق کرتا ہے اس پہ تو ہم ایمان لائے ہوئے ہیں۔ یہ بڑا معقول اعتراض ہے۔ اور پھر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآنِ کریم شروع سے آخر تک ان کو بتاتا چلا جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ تم نے اپنی کتابوں کی تحریف کر دی۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس وہ نہیں ہے جو کتابیں ہم نے تمہارے نبی کو دی تھیں۔ اور اس کے باوجود ہم ان سے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے تو کیا یہ انجیل کی تصدیق کرتا ہے (معاذ اللہ)۔ 'یہ تصدیق کرتا ہے' جو اردو زبان میں اس کے معنی ہیں' وہ ہم نے لے لیے۔ تصدیق کے معنی Verify کرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ذرا اس سے تصدیق کرا لائیے' جی! مصدق کے یہ معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ ''وہ جو دعاوی تم کر رہے ہو لیکن وہ پورے نہیں ہو رہے' ان کو یہ سچ کر کے دکھانے والا ہے''۔ صدق کے معنی ہوتا ہے ''کسی کے دعوے کو سچ کر کے دکھا دینا''۔ کہا ہے کہ تم دعوے تو کرتے ہو لیکن تمہارا کوئی دعوٰی سچ ہو کر سامنے نہیں آتا۔ ان کے بھی دعاوی یہ تھے کہ تیری مرضی پوری ہو جو تیری حکومت آسمانوں پہ ہے' وہ زمین کے اوپر ہو۔ یہ ان لوگوں کے دعاوی تھے' یہ پورے نہیں ہو رہے تھے' یہ ان دعاوی کے لیے کسی آنے والے کا انتظار کرتے تھے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ تم جو دعوے کرتے ہو اور وہ تم سے پورے نہیں ہو رہے ہو سنو! وہ اس لیے پورے نہیں ہوتے کہ تمہارے پاس وہ دین اپنی اصلی شکل میں نہیں رہا۔ اب یہ آیا ہے' یہ قرآن کریم اور قرآن کریم کا لانے والا ہے جو تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھائے گا کیونکہ وہ مذہب نہیں' دین ہے۔ اب یہ وہی چیز آ گئی جو میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ہم ہمیشہ قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں لیکن یہ یہاں کا نظام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا۔ اس لیے کہا ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آؤ **مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ**

**وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدۡبَارِهَاۤ** (4:47) قبل اس کے کہ تمہارے ہاں کے جو بڑے بڑے سردار واقع ہوئے ہیں' ان کا چہرہ مسخ ہوجائے' وہ پیٹھ دکھا کر میدان سے بھاگ جائیں۔

## وحیٔ خالص کی روشنی میں قائم کردہ نظام کا نتیجہ

آپ دیکھیے کہ ان یہودیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ جب یہ مسلمان ہجرت کرکے' مظلوم' بے کس' ناتواں سی ایک قوم کی حیثیت سے مدینے میں آئے ہیں' یہاں کے یہودی فی الواقعہ اس وقت ''اصحاب سبت'' تھے' اس وقت ان سے یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور وہ مذاق کرتے تھے کہ 'ذرۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر' ان کے دعوے دیکھیے روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ جب یہی یہودی چند ہی سال کے عرصے کے اندر مدینے سے نکلے تو انہیں کہیں پناہ نہیں ملی۔ وہاں سے بھی جس ذلت وخواری کے ساتھ نکلے ہیں' تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرتی۔ انہیں پورے ملک سے ملک بدر کر دیا گیا۔ سچائیاں جب آتی ہیں تو وہ تو پوچھو نہیں کہ اپنے اندر کتنی قوتیں رکھتی ہیں!

## اصحابِ سبت کی تباہی کی وجہ قانون شکنی تھی

عزیزانِ من! کہا ہے کہ **اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ** (4:47) یا یہ ان خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں جیسے کہ اس سے پیشتر تم خود جانتے ہو کہ تمہارے ''اصحاب سبت'' کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اصحابِ سبت کی یہ کیا چیز تھی۔ یونہی مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ جب قوم میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے تو یہ جو قانون کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوتی ہیں' تو ہر انسان ان کو توڑنے کے راستے بھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو ہفتے میں گوشت کا دو دن کا ناغہ ہوتا ہے' یہ ایک معاشرتی قانون ہے' معاشرے کے فائدے کی چیز ہے لیکن قوم میں قانون شکنی کا رجحان اتنا ہو گیا ہے کہ یہ دو دن کا ناغہ توڑنے کی خاطر' فریج والے گھرانے' سوموار کو ہی اتنا لے جاتے ہیں کہ جمعرات تک چلتا ہے حالانکہ آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے قصاب کی دکان پہ اپنے چچازاد بھائی کو دیکھا کہ اپنی ضرورت سے زیادہ گوشت لے رہا تھا۔ آپؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا' کہنے لگے کہ تمہارے ہمسائے کو بھی گوشت کی ضرورت ہے' یہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس پیسے زیادہ ہیں تو ساری دکان خرید کر لے جاؤ حالانکہ وہ چوری تو نہیں کر رہا تھا۔ خریداری میں بھی انہوںؓ نے کہا کہ یاد رکھو کہ چیزیں ہر ایک کے حصے میں آئیں۔ دیکھتے ہیں ان لوگوں کی کہاں تک نگاہیں جاتی تھیں!

عزیزانِ من! ہفتے میں گوشت کے ناغے کے دوران اول تو وہ آج ہی اتنا خرید لیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ تو عام ہے کہ باہر کا دروازہ بند ہے' پچھلا دروازہ کھلا ہے' اور پھر وہی ہوتا ہے جیسے رمضان کا احترام ہوا کرتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ قانون شکنی کی عادت ہے۔ جب یہ عادت قوم میں پڑ جائے تو قانون کی اطاعت ان پر بڑی گراں گزرتی ہے خواہ وہ دائیں یا بائیں ہاتھ جانے کی بات ہی کیوں

نہ ہو۔ میں کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ یہ Keep to the left (بائیں ہاتھ چلو) چھوٹی سی چیز ہے' اس میں تمہارا ہی بھلا ہے' اس کی خلاف ورزی سے ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ چوراہے پہ جا کر دائیں طرف جانے کے لیے گول چکر پر کوئی ایک پاؤں سائیکل کا قوم کو گوارہ نہیں اور دور سے دیکھا کہ وہ ٹریفک والا نہیں ہے تو وہاں پہنچ کر سیٹی بجاتا ہوا دائیں طرف چلا جاتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ پھر قوم کو قانون شکنی میں لذت ملتی ہے۔عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو اس قوم کو دو سال سے میں مسلسل کہہ رہا تھا' جب یہ قانون شکنیوں کا جشن منا رہے تھے' میں ان سے کہہ رہا تھا کہ قوم کو یہ عادت نہ ڈالو' جب قانون شکنی کی عادت پڑتی ہے تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کس کا قانون اور ضابطہ ہے' آج ان کے خلاف تم یہ کچھ کر رہے ہو' کل تمہارے خلاف یہی کچھ ہوگا' قوم کو قانون کا احترام سکھاؤ۔ یہ سبت کی بات اتنی سی تھی۔ کہا یہ تھا کہ ایک دن ناغہ کرنا ہے' تم نے مچھلیاں نہیں پکڑنی' یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' اسی روش پہ وہ بھی گامزن تھے۔قرآن کریم نے کہا کہ اس قوم کی یہ ذہنیت ہو چکی ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ ہم اہلِ کتاب کی سطح پہ آ چکے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیسے تسلسل سے ان کے پیچھے ہم چل رہے ہیں! کیا اصحابِ سبت ہم نہیں ہیں؟ تو کیا وہ جو اس نے قرآن کریم میں کہا تھا کہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاؤ گے' ہر شخص ہم میں سے رو نہیں رہا؟ خدا کا عذاب یوں آتا ہے۔قرآن حمید کہتا ہے کہ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (4:47) ۔اللہ اکبر! یاد رکھو! یہ تنبیہ یونہی دھمکی نہیں ہے' یہ یونہی کسی بڑ مارنے والے کی بڑ نہیں ہے' یہ اس قادرِ مطلق کا قانون ہے جو ہمیشہ ہو کر رہتا ہے اور کسی خاص دور میں ہی ہو کر نہیں رہتا بلکہ جب بھی کہیں سبت کی ذہنیت پیدا ہوگی' وہی لعنت اس قوم پر مسلط ہو جائے گی وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (4:47) یاد رکھو! یہ تنبیہ یونہی دھمکی نہیں۔ یہ قانونِ خداوندی کا اعلان ہے اور خدا کے قانون کے نتائج سامنے آ کر رہا کرتے ہیں۔ اس کی کوئی اسکیم ناکام نہیں ہو سکتی۔

یہ چیزیں کیوں ہوتی ہیں؟ اگلی ہی آیت میں یہ بات بتا دی کہ توحید یہ ہے کہ ایک خدا کے قوانین ہیں اور ان کے سامنے دل کے جھکاؤ سے' اطاعت کرتے چلے جانا ہے' جھک جانا ہے' کسی اور کو اس کے اندر شریک نہیں کرنا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔

## توحید کے مفہوم کی محسوس مثال

عزیزانِ من! توحید کے معنی سمجھانے کے لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کوئی فارمولا آپ کے پاس ہو' سائنس کا فارمولا' میڈیسن کا فارمولا' ڈاکٹر کا نسخہ' کوئی آپ کے پاس ہو' آپ اس میں سے کوئی جزو نکال کر' اس میں دوسرا شریک کر دیجیے' یہ شرک ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا' بلکہ اس کے خلاف کئی خطرناک چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے شرک کہتے

ہیں۔ پھر اگلا شرک لیجیے' انسان اپنے عہدِ طفولیت میں جب پہلے دور میں تھا تو اس وقت علم' عقل' سائنس کے انکشافات' اس کے سامنے نہیں تھے' فطرت کی قوتیں مہیب انداز میں چاروں طرف سے اس کے خلاف آتی تھیں' یہ نہتا کمزور تھا' ڈرتا تھا' سہما ہوا ہوتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ دریا امڈ کر آیا تھا تو یہ ہاتھ جوڑ لیتا تھا' اس بیچارے' کمزور کو' کچھ اور آتا ہی نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ لے' گڑگڑانے لگ جائے' آنسو بہانے لگ جائے' منتیں کرنے لگ جائے' سماجتیں کرنے لگ جائے۔ کمزور کرتا ہی یہی ہے۔ یہ جو اللہ ہے اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ یہ وجہ ذلتِ انسان ہے۔ صرف اسی ایک اللہ کی محکومیت اختیار کرنے کا نام توحید ہے۔

## معاشرتی اور تمدنی طور پر غلامی کی محسوس عملی شکل

آج بھی جو ذی احتیاج ہوتا ہے' اس کو دیکھو' اس کے سامنے کھڑے ہوئے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ میری احتیاج پوری ہوگی' وہ وہاں کیا کچھ نہیں کرتا۔ یہاں اس غلط نظام میں تو ذی احتیاج کی حق تلفی کی حد کر دی گئی ہے۔ مزدور دن بھر مزدوری کرنے کے بعد' جو As of right (بطورحق) اپنی مزدوری لے سکتا ہے' وہ بھی جب جاتا ہے تو قطار میں یوں کھڑا ہوتا ہے' جیسے خیرات مانگ رہا ہے' وہ اس کو دھتکارتا ہے' یہ اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔

اپنے پہلے دور میں انسان کی یہ حالت تھی کہ فطرت کی ہر قوت کے سامنے کانپتا تھا' گڑگڑاتا تھا' اس کے سامنے سجدہ کرتا تھا' نذر نیاز دیتا تھا۔ یہ شرفِ انسانیت کی کتنی ذلت تھی! اس سے ذرا اور آگے بڑھا' پروہت آئے' ذرا زیادہ سمجھدار سیانے آئے' انہوں نے اپنی عقل کے زور پر یہ جو باقی تھے' ان سے اپنی باتیں منوائیں۔ اُن کے سامنے اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ راز اُنہوں نے یہ رکھا کہ ہم یہ کچھ نہیں کرتے' یہ بت کرتے ہیں جو تمہارے سامنے ہیں' ہم ان سے کروا دیتے ہیں' ہم بیچ میں نہ ہوں تو براہِ راست تم ان سے کچھ نہیں کرا سکتے۔ پھر انہوں نے ان کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔

## تمدنی سطح پر فرعونیت کے دور میں شرفِ انسانیت بک جاتا ہے

پھر اس کے بعد استبداد والی حکومت آئی' فرعون آیا' اس نے کہا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) تمہاری پرورش میں ہی کرتا ہوں۔ کھانے پینے کو میں دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا ''اَن داتا'' ہوں۔ اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ ہوا یہ کہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد ایک ایک سے روٹی کی خاطر سجدے کرائے' پھر انسانیت بک گئی' پھر اس کا شرف جاتا رہا۔

## دین کا نظام ملائکہ کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے

اور پھر جب یہ انقلاب آفریں الدین آیا جس نے آ کر کہا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) فطرت کی قوتوں کو ہم نے تمہارے لیے تابع فرمان بنا رکھا ہے۔ یہ جو آدم کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا' وہ یہی چیز تھی۔ آج تم ان کے سامنے جھکتے ہو حالانکہ انہیں تمہارے سامنے جھکنے کے لیے بنایا گیا ہے' اٹھو! سائنس کا علم حاصل کرو' ایک ایک قوت تمہارے سامنے جھکے گی۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنایا۔ اب آگے آئی یہ پروہتوں کی جماعت اور سنیے! کہ ان احبار و رہبان سے کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسرا شامل نہیں ہوا کرتا' اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ تمہاری بات ان کے ذریعے خدا تک پہنچے۔

## حق حکومت سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو حاصل نہیں

سوال تو اس کے قانون کا ہے لہٰذا یہ قانون موجود ہے' اس کی اطاعت کرو' نتیجے نکلیں گے' یہ درمیان میں آنے والے کون ہیں انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ جو حاکم بنے بیٹھے ہیں کیا انہوں نے اپنا حقِ حکومت سمجھ رکھا ہے۔ سنو! مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' خواہ اس کے پاس قانون سازی کی قوت ہو' خواہ اس کے پاس حکومت کی قوت ہو' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بنو۔ یہ کسی کو حق حاصل نہیں۔ اللہ اکبر! انسان کو کس قدر بلند مقام پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ایک خدا کے سامنے جھکنے سے انسان ساری دنیا کی چوکھٹوں سے سرفرازانہ گزر گیا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شرک وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے' خدا کا اس میں کچھ نہیں بگڑتا ' تم سینکڑوں معبود بنالو' بگڑتا تو وہ ہے جس کی حکومت تمہارے ووٹوں کے سہارے پہ چلتی ہے۔ وہ تو اس وقت بھی حاکمِ مطلق تھا جب کوئی انسان نہیں تھا' اس وقت بھی رہے گا جب کوئی نہیں ہوگا اور تم سارے کے سارے اگر اس سے انکار کر دو گے تو اس کا کیا بگڑے گا' تمام دنیا آنکھیں بند کر لے تو سورج کی روشنی میں کچھ فرق نہیں آ جائے گا' تم ہی اندھے ہو جاؤ گے۔

## دین کا نظامِ حیات سراپا شرفِ انسانیت ہے جبکہ شرک تذلیلِ انسانیت

یہ سوال نہیں ہے کہ شرک میں خدا کے سوا دوسرے کو اگر معبود مان لیا جائے ''تے اللہ نوں غصہ آ جاندا اے'' (تو پھر اللہ کو غصہ آ جاتا ہے)۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں۔ دین کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شرفِ انسانیت کو بلند کرتا ہے' شرک شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے' فطرت کی کسی قوت کے سامنے جھکنا شرک ہے' وہ قوت جو تمہارے لیے مسخر کر دی گئی' اس کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیت کی ذلت ہے۔ انسان جو سارے برابر ہیں' ان کے لیے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب

التکریم بنایا ہے۔ اپنے جیسے کے سامنے جھکنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے' یہ وجہ ذلتِ انسان ہے۔

جھکنے کے معنی اطاعت اختیار کرنا ہے' محکومیت اختیار کرنا ہے۔ عزیزانِ من! اس اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ جو کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ (4:48)۔ ہمارا مروجہ ترجمہ یہ ہے کہ شرک معاف نہیں ہوسکتا' اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوگا' وہ معاف ہوسکتا ہے' یہ نہیں ہوسکتا۔ ''مغفرت'' کے معنی اب آپ احباب کو معلوم ہیں۔ مفہوم اس کا یوں ہوا کہ شرک سے انسانیت کے شرف کو جو نقصان پہنچتا ہے' اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اور نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے اور نقصانات جزوی ہونگے' یہ نقصان بنیادی اور اصولی ہے۔ اس سے انسان اپنے مقام پہ نہیں رہتا:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا' نہ من

یہ ہے شرک کا نقصان۔ ہاں البتہ اس شرک کے نقصان سے انسان قانونِ خداوندی کے مطابق محفوظ رہ سکتا ہے۔

## مذہب تو اپنے اندر شرک کی کئی شکلیں لیے ہوئے ہے

میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے اور اسے پھر دہرادوں کہ جب دین مذہب میں بدلا' تو انہوں نے شرک کی ایک ہی شکل باقی رکھ دی اور وہ ہے 'بتوں کے سامنے نہیں جھکنا' بس ٹھیک ہے اور اس کے بعد مسلمان مطمئن ہوگئے کہ ہم تو شرک نہیں کرتے۔ اب انسان یہ کہتا ہے کہ جی! میں بت پرستی تو نہیں کر رہا اور بُت بھی وہ ہے جس کی ذرا کچھ شکل بنادی جائے۔ اگر اس بت کی شکل یوں نہ بنائی جائے' اس کو قبر کی صورت بنادیا جائے تو یہ بھی بت نہیں ہے یہاں روز سجدہ ہوگا' شرک نہیں ہے صاحب! شرک تو مہاجنوں کے مندر میں آتا ہے۔ ارے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کی تو پھر بھی وضع قطع تو تھی' تم نے جو کیا اس کے لیے سنو تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ (95:5) جب یہ کم بخت گرتا ہے تو پھر گرتے ہوئے پتہ نہیں چلتا کہ یہ انتہاؤں تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں سے یہ گرا ہے' چبوتروں کو سجدے کر رہا ہے' یہاں ایک پاؤں کا نقش لگا ہوا ہے' اس کو سجدے کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں حضرت صاحب بیٹھتے تھے' اس کو سجدے کر رہا ہے۔ یہ پست ترین سطح پہ پہنچ گیا ہے۔ ایسا کیوں عام ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ شرک کی ایک ہی شکل بتادی اور وہ ہے بت کو سجدہ کرنا۔ اب یہ ہے کہ بت کو سجدہ نہیں کرنا۔ اور اقبالؒ (1938-1877ء) نے کیا کہا ہے؟ یہ ایسا عمدہ طنز ہے! میں پھر وہی بات کردوں کہ میری بچیاں کہیں گی کہ ترجمہ کردو۔

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر

ایک برہمن نے محمود غزنوی سے کہا کہ ذرا ہماری کرامت دیکھیے

تُو کہ شکستہء ' بندہ شدی ایاز را

پتھر کے بتوں کو تو تُو نے چھوڑ دیا لیکن ایاز کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس کے ''عشق'' میں کھو کر اس کے بُت کا پرستار بن گیا۔ ذرا ہماری کرامت دیکھو کہ تمہیں ہم نے کس شرک کے اندر الجھا دیا۔ کیا بات ہے کہ مسلمان کی یہ کیسی تعریف کر دی!

تُو کہ شکستہء ' بندہ شدی ایاز را

(اقبالؒ: پیامِ مشرق)

تُو نے بُت کو توڑا' تُو ایاز کا غلام بن گیا اور اپنے نفس کو مطمئن کر لیا کہ یہ شرک نہیں ہے۔ جب خواجہ حسن نظامی مرحوم (1955-1876ء) نے ''مرشد کو سجدۂ تعظیم'' کتاب شائع کی تھی تو اس پر بڑے بڑے فتوے لگائے گئے اور کہا گیا تھا کہ مرشد کو سجدہ بالکل جائز ہے صاحب! یہ نہایت ضروری ہے۔

## حدیث نبوی ﷺ میں شرک کی جامع تعریف

میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن حکیم نے شرک کی کیا کیا شکلیں بیان کی تھیں۔ سب سے پہلا شرک' تو میں نے کہا تھا کہ یہ ہے آپ کے ہاں کے جو پروہت تھے' انہوں نے شروع کیا تھا۔ کیفیت یہ ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31) یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو' خدا سے ورے ہی' اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! دیکھتے چلے جایئے' ایک ایک شق اسے ثابت کرتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی تشریح میں ایک حدیث بھی آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے کہ غالباً یہودیوں میں سے انہوں نے آ کر کہا کہ یہ آپ ﷺ نے کیسے کہہ دیا کہ ہم انہیں معبود بناتے ہیں' خدا سے ورے ہی انہیں خدا تسلیم کر لیتے ہیں' ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ کیا یہ صورت نہیں ہے کہ تمہارے احبار و رہبان جس چیز کو حلال کہہ دیتے ہیں' اسے حلال مان لیتے ہو' جسے وہ حرام کہہ لیں' اسے تم حرام مان لیتے ہو؟ اُنہوں نے کہا تھا کہ جی ہاں! فتویٰ تو انہی سے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو ان کو خدا بنانا ہے' یہی تو خدا بنانا ہے۔

## دین میں کسی انسان کو سند تسلیم کر لینا ہی تو شرک ہے

برادرانِ عزیز! دین میں کسی انسان کو سند تسلیم کر لینا' شرک ہے اور اسی لیے اب اگلی بات شرک کی آتی ہے۔ یہ جتنے فرقے آپ کے ہاں بنتے ہیں' وہ فرقے وہ ہیں جو خدا سے ورے' کسی نہ کسی انسان کو' اپنی سند بناتے ہیں' فرقہ کسی انسان پہ جا کر رک جاتا ہے' جو

کچھ ان کا ارشاد' ان کا فیصلہ ہوتا ہے' اُسے وہ دین میں یا شریعت میں سند سمجھتے ہیں۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہاں احبار و رہبان کے متعلق کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:31-32) دیکھنا مسلمانو! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر مشرک نہ ہو جانا' اُنہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! کیا ہم کوئی بت پرستی کریں گے؟ کہا کہ شرک یہی 'بت پرستی' نہیں ہے۔ دیکھنا! کہیں تم فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ اس کے بعد ہر فرقے کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہم حق پہ ہیں' دوسرے سب باطل ہیں۔ کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) دیکھنا! کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا! اس سے زیادہ واضح اور کھلی ہوئی آیات کیا ہونگی!

## مسلمانوں میں مختلف فرقہ وارانہ شاخوں کی تفصیل

اب آپ کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ فرقے کی نسبت کے بغیر آپ اپنے آپ کو مسلمان بتا ہی نہیں سکتے۔ جس سے ملیے' تعارف کرائیے' یہ پوچھیے کہ صاحب! آپ کون ہیں؟ جی مسلمان ہوں۔ صاحب! یہ تو مجھے بھی پتہ ہے' اس سے کیا کام چلتا ہے' بتاؤ کہ تم کون سے مسلمان ہو؟ اس کے بعد شیعہ سنّی تک ہی بات ختم نہیں ہو جاتی' وہ تو درخت کے پہلے دو ٹہنے تھے' سنّی ہو؟ پھر آگے یہ ہوا کہ اہلِ حدیث ہیں یا اہلِ فقہ ہیں صاحب؟ وہ اہلِ فقہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی شریعت کیا ہے؟ اس کے بعد یہ ہوا کہ آپ کیا ہیں: مالکی' حنبلی' شافعی' حنفی؟ کہا کہ حنفی مسلمان ہیں جی۔ کہا کہ او جی! حنفی تو ہوا مگر یہ تو بتاؤ کہ آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی ہیں؟ بریلوی ہوئے صاحب! پھر پوچھا کہ بتائیے کہ آپ نقشبندی ہیں' چشتی ہیں' قادری ہیں' نظامی ہیں؟ عزیزانِ من! مسلمان کہلانے سے کسی کا اطمینان ہی نہیں ہوتا۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ **سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ** (22:78) خدا نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا ''کیندے نیں اوس طراں ای جیویں بچپن اچ مینوں کا کا کیندے ہوندے سن' ناں تے میرا کچھ ہور سی۔ او تے میں چھوٹا ہوندا سی جدوں مینوں کا کا کیندے سن' ہن تے میں وڈا ہو گیا واں' ہن مینوں شرم آندی اے' ہن مینوں تسی سنّی کہو' تے حنفی کہو' فقہی دیوبندی کہو' بریلوی کہو' نقشبندی کہو' گل ہوئی نا کوئی'' (اسی طرح کہتے ہیں جس طرح عالمِ بچپن میں مجھے ''کا کا'' کہتے تھے۔ نام تو میرا کچھ اور تھا۔ وہ تو میں چھوٹا سا تھا جب مجھے ''کا کا'' کہتے تھے۔ اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے شرم آتی ہے۔ اب مجھے آپ سنّی کہیں' فقہی دیوبندی کہیں' بریلوی کہیں' نقشبندی کہیں۔ اب یہ بات ہوئی نا!)۔ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ سنو! **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا** (22:78) اور نئی بات نہیں ہے' پہلے بھی جو ہمارے اسلاف تھے' ہم مسلمان ہی کہا کرتے تھے' تمہارا نام بھی ہم نے مسلمان ہی رکھا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) دیکھنا! کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

برادرانِ عزیز! یہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ پھر اور آگے چلیے شرک کی وہ کیفیت بھی ہے جو غیر مرئی ہے۔ یہ تو شرک کی مرئی صورتیں ہیں، یہ شرک کی محسوس شکل ہے جو تمہارے سامنے رکھے ہوئے بت ہیں۔ انہیں تو انسان دیکھ لیتا ہے کہ وہ بت ہیں۔ ایک شرک کی غیر مرئی شکل بھی ہے جس کے متعلق اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا تھا کہ

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

یہ شرک ہے اندر کے بت کو اپنا الٰہ ماننا، اسی کے مطابق اپنے آپ کو اس کا محکوم بنا لینا۔

## اپنے اپنے جذبات وخواہشات کی پیروی نے الٰہ کے قرآنی مفہوم کو ہی نظر انداز کر دیا ہے

یہ جو اندر کا بت خانہ ہے، قرآن مجید کہتا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ (45:23) تم نے اس مشرک کو بھی دیکھا، جس نے ''اپنے جذبات اور خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا''۔ عزیزانِ من! آج اس شرک سے کون بچا ہوا ہے؟ کوئی نہیں۔ ہر ایک نے اپنے مفاد کو، اپنی خواہشات کو ہی اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ اب یہاں جو آپ نے الٰہ لفظ دیکھا، اس سے بات سمجھ میں آئی کہ جو لا الٰہ کہنے والا ہے، وہ کیا کہتا ہے، وہ کس کس الٰہ کے گلے پہ چھری پھیرتا ہے اور جب ہم نے اس کا ترجمہ صرف معبود کر لیا کہ جس کی پرستش کی جاتی ہے اور پرستش کے معنی اتنی سی بات ہو گئی تو توحید اور شرک کا وہ سارا مفہوم ہی ذہن سے غائب ہو گیا۔

الٰہ کے تو معنی ہیں ''جس کی مانی جائے'' اور تم ہو کہ اس کے احکام وقوانین کے سامنے، پھر بھی اپنی مانتے ہو تو مشرک ہو۔ کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (45:23) ایک تو وہ جہالت تھی کہ علم نہیں تھا تو اس صورت میں کسی جہالت میں پہنچ گئے۔ یہ بت پرستیاں وغیرہ جہالت کے دور کی چیزیں ہیں، کہا ہے کہ یہ وہ ہے کہ علم کے باوجود اندھا ہے کیونکہ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) آنکھوں میں پردے ہیں، کانوں میں ڈاٹ ہیں اس کی کیفیت یہ ہے کہ دل پہ مہریں لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ لاکھ سمجھاؤ، لاکھ سمجھانے کی کوشش کرو، بات آگے چلتی ہی نہیں ہے۔

## خالصتاً جذباتی زندگی کے قید خانے میں گرفتار انسانی نفسیات کی حالتِ زار

یہ صرف اس لیے ہے کہ یہ حیوانِ ناطق ہے، جذبات کے تابع آیا ہوا ہے، اپنے جذبات میں مدہوش ہو چکا ہے۔ آپ میں اس معاشرے کے اندر کون ہے جسے یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ بدنظمیاں، یہ قانون شکنیاں، یہ رشوتیں، یہ بدعنوانیاں تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ پھر کیا ہو رہا ہے کہ اس کے باوجود وہ راہِ راست پہ نہیں آتا؟ اس لیے کہ اس نے اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔ قرآن حکیم کہتا

ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ہیں' جو اندھے ہوتے ہیں۔اور وہ مقام ہے جہاں کہا ہے کہ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) جو اپنی یہ کیفیت پیدا کرلے' اس کے بعد اس کو راہِ راست پر کون لاسکتا ہے۔ یہ اپنے ہی جذبات کو الٰہ بنا لینے والے ہیں۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے۔عجیب انداز میں قرآن کریم کہتا ہے۔

قرآن کریم سے انسان کتنا اوپر ہوجاتا ہے! مگر اس کے برعکس ان بتوں کا انسان' بزرگوں کے بت' احبار و رہبان کے بت' خواہشات کے بت' استبداد کی حکومتوں کے بت' جن کے ساتھ احتیاجیں وابستہ ہیں ان کے بت' یہ جب اتنے بتوں کا خوگر ہوجائے پھر اس انسان کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ محسوس شکل میں اگر کسی ایک شخص کی آپ نے یہ کیفیت دیکھنی ہو تو دیکھیے اُسے جو اِن قبروں پہ جاتا ہے' پیر پرستیاں کرتا ہے 'قلندر حق چہ گوید دیدہ گوید' اس بدبخت کی شاعری میں شاید ہی ملک کی کوئی قبر ہو' جس کی مٹی اس کے ساتھ نہ لپٹی ہوئی ہو۔ کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے کہ توحید کی' خدائے واحد کی بات اس سے کرو تو اس کی وہ عجیب اضطرابی کیفیت ہوتی ہے کہ کیا بات لے کر بیٹھ گیا اور جونہی اس کے سامنے اس کے حضرت صاحب کی بات کی تو کہا کہ سبحان اللہ صاحب! بات ہوئی صاحب! حضرت صاحب کا مقام کیا ہے' اب اس بات کو صاحب آپ پہچانے ہیں' باچھیں کھل جاتی ہیں۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (39:45) یہ جو اللہ اور آخرت سے' مکافاتِ عمل سے' انکار کرنے والے ہیں جب اکیلے خدا کا ان کے سامنے ذکر کرو تو منہ بسور لیتے ہیں' ماتھے پہ شکنیں پڑ جاتی ہیں' تنگ آجاتے ہیں کہ جلدی سے یہ بات ختم کرو اور اس کے ساتھ کہا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) اور اس کے ساتھ جب حضرت صاحب کا ذکر کر دیا' خوش ہوجاتے ہیں' صاحب! سبحان اللہ' سبحان اللہ' جی سبحان اللہ۔قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ اکیلے خدا کا ذکر نہیں سن سکتے' جب اس کے ساتھ ان کا ذکر کرو تو بڑے خوش ہوجاتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی دو تین آیتیں اور بھی لے لیجیے' بڑی اہم چیزیں ہیں۔کہا ہے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ (40:12) وہ اس لیے کہ جب اکیلے خدا کی توحید کی طرف تمہیں دعوت دی جائے تو اُس سے انکار کرتے ہیں۔ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) اس کے ساتھ اور شریک کر دیئے جائیں تو پھر خدا پر ایمان لاتے ہیں' وہ خدا' جس سے متعلق حضرت صاحب ہیں' یہ خدا ان کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے' اس پر ان کی نسبت سے ایمان لایا جاتا ہے۔

## یورپ میں پرچار کے سلسلہ میں ایک مولوی صاحب کی ناکامی کی بنیادی وجہ

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک مولوی صاحب تھے۔ وہ یورپ میں گئے۔ انہوں نے جا کر خدا کا پرچار شروع کیا' دعوت دینی شروع کی'

کسی نے پوچھا ہی نہیں وہ تھک کر چلا آیا' آ کر اس سے پوچھا کہ بتاؤ ذکر کیا؟ کہنے لگے کہ صاحب! میں وہاں خدا کا ذکر کرتا رہا' کسی نے میری بات ہی نہیں سنی۔ کہنے لگے کہ تمہیں پتہ نہیں' چلو' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس طرح خدا کی بات نہیں سنتے! اس کے پاس پتہ نہیں کیا فن ہے' وہ آیا' اس نے آ کر جگہ جگہ حضرتِ مسیحؑ کی منادی شروع کردی اور مسیح کی منادی ہوئی۔اس پہ لاکھوں لوگ اس کے پیچھے آئے۔تب اس نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ مسیح کس کا بیٹا تھا؟ وہ خدا کا بیٹا تھا۔مسیح کے باپ کی حیثیت سے خدا کو پیش کرو' تب خدا کو مانیں گے' براہِ راست پیش کرنے سے کون مانتا ہے اور یہی ہے وہ فریب جو دیا جاتا ہے کہ ان کی وساطت سے ہم خدا تک پہنچتے ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) انہیں ساتھ ملاؤ تو پھر یہ خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

## قرآنِ حکیم کی رُو سے محکومیت فقط قوانینِ خداوندی کی اختیار کرنا ہے

اسی آیت کے آگے یہ ہے جس نے اس شرک کی جڑ کاٹ دی ہے۔کہا ہے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12) محکومیت اختیار کرنی ہے تو تم صرف اس کی اختیار کرو جو بڑے ہی بلند مرتبے کا' بڑی قوتوں کا مالک ہے' تمام فیصلے اسی کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔اس میں کسی اور کا قانون شریک نہیں ہوتا' اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا اور تم ہو کہ ان کو مان کر' مسیح کے باپ کی حیثیت سے' اِن کی نسبت سے' اسے خدا مان رہے ہو حالانکہ کہا یہ ہے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)۔

## توحید کی بنیاد پر خدا کو ماننے والی شخصیت حضرت یوسفؑ کی ذات کا ذکر

عزیزانِ من! یہی ہے وہ توحید جو حضرتِ یوسفؑ نے قید خانے میں پیش کی تھی۔توحید کا ماننے والا کسی موقعہ کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔یہ بڑی عجیب چیز ہے' سورۃ یوسف پہ آؤنگا تو میں عرض کرونگا۔یہ قید خانے میں بھی ہیں۔انہوں نے دیکھا کہ دو قیدی اپنا مطلب لے کر آئے ہیں۔یہاں بھی جسے ہم خدا کا بندہ کہتے ہیں' موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو آپ اپنی لے کر آئے ہیں' اس کے لیے تو یہ ٹھہریں گے ہی' اس سے پہلے ان کو خدا کی بات تو سنا دو۔اور وہ خدا کی بات کیا ہے؟ یہ کہ فرعون کا نظام ہے' اس کی مملکت میں بیٹھے ہیں' اس کے جیل خانے کے اندر پڑے ہوئے ہیں' یہ جو دونوں قیدی ہیں' یہ اس کے ملازم ہیں جو بات پوچھنے کے لیے آئے ہیں۔یہ ان قیدیوں سے کہہ رہے ہیں کہ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ (12:39) اے میرے قید خانے کے ساتھیو! آپ نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بڑا اونچا مقام نہیں دیا' عزیزانِ من! قرآن کریم کے یہ مقام بڑے غور طلب ہوتے ہیں۔یہ نہ کوئی مساجد والے بنے ہیں' نہ کوئی بڑے مولوی صاحب بنے ہیں' نہ کوئی اونچے مقام پہ کھڑے ہوئے ہیں۔کہا یہ کہ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! جیسے تم قیدی' ویسے ہی میں قیدی' آہاہا! یہ کتنی پیاری چیز ہے کہ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! بات

اتنی سی ہے کہ سوچو کہ ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ (12:39) ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے اور دوسرا شخص بیک وقت بیس مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ان میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ اتنی سی بات تو تم بھی جانتے ہو کہ کسی ایک شخص کی ملازمت کر لینا ان بیس مالکوں کے ملازم ہو جانے سے بہتر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اُس کی زندگی بہتر ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بات ہے! یہ انہی کی سطح پہ سمجھا رہے ہیں۔ دس بیس کا نوکر ہو کر ذرا بتائے کہ اس کے ساتھ کیا تماشا ہوتا ہے۔ وہ ملازم کہتا ہے کہ میں یہاں کیسے کام کر سکتا ہوں' میری تو مت ماری جاتی ہے۔ اس میں پھر ہوتا یہ ہے کہ ''بی بی جی کچھ کیندیاں نیں' کاکا کچھ کیندا اے' اے میاں جی کچھ آواز دین ڈیا ہیگا'' (بی بی کچھ کہتی ہیں' بچہ کچھ کہتا ہے اور یہ میاں جی ہیں کہ کچھ اور ہی آواز دے رہے ہیں)۔ کہا ہے کہ ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ (12:39)۔ کتنی عمدہ بات تھی جو ان کی سمجھ میں آ گئی۔ کہا ہے کہ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ (12:40) بس یہی صورت ایک اطاعت کرنے والوں کی ہے' یہ اس ایک کو چھوڑ کر جن کی تم محکومی اختیار کرتے ہو' یہ تو ایکٹرز (اداکار) ہیں' پردے کے پیچھے جا کر دیکھو یہ وہی چور کا چور ہے' پردے کے باہر آیا ہے تو بادشاہ بنا ہوا ہے جناب! وزیر بنا ہوا ہے۔ تم نے ان ایکٹرز کے کچھ نام رکھ لیے ہیں' کچھ تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لیے۔ یہ حضرت صاحب چھ سو صدی پہلے تک تو کچھ نہیں تھے' آج تم نے ان کے کچھ نام رکھ لیے ہیں' ان مختلف آقاؤں کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

## قرآنِ حکیم نے ان میں سے کسی کو کوئی سند نازل نہیں کی

صرف نام رکھے ہوئے ہیں' ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو فی الواقعہ کسی اقتدار و اختیار کا مالک ہو۔ کہا ہے کہ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ (12:40) خدا نے ان کے اختیار و اقتدار کے لیے کوئی سند نہیں نازل کی۔ اختیار تو اس کا ہے' جو کسی کو اپنا اقتدار اور اختیار تفویض کر دے اور کسی کو سند دیدے تو پھر بھی یہ بات ہو جائے کہ ہاں صاحب! ذاتی نہیں' اضافی طور پہ ہی سہی' کوئی اختیار اُسے حاصل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تو اس کی بھی کوئی سند نازل نہیں کی۔ اور تم ہو کہ کبھی غور ہی نہیں کیا کہ ان آقاؤں کی' ان خداؤں کی' حقیقت کیا ہے اور اصلیت کیا ہے؟ یہ بس اتنی ہی ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔

## کیا آدم یا انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے؟

وہ جو آپ کے ہاں ایک عام چیز ہے کہ آدم یا انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے معنی ''نائب'' کے ہیں کہ اس کی جگہ وہ اس دنیا میں خدا ہے حالانکہ وہ کہتا ہے کہ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ (57:4) تم جہاں ہو' میں وہاں ہوں۔ عزیزانِ من! نیابت بھی

نہیں' تفویض بھی نہیں' اس کا سوال ہی نہیں۔اور یہ ہے توحید۔کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ "اِنِ الْحُكْمُ" کے بعد جو "اِلَّا" آیا ہے' اس کے کیا معنی ہیں۔یہ یک لخت' ہر ایک کو خدا کے سوا کاٹ دینے کا طریق ہے۔یہ انداز ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40)۔اب یہاں کہا ہے کہ حکم چلانے کا ' حکومت چلانے کا حق' خدا کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔آپ دیکھیے عبادت کے معنی کیسے واضح ہوتے ہیں! امر' حکم اس نے ہی دیا ہے کہ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (12:40) اس کے سوا کسی کی حکومت جائز نہیں' حکومت کا حق صرف اس کا ہے' اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو' اور نہ ہی یہاں اس کے معنی پرستش کیجیے' بات ہی نہیں بنتی' لفظ عبادت لے آیئے بات صاف ہو جاتی ہے۔کہا ہے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40) یہ ہے دینِ قیم۔وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:40) مشکل یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔وہ عبادت کو پرستش جانتی ہے' الٰہ کو معبود سمجھتی ہے۔یہ جو کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) تو کہتے ہیں کہ اس کی بادشاہت آسمانوں کے اوپر ہے' حالانکہ اس نے کہا تھا کہ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84) آسمانوں میں بھی وہی حاکم ہے اور زمین پہ بھی وہی حاکم ہے۔

## میں قرآنی آیات کا مفہوم قرآن حکیم ہی کی سند کے بغیر پیش نہیں کرتا: پرویزؒ

عزیزانِ من! یہ تھا شرک۔اب کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (4:48) یاد رکھو! سہو و خطا سے کوئی لغزش ہو جانا اور بات ہے' اُس کے نقصانات سے انسان قانونِ خداوندی کے مطابق محفوظ رہ سکتا ہے لیکن جو شخص خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کرتا ہے' شرک کرتا ہے تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی' یہ نقصان جو وجہِ تذلیلِ انسانیت ہے' وہ اس سے پہنچتا ہے۔عزیزانِ من! یہ الفاظ یا مفہوم میرا اپنا نہیں ہے۔اللہ کا فضل ہے میں جو مفہوم عرض کرتا ہوں' وہ قرآن حکیم ہی کی کسی نہ کسی آیت سے ماخوذ ہوتا ہے' اسی شمع نورانی کی یہ کڑیاں ہوتی ہیں۔کہا ہے کہ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ (22:31) یاد رکھو! جو بھی خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے' حقِ حکومت دیتا ہے' اس کے سامنے جھکتا ہے' اس کی محکومیت اختیار کرتا ہے' انسان بھی ایسا کرتا ہے' یہ سمجھو کہ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) یوں سمجھو جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آگرا ہے۔وہ آگرا ہے تو اس سے خدا کا جو تختِ حکومت ہے' اس کا پایہ نہیں ہل جاتا۔

## شرک کا عمل تو انسان کو آسمان سے زمین پر اس طرح گرا دیتا ہے جس طرح کوئی چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے زمین پر آگرے

عزیزانِ من! اس سے بڑی بھی کوئی ذلت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ کہا ہے کہ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) ایسے شخص کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرا تو اس انداز سے جیسے ایک چڑیا کا نوزائیدہ بچہ اپنے گھونسلے سے زمین کے اوپر آ گرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ (22:31) اور ایک چیل آئے اور جھپٹ کر لے جائے۔ دیکھتے ہیں آپ شرک کے نقصانات' پھر جس کا پنجہ ذرا سخت ہو' جس کے ناخن تیز ہوں' وہی اس کو لے جائے۔ آسمان کی بلندیوں سے گرا تو اس طرح گرا جیسے چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گرتا ہے' جس میں اڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی پھر جو زیادہ تیز پکڑنے والا پہلے آ گیا تو وہی لے کر اڑ گیا اور اگر وہ نہ بھی آیا اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (22:31) تو ہوا کا کوئی تیز جھونکا' خس و خاشاک کی طرح اس کو اڑا کر لے گیا۔ صاحب! شرک یہ ہے۔

## شرک کے بعد اسباب زوالِ امت پہ انکوائری کمیشن کیوں؟ خدا کے قانونِ حیات کے ماوراء نظام قائم کرنے سے انسان روٹی کے لیے بھی بھیک مانگتا ہے۔

عزیزانِ من! اس کے بعد آپ پھر اپنے ہاں انکوائری کمیشن بٹھاتے ہیں کہ وہ اسبابِ زوالِ امت کی تحقیق کریں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہے۔ شرک میں جو گرفتار ہے' کیا وہ کسی عزت کا مالک ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ قطعاً نہیں۔ یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ پھر اس قسم کے نظام قائم کر دیئے جاتے ہیں کہ اس کے بعد فرد کو اس کے سوا مفر نہ رہے کہ وہ روٹی کے لیے بھی بھیک مانگے اور جب روٹی کے لیے بھیک مانگے تو جو جی چاہے' اس سے منواتے چلے جایئے' پھر اس کی حکومت بھی قائم ہو جائے گی۔

## کوئی حکومت بھی اپنے استبداد کو مذہبی پیشوائیت کے بغیر قائم رکھ ہی نہیں سکتی

فرعون کی فرعونیت اس دعوے کے اندر تھی کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) میں تمہارا ان داتا ہوں' میں تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ کس طرح سے انسان اس ذلت کے لیے تیار ہو جاتا ہے' اس کے لیے ہامان ساتھ رکھا ہوا تھا' اس نے اپنے ساتھ پروہت رکھا ہوا تھا' اس کے جنود تھے' اس کے لاؤ لشکر ساتھ رکھے ہوئے تھے' وہ صبح شام اس کے کان بھرتے تھے کہ یہ خدا جس کو تم مانتے ہو' یہ اس دنیا کے اوپر اس کا اوتار ہے۔ وہ صبح شام ان سے یہ کہتے تھے' ان کو معبود بناتے تھے۔ حکومت کا استبداد کبھی بھی مذہبی پیشوائیت کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا اور ان دونوں سے پھر وہ نظام قائم ہوتا ہے جس کا نمائندہ قارون ہے۔ بس یہ تین چیزیں ❶ اکٹھی کر لیجیے' اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو توڑنے کے لیے کسی صاحبِ ضربِ کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شرک کو آ کر توڑتا ہے' یہ توحید کا

---

❶ یہ تین چیزیں یہ ہیں: (1) فرعون۔ یہ استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ ہے۔ (2) ہامان۔ یہ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہے۔

(3) قارون۔ یہ نظامِ سرمایہ داری کا نقیب ہے۔

نظام راسخ کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنی روٹی کی خاطر کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا اور جب محتاج نہیں ہوتا تو محکوم نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ وَ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا (4:48) خدا کے ساتھ شرک کرنے والے کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے' کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ دنیا میں کسی انسان کو اپنا محکوم بنائے' جو یہ دعویٰ کرتا ہے' وہ افتراء ہے' وہ خود وضع کرتا ہے۔ یہ عجیب الفاظ ہیں صاحب! اور نتیجہ یہ ہے کہ اِثْمًا عَظِیْمًا (4:48) ہمارے ہاں تو ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ بڑا گناہ ہے' اس طرح ہمارے ہاں اس کا تو مفہوم ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔

## اثم کا لغوی مفہوم ''اپنی صلاحیتوں کا مضمحل ہو جانا یا کمزور ہو جانا ہے''

میں نے شاید پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے اندر اثم کہتے ہیں ''جب کسی کی توانائیاں اتنی مضمحل ہو جائیں کہ وہ صفِ انسانیت کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے''۔ آیت (4:48) کے آخری الفاظ میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ غیروں کے محتاج ہو جاؤ' ان کی محکومی اختیار کر لو' پھر تم دیکھو کہ اس قوم کے اوپر کتنی اضمحلال اور فرسودگی چھا جاتی ہے' پھر اس قوم کے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ یہاں سے بھیک مانگو' وہاں سے قرضہ لو' وہاں سے یہ چیز لو۔ وہ قوم اس قدر مضمحل مزاج ہو جاتی ہے' اس قدر ناکارہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت سے چنے چبا کر گزارہ نہیں کرنا چاہتی۔ جہنم کی جو روٹی ہے اس کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ سمندر کا پانی جو خس وخاشاک اور جھاڑ جھنکار کو ساحل پر پھینک دیتے ہیں' وہ اہلِ جہنم کا کھانا ہوتا ہے۔ وہ پھر یہ کھانا کھاتے ہیں' مست ہو جاتے ہیں' پھر اپنی خوشحالیوں کے قصے سناتے ہیں۔ یہ ہے اِثْمًا عَظِیْمًا (4:48)۔ کہتا ہے کہ اس قوم کے اندر توانائیاں مضمحل ہو جاتی ہیں۔ عرب نَاقَةُ الْاٰثِمَةُ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو تکان سے اس قدر مضمحل ہو جائے کہ باقی اونٹوں کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے' اس لیے بہت آہستہ چلے' گھسٹتی ہوئی پیچھے چلی جائے۔ شرک کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ بڑی اہم آیات تھیں جو ہمارے سامنے آئیں اور آگے پھر قرآنِ حکیم اس کی شقیں لاتا ہے کہ آؤ ہم جو روحانیت کے بڑے بڑے مدعی ہوتے ہیں' تمہیں ان کا بتائیں۔ یہ بات ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

# چودھواں باب: **سورۃالنسآء** (1)، (آیات 49 تا 58)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿49﴾ انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ﴿50﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿51﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿52﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿53﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ﴿54﴾ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿55﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿56﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿57﴾ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿58﴾

عزیزانِ من! آج❶ ستمبر 1970ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 49 سے ہو رہا ہے: (4:49)۔

## قرآنِ حکیم میں روحانیت کی اصطلاح کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی باطنی علم کی کوئی حقیقت ہے

احبار ورہبان جنہیں علماء ومشائخ کہا جاتا ہے' وہ روحانیت کی دنیا کے تصرف کرنے والے کہلاتے ہیں۔ واضح رہے کہ دینِ اسلام جو قرآنِ کریم نے دیا تھا' اس میں جسے یہ ہماری اصطلاح میں روحانیت کہتے ہیں' کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ یہ خالصتاً غیر اسلامی تصور ہے۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی ورنہ میں بتاتا کہ اس کی تعریف کیا ہے۔ افلاطون نے ایک تصور دیا تھا کہ دنیائے محسوسات (خارجی کائنات) کا دراصل اپنا کوئی وجود نہیں' یہ قابلِ اعتماد نہیں' اس پہ یقین ہی نہیں کیا جاسکتا یعنی اگر اس کا اپنا وجود ہی نہیں ہے تو پھر اس کا یقین ہی نہیں کیا جائے گا۔ اصل میں اوپر ایک دنیا ہے۔ یہ حقیقی دنیا عالمِ امثال (World of Ideas) کی ہے۔ یہ کہیں آنسوئے افلاک واقع ہے۔ یہ نیچے کی دنیا' یہ مرئی کائنات' یہ سب اس کا سایہ ہے' اس کا عکس ہے اور عالمِ امثال کا علم باطنی طریقے

---

❶ شروع کی ریکارڈنگ قدرے خراب ہو چکی ہے۔

سے' اندر کی دنیا کو' روشن کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہوسکتا تھا وہ ظاہر ہے یعنی جب یہ عالمِ محسوسات درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریب اور سراب ہے' عالمِ خواب ہے تو اس کے متعلق جو علم انسانی حواس (Senses) کے ذریعے حاصل ہوگا' وہ بھی اپنی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہوگا جو انسان کو چشم بند و گوش بند و لب بہ بند کے بعد اپنی دنیا میں جذب ہوجانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابلِ اعتماد ہوگا۔ محسوسات کا علم (Perceptual Knowledge) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ ایک تصور تھا۔

## عالمِ انسانیت کی ایک بہت بڑی بدقسمتی کی نشاندہی جس کی قرآنِ حکیم نے کہیں تائید نہیں کی

تاریخِ انسانیت کی بڑی بدبختی ہے کہ ایسی شخصیتیں ہیں جن کے ذہن تو بہت بلند ہیں مگر ان کی نگاہیں ٹیڑھی ہیں۔ وہ اتنا نقصان پہنچا جاتے ہیں کہ صدیوں تک انسانیت پنپ نہیں سکتی' ان میں ایک افلاطون بھی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ پلیٹو (افلاطون: 347-428ق م) کے اس تصورِ عالمِ امثال سے اڑھائی ہزار سال ہوئے' نسل درنسل' تمام اقوامِ عالم' مذاہب کی دنیا' طریقت کی ساری دنیا' متاثر چلی آ رہی ہے اور اسی نے تاریخِ انسانیت میں مختلف پیراہن پہنے ہیں۔ اسی پر یونانی تصوف کی عمارت استوار [1] ہوئی ہے۔ یونان میں بھی یہ تصوف اشراقین وغیرہ کی شکل میں ابھرا' ایران میں یہی چیز' ان کے آتش کدوں میں حرارت پذیر ہوئی' ہندوستان کے جوگیوں میں یہی کچھ آیا' اس نے ویدانت کی شکل اختیار کی اور وہیں سے اسلام نے مستعار لے کر اپنے ہاں خانقاہیت کی رسم ڈالی۔ اس کا کوئی ذکر' کوئی تصور' کوئی وجود' تک قرآنِ کریم میں نہیں ہے' دین میں نہیں ہے' یہ مانگی ہوئی چیز ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا ہمارے ہاں بڑی بے تکلفی سے تین اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں کہ صاحب! اس دور میں ہمارے ہاں مادی' اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوئیں۔ مادی (Material) بات سمجھ میں آتی ہے' اخلاقی بھی سمجھ میں آتی ہے' مگر اخلاقی سے آگے چل کر' اس سے بھی بلند تر مقام' جو روحانی ترقی کا بتایا جاتا ہے' یہ قابلِ فہم نہیں ہے۔

---

[1] چنانچہ اس ہندو فلسفہ کی رو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی' یہ خواب معدوم ہوجائے گا۔ یہ عظیم کارگہ کائنات' ایشور کی لیلا (ناٹک کا کھیل) ہے' جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو ایرانی مغچوں کے ہاتھوں ''شرابِ معرفت'' بن کر چھلکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کرگیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دیدیا گیا اور دنیا ایک قابلِ نفرت شے تصور کرلی گئی' جس سے دور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا (پرویزؒ: سلسبیل' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1997' ص۔163)۔

## قرآنِ حکیم نے نبی اکرم ﷺ کے لیے بھی خلقِ عظیم کا لفظ استعمال کیا ہے' روحانیت کا نہیں

بس یہ روحانیت ایک اصطلاح ہے۔ کسی سے پوچھیے کہ یہ ہوتی کیا ہے' تو وہ یہ کہتا ہے کہ 'ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی!' یہ تو نشہ شراب ہے' جو پئے گا اسے ہی پتہ چل سکتا ہے' دوسرے کو پتہ ہی نہیں چل سکتا لیکن اس کو مقام اتنا اونچا دیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے یہ اخلاقیات کی دنیا' یہ ساری شریعت کی دنیا' پست ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ یہ مقام اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کا ہے جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز المرام ہے' جس سے بلند تر ہستی کا تصور کوئی ذہن نہیں کر سکتا' جس کے متعلق 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' کہہ دیا گیا ہے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم نے بھی یہ کہا ہے کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (68:4) تو اخلاق کی بلندیوں کے اوپر ہے' اس سے آگے کوئی اور لفظ نہیں کہا گیا۔ اخلاق کی بلندی سمجھ میں آ سکتی ہے' Moral (اخلاق) سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اب ان سے آگے Material, Moral & Spiritual (مادی' اخلاقی اور روحانی) ایک چیز آتی ہے اور یونہی ضمناً' یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آج صبح پاکستان ٹائم (Pakistan Time) میں جو آج کے اس درس کا اعلان ہوا ہے' معلوم نہیں کہ وہ کس درس کا عنوان ہے' وہاں میرے نام کے آگے لکھا ہوا ہے:

Mr. G.A. Parwez 8:30, Topic "Spiritualism

سنیے! یہ Spiritualism (روحانیت) ایک خالص یونانی تصور تھا' عیسائیت نے اس کو اپنایا' اس کے ہاں باپ بیٹا اور روحِ قدس کے ساتھ ایک شرک لانے کی ضرورت تھی۔ آپ کے ہاں بھی یہ Spiritualism (روحانیت) کی اصطلاح آ گئی اور پھر اس کا ترجمہ روحانیت' یا روحانیت کا ترجمہ Spiritualism ہوا۔

## تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم اہلِ تصوف کے بیان کردہ تصور کے بالکل برعکس ہے

ہمارے ہاں کوئی شے Spiritualism (روحانیت) نہیں ہے' احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے انسان کا اخلاق بلند ہوتا ہے اور اخلاقیات کے بلند تریں مقام پہ حضورِ نبی اکرم ﷺ فائز تھے۔ یہی مقامِ مومن ہے' اسی سے انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ ذات کی نشوونما ہے جس کو تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔ روحانیت والوں کے ہاں تو تزکیۂ نفس کچھ اور ہی شے ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تو نفس کشی کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ تزکیہ کے معنی ہوتا ہے: ''بالیدگی' ابھارنا' بلند کرنا' برومند کرنا' نشوونما دینا'' لیکن اندازہ لگائیے کہ جو نفس کشی ہے' نفس کو مارنا ہے' اس کو کہا جاتا ہے ''نفس کو نشوونما دینا''۔ اور قرآنِ کریم نے جہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے وہ ''زکی کرنا'' ہے جہاں سے تزکیہ ہے' اس کے معنی ''انسانی ذات کی نشوونما'' ہے جو قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے اور

اس کی نمود انسان کے کیریکٹر میں ہوتی ہے' کردار میں ہوتی ہے۔ اسے ہی اخلاق کہا جاتا ہے' اسے ہی Moral کہا جاتا ہے' یہی چیز ہے' اس سے آگے کوئی اور چیز نہیں' اس سے الگ کوئی اور چیز نہیں۔ جس کا کردار قرآن حکیم کی اقدار کے مطابق ہے' وہی مومن ہے' وہی متقی ہے' وہی مزکی ہے' قرآن حمید کی رو سے اس سے الگ کوئی اور شے نہیں اور پھر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کا جو ذریعہ بتایا ہے' یہ ہمارے ہاں کی اصطلاحِ روحانیت بالکل اس کی نقیض ہے' اس کے الٹ جاتی ہے۔ ہماری روحانی دنیا میں' صوفی ' قلندروں' درویشوں' یا پیروں کی' جو ابتدائی اسٹیج ہوتی ہے اس میں یہ ہے کہ کسی نے اللہ واسطے کی روٹی دیدی اور انہوں نے کھالی اور جب ان کے مقام بلند ہوتے ہیں تو پھر جو عقیدت مندانہ نذرانے آتے ہیں' اس کے بعد ان کو دیکھیے کہ کس ٹھاٹھ سے زندگی بسر ہوتی ہے' کتنی جائیدادیں کھڑی کی جاتی ہیں' وراثت میں جاگیریں آتی ہیں' ان کے ہاں ایک گدی چلتی ہے' ان کی ایک ریاست ہے۔ یعنی اس کے اندر یہ لوگ خود کماتے نہیں ہیں' ان کا اپنا ذریعہ کسبِ معاش نہیں ہوتا' باقی دنیا کماتی ہے' ان کو لا کر دیتی ہے اور یہ ہے پہلی چیز۔

## اہلِ طریقت کے متعلق قرآنِ کریم کا ارشاد

اب دیکھیے قرآنِ کریم نے پہلے ان کے اربابِ شریعت کو لیا اور اب اربابِ طریقت کو لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ (4:49) جو لوگ اس باطل تصور کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں' ذرا ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کرنا' وہ روحانیت کے بڑے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں' اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ صاحب! ہم بڑے مزکی ہیں' ہمارے نفوس نشوونما یافتہ ہیں' یہ تزکیۂ نفس کے دعویدار ہیں' ان کو دیکھیے یہ اپنے ہی ذہن کے مطابق' یہ کچھ بنے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ہم ''روحانیت کی منزلیں'' طے کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خود اپنے تصور کے مطابق کچھ نہیں بنا جا سکتا۔

## انسانی ذات کی نشوونما کا اصول اور لفظ زکوٰۃ کا قرآنی اور مروّجہ مفہوم و مقصود

آگے کہا ہے کہ بَلِ اللّٰهُ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (4:49) یاد رکھو! انسانی ذات کی نشوونما تو خدا کے قوانین کے مطابق ہوتی ہے جسے اس نے اپنی مشیت کے مطابق بذریعہ وحی عطا کیا ہے۔ جو بھی اپنی ذات کی نشوونما چاہتا ہے' وہ ان قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے تو اسے یہ چیز حاصل ہو جائے گی اور اس کی کوششوں کے نتائج میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی' اس کو پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ موضوع دوسرا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے' میں یہ عرض کروں کہ تزکیہ کسے کہا جاتا ہے۔ ''زکوٰۃ'' کا لفظ یہیں سے نکلا ہے۔ اس کے معنی بھی ''نشوونما دینا'' ہیں۔ ہمارے ہاں تو زکوٰۃ اب شریعت کی ایک اصطلاح بن چکی ہے' کسی مال

پر جو اتنا ہو' جسے نصاب کہتے ہیں' سال کی مدت گزر جائے تو اس میں سے خدا کے نام پر اڑھائی فیصد دیدیا جائے تو اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے حالانکہ زکوٰۃ کے معنی تو ''دوسرے کو نشوونما دینا'' تھے۔ قرآنِ کریم نے اسلامی مملکت کا یہ فریضہ قرار دیا ہے۔ کہا کہ جب ان مومنین کو حکومت حاصل ہو جائے گی تو ان کا فریضہ اٰتوا الزکوٰۃ ہوگا' یہ زکوٰۃ دیں گے' لیں گے نہیں۔ اب سوال ہے کہ یہ کیا چیز دیں گے؟ یہ انہیں ''عالمِ انسانیت کی نشوونما کا سامان'' دیں گے' جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو ان کا فریضہ یہ ہوگا کہ تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کریں' ان کو سامانِ نشوونما عطا کریں۔ انہیں یہ سامانِ نشوونما دینا مملکت اسلامیہ کا فریضہ تھا۔ اسی کا نام زکوٰۃ دینا تھا۔

ہمارے ہاں وہ اڑھائی فیصد یا تو اپنے طور پہ باندھ دیجیے اور اس کی اصلاح کی جو کوششیں کی جاتی ہیں تو وہ یہ ہیں کہ صاحب! حکومت ایک الگ بیت المال کھولے' اس میں یہ روپیہ جایا کرے یعنی اسلامی حکومت کا خزانہ تو الگ ہو' اور اس میں بیت المال الگ ہو۔ خزانے کے لیے یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ بیت المال کے معنی ہیں ''وہ جگہ جہاں مال اکٹھا کیا جائے''۔ ہمارے ذہنوں میں ہے کہ صاحب! یہ تو ایک شرعی چیز ہوتی ہے اور جو حکومت کا خزانہ ہوتا ہے' یہ دنیاوی چیز ہوتی ہے اس لیے جو زکوٰۃ کا روپیہ ہوگا' یہ حکومت کے خزانے میں نہیں جا سکتا' یہ تو بڑا پاک مقدس مطہر سا روپیہ ہے' یہ اس قسم کی نجاست میں کیسے جا سکتا ہے جسے حکومت کا خزانہ کہا جاتا ہے۔ کیا کیا عرض کریں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے! جو اسلامی حکومت کا خزانہ تھا اس کو بیت المال کہا جاتا تھا۔ اب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ تو بیت المال میں چلا جائے' اس کا نام زکوٰۃ رہ گیا۔ قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اسے زکوٰۃ دینا کہتے ہیں۔ اور یہاں سے یہ وہی لفظ ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ ''یزکی'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں کہ یہ اپنے اپنے زعم کے مطابق' اپنے خیال کے مطابق' یزکی بن بیٹھتے ہیں' روحانیت کے علمبردار اور اجارہ دار بن بیٹھتے ہیں۔ یہ مزکی ہونا اپنے ذہن کی بات نہیں ہے' یہ چیز تو قوانینِ خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔

## قرآنِ حکیم انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے: انسانی سطحِ زندگی اور حیوانی سطحِ زندگی

عزیزانِ من! اب میں عرض کروں کہ قرآنِ حکیم نے اس کا ذریعہ کیا بتایا ہے؟ اس نے ذریعہ بتایا ہے کہ اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی (92:4) تمہاری کوششوں کے رخ مختلف ہونگے' مختلف سمتیں ہونگی' وہ پھیلی ہوئی ہونگی لیکن اصولی طور پر تمہیں دو کیٹگریز (شقوں) کے اندر تقسیم کیا جا سکے گا۔ ایک تو یہ ہے کہ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰی ۔ وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی (92:5-6) (جو اشخاص تمام نوعِ انسان کو ایک وحدت سمجھ کر یہ روش اختیار کرتے ہیں کہ اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتے ہیں اور اس طرح معاشرے

میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے محتاط رہتے ہیں) یعنی وہ جو کماتے ہیں اور اس میں سے دیتے ہیں اور توازن کو حسن کارانہ انداز سے قائم رکھ کر اپنے دعوے کو عملاً سچ کر دکھاتے ہیں اور یوں تقویٰ شعار بنتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ انہیں کہتے ہیں کہ مَنۡ اَعۡطٰی (92:5) جو دیتا ہے۔ انسان کی حیوانی زندگی کا تقاضا لینا ہے' کوئی حیوان دوسرے کو دیتا نہیں ہے' وہ اپنی ضرورت کے مطابق لیتا ہے' طبعی زندگی کا دارومدار اس چیز پہ ہے جو آپ اپنے استعمال میں لائیں۔ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پہ جب زندگی پہنچتی ہے تو اس کا تقاضا مَنۡ اَعۡطٰی (92:5) ہے کہ دوسرے کے لیے کتنا دیتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے بنیاد آپ کے ہاں کے معاشی نظام کی' یہ ہے اساسِ محکم کہ جان مار کر کمائی کرتا ہے اور اس کے بعد اپنی ذات کی نشوونما کے لیے دوسروں کو دیئے چلا جاتا ہے یعنی مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰی. وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی (92:5-6) اور اس طرح سے وہ ان حسنات کو سچ کر دکھاتا ہے جن پر اس کا ایمان ہے۔ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلۡیُسۡرٰی (92:7) تو اس کے لیے زندگی کی راہیں بڑی آسان کر دی جاتی ہیں۔

## دوسری کیٹگری بخل کے خدوخال

اس کے مقابلے میں دوسری روش یہ ہے کہ وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی. وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی (92:8-9) وہ سارا کچھ سمیٹ کر اپنے لیے رکھتا چلا جاتا ہے اور اس طرح سمجھتا ہے کہ میں دوسروں سے مستغنی ہو چکا ہوں' دوسروں کی مجھے کیا پرواہ ہے اور اس طرح سے اپنے دعوٰئ ایمان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ دوسری کیٹگری آئی۔ اور اسی سورۃ الّیل کی یہ پانچ سے دس تک ابتدائی آیات تھیں اور اگلی آیت یہ ہے کہ یاد رکھیے! جہنم کے شعلے بڑے بھڑکنے والے ہیں' یہ جنہیں کہا تھا کہ دین کی تکذیب کرتے ہیں وہ اس میں جائیں گے اور اس کے برعکس وَسَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی (92:17) جو ہمارے قوانین کی نگہداشت کرتا ہے' وہ اس تباہی سے دور رکھا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا۔ یہ وہ شخص ہوگا الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (92:18) جو اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے تا کہ اس کا تزکیہ ہو جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں روحانیت کی ابتدا ہی اللہ واسطے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہے اور آگے چلتے ہیں تو پھر تو عقیدت مندیوں کے نذرانے' جتنے آتے ہیں' پوچھیے نہیں یعنی ان کے ہاں دینا نہیں ہوتا' لینا ہی ہوتا ہے۔

## روحانیت کے تصور کے تحت کرامتوں کا تصور اور اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ کی زندگی

اور قرآن حمید یَتَزَکّٰی کے لیے بنیادی چیز یہ بتاتا ہے کہ وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ اب وہ کمائے گا تو دے گا۔ جو دوسروں کو دینے والا ہے' اس کا یہاں تزکیہ ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی شے نہیں جسے آپ روحانیت کے کچھ موہوم سے تخیل میں' اپنے ذہن میں لے لیں کہ پتہ تو کچھ ہے نہیں کہ کیا ہوتا ہے بس وہ یہی چیز ہے کہ جی حضرت صاحب سے کچھ کرامتیں سرزد ہوتی ہیں' اس کے لیے ان کو ہم صاحبِ

روحانیت کہتے ہیں۔ان کرامات کا ذکر تو قرآن حمید میں کہیں نہیں آیا اور کرامتیں تو ان بت پرستوں' مشرکوں' سادھوؤں سے ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا تصور بھی دوسرے آدمی نہیں کر سکتے۔

عزیزانِ من! یہ کرامات دکھانا ایک فنی چیز ہے' اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں' روحانیت سے کوئی واسطہ نہیں' اسلام میں ایسی کوئی شے نہیں ہے یا قرآن حمید کی رو سے روحانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔وہاں دو ہی چیزیں مادی اور اخلاقی ترقی کی ہیں' Material & Moral (مادی اور اخلاقی) ترقی (Promotion) کی ہیں اور Moral (اخلاق) ہی وہ ترقی تھی جس پر میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (68:4) آپ حضورﷺ اخلاق کی بلندیوں کے اوپر ہیں اور مادی ترقی کے لیے یہ کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو مسخر کرو کہ تمہارے لیے ان کو تابع قوانین بنا دیا گیا ہے۔قرآن حمید کی رو سے یہ مادی ترقی ہے اور جو دوسری ترقی ہے' وہ اخلاقی ترقی ہے' وہ کیریکٹر کی بلندی ہے۔

## کیریکٹر یا بلندئ کردار کی پہلی عملی شکل اور اس کا ثبوت

یاد رکھیے! مومن' متقی اور مزکی' جو بھی الفاظ قرآن حکیم میں آئے ہیں' اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کا کیریکٹر کتنا بلند ہے' سیرت اور کردار کس قدر بلند ہے' اس کے علاوہ اس کے لیے کوئی اور چیز کا معیار قرآن حکیم نے بیان نہیں کیا۔اور کیریکٹر کی بلندی کی پہلی نشانی یہ ہے کہ انسان جان مار کر' محنت کر کے' ان لوگوں کی ضروریات کے لیے کتنا دیتا ہے' جن کی ضروریات ان کی اپنی محنت سے پوری نہیں ہوتیں یا وہ جو کسی وجہ سے محنت کر کے خود کمانے سے معذور ہو چکے ہیں۔یہ ''دوسروں کے لیے کتنا دیتا ہے''۔یہ ہے اخلاق کی بلندی۔ اتنی سی چیز حاصل ہو جائے تو آپ دیکھیے کہ یہ جتنے زمائم' عیوب' نقائص اور جرائم معاشرے میں عام ہو رہے ہیں' وہ ختم ہو جائیں۔وہ سارے اس لیے ہیں کہ مَنْۢ بَخِلَ (92:8) ہر شخص سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے' اسی وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔اگر نگاہ کے اندر یہ بنیادی تبدیلی آجائے کہ دین نام ہی دینے کا ہے' تو ان چیزوں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔یہی ہے جسے قرآن کریم نے تزکیہ کہا ہے بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (4:49) یہ جسے تم تزکیہ کہتے ہو' یہ تو خدا کے قوانین کے تابع آتا ہے۔اور میں نے دو آیات آپ کے سامنے رکھ دیں کہ ایسے حاصل ہوتا ہے۔جو اس طرح اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے' اس کی کوشش کے ماحصل میں ذرا سی بھی کمی نہیں کی جاتی' وہاں سے پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔

## مولانا رومؒ کا قول ہے کہ قرآن کریم کا مغز ہم نے لے لیا اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ جو اس طرح سے روحانیت لیے بیٹھے ہیں' کہ جو لفظ تک ہم نے استعمال ہی نہیں کیا' جس کا تصور تک

بھی قرآن کریم میں نہیں ہے اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ (4:50) دیکھو! یہ کس طرح اپنے ذہن سے ایک چیز گھڑتے ہیں اور پھر اسے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کتنی بڑی وعید ہے جو قرآن حکیم نے یہاں بیان کی ہے! یہ افترا ہے کہ جس مسلک و مشرب کا تصور تک قرآن مجید میں نہیں آیا' اس کو اب دین ہی نہیں بلکہ اسے قرآن حکیم کا مغز کہا جاتا ہے۔ وہ تو مولانا (جلال الدین رومی) (1165-1240 A.D.) کا شعر ہے جو ہر ایک کی زباں زد ہوگا کہ

ما زقرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

ہم نے قرآن مجید کا مغز لے لیا ہے' یہ جو دوسروں کے پاس ہے' یہ جو اس طرح سے قرآن حکیم ہے' یہ تو خالی ہڈیاں رہ گئی ہیں' جو کتوں کے آگے ڈال دی گئی ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے! قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ ساری چیزیں اِفْتِرَاءً عَلَی اللّٰہِ ہیں' انسانی ذہنوں کی پیداوار ہیں' تم انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا (4:50) اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ان کی اپنی ذات میں تقویت اور نشو و نما کے بجائے ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز ان کی تباہی کے لیے کافی ہے۔ ایسا کھلا ہوا جھوٹ' اتنا واضح جرم اور دعویٰ یہ کہ ہم خدا کے مقرب ہیں۔

## جو قوم بھی اس قسم کے تصورات کی گرویدہ ہوگی وہ دنیا کی ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جائے گی جو قدرت نے انسان کے لیے پیدا کی ہیں

عزیزانِ من! اور چیزیں تو ایک طرف رہیں' جس قوم میں بھی تصوف کا یہ تصور آ جائے گا' اس قوم میں قوتِ عمل مفقود ہو کر رہ جائے گی۔ کہا ہے کہ اِثْمًا مُّبِیْنًا (4:50)۔ کیا بات کہی ہے قرآن کریم نے! کہ اضمحلال' افسردگی' تکان' حرکت و عمل کی قوتوں کا مضمحل ہو جانا' ایسا مضمحل ہو جانا کہ نظر آ جائے کہ واقعی مضمحل ہو چکی ہیں۔ جس جس قوم میں اس تصور نے گھر کیا' اس کا پہلا نام ہی تارکِ دنیا ہے یعنی ترکِ دنیا کا نام تصوف کی بنیاد ہے۔ غاروں میں چلے جاؤ' جنگلوں میں چلے جاؤ' صحراؤں میں چلے جاؤ' گوشوں میں' خلوتوں میں' حجروں میں' زاویوں میں سمٹ جاؤ' گیان دھیان میں بیٹھے رہو۔

یہ ہے تصوف' یہ ہے ترکِ علائق' ترک ترک۔ اور اس کے بعد اگلی چیز یہ ہے کہ جو بھی مقصد پیشِ نظر ہو' اس کے لیے کسی حضرت صاحب کے ہاں چلے جائیے' ان سے دعا کرائیے' ان سے تعویذ لکھائیے اور ان سے وظیفہ پوچھیے۔ یہ کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ یہ جو ان کے وظیفے ہیں اور یہ ورد اور تعویذ ہیں' یہ ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ ہمارے لیے آپ خدا سے یہ کرا دیجیے یعنی ''کرا دیجیے''۔ خدا

اتنا قادرِ مطلق' وہ ان کے ورد و وظائف اور ان کی دعاؤں کا تابع ہو جاتا ہے' یہ اس سے جو جی میں آئے کرا سکتے ہیں (معاذ اللہ)۔ اور کیا چیز ہے جس کے لیے آپ ان لوگوں کے پاس جاتے ہیں؟ کہ جو کچھ خدا نے کرنا ہے تو وہ از خود اس نے کر دینا ہے' ان کے پاس جایئے تا کہ وہ ہماری مرضی کے مطابق کچھ کرے۔ ان کے پاس کیوں جایئے؟ اس لیے کہ یہ کرا سکتے ہیں۔ کبھی کوئی نہیں کھڑا ہو کر سوچتا کہ ہم یہ کر کیا رہے ہیں' خدائے قادرِ مطلق کو مجبور بنایا جا رہا ہے اور مجبور بھی کس کا بنایا جا رہا ہے؟ ''جی! سائیں پھوہڑ شاہ دا'' جو اپنی روٹی کے لیے دوسروں کا محتاج ہے اور بعض تو اس میں وہ ہوتے ہیں جو اپنی غلاظت نہیں دھو سکتے۔ یہ ہیں جنہیں یہ مجذوب کہتے ہیں' خدا ان کے کہنے کے مطابق کرتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ (4:50) دیکھو! کس طرح سے جھوٹ بول کر اِفۡتِرَاءً عَلَی اللّٰہِ کرتے ہیں وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا (4:50) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس قوم میں یہ تصور جا گزیں ہو جائے' پھر اس قوم کی قوتِ عمل کمزور ہو جاتی ہے اور پھر وہ حضرت صاحب کی دعاؤں' ورد' وظیفوں اور نظرِ کرم کی محتاج ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کسی مقصد کے لیے یہ نہیں کہتا کہ مجھے کوئی تدبیر کرنی چاہیئے' ہمت کرنی چاہیئے' محنت کرنی چاہیئے' کسی طریقے سے اس کو حاصل کرنا چاہیے۔ نہیں' بالکل نہیں حضرت صاحب کی نظرِ کرم ہو جائے گی تو سب کچھ ہو جائے گا صاحب! جیتے ہیں تو یوں چلے جائیں گے' تہ خاک چھپ چکے ہیں تو وہ ان کے مزاروں پہ چلے جائیں گے' نذرانے لے جائیں گے' نیازیں دی جائیں گی' یہ کبھی نہیں ہوگا کہ اس کے لیے جو کچھ مجھے کرنا ہے وہ تدبیری طور پر کیا جائے۔ قوم بے عمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہے وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا (4:50)۔

## دین ایک جیتی جاگتی زندگی کا نام ہے جبکہ مذہب صرف چند حرکات و سکنات کا ہی مجموعہ ہوتا ہے

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ دین زندہ قانون' فارمولے کا نام ہے۔ آپ اس کے مطابق کرتے چلے جایئے' اس کے نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے' اس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ اس کے مطابق کرنے سے ایسا ہو جائے لیکن جب وہ چیزیں صرف ایک رسم بن کر رہ جائیں تو حرکات و سکنات تو اس قسم کی رہتی ہیں' مگر اس کا وہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک چیز کو آپ خالی رسمی حیثیت سے کیجئے' وہ کبھی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ تو اس کے اندر اس کی اصل روح ہے' وہ تو اس پورے فارمولے کا عملی اتباع ہے جس سے وہ نتیجہ پیدا ہوگا۔ اور جیسا کہ میں مثال میں کہا کرتا ہوں کہ آرمی کے اندر جو ایک سولجر (سپاہی) ہے' اس کی صبح سے شام تک ہر نقل و حرکت اسے ایک نتیجہ پیدا کرنے کی طرف لے جاتی ہے حتیٰ کہ اس کے ڈسپلن میں بوٹ کے تسموں کا خاص طریق سے باندھنا بھی ایک ضروری چیز ہو جاتی ہے' اس کی جتنی بھی مجموعی نقل و حرکت ہوتی ہے' اس کا ایک زندہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہی سپاہی آرمی سے الگ ہو کر اپنے گاؤں میں آ جائے اور صبح اٹھ کر اپنی وردی بھی اسی طرح سے پہن لے' بندوق کا لائسنس بھی ہے تو وہ بھی پاس رکھ لے' ورنہ ایک ڈنڈا ہی لے لے' اور اس

گلی کے اندر اسی پابندی کے ساتھ لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتا پھرے جس پابندی سے وہ وہاں اپنی فوج میں کر رہا تھا تو کیا یہ چیز کوئی نتیجہ پیدا کرے گی؟ نہیں' اب یہ جو کچھ کر رہا ہے رسماً کر رہا ہے۔ دین میں یہ ساری نقل و حرکت فوج کے ایک سپاہی کی نقل و حرکت ہوتی ہے' دین جب مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے تو نقل و حرکت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں سے فوجیت نکل جاتی ہے' دین انفرادی چیز رہ جاتا ہے۔

## ہمارے ہاں ''ثواب کے معنی ثواب'' کے علاوہ کوئی عملی محسوس شکل پیش نہیں کرتے حج اور اسرائیل کی مثال

یہ جتنی چیزیں ہیں اس کے بعد یہ آپ کے ہاں شریعت بن جاتی ہیں' نتیجہ کوئی پیدا نہیں کرتیں' یہ فریب دیدیا جاتا ہے کہ صاحب! ان چیزوں کا ثواب ہوتا ہے۔ ثواب کیا ہوتا ہے' کیا چیز ہے جسے ثواب کہتے ہیں؟ یہ کوئی نہیں سمجھا سکے گا صاحب! ہوتا ہے کچھ۔ بھئی! اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ کہ جی! اگلی دنیا میں جا کر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ثواب الدنیا(3:145;3:148;4:134) کہا ہے کہ اس دنیا میں کچھ ہوتا ہے' اس کے نتائج یہاں اسی دنیا میں نکلتے ہیں۔ یہ چیزیں جب رسم بن جاتی ہیں تو پھر ان رسموں کے ساتھ چپکائے رکھنے کے لیے یہ سارے عقائد وضع کیے جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آپ دیکھیے! اتنی تعداد میں ہماری قوم' جنہیں آپ نماز روزہ حج زکوٰۃ شریعت کے احکام کہتے ہیں' گو کم ہی سہی لیکن اس کے باوجود بڑی تعداد ان پر آج بھی کاربند ہے۔ ابھی ابھی رمضان شریف آئے گا تو آپ دیکھیں گے کہ کس عقیدت مندی سے مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں بھی روزے رکھے جاتے ہیں۔ مزدور غریب فاقوں سے ہوتے ہیں' پھر بھی یہ کچھ وہ کرتے ہیں' آدھی آدھی رات تک کھڑے ہوئے قرآن مجید بھی سنتے ہیں۔ یہ کتنی مشقت طلب چیز ہے! لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انسان یہ کچھ کرتے ہیں۔ اب بھی آپ کے ہاں صدقات خیرات زکوٰۃ کے جو پیسے نکلتے ہیں' ذرا اس رقم کو جمع کیجئے' ایک حج میں جو آپ کے ہاں اجتماع ہوتا ہے' غور کیجئے' اس میں ساری دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ دس بارہ چودہ لاکھ ❶ کی تعداد میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے تو ایک طرف رکھیے' اس میں جو محنت صرف ہوتی ہے' اس کے بعد کیا کوئی نتیجہ نکلتا ہے؟

جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ جتنی آپ کی نفری حج کے میدان میں جمع ہوتی ہے' اسرائیل کے جوانوں کی جو تعداد یا آبادی ہے' وہ اس کی آدھی بھی نہیں۔ وہ آپ کے سینے میں خنجر گھونپے ہوئے بیٹھا ہے' علی الرغم آپ کی اتنی سلطنتوں کے اندر' وہیں اس کے پڑوس میں ہر سال یہ اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں آپ کیا کرتے ہیں؟ یہ سب کچھ کرنے کے بعد گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں یا اللہ! اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں' روتے ہیں' چلاتے ہیں۔ آپ کی ساری دنیا رو رہی ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! دس بارہ لاکھ ❶ کا مجمع اور اس طرح پاکیزگیٔ خیال سے' وہاں جا کر جمع ہو جائے اور اس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہو کہ رو رہے ہیں۔ یہ کیا ہوا؟

---

❶ یاد رہے یہ بات ستمبر 1970ء کی 20 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے اور ہر سال بڑھ رہی ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل ' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں ' تُو باقی نہیں ہے
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

## دین اور مذہب میں فرق محسوس نتائج ہی کا ہوتا ہے

جتنے بھی دین کے احکام' پروگرام' ارکان ہیں' یہ جب مذہب میں آتے ہیں تو رسومات بن جاتے ہیں۔قرآن کریم نے اسے جبْتِ ❶ (4:51) کہا ہے۔اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ (4:51) اب ان کی حالت پہ ذرا غور کیجیے کہ ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ (4:51) ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس قسم کی رسومات ہی کو انہوں نے اصل دین سمجھ لیا ہے' اس سے بڑے خلوص سے چپکے ہوئے ہیں' ان پہ ایمان لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ان کی کیفیت یہ ہے۔ یہ تو ہو گیا حصہ ان عقائد یا عبادات کا' اسے الگ کیا جاتا ہے' اب رہی معاملات کی دنیا' تو معاملات کی دنیا میں خدا کے قوانین کے ماتحت وہ فیصلے نہیں دیں گے' وہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلیں گے یا تو خود ہی فیصلہ کر لیں گے یا اگر حکومتیں ہیں تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ دیں گے۔قدامت پرستی ہے تو کسی پہلے دور کے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ دیں گے' جدت پسندی ہے تو آج کے دور کی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے ہیں ان کے مطابق فیصلہ کریں گے۔بہر حال انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جن کے تابع یہ چلتے ہیں۔دین میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے' حقِ حکومت اسی کو حاصل ہے' کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

## قرآنی احکام کو عملی شکل دینے کے برعکس انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی طاغوت کی حکمرانی کہلاتی ہے

جیسا بھی نظامِ حکومت آپ کے ہاں بنے گا' وہ اس کے دیئے ہوئے قوانین کو نافذ کرے گا' اس کے دیئے ہوئے اصولوں کی

---

❶ جِبت ہر بے حقیقت اور بے معنی چیز۔توہم پرستیاں' رسومات جن میں روح باقی نہ رہے۔جو اندر سے کھوکھلی (مُجَوَّف) ہو چکی ہوں۔جو قوم بھی خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا ''معبود' بنا لیتی ہے۔(پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔413)

روشنی میں' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' عملی تدبیریں کرے گا' پروگرام نافذ کرے گا' اس کی تفصیلی جزئیات متعین کرے گا۔ بس اس حد تک آپ کے ہاں یہ حکومت کے فرائض ہوتے ہیں۔ جو قانون بنانا ہے یہ کسی کے اختیار میں نہیں دیا گیا تھا۔اس کو کہتے ہیں اسلامی حکومت' نظامِ خداوندی کہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے فیصلوں کا محکوم نہیں ہوتا لیکن جب یہ شکل نہ رہے تو غیرِ خداوندی کسے باشد' اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں طاغوت کہتے ہیں۔اللہ کے مقابلے میں جسے آپ غیراللہ کہتے ہیں' وہ کوئی بھی ہو' اسے قرآن کریم طاغوت کہتا ہے۔اور یہ جو آپ کے ہاں کفراور ایمان ہے' وہ ہے ہی یہ چیز' ہر غیراللہ طاقت کی محکومیت سے انکاراور صرف ایک خدا کی محکومیت کا اقرار۔کہا ہے کہ **فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَا انۡفِصَامَ لَہَا** (2:256) جس نے طاغوت سے انکار کیا' خدا پر ایمان لایا اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا' تو یہ وہ ہے جس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔

## پہلا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا یہی عملی مفہوم اور یہی اس کی عملی تفسیر ہے

آپ نے دیکھا کہ یہاں اللہ اور طاغوت کو ایک دوسرے کی ضد میں رکھا گیا ہے یعنی طاغوت سے انکار خدا کا اقرار۔اور یہی ہے جسے اختصار کی غرض سے اس کلمہ کے اندر رکھ دیا گیا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ' اللہ کے سوا ہر الٰہ کی نفی ہے' اس کی محکومیت نہیں اختیار کی جاسکتی' اسے طاغوت کہتے ہیں۔کہا یہ ہے کہ **اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَ الطَّاغُوۡتِ** (4:51) ذرا ان کی حالت پہ غور کیجیے جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔ان کی یہ کیفیت ہے کہ رسومات کو ہی انہوں نے اصل دین سمجھ لیا۔اس طرح عقائد اور عبادات کی دنیا میں محض رسوم باقی رہ جاتی ہیں' معاملات کی دنیا میں غیرِ خداوندی قوتوں کے فیصلوں کی اطاعت کی جاتی ہے' خواہ وہ کسی انسان کے بنائے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔**وَ یَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہٰۤؤُلَآءِ اَہۡدٰی مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِیۡلًا** (4:51) اور اس کے بعد ضد کا عالم یہ ہے کہ یہ جتنے لوگ اس قرآنی نظام سے انکار کرتے ہیں' وہ ان قرآن کریم پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں یہ کافر بہت اچھے ہیں' یہ زیادہ سیدھی راہ پر ہیں جو اس طاغوتی نظام کے پیرو ہیں۔یہ خود مخالفت کرتے ہیں اور اپنے میلانات اور اپنی دوستی کے تعلقات ان لوگوں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں جو اس نظام کے دشمن ہوتے ہیں حالانکہ تم ان اہلِ کتاب کو' کفار پر ترجیح دیتے ہو۔

## قرآنِ حکیم کے وسیع تر مفہوم کی بجائے ہمارے ہاں لعنت کے لفظ کا محدود تصور

آگے کہا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ مَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا** (4:52) ۔اس کا عام ترجمہ تو ہمارے ہاں

یہ کیا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور جن پر اللہ کی لعنت ہو تو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ بس لعنت کا جو ہمارے ہاں لفظ آ گیا تو پھر ہر قسم کی گالیاں دینے کے لیے ان کو سند حاصل ہوگئی کہ صاحب! آپ کیوں دوسروں کو لعن طعن کرتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے اللہ لعنتیں بھیجتا ہے' میں کیوں نہ بھیجوں یعنی سنت اللہ کی پیروی ہو رہی ہے حالانکہ عربی زبان کی رو سے "لَعن" کے معنی ہوتے ہیں "کسی خوشگواری سے محروم رہ جانا"۔ یہ لوگ جو صحیح راستے سے دوسری طرف چلے جاتے ہیں' اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں' تو خدا کا تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا' یہ اس نظام کے جو انسانیت ساز نتائج نکلنے ہیں' ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جو اس طرح اس نظام کے نتائج سے محروم رہ جائے' تو پھر دنیا میں کون ہے جو اسکی مدد کرے؟ کوئی بھی نہیں۔

## دنیا بھر میں مسلمان سلطنتوں کی محرومی کی حالت اور باہمی نفرتوں کا نتیجہ

عزیزانِ من! ہم دیکھ رہے ہیں کہ کون مدد کر رہا ہے؟ بھیک کے ٹکڑے تو جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ دنیا بھر کی مسلمانوں کی سلطنتوں کو آپ دیکھ لیجئے' اس بھیک کے ٹکڑے جھولی میں ڈالنے کو مدد کہتے ہیں۔ دوستی کی حیثیت سے کہاں آپ کو مدد ملتی ہے؟ کہیں سے بھی نہیں۔ کہا ہے کہ اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا(4:53) یہ تو غنیمت ہے کہ اُنہیں ملک میں اقتدار حاصل نہیں' ورنہ یہ لوگوں کو تل کے برابر بھی کوئی شے نہ دیتے۔ اس لیے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کر کے' اپنے آپ کو جو ان نتائج' اِن خوشگواریوں سے' محروم کیا ہے' دنیا میں کوئی بھی ان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ خود تو اس نظام کو چھوڑا' اس قانون کو چھوڑا' اس راستے کو چھوڑا' اس سے محروم رہ گئے۔ اب جو اس راستے پہ چل رہے ہیں' اس کے نتائج سے ان کی جھولیاں بھر رہی ہیں۔ انہوں نے فصل بوئی تھی' وہ کاٹ کر لا رہے ہیں لیکن ان کی حالت اس کے بعد کیا ہے؟ اس کے لیے یہ کہا ہے کہ اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ (4:54) اب یہ ان سے حسد کرتے ہیں کہ ان جماعتِ مومنین کو یہ کیوں مل گیا۔ کبڑا چاہتا ہی یہ ہے کہ ساری دنیا کبڑی ہو جائے۔ یہ حسد ہے کہ انہیں یہ کچھ کیوں مل گیا۔ بھئی! یہ سب کسی رعایت سے نہیں ملا ہے۔ انہوں نے اس صحیح طریقے کو Follow (تسلیم کر کے عمل) کیا' اس کا نتیجہ ان کو مل رہا ہے' تم بھی یہ کچھ کرتے' تمہیں بھی مل جاتا۔ کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ان لوگوں کے حصے میں آ گئی ہے۔ یہ کیا چیزیں تھیں جو انہیں مل گئیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ آخرت ہی کے سارے انعامات ہیں جو اسلام کے اتباع سے ملتے ہیں یعنی مذہب کے اتباع سے ملتے ہیں وہ تو ٹھیک ہے۔ دیکھیے قرآن کریم کیا گنا تا ہے کہ یہ جو نئی بات تھی کہ ان کو مل گئی تو فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ اٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا (4:54) آلِ ابراہیمؑ کو دیکھیے! اس سے پیشتر وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقے پہ چلے' خدا کی طرف سے ان کو

ضوابطِ قوانین ملے' کتاب ملی' حکمت ملی' عقل ودانش' فکروبصیرت' دلیل وبرہان' یہ چیزیں بھی ان کو ساتھ ملیں۔قوانین ملے اوران کی علت اورحکمت اورغایت اورمصلحت' یہ ساری چیزیں' سمجھنے کی صلاحیتیں' عطا ہوئیں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں اوران کی اقوام کا ذکرآ رہا ہے تو کیا چیزیں ہیں جو بطورِنعمت کہی جا رہی ہیں کہ ان کو ملی تھیں۔خدا کی طرف سے ضابطۂ قانون' اس کے لیے سمجھ بوجھ' عقل وفکرعطا ہوا وَ اٰتَیۡنٰهُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا (4:54) اوراس کے ساتھ بہت بڑی مملکت ان کو ملی تھی۔یہ ہیں وہ انعامات جوخدا گنا رہا ہے۔یہ دین کے طریقے پہ چلنے کا نتیجہ تھا۔ان سے کہو کہ قرآن کریم تو ملکِ عظیم بھی کہتا ہے' تو یہ کہتے ہیں کہ وہ جنت کی بادشاہی ہے جی! ''یعنی ایتھے جوتیاں ای کھاندے رہو'' (یعنی یہاں جوتے ہی کھاتے رہو)۔جن پہ خدا نے کہا تھا کہ ہمارا غضب نازل ہوتا ہے ان کے متعلق کہا تھا کہ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ان میں محکومیت اورتساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہوگئیں اوراس طرح ان پرذلت وخواری کا عذابِ خداوندی مستولی ہوگیا۔یہ اس دنیا میں ہوا۔یہ تھا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا (5:33) اس دنیاوی زندگی میں ذلت اوررسوائی' خدا کا عذاب ان کے پیچھے لگ گیا' جہاں بھی گئے ذلت اوررسوائی ان کے پیچھے رہی تھی۔اس دنیا میں' یہ ملکِ عظیم تو اس دنیا کی مملکت کا نام ہے' یہ ملتی ہے۔اور فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ وَ کَفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیۡرًا (4:55) انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں' ان آلِ ابراہیمؑ میں سے ہی ہیں' یہ جوعرب اوریہ جو اہلِ کتاب جن کو یہودی کہا گیا ہے' یہ دونوں آلِ ابراہیمؑ میں سے تھے' یہ قومِ ابراہیمؑ ہی تھی۔یہ حضرتِ اسماعیلؑ کی اولاد تھی' جو حجاز میں بس گئی' وہ دوسری طرف حضرتِ اسحٰقؑ کی اولاد تھی جو بنی اسرائیل کہلائی۔کہا یہ ہے کہ ان میں سے پھر کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اس ضابطۂ قانون پرایمان لاتے ہیں' انہی میں وہ بھی ہیں جو اس سے روکتے ہیں اوررکتے ہیں' اس پرایمان نہیں لاتے۔وَ کَفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیۡرًا (4:55) یہ جو روکتے یا رکتے ہیں وہ ایمان نہیں لانے والے ہیں' ان کے لیے وہ عذاب ہے جو ان کے اس تمام کاروبار کو راکھ کا ڈھیر بنا کررکھ دے گا۔

## دنیا میں زیادہ خسارے میں وہ قوم ہوتی ہے جن کے اعمال رائیگاں چلے جائیں' یہ دنیا میں بھی ہوتا ہے: مدینے میں یہودیوں کی مثال

قانونِ شریعت کی رسومات کی رو سے یہ جتنی پابندیاں ہیں' آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں کتنی محنت درکار ہے لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ راکھ کا ڈھیر ہوکررہ جاتی ہیں' کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔یہ ہے عذاب جو ایسی قوم کے اوپر نازل ہوتا ہے۔آگے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡهِمۡ نَارًا (4:56) یہ لوگ جو ہمارے اس صحیح قانون سے' صحیح ضابطے سے' انکار کرتے ہیں' اس

سے سرکشی برتتے ہیں' مخالفت کرتے ہیں' کفر صرف انکار کا نام نہیں ہے' سرکشی اختیار کرنے کا بھی نام ہے' مخالفت کرنے کا بھی نام ہے' وہ جو کچھ کرتے ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ سَوۡفَ نُصۡلِيۡهِمۡ (4:56)۔اب دیکھیے! یہ "سوف" عربی زبان کا لفظ ہے کہ عنقریب تم دیکھو گے کہ کس طرح یہ جہنم میں ڈالے جاتے ہیں۔عزیزانِ من! ظاہر ہے کہ یہ چیزیں تو قیامت تک اٹھا لینے کی نہیں ہیں۔ یہ "سَوۡفَ" کیا چیز ہے؟ اس کے لیے سُنیے! یہ نظام مدینے میں جا کر قائم ہو رہا ہے۔اس نظام کے ابتدائی ایام کی کشمکش ہے' ٹکراؤ ہے' تصادم ہے۔اب ان کے پاس جتھہ ہے' ان کے پاس دولت ہے' وہ Established (مستحکم ومضبوط) ہیں' یہ ابھی بیچارے مہاجر ہیں' نو وارد ہیں۔

اس کشمکش میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ جو ان کے پاس ہے' اس کے باوجود تم عنقریب دیکھو گے کہ یہ کس طرح جہنم کی جھلستی ہوئی آگ میں جاتے ہیں۔یہودی چونکہ اہل کتاب تھے اس لیے سب سے پہلے انہی کو جہنم میں جانا تھا۔اب دیکھیے! وہاں ان کا انجام کیا ہوا؟ مدینے میں ان کی بڑی شان وشوکت تھی' یہ سارے Finances (اقتصادیات) کنٹرول کرتے تھے' اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔چند ہی دنوں کے بعد سب سے پہلے انہیں مدینے سے نکلنا پڑا' خیبر میں پناہ لینی پڑی' اس کے بعد پہلے ہی حملے کے اندر خیبر سے بھی ان کو نکلنا پڑا اور اس کے بعد جزیرۃ العرب سے ان کو خارج ہونا پڑا۔ان کی یہ کیفیت ہوگئی' تباہیاں ہوگئیں۔قرآن کریم کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ تم نے تو ان کے کچھ قلعے اور مکان ڈھائے تھے' یہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر کے بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بھاگ رہے تھے نہایت ذلت کی زندگی سے۔قرآن حمید نے اسے جہنم قرار دیا ہے۔کہا ہے کہ عنقریب دیکھو گے کہ یہ جہنم کے اندر پھونکے جائیں گے۔اور اس نے آگے بتایا ہے کہ كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا (4:56) خدا بڑا غلبے والا ہے لیکن اس کا غلبہ دھاندلی کا نہیں ہے' حکمت پر مبنی ہے' قاعدے قانون پر مبنی ہے' عدل پر مبنی ہے۔عنقریب تم دیکھو گے کہ وہ اس جہنم میں جائیں گے۔

## قرآنِ حکیم میں استعمال ہونے والی چند ایک اصطلاحات کا غور طلب مفہوم اور ان کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! اب آگے یہ جو چیزیں ہیں' یہ قرآن حکیم کی اصطلاحات ہیں' یہ بڑے غور سے سمجھنے کے قابل ہیں۔اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ وہاں ان کی کھالیں پک جائیں گی' تو ان کی جگہ دوسری کھالیں ان کو دی دی جائیں گی تاکہ وہ عذاب کا مزا چکھیں۔اب اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے' وہاں جب ان کی اوپر کی کھال جل جائے گی تو پھر دوسری کھال ان کے اوپر چڑھا دی جائے گی' پھر وہ جلے گی' پھر اور کھال ان کے اوپر منڈھ دی جائے گی۔میں نے یہ عرض کیا ہے کہ یہ قرآن کریم عربی مبین میں

نازل ہوا ہے' تو عربی سے پوچھو کہ ان الفاظ اور ان اصطلاحات کے معنی کیا ہیں؟

ہر زبان میں الفاظ کے معنی ایک تو لغوی (Literal) ہوتے ہیں اور ایک مجازی (Allegorical) ہوتے ہیں۔ جب کہنے والا کہتا ہے کہ 'پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات' تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں پگھل کر پانی ہو کر نالی میں بہہ گیا۔ اس کے یہ مجازی معنی (Allegorical Meaning) ہیں' شرمساری کے معنی ہیں۔ بہادری کے لیے ہم کہتے ہیں کہ وہ تو شیر ہے صاحب! یہ جو چیزیں ہمارے ہاں پنجابی میں کہتے ہیں''ایہدی کھلڑی اچ ڈر ای کوئی نئیں ہیگا'' (اس کی کھال میں کوئی ڈر اور خوف ہی نہیں ہے)۔ وہ ڈر کھلڑی (کھال) میں کہاں ہوتا ہے۔ اب اگر ان الفاظ کے لغوی معنی لیے جائیں' پانی کے معنی پانی' اسی طرح سے لیے جائیں' یہ کھلڑی کے معنی کھال ہی لیے جائیں' شیر کے معنی وہ درندہ ہی لیے جائیں' تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے اور عربی زبان میں تو اس چیز کی بڑی بہتات تھی' ہر زبان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے' پشتو کی خصوصیت ہے کہ ان کے ہاں ہر بات کے لیے ایک بڑی برجستہ مثال ہوتی ہے۔ عربوں کی جو ساری اصطلاحات تھیں' یہ ان کے ہاں مجازی معنوں کے اندر استعمال ہوتی تھیں۔ جلد کے معنی کھال ہی نہیں ہوتی تھی' وہ پورے کا پورا انسان مراد لیتے تھے' کسی کی قوت مراد لیتے تھے' کسی کی شان و شوکت مراد لیتے تھے' اس کی شخصیت کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔

قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ اس کے بعد ایسا ہوگا کہ ایک مقام پہ ان کو شکست ہوگی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اتنے میں ہی ان کا خاتمہ ہو جائے گا' یہ پھر دوبارہ قوت اکٹھی کریں گے' پھر اسی طرح سے میدان میں آئیں گے' پھر ان سے ٹکراؤ ہوگا' پھر ان کو شکست دی جائے گی' پھر یہ اسی طرح سے کوشش کریں گے۔ اور اس طرح سے علی التواتر شکستوں کے بعد شکست ہوگی' پھر کہیں جا کر ان کا یہاں سے خاتمہ ہوگا۔ یہود کے ساتھ یہی ہوا تھا' قریش کے ساتھ یہی ہوا' جس جس نے بھی اس نظام کے ساتھ ٹکر لی' اس کی کیفیت یہی ہوئی تھی کہ اس ٹکراؤ کے اندر ان کو شکست ہوتی تھی وہ مزید قوت فراہم کر کے دوبارہ سامنے آتے تھے' اور پہلے سے زیادہ ان کو شکست ہوتی تھی۔ اور اس طرح سے بتدریج وہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (68:44) بتدریج' آہستہ آہستہ' رفتہ رفتہ ہم ان کو اس مقام کے اوپر لے جائیں گے۔ یہ اس طرح سے ہوا تھا۔ پہلی ہی جنگ میں' پہلے ہی میدان کے اندر' ان کو ایسی شکستیں نہیں ہو گئی تھیں کہ دوبارہ ابھر کر یہ سامنے آئے ہی نہیں' یہ بار بار آئے تھے۔

## باطل کی بار بار کی شکست انہیں تباہ و برباد کر دے گی اور حق غالب آ جائے گا

یہ ہے جو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم عنقریب دیکھو گے کہ یہ جہنم میں ہونگے لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ پہلی دفعہ جب سامنے آئیں تو یہ کیفیت ہو جائے گی۔ پہلی دفعہ ان کو شکست ہوگی' پھر یہ نئی کھالیں پہن کر دوبارہ آئیں گے' پھر وہ کاٹی جائیں گی' ادھیڑی جائیں گی پھر

یہ اسی طرح سے آئیں گے۔ **لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ** (4:56) تاکہ یہ بار بار کی شکست اور ذلت کا عذاب چکھیں۔ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا** (4:56) غلبے والا تو وہ بڑا ہے' وہ چاہے تو اس تمہاری فوجوں کے بغیر ہی ان کو وہاں کہیں پتھر کا بنا دے یا ملیا میٹ کر دے لیکن یہ تو سوال نہیں ہے۔ اس سے یہ بات کیسے ثابت ہوگی کہ حق اور صداقت کی علمبردار جماعتیں باطل کے نظام پر غالب آیا کرتی ہیں۔ اس حکمت کے لیے یہ چیز ہے کہ دنیا کے اندازوں کے مطابق ٹکراؤ ہو' اس ٹکراؤ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوگا کہ تمہیں بھی عارضی طور پر شکست ہو جائے' پھر یہ دوبارہ میدان میں آئیں اور تم تدبیری مراحل اختیار کر کے دوبارہ میدان میں آؤ۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ سب کچھ ہوگا کہ خدا کا غلبہ حکمت کے ساتھ بروئے کار آتا ہے۔

## کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے فارمولے کی صداقت پر یقینِ محکم ہونا ضروری ہے

آگے قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا** (4:57) اور اس کے مقابلے میں ''جو لوگ اس نظام کی صداقتوں پر یقین رکھیں گے'' پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں یقین ہو کہ یہ فارمولا صحیح نتیجہ پیدا کرے گا' اس کے بعد ''اس کے مطابق کام کرنا شروع کریں''۔ کتابوں کے اندر تو ہر فارمولے کے متعلق لکھا ہوا ہوتا ہے لیکن پھر اس فارمولے کے اوپر کام کرنا پڑتا ہے' جسے قرآن حکیم نے صلاحیت بخش کام کہا ہے۔ ہمارے ہاں تو اب اعمالِ صالحہ کا بھی تصور وہی آ چکا ہے جو مذہب کی دنیا والا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن سے انسانوں کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں کہ یہ کام کریں۔ اس کے بعد پھر یہاں بھی وہی **سَنُدْخِلُهُمْ** (4:57) ہے' انہیں دیکھو گے کہ کس طرح سے جنہیں ابدی باغات کہا جاتا ہے' یہ وہاں ہیں۔ یہ بھی جو چیز ہے یہ سچ مچ کا یوں درختوں بھرا باغ والی بات نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں تو یہ تھا کہ وہ وسیع و عریض صحرا میں رہنے والے تھے جہاں سینکڑوں میلوں تک چلے جاؤ تو ہری گھاس کا پتا تک نظر نہیں آتا تھا' کہیں نخلستان میں چار درخت ہوتے تھے' تو انہیں باغ کہا جاتا تھا۔ ان کے لیے ان کا سایہ' ٹھنڈا اور صاف پانی' چند درخت اور ان کے پھل بہت بڑی نعمت تھی۔ کسی قوم کو جب بتایا جائے کہ تمہارے ذہن میں نعمتوں کی جو معراج ہے' وہ ملے گا تو اس قوم کو یہی کہا گیا ہے اور ان کے لیے یہی چیز تھی' یہ ان کے لیے بہت بڑا معراج تھا۔

## حق کی بنیاد پر یقینِ محکم قوموں کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیتا ہے

آپ کو یاد ہے کہ ایک عباسی خلیفہ [1] کے ہاں ایک بدو آیا تھا' پتہ نہیں کتنے سو میل کے فاصلے سے آیا تھا' ایک گھڑی (صراحی) سر پہ

---

[1] تاریخ بتاتی ہے کہ یہ خلیفہ ہارون الرشید تھے۔

لیے ہوئے تھا اور منت ترلا (منت سماجت) کر کے وہاں رسائی حاصل کی کہ میں خلیفہ کے لیے وہ چیز لایا ہوں جو کہیں نہیں ملتی۔ اس خلیفہ نے بھی کہا کہ بھئی! آنے دو' ان درباریوں نے کہا کہ دکھا تو دو۔ کہنے لگا کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے' یہ تو انہی کے لیے لایا ہوں' وہی دیکھیں گے۔ تو وہ آئے اور انہوں نے کہا کہ دکھاؤ بھئی! یہ کیا چیز ہے؟ جب اس نے کھولا تو کہا کہ صاحب! ایک جگہ سے مجھے شفاف پانی مل گیا تھا' میں نے کہا کہ یہ میرے پینے کا نہیں' بادشاہ کے پینے کا ہے۔ جس قوم کے نزدیک شفاف پانی کی یہ کیفیت ہو' اسے انہی Terms (اصطلاحات) میں بات سمجھائی جائے گی: آبِ رواں' بہتے ہوئے چشمے' سایہ' درخت' پھل۔ کہا ہے کہ ان کو یہ چیزیں ملیں گی۔ اور وہ وہاں ہونگے اور ان کے رفقا بھی وہاں ہونگے۔ یہ تصوف کی جنت نہیں کہ تنہائیوں میں' خلوتوں میں' انفرادی طور پر ایک ایک شخص کو اپنی ذات میں ملے۔ جنت کا جہاں ذکر آیا ہے' کہا ہے کہ رفقا ساتھ ہونگے کہ دین اجتماعی شے ہے' تنہا انسان کو نہ کسی قاعدے قانون کی ضرورت ہے اور نہ دین اور وحی کی حاجت۔ غار میں بیٹھے ہوئے انسان کو کسی راستہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے رفقا ضرور اس کے ساتھ ہونگے۔ نُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا (4:57) انہیں خدا کی حفاظت اور سایۂ عاطفت نصیب ہوگا۔

## کشمیر کی وادی میں حضرت بل کی مسجد کے اندر ایک واعظ کا خوبصورت وعظ

اگر کشمیر کی وادی میں یہ کہا جائے کہ ان کو وہاں گھنے سائے ملیں گے' ٹھنڈے چشمے ہوں گے یخ بستہ پہاڑ ہوں گے اور ٹھنڈا پانی اور یہ چیزیں ہوں گی' اور وہ بیچارے سردی سے کپکپا رہے ہوں اور کانپ رہے ہوں تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ حضرت بل کی مسجد میں واعظ کو سنا۔ ساری عمر تو وہ اُن سے کہتا رہا تھا کہ نمازیں پڑھا کرو' روزے رکھا کرو' جو بھی اعمالِ صالحہ ہیں وہ کیا کرو تو تم دیکھو گے کہ وہاں اللہ میاں تمہیں بڑی بڑی رضائیاں دیں گے' موٹی موٹی تانگیاریاں (ایک انگیٹھی سی ہوتی ہے) ان کے اندر ہونگی' اس کی آگ بجھے گی نہیں' کبھی بھی نہیں بجھے گی اور اگر وہ وہاں نماز روزے کے لیے وضو کا کہے کہ سائے گھنے ہونگے' ٹھنڈا یخ بستہ سا پانی ہوگا تو وہ کپکپا اٹھیں گے' وہ کہیں گے کہ صاحب! اس اسلام سے کفر بہتر ہے۔ بات سمجھانے کی ہوتی ہے۔ نعماء ملیں گے' زندگی کی خوشگواریاں ملیں گی لیکن کس طرح سے ملیں گی؟

عزیزانِ من! اب بات آ گئی۔ سورۃ النسآء میں' شروع میں' عائلی زندگی کے متعلق قوانین آ رہے تھے' پھر احبار و رہبان کے متعلق یہ چیز کہی کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اب بات آئی نظام کی۔

## ایک اسلامی مملکت کے آئین کی بنیاد اور اس کی اساس نیز لفظ امانت کا غور طلب مفہوم

عزیزانِ من! اب اس کے بعد یہ نظام آیا۔ دیکھیے! بات تو قرآن کریم چلتے چلتے کرتا ہے لیکن ایسی اصولی چیز بتا جاتا ہے۔ آج

آپ اس تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین کی بنیادیں اور اساس کیا ہوں گی۔ اساس و بنیاد تو قرآن کریم میں ہے۔ سنیے! قرآن کریم کیا کہتا ہے اس نظام کے متعلق' اس مملکت کے متعلق! کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰـهَ یَاْمُرُكُمْ (4:58) پہلا حکم تمہیں یہ دیا جاتا ہے کہ اَنْ تُـؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (4:58) ۔اس کا ترجمہ آپ کو یہ ملے گا کہ صاحب! کوئی امانت تمہارے پاس رکھ جائے تو اس کو واپس دیدیا کرو۔ یہ بھی کچھ ٹھیک ہے۔ ساری بات یہ نہیں ہے۔ پہلے تو امانت کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ لفظ تو امن سے ہے۔ آپ کسی کو کوئی چیز دے کر پھر امن میں ہو جائیں' آپ کو اطمینان ہو جائے' کوئی کھٹکا نہ رہے کسی قسم کا۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ مملکت کے اندر اختیارات ہوتے ہیں' اقتدارات ہوتے ہیں' قوتِ نافذہ ہوتی ہے' سلطنت کا مال ان کے پاس ہوتا ہے' فوجیں ان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں یعنی ساری قوتیں' سارے اختیارات' سارے اقتدارات' اُن کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جنہیں آپ اربابِ نظم و نسق کہتے ہیں۔ پہلی چیز تو قرآن مجید نے یہ کہی کہ یاد رکھیے! یہ ان کے ذاتی نہیں ہیں' یہ امانت ہیں' Trust ہیں جو ان کے پاس دیئے گئے ہیں۔ یہ اختیار' یہ اقتدار' ہر فرد کو بھی حاصل تھا۔ کہا ہے کہ آپ لوگوں نے کیا کیا۔ اگر انفرادی طور پہ ہر شخص ان کو استعمال کرنے لگ جائے تو انارکی پھیل جائے۔ جو شخص کسی کو قتل کرے' اس کی سزا قتل ہے لیکن یہ جسے قتل کرتا ہے' وہ یا اس کے وارث' یا جو دوسرے لوگ ہیں' ان کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود استعمال کریں اور اسے قتل کر دیں۔ یہ جرم ہے۔ اِنہوں نے کیا کیا؟ اپنے اس اختیار کو جا کر عدالت یا حکومت کے ہاتھ میں دیدیا کہ آپ اسے ہماری طرف سے استعمال کریں اور اب مطمئن ہو گئے کہ جہاں ہم نے اسے استعمال کرنا تھا' اس سے صحیح تر طریقے سے یہ استعمال کریں گے۔ آپ نے اپنی کمائی میں سے جتنا اپنی ضرورت سے فاضل تھا' وہ دینا تھا' اپنے طور پہ یہ دیدینے والی بات نہیں ہے' جایئے اور اپنے اس اختیار کو کسی دوسرے کے سپرد کر آیئے جسے آپ حکومت کہتے ہیں کہ لے لیجیے صاحب! اور آپ انہیں استعمال کیجیے جس طرح سے کلی اجتماعی مفاد کا تقاضا ہو۔ آپ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ خدا نے یہ اختیارات دیئے' تم نے انفرادی طور پر اپنے اختیارات ان کو جا کر دیدیئے۔

پہلی چیز تو آپ یہ دیکھیے کہ اربابِ حکومت کے جو اختیارات ہیں ان کو قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ان کے پاس امانتیں ہیں اور یہ امانت کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے کہ جنہوں نے تمہیں یہ تفویض کیا تھا' یہ دیدینے کے بعد انہیں امن اور اطمینان ہو جائے ورنہ اپنا اختیار دینے کے بعد تو آدمی کانپتا رہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہ رہا۔ یہ فسادات' جن میں آپ کے ہاں لائسنس یافتہ اسلحہ بھی کہتے ہیں' تھانے میں جمع کرا آؤ' اس سے اطمینان یہ ہوتا ہے کہ فساد میں ڈر ہوتا ہے کہ آ کر کوئی ڈاکہ مارے گا' حملہ کر دے گا۔ یہ موجودہ نظام جسے جمہوری کہتے ہیں' اس میں بھی جو ایک ووٹ آپ کسی کو دیتے ہیں' وہ اپنا اختیار دوسرے کے سپرد کر رہے ہوتے ہیں کہ میری طرف سے تم نے وہاں یہ بات کرنی ہے۔ یہ کسے دو؟ وہ اسے دو جو واقعی تمہاری طرف سے بات کرنے کا اہل ہو۔ کتنا بڑا اصول ہے' دو لفظوں میں

بات بتادی۔اختیارات کوامانات کہااور یہ کہا کہ یہ ان کے سپرد کروجواس کے اہل ہیں۔

اگلاٹکڑا یہ ہے کہ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ (4:58) ان سے کہا گیا کہ اب لوگوں میں اختلافات ہونے ہیں' نزاعات ہونے ہیں' جھگڑنے ہونے ہیں' ان کے مفادات کاٹکراؤ ہونا ہے' جب اس قسم کی اختلافی نزاعی چیزیں تمہارے پاس آئیں تو تم ان میں فیصلہ کرو: اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ (4:58) عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔افراد سے کہا کہ تم اپنے اختیارات انہیں سونپو' ان کو تفویض کروجواس کے اہل ہیں' اُن سے کہا کہ تم ان کے معاملات کا فیصلہ عدل کے ساتھ کرو۔

## جس طرح فیصلہ سازی کے لیے عدل ایک لازمی جز ہے اسی طرح بذاتِ خود قانون کا عدل پر مبنی ہونا بھی ضروری ہے: کیا وہ قانون بھی مبنی بر عدل ہے؟

اب عدل کی Definition (تعریف) تو دنیا میں عجیب وغریب ہوگئی اور سب سے بڑا عدل تو ملک میں یہ ہوتا ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔عدالت ہوتی وہ ہے جو مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے' قانون کے مطابق فیصلہ ہو تو عدل کہا جائے گا۔ اگر اس میں کسی کی رعایت ہو جائے' کسی کے ساتھ دشمنی ہو جائے' کوئی رشوت لے لے' تو پھر اسے عدل نہیں کہتے وہ فیصلہ قانون کے مطابق نہیں رہتا۔اب اس میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ قانون کیسا ہے۔کیا وہ قانون بھی مبنی بر عدل ہے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

عزیزانِ من! دنیا نے اسی کو عدل کہا ہے کہ فیصلہ مروجہ قانون کے مطابق ہو لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ قانون تم خود پہلے بنانے کے لیے بیٹھ جاؤ اور ایک غلط قانون بنا کر نافذ کر دو' جنہوں نے فیصلہ کرنا ہے وہ تو عدل کے مطابق کریں گے لیکن یہ فیصلہ عدل پہ ہوگا ہی نہیں۔قرآن حکیم نے دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ (7:182) یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ہم ذکر کر رہے ہیں' یہ نظامِ حکومتِ الٰہیہ والے ہیں' مومنین کی جماعت ہے جو قرآن حکیم کے مطابق عدل کرتے ہیں۔یعنی عدل کو بھی آپ دیکھیے پابندی سے مستثنیٰ نہیں کیا' قرآن کریم نے بے باک نہیں ہونے دیا' عدل پہ بھی ایک پابندی لگائی ہے کہ عدل کی Definition (تعریف) یہی ہے کہ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ (7:182)۔وہ قانون اس کے مطابق بناتے ہیں اور پھر اس قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ کونسی بات رہ گئی جس سے آپ کے دستور کا اصول مرتب نہیں ہوتا۔بنیاد یہ ہے اور یہی کفر اور اسلام کے درمیان خطِ امتیاز ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔مروجہ عدل کی Definition (تعریف) کے مطابق آپ کے ہزار فیصلے ہوں' قرآن کریم عدل نہیں قرار دیتا'

قرآن کریم ایمان قرار نہیں دیتا' قرآن کریم اسے اسلام قرار نہیں دیتا' کہتا ہے کہ یہ طاغوت ہے۔

## قانون سازی کے سلسلہ میں قانون سازوں کی اہلیت کا تعین نہایت ضروری ہے

کہا یہ ہے کہ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ (7:182) اس کے مطابق قانون بناؤ' اس قانون کے مطابق فیصلے کرو' جنہوں نے فیصلے کرنے ہیں تم ایسے لوگ چنو جو یہ کچھ کرنے کے اہل ہوں مجلسِ قوانین سازان پر مشتمل ہو جو قرآن حمید کے مطابق جزوی قوانین بنانے کی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہوں' اس قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا کام انہیں سونپو جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔ عزیزانِ من! نظام کی بنیادیں آپ کے ہاں مل گئیں۔ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (4:58) یہ بڑی عمدہ بات ہے جو تم سے کہی جا رہی ہے' اس کو یونہی چھوٹی سی بات نہ سمجھنا' یہ بڑی عمدہ سی بات ہے۔ اور اس سے آگے ہے' یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہے' کیا یہ صرف Formally (رسماً) ہوگا یعنی یہ قوانین' یہ قاعدے قانون' جسے آپ رسومات کہتے ہیں' کیا اس کے مطابق پابندیاں' یہ یونہی Formally (رسماً) کیا جائے گا ؟ جب درمیان سے روح چلی جاتی ہے تو یہ چیزیں' یہ نماز روزے' آپ کے رسوم رہ جاتے ہیں' اس لحاظ سے جتنے نظام عدل ہیں' وہ بھی فقط رسوم ہی ہوتی ہیں۔ وہ تو غنیمت سمجھو کہ یہاں Formality (رسم) ہی Observe (نافذ العمل) ہو جائے لیکن بہر حال ہوتا یہی ہے۔

## قرآنی آیات کے آخر پر صفاتِ خداوندی کی اہمیت

عزیزانِ من! میں یہ کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم کی آیات کے آخر میں جو خدا کی صفات دی ہوئی ہوتی ہیں' وہ بڑی غور طلب ہوتی ہیں' ان کا اس مضمون سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے جو اس آیت میں آیا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے لیے جو بھی قوانین ساز ہیں ہم نے انہیں یہ ضابطہ یا ہدایات دیدیں' اس کے مطابق عدل کرنے والوں کے متعلق بھی یہ کہہ دیا ہے کہ وہ یہ کچھ کریں۔ اور اس کے بعد ایک اور بات ذہن میں رکھو! وہ یہ کہ ایسی بات نہ ہو کہ اگر کہیں کوئی دیکھنے سننے والا ہے تو پھر تو اس کے مطابق عمل ہو' اور جہاں تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اسے کوئی دیکھ یا سن نہیں رہا تو اُس وقت جو جی میں آئے تم کر لو۔ ایسی حکومتوں میں جہاں قانون نافذ ہوتا ہے' عدلیہ وغیرہ بھی ہوتی ہیں' پولیس بھی ہوتی ہے' وہاں قانون کی پابندی کیسے ہوتی ہے؟ اس طرح کہ اگر کوئی دیکھنے والا ہے' پھر تو قانون کی پابندی ہوگی' اور اگر یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں' اس کا کوئی شاہد یا گواہ کہیں نہیں' نہ دیکھنے والا ہے' نہ سننے والا ہے' تو بڑی بیباکی سے آپ وہ کچھ کر گزریں گے۔ یہ ساری رشوتیں' حکم عدولیاں' قانون کی خلاف ورزیاں' خواہ وہ محکموں کے اندر ہوں یا باہر کی دنیا میں ہوں' اس اطمینان کے ساتھ کی جاتی ہیں کہ بہر حال کوئی ان کو Detect (معلوم) نہیں کرے گا کیونکہ کوئی دیکھنے سننے والا نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہ سب کچھ جو ہم نے کہا ہے' یہ ٹھیک ہے' یہ ضابطے ہیں یا قاعدے ہیں یا قوانین ہیں لیکن

اس ایمان کو دل کی گہرائیوں میں لے جاؤ کہ جہاں کوئی سننے والا نہیں ہے' وہاں ایک سننے والا ہے' جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں' وہاں ایک دیکھنے والا ہے۔ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًاۢ بَصِیۡرًا (4:58)۔

## ذاتِ خداوندی کو بصیر جانے بغیر انسان کا کوئی عمل ثمر بار نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! اس بنیاد پہ دین کی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اس ایمان کے بغیر اچھے سے اچھا قانون بھی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ کیوں صاحب! ایمان کی اعمالِ صالحہ کے لیے کیا ضرورت ہے؟ اس کے بغیر عمل' عملِ صالح ہوتا ہی نہیں ہے' محض Formalities (رسومات) ہیں جو پوری ہو جائیں گی۔ پھر Formality (رسم) جو کچھ کرتی ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ ہے یقین جو اصل چیز ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن مجید کہاں تک آیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًاۢ بَصِیۡرًا (4:58) وہ سننے والا' وہ دیکھنے والا ہے۔ یہ اسی کو Accountability (جواب دہی) کہتے ہیں' جسے ہم اپنی زبان میں کسی کے سامنے حساب دینا کہتے ہیں۔

## انسانی معاشرے کی ساری بنیاد مکافاتِ عمل پر ہی استوار ہوتی ہے

یہ سمیع اور بصیر کیا ہے؟ یہ جتنے قوانین ہمارے ہاں نافذ ہوئے' ان پر ایک اور قانون ہے' وہ ہے جو کسی Formality (رسم) کا پابند نہیں ہے' اور پابند دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اس کے لیے محسوس عدالتیں نہیں' پولیس نہیں' گواہ نہیں' شاہد نہیں' تحریریں نہیں' دستاویزات نہیں۔ وہ قانون ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔ یہ قانون کہ انسان کا ہر عمل متعین نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے' جو اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے' نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے' خواہ کوئی دیکھنے سننے والا نہ ہو' کوئی گواہ' شاہد نہ ہو' کوئی عدالت نہ ہو' کوئی سپاہی نہ ہو' کوئی Detect (شناخت) کرنے والا نہ ہو' وہ اس وقت بھی یہ نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ محسوس دنیا میں' طبعی دنیا میں' وہ جس کی عام مثال میں دیا کرتا ہوں کہ کمرے کی تنہائیوں میں جہاں کوئی موجود نہیں ہے' وہاں بھی اگر آپ آگ میں اپنی انگلی ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ جلے گی' اس سے سخت تکلیف ہوگی' اس سے زخم ہوگا۔ یہ جو آپ کو سزا مل رہی ہے' یہ کتنی بڑی سزا ہے! وہ جو چھ مہینے تک کی جیل ہے وہ ایسی سزا نہیں ہوتی' جو اس طرح سے انگلی کے جل جانے سے ہوتی ہے۔ یہ عذابِ سعیر ہے۔ قرآن حمید نے جو کہا ہے کہ یہ جل جانے کا عذاب ہے' اس میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کونسی عدالت تھی جس نے یہ فیصلہ سنایا کہ ہاں پندرہ دن کے لیے اس کو ایسی تکلیف دی جائے کہ یہ راتوں کو سو نہ سکے؟ کسی عدالت نے بھی یہ فیصلہ نہیں کیا' کسی سپاہی نے بھی آپ کو آ کر پکڑا نہیں' کسی گواہ کی ضرورت نہیں پڑی' کسی دستاویز کی ضرورت نہیں پڑی حتیٰ کہ آپ کے زبانی اقرار کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ عمل کے اندر یہ نتیجہ مضمر

ہے۔یہی ہے جو کہا ہے کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (46:14) جو کرتے ہو' وہی جزا بن کر آ جاتا ہے' وہی سزا بن کر آ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل لیکن ہم محسوسات کے خوگر یہ تو جانتے ہیں کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے یہ ہوتا ہے' یہ ہمیں پتہ ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہوتی ہے' ہم اسے محسوس نہیں کرتے کہ جھوٹ بولنے سے بھی کچھ ایسا ہوتا ہے۔بس اتنی سی بات ہے اگر قانونِ مکافاتِ عمل جو ہماری طبعی زندگی پر یوں وارد ہے اور جس کا ہمیں علم واحساس ہر وقت ہوتا ہے' اگر ہمارا یہ ایمان ہو کہ ہماری انسانی زندگی پر بھی یہ قانون اسی طرح سے وارد ہوتا ہے اور اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عملِ محسوس تو ایک طرف رہا' قرآن کہتا ہے کہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں۔یہ ہے وہ ایمان جس کے متعلق کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا (4:58) جب کوئی سننے والا نہ ہو' اس وقت بھی ایک سننے والا' اور جب کوئی اور دیکھنے والا نہ ہو' اس وقت بھی ایک دیکھنے والا' اللہ' موجود ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! خدا کا سننا' خدا کا دیکھنا کے کیا معنی ہیں؟ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل وہ ہے جو تمہارے اس عمل کو اُس وقت دیکھتا ہے جب کوئی نہیں دیکھتا' اُس وقت سنتا ہے جب کوئی نہیں سن رہا ہوتا۔اب اس مملکت کے آئین اور قانون کی ہمیں بنیاد مل گئی صاحب! کہ اختیارات اور اقتدارات خدا نے ان کو تفویض کیے ہیں یعنی ان کو کہا ہے کہ ہمارے احکام کو تم نافذ کرو۔افراد نے اپنے جو ذاتی اختیارات تھے' وہ ان کے سپرد کیے۔کہا ہے کہ ان کے سپرد کرو جن کے سپرد کرنے سے تمہیں امن نصیب ہو جائے اور یہ ایسے ہوں جو اس کے اہل ہوں۔اور اُن سے کہا ہے کہ تم ہر نزاعی معاملے کا فیصلہ عدل کے ساتھ کرو اور عدل کے متعلق کہا ہے کہ عدل ان قوانین کا نام ہے جو قرآن کریم کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔اور یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہا کہ اس کی بنیاد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یہ ایمان ہے کہ جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا تو ایک دیکھنے والا ہے' جب کوئی سننے والا نہیں ہوتا تو ایک سننے والا ہے' اور یہ ریکارڈ ایسا ہے جو کبھی تلف نہیں ہو سکے گا' اس کے مطابق نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔یہ نوٹ جو میں نے رشوت میں لیے ہیں' ان پر مجسٹریٹ کے دستخط ہیں یا نہیں' یہ ایک دن پکار اٹھیں گے کہ یہ رشوت کے تھے اور اس کا جو نتیجہ ہے' وہ برآمد ہو کر رہے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے ایمان۔

اب یہ چیز ہے کہ اس کا قانون کیسے Work (کام) کرتا ہے' اس کا کیا پروگرام ہے' کیا مشینری ہے؟ یہ موضوع دوسرا ہے۔یہ قرآنِ کریم میں آتا جائے گا۔قرآن کریم کی پوری تعلیم اس محور کے گرد گردش کرتی ہے جسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں لیکن بات ہو رہی تھی اس نظام کی جو خدا کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لیے انسانی دنیا میں متشکل ہونا ہے۔پہلی چیز اس میں یہ کہی ہے۔

## خدا کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت اور پھر یہ اُولِــی الْاَمْــر کون ہوتے ہیں؟ یہ بڑا اہم موضوع ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد آگے کہا ہے کہ اس نظام کا سارا دارومدار کہ یہ کامیابی سے چلے گا' اطاعت پر ہے' اطاعت کرنی ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا(4:59)۔اس وقت میں صرف ترجمہ پیش کرونگا۔ عام جو آپ کو لکھا ہوا ملے گا وہ یہ ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو' رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے ان لوگوں کی جو صاحب امر ہوں' صاحبِ حکم ہوں' پھر اگر کسی چیز میں تمہارا تنازع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم خدا اور آخرت پہ ایمان لاؤ گے تو یہ چیز بہتر ہے' انجام کار اچھی ہے''۔ یہ ترجمہ ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے نظامِ حکومتِ خداوندی کی اصل اور بنیاد یہ ہے اور بات بڑی غور سے سمجھنے کی ہے کہ اس میں اطاعت سے کیا مفہوم ہے؟ اللہ اور رسول کی اطاعت کسے کہتے ہیں؟ اور یہ اولی الامر کون ہوتے ہیں جن کی یہ اطاعت ہوتی ہے؟ اگر کسی معاملہ میں تنازع ہوجائے' اختلاف ہوجائے تو پھر اس کو کس کی طرف لے جانا چاہیے۔ یہ جو کہا ہے کہ اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔ یہ اصطلاحات ہیں اور بڑی اہم اور بنیادی ہیں جن کے صحیح مفہوم نہ ہونے سے بہت سی الجھنیں پیدا ہوگئیں' جن کا مفہوم سامنے آنے سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ آج چونکہ وقت ہو رہا ہے اگرچہ کچھ منٹ باقی ہیں لیکن یہ بات ایسی نہیں کہ چند منٹوں میں طے ہوجائے' شاید یہ بات پورا درس لے جائے گی تو اسے ہم آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! سورۃ النسآء کی آیت 58 تک ہم آ گئے' اب 59 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

# پندرھواں باب: **سورۃ النسآء** (1)' (آیت 59: اللہ اور رسول کی اطاعت)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

عزیزانِ من ! آج ستمبر 1970ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النس آء کی آیت 59 سے ہوتا ہے:((4:59۔

یہ موضوع جواب ہمارے سامنے آتا ہے' یہ جہاں بے حد اہم ہے' اس کے ساتھ ہی اتنا ہی نازک بھی ہے اس لیے یہ بڑے ہی غور کا محتاج ہے۔ سابقہ آیات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بات Personal Laws (شخصی قوانین) سے آگے بڑھ کر اسلامی نظام کی آ رہی تھی اور اس میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ اقتدار اور اختیار' یہ حکومت کا حق' درحقیقت ایک امانت ہے' یہ ان کے سپرد کرو جو اس امانت کے اہل ہوں۔ اور اُن سے کہا گیا تھا جنہیں یہ امانت دی جائے کہ جب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو تو وہ فیصلے عدل کے ساتھ کیا کرو۔ اور عدل کی Definition (تعریف) قرآن کریم نے یہ دی تھی کہ وہ قوانین جو قرآنِ کریم کی حدود کے اندر رہ کر بنائے جائیں ان کے مطابق فیصلے کرو۔ یہ ہے اسلام کا اساسی نظام۔ اب اسی سلسلے میں اگلی کڑی ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ( (4:59۔

## اسلامی نظام کا سارا دارومدار خدا کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت اور صاحبِ امر کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے پر موقوف ہے

یہ آیہ جلیلہ اسلامی حکومت کی' اسلامی نظام کی بنیاد ہے۔ پہلے اس کا رواں ترجمہ جو عام آپ کے سامنے آئے گا' وہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں' پھر اگر کسی معاملے میں تمہیں اختلاف ہو' تنازعہ ہو' تو اسے اللہ اور رسول کی طرف Refer (منتقل) کر دو اور یہی اس چیز کی دلیل ہوگی کہ تمہیں خدا اور آخرت پر ایمان ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس سے نہایت حسین نظام قائم ہوگا۔ یہ انجام کار تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہوگا''۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ

کی اطاعت اور اس میں تیسری اطاعت ان کی آ رہی ہے جو اولی الامر ہیں۔ ان کی اطاعت کے متعلق بھی اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں رسول صاحبِ امر قرار دے' تو یہ ان کے ماتحت ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد پھر یہ دو اطاعتیں تو سامنے رہ جاتی ہیں اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے ہاں ہر ایک کی زبان پہ ہے: اللہ اور رسول کا حکم' اللہ اور رسول کی اطاعت۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام کی بنیاد ہی یہ تھی کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں

نبی اکرم ﷺ جب اس دنیا میں تشریف فرما تھے' آپ ﷺ نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی بنیاد یہ تھی کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) ۔ یہ آیت کئی بار سامنے آ گئی ہے۔ یہ اسلامی نظام کی اصل اور بنیاد ہے۔ وہ لوگ جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' فیصلے نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یعنی کافر اور مومن کی حدِ امتیاز یہی ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق حکومت قائم کی جائے' فیصلے دیئے جائیں تو یہ ایمان ہے' ایسا کرنے والے مومن ہیں اور جہاں ایسا نہ کیا جائے وہ کفر ہے۔ اب یہ ہے بنیاد: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) ۔ قرآنِ کریم میں بیشمار مقامات پر یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ جسے ہم لا الہ الا اللہ کہتے ہیں' یہ الوہیت جس کا ترجمہ ہم معبودیت کر دیتے ہیں' اس میں ''پوجنے کے لائق'' کی بات نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار ہی کے ہیں' یہ وہی حقِ حکومت کی بات ہے۔ یہ جسے ہم عبادت کہتے ہیں' عربی زبان کی رو سے اور قرآنِ کریم کی رو سے' اس کے معنی محکومیت کے ہیں' یہ جسے ہم معبود کہتے ہیں وہ حاکم ہے۔ یہاں حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن خدا تو ایک غیر مرئی حقیقت ہے' آنکھوں کے سامنے نہیں آتا' دکھائی نہیں دیتا۔ اب یہ چیز ہے کہ وہ حکومت کس طرح سے کرے گا' ہم اس کی محکومیت کس طرح سے اختیار کریں گے؟ اس کے لیے اس نے یہ کہہ دیا کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی ہم نے جو یہ کتاب نازل کی ہے' یہ ہمارا ضابطۂ قوانین ہے اگر اس کی اطاعت کی جائے تو وہ خدا کی اطاعت ہو جائے گی۔ یہ وہ ہے جسے آپ حکومت کی اطاعت کہتے ہیں' یہ حکومت کے قانون کی اطاعت ہوتی ہے۔ وہ جو اشخاص کا زمانہ تھا' جسے ہم شخصی حکومتیں یا ڈکٹیٹر کی حکومت کہتے ہیں' اس میں تو ٹھیک ہے ایک شخص کے فیصلے کی اطاعت کی جاتی تھی لیکن جہاں کہیں قانونی حکومت ہوگی تو حکومت کی اطاعت کے معنی ہونگے حکومت کے قوانین کی اطاعت۔ اسی اعتبار سے خدا کی جو اطاعت ہے' وہ ایک شخصی بادشاہ کی اطاعت کی طرح نہیں ہے کہ جس معاملے کے متعلق اس نے جو حکم دیدیا اس کی اطاعت کی۔ اس نے جو بھی احکام دینے تھے وہ قوانین کی شکل میں قرآنِ کریم کے اندر منضبط ہیں۔ اب حکومت ان کے مطابق ہے۔

## حکم اور قانون میں فرق

اصل یہ ہے کہ حکم اور قانون میں فرق یہ ہوتا ہے کہ حکم ہر آن بدلتا رہتا ہے اور یہی حکم اگر غیر متبدل ہو جائے تو وہ قانون ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک امن کی صورت ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو یہ پتہ ہے کہ فلاں معاملے کا یہ فیصلہ ہے' یہ حکم ہے' یہ قانون ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کے متعلق یہ ہوگا اور یہ بدلا نہیں جائے گا۔ تو یوں کہیے کہ خدا کے احکام جن کے متعلق اس نے یہ کہہ دیا کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی' تو غیر متبدل احکام قانون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ کبھی یہ ہو اور کبھی وہ ہو بلکہ یہ ہے کہ ''یہ ہمیشہ ہوتا ہے''۔ قانون بنتا ہی اس وقت ہے جب اس کے ساتھ Always (ہمیشہ) کی شرط ہو۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں' کہ سائنس کے اندر Law (قانون) کی Definition (تعریف) یہی ہے کہ If یعنی اگر ایسا ہو' Then تو پھر ایسا ہوگا' Always ہمیشہ ایسا ہی ہوگا❶۔ تو اس چیز کو قرآن مجید نے کہا کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) اس نے ان احکام یا خدا کے فیصلوں کو قانون کا درجہ دیدیا اور اس کے بعد جب پھر یہ آخری کتاب آ گئی تو یہ ''ہمیشہ'' کے لیے قانون بن گیا۔ تو خدا کی اطاعت' خدا کے قوانین کی اطاعت ہوگئی جو اس کتاب کے اندر ہمیشہ کے لیے منضبط اور محفوظ ہے' مکمل ہے۔ **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ** (5:3) ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کر دیا۔ وہی چیز دوسری جگہ ہے کہ یہ قوانین غیر متبدل اور محفوظ ہیں' ہمیشہ کے لیے قانون کی حیثیت لیے ہوئے ہیں۔

## قانون کی عمل داری کا طریق کار

قانون تو پھر کتاب کے اندر ہوتا ہے۔ یہ بات بھی تو سمجھ میں آنے والی' دیکھی جانے والی ہے لیکن کتاب کے الفاظ یا نقوش اور حروف اپنے آپ کو خود سے نافذ نہیں کر سکتے' قانون کو تو نافذ کیا جاتا ہے۔ ''نافذ کیا جاتا ہے'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے پھر منوایا جاتا ہے۔ ''جو مانا جاتا ہے'' والی بات ہے وہ تو مومن کی یہی صورت ہے۔ ابھی آگے ایک آیت آئے گی کہ وہ دل کی گہرائیوں سے مانا جاتا ہے۔ اس قانون کو ماننے میں' مومن اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں کرتا' وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ جیسے یہ فطرت کا قانون ہے کہ سانس لینے سے زندگی کی بقا ہے اور سانس لینا ہم کسی کے خارجی حکم کے تابع نہیں کرتے' بلکہ ہمارا اندر کا تقاضا سانس لینا ہوتا ہے' سانس نہ لیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ مومن جو قانون کی اطاعت کرتا ہے تو اس کی کیفیت ایسے ہی ہوتی ہے جیسے زندہ انسان یا ہر زندہ شے سانس لیتی ہے' اس کی اطاعت میں اسے کسی قسم کی گرانی نہیں' بلکہ گرانی کیا' اسی میں تو اس کی

---

❶ یہ ہے: Always ⟵ Then ⟵ If

زندگی کا راز مضمر ہوتا ہے لیکن معاشرے کے اندر وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو قانون کو اس طرح سے نہیں مانتے' قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ پھر ان لوگوں سے قانون کو منوایا جائے۔ منوایا جانے کے یہ معنی نہیں کہ شروع سے استبداد کیا جائے بلکہ کہا جائے کہ اگر تم نے اس مملکت کے اندر رہنا ہے تو پھر اس مملکت کے آئین وقوانین کی اطاعت تمہارے لیے ضروری ہوگی۔ اور یہ تو سیدھی سی بات ہے' یہاں تو قرآن حکیم اس کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔

## دین میں اکراہ نہیں

اب جہاں تک رضامندی کی صورت ہے' تمہارا جی چاہے اس مملکت میں رہو' نہیں جی چاہتا یہاں نہ رہو۔ اور قرآن حکیم تو یہاں تک اس معاملے میں رعایت برتتا ہے کہ اگر دشمن کا کوئی فرد تمہارے ہاں آ جائے اور پناہ چاہے تو اسے پناہ دو' پھر اسے قرآن حکیم سناؤ' کہو کہ یہ ہمارا نظام ہے' یہ ہمارے قوانین ہیں۔ وہ اس کے ماننے کے لیے تیار ہو تو تمہاری مملکت کا ایک Citizen (شہری) ہو جائے گا' اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تو اپنی حفاظت میں اس کو اس کے امن کے گھر تک پہنچا آؤ۔ گویا یہاں تک تو یہ ہو گیا کہ دین میں اکراہ نہیں ہے لیکن جب کسی نے یہ مان لیا کہ میں اس مملکت کا باشندہ بن کر رہنا چاہتا ہوں' پھر یہ چیز اس پہ نہیں چھوڑی جاتی کہ اس مملکت کے قوانین میں سے جس قانون کو وہ چاہے مانے اور جس کو چاہے نہ مانے' پھر تو اس کے قوانین کو ماننا ہی ہوگا۔ ایک کیٹگری (شِق) تو مومنین کی ہو جائے گی جن کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ قوانین یا جنہیں ہم اقدار کہتے ہیں' یعنی Life (زندگی) کی Values (اقدار) کہتے ہیں' وہ ان کی زندگی کا تقاضا بن جائیں گی۔

## قانون کے نفاذ کے لیے ایک اتھارٹی کی ضرورت لازم ہے ورنہ قرآن کریم کا نظام یا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے

بہرحال اس قسم کے افراد تو ہوتے ہی ہیں جن سے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا یہ Intentionally (ارادے سے) خلاف ورزی کرتے ہیں تو مملکت کا یہ فریضہ ہے کہ قوانین کی اطاعت کرائے۔ یہ اطاعت صرف کتاب نہیں کرا سکتی' ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہے جو ان کی اطاعت کرائے۔ یعنی اس کے ضابطۂ قانون کی رو سے محکومیت تو خدا ہی کی اختیار کی جائے گی' لیکن اس کے لیے ایک نافذ کرنے والی اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دین بنتا ہی اسی طرح سے ہے' یہ نظام نہ رہے تو دین' مذہب ہو جاتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر کسی نے کسی طرح مان لیا' کسی نے کسی طرح مانا' نہ مانا تو اس کو وعظ کہہ دیا کہ بھئی! سچ بولا کرو' جھوٹ نہ بولا کرو' بددیانتی نہ کیا کرو' رشوت نہ لیا کرو' پھر یہ کہ صاحب! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان پر چلیں' آمین۔ اور پھر رشوت لینے

والا رشوت لینے لگا' جھوٹ بولنے والا جھوٹ بولنے لگا' اور یہ کہنے والا بھی جو جی میں آئے کرنے لگا۔ یہ مذہب ہوتا ہے۔ دین یہ ہوتا ہے کہ یہ قانون ہے' پہلے سوچ لو' سمجھ لو' دیکھ لو' بھال لو' اگر اس کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے تو اس مملکت کے شہری کی حیثیت سے رہنا ہوگا اور پھر یہ اختیار نہیں ہے کہ جس قانون کو جی چاہا اسے مان لیا اور جس کو جی چاہا' نہ مانا۔ اس کے لیے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے دین کا نظام۔ خدا کی محکومیت اس کی کتاب کی شکل سے قائم رہتی ہے۔ یہ وہ چیز ہوگئی کہ جو ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' یہی لوگ ہیں کہ جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اور اس کتاب کے اندر قانون آئے تو ایک زندہ اتھارٹی ہو جو ان قوانین کی اطاعت کرائے۔

## اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کے تحت انتظامات کی نگرانی کرنے والوں (اولی الامر) کا منصب اُن کے اختیارات اور فرائض کا ذکر

اب یہ جو پہلی اتھارٹی اسلام میں آئی' یہ خود نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی: ایک نظام کی مرکزی اتھارٹی۔ مملکت وسیع ہوتی ہے' تو ایک ہی شخص ساری مملکت کے امور کے فیصلے نہیں کرتا۔ اسے اپنے افسرانِ ماتحت مقرر کرنے پڑتے ہیں' یہ میں آج کی اصطلاح میں عرض کر رہا ہوں۔ یہ جو نیچے مقرر ہوئے ہوتے ہیں انہیں أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (4:59) کہا جائے گا جن کے سپرد کچھ Administration (نظم و نسق) کے' نظام کے' انتظام کے کام کیے جائیں۔ اب یہ نظام کی شکل ہمارے سامنے آ گئی۔ سیکولر نظام میں تو زندہ اتھارٹی تک جا کر ہم رک جائیں گے' وہ آخری شکل ہوگی' اسے قانون بنانے والی پارلیمنٹ کہہ لیجیے' اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جمہوریت ہے تو اکیاون فی صد نے جو قانون پاس کر دیا' وہ آپ کی مملکت کا آخری قانون بن گیا' اس پر کوئی اور پابندی نہیں ہے۔ جو نافذ کرنے والا ہے' وہ اس قانون کو نافذ کرتا چلا جائے گا' اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر تبدیلی کرے۔ بہترین نظام جو انسان اس وقت تک سوچ سکا ہے وہ یہی ہے۔ اسلام کا نظام' قرآن حمید کا نظام یا جسے ہم دین کہتے ہیں' وہ ایک قدم آگے چلتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ نہ تو مجلسِ قانون ساز اس معاملے میں اقتدارِ مطلق (Absolute Authority) کی مالک ہے' نہ یہ نافذ کرنے والا اپنے اختیار سے کام کر سکتا ہے۔ قانون سازی کا انہیں حق نہیں ہے۔ قوانین دیئے گئے ہیں' قوانین بنانے کی حدود مقرر کی گئی ہیں' وہ ہیں تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ (4:58)۔ قانون ساز اتھارٹی آپ کے ہاں کی بھی ہے' وہ کوئی بھی آپ رکھ لیں' وہ قرآن کریم کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے' جزوی قوانین بنا سکتے ہیں۔ گویا جہاں آپ کے ہاں کی دنیا کے نظام میں جسے آپ سیکولر کہتے ہیں' وہ آخری حد تھی یا آخری اتھارٹی تھی' دین کے نظام میں وہ آخری اتھارٹی نہیں رہتی بلکہ آخری اتھارٹی خدا کی کتاب ہوتی ہے اور اسی کو خدا کے فیصلے

کہا جاتا ہے۔ اس پابندی کے تابع جو نظام رہے گا' اسے تو آپ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت کہیں گے۔ اس میں جسے آپ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کہتے ہیں وہ یہاں نہ پارلیمنٹ کو حاصل ہوتی ہے' نہ کسی ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے۔

## ''اقتدار کا سرچشمہ عوام ہے'' یہ مغرب کی نقالی ہے' قرآنی نظامِ حیات اس کی اجازت نہیں دیتا

یہ جو ہمارے ہاں بھی دیکھا دیکھی مغرب کے سلوگن (نعرے) چلتے ہیں کہ صاحب! جو اقتدار ہے وہ عوام کو حاصل ہے' یہ مغرب کی نقالی ہے' وہاں کا جو جمہوریت (Damocracy) کا ایک آئین ہے' یہ اس کی نقالی ہے۔ وہ اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک فرد کا جو حقِ اقتدار ہے وہ چھین کر کہہ دیا جائے کہ یہ عوام کو حاصل ہے۔ پھر آپ کے ہاں جمہوریت کی میشینری یہ ہوئی کہ الیکشن کے ذریعے سے عوام اپنے نمائندوں کو چنیں اور وہ پارلیمنٹ میں جا کر جو قانون بنا دیں' انہیں سمجھا جائے کہ یہ عوام کے قوانین ہیں' عوام نے جو اپنا حق ہے' جو اختیارات ہیں یا جو اقتدار ہے' اس کو Exercise (استعمال) کیا ہے۔ میں اس وقت اس میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ بجائے خویش کس قدر ناقص چیز ہے اور غلط تصور ہے کہ ایک شخص وہ ہے جس کو آپ ایک ووٹ دیدیتے ہیں' پھر وہ پانچ سال تک جو کچھ وہاں کرتا رہے' وہ یوں کہے کہ تمہارا کہا ہوا ہے یعنی خواہ وہ میری مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لیکن تمہیں سمجھنا پڑے گا کہ وہ وہاں بیٹھا ہوا تمہارا ہی ترجمان ہے۔ خیر یہ دوسری بات ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ دین کے نظام میں آخری اتھارٹی عوام کو بھی حاصل نہیں ہے' کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ وہاں اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) آخری اتھارٹی' Sovereignty (اقتدارِ مطلق) خدا ہے۔

## مذہب انسان کو فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ ''ویسے صاحب! ہے تو وہ سب کچھ اللہ کا ہی'' جبکہ دین اسے حقائق پیش کرتا ہے کہ ''اللہ کی کتاب زندہ اتھارٹی ہے''

برادرانِ عزیز! یہ کوئی ذہنی اور عقیدے کی بات نہیں ہے کہ نظری طور پہ میں نے مان لیا کہ ہاں صاحب! حقِ حکومت تو اسی کو حاصل ہے اور پھر اس کے بعد یا ہر مولوی صاحب کا فتویٰ حقِ حکومت یا ہر حکومت کا فیصلہ حقِ حکومت ہے: ''ویسے صاحب! ہے تو وہ سب کچھ اللہ کا ہی''۔ یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ جو مکانوں کے باہر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ ہے تو خدا کی ملکیت' چندروزہ میرے پاس امانت ہے اور وہ ساری عمر کے لیے جس کی ملکیت ہے وہ نہ لینے کے لیے آتا ہے' نہ یہ دینے کو تیار ہیں' خود بیچتے ہیں' اس کا کرایہ بھی وصول کرتے ہیں' رہ بھی رہے ہیں اور مرنے کے بعد وراثت میں چلا جاتا ہے۔ اور اسی طرح سے نسلاً درنسلاً چلا جا رہا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ صاحب! ہے یہ خدا کا حقیقت میں۔ یہ مذہب کا فریب ہے۔

دین ذہنی اور اعتقادی چیز نہیں ہے' دین اعتقادات کو عمل کے اندر لاتا ہے۔ وہ جب کہتا ہے کہ جو حقِ حکومت یا Sovereignty

(اقتدارِ مطلق) ہے' It belongs to Allah (وہ خدا کی مِلک ہے) تو اس کے معنی اعتقادی چیز نہیں ہے' ایک عملی چیز ہے اور وہ عملی چیز یہ ہے کہ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) بھی' اپنا اقتدار بھی' اپنے قانون کے ذریعے منواتی ہے۔ قانون خدا نے اپنی کتاب کے اندر دیدیا' جواب Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہے' وہ اس کتاب کو حاصل ہے' نہ کہ ایک فرد کو یا افراد کے گروہ کو کیونکہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) کفر اور ایمان کا حدِ امتیاز یہ ہے لیکن اس کے نافذ کرنے والی ایک اتھارٹی کی ضرورت ہے' Sovereignty (اقتدارِ مطلق) اس اتھارٹی کو بھی حاصل نہیں ہوگی' خواہ وہ آپ کی جمہوریت کی پارلیمان ہو' یا کوئی ڈکٹیٹر ہو یا ملوکیت ہو' اس کو بھی یہ حاصل نہیں ہوگی' یہ صرف اس کے نافذ کرنے کی اتھارٹی ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ نے سب سے پہلے اس مملکت کو قائم فرمایا۔

## مملکت کو قائم کرنے کا طریق اور اسکی شرطِ اول

اب یہ چیز کہ عملاً خدا کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے؟ میں نے عرض کیا کہ بیشمار آیات میں براہِ راست کہا ہے کہ حکومت خدا کی ہے' بیشمار آیات میں یہ کہا ہے کہ حکومت خدا کی کتاب کی ہے' یہ ایک ہی بات ہے۔ اب اگلی چیز یہ ہے کہ نظام کے اندر' مملکت کے اندر' خدا کی کتاب کی محکومیت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یہ انفرادی چیز تو ہے نہیں کہ اپنے اپنے طور پہ کر لی جائے گی۔ عملی شکل یہ ہوگی کہ نظام قائم کرنے والی آج کی اصطلاح میں اسے حکومت کہیے' نظام کہیے' وہ ایک نظام ہوگا۔ نظام میں تو بالآخر آپ کے لیے ایک فائنل اتھارٹی ہوگی' اس کے بغیر تو چارہ نہیں ہے۔ اس مملکت میں جو نبی اکرم ﷺ نے سب سے پہلے قائم فرمائی' جسے اسلامی نظام' اسلامی حکومت' حکومتِ خداوندی' کچھ بھی کہہ لیجیے' اس کی جو عملاً فائنل اتھارٹی تھی' اس مملکت کی فائنل اتھارٹی خود نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شرط تو اس کی یہ ہے کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (49:13) ان میں سے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے والا ہوگا' اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ سب سے زیادہ واجب العزت ہو تو حضور ﷺ کی موجودگی میں اور کون ایسا ہو سکتا تھا۔

یہ تھی وہ شکل جو اس نظام کی قائم ہوئی تھی۔ اب اس میں خود نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ چیز کہہ دی گئی کہ لوگوں کے معاملات کے اندر' ان کے آپس میں اختلافات ہونگے' نزاع ہوگا' اس کا فیصلہ قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق کرو۔ اور لوگوں سے کہا گیا کہ وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡهِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُهٗۤ اِلَی اللّٰہِ (42:10) جہاں کہیں اختلاف پیدا ہو' اس کا فیصلہ' اس کا حکم' جسے آپ آخری فیصلہ کہتے ہیں' وہ صرف خدا کی طرف سے ہوگا۔ اس آخری فیصلے کے لیے جیسے میں نے عرض کیا ہے' یہ شکل نہیں تھی کہ اپنے طور پہ ہم دونوں کا

یا میرا کوئی معاملہ کہیں ہوا' ہم نے خود ہی کچھ فیصلہ کرلیا۔ایک منضبط نظام کے اندر یہ شکل نہیں ہوتی۔وہاں آپ کو حکومت کی طرف' نظام کی طرف' نظام کے نمائندے کی طرف جانا پڑتا ہے۔اور یہ جو اس نظام کے' اس مملکت کے سب سے بڑے سربراہ خود نبی اکرمﷺ تھے ان کے متعلق قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ (5:48) اے رسول! ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی۔مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (5:48) اس سے پہلے جتنی صداقتیں' سچائیاں آئی ہیں' یہ ان کو سچ کر کے دکھادے گی' جو وعدے ان کے اندر کیے گئے ہیں ان کے اوپر یہ مُہَیۡمِنۡ ہے' وہ تمام سچائیاں جو پہلے آئی تھیں' وہ ساری ہم نے اس کے اندر دیدی ہیں۔اس کے بعد حکومتِ خداوندی کے ضابطۂ قوانین کا یہ Latest Edition (جدید ترین ایڈیشن) ہے' اب اسی کی اطاعت ہوگی۔

وہ جو کہا کرتے ہیں کہ ''تمام مذاہب میں عالمگیر سچائیاں پائی جاتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ جو اطاعت کرلے تو اسلام کہتا ہے میرا کام بن گیا'' یہ 'حدیثِ بےخبراں' ہے۔قرآن حکیم کے نازل ہونے کے بعد' اب خدا کی طرف سے دی ہوئی سچائیاں' اپنی اصلی شکل میں کسی اور جگہ موجود نہیں ہیں۔وہ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (5:48) وہ جتنی خدا کو قیامت تک کے لیے' اپنی آخری مکمل شکل کے اندر' غیر متبدل رکھی جانی مقصود تھیں' وہ اس قرآن حکیم' اس ضابطے کے اندر آ گئیں: وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ ۔اب یہ Latest Edition (جدید ترین ایڈیشن) ہے' اب یہ محفوظ ایڈیشن' پوری انسانیت کے لیے ہے۔مذاہب تو اپنی اپنی جگہ دنیا میں کتنے ہو سکتے ہیں' دین تو ایک ہی ہوسکتا ہے' کسی مملکت میں حکومت کے دو نظام نہیں چل سکتے۔اور مملکتِ خداوندی نے تو آخرالامر پوری انسانیت کو محیط ہونا ہے اس لیے خدا کی طرف سے قانون کے دو ضوابط ہو ہی نہیں سکتے' وہ تو ایک ہی ہوگا۔تو یہ ہے جو آخری ضابطہ ہے۔یہ ہے مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (5:48) اور رسول اللہﷺ سے کہا ہے کہ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (5:48) اپنے اختلافی معاملات کو لیے لوگ تیری طرف آئیں گے' تُو اس کتاب کے مطابق ان کے فیصلے کر۔یعنی اس فائنل اتھارٹی کے لیے کہا گیا کہ تیرا کام یہ ہے کہ جتنے کیسز (Cases) تمہارے پاس آئیں' ان کے فیصلے اس ضابطۂ حیات یعنی قرآنِ کریم کے مطابق کیا کرو۔وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ (5:48) اب جبکہ یہ حق کا ضابطہ تیری طرف آ گیا' تو اب تمہیں کسی کے خیالات اور جذبات کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں رہی' اسی کتاب اللہ (قرآنِ کریم) کے مطابق تم نے یہ فیصلے کیے چلے جانا ہے۔یہ تھا وہ نظام جو نبی اکرمﷺ نے قائم فرمایا۔

## قرآنی نظام کے تابع قائم کردہ مشینری کے خدوخال اور ان کے کیے گئے فیصلوں کی نوعیت

اب اس نظام کے تابع' جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' یہ تو ایک سنٹرل اتھارٹی ہوئی' یہ اس مملکت کے مرکز ہوئے' نظام میں

تو پھر افسرانِ ماتحت بھی ہوتے ہیں: وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (4:59) اور تم میں سے جنہیں کسی حد تک یہ اختیارات سونپے جائیں' افسرانِ ماتحت ہوں' ان کی بھی اس فرق کے ساتھ اطاعت کرو کہ نیچے کی عدالتوں کی اپیل اوپر کی عدالت میں جا کر ہوتی ہے لیکن مملکت میں ایک آخری عدالت ہوتی ہے' ایک آخری اتھارٹی ہوتی ہے جس کے بعد آگے اپیل نہیں ہوسکتی' یہ کہیں تو ہونی چاہیے' یہ سلسلہ لامنتہا ہو نہیں سکتا۔ کہا ہے کہ یہ جو ماتحت عدالتیں یا ماتحت حکام ہیں' یہ جنہیں اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (4:59) کہا گیا ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ (4:59) ان کے ساتھ کسی معاملے کے اندر اختلاف ہو جائے' تم اس کے کسی فیصلے سے مطمئن نہ ہو تو اس کے لیے اپیل کا حق ہم نے رکھ دیا۔ وہ اپیل کا حق کس کی طرف ہے؟ کہا ہے کہ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (4:59) تم اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ میں ابھی تک یہ دونوں لفظ استعمال کیے جا رہا ہوں۔ یعنی یہ جو اس سٹیٹ کی' اس مملکت کی فائنل اتھارٹی ہے' اس نظام کی ماتحت عدالتیں یا افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف اس فائنل اتھارٹی کی طرف اپیل کی جاسکتی ہے۔ اور جب یہ اس اتھارٹی کو فائنل کہیں گے تو اس کے بعد تو پھر کہیں اپیل نہیں کی جا سکے گی۔

## مملکت کے فیصلوں کے سلسلہ میں اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم یا اس کی نوعیت

یہ آخری اتھارٹی جو ہمارے ہاں ہوئی' اس کے لیے قرآنِ کریم نے 'اللہ اور رسول' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ مختلف مقامات میں قرآنِ کریم نے 'اللہ اور رسول' کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس کے لیے جو ضمیر (Pronoun) استعمال کی ہے' وہ واحد استعمال کی ہے' دو نہیں حالانکہ عربی زبان میں دو کے لیے الگ ہوتا ہے اور جمع کے لیے الگ ہوتا ہے۔ واحد کے لیے ایک ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ قرآن کریم نے ایک چیز کہا ہے۔ جیسے جب آپ حکومت کہیں گے تو حکومت کے اندر تو آپ دیکھتے ہیں کہ اوپر سے نیچے تک کتنے افسر شامل ہوتے ہیں' President (صدر) سے لے کر نیچے تک سینکڑوں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ کہا یہی جاتا ہے کہ حکومت کا فیصلہ یہ ہے' اس معاملے میں حکومت کی طرف رجوع کرو۔ نظام ہمیشہ ایک یونٹ ہوتا ہے' قرآنِ کریم نے بھی یہ الفاظ استعمال کر کے جہاں جہاں ضمیر لانے کی یا Verb لانے کی یا فعل لانے کی' ضرورت پڑی ہے تو عربی زبان میں جو فعل ہوتا ہے' فاعل کے ماتحت' اس کے اوپر بھی اثر پڑتا ہے' ایک کے لیے اور انداز ہوتا ہے' دو کے لیے علیحدہ ہوتا ہے' جمع کے لیے اور ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے ہمیشہ واحد کے صیغے میں بیان کیا ہے لہٰذا نظر آتا ہے کہ یہ دو چیزیں نہیں تھیں اور جب رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا گیا کہ تیری طرف جب یہ لوگ اپنے معاملات لائیں تو تُو کتاب اللہ کے مطابق ان میں فیصلے کیا کر۔ تو فیصلے کا جو حق ہے' وہ تو کتاب اللہ کو دیا' اس کے مطابق فیصلہ کرنے والی جو اتھارٹی ہے وہ رسول کو قرآنِ کریم نے متعین فرمایا۔

## نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد نظام کے قیام کے سلسلہ میں اٹھنے والا سوال

یہاں تک بات بالکل واضح ہے کہ ایک نظام ہے جس میں خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے کرانے کے لیے' اس مملکت کے نظام میں سب سے پہلے افسرانِ ماتحت کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اگر آپ ان کے فیصلے سے مطمئن نہیں تو Highest Authority (اعلیٰ ترین حاکمِ مجاز) کی طرف آپ اپیل کر سکتے ہیں اور مملکت کی Highest Authority (اعلیٰ ترین حاکمِ مجاز) خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہیں لیکن قرآن حمید نے یہ بتانے کے لیے کہ یہ اطاعت یا یہ محکومیت' اس رسول کی بھی نہیں ہے کیونکہ کہا یہ گیا تھا کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے اس لیے ساتھ یہ چیز کہی کہ وہ اطاعت خدا کی اطاعت ہے جو اس رسول کی وساطت سے کی جائے گی' جو اس کی حکومت کا سب سے بڑا اختیارِ اعلیٰ رکھنے والا ہے۔ یہ ہے وہ چیز کہ اکیلے خدا کی اطاعت کی جائے گی تو بات Concrete (محسوس) طور پہ سمجھ میں نہیں آئے گی کہ وہ اطاعت کیسے کی جائے۔ اپنے اپنے طور پہ اطاعت کرنے سے وہ مذہب بن جائے گا' تنہا اگر رسول کے متعلق کہا جائے گا تو اس میں پھر خدا نکل جاتا ہے' فائنل اتھارٹی رہ جاتی ہے۔ اور رسول کی کتنی بھی عمر کیوں نہ ہو' بہرحال اس دنیا سے تو اس نے چلے جانا ہے تو پھر کیا ہو؟ کیا اس کے بعد یہ نظام ختم ہو جائے گا؟ اس لیے ہر جگہ خدا نے یہ تصور بالکل واضح کیا کہ محکومیت تو خدا کی اختیار کی جائے گی' اس محکومیت کی شکل یہ ہوگی کہ خدا کی محکومیت' خدا کی کتاب کے مطابق ہوگی ' جسے عملاً اس کا یہ رسول اس مملکت میں نافذ کر رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں۔ اس وقت پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا شکل ہوگی۔

## مذہب کی شکل میں کسی مذہبی شخصیت کی زندگی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال

یہاں یہ تصور تھا کہ یہ تو رسول ہی تھا' یہی شخصیت تھی جس کے ساتھ یہ مذہب قائم تھا۔ مذہب کی دنیا میں تو مذہبی شخصیت ہی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ شخصیت جب دنیا میں نہیں رہتی تو اس کے بعد آپ کو یہ جو اس کے نشانات ہیں' یہ حضرت صاحب کے مقبرے اور یہ گنبدیں ہیں اور پھر یہ ان کے کوئی نشانِ پا ہیں اور یہ ان کی ساری چیزیں ہیں' آپ ان کے یہ Symbols (شعائر) قائم کرتے ہیں کیونکہ ان کی ذات کو آپ نے اپنے ذہن میں ایک اتھارٹی تصور کر لیا تھا' اب اور کچھ نہیں ہے تو ان کا یہی کچھ سہی۔

## حضور ﷺ کے بعد دین کے مرکزی نظام کو قائم رکھنے کے مسئلہ کا حل اور حضرت ابوبکرؓ کا اہم خطاب

لیکن یہ تو دین کا نظام تھا' نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن مجید نے یہ کہہ دیا۔ یہ (3:143) نظامِ اسلامی کے مختلف عناصر اور عناصرِ

ترکیبی کے سمجھنے کے لیے بڑی اہم آیت ہے۔ پھر دہرا دوں' میں نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ بڑا اہم بھی ہے اور نازک بھی ہے۔ نزاکت اس کی اب آتی ہے۔ خدا کی محکومیت اس کی کتاب کے توسط سے ہے' جسے عملاً یہ نظام نافذ کرے گا' جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں نبی اکرم ﷺ تھے۔ یہاں تک بات صاف ہے۔ الجھاؤ حضور ﷺ کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی لیے حضور ﷺ کی زندگی میں یہ چیز کہہ دی کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:144) محمد ﷺ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کا ایک رسول ہے' اس کا پیغامبر ہے' اس سے پہلے بھی خدا کے رسول آتے رہے' اپنے اپنے وقت پہ اپنا مشن پورا کر کے یہاں سے چلے جاتے رہے۔ آگے کہا ہے کہ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (3:144) کیا کل کو اگر یہ فوت ہو جائے یا قتل کر دیا جائے تو اس کے بعد تم یہ سمجھ لو گے کہ صاحب! یہ جو دین تھا' یہ تو اس شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا' وہ دنیا میں باقی نہیں رہی' اس لیے وہ دین بھی باقی نہیں رہا تو کیا اس کے بعد تم پھر اپنے ہاں' وہی جو پرانے نظام ہیں' اُنہیں نافذ کر لو گے؟ کیا پھر اپنی روشِ کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا (3:144) یاد رکھو! جو ایسا کرے گا' وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا' وہ اپنا ہی نقصان کرے گا' خدا کا تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

یہ تو دنیاوی حکومتوں کی بات ہوتی ہے کہ اگر یہ رعایا باغی ہو جائے' تو اس کی حکومت باقی نہیں رہتی۔ کہا ہے کہ ہماری حکومت تو تمہاری محتاج نہیں ہے اس لیے اگر تم پلٹ جاؤ گے کہ اب وہ نظام باقی نہیں رہا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ہی کچھ نقصان اٹھاؤ گے' خدا کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ بات بڑی اہم کہہ دی ہے۔ انسان کی بے بسی بھی عجیب چیز ہے اس کے لیے دیکھیے کہ ''آ اِنی کو جنّی مکھی وخت پا چھڈ دی اے'' (یہ چھوٹی سی مکھی مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے)۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کے جو دست پروردگان رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے' وہ اس نظام کو کیسے سمجھے تھے۔ اس آیت کی صحیح تفسیر بھی اس وقت سامنے آتی ہے۔ تاریخ میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد' یہ جسے کہتے ہیں کہ ابھی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی' ضمناً یہ بات سامنے آ گئی جو وہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! حضور ﷺ کی ابھی لاش مبارک بھی باہر پڑی ہوئی تھی اور ان لوگوں کو خلافت کی پڑ گئی' یہ جا کر اپنے لیے طے کرنے لگ گئے کہ خلیفہ کون ہوگا' انہوں نے اتنا بھی نہیں کیا کہ پہلے ان کو دفن کیا جائے۔

یہیں سے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ لوگ کس طرح دین کی حقیقت سے واقف تھے اور اگر وہ واقف نہ ہوتے تو اور کون واقف ہوتا۔ انہیں پتہ تھا کہ دین کا نظام ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ اتھارٹی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ جہاں کوئی اختلاف ہوا اس کا فیصلہ اس اتھارٹی نے کرنا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کے دمِ واپسیں کے بعد سب سے پہلا کام امت کے لیے یہ تھا کہ وہ طے کرے کہ یہ نظام آگے کیسے چلے گا۔ اسے آپ کے ہاں خلافت کا انتخاب کہتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت کا عملی ثبوت مل گیا کہ یہ خلیفہ کا انتخاب کرنے کے بعد آئے

تو پہلے ہی یہ بات سامنے آ گئی کہ حضورﷺ کو کہاں دفن کیا جائے اور اس میں آپس میں اختلافات ہو گئے۔ اب اگر یہ اختلاف مٹانے والی اتھارٹی پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی' تو اسی اختلاف پہ آپ دیکھتے بات کہاں تک چلتی۔

عزیزانِ من! آپ نے اپنی' روزمرہ زندگی میں دیکھا ہے کہ جنازے کے بعد جب وہ اختلاف مٹانے والی اتھارٹی نہیں ہوتی تو جمہوریت کیا ناچ نچایا کرتی ہے اور مردے کو دفن کرنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے کہ قبر دو بالشت کم ہے' چوڑی کم ہے' گہری زیادہ ہے' اینٹیں نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سرکنڈا ڈالو' وہ کہتا ہے کہ تختے ڈالو' وہ کہتا ہے کہ یہ خلافِ شریعت ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ ہمارے ہاں جائز ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ وہ ایک بزرگِ خاندان بیچ میں نہیں ہے جو کہے کہ اس کے مطابق یوں ہوگا۔ خلیفہ کا یہ انتخاب وہاں اسی لیے سب سے پہلے ہو گیا پھر یہ بات چھڑی کہ حضورﷺ کو دفن کہاں کیا جائے گا؟ اُنہوں نے کہا کہ خلیفہ سے پوچھو۔

عزیزانِ من! جب یہ چیز ذہن میں پیدا ہوئی کہ حضورﷺ کے بعد اس نظام کا کیا بنے گا تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ جو حضورﷺ کے بعد سب سے پہلے ان کے جانشین حضرتِ ابوبکر صدیقؓ (634-571ء) ہوئے' انہوںؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ اس میں کسی اضطراب کی ضرورت نہیں ہے' اس میں پریشانی کی بات نہیں ہے' اس کے لیے تو خود خدا نے ہمیں پہلے ہدایت دیدی ہوئی ہے' اس کے لیے ہمارے پاس ایک Resolution (قرارداد) موجود ہے۔ اور آپؓ نے وہاں یہ آیت تلاوت فرمائی کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:144) یہ تو خدا نے کہہ دیا تھا کہ آپﷺ کی طبعی زندگی ہے' طبعی زندگی کے بعد آپﷺ کو یہاں سے چلے جانا ہے اور کہا تھا کہ کیا اس کے بعد تم سمجھو گے کہ اب یہ وفات پا گئے اس لیے یہ ہمارا جو وہ نظام تھا ختم ہو گیا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ (634-571ء) کے وہ فقرے تھے کہ ''یہ بات یاد رکھو کہ جو محمدﷺ کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا وہ یہ سمجھ لے کہ اس کا حاکم یا معبود واقعی مر گیا اور جو خدا کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا' اسے جاننا چاہیے کہ وہ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ ہے' وہ کبھی نہیں مر سکتا ہے''۔

اب سوال یہ ہے وہ کس طرح زندہ ہے؟ زندگی کا یہ ثبوت نبی اکرمﷺ کے وقت الموت کا جو واقعہ ہمارے ہاں تاریخ میں ملتا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ کاغذ قلم دوات لایئے' میں کچھ لکھ کر دوں۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بڑی اہم بات ہے جو وہاں ہوئی۔ اس کے بعد حضورﷺ پہ غش طاری ہوا' اس کا موقع نہ ملا' تو بات یہ ہوئی کہ وہ کچھ لکھا لینا چاہتے تھے تو وہاں وہ چیز ہے کہ حضرتِ عمرؓ (581-644/45 A.D.ء) نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰهِ ' ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہے اور ہر معاملے کے لیے وہ کافی ہے اس لیے اس سے کوئی کمی واقعہ نہیں ہو جائے گی کہ اگر اس وقت جو کوئی بات تھی اگر حضورﷺ کے لکھوانے سے رہ گئی ہے اور حضورﷺ اس طرح سے ہی دنیا سے تشریف لے گئے' تو کوئی بات نہیں ہے اس لیے

کہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ** (اللہ کی کتاب' قرآنِ کریم' ہمارے لیے کافی ہے)۔

یہ لوگ تھے' انہیں پتہ تھا کہ شخصیتوں کے چلے جانے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی' کتاب اللہ ہے جو ہمارے ہاں باقی ہے۔ انہوںؓ (حضرت عمرؓ) نے یہ بات کہی اور پہلے ہی جانشینؓ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) نے یہ بات کہہ دی کہ جو یہ سمجھتا تھا کہ یہ سارا نظام' یہ ساری حکومت' اس شخصیت کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ تو سمجھ لے کہ واقعی بات ختم ہوگئی اور جو سمجھتا تھا کہ نہیں' یہ تو خدا کی محکومیت ہے' تو خدا تو زندہ ہے' لایموت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس صورت میں وہ ہمارے لیے زندہ ہے؟ اس سے کہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ** ' اس کی کتاب زندہ اور پائندہ ہے' وہ اس نے محفوظ رکھی ہوئی ہے' اس لیے ہمارے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی۔

نظام میں آخری اتھارٹی کی ضرورت تھی' آخری (Final) اتھارٹی رسول اللہ ﷺ کے بعد' ان لوگوں نے خود ایک اتھارٹی منتخب کر کے اپنے ہاں سے چن لی۔ اب آخری (Final) اتھارٹی آ گئی۔ چنانچہ جس نہج سے وہ نظام پہلے چلتا تھا' اسی نہج سے یہ نظام چلتا رہا' اس میں کوئی فرق نہیں آیا' اسی طرح سے اولی الامر کی اطاعت کے جو احکام تھے' گورنرز کے ولایات میں' یا ان کے بھی نیچے جو افسرانِ ماتحت تھے' ان کی اطاعت کی جاتی تھی۔ ان کے فیصلوں کے خلاف جو اپیل تھی وہ اپیل اب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بجائے' جو خلیفہ حاضر تھا' اُس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے' وہ معاملات ان کے پاس آتے تھے۔ یہ جو فیصلے دیتے تھے' یہ فیصلے وہی ہو جاتے تھے جسے قرآن کریم نے خدا اور رسول کی اطاعت کا فیصلہ کہا ہے۔ حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کے فیصلے ان کے اپنے ذاتی فیصلے نہیں تھے' اس نظام میں ذاتی فیصلے کرنے کا مجاز تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ سے یہ کہہ دیا گیا کہ جب اپنے نزاعات لے کر تیرے پاس لوگ آئیں گے' تو فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کر دیا کرو۔ خدا کی کتاب موجود ہے' فیصلے کرنے والی ایک اتھارٹی موجود ہے تو نظام میں کسی چیز کی کمی نہیں آئے گی۔ یہ تھا نظام جو آگے چلا۔

عزیزانِ من! یوں خدا اور رسول کی اطاعت آگے ہوتی گئی' اس میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ نبی اکرم ﷺ کے صحیح نمائندے یا جانشین تھے' جب تک کتاب اللہ کے مطابق اس نظام میں فیصلے ہوتے رہے' وہ فیصلے کسی نے بھی کیے' تو خدا کی اطاعت' خدا کی عبودیت' خدا کی محکومیت' کا نظام قائم رہا۔ یہاں کسی نے اس چیز کو Miss (ترک) نہیں کیا کہ صاحب! ایک چیز تو اس کے ساتھ اطاعتِ رسول بھی تھی' اب وہ کس طرح سے کی جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہی مقصد اس زمانے میں تھا' وہی مقصد اب پورا ہو رہا ہے۔ اس مملکتِ خداوندی کی جو سنٹرل اتھارٹی ہے' اس کی اطاعت جو وہ خدا کی کتاب کے مطابق کرائے' یہ ہے اطاعت جو حقیقت میں مقصود ہے۔ اور یہ نظام اس طرح سے قائم رہا۔

## خلافت کے بعد دورِ ملوکیت یا سیکولر گورنمنٹ کے دور کا آغاز اور اس کے نتائج

میں نے عرض کیا ہے کہ کسی نے اس دوران میں یہ سوال ہی نہیں اٹھایا۔ جب یہ نظام ٹوٹ گیا اور اس کے بعد آپ کے ہاں ملوکیت آ گئی' جو بھی کہیے آپ کے ہاں ملوکیت ہی ہے' اصل میں آج کی اصطلاح میں اسے سیکولر گورنمنٹ کہا جاتا ہے۔ یہ سیکولر نظام جو آپ کے ہاں قائم ہوا تو اس میں مملکت کے جو امور تھے' وہ تو حکومت نے لے لیے اور قوانینِ خداوندی کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے: Personal Laws (شخصی قوانین) اور Public Laws (حکومت کے قوانین) الگ الگ کیے گئے۔ یہ سب سے پہلا شرک ہے جو دین کے اندر ہوا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے نہ انسانی ذات کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں' نہ اس کی زندگی کے معاملات کو یوں بانٹا جاسکتا ہے۔ یہاں پبلک اور پرائیویٹ کا کوئی Question (سوال و معاملہ) ہی نہیں ہے صاحب! یہاں Personal Laws (شخصی قوانین) اور Public Laws (حکومتی قوانین) الگ الگ ہیں ہی نہیں۔ اسی قرآن مجید میں Personal Laws (شخصی قوانین) ہیں' اسی قرآن کریم میں Public Laws (حکومتی قوانین) ہیں۔ وہی معاملہ میاں بیوی کے اندر ہوتا ہے تو آپ کی اصطلاح میں Personal (شخصی) کہا جاتا ہے' ہمسائے کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کو آپ Public (حکومتی) کہہ دیتے ہیں۔

## غیر قرآنی نظام کو سہارا دینے والی قوتیں

یہ اس زمانے میں تفریق نہیں ہوئی بلکہ بڑی گہری سوچ کے بعد تفریق کی گئی کہ یوں مملکت کا استبداد قائم نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ اس کو مذہبی پیشوائیت کی تائید حاصل نہ ہو۔ فرعون کی فرعونیت' ہامان کے زور پہ چلتی ہے۔ قرآن کریم نے ہامان کے جنود کہا ہے۔ فرعون کے بھی لشکر تھے لیکن اس کی تقویت کا راز ہامان کے لشکروں کے اندر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ کی ضربِ کلیمی سے اس (فرعون) نے سمجھا کہ میں عاجز آ رہا ہوں' آپ پیچھے ہٹ گیا اور ان تمام مذہبی پیشوائیت والوں کو' ہامان کے جنود کو' بلا بھیجا کہ آ و تم نپٹو' یہ کچھ خدا کی بات کر رہا ہے' یہ تمہارے معاملے کی بات آ گئی۔ اور لوگوں کو بلا لیا کہ دیکھو! تمہارے بزرگوں کے خلاف یہ کیا کہہ رہا ہے' تمہارے معبودوں کے خلاف کیا کہہ رہا ہے؟ مذہب کے اندر ایسا پراپیگنڈہ ہی ہوتا ہے صاحب! یہ بالکل یہی حربہ تھا' یہ ساری حکمتِ فرعونی ہے۔

## ہامان اور فرعون کی باہمی طور پر سودے بازی کی شکل

سیکولر گورنمنٹ میں ہوتی ہی حکمتِ فرعونی ہے۔ قارون سے کہا جاتا ہے کہ سمیٹتے چلے جاؤ' تمہارے خزانے کی چابیاں بھی چالیس آدمی اٹھائیں اور اُدھر ہامان' اس کو بھی عین مطابقِ شریعت بتاتا ہے' ادھر فرعون کو بھی وہ ظل اللہ یعنی خدا کا سایہ بتاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی یہ ہے کہ السلطان ظل اللہ علی الارض 'بادشاہ زمین پہ خدا کا سایہ ہے'۔ کون یہ سائے بناتا ہے؟ آپ کو اس قسم کے

فقرے گھڑ کر کون دیتا ہے؟ یہ مذہبی پیشوائیت دیتی ہے' محراب و منبر پہ کھڑے ہو کر ان کی مملکت کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ان کو اس چیز کی ضرورت تھی کہ اس قسم کی تائید حاصل ہو' تائید تو بغیر رشوت کے نہیں مل سکتی' انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو یہ ہے کہ یہ معاملے خواہ مخواہ دردِ سر ہیں' یہ ان کے ہاں کے نجی معاملے ہیں' یہ فیملی کے معاملے ہیں' یہ پرائیویٹ معاملے ہیں' یہ حصہ الگ کر کے اسے ان کی تحویل میں دیدیا کہ یہ تمہاری مملکت کی بات ہے۔

## شخصی معاملات کے فیصلے مذہبی پیشوائیت کے سپرد اور ان کی طرف سے بادشاہت کے حق میں فتویٰ

اب ان کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا۔ اقتدار بڑی چیز ہوتی ہے۔ یعنی آج تو اقتدار کی بات یونہی مذاق سی ہو گئی ہے ورنہ یہ اقتدار کوئی چھوٹا اقتدار نہیں تھا کہ میاں بیوی اچھے بھلے گھر میں بس رس رہے ہیں' باہمی رضامندی سے نکاح ہوا ہے' کسی دوسرے کے دخل کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے وہاں بیٹھے ہوئے فیصلہ کیا کہ صاحب! ان کے جو اعتقاد ہیں' وہ کچھ خراب ہو گئے ہیں' اس لیے ان کی بیوی کو طلاق پڑی۔ شرعی اقتدار کے ماتحت وہ اس طرح بیوی ہی نہیں رہتی' وہ معاملہ ختم ہوا۔ یہ اقتدار کی بھی حد ہے' یہ Personal (شخصی) معاملے بڑے تنگ کرنے والے ہوتے ہیں اور زندگی میں ہر وقت ان سے معاملہ پڑتا ہے۔ بڑے معاملے کو تو آپ Avoid (احتراز) کر سکتے ہیں۔ یہ جو معاملات تھے وہ ان کے ہاتھ میں دیئے کہ شخصی معاملات کے فیصلے مذہبی پیشوائیت کرے گی۔ اور اس کے صلے میں وہ محراب و منبر سے ان کے حق میں دعائیں مانگتی چلی جائے۔ جب یہ ثنویت ہوئی ہے' جب یہ شرکِ اولیں آپ کے ہاں آیا ہے' وہاں پھر یہ بات ہوئی صاحب! کہ اب ان کی اطاعت کس طرح سے کی جائے۔ قرآنِ خالص کی طرف آتے ہیں تو وہاں تو بانس ہی نہیں رہتا' بنسری کہاں بجتی ہے' وہ تو اس قسم کی حکومت کو' فرعون کی حکومت کو' خلافِ قانون قرار دیتا ہے' خلافِ دین قرار دیتا ہے' اس میں تو ملوکیت باقی نہیں رہتی' مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی' ' دہن کا ذکر کیا یہاں تو سر ہی غائب ہے گریباں سے' قرآنِ خالص سے تو یہ دونوں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن حمید کی طرف کیسے آئیں صاحب! پہلے تو وہاں سے اس Bifurcation (تقسیم) کی ہی سند نہیں مل سکتی۔ پھر اگر اس میں بھی آ جائیں تو یہ تو ہر اختیار کو اتنا محدود کر دیتا ہے کہ جونہی آپ نے کوئی فیصلہ دیا تو آپ کو قرآن کریم کی آیت سے سند دینی پڑے گی' اس نے حدود مقرر کی ہیں' اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ محدود اختیارات کے اندر تو حکومت کی لذت نہیں ملتی کیونکہ حکومت تو وہی ہے کہ اختیار حاصل ہو اور پھر لامحدود اختیار حاصل ہو۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے ملنے والے اختیارات میں اضافے کے مسئلے کا حل قرآن کریم کے ساتھ مثلہ معہ کا سلسلہ

اب یہ ہے' عزیزانِ من! وہ پہلا دور' جس میں اس کی ضرورت پڑی کہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ اور وہاں

پہلی دفعہ یہ چیز آپ کے ہاں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک تو قرآن کریم نازل ہوا تھا اور مثلہ معہٗ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' قرآن کے علاوہ کچھ اور بھی۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو وہاں ثنویت (Dualism) تھی' اس کے لیے یہاں آ گے کس طرح ثنویت پیدا ہو رہی ہے: قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کچھ اور۔ اب قرآن کریم جو تھا وہ اس دفتین کے اندر موجود تھا' خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا' اس میں تو ایک شوشے کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی' نہ اس میں اضافہ ہو سکے' نہ اس میں اس کے اندر رہتے ہوئے تحریف ہو سکے' اس میں تو گنجائش نہیں رہتی۔ اور بات اپنے اختیارات کے لامحدود کرنے کی تھی اس کے لیے یہ چیز ہوئی کہ صاحب! یہ جو قرآن کریم نے اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کہا ہے' اللہ کی اطاعت تو قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگی' اب بتاؤ رسول ﷺ کی اطاعت کیسے ہوگی؟ بات تو سوچنے کی ہے۔ نظام کا تصور تو ذہن سے نکال دیا گیا۔ تو اب اس کے لیے انہوں نے کہا کہ خدا کی اطاعت' خدا کی باتوں کے لیے تو قرآن کلمات اللہ ہو گیا' رسول ﷺ کی اطاعت رسول ﷺ کی باتوں سے ہوئی جنہیں حدیث کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بڑی غور طلب چیز ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد تو خلافتِ راشدہ بھی قائم ہے جسے سب سے پہلے ان کی ضرورت پڑنی تھی اگر ان کی حیثیت یہی ہوتی جنہیں یہ روایات یا احادیث کہتے ہیں' تو وہ کہاں تھیں۔

## صحابہ کرامؓ کے زمانے میں تو روایات کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا تھا بلکہ تلف کروا دیا گیا

صحابہ کرامؓ کے زمانے میں کہیں کوئی مجموعۂ احادیث مرتب نہیں ہوا۔ یہی نہیں کہ مرتب نہیں ہوا یا سہواً رہ گیا' اس Issue (مسئلے) پر Discussion (بحث و مباحثہ) ہوا' ان کے ہاں ایک خلیفہ کے بعد دوسرے خلیفہ کے دور میں کیبنٹ بیٹھی' مشاورت کی مجلسیں بیٹھیں' مہینہ مہینہ اس کے اوپر بحث و مباحثہ ہوا کہ ہمیں یہ چیزیں اکٹھی کر لینی چاہئیں' ہر بار یہ طے پایا کہ یہ غلط ہے۔ پہلی امتیں تباہ ہی اس لیے ہوئی تھیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ کچھ اور شریک کر لیا تھا' ہم کتنی احتیاط برتیں' ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کی مستقل حیثیت کتاب اللہ کے ساتھ ہو جائے' ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اور ان احادیث کی تاریخ بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ نہیں کرنے کے بعد' جب طے ہوا تو یہ مملکت نے طے کیا تھا' اس کے بعد یہ چیز طے پائی کہ جہاں جہاں کسی کے پاس کوئی چیز اپنے طور پہ بھی لکھی ہوئی ہے' وہ ساری لے آئے' یہاں لا کر وہ تلف کر دی گئیں۔ اصول ہی یہ تھا کہ **حسبنا کتاب الله** ہمارے لیے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔

## امام مالکؒ کی وفات 179 ھجری' امام بخاریؒ کی وفات 256 ھجری میں ہوئی

اس کے بعد آگے خدا اور رسول کی اطاعت کی چیز تھی۔ انہوں نے کہا کہ خدا اور رسول کا جو جانشین ہے' مملکتِ خداوندی کا جو سربراہِ اعلیٰ ہے' جو سنٹرل اتھارٹی ہے' اس کا فیصلہ ہے' کتاب اللہ کی حدود کے اندر دیا ہوا ہے۔ وہاں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پڑی'

عزیزانِ من! چنانچہ اگر امام مالکؒ (یمنی' مدنی: 179-93ھ) کی مؤطا کو ہم الگ رکھیں ❶ اس میں مدینہ کے اصحاب کا جو کچھ معمول ہے' صرف وہ لکھا ہے اور اس میں بہت کم حدیثیں ہیں' اس کے مختلف نسخوں میں زیادہ سے زیادہ تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں' ان کی وفات 179 ھجری میں ہوئی تھی۔ احادیث کا سب سے پہلا مجموعہ جس کو بعدِ کتاب اللہ صحیح ترین (اصح الکتب بعد از کتاب اللہ) کہا جاتا ہے' وہ امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (256-194ھ) کا ہے' امام بخاریؒ کی وفات 256 ھجری میں رسول اللہ ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد ہوئی ہے۔

## اب صحاحِ ستہ کے علاوہ شیعہ حضرات کے الگ چار مجموعے ہیں

اس کے بعد یہ جتنے آپ کے ہاں صحاح ستہ ہیں' جنہیں چھ حدیث ❷ کی صحیح ترین کتابیں کہتے ہیں' یہ ساری ان کے بعد کی ہیں۔ اور ضمناً یہ بھی تاریخ کی ایک عجیب چیز ہے کہ یہ جتنے بھی جامعین حدیث ہیں' جن کے یہ مجموعے آپ کے ہاں احادیث کی کتابیں کہلاتی ہیں' وہ سب کے سب ایرانی تھے' وہاں کے عربی بھی نہیں تھے۔ اور یہ سُنّیوں کے چھ مجموعے ہیں۔ شیعہ حضرات کے اپنے الگ اس قسم کے چار مجموعے ❸ ہیں۔ اور ان میں سے انہوں نے اپنے طور پر صحیح ترین منتخب کر کے اپنے ذہن میں الگ کیے ہیں ورنہ اس کے علاوہ جو باقی ہیں' وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں لیکن یہ مجموعے کس طرح سے مرتب ہوئے' یہ بات کئی دفعہ آ چکی ہے۔

## لاکھوں روایات کو اکٹھا کرنے کا طریق اور پھر اُن کو صحیح قرار دینے کا معاملہ

پہلے سے کوئی Written Record (تحریری رکارڈ) نہیں تھا جن سے یہ مرتب ہوئے۔ خود ان کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے۔ ان میں یہ چیز ہے کہ مجھ سے فلاں نے کہا' اُن سے فلاں نے کہا' اُن سے فلاں نے کہا اور پیچھے تک جاتے جاتے کوئی حدیث تو کسی صحابیؓ تک چلی جاتی ہے کہ ان سے فلاں صحابی نے' مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا' یا کوئی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا۔ دو اڑھائی سو سال کے بعد بغیر Written Record (تحریری رکارڈ) کے کس طرح سے روایات کی سند دیتے ہوئے ایک چیز رسول اللہ ﷺ تک پہنچائی جاتی ہے۔ وہ جتنی یقینی ہو سکتی ہے' ظاہر ہے۔ وہاں ہر حدیث کے بعد یہ خود کہتے ہیں کہ یہ 'او کما قال رسول اللہ ﷺ' یعنی

---

❶ احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے' وہ امام مالکؒ (المتوفی 179ھ) کی کتاب مؤطا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اُس زمانے میں مدینہ میں ارکانِ اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔

❷ (1) صحیح بخاری' (2) صحیح مسلم' (3) ترمذی' (4) ابوداؤد' (5) ابن ماجہ اور (6) نسائی

❸ (1) الکافی۔ جامع ابوجعفر محمد جو کلینی (المتوفی 239ھ) کے نام سے مشہور ہیں۔ (2) من لایستحضرہ الفقیہ۔ یہ شیخ محمد ابن علی (المتوفی 381ھ) کی تالیف ہے۔ (3) تہذیب۔ مؤلفہ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن (المتوفی 460ھ) (4) استبصار۔ یہ بھی شیخ ابوجعفر محمد بن حسن کی تالیف ہے۔

یہ یا یوں جیسے حضورﷺ نے فرمایا ہو یعنی انہیں خود اس بات کا یقین نہیں۔ یقین ہو ہی نہیں سکتا۔

## وحی کی دو قسموں ''وحی متلو اور وحی غیر متلو'' کی وضاحت

عزیزانِ من! اور اس کے بعد اگر آپ اس امر کی تاریخ لیں کہ ان کے معیار کے مطابق کتنی حدیثیں وضع ہوئی تھیں' لوگوں نے کتنی گھڑی تھیں' تو اس میں لاکھوں کی تعداد آ جاتی ہے لیکن یہ چیز اس طرح سے لا کر یہ کہا گیا کہ صاحب! اب خدا کی اطاعت قرآن کریم کے مطابق' رسولﷺ کی اطاعت احادیث کی رو سے ہے۔ یہ بھی وحی ہے وہ بھی وحی ہے' اِس وحی کی تلاوت ہوتی ہے اُس وحی کی تلاوت نہیں ہوتی' صرف یہ چیز ہے کہ وحی متلو (وحی جلی یعنی قرآنِ کریم) ہے اور وحیٔ غیر متلو (وحیٔ خفی) احادیث ہے۔ یہ جو وحی کی دو قسموں کا تصور ہے یہ یہودیوں کے ہاں تھا۔ ان کے ہاں تورات کے ساتھ حضرتِ ہارونؑ کی اولاد کی جو باتیں یا روایات تھیں وہ وحی غیر متلو (وحیٔ خفی) کہلاتی تھیں۔ آپ کے ہاں یہ دونوں چیزیں سند قرار پائیں۔ اب اس میں بڑی گنجائش ہو گئی' صاحب! ان مجموعوں میں ایک ہی معاملے کے متعلق' ہر جگہ آپ کو متضاد حدیثیں مل سکتی ہیں' کہ یوں بھی ہے اور یوں بھی ہے۔

## قرآنِ حکیم کی تفسیر و تشریح روایات کی روشنی میں اور پھر قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا ماجرا

پہلے تو یہ کہا گیا کہ صاحب! ان کی ضرورت اس لیے ہے کہ قرآنِ کریم ان کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا' قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ان کی ضرورت ہے' یہ قرآن کریم کی تفسیر یا تشریح کرتی ہیں۔ اچھا جی! وہ تفسیر و تشریح بھی یہ کہ جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق جب یہ کہہ دیا جائے کہ حضورﷺ نے اس کی یہ تشریح فرمائی ہے تو پھر کونسا مسلمان ہے جو یہ کہے گا کہ نہیں صاحب! میں اس سے الگ کوئی تشریح کرتا ہوں' یہ تشریح زیادہ اچھی ہے (معاذ اللہ)۔ تو وہ جو تشریح بھی کی گئی' اس کی بھی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ بھی فائنل ہوئی لیکن اس سے بھی بات آگے چلی۔ ایسی بھی روایات تھیں جو قرآن کریم کے خلاف جاتی تھیں۔ اب اس صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ کے ذہن میں بے ساختہ یہ بات آئے گی کہ صاحب! بہر حال قرآن حمید کا تو مقام اونچا ہے' قرآن حمید کی بات کو حکم یا اتھارٹی مانا جائے' اس کے متضاد جو بات جاتی ہے' ہم کہیں گے کہ یہ رسول اللہﷺ کی نہیں ہو سکتی۔ نہیں! کہا یہ گیا کہ جہاں ایسی چیز پیدا ہو کہ اس میں تضاد ہے' یہ حدیث قرآن حمید کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اب اس کے لیے کسی حکومت کی طرف جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ جو مجموعے تھے یہ ان حضرات کے پاس آ گئے۔ اب امت کو خدا اور رسول کی اطاعت پوچھنے کے لیے' ان کی طرف جانا پڑا۔ خدا اور سول کی جب اطاعت ہوتی تھی' امت کی وحدت تھی ایک امت تھی' ایک مملکت' ایک اس کا نظام تھا' ایک ہی اس کے فیصلے تھے اس لیے کہ وحدت کا نام ہی توحید تھا۔

## مسلمانوں میں مختلف فرقوں کا وجود اور ان کی نوعیت

جیسا کہ متعدد بار میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں بہ نصِ صریح کہا گیا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے۔ اور یہ' عزیزانِ من! ایک ہی معاملے کے متعلق اگر آپ کو دو فیصلے ملیں' دونوں فیصلے خدا کے تو ہو نہیں سکتے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ تو دو میں سے بہرحال اگر ایک فیصلہ خدا کا ہو تو دوسرا تو کسی غیر اللہ کا ہوگا اور یہیں سے تو تفرقہ یا فرقہ بنتا ہے اور اسی لیے قرآن کریم نے اس کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ وہ مقام آیا جہاں مختلف لوگوں نے مختلف فیصلے دیئے اور اپنے ہر فیصلے کی سند میں کوئی نہ کوئی حدیث نقل کی۔ یہ بنیادی طور پہ چار ہیں جو آپ کے ہاں فقہ کے امام ❶ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ چار تو یونہی گنے جا رہے ہیں ورنہ فرقوں کے اعتبار سے تو پوچھو نہیں کہ آپ کے ہاں کتنے فرقے بنے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک جو دلیل اور سند لاتا ہے' وہ روایت پہ ہے' قرآنِ کریم کی آیت تو اوپر تبرکاً لکھی جاتی ہے اور نیچے اس کے جو سارے احکام ہیں' وہ احکام روایت سے ہوتے ہیں۔

## احکام القرآن حنفی فقہ کے مطابق اور احکام القرآن شافعی فقہ کے مطابق

آپ حیران ہونگے یہ فرقہ بندی کہاں لے جاتی ہے۔ ''احکام القرآن'' کتاب کا نام ہے۔ آپ کے ذہن میں آئے گا کہ ٹھیک ہے صاحب! احکام القرآن' اگر کسی سے' کہیں سے یہ کتاب مل جائے تو بڑی بات ہے صاحب! یہ قرآن حکیم کے احکام ہیں۔ چلیے صاحب! انہوں نے قرآن حکیم کے احکام کو قرآن حکیم سے الگ کر کے ایک جگہ رکھ دیا۔ ٹھیک ہے یہ قرآن کے احکام ہوئے۔ میرا بھی ایک چھوٹا سا مجموعہ ''قرآنی قوانین'' ہے۔ قرآن کی اقدار اس کے اندر رکھ دی ہیں' مختلف عنوانوں کے ماتحت ان کو تبویب کے ذریعے سے کیا ہے۔ ٹھیک ہے حصاص نے یہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد ابنِ عربی کے احکام القرآن ہیں' ہم اس کی طرف بڑھے۔ آپ حیران ہونگے کہ یہ دونوں احکام القرآن مختلف ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ حصاص حنفی ہیں' انہوں نے کہا ہے کہ قرآن حکیم کے احکام حنفی فقہ کے مطابق ہیں' ابنِ عربی' شافعی ہیں' انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم کے احکام شافعی فقہ کے مطابق ہیں۔ دونوں کتابیں موجود ہیں' میں نے آپ کے سامنے دو ہی کا صرف ذکر کیا ہے: 'احکام القرآن' حنفیوں کے مطابق' اور احکام القرآن شافعیوں کے مطابق' دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

---

❶ یہ چار یہ ہیں: (1) امام اعظمؒ کوفی (150-80ھ)۔ یہ فقہ حنفی ہے۔ (2) امام مالکؒ یمنی' مدنی (179-93ھ)۔ یہ فقہ مالکی ہے۔ (3) امام شافعیؒ عسقلانی' مکی (204-150ھ)۔ یہ فقہ شافعی ہے۔ (4) امام احمد بن حنبلؒ بغدادی (241-164ھ)۔ یہ فقہ حنبلی ہے۔ یہی چار مکاتبِ فقہ مشہور ہیں۔ انہیں عموماً مذاہبِ اربعہ بھی کہا گیا ہے۔

## قرآنِ حکیم کا حنفی ترجمہ اور قرآنِ حکیم کا شافعی ترجمہ

عزیزانِ من! یہ تو احکام کی بات ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن حمید کا حنفی ترجمہ بھی ہوا ہے۔ جب یہ ترجمہ شائع ہوا تھا تو اس کے بعد بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر' یہ بات کہی گئی تھی کہ صاحب! دیکھیے یہ ترجمہ حنفی فقہ کے متعلق ہے' اس میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے' قرآن حکیم کا کوئی اور حنفی ترجمہ نہیں ہے۔ بہرحال احکام القرآن حصاص کے اور احکام القرآن ابن العربی کے موجود ہیں۔ پھر یہ احکام القرآن کیا ہوا؟ قرآن کریم کے احکام کی تفسیر وتشریح کچھ بھی کہہ لیجیے' ان روایات کے مطابق جنہیں حنفی فقہ والے صحیح مانتے ہیں' قرآن کریم کے احکام کی تشریح وتفسیر ان روایات کے مطابق جنہیں جو شافعی المذہب ہیں' وہ صحیح مانتے ہیں' دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ آپ جو اتنے فرقے دیکھ رہے ہیں یہ بات ذہن میں آتی ہوگی کہ خدا کی کتاب موجود ہے اس کی موجودگی میں اتنے فرقے کیوں؟

## فرقہ بندی پر اہلِ مغرب کا اعتراض

فرقوں کا یہ اعتراض کرنے والے اہلِ مغرب ہیں۔ وہ تو اعتراض کرتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں اور کیفیت یہ ہے کہ ان کے 72 فرقے ہیں لیکن درحقیقت یہ 72 ہزار فرقے ہیں' چھوٹی چھوٹی سی بات پر ایک دوسرے کا سر پھٹول ہو رہا ہے' دونوں خدا اور رسول کی سند لاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ پھر وہ کونسی چیز ہے جس کے تحت آپ کے ہاں تفرقہ نہیں ہو سکتا' اختلاف نہیں ہو سکتا۔ حصاص کے احکام القرآن اور ہیں' ابن العربی کے اور ہیں۔ ہر فقہ والا اپنی ہی فقہ کو صحیح کہتا ہے۔ مذاہبِ اربعہ کی وہ کتابیں میرے ہاں پڑی ہیں۔ ان کو آپ اٹھا کر دیکھیں۔ یہ چاروں مذاہب کی کتابیں ہیں۔ اور اس کے ہاں تو اب ان فقہ والوں کا ایک اور سلسلہ انسائیکلوپیڈیا شروع ہوا' یہ آٹھ مذاہب[1] کی کتابیں ہیں۔

## خلفائے راشدینؓ کے بعد قائم ہونے والی تمام حکومتیں' مسلمانوں کی حکومتیں ہیں' اسلام کہیں موجود نہیں

اور یہیں یہ بات ختم نہیں ہوگئی ہے' یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ جو اس طرح سے روایات جمع ہوئیں' ان کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اگر کوئی قرآن کریم کی آیت ایسی ہے جو حدیث سے متضاد ہے' تو ان کے ہاں یہ ہے کہ پہلے تو قرآنی آیت کی تاویل ایسے کرو کہ وہ اس کے مطابق ہو جائے اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو' تو پھر اس کے بعد بہرحال عمل تو حدیث کے مطابق ہوگا کیونکہ یہ بھی وحی ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں جو خدا اور رسول کی اطاعت کا تصور چلا آ رہا ہے۔ اب بات آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد جتنی حکومتیں

---

[1] یہ چار سنیوں کے ائمہ فقہا اور چار فقہ جعفریہ کے ائمہ فقہا کی ہیں۔

قائم ہوئی ہیں' وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں' اسلامی حکومت آپ کے ہاں پھر قائم نہیں ہوئی۔ آپ کہیں گے کہ بہت بڑا بول ہے جو تم نے بول دیا۔ بات بڑی صاف سی ہے۔ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں مرکز خدا کی کتاب ہو' جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔ پھر اسلامی حکومت کے اندر جو مسلمان بسنے والے ہونگے' جو قانون اس حکومت کی طرف سے نافذ ہوگا' اس کا ان تمام پر یکساں طور پہ اطلاق ہوگا۔ ایک حکومت اسلام کے احکام مسلمانوں پہ نافذ کر رہی ہے اور آپ کے ہاں اس پوری تاریخ میں سوائے صدرِ اول (2-40ھ/632-661AD) کے' پھر کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی' جس میں انہوں نے جو قوانین نافذ کیے ہیں' انہیں مسلمانوں کے تمام فرقوں نے اسلامی مان لیا ہو۔ منوالینا تو اور بات ہے۔ وہ تو ملوکیت بھی اپنے قوانین منواتی آئی ہے۔ وہ حکومت کے ارباب جس فقہ یا فرقے سے متعلق تھے' انہیں بادشاہ کہیے یا جو بھی کہیے' اس کی فقہ ملک کے اندر چلتی تھی' اسے منوایا جاتا تھا۔ شخصی قوانین' جو مختلف فرقوں کے تھے' انہیں اس کی اجازت تھی کہ وہ اپنی اپنی فقہ پہ عمل کرلیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ اصل میں جو اسلام ہے' وہ تو یہ شخصی قوانین ہی ہیں' باقی جتنی بھی چیزیں ہیں' وہ مملکت اور حکومت کی ہیں' وہ دنیا کے معاملات ہیں اور اسی پر وہ مطمئن چلے آئے۔ یہ ہے اسلام کا تصور جو چلا آرہا ہے' یہ ہے آپ کے ہاں جو حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔

## فقہ کے نفاذ سے اسلامی مملکت تو قائم نہیں ہوتی

ہر حکومت میں یہ جو اربابِ حکومت تھے جو ان کا مذہب تھا' جس فقہ سے وہ متعلق تھے' وہ فقہ مملکت کے اندر نافذ رہی' اسلامی قانون تو نافذ نہیں رہا۔ اس کے بعد اسلامی مملکت وجود میں آئی نہیں۔ اتفاق یہ تھا کہ اس دوران میں عام مملکتوں کے اندر' ایران وغیرہ کی دو چار مملکتیں یا حکومتیں چھوڑ کر' جہاں حکومتیں بنیں' وہاں فقۂ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت تھی اس لیے عام طور پہ جو فقۂ حنفی تھی' یہ حکومت کا قانون رہا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' اس کا اطلاق سارے مسلمانوں پر تو نہیں ہوسکتا تھا' وہ فرقے موجود تھے جو اس کو اسلامی یا شرعی مانتے ہی نہیں' وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

## تحریکِ پاکستان کا بنیادی تصور خالصتاً ایک قرآنی حکومت کا قیام تھا

عزیزانِ من! اس تیرہ سو سال کے بعد پہلی دفعہ یہ تصور آیا اور یہ ایک ایسی مملکت کا تصور دیا گیا جہاں پہلے سے کوئی حکومت قائم نہیں تھی اور مسلمانوں نے پہلے سے ازسرِنو حکومت قائم کرنی تھی۔ یہ تھی پاکستان کی تحریک۔ جن کے دلوں میں دین کا صحیح تصور اور اس کے لیے محبت کا جذبہ تھا' وہ اس جذبے کے ماتحت اس تحریک کے اندر آئے کہ اتنی دیر کے بعد ہی سہی' بہرحال طلوعِ سحر تو ہونے لگی ہے۔ کہیں ایک مملکت تو اس آسمان کے نیچے ایسی بن رہی ہے' جہاں پہلے سے کوئی فقہ نافذ نہیں ہے۔ اور جنہوں نے اس کا تصور دیا' اقبالؒ

(1877-1938ء) نے بھی یہ کہا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تم نے مسلمان بننا ہے تو وہ صرف قرآن کریم کی رو سے بنا جائے گا۔ اور انہوں نے اپنے خطبات ❶ میں یہ چیز دی حالانکہ وہ 1928ء میں لکھے ہوئے تھے ۔ یاد رکھیے! امت کو از سرِ نو مسلمان ہونے کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسا شخص حضرت عمرؓ (581-644/45ء) کی انقلابی روح لے کر کھڑا ہو' جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ کہے کہ حسبنا کتاب الله ۔ وہ شخص ❷ بڑی پتے کی بات کہہ گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے الٰہ آباد کے خطبے میں اس مملکت کا تصور دیا۔ اس نے کہا کہ اس سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان' ہندو اور انگریز کی غلامی سے آزاد ہو جائے اور بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلام پر ملوکیت نے جو ٹھپہ لگا رکھا ہے' ہم اس کو دھونے کے قابل ہو جائیں گے۔ اور یہی تصور تھا جو اس کے بعد قائداعظم علیہ الرحمۃ محمد علی جناح (1876-1948ء) نے دیا جنہوں نے یہ کہہ دیا کہ ''اسلامی مملکت کا یہ بنیادی تصور ذہن میں رکھو کہ اس کی آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب مقرر کرتی ہے' کوئی اور اتھارٹی ہمارے پاس نہیں ❸ ہو سکتی''۔ یہ تھے دعاوی جن کے لیے اس مملکت کو حاصل کیا گیا۔ لیکن ہماری بد قسمتی تھی کہ مملکت حاصل ہوئی تو نہ اقبالؒ (وفات 1938ء) رہا' نہ محمد علی جناحؒ (وفات 1948ء) رہا اور

زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن !

اور وہی پھر قوتیں یورش کر کے یہاں اقامتِ دین' اسلامی نظام' شریعت کے قانون کے یہ نعرے لیے چلی آ رہی ہیں۔

## پرویزؒ کی اس قدر مخالفت کی وجہ اور اس کا طریق

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ میرے خلاف جو اتنی بڑی ڈگڈگی بجائی گئی تھی' وہ کیا ہوا تھا؟ مذہب کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی' دلیل دین کے پاس ہوتی ہے' مذہب لیبل تلاش کرتا ہے اور اس لیبل کو مسلسل پروپیگنڈے سے اتنا گھناؤنا بنا دیتا ہے کہ جس کے ساتھ چپکا دے' پھر اس کے پیچھے ہجوم لگ جاتا ہے کہ پکڑیئے' ماریئے' مرتد ہے' ملحد ہے' کافر ہے' بے دین ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ

---

❶ The Reconstruction of Religious Thought in Islam

❷ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

❸ حوالہ یہ ہے: Daily Inqilab, Lahore, August 2,1941 in Manzoor-ul-Haque(Dr.): Story of Pakistan, Islamic Dawn Society, London, 2006, P.18.

ایسا کیوں ہے؟ او پوچھو یہ کیوں ہے؟ یہ کہ ''ساری دنیا اے کیندی ہیگی اے'' (ساری دنیا یہی کہتی ہے)۔ کیا تھی یہ چیز؟ انہوں نے کہا کہ مملکت کا قانون کتاب وسنت کے مطابق بنے گا۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مسئلہ بڑا نازک بھی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں یہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کتنی بڑی نزاکت ہے! کون مسلمان ہے جو اس سے انکار کرے گا' کوئی سن بھی سکتا ہے؟

## فرقوں کی موجودگی میں کسی فرقے کی حکومت تو قائم ہو سکتی ہے لیکن اسلامی حکومت کا تصور سامنے نہیں آ سکتا: پرویزؒ

بہرحال' عزیزانِ من! میں تو زندگی کے آخری دور میں پہنچ رہا ہوں۔ جس بات کو قرآن حمید کی رو سے حق سمجھتا ہوں' حق کہتا چلا آ رہا ہوں' در بارتو اں گفت و منبر نا تواں گفت' بالکل برہنہ کہنا چاہیے۔ میں نے یہ بات کہی اور اسی طرح سے اس کی تشریح کر کے یہ کہا کہ یاد رکھو! اس طرح سے اسلامی مملکت قائم نہیں ہو سکتی' کسی فرقے کی حکومت تو آپ قائم کر لیں گے' اسلامی نہیں ہو سکتی۔ آپ کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ اس کے ساتھ آپ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکیں گے جو تمام مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلمہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ یہ کتاب اللہ کی روشنی میں بن سکتا ہے۔ اگر یہاں کے مسلمانوں نے یہ طے کیا ہے کہ انہوں نے مسلمان کی طرح جینا ہے' تو انہیں یہ کہنا ہوگا کہ اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر قرآنِ خالص کو اپنے لیے سند اور حجت قرار دے کر آج کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' اپنی فقہ یہاں خود مرتب کی جائے گی' جو تمام مسلمانوں کے اوپر یکساں طور پر لاگو ہوگی۔ اسے اسلامی شریعت کہا جائے گا۔ یہ مملکت یوں اسلامی بن سکے گی ورنہ دوسروں کو کیوں فریب دیتے ہو۔ تم میں Majority (اکثریت) تو وہ تھی جو بیچارے خود فریب کھائے ہوئے تھے دانستہ بالکل نیک نیتی سے' وہ کہتے تھے۔ یہ لفظ' ایسے بھی تھے جو یہ جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چلتے گئے صاحب! اس بیس بائیس تیئیس سال کے عرصے میں جو کچھ میرا حشر ہوا' وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اتنی توفیق دی کہ میں اپنی اس آواز کو بلند کر سکوں کہ جو جی میں آئے' مجھے کہہ لو' اس سے کوئی قانون ایسا نہیں بن سکتا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک یکساں طور پہ اسلامی کہلا سکے۔ مملکت تو ایسی نہیں بن سکتی' اسلامی اسے آپ نہیں کہہ سکتے جس میں ایک ہی قانون تمام مسلمانوں پر لاگو نہ ہو۔ میں کہتا رہا کہ نہیں ہو سکے گا' نہیں ہو سکے گا۔ اللہ کا احسان ہے' حقیقت خود کو منوا لیتی ہے' مانی نہیں جاتی۔

## آخر کار سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اعتراف پر ایک اہم سوال اور ان کا جواب

آپ نے دیکھا ہوگا جو میری اس مخالفت میں سب سے آگے آگے تھے اور جنہوں نے اتنی شدت سے پروپیگنڈہ کیا' آپ کو معلوم ہے کہ اب اقامتِ دین کی سب سے بڑی اجارہ دار جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1979-1903ء) نے اس

کا اعلان کر دیا ہے کہ کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حقیقت خود کو منوا لیتی ہے۔ شخصی قوانین کے لیے تو پہلے ہی وہ Constitution (آئین) میں رکھوا دیتے تھے کہ ہر فرقہ شخصی قوانین میں اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کر سکتا ہے' اس ملک کو فریب یہ دیئے چلے جا رہے تھے کہ کم از کم Public Laws (حکومتی قوانین) تو ایسے بن سکیں گے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پہ کیا جائے اور وہ اسے اسلامی مانیں۔ یہ چیز مبہم رکھی ہوئی تھی۔ یہ سوال اب متعین طور پہ سامنے لایا گیا کہ آپ جو کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمارا اقتدار آ گیا' ہم برسرِ حکومت آ گئے تو ہم یہاں اسلامی نظام' اسلامی قانون قائم کریں گے۔ یہ سوال اٹھایا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ وہ کونسا قانون ہوگا؟ انہیں یہ کہنا پڑا کہ اکثریت کا' یہاں جو قانون یا فقہ ہے' وہ حنفی ہے اس لیے یہاں وہ نافذ کی جائے گی' انہیں یہ جواب ملا کہ یہ کونسا اسلام ہے جی جس میں حق اور باطل کا معیار' اکثریت اور اقلیت ہے۔ ان فرقوں کو آپ کیا کریں گے جو یہاں اقلیت کے اندر ہیں اور جو اس فقہ حنفی کو اسلامی مانتے نہیں ہیں' آپ ان پر بالجبر یہ قانون نافذ کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ اسے خدا اور رسول کی اطاعت سمجھ کر مانو' ہم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مدت ہوئی میں نے حکومت والوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کے لیے میری ایک بات مان لو' چند دنوں کے لیے حکومت ان کو دیدو اور ان سے کہو کہ بھائی! ایسا کوئی قانون نافذ کر دیجیے جسے سارے مسلمان صحیح مان لیں۔ میں نے کہا کہ آپ دیکھیں گے کہ چار دن میں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ وہ کہانی بچپن میں پڑھا کرتے تھے کہ حضرتِ نوحؑ کے طوفان میں مومن تو کشتی میں سوار ہو کر چلے گئے تو یہ جو کفار تھے' جنہوں نے ڈوبنا تھا' انہوں نے مٹکے خرید لیے اور وہ ایک ایک اپنے اپنے مٹکے کے اوپر سوار ہے اور وہ بھی ساتھ چلا جا رہا ہے۔ حضرتِ نوحؑ نے یہ کہا کہ اللہ میاں! یہ کیا ہوا' یہ تو چلے جا رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' ابھی آپ کو پتہ چلے گا' چناں چہ اللہ میاں نے آندھی چلا دی' وہ مٹکے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے اور سارے غرق ہو گئے۔ میں نے ان کو کہا تھا کہ انہیں چار دن کے لیے حکومت دیدیجیے' ان کو مٹکوں پہ سوار ہونے دیجیے اور اس کے بعد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی آندھی جو چلے گی' آپ دیکھیے گا' کیسے مٹکے ٹوٹتے ہیں۔ یہاں انہوں نے Risk (خطرہ مول) نہیں لیا یا ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

## اسلامی مملکت کے سلسلہ میں کثرتِ تعبیر کا نتیجہ اور اس کا علاج

اب' عزیزانِ من! متعین طور پر یہ سوال سامنے آ گیا' بتاؤ کیا ہوگا؟ اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ آج اگر تم اس قسم کا یہاں کوئی قانون نافذ کرو گے تو ہمیں اپنے اور اس ملک کے مستقبل کے متعلق کسی اور زاویہ نگاہ سے سوچنا پڑے گا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ وقت ہو گیا' یہ تفصیل آپ نے دیکھ لی۔ اتفاق سے اسی مہینے کا طلوع اسلام ❶ آ گیا ہے۔ اس میں پوری تفصیل سے یہ موضوع ہے اس میں یہ بات کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے 'اسلامی مملکت کا خواب جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہو گیا'۔ یہ کثرتِ تعبیر سے پریشاں

ہوتا ہے' عزیزانِ من! اسے آپ دیکھ لیجیے گا۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی نظام میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اس میں اس کی کتاب قرآنِ حکیم آپ کے ہاں مرکزی حیثیت رکھے' فائنل اتھارٹی ہو' سند دین میں حجت ہو۔ اس پہ لفظی اتفاق تو سب کو ہے' عملی اتفاق کرنے کے لیے یہ ہے کہ ہمارے لیے ہماری فقہ یا قانون یا دین کے قوانین میں سند' یہ کتاب ہے' اس کو لے کر بیٹھیں' اپنی اپنی فقہ اور روایات کو الگ رکھیں۔ مل کر بیٹھیں' موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں' ان کو سامنے رکھیں' آخری سند خدا کی کتاب کو رکھیں اور اس کے بعد دیکھیں کہ یہ ایسا ضابطۂ قوانین دے سکتی ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک یکساں قرآنی ہوگا۔ اس ضابطے کو جو نافذ کریں گے' اسے اسلامی حکومت کہا جائے گا' اس ضابطے کی اطاعت اس نظام کے تابع ہوگی۔ اگر کسی معاملے میں حق اختلاف ہو تو اسے اسلامی حکومت کو ریفر کیا جائے جس کی مرکزی اتھارٹی خدا کی کتاب ہو اور یہ ضابطۂ قوانین نافذ کیا جائے۔ یہ سند اور حجت اپنی جگہ غیر متبدل رہے' زمانے کے تقاضے بدلتے جائیں' اس کے مطابق پھر باہمی مشاورت سے اپنے بنائے ہوئے جزئیاتی قوانین (By-Laws) کے اندر تبدیلی کرتے چلے جاؤ۔ یہ ہے اسلام۔

عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن حمید نے کہا تھا کہ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ (4:59) اطاعت کرو اللہ اور رسول کی' رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ اطاعت اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی' جسے آپ تسلیم کرلیں' بنا لیں اور یہ کتاب اللہ کے مطابق قوم کو چلائے اور حکومت قائم کرے تو یہ اطاعت اس کی ہوجائے گی۔ اس کے جو ماتحت افسر ہونگے' یہ بھی ان قوانین کو نافذ کریں گے' ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق حاصل ہوگا' اپیل کی فائنل اتھارٹی پھر یہی مرکزی اتھارٹی ہوگی اور یہ جو فیصلہ دے گی' وہ آپ کے ہاں آخری فیصلہ ہوگا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! جو قرآن نے کہا کہ اگر ان کے ساتھ اختلافی بات ہو تو اسے وہاں ریفر کیا جائے لیکن شرط یہ ہے کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (4:59) اگر تم خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتے ہو تو یہ ہے وہ طریقِ زندگی جو تمہیں اختیار کرنا پڑے گا۔ ذٰلِكَ خَيۡرٌ (4:59) تم دیکھو گے کہ اس کے اندر تمہاری کتنی بھلائی ہے' یہ کتنی بڑی چیز ہے! آج اس امت کے باہمی اختلاف مٹ جائیں۔

عزیزانِ من! ان کی قوتوں کا راز پوچھو نہیں کہ' یہ مسلمان مراکش سے لے انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار ہے' اس کی جغرافیائی پوزیشن یہ ہے کہ یہ پوری کی پوری بیلٹ دنیا کے مرکز کے اندر سے جاتی ہے۔ ان میں اگر ایک مرکز پر رہنے کا اسلوب پیدا ہوجائے' ان میں اختلافی معاملات کے لیے ایک فائنل اتھارٹی مقرر کرلیں' آپ سوچیے تو سہی' دنیا کی کوئی قوم بھی اس قوم کو پھر شکست نہیں دے سکتی۔ یہ ہے ذٰلِكَ

---

❶ طلوعِ اسلام ستمبر 1970ء

**خَیْـرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا** (4:59)۔قرآن کریم نے عجیب بات کہی ہے کہ مآلِ کار تم دیکھو گے یہ کتنا حسین نظام ہے جو تمہیں ہم دیتے ہیں۔ تاویل کے معنی مآلِ کار ہوتا ہے۔ یہ قائم ہوا تھا' یہی قائم ہوگا۔ جب اور جہاں یہ قائم ہوگا' اسی کو اسلامی نظام کہا جائے گا' عزیزانِ من! اسی کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی اور یہی **احسن تاویلا** کی قرآنی تشریح آپ کے سامنے پیش کرے گا۔

عزیزانِ من! وقت ختم ہوگیا' آیت ہم نے ایک ہی لی۔ خدا کرے کہ میں نے اس کی تشریح کی ہو اور بات آپ کے ذہن میں آ گئی ہو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے' بڑی نازک چیز بھی ہے' یہ نقطۂ ماسکہ ہے' آپ کے ہاں اسلامی نظام کی بنیادی چیز ہے۔ جب بھی کسی نے اس نظام کو قائم کرنا ہے' جہاں بھی کسی نے قائم کرنا ہے' اس پہ آنا پڑے گا لیکن اس میں دشواری یہی ہے کہ اس میں نہ تو سیکولر نظام کی حکومت کے مزے رہتے ہیں' نہ مذہبی پیشوائیت رہتی ہے' نہ نظامِ سرمایہ داری رہتا ہے۔ صاحبِ ضربِ کلیمؑ ان تینوں کو مٹاتا ہے' تو خدا کی حکومت قائم کرتا ہے۔ دیکھیے! یہ سعادت کس قوم اور کس خطۂ زمین کے ہاتھ آئے گی۔ اس کے ہاتھ میں آئے گی' جو شرطِ اول جو قرآن حمید نے کہی ہے کہ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ** (2:256) ہر غیر خداوندی اتھارٹی سے انکار کرے گا' تو پھر وہ خدا کی اتھارٹی کی طرف آئے گا۔ جو قوم ایسا کرے گی' جو پہلے حصۂ ''لا'' میں سے گزرے گی کہ یہ بھی غلط ہے' یہ بھی نہیں ہے' صرف اللہ ہے' وہ قوم اس نظام کو قائم کرے گی۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کو' انسانیت کو' یہ نظام قائم کرنا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں جو قرآن حمید نے کہا ہے کہ **لِیُـظْهِـرَهٗ عَـلَـی الدِّیْنِ کُلِّهٖ** (9:33) ہر نظامِ حیات پر یہ نظام غالب آ کر رہے گا۔ بہر حال جہاں بھی اس نے آنا ہے' یہ نہ کسی قومِ خاص سے مختص ہے' نہ کسی خاص ملک کے اندر محدود ہے۔ یہ تو ذکر للعلمین ہے' جو قوم بھی اس کو اپنا لے گی' وہی قوم اسلامی کہلائے گی۔

عزیزانِ من! اب وقت ہوگیا۔ ایک ہی آیت ہم نے لی۔ خدا کرے کہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# سولھواں باب: **سورۃ النسآء** (1)‘ (آیات 60 تا 65)

وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ
اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ
الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ
اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا
بَلِيْغًا ۝۶۳ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ
وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۶۴ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا
يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1970ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 60ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:60)۔

## زیرِ نظر سورۃ النسآء کی آیت 60 کی اہمیت

یہ آیات ایک ہی موضوع کے سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جس کی ابتدا سابقہ درس سے ہوئی تھی۔ یہ بڑی اہم کڑیاں ہیں اور بڑا ہی اہم موضوع ہے۔ آج کل اور کچھ عرصہ پہلے سے اسلامی نظام‘ اسلامی حکومت اور اسلامی شریعت کی ان چیزوں کا عام چرچا ہو رہا ہے لیکن کہیں سے متعین طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکتا‘ نہ کوئی بتاتا ہے کہ اسلامی نظام ہے کیا‘ یہ متشکل کیسے ہوتا ہے؟ یہ نظام‘ غیر اسلامی نظام سے متمیز کس طرح سے ہوتا ہے؟ متعین طور پر یہ چیز کہیں سے نہیں آتی‘ نہ اقامتِ دین کے اجارہ داروں کی طرف سے‘ نہ ان سے جنہوں نے پہلی دفعہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ عین انہی دنوں قرآنِ کریم کی یہ آیات ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں اس نے اسلامی نظام کے اصولی خدوخال کو نمایاں طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ آیات اور یہ موضوع زیادہ اہم ہوجاتا ہے۔

سابقہ درس میں میں نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نظام اسلامی حکومت اسلامی شریعت کی بنیاد ایک ہی آیت پر ہے دیگر آیات اس کی تشریح کرتی ہیں اور وہ ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو لوگ خدا کی اس کتاب کے مطابق اپنے فیصلے کرتے ہیں کراتے ہیں حکومت قائم کرتے ہیں وہ مومن ہیں اسے ایمان کہا جاتا ہے اور جو فیصلہ جو حکومت جو طرزِ زندگی اس کے خلاف ہے اسے کفر کہا جاتا ہے۔ کتنا بیّن اور نمایاں سا اصول ہے جو دیدیا گیا لیکن اس سے آگے وہ چلتا ہے اور وہ مذہب اور دین میں فرق کرتا ہے۔ مذہب میں خدا کے احکام کی جسے بھی اہلِ مذہب خدا کے احکام سمجھیں کی اطاعت اپنے اپنے طور پر انفرادی طور پر ہوتی ہے زندگی کے اجتماعی نظام سے اسے واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ حکومت خواہ سیکولر کیوں نہ ہو مذہب اس کے اندر پنپتا ہے جیتا جاگتا رہتا ہے اس سے تعرض نہیں کرتا۔ دین کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ دین اجتماعی نظام کا نام ہے اگر یہ نظام نہ ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے اور اس نظام کی بنیاد ہے کہ حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم کی جائے پھر وہ اسلامی ہوتی ہے ایسا نہ ہو تو وہ اسلامی نہیں ہوتی۔

## اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم اور اس کی عملی شکل

اب اس نظام کے متعلق اس نے یہ بتایا کہ نظام کی ایک مرکزیت ہوتی ہے جسے سنٹرل اتھارٹی کہتے ہیں فائنل اتھارٹی کہتے ہیں۔ نظری اعتبار سے تو حکومت میں Sovereignty یا اقتدارِ اعلیٰ فائنل اتھارٹی کتاب اللہ کو ہی حاصل ہو گی لیکن کتاب اللہ تو اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی اس کے لیے کسی جیتی جاگتی اتھارٹی کی ضرورت ہے اور اسے ہی نظامِ مملکت میں فائنل اتھارٹی کہا جاتا ہے آج کی اصطلاح میں اسے Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) کہہ لیجئے جو کتاب اللہ کے مطابق معاملات کے فیصلے کرے۔ قرآن کریم نے اس کے لیے اللہ اور رسول کی اصطلاح اختیار فرمائی ہے۔ یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ خود رسول سے بھی یہ کہا گیا تھا کہ جب یہ تمہارے پاس اپنے معاملات لے کر آئیں تو تم قرآن کریم کے مطابق ان کے معاملات کے فیصلے کر دیا کرو۔ معاملات کے فیصلوں کے لیے اس اتھارٹی کی طرف آنا پڑے گا اور اتھارٹی جو بھی اپنا انتظام کرے جسے آپ Administrative (تنظیمی) انتظام کہتے ہیں اس کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ یہ جو نیچے افسرانِ ماتحت ہیں وہ اس فرق کے ساتھ بھی شامل ہیں کہ ان کے فیصلے کے خلاف اس فائنل اتھارٹی اس مرکزی اتھارٹی کی طرف جسے خدا اور رسول کہا گیا ہے اپیل کی جا سکتی ہے اور یہ جو مرکزی اتھارٹی ہے اس کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ ہر نظامِ حکومت میں کوئی ایسا مقام گوشہ یا اتھارٹی ہوتی ہے جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔

## بزعمِ خویش مسلمان سمجھنے والوں کی نفسیاتی کیفیت اور طاغوتی زندگی

یہ ہے نظام جس کے خدوخال قرآن حمید نے یہاں دیدیئے۔ اب اس کے بعد اس کے متعلق اس نے یہ کہا کہ آ ؤتمہیں ان لوگوں کے متعلق بھی کچھ بتائیں جو بزعمِ خویش یہ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم مومن ہیں' ایمان لائے ہوئے ہیں' آج کی اصطلاح میں ہم مسلمان ہیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ (4:60)۔ یہ یَـزۡعُـمُوۡنَ قرآن حمید کا خوب لفظ آیا ہے۔ بزعمِ خویش یہ سمجھے ہوئے ہیں' بڑے مطمئن ہیں' اس کے متعلق اندر نہ کوئی کشمکش ہے' نہ انکار ہے' نہ سرکشی ہے' اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ہم کہیں گے کہ نہایت دیانتدارانہ طور پہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جس سے پوچھیے' وہ کہے گا کہ الحمدللہ مسلمان ہوں۔ اور سارے عالمِ اسلام میں آپ دیکھیے' کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آئے گا جو مسلمان نہ ہو اور اُسے آپ کہیں کہ وہ یہ کہے کہ نہیں صاحب! میں تو مسلمان نہیں ہوں۔ یَـزۡعُـمُوۡنَ اَنَّهُـمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ (4:60) بزعمِ خویش وہ اپنے آپ کو مطمئن کیے ہوئے ہے کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں اس کتاب پر بھی جو اس سے پیشتر خدا نے نازل کی تھی۔ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ (4:60) اپنے آپ کو تو اس زعمِ باطل میں رکھا ہوا ہے' سمجھے ہوئے ہیں' دل میں خیال کیے ہوئے ہیں کہ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔ ان کی کیفیت اور ارادہ یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس کا فیصلہ طاغوت سے ہو۔

## قرآنی اصطلاحات کے خودساختہ مفہوم کا نتیجہ اور قرآن حکیم کی اپنی وضاحت

میں نے قرآن حکیم کا یہی لفظ استعمال کر دیا۔ یہ طاغوت کیا ہے؟ قرآن حکیم نے تو بڑی وضاحت سے بات بتادی تھی اور میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا کہ ہم نے اپنے آپ کو فریب دیا۔ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ اس فریبِ خویش کی یا خودفریبی کی اصل بنیاد قرآن حکیم کی ان اصطلاحات کا اپنی منشا کے مطابق ایک مفہوم متعین کرنا ہے' نہ کہ قرآن حکیم کی منشا کے مطابق۔ اور سیدھی سی بات ہے کہ قرآن کے الفاظ تو یہاں لکھے ہوئے ہیں' جو ان کا مفہوم آپ انہیں پہنا دیں گے وہی مفہوم ان الفاظ کا آپ لے لیں گے' آپ اسی کے مطابق سمجھیں گے کہ ہم قرآن حمید کے مطابق کر رہے ہیں۔ ہوا ہی ہمارے ہاں یہ ہے کہ یہ جو قرآن حکیم کے الفاظ یا Concepts (تصورات) یا اس کی اصطلاحات (Terminologies) ہیں' انہیں اس کو اپنے معنی پہنائے گئے ہیں حالانکہ قرآن مجید اتنی جامع کتاب ہے کہ اس نے اپنے کسی لفظ کو ایسا نہیں چھوڑا ہے کہ اس کے معنی متعین نہ ہو جائیں' نہ کسی اصطلاح کو ایسا چھوڑا ہے کہ اس کا مفہوم متعین طور پر قرآن مجید کی رو سے آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ یہ یَتَـحَـاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ (4:60) والی آیات پہلے آ چکی ہیں لیکن میں پھر دہراتا ہوں۔ کہا ہے کہ لَاۤ اِکۡـرَاهَ فِی الدِّیۡنِ (2:256) دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں' اس نظامِ حکومت کے

اندر رہنا چاہتے ہو یا نہیں' اس میں زبردستی کی کوئی بات نہیں ہے' اس چیز کا تمہیں اختیار دیا گیا ہے۔ **قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ** (2:256) ہمارے ذمہ یہ تھا کہ زندگی کے دوراہے پہ تم کھڑے ہو تو دونوں راستے متمیز طور پر تمہارے سامنے آ جائیں کہ غلط راستہ کونسا ہے اور صحیح راستہ کونسا ہے' وہ ہم نے کر دیا۔ بات واضح ہو چکی ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ غلط راستہ کونسا ہے اور صحیح راستہ کونسا ہے' دونوں راستے دیدیئے ہیں۔ اب دوراستے دیکھیے کہ کون کون سے ہیں؟ راستے یہ ہیں کہ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ** (2:256) جس نے طاغوت سے انکار کیا اور اللہ پہ ایمان لایا۔

## لفظ طاغوت کا لغوی اور قرآنی مفہوم

اب یہاں سے واضح ہے کہ اللہ کے مقابلے میں یہاں طاغوت کا لفظ آیا تو ہر وہ خیال' ہر وہ نظریہ' ہر وہ قانون' ہر وہ قوت' ہر وہ اقتدار جو غیر اللہ ہے یعنی اللہ کے سوا ہے' وہ طاغوت ہے۔ اللہ کے مقابل جو وہ ایک لفظ لے آیا ہے وہ طاغوت ہے۔ جس نے طاغوت سے انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا۔ **فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256) تو اس نے ایک ایسا مضبوط رشتہ تھام لیا جو کبھی دغا نہیں دے گا' ٹوٹے گا نہیں۔ اب ہمارے سامنے یہ بات آ گئی کہ قرآنِ کریم کی رو سے ہر غیر اللہ کو طاغوت کہا جائے گا۔ اس کے بنیادی لفظی معنی ''اللہ سے سرکشی اختیار کرنے والا'' ہیں۔ اور اللہ سے مفہوم خدا کی کتاب ہے' اس لیے کہ وہ تو ایسی ایک بسیط حقیقت ہے کہ ذہنوں میں نہیں آ سکتا۔ خدا سے مراد اس کی کتاب ہے۔ طاغوت' بالکل اللہ کے مقابل میں لفظ ہے' لہٰذا جو چیز قرآنِ کریم کے مطابق نہیں ہے' وہ طاغوت ہے۔ اس نے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کی' طاغوت سے انکار کی' شرط عائد کی ہے یعنی یوں کہیے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ نظریہ' تصور' اعتقاد' رسوم' آپ کی عبادات' زندگی کی کوئی شے جو قرآن کریم کے خلاف ہے' وہ طاغوت ہے۔ کہا ہے کہ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ** (2:226) ' اللہ پر ایمان لانے سے پہلے شرط یہ ہے کہ تم ہر غیر قرآنی نظریہ' تصور' عقیدے سے انکار کرو۔ جب تک یہ نہیں کرو گے' اس وقت تک ایمان باللہ نہیں آ سکتا۔ یہ تختی ایسی ہے کہ اس پر جو لکھا ہوا ہے' اسے مٹاؤ گے تو پھر نئے الفاظ لکھے جا سکیں گے' ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا لفظ نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ چیزیں ذہن سے نکلیں گی تو پھر خدا پر ایمان آئے گا۔ وہ بڑا غیور واقع ہوا ہے' کعبے کے اندر رکھے ہوئے بتوں کو نکالو گے تو پھر وہ اندر قدم رکھے گا۔ جب تک انسان کا ذہن' قلب و دماغ' غیر قرآنی تصورات سے صاف نہیں ہوتا' یہ اللہ پر ایمان کی طرف نہیں آ سکتا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ** (2:256)۔ اور اسی کو سمٹا کر اس نے اپنے اس بنیادی اصول یا نظریئے میں جسے آپ کلمہ کہتے ہیں سمو دیا ہے۔

## لفظ کلمہ یعنی لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم اور پرویزؒ کے ہاں طریقت کے دلچسپ ''وادیاں'' جو وہ چھوڑ چکے

برادرانِ عزیز! کلمہ کے معنی ہی نظریۂ حیات ہوتا ہے۔ **لا الٰہ الا اللہ** میں آپ دیکھتے ہیں کہ پہلے اس نے وہ نفی کی ہے۔ یہی **من یکفر بالطاغوت** اس کا ترجمہ ہے لا الٰہ انکار ہے' ہر الٰہ سے انکار' الا اللہ خدا کے سوا۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن کیا کیا جائے ہم تو باتیں ہی ابھی اربابِ شریعت کی کرتے ہیں' اربابِ طریقت کے ہاں آؤ گے تو وہاں تو پھر بڑی دلچسپ چیزیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی وہاں کیا ہیں؟ لا الٰہ الا اللہ' تم نے یہ جتنے باطل الٰہ معبود بنائے ہوئے ہیں' وہ خود کچھ نہیں' الا اللہ یہ سب اللہ ہی ہیں۔ چل بھئی! بڑی دلچسپ ''وادیاں'' ہیں' ان کی بھی صاحب!

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا' پر یاد آتا ہے

ان راستوں کو چھوڑے ہوئے عرصہ ہو گیا لیکن پھر بھی وہ ذہنوں میں فوراً آ جاتے ہیں۔ خیر۔ لا الٰہ' جب تک لا الٰہ میں آپ پورے نہیں ہوتے' الا اللہ نہیں آ سکتا۔ عزیزانِ من! سوچنے کی یہ بات ہے کہ کیا ہم نے زندگی میں' کسی لمحے میں' کسی مقام پر' کسی گوشے کسی دوراہے پہ کھڑے ہو کر دیکھا بھی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ تو نہیں آ گیا' کوئی ایسا تصور تو نہیں ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔ کبھی ایسا سوچنے کی ہم نے زحمت گوارہ کی ہو؟ اور وہ کہتا ہے کہ الا اللہ پر آ ہی نہیں سکتے' ایمان باللہ پہ تم آ نہیں سکتے جب تک کہ کفر بالطاغوت نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ایمان باللہ کی بات تو آگے چل کر آئے گی۔

## طاغوت کا وہ غیر قرآنی مفہوم جو ہمارے اپنے ذہنوں میں جاگزیں ہے

سوال یہ ہے کہ کفر بالطاغوت کے متعلق ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ یہ ہو گیا ہے؟ وہ اطمینان کیا کیا جائے گا' ہم تو اس طاغوت کے اندر سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور اس نے کہا یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف تم نے دیکھا ہے کہ **یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ** (4:60)۔ دیکھیے! کن کا ذکر کر رہا ہے؟ ان کا جو بزعمِ خویش سمجھے ہوئے ہیں کہ صاحب! الحمد للہ مسلمان ہیں۔ ستر کروڑ ہیں' پتہ نہیں کہ وہ کتنے کروڑ اور ہو جائیں گے مگر کیفیت ان کی یہ ہے کہ **یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ** (4:60) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں۔ اب بات صاف ہو گئی یعنی کتاب اللہ کے علاوہ اور جگہ سے فیصلے کرائیں۔ بات کتنی صاف تھی اُنہوں نے تو وہ لا الٰہ الا اللہ کیا' انہوں نے یہ کہا کہ طاغوت جو ہیں جی' وہ اس زمانے میں جو کاہن ہوتے تھے' مندروں میں بیٹھے ہوئے پروہت ہوتے تھے' پیشن گوئیاں کرتے تھے' فالیں نکالتے تھے اور طاغوت ان کو کہتے ہیں کہ جو بھی اپنے معاملوں میں فالیں نکلوانے کے لیے اس زمانے کے کاہنوں کی طرف جائے گا' بس وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اور اب چونکہ نہ وہ کاہن

رہے' نہ وہ مندر رہے' دنیا سے ان کے ہاں کا طاغوت تو ختم ہوا۔ اور جب ان سے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو ان کے پاس نہیں جاتے۔ تو یہ چیز ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ ان اصطلاحات کے مفہوم جب ہم نے اپنے ذہن میں یوں متعین کر لیے' راستے صاف کر لیے لیکن یہاں تو یَزْعُمُوْنَ ہے لہٰذا سوال تو اپنے ذہن کا نہیں ہے' سوال تو اس کے مطابق کا ہے۔ سوچیے عزیزانِ من! کہ جو بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے لیکن اپنی زندگی کے معاملات کے فیصلے غیرِ کتاب اللہ سے کراتا ہے' اس کے متعلق یہ چیز اس نے کہی کہ تم نے پھر ان لوگوں کو بھی دیکھا جبکہ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ (4:60) ہم نے حکم دیا تھا کہ اس سے انکار کرو' اپنے لوحِ دماغ سے' ان نقشوں کو پہلے مٹاؤ' ان بتوں کو اس کعبے سے باہر نکالو۔ ہم نے انہیں حکم دیا تھا لیکن اس کے باوجود تم ان لوگوں کی کیفیت دیکھتے ہو کہ کہتے یہ ہیں کہ الحمدللہ مسلمان ہیں۔

## چودہ سو سال سے ہماری علمی اور تاریخی پس ماندگی کی حالت زار

عزیزانِ من! اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ یہ ان کی طرف جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا (4:60) یہی تو شیطان کا راستہ ہے جو چاہتا ہے کہ تمہیں راہِ راست سے اتنی دور پھینک دے کہ راہِ راست کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ رہے۔ اور اب ہماری یہی کیفیت ہو چکی ہوئی ہے۔ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا (4:60) کہیں آس پاس ہی پھینکے تو پھر بھی پتہ چل جائے کہ نہیں صاحب! دوسرا راستہ آ گیا' اتنی دور پھینکے کہ جب بھی اب کہیں اسلام کے متعلق ذکر آئے بس وہ چودہ سو سال پہلے کی تاریخ آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ وہیں سمٹا ہوا اس کے بعد پھر آتا ہی نہیں ہے آگے' مثال بھی کوئی نہیں دی جا سکتی صاحب! یہ ہے ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا (4:60)۔ یہ چیز آ گئی اسلامی نظام کی کہ ہر غیرِ کتاب اللہ کا جو فیصلہ ہے' اس سے انکار ہے' کتاب اللہ کے مطابق حکومت کا قائم کرنا اور فیصلے کرنا ہے۔ سارے اعتقادات' نظریات' قوانین' ضوابط' اصول' سب اس کے مطابق پرکھتے چلے جایئے' کفر اور ایمان میں امتیاز ہوتا چلا جائے گا۔ اب یہ جو لوگ ہیں کہ اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور کیفیت یہ ہے' اسی کو تو اس نے منافقت کہا ہے۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (4:61) ان سے جب کہا جاتا ہے کہ بھئی! ادھر آؤ کہ یہ نظام جو خدا کی کتاب پر مبنی ہے اور جس کا سربراہ' جس کی مرکزی اتھارٹی یہ رسول ہے' اس نظامِ خداوندی کی طرف آؤ' جب ان سے کہا جاتا ہے تو تم انہیں دیکھو گے کہ وہ لوگ جو یونہی بزعمِ خویش سمجھے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اس طرف آنا نہیں چاہتے' انہیں تم دیکھو گے کہ وہ کس طرح سے پھر اس طرف آنے سے رکتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ آنا تو بڑی چیز ہے' آپ یہ آواز دے کر دیکھیے کہ صاحب! اسلام کا جو مدار ہے' وہ قرآن کریم ہے' خدا کی

کتاب ہے‘ اس کے سوا کچھ نہیں تو اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ کس طرح سے راستے میں یہ روک پیدا کی جاتی ہے کہ کوئی نہ ادھر آنے پائے۔ کہا ہے کہ اس وقت تو ان کی یہ کیفیت ہے تو جب معاملات کے فیصلے کے لیے ان سے کہا جاتا ہے تو اس وقت تو یہ اعراض برتتے ہوئے‘ ادھر نہیں آتے لیکن جب کبھی کچھ مصیبت آتی ہے تو پھر دیکھیے کہ اس مصیبت کے وقت کس طرح تمہارے پاس آتے ہیں اور کس طرح قسمیں اٹھاتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارا ارادہ تو یہ نہیں تھا‘ ہماری نیت تو یہ نہیں تھی۔ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا (4:62) اس وقت تو ان کی یہ کیفیت ہے کہ معاملات کے فیصلوں کے لیے کہیے کہ صاحب! آؤ ادھر اس اتھارٹی کی طرف‘ خود بھی رکتے ہیں دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ لیکن جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو پھر دیکھیے کس طرح بھاگے ہوئے آتے ہیں‘ قسمیں اٹھاتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہماری نیت‘ ہمارا ارادہ‘ قطعاً یہ نہیں تھا۔ ہم تو حسن کارانہ انداز سے یہ کچھ کرتے تھے۔ ہم تو چاہتے یہ تھے کہ موافقت پیدا ہوتی رہے لوگوں کے اندر اس لیے ہم نے یہ روش اختیار کی تھی۔

## مسئلہ تقدیر کی اہمیت

بات تو آگے چلے گی‘ اسی سلسلے میں درمیان میں ایک ٹکڑا آ گیا ہے جو آپ کے ہاں کے اس مسئلے کو وضاحت سے سامنے لے آتا ہے جس نے خواہ مخواہ آپ کو ایک طلسم پیچ و تاب میں الجھا رکھا ہے۔ یہ ہے جسے تقدیر کا مسئلہ کہا جاتا ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے‘ اللہ کو یہی منظور تھا صاحب! اس کے حکم کے سامنے کوئی پر نہیں مار سکتا‘ پھڑک نہیں سکتا‘ ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا‘ اس لیے جو بھی مصیبت آتی ہے‘ یہ خدا کی طرف سے آتی ہے‘ اسے برداشت کیا جائے گا صاحب! وہ کہتا ہے کہ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (4:62) جب ان پہ کوئی مصیبت آتی ہے‘ یہ خود ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ مصیبتیں اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں‘ کوئی مصیبت کسی طرح بھی خدا کی طرف سے نہیں آتی۔

## تمام کے تمام مصائب و آلام انسان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں

وہ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (22:10) نہیں ہے‘ کیا بات ہے ان دو لفظوں ظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ کی بھی! کیا کہوں‘ آگے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ ظالم کی جگہ یہ ظَلَّامٍ آیا ہے یعنی بہت زیادہ سختی کرنے والا اور اُدھر عبد کی جمع عَبِيْدِ ❶ ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ بیچارے اتنے

---

❶ یہ عباد اور عبید دراصل عبد کی جمع ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کر کے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو عبید کہتے تھے (پرویزؒ : لغات القرآن جلد سوم‘ ادارہ طلوع اسلام‘ لاہور‘ 1961‘ ص۔1124)

اتنے سے ذرے، عاجز و ناتواں ہیں، ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کو تکلیف دیں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ کوئی مصیبت اس کی طرف سے نہیں آتی۔ وہ **بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ** (4:62) ہوتی ہے یعنی اس فرد کی، اجتماعی نظام کی، معاشرے کی، بہرحال انسانوں کی، اپنی لائی ہوئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ یہ مصیبتیں تو وہ لاتے ہیں، مصیبتوں میں دوسروں کو گرفتار کرتے ہیں، یہ ان کی ایک سامریت تھی، ان کی سحر آفرینی تھی کہ ان کا ذہن کبھی اِدھر منتقل نہ ہونے پائے کہ ان لوگوں کی وجہ سے یہ ساری مصیبتیں معاشرے پہ آ رہی ہیں۔

## انسانوں کے ان مصائب وآلام میں صبر وشکر کے غلط مفہوم کا پرچار

انہوں نے ذرا Twist (توڑ موڑ) لیا، مذہبی پیشوائیت کو ساتھ ملایا اور کہا کہ ہر چیز خدا کے حکم سے ہوتی ہے، بندۂ بشر کیا کر سکتا ہے۔ اپنی ہر مصیبت پر کچھ رولیا، کچھ خدا کے سامنے گڑگڑا لیا، اس کے بعد وہ صبر دینے والے آ گئے کہ میاں! یہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، صبر کرو شکر کرو۔ یہ صرف اس لیے کیا ہے کہ جہاں سے ہوتا ہے اُدھر نگاہ نہ اٹھنے پائے۔ یہ ہے جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا ہے، یہ ہے وہ تقدیر کے مسئلے کی اصل لم۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ م بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ** (4:62) جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خود ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ بر سبیلِ تذکرہ یہ بات آ گئی تھی اس لیے میں نے یہ عرض کیا ورنہ قرآنِ کریم میں تو بیشتر مقامات میں یہ چیز ہے اور مکافاتِ عمل کی اصل و بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔ وہ تو خود ہی اس مسئلے کو صاف کر دیتا ہے۔ اگر یہ مصیبت آتی ہی اسی کی طرف سے ہے، اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا، تو پھر انسان صاحبِ اختیار نہیں، تو اپنے اعمال کا ذمہ دار کیسا، جب ذمہ دار نہیں تو پھر اس کو جزا اور سزا کیسی۔ اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰہُ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ** (4:63) یہ وہ لوگ ہیں، جو زبان سے جو کچھ جی میں آئے کہیں لیکن اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے بنیاد ایمان کی کہ وہ جانتا ہے کہ دلوں میں بھی کیا ہے۔

میں ابھی آگے چل کر عرض کرونگا کہ اسی سلسلے کی آخری کڑی ایک بڑی عظیم آیت آ رہی ہے لیکن ایمان باللہ کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ وہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ ''وہ واقف ہے'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ خیالات بھی اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتے ہیں اور مجھے ان نتائج کو بھی بھگتنا پڑے گا، مجھ پر ان کی بھی Accountability (جواب دہی) ہے۔ میں ابھی آگے چل کر عرض کرونگا کہ اسلامی نظام کی اصل 'لم' بنیاد کیا ہے لیکن وہ یہی چیزیں ہیں جو آگے چل کر آپ کے سامنے آئیں گی۔ یہاں کہا ہے کہ **فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ** (4:63) ان سے اعراض برتو۔ نظریہ آتا ہے کہ صاحب! اتنا بڑا آخری رسول ﷺ ہے جس کے ذمہ نوعِ انسانی کو راہِ راست پہ لانا تھا۔ انہیں ﷺ کہا جاتا ہے کہ **فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ** (4:63) ان سے اعراض برتو۔

## اعراض برتنے والوں کے امراض تک کے لیے حکیمانہ انداز میں باہمی روابط کا سبق

لیکن آپ دیکھیے یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق یہ چیز معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے' زبان پہ کچھ اور ہے' آ کر کہتے کچھ ہیں' کرتے کچھ ہیں' نیتیں کچھ ہیں' الفاظ کچھ ہیں۔ان کے متعلق یہ ذکر ہو رہا ہے۔ٹھیک ہے ان سے اعراض تو برتا جائے گا۔ یہ لوگ جماعت کے اندر بڑے ہی نقصان اور ضرر کا باعث بنیں گے تو کہا ہے کہ ان سے اعراض برتو۔تو کیا یہ چیز ہوگئی کہ بس ان کو چھوڑ دو' تباہ ہونے دو' ان کو برباد ہونے دو؟ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے۔کہا ہے کہ وَ عِظْهُمْ (4:63) اس کے باوجود صحیح بات ان سے کہتے رہو' ان کو سمجھاتے رہو۔ پہلے یہ کہا تھا کہ ان کے دل میں جو کچھ ہے' وہ ہم جانتے ہیں اور اب یہ کہا ہے کہ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (4:63) انہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی زیادہ شدت سے سمجھانے کی ضرورت ہے' انہیں اس طرح سے سمجھاؤ کہ بات ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔اللہ اکبر! جن سے اعراض برتا جاتا ہے' ان سے یہ تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ اعراض جماعتی حیثیت سے برتا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ اس جماعت کے افراد بن کر نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ بڑے ہی خطرناک نقصانات کا موجب بنیں گے لیکن انسانوں کی حیثیت سے تو یہ تمہارے پاس ہیں۔اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ تمہاری زیادہ توجہ کے مستحق ہو گئے ہیں' ان کے دلوں کے اندر روگ ہے۔ یہ جو اور آ رہے ہیں' ان سے ظاہرہ کچھ لغزشیں ہونگی' ان لغزشوں کی تلافی آسانی سے ہو جائے گی۔ان کے دلوں کے اندر روگ ہے اس لیے انہیں خاص طور پہ اس انداز سے سمجھاؤ جسے تبلیغ کہتے ہیں' ان تک بات پہنچاؤ کہ وہ بات فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (4:63) ہو یعنی ان کے دل کی گہرائیوں تک اتر جائے۔

عزیزانِ من! حق وصداقت کی زندگی اسی وقت بسر ہو سکتی ہے جب انسان میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔جب تک دل نہ بدلے' انسان کی روش نہیں بدل سکتی۔اس وقت ایمان محض ان کی زبانوں تک ہوتا ہے۔ان کے قلب کے اندر جاگزیں نہیں ہوا۔اس کے لیے کتنی کوشش کرنی پڑتی ہے۔آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے اور مقامات پہ بھی یہ کہا ہے کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) انہیں چھوڑو لیکن چھوڑو بڑے حسن کارانہ انداز سے۔یعنی جو تعلق قائم کرنا ہے' وہ تو دنیا جانتی ہے کہ حسن کارانہ انداز سے تعلقات قائم کرنے چاہئیں' یہاں تعلیم یہ ہے کہ جو تعلق چھوڑ رہے ہو' اس کو بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔اور یہ کیا انداز ہے' جسے حسن کارانہ کہا گیا ہے!

## جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ اسلام کی طرف یہ دعوت دینے والا ہے' اس کی ذمہ داریاں کتنی بڑھتی ہیں! کہا ہے کہ وَذَرِ

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (6:70) یہ لوگ جنہوں نے دین کو مذاق بنا رکھا ہے' انسانی زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے' یہ جو طبعی زندگی کے فائدے ہیں' دنیاوی مفاد ہیں' انہوں نے انہیں عجیب فریب میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس دھوکے میں ہیں کہ مقصدِ حیات عیش و عشرت ہے اور بس۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو چھوڑ دو۔ جی ہاں! چھوڑ دیا تو کیا اب ان بیچاروں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوگا' وہ طبیب ان کی بالیں سے یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اس وقت کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ کیا یہ ابدی مایوسیوں کے اندر چھوڑ دیئے جائیں گے؟ اتنی سی آیت سے تو یہی نظر آتا ہے۔ کہا ہے کہ نہیں! وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ (6:70) چھوڑ دو لیکن اس کے بعد قرآن کریم کی رو سے ان کو نصیحت کرتے رہو۔ یہ کیوں کرتے رہو؟ اس کے بعد میرا کیا فریضہ ہے؟ ان کی کیفیت یہ تھی کہ میں نے اتنا کچھ کیا' اس کے باوجود انہوں نے نہ میری سنی' نہ میری مانی' نہ انہوں نے اطاعت اختیار کی۔ اس کے برعکس یہ سرکشی' اعراض' منافقت' یہ کچھ اختیار کرتے چلے گئے' اس کے باوجود کہا ہے کہ میں ان تک یہ چیزیں پہنچائے چلا جاؤں' نصیحت کیے چلا جاؤں' تعلیم دیئے چلا جاؤں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ کچھ کیوں کرتا چلا جاؤں؟ اس کے لیے کہا ہے کہ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (6:70) ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص محض اس لیے اپنی غلط کاریوں سے تباہ ہو جائے کہ اس تک صحیح بات پہنچی نہیں تھی۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا اسوۂ حسنہ

کتنا مشفق ہے یہ خدا! کتنا غم خوار ہے یہ! ان کے برتاؤ کی کیفیت یہ ہے' اس مقام تک پہنچا ہے جہاں کہا ہے کہ وَذَرِ الَّذِيْنَ (6:70) ان کو چھوڑ دو' یہ نہیں چل سکتے' یہ تنگ کرتے ہیں۔ چھوڑنے کے بعد بھی یہ کہتا ہے کہ وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ (6:70) لیکن بات ان کو سمجھاتے چلے جاؤ۔ اس لیے کہ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (6:70) کسی شخص کو' اس کے غلط اعمال کی وجہ سے' قرآنِ کریم سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ بِمَا كَسَبَتْ تو وہی ہے جو کچھ ان کی اپنی بداعمالیاں ہیں' ان کی وجہ سے تباہی آئے گی لیکن یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اس غلط روش پہ اس لیے چلے جا رہے ہوں کہ صحیح روش تم نے ان کو نہیں بتائی' اس لیے یہ کہیں تباہ نہ ہو جائیں۔ تم جانتے ہو کہ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ (6:70) خدا کے سوا ان بیچاروں کا کوئی نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی رفیق اور مددگار ہو سکتا ہے' نہ سفارشی۔ اللہ اکبر! سلوک اور برتاؤ یہ ہے کہ ان کے ساتھ اب تعلقات نہیں رکھے جا سکتے لیکن اس کے بعد بھی یہ کہا ہے کہ تم اپنی بات پہنچائے چلے جاؤ تاکہ یہ اپنی غلط روش کی وجہ سے تباہ نہ ہو جائیں۔ یہ اس واسطے ہے کہ خدا کے سوا ان بیچاروں کا کوئی نہیں ہے۔ ایسا خدا ہو تو بتاؤ کہ کیا وہ خواہ مخواہ انسانوں کے اوپر مصیبتیں نازل کرتا چلا جائے گا؟ یہ ہے ذمہ داری' عزیزانِ من! جسے تبلیغ کرنے والا' دوسرے تک بات پہنچانے والا کہتے ہیں۔

ان کی طرف سے گالیاں مل رہی ہیں' اینٹیں آ رہی ہیں' پتھر آ رہے ہیں' لہولہان ہو رہے ہیں' جانیں جا رہی ہیں' میدانِ جنگ میں آ گئے ہیں' مقابلے میں آ گئے ہیں' یہ سب کچھ وہ کر رہے ہیں اور اس ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اِس کے باوجود تم ان تک صحیح بات پہنچاتے رہو۔ یہ بے وقوف احمق اپنی حماقت کی وجہ سے' اپنے آپ کو کہیں تباہ نہ کر لیں اس لیے کہ خدا کے سوا ان کا کون ہے جو یہ کچھ ان کے لیے کرے گا۔ یہ ہے **قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا ۢ بَلِيْغًا** (4:63) ۔اور یہ تو خدا ہے جو اس کو کہنے والا ہے اور جس ﷺ سے یہ کہا جا رہا ہے' یہ کرنے والا ہے۔اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس طبیب مشفق ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ کہا جا رہا ہے۔غور کیجیے کہ یہ طبیب کس قدر غمگسار ہے' خود خدا رسول سے کہہ رہا ہے یعنی اُدھر تو خدا نے رسول سے یہ کہا ہے کہ یہ لوگ یہ کچھ کرتے گئے مگر تم سنو! یہ احمق ہیں' یہ بے وقوف ہیں' کہیں یہ اپنی غلط روش کی بنا پر یونہی تباہ نہ ہو جائیں' انہیں روکتے چلے جاؤ' بتاتے چلے جاؤ۔

اور عزیزانِ من! اس کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ خدا خود اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ **فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا** (18:6) اے رسول! ہم جانتے ہیں کہ تُو اپنے سینے میں ایسا دردمند دل رکھتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایسی واضح حقیقت پر بھی ایمان نہ لائے تو' تُو اِن پر آنے والی تباہی کے غم میں اپنی جان گھُلا لے گا۔اس بنا پر کہ یہ کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تم اپنی جان کو گھلا رہے ہو' تم اس غم میں مر جاؤ گے کہ یہ کیوں ایمان نہیں لائے۔خدا تو یہ خدا ہے اور اس کا پیغامبر ﷺ تو ایسا پیغامبر ہے جو اعراض برتنے والوں کے غم میں اپنی جان گھلا رہا ہے اور خدا پھر بھی ان کے متعلق کہہ رہا ہے کہ انہیں پیغام پہنچائے جاؤ۔جس کے ساتھ یہ بیت رہی ہے' جس کی کوئی چیز ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں' وطن تک چھوڑنا پڑا ہے' اس کے بعد میدانِ جنگ میں آ گئے ہیں' ان کے متعلق یہ کیفیت ہے۔خدا کہہ رہا ہے کہ ہمیں تو تمہارے متعلق کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ تُو اس لیے غم سے مر رہا ہے کہ یہ لوگ کیوں نہیں صحیح راستے پر آتے' کیوں اپنے آپ کو نہیں بچاتے' کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ اس غم میں تُو اپنی جان گھلا لے گا۔

## اسلامی نظام کو متشکل کرنے کے سلسلہ میں راہِ منزل کی مشکلات اور ''آسانیاں''

اسلامی نظام کیسے قائم ہوتا ہے؟ دیکھ رہے ہیں اس نظام کی تبلیغ کرنے والوں کی یہ کیفیت ہونی چاہیے۔یہاں کوئی چیز' جو کسی کی منشا کے ذرا خلاف چلی جائے' کفر والحاد کے فتوے لگ جاتے ہیں' گالیوں کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے' ماتھے پر اتنے شکن آ جاتے ہیں' آنکھیں ہیں کہ خشمگیں اور لبوں پر ہے تو وہ کف بر وہاں' یوں کیفیت ہو جاتی ہے کہ جیسے سر پر بھوت سوار ہو گیا ہے۔نکل جاؤ! مردود کے علاوہ تو ان کو کوئی لفظ ہی نہیں یاد ہوتا۔نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔وہاں یہ کیفیت ہے کہ یہ حکم ملتا ہے اور اس حکم پر عمل کرنے والے کی کیفیت یہ ہے کہ اپنی جان گھلا رہا ہے کہ یہ کیوں تباہ ہو رہے ہیں۔ایسا مشفق طبیب' ڈاکٹر اگر کسی مریض کو نصیب ہو جائے تو کس قدر خوش بختی ہے

اس مریض کی بھی صاحب! اور یہ کیفیت ہونی چاہیے اس شخص کی کہ جو دوسروں تک خدا کی کتاب کو پہنچا رہا ہے کہ وہ اپنی جان گھلا رہا ہے اس لیے کہ کہیں یہ اپنی غلط روش کی وجہ سے تباہ نہ ہو جائیں۔

## اجتماعی طور پر انسانی معاشرے میں نظامِ خداوندی کے بنیادی خدوخال

اب آگے آیئے جو میں نے کہا تھا کہ بات وہ کرو جوان کے دل کے اندر اتر جائے۔ یہ کیا بات کہی تھی؟ پہلی چیز تو اسی نظام میں' میں پہلے یہ عرض کردوں کہ یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (4:64) رسول کو بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے تاکہ خدا کے حکم کے مطابق' قانونِ خداوندی کے مطابق' اس کی اطاعت کی جائے۔ یعنی اطاعت براہِ راست خدا کی نہیں کی جاسکتی اس لیے کہ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو خانقاہیت کا تصور ہے کہ گوشوں میں' حجروں میں' کونوں میں' زاویوں میں' جنگلوں میں' غاروں میں' بیٹھ کر خدا کی اطاعت کی جاتی ہے' اس سے لو لگائی جاتی ہے' اس کا قرب حاصل کیا جاتا ہے یہ کس قدر طاغوتی تصور ہے' یہ یکسر قرآن حمید کے خلاف ہے' یہ مذہب کا تصور ہے' یہ دین کا تصور نہیں ہے۔ مذہب کے تصور میں ضرورت ہی نہیں ہے کسی رسول کو بھیجنے کی' یہی خدا کے احکام اگر کسی پہاڑ کی چٹان پر وہ لکھ دیتا اور اس کے لیے مشکل کیا تھا ایسا کرنا' تو ٹھیک ہے اپنے اپنے طور پہ کرتے چلے جاؤ۔ چلیے رسول آیا بھی' دے گیا کتاب' اپنی اپنی جگہ اس کو لے لیجیے اور اس کے بعد اپنے طور پر اس کے حکم کی اطاعت کرتے چلے جایئے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔

## لفظ اطاعت کا لغوی مفہوم اور اس کی اہمیت

ان احکام کے ساتھ ایک محسوس شخصیت آتی ہے' وہ ایک نظام قائم کرتی ہے' اس کی وساطت سے خدا کے احکام کی اطاعت کی جاتی ہے۔ پہلے تو طَـــاعَ (4:64) کا لفظ ہی جو قرآن مجید نے استعمال کیا ہے' خود اس کے اندر یہ چیز ہے کہ یہ بات برضا ورغبت کی جاتی ہے۔ ایک پھل وہ ہوتا ہے جسے آپ جھانپل سے مار کر اتارتے ہیں' وہ کچا پھل ہوتا ہے' وہ اپنی مرضی سے نہیں اترتا' آپ اسے زبردستی اتارتے ہیں۔ اور ایک پھل وہ ہوتا ہے کہ جب وہ بالکل پک جاتا ہے تو خود ٹپک پڑتا ہے۔ جو پھل اس طرح سے خود پک کر آپ ٹپک پڑے' اسے عربی زبان کے اندر طَـــاعَ کہتے ہیں۔ یہ اطاعت تو اس طرح سے کی جاتی ہے۔ رسول کو اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اس کی اطاعت خدا کے قانون کے مطابق کی جائے۔

## قرآنی نظامِ حکومت کی تشکیل کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما کے سوا اور کچھ نہیں ہے

اب آگے دیکھیے کہ اس اطاعت کا نظام کیا قائم کیا جارہا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ (4:64) وہ کہ جو

اپنے آپ پہ کچھ زیادتی کر بیٹھیں۔ دیکھا! اپنے آپ پہ زیادتی کی جاتی ہے' خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ خود اپنے آپ پہ کوئی زیادتی کر بیٹھیں یعنی یہی ہے جس اصول اور جس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کو کہا گیا ہے' اس کے خلاف ان کا قدم اٹھ جائے تو وہ انسان کی اپنی ذات کے خلاف ایک ظلم ہوتا ہے۔ یہ جسے آپ قوانین کی اطاعت کہتے ہیں' وہ یہ نہیں ہے کہ کوئی حکومت ہے' اس حکومت کے قوانین کی ہم کچھ اطاعت کرتے ہیں' اس کا اس سے کچھ کام چل رہا ہے' اس کا کوئی مقصد پورا ہو رہا ہے۔ دین میں یہ بات نہیں ہے۔ یہ سارا مقصد تمہاری اپنی ذات کا ہے' اس سے تمہاری ذات سنورتی ہے' یہ چیزیں کہی جاتی ہیں۔ اسی لیے جہاں بھی اس نے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی کہی ہے' اس نے کہا یہ ہے کہ تم اپنی ذات کے خلاف ظلم کر رہے ہو۔

## دین کے نظام کے بالمقابل مذہبی تصورات کے خدوخال

کہا ہے کہ جب یہ اپنے خلاف اس قسم کی کوئی لغزش کر بیٹھیں تو اس کے لیے مذہب میں کیا کرنا ہوتا ہے؟ یہ توبہ ہوتی ہے' استغفار ہوتا ہے۔ یہ کچھ کہاں کرنا ہوتا ہے؟ یہ گھر کے اندر مصلے پہ' اپنے طور پر کرنا ہوتا ہے۔ کیا اسے خدا اور بندے کے درمیان کوئی بات سمجھی جاتی ہے؟ یا اللہ میری توبہ! تُو بخشنے والا ہے' اس کے لیے اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہِ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ وَّ اَتُوۡبُ اِلَیۡہِ کہا جاتا ہے' اس کے اندر کسی تیسرے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو مذہب کا تصور ہے' دین کا نہیں۔ یہ لغزش ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ جَآءُوۡکَ (4:64) اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ تیرے پاس آئیں۔ دیکھ رہے ہیں آپ یہاں توبہ اور استغفار کا تصور کیسے بدل رہا ہے۔ یہ ایک نظام ہے۔ جَـــآءُوۡکَ (4:64)۔ اب اس میں یہ بات ذہن میں آ گئی کہ یہ ہے اصل میں اتھارٹی کہ جس سے جا کر عام الفاظ میں معافی طلب کی جائے گی تو یہ معاف کرے گا' معاف کر دینا یا سزا دے دینا اس کے اختیار میں ہے' اس کے پاس جاؤ۔ کہا ہے کہ نہیں! فَـاسۡتَـغۡـفَـرُوا اللّٰـہَ (4:64) تیرے پاس آ کر یہ کہیں کہ خدا سے ہماری حفاظت کا سامان طلب کر دے۔ اب خدا سے مراد تو آپ کو معلوم ہے کہ کتاب ہے۔ اپنے طور پہ نہیں' تیرے پاس آ کر یہ چیز کہیں کہ یہ ہے ہم سے جو لغزش ہوئی ہے۔ اب قانونِ خداوندی کے مطابق اگر اس میں ہمارے لیے حفاظت کا سامان نکلتا ہے تو آپ ہمیں اس کے Consequences (عواقب) سے محفوظ کر دیجیے۔ غَـفَـرَ' اِسۡتِـغۡـفَـارُ کے معنی ہی حفاظت طلب کرنا ہوتا ہے۔ وہ جو نقصان ہونا ہے' اس نقصان سے حفاظت طلب کرنے کے لیے تیرے پاس آئیں۔ یہ دیکھیے جَـــآءُوۡکَ ہے' تیرے پاس آئیں لیکن آپ غور کیجیے' ایمان کس طرح خدا کی طرف بتایا جاتا ہے اور یہ کہے کہ کتاب اللہ سے ہمارے لیے حفاظت کا سامان بتا دیجیے کہ کس طرح سے ملے گا۔

## قرآنی نظام میں لغزش کے ضمن میں ایک اتھارٹی فیصلہ صادر کرتی ہے

کہا ہے کہ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ (4:64)۔قانونِ خداوندی کی رو سے انہیں معافی مل سکتی ہے' یہ ایسی چیز ہے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے ان کو معاف کیا جاسکتا ہے: وَ اسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ (4:64) یہ رسول کے پاس آئے' خدا کے استغفار کے لیے' رسول ان کے لیے خدا سے یہ چیز طلب کرے۔ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں ایک وسیلہ بنا دیا گیا ہے جیسے اب ہم نے پیروں کا سمجھ لیا ہے کہ براہِ راست تو ہم خدا سے بات نہیں کر سکتے' حضرت صاحب کے پاس جایئے' وہ خدا سے یہ منوا لیں گے۔اس کا سوال ہی نہیں ہے۔وہ اس اتھارٹی کے پاس کتاب اللہ سے فیصلہ لینے کے لیے آئیں' یہ اتھارٹی خود مجاز نہیں ہے کہ اپنے طور پر جسے چاہے کہے' اچھا جاؤ ہم نے تمہیں معاف کر دیا' یہ تو ملوکیت میں ہوتا ہے۔ یہاں تو سب سے بڑی اتھارٹی بھی خود قرآن حمید کی پابند ہے' کتاب اللہ کی پابند ہے' یہ اس کو کہاں سے اختیار ہے کہ یہ اپنے طور پہ کہدے کہ میں نے معاف کر دیا۔ وہ دیکھے کہ کتاب اللہ کا اس کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ رسول معاف کر دے۔ کہا ہے کہ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ (4:64) یہ رسول ان کے لیے خدا کی کتاب سے حفاظت طلب کرے' دیکھے کہ آیا ان کو وہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟

## قرآنی نظام میں مرکزِ ملت کو بھی قرآن حمید کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے کہ کیا جو قوانین رائج ہیں' لوگ ان پر چلتے بھی ہیں؟ ایک اہم سوال۔

آپ دیکھتے ہیں' ہمارے ہاں نظام کے ٹکڑے کس طرح سامنے آ رہے ہیں۔اور اس کے بعد ہے کہ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا (4:64) تیرے پاس خدا سے حفاظت طلب کرنے کے لیے آئیں' تم خدا سے حفاظت طلب کرو۔اور اگر یہ رسول کہدے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے تمہیں معاف کیا تو ذہن میں آسکتا تھا کہ یہ رسول ہے' یہ اتھارٹی ہے جو معاف کر سکتا ہے۔ کہا ہے کہ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا (4:64) تم دیکھو گے' اگر وہ کتاب اللہ سے دیکھے گا کہ اس میں معافی کی گنجائش ہے تو پھر یہ اپنے خدا کو "تَوَّابًا رَّحِيۡمًا" پائیں گے۔ کس انداز سے بات سمجھا گیا ہے قرآن حمید!

کیا شاندار تعلق ہے افراد کا اس نظام سے اور اس نظام کا خدا سے! اب آئی وہ آیت' جو بنیاد ہے اسلامی نظام کی۔ اسلامی نظام کے متعلق زیادہ سے زیادہ جو وضاحت کی جاتی ہے' وہ یہی ہے کہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کیا جائے' قوانینِ شریعت کو نافذ کیا جائے۔ میں مانے لیتا ہوں کہ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ صاحب! وہ جو قرآن حمید کے احکام ہیں انہی کو نافذ کیا جائے گا' یہ بھی ہے کہ ان کی اطاعت یعنی ان قوانین کے مطابق لوگ بھی چلیں' ان کو مان لیں۔ آج بھی تو بہت سے قوانین ہیں جن کے مطابق لوگ چلتے ہیں' انہیں مان رہے

ہیں۔ان قوانین میں بیشتر ایسے ہیں جو شریعت کے مطابق ہیں مثلاً چوری کی سزا ہے' فریب دہی کی سزا ہے۔لوگ ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ان قوانین کے مطابق زندگی بھی بسر کرتے ہیں' لوگ ان قوانین کو مانتے بھی ہیں' اس کے مطابق کام بھی کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا نظامِ خداوندی یا جو نظام قرآن حمید چاہتا ہے' جس قسم کا ایک حکومتی نظام چاہتا ہے' اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ قوانین نافذ کیے اور لوگوں نے ان قوانین کے مطابق چلنا شروع کر دیا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

## خدا کی کتاب کے مطابق قوانین کے نفاذ کے باوجود ایک اہم شق کی تکمیل جو نہایت ضروری ہے

عزیزانِ من! نظر یہ آتا ہے کہ اس میں تو کچھ اور چاہیے ہی نہیں' منتہا ہی یہ نظر آ رہا ہے۔آپ دیکھیے گا' خدا کی کتاب کے مطابق قوانین نافذ کریں' لوگ ان کو ماننا شروع کر دیں تو اس سے آگے کیا تصور جائے گا کہ صاحب! ابھی تک حکومتِ خداوندی قائم نہیں ہوئی' ابھی تک وہ مومن نہیں ہوئے' یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی حکومت قائم ہو جائے۔یہ اس سے آگے جاتا ہے اور یہ ہے وہ چیز جس بنیاد پر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔اسے پھر دہرا دوں کہ یہ جو قوانین ہیں' کون ہے جو ہم میں سے یہ نہیں جانتا کہ جھوٹ بولنا قرآن کریم کی رو سے جرم ہے' چوری کرنا قرآن کریم کی رو سے جرم ہے' اس کے باوجود عمل نہیں ہو رہا۔جہاں عمل ہو رہا ہے' وہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک خاص قانون کی اطاعت تو ہو رہی ہے لیکن اس زندگی کے اندر تبدیلی نظر نہیں آ رہی۔قانون کے پابند لوگوں کو بھی آپ دیکھیں گے کہ اس حد تک تو وہ قانون کی پابندی کر رہے ہیں مگر زندگی کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آ رہی۔دیکھیے قرآن حمید کس طرح سے کہتا ہے! یہ لرزہ دینے والی آیت ہے' عزیزانِ من! جسے اس انداز سے قرآن حمید نے بیان کیا ہے۔کہا ہے کہ فَلَا (4:65) نہیں' قطعاً نہیں! اس طرح سے نہیں جیسے یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ احکام' یہ قوانین نافذ کر دیئے' انہوں نے ان کی اطاعت کر لی اور مومن ہو گئے۔فَلَا (4:65) بات یوں نہیں ہے' انداز دیکھیے! کہا ہے کہ بالکل ایسے نہیں۔آگے ہے کہ وَ رَبِّکَ (4:65) تیرے خدا کی قسم! یوں نہیں' بات یوں ہے جو ہم کہہ رہے ہیں یعنی خدا خود یہ کہہ رہا ہے۔قسم میں نے اپنے روزمرہ کے مطابق کہا ہے۔عربی زبان میں یا قرآن حمید کی رو سے تو یہ ہوتا ہے کہ تیرا خدا اس بات پر شاہد ہے جو ہم کہنے لگے ہیں کہ یہ بات نہیں جو یہ لوگ یوں سمجھے ہوئے ہیں۔ یہاں اطاعت کرنے والوں کا ذکر آ رہا ہے کہ قطعاً نہیں۔وَ رَبِّکَ (4:65) تیرا خدا اس پہ شاہد ہے کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ (4:65) یہ ایمان والے قطعاً نہیں کہلا سکتے' نہ ہو سکتے ہیں۔اب اس سے زیادہ اور تاکید والے الفاظ نہیں ہو سکتے۔

## سب کچھ ہونے کے باوجود قرآنی نظام کی ایک بنیادی شرط کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ بتانے کے لیے کہ ایمان والا پھر کون ہو سکتا ہے اور کون نہیں ہو سکتا' کہا ہے کہ یہ ایمان والے قطعاً نہیں ہو سکتے۔

آ گے دو شرطیں ہیں۔ کہا ہے کہ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَ بَیْنَهُمْ (4:65) تاوقتیکہ اپنے ہر معاملے میں' یہ تمہیں اپنا حکم مقرر نہ کریں' تجھ سے آ کر اس کا فیصلہ نہ لیں' جو تُو ان کو فیصلہ قرآن کریم کے مطابق دے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ تیرے پاس آ ئیں' یہ صرف فیصلہ لینے کے لیے آ نا ہے۔ اس نے فیصلہ دیدیا' اس کے مطابق ہمارے تصور کی رو سے اس نے وہ فیصلہ مان لیا' اس کے مطابق اس نے کام کیا۔

## اور فیصلہ مان لینے کے بعد دل میں کسی قسم کی گرانی تک بھی محسوس نہ کرنا: یہ دوسری بنیادی شرط ہے

اگلی شرط وہ ہے کہ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ (4:65) اور پھر کیفیت یہ ہو کہ تُو جو فیصلہ دے اس کے خلاف یہ اپنے دل میں بھی گرانی محسوس نہ کریں۔ یہ ہے بنیاد۔ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (4:65) اسے یوں تسلیم کریں کہ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ اَنْفُسِهِمْ وہی ہے جو وَ قُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا (4:63) میں آیا ہے کہ دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ دیکھا آپ نے قرآن کریم کی رو سے اطاعت کسے کہتے ہیں۔ یہ قوانین کی ظاہر داری سے پابندی کا نام نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی نظام بھی ہو' وہ نظام صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس شخص نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے یا اس کے مطابق چل رہا ہے ۔اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کا یہ ارادہ اور نیت اندر سے کیا تھی۔ ساری دنیا کے قوانین اور عدالتیں ظواہر پہ چلتی ہیں' اسے قانون کا پابند سمجھا جاتا ہے جو قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا' اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا' اسے پرامن شہری کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید تو آ گے جا رہا ہے کہ اطاعت اس طرح سے ہو کہ دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ کرے۔

## آ ج اس قدر شدت کے ساتھ وعظ و نصیحت کے باوجود اتنی اخلاقی کمزوری کیوں؟

اور ظاہر ہے' عزیزانِ من! کہ جب انسان کے قلب کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس حکم کے خلاف دل کے اندر بھی وہ کوئی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کرے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے زندگی بدل جاتی ہے۔ اب یہاں آیئے کہ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ کی کیفیت قرآن مجید نے کہی ہے۔ ہم نے یہاں دیکھا ہے کہ یہ نفسیاتی تبدیلی ہے جو قرآن حمید چاہتا ہے اور یہی وہ اصل چیز ہے۔ نفسیاتی تبدیلی بنیاد ہے۔ یہ جو ہم رو رہے ہیں کہ صاحب! اتنی کوششیں کی جا رہی ہیں' حکومت بھی کوشش کر رہی ہے' لیڈر بھی کوشش کر رہے ہیں' واعظ بھی کوشش کر رہے ہیں' سب چلا رہے ہیں کہ خدا کے لیے اپنے اخلاق کو درست کرو' اپنی زندگیوں کو درست کرو' اسلام کے قالب میں ڈھالو' قانون کی اطاعت کرو۔ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کچھ نہیں ہو رہا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ کبھی قانون کی اطاعت نہیں کی جا سکتی' یہ وہ اطاعت ہے جس سے معاشرہ اس انداز کا پیدا ہو جائے' تاوقتیکہ انسان کی نفسیاتی کیفیت نہ بدل جائے' اس کے قلب و دماغ میں

تبدیلی نہ آ جائے۔

## قرآنی تعلیم انسان کی نفسیات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے' یہ قلب ونگاہ کی تبدیلی کا پروگرام ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے یہی کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (13:11) قوم کی حالت مکینکل چیزوں سے نہیں بدلی جاتی' قوم کی حالت اس وقت بدلی جاتی ہے جب اس قوم کی نفسیاتی کیفیت بدلتی ہے۔ نفسیاتی کیفیت کی بات وہ بتائی ہے کہ قانون کے مطابق چلنے میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو' کتنی ہی کیوں نہ صعوبت برداشت کرنا پڑے' تکلیف برداشت کرنا پڑے' مشقت اٹھانی پڑے لیکن اس کے خلاف دل میں کوئی بھی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ دل میں گرانی کیسے نہیں محسوس ہوسکتی؟ یہ ہے ذہنیت بدلنے سے' نفسیاتی کیفیت بدلنے سے' قلب ونگاہ کا زاویہ بدلنے سے۔ پھر سنیے! کہا ہے کہ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (4:65) تیرے اللہ کی قسم! یہ کبھی ایماندار نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ قانون کی اطاعت اس طرح سے نہ کریں کہ اپنے دل میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ ہے ایمان کا درجہ۔ وہ جو اعراب یا بدوؤں سے کہا گیا تھا کہ ان سے کہو کہ اپنے آپ کو یونہی نہ کہدیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ یہ اسلام لے آئے ہیں' اسلام قبول کرلیا ہے لیکن کہا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان والے ہوگئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (49:14) ایمان دل میں نہیں اترا۔

یہ دل میں اترنے کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی ڈول ہے جو آپ نے کنویں کے پانی میں ڈبو دینا ہے؟ دل میں اترنے کی بات کیا ہے؟ یہ ذہنیت کی تبدیلی' قلب ونگاہ کی تبدیلی' نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) ہے۔ یہ اگر ہوتا ہے تو پھر یاد رکھیے! اس بنیاد پہ جو عمارت اٹھتی ہے' اسے آپ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ اس سے پھر یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ جنگل کی تنہائیوں میں بھی کسی سے لغزش ہوگئی ہے' جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' وہ روتا ہوا عدالت کے اندر آ جاتا ہے کہ مجھ سے یہ لغزش ہوگئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قانون کی رو سے کوئی گواہ نہیں' کوئی شاہد نہیں' اس کی گرفت میں تم نہیں آتے' اُس نے کہا کہ نہیں' میرا قلب اس کے لیے مجھے ڈس رہا ہے' مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اسلامی نظام کی بنیاد۔ یہ خالی قانون سازی کی بات نہیں ہے' یہ خالی قانون کی تنفیذ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ خالی قانون کی اس طرح سے پابندی کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو نگاہ کی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ یہ نگاہوں کی تبدیلی تھی جو نبی اکرم ﷺ کا پروگرام تھا۔ وہ کیا پروگرام تھا؟ یہ کہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ (2:129) یہ تو صرف تعلیم وحکمت ہے۔

وہ تعلیم دیتا ہے اور پھر ان کو قانون کی جو غرض وغایت ہے' یہ سمجھانے والی بات ہے ورنہ یہ صرف Intellectual Process

(ذہنی عمل) ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو قانون کو سمجھے ہوئے تو ہیں' سوائے کسی دیوانے اور پاگل کے' آپ سب سمجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ قانون یہ ہے اور یہ اس کے مطابق کرنا چاہیئے' یہ اچھا ہے۔ کون نہیں سمجھا ہوا کہ جھوٹ بولنا برا ہے۔ اتنا سا حصہ تو تھا کہ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) وہ قانون کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی غرض وغایت بھی سمجھاتا ہے۔ اور اس نے یہیں تک نہیں رہنے دیا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ يُزَكِّيْهِمْ** (2:129) ان کی ذات میں یہ ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہ تھا پروسیس' یہ تھا اس کا پروگرام۔

## جب میں تصوف کی وادیوں سے نکلا اور علم نفسیات کا مطالعہ کیا: پرویزؒ

یہ تبدیلی کس طرح سے پیدا ہوتی ہے؟ عزیزانِ من! بات تو بڑی لمبی سی ہے' تھوڑے سے وقت میں سمجھانے کی کوشش کرونگا۔ وہ Psychological (نفسیاتی) چیز ہے' اور نفسیاتی ہی اس کے لیے ایک پروگرام ہوتا ہے۔ اس چیز میں پھر کچھ ''میں'' آجاتی ہے۔ جب میں تصوف کی وادیوں سے نکلا تو سائیکولوجی کا Study (مطالعہ) کرنے کے بعد' اس نتیجے پہ پہنچا کہ کسی دور میں یہ لوگ سائیکولوجسٹ تھے' اُس دور کے مطابق' جب بھی وہ تھے' انہوں نے' سائیکولوجی سے یوں کہیے کہ کچھ کام لیا پھر جیسا کہ بعد میں ہوتا ہے اس کا ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے' وہ رسمِ اذاں باقی رہ جاتی ہے' روحِ بلالیؓ نہیں رہتی۔ تو ہوا پھر یہ کہ وہ ڈھانچہ باقی رہ گیا اور جب صرف ڈھانچے کی اطاعت کی جائے تو اس سے جو نقصانات ہوتے ہیں' وہ ہمارے سامنے ہیں' Mechanically (میکانکی طور پر) یہ کچھ کرنے سے اندر کی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بعد میں نے سائیکولوجی کو دیکھا۔ یہ جو Psycho Analysis (تحلیلِ نفسی) والے ہیں' تجزیہ نفس کرنے والے ہیں' یہ سائیکاٹرسٹ بھی ہیں' (اعصابی) معالج بھی ہیں۔ یہ جو اعصابی بیماریاں ہوتی ہیں وہ ان کا علاج بھی کرتے ہیں۔ وہ تو پھر ایک فنی چیز ہو جاتی ہے۔ 99% جو عام لوگ ہوتے ہیں' ان کے اندر نفسیاتی پیچیدگیاں ہوتی ہیں' انہیں Complexes (الجھنیں) کہتے ہیں' یہ پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کچھ پڑھا اور جتنا دیکھا کہ یہ Complexes (الجھنیں) ان لوگوں کے دل میں ہوتی ہیں جنہیں بچپن میں ماں باپ کی طرف سے پیار نہیں ملا ہوتا۔ اب لفظ ہمارے پاس ہے نہیں' ہماری زبان بڑی مفلس' اور محتاج ہے۔ یہ پیار کا لفظ ذرا آپ آگے چلیں گے تو آپ دیکھیں گے' کہ اس کے معنی کچھ اور ہو جائیں گے اور محبت تو کہی نہیں جا سکتی صاحب! کیونکہ بچپن میں تو میں نے کہہ دیا کہ پیار نہیں ملا' اگر میں نے بعد میں کہا کہ اسے پیار دیا جائے گا اور محبت دی جائے گی تو آپ سوچتے ہیں وہاں کیا معنی ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس لفظ نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے اگرچہ Love کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے پاس پھر بھی Affection (مؤدّت' ذہنی جھکاؤ' لگن) کا ایک لفظ ہے۔

عربی زبان کے اندر تو یہ چیز تھی لیکن ہمارے ہاں اس کے معنی کچھ اور ہو گئے ہیں' اس کے لیے رحمت کا لفظ تھا' بڑا عجیب لفظ تھا۔ جن بچوں کو بچپن میں پیار نہیں ملا ہوتا' Affection (مَوَدّت' شفقت) نہیں ملی ہوتی' ان کی نفسیاتی کیفیت یا جسے آپ ذات کہتے ہیں' اس میں کرختگی (Rigidity) پیدا ہو جاتی ہے' وہ ایسے سوکھ جاتا ہے جیسے چمڑا' پھر اس میں لوچ باقی نہیں رہتی' کرختگی آ جاتی ہے' پیار نہ ملنے سے ان کی ذات میں خلا پیدا ہوتا ہے اور اس میں ایک کرختگی آ جاتی ہے' سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جو میں نے عربی زبان کے اندر رحمت کا لفظ کہا تھا اسے ذہن میں رکھیے۔ یہ تو عجیب لوگ تھے' رحم سے یہ لفظ لائے ہیں اور رحم میں جتنا لوچ ہوتا ہے اور جس پیار سے اس بچے کو اندر پرورش ملتی ہے اس کی تو مثال ہی دنیا میں نہیں ہے۔ یہ شفقت' یہ پیار وہاں سے شروع ہوتا ہے' ماں اپنے جسم کا ایک حصہ اندر ہی اندر اس کو دیئے چلی جا رہی ہوتی ہے اور اس میں اتنی لوچ ہوتی ہے کہ وہ اس کی ضرورت کے مطابق پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر پیدائش کے بعد جس انداز سے ماں اس کی پرورش کرتی ہے' ماں سے مراد پہلے دور کی مائیں ہے جو بچوں کو نرسوں کے حوالے کر کے کلبوں میں نہیں چلی جاتی تھی' جس بچے کے ہاتھ میں صرف بوتل آتی ہے' اسے کچھ پتہ نہیں' ہمارے ہاں سائیکولوجی ہے ہی نہیں۔ Psychologically (نفسیاتی طور پر) بچے کو ماں کے سینے سے یہ چیز ملتی ہے' وہ دودھ ہی نہیں ہوتا' اس کے اندر ماں کی محبت کے چشمے بہے چلے جا رہے ہوتے ہیں اور بچہ جو پیتا ہے وہ جو دودھ ہے اس کا تجزیہ لیبارٹری میں نہیں کیا جاتا' آپ نے کبھی بوتل کو دیکھا ہے' بچہ اسے اس طرح ہمک اور لپک کر نہیں پکڑتا جس طرح جس محبت سے ماں کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ اے کاش! ان ماؤں کی سمجھ میں اتنی سی بات آ جائے۔

یہ بچہ یہاں سے' اس پیار سے محروم ہوتا ہے۔ کپڑے نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں' اسکول میں' وہاں نرسری میں' داخل کرا دیا ہے' سات سو روپے ❶ کی ماہانہ فیس ہے لیکن ماں اس کی پرواہ نہیں کرتی' بچے کی صحیح پرورش اور تربیت بڑی ضروری ہے۔ تربیت' پرورش نرسز کے ہاتھوں ڈبے کی رو سے ہوتی ہے' تربیت ان اسکولوں میں ہوتی ہے جنہوں نے محض پروفیشن کے طور پر As Business (بطور کاروبار) کھولا ہوا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ ''قلندر کے بندر'' کی طرح تو اس کو بنا دیتی ہے۔ ٹھیک ہے وہ Disciplined (پابندِ نظم وضبط) ہوتا ہے۔ اس پہ گھر والے بہت خوش ہو جاتے ہیں' انہیں پتہ نہیں کہ یہ بچہ کس چیز سے محروم ہو رہا ہے۔

اور اس کے بعد اس کی اس محرومی سے' عزیزانِ من! وہ جو Vacuum (خلا) اس کے اندر Create (پیدا) ہوتا ہے' یہ عمر کے ساتھ بڑھتا ہے اور اس کے بعد پھر اس میں یہ لوچ کی چیز باقی نہیں رہتی۔ تنگ نظری' حسد' رقابت پیدا ہوتے ہیں' سب کچھ سمیٹنے کی

---

❶ یاد رہے یہ بات اکتوبر 1970ء کی 4 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج تو اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔

قوت پیدا ہو جاتی ہے' اس کے خلاف انتقام لینا' جھپٹ مارنا پیدا ہو جاتا ہے' بھائی بہن آپس میں لڑ رہے ہیں' اس میں اخوت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا' اس میں مؤدت کا جذبہ نہیں ہوتا' سکینت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ تو بس جیسی Mechanically (میکانکی طور پر) پرورش ہوئی تھی ویسا Mechanically اس کا رشتہ ہوتا ہے' ماں باپ سے بھی یہی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ کیا ہوتا ہے؟ احتیاج کا رشتہ ہوتا ہے' اس سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں' یہ صرف اس وقت تک ہوتا ہے' جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ ضرورت ہٹ گئی' اس کے بعد رشتہ ہی کوئی نہیں ہوتا' یہ رشتہ وہ ہوتا ہے جو بینک میں اکاؤنٹ رکھنے والے اور بینک مینجر کا ہوتا ہے۔ آج مثلاً آصف صاحب مینجر ہیں' ان سے جا کر روپیہ لے لیا' کل گئے ہیں تو وہاں کوئی سعید صاحب بیٹھے ہوئے ہیں' ان سے جا کر لے لیا' رشتہ تو ان کے ساتھ اتنا ہی ہے۔ صرف یہ رشتہ رہ جاتا ہے۔

وہ رشتہ جس میں یہ ماں یا یہ باپ چاہتے تھے کہ وہ اپنا سارا پیار اس کے اندر انڈھیل دیں اور اس کا ردِعمل اس کی طرف سے یہ ہوتا تھا' برادرانِ عزیز! کہ بچہ آپ سے جس محبت سے چپکتا ہے تو یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے۔ عزیزانِ من! سائیکولوجسٹ یہ بتاتے ہیں کہ یہ جو محرومی یا خلا ہے' یہ Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) سے بھرنا تھا' جب یہ چیز ناپید رہتی ہے تو سائیکولوجی کے Complexes (الجھاؤ) پیدا ہوتے ہیں۔ اور بھی اس کے لیے Causes (اسباب) ہیں لیکن Main (بڑی بنیادی) علت یہ ہوتی ہے اور اس کے لیے علاج یہ ہوتا ہے کہ انہیں پھر کہیں سے Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) ملے۔ پھر یہ Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) کہاں سے ملے' بچپن میں تو وہ ماں سے ملنی تھی' باپ سے ملنی تھی' یہ مریض تو بڑا ہو گیا ہے۔ اور وہ اس معاشرے کے اندر پھینکا ہوا ہوتا ہے جہاں اس کو ماں باپ نے Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) نہیں دی' تو معاشرے والے اس کو Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) کہاں سے دیں گے۔

## رسول کی ہستی انسانی ذات میں پیدا ہونے والے Complexes (الجھنوں) کا علاج Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) کے ذریعے کرتی ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ (2:129) یہ رسول ان کی ذات کی تربیت کرتا ہے۔ رسول کا فریضہ صرف خدا کے احکام پہنچانا نہیں تھا' عزیزانِ من! جو چیزیں ماں نے دینی تھیں' جو چیزیں باپ نے دینی تھیں' وہ یہ رسول ان کو دیتا تھا۔ پہلی چیز قرآن کریم نے رسول کے متعلق یہ کہی۔ یہ کہتے ہیں کہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی جاتی ہے حالانکہ لٹھ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو یہ ہے جو سنتِ رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہو رہی ہے۔ کہا ہے کہ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:159)۔ دیکھیے! رحمت کا لفظ' خدا کی طرف سے بندوں کو

ہے' یہ وہی Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) کی چیز چلی آ رہی ہے چونکہ اس قسم کی Affection (مؤدت وشفقت' سکینت) دیتی تھی۔ یاد رکھیے! کچھ مجھے بھی تسکین نہیں ہوتی یہ لفظ بول کے ''جی ٹھنڈا نئیں ہوندا ایہدے نال وی'' (اس سے بھی دل میں ٹھنڈک نہیں آتی)۔ بات کچھ اور ہے جو ملتی ہے۔ بس سمجھ لیجیے صحیح ماں سے جو بچے کو چیز ملتی ہے' وہ ہے یہ چیز۔ کہا ہے کہ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:159) خدا چاہتا تھا' اس کی وجہ سے یہ ہے کہ لِنۡتَ لَهُمۡ (3:159) تو اُن کے ساتھ ایسا ہے جس میں بڑی لوچ ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کے بعد ماں کی طرف سے ملنے والی Affection (مؤدت وشفقت' رحمت وسکینت) کی لطافت' لوچ اور اس کی نوعیت کے بیان میں ایک عظیم سبق ہے

پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کی تربیت کرنے والے کے خود اپنے اندر رحمِ مادر کی طرح یہ لوچ ہونی چاہیے۔ رحم میں بچہ کروٹ لیتا ہے' کروٹ کے ساتھ ہی یہ بھی اسی طرح سے پھیل جاتا ہے' دوسری طرف کروٹ لیتا ہے' سمٹ جاتا ہے۔ یہ اتنا نرم ونازک قالب' دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا۔ کہا ہے کہ لِنۡتَ لَهُمۡ (3:159) تیرے اندر اس قسم کی لوچ ہے۔ خدا کی رحمت ہے اور رسول کی لوچ ہے۔ وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ (3:159) اگر تیرے دل کے اندر وہ کرختگی ہوتی' وہ خشک ہوا ہوتا' جیسا میں نے کہا ہے تو سب تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔ اس کے بعد یہ بچے اس قسم کے ماں باپ سے جب بھاگتے ہیں' وہ اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ یہ جو احتیاج مجھے یہاں لا رہی ہے' جس دن یہ ختم ہو' اسی دن بچہ اس سے بھاگ جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں وہ لوچ نہیں ہوتی۔ پہلا فریضہ یہ رسول ماں کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ عزیزانِ من! اتنا ہی نہیں اور آگے چلیے دیکھیے! رسول اللہ ﷺ کی یہ خصوصیاتِ کبریٰ قرآن حمید نے جو دی ہیں' یہ بنیاد ہے آپ کے ہاں انسانوں کی نفسیاتی تربیت کی اور اسی کی بنا پہ پھر وہ نظام قائم ہوتا ہے جس میں یہ افراد اس کے فیصلوں کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس نہیں کرتے۔

## خالقِ کائنات کی شہادت نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی' لہو کو گرما دینے اور دلوں کو تڑپا دینے والی درخشندہ قرآنی حقیقت

دیکھیے! کیسے بات آتی ہے۔ کہا ہے کہ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ (9:128)۔ قرآن کریم ہے' عزیزانِ من! رسول آیا' عام لفظ تو یہی ہونگے کہ تمہارے اپنوں میں سے ہی ہے۔ یہ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ (9:128) یوں ہے جیسے کہ تمہاری جانوں سے ہی مرتب ہو کر یہ ایک رسول بنا ہے۔ قرآن حمید ہے' عزیزانِ من! عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ (9:128) تمہیں ذرا سی بھی تکلیف ہوتی ہے اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ سردیوں کی راتوں میں بچہ پیشاب کرتا ہے' جب اس کا بستر ذرا سا ٹھنڈا ہوتا ہے' تو ماں خود اس

حصے پہ آ جاتی ہے اُسے خشک حصے کی طرف لے جاتی ہے۔ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (9:128) ذرا سی تکلیف تمہیں آتی ہے تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ پہلو پھر بھی ابھی Negative (منفی) ہے تکلیف آتی ہے تڑپ اٹھتا ہے اتنی سی بات نہیں ہے بلکہ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ (9:128) بڑا ہی لالچی ہے۔ کس بات کے لیے ہے؟ تمہیں آرام پہنچانے کے لیے اچھی اچھی سب چیزیں تمہارے لیے لے آئے۔ اپنا سودا لینے کے لیے جاتے ہیں بچے کے لیے یہ کھلونا وہ ایک کیلا اس کو بہت اچھا لگتا ہے اے غبارے والے! یہ دے جانا۔ یہاں یہ حَرِیْصٌ کیا لفظ ہے! للچائی ہوئی ماں کی طرح تمہارے لیے یہ تمہارے قلب ونگاہ کی شادابیوں کے لیے جو چیز کہیں اچھی نظر آتی ہے اپنے لیے نہیں لیتا تمہارے لیے لے کر چلا آ رہا ہے۔

## ذاتِ خداوندی اور نبی اکرم ﷺ کی ہستی رؤف بھی ہے اور رحیم بھی

آگے کہا ہے کہ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (9:128)۔ یہ الفاظ ہیں عزیزانِ من! جو میں کہہ رہا تھا کہ ترجمے نہیں ہو سکتے انگریزی بھی Affection (مؤدت وشفقت رحمت وسکینت) تک آ گئی۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (9:128)۔ یہ دونوں صفتیں خدا کی ہیں دونوں صفتیں اس رسول کی یہاں بیان کر دیں۔ خدا کی رافت ورحمت تو وہاں ختم ہوئی رزق بکھیر دیا راہنمائی دیدی اب جو عملی طور پہ Context (متن) میں آ رہا ہے یہ رسول آ رہا ہے۔ خدا کی جو صفاتِ روف ورحیم ہیں وہ اس کے اندر موجود ہیں

## تغیرِ نفس کے ضمن میں رافت اور رحمت کے الفاظ کا وہ مفہوم جن تک آج کا سائیکولوجسٹ پہنچا ہے

یہ رافت اور یہ رحمت ہیں۔ وہ الفاظ جو میں کہہ رہا تھا کہ میں Affection (مؤدت وشفقت رحمت وسکینت) بھی کہتا ہوں تو میرا جی ٹھنڈا نہیں ہو رہا۔ یہ ہیں وہ الفاظ لیکن اب ان الفاظ کا ترجمہ میں آپ کو کیا سمجھاؤں۔ یہ بالکل وہ چیز ہے جو میں نے کہی ہے کہ جس چیز کے نہ ہونے سے بچے میں Vacuum (خلا) پیدا ہوتا ہے وہ ہے یہ رافت اور رحمت۔ نرمی بھی اس کے اندر ہوتی ہے لوچ بھی ہوتی ہے لچک بھی ہوتی ہے ہر ضرورت کے مطابق چیز کو دینا یہ رافت کے معنی ہوتے ہیں۔ کسی کی ہر ضرورت کے مطابق چیز اس طرح سے دینا کہ اس کو گراں نہ گزرے یوں دینا کہ تمہارا دینا اسے گراں نہ گزرے۔ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (9:128)۔ دیکھ رہے ہیں یہ نفسیاتی تربیت کیسے ہو رہی ہے!

عزیزانِ من! آج آپ کے ہاں بیسویں صدی کے اندر یہ ٹھیک ہے کہ جنہوں نے یہ تحقیقات کی ہیں انہوں نے انسانیت پر بڑا احسان کیا ہے ان کا مقام بڑا اونچا ہے۔ یہ جتنے بھی ہمارے ہاں کے سائیکولوجسٹ ہیں خواہ سگمانڈ فرائیڈ (1939-1856ء) ہو کارل گسٹوف (Gustov) ینگ (1961-1875ء) ہو ایڈلر الفرڈ (1937-1870ء) ہو یہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بڑی تحقیق

کی ہے لیکن یہ چیزیں آپ دیکھتے ہیں کہ چودہ سو سال پہلے قرآن حکیم نے دی ہیں' تغیرِ نفس سے وہ کہتا ہے' تغیر آتا ہے قوم میں' تغیرِ نفس کے متعلق یہ پروسیس بتا رہا ہے کہ یہ جو شخص اس طرح سے تربیت کرنے والا ہے' اس کی کیفیت یہ ہونی چاہیے تا کہ یہ جوان کے ہاں خلا رہ گیا ہے' کہیں سے ان کو رافت اور رحمت نہیں ملی ہے' یہ اس خلا کو بھر دے' یہ بھرنا شروع کر دے۔ اور یہ وہ چیز ہے جتنی اسے دیئے چلے جاؤ' اتنی ہی یہ آگے بانٹتا چلا جاتا ہے اور بانٹتا چلا جاتا ہے اور یہ پھر اتنا ہی اس کو بھر دیتا ہے' اس میں کمی نہیں آنے دیتا۔ کل جب میں سمجھا رہا تھا تو میری عزیزہ بیٹی نے مجھ سے کہا کہ بابا جی! اسی کو تو ثواب کہتے ہیں کہ جتنا دیئے جائے اتنا ملتا چلا جائے' میں نے کہا' بہت ٹھیک کہا بیٹی! بہت جی راضی ہوا میرا۔ یہ جو دوسروں کے ساتھ رؤف و رحیم تھے وہ کیوں تھے؟ اس لیے کہ اپنے قلب سے رافت اور رحمت کا جتنا حصہ دے رہے تھے' جب وہاں آتے تھے تو وہ اس کو پورا ہو جاتا تھا بلکہ اس سے زیادہ ہی ملتا ہوگا کیونکہ خدا نے تو کہا ہے کہ میں ستر ستر گنا دونگا صاحب! یہ ایک نظام ہے۔

## کوئی انسان دوسروں کے لیے جتنا حریص ہوگا' وہ اتنا ہی زیادہ مطمئن اور باوقار بھی ہوگا اور یہ چیز دل کے اندر سے اُمڈتی ہے

عزیزانِ من! جب اِدھر سے یہ کیفیت ہو جائے' تربیت دینے والے' نفسیاتی تغیر پیدا کرنے والے کی کیفیت یہ ہو کہ ان کی ذرا سی تکلیف اس کو بے چین کر دے' ہر جگہ حریص ہو کہ یہ بھی ان کے لیے لے لوں' یہ بھی ان کے لیے لے لوں' ایک ماں کی طرح محبت کی یہ کیفیت ہے کہ اپنا آپ انڈھیلنے کو جی چاہ رہا ہے تو اس کا ردِعمل بھی تو پھر آپ سمجھتے ہیں پتھر تو نہیں ہیں سامنے کہ جن کے اوپر آپ انڈھیلتے چلے جائیں اور وہاں سے ردِعمل نہ ہو۔ اب آگے اس کا ردِعمل سنیے۔ وہ یہ تھا اور ان کی کیفیت پھر یہ تھی کہ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6) یہ نبی ان کے لیے اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ یہ رشتے ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! آج ہر ایک ہم سے شاکی ہے' آج کل کے بچے سرکش ہو رہے ہیں' گھر کے اندر نہ ادب ہے' نہ قانون ہے' نہ احترام ہے' نہ بھائی بہن کی محبت ہے۔ ہر جگہ یہ فساد پیدا ہو رہا ہے' سوچتے نہیں ہم کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب ادھر سے اس کی یہ کیفیت پیدا ہوئی تو اس کے بعد ردِعمل یہ ہے کہ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6)۔ یہ مِنْ اَنْفُسِهِمْ کی جو بات ہے' یہاں سے وہ چیز آئے گی کہ پھر اپنے دل کے اندر بھی کوئی گرانی نہ محسوس کرے۔ وہاں بھی اَنْفُسِهِمْ کا لفظ ہے کہ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (4:65)۔ جب بھی کوئی چیز آئے گی' کسی چیز کے متعلق' کسی کا حکم آئے گا' اب اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو کچھ چھوڑنا پڑے گا اس کے خلاف' کس چیز کے خلاف آپ کو یہ کرنا پڑے گا؟ یہ جو آپ کا اندر Ego (پندارِ نفس) ہوتا ہے' یہ جو

آپ کو اپنے ذاتی مفادات سمجھتا ہے' یہ آواز بلند کرے گا کہ انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ میرے معاملات کے اندر دخل دیتے چلے جاتے ہیں' ٹھیک ہے مجھ سے ان کو کچھ محبت ہے' مجھ سے ان کو پیار ہے' یہ ٹھیک ہے لیکن میں اب بڑا ہو گیا ہوں' اپنے معاملات آپ کر سکتا ہوں' خواہ مخواہ یہ دخل اندازی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو فیصلہ ایسا ہو' جو میری مرضی کے مطابق ہو' اس کو مانتا چلا جاؤں اور جو میری مرضی کے مطابق نہیں ہے' اب اس کے بعد یہی صورت ہے کہ ماننا ہے تو محض نظام کی رو سے کہ سزا سے بچ جاؤں' یہ کیفیت ہو گئی لیکن اگر بات یہ ہو گی کہ یہ جو فیصلہ دے رہا ہے وہ شخص اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6) جتنا کوئی شخص خود اپنی ذات پر حق رکھتا ہے' رسول کا اُس پر اس سے بھی زیادہ حق ہوتا ہے۔ اس کے اندر سے یہ جو آوازیں نکل رہی ہیں' ان سے یہ زیادہ عزیز ہے' یہ آواز ہی اندر سے نہیں نکلے گی۔ یہ ہے وہ تغیرِ نفس جس کے بعد یہ کیفیت ہوتی ہے کہ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ (4:65) جو فیصلہ تم صادر کرو' اس کے سامنے یہ دل کی گہرائیوں میں گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔

عزیزانِ من! ہم نے تو کبھی اس پروسیس پہ عمل کر کے دیکھا ہی نہیں۔ یہ Affection جسے رافت اور رحمت کہا ہے' یہ پیار اور یہ محبت کسی کو دے کر دیکھیے پھر دیکھیے جو اس کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6) اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتا ہے' اس کے اندر سے جو آوازیں نکلتی ہیں' دوسری طرف لے جانے والی بالکل نہیں ہیں' اس سے زیادہ' سبقت کس کو ہوتی ہے؟ کہتا ہے کہ نہیں جو یہ کہہ رہا ہے وہ دل کے اندر سے اٹھتی چیز ہے۔ اور یہیں ایک اور چیز قرآن مجید نے کہدی ہے۔

## مَردوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تربیت کے لیے ازواج مطہرات کا عمل دخل اور اُن کا مقامِ بلند

ایسا کرنے والا نبی ہی نہیں ہے' یہاں تو تربیت ہونی تھی' مردوں کی بھی ہونی تھی' عورتوں کی بھی ہونی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نبی صرف مردوں تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھ رہا تھا' پوری امت اس کے سامنے تھی' لیکن زندگی کے بہت سے گوشے ایسے ہوتے ہیں جہاں عورت ہی یہ تربیت کر سکتی ہے۔ یہ جو ازواجِ مطہرات تھیں' یہ شعبہ ان کے ذمہ تھا اور وہاں بھی صورت یہ تھی کہ یہ صرف عورتوں کی تربیت نہیں کر رہی تھیں' ان کے سامنے بھی پوری امت تھی۔ آج تو ہمارے ذہن میں تصور ہی اور پیدا کر دیا گیا ہے کہ انہیں کمروں میں بند رکھو' صندوقوں میں تالے لگاؤ۔ ان کے ذمہ بھی امت کی تربیت تھی۔ اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے آپ کو معلوم ہے' قرآن مجید نے ان کا کیا مقام بتایا ہے؟ جھومیے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَ اَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (33:6) اسکی بیویاں ان کے ساتھ ماں کی حیثیت رکھتی ہیں' جو ماں بچوں کے ساتھ کرتی ہے' یہ اس کی بیویاں ان کے ساتھ کرتی ہیں۔

## اسلام ایک زوجہ کے سوا ہر بیٹی اور ہر عورت کا مقام بطور ماں تصور کرتا ہے

یاد رکھیے! مرد کو بھی جب کبھی تربیت کرنی ہوگی تو اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی تو اس حساب سے اسے بھی ماں کہہ لیجیے' اسے بھی ماں بننا ہوگا۔ عورت کا جب بھی ایسا مقام آئے گا' جب وہ اس چیز کے لیے اٹھے گی تو وہ Mother (ماں) کا مقام رکھے گی' پھر تربیت کر سکتی ہے۔ اور اسلام اپنی ہر بیٹی' اپنی ہر عورت سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ سارے معاشرے میں ماں کی حیثیت سے کھڑی ہو۔ زوج کی کیفیت تو صرف گھر کے اندر خاوند سے ہوتی ہے' اس کے علاوہ اس کا ماں کا مقام ہونا چاہیے۔ عورت بڑی تربیت کر سکتی ہے' عزیزانِ من! بشرطیکہ ماں کا مقام ہو۔ ماں کے مقام میں وہ ساری باتیں آ گئیں جو میں نے اِس وقت تک عرض کی ہیں' وہ سارے خلا بھرنے کی چیزیں آ گئیں۔ اور جو میں نے کہا تھا کہ لفظ ساتھ نہیں دے سکتے' یہاں میں نہ پیار کا لفظ بول سکتا ہوں' نہ محبت کہہ سکتا ہوں۔

## دلی کے محلات اور لکھنؤ کی گلیوں میں الفاظ کی حرمت کو پامال کر دیا گیا: الفاظ کے تصورات بدل دیجیے' قوم کا تصور بدل جائے گا

ہمارے دورِ انحطاط میں دلی کے محلات میں اور لکھنؤ کی گلیوں کے اندر جو زبان بنی ہے' اس نے ان الفاظ کو تباہ کر کے رکھ دیا' ہمارے ہاں اب لفظ نہیں ملتا' عزیزانِ من! ''بڑی عورت ایک مرد کے ساتھ'' یہ جو کیفیت قرآن کریم نے بتائی ہے' یہ پیدا کرے ' یہ اُمَّھٰتُھُمْ کی کیفیت پیدا کرے' ماں کی حیثیت سے یہ کہے۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں جو ہم کہہ سکیں کہ اس کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھے' محبت اور پیار کا تو لفظ ہی نہیں آتا۔ الفاظ اس لیے نہیں ملتے کہ ہمارے ہاں سے یہ تصورات محو ہو گئے ہیں۔ یاد رکھیے! لفظ ہمیشہ Concept (تصور) کے لیے بنتا ہے' کوئی Concept یا تصور بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا' کوئی لفظ بغیر Concept (تصور) کے نہیں ہوتا۔ اگر کسی زبان میں کسی Concept (تصور) کے لیے لفظ نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس زبان میں اس قوم میں وہ Concept (تصور) نہیں ہے۔ یہ Concept (تصور) اور ملت کی یہ عورتیں' اس تغیرِ نفس کے ساتھ اس قسم کی تربیت کریں گی جیسی ماں بچے کی تربیت کرتی ہے اور وہ چیز جو بچے کو دیتی ہے' اس کے لیے ہمارے پاس لفظ نہیں ہیں۔ یہ کیفیت عزیزانِ من! نبی پیدا کرتا ہے۔ اور جب یہ تغیرِ نفس پیدا ہوتا ہے تو اس کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) پھر اس کے فیصلوں کے خلاف دل سے بھی کوئی Protest (احتجاج) نہیں اٹھتا۔ یہ ہے تعلق' عزیزانِ من! اسلامی نظام اور اسلامی شریعت میں۔

وہ کیا چیز ہے صاحب! جس سے دل میں نہ گرانی پیدا ہوتی ہے اور نہ کبیدگی؟ آج چوراہوں کے اوپر ڈنڈے باز کھڑے ہونگے' ہنٹر ہاتھ میں لیے ہوئے ہونگے' مار مار کر کھال ادھیڑ رہے ہیں۔ کیفیت یہ ہے۔ اندازہ لگایئے اور اُدھر ❶ دیکھیے صاحب! چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ وہ تو نفسیاتی طور پہ ایک Exception (استثنا) ہوتی ہے جسے ایک جرم کی ذہنیت کہتے ہیں۔ جب میں وہاں آونگا تو عرض کرونگا کہ Psycholigically (نفسیاتی لحاظ سے) اس کی کتنی ضرورت ہوتی ہے لیکن معاشرے کی جو عام کیفیت ہے' وہ نفسیاتی تغیر ہے جس کا یہ پروسیس ہے۔ نبی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چودہ سو سال ہوئے' ایک فرد آیا تھا' اس کا امت کے ساتھ یہ تعلق تھا' وہ چلا گیا' اب اس کے ساتھ کسی اور کا تعلق نہیں رہے گا۔ ہر وہ شخص جو اس نظام کے لیے اٹھتا ہے' تبلیغ کرتا ہے' اس کو قائم کرنا چاہتا ہے' ہر وہ جو سربراہ بنتا ہے' ہر وہ جس کے ہاتھ میں یہ چیز دی جاتی ہے' اس کے اندر یہ کیفیت ہونی چاہیے۔ یہ چیز ہوگی تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ان کا ردِعمل بھی اس کے ساتھ یہی ہوگا جو قرآن حمید نے یہاں بیان کیا ہے۔

## رافت اور رحمت کے تصور پر زندگی بسر کرنے والا تو شکریئے کا بھی متمنی نہیں ہوتا

یہ ایک گوشہ قرآن کریم نے ایسا خوبصورت بتایا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو کچھ اپنی Affection کو' اس رافت کو' اس رحمت کو' باہر انڈھیل رہے ہیں' دوسروں کو دیئے چلے جا رہے ہیں تو اس دینے میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) ہم تم سے اس کے لیے کوئی بدلا نہیں چاہتے۔ بدلا چاہنا تو ایک طرف رہا' ہم تو شکریئے کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ یہاں ان کی یہ کیفیت ہے لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے کو اگر اسکول میں کاپی پہ "Good" ملا ہے تو وہ کس طرح چھٹی کے بعد بھاگتا ہوا چلا آ رہا ہوتا ہے اور گھر آ کر بستہ وہ پھینکا' ٹوپی وہ پھینکی' ''آج مجھے Good ملا ہے میں مانیٹر بن گیا ہوں''۔ اس اظہارِ مسرت کے خلاف یہ بات کہہ دی جائے کہ ''کی ہر ویلھے ستاں دا رہندا ہیگا ایں ماں نوں' گل پیا رہندا ایں۔ دیکھدا نئیں ہیگا میں ہانڈی پکا رہی آں'' (کیا ہر وقت ماں کو ستاتے رہتے ہو۔ گلے پڑے رہتے ہو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ ہنڈیا پکا رہی ہوں)۔ آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ آپ اس وقت کیا کر گئیں' آپ نے کیا کر دیا۔ یہ جو کچھ اس میں انڈھیلا تھا' اس کا جو خلا تھا' وہ خلا بھرنے کے لیے یہاں آیا تھا' وہ سب اکارت گیا۔ یہ افراد جو وہاں انڈھیلتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) ہم تم سے نہ جزا کے متمنی ہیں اور نہ شکریہ کے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ جب یہی تمہارے پاس آئیں اور جو چیزیں بھی لے کر آئیں' کہو کہ **صَلِّ عَلَيْهِمْ** (9:103) ان کے اچھے کاموں کی تحسین وستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کرو' محبت بھری ماں کی طرح ان کو شاباش بھرے لفظ کہو:

---

❶ یہ اشارہ حکومتِ سعودی عرب کی طرف ہے۔

''شاباش جیتے رہو' مجھے تم سے یہی توقع تھی''۔عزیزانِ من! یہ کہا جا رہا ہے جو کسی شکریئے کے متمنی نہیں تھے' جو کسی صلے کے متمنی نہیں تھے۔

## تعمیری سوچ کے تحت عمل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی تاکید

یہاں اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ دیکھو! یہ دوسرا مقام آ گیا ہے۔وہاں بچہ ماں کے پاس آ رہا ہے۔کہا ہے کہ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (9:103) تیری یہ جو شاباش ہے' یہ جو اچھے کاموں کی تحسین وستائش ہے' یہ جوان کے دل میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی ہے' یہ ان میں سکون پیدا کر دے گی' ان کی ذات متوازن ہو جائے گی۔عزیزانِ من! ان کی یہ کیفیت ہونی چاہیے جو دعویدار بن کر اٹھتے ہیں:

نگاہ بلند ' سخن دلنواز ' جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اس کے اندر کشادہ ہو' تنگ نظری نہ ہو' وہ شاباش دے' ان کی حوصلہ افزائی کرے۔اب یہ چیز تو نظری ہوگی لیکن عملی طور پر کیا ہوگا؟

## صراطِ مستقیم کی نشاندہی کے لیے کتاب اللہ کے ساتھ متمسک رہنا مشروط ہے اور اسے ہی آپ اسلامی نظام کہیں گے

ان سے کہا ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ (3:51) یاد رکھو! میرا بھی نشوونما دینے والا اور تمہارا بھی نشوونما دینے والا' اللہ ہے جس کے متعلق ابھی ابھی کہا ہے کہ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (3:101) زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ پر ہے۔اس لیے کہا ہے کہ فَاعْبُدُوْهُ (3:51) اس کے قوانین کے مطابق اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کیجیے۔هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (3:51) یہ ہے صراطِ مستقیم ' سیدھی اور متوازن راہ جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔کہا ہے کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیری ہی عبودیت اختیار کر رہے ہیں۔پھر یہ آرزو دل کے اندر پیدا ہوئی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں بلاخوف وخطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔تم تو صراطِ مستقیم کی تمنا رکھتے ہو۔سنو! اگر تم اپنے پہلے دعوے میں سچے ہو' اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہی' اس لیے کہ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (3:51) محکومیت صرف اس ایک کی ہے' اطاعت صرف اس ایک کی ہے کسی اور آستانے کے اوپر سر نہ جھک جائے۔یہ ہے صراطِ مستقیم: هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (3:51)۔

عزیزانِ من! سوچیے مسجد کے اندر باوضو قبلہ رو کھڑے ہو کر جو ہم کہتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) اور اس

کے بعد کیفیت یہ ہوتی ہے' کہ اس وقت بھی اپنے اس دماغ کے اندر بیسیوں بُت آستینوں میں چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام بن رہا ہوتا ہے کہ یہاں سے سلام پھیرنے کے بعد کس کے ہاں جانا ہے' کہاں کیا مانگنا ہے' یہ بت خانہ ہے۔ کیا یہ ہے **فَاعۡبُدُوۡهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ** (3:51) محکومیت صرف اسی کی اختیار کی جاسکتی ہے اور یہ ہے سیدھی اور متوازن راہ جو تمہیں منزلِ مقصود تک لے جائے گی؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس قسم کی اطاعت ہوگی؟ اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اسے ہر ایک پر نہیں چھوڑ دیا' قرآن حکیم تو چھوڑتا ہی نہیں ہے کہ وہ کہے کہ جسے میں اپنے ذہن میں سمجھونگا اس کی عبادت کروں گا' وہ عبادت ہوجائے' جسے آپ سمجھیں عبادت کر رہے ہیں' وہ عبادت ہوجائے گی۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہاں تو کہا ہے کہ **وَ مَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ** (3:101) یاد رکھو! جو خدا کی کتاب کے ساتھ متمسک رہے گا' اس کو مضبوطی سے پکڑ لے گا وہ صراطِ مستقیم پر ہے۔ بات اب بھی نظری سی رہی' Academic سی رہی۔

اسے ماں بننا پڑتا ہے تا کہ بچے لپک کر اس کی طرف آئیں اور یہ ماں یوں رافت اور رحمت دیتی ہے' پھر اس ماں کا جو فیصلہ ہوتا ہے اس میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ **ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَ يُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا** (4:65) وہ جو فیصلہ صادر کرے اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کردو کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ ہو۔ عزیزانِ من! یہ ہے آپ کے ہاں کے اسلامی نظام کی بنیاد۔ اس کے برعکس یہ کہنا کہ آپ کے ہاں قوانین ساز اسمبلیاں ہیں' پارلیمنٹری نظام ہے' Presidential System (صدارتی نظام) نہیں ہے' Constitution (آئین) ایسا بننا چاہیئے' اس میں کتاب وسنت کے مطابق قانون ہونے چاہئیں' تو سنو! بنیاد یہ نہیں ہے' یہ اساسِ محکم نہیں ہے' یہ سب کچھ کر دیجئے' یہ سب مکینکل ہوگا۔ آج بھی آپ کے ہاں کم از کم 75% قوانین وہی ہیں جو قرآن کریم نے دینے ہیں' جو شریعت نے آپ کے ہاں دینے ہیں۔ تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ پوچھیے ان سے' یہاں تو یہ ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے

اگلی نسل یہ ہو رہی ہے۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد' عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ یہ کیا آیہ جلیلہ ہے! کیا نظام قرآن کریم نے بیان کردیا ہے! یہ نظام قائم ہوگا تو اسے آپ اسلامی کہیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی 65ویں آیت تک ہم آ گئے' خدا کرے کہ جو بات میں نے کہنی تھی وہ کہہ سکا ہوں۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ**

# سترھواں باب: **سورۃ النسآء** (1) '(آیات 66 تا 76)

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ
فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿66﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿67﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿68﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿69﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿70﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿71﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ
قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿72﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿73﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿74﴾ وَمَا لَكُمْ لَا
تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ
هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿75﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ
الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿76﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1970ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 66ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:66)۔

## سلسلہ تجدیدِ یادداشت اور ایمان کی بنیادی خصوصیت اور فیصلوں پر گرانی محسوس ہونے کا مسئلہ

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ سابقہ آیت میں جو پچھلے درس میں موضوعِ سخن تھی' دین کے متعلق ایک بنیادی حقیقت سامنے لائی گئی تھی۔ اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بنیادی حقیقت کی رو سے کفر اور اسلام کا جو دراصل معیار ہے اسے ہر شخص پرکھ کر دیکھے کہ آیا اس معیار پر ہم پورے اتر رہے ہیں یا نہیں۔ اپنے آپ کو یونہی فریب میں رکھے چلے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اگر ایمان وہ ایمان نہیں جسے قرآن کریم ایمان کہتا ہے تو پھر اس کے بعد ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ایمان نہیں ہے' کھلے بندوں کفر اختیار کرو یا دل کے یقین کے ساتھ ایمان اختیار کرو۔ اور یہ عجیب چیز ہے۔ اسے منافقت بھی نہیں کہا جاتا کہ اس میں ہمارے دل کے ارادے کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ منافقت میں بھی ایک دخل ہوتا ہے کہ دل میں کچھ ہو' باہر کچھ کہے۔ یہ جو رسمی روش ہوتی ہے اس میں تو دل کے فیصلے کا

دخل ہی نہیں ہوتا۔ اس میں تو بالکل مکینکلی' بالکل حیوانی زندگی کی طرح ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم نے معیار یہ دیا تھا کہ دل کے یقین کے ساتھ ایمان اختیار کرو۔

اسے پھر دہرا دوں کہ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (4:65)۔ کتنا اہم انداز ہے جس میں یہ بات کہی گئی کہ بات یوں نہیں' جیسے تم سمجھے بیٹھے ہو۔ بات یوں ہے کہ ''اور تیرے رب کی قسم! تیرا خدا اس بات کا شاہد ہے کہ تم کبھی مومن نہیں ہو سکتے'' حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ (4:65) تاوقتیکہ اپنے ہر نزاعی معاملے میں تجھے اپنا حَکَم' ثالث' فیصلہ کن' آخری اتھارٹی تسلیم نہ کریں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں تک بات قانونی سی ہو جاتی ہے کہ قانونی حیثیت سے' آخری اتھارٹی' یہ اقتدارِ اعلیٰ' اسے حاصل ہونا چاہیے جو دین کا نظام قائم کرتا ہے اور افراد کے لیے روش یہ ہے کہ اپنے ہر معاملے میں وہاں سے فیصلہ لیں۔ یہ صرف قانونی حیثیت ہے' یہیں تک قرآن کریم نے بس نہیں کیا۔ پھر سوچیے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ کیفیت یہ نہ ہو کہ یہ اپنے ہر معاملے کا فیصلہ دین کی مرکزی اتھارٹی سے لیں۔ اور اس کے ساتھ اگلی شرط یہ ہے کہ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ (4:65) جب وہاں فیصلہ مل جائے تو پھر کیفیت یہ ہو کہ اس فیصلے کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اسے کہتے ہیں وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (4:65) بہ طیبِ خاطر تسلیم کرنا' اسے اسلام کہتے ہیں۔ اس نظام کی بنیادی شرط تو پہلے ہی ہمارے ہاں پوری نہیں ہوتی کہ یہاں کوئی ایسی مرکزی اتھارٹی ہی نہیں ہے۔

## آج ہمارے ہاں دین کی بنیاد پر کوئی مرکزی اتھارٹی موجود ہی نہیں ہے تو نظام کیسے قائم ہو؟

دین تو مذہب ہو گیا ہوا ہے' سوال ہی نہیں پیدا ہوا ہے کہ آپ کے ہاں کوئی مرکزی اتھارٹی ہے' اقتدارِ اعلیٰ کسی کو حاصل ہے' اپنے ہر معاملے کا فیصلہ وہاں سے لینا ہے' یہ چیز تو باقی ہی نہیں رہی۔ اور جب یہی چیز باقی نہیں رہی تو یہ اگلی چیزیں کہاں آئیں گی۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جس کے لیے آج سے چالیس سال پہلے اس مردِ درویش [1] نے قرآن حمید کی روشنی میں یہ چیز کہی تھی کہ جب تک مسلمانوں کی صاحبِ اختیار اپنی مملکت نہ ہو' اس وقت تک اسلام زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ اور پھر مملکت بھی یہ نہیں کہ مسلمان قوم ہے' ان کی ایک مملکت ہے' وہ تو دنیا کے اندر دوسری مملکتیں موجود تھیں۔ اسکے بعد اگلی شرط یہ ہے کہ مملکت وہ ہو جس میں کفر اور ایمان کا جو معیار قرآن مجید نے دیا ہے' وہ ہو یعنی یہ کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) اس مملکت میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق فیصلے ہوں۔ لہٰذا اس مذہب کو دین میں تبدیل کرنے کے لیے پہلی شرط تو یہ ہو گئی کہ اپنی آزاد

---

[1] یہ اشارہ علامہ محمد اقبالؒ کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد کی طرف ہے۔

مملکت ہو جس کی بنیاد یہ ہو کہ اس میں قرآن مجید کے مطابق قانون بنانے ہیں' اس کے مطابق نظام قائم کرنا ہے۔

## آئینی طور پر اسلامی مملکت کی دو بنیادی خصوصیات

پہلی بنیادی اینٹ تو یہاں رکھی گئی۔ افراد کے لیے اب اگلا قدم اٹھنا' دین کے مطابق ممکن ہو گیا کہ اپنے ہر نزاعی معاملے میں' اختلافی معاملے میں' فیصلہ وہاں مرکزی اتھارٹی سے لیا جائے۔ وہاں سے لیے جانے کے معانی یہ ہیں کہ ''ان کی طرف سے نافذ کردہ قوانین اور احکام سے اپنا فیصلہ لیا جائے''۔ دوسری شرط یہ ہوگئی۔ یہاں تک تو یہ جتنی بھی دنیا میں Constitutional Governments (آئینی حکومتیں) ہیں' ان کے افراد یا ان ممالک کی رعایا جنہیں آپ باشندے کہتے ہیں' وہ اپنے فیصلے ملک کے مروجہ قانون سے لیتے ہیں۔ یہ چیز قانونی طور پہ یہاں تک تو ہوتی ہے' ہر جگہ ہوتی ہے۔ اگلی چیز وہ ہے جو مومن بناتی ہے کہ پھر اس فیصلے کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کی جائے۔ یہ وہ چیز ہے جہاں ایک نفسیاتی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے' یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے۔ یہاں قلب و نگاہ کے اندر ایک تبدیلی کی ضرورت ہے' نفسیات میں تبدیلی کی ضرورت ہے کہ اس فیصلے کے خلاف دل میں کوئی گرانی بھی محسوس نہ کرے' اسے قرآن کریم وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) کہتا ہے۔ اسلام یہاں سے ہے۔ یہ چیزیں ہونگی تو پھر سوچیے کہ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (4:65) (اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے) جو کہا گیا ہے تو وہ کیا ہے؟

## ضمیر کی کہانی' حقائق کی زبانی

اب اس میں ایک بڑی اہم چیز آتی ہے' اسے ذرا غور سے سنیے گا' کام آئے گی۔ دنیا میں عام طور پہ یہ چیز ہے کہ صاحب! انسان کو ضمیر کی آواز پہ چلنا چاہیے' اپنے ''دل'' سے پوچھنا چاہیے' ضمیر مردہ ہو گئے ہیں صاحب! ضمیر کی بیداری نہیں رہی۔ یہ ضمیر کیا چیز ہے؟ کہ صاحب! انسان کے اندر یہ ایسی کوئی چیز ہے کہ جہاں کوئی بات غلط ہوتی ہے' تو وہ اس کو ٹوک دیتی ہے' روک دیتی ہے' آواز دیتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ جیسا کہ کئی بار میں پہلے عرض کر چکا ہوں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو آپ کے اندر سے آواز اٹھتی ہے' یہ حق اور باطل کے اندر تمیز نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ مطلق حق یا جسے مطلق باطل کہتے ہیں جو Absolute Right (حقِ مطلق) ہے' یہ اندر کی آواز آپ کو بتا سکے کہ یہ مطلق حق ہے' یہ Absolute Truth (صداقتِ مطلق) ہے۔ اور اس کی تائید میں آپ کے اندر سے جو آواز نکلے' اس کے خلاف اگر آپ کچھ کرنے لگیں تو اس سے ضمیر روک دے۔ ضمیر میں ایسی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان کی بچپن سے جو تربیت ہوتی ہے' جس قسم کے ماحول میں وہ رہتا ہے' جس قسم کی سوسائٹی میں وہ پرورش پاتا ہے' وہاں وہ سوسائٹی جن

چیزوں کو معیوب قرار دیتی ہے' اس کے لاشعور میں' اس کے Unconscious Mind (لاشعور ذہن) میں' اس کے خلاف نفرت یا سرکشی کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔جس ماحول میں پرورش پاتا ہے' وہاں جس چیز کو برا سمجھا جاتا ہے' اسے وہ بُرا سمجھتی ہے۔یاد رکھیے! یہی وہ لاشعور کی آواز ہے کہ آگے چل کر جہاں اس قسم کی کوئی چیز آئے گی' وہ اندر سے آواز دے گی کہ یہ غلط ہے۔

## ضمیر کی یا دل کی چند ایک مثالیں اور اُن کا معیار

جیسا کہ میں مثال میں بتایا کرتا ہوں جینیوں کے ہاں کے بچے میں بچپن سے یہ چیز ہے کہ ان کے ہاں گوشت اس قدر قابلِ نفرت ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے سے ہی انہیں متلی ہوجاتی ہے صاحب! یہ اس کا دھرم ہو چکا ہے' اس کے اندر یہ آواز اس کے تحت الشعور میں جاگزیں ہوجاتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا تو ایک طرف رہا' گوشت کو دیکھ کر بھی اس کو قے ہوجاتی ہے۔اس کے مقابل میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا بچہ' دودھ چھوڑنے کے بعد ہی' بلکہ اکثر اوقات تو اس سے پہلے ہی' ہڈی لے کر نہایت مزے سے چوس رہا ہوتا ہے۔اس کے بعد کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس سے نفرت آنا تو ایک طرف رہا' یہ جو دو دن کا ناغہ ہے' اس کے اندر وہ اس قسم کی چار سو بیس کرتا پھرتا ہے کہ صاحب! اس ناغے میں بھی کسی طرح سے گوشت مل جائے۔اس کے اندر کی آواز کبھی گوشت کے خلاف سرکشی یا نفرت نہیں پیدا کرے گی' جینی بچے کی آواز اس کے خلاف ہمیشہ یہ چیز کہے گی۔

اب دوسری مثال لیجیے۔ٹھگوں کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اُسے بچپن سے یہ تعلیم دی جاتی کہ جب تک وہ پہلا لوٹ کا کیس یا قتل کا کیس نہیں کر لیتا' ان کے ہاں اس کی شادی نہیں ہوتی۔اُن کے ہاں کی جو بھیرو دیوی تھی' وہ اس سے تب خوش ہوتی تھی جب لوٹ کا پانچواں حصہ اس کے آگے دان دیدیا جائے۔ٹھگوں کا جو بچہ تھا' کبھی بھی اس کے اندر ضمیر کی آواز اُسے یہ نہیں کہتی تھی کہ یہ لوٹنا' دوسرے کو دھوکا دینا' اس کا گلا گھونٹنا' یہ کوئی بری بات ہے۔یہ تو اس کے نزدیک کارِ ثواب ہے' دیوی اس سے خوش ہوتی تھی۔

آج بھی دنیا میں جن جن اقوام میں' جو چیزیں ان کے ہاں کے معاشرے کے اندر جائز قرار پائی ہوئی ہیں' ان کے ہاں کا جو بچہ ساری عمر اس چیز کے خلاف ہے' اس کے دل میں کبھی بھی یہ چیز نہیں آئے گی۔ہم نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ چوہیا چھپکلی وغیرہ قسم کے جانور دیکھنے سے نفرت آتی ہے' اتنی نفرت ہوتی ہے کہ جیسا میں نے کئی دفعہ یہ کہا ہے' ہمارے ہاں یہ لوگ شراب جیسی چیز جو ایسی ممنوع ہے' وہ شرابی شراب پی رہا ہوتا ہے لیکن اس کے پیالے میں اگر چوہیا گر جائے تو وہ اس کو شراب سمیت گرا دیتا ہے لیکن وہ قومیں بھی ہیں جو نہایت لذت سے ان چیزوں کو کھاتی ہیں' ان کے بچوں کے دل میں کبھی بھی اس کے خلاف perversion (بدنہادی) نہیں پیدا ہوگی۔

## ضمیر کی آواز تو قلب ونگاہ میں سمویا ہوا سماج ہے، حق وباطل کا امتیاز نہیں

میں کہہ یہ رہا تھا کہ جسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں، وہ حق اور باطل کے اندر امتیاز نہیں کرسکتی۔ بچپن سے اس بچے کو جو چیز کہی جاتی ہے، اچھی ہے تو اس کے تحت الشعور میں اس کے متعلق اچھے جذبات ہوتے ہیں، جسے بچپن کی تربیت کے دوران یہ کہا جائے کہ یہ چیز اچھی نہیں، معیوب ہے، ناجائز ہے، قابلِ نفرت ہے، اس کے اندر یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو پھر وقتاً فوقتاً اندر سے جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں، وہ آواز آ جاتی ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ضمیر کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ

It is the society internalize❶

یہ اس کی بڑی عمدہ Definition (تعریف) ہے کہ اس کے اندر ماحول یا سماج یا معاشرہ داخل کر دیا جاتا ہے، انسان کے دل کی یہ آواز ہوتی ہے جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں لیکن بات جو میں کہہ رہا تھا وہ آگے چلتی ہے۔

## مذہب، دین اور فیصلوں میں ضمیر کی آواز کے مفروضے اور مضمرات

جب انسان کسی معاملے کا خود فیصلہ کرے گا تو اس کے دل کی گہرائیوں میں، اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی گرانی محسوس ہی نہیں ہوگی۔ خود فیصلہ کرے گا تو اس میں ضمیر بھی اس کا مطمئن ہے، کوئی گرانی محسوس نہیں ہو رہی۔ یہ گرانی کہاں محسوس ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے؟ کہ فیصلہ کوئی دوسرا دے۔ اپنے فیصلے کے خلاف تو کبھی بھی کسی کے دل میں گرانی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہاں سے مذہب چھوڑ کر دین شروع ہوتا ہے۔ مذہب میں انسان اپنے فیصلے آپ کرتا ہے، اس لیے اپنے فیصلوں کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہوتی، اس کا ضمیر بھی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن یہ جو دین میں دوسرا فیصلہ دیتا ہے، یہ اتھارٹی اس کو فیصلہ دیتی ہے۔ یہاں یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ فیصلہ اس کی اُس ضمیر کے بھی خلاف ہے کہ وہ جو ماحول ہے اس نے اپنے اندر اقدار (Values) کے تصورات قائم کیے ہیں، اس کے بھی خلاف ہو، اس کے اپنے مفادات کے خلاف ہو، اس کے اپنے فیصلوں کے خلاف ہو۔ ان چیزوں کے خلاف ہوتے ہوئے بھی دل کے اندر گرانی پیدا نہ ہو۔ یہ ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ ایمان شروع ہوتا ہے۔

اور اگلی چیز اور سمجھیے جو میں نے کہا تھا کہ بڑی کام کی چیز ہے۔ ضمیر کی آواز سے مذہب کی دنیا میں اپنا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ انسان اس پہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ رام بھی وہی ہے، رحیم بھی وہی ہے، کسی نے بھگتی کر لی، کسی نے پرستش کر لی، کسی نے پوجا کر لی، کسی نے Worship کر لی، کوئی گرجے چلا گیا، کوئی مندر چلا گیا، اس لیے کہ

---

❶ معاشرہ نے جو کچھ دیا ہے اس نے اسے اپنے قلب ونگاہ میں سمو لیا ہے۔ یہ ہے ضمیر کی آواز۔

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے
کہت کبیر عقل کے پھیرے

## مذہب انفرادی فیصلوں کا مجموعہ ہوتا ہے' دین اجتماعی زندگی کا نام ہے اس لیے ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت ہے

تصوف کی عجیب فریب انگیز مثالیں ہوتی ہیں۔ مذہب کے اندر انفرادی طور پر یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں' سب کا الگ الگ فیصلہ ہوتا ہے۔ دین Collective (اجتماعی) چیز ہے۔ اجتماعی زندگی کے اندر جو انفرادی فیصلہ ہے' وہ کام ہی نہیں دے سکتا۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ آپ کی دو ہزار یا چار ہزار سپاہیوں کی فوج کھڑی ہو اور وہاں یہ کہہ دیا جائے کہ اپنے اپنے ضمیر کے مطابق' یعنی جو کچھ تمہیں ضمیر کہہ رہا ہے یا جو تمہارا اپنا فیصلہ ہے' اس کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے' تو اس فوج کا کیا حشر ہوگا؟ یہ Collective (اجتماعی) زندگی ہے' یہاں اجازت ہی نہیں دی جا سکتی کہ اپنا اپنا فیصلہ کر کے وہ وہاں اس کے مطابق کوئی قدم اٹھائیں۔ وہاں تو صورت یہ ہوگی کہ کہیں سے ان کو ایک آواز آئے گی کہ Right Turn (دائیں طرف مڑو) ' ان کا دل کچھ کہے' ان کا ضمیر کچھ کہے' ان کے اپنے فیصلے کچھ کہیں' انہوں نے اس آواز کی اطاعت کرنا ہوگی۔ یاد رکھیے! دین میں' کیونکہ زندگی اجتماعی (Collective) ہوتی ہے' اس لیے اس کو خارجی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ مذہب میں انفرادی زندگی ہوتی ہے' خارجی ہدایت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' اپنے دل کے اندر سے جو جی میں آئے کرتے چلے جائیے اور مطمئن ہو جائیے۔ دین اجتماعی زندگی کا نام ہے اس لیے اس میں آپ کو منزل من اللہ Direction (ہدایت) کی ضرورت پڑتی ہے' خارجی ہدایت کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب ہدایت بھی کہیں خارج سے' باہر سے' آئی ہوئی ہو اور اس ہدایت کو چلانے والی اتھارٹی بھی آپ کے ہاں باہر ہو' نہ آپ کے اندر سے یہ ہدایت ابھری ہوئی ہو' نہ یہ کہ آپ اس ہدایت کے مطابق جیسا جی میں آئے' اپنا اپنا فیصلہ کرتے چلے جائیں تو آپ کو اس اتھارٹی کے تحت' اس ہدایت کے مطابق چلنا پڑے گا۔ اس کے برعکس کوئی نظام نہیں چل سکتا' حکومت کا نظام نہیں چل سکتا' فوج کے نظام نہیں چل سکتے' Collective (اجتماعی) زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں چل سکتا۔ اگر ہر فرد کو اس کی اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے اپنے دل کے فیصلے کے مطابق اقدام کرے' اپنے ضمیر کو راضی کر کے آگے چلے تو حکومت کے اس نظام میں انارکی پھیل جائے گی۔ مذہب تو چلتا ہی اس میں ہے لیکن دین چل ہی نہیں سکتا کیونکہ دین اجتماعی زندگی کا نام ہے اور اجتماعی زندگی میں ہدایت ہمیشہ خارج سے ملے گی' خارج سے آپ کو حکم ملے گا' اس کی اطاعت آپ کو کرنا پڑے گی۔ عزیزانِ من! یہ وجہ ہے کہ دین میں ایک مملکت' ایک Sovereign

Authority (اقتدار کی اتھارٹی) کی ضرورت ہوتی ہے اور اطاعت کے لیے خارج سے کسی قانون دینے والے کی یا قانون نافذ کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔

## قرآنی حکومت کے برعکس سیکولر گورنمنٹ کا خودساختہ قانون کسی خارجی معیار کو تسلیم ہی نہیں کرتا: یہ دھوکا ہے

اب اگلی بات یہ آ گئی کہ یہاں تک تو ایک سیکولر گورنمنٹ بھی یہی کہے گی کہ ملک میں جو قانون رائج ہے' اس کے مطابق اطاعت کی جائے گی۔ قرآنی حکومت میں پہلی چیز تو یہ ہوگی کہ وہ قانون ایسا نہیں کہ جیسا جی میں آئے' حکومت بنا لے' یہ خدا کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق بنے گا۔ اور دوسری چیز جو میں نے عرض کیا ہے' اس آیت میں ہے کہ نفسیاتی تبدیلی' نگاہ کی تبدیلی' انسان کے اندر کے جذبات وخیالات کی تبدیلی' اس قسم کی ہوگی کہ اس فیصلے کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ ہے **وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** (4:65) دل کی گہرائیوں سے' بہ طیبِ خاطر تسلیم کریں۔۔ پہلا حصہ نگاہ کی تبدیلی' جذبات وخیالات کی تبدیلی' نفسیاتی تبدیلی ایمان کا تھا' یہ حصہ فیصلوں کو بہ طیبِ خاطر قبول کرنا اسلام کا ہے۔ یوں اس کے سامنے جھک جانا اور اس کی اطاعت کرنا' اسے اسلام کہتے ہیں۔ اب یہ دیکھ لیجئے' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ پھر اس کے بعد ہم خود اس معیار کے اوپر اپنے آپ کو پرکھ کر دیکھ لیں کہ کیفیت کیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بات کچھ ایسی نہیں ہے کہ ٹال کر آگے چلے جائیں۔ کہا یہ ہے کہ **فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ** (4:65) اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حَکَم (فیصلہ کرنے والا ثالث) نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم صادر کرو' اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔ سیدھی سی بات ہے آپ دیکھ لیجیے کہ کتنی چیزیں ایک آیت کے اندر آ گئیں۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا' یہ پورے کے پورے نظام کا اصل الاصول اس ایک نظام کے اندر آیا ہوا ہے۔ یہ انفرادی فیصلے نہیں ہیں' یہ باہر سے آئے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ اس کی اجتماعی طور پر اطاعت کی جائے گی اور اس اطاعت کی کیفیت یہ ہوگی کہ دل میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ اسے اسلام کہا جائے گا۔ ہمیں ایسا کر کے دیکھ لینا چاہیے۔

اس کے بعد یہ جو ہمارے ہاں روز رونا ہے کہ صاحب! دنیا میں ستر کروڑ[1] مسلمان بستے ہیں' صاحبِ ایمان ہیں' ان کی کیفیت

یہ ہے کہ جنہیں ذلیل تریں قومیں کہتے ہیں' یہ ان ذلیل تریں قوموں کے ہاتھوں خود ذلیل ہو رہے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ذرا سوچ کر تو دیکھیے کہ آیا یہ ایمان بھی ہے؟ یہ تھا جو میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! اپنے آپ کو دھوکا دیئے چلے جانے سے فائدہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ دنیا کی قومیں یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ اسلام تھا' ایک اچھا کارتوس تھا لیکن کسی زمانے میں چل گیا' اب یہ چلا ہوا کارتوس ہے۔ اب یہ دنیا کے اندر چل ہی نہیں سکتا' چل سکتا تو ان ستر کروڑ انسانوں[1] کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ ہم نے اس اسلام کو بھی ڈبو دیا' ہماری حالت نے اس دین کو بھی ذلیل کر دیا۔ وہ آ گئی پہلی چیز جو میں نے دہرا دی۔

قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ نگاہ کی تبدیلی' جذبات و خیالات کی تبدیلی' ایمان کی بنیاد ہے' تو کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ پوچھے کہ بتاؤ میں مسلمان ہوں یا مومن ہوں؟ اگر یہ نہیں ہے تو اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) یہ بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ خدا کو اور مومنین کو بھی دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (2:9) وہ کسی کو کیا دھوکا دیتے ہیں' اپنے آپ کو دھوکا دیئے چلے جا رہے ہیں۔ پہلی چیز کے بعد اب اگلی آیت آتی ہے کہ اس کا ٹیسٹ کہاں آتا ہے؟

## قرآنِ حکیم پر ایمان لانے کا آخری ثبوت میدانِ جنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! یوں تو زندگی میں قدم قدم پر اس کا ٹیسٹ آتا ہے مگر ہر اختلافی معاملے کے اندر وہاں سے فیصلہ لینا اور اس فیصلے پہ اس طرح چلنا کہ دل میں بھی کوئی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ ہو' یہ ہے اس کا ٹیسٹ۔ اس میں شبہ نہیں کہ قدم قدم پہ یہ ٹیسٹ اور اس قسم کے امتحان انسان کے آتے ہیں لیکن اس کی انتہا وہاں ہوتی ہے جب جان دینی پڑتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے میدانِ جنگ کو ایمان کی آخری کسوٹی قرار دیا ہے۔ مومن ہونے کے لیے جو معاہدہ تھا اس میں یہ تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ (9:111) یہ اپنی جان بیچ دیتا ہے اور جو کچھ اکتسابی طور پر یہ کماتا ہے وہ بھی بیچ دیتا ہے۔ یہ جو مال والی چیز ہے' اس میں تو پھر بھی انسان عمل کرتا ہی رہتا ہے' اصل ٹیسٹ آتا ہے جہاں جان جیسی چیز دینی پڑتی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے ایمان کی یہ جو امتحان گاہ ہے' یہ جو میدانِ کارزار بتایا ہے' اُسے یہ جان دینے والی بات کہا ہے۔

## جہاد کا فلسفہ دوسروں کی جان لینا نہیں بلکہ جان دینا ہے

اور یہ دیکھیے قرآن حمید کا اعجاز' یہاں یہ بات نہیں کہی' میدانِ جنگ یا جہاد کا لفظ نہیں لایا' یہ بھی نہیں کہا کہ جا کر دوسروں کو مارنا'

---

[1] اس وقت یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے اور اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ بات اکتوبر 1970ء کی 11 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

ٹیسٹ ہے۔کہا یہ ہے کہ وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (4:66) جو یوں ایمان نہیں لائے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملوں کے اندر تو شاید پھر بھی یہ کیفیت ہو کہ مرتے دھرتے کسی طرح سے تسلیم کر ہی لے لیکن اگر ان پہ کسی وقت یہ فرض عائد کر دیا جائے' حکم دیدیا جائے کہ جاؤ اور اپنی جانیں دیدو۔ دیکھیے یہ لفظ یہاں کہا ہے کہ اپنی جانیں دیدو' ورنہ میدانِ جنگ میں تو انسان دونوں قسم کے خیال لے کر جاتا ہے اور اولیں خیال تو یہ آتا ہے کہ ہم نے دوسرے کی جان لینی ہے' فاتح اور منصور لوٹنا ہے۔خیال یہی ہوتا ہے اور اس خیال کے ماتحت آدمی چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خیال ہی پہلی چیز ہے کہ نہیں صاحب! اس خیال کے ماتحت جانا ہے کہ ہم نے وہاں جا کر جان دینی ہے۔

اب اگر ایسا موقعہ آجائے اور یہ کہا جائے تو پہلی چیز یہ ہے کہ گھروں کو چھوڑ کر نکلنا ہوگا' میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تو گھروں کو چھوڑنا ہوگا۔ وہ جو گھر ہے' اس میں ہزار قسم کی جاذبیتیں سمٹی ہوئی ہوتی ہیں' گھر کے چھوڑنے کے معنی کسی چار دیواری یا اینٹ اور پتھر کو چھوڑنا نہیں ہے' اس میں تو کیا ہی جاذبیت ہوتی ہے۔گھر تو نام ہی ہوتا ہے دنیا بھر کی ساری گہری Attractions (جاذبیتیوں) کا۔ وہ ساری گھر کے اندر موجود ہوتی ہیں۔انہیں چھوڑنا پڑے اور جان دینی پڑے تو کہا کہ یہ ہے اس کا ٹیسٹ۔

اگر یہ صورت ہوجائے تو جن کا اس انداز کا وہ ایمان نہیں ہے وہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔اس ٹیسٹ پر وہ پورے نہیں اتر سکتے۔کہا ہے کہ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66) اگر یہ اپنا وہ انداز اپنے اندر پیدا کر لیتے جو ہم نے پہلے کہا ہے تو ان کے اپنے اندر اس قسم کی نگاہ میں' نفسیات میں' تبدیلی پیدا ہوجاتی کہ ان فیصلوں کے خلاف دل میں بھی کچھ گرانی پیدا نہ ہوتی پھر یہ لوگ یہ جو آواز' اس پر کشاں کشاں' رواں دواں' رقص کرتے ہوئے' میدانِ جنگ میں چلے جاتے۔اور اگر یہ کیفیت پیدا ہوتی تو لكان خَيْرًا لَّهُمْ (4:66) ان کے لیے بہت ہی بہتر ہوتا۔

## لفظ خیر کا لغوی مفہوم ''اختیارات میں وسعتوں کا پیدا ہونا'' ہے

جیسا میں نے عرض کیا کہ خیر کتنی جامع قرآنی اصطلاح ہے۔معنی تو ہم نے ان چیزوں کے نیکی کر دیا اور پھر نیکی کی ابتدا تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ سال بھر کے رونے والے بچے کو اماں ڈراتی ہے کہ ''اونیکی آئی''۔پہلے ہی دن سے یہ ہوتا ہے کہ کسی قسم کا ہوّا آیا حالانکہ یہ تو خیر ہے۔یہ اختیارات کی وسعتیں ہیں' اس کا مادہ ''خ ی ر'' ہے۔اس سے انسان کی ذات کے اختیارات کی وسعتیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس اطاعت سے' اس جبر سے انسان کے اندر اختیار پیدا ہوتا ہے۔یاد رکھیے صاحب! یہ وہ Fall (ٹھوکر) ہے' یہ وہ ''سان'' (ٹھوکر) ہے' پتھروں کی دیوار ہے' جس سے ٹکرانے کی مجبوری سے اس ندی کی رفتار دوگنی ہوجاتی ہے۔اسی لیے قرآن کریم نے اختیار کے لیے

خیر کا مادہ استعمال کیا ہے۔ اس مقابلے میں نیکی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کہتا ہے کہ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ کسی کی اطاعت کر رہے ہیں' اپنے تمام ارادے اس کے تابع کر رہے ہیں' سرنڈر کر رہے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں کہ یہ جو طریق ہے' یہ ایسا Process (عمل) ہے کہ اس کے بعد تمہارے اختیارات کی وسعتیں کتنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہے خَيْرًا لَّهُمْ (4:66) یہ ان کے لیے خیر و برکت کا موجب ہے۔

## جہاد کے عمل سے انسانی ذات ایک ایسی پختہ شکل اختیار کر جاتی ہے جس طرح دودھ کے بلونے سے مکھن

اب سوال یہ ہے کہ اختیارات کی یہ وسعتیں کس طرح سے بڑھتی ہیں؟ کہا کہ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66) تمہاری ذات کے اندر اس قسم کا ثبات و استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ثبات و استحکام سے پہلے اس کی یہ کیفیت ہے جو ایک مثال کے ذریعے بیان ہوتی ہے۔ مثلاً دودھ میں بھی مکھن ہوتا ہے لیکن اس شکل میں کہ وہ پانی کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اندر اور پانی ڈال دیجیے وہ پھر بھی ملا ہوا ہے' اس کی اپنی الگ ذات ہوتی نہیں ہے۔ اس کو ذرا بلو کر' ٹکراؤ سے' تنوع سے' تلاطم سے' ایک مکھن کا پیڑا بنا لو اور اس کے بعد اس کو دن بھر پانی میں چھوڑے رکھو' ایک ذرّہ بھی اس میں سے کم نہیں ہوگا۔ یہ کیا ہوا؟ کہ یہ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66) ہے' یہ مزید مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے ثبات و استقامت کا باعث بنا۔ انسانی ذات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ ہر فرد کے اندر موجود ہوتی ہے اور ایسے ہی ہوتی ہے جیسے دودھ میں اس کی دوہنائی ہوتی ہے' دوہنیت ہوتی ہے' مکھن ہوتا ہے مگر یہ دودھ کے اندر کا مکھن ہے۔ نہ مکھن کو پتہ ہوتا ہے کہ میں موجود ہوں' نہ دیکھنے والا اس کو محسوس کرتا ہے' بس وہ تو اس وقت یوں ہے کہ پانی ڈالا اور وہ گھل گیا لیکن اس دودھ کے اندر سے ''مدھانی وچوں جدوں رڑ کیا جاندا اے نا'' (مدھانی سے جب اسے بلویا جاتا ہے) تو اس کے بعد جب وہی دوہنیت ابھرتی ہے تو پھر وہ مکھن کی شکل میں Solid (ٹھوس) ہوتی ہے' پھر پانی اس کو اپنے اندر جذب نہیں کرتا۔ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66)۔

## عظیم' عظمت اور علیؓ کا قرآنی مفہوم

یہ کیا الفاظ ہیں قرآن کریم کے! عزیزانِ من! جھوم جائیے۔ ان کے لیے کلاس کی ضرورت تھی۔ یہ قرآنِ حکیم نصاب (Curriculum) کی کتاب ہے' اس کا جو ایک ایک لفظ ہے' نجانے وہ کتنے پیریڈ لینے کی خود ایک چیز ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66) اگر یہ اپنی زندگی کو اُس نہج پر ڈال لیں جس کی انہیں تلقین کی جاتی ہے' تو یہ ان کے لیے ہزار خیر و برکت کا موجب ہو' اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے ثبات و استقامت کا باعث بنے۔ آگے کہا ہے کہ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:67) اگر یہ یوں کر کے بتاتے تو دیکھتے کہ پھر ہماری طرف سے انہیں کس قسم کا اجر ملتا ہے۔ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق بہت بڑا معاوضہ ملتا۔ پھر وہی بات آ گئی۔ آپ نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں ''عظیم'' کا لفظ بولا

جاتا ہے۔ یہ عظیم بھی' اعظم بھی' عظمت بھی اور تعظیم بھی بولا جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے معنی ذہن میں کیا آتے ہیں۔ اور کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟

یہ جو ''ع ظ م'' کا مادہ ہے' اسے عظم کہتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحبان تو اس کی داد دیں گے۔ یہ جو Bones (ہڈیاں) ہیں' یہ جو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے' یہ آپ کے سارے جسم کی بنیاد ہے' اسی کے اوپر یہ ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ جس قسم کی یہ ہڈیاں مضبوط ہونگی' اسی قسم کی آپ کے سارے جسم کی توانائی ہوگی۔ وہ شے جس پر دوسری چیزوں کی عمارت اٹھے' یہ ہے جسے ''ع ظ م'' کہتے ہیں' جسے بنیاد کہتے ہیں یا ہڈی کہتے ہیں۔ ''عظیم'' وہ شے ہوتی ہے جو بنیاد کے طور پہ مضبوط ہو۔ ''عظمت'' کے معنی ہیں ''کسی شے کی بنیادی مضبوطی''۔ ایک اور بات یاد آ گئی' قرآن کریم نے خدا کے لیے کہا ہے کہ **وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ** (2:255)۔ ایک طرف اس کی علی المرتبت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ انتہائی بلندیوں پر ہے اور کائنات کی بنیادیں بھی اسی ذات پر ہیں' عظیم بھی ہے عَلِیٌّ بھی ہے۔ قرآن کریم کس قدر دو متضاد صفات لایا ہے صاحب! کسی عمارت کو Define (حدود متعین) کرنے کے لیے جو بہترین چیز ہے' اس کے لیے کہنا ہی یہ ہوگا کہ بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ اس کے اوپر تین سو فٹ اونچی منزلیں ہیں' بیس بیس چالیس چالیس منزلیں ان کے اوپر اٹھ گئی ہیں۔ یہ ہے **هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ** (2:255)۔

## خدا کی ذات عظیم بھی ہے' اس میں ثبات بھی ہے اور وہ عَلِیٌّ بھی ہے

جو عظیم نہیں وہ عَلِیّ' نہیں ہوسکتا' وہ جو بنیاد ہے' وہ تو ایک منزل بھی نہیں سہار سکتی' ڈھانچہ اتنا مضبوط ہونا چاہیے۔ یہ ہے عظیم۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ عظمت کسے کہتے ہیں' تعظیم کیا ہے' اعظم کونسا ہوگا' خدا کو عظیم کیوں کہا گیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز کرو تو ہم تمہیں **اَجۡرًا عَظِیۡمًا** (4:67) دیں گے یعنی اس کے بعد تمہاری بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی۔ اور ہر عمل کی بنیاد تو انسان کی ذات پر ہی ہے۔ اگر اس میں **تثبیتًا** کی کیفیت آئی ہوئی ہے' اس میں ثبات ہے' وہ مثبت (Positive) ہے' وہ مضبوط ہے' وہ محکم ہے تو اس کے عظیم ہونے میں شبہ کیا ہے صاحب! اگر اس میں انتشار ہو' وہ ریت کی سی چیز ہو' وہ الگ الگ ذرے ہوں تو وہ عظیم ہو ہی نہیں سکتی۔ عظیم کے لیے تثبیت کی ضرورت تھی صاحب! کہا ہے کہ اس سے یہ کیفیت ہے کہ **اَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا** (4:66) وہ بڑی محکم ہوگی۔ اور یوں تمہیں وہ اجر ملے گا جسے **اَجۡرًا عَظِیۡمًا** کہا جائے گا' ٹھیک ہے بنیاد مضبوط ہوگی۔

عزیزانِ من! کیا اس مثال سے یہی سمجھا جائے کہ یہ جس شے کے متعلق کہا ہے' وہ ایک مقام پر جامد طور پہ کھڑی ہوگی؟ کہا ہے کہ نہیں! مثال تو یہاں تک ہی ہے کہ یہ بنیاد کا مضبوط ہونا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَّ لَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا** (4:68) یہ جامد نہیں

ہوگی' چلنے والی شے ہوگی۔ سیدھے راستے پہ' توازن بدوش منزل کا تعین موجود ہے' اس چلنے والے مسافر کی اس قدر محکم ہڈیاں ہیں کہ کہیں وہ اس کو تھکنے نہیں دیں گی' وہ توازن بدوش سیدھی راہ پر چلتا چلا جائے گا' وہ اسے زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیں گی' اس کی وسعتیں اتنی ہیں کہ وہ خَیۡرًا لَّهُمۡ (4:66) ہیں' اس کے لیے ہزار خیر و برکت کا موجب ہیں کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

''اور بھی ہیں'' تو وہ کہے گا جس نے یہ امتحان پاس کر لیا ہوگا ''جیہڑا ایتھے ای فیل ہو گیا اوہدے لئی ہور دا فائدہ کی اے'' (جو یہیں ناکام ہوگیا اس کے لیے اور کا فائدہ کوئی معنی نہیں رکھتا)۔ کیا بات کہہ جاتا ہے یہ!

## صراطِ مستقیم کی روح کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ: مسائل ہی مسائل

عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَّ لَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا (4:68)۔ وہ جو صراطِ مستقیم ہے' یہ پھر وہی بات ہوگئی کہ یہ کوئی انفرادی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ جو راستہ ہی نہیں چلا' اس کو کیا پتہ کہ صراطِ مستقیم کیا ہوتی ہے' منزل کسے کہتے ہیں۔ پانچ وقت' جسے ہم اجتماعی طور پہ باجماعت نماز کا پڑھنا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے بڑا ثواب ہوتا ہے' وہ تو ہمارے ہاں Term (اصطلاح) ہی رہ جاتی ہے صاحب! یہ کہتے ہیں کہ مسجد میں نماز پڑھنے سے' گھر میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں' سو گنا ثواب ہے' پھر اسی طرح باجماعت پڑھنے سے وہ اتنے گنا ثواب ہے۔ یہ تو گویا کوئی رجسٹر ہے جس میں ان کے ہاں Entry (داخلہ) ہوتی رہتی ہے۔ یہ جو چیزیں تھیں' یہ بڑی عظیم تھیں صاحب! نماز باجماعت میں جا کر ہم بھی اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1:5) کی یہ پہلی دعا' ہر رکعت میں کرتے چلے آتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو پتہ ہے کہ کس کی نماز ہوتی ہے' کس کی نہیں ہوتی؟ وہاں سوال و مباحثہ یہ ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے یا نہیں پڑھنی چاہیے۔ یہاں سارا مسئلہ ہی یہی رہ گیا ہے! کسی نے کہہ دیا کہ پڑھ لی تو کہا کہ ٹھیک ہے تیری نماز ہوگئی۔ کسی نے کہا کہ نہیں پڑھنی چاہیے تو کہا کہ تمہارے اپنے فرقے کی رو سے نماز ہوگئی۔ دونوں کی ہوگئی اور دونوں گھر چلے آئے۔ ''یعنی صراطِ مسقیم اوہدر جانی ہیگی مگر اے سٹیشن توں ٹکٹ لے کے تے گھر آ گئے'' (یعنی صراطِ مستقیم اُدھر جانے کا نام ہے لیکن یہ اسٹیشن سے ٹکٹ لے کر گھر آ گئے)۔ اور اس کے دو گھنٹے بعد پھر چلے گئے' ساری عمر پلیٹ فارم ہی خریدتے رہے۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1:5) پہلا مسئلہ یہ ہے۔

## آمین کے مسئلہ پر باہمی سرپھٹول' منزل سے دوری کی کیفیت اور سفرِ زندگی کا کارواں

عزیزانِ من! اور پھر اگلا مسئلہ ہے جس پہ سر پھٹول ہوتی ہے کہ ''آمین فیر ایہد ے بعد اُچی کہنی چاہیدی اے یا ہولی کہنی چاہیدی ہیگی'' (پھر اس کے بعد آمین بآواز بلند کہنی چاہیے یا آہستہ)۔کیا بات ہے صاحب! مناظرے کے بعد بڑے خوش ہوتے ہیں' اب تو مناظرے ہوتے نہیں' ہمیں پتہ ہے کہ کیا ہوتے تھے۔کہا ہے کہ وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (4:68) یہ صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کوئی انفرادی چیز نہیں تھی۔ سنیے! قرآن حمید اس کے بعد کیا تشریح کرتا ہے؟ پہلے تو یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ یہ کہ ایک کارواں چلا جا رہا ہے' ایک قافلہ چلا جا رہا ہے۔یہاں انفرادی طور پہ کسی ایک مسافر کی بات نہیں ہے۔یہ ایک قافلہ ہے' جو اپنے اندر کچھ تبدیلیاں کر لے گا کہ جان تک دینے کے لیے رخشاں وفرحاں بھاگتا چلا جائے گا۔کہا ہے کہ یہ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا (4:66) والی کیفیت ہے اور اس کا بدلہ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:67) ہے۔اس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے' تقویت آتی چلی جاتی ہے' ہڈیاں مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہیں۔یہ کاہے کے لیے ہے؟ کیا یہ کچھ مصلے پہ بیٹھنے کے لیے ہے؟ کہا ہے کہ ہم صراطِ مستقیم دکھائیں گے۔کیا یہ مسافر اکیلا چلا جائے گا؟ کہا ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔سفرِ زندگی تو کارواں کے اندر شامل ہونے سے ہی شروع ہوگا' یہ دین ہے۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ صراطِ مستقیم ہر راہ گم کردہ مسافر کو قافلے کے ساتھ چلنے کے قابل بنا دیتا ہے

سنیے! صراطِ مستقیم سے ہوتا کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ (4:69) جو اس طرح سے ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت کرتا ہے۔اب میں نے عرض کر دیا ہے کہ ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت سے مراد کیا ہے۔یہ اس نظام کی اطاعت ہے جو قرآن حکیم کے مطابق قائم ہو رہا ہے۔جو اس کی اطاعت کرتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے؟ سنیے! عزیزانِ من! مذہب اور دین کا فرق کیا ہے۔کہا ہے کہ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ(4:69) وہ ان لوگوں کی معیت میں آ جاتے ہیں جو انعاماتِ خداوندی سے نوازے جاتے ہیں' اس کی تنہائیاں ختم ہو جاتی ہیں' پھر وہ اُن کے ساتھ مل جاتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:5-6) وہ راستہ دکھا کہ جس پر وہ چل رہے ہیں' جن کو زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہیں۔اس نے کہا یہ ہے کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یوں اطاعت کرو کہ اس کے صادر کردہ فیصلوں پر تمہارے دل کے اندر بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو اور اطاعت کی انتہا یہ ہے کہ جان دینے کے لیے بھی بلایا جائے تو رخشاں وفرحاں وہاں چلے جاؤ۔اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہا کہ اس کے بعد یہ ہوگا کہ وہ راستہ ابھر کر تمہارے سامنے آ جائے گا۔ہدایت کے معنی ہوتا ہے ''کسی

چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا''۔ وہ راستہ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

## اہلِ قافلہ کی باکمال ثمر بار خصوصیات اور پھر اس کے حسین نتائج کہ وہ کاروانِ حیات میں جا ملے

پھر اس راستے پہ چلنے سے کیا ہوگا؟ کہا کہ تم اس کارواں کے اندر جا کر مل جاؤ گے۔ اکیلے مسافر کو تو راستے میں ہزار ڈر ہوتے ہیں' زندگی تو کارواں کے اندر چلتی ہے۔ اب سوال یہ بھی ہے کہ تم کس کارواں کے اندر شریک ہو جاؤ گے؟ کہا ہے کہ اس کارواں کے اندر مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (4:69) جن پہ خدا نے اپنے انعامات کیے ہیں۔ تم اس کارواں میں شریک ہو جاؤ گے۔ یہ انعامات یافتہ کون سے لوگ ہیں؟ کہا ہے کہ یہ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ (4:69) ہیں۔ یہ کارواں دیکھیے صاحب! اس کے اندر سالارِ کارواں انبیا کی جماعت چلی جا رہی ہے' پھر یہ صدیقین کی جماعت ان کے پیچھے ہے۔ صدیق وہ ہیں جنھوں نے اپنے دعوائے ایمان کو عمل سے سچ کر دکھایا۔ پھر "شُهَدَآءِ" کی جماعت چلی آتی ہے جن کے ذمے پوری اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ(2:143) اور اس طرح سے ہم نے تمھیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو۔ یہ شہدآء ہو جائیں گے لیکن یہ کون ہونگے جو ایسا کر سکیں گے؟ یہ صالحین ہونگے یعنی وہ ہونگے جن کی اپنی صلاحیتیں بیدار ہو چکی ہونگی۔ یہ ایک قافلہ چلا جا رہا ہوگا جس کے اندر تم جا کر مل جاؤ گے۔ یہ کتنا پریکٹکل پروسیس ہے' زندگی کا کتنا حسین نقشہ ہے!

عزیزانِ من! مسافر کو تو مارتی ہی تنہائی ہے۔ کارواں کے اندر مل رہا ہے لیکن افرادِ کارواں کون ہیں؟ وہ جن کے اپنے اندر یہ تبدیلی آ چکی ہے۔ ان میں سے ہر فرد اس قسم کی صلاحیتوں کا مالک ہے' پھر یہ افراد مل کر ایک کارواں بنتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے' صاحب! پھر میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو نصاب (Curriculum) کی بات ہے۔ فرد کے اندر یہ تبدیلی' جہاں تک نظر آتا ہے' انفرادی ہے۔ زندگی ایک انفرادی شے ہے' ہر فرد کے اندر اس کی اپنی ذات ہے' اس کے اندر یہ نشو و نما ہوگی' اس میں تبدیلی آئے گی۔ فرد کے اندر یہ تبدیلی مقصود بالذات نہیں ہے' اس تبدیلی کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس میں اس قسم کی طاقت پیدا ہو جائے کہ اس کارواں کے اندر جا ملے جو منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ چلنے سے تھک کر نہ بیٹھ جائے' اس لیے اس کے اپنے اندر اتنی توانائی ہونی چاہیے۔

## عربوں کے ہاں اسلام کے معنی قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے تھے

کیا آپ کو پتہ ہے کہ اسلام کے معنی عربوں کے ہاں کیا ہوتے تھے؟ وہ یہ تھا کہ وہ چار گھوڑے جو اس طرح سے چلیں کہ ہر ایک کا

قدم یکساں طور پر اٹھے' یکساں طور پر پڑے' تو وہ اس کو تسالم کہتے تھے۔ اس جماعت کے اندر یہ افراد اتنی توانائیوں کے مالک ہوں' ان کے یکساں قدم اٹھیں' یکساں قدم پڑیں۔ منزل ایک ہو' سالارِ کارواں ایک ہو' قافلہ کے افراد میں یہ کیفیت ہو' ان میں سے ہر فرد اتنی صلاحیتوں کا مالک ہو' وہ اٹھیں تو پھر قدم اس طرح سے اٹھیں۔ پھر وہی آرمی اور فوج یاد آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے' ان کی روایات کو مستحکم بنائے' ان کے ہاں یہ روایتیں ابھی کام کرتی ہیں۔ ان کو بھی چلتے ہوئے دیکھیے ''تے انارکلی جیہڑے چلن ڈیے ہوندے نیں او ہناں نوں وی تکیا کرو'' (جو انارکلی (لاہور کا ایک معروف بازار) میں چل رہے ہوتے ہیں' انہیں بھی دیکھا کرو) نہیں جی! انار کلی میں نہیں' یہ جو حج کر کے آئے ہیں' ان سے پوچھیے کہ ان میدانوں کے اندر چلنے والوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ ''بھاگڑ مچی ہوئی ہوتی ہے'' افراتفری ہوتی ہے' نفسانفسی ہوتی ہے' کسی کا قدم دوسرے سے نہیں ملتا' لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اب اس کے اندر اس طرح سے شرکت ہو' ہر فرد اپنے طور پر ان صلاحیتوں کا مالک ہو' وہ اگر ساری صلاحیتوں کو برومند کر کے کارواں کا فرد بنے گا تو یہ کارواں تنہا نہیں چلے گا۔ اب مذہب تو دین میں تبدیل ہو رہا ہے۔ مذہب میں اجتماعی نظامِ حیات کا کیا دخل! کچھ بھی نہیں۔

## زندگی کا مقصود و مفہوم صرف صراطِ مستقیم اور پھر اس کو بروئے کار لانے والی شخصیات کی معیّت

آپ نے دیکھا کہ دونوں کیفیتیں کیسے ہونگی؟ یہ بھی نہیں ہے کہ ایک فرد اپنے اندر یہ چیزیں پیدا کرے یا نہ کرے' اس کی اپنی اخلاقی حالت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو' پارٹی کے اندر شامل ہو جائے' جیسا کہ ان پارٹیوں میں یہ شامل ہونے والی بات ہوتی ہے۔ کیا اسے اس کارواں میں یوں شامل ہو جانا چاہیے؟ کہا کہ بالکل نہیں۔ فرد کے اپنے اندر ان صلاحیتوں کی' ان خصوصیات کی نشو ونما ہونی چاہیے' پھر وہ اس کارواں کے اندر شامل ہو ورنہ قطعاً نہیں۔ کیا بات کہہ جاتا ہے اقبالؒ (1877-1938ء)! مشکل یہ ہے کہ یہ پھر فارسی میں کہتا ہے' اردو اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ کہا ہے کہ

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است [1]

آہاہاہا! زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے تو اپنی ذات کی' خودی کی' نگہداشت کی جائے لیکن یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ مقصود بالذات ہو' کہ اس شمع کو جلا کر اپنے ہی اندر رکھ دیا۔ نہیں! یہ انجمن آرا ہے۔ یہ کرنے کے بعد' خلوتوں کے بعد' یہ جلوت میں آئے گی' اسے اجتماعی زندگی کے اندر آنا ہے۔ اور اگلی مثال یہ ہے کہ

اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو [2]

---

[1] زندگی انجمن آراستہ کرنے والی اور خود کو نگاہ میں رکھنے والی یا اپنی حفاظت آپ کرنے والی ہے۔

[2] اے وہ شخص جو قافلہ میں شامل ہے' سب کے ساتھ رہ لیکن سب سے الگ چل۔

کیا سمجھاؤں کہ کیا بات ہے صاحب! اے قافلے کے اندر چلنے والے! تمہاری اپنی ذات کا جہاں تک تعلق ہے' ایسی ہو کہ تُو بے ہمہ ہے۔ جیسے تم نے اپنی ذات پہ' اپنے بھروسے پہ' اپنے اعتماد پہ' چلنا ہے' اپنے اندر اعتمادِ خویش کی یہ کیفیت پیدا کر' تمہارے اندر اتنا Self Confidence (خود اعتمادی) ہو کہ گویا میں نے ہی تنہا منزل تک جانا ہے لیکن با ہمہ رو ہو' قافلے کے ساتھ چلے۔ یہ ہے اسلام' عزیزانِ من!

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

(اقبالؒ: زبورِ عجم (1948)' ص۔184)

یہ ہے صراطِ مستقیم۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ کہا ہے کہ یہ اس کارواں کے اندر جا کر شامل ہو جاتا ہے جو کارواں ان افراد پہ مشتمل ہے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ سالارِ کارواں چلے جا رہے ہیں' ان کے ساتھ صدیقوں کی جماعت ہے' شہداء کی جماعت ہے' صالحین کی جماعت ہے۔ یہ آپ کے سامنے پورا نظام آ گیا۔

## زیرِ نظر قرآنی آیت کے غلط مفہوم کی پیدا کردہ تباہ کاریوں کی کیفیت

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے دور میں اس آیت (کے غلط معنی و مفہوم) نے کیا مصیبت پیدا کر دی ہوئی ہے؟ اس ابتری کے دور میں تو وہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) ہوتا ہے کہ اسی قرآن کریم سے ہزار گمراہیاں پیدا کی جائیں گی۔ یہ جو ہمارے ہاں پنجاب میں دعویٰ نبوت [1] ہوا' اس میں بنیادی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ دیکھیے صاحب! قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ (4:69) جو خدا اور رسول کی اطاعت کرے گا' وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائے گا جن پہ خدا نے انعام کیا یعنی انبیاء' صدیقین' شہدآء' صالحین میں' تو کہا ہے کہ یہ جو "من النبین (4:69) آیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو پھر نبی ہو جائے گا۔ اس استدلال سے انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ ہم نے خدا اور رسول کی ایسے اطاعت کی کہ ہم نبی ہو گئے۔ یہ ہے صاحب! اس کی دلیل۔ کہنے لگے کہ اس میں من النبین (4:69) لکھا ہوا ہے۔ وہ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ (4:69) اطاعتِ خدا اور رسول سے وہ نبی ہو گئے۔ یہاں بات کیجیے صاحب! کہ کیا یہ بھی کوئی دلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پہ اس سے زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ چلے ہوئے کارتوس ہیں' انہیں پوچھتا کون ہے مگر افسوس اس چیز کا آتا ہے کہ قرآنِ کریم نے نبی کا جو انقلاب آفریں مشن دیا تھا اور اس نے ایسا تہلکہ انگیز قیامت برپا

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908ء) کی طرف ہے۔

کرنے والا جو مقام بتایا تھا' افسوس یہ ہوا کہ اس قسم کے دعویداروں نے ان تصورات کو خاک میں ملا دیا۔ اب ذہن میں یہ تصور آ گیا کہ وہ نبی یہ ہوتے ہیں جو اس طریقے سے بنتے ہیں۔

## معیت کے غلط مفہوم سے پیدا ہونے والے تاثر کا نتیجہ

اور اب سوال یہ ہے کہ پھر اس کے بعد وہ کر کے کیا جاتے ہیں؟ وہ تو پتہ نہیں مگر وہ اس سے بھی پہلے کیسے کہہ گیا تھا کہ

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

(غالب: 1797-1869ء)

امت کے دکھ کی دوا کرنے والا کوئی ہوتا تو جب ہی ''اپنی دعا کرکے' اپنی اروڑیاں جیہڑیاں ہیگیاں نیں' جنت البقیع بنا کے' چپہ چپہ زمین لکھاں روپیہ دی وکن ڈئی ہیگی'' (اپنی دعا کر کے' یہ جو الجھنیں پڑی ہیں انہیں جنت البقیع بنا کر چپہ چپہ زمین لاکھوں روپوں کی لکھا کر بیچی جا رہی ہے)۔ ہم تو وہاں کے [1] رہنے والے تھے' نام بھی اس کا غلام احمد (1835-1908ء) ہے جی! اس میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے' صرف اتنا سا عرض کرونگا جہاں لوگوں کو مغالطہ دیا جاتا ہے کہ نبی بن جاتا ہے۔

یہ جو مَعَ الَّذِيْنَ (4:69) ہے' جو معیت ہے' جو ساتھ ہونا ہے' یہ کہتے ہیں کہ ساتھ ہونے سے صاحب! وہی بن جاتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ جو صراطِ مستقیم پہ چلنے والا ہے' جو صراطِ مستقیم بتایا تھا' چلیے صاحب! یہ جو مع کا لفظ ہے ''جس کے معنی ساتھ ہوتا ہے'' کے ہیں تو خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو' تو اگر معیت سے' ساتھ ہونے سے' انسان وہی ہو جاتا ہے تو ہر فرد' ہر انسان خدا ہے۔ اور آگے چلیے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (2:153) چلیے اللہ ہر ایک کے ساتھ نہ سہی' صابرین کے ساتھ ہے۔ یہ معیت خدا کی معیت ہوگئی۔ اگر کسی کی معیت سے وہ جو مع الذین استدلال لاتے ہیں یعنی کسی کے ساتھ ہو جانا' تو اس سے وہی ہو جاتا ہے۔ تو پھر نبی تک ہی کیوں رک گئے جی! کہا کہ ٹھیک ہے' صالحین بھی ہو سکتے ہیں' شہدآء بھی ہو سکتے ہیں' صدیقین بھی ہو سکتے ہیں' نَبِيِّنَ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ ایک قدم اور آگے بڑھیے' حضرت صاحب! وہ جو اِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَعَكُمْ (47:35) کہا ہے اللہ معیت میں ہے' تو اگر معیت ہی شرط ہے تو خدا کیوں نہیں ہو سکتا۔ اور وہاں تو اور چیز بھی ہے۔ یہاں تو معیت کے لیے صراطِ مستقیم پہ کہا تھا' اس نے کہا کہ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56) میرا رب بھی صراطِ مستقیم پہ چل رہا ہے' پھر تم بھی صراطِ مستقیم پہ چلو' خدا کی معیت نصیب ہوئی تو خدا بھی بن گئے

---

[1] یعنی ہم تو اس علاقے کے رہنے والے تھے جہاں سے اس مرزا غلام احمد قادیانی نے نبی بننے کا دعویٰ کیا تھا۔

جناب! رک کیوں گئے ہو؟ چنانچہ ان میں پھر بعد میں وہ عبداللطیف' وہ چارہ جوئی وغیرہ والے آئے' انہوں نے خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا کہ ٹھیک ہے "اگے کوئی پھاٹک لگا ہیگا" (آگے کوئی پھاٹک تو لگا ہوا نہیں ہے)۔ یہ معیت ہی تو ہے۔ دلیل ملاحظہ فرماؤ صاحب! کسی کے کارواں میں شریک ہو جانا' فردِ کارواں ہو جانا' اور یہ سمجھنا کہ صاحب! جو اس کارواں میں شریک ہوا وہ سالارِ کارواں بن گیا کیونکہ اسے کارواں کی معیت جو نصیب ہو گئی' مزید دور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ استدلال کا بھونڈا پن تو دیکھیے!

## خدا کا انسان کے ساتھ باہمی تعلق رفاقت کا ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ کتاب قرآن حمید عجیب وغریب ہے۔ میں کیا عرض کروں! اس "معیت" سے انہوں نے کہا کہ صاحب! دیکھیے! وہ نبی ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ معیت سے ہوتا کیا ہے؟ یہ آیتِ قرآن حمید میں نے ابھی یہاں تک ہی پڑھی ہے اور وہ ایسی بھونڈی دلیل لانے والے بھی آپ کے سامنے اتنی ہی آیت پیش کریں گے' قرآن حمید خود اس کی تفسیر کرتا ہے۔ آگے ہی کہتا ہے کہ **وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا** (4:69) یہ کتنے اچھے رفیق ہوتے ہیں۔ آہاہا! ان کو رفاقت ملتی ہے۔ سفرِ زندگی میں ان سے بہتر رفیق اور کون ہو سکتے ہیں۔

عزیزانِ من! ساری بات یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے چھوڑ دیا' جن کے سامنے پیش کیا انہوں نے بھی کبھی اٹھا کر اس آیت کو نہ دیکھا کہ پوری آیت ہی پڑھ کر دیکھیں کہ اس "معیت" کے' اس "مع" کے معنی کیا ہیں۔ وہ تو ایسا خدائے خبیر وعلیم ہے کہ یوں نظر آتا ہے جیسے یہ سارے اس کے سامنے ہی ہونگے "کہ ایناں نے آ کچھ وی کرنا ہیگا' تے سارے دروازے اونے بند کتے" (کہ انہوں نے یہ کچھ بھی کرنا ہے تو اُس نے سارے دروازے ہی بند کر دیئے)۔ یہ ہے **وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا** (4:69) ان کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔

اور آگے بڑھیے۔ وہ جو ذاتِ اقدس واعظم ہے' اس نے انسان اور خدا کا تعلق بتایا تھا' عزیزانِ من! یہ معیت سے خدا ہو جانے والی بات نہیں تھی۔ زندگی کے آخری سانس میں نبی اکرم ﷺ نے کہا تھا کہ **بَلْ ھُوَ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی**۔ وہ رفیق ہے اور ایک اعلیٰ کا لفظ اس میں اضافہ کر کے' انسان اور خدا کے درمیان تمیز بھی قائم رکھی کہ وہ رفیقِ اعلیٰ ہے' یہ رفیقِ ادنیٰ ہے' بس یہ فرق ہے۔ رفاقت نصیب ہے صاحب! رفاقت ملتی ہے' عزیزانِ من! "جنوں اسی کیندے آں' چار باواں والا آدمی ہونا چہیدا ہیگا وے' تہانوں پتہ اے نا پنجابی اچ اے باواں والا کہندے ہیگے نیں" (جسے ہم کہتے ہیں کہ چار ساتھیوں والا آدمی ہونا چاہیے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ پنجابی زبان میں "چار باہوں" والا کہتے ہی کس کو ہیں)۔ یہ ہے رفاقت۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے سہارے یہ انسان اس طرح سے بیٹھتا ہے۔ اُسے یہ رفاقت نصیب ہوتی تھی اس حصے کو عربی زبان کے اندر رفاقت کہتے تھے جس میں "چار ساتھی" اس کی معیت میں ہوں۔ قرآن کریم میں **وَالْمَرَافِقُ** (5:6) تھا۔ رفاقت یہ ملتی ہے "ایہو جیاں باواں لگ جاندیاں نیں جماعت نوں" (جماعت کو ایسے رفقا

نصیب ہوجاتے ہیں)۔اس قافلے میں پھر اس کی کیفیت یہ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (4:69) ہوتی ہے۔ یہ ہے ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ (4:70) یہ اللہ کی نوازشات اور عنایات ہیں۔ یہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔

## الفضل اور علیم کی مختصر سی تفصیل

عزیزانِ من! یہ فضل کا لفظ عجیب وغریب ہے۔ وہاں اجر کہا تھا' یہاں فضل کہا ہے۔ اجر عدل تک کی چیز ہوسکتی ہے' آگے جو چیز ہے جس کو آپ احسان کہتے ہیں' وہ فضل میں شامل ہوتا ہے' اس فرد کی جو بھی کمیاں ہیں جو کارواں کے اندر شریک ہوگیا' اس رفاقت سے وہ پوری ہوجاتی ہیں۔ جو کارواں میں شریک ہے' اسے یہ حاصل ہوگیا۔ اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔ Basically (بنیادی طور پر) جو تھوڑی بہت کمی رہ جاتی ہے' وہ کمی اس کارواں میں رفاقت کے ساتھ پوری ہوجاتی ہے۔ یوں شریکِ کارواں ہونا دین ہے۔

عزیزانِ من! تنہا سفر مذہب ہے۔ کہا ہے کہ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا (4:70) اور یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ کسی ایک وقت میں ہوئی تھی' یا کسی دوسرے وقت میں ہوئی۔ میں پھر عرض کرونگا' عزیزانِ من! قرآن حمید کے الفاظ پہ زور دیجئے' یہاں ''علیم'' آیا ہے' یہ فعیل کے وزن پر ہے' یہاں بابِ فعیل میں ہوتا ہے ''مسلسل اسی انداز سے' وہ چیز کرتے رہنے والا''۔ اس کا علم یہی نہیں تھا کہ چودہ سو سال پہلے کے افراد کے متعلق اس نے بات کہہ دی تھی' قیامت تک کے لیے مسلسل اس کا یہ علم اس بنا پہ ہے۔ وہ یہ بات کہتا ہے کہ افراد یہ چیز اپنے اندر پیدا کریں۔ اس کے بعد شریکِ کارواں ہوں۔ ان میں یہ کیفیت پیدا ہوجائے گی کہ کارواں کی جو رفاقت اس کو نصیب ہوگی' اس سے اس کے اندر کی Deficiencies (کمزوریاں) بھی ساتھ پوری ہوتی چلی جائیں گی۔ اور یوں یہ رواں دواں کاروانِ انسانیت اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا اپنے نصب العین کی طرف چلا جائے گا۔

## جنت بھی کاروانِ انسانیت کی آخری منزل نہیں ہے

برادرانِ عزیز! قرآن حکیم کی رو سے جنت بھی اس کارواں کی آخری منزل نہیں ہے' وہ تو راستے میں ستانے کا مقام ہے۔ وہاں بھی اس نے کہا ہے کہ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ (57:12) ان کی پیشانیوں کی سرچ لائٹ ان کو اگلے راستے دکھاتی چلی جائے گی۔ یہ صراطِ مستقیم ہے' اُسے صراطِ حمید کہا ہے لیکن یہ چیز حاصل کیسے ہوگی؟ یہ اس صراطِ مستقیم کی طرف چلنا' یہ اس قسم کے حسین و شاداب کارواں کی معیت اور رفاقت نصیب ہوجانا' کس طرح سے ہوگا؟ عزیزانِ من! قرآن کریم یہ پروگرام دے رہا ہے۔

## مومن اپنے نصب العین کے تحفظ کی خاطر ہر آن چوکس رہتا ہے

پھر وہی بات ہے جو میں نے عرض کی تھی کہ یہ اس کا ٹیسٹ وہی میدانِ جنگ ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا

حِذْرَكُمْ (4:71)۔سنو! پروگرام کیا ہے؟ یہ مومن کی وہی زندگی ہے۔حدیث ﷺ ہے کہ جب جہاد ہو رہا ہے تو وہ اس میں شامل ہے جہاد نہیں ہو رہا تو جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہے: خُذُوْا حِذْرَكُمْ (4:71) زمانہ امن میں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھ لو' مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جاؤ' اپنی حفاظت کے پورے سامان اپنے ساتھ رکھو۔بات کہنے کا یہ انداز ہے کہ خُذُوْا حِذْرَكُمْ (4:71) جیسے یہ کہتے ہیں کہ شمشیر کے قبضے پہ ہاتھ رکھو' یعنی اتنی دیر بھی نہ ہو جائے کہ اس وقت آپ کو تلوار ڈھونڈنی پڑے کہ کہاں ہے شمشیر اور کہاں ہے اس کا قبضہ۔تم اپنی حفاظت کے سامان اس طرح سے تیار رکھو' باطل کی قوتیں اس مستحکم قلعہ کو توڑنے کے لیے ہر وقت گھات میں بیٹھی ہوئی ہیں' ہر وقت سامانِ حفاظت تیار رکھو۔اور وہ جو سورۃ انفال میں ہے کہ اپنی سرحدوں کے اوپر اس قسم کے گھوڑے باندھ کر رکھو' اس قسم کے رسالے رکھو کہ تمہارے دشمن اور خدا کے دشمنوں کو جراٴت نہ ہو سکے کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ یہ ہے خُذُوْا حِذْرَكُمْ (4:71)۔

اور اس کے بعد جب بگل بجے' وقت آئے' آواز آئے' فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (4:71) یہ نہ ہو کہ نہیں صاحب! صرف دو چار بٹالین جائیں گی' دو چار کمپنیاں ہی جائیں گی' یہ ہرگز نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ نہیں! پوری War (جنگ) لگی ہوئی ہے' پورے کا پورا ڈویژن حملہ کرے گا۔کہا ہے کہ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (4:71)۔کیا بات کہہ گیا ہے قرآن کریم! کہا ہے کہ پھر عندالضرورت ٹکڑیوں میں لڑو' پوری کی پوری جماعت کی ضرورت ہو' وہ آگے بڑھے۔یہ ہیں وہ افرادِ کارواں' یہ ہے وہ قافلہ جو اس طرح سے راستے کی ہر پُر خطر وادیوں سے محفوظ اور مامون گزرتا چلا جاتا ہے کہ ہر فرد اپنے اندر یہ صلاحیت رکھے ہوئے ہے' یہ کارواں ان پر مشتمل ہے' کیفیت یہ ہے کہ حفاظت کا سامان ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور تیار بیٹھے ہیں گویا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

ایک آواز کے اوپر' جتنوں کے متعلق کہا جائے گا' وہ مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے' ٹکڑیوں میں' اور جمعیت کی جمعیت بھی۔لیکن وہ لوگ بھی ہونگے جن کی یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ان کے لیے کیا حکم ہے؟ یہ ہے ایک سوال۔

## جہاد کے موقعہ پر شمعِ قرآنی کی مخالفت کرنے والوں کا کردار

عزیزانِ من! ان کے لیے کہا ہے کہ وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا. وَ لَـئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡۢ بَيۡـنَكُمۡ وَ بَيۡنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا (4:72-73) آؤ! اب تمہیں دوسری ذہنیت والے لوگ بتائیں۔یہ Opportunists (موقعہ پرست) ہیں۔ان کی کیفیت

یہ ہے کہ جب آواز آتی ہے تو بجائے اس کے کہ کیفیت یہ ہو کہ اچھل کر آگے چلیں کہ اللہ کا احسان ہے کہ یہ موقعہ آ گیا' جہاں ہم اپنے ایمان اور اپنے اعمالِ صالحہ کا ٹیسٹ کر سکیں گے کہ وہ کس پیمانے پہ پورے اترتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ خود ان کے اپنے پاؤں بھی بوجھل ہو جائیں گے کہ کہاں سے موت کی یہ آواز آ گئی اور دوسروں کو بھی یہ چیز کہیں گے کہ نہیں بھائی' خواہ مخواہ موت کے منہ میں جانا بھی بھلا کوئی بات ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہو گی۔ اُدھر اُن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی محسوس نہیں کر رہے' اِدھر اِن کی کیفیت یہ ہے کہ بوجھل ہو رہے ہیں' پاؤں اٹھ نہیں رہے' دوسروں کو بھی منع کریں گے۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ اس کے بعد تم میدانِ جنگ میں آ گئے' یہ پیچھے رہ گئے۔ وہاں اگر تمہیں کسی طرح سے کوئی مصیبت آئی' کوئی تکلیف پہنچی' کوئی شکست ہو گئی اور یہ لگے گھی کے چراغ جلانے' سب سے کہنے کہ دیکھا! ہم نے کہا تھا کہ جنگ میں نہ جانا' دیکھا کیا حشر ہوا ان کا۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے' ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا یونہی سر پھرے ہیں' کسی کی مانتے ہی نہیں ہیں' دیکھیے وہاں جا کر کیا حشر ہوا۔ اور اگر تمہیں وہاں کامیابی ہو گئی' فتح مندی ہوئی' بہت کچھ حاصل ہو گیا' تو اس کے بعد ان کو اس کا افسوس ہوتا ہے کہ ہم کیوں نہ ساتھ چلے گئے' ہم جاتے تو ہمیں بھی اس میں سے حصہ ملتا۔

قرآن کریم کا Within Brackets (بین السطور) انداز یہ ہے کہ اس نے ایک چیز کہی ہے کہ یہ ایسے بات کہتے ہیں جیسے تمہارے ساتھ پہلے ان کا تعلق واسطہ ہی نہیں تھا۔ پہلے اپنے آپ کو تم میں سے کہتے تھے' اپنے آپ کو تمہاری جماعت کے افراد بتاتے تھے' اب کیفیت یہ ہوئی کہ جب ایسا وقت آیا کہ اس خیال سے کہ صاحب! وہاں مصیبت آ جائے گی' خود بھی پیچھے بیٹھے رہے' لوگوں کو بھی پیچھے رکھا' تمہیں کوئی مصیبت آئی' گھی کے چراغ جلائے اور اگر تمہیں کامرانیاں نصیب ہوئیں' فوز المرادیاں ہوئیں' تم لوٹے تو اب کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہم بھی ساتھ جاتے' ہمیں بھی یہ سب کچھ مل جاتا۔

تیسری جگہ ہے کہ پھر آ کر یہ عجیب عجیب قسم کی معذرتیں پیش کریں گے کہ صاحب! ہم کیوں نہیں گئے تھے۔ کہیں گے کہ خدا کی قسم! اصل میں بات یہ نہیں تھی کہ ہم وہاں جانا نہیں چاہتے تھے اور ہم لڑنا نہیں چاہتے تھے' آپ کے سر پر ایک جان کیا ہزاروں جانیں قربان کر دیں صاحب! لیکن اگر تمہیں وہاں کوئی مصیبت پڑ گئی تو پھر اس کے بعد یہ بغلیں بجاتے ہیں' ان کو خوشیاں ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔

## جہاد کے موقعہ پر مفاد پرستوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

کیا آپ کو معلوم ہے انہیں قرآن حکیم کس کیٹگری (شِق) میں رکھ رہا ہے؟ یہ ساتھ تھے' عمل کے وقت ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ **فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ** (4:74) یہ وہ لوگ ہیں جو دنیاوی مفاد کو مستقبل کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں' ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرو' یہ اسی کیٹگری (شِق) میں شامل ہیں۔ اور یہ تو ان سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں' جو

جماعتوں کے اندر رہ کر یہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ آستین کے سانپ ہیں' ان کے متعلق پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس وقت ان کی کیا کیفیت ہو جائے گی۔

## لفظ خدع کا لغوی مفہوم اور عربوں کی معاشرتی وتمدنی زندگی کی ترجیحات

وہ جو شروع میں ہی سورۃ البقرۃ میں قرآن حمید نے کہا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ (2:9)۔ یہ ٹھیک ہے کہ ''فریب'' ہی اس یُخٰدِعُوْنَ کا ترجمہ ہوتا ہے۔ اُس وقت جب یہ درسِ نو شروع ہوا تھا تو آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اس کی تشریح کی تھی کہ یہ اتنی وسیع زبان ہے جو خدا جیسے مصنف کے شاہکار کو بھی محیط ہو جائے' اُس کے لیے بھی وہ اُس کی حامل ہو جائے۔ اِس وقت شاید آپ احباب نئے آئے ہوں ان کے لیے پھر دہرا دوں کہ یہ ''فریب'' ہوتا کیا ہے؟ عربوں کی ساری زبان تو ان چند چیزوں کے گرد گھومتی ہے: وہ ایک خیمہ' نخلستان' چند کھجوروں کے درخت' ایک چشمہ' کچھ اونٹ' گھوڑے' کچھ بکریاں' شمشیر' تیر' تفنگ۔ بس یہ تھی ان کی کل کائنات۔ یہ ان چیزوں کے گرد گھومتی ہے' یہ زبان عجیب وغریب چیز ہے۔

یہ یَخْدَعُ کیا ہوتی ہے؟ عربوں کے ہاں مہمان نوازی عظیم ترین صفت تھی ''کریم'' کہتے ہی اس کو تھے جو ان کے ہاں مہمان نواز ہو۔ ان کے ہاں اگر مہمان کی تواضع میں کسی قسم کا بھی کوئی فرق آ جاتا تو وہ لوگ باہر قبیلوں کو منہ نہیں دکھاتے تھے۔ شاعر کسی قبیلے کے لیے ہزار چیزیں کہے وہ اس کو برداشت کر لیتے تھے' اگر کسی شاعر نے ایک مصرع کہہ دیا کہ یہ ویسے مہمان نواز نہیں رہے تو سمجھ لو کہ وہ قبیلہ ختم ہو گیا۔ زندگی یہ ہے کہ صحرا میں بس رہے ہیں' نہ کوئی مارکیٹ ہے' نہ کوئی بازار ہے' نہ کوئی دکان ہے' گھر میں فریج بھی نہیں ہے کہ اس میں چیزیں لا کر ہی رکھ لیں۔ یہ بھی نہیں ہے کہ ریلوے اسٹیشن پہ بستے ہیں کہ اس گاڑی سے کوئی مہمان نہیں اترا' تو چلو شام تک اب کوئی نہیں آئے گا۔ یہ صحرا کی بات ہے' پتہ نہیں کس وقت کوئی چلا آئے۔ اپنے اندر کی متاع کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی چیز بھی اس میں نہیں رکھی جا سکتی' مہمان کا پتہ ہی نہیں کہ کس وقت آ جائے' مہمان نوازی کی وہ کیفیت ہے۔ تو کیا تھا ان کے پاس؟

عزیزانِ من! یہ اسٹور کی چیزیں ہیں کہ اونٹ کھڑا ہے۔ اب تو یہ بہت بڑا فریج ہے' جب جی چاہے اس میں سے تازہ گوشت یا دودھ نکال لیں۔ اس سے ذرا پہلے بکریاں تھیں اور ان کے اندر بڑا عمدہ دودھ ہوتا ہے۔ ان کے ہاں بکریوں کے اندر کریم النفس وہ ہوتی تھیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جس وقت بھی چاہا جا کر دودھ دوہ لیا۔ ان بکریوں کو باہر نہیں بھیجتے تھے' عام طور پہ اپنے خیمے کے ارد گرد ہی رکھا کرتے تھے کہ پتہ نہیں کس وقت مہمان آئے' اُس وقت وہ بکری پتہ نہیں کہاں ہو' جب بھی مہمان آئے بکری موجود ہے' بچہ بوڑھا عورت جو بھی گیا اس نے دودھ دوہ لیا۔ یہ ان کے ہاں بڑی متاع تھی اور اس بکری کی بڑی قدر تھی۔ ان کے ہاں اس قسم کی بکریاں بھی ہوتی تھیں کہ ایک وقت میں اسے دوہنے لگیں تو دو چار سیر دودھ دیں کہ برتن بھر دیا' دوسرے وقت میں گئے تو ان کا وہ جو ہوانا ہے' وہ تو اتنا

بڑا نظر آ رہا ہے لیکن دوہنے لگے ہیں تو وہ دودھ چڑھا گئی۔

اب آپ سوچیے کہ مہمان آ کر بیٹھ گیا' یہی بکری ہے جس کے سہارے پہ تو اضع ہونی ہے' اس بھروسے پہ جا کر اسے دوہ رہے ہیں کہ اس میں سے اتنا دودھ مل جائے گا اور وہ دودھ چڑھا جائے' تو کیفیت کیا ہوگی۔ یہ جو اس قسم کی بکری ہوتی تھی اسے وہ خَادِعُ کہتے تھے۔ خدع کے معنی ہیں کہ ''جس پہ اعتماد نہ کیا جائے' کسی وقت جذباتی طور پہ موج میں آئے تو پتہ نہیں کتنا دیدے' دوسرے وقت میں ضرورت ہے تو سارا دودھ ہی چڑھا جائے''۔ کہا یہ ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) جماعت کے اندر یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ ایسے لوگ جن پر تم بھروسہ نہ کر سکو' ان سے تو بہتر ہے کہ وہ بکری وہاں ہوتی ہی نہیں' ٹھیک ہے ہم کچھ اور انتظام سوچ لیتے۔ بالکل دودھ دیتی ہی نہیں' جانور خشک بھی تو ہو جاتے ہیں' اس پہ بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہ ایک وقت میں تو وہ اتنا دودھ دیدے' دوسرے وقت میں جب جی چاہے' اس کو چڑھا جائے' کہا ہے کہ یہ لوگ خطرناک ہیں فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ (4:74) یہ درحقیقت وہ لوگ ہیں جو مفادِ عاجلہ کو مستقبل کے مفاد پر اور اپنی طبعی زندگی کو آخرت کی حیاتِ جاوداں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خلاف پہلے اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ وَ مَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (4:74) اس کو اللہ کے راستے میں جنگ کہا گیا ہے۔ پھر فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (4:74) پھر اس جنگ کے اندر وہ شہید ہو جاتا ہے یا فاتح اور منصور واپس آتا ہے' دونوں صورتوں میں خدا اجرِ عظیم دیتا ہے۔ کامیابی ہو جائے تو بھی اجرِ عظیم اور اگر میدانِ جنگ میں مارے جائیں تو بھی صلۂ شہید۔ یہ نہیں ہے کہ وہاں جو جان دینے والا ہے اسی کے لیے صرف اجر ہے' جو فاتح لوٹنے والا ہے اس کے لیے بھی اجر ہے۔ اب یہاں سے جنگ کی بات چھڑ گئی۔

## جنگ کے مقصد سے کفر اور اسلام کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور اسلام میں جنگ کی اجازت کب اور کیوں؟

جنگ کی Efficiency (استعدادِ کارکردگی) تو اور چیز ہے۔ یہ ہے فوجوں کا نہایت عمدہ تربیت یافتہ ہونا' Disciplined (بانظم وضبط) ہونا' ان کے اندر جذبہ کا بھی ہونا' اسلحہ بھی Latest (جدید ترین) ہونا' یہ ساری چیزیں بھی موجود ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جنگ کا مقصد کیا ہے۔ بس یہاں آ کر کفر اور اسلام میں فرق پیدا ہوتا ہے کہ کس غرض کے لیے جنگ لڑی جائے؟ قرآن کریم نے مقاصد متعین کر دیئے ہیں صاحب! جنگ کی اجازت جہاں آئی ہے وہاں سب سے پہلی دفعہ سورۃ الحج کی 39 ویں آیت ہے' وہاں اجازت ہے۔ تیرہ سالہ مکہ کی زندگی کے بعد' وہاں کی تمام تکالیف مصائب مشکلات دشواریوں کو برداشت کر کے' نہایت تحمل سے' استقامت سے کہ کہیں جھگڑا نہیں کیا' کسی جگہ فساد برپا نہیں کیا' کوئی جلاؤ گھیراؤ نہیں کیا' کسی کو گالی تک نہیں دی' وہاں سے چلے آئے' مدینے آ گئے تو پھر بھی مکے والوں نے پیچھا نہیں چھوڑا' اس چراغ کو بجھانے کے لیے' ایک لشکر کو لے کر وہاں مدینہ میں آ گئے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ پہلی دفعہ زندگی اور موت کا معرکہ ہے۔ وہاں کہا ہے کہ **اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39) انہیں جنگ کرنے کی اجازت دیجاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر یہ چڑھ دوڑے ہیں اور ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ **وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ڹ** (22:39) ان حالات میں ہم ان کی مدد پر قادر بھی ہیں۔

یہ بات پھر میں عرض کرونگا کہ خدا کی ''نصرت'' کیا ہوتی ہے۔ کون لوگ ہیں جن کو یہ اجازت دی جاتی ہے؟ کہا ہے کہ **الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ** (22:40) ان کی یہ کیفیت ہے کہ ان کے گھر بار سے ان کو نکال دیا گیا۔ ان کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ جرم تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے' اس جرم کی پاداش میں گھروں سے نکال دیا۔ یہ یہاں مدینہ میں آ کر بیٹھ گئے' کسی کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہے' کچھ نہیں کر رہے' وہ ان پر چڑھ دوڑے۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی کہ اس مدافعت کے اندر کہ جہاں اس طرح سے دوسرے چڑھ دوڑیں' وہاں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگلی چیز اس کے اندر' اسی آیت کے ساتھ ہی ہے کہ **وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا** (22:40) اگر اس قسم کی دھاندلیاں روا رکھی جائیں' کوئی ایسی جماعت ہی نہ ہو جو اس قسم کے مستبد لوگوں کی' سرکش لوگوں کی' مدافعت کر سکے تو دنیا میں تم دیکھو گے کہ عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے صومعے' راہبوں کی خانقاہیں' مسلمانوں کی مسجدیں' ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہ رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے یہ جنگ ہو رہی ہے؟ کفار کے معابد' ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے' اس میں مسجد کا ذکر تو آخر میں آیا ہے۔ یہ جنگ Oppression or Exploitation (استبداد اور سلب ونہب' لوٹ کھسوٹ) کے لیے نہیں' استبداد کے لیے نہیں' دوسروں کو اپنا محکوم ومغلوب بنانے کے لیے نہیں' ان کی ان چیزوں کی حفاظت کے لیے ہے جنہیں وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ ''معبد'' کا نام لیا ہے کہ سب سے زیادہ عزیز یہ چیز ہوتی ہے۔ اپنی مدافعت' ان چیزوں کی حفاظت ایک چیز ہے۔ جماعت کے اندر جیسا میں نے عرض کیا ہے' اگر اس قسم کا Element (عنصر) پیدا ہو جائے' یہ نہیں کہ اس کے بعد فوراً ان کے خلاف جنگ کی جائے گی' ان کو الگ کیا جائے گا' الگ کرنے کے بعد پھر ان سے معاہدات کیے جائیں گے۔ معاہدوں کے باوجود اگر یہ اس میں توڑ پھوڑ کرتے ہیں' یعنی معاہدے توڑ دیتے ہیں' کسی بات پہ قائم نہیں رہتے' اس صورت میں جنگ کی یہ چیز ہے۔

## ہجرت کے بعد مدینے میں رہ جانے والوں کی حالت زار اور مسائلِ تقدیر و دعا

عزیزانِ من! جنگ کی اگلی چیز جو یہاں بتائی کہ یہ یہاں مدینے میں آ گئے' یہ تو محفوظ ہو گئے' اُدھر مکے میں مسلمان رہ گئے۔ اب سوچیے تو سہی وہ ہندوستان کے اندر جو باقی مسلمان رہ گئے اور ہم یہاں چلے آئے' ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' مکے والے ان باقی ماندہ مسلمانوں کے ساتھ یہ کچھ کر رہے تھے۔ اس وقت یہ چیز آئی کہ **وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** (4:75)۔ یہ دیکھیے! اللہ کی

راہ میں جنگ کہاں کہا گیا ہے؟ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے' اے مدینے کے مسلمانو! تم تو اب اس حالت میں ہو' اس پوزیشن میں ہو کہ ان کی حفاظت کرسکو' تم سنتے نہیں ہو' اب کونسی چیز باقی رہ گئی ہے جس کے انتظار میں بیٹھے ہو۔ یہ کیا چیز ہے؟ **وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَاۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّاۚۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا** (4:75) ان میں بے بس اور ناتواں' مرد عورتیں بچے وہ سب گڑگڑا رہے ہیں' فریادیں کر رہے ہیں' رو رہے ہیں' چیخ رہے ہیں' وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم پہ بے حد ظلم ہو رہا ہے' ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی حفاظت آپ کرسکیں یا اللہ! تُو ہماری مدد کر' کسی کو ہمارا سرپرست بنا' کسی کو ہمارا مددگار کر۔ خدا سے یہ فریاد کر رہے ہیں۔

بات میں سے بات نکل آئی' عزیزانِ من! ان سے زیادہ مخلص دعا بھی کسی اور کی ہوسکتی ہے۔ خدا کہہ رہا ہے کہ **یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا** (4:75) یہ مظلوم دہائی دے رہے ہیں' اپنے خدا کو پکار رہے ہیں کہ ہماری مدد کر' ہمیں کسی طرح سے نکال اس ظالم بستی سے۔ خدا سے یہ کہہ رہے ہیں۔ کیا مشکل تھا جی! خدا کے لیے کہ ان کو اس بستی سے نکال کرلے جائے' کیا مشکل تھا ان کی اس دعا کو یہ قبول کرتا۔ دعا کو تو قبول کر رہا ہے' پتہ ہے کیا کہہ رہا ہے؟ ان مدینے والوں سے کہہ رہا ہے کہ تم سنتے نہیں ہو' وہ کس طرح سے گڑگڑا کر ہمیں پکار رہے ہیں اور تم بیٹھے ہوئے ہو' اٹھتے نہیں ہو۔ یا اللہ! ''ساہڈے ورگا ہوندا تے کہندا تینوں کی ہو یا اے' تیتھوں اینا کم وی نئیں ہوندا'' (ہمارے جیسا ہوتا تو کہہ دیتا کہ تجھے کیا ہوگیا ہے' تم سے اتنا سا کام بھی نہیں ہوسکتا) معاذ اللہ معاذ اللہ۔ سنیے تو سہی بات کیا ہو رہی ہے کہ ''تم سنتے نہیں ہو' مظلوم کس طرح سے فریادیں کر رہے ہیں!'' یہ کس سے فریادیں کر رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے۔ وہ کہتے کہ ہم سے تھوڑا کہہ رہے ہیں' آپ سے کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ''ہم سے فریادیں کر رہے ہیں' تم سنتے نہیں ہو' بہرے ہوگئے ہو' اٹھتے کیوں نہیں ہو' ان کی مدد کے لیے''۔ عزیزانِ من! یہ ہیں تقدیر اور دعا کے مسائل۔

## حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک خلافت کا فریضہ اور جنگ کا مقصد

وہ جو حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے کہا تھا' وہ کتنا اہم تھا۔ وہ شخص کتنی عجیب بات کہہ گیا ہے۔ کہا تھا کہ میں خلیفہ اس لیے بنا ہوں کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں' راستے میں روک لیا کروں۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ تم دعائیں کرو' وہ دعائیں وہاں پہنچیں' وہاں سے وہ پھر مجھے کہے' ضرورت کیا ہے' میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں' دعا تم کرو تو میں وہ دعا وہاں پہنچنے ہی نہ دوں' یہیں مسئلہ حل ہوجائے۔ یہ ہے خلافت کا فریضہ اور یہ ہے' عزیزانِ من! جنگ کا دوسرا مقصد۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ یہ مظلوم مسلمان ہوں۔ جہاں اس نے معبد کی حفاظت کے لیے کہا ہے' پہلے عیسائیوں کے گرجے کہا' یہودیوں کے صومعے کہا' راہبوں کی خانقاہیں کہا۔ دنیا میں کوئی بھی ہو' وہ انسان ہونا چاہیے۔ مظلوم انسان جہاں سے آواز دے گا کہ مجھ پہ ظلم ہو رہا ہے اور میں اپنی حفاظت نہیں کرسکتا' جہاں بھی

یہ خدا کا سپاہی بیٹھا ہوا ہوگا' وہ کہے گا کہ لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ میں آیا تمہارے لیے' کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہے جنگ کا مقصد۔ یہاں کہا ہے کہ مَا لَکُمْ (4:75) تمہیں کیا ہوگیا ہے' بیٹھے سن رہے ہو' دیکھ نہیں رہے ہو کہ وہ کیسے ہم سے دعائیں مانگ رہے ہیں' ہمیں مدد کے لیے کس طرح پکار رہے ہیں' اٹھتے کیوں نہیں ہو۔ ٹھیک ہے' تم اٹھو لیکن نہیں' اس نے اٹھنے کے بعد انہیں کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (4:76) یہ ہیں ایمان والے' یہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں اور یہ جنگ دنیا سے ظلم واستبداد مٹانے کے لیے ہوتی ہے۔ اسے ''اللہ کی راہ میں'' جنگ کہا جائے گا۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (4:76) اس کے علاوہ جنگ کا اگر کوئی اور مقصد ہے' مظلوموں اور کمزوروں کا گلا گھونٹنا مقصد ہے تو یہ جنگ طاغوت کے راستے میں ہے۔

اب یہاں بات صاف ہوگئی مگر یہ کہتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا' یہ اتنی اتنی مملکتیں بزورِ شمشیر حاصل کرتے چلے گئے' یہ سارا کچھ آپ کے ہاں ہو رہا ہے۔ کوئی قرآن کریم اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ یہ ہے جنگ سے مقصد' یہ ہے قتال فی سبیل اللہ' اس کے علاوہ اگر کوئی اور جذبۂ محرکہ بھی جنگ کا' قتال کا' ہو تو وہ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (4:76) ہے۔ یہی نہیں کہ یہ جو دوسرے جنگ کرنے والے ہیں' ان کو کرنے دو۔ یہ طاغوت ہر وہ قوت یا نظام ہے جو حق وصداقت سے سرکشی اختیار کرکے' دنیا میں اپنی من مانی کرے۔ کہا ہے کہ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (4:76) ان کے خلاف جنگ کرو جن کا جنگ کا جذبہ کوئی اور ہو۔ یہ ہے مظلوم کی فریاد پہ پہنچنے والی جماعت اور یہ ہے جنگ۔

کہا یہ ہے کہ اپنی حفاظت کرو' مظلوم کی فریاد پہ پہنچو' یہ ہے اللہ کے راستے میں جنگ' اگر کوئی اور دوسرا جذبہ بھی ہوگا تو وہ جنگ' فی سبیل الطاغوت ہے' جو ایسی جنگ کرے اس کے ساتھ پھر تم جنگ کرو۔ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا (4:76) سوائے جماعتِ مومنین! تم ان قوتوں کے خلاف جنگ کرو جن کا مقصد ہی قوانینِ حق وباطل سے سرکشی اختیار کرنا ہے اور اس کا یقین رکھو کہ یہ لوگ تمہارے خلاف کتنی ہی خفیہ تدبیریں اور سازشیں کیوں نہ کریں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جو تدبیریں ظلم واستبداد کے لیے کی جائیں' ان میں قوت کہاں سے آسکتی ہے؟ ریت کی بنیادوں پر قلعے تعمیر نہیں ہوا کرتے۔ تم دیکھو گے کہ اس قسم کی جتنی بھی چالیں چلیں گے وہ تمہارے مقابلے میں بہت کمزور رہیں گی۔ تمہیں اندرونی تثبیت حاصل ہو جائے گی' استحکام حاصل ہو جائے گا' اپنی حفاظت کا سامان تمہارے پاس ہوگا' اطاعت کا وہ جذبہ ہوگا کہ آواز آئے' جانیں دینے کے لیے بطیبِ خاطر میدانِ جنگ میں چلے جاؤ۔ جنگ کا مقصد یہ ہوگا پھر دنیا کی کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی 76 ویں آیت تک ہم آگئے۔ بات آگے بھی یہی چلتی ہے' اس میں اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں' انہیں ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

# اٹھارواں باب: سورۃ النسآء (آیات 77 تا 81)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ
اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾ اَيْنَ مَا
تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
حَدِيْثًا ﴿٧٨﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٧٩﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1970ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 77 ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:77)۔

## دوسروں کے خلاف جنگ کی ضرورت کیوں، کب اور کیسے؟

سابقہ آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ دین کے نظام میں جنگ کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ وہ کونسے حالات ہیں جن میں جنگ کی اجازت ہے اور کونسے حالات ہیں جن میں وہ ضروری ہو جاتی ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے دہرا دوں کہ اجازت تو سب سے پہلے اس وقت دی گئی تھی جب یہ جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکے کے نامساعد حالات کے بعد مدینے کی طرف ہجرت کر کے آ گئی تھی، مخالفین نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور یورش کر کے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ان کی طرف حملے کے لیے بڑھ آئے تو سب سے پہلے اس مقام پر ان کو اجازت دی گئی کہ یہ اپنی مدافعت میں جنگ کے لیے باہر نکلیں کیونکہ سوال یہاں موت اور زندگی کا آ گیا تھا۔

جنگ کی اجازت کے متعلق کہا ہے کہ جب یہی مکے کے مخالفین، ان مظلوم، بے کس، بے بس مسلمانوں کو، جو وہاں ان کے زیرِ تسلط رہ گئے تھے، سخت تکالیف پہنچاتے تھے تو ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہم سے (خدا سے) فریاد کر رہے ہیں کہ ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نکال لو اور یوں تو یہ نکلنے نہیں دیتے، کوئی ہمارا حمایت کرنے والا، کوئی ہمارا سرپرست مقرر کر دے جو اس بستی سے نکلنے کے لیے ہماری مدد

مدد کرے۔ یہ مظلوموں کی فریاد تھی۔اس وقت مدینے کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ یہ مظلوم کس طرح آہ وفغاں کے ساتھ ہم سے مدد مانگ رہے ہیں اور تم ان کی مدد کے لیے نہیں اٹھتے' اٹھو اور انہیں اُن ظالموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑاؤ۔

جنگ کی اجازت تو اپنی حفاظت کے لیے تھی اور جنگ کا حکم ظلم کو روکنے کے لیے' مظلوموں کی مدد کے لیے دیا گیا ہے۔اور مظلوم میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہی ہونے چاہئیں' دنیا میں کسی مظلوم کی آواز کہیں سے اٹھے' یہ اس جماعت کا فریضہ ہوتا ہے کہ اس مظلوم کی مدد کے لیے پہنچے۔اور اس مدد میں جان بھی دینی پڑے تو اپنی جان دیدے۔انسانیت کی جان بچالے۔یہاں جنگ فرض ہو جاتی ہے۔اور یہ وہ مقام ہے جس کے لیے ہر مسلمان سے یہ معاہدہ لیا جاتا ہے کہ وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔مال کی تو صورت ہی قرآن کریم کی رُو سے یہ ہے کہ ضرورت سے زائد کسی کے پاس کچھ رہتا ہی نہیں' مومن اپنے اس معاہدے کی رو سے بطیبِ خاطر اپنا ضرورت سے زائد سب کچھ اس مملکت کو دیدیتا ہے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کرے۔یہ جس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ ضروریات پوری کرنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ تو اس لیے ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔اس کے لیے مومن کو ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ اپنی ضرورت سے زائد کچھ رکھے' یہ دین کے نظام کی باتیں ہیں جو میں کر رہا ہوں کہ مال کو یوں اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہوتا ہے اور جان امانت کے طور پر اس کے پاس رکھی ہوتی ہے کہ جب بھی آواز آئے اور اس کے دینے کی ضرورت پڑ جائے' یہ اسی وقت اس آواز پہ لبیک کہتا ہوا' سر بکف میدان میں آجائے۔یہ ہے دین کا نظام۔اب اس آیت میں جو آج ہمارے سامنے آرہی ہے' دین اور مذہب میں ایک بڑا دلچسپ فرق بتایا گیا ہے۔

## مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت

مذہب میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جہاد یا قتال یا جنگ کا مقام آتا ہی نہیں ہے' وہاں تو پوجا پاٹ ہوتی ہے' رسومات ہوتی ہیں' نظریات ہوتے ہیں' تصورات ہوتے ہیں اور جہاں تک اعمال کا تعلق ہے تو وہ یہی پرستش کے' پوجا پاٹ کے' کچھ رسوم کے ہوتے ہیں جنہیں ادا کر لیا جاتا ہے۔اور یہاں تک وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کا مقصد تو ادا ہو گیا' اب اس سے آگے کے معاملات میں' جہاں جان دینی پڑتی ہے تو وہ معاملہ ان کے نزدیک مملکت یا ریاست کا ہوتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیاداروں کی باتیں ہیں' سیاست سے ان کا تعلق ہے۔مذہب وہاں سے آگے نہیں بڑھتا۔

دین میں یہ جو ابتدائی زندگی ہے' یہ ٹریننگ کی زندگی ہے' ڈسپلن کی زندگی ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہ جو میں نے اس سے پیشتر بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ دین' قلب اور نگاہ کی ایک بنیادی تبدیلی کا نام ہے' ذہنیت کے بدلنے کا نام ہے۔دین میں انسان کی نفسیات

میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے' نگاہ کا زاویہ بدلتا ہے۔اور جب وہ اندرونی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو خارجی تبدیلی اس کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔یہ نہ تو یونہی کچھ رسمی طور پر عبادات شروع کرنے کا نام ہے' نہ Mechanically (میکانکی طور پر) احکامِ شریعت کے اتباع کا نام ہے۔یعنی محض قانون نافذ کر کے اور کسی سے قانون کو منوا کر یہ سمجھ لینا کہ اسلام قائم ہے اور یہ مومن ہے' یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ بات ہی غلط ہے۔آپ کے بیشتر قوانین ایسے ہیں جو باقی غیر مسلم اقوام نے بھی اپنے ہاں رائج کر رکھے ہیں۔یہ جنہیں آپ Universal Morals (عالمگیر اخلاقی ضوابط) کہتے ہیں وہ تو ہر ایک جگہ ہوتے ہیں۔کون کہتا ہے کہ جھوٹ ضرور بولا کرو' چوری کیا کرو' زنا کیا کرو۔اور یہ کہ ہر مملکت کے قانون میں فریب دینا جرم ہے لیکن آپ دیکھیے کہ ان چیزوں کے اتباع سے' ان پر عمل کرنے والے بھی یا وہاں جو پرامن شہری ہیں' انہیں بھی آپ مومن نہیں کہہ سکتے۔اگر آپ کے ہاں بھی کلمہ پڑھنے کے بعد' زیادہ سے زیادہ ان چند رسومات کو ادا کریں یا اگر ان قوانین پر بھی عمل پیرا ہو جائیں تو آپ انہیں قرآن کریم نے جو فرق کیا ہے' مسلمان تو کہہ سکتے ہیں' مومن نہیں کہہ سکتے۔اور جہاں نہ تو قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا ہوئی ہو اور نہ ان قوانین کے سامنے جھکنے کی بات ہو تو انہیں کیا کہا جاتا ہے؟ اپنا نام ہم جو جی میں آئے رکھ لیں بس ہمیں تو یہ کہا جائے گا کہ آپ سوچ لیجیے۔

## مکے میں نبی اکرمﷺ کی تیرہ سال زندگی کا ماحصل اور اسلام سے قبل عرب کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے خدوخال

قرآن حکیم نے تو یہ بتایا ہے کہ اصل چیز پہلے ایک ڈسپلن ہے۔یہ قلب و نگاہ کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی چیز ہے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ مکے کی جو تیرہ سالہ زندگی ہے' وہ اِس تربیتِ نفس کا' قلب و نگاہ میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا' ابتدائی مرحلہ تھا۔اس کے بعد اسلام کی جو اگلی زندگی آ رہی ہے' جسے ہم مدنی زندگی کہتے ہیں' اس میں تیرہ برس میں جس جس قسم کی تبدیلیاں لاتے گئے' ان کے محسوس مشاہدے اور مظاہرے' اُس زندگی میں جا کر ہونے تھے لیکن آپ دیکھیے کہ قرآن حکیم ان لوگوں کے متعلق کیا کہتا ہے جن کی ذہنیت دین کی نہیں' مذہب کی ہوتی ہے؟ کہتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (4:77) ان لوگوں کی حالت پہ ذرا غور کرو کہ دین کی ابتدائی اسٹیج میں جب یہ ہنوز زیرِ تربیت تھے جب ''اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ'' کے نظام کا ابتدائی دور تھا' جس میں اس تصور کو محض فکری طور پر پیش کیا جاتا تھا اور کسی سے ٹکراؤ کی شکل پیدا نہیں ہوئی تھی تو ان سے یہ کہا گیا تھا کہ تم نے ہاتھ نہیں اٹھانا ہے۔یاد رکھیے! مکے کی زندگی میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے' ان کے لیے یہ بات نہیں تھی کہ یہ کچھ جنگجو نہیں تھے' انہیں لڑائی کرنا نہیں آتی تھی یا یہ لڑائی کرتے نہیں تھے۔یہ انہی قریش میں سے کچھ لوگ تھے جو اسلام لے آئے تھے اور یہ تو

(جنگجو نسل) Martial Race تھی' ان کے ہاں تو صدیوں سے' نسلوں سے' آپس میں ایک ایک ایشو پر سو سو سال تک لڑائیاں ہوتی تھیں۔تلوار کے بغیر عرب کا تصور ہی نہیں تھا' ہمیشہ جنگ میں مصروف رہتے تھے۔اب یہ جو Convert (تبدیل) ہو کر ادھر اسلام کی طرف آئے ہیں' تو وہ بھی انہیں میں سے تھے' یہ بھی لڑنا جانتے تھے' یہ بھی تلواریں اپنے پاس رکھتے تھے لیکن یہ عجیب تبدیلی ہے کہ اس تیرہ سال کے اندر انہی کے بھائی بندوں میں سے یہ جو نکل کر آئے تھے' ان کو ہر قسم کی تکلیفیں دیں' الزامات تراشے' طعن و تشنیع کیا' پتھر مارے اور یہ کہ ان کے میانوں میں تلواریں موجود تھیں اور ان کو لڑنا بھی آتا تھا' ان میں سے کسی نے ہاتھ بھی نہیں اٹھایا۔

عزیزانِ من! دیکھیے یہ ٹریننگ کا جو پیریڈ ہے یہ کس انداز سے گزارا جا رہا ہے۔یہ ہے وہ چیز کہ اس دور میں لوگوں سے کہا گیا تھا' جو زیرِ تربیت تھے کہ لڑائی کے لیے ہاتھ نہیں اٹھانا۔اس میں ''اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ'' کے جو ٹریننگ کے مرحلے ہیں ان کو اس کی مشق کرائی جا رہی تھی۔یہ ٹریننگ ہے جس کے لیے جسے آپ یہ صلوٰۃ کہتے ہیں' یہ حقیقت میں قلب و نگاہ کی تبدیلی کے لیے ٹریننگ ہے' یہ انسان کو Disciplined (پابندِ ضبط و نفس) کرتی ہے۔اور یہ وہ چیز ہے جو اس دور میں بھی شروع کی جا سکتی ہے جس میں ہنوز اپنی مملکت قائم نہ ہوئی ہو۔مکے کی زندگی ایسی تھی۔

## فرعون کے دورِ غلامی میں بنی اسرائیل کو اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنانے کی ہدایت

بنی اسرائیل کے قصے میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب وہ ہنوز مصر میں تھے اور فرعون کی غلامی میں تھے' ان کو تو آزادی نصیب نہیں تھی۔حضرتِ موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی وہاں ان کی تربیت میں مصروف تھے۔وہاں کہا گیا ہے کہ ابھی دین کا مرحلہ تو نہیں آیا کہ اپنی آزاد مملکت قائم ہو چکی ہو' ان سے کہو کہ ابھی اپنے گھروں کو ہی اپنا قبلہ بنا لیں۔یہ گھروں کو قبلہ بنانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد باجماعت نماز ادا کیا کرو اور ابھی الگ الگ پرائیویٹ طور پر' اپنے طور پر نماز پڑھ لیا کرو۔بات یہ تھی کہ ابھی یہ جس حالت میں ہیں ٹھیک ہے' دوسروں کی غلامی میں ہیں' ان کے ساتھ جنگ نہیں کی جا سکتی' لڑا نہیں جا سکتا لیکن اپنی ٹریننگ تو کی جا سکتی ہے۔یہ جو ٹریننگ ہے اس کے لیے انتظار مت کرو کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے' اپنی مملکت قائم ہو گی تو پھر وہاں جا کر ٹریننگ حاصل کریں گے۔ٹریننگ یہیں سے شروع کر دو۔مکے کی زندگی کا جو یہ Period (دور) تھا' اس زندگی میں ان سے یہ کہا گیا تھا کہ ہاتھ روک کر رکھو اور ''اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ'' سے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی' قلب و نگاہ کے اندر ایک Change (تغیر) پیدا کرتے چلے جاؤ۔اس کے بعد پھر وہ زندگی شروع ہوئی جب ان پہ جہاد یا قتال فرض کیا گیا کہ ہاں! اب دین کا تقاضا ہے کہ تم میدانِ جنگ میں بھی نکلو۔اب ان لوگوں میں فرق پیدا ہوا ہے کہ جو صحیح معنوں میں دین کا تصور سمجھ گئے تھے' انہوں نے تو دین کے تصور کے

ماتحت اس آواز پہ لبیک کہا اور وہ رخشاں وفرحاں میدانِ جنگ میں آ گئے لیکن کچھ لوگ اس قسم کے بھی ساتھ شامل ہو گئے تھے جن کے دلوں کے اندر ایمان نہیں اترا تھا' قرآن حکیم کے الفاظ یہ ہیں کہ **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ** (49:14) ایمان ابھی ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ ابھی ان کی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ **فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً** (4:77) ان میں کچھ لوگ وہ بھی نکلے جن کے دلوں پر لوگوں کا خوف وہراس بڑی شدت سے چھایا ہوا تھا۔ ڈرنا تو صرف قانونِ خداوندی سے چاہیے کہ اس کی سرکشی کے' اس کی خلاف ورزی کے' نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں' انسانوں سے ڈرنے کے معنی کچھ بھی نہیں لیکن ان میں یہ لوگ بھی تھے جو انسانوں سے ڈرتے تھے۔ ان کی کیا کیفیت تھی؟ اس کے لیے کہا کہ **وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ** (4:77) انہوں نے کہا کہ یا اللہ! یہ کیا ہوا! ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ بڑی آسان سی بات ہے' مذہب کا معاملہ ہے' کسی طرح سے گیان دھیان نہ کیا' یوں نماز پڑھ لی' اس طرح سے کچھ عبادات پوری کر لیں۔ اب یہاں معاملہ متشابہات سے محکمات تک چلا آ رہا ہے' ہم سے کہا جا رہا ہے کہ میدانِ جنگ میں جانیں دینی ہونگی' یا اللہ! یہ کیا کر دیا! **لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ** (4:77) یہ تُو نے کیا کر دیا کہ ہمیں قتال کا حکم دیدیا ہے' یہ تو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔

## مذہبی تصورات کو دین کے رنگ میں رنگنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے: صلوٰۃ کی ایک مثال

اصل یہ ہے کہ جب مذہب کا تصور ذہن میں ہو تو اس کے بعد جب بھی کوئی ایسی بات آئے جہاں مذہب اور دین میں فرق ہوتا ہے' مذہب کے تصور والے اس کو اپنا ہی نہیں سکتے۔ حضرت شعیبؑ کے قصے میں جیسا قرآن کریم نے کہا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم اتنی زیادتی نہ کرو' بہرحال تم ہمیں صلوٰۃ کی تو اجازت دیدو' اس میں تو رکاوٹیں پیدا نہ کرو۔ یہ دین کی تبلیغ کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ قوم نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ان کے ذہن میں یہی مذہب کا تصور تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن جب صلوٰۃ کا نظام سامنے آیا تو قرآن کریم میں ہے کہ اس قوم نے ان سے کہا کہ اے شعیبؑ! تم نے تو ہم سے صرف صلوٰۃ کا کہا تھا' صلوٰۃ کا ترجمہ نماز کر لیں تو ٹھیک ہے کہ تم نے تو صرف نماز کے متعلق ہم سے کہا تھا۔ اور قرآن کریم میں آگے ہے کہ حضرت شعیبؑ نے کہا کہ صلوٰۃ ہی تو ہے جس کی میں نے تم سے اجازت لی تھی' تو انہوں نے کہا کہ تیری صلوٰۃ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال جس طرح سے جی چاہے صرف کریں' یہ عجیب قسم کی صلوٰۃ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دین کی صلوٰۃ کا دائرہ کہاں تک جاتا ہے۔

## مذہب کے اکنامک سسٹم اور دین کے اکنامک سسٹم میں بنیادی فرق ہے

وہ ذہن میں سمجھے تھے کہ یہ مذہب کی نماز ہے' مسجد میں پڑھ لی' دو سجدے کر لیے' فریضہ ادا ہو گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ صاحب!

بات تو صلوٰۃ کی یا نماز کی ہو رہی تھی اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنا اکنامک سسٹم بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے کہا شعیبؑ! یہ کس قسم کی صلوٰۃ ہے کہ جس میں ہمیں اجازت نہیں کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔ انہوںؑ نے کہا کہ ہاں دین کی صلوٰۃ یہی ہوا کرتی ہے' تم تو یہاں مال کی بات کہتے ہو ہم تو جان بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں رکھ سکتے۔

## 1857ء کی جنگِ آزادی پر ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے شائع ہونے والا منشور

مذہب کی آزادی دنیا میں ہر ایک آپ کو دیدیگا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ملکۂ وکٹوریہ (1901-1819ء) کا جو پہلا منشور شائع ہوا تھا' جسے بڑے فخر سے پیش کیا جاتا رہا' اس میں انہوں نے مذہب کی آزادی دی' آپ کے نماز روزے حج زکوٰۃ میں کوئی تعرض نہیں کیا۔ ٹھیک ہے اپنے طور پہ کرتے چلے جاؤ' سلطنت کا اس سے بگڑتا کیا ہے۔ لیکن جونہی انہوں نے مذہب کی آزادی دی' کہا یہ گیا کہ ہمارے دین کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری الگ مملکت ہونی چاہیے تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ تم نے اگر آزادی دی ہے تو وہ آزادی یہاں تک پہنچنی چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ وہ جو خلافت کا مولانا محمد علی مرحوم (1931-1878ء) اور ان کے ساتھیوں کا مقدمہ ہے جو کراچی میں خالق دینا ہال میں ہوا تھا' اس میں مولانا صاحب مرحوم محمد علی جوہر نے Argument (دلیل و برہان) دیا تھا۔ ہوا یوں کہ اس میں انگریزوں کی طرف سے مسلمان فوجیوں کے سامنے میدانِ جنگ میں مسلمان تھے۔ ترکوں کے خلاف جنگ ہو رہی تھی۔ یہاں خلافت موومنٹ والے جن کو مولانا (محمد علی) جوہر مرحوم لیڈ کر رہے تھے' انہوں نے یہ ریزولیشن پاس کیا تھا کہ ''مسلمان کے لیے دین کی رو سے یہ حرام ہے کہ وہ کسی مسلمان پر گولی چلائے''۔ قرآن کریم کی آیت موجود ہے۔ اس پہ جب ان کو گرفتار کیا ہے تو اس میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے یہ کہا تھا کہ تم نے ہمیں Religion (مذہب) کی آزادی دی ہوئی ہے اور ہمارے Religion (مذہب) کا یہ حکم ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر گولی نہیں چلا سکتا۔ ہمیں تو اس چیز کی آزادی حاصل ہے کہ ہم اس پہ کاربند ہوں۔ ایسا کہنے سے تم ہمارے خلاف جرم کی یہ حد کیوں عائد کر رہے ہو' ہم نے کیا جرم کیا ہے لیکن انگریز نہیں سمجھ سکتا تھا' سچ تو یہ ہے کہ وہ سمجھنا چاہتا نہیں تھا۔

## ملازمت کے دوران پرویزؒ کا ایک ذاتی واقعہ

میں سمجھتا ہوں کہ ان میں اکثریت ان کی تھی جو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ یونہی ایک ذاتی سی بات آ گئی' جس کی بنا پہ میں نے کہا ہے کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے' ویسے یہ لوگ بات سمجھتے ہیں اور میں نے تو دیکھا ہے کہ ان میں ایسے لوگ تھے جو ہم سے زیادہ اسلام کو' دین کی حیثیت سے' سمجھتے تھے۔ وہ ذاتی بات جو میں نے کہی ہے' وہ یہ ہے کہ جب ریڈیو نیا نیا چلا' غالباً یہ 1935ء کا ذکر ہے' میں ہوم

ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا۔عیدِ قرباں کا تہوار آ رہا تھا' اس پہ انہوں نے اسوۂ ابراہیمیؑ پہ ایک تقریر رکھی اور مجھے اس کے لیے انہوں نے کہا کہ تم تقریر کرو۔ یہ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی گورنمنٹ ملازم ریڈیو پہ آ کر تقریر کرے۔ یہ Issue (مسئلہ) بھی ہوم ڈیپارٹمنٹ کا تھا' جس میں' میں ملازم تھا۔اصولی بحث چلی کہ گورنمنٹ سرونٹ کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے کہ وہ وہاں جا کر تقریر کرے۔ بہرحال طے یہ پایا کہ اجازت تو دی جائے لیکن ان کی تقریروں کو پہلے Vet (ماہرانہ جانچ پڑتال) کرلیا جائے' دیکھ لیا جائے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ تم بھی اپنی تقریر یہاں پیش کر دینا۔

جو میری تقریر تھی' وہ تو اردو میں تھی۔اس پہ Vetting (ماہرانہ جانچ پڑتال) کرنے کی ذمہ داری کون لے۔انہوں نے نیچے لکھ دیا کہ صاحب! ہمیں تو اتنی اردو نہیں آتی کہ ہم دیکھ لیں۔ یہ معاملہ مذہبی بھی ہے۔ یہ پہلا Issue (معاملہ) تھا' اس لیے معاملہ دور تک پہنچا۔بات سیکرٹری تک چلی گئی۔اس زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے جو سیکرٹری تھے' وہ گورنر بن کر آیا کرتے تھے' ان کا بلند درجہ ہوتا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ انہوں نے مجھے بلایا' بلا کر کہا کہ اس تقریر کو میں نے Vet (ماہرانہ جانچ پڑتال) کیا ہے' تم بتاؤ کہ تم اس میں کیا کہو گے۔ میں نے کہا کہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوہ حسنہ بیان کرونگا۔اس میں' میں یہ کہنا چاہوں گا کہ انہوں نے شرک سے اجتناب کیا۔قرآن کریم نے اسی پہ زور دیا ہے کہ وہ مشرک نہیں تھے اور میں اپنی تقریر کے اسی پوائنٹ (نکتے) کو Discuss (گفتگو) کرونگا کہ شرک کیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے شرک سے کس طرح اجتناب کیا تھا۔اس انگریز سیکرٹری نے کہا کہ کیا تم اس کی اجازت چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ مذہب کا ایک معاملہ ہے' میں شرک پر تقریر کر رہا ہوں تو اس میں کونسی چیز خرابی کی ہے۔

عزیزانِ من! غور فرمایئے! مجھے آج تک یاد ہے' میں نے لکھ رکھا ہے۔اُس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ تم قرآن کریم کی رو سے خطبے دیتے ہو۔میں وہاں (سیکٹیریٹ ❶ کی مسجد میں) بروز جمعہ خطبہ دیا کرتا تھا۔اس سیکرٹری نے کہا کہ تم قرآن کریم کی رو سے خطبے دیتے ہو' یہ عمل ہمارے پاس ہے۔''کیا قرآن کریم کی رو سے شرک اتنی سی بات ہوگی کہ بت نہ پوجا کرو؟ کیا شرک میں یہ نہیں آتا ہے کہ مسلمان خدا کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرے؟'' وہ انگریز سیکرٹری مجھ سے یہ کہہ رہا ہے اور کہا کہ ''اس ابراہیمؑ نے' جس کا تم اسوہ پیش کرو گے' کیا بادشاہ کے خلاف اس نے دربار میں کھڑے ہوئے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ خدا کے مقابلے میں تمہاری حیثیت کیا ہے' اور جب وہاں اس کو اپنے طور پر اپنے دین کو قائم کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی تو اس نے وہاں سے ہجرت کرنا قبول کرلیا تھا' یہ ہے نا توحید پرست ابراہیمؑ جس کا تم اسوہ بیان کرو گے''۔ یہ اس نے ہنستے ہوئے' مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے بعد کہا ''تم کہہ رہے ہو کہ صاحب! یہ

---

❶ یاد رہے کہ علامہ جی۔اے پرویزؒ نے 1927ء سے انڈیا کی مرکزی حکومت کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کا آغاز کیا تھا (محمد عمر دراز: دولتِ پرویز' النور پرنٹرز و پبلشرز' لاہور' 1992' ص۔224۔ نیز شعبۂ تحریکِ پاکستان: تحریک پاکستان گولڈ میڈل اعزاز یافتگان وتعارفِ خدمات' محکمہ اطلاعات وثقافت' حکومتِ پنجاب' 1990' ص۔ 33)۔

بڑی Innocence (معصوم) سی بات ہے‘‘۔اس پر میں نے کہا کہ میں نے تو شرک پہ تقریر کرنی ہے اور کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک نہیں تھے۔ میری تقریر میں یہی تھا۔عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کی نگاہیں اتنی دوربین ہوتی تھیں۔ یہ ہماری طرح نہیں تھے کہ صرف مذہب پرست ہوں اور دین کو نہ سمجھیں۔ان کے ہاں تو دین تھا ہی نہیں لیکن آپ کے دین کو وہ خوب سمجھتے تھے۔

## اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ایک تربیتی پروگرام ہے۔اس کے اپنے لوازمات ہیں

میں نے یہ کہا تھا کہ یہاں مقام یہ آ گیا تھا کہ ان لوگوں نے یہ کہا کہ صاحب! مذہب نماز روزے کی حد تک تو ٹھیک تھا‘ یہ کیا کہ آپ نے ہم پہ یہ فرض قرار دیدیا ہے کہ میدانِ جنگ میں جائیں اور جانیں ہتھیلیوں پہ لے کر آئیں‘ یہ کس طرح سے دین کا حصہ ہے؟ کہا کہ لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (4:77) ہمارے اوپر جنگ واجب قرار دی جارہی ہے۔لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰىٓ اَجَلٍ قَرِيْبٍ (4:77) کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ذرا توقف کیا جائے‘ ٹھہرا جائے‘ اس فرض کو عائد کرنے سے پیشتر ہمیں مہلت دی جائے کہ ہم سوچ تو لیں۔ٹھیک ہے‘ بات تو بڑی سوچنے کی ہے:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

انہوں نے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (4:77) کو بھی آسان سمجھ لیا تھا۔قرآن کریم کہتا ہے کہ یہاں تک تو معاملہ بالکل ٹھیک تھا‘ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔لیکن اب اس کے بعد یہ جو مقصد آیا‘ جس کے لیے یہ ٹریننگ ہورہی تھی‘ اصل میں وہاں پہنچ کر کہنے لگے کہ صاحب! یہ کیا ہے کہ قتال یعنی جنگ ہم پہ فرض کی جارہی ہے‘ اس میں جان دینی پڑے گی‘ تھوڑی سی مہلت دیجیے تاکہ سوچ لیں۔

## زندگی کی ہر دو منزلوں کی اہمیت اور ان کی سودمندی کا فیصلہ انسان کو خود ہی کرنا ہوتا ہے

قرآن حمید کہتا ہے کہ مہلت کی کیا بات ہے‘ سوچنے کی کیا بات ہے‘ بات تو بڑی آسان ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (4:77) ان سے کہو کہ سوال تو صرف دوراہے پہ کھڑے ہو کر یہ سوچنا ہے کہ ایک طرف دنیاوی مفاد ہیں‘ دوسری طرف مستقبل کی زندگی ہے۔اب جان بچا کر یا تو دنیاوی مفاد حاصل کر لینا ہے یا جان دے کر مستقبل کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل کر لینا ہے۔بات تو یہ طے کرنے کی ہے۔اس میں مہلت کس کے لیے مانگتے ہو۔یہ بات بڑی ٹھیک ہے۔وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (4:77) یاد رکھو! یہ نہیں ہوگا کہ تمہاری جان یونہی مفت میں لے لی جائے گی اور پھر تم پہ ظلم کیا جائے گا‘ قطعاً ظلم نہیں ہوگا۔قرآن حمید تو پہلے ایک قانون دیتا ہے‘ پھر اس کے بعد اس کی علت بھی سمجھاتا ہے‘ اس کی وجہ جواز بھی بتاتا ہے‘ اس کے حق میں دلیل بھی دیتا ہے۔کہا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ مرنے اور مرنے میں فرق کتنا ہے! اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ

(4:78) بتاؤ یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ موت بہر حال آنی ہے' تم کتنے ہی مضبوط قلعوں کے اندر کیوں نہ بیٹھے ہو' موت ایک دن آجانی ہے۔ چناں چہ مرنا تو ضرور ہے' فرق یہ ہے کہ ایک مجبوری کی موت ہے کہ اس نے آجانا ہے اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ طبعی موت ایک بے اختیاری عمل سے اور دوسری صاحبِ اختیار کی موت ہے جو خود مرنے کے لیے جاتا ہے۔ کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ہے۔ یہ ایک مرگِ باشرف ہے۔

یہاں قرآن حکیم بڑی عجیب بات کہہ گیا ہے' انسان صاحبِ اختیار پیدا کیا گیا ہے' طبعی زندگی کے قوانین اس پر اس طرح لاگو ہوتے ہیں کہ ان میں اس کا اختیار نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس حیوان کو بے اختیار پیدا کیا گیا ہے۔ موت طبعی زندگی پر آتی ہے' حیوان کے اختیار میں نہیں ہوتا' طبعی موت انسان کو بھی اس طرح سے آتی ہے۔ کہا ہے کہ اگر وہی طبعی موت تمہارے اوپر آجائے جس سے بچنے کا تم میں اختیار نہیں ہے تو مرنا تو تم نے اس طرح سے بھی ہے' اس میں تمہارا اختیار نہ رہا۔ اور جس معاملے میں بااختیار بے اختیار ہو جاتا ہے' اس کا شرفِ انسانیت ختم ہو جاتا ہے۔ بے اختیار' مجبوری کی موت مرنے کی بجائے بااختیار موت کو کیوں نہیں قبول کرتے کہ خود مرنے کے لیے باہر چلے جاؤ' اور حق کی خاطر جان دو' یہ عمل بااختیار ہے۔ اسی میں رازِ حیات ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ قرآن حمید کیا بات کہہ جاتا ہے صاحب!

## مسئلہ تقدیر کا سارا الجھاؤ عجمی تصورات ہی کا پیدا کردہ ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد ایک ایسی آیت آرہی ہے جو بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بڑی اہم ہے' جس کے غلط مفہوم سے اتنی بڑی غلط عمارت استوار ہوگئی ہے کہ جس میں مسلمان بری طرح سے الجھا ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے اور میں آپ کو بتاتا چلا آرہا ہوں کہ سب سے پہلا مسئلہ' جسے آپ تقدیر کا مسئلہ کہتے ہیں' یہ آپ کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کی بنیادوں پر آپ کے فرقے پیدا ہوئے۔ اور اس میں اس وقت تک مسلمان الجھا چلا آرہا ہے۔ جب تک قرآنِ خالص مسلمان کے ہاتھ میں تھا' یہ مسئلہ نہیں تھا' یہ سوال نہیں تھا۔ قرآن حمید میں یہ بڑی عمدگی سے حل ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد جب دین عجمی تصورات سے متاثر ہوا ہے تو سب سے پہلا مسئلہ جو ان کے ہاں بحث کا چلا' وہ تقدیر کا تھا۔ عرب بڑی سادہ سی قوم تھی' انہوں نے اسلام کو قلب ونگاہ کی تبدیلی کے ساتھ قبول کیا تھا' وہ بحثوں میں نہیں پڑتی تھی' وہ زیادہ تصوراتی یا نظریاتی قوم تھی ہی نہیں۔

## مسلمان ہونے سے پہلے اہلِ ایران کی تمدنی اور معاشرتی زندگی' نیز شبِ برات کی حقیقت

جب ایران مسلمان ہوا ہے تو اول یہ اس طریق سے نہیں ہوا تھا کہ پہلے ان کے قلب ونگاہ کی ٹریننگ ہو جاتی اور پھر وہ اسلام قبول کرتے۔ انہوں نے تو شباشب (Over Night) اسلام قبول کیا تھا۔ اور اس طرح سے جب دین میں تبدیلی آتی ہے تو سنیے! کئی دفعہ میں کہہ چکا ہوں کہ خود ہمارے ہاں کے ''لالہ'' کو ہم نے دیکھا' وہ ہندو سے مسلمان ہوئے تھے' انہیں جب بھی چھینک آتی تھی تو وہ ''جے نندی کی'' کہتے تھے۔ ان سے کئی دفعہ کہا گیا کہ صاحب! الحمدللہ والی جو بات ہے وہ کہو تو وہ کہتے تھے کہ صاحب! یہ ''جے

نندی' جونسلوں کی گھسی ہوئی ہے' وہ نکلے ہی نکلے گی اور جو رحیم ہے وہ گھستا ہی گھسے گا' اس میں کچھ وقت تو چاہیے۔

ہاں تو غیر شعوری طور پر چھینک کے ساتھ ''جے نندی'' آ جاتی تھی۔ ان ایرانیوں کے ہاں بھی یہ جو جے نندیاں چھپی ہوئی تھیں' یہ ساتھ آ ئی تھیں۔ اور علم وفضل اور تہذیب وتمدن میں وہ ان سادہ عربوں سے کہیں آ گے تھے۔ انہوں نے ان عربوں کے شہروں میں آ کر ان کے ساتھ مل کر' وہ فلسفیانہ بحثیں شروع کر دیں جو ان کے ہاں روزمرہ کا معمول تھا کہ صاحب! بتایئے اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو پھر تو ہر بات اس کی مرضی کے مطابق' اس کے حکم کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ مانتے تھے کہ قادرِ مطلق ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر انسان کو جزا اور سزا کا مستحق کیوں قرار دیا جاتا ہے' اس کا تو ہر فعل خدا کے حکم کے مطابق ہوگا۔ اس کے حکم کے خلاف تو پتا نہیں ہل سکتا۔ یہ عرب سادہ لوح تھا' یہ ان فلسفیانہ مباحث کا جواب کس طرح سے دیتا۔ جواب تو نہ دے سکا' شکوک وشبہات کے کانٹے تو بوئے گئے۔ آپ کے ہاں یہاں سے بات شروع ہوتی ہے اور پھر ریل جو دوسری پٹڑی پہ پڑی ہے' اس کے بعد ادھر ہی چلتی گئی۔

ضمناً یاد آ گیا کہ پرسوں 16 اکتوبر 1970ء کو ہی تو آپ کے ہاں شب برات منائی گئی ہے۔ یہ تقریب کیا ہے؟ کبھی کسی نے اس پر سوچا ہے؟ سال میں جتنی تقریبات آتی ہیں' ان کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریب کیوں آئی' اس میں کیا ہوا تھا' یہ کیوں منائی جاتی ہے لیکن شب برات ایسی ہے جس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ یہ کیوں منائی جاتی ہے۔ کسی سے پوچھیے' وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتائیں گے کہ روایات ہیں' ان میں یہ آیا ہے کہ یہ رات بڑی مبارک رات ہے اور اس میں وہ جیسے بادشاہوں کے ہاں ان کی سالگرہ پہ قیدیوں کو چھوڑتے تھے' روایت میں یہ آیا ہوا ہے کہ اس رات خدا لاکھوں کروڑوں جہنمیوں کو جہنم سے آزاد کر دے گا۔ وہی ملوکیت کا تصور ذہنوں کے اندر ہے کہ بادشاہ کا جشنِ سالگرہ ہے' ہر ایک جشن کے اندر قیدیوں کو رہا کیا کرتے تھے۔ تو اس رات خدا جہنم سے رہا کر دیتا ہے۔

عزیزانِ من! اصل میں یہ ''برات'' کا لفظ ہے۔ یہ ''برات'' تو ہمارے ہاں فارسی سے آیا ہے یعنی گناہوں سے آزادی' گناہوں کو الگ کر دینا۔ یہ اتنا ہی ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور یہ بات اس سے کہیں گہری ہے۔ یہ مجوسیوں کے ہاں کا تہوار تھا۔ ہوا یوں کہ عباسیوں کے زمانے (1258-750ء) میں برامکا آئے ہیں ❶ مملکت کا اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا ہے۔ یہ مجوسی تھے اور

---

❶ ابومسلم' جس کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا' ایرانی النسل تھا اور بزرجمہر کی اولاد تھا' اصفہان میں پیدا ہوا تھا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی تھی' بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا اور پروپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ اس نے ''اہل بیت'' کے نام سے اس قدر شدومد سے پروپیگنڈہ کیا کہ سلطنت بنی امیہ (750-661ء) کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہوگیا۔ ابومسلم' ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا۔ یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کے بعد' ایک فرد نہیں' بلکہ خاندان' اسی عزم کو لے کر عباسیوں کے ہاں آ گیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت کو زندہ تو نہ کر سکا لیکن اس نے اس عظیم سلطنت (عباسیہ) میں نہ اسلام رہنے دیا' نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیت نے لے لی (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

مسلمان ہوئے تھے۔اس رات کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ یہ عقیدہ ہے کہ سال بھر آنے والے جتنے فیصلے ہیں' اس رات میں ہوجاتے ہیں' وہ جس کا پتا کٹنا ہوتا ہے وہ درخت سے کٹ جاتا ہے۔ ہر بات کے فیصلے اس رات کو ہوجاتے ہیں۔ یہ وہی جبر کا عقیدہ ہے' جب سال بھر کے فیصلے پہلے سے ہی ہوگئے تو معاملہ ختم ہوا' آپ صاحبِ اختیار تو رہے ہی نہیں' آپ کے تو فیصلے ہوچکے ہیں' تو سال بھر کے یہ فیصلے ہوجاتے تھے۔ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا۔اس کے متعلق انہوں نے ایک دن رکھا ہوا تھا۔ یہ ادھر آئے تو انہوں نے یہ تہوار بھی یہاں منانا شروع کیا اور اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ آتش بازی ہوتی ہے۔ یہ آتش بازی کیوں آتی ہے؟ اس لیے کہ مجوسیوں کی قوم آتش پرست تھی' اس کے ساتھ یہ آتش پرستی یا آتش بازی لازم وملزوم ہے۔ یہ آتش بازی' آگ کا کھیل ہے۔مسلمان کے ہاں عذاب کے لیے قرآن کریم نے لفظ ہی ''نار'' کہا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کے ہاں جو اس انداز میں مسئلہ جبر وتقدیر ہے جس کو ایک خالص علمِ کلام کا مسئلہ کہا جاتا ہے' یہ بہت بعد میں ہوا تھا۔

## تقدیر کے عقیدے میں پایا جانے والا تضاد

اب بات اس آیت کی آئی ہے' اس نقطۂ خیال سے دیکھیے تو یہ اسے مشکل ترین آیت کہتے ہیں۔کہا ہے کہ **وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ** (4:78) یہ جو میدانِ جنگ سے اس طرح سے جانیں چرا چرا کر منہ موڑتے ہیں اور آنا نہیں چاہتے' ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر یہ کبھی میدان میں آ بھی جاتے ہیں یا ویسے ہی تمہارے ساتھ رہتے ہیں' تو اگر کوئی خوشگواریوں کی بات ہوتی ہے' اچھائیاں ملتی ہیں' مساعد حالات ہوتے ہیں' تو اس میں یہ کوئی کریڈٹ رسول کو نہیں دیتے۔ یہ جو جماعت کا امام ہے' ملت کا مرکز ہے' اس کی طرف کریڈٹ نہیں جاتا۔سوال یہ ہے کہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ کہتے یہ ہیں کہ **هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّىۡ** (27:40) اور **هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ** (4:78) یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے' یہ تو ہمیں ملنا ہی تھا کہ خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اس میں اس نظام کا' اس اسلام کا' اسلام کے اس مرکز کا' کوئی کریڈٹ نہیں ہے' اس کا اس سے کیا تعلق' اس کی اس میں کیا خوبی' یہ تو خدا کی طرف سے ہے'

---

(پچھلے صفحے کا فٹ نوٹ) اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔تاریخ میں یہ خاندان برامکہ کے لقب سے مشہور ہے۔ برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے لیکن اکثریت کا خیال ہے کہ اس لفظ کی اصلیت ''برماہ گاہ'' ہے یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متولّی یا پجاری۔اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برمکیوں کا جدّ امجد' جاماسپ بن یشتاسپ تھا جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موبد مقرر ہوا اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری سلطنت کا موبدِ موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔۔۔۔۔ ہم پہلے عباسی خلیفہ عبداللہ بن محمد بن علی (132-136/750-754A.D ھ)' ملقب بہ سفّاح کے دربار میں' خالد برمکی کو ایک نہایت بلند ذمہ دار منصب پر فائز دیکھتے ہیں۔(تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور' 1987' ص ص۔ 441 تا 468)

ہمیں ملتا ہی ہے۔ کہا ہے کہ وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ (4:78) اور اگر کہیں کوئی نامساعد بات آتی ہے' نقصان دہ چیز آتی ہے' تو گلے پڑ جاتے ہیں کہ تیری بدتدبیری کی وجہ سے یہ کچھ ہوا ہے' تم نے ہمیں مروادیا۔ کہا ہے کہ پہلے یہ دیکھیے کہ ان کے اپنے عقیدے اور عمل میں کتنا تضاد ہے! یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ حسنات' یہ خوشگوار حالات' ہوتے ہیں تو یہ خدا کی طرف سے ہیں اور اس میں رسول کے حسنِ تدبیر کا کوئی دخل نہیں' یہ جتنے نقصانات ہوتے ہیں' یہ بھی خدا کی طرف سے ہیں' تم درمیان میں جھٹ سے یہ کیوں کہہ دیتے ہو کہ یہ تمہاری (رسول) کی غلط تدبیروں کا نتیجہ ہے۔ تم یہ کیسے لے آتے ہو۔ اور اگر نقصانات اسی کی بدتدبیری کی وجہ سے ہوتا ہے تو جو خوشگواریاں آتی ہیں' ان کے لیے کہو کہ یہ تمہارے ہی حسن وتدبر سے ملی ہیں' شکر یہ آپ کا مگر نہیں' یہ ایسا نہیں کرتے۔ جو چیزیں اچھی ملتی ہیں' تو کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور جہاں کوئی چیز خرابی کی ہوتی ہے' اس کے لیے ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کے سر اس کا الزام تھوپیں۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔

## تقدیر اور جبر سے متعلق یہ قرآنی حقائق و اقدار کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے

آگے بات آئی۔ سامنے قرآنِ کریم ہے تو یہ دیکھیے! یہ بڑی اہم آیت ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (4:78) ان سے کہیے کہ یہ غلط ہے' یہ جو تم نے تقسیم کردی ہے کہ اچھائیاں' خدا کی طرف سے ہیں' اور برائیاں یا نقصان کی چیزیں اس کی طرف سے ہیں' ان سے کہو کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں پہلی بات ہی یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتا ہے: اچھے کا اچھا اور بُرے کا برا۔ ان کی جو روش ہے اس سے تو فوراً ذہن اس طرف گیا کہ یہ تو جبر کا وہ عقیدہ آ گیا کہ سب کچھ اس کی طرف سے ہوتا ہے۔ فوراً ہی آگے آیا ہے کہ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا (4:78) اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ اصل بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی' دراصل یہ بات سمجھنا چاہتے ہی نہیں ہیں ورنہ اصل حقیقت کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں۔

## انسان کی انسانیت کا آغاز انسانی اختیار و ارادہ کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر ہوتا ہے

تقدیر میں جبر کا عقیدہ رکھنے والا بات سمجھنا ہی نہیں چاہتا ہے۔ اس جبر کے عقیدے میں بڑی موج ہوتی ہے صاحب! کہ جو بات ہوئی' اس کے متعلق کہا کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا' ہم کیا کرتے' اس نے ہماری قسمت میں لکھا ہی یہ تھا' ہماری تقدیر ہی ایسی تھی۔ تقدیر کے اس جبر کے عقیدہ میں کوئی الزام اپنے اوپر نہیں لیا جاتا ہے اور اُدھر قانونِ خداوندی میں انسانیت کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان اپنی Responsibility (ذمہ داری) کا اعتراف کرے۔ اس کا اعتراف کرے کہ مجھ سے غلطی ہوئی' میں اس کا ذمہ دار ہوں' بس یہاں

سے انسانیت شروع ہوتی ہے۔حیوان مجبور ہوتا ہے' انسان صاحبِ اختیار ہے۔اور انسان بھی اگر یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! میں تو صاحبِ اختیار نہیں ہوں' جو ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے' تو وہ فوراً سطحِ حیوانیت پر آ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قصہء ابلیس و آدم' جو قرآن کریم کہتا ہے' اس میں بات ہی اتنی ہے' اس کے اندر لم ہی اتنی ہے کہ آدم سے بھی ایک غلطی ہوئی' لغزش ہوئی' ابلیس سے بھی ایک حکم کی نافرمانی ہوئی' دونوں نے نافرمانی کی تھی۔ آدم سے جب کہا گیا کہ یہ کیا ہے' بتاؤ! یہ کیوں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (7:23) بارِ الٰہا! مجھ سے زیادتی ہوئی ' بھول ہوگئی' میں اپنی لغزش کا ذمہ دار ہوں' یہ میں نے کیا ہے۔کہا کہ تمہاری اصلاح کا امکان ہے' تم نے اپنے اختیار سے اعتراف کیا ہے' کہ یہ غلطی ہے' اب اپنے اختیار سے اس غلطی کی تلافی کرلو گے' اس کی تلافی کا امکان ہے۔

## قصہء ابلیس و آدم کی ساری لم انکار اور اقرار کے مفہوم میں مضمر ہے پھر خوشگواریوں اور مصیبتوں کے لانے میں تضاد کیوں؟

وہ جسے کہتے ہیں کہ خدا نے آدم کی توبہ قبول کرلی تو وہ کیا چیز تھی؟ اس نے کہا تھا کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (7:23) بارِ الٰہا! غلطی ہوئی ہے ہم سے۔اس کے برعکس ابلیس سے کہا کہ تُو نے یہ کیا کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ میں نے کیا کیا' تُو نے مجھے گمراہ کرایا ہے میں کیا کرسکتا تھا! اب یہ جبر کا عقیدہ آ گیا' اُس خدا نے کہا کہ قیامت تک کے لیے تیری اصلاح نہیں ہوسکتی۔جو اپنی غلطی کا اعتراف ہی نہیں کررہا تو اس کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے! یہ ہے ابلیس و آدم کا قصہ۔جونہی آپ نے یہ کہا کہ صاحب! میں تو اس کا ذمہ دار نہیں ہوں' یہ خدا کی طرف سے ہے' تو وہ ابلیسیت کی روش ہے' اس کی کبھی اصلاح نہیں ہوسکتی۔کہا: ان کی کیفیت یہ ہے۔

برادرانِ عزیز! چونکہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتا ہے' اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (4:78) انہیں بتادو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔اب آگے یہ دیکھیے۔کہتا ہے کہ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ (4:79) جتنی اچھائیاں آتی ہیں' خوشگواریاں آتی ہیں (پہلے میں عام ترجمہ کرتا ہوں) وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور یہ جتنے تمہارے نقصانات اور تباہیاں آتی ہیں وہ سب تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں' خدا کو اس کا الزام مت دو۔پہلے تو یہ کہا کہ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (4:78) ان سے کہو کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے تو ذہن میں فوراً بات آتی ہے کہ پہلے تو یہ کہا کہ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (4:78) خدا ہی کی طرف یہ سب کچھ ہوتا ہے' یہاں پھر اس کے دو ٹکڑے کردیئے کہ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ (4:79) جو اچھائیاں ہوتی ہیں'

خوشگواریاں ہوتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں' جو مصیبتیں آتی ہیں' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہیں۔اوپر کہا تھا کہ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (4:78) سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

یہ ایک ہی آیت ہے۔اس پہ کہا جاتا ہے کہ یہ بڑی مشکل آیت ہے' بات سمجھ میں نہیں آتی۔اوپر یہ کہا ہے اور ساتھ ہی یہ چیز کہہ دی ہے' ان دونوں کے اندر تو بظاہر بڑا تضاد نظر آتا ہے۔پہلے کہا ہے کہ ''کہہ دو سب خدا ہی کی طرف سے ہے''۔پھر کہا کہ نہیں! ''خوشگواریاں اس کی طرف سے ہیں اور جتنی سیأت ہیں وہ تمہاری طرف سے ہیں''۔

## ''کائنات میں ہر واقعہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے'' کے قرآنی مفہوم کی وضاحت

عزیزانِ من! بات بالکل صاف ہے۔کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے' خدا کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت ہو رہا ہے۔اس لیے کہا ہے کہ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (4:78) ہر واقعہ جو یہاں ہوتا ہے خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔یہ جسے ہم کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ ہر واقعہ کے لیے وہ الگ الگ فیصلے دیتا ہے یا حکم دیتا ہے۔جب ایک فیصلہ غیر متبدل ہو جائے تو اسے قانون کہا کرتے ہیں۔فیصلے خدا نے ایک دفعہ کیے اور انہیں غیر متبدل قرار دیدیا' اسے Law (قانون) کہتے ہیں۔خدا کی طرف سے ہے جو کچھ یہاں ہوتا ہے' وہ سب خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔اب آگے یہ ہے کہ فَمِنَ اللّٰهِ (4:79) اگر تم ان قوانین کے مطابق عمل کرتے ہو تو حَسَنَةٍ یعنی خوشگواریاں ہی خوشگواریاں آتی ہیں اور جہاں تم دیکھو کہ کوئی مصیبت آئی ہے تو سمجھ لو کہ اس کے خلاف تم نے اپنی مرضی سے کچھ کر لیا۔یہ ہو نہیں سکتا کہ قانونِ خداوندی کے مطابق کرو اور اس کے نتیجے میں تباہی اور بربادی آ جائے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا۔اس نے بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26) کہا ہے۔کیا خدا تباہیاں لاتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے بندوں پہ ظالم نہیں ہیں' ہم ظلم نہیں کرتے' ہم تباہیاں نہیں لاتے۔تباہیاں لانا ہوتا تو یہ سارا تعمیری سلسلہ ہم وجود میں ہی کیوں لاتے۔یہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26) ہے۔خدا کی طرف سے ہمیشہ حسنات ہوتی ہیں۔یہ تو جب انسان اس کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس میں اس کو مصیبت آتی ہے۔

## خدا کا قانون تو ہر لحہ انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں مصروف کار رہتا ہے

اب دیکھیے بات کتنی صاف ہوگئی کہ یہ جو تمہیں کہتے ہیں کہ خوشگواریاں خدا کی طرف سے ہیں' مصیبتیں' اے رسول! تمہاری طرف سے ہیں' تو ان سے کہو کہ یہ غلط ہے۔یہ دونوں چیزیں خدا کے قوانین کے تابع ہوتی ہیں۔اس کے آگے پھر اسے Further Explain (مزید واضح) کیا کہ مصیبتیں بھی آتی ہیں' خوشگواریاں بھی ملتی ہیں' تو پھر یہ کیسے ہے؟ کہا ہے کہ یہ ایسے ہے کہ جب تک

تم خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے جاؤ گے' خوشگواریاں ہی خوشگواریاں ملتی چلی جائیں گی۔ یہ ہے **مَآ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ** (4:79) ہر وہ عمل جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا اس کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار ہوگا۔ پھر آگے کہا ہے کہ **وَ مَآ اَصَابَکَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ**(4:79) اور جہاں مصیبتیں آئیں گی تو سمجھ لو کہ تم نے خدا کے قانون کے مطابق نہیں کیا' اپنے جذبات کے تابع' اپنے فیصلے کے مطابق' کچھ کر گئے' اس کی وجہ سے تمہیں یہ مصیبت کا نتیجہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب یہاں بات صاف ہوگئی۔ ہر بات یہاں خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے' اس کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ حسنات ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف ورزی کرنے کے نتیجہ کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس کے مطابق نہیں کیا' میں نے اپنے فیصلے کے مطابق کیا ہے۔ جب یہ کرو گے اور وہ اس کے خلاف جائے گا تو اس کا نتیجہ مضرت رسانیاں ہونگی' نقصان ہوگا۔ یہ ہے جو تم سمجھنا نہیں چاہتے ہو ورنہ بات مشکل نہیں ہے:

ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے ❶

## ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

عزیزانِ من! یہ جسے تقدیر کا مسئلہ کہتے ہیں' یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے' آسان ہے' یہاں ہر شے کے لیے قوانین مقرر ہیں۔ جس قسم کا انسان خود ہو جاتا ہے' اس قسم کے قانون اس پر لاگو ہو جاتے ہیں۔ یہ کس قسم کا ہونا چاہتا ہے' یہ اس کے اپنے اختیار کی چیز ہے لیکن جس قسم کا یہ ہونا چاہتا ہے یہ فیصلہ خود کرے' اس پر عمل کے بعد اس کا نتیجہ کیسے نکلے گا' یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ یہ تو اس کے اختیار میں ہے کہ سنکھیے کی پڑیا کو پھانک لے یا پھینک دے' یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ سنکھیا پھانکے اور شہد کا اثر پیدا کرلے۔ پھر اس سنکھیے کی بھی تقدیر مقرر ہے۔ تقدیر کے معنی یہ ہے کہ پیمانے مقرر ہیں مگر سمجھو تو!

## قدرت نے کائنات کی ہر شے کے لیے تقدیر مقرر کر رکھی ہے

سنکھیے میں تو شاید بات ہر ایک کی سمجھ میں نہ آئے' پانی تو آپ کے لیے ممدِ حیات ہی نہیں بلکہ بنائے حیات ہے' زندگی کی بنیاد پانی پر ہے' اس کے بغیر زندگی مل ہی نہیں سکتی' انسان زندہ رہ ہی نہیں سکتے لیکن یہ لوگ پانی میں ڈوب کر روز مرتے ہیں۔ جو چیز بنائے حیات ہے' وہی ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہوا؟ پانی کا ایک گلاس یا دو گلاس پیاس بجھانے والا ہوتا ہے۔ وہ اس کے ممدِ حیات ہونے کی تقدیر ہے اور جب اس پیمانے سے زیادہ تم اپنے اندر انڈھیل لو گے تو وہی جو پانی ہے' اس کا قانون یہ ہے کہ وہ آپ کے لیے

---

❶ بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے　　(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

موت کا باعث بن جائے گا۔ یہ پانی کی تقدیر ہے۔ جو اشیائے کائنات ہیں' ان کی تقدیر ہے' ان کے پیمانے مقرر ہیں' یہ اشیائے کائنات ان سے انحراف نہیں کر سکتیں' یہ مجبور ہیں۔ آگ ہمیشہ جلائے گی' پانی نشیب کی طرف بہے گا' سنکھیا ہلاکت کا اثر پیدا کرے گا' وہ مجبور ہیں۔ انسان اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں 'احکامِ الٰہی کا پابند' یہ تقدیر کا پابند نہیں ہے۔ یہ Choice (انتخاب) اس کو خود دیا گیا ہے کہ جی چاہے تو ایک گلاس پانی پیئے اور اس کے بعد پیاس بھی بجھے اور ممدِ حیات بھی ہو' جی چاہے تو دریائے راوی میں جا کر اسی پانی سے ڈوب کر مر جائے۔ پانی کی تقدیر اٹل ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے اندر پانی کا گھڑا انڈھیل لے اور وہ اسے زندگی دے۔ اب یہ کہ وہ گھڑا انڈھیلے گا نہیں' یہ اس کے اختیار کی چیز ہے۔

## ''خدا کی مرضی یا خدا کے چاہنے'' کا مفہوم خدا کا قانون ہوتا ہے

اب یہ چیز انہوں نے کہی تھی کہ صاحب! یہ جو کچھ ہوتا ہے' سب جیسا خدا چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے۔ یہ آیات پہلے بھی کئی دفعہ آئیں۔ دو آیات کو آپ دیکھ لیجئے' بات سمجھ میں آ جائے گی۔ کہا ہے کہ سَيَقُولُ الَّذِينَ اَشْرَكُوْا (6:148) جو لوگ شرک کرتے ہیں' ان سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! تم شرک کیوں کرتے ہو؟ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہ لوگ اس سَيَقُولُ الَّذِينَ اَشْرَكُوْا (6:148) کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیں گے کہ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا (6:148) کیا کہتے ہو کہ ہم کیوں شرک کرتے ہیں' بندہ بشر ❶ ہے ہم کون ہیں شرک کرنے والے! یہ تو خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ہم کبھی شرک نہ کرتے۔

عزیزانِ من! یہی بات ہے جو ہم روز کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی یہی تھی' وہ چاہتا تو ایسا کیوں ہوتا' بس اس نے کر دیا۔ یہی بات ہے جو قرآن حمید کہہ رہا ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ شرک کیوں کرتے ہو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں! خدا اگر چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں تو ہم میں اس کی کیا قوت تھی کہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکتے؟ وہ چاہتا تو ہم کبھی بھی شرک نہ کرتے۔ کہا ہے کہ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (6:148) یہ انہی کی بات نہیں ہے' جس طرح یہ حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں' ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا کیا تھا' حقیقت کو اس وقت تک جھٹلایا تھا کہ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا (6:148) تا آنکہ ہمارے عذاب نے ان کو پکڑ لیا۔ یہ عقیدہ رکھنے والے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ خدا کی منشا سے ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ اس سے قوموں پر عذاب آتا ہے۔ ہم تو صبح سے شام تک اسی پر چلے ہوئے ہیں۔ اور جتنا کوئی یہ زیادہ کہنے والا ہے کہ سب اس کی مرضی سے ہوتا ہے' وہ اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ بھی ہے کہ

---

❶ سہو و خطا انسانی خُو ہے۔

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

یعنی دعا بھی نہ کرو‘ اگر خدا کی مرضی یہ ہے کہ مجھے یہ تکلیف آئی ہے تو تمہاری دعا کے معنی یہ ہیں کہ تم یہ تکلیف ہٹانا چاہتے ہو‘ ایسا نہ کرو‘ کہیں مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو جائے۔ دیکھتے ہیں یہ چیز کہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ اگر یہ خدا کو منظور ہوتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔قرآن کریم اسے مشرکین کا قول کہتا ہے۔کہتا ہے کہ یہ دین کی تکذیب ہے‘ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے‘ عذاب ہے۔

دو تین ریفرنس اور لے لیں۔ یہ ہیں (16:35; 36:47; 43:20)۔ یہ سورۃ یٰسٓ کی آیت تو خاص طور پہ Quote (نقل) کرنے کے قابل ہے۔ یہ جو روز کی چیز ہے کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے‘ جسے چاہے وہ غریب کردے‘ جسے چاہے وہ امیر کردے ”ککھوں لکھ کردے‘ لکھوں ککھ کردے“ (کروڑ پتی کو کنگال کردے اور کنگال کو کروڑ پتی)۔ جب کہا جائے کہ صاحب! دیکھو یہ بھوکے مفلس کس طرح سے بھوک سے مر رہے ہیں‘ آؤ اپنے حالات میں‘ اپنی سوسائٹی میں‘ کچھ تبدیلی کریں تاکہ ان بھوکوں کو روٹی ملے تو اس کا جواب مذہب پرست طبقے کی طرف سے ملتا تھا‘ اب تو خیر زمانے کے تقاضوں نے ”جنوں کیندے نے بتھاڑ سیک دتا“ (جسے کہتے ہیں کہ شرما کر رکھ دیا ہے) اب تو سب سمجھنے لگ گئے ہیں۔آج سے چند مہینے پہلے تک مجلّہ طلوعِ اسلام کے خلاف یہ مضامین شائع ہوتے تھے کہ یہ شخص خدا کی رزاقیت کا منکر ہے‘ رزق تو اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے‘ وہ جس کو بھوکا مارنا چاہتا ہے‘ یہ کہتا ہے کہ اُسے روٹی دی جائے‘ یہ خدا کے خلاف جنگ ہے‘ یہ اس کے رازق ہونے پہ ایمان کی نفی ہے۔اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو کسی کی کیا مجال تھی کہ پھر یہ بھوکے رہ سکتے‘ وہ رزق خود دیتا ہے۔ یہ تھی چیز جو کل تک کہتے تھے۔یہ نہیں ہے کہ قرآن حمید اس کے بعد نازل ہوا ہے کہ انہوں نے اب دیکھا کہ ”اسی تے پہلاں ایویں غلطی کردے رہے“ (ہم تو پہلے یونہی غلطی کرتے رہے)۔چودہ سو سال سے دن رات دہرایا جاتا ہے اور پھر یہ جو سورۃ یٰسٓ [1] ہے یہ مرتے وقت سناتے ہیں کہ ’از یٰسینِ او آسان بمیری‘۔وہ کتابِ عظیم جو مُردوں کو زندگی دینے کے لیے آئی تھی‘ یہ زندہ کو آخری وقت میں سنائی جاتی ہے کہ جلدی سے اس کی موت آئے۔سورۃ یٰسین چونکہ مُردوں کو سنائی جاتی تھی‘ وہ جو قلعۂ معلّٰی تھا‘ وہاں مغلوں کی شہزادیاں جب قرآن حمید میں اس پر آتیں تو اس کا نام یٰسین نہیں لیتی تھیں‘ کہتی تھیں کہ اگلی سورۃ نمانی ہے ”یعنی جیہدا ناں ای کوئی نئیں ہیگا‘ ایہڈی منحوس‘ پئی ایہدا ناں ای نئیں لینا چاہیدا“ (یعنی اس کا کوئی نام ہی نہیں ہے‘ یہ اتنی منحوس ہے کہ اس کا نام ہی نہیں لینا چاہیے)۔

---

[1] دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان‘ سورۃ یٰسٓ‘ ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)‘ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ‘ لاہور‘ 2009۔

## دوسروں کی روٹی کا انتظام کرنے کے سلسلہ میں کافروں کا جواب

عزیزانِ من! اس میں کہا ہے کہ **وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ** (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پاس ضرورت سے زائد ہے' یہ ان کے لیے دیدو جو بھوکے ہیں' ان کی بھوک مٹانے کے لیے ان بھوکوں کو دے دو۔ **قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا** (36:47) یہ کافر' مومنوں سے کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ **اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ** (36:47) کیا کہہ رہے ہیں کہ ہم ان کو کھلائیں' اگر خدا چاہتا تو وہ ان کو روٹی دیتا' اس نے جو بھوکا رکھا ہے تو معنی یہ ہیں کہ وہ انہیں روٹی نہیں دینا چاہتا۔ وہ روٹی دینا نہیں چاہتا' تم ہم سے کہتے ہو کہ جا کر انہیں روٹی دو' تمہاری مت ماری ہوئی ہے کہ خدا کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ کافر یہ باتیں مومنوں سے کہتے ہیں۔ **اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ** (36:47) ان سے کہو کہ تم لوگ کتنی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ سمجھتے ہو! لیکن یہ کیا بات ہے! کیا کھلی ہوئی گمراہی ہے! اگر یہ چیز ہو جائے کہ یہ انسانوں کی طرف سے ہے تو پھر تو ان بھوکوں کو سوچنا پڑے گا کہ وہ کون ہیں جنہوں نے ہماری روٹی روک رکھی ہوئی ہے ورنہ یہ فرعون کی فرعونیت چلتی ہی نہیں جب تک ہامان کی ہامانیت ساتھ نہ ہو۔ فرعون رزق کو روکتا ہے' ہامان لوگوں کو تھپکاتا ہے کہ یہ تو اللہ نے روکا ہوا ہے' یہ کون ہوتا ہے روکنے والا' اس کے ہاتھ میں کیا ہے صاحب! اُس نے روکا ہوا ہے' رزق کی بسط وکشاد وہاں ہوتی ہے' وہ اگر دینا چاہتا تو کوئی راستے میں روک نہیں سکتا۔ یہ ان کو تھپکاتے رہتے ہیں کہ ان کی نگاہ اُدھر اٹھنے نہ پائے' جنہوں نے رزق روکا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! یہ سلسلہ آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے کہ خدا جتنا چاہتا ہے کسی کو دیتا ہے تا کہ نظام کے بدلنے کی طرف تمہارا دھیان نہ جائے۔ قرآن حمید کن الفاظ میں یہ کہتا ہے کہ یہ کفار کا عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم ہم سے کہتے ہو کہ ان کے کھانے کا کچھ انتظام کرو' اگر اللہ ان کو روٹی دینا چاہتا تو کیوں نہ دیتا' وہ دے نہیں رہا' ہم سے کہہ رہے ہو کہ جا کر دو' اونہ بابا! ہم خدا کے خلاف لڑائی کریں!

عزیزانِ من! یہ تھا قرآن حمید' قرآن حمید کی آیہ جلیلہ لکھ کر رکھیے۔ کہا ہے کہ **وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ** (42:30) کوئی مصیبت نہیں آ سکتی' کوئی واقعہ ایسا نہیں ہو سکتا' اگر اصاب کے کھلے معنی لینے ہیں تو اس کے معنی ہیں حادثہ یا واقعہ' صرف مصیبت معنی لینے ہیں تو مصیبت لیجیے۔ یہ کوئی نہیں ہو سکتا یہ تو **فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ** (42:30) ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔

## تقدیر کے موجودہ تصور کے تحت ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی ذات پر الزام تراشی کی نوعیت

جو قوم اپنے ہاں یہ عقیدہ رکھ لے کہ ہماری ہر تباہی ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے' خواہ وہ ذاتی طور پر انفرادی ہو یا اس

سے آگے بڑھ کر' وہ اجتماعی معاشرے کی لائی ہوئی ہو' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی ہی لائی ہوئی ہے وہ اس سے نکل آتی ہے۔لہٰذا جس قوم کے پاس یہ عقیدہ تھا یا جس کی تعلیم کی بنیاد یہ تھی' اس قوم کے عقیدے میں یہ بات داخل کر دی گئی کہ نہیں صاحب! یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔اور پھر ہم سے تو وہ اچھے تھے جو یہ کہتے تھے کہ حسنۃ تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے' اچھی باتیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔اس کے برعکس ہماری جتنی چیزیں اچھی ہوتی ہیں' ان کے متعلق تو یہ دکھاتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی کاریگری ہوتی ہے کہ صاحب! اتنا کچھ ملا۔پوچھنے لگے کہ کیا ملا؟ یہ کہ میں نے وہ جو سودا کیا تھا اس پر جب میں نے یوں غور کیا اور وہاں یہ کیا' یہ کیا' یہ کچھ ہوا' جھٹ سے یہ آ گیا صاحب! مقدمہ جیت لیا صاحب! جیت کیوں نہ لیتا صاحب! وکیل کیا تھا تو ایسا کیا تھا' گواہ میں نے توڑے اور جج تک رشوت پہنچائی' یہ سارا کچھ کیا' دستاویز کو جلا دیا' چارسوبیسی کی اور مقدمہ جیت لیا۔اب یہ ساری کاریگری خود کی ہے۔اگر مقدمہ ہار جائے تو کہے ہے کہ جی! اپنی طرف سے تو بہت کچھ کیا تھا' اللہ کو منظور ہی ایسا تھا۔اگر مریض اچھا ہو جائے تو کچھ اپنا کریڈٹ ہے کہ صاحب! بہت دوڑ دھوپ کی' کچھ ڈاکٹر صاحب نے کمال کر دکھایا۔آپ دیکھتے ہیں کہ کس حالت سے یہاں تک آیا۔اگر مر گیا۔پوچھا کہ جی! کیا ہوا؟ کہا کہ اللہ کی مرضی ہے صاحب! موت آ گئی۔

## اللہ کی مرضی کا یہ غلط تصور قوم کو جاہل بنانے کا ایک مؤثر حربہ ہے

میں کہا کرتا ہوں کہ لڑکا پیدا ہو تو بڑی خوشی سے کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے صاحب! میرے گھر لڑکا پیدا ہوا اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو وہ آ جاتی ہے: ''اللہ دی مرضی ایہو ہیگی سی جناب!'' (جناب! اللہ کی مرضی یہی تھی)۔یعنی ہر وہ کام جس کے اندر آپ کو شکست و نامرادی ہوتی ہے یہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ہمارے ایک دوست ہیں۔وہ کہنے لگے کہ اتنے نام تو اللہ کے سنے تھے' یہ عبدالبگاڑ وہم نے نہیں سنا تھا (معاذ اللہ)۔میں کہہ رہا ہوں ہم سے وہ جاہلیت کے کافر اچھے تھے کہ کم از کم حسنات کو تو خدا کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ہم حسنات کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں' پھنے خاں بنے پھرتے ہیں اور جونہی کوئی چیز ہماری مرضی کے خلاف ہوئی' فوراً کہا کہ ''اللہ دی مرضی ایہو سی'' (صاحب! اللہ کی مرضی یہی تھی) یعنی جو کام بگڑتے تو وہ یہ بگاڑتا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ ہم سے تو وہ اچھے تھے کہ وہ وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (4:78) کم بخت اتنا تو کہتے تھے کہ حسنات اللہ کی طرف سے ہیں لیکن عزیزانِ من! ہم تو یہاں تک آ گئے کہ مصیبتوں کو بھی خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔سن رکھیے کہ مَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (42:30) تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہیں' انفرادی غلطیوں کی وجہ سے یا اجتماعی نظام کی وجہ سے۔اسے سن رکھیے کہ مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (4:79) ہر وہ عمل

جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا اس کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار ہوگا اور اس طرح اصول یہ ہے کہ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (4:78) ہر چیز خدا کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے ہوتی ہے۔ بات دور چلی جائے گی ورنہ میں عرض کرتا کہ قرآن مجید نے یہاں جو مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (4:78) کہا ہے اور آگے (4:79) میں "مِن" کہا ہے وہاں "عِنْدِ" (4:78) کہا ہے تو اس میں بھی ایک بڑا عجیب فرق ہے۔ یہ عِنْدِ وہی ہے جسے کہتے ہیں "اس کی طرف سے" اور وہ مِّنْ ہے "اس سے"۔ اس میں یہ ذہن میں رکھیے کہ عِنْدِ سب چیز خدا کے قانون کی رو سے ہے۔ کہا ہے کہ اس کے مطابق چلتے رہو گے تو حسنات ہی حسنات آئیں گی' جونہی دیکھو گے کہ کوئی خرابی واقع ہوئی ہے' کھڑے ہو کر سوچ لو کہ اس کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے کیونکہ یہ تمہارے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد

یہ جو کہتے ہیں کہ اے نبی اکرم ﷺ! تمہاری وجہ سے یہ ساری خرابیاں آتی ہیں' یہ سب کچھ ہوتا ہے تو سنو! وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (4:79) تمہیں تو ایک پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہے' تمہاری طرف سے ان خرابیوں کے آنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (4:79) نگرانی تو صرف خدا کے قانون کی ہے' تم تو نگران بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو تم بھی نہیں روک سکتے۔ قرآن حکیم میں خود نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو اس کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔

## نبی اکرم ﷺ کا فریضہ قرآنی نظام کی تشکیل کرنا تھا مگر اس کے متعلق متواتر سازشیں ہوتی رہی

آؤ' اب تمہیں حسنات کا بتائیں کہ پروگرام کیا ہے۔ کہا ہے کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (4:80) تمہیں پیغامبر بنا کر بھیجا ہے' صرف پیغام رسانی تمہارا فریضہ نہیں ہے' تمہارا فریضہ تو یہ نظام قائم کرنا ہے۔ خدا کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں ہو سکتی کہ اُس نے وہاں نفل پڑھ لیے' اِس نے وہاں نماز پڑھی' اُس نے وہاں یہ کیا' کہہ دیا کہ اطاعت خدا کی ہونے لگ گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ جو نظام بنا رہا ہے اس کی اطاعت کی جائے گی تو خدا کی اطاعت ہوگی' یہ اجتماعی ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (4:80) ہم نے تمہیں داروغہ (Darogah) بنا کر نہیں بھیجا کہ مار مار کر ان سے ان چیزوں کی اطاعت کراؤ۔ اس نظام کی بنیاد اطاعت پہ ہے اور میں نے عرض کیا تھا خود لفظِ اطاعت کے اندر رضامندی شامل ہوتی ہے۔ یہ بطیبِ خاطر کسی چیز کا ماننا ہے' دل کی رضامندی کے ساتھ اس کو ماننا اسلامی نظام کی بنیاد ہے۔ داروغہ (Darogah) بنا کر تمہیں نہیں بھیجا گیا۔ یہ دل کی رضامندی سے نظام کے اندر داخل ہوں۔ عزیزانِ من! اس نظام میں داخل ہونے کے بعد پھر یہ چیز تمہارے اختیار پر نہیں چھوڑ دی کہ

جس حکم کو چاہے مانو' جس کو چاہے نہ مانو' پھر تو سوسائٹی کے تمام قوانین کو ماننا پڑے گا۔ یہ ہے اطاعت لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ** (4:81) اور ایک تو وہ اطاعت ہے جو بہ طیبِ خاطر کی جاتی ہے اور ایک اطاعت اس قسم کی ہے کہ ''وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے' ہم اطاعت کرتے ہیں'' لیکن **فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ** (4:81) جب یہاں سے یہ باتیں سن کر جاتے ہیں' اطاعت کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر وہاں جا کر پھر راتوں کو اپنے خفیہ مشورے کرتے ہیں۔ جو کچھ تُو کہتا ہے' وہ اس کے خلاف باتیں کہتے ہیں اور جی میں سمجھتے ہیں کہ اس کا کسے پتہ چل سکتا ہے؟ حالانکہ **وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ** (4:81) خدا کا قانونِ مکافات ان کی تمام باتوں کا ریکارڈ محفوظ رکھتا ہے

## سیکولر نظامِ حیات کے برعکس قرآنِ حکیم کے فلسفہ کے مطابق مکافاتِ عمل کا تصور

یہاں یہ بات انسانی قانون کی نہیں ہے' انسانی قانون میں تو یہ ہے کہ جو چیز عمل میں آجائے اور اس کی گرفت ہو جائے مثلاً سپاہی پکڑ لے یا اس وقت کوئی شہادتیں بہم پہنچ جائیں تب ہی وہ مجرم قرار پاتا ہے۔ تنہائی میں کبھی آپ کوئی جرم کیجیے' نہ کوئی شاہد' نہ کوئی پکڑنے والا ہو' تو معاشرے کے مروّجہ نظام میں وہ جرم ہی نہیں ہوتا' آپ اس کی سزا ہی نہیں پاتے۔ عزیزانِ من! بس اتنا فرق ہے اس ایمان میں اور انہی قوانین کو دوسرے سیکولر انداز سے نافذ کرنے میں کہ یہاں ایمان یہ ہوتا ہے کہ کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں' پولیس کا سپاہی پکڑنے والا ہے یا نہیں' عدالت سزا دینے والی ہے یا نہیں' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہاں تو یہ ہے کہ میں نے جو اس کی خلاف ورزی کی ہے' اس کا نتیجہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔

عزیزانِ من! میں طبعی قانون کی مثال دیا کرتا ہوں کہ کمرے کی تنہائیوں میں بیٹھے ہوئے بھی اگر آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال دیں تو اس سے آپ کو جو سزا ملتی ہے' اس کے لیے نہ یہ ضروری ہے کہ سپاہی پکڑ کر تھانے لے جائے' نہ یہ کہ اس کے لیے گواہ ہوں' نہ یہ کہ عدالت اس کے لیے کوئی حکم صادر فرمائے کہ ہاں تین مہینے اس انگلی میں ٹیس اٹھتی رہے گی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ عمل کی جزا تو اس کے اندر ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (56:24) وہی عمل اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ وہ سزا ہے جو عدل کے مطابق ہے۔ کسی کو لاکھ روپے رشوت دیدیجیے اور کہیے کہ یہ جو میرا درد ہے' یہ ہٹ جائے' یہ رشوت سے نہیں ہٹے گا۔ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو' حتیٰ کہ ماں اور بیٹے کا بھی تعلق کیوں نہ ہو' یہ جو اس کا درد ہو رہا ہے' ہمدردی تو اس سے کی جا سکتی ہے' درد نہیں لیا جا سکتا۔ باقی رہی سفارش تو اس کے لیے اگر گورنر جنرل کا Certificate (سرٹیفیکیٹ) بھی لے آئے اور انگلی کے ساتھ باندھ دے کہ صاحب! اپنے لیے نہیں' خدا کے لیے میری رعایت سے ہی ذرا اس کا درد کم کرو' یہ کم نہیں ہو سکے گا۔ اس درد کے کم ہونے کا سوال ہی

نہیں۔عدل یہ ہوتا ہے لیکن یہ ظلم نہیں ہے۔اس کے لیے اس نے مداوا تجویز کر دیا ہے' قانون کی خلاف ورزی کی' آگ میں انگلی دی' قانون یہ ہے کہ (مثلاً) برنال لگا دیجئے' آرام ہوتا ہے۔قانون شکنی کے بعد قانون کی طرف آیئے' پھر تو اس کا مداوا ہو سکے گا۔قانون شکنی کے بعد رشوتیں اور سفارشیں' اور یہ چیزیں لانے سے' قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

## توبہ کے سلسلہ میں بھی انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے جبکہ انسان کا نفس ہی اس کا کاتب ہوتا ہے

جسے توبہ کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ''قانون توڑا' سزا ملی' پھر قانون کی طرف آ جاؤ' اس کا مداوا ہو جائے گا''۔توبہ میں بھی چار لفظ دہرانے کے معنی نہیں ہیں' جس طرح قانون شکنی کچھ کرنے کا کام ہے' توبہ بھی کچھ کرنے کی بات ہے۔توبہ کے معنی یہ ہیں کہ جہاں سے تم نے راستہ بھولا تھا یا دوسری طرف قدم اٹھایا تھا' اسی چوراہے پر دوبارہ لوٹ کر آ جاؤ' وہاں لوٹ کر آنا۔اور آ کر کھڑے ہو جانے سے بات نہیں بنتی۔کہا ہے کہ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ (6:54) اسی چوراہے پر دوبارہ لوٹ کر آ ؤ اور پھر سیدھے راستے پہ چل پڑو۔تمہارا مداوا ہو جائے گا۔اس میں کسی کا بھی جو داروغہ (Darogah) ہونا ہے' یہ کام نہیں دیتا کہ وہ تمہارے سامنے کہے کہ صاحب! ہم تمہاری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے بعد تمہارے خلاف مشورے کرنے لگ جائیں۔کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ يَكۡتُبُ مَا يُبَيِّتُوۡنَ (4:81) جو کچھ تم خفیہ مشورے کرتے ہو' اللہ ان کو لکھتا رہتا ہے۔

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے قانونِ مکافاتِ عمل میں کون لکھتا ہے' اس کے لیے کون سے کاتب ہوتے ہیں؟ یہ سمجھانے کی بات ہے۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہارا نفس خود تمہارا کاتب ہے' یہی تمہارا اعمال نامہ ہے' اب لپٹا ہوا ہے' پھر کھل کر سامنے آ جائے گا۔اس لیے فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ (4:81) اس قسم کی جو ذہنیت رکھنے والے ہیں' ان سے اعراض برتو۔اعراض کی بات میں پہلے کہہ چکا ہوں۔اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ خداوندی ان تک پہنچاؤ ہی نہیں۔کہا ہے کہ وہ تو پہنچاتے رہو' تمہاری جماعت میں یہ نہیں رہے ہیں تو کوئی بات نہیں' یہ نہیں کہ ان کے ووٹ کم ہو گئے تو ممبر نہیں بن سکو گے۔اس کے باوجود ان کو ساتھ رکھنا پڑتا ہے' بلی اپنی گھات میں ہوتی ہے چوہا اپنی گھات میں ہوتا ہے' دونوں منافق ہوتے ہیں لیکن ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔کہتا ہے کہ تمہیں اس کی پروا نہیں کہ الگ ہوتے ہیں تم تو وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ (4:81) رکھو' خدا کا قانون بڑی قوت رکھتا ہے' اس کے ساتھ رہو وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا (4:81) توکل کے بعد اب آپ وکیلا دیکھتے ہیں' قابلِ اعتماد قانون اسی کا ہے' اس کے قانون کے ساتھ وابستہ رہو' ان کا چلے جانا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عزیزانِ من! اب میں یہ درس دو وجہ سے دس منٹ پہلے ختم کر رہا ہوں۔ایک تو یہ ہے کہ مجھے ضروری اعلان کرنا ہے اور دوسرا یہ ہے

کہ آگے ایک اور آیت آ رہی ہے اور بڑی اہم آیت ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے' کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔اور مسلمانوں کا کوئی بھی ایسا فرقہ نہیں ہے جس نے اس قرآن کریم سے انحراف برتا ہو یا کہہ دیا ہو کہ میں نے انکار کیا۔اس قرآن کریم پہ کہنے کو اقرار ہے لیکن درحقیقت ان کے نزدیک اس میں بہتّر ہزار اختلافات موجود ہیں:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ قرآن کریم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ کسی کی ایک بات دوسرے کے ساتھ نہیں ملتی جبکہ دعویٰ ہر ایک کا یہ ہے کہ ہم کتاب اللہ کے مطابق عمل کر رہے ہیں' یہ کیا تماشا ہے۔آگے یہ آیت آئے گی اسی لیے میں نے کہا ہے کہ آج اس کو چھوڑ دیتا ہوں کہ بات لمبی چلی جائے گی' اس کو ہم آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی آیت 81 تک آئے' 82 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# انیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیت82)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1970ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 82ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:82)۔

## قرآنِ حکیم کے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت کا انداز کیا ہوگا؟

سابقہ اتوار کو طلوعِ اسلام کنونشن ❶ کی وجہ سے مسلسل درس نہیں ہو سکا تھا۔ وہ آیہ جلیلہ جو اس وقت زیرِ نظر ہے' دین کے نظام کے اعتبار سے بڑی ہی بنیادی اور اساسی ہے۔ اس میں قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل دی گئی ہے' ثبوت پیش کیا گیا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دین کا سارا نظام اس محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ قرآن حکیم کسی انسان کی تصنیف نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوا ہے' یہ کتاب اللہ ہے۔ اب یہ جو سوال ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے تو اس کے لیے دلائل کی بھی ضرورت ہے' جو اس پر ایمان لے آتے ہیں وہ تو اسے مانتے ہیں لیکن جب آپ اسے باقی دنیا کے سامنے پیش کریں گے تو وہ اس کے لیے دلیل مانگیں گے' ثبوت مانگیں گے۔ اور بات یہ بڑی غیر محسوس' غیر مرئی سی ہے' اگر یہ کہا جائے کہ یہ فلاں انسان کی تصنیف نہیں ہے' اس کے بجائے دوسرا شخص اس کا مصنف ہے تو یہ چیز تحقیق کی جا سکتی ہے کہ اس کا مصنف فلاں انسان ہے یا دوسرا انسان ہے لیکن جب یہ کہا جائے کہ یہ کسی انسان کی تصنیف ہی نہیں اور جو اس کا مصنف بتایا جائے' اس سے نہ کوئی پوچھ سکے' نہ وہ خود آ کر بتا سکے کہ واقعی یہ میری کتاب ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس قسم کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے بالکل دوسرا انداز اپنانا ہوگا۔

## اگر قرآنِ حکیم کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں یقیناً تضاد ہوتا

یہ ثبوت تو خود اس کتاب کی تعلیم سے ہی بہم پہنچایا جا سکتا ہے اس کے لیے دلائل اور ثبوت بہت سے ہیں لیکن قرآنِ کریم نے اس مقام پہ جو ایک دلیل دی ہے' وہ بڑی ہی بنیادی اور اساسی ہے' جسے اس نے حتمی اور یقینی طور پر تحدی کے ساتھ' دعوے کے ساتھ' کہا ہے کہ کیا یہ لوگ قرآن حکیم میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا' کسی اور کی کتاب ہوتی' تو اس میں بہت

---

❶ بزمِ مذاکرہ طلوعِ اسلام کنونشن' منعقدہ اکتوبر 1970۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو: طلوعِ اسلامی جنوری 1971ء' ص ص۔ 57 تا 76۔

سے اختلافات پائے جاتے۔ گویا قرآن حکیم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی بات اختلافی نہیں ہے۔ اختلاف کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ خدا واحد ہے' دوسرے مقام پہ لکھا ہوا ہو کہ نہیں' خدا تین ہیں۔ اس قسم کے اختلاف کا تو سوال ہی نہیں ہے اور پھر اس قسم کی چیز کہ کوئی اچھا مصنف بھی ہو' اس کی کتاب میں بھی یہ بات نہیں ہوتی۔ ایک کتاب میں تو ایک طرف رہا' اگر کسی مصنف کی زندگی میں اس کی مختلف کتابوں میں' کہیں بھی' جو کچھ اس نے ایک جگہ کہا ہے' اس سے متضاد بات کسی دوسری جگہ نظر آئے تو وہ مصنف ہی Condemn (مطرود) ہو جاتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا ہے کہ ایک جگہ یہ کہتا ہے' دوسرے مقام پہ یہ کہتا ہے۔ اور اگر کہیں ایسی بات ہوئی ہے تو اس کے لیے اس کو معذرت کرنا پڑتی ہے۔ یہ اس قسم کا جو اختلاف ہے وہ تو انسانوں کی اچھی تصانیف میں بھی نہیں ہوتا۔

## غور وفکر کے عربی لفظ کے علاوہ تدبر زیادہ پُرمعنی ہے

قرآنِ کریم میں جو کہا گیا ہے کہ اس کے اندر اختلاف نہیں' یہ اس سے زیادہ غور طلب چیز ہے' معنی خیز چیز ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو لفظ قرآن کریم نے یَتَدَبَّرُوْنَ کہا ہے' تدبر کہا ہے' وہ راز اس کے اندر پنہاں ہے کہ وہ اس میں بات کہتا گیا ہے۔ عام طور پہ تو یہ لفظ غور وفکر کے معنی میں ہی آئے گا لیکن غور بھی عربی زبان کا لفظ ہے' فکر بھی عربی زبان کا لفظ ہے' یہاں تدبر کہا گیا ہے۔ تدبر کا مادہ ''د ب ر'' - دبر - ہے۔ دبر کے معنی ہوتا ہے پیٹھ' جانور کا جو آخری حصہ ہوتا ہے اسے ''دبر'' کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کسی پروگرام کے انجام کو' اس کے نتائج کو' بھی اس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تدبیر کے معنی ہوتے ہیں ''کسی بات کے آخری مقام کو سامنے رکھ کر اس کے لیے کوئی پروگرام وضع کرنا' نتائج اور انجام اور عواقب کو پیشِ نظر رکھنا' کسی تعلیم کو اس کے نتائج کے اعتبار سے دیکھنا کہ اس کے اندر اختلاف نہ ہو جائے''۔ اب یہ بڑی اہم بات ہوگئی۔ پہلے تو یہ جو غور وفکر ہے' اس کا طریقہ یہ ہوگا۔ دبر کے معنی ''پیچھے پیچھے چلنے'' کے ہوتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس پہ غور وفکر کرنے والے کو قرآنِ کریم کے پیچھے (Follow) چلنا ہوگا۔ قرآن کریم سے آگے نہیں چلنا ہوگا کہ قرآن کو اپنے پیچھے یوں لگالے کہ پہلے سے ذہن میں جو ایک خیال ہے' وہ جما لے اور پھر یہ ڈھونڈنا شروع کردے کہ اس کی تائید قرآن کریم میں سے کہاں سے ہوتی ہے۔ یہ تو قرآن کو پیچھے لگانے کی بات ہوگئی۔

قرآن مجید میں غور وفکر کا جو طریقہ ہے' وہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلے' یہ دیکھتا چلا جائے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اور پھر غور وفکر کرے۔ قرآن حمید میں غور وفکر کی تاکید تو اس کے ایک ایک صفحے میں آپ کو ملے گی کہ اس میں غور وفکر کرے اور یہ بھی کہ اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ قرآنِ حکیم جو تعلیم پیش کرتا ہے' اس تعلیم کے نتائج کے اعتبار سے اختلاف نہیں رہیں گے۔ وہ نتائج

ایسے پیش کرے گا کہ جن میں متضاد باتیں نہیں ہونگی' اُن میں اختلافی بات نہیں ہوگی' ان میں نتائج کے اعتبار سے وحدت ہوگی۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے جو قرآن حمید نے کہی ہے اور یہ اتنی اہم چیز ہے کہ دوسرے مقام پہ اس نے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا ہے کہ اگر اس طرح سے تدبر نہ کیا جائے یا اس طرح سے قرآن میں غور وفکر نہ کیا جائے تو اس کے عواقب قلب ونگاہ کو مقفل کر دیتے ہیں۔ اس لیے غور کیجیے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن حمید اس چیز کو کیا کہتا ہے؟ قرآنِ کریم کے یہی الفاظ دوسرے مقام پہ ہیں۔ کہا ہے کہ **اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ** (47:24) کیا انہوں نے قرآنِ کریم میں تدبر نہیں کیا؟ یا یہ قرآنِ کریم میں تدبر نہیں کرتے؟ **اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا** (47:24) کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟

## تدبر سے کام نہ لینے پر انسان اپنے دلوں پہ خود تالے لگا لیتا ہے

عزیزانِ من! ضمناً یہاں بڑی دلچسپ چیز یہ **اَقْفَالُهَا** (47:24) ہے کہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ تالا دل کے اوپر کہیں باہر سے آ کر نہیں پڑتا' خود دل ہی اپنا تالا آپ بند کر دیتا ہے۔ جو دل سمجھنا سوچنا چھوڑ دیتا ہے' اس پہ کہیں باہر سے آ کر تالا نہیں پڑتا۔ یہ ایسے ہی سمجھیے کہ جیسے کوئی شخص گھر کے اندر بیٹھا ہوا' اندر سے دروازے کی' کواڑ کی' زنجیر لگا لے اور اس کے بعد رونا شروع کر دے کہ میں باہر کیسے نکلوں' دروازہ بند ہے حالانکہ دروازے کو' کواڑ کو اندر سے اس نے زنجیر لگا رکھی ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن حمید نے کہی ہے۔ کیا بات ہے صاحب! قرآن کی! چلتے چلتے ایک بات کہہ جاتا ہے۔ **اَقْفَالُهَا** کے اندر یہ کتنی عجیب چیز سامنے آئی کہ یہ دلوں کے اپنے ہی تالے ہیں' جو دلوں پر پڑے ہوئے ہیں اور یہ کسی باہر والے کے بس کی بات نہیں کہ وہ آ کر اس کا تالا کھولے' اس نے خود ہی وہ تالا ڈال رکھا ہے' اس کو خود ہی وہ تالا کھولنا پڑے گا۔ تالا کھولے گا تو شاید کشاد پیدا ہو جائے گی۔ تدبر نہ کرنے سے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تالا پڑ جاتا ہے۔ سائیکولوجی کے جاننے والے اس حقیقت کو Appreciate (پسند) کریں گے کہ قرآن مجید نے کیا کہا ہے۔ عدمِ تدبر سے' خود تدبر کرنے کی صلاحیتیں' پہلے شل ہو جاتی ہیں پھر مفلوج ہو جاتی ہیں' پھر مسلوب ہو جاتی ہیں' پھر ختم ہو جاتی ہیں۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں بھی یہی کہا ہے کہ کیا یہ لوگ قرآن حکیم میں غور وفکر اور تدبر نہیں کرتے' کیا ان لوگوں کے دلوں نے اپنے تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں؟ اور اس کے آگے ہے کہ **اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَی الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰی لَهُمْ** (47:25) یہ لوگ جو اس طرح سے قرآنی رہنمائی کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد اس سے یوں پھر جائیں تو اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے جذبات انہیں ان کی مفاد پرستیوں کو بڑا خوشنما بنا کر دکھاتے ہیں اور انہیں طرح

طرح کی فریب انگیز امیدیں دلاتے ہیں۔ یوں یہ لوگ' اپنے انفرادی مفادِ عاجلہ کونوعِ انسانی کے مفادِ کلی پر ترجیح دے کر قرآن مبین کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ جسے آپ ارتداد کہتے ہیں وہ یہی ہے یعنی دین سے پھر جانا' مرتد ہو جانا' یہ لوگ اپنی پیٹھ پیچھے پھر جاتے ہیں۔اور یہیں سے آپ کے ہاں لفظِ مرتد ہے۔

## قرآنِ حکیم پر تدبر قرآنِ حکیم کے اصولوں کے مطابق کرنا ہوتا ہے ورنہ فرقے جنم لیتے ہیں

قرآن حکیم میں تدبر نہ کرنا یا تدبر کے بعد' اس نتیجے پر عملاً نہ پہنچنا کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہوگی' یہ ارتداد ہے۔ لفظ مرتد تو آپ نے سنا ہوگا جس کی سزا ان کے ہاں قتل ہوتی ہے' کیا کبھی انہوں نے غور کیا کہ قرآن مجید نے کہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے؟ اُس مقام پر تدبر کرنا یا اس طرح سے تدبر کرنا کہ اس کے نتیجے میں اتنے اختلافات پیدا ہوں' یہ قرآن مجید کی رو سے ارتداد ہے' ایسی قوم مرتد ہے۔اب اس حقیقت کو سامنے لائیے کہ قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر کوئی اختلاف رونما نہیں ہوگا۔اور عملاً اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو کتاب وسنت کا متبع بھی کہتی ہے' کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے مگر اختلافات کی جو کیفیت ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ سوچنے کی بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن حمید نے تدبر کے نتیجے کے اعتبار سے بتایا تھا' کہ اختلاف پیدا ہی نہیں ہونگے۔آج قرآن حمید پر عمل کرنے کی مدعی قوم کا عملی نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ اس کے اندر یہ جتنے فرقے ہیں ان فرقوں میں اختلافات ہیں۔ یہ تمام آپ کے سامنے ہیں۔

## قرآنِ حکیم پر عملاً تدبر کرنے کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نکلے گا یہی تو فطرت کا قانونِ یکسانیّت ہے

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم تو یہ کہتا ہے کہ جب تم عملاً اس قرآن پر اس طرح سے غور وفکر کرو گے تو تم دیکھو گے کہ اس کا نتیجہ وحدت ہوگی۔ایک قانون' ایک فارمولا' جو اگر صحیح ہے تو ایک شخص افریقہ کے صحراؤں میں اس پر عمل کرے' دوسرا شخص ہمالیہ کی چوٹیوں پر کرے' تیسرا سمندر کی تہ میں جا کر کرے' یورپ میں کرے' ایشیا میں کرے' کالے رنگ والا کرے' سفید رنگت والا کرے' کوئی قوم کرے اگر وہ فارمولا صحیح ہے' تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔اسے سائنس کی اصطلاح میں Law of Uniformity of Nature (فطرت کا یکساں قانون) کہتے ہیں۔یعنی Uniform Law (یکساں قانون) وہ ہوتا ہے کہ جب اور جہاں بھی کوئی قوم اس Law (قانون) پہ عمل کرے گی تو اس قانون کا نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔ مثلاً قانون یہ ہے کہ سمندر کی سطح کے برابر اگر پانی آگ پہ رکھا جائے تو وہ سو درجے سنٹی گریڈ پہ پہنچنے پر Boil (ابلنا) شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قانون ہے' دنیا میں کہیں بھی اس پر عمل کیجیے' اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔

قانون یہ ہے کہ گندم سے گندم اُگے گی' کہیں اس کو بو کر دیکھیے اس کا نتیجہ ایک ہی جیسا نکلے گا۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے ہیں۔ ان کے خدا کی طرف سے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے جو دعویٰ کیا ہے کہ ایسا کرنے سے ایسا ہوگا' جب جہاں جس کا جی چاہے' ویسے کر کے دیکھ لے' اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔ اسے کہتے ہیں کہ اختلاف نہیں ہے۔ تدبر کے معنی یہ ہیں کہ جب اس پہ عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ ہر جگہ ایک ہی نکلے گا۔ قرآن کریم عجیب لفظ استعمال کر گیا ہے۔ Laws of Nature (قوانینِ فطرت) جو ہیں' یہ خدا کے قوانین ہیں اور روز ان کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ یہ آپ کی ساری کائنات اس عظیم حقیقت پر چل رہی ہے کہ جسے قانون کہا جاتا ہے' قانون میں Nature (فطرت) کی جو Uniformity (یکسانیت) ہے' وہ ہر مقام پہ اپنا نتیجہ وہی دیتی ہے' اس کے نتیجے میں کبھی فرق نہیں ہوتا۔ اگر یہ ہونے لگ جائے کہ یہاں اس دفعہ گندم بویا ہے تو اس میں سے گندم پیدا ہو' اگلے سال بویا ہے تو اس میں سے جو پیدا ہو جائے' یہاں بویا جائے تو اس میں سے جَو پیدا ہوں' وہاں بویا جائے تو اس میں سے چنے پیدا ہونے شروع ہو جائیں۔ آگ جل رہی ہے' پانی رکھا ہوا ہے' یہاں وہ ابلنے لگ جائے' وہاں وہ یخ بستہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ایک دن کاروبار نہیں چل سکتا۔ ان قوانین کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے' اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے نتائج میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ لَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا** (4:82) اگر یہ قوانین خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتے تو ان کے نتائج میں کثیر اختلاف ہوتا۔ قرآن حمید کے لیے بھی اس نے یہی دلیل دی ہے کہ قوانینِ فطرت کی طرح اس کی بھی یہ کیفیت ہوگی کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے' جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا' اس کا نتیجہ ایک نکلے گا' اس کا نتیجہ وحدت ہوگا' اختلاف نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی کھیت کے اندر آپ سارے گیہوں کے بیج ڈالیں اور ایک کنال میں تو گیہوں اُگے' دوسرے میں جَو آ جائے' تیسرے میں چنا آ جائے' چوتھے میں باجرا نکل آئے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے بعد غور کیجیے کہ قرآن حمید کا دعویٰ یہ ہے۔ اب جو قرآن کو مانتے ہی نہیں ہیں اس پہ وہ عمل کرنے کے مدعی ہی نہیں' ان کو تو چھوڑ دیجیے۔ جو قوم مدعی ہے' اپنی نسبت قرآن حکیم سے کرتی ہے' اپنے آپ کو کہتی ہے کہ ہم قرآن حکیم کے متبع ہیں اور اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ ایک کا طریق دوسرے سے نہ ملے' فکر دوسرے سے نہ ملے' عقیدہ دوسرے سے نہ ملے' ان کے اندر اس قدر اختلاف ہوں تو عزیزانِ من! غور کیجیے کہ اس سے ایک غیر مسلم کس نتیجے پہ پہنچے گا۔ اگر ان کا دعویٰ صحیح ہے کہ یہ سب قرآن حکیم پہ عمل کرتے ہیں اور اس کے باوجود اختلاف کی کیفیت یہ ہے کہ اتنا سخت اختلاف ہے' اس اختلاف کی اتنی گرہیں بندھی ہوئی ہیں کہ آپ کے ہاں روز سر پھٹول ہوتا ہے' مقدمے بازیاں ہوتی ہیں' آپ کے ہاں جنگیں ہوئی ہیں' آپ کی تاریخ کے اندر قتل و غارت گری ہوئی ہے' سینکڑوں برس تک ایک ایک عقیدے پر' ایک دوسرے کی گردنیں ماری گئی ہیں' یہ اس قدر شدید اختلافات موجود ہیں' تو اب صورت یہی ہے کہ اگر ان کے یہ دعوے صحیح ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کے

مطابق عمل کرتے ہیں اور نتیجہ یہ اختلاف ہے تو (معاذ اللہ) قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ بات سیدھی سی ہے' اس کے سمجھنے کی بات کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس پر عمل کرو تو نتیجتاً وحدت پیدا ہوگی۔ ایک قوم اس کی مدعی ہے کہ ہم اس پہ عمل کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ اس قدر اختلافات ہیں تو یہی کہیں گے کہ اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ یہ قرآنِ کریم پہ عمل کر رہے ہیں تو قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہے۔ ساری دنیا یہ کہے گی۔ اور اگر اسے صحیح مانا جائے کہ قرآنِ کریم کا دعویٰ تو صحیح ہے تو دوسری چیز پھر یہ ماننی پڑے گی کہ اس قوم کا قرآنِ کریم پہ عمل ہی نہیں ہے۔ اب جو جی میں آئے' آپ اس کو مان لیجیے' اور پھر ان آیات کا ان سے پوچھیے۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم اور اس کے نتائج میں شرک نام کی کوئی شے نہیں ہے

عزیزانِ من! یہ آیات کبھی آپ کے سامنے نہیں لائی جائیں گی' یہ لوگ کبھی ان پہ گفتگو نہیں کریں گے۔ یہ بڑی ہی غور سے سمجھنے کی باتیں آ رہی ہیں' بڑی اساسی اور بنیادی چیزیں ہیں جو قرآنِ حکیم کہہ گیا ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے قوانینِ فطرت میں وحدت ہے' میں نے ابھی آپ کو مثال دی ہے کہ Laws of Nature (قوانینِ فطرت) میں جب آپ دیکھنا چاہیں تو وہاں آپ کو نتیجے کے اعتبار سے وحدت ملے گی۔ اگر ایک جیسا بیج ہے تو ایک ہی جیسی فصل اگنی چاہیے' اس میں وہی پیدا ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ چیز ہو جائے کہ ایک قانون پہ ایک شخص عمل کر رہا ہے' اس کا نتیجہ کچھ نکل رہا ہے' اسی قانون پر دوسرا شخص عمل کر رہا ہے اسکا نتیجہ کچھ اور نکل رہا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ وہ قوانین کسی ایک کے دیئے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ کسی ایک کے قانون پہ عمل کر رہا ہے' یہ کسی دوسرے کے قانون پہ عمل کر رہا ہے۔ اسے قرآن مبین کی اصطلاح میں شرک کہتے ہیں یعنی ایک کا قانون نہیں بلکہ دوسروں کے مختلف قسم کے قوانین۔

## امتِ واحدہ کا تصور مشرکین کے لیے زہرِ قاتل ہے

اب آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے جب دین دیا ہے تو یہ دین حضرت نوحؑ سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک اصولی طریقے سے' قانون کے اعتبار سے' ایک ہی تھا یعنی قوانین ہر رسول کو وہی دیئے گئے۔ ان قوانین کے متعلق یہ کہا ہے کہ **شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:13) اس نے جو نظامِ زندگی تمہارے لیے تجویز کیا ہے وہی ہے جسے اس نے نوحؑ' ابراہیمؑ' موسیٰؑ' عیسیٰؑ اور دیگر انبیا کی طرف وحی کیا تھا۔ (یہاں حضرت نوحؑ سے لے کر انبیائے کرامؑ گنا دیئے کہ ہم نے ہر ایک کو یہی دین دیا اور ان سے یہ کہا کہ) اس دین کے مطابق عمل کرنا' اس نظام کو عملاً قائم کرنا اور تفرقہ پیدا نہ کرنا۔ یہ ایک بات کہی۔ اور آگے کہا ہے کہ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ** (42:13) لیکن یہ جو عوت ہے' یہ جو بات ہے کہ مختلف نتائج برآمد نہ ہوں' بلکہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہو' انسانیت کے

اندر وحدت پیدا ہو جائے' انسانیت کے اختلافات مٹ جائیں' تو کہا ہے کہ مشرکین کو یہ بات بڑی ناگوار گزرے گی۔

وہاں (47:25) میں عدمِ تدبر کو ارتداد کہا' مرتد ہو جانا کہا' یہاں (42:13) میں ان لوگوں کو جو نتیجے کے اعتبار سے وحدت نہیں' اختلاف چاہتے ہیں' ان کے اوپر اڑے رہیں' قرآن کریم ان کو بھی مشرکین کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ بات مشرکین پر بڑی ہی گراں گزرے گی کہ وحدت پیدا ہو جائے۔ یہی چیز تھی جو حضور نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے خود آپ کے متبعین کو کہلائی گئی' اُن سے کہا گیا کہ **وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:13)۔ دیکھیے! وہی الفاظ ہیں' وہاں بھی یہی کہا تھا کہ ہر نبی نے' ہر رسول نے' وہی دین پیش کیا جس کا نتیجہ وحدتِ انسانیت تھا' انسانوں کے اختلافات کو مٹا کر ان میں وحدت قائم کرنا تھا لیکن یہ بات مشرکین پر بڑی ہی گراں گزرتی ہے۔

## پوری انسانیت کو ایک مرکز پر صرف ایک ضابطۂ حیات ہی جمع کر سکتا ہے

یہاں انہیں کہا گیا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) دیکھنا وحدت پر ایمان لانے کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا یعنی **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** (30:32) ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا' فرقے پیدا کر دیئے **وَ كَانُوْا شِيَعًا** (30:32) اور خود ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ اور **كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) پھر اس کے بعد یہ نہیں کیا کہ بیٹھ کر تدبر کریں کہ صاحب! اگر قانون ایک ہی تھا اور اس پر عمل بھی صحیح طریقے پر ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کیا ہے تو اس کا نتیجہ ایک کیوں نہیں نکل رہا۔ پھر اس پہ بیٹھ کر تدبر نہیں کیا بلکہ یہ کیا کہ ہر شخص نے' برآمد ہونے والے نتیجے سے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ یہ نتیجہ صحیح ہے' اُس کا نتیجہ غلط ہے حالانکہ وہ کہتا یہ ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ تھی کہ اس کا بھی وہی نتیجہ نکلتا اور اُس کا بھی وہی نتیجہ نکلتا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو چیز کہی تو اس کے بعد ہر ایک مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ میرا نتیجہ صحیح ہے' اس کا غلط ہے۔ یہ ہے شرک' یہ ہے عدمِ تدبر۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر دو مختلف نتیجے نکلے تھے تو ان دونوں کو مل کر بیٹھنا چاہیے تھا کہ ہم میں سے ایک کا دعویٰ غلط ہے' ہو سکتا ہے کہ دونوں کے ہی غلط ہوں' نتیجہ کوئی تیسرا ہی نکلنا تھا' اس وقت تدبر کرنے کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک تدبر کرنے کی ضرورت تھی جب تک ان سب کے نتائج ایک نہ ہو جائیں۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا کہ ہر ایک اپنی جگہ بزعمِ خویش یہ کہے کہ میں قرآن حمید پہ عمل کر رہا ہوں' نتائج کے اعتبار سے آپ کے بہتر ہزار فرقے بنتے چلے جائیں اور ہر ایک مطمئن ہو جائے کہ میرا نتیجہ تو صحیح ہے' باقیوں کا نتیجہ غلط ہے۔ میں کسی دوسرے وقت اس موضوع کو لونگا۔

## نبی اکرم ﷺ کے پروگرام میں اختلافات پیدا کرنے کا عملی نتیجہ

عزیزانِ من! قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یاد رکھو! قرآن مبین کا جو منتہا ہے' وہ پوری عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل ہے' پورے نوعِ انسانی کو ایک برادری کے اندر منسلک کرنا ہے' یہ تو اس کے لیے خمیر تھا جو تیار کیا گیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے جس امت کی تشکیل کی' وہ ایک چھوٹے پیمانے پر عملاً کر کے دکھایا تھا کہ کس طرح سے وطن' زبان' رنگ' نسل' خون' ان تمام اختلافات کے باوجود ایمان کی بنیادوں پر ایک امت کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ یعنی قرآنِ حکیم کو ماننے کے بعد آپس کے اختلافات اس طرح سے مٹ جاتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے پیمانے پر' ایک لیبارٹری کے اندر' اس قانون پر تجربہ کر کے بتایا تھا اور مقصد اس کا یہ تھا کہ یہ جو خمیر تیار کیا ہے اس کو جس آٹے میں بھی جا کر ملایا جائے وہ آٹا خود خمیر ہو جاتا ہے۔ تبلیغِ نبویؐ کا یہ پروسیس ہوتا ہے' یہ طریق ہوتا ہے کہ وہ ایک جگہ' ایک مقام پر' ایک لیبارٹری میں' ان چیزوں پر عمل کر کے نتیجہ دکھا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ کہتے ہیں کہ اس کو پھیلاتے چلے جائیے' عام کرتے چلے جائیے تا آنکہ پوری دنیا کے اندر آپ کا یہ نظام رائج ہو جائے۔ یہ تھا دین کا مقصود۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ اختلافات مٹاتا چلا جائے گا۔

قرآن کریم نے اختلافات کے متعلق متعدد مقامات پر یہ چیز کہی ہے کہ اختلافات خدا کا عذاب ہیں۔ اور کہا ہے کہ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا (3:105) دیکھنا اے جماعتِ مومنین! اے مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے پیدا کر لیے' وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) اختلاف پیدا کر لیا' مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (3:105) قرآن کریم آ جانے کے بعد' خدا کی طرف سے تعلیم آ جانے کے بعد' اختلاف پیدا کر لیے۔ جب یہ تعلیم نہیں تھی تو اختلافات ہو سکتے تھے لیکن اس تعلیم کے آ جانے کے بعد' جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے اختلافات مٹ جاتے ہیں' اس کے بعد بھی اگر اختلافات پیدا ہوتے ہیں' تو کہا کہ یہ تو اس دین کا اتباع ہی نہیں ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105) یہ ہیں وہ لوگ جن پہ عذابِ عظیم آئے گا۔ غور فرما رہے ہیں آپ کہ عذابِ عظیم کہا ہے۔ یہ جو تفرقہ پیدا کرنا ہے' اگلی آیت میں کہا کہ آپ کے سامنے یہ نتیجہ آ جائے گا' اس وقت جب آپ دیکھیں گے کہ اسی گروہ میں سے بعض لوگ وہ ہونگے جن کے چہرے نورانی تھے اور بعض وہ جن کے اوپر روسیاہی کی کالک ملی ہوئی ہوگی۔ کہا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ (3:106) جن کے چہروں کے اوپر ذلت اور مسکنت کی سیاہی ملی ہوئی ہوگی' جن کے اوپر عذاب آیا ہوا ہوگا' ان سے یہ کہا جائے گا۔ سنیے! عزیزانِ من! قرآن کریم آ جانے کے بعد اختلاف کو قرآنِ کریم کن الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106) تم وہ روسیاہ ہو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر

اختیار کر لیا تھا۔ یہی تو ارتداد ہے۔

## قرآنِ حکیم کے پیش کردہ امتِ واحدہ کے نظام میں تفریق پیدا کرنے والوں کا انجام

عزیزانِ من! ذرا غور کیجیے' قرآن حکیم کیا کہہ رہا ہے کہ یہ جنہوں نے اختلاف پیدا کیا' فرقے پیدا کر لیے' ان کے چہروں پر لعنت کی کالک مل گئی' وہ لوگ روسیاہ ہو گئے۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا تھا۔ قرآنِ حکیم ملت میں اختلاف کو' تفرقے کو' فرقہ بندی کو' شرک قرار دیتا ہے' کہیں اسے کفر قرار دیتا ہے' کہیں اسے ارتداد قرار دے رہا ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا تو فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (3:106) اس کفر کے نتیجے میں اس عذاب کا مزہ چکھو۔ خدا کی طرف سے تعلیمِ بینات آ جانے کے بعد' کفر کے اس نتیجے کا مزہ چکھو۔ وہ امت کہ جو اس پہ عمل کرنے کی مدعی ہو اس میں فرقے اور اختلاف کے وجود کو قرآنِ مجید شرک کہتا ہے' ارتداد کہتا ہے' موجبِ عذاب کہتا ہے اور کہتا ہے کہ پھر ٹھیک ہے مزہ چکھو اس عذاب کا جس میں تم مبتلا ہو۔ قرآنِ کریم نے اپنے متعلق یہی نہیں کہا ہے کہ تم دیکھو گے کہ اس میں اختلاف نہیں بلکہ یہ کہا ہے کہ اس میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ لوگوں میں جو اختلافات ہیں' یہ ان کو مٹا دے۔

## قرآنی تعلیم کی خصوصیت حقائق کو نکھار کر پیش کرنا ہے' جب کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (16:64) یہ ہم نے نازل ہی اس لیے کیا ہے کہ اے رسول! جب تُو اس کو واضح کر دے تو اس کے بعد جن معاملات میں لوگ اختلاف کرتے ہیں' وہ معاملات ان پر بالکل صاف اور Clear (عیاں) ہو کر سامنے آ جائیں اور اختلافات مٹ جائیں۔ ذرا اس Construction (ترکیب) پہ غور کیجیے گا کہ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ (16:64) یعنی اسے نازل ہی اس لیے کیا گیا ہے' اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہر اختلافی معاملے کو صاف کر کے' نکھار کر' ابھار کر' تمہارے سامنے لے آئے۔ لتبیــن کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کو ابھار کر سامنے لے آنا''۔ یہ صرف وضاحت ہی نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ یہ اختلافی معاملات کو ابھار کر لے آئے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ اگر کسی معاملے کے اندر اختلاف پیدا ہو جائے' ٹھیک ہے متعدد اسباب ہوتے ہیں جن میں Differences (اختلافات) پیدا ہوتے ہیں' تو اس کے لیے طریقہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَىْءٍ (42:10) جب کبھی کسی معاملے میں تمہیں باہمی اختلاف ہو جائے' تو فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (42:10) خدا کی کتاب سے اس کا فیصلہ لے لیا کرو۔ آپ سوچیے تو سہی اختلاف کے مٹانے کے لیے عملاً شکل یہ بتائی کہ اس سے فیصلہ لے لیا کرو۔ اور اگر ہمارا دعویٰ یہ ہو کہ

صاحب! ٹھیک ہے' ہر ایک نے اس سے فیصلہ لیا تھا۔ اب یا تو اس نے یہ فیصلہ یوں دیا کہ سنّی کو سنّیوں میں سے دیا' حنفی کو یہ دیا' مالکی کو یہ دیا' حنبلی کو یہ دیا' شافعی کو یہ دیا' دیوبندی کو یہ دیا' بریلوی کو یہ دیا' تو ایک ہی جگہ سے فیصلے لیے گئے اور یہ فیصلے الگ الگ دیتا چلا گیا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

## قرآن حکیم کی طرف سے ہم نے ہزار سال سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں' کتاب اللہ کی طرف نہیں آتے

عزیزانِ من! جرأت کر کے یا تو ماننا پڑے گا کہ یہ جو سارے دعاوی ہیں (معاذ اللہ) سب غلط اور باطل ہیں یا ماننا پڑے گا کہ وہ دعویٰ باطل ہے کہ ہم نے قرآنِ حکیم سے فیصلہ لیا ہے۔ اب جو آپ کے جی میں آئے مان لیجیے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے کچھ نہیں بنتا' ہزار بارہ سو سال سے آپ آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں' عذاب پر عذاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا عذاب' کہتا ہے کہ یہ عذاب بنی اسرائیل کو جسے قرآنِ حکیم نے ذلیل ترین قوم کہا تھا ان کے اختلافات کی وجہ سے دیا تھا اور اب دنیا کی اسی ذلیل ترین قوم کے ہاتھوں آپ کو عَذَابٌ عَظِيمٌ ذلیل ترین عذاب آیا ہے۔ کوئی غلطی تو ہے جو ہم سے ہوئی ہے۔ یہ خدا کے قانون کے ساتھ مذاق کرنا ہے' اس کی ہنسی اڑانا ہے' اس کی تکذیب کرنا ہے اور یہ ہے اس کا نتیجہ۔ لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ اس کا جو مکافاتِ عمل ہے اس کی بَطْشَ شَدِيدٌ [1] کتنی ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ کرتے چلے جانا کہ ہم سے ہر ایک نے ہدایت لی ہے اور قرآنِ کریم نے ہم میں سے ہر ایک کو مختلف ہدایت دی ہے' میں کہتا ہوں کہ یہ خدا کے اس دعوے کی اتنی بڑی تکذیب ہے۔ کیا وہ بیٹھا ہوا آپ کی یہ باتیں سنتا رہے گا؟ انہوں نے سمجھا ہے کہ عرش پہ بیٹھا ہوا ہے' ہمارا کیا بگاڑ لے گا' دیکھتے ہیں کہ ان کا کیا بگاڑا ہوا ہے' یہ اس کے قانون کے نتائج ہیں جو سامنے آتے ہیں۔ کیکر کے درخت کا بیج بوؤ گے اور انگوروں کی توقع کرو گے' سنو! یہ نہیں ہوسکتا۔ کہا یہ تھا کہ اختلاف پیدا ہونگے' اختلاف پیدا ہوں تو فوراً جاؤ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42:10) اللہ کے حکم کی طرف یعنی کتاب اللہ کی طرف۔

## خدا کی ذات اپنا قانون دے کر خاموش نہیں بیٹھی رہتی' اس سے فیصلہ لینے کا ایک عملی نظام ہے

لیکن وہ یہیں تک بات نہیں چھوڑتا۔ میں اپنی جگہ بیٹھ جاؤں' وہ اپنی جگہ بیٹھ جائے' کہتا ہے کہ یہ طریق نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کریم ایک عملی نظام ہے' یہ صرف نظری چیز نہیں ہے' یہ ایک عملی طریقہ بتاتا ہے اور وہی عملی طریق تھا جس سے کہ اس کے نتائج وحدت کے

---

[1] یہ پوری آیت یوں ہے: ان بطش ربک لشدید (85:12) خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

نکلنے تھے۔ وہ عملی طریقہ کیا تھا؟ ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ مجید کی طرف آ ؤ مگر اپنے اپنے طور پر نہیں۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم سے فیصلہ لینے کا عملی نظام کیا ہے جس کا نتیجہ وحدت ہوگی۔ کہا ہے کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ** (4:65) ''تیرے اللہ کی قسم'' جیسے کہتے ہیں' کوئی ان میں سے مومن نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اپنے اختلافی معاملے میں فیصلہ لینے کے لیے تیرے پاس نہ آئیں۔

## قرآنی نظام کو متشکل کرنے کا طریق

ہمارے سامنے اگلا قدم آ گیا۔ اور پھر اس کے بعد کی کیفیت کیا ہے یہ میں وضاحت سے ایک درس میں بیان کر چکا ہوں۔ کہا یہ ہے کہ **ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** (4:65) اور اس کے بعد یہ جو فیصلہ دے اس سے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں' ان میں سے ہر کوئی ایسا کرے۔ جہاں بھی کوئی اختلافی بات ہوئی تو کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ** (4:59) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور جن کو اسلامی مملکت نے اپنا افسران ماتحت مقرر کر دیا ہو ان کی اطاعت کرو۔ **فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ** (4:59) پھر جب کبھی باہمی تنازعہ ہو' کسی معاملے میں جھگڑا ہو' اختلاف ہو' تو آپ اسے اپنی مرکزی اتھارٹی کی طرف جو آپ کا نظام قائم کیے ہوئے ہے ریفر کر دیا کرو' وہاں سے فیصلہ لے لیا کرو' اختلاف مٹ جائیں گے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ تم فیصلہ لینے کے لیے رسول کے پاس آؤ' وہاں کہا گیا تھا کہ جب کبھی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس اختلافی صورت میں **فَحُكْمُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ** (42:10) خدا کی کتاب سے فیصلہ لیا کرو۔

یہاں ذہن میں تھوڑی سی کشمکش کی صورت پیدا ہوگی کہ یہ دو الگ الگ باتیں قرآن کریم کہہ گیا ہے۔ وہاں کہا کہ جب یہ صورت پیدا ہو تو قرآن کریم سے فیصلہ لے لیا کرو' یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اختلاف پیدا ہو تو اس اتھارٹی کی طرف آؤ۔ اور اس اتھارٹی سے یہ کہا' اس رسول سے یہ کہا کہ دیکھیے! عملی نظام کی کیسے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں کہا ہے کہ اس رسول ﷺ کے پاس آیا کرو' انہیں ﷺ سے کہا ہے کہ **وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (5:48) یہ اختلافی معاملات میں تیرے پاس آئیں گے' تو خدا کی کتاب کے مطابق ان کے فیصلے کر دیا کر۔ عزیزانِ من! یہ ہو گیا ہمارے سامنے عملی نظام یعنی نکلنے تھے۔ وہ عملی طریقہ کیا تھا؟ ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ مجید کی طرف آؤ مگر اپنے اپنے طور پر نہیں۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم سے فیصلہ لینے کا عملی نظام کیا ہے جس کا نتیجہ وحدت ہوگی۔ کہا ہے کہ **فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی**

يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (4:65) کی رو سے ہر اختلافی معاملے میں کتاب اللہ سے فیصلہ لینا ہے' اپنے طور پہ نہیں' اپنے طور پہ تو ہو سکتا ہے کہ تم میں ہر ایک حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) والی بات کر دے' یہ نہیں ہے' ایک اتھارٹی مقرر کرو۔ ہر اختلافی معاملہ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ (4:59) اُدھر ریفر کرو۔ اور جدھر ریفر کرو' وہ عدلیہ ہے' وہ آپ کے ہاں کی سپریم کورٹ ہے' وہ آخری اتھارٹی ہے' اسے یہ کہا گیا ہے کہ تیرے لیے فیصلے کرنے کی جو اساس اور بنیاد ہے' وہ یہ کتاب اللہ ہے تو ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔ اور انہیں کہہ دیا گیا کہ جب یہ فیصلہ یہاں سے مل جائے تو دل میں بھی گرانی محسوس نہ ہو' اس کے سامنے سر جھکا دو۔ بات ختم ہوگئی' اب اختلاف کیسے پیدا ہوگا' وحدت پیدا ہوگئی۔

عزیزانِ من! یہ عملاً توحید تھی' یہ وہ وحدت تھی جو نبی اکرم ﷺ نے تمام طبعی اختلافات ختم کر کے' ایمان کے اشتراک سے' قرآنِ کریم کی رو سے' ایک امت کی تشکیل کی تھی۔ اس کے اندر جتنے بھی معاملات تھے' ان کے فیصلے ایک مرکز کی طرف سے کتاب اللہ کے مطابق ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں آپ کو کوئی فرقہ ملتا ہی نہیں' فرقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' فرقہ تو شرک ہے' اس دور میں آپ کو کسی فرقے کا نام ہی نہیں ملتا' صرف امت کا ہی نام ملتا ہے۔ کہا ہے کہ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا ہے جسے' تمام دنیا میں' بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو' جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو' وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی ہو' اور اس طرح كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ (3:110) اے جماعتِ مومنین! تمہیں اس لیے اٹھا کھڑا کیا ہے تاکہ تم ایسا نظام قائم کرو جو تمام انسانیت کے لیے نفع رساں ہو۔ یہ تھا آپ کے ہاں کا عملی نظام۔

برادرانِ عزیز! جب تک نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں یہ نظام قائم رہا' آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے ہی نقشِ قدم پر چلنے والے خلفا کے عہد میں' جب تک یہ نظام قائم رہا کہ ایک مرکز' اختلافی معاملات میں اس کی طرف رجوع کرنا' اس کا قرآنِ کریم کے مطابق فیصلہ دینا' اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ اتنے فرقے شاید بنی اسرائیل میں بھی پیدا نہیں ہوئے جتنے اس قوم میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ان کڑیوں میں سے کوئی کڑی بھی باقی نہیں رہی جن پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کر کے دکھا دیا تھا کہ دیکھ لیجیے یہ ہر وعدہ سچا بھی ہے اور ممکن العمل بھی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں اس درمیان کے عرصے سے یوں گزر جاتا ہوں کہ میرے سامنے تاریخ کا احتساب مقصود نہیں ہے کہ میں آپ کو تاریخی طور پر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس کے بعد امت میں ہمیں اتنے فرقے نظر آ رہے ہیں' یہ امت باقی نہیں رہی' یہ فرقے ہیں جو باقی ہیں۔ یہ فرقہ بازی جسے قرآن کریم نے شرک کہا ہے' یہ امت میں اختلاف و افتراق ہے جسے اس نے عذابِ عظیم کہا ہے۔ یہ سب آپ کے ہاں موجود ہیں۔ ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ جب بھی امت کے اندر فرقے پیدا ہو جائیں' قرآنِ

مجیدا سے توحید نہیں' شرک کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (30:31) دیکھنا مشرک نہ بن جانا' اس سے توحید رہتی نہیں ہے۔ یہ تو ہوا خدا کی طرف نسبت کا معاملہ۔ شرک اور توحید میں خدا کے متعلق بات ہوتی ہے۔

## کتاب وسنت کی اصطلاح کی نوعیت

ایک ایسے قانون کو ماننا جو خدا کی طرف سے آئے' توحید ہے۔ مختلف قوانین پر عمل کر کے تفرقے پیدا کر لینا شرک ہے۔ یہ خدا کی نسبت سے ہوا۔ ہمارے ہاں اس کے بعد کتاب وسنت کی اصطلاح وضع ہوئی۔ کتاب سے تو خدا کی طرف نسبت ہوگئی اور خدا نے یہ کہہ دیا کہ جس قوم کے اندر تفرقہ اور اختلاف ہے وہ مجھے نہیں مانتی۔ آپ نے دیکھا کہ کفر بھی قرآن کریم نے کہا تھا' ارتداد بھی کہا تھا' شرک بھی کہا تھا کہ خدا نے تو یہ اعلان کر دیا کہ یہ قوم جو کتاب اللہ کی طرف نسبت کر رہی ہے یہ جھوٹ بولتی ہے۔ میری طرف تو ان کی نسبت ہی نہیں ہے۔ اب اگلی چیز ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت رہ گئی' کیونکہ ساتھ کتاب وسنت ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کتاب والے نے تو اعلان کر دیا ہے کہ اگر فرقے موجود ہیں تو ان کی میری طرف نسبت بالکل غلط ہے' یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر وہ اپنی طرف ان کی نسبت صحیح مان لے تو اس کے سارے دعاوی غلط ہو جاتے ہیں اسی لیے اس نے بات صاف کر دی کہ صاحب! جس امت میں فرقوں کا وجود ہے' وہ اگر کتاب اللہ کی طرف اپنی نسبت کرتی ہے تو غلط ہے۔

اب اس میں دوسری اصطلاح سنتِ رسول اللہ ﷺ کی آتی ہے۔ اور دوسری جگہ قرآنِ کریم میں خدا نے یہ کہہ دیا کہ کتاب اللہ کی طرف نسبت تو خدا کے ان ارشادات کے مطابق نسبت ہے جو قرآنِ کریم میں ہیں مگر سنت کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں تو یہ نسبت غلط ثابت ہوگئی' رسول اللہ کی بھی کتاب اللہ کی طرف نسبت ہے۔ کہا یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (6:159) اے رسول! جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک گروہ بن جائیں تو سنو! لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ (6:159) تیرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لے آیئے کتاب اللہ کی اصطلاح' جناب! فریب دینے کے لیے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (6:159) ان کا معاملہ ہماری طرف چھوڑ دو' ہم ان کے انجام کو بتا دیں گے کہ یہ کیا کرتے تھے اور اپنی زبانوں سے کہتے کیا تھے۔ عزیزانِ من! یہی تو دو نسبتیں تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ کب تک فریبِ نفس کے اندر مبتلا رہو گے اور فریبِ نفس میں مبتلا رہنے سے نتائج تو نہیں بدل جایا کرتے۔ سنکھیے کو ہزار مصری کی ڈلی اور چینی کہہ کر پھانکیے وہ تو اپنا نتیجہ ہلاکت آمیز پیدا کر کے رہے گا۔ قانون کو فریب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ان معنوں میں دونوں نسبتیں کٹ گئیں۔

## نبی اکرم ﷺ کے دور میں مسجد ضرار کی تعمیر پر قرآنِ حکیم کا ردِعمل اور ہماری کیفیت

عزیزانِ من! علیحدگی یا ذرا سے اختلاف کی' بھی یہ کیفیت ہوتی ہے آپ کو یاد ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارک میں' کچھ لوگوں نے ایک اور مسجد بنالی' مندر نہیں بنایا تھا' بت کدہ نہیں تھا' کوئی گرجا نہیں تھا' صومعہ نہیں تھا' مسجد بنائی تھی۔ کبھی ایسا سوچا جاسکتا ہے کہ اس عمل کے ردِعمل میں کوئی تنبیہ آئی ہوگی کہ اگر یہاں کوئی شخص مسجد بنائے تو اس کے لیے جنت میں موتیوں کا گھر بنتا ہے۔ انہوں نے مسجد تو بنائی تھی لیکن جس چیز سے امت کے اندر اختلاف اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے وہ تو عام مسجد چھوڑ کر دوسرا کعبہ بنایئے' وہ کفر ہوجاتا ہے۔ سنیے! اس مسجد کے متعلق قرآن حکیم کہتا ہے کہ **وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا** (9:107) انہوں نے مسجد بنائی تو گویا ان کی بنیادیں ہلا دیں' ان کو اتنا عظیم نقصان پہنچا دیا! اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ کہا ہے کہ **وَّ كُفْرًا** (9:107) مسجد کی تعمیر کفر ہے۔ کیوں؟ یہ کیا ہوگیا؟ یہ کہ اتنی نقصان رساں چیز ہے' اس سے کیا ہوا؟ تم دیکھتے نہیں ہو کہ **تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** (9:107) اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ یہ کیا چیز ہے؟ کہا ہے کہ کیا اس کو تم مسجد سمجھتے ہو؟ سنو! **وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ** (9:107) اس سے پیشتر دین کے جتنے دشمن تھے' یہ مسجد نہیں ہے' یہ ان کے لیے ایک پناہ بن گئی ہے' کمین گاہ بن گئی ہے' اس کے پیچھے بیٹھ کر وہ امت پر تیر چلائیں گے۔ یا اللہ! یہ کتنی بڑی سازش کا انکشاف کیا ہے! اس مسجد میں نمازیں پڑھنے والے خدا اور رسول کے خلاف محاذ قائم کرکے' اس کمیں گاہ کے پیچھے سے' اس امت پر تیر چلائیں گے۔ یہ مسجد ہے! اُف میرے اللہ!!! آج آپ بڑے فخر سے ہر مسجد کے باہر ''تفریق بین المؤمنین'' کا کتبہ لکھتے ہیں کہ یہ حنفیوں کی مسجد ہے' یہ بریلویوں کی مسجد ہے' یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے' یہ شیعہ کی مسجد ہے' یہ سنّیوں کی مسجد ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ عرض بھی کیا ہے کہ آج یہ کیفیت ہوگئی ہے۔

انارکلی (لاہور) میں آپ چلیے پھریئے' ہر قسم کے مسلمان وہاں چلتے پھرتے نظر آئیں گے' وہاں اس وقت آپ کو کوئی تفریق نہیں نظر آئے گی' اچھے بھلے پھر رہے ہیں' اور یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ مسجدوں کے اندر اذانیں ہوئیں آپ دیکھیں گے کہ اس ہجوم کے اندر سے وہی لوگ گروہ در گروہ مختلف سمتوں میں جانے لگ گئے' آپ کو مسجدوں کی طرف جانے سے تفریق نظر آجائے گی۔ مسجد اس امت میں تفریق کا نشان بن گیا ہے' نماز تخریب کی علامت بن گئی ہے۔ جس صلوٰۃ کے متعلق کہا تھا کہ **اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرو اور مشرک نہ ہوجاؤ۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتے' ان میں تو تفریق کی کوئی علامت نظر نہیں آتی اور ان میں سے جو نماز پڑھنے والے ہیں' یہی نماز ان کی تفریق کی علامت بن گئی ہے۔ اذان نہیں ہوئی تو پتہ نہیں چلا' دونوں اکٹھے جا رہے تھے' اب اس نے بھی کہا میں نماز پڑھ آؤں' اُس نے بھی کہا نماز پڑھ آؤں۔ یہ اِدھر گیا وہ اُدھر گیا۔

ارے! یہ تو دونوں اکٹھے چلے آ رہے تھے۔کہا ہے کہ جی! وہ دنیاداری کا معاملہ تھا۔اب کیا ہوا؟ اب دین داری آ گئی ہے۔عزیزانِ من! سوچیے کس مقام پہ ہم ہیں! یہ مسجد ہے جس کے متعلق رسول سے کہا گیا ہے کہ **لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا** (9:108) ''اس مسجد میں قدم نہ رکھنا''۔یہ مسجد ہے کہ **اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ** (9:109) اس کی بنیادیں جہنم کی آگ پر رکھی گئی ہیں' یہ خود بھی جہنم میں جائے گی اور جنہوں نے یہ بنیادیں رکھ کر عمارتیں استوار کی ہیں' ان کو بھی یہ لے ڈوبے گی۔**وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ** (9:109) کیا خدا اس قسم کی ظالم قوم کو کشادگی راہیں دکھاتا ہے جو مسجدیں الگ الگ بنانے لگ گئی ہو؟ سنو! حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں' ان پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کبھی نہیں کھل سکتی۔

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ کتاب وسنت کی طرف نسبت رکھنے والے یہ لوگ کون ہیں؟ کتاب کے متعلق میں نے عرض کر دیا ہے' سنت کے متعلق یہ چیز آپ کے سامنے موجود ہے۔میں نے اس لیے یہ عرض کیا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ کہا گیا ہے' سنتِ رسول اللہ ﷺ یہ ہے کہ وہ مسجد جو ''تفریق بین المؤمنین'' ہے' ان کے اندر قدم نہ رکھا جائے۔یہ ہے سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ کتاب وسنت کے مطابق عمل کر رہے ہیں!!! کیا ہوا اس کے اندر؟ یہ مرکز ٹوٹا' جہاں سے جا کر ہر ایک نے فیصلہ لینا تھا۔

## جب کسی سرکل کا مرکزی نکتہ ہی مٹ جائے تو پھر سرکل مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔یہی امت میں ہوا

عزیزانِ من! یہ ہوا کہ جب مرکز ٹوٹا تو اپنے اپنے طور پر فیصلے لینے لگ گئے' جب فیصلہ لینے لگ گئے تو پھر اس میں اختلاف پیدا ہوا' اختلافات پیدا ہوئے تو خدا نے کہا تھا کہ یہ عذابِ عظیم ہے۔کہا کہ جی نہیں! خدا نے تو یہی کہا تھا مگر خدا کے رسول نے کہا تھا کہ امت میں اختلاف رحمت ہے' میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔تو کیا خدا نے یہ بت پرستوں کے لیے کہا تھا کہ دیکھنا مسلمانو! مومن ہونے کے بعد پھر تفرقہ نہ پیدا کر لینا' اختلاف نہ پیدا کر لینا' قرآن حمید نے تو یہاں مخاطب ہی ان کو کیا تھا۔اب یہ لگے اپنے آپ کو فریب دینے۔یہ مرکز ٹوٹا' اپنے اپنے طور پر فیصلے لینے لگ گئے۔یہ جو انفرادی طور پر اپنے طور پر فیصلے لیے گئے' یہ ہیں جنہیں آپ کے ہاں شریعت یا فقہ کہتے ہیں۔آج جو آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص بھی جو شریعت کے مطابق فیصلہ لینا چاہتا ہے تو ہر فرقے کی اپنی شریعت ہوتی ہے' وہ الگ الگ فیصلے لیتی ہے۔قرآن حمید نے پہلے سے یہ بتا دیا تھا کہ یہ الگ الگ تفرقے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟

## فرقوں کے اختلافات' خدا کے شریک مقرر کرنا اور اپنی اپنی شریعت بنا لینا ہے۔اسے مٹانے کا طریق

کہا ہے کہ **اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ** (42:21) انہوں نے خدا کے شرکا' خدا کے شریک مقرر کر لیے۔انہوں نے زندگی کا جو راستہ اختیار کیا اسے خدا نے مقرر نہیں کیا تھا۔انہوں نے اور ہستیوں (اپنے مذہبی رہنماؤں) کو

خدا کا شریک بنالیا جو ان کے لیے دین یعنی نظامِ زندگی میں مختلف راہیں (شریعتیں) وضع کرتے رہتے ہیں۔ عزیزانِ من! خدا کے ہاں تو جب بھی فیصلہ لینا تھا' ایک ہی فیصلہ ملنا تھا لیکن انہوں نے خدا کے شریک مقرر کر لیے۔ ان لوگوں نے جنہیں انہوں نے خدا کا شریک قرار دیا تھا' ان کے لیے الگ الگ شریعتیں بنا دیں' وہ شریعتیں جن کا حکم خدا نے نہیں دیا تھا۔ یعنی ہر ایک یہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! میں تفرقے کا مجرم نہیں ہوں' تفرقے تو اوروں نے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ بہت اچھا صاحب! کوئی تفرقے مٹانے کی سبیل' کوئی طریق آپ کو کس کتاب وسنت سے ملتا ہے' کوئی ہے اس قسم کا طریقہ' یا اسلام کا یہی نقشہ ہے جو ہمارے سامنے آج موجود ہے؟ چلیے! ہم نے یہ متعین کر لیا کہ کون اس میں مجرم ہے' کس نے یہ کیا ہے۔ اس کو چھوڑیئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو قرآنِ کریم نے بتایا ہے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ پہلے انہیں یہی چیز منوانی پڑے گی کہ تفرقہ اور اختلاف عذاب ہے جبکہ ان کا عقیدہ ہے کہ تفرقہ رحمت ہے۔

پرانی باتیں تو ایک طرف رہیں' آپ کو معلوم نہیں' یہ کل کی بات ہے' یہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے ''المنبر'' اخبار نکلتا ہے۔ وہ مرزائیوں کے خلاف بہت کچھ لکھتا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ امت میں یہ اچھا نبی آیا کہ تفرقہ پیدا کر دیا اور اختلاف پیدا کر دیا۔ اس کے جواب میں قادیانیوں نے اپنے رسالے ''الفضل'' میں یہ لکھا تھا کہ بجائے اس کے کہ ہمارا شکریہ ادا کرو' الٹا شکوہ کرتے ہو' اختلافِ امت ہی تو رحمت ہے' ہم نے اختلاف پیدا کر کے رحمت میں اضافہ کیا ہے اور تم اس پر شکوہ کرنے لگ گئے ہو۔ بڑے ہی احسان فراموش ہو صاحب! اور پھر آج کل تو جبکہ الیکشن کا زمانہ ہے' جو رحمت ہے' وہ تو پوچھو نہیں کہ کیسے برس رہی ہے صاحب! ابرِ گہر بار صاحب! جسے رحمت کہتے ہیں وہ ہیں گالیاں' طنز' تشنیع' پتھر' چھرے' اور آگے آگے دیکھیے آپ کے ہاں یہ رحمت کیا کیا بہروپ بدلتی ہے۔ اختلاف رحمت ہے!!! پہلے تو انہیں یہ بتانا ہوگا کہ یہ رحمت نہیں ہے' یہ عذاب ہے' یہ اسلام نہیں ہے' یہ کفر ہے' یہ توحید نہیں ہے' یہ شرک ہے' یہ ارتداد ہے' پھر آگے بات چلے گی۔ بیمار کو تو پتہ چلے کہ میں بیمار ہوں' اور اس کے بعد آگے یہ بات ہوگی کہ فرقے مٹنے کا طریقہ وہی ہے جو قرآن کریم نے پہلے دن بتایا' جس پہ عمل کر کے دکھا دیا گیا کہ ایک مرکزی اتھارٹی ہے اور اس اتھارٹی پر یہ پابندی عائد ہے کہ ہر بات کا فیصلہ قرآنِ مجید کے مطابق کرے گی۔ اپنے اپنے اختلافات کو وہاں لے جایئے' اس سے فیصلہ لے لیجیے اور وہ قرآنِ مجید کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے! آپ کے ہاں یہ جتنے فرقے موجود ہیں' یہ قرآنِ مجید کے ساتھ کچھ اور شامل کرنے سے وجود میں آتے ہیں۔ دو چیزیں نہ رہیں: ایک مرکزی اتھارٹی نہ رہی' اور دوسرے یہ کہ وہ فیصلہ قرآنِ مجید کے ساتھ کچھ اور شامل کرنے سے لیا گیا۔

آجایئے پھر اسی اوریجنل پروگرام کی طرف کہ ایک اتھارٹی اور اس کے لیے ایک ہی ضابطہ ہو کہ اس نے قرآنِ کریم کے مطابق فیصلہ دینا ہے صاحب! یہ کیجیے اور پھر دیکھیے قرآنِ کریم کا وہ دعویٰ کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہوتا ہے۔ خدا سے زیادہ وعدے کا سچا اور

کون ہوسکتا ہے۔عزیزانِ من! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور آج پھر دہرادوں کہ ہزار برس سے یہ چیز ہمارے سامنے کتاب وسنت کا اتباع اور اس کے مطابق ہر فرقے کا یہ دعویٰ آتا ہے۔ یہ مملکت اس لیے حاصل کی گئی تھی کہ یہاں وہی جو پہلا صدرِ اول کا اسلام تھا' اس کا احیا ہو۔اس کی پہلی نشانی یہ تھی کہ اختلافات نہ رہیں' فرقے نہ رہیں۔ یہاں آنے کے بعد بھی انہوں نے یہی دعویٰ کیا کہ یہاں جو نظام بنے گا' وہ کتاب وسنت کے مطابق بنے گا۔ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا' میں نے یہ چیز کہی ہے کہ یاد رکھو! اس سے تفرقہ نہیں مٹے گا' کوئی ایسا ضابطۂ قانون کتاب وسنت کی بنیاد پر تم نہیں بنا سکتے جو سارے فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔قرآنِ مجید نے جو طریق مقرر کیا ہے' وہی اس طرف لائے گا کہ ایک مرکزی اتھارٹی ہو' آپس میں بیٹھ کر فیصلہ کرلو۔کوئی اتھارٹی مقرر کرلو اور اس پر یہ پابندی عائد ہو کہ وہ ہر فیصلہ صرف قرآنِ حکیم کے مطابق دے اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ ملائے۔ یہ ہے فرقوں کو مٹانے کا طریق۔

## بائیس سال بعد اعترافِ حقیقت

انکارِ سنت' انکارِ حدیث اور کفر اور منکرِ شانِ رسالت اور معلوم نہیں کیا کیا جو جی میں آئے' کہتے چلے جایئے۔کہتے چلے گئے۔ یہ بائیس سال تک یہی کچھ کہتے چلے گئے۔ اب عملاً وہ وقت قریب آ رہا تھا جب یہ چیز نکھر کر سامنے آ جانی تھی کہ یہ بنتا ہے یا نہیں بنتا۔اور اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ اب انہیں یہ اعتراف ہوا اور انہوں نے اس کا اعلان کیا ہے کہ ''کتاب وسنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا متفق طور پر ضابطہ نہیں بن سکتا جو سب کے نزدیک اسلامی کہلا سکے''۔للہ الحمد کہ اس حصۂ لا تک تو یہ پہنچے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔

## لا کے بعد اللہ کی منزل کا حصول اور اس کا طریقہ

اب اگلی چیز یہی ہے کہ اگر واقعی آپ نے یہاں اسلامی نظام قائم کرنا ہے تو اس کا اعتراف تو آپ نے کرلیا کہ کتاب وسنت کی بنیاد پر یہ نہیں ہوسکتا تو آؤ کتاب سے پوچھیں' قرآن کریم سے پوچھیں کہ اس کا طریقہ کیا ہے۔کچھ ہے بھی یا نہیں؟ یا اب ہمیشہ قیامت تک کے لیے یہ قصہ ختم ہوا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔کتاب اللہ تو قیامت تک کے لیے ہے' اس میں آج بھی اختلاف کو مٹانے کی وہ صلاحیت موجود ہے جو چودہ سو سال پہلے تھی' قیامت تک اس میں یہ صلاحیت باقی رہے گی۔اس سے آ کر پوچھو کہ کیا کریں؟

قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (42:10) جس بات میں بھی اختلاف پیدا ہو' خدا کی کتاب سے اس کے متعلق حکم لو لیکن اپنے طور پر اپنے اپنے فرقے کے پیشواؤں سے نہیں۔ایک اسی کی طرف آؤ' کوئی اتھارٹی مقرر کرلو۔اس اتھارٹی سے یہ کہا ہے کہ جب یہ تمہارے پاس آئیں تو کتاب اللہ کے مطابق ان کے ساتھ فیصلے کرو۔اگر یہ اس چیز پر آ گئے تو امت میں پھر سے وہ وحدت پیدا ہو جائے گی' پھر سے اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔اور یہی چیز ہے جو قرآن کریم میں' میں نے پہلی

آیت جو تلاوت کی' جہاں سے درس کا آغاز ہوا' اس کے ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ بات تو یہاں یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اختلاف تو نہیں رہے گا لیکن ان کی عملی کیفیت یہ ہے کہ **وَ اِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ وَ لَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَی الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤی اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ** (4:83) جب یہ کہیں سے امن یا خوف کی کوئی اڑتی ہوئی بات سُن پاتے ہیں تو اسے لے دوڑتے ہیں اور خوب پھیلاتے ہیں حالانکہ نظام سے وابستگی اور اطاعت کا تقاضا ہے کہ ایسی باتوں کو رسول یعنی مرکزی اتھارٹی یا افسرانِ ماتحت تک پہنچایا جائے تا کہ وہ لوگ جو بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' اِس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کریں ۔اسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ان کا ایمان ہے' کتاب اللہ کا بھی دعویٰ ہے مگر عملاً کیفیت یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی خوف یا امن کی بات ان کے پاس پہنچتی ہے تو اپنے طور پر لے اٹھتے ہیں ۔اگر یہ اسے رسول کی طرف یا اس کے مقرر کردہ افسرانِ ماتحت کی طرف لے جائیں' تو وہ اس سے دیکھتے اور استنباطِ نتائج کرتے ۔ یہ ہے تدبر فی القرآن ۔ وہ استنباطِ نتائج کرتے اور پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچتے' اس کے مطابق یہ عمل کرتے' پھر یہ ٹھیک تھا۔ اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے اپنے طور پر لے اٹھتے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ وَ رَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّیۡطٰنَ اِلَّا قَلِیۡلًا** (4:83) اگر خدا کی یہ رحمت اور فضل تم پہ نہ ہوتا کہ یہ نظام تمہارے اندر قائم ہے کہ ایک مرکز کی طرف آنا اور اس کا قرآن کریم کے مطابق فیصلے دینا' اگر یہ نہ ہوتا' تو تم واقعی پھر شیطان کے پیچھے لگ چکے ہوتے' تم میں سے اکثر اس قسم کی افواہوں کے پیچھے لگ کر تباہیاں لے آتے' ان لوگوں کی غیر ذمہ دارانہ اور سازشانہ حرکات سے نقصان اٹھا چکے ہوتے۔ یہ جو چیز ہے' آپ نے دیکھا کہ یہاں قرآن کریم نے پہلے یہ کہا ہے کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں اور اس سے اگلی آیت میں وہ عملی پروگرام بتا دیا۔ اپنے اپنے طور پر اس سے نتائج اخذ کرنا نہیں ہے' ہر بات کے لیے اس اتھارٹی کی طرف آنا ہے' وہ استنباط کریں گے۔ یہ وہی **یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ** (4:83) کا لفظ ہے' وہ جسے آپ استنباط (Deduction) کہتے ہیں' وہ استنباطِ نتائج کریں گے اور ان کے مطابق جب عمل کیا جائے گا تو وحدت پیدا ہو جائے گی' توحید پیدا ہو جائے گی۔

## اصل حقائق سے منہ موڑ کر فرقہ بندی کی بجائے مکاتبِ فکر کی اصطلاح کا استعمال

اس میں ایک بات جاتے جاتے یاد آ گئی۔ اب یہ فرقے' یہ تفرقہ' یہ جو چیزیں تھیں' اب یہ جو اس دور میں ابھری ہیں' ان کے سامنے آئی ہیں۔ اس سے پیشتر آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیتیں جن میں اس نے فرقہ بندی اور اختلاف کو کفر اور ارتداد اور شرک وغیرہ قرار دیا ہے' یہ لوگ کبھی زیرِ بحث ہی نہیں لائے' آنکھیں بند کر کے چلتے گئے۔ اب یہ جو سامنے آنی شروع ہوئیں گو جواب تو اس کا نہیں تھا تو انہوں نے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہوئی ہے۔ اب یہ فرقے کی بجائے مختلف مکاتبِ فکر کہتے ہیں۔ ''رام داس داناں

عبدالرحمٰن رکھ دیتا جی'' (رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا جی!) ' مکاتبِ فکر کہا ہے' نہ بولنے والے کو پتہ' نہ سننے والے کو پتہ کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! فکر کے اندر جو اختلاف ہے' یہ ہوسکتا ہے۔ قرآنِ کریم کے احکام ہیں' محکمات ہیں' قرآنِ کریم کے کچھ حقائق بھی ہیں جنہیں تشبیہاً بیان کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ اوپر آسمان کی طرف دیکھیے کیسے چمکتے ہوئے چراغ نظر آتے ہیں' ٹمٹماتی ہوئی قندیلیں نظر آتی ہیں! ٹھیک ہے۔ کسی زمانے میں ان کے علم کی سطح اتنی تھی' انہوں نے واقعی یہ سمجھا کہ یہ ایک شیشے کا ڈل ہے' اس کے اندر یہ جواہرات جڑے ہوئے ہیں جو چمکتے ہیں۔ اس زمانے کی علمی سطح ہی اتنی تھی' یہ فکر تھی۔ زمانہ آگے بڑھا' آسمان کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ کیا چیز ہے' ستاروں کے متعلق معلوم ہوا' یہ کیا شے ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات سامنے آئیں جس میں پھر وہ پتہ کیا کہ ہر وہ چیز جو اوپر Space (خلا) میں ہو' اسے سمآء کہتے ہیں۔ چمکنے والی چیزوں کو سمجھانے کے لیے اس نے یہ کہا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ یہ عظیم الجثہ کرّے ہیں جو اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر اس طرح سے چکر لگا رہے ہیں' مصروفِ عمل ہیں۔ فکرِ انسانی کی سطح بلند ہوئی' قرآنِ حکیم کی ان آیات کا یہ مفہوم سامنے آ گیا۔ اسے کہتے ہیں فکر' اسکی بنیاد کے اوپر نہ تو کوئی فرقہ بن سکتا ہے' نہ کوئی یہ اختلاف ہے کہ پھر ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول شروع ہو جائے۔ اس میں انفرادی طور پر اختلاف ہوتا ہے۔

## فرقہ وجود پذیر کس طرح ہوتا ہے؟

جب کوئی کسی طرح عمل کرنے لگ جائے' کوئی کسی طرح کرنے لگ جائے تو اس سے فرقہ بنتا ہے۔ عملی طور پر یہ جتنے فرقے بنے ہوئے ہیں' یہ ان کا اختلاف فی العمل ہے' اسی اختلاف فی العمل سے فرقہ بنتا ہے۔ فکری طور پر اگر ان کے ہاں اتنا ہی رہتا کہ ایک فرقہ تھا' جس نے یہ کہا کہ خدا کے ہاتھ ہیں ''خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا'' تو اس کے واقعی ہاتھ ہیں' جب کہا جائے کہ خدا دیکھتا ہے تو اسکی آنکھیں ہیں' جب کہا جائے وہ عرش پہ ہے تو وہ واقعی وہاں بیٹھا ہے۔ ایک نے یہ سوچا' دوسرے نے یہ کہا کہ نہیں! یہ الفاظ مجازی طور پر استعمال ہوئے ہیں' اس کے معنی خدا کا اقتدار ہے' خدا کی قوتیں ہیں۔ ان دونوں نے ان معاملوں میں یوں سوچا' کوئی بات نہیں! کسی کا جی چاہے اس طرح سے مان لے' کسی کا جی چاہے اس طرح سے مان لے۔ یہ ہے جسے آپ فکری آزادی کہتے ہیں' اس سے اختلاف نہیں پیدا ہوتے' اس سے فرقے نہیں بنتے لیکن آپ کے ہاں دو لوگوں نے یوں دو طرح سے سوچا' آپ کے ہاں دو فرقے بن گئے تنبیہ اور تحییہ یعنی ایک فرقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ نہیں! خدا کے ہاتھ ہیں' دوسرا فرقہ ہے جو کہتا ہے کہ نہیں! اس کے معنی اقتدار ہیں۔ اور پھر آپس میں سر پھٹول ہو رہی ہے۔ یعنی یہ شے ہے جسے آپ تفرقہ یا فرقہ بندی کہتے ہیں۔ اگر یہی چیز فکر کی حد تک رہے'

تو اس سے کوئی نقص واقع نہیں ہوتا' لیکن جب یہ اعتقاد بنتی ہے تو یہ ایک الگ فرقے کی بنیاد بن جاتی ہے۔

عقیدہ کے معنی ہوتے ہیں "گنڈھ دے لینا" (گانٹھ دے لینا)۔ وہ اس کو گرہ دیدیتے ہیں۔ تو گرہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ آہستہ آہستہ پختہ ہوتی جاتی ہے کہ "ہتھا دیاں دتیاں ہویاں فیر دنداں نال کھولنیاں پیندیاں نیں' تے کئی تے کھلدیاں ای نئیں رسی ٹٹ جاندی اے" (ہاتھوں کی دی ہوئی گانٹھیں پھر دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں اور اگر وہ گانٹھ سخت تنی ہوئی ہو تو پھر وہ کھلتی نہیں وہ رسی ہی ٹوٹ جاتی ہے)۔ جب یہ شے عقیدہ بنتی ہے تو ایک الگ تفرقے کی بنیاد بن جاتی ہے اور پھر اس کے بعد زندگی کے ہر معاملے میں' دوسرے کے ساتھ اختلاف اور تفریق آ جاتی ہے۔ بات اتنی سی تھی اور اس سے یہ کیفیت پیدا کر دی۔

## توحید تفریق فی العمل نہیں ہونے دیتی کیونکہ دین میں ایک فیصلہ کن مرکزی اتھارٹی کا وجود لازم ہوتا ہے

یہ جو آپ کے ہاں دین کا نظام ہے جس میں ایک مرکزی اتھارٹی ہوتی ہے اور وہ فیصلے دیتی ہے' وہ تفریق فی العمل نہیں کرنے دیتی' امت کا عملی پروگرام ایک رہتا ہے۔ اور جسے آپ عقیدہ کہتے ہیں' وہ اجزائے ایمان ہیں' وہ بھی ایک رہتے ہیں جو قرآنِ حکیم کی رو سے ہوتے ہیں۔ باقی یہ جتنی چیزیں ہیں' قرآنِ حمید کے متشابہات ہیں یا حقائق ہیں' یا مابعد الطبیعاتی مسائل ہیں' ان کے متعلق اپنے اپنے زمانے کی فکری سطح کے مطابق یا انفرادی طور پر بھی' اپنی اپنی فکری اور عقلی سطح کے مطابق' جو کوئی اس قسم کی تحقیق کرتا ہے' کسی ایک نتیجے پہ پہنچتا ہے' اس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' اس سے امت میں اختلاف پیدا نہیں ہوتے' اس سے تفرقہ پیدا نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! پھر سے امت کے اندر وحدت پیدا کرنے' اور پھر سے اسلام کے احیا کے لیے طریقہ صرف ایک ہے کہ لیبارٹری کے طریقے پہ ایک مملکت یا ایک خطۂ زمین کے اندر شروع میں ایک مرکزی اتھارٹی قائم کیجیے اور اس کے لیے صرف ایک شرط ہو کہ وہ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے دے گی۔ اور یہ جو امت ہے یہ اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لے کہ ہمارے جتنے اختلافات ہیں' ان کے حل کے لیے ادھر سنٹرل اتھارتی کو ریفر کر دیا جائے گا' جو فیصلہ وہاں سے ہوگا' ہم دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں کریں گے پھر ہمارا عمل اس کے مطابق ہوگا۔ یہ ہو جائے گا تو پھر وہ شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو آپ کے یہ الگ الگ فرقے رہیں گے جب تک عصمتِ بی بی از بیچارگی تھی کسی فرقے کے پاس کوئی اقتدار یا کوئی طاقت نہیں تھی' اس وقت تک یہ نظری بحثیں آپ کی مسجدوں تک' مندروں تک' جلسوں تک' محدود تھیں۔ اور اگر آپ کے ہاں یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ کوئی ایک فرقہ اپنی عددی اکثریت کی بنا پر مملکت میں صاحبِ اقتدار ہو جائے اور مملکت کے قانون کے زور پر' دوسروں کے اوپر' اپنے اصولِ شریعت یا فقہ کو نافذ کرنا چاہے تو اس کا نتیجہ جو ہو سکتا ہے' آج ظاہر ہے۔ اور جب یہ آپس کی خانہ جنگی ہو تو اس کے بعد جو لوگ زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ

پھر یہ کہیں گے کہ بابا! اگر مذہب یہی کچھ سکھاتا ہے جو ہمارے ہاں ہو رہا ہے تو خدا کے لیے اس کو الگ رکھو' تم جاؤ' اس کو مسجدوں اور گرجوں تک محدود کر دو' دنیا کے معاملات دنیا کے طریقوں سے ہمیں نپٹانے دو۔

## یورپ کے ہاں مادی ترقی کا راز

یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ Personal Laws (شخصی قوانین) تک کی تو انہوں نے اجازت دیدی' جو سلطنت کے امور تھے ان کے متعلق کہا کہ ان میں No Interference (کوئی مداخلت نہیں) تم دخیل نہیں ہو سکتے۔ ٹھیک ہے! ان کے ہاں کوئی ایسا ضابطۂ قانون تھا ہی نہیں جو ضابطۂ مملکت بھی بن سکتا۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ کتاب نے کسی شے میں کوئی کمی چھوڑی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آپ سوچ لیجیے کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں۔ اتفاق ہے کہ آج یہی آیت سامنے آ گئی جو ہمارے ہاں کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ اس وقت یہاں درپیش ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآنِ کریم کی آیت۔

پھر دہرا دوں کہ قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل اور ثبوت یہ ہوگا کہ جو بھی قوم اپنی نسبت اس کی طرف کرے گی' اس کے اندر کوئی اختلافی بات نہیں ہوگی' کوئی فرقہ نہیں ہوگا' وہ امتِ واحدہ ہوگی۔ اور اگر وہ امت ایسی ہے جس میں اختلاف ہیں اور فرقے ہیں تو اگر وہ خدا کی طرف' خدا کی کتاب کی طرف' اپنی نسبت کا دعویٰ کرتی ہے تو دو میں سے ایک بات یقیناً اس کا لازمی نتیجہ ہے: یا معاذ اللہ خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے یا اس قوم کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس کی نسبت کتاب اللہ کی طرف ہے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# بیسواں باب: **سورۃ النسآء** (2)' (آیات 84 تا 90)

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ
اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ
لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿٨٥﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ
حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي
يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ
يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ
السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿٩٠﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1970ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 84 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:84)۔

## جہاد وغیرہ سے متعلق سابقہ درس کا خلاصہ اور ایک مرکزی اتھارٹی کی اہمیت

سلسلۂ کلام تو آیات 76-75 سے چلا آ رہا تھا' جہاں یہ کہا گیا تھا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعتِ مجاہدین' اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے اٹھتے نہیں ہو۔ اور وہیں یہ بات بتا دی گئی تھی کہ خدا کی راہ میں جنگ کیا ہوتی ہے اور غیر خدا کی راہ میں جنگ کسے کہتے ہیں۔ اگلی آیت میں کہا تھا کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (4:76)۔ جنگ میں ایک ہی چیز ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے لڑی جاتی ہے' قرآن کریم کی رو سے جائز اور ناجائز بلکہ حلال اور حرام قرار پا جاتی ہے۔ فی سبیل اللہ جنگ کے متعلق اس نے خود ہی یہ بتا دیا تھا کہ ایک تو وہ مدافعانہ جنگ (Defence War) ہے کہ جب صورت یہ آ جائے کہ مخالفین تمہیں کسی جگہ بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں' تمہاری آزادی کو

آزادی کو سلب کرنا چاہیں، تم اس سرزمین کو چھوڑ کر دوسری جگہ بھی چلے آؤ تو پھر بھی وہ یورش کر کے تمہارے پیچھے آجائیں۔ تب موت اور زندگی کے فیصلے کی گھڑی آ جائے تو ایسے وقت میں جنگ جسے آج کی اصطلاح میں خالصتاً مدافعانہ (Defensive) کہا جائے گا، اس کی اجازت دی گئی تھی۔ اور دوسری جگہ جو سورۃ النسآء میں کہا گیا ہے، وہ یہ تھا کہ مظلوم جہاں بھی بے سہارا رہ جائے اور وہ اپنی مدد کے لیے پکارے تو اس مظلوم کی مدد کے لیے اٹھنا ہے۔ ظالم کی کلائی مروڑ کر عدل کی میزان پہ جھکا دینے کے لیے ایک حدیث آتی ہے۔ یہ جنگ کی دوسری صورت ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ دو ہی شکلیں بتائی ہیں: (1) اپنی حفاظت کے لیے بطور آخری چارۂ کار کی جنگ اور (2) مظلوم کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جانے کی جنگ۔

مظلوم کی اس مظلومیت میں قرآن کریم نے یہ کہا تھا اور اس کی کتنی بڑی کشادہ نگہی ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے معبد ہوں، پرستش گاہیں ہوں، ان کی حفاظت کرنا ہے۔ بات تو پرستش گاہ کی حفاظت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ درحقیقت اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی کسی دوسرے کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کے لیے اگر استبداد سے کام لے اور وہ مظلوم ہوں تو تم ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرو، خود سینہ سپر ہو کر وہاں کھڑے ہو جاؤ، اپنے سینے میں گولیاں کھاؤ تاکہ بت پرستوں کے بت کدے محفوظ رہ جائیں۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے جنگ فی سبیل اللہ کا دامن کہاں تک پھیلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ وہ جو الزام دے رہے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا، ایک ہی آیت ان کے جواب کے لیے کافی ہے کہ جو اسلام اس جنگ کو جنگ فی سبیل اللہ قرار دیتا ہے کہ جس میں غیر مذاہب کے معبدوں کو بچانا تمہارے لیے فرض ہو جاتا ہے، کیا اس دین میں یہ چیز ہوگی کہ اپنا جو دین ہے وہ بزورِ شمشیر پھیلایا جائے؟ یہ تھا جسے اس نے جنگ فی سبیل اللہ کہا تھا۔ اور اس کے بعد مختلف ہدایات تھیں اور ان ہدایات میں آخری چیز یہ تھی جو پچھلی آیت میں ہمارے سامنے آئی کہ باہمی اختلاف پیدا نہ کر لینا۔ اس کی شکل اس نے بتائی تھی کہ اپنے ہر اختلافی معاملہ کے لیے ایک سنٹرل اتھارٹی ہونی چاہیے، ایک مرکزی اتھارٹی ہونی چاہیے، جسے آج کی اصطلاح میں آپ مملکت کی اتھارٹی کہہ سکتے ہیں، قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ''اللہ اور رسول'' قرار دیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! اصل میں تو اطاعت اور محکومت قرآن کریم کی رو سے خدا کے احکام کی ہی ہے لیکن وہ اطاعت کسی ایک محسوس مرکز کے ذریعے کی جائے گی۔ اس کے لیے قرآن کریم کی اصطلاح ''اللہ اور رسول کی اطاعت'' ہے۔ اور کہا یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ تمہارے سامنے آئے، خود ہی اس کا فیصلہ نہ کرنے بیٹھ جایا کرو اور قطعاً آگے نہ پھیلایا کرو تاآنکہ تم اسے یا تو سنٹرل اتھارٹی کی طرف یا اس سنٹرل اتھارٹی کی طرف سے جس میں افسرانِ ماتحت متعین کیے گئے ہوں ریفر کر دو، ان کی طرف اس چیز کو لوٹاؤ تاکہ وہ تفتیش و تحقیق کے بعد، یہ دیکھیں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور پھر کسی نتیجے پہ پہنچ کر فیصلہ کریں۔ ان فیصلوں کے متعلق اس مرکزی اتھارٹی پر یہ پابندی عائد

کردی کہ ان کا ہر فیصلہ قرآن کریم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے گا۔ یہ ہے جسے آپ اسلام کا سیاسی نظام کہیے' یہ ہے جسے آپ اسلامی مملکت کہیے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے زیرِ فیصلہ' جس کے زیرِ کمان' جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا جائے گا اور جنگ لڑی جائے گی۔ یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن کریم پھر اس آیت میں' جو آج ہمارے زیرِ درس ہے' اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

## فی سبیل اللہ کا مفہوم اور نظامِ حکومت میں ذمہ داری کے تعین کا مسئلہ

کہا ہے کہ فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (4:84)۔ جہاں جہاں جنگ آئے گی وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ جنگ فی سبیل اللہ ہے۔ کہا ہے کہ فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (4:84) تم صرف اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ فی سبیل اللہ کی تشریح' وضاحت اور تعین خود قرآن حکیم نے کر دیا کہ یہ جنگ نظامِ خداوندی کے قیام و بقا اور مظلوموں کی امداد اور حفاظت کے لیے ہے۔ آگے اس میں دو ٹکڑے آتے ہیں اور اس سلسلے میں بڑے بنیادی ہیں۔ کہا ہے کہ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ (4:84) تم صرف اپنی ذات کی ذمہ داری لے سکتے ہو' اوروں کی نہیں۔ یہاں واحد کی ضمیر ہے' رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اس باب میں جہاں تک ذمہ داری کا تعلق ہے وہ تو تُو اپنی ذات کی ذمہ داری ہی لے سکتا ہے۔ جسے آپ آج Individual Responsibility (انفرادی ذمہ داری) کہتے ہیں' وہ بڑی اہم چیز ہے۔ دورِ حاضر نے سیاسی نظام کی ایک شکل پیدا کی ہے جسے نظامِ جمہوریت کہا جاتا ہے یا مملکت کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں آپ کسی فرد کی ذمہ داری کو متعین ہی نہیں کر سکتے۔ آپ کسی سے پوچھیے' یہاں تک کہ جو اربابِ نظم و نسق ہیں یا اربابِ حکومت ہیں' ان میں سے بھی کسی سے بات کیجیے' وہ یہی کہیں گے کہ صاحب! کیا کیا جائے' حکومت کی مشینری اتنی خراب ہو گئی ہے' نظم و نسق میں اتنی خرابیاں آ گئی ہیں۔ گویا یہ باہر سے بول رہے ہیں' مشینری کہیں اور ہے۔ کہتے ہیں صاحب! یہ حکومت کی غلطی ہے جو ایسا کیا جا رہا ہے' میں اس کا ذمہ دار تو نہیں ہوں' ہم ذمہ دار نہیں ہیں' اس کے لیے تو حکومت کے غلط احکام اور فیصلے ذمہ دار ہیں۔

اوبھئی! حکومت کیا ہے جو پتہ چلے؟ یہ کسی کو معلوم ہی نہیں' نہ اس کا ایڈریس کسی کو معلوم ہے' نہ اس کا پتہ ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے جہاں جا کر اس کو ملیں۔ اور یہ کہنے والے کوئی باہر کے نہیں۔ آپ خود اربابِ حکومت سے بھی پوچھیے تو ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ہر کوئی حکومت کو کوستا ہے۔ یہ اس نظامِ حکومت کا بنیادی نقص ہے۔ یہ مغربی اندازِ جمہوریت کا نقص ہے۔ آپ کسی چیز کی ذمہ داری کسی Particular Individual (خاص فرد) پہ Locate (متعین) نہیں کر سکتے اور نہ کوئی Particular Individual (خاص فرد) اس میں ذمہ داری لیتا ہے۔ یہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جو آپ کے ہاں ہوتی ہے' اس میں بھی اگر آپ ان کا تعین کرنا چاہیں کہ صاحب! اس کا ذمہ دار کون ہے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ یہاں سے وہاں تک' ایک سلسلہ اور ایک جال پھیلا ہوا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں اصلاح نہیں ہوسکتی۔ کسی معاملے کے متعلق آپ بات چھیڑ کر دیکھیے' کہیں کیس لے جائیے' اس میں دیکھیے کہ کتنے الجھاؤ نظر آتے ہیں۔ اور سب کچھ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ متعین طور پر کوئی اس کے اندر مجرم ہے ہی نہیں۔ مجرم کون ہے؟ یہ حکومت ہے جس کا ایڈریس کسی کو معلوم نہیں۔ یہ Abstract (غیر محسوس) چیز ہو جاتی ہے' محسوس چیز نہیں ہوتی۔

## مملکت کا نظم وضبط اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی اور طریقِ کار

عزیزانِ من! قرآن حکیم ذمہ داری کو متعین کرتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ (4:84) پہلی چیز جو سربراہِ مملکت سے کہی گئی ہے کہ یہ تیری ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری میں تم اپنے لیے جس طرح سے جی چاہے کرو' ہم تم سے پوچھیں گے۔ بظاہر تو یہاں یہ معنی نظر آتے تھے کہ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ (4:84) تُو اپنی ذات ہی کا ذمہ دار ہے کسی دوسرے کا نہیں لیکن یہ بات بڑی گہری ہے جو قرآن حکیم یہاں کہہ گیا ہے۔ اب یہ چیز کہ صاحب! جنگ تو نظم ونسقِ حکومت ومملکت کا کام ہے' یہ ایک فرد کی تو بات نہیں ہے' اس میں تو ساری جماعت ساتھ ہوگی اور قرآن حکیم کی رو سے جو اس کا نظامِ مشاورت ہے' اس کے اندر پوری جماعت شریک ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس باقی جماعت کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟ کہا یہ گیا ہے کہ یہ تمہاری Responsibility (ذمہ داری) ہے' ہم تو تم سے پوچھیں گے اور تیرا کام یہ ہے کہ وَ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (4:84) تم مناسب تعلیم وتربیت سے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما سے' اپنی جماعت کے افراد کی کمزوریوں کو رفع کرتے جاؤ تاکہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ آپ کوئی قرآنِ کریم اٹھا کر دیکھیے اس کے ترجمے میں آپ کو یہ بات ملے گی کہ تم مومنین کو جنگ کے لیے اکساؤ' ان کو جنگ کے لیے ترغیب دو۔ یہ بات جچتی ہی نہیں ہے۔ کیا تیری ذمہ داری یہ ہے کہ ڈنڈا ہاتھ میں لیے' اپنی جماعت کے پیچھے پڑ جاؤ کہ چلو جنگ کے لیے اٹھو' تم کیوں نہیں جاتے؟ یہ ڈنڈا ہاتھ میں لینے والی بات نہیں ہے۔ جناب! یہ حَرِّضِ کے عام معنی سے یہ چیز انسان کے ذہن میں آتی ہے جبکہ بات یہ نہیں ہے۔ یہ حَرِّضِ بڑی عظیم چیز تھی کہ جہاں تک تیری جماعت کا تعلق ہے تو تیرا فریضہ یہ حَرِّضِ ہے۔

## لفظ حَرِّضِ کا لغوی اور قرآنی مفہوم

حَـــرِّضِ کے معنی ہوتا ہے ''کسی کی کسی کمی کو پورا کر دینا' Deficiencies (کمزوریوں) کو دور کر دینا' اس کی کجیاں دور کر کے نشوونما کر دینا''۔ وہ فریضہ یہ بتایا تھا کہ وَ يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ (1:129) تُو ان کو قوانین اور قوانین کی غرض وغایت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے حَـــرِّضِ کہا جاتا ہے۔ جس میں کوئی کمی رہ گئی ہے' وہ کمی پوری کرنا ہوتا ہے۔ اب دیکھیے کیا عمدہ نظام ہوا کہ یہ ذمہ داری تو تمہاری ہے' ہم تم سے یہ بات پوچھیں گے کہ ایسے وقت میں

یہ کرنا تھا' وہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اب یہ چیز ہے صاحب! میرے جو ساتھی تھے' جن کو ساتھ لے کر ان کے تعاون سے' ان کی رفاقت سے' میں نے یہ سب کچھ کرنا تھا' ان میں یہ کمزوریاں تھیں' ان میں کمیاں تھیں' یعنی تم یہ Excuse (بہانہ) پیش نہیں کر سکتے اس لیے کہ یہ تمہارا فریضہ ہے کہ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:84) جماعت کے اندر جتنی کمیاں' کمزوریاں (Deficiencies) ہیں ان کو پورا کرو۔ یہ تیرا کام ہے۔ تم یہ فریضہ پورا کرو اور ہم اس کے متعلق تم سے پوچھیں گے' ان کمزوریوں کو پورا کرنا تمہارا فریضہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن حمید کیسا عجیب نظام دے جاتا ہے اور کس طرح دو دو لفظوں کے اندر کتنی گہری بات بیان کر جاتا ہے! عزیزانِ من! قرآن حمید سے استنباط کے لیے طریقہ ہی یہ ہے کہ اس کی ان چیزوں سے سرف نظر کر کے یونہی آگے نہ بڑھ جایئے' انسان تو ایک ایک لفظ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جائے۔

## فوج میں ماتحتوں کے لیے ذمہ داری پورا کرنے کا طریقِ کار

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ چیز کی کہ اپنی Responsibility (ذمہ داری) کا احساس کیا کہ میں خدا کے سامنے اس کا Accountable (جواب دہ) ہوں' میں نے جواب دینا ہے' وہاں یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتا کہ صاحب! یہ جو میرے ماتحت تھے' ساتھی تھے' میرے رفقاء تھے' ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں تھی اور وہ کمزور ہو گئے تھے۔ یہ تمہارا کام ہے کہ تم ان کی تربیت کرو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی ہمارے ہاں سول ایڈمنسٹریشن میں یہ کیفیت ہے جو میں نے عرض کی کہ کہیں بھی Locate (متعین) نہیں کرتے کہ ذمہ دار کون ہے؟ غنیمت ہے کہ ہماری فوج کی ایڈمنسٹریشن میں یہ چیز نہیں ہے۔ فوج کا جرنیل Responsible (ذمہ دار) ہے' وہاں ذمہ داری Locate (متعین) کی جاتی ہے۔ اب رہی یہ چیز کہ جس قدر بھی اس کے ماتحت ہیں' ان میں کس کس چیز کی کمی ہے' اس کی کیا کیا ضرورتیں ہیں' ان کے پاس کیا کچھ ہونا چاہیئے' کیسے ڈسپلن ہونا چاہیئے' ان کی میٹریل کی کمی' Moral (اخلاق) کی کمی' جتنی بھی ہے' اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ اور اس کی یہ ذمہ داری کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا' وہ اس کے اوپر آتی ہے۔ اسی سے صحیح نظم و نسق قائم رہتا ہے۔

## استبداد کی روک تھام کا طریق اور اس کا خوشگوار نتیجہ

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس جنگ کے لیے یاد رکھو' تمہارا فریضہ یہ ہے کہ جتنی کمیاں' کمزوریاں (Deficiencies)' ضرورتیں ہیں' وہ ساری پوری کرنی ہیں' تم اس کے ذمہ دار ہو۔ اور ہم تم سے پوچھیں گے کہ فلاں وقت یہ جو کرنا تھا' وہ کیوں نہیں کیا گیا اور کیوں نہیں ہوا۔ اگر تم اپنا یہ نظام قائم کر لو تو عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (4:84) وہ وقت دور نہیں جب خدا'

تمہارے مخالفین کی پیدا کردہ مشکلات ومصائب کی روک تھام کا انتظام کردے گا۔ یہاں جنگ کا مقصد جس مدافعت کا تھا وہ واضح ہوگیا۔ یہ تم کرلو گے تو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ اتنی جلدی ایسا کچھ ہوجاتا ہے کہ یہ جو دست درازیاں کرتے ہوئے بڑھتے چڑھتے ہوئے' یورش کرکے تمہارے پیچھے آجاتے ہیں' خدا کس طرح ان کے استبداد کی روک تھام کردیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جنگ کا مقصد دوسروں کی زیادتی' ان کے استبداد' ان کے مظالم کی روک تھام ہے۔ وَ اللّٰـهُ اَشَـدُّ بَاْسًا (4:84) خدا کا قانون بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ یاد رکھو! اس نظام میں جو خدا کے ان قوانین کے تابع' تم متشکل کروگے' اس میں بڑی قوت آئے گی۔ کس لیے قوت آئے گی؟ کیا یہ قوت انسانیت کو کچل دینے کے لیے ہے؟ کیا یہ دوسروں کو غلام بنالینے کے لیے ہے؟ اس کا جواب ایک لفظ وَ اَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا (4:84) میں دے دیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو تَـنۡكِيۡلًا ہے' یہ ہے جسے ہم نکال کہتے ہیں' وہ عربی زبان کا نکل ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''جو سرکش ہوجائے' اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال کر اس کو روک دینا''۔ یہ صرف روک دینے کے لیے ہے۔ یہ سرکش' ظالم' مستبد قوتوں کو ان کی سرکشی اور دست درازی سے روکنے کے لیے ہے' جنگ کا مقصد یہ ہوگیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حمید نے کہا ہے کہ جنگ میں جس مقام پہ بھی دشمن تم سے صلح کے متعلق کہے تو فوراً صلح کو تسلیم کرلو۔ کیونکہ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی سرکشی سے باز آجائے۔ نہ تو جوع الارض مقصد تھا کہ تم نے دوسروں کی مملکت چھیننی ہے' نہ کسی کی آزادی کو سلب کرنا تھا' نہ کہیں لوٹ مار کرنی ہے۔ مقصد تو سارا یہ ہے کہ جو مظلوم انسانیت پر زیادتیاں کررہے ہیں' وہ اپنی ان زیادتیوں سے رک جائیں۔ جونہی یہ رک جائیں بس تمہارا مقصد پورا ہوگیا۔ اور خدا کا قانون ایسا محکم گیر ہے کہ وَ اَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا (4:84) وہ ان سرکشوں کو جکڑ کر رکھ دے گا۔ اور اس طرح سرکشوں کو ان کی سرکشی سے روکنے کے لیے' خدا کی قوت کام میں لائی جائے۔ یہ ہوئی فی سبیل اللہ اطاعت اور یہ جو تمہاری جماعت ہے' اسے تو تمہارے ساتھ چلنا ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنا جان اور مال بیچ کر خدا کے ہاتھوں اس جمات کے اندر شامل ہوئے ہیں۔ قرآن مجید نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ وَ تَـعَـاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰى وَ لَا تَـعَـاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ (5:2) ایک دوسرے کی مدد کرو اچھے کاموں میں (عام ترجمہ ہے) اور برے کاموں میں کسی کی مدد نہ کرو۔

## خیر و شر کا معیار تو قرآنِ حکیم نے متعین کر رکھا ہے

اب یہ چیز کہ اگر کوئی بھی اچھے کام کے لیے اٹھے اور جو اچھا کام ہے' وہ انفرادی طور پر یا عام معیار کے مطابق نہیں ہے تو اس کے لیے قرآن مبین نے خود معیار دیدیئے ہیں کہ وہ بِرّ اور تقۡوٰی کے مطابق ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ ''بِرّ اور تقۡوٰی '' کیا ہوتا

ہے۔ یہ وہ امور ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی راہیں کشادہ کریں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا موجب بنیں۔ کہا ہے کہ ''بِـرّ اور تَـقْـویٰ '' ان کاموں میں تعاون کرنا' دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوجانا ہے۔اسی طرح سے اگر وہ جماعتِ مومنین کسی اچھے کام کے لیے اٹھتی ہے' اس میں وہ Invite (مدعو) کرتی ہے کہ اگر کوئی اس کا ساتھ دینا چاہے تو آئے اور اس کا ساتھ دے۔ یہ کسی کا اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوجانا ہے۔ آپ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ٹکڑے کیسے عمدہ آ رہے ہیں۔ یہ Direct Responsibility (براہِ راست ذمہ داری) اس سربراہ کی ہے اور اس کے یہ جتنے بھی ساتھی ہیں' ان کی نشوونما کی ذمہ داری اس پر ہے۔ اور اس کے بعد پھر یہ ہے کہ اگر اچھا کام ہے اور کوئی اس میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے' وہ ساتھ دے۔

## لفظ شفاعت کا لغوی مفہوم

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّـنْهَـا (4:85) ۔آپ کو معلوم ہے کہ شفاعت قرآنِ کریم کی روسے' عربی زبان کی روسے' کسی کا ساتھی بن کر اس کے ساتھ کھڑے ہوجانے کو کہتے ہیں' کسی کا حمایتی بن کر اس کے ساتھ کھڑے ہوجانے کو کہتے ہیں' اس کی حمایت کرنے کو کہتے ہیں''۔شَـفْـعَ کے معنی ہی ہیں ''ایک سے دو ہو جانا' اگر وہ کسی معاملے میں تنہا ہے اور وہ معاملہ اچھا' نیکی کا ہے تو اس کے ساتھ کھڑے ہوجانے کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اگر ''بِرّ اور تَقْویٰ '' کا معاملہ ہو تو اس کے ساتھ کھڑا ہوجانے والا جو ہے قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس میں اس کا حصہ بھی ہوتا ہے ۔اسے یوں کہیے کہ ''جو اچھے کام میں کسی کے ساتھ کھڑا ہوجاتا ہے' اس اچھے کام کا جو نتیجہ ہے' جو حسنِ عمل ہے' اس میں اس کا بھی حصہ ہوجاتا ہے''۔ ہرچند اس میں Initiative (پہل) کسی دوسرے نے لیا تھا' پروگرام اُسی کا تھا لیکن اس پروگرام میں اگر کوئی دوسرا بھی شریک ہوگیا ہے اور اس نے آکر تعاون کیا ہے' امداد کی ہے تو اس اچھے کام کے نتیجے میں وہ بھی شریک ہوجاتا ہے۔وَ مَـنْ يَّشْـفَـعْ شَـفَـاعَةً سَيِّـئَةً يَّـكُنْ لَّـهٗ كِفْلٌ (4:85) اسی طرح سے اگر تخریب کے کام میں کوئی دوسرا کھڑا ہوجاتا ہے' خواہ پہل کسی اور نے ہی کیوں نہ کی ہو' تو اس کا جو تباہ کن نتیجہ ہے' اس میں سے اس کو بھی حصہ ملے گا' وہ بھی برابر کا شریک ہوجائے گا۔

یہ جسے جرم کی Definition (تعریف) کہتے ہیں' اس میں ایک تو جرم کرنے والا مجرم ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے جو جرم میں اس کا ساتھ دیتا ہے' یہ بھی بجائے خویش ایک جرم ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے یہاں آپ دیکھیے کس طرح ایک عالمگیر اصول بیان کیا ہے کہ جہاں کہیں بھی انسانیت کی فوز و فلاح کے لیے اچھا کام ہوتا ہو' ان کے ساتھ کھڑا ہوجانا چاہیے لیکن جہاں بھی انسانیت کے خلاف کام ہوتا ہو' اس کی تائید کبھی نہیں کرنی چاہیے' اس کی تو مخالفت کرنی چاہیے۔ یہ جو عام طور پر ہمارے ہاں شفاعت کے لیے سفارش کا ایک لفظ

آیا ہے' سفارش ہمارے ہاں غلط معنوں میں استعمال ہوگیا۔ بات تو یہی ہے کہ حق پر ایک شخص ہے' تنہا ہے' اس کو کسی مدد کی ضرورت ہے' اس کی مدد کے لیے کھڑے ہو جانا شفاعت ہے۔ اور یہ جو چیز ہے کہ اگر آپ کو معلوم ہے کہ کوئی شخص فی الواقعہ مظلوم ہے' اس پہ ظلم ہو رہا ہے' جہاں سے اس کا فیصلہ ہونا ہے اس کو اس کا علم نہیں ہو رہا کہ یہ فی الواقعہ مظلوم ہے۔ آپ کے علم میں یہ چیز ہے کہ وہ مظلوم ہے' اسے اس کے متعلق اطلاع دیدینا کہ یہ شخص مظلوم ہے اور اس کے لیے یہ ثبوت ہے' یہ دلیل ہے' یہ چیز بھی اس کی شفاعت ہے' یہ شفاعتِ حسنہ ہے۔ کسی طریق سے بھی آپ اس مظلوم کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو تنہا ہے' جو مدد کا محتاج ہے' کھڑے ہو جائیں گے' جس ضمن میں بھی آپ اس کی مدد کریں گے' یہ اس کی شفاعت کہلائے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس میں اس کا بھی حصہ ہے جو کسی چیز کا ساتھ دیتا ہے۔

## انسانیت کی نشوونما کے لیے کسی کو قوت فراہم کرنا اصل میں اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا ہے

آگے کہا ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (4:85)۔ عام ترجمے میں آپ اس لفظ مُّقِیْتًا کے معنی دیکھیں گے تو لکھا ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے' قابو رکھتا ہے۔ یہ بات کچھ جچتی نہیں ہے' یہاں قدرت اور طاقت کا تو سوال نہیں ہے۔ یہ اصل میں مُّقِیْتًا جو ہے اس کا مادہ ''ق و ت'' ہے اور ''القوت'' کے معنی ہیں ''اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے''۔ اس کی جمع اقوات ہے۔ یہ قوّت نہیں ہے' ''قُوت'' ہے اور ''قُوت'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی کی نشوونما کے لیے جتنی غذا کی ضرورت ہے' وہ غذا بہم پہنچا دینا''۔ یہ اس غذا کو کہتے ہیں جیسے نشوونما کے لیے خدا کا قانون' غذا بہم پہنچاتا ہے' بڑی گہری چیز ہے۔ اور آپ دیکھیے کہ اس میں ساتھ دینے والا بھی' آخری انجام میں ملنے والے انعام کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ آپ زمین میں بیج بو دیتے ہیں' بیج کے اندر کچھ تھوڑی سی صلاحیت ہوتی ہے' اس بیج کو آپ میز کے اوپر رکھ چھوڑیئے' قیامت تک رکھ چھوڑیئے' اس کی صلاحیتیں نہیں ابھرتیں۔ اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے اسے تعاون کی ضرورت ہے' بیج کو مٹی میں ڈالتے ہیں' مٹی اس سے تعاون کرتی ہے' وہ اپنے منرل (Mineral) اس کے اندر جذب کرتی ہے' پانی اس کو رطوبت دیتا ہے' نمی دیتا ہے' آکسیجن دیتا ہے۔ ان کے باہمی تعاون سے وہ جو بیج ہے' اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو رہی ہے' سورج کی حرارت اس کو اور تقویت دے رہی ہے۔ یہ ساری چیزیں' اس بیج کی شفاعت کر رہی ہیں۔ اصل میں تو اس بیج کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو رہی ہے' اس مٹی' پانی' سورج کی حرارت اور ہوا کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں بلکہ یہ تو اس بیج کو ایک درخت بنانے کے لیے ساتھ اسکی شفاعت کر رہی ہیں۔

## انسانی برادری میں باہمی تعاون کے ثمر کا نتیجہ لازوال سرمایہ حیات ہے

جب یہ پودا بڑھے گا' مثلاً انگور کی بیل ہے' اس میں جب پھل آئے گا' انگور کے خوشے لٹکیں گے' تو آپ جانتے ہیں کہ ان

خوشوں میں اس بیج کے اندر جو صلاحیتیں تھیں' وہ بھی اور یہ جو مٹی اور پانی اور حرارت تھی یہ بھی مل کر انگور بن گئی ہوئی ہے۔ انگور کی جتنی قیمت ہے اس میں ان سب کا برابر کا حصہ ہے۔ جتنا ان میں کسی نے Contribute (حصہ ادا) کیا ہے' اتنا حصہ ان کا اس کے اندر موجود ہے۔ یہ ہے وہ چیز یعنی اس تعمیری کام میں جو بھی اس کی شفاعت کرتا ہے' دوسرے کا ساتھ دیتا ہے' اس کا جزو بنتا ہے۔ اصل میں تو اس مقصد کی نشوونما ہو رہی ہوتی ہے جس کا یہ ساتھ دے رہا ہے لیکن جب اس کا ثمر نکلتا ہے' پھل نکلتا ہے' اس کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس میں یہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مٹی بھی انگور بن گئی ہوتی ہے' پانی بھی انگور بن گیا ہوتا ہے۔ اس کی یہ شیرینیاں' یہ لطافتیں' یہ بڑی قوتیں جو منرلز (Minerals) کی ہوتی ہیں' یہ فقط اس بیج کی صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ اس بیج کی صلاحیت کو نشوونما دینے کے لیے ان باقی اجزا نے تعاون کیا ہے' شفاعت کی ہے۔

عزیزانِ من! اس شفاعت میں آپ دیکھیے کہ انگور کی جو قیمت ہے' اس مٹی کی بھی وہی قیمت ہوگئی' اس پانی کی بھی وہی قیمت ہوگئی حتیٰ کہ اس کھاد کی بھی وہ قیمت ہوگی جو انگور کی قیمت ہے۔ اگر وہ پانچ روپے سیر بک رہا ہے تو یہ مٹی بھی اس میں پانچ روپے سیر بک رہی ہے۔ کسی اچھے کے ساتھ لگنے سے انسان خود اچھا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ساتھ لگنا اس طرح کا ہے کہ انسان اس کا جزو بن جائے' پھر تو ''تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری'' ہے۔ جو قیمت اس اصل کی لگ رہی ہے وہ قیمت اس کی بھی لگ رہی ہے جو اس کا جزو بن گیا ہوا ہے۔ یہ ہے مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا (4:85) یہ اس کا حصہ اس کو ملتا ہے۔ یہ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا (4:85) عجیب لفظ ہے۔ وہ جتنے میں انگور بکتا ہے اتنی ہی قیمت مٹی کی لگ رہی ہے' اتنی ہی قیمت کھاد کی لگ رہی ہے' اتنی ہی قیمت پانی کی پڑ رہی ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بیج یہ نہیں کہتا کہ نہیں صاحب! حقیقت میں اصل تو میں تھا' اس میں سے 90% تو مجھے ملنا چاہیے' مثلاً چار روپے سیر میری قیمت ہونی چاہیے اور ایک روپیہ یہ باقی آپس میں بانٹ لیں۔ اس کا تو سوال نہیں ہے۔ صاحب! یہ ہے تعاون۔

## قرآن حکیم کے نزدیک باہمی تعاون سے اگلی منزل شفاعت کی ہے

برادرانِ عزیز! تعاون کی بجائے یہاں قرآن حکیم نے يَّشۡفَعۡ کا لفظ استعمال کیا ہے شَفَاعَةً کا کہا ہے۔ یہ بات تعاون سے ایک قدم آگے چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ کھڑا ہو جائے' پوری ذمہ داریاں لے' بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلے۔ قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا (3:200) ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر استقامت کا ذریعہ بنتا چلا جائے۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ نظام جو قرآن مجید تجویز کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نظام میں آ کر تو ''تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے''۔ یہاں تو مٹی بھی خوشۂ انگور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کسی اچھے نظام کے ساتھ تو لگو' پھر دیکھو یہ جو پتھر کے ٹکڑے ہیں' ان کی

قیمتیں بھی کیسے لعل و جوہر جیسی ہوجاتی ہیں۔ اور اگر وہ نظام غلط ہے' وہ مٹی' وہی پانی' وہی ہوا' وہی سورج کی روشنی' ببول کے بیج کے ساتھ بھی تو چلتی ہے اور کانٹوں میں تبدیل ہوجاتی ہے' بے ثمر رہ جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ انسانیت کی تعمیر کے لیے جہاں جہاں کچھ ہو رہا ہے' اس کا ساتھ دو اور اگر تم اس میں Initiative (پہل) کرتے ہو' جو قرآن مجید اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ Initiative (پہل) کہتا ہے کہ تعمیرِ انسانیت کے پروگراموں کا سلسلہ جماعت مومنین کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور اس کے بعد پھر جو بھی اس کے ساتھ لگتا ہے' جو بھی اس کا جزو بنتا ہے' اس ساتھ لگنے سے اس کا حصہ دار ہوتا ہے۔

## لفظ مقیتًا کی بنیاد پر اٹھنے والی عمارت کا ہر ہر کونہ اور اُسکی ہر ہر منزل دیدہ زیب صفات کی حامل ہوتی ہے

اب آگے کہا ہے کہ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (4:85) ۔لفظ مقیتًا کے لیے میں نے یہ کچھ کہا تھا۔اب دیکھیے کہ کیا بات ہوگئی کہ یہ جو سامانِ نشو ونما ہے' یہ جو غذا دینا ہے' یہ پھر ان سب کو ملتی ہے جو بھی اس کا ساتھ دے رہا ہو حالانکہ مٹی کے اندر یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ایک پیڑ بن جاتی' ایک بیل بن جاتی' پانی میں یہ صلاحیت نہیں تھی' ہوا اور روشنی میں نہیں تھی' صرف بیج کے اندر یہ صلاحیت تھی لیکن جب یہ اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ شفاعةً حسنةً میں اکٹھے ہوئے ہیں' ان سب کو ایک غذا ملتی چلی گئی' سامانِ نشو ونما ملتا گیا اور یہ سارے مل کر ایک خوشۂ انگور بن گئے۔اسی لیے کہا ہے کہ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (4:85) خدا کا قانون یوں ہر شے کو سامانِ نشو ونما عطا کر دیتا ہے۔

## کسی کی طرف سے خیر سگالی کا جواب دینے کا طریق محض ایک رسم بن کر رہ گیا ہے: ایک رسم ''السلام علیکم'' اور دوسری رسم ''وعلیکم السلام''

آپ نے مُقِیْتًا میں دیکھا کہ یہاں کیا بات آئی ہے! اسی کی تشریح آگے آرہی ہے کہ یہ نظام کیسے چلے گا۔عجیب آیات ہیں! کونسی آیت عجیب نہیں صاحب! آگے کہا ہے کہ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَآ (4:86)۔اس آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جائے گا کہ جب تمہیں کوئی دعا یا سلام کہے تو تم اس سے ذرا بہتر' جواب دو' ورنہ اس جیسا تو ضرور دو۔اور قرآن کریم کے اس حکم کی تعمیل ہمارے ہاں ''اسلام علیکم'' ہوتی ہے۔میں عرض کروں گا کہ یہ اسلام علیکم بڑی چیز ہے لیکن یہ صرف رسم بن کر رہ گئی ہے' میں صرف اس اسلام علیکم کا ذکر کرتا ہوں۔اس معاشرے پر غور کیجیے کہ جس میں ہر فرد دوسرے کو یہ یقین دلاتا ہو کہ ''وعلیکم السلام'' میری طرف سے بھی تُو امن میں رہے گا۔معاشرے کے ہر دو فرد جب ملیں' وہ ایک دوسرے کو اس بات کی ضمانت دیدیں کہ میری طرف سے تُو بالکل امن میں رہے گا۔یہ کیا خوب معاشرہ بنے گا! یہ سلام تو وہی ہے جسے آپ اسلام کہتے ہیں' تو یہی تو اسلام کا معاشرہ ہے' ہر فرد

دوسرے کے امن اور سلامتی کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ اندازہ لگائیے! وہ جب کہتا ہے کہ ''اسلام علیکم'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس چیز کا ذمہ دار ہوں لہٰذا تم میری ضمانت سمجھو اور میرے متعلق یقین رکھو کہ میں تمہارے امن اور سلامتی کا ذمہ دار ہوں اور دوسرا بھی یہی کہہ کر امن وسلامتی کا ذمہ دار بنے۔ ہر فرد دوسرے کی امن اور سلامتی کا ذمہ دار ہے۔

اب آپ کے ہاں ہوتا ہے ''سلام علیکم وعلیکم السلام'' یہ روز ہو رہا ہے یا آگے بڑھ کر مسنون طریقہ ''السلام علیکم'' کے ساتھ ہاتھ بھی لے رہے ہیں' اندر سے کہہ رہے ہیں اچھا! چل سہی باہر۔ یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں' یہ صرف سلامتی کی بات نہیں ہے' بات آگے پہنچ گئی لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ ترجموں سے بات کیسے ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ دیکھتے چلے جا رہے ہیں' قرآن حمید کے نسخے آپ کے سامنے ہیں' ترجمے آپ کے سامنے ہیں۔ عمل اس پہ یوں ہوتا ہے کہ جب کوئی تمہیں ''اسلام علیکم'' کہے تو **فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ**(4:85) تم اس سے بہتر طریق سے حیات بخش سامان بہم پہنچاؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہے کہ ''اسلام علیکم'' اور تم کہو ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' اس سے اور بڑھایا اگر وہ کہے ''اسلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تم کہو ''وعلیکم السلام رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ''۔ ''جے اووی نال برکاتہ کہہ دوے تے' ایہدے اگے گھوڑا ای مک گیا'' (اگر وہ بھی ساتھ برکاتہٗ کہہ دے تو اس کے آگے تو بات ہی ختم ہوگئی)۔ آج یوں اس حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اپنی جگہ ''اسلام علیکم'' بھی بڑی چیز تھی لیکن اس کی تعمیل آپ قرآن حمید کی رُو سے دیکھیے کہ جو تمہیں سلام کرے' تم اس سے بہتر جواب دو' یا کم از کم اتنا ہی لوٹا دو' ہمارے ہاں اس کی تعمیل یوں ہوتی ہے۔ دین جب مذہب میں بدل جاتا ہے تو اس کی شکل وصورت والفاظ تو وہی رہتے ہیں مگر وہ ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ''اسلام علیکم'' ہی آپ دیکھ لیجیے۔ یہ آپ کے ہاں رسم بن کر رہ گیا ہے' کسی کے قلب سے بھی وہ جذبہ نہیں ابھرتا جو اس کے اندر پنہاں تھا جس کے لیے یہ کہا گیا تھا۔ یہ چیز محض رسم بن کر رہ جاتی ہے۔

## باہمی رفاقت سے پیدا ہونے والے فرق کی نوعیت: اس سے بہتر سامانِ حیات دو

یہ چیزیں رسمی نہیں تھیں' یہ زندگی کے شعار تھے لیکن یہاں تو قرآن کریم بات کو سلام سے آگے لے گیا ہے۔ کہا ہے کہ **حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ** (4:86) یہ تو حیات ہے' اس کا تو مادہ ''ح ی ی'' ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ''تَحِيَّةٍ'' کے معنی دعا دینا بھی ہیں لیکن جب اس کے مادہ میں حیات کا مفہوم بنیادی ہے تو اس آیت میں ''تَحِيَّةٍ'' کے معنی ''حیات بخش'' زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہا ہے کہ جب کوئی بھی تمہیں سامانِ حیات بہم پہنچائے' تمہیں آکر زندگی بخش چیزیں عطا کرے' اس مفہوم سے بات کہاں سے کہاں

چلی گئی۔ امن اور سلامتی صرف Negative Aspect (منفی پہلو) ہے کہ میری طرف سے تو امن میں رہے گا' ابھی اس کے اندر کوئی Positive (مثبت) چیز نہیں آتی۔ اگرچہ پہلی چیز بھی بڑی ہے' اس معاشرے میں اگر اطمینان ہو جائے کہ بھئی! میں اپنے پڑوسی سے امن میں رہوں گا' یہ بھی بڑی چیز ہے لیکن اس سے بات آگے نہیں بنی۔ قرآن کریم یہ حُيِّيْتُمْ آگے بنا رہا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ اگر وہ امن وسلامتی کی ضمانت دے گا اور ساتھ کہے گا۔ جس پڑوسی کے ساتھ تمہارے تعلقات اچھے نہیں ہیں' وہ تمہارے ہاں سیویاں کیوں بھیجے گا' وہ تو خوشگواری کے تعلقات ہیں۔ امن وسلامتی کی ضمانت تو اپنی جگہ اس سے آگے یہ بڑھایا ہے کہ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ (4:86) جب کوئی تمہیں اس قسم کی چیز دے جو تمہاری زندگی میں اضافہ کرنے کا موجب بنتی ہے' تو یہ نہ کرو کہ اس کو لے کر ہضم کر جاؤ اور ہڑپ کر جاؤ۔ یہاں تو جو چیز اُدھر سے آ رہی ہے' وہ تعاون ہے' لفظِ تعاون کے اندر بھی تفاعل کے وزن پہ دو طرفہ چیز ہو' جسے آپ تعاون کہتے ہیں۔ عربی کے یہ الفاظ عربی زبان کے ابواب سے بات واضح کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ جب بھی تمہیں ایسی زندگی بخش چیز دے تو فَحَيُّوْا تم بھی ''حیات بخش'' سامانِ حیات دو۔ یہ کتنی جامع چیز ہے۔

## جہاں ہر شخص دوسروں کے لیے جینا سیکھ لے' وہاں زندگی موت کی بجائے جوئے رواں میں تبدیل ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! اب یہ چیز Positive (مثبت) ہو گئی' یہ صرف امن میں رکھنے کی بات نہیں ہے بلکہ کسی کو حیات بخش چیز کا دینا ہے۔ جب بھی دوسرے کی طرف سے تمہیں کوئی حیات بخش سامان ملے تو بِاَحْسَنَ مِنْهَآ (4:86) تو تم اسے اس سے زیادہ بہتر' حسین طریقے سے لوٹاؤ۔ اور اَوْ رُدُّوْهَا (4:86) اگر اس سے زیادہ نہیں دے سکتے تو کم از کم اُتنا ہی سامانِ حیات مہیا کرو۔ اللہ اکبر! عزیزانِ من! مسلمانوں کے معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے' ہر ایک دوسرے کے امن وسلامتی کا ذمہ دار ہے اور دوسرے کو سامانِ حیات دینے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ یہ اُسے دے رہا ہے' وہ اس سے لے رہا ہے۔ یہ ہے اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (4:86)۔ یہاں ''اَحْسَنَ'' وزن کے اعتبار سے نہیں کہا' حسن کے اعتبار سے کہا ہے کہ اس سے زیادہ حسین تر سامانِ حیات دو۔ اگر اتنی بھی توفیق نہیں ہے تو اَوْ رُدُّوْهَآ (4:86) کم از کم اتنا تو لوٹا ہی دو۔ اس کے لیے ہمارے ہاں یہ ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! ہم نے خود ہی اپنے اندر حساب کر لیا ہے کہ اتنا آیا ہے اتنا دینا چاہیے۔ ''پا جی! آ نیوندرا' جیہڑا اتھاڈے پیندا ہونداا ے ❶''۔ یہ ہماری اگلی نسل بیچاری تو مجھ سے اس کے بھی معنی پوچھے گی اور کہے گی کہ تمہاری لغات القرآن میں تو یہ لفظ ہی نہیں آیا ہے' انہیں یہ بھی

---

❶ بھائی جان! (شادی بیاہ پر) یہ ''لاگ'' (سلامی) ہے جو تمہارے ہاں ڈالا جاتا ہے۔

پتہ نہیں کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ یہ بڑی بوڑھیوں سے پوچھیے کہ ''نیوندرا'' کیا ہوتا ہے۔ سو برس کی وہ بے بے (بوڑھی عورت) ہے' معلوم نہیں کہ کس طرح ساری زندگی میں اسے یاد ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں فلاں کی شادی ہوئی تھی تو دو جوڑے لائی تھی اور فلاں کی منگنی ہوئی تھی تو اس نے ایک کٹورہ دیا تھا اور فلاں کی تقریب ہوئی تھی تو اس میں یہ یہ چیز لائی تھی۔ اسے سارے خاندان اور سارے رشتوں کی ساری فہرست یاد ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر اگلی چیز یہ ہے کہ اسے یہ بھی یاد ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ دیا تھا' وہ ہمارے ہاں آئے تھے تو انہوں نے نیوندرے کے اتنے روپے دیئے تھے' تو وہ تھوڑا سا نیوتا' کوئی جھکتا ہوا سا' ان کی طرف سے چار روپے آئے ہوئے ہیں۔ اگر تو چار کے چار دے آؤ تو پھر تمہارا ان کا حساب آگے نہیں چلے گا' لیکن تم چار کے پانچ دے آؤ کہ ان کی طرف جھکتا ہوا رہے تو حساب آگے چلتا رہے۔

## پوری دل جوئی سے باہمی رفاقت کو قائم رکھنے کا حساب انسان کی بجائے خدا پر چھوڑ دو

''اے نیوندرا کینوں کیندے ہیگے نیں؟ اے نیوندرا اے ہوندا ہیگا اے'' اگر یہ چار کے چار دے آتا ہے تو یہ ''نیوندرا نئیں ہوندا' او پا جی ہوندی ہیگی اے' اوہنوں پنج بنا لینا' تے فیر اک اوہدے ول ہو گیا''❶ اس کے معنی یہ ہیں کہ آگے جو تعلقات ہیں' وہ اس کے ساتھ باقی رکھنے ہیں کہ جب تمہارے ہاں شادی بیاہ کی تقریب ہو گی تو چونکہ ایک اس کی طرف نکلتا ہے اس لیے وہ آئے گا۔ یہ حساب ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ اگر یہ چیزیں ہوں تو خود حساب کرنے نہ بیٹھ جاؤ۔ سنو! اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا (4:86) نظامِ خداوندی ان تمام امور کا پورا پورا حساب رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ حساب ہم کر کے بتائیں گے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن حمید کی آیات میں خدا کی جو صفات آئی ہیں' ان سے یوں نہ گزر جایا کیجیے۔ ان میں تو اس نے سارے مفہوم کو Concentrate (مرتکز) کر دیا ہوتا ہے۔ اوپر مُّقِيْتًا کہا ہے' یہاں اِنَّ اللّٰـهَ كَـانَ عَـلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا (4:86) کہا ہے کہ یہ نہ ہو کہ اپنے ہی طور پر حساب کر کے مطمئن ہو جاؤ کہ ہاں صاحب! ہمارے ذمے اتنا تھا اتنا دے دیا۔ نہیں! حساب بھی ہم سے آ کر کراؤ' ہم جو تمہارے Accountant (حساب دان) بیٹھے ہوئے ہیں۔ حسیب وہ خود ہے۔ کہتا ہے کہ ہم سے حساب کراؤ' ہم سے حساب کرا کر پرچی لے جاؤ گے' کسی کو گلہ نہیں ہو گا۔ وہ دھرم کانٹے والا جو بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ صراف سے سونا خریدتے ہو تو ہزار شکایت ہوتی ہے' وہاں جا کر تلا لیتے ہو' تو پھر شکایت مٹ جاتی ہے' حساب کسی تیسرے نے کیا اور وہ واقعی اگر دھرم کانٹا ہے تو شبہ نہیں رہتا۔ کہتا ہے حساب کرانا ہو تو ہمارے دھرم کانٹے پہ آؤ' یہاں سے حساب کراؤ۔ اور اس نے یہ کانٹا اس قرآن کریم میں دیا ہوا ہے۔

---

❶ یہ ''لاگ'' کسے کہتے ہیں؟ وہ یہ ''لاگ'' (سلامی) ہوتا ہے۔ اگر یہ چار کے چار ہی واپس کر دیئے تو یہ برادری کا ''کھانا'' ہو جاتا ہے' ''سلامی'' نہیں ہوتی۔ اگر اس کے چار روپے کے پانچ روپے بنا لیے تو ایک روپیہ ان کی طرف زائد ہو جاتا ہے۔

## قرآنی معاشرے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی انسان کسی کا محتاج و محکوم نہ رہے مگر اس معاشرے کے قیام کے لیے ٹکراؤ ہوگا

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں یہاں کس معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ وہ فی سبیل اللہ جنگ ہے' یہ شفاعت دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جانا ہے' یہ مُقِیۡتًا سامانِ حیات بخش کسی کو بخش دینا ہے' اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا ہے' یہ کس لیے کیا جائے گا؟ یہ اس مقصد کے لیے کہ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ (4:87) انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ رہے' یہاں حکومت کا حق صرف اللہ کے قوانین کو حاصل رہے۔ اس مقصد کے لیے یہ سارا کچھ ہوگا۔ آپ دیکھیے کہ کس مقام پہ اس مقصد کو واضح کیا جا رہا ہے! جنگ بھی اس مقصد کے لیے ہے' تعاون بھی اس مقصد کے لیے ہے' شفاعت بھی اسی کے لیے ہے' یہ جو تحیۃً ہے' یہ چیزیں بھی اس کے لیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کہا ہے کہ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ (4:87) کائنات میں اختیار و اقتدار صرف ایک خدا کا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کے سامنے جھکا جائے اور اس کی محکومی اختیار کی جائے۔ انسانوں کی دنیا میں بھی صرف اسی کا قانون رائج ہونا چاہیے۔ باقی رہے یہ مخالفین' ان کے لیے ہم نے تمہیں مختلف چیزیں بتائی ہیں کہ انہیں سمجھاؤ' ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' ان کے ساتھ حسنِ سلوک رکھو' بتاؤ کہ غلط راستے غلط منزل کی طرف لے جاتے ہیں' صحیح راستے کونسے ہیں۔ اس کے باوجود اگر یہ سرکشی سے باز نہ آئیں' ظلم و استبداد کو نہ چھوڑیں' جرم سے اجتناب نہ کریں تو کوئی بات نہیں اس مخالفت کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ (4:87) آنے والے انقلاب کے وقت تم اور تمہارے مخالفین' میدانِ جنگ میں ایک ساتھ جمع ہونگے۔ یہ ٹکراؤ ہو کر رہے گا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن ہمارے مروّجہ ترجموں میں پھر وہی بات آ جائے گی کہ تمہیں ہم قیامت کے دن اکٹھا کریں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے' ٹھیک ہے' لیکن عزیزانِ من! صرف قیامت کے دن اکٹھا کرنے سے یہاں کی بات تو نہیں سنورتی' یہ سارا کچھ تو یہاں کی باتیں سنوارنے کے لیے ہو رہا ہے۔ وہ[1] تو یہاں کہہ گیا تھا کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

## قرآنِ حکیم تو انسان کی اس زندگی کے لیے ضابطۂ حیات ہے

جس نظام میں یہاں انسانیت کے دکھوں کی دوائیں نہیں ہوتیں وہ انسانیت کے لیے کسی کام کا نہیں ہوتا۔

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797ء) کی طرف ہے۔

پس از اں کہ من نہ مانم واقع چہ کار خواہی آمد

جب میں ہی نہ رہونگا تو تمہارے یہ سارے علاج معالجے' کاریگریاں کس کام آئیں گی صاحب! میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔اس لیے یاد رکھیے! جیسا میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں قرآنِ کریم میں یہ جتنی چیزیں ہیں' جسے آپ قیامت کا اجتماعِ حشر کہتے ہیں' فیصلے کی گھڑی کہتے ہیں' مرنے کے بعد کی ان ساری چیزوں پر ہمارا ایمان ہے' وہ اپنے مقام پر ہیں لیکن وہ اور منزلیں ہیں' وہ اور مقام ہیں۔ اس دنیا کے اندر بھی یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں' یہیں فیصلے ہوتے ہیں' یہیں اجتماعات ہوتے ہیں۔

## نوعِ انسانی جہانِ نو کی تشکیل کے لیے نظامِ سرمایہ داری کے زوال کی منتظر' نیز قانون اور حکم میں امتیاز

کہا کہ اگر یہ اس طرح اپنی سرکشی سے باز نہیں آتے تو قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ آخری دور میں یہ پورا نظامِ سرمایہ داری جو دوسروں کی محنت کو چوس کرلے جاتا ہے بالآخر ڈوبے گا۔اب سوال یہ ہے کہ یہ کب ڈوبے گا۔اس کے لیے اقبالؒ (1938-1877ء) نے بھی کہا ہے کہ ''کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ''۔اس کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ڈوبے گا جب **يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) انسانیت خدا کی ربوبیت کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔یہ یہاں قام کا لفظ ہے' وہیں سے قیامت ہے' اس 'ۃ' کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی چیز یکبارگی کر دینا'' اسی کو انقلاب کہتے ہیں۔فساد نہیں کہتے۔فساد اور انقلاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ہمارے ہاں یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ فسادات ہو رہے ہیں۔انقلاب ہوتا ہے ''انسانیت کے لیے جو ایک تعمیری مقصد سامنے ہو' اس کے لیے ایک نظام کو بدل دینا''۔کہا ہے کہ اس مقصد کے لیے کوئی بات نہیں ہے' مقصد یہ ہے کہ محکومیت خدا کے سوا کسی کی نہ رہے۔اس کے لیے یہ تیاریاں تھیں جو پہلے کہی ہیں' اس کے لیے یہ جماعت بنے گی تو آخر میں اسے میدان کے اندر جمع ہونا پڑے گا' اور وہ ہو کر رہے گا۔اور وہاں جا کر پھر یہ چیز سامنے آجائے گی کہ حق وصداقت کو جو جماعت لے کر اٹھتی ہے' کس طرح خدا کی نصرت اور فتح اس کے ساتھ ہوتی ہے۔کہا ہے کہ **وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا** (4:87) یہ بات ہم کہہ رہے ہیں اور تمہیں ہم سے زیادہ سچی بات کہنے والا اور کون ہے۔جہاں جہاں قرآن کریم میں یہ آیا ہے کہ خدا نے یہ وعدہ کیا ہے' خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا' خدا اپنی بات کا پکا اور سچا ہے' یہ وعدے' یہ بات کا پکا سچا ہونا' کیا ہے؟ آج کی اصطلاح میں اسی کو تو قانونِ خداوندی کہتے ہیں۔قانون کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تبدیل نہ ہو۔حکم وہ ہوتا ہے جو اس وقت کچھ اور حکم ہوتا ہے' دوسرے وقت میں کوئی اور حکم دیا جا سکتا ہے۔حکم کے معنی فیصلہ ہوتے ہیں لیکن جو فیصلہ اس قسم کا ہو کہ اس میں کبھی تبدیلی نہ آئے' وہ Law (قانون) بن جاتا ہے۔یہ جیسے کہا جاتا ہے کہ خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا' اس کے معنی یہ ہیں کہ قانونِ خداوندی میں تبدیلی نہیں آتی۔

## خدا کے وعدہ سے مراد خدا کے قانون کی حاکمیت کا ثمر بار ہونا ہے

کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (24:55) ہم نے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل کیا کہ انہیں اس زمین میں استخلاف، تمکن، مملکت، قدرت، حاصل ہو جائے گی۔ خدا نے وعدہ کیا ہے، بات کیا ہوئی؟ یہ کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ تمکن فی الارض ہے۔ یہ قانونِ خداوندی ہے۔ اور خدا کے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں یعنی اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ معنی ہوتے ہیں جہاں خدا یہ کہتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (4:87) یہ بات خدا کی طرف سے کہی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہے؟ یہ ہو گیا ایک معاشرہ۔

## تین گروہوں کا ذکر اور کچھ غلط فہمیاں

اب آگے ایسے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے، ان سے پوچھو تو ہر وقت کہیں گے کہ الحمدللہ، ہم مسلمان ہیں، مردم شماری کے رجسٹر میں یہی چیز لکھی ہوئی ہے۔ یہ غالباً ووٹوں کی فہرستیں جو بنی ہوئی ہیں، ان میں یہی ہوگا۔ جہاں بھی دیکھیے کہتے ہیں کہ الحمدللہ! اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ دو گروہ تو وہ ہیں جو، یا کھلے بندوں حقیقت کا اقرار کرتے ہیں، یا کھلے بندوں اس سے انکار کرتے ہیں، جو کھلے بندوں انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم مسلمان نہیں ہیں، ٹھیک ہے وہ (مثلاً) ہندو ہیں۔ اب یہ ایک اور کیٹگری (شق) ہے جو صرف زبان سے کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! الحمدللہ! ہم مسلمان ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ ایمان نہیں لائے، وہ مومن نہیں ہیں۔ اب سوچیے کہ یہ کون لوگ ہیں۔

قرآنِ کریم میں جہاں کہیں منافقین کا ذکر آتا ہے تو ہمارے ہاں تو یہ بات عام ہو گئی ہے کہ منافقین مدینے میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے، اس کے بعد ان کا خاتمہ ہو گیا تو یہ ساری آیتیں ان کے متعلق تھیں۔ اب یہ جتنی بھی آیتیں ہیں، یہ ساری ذلت اور خواری اور نکبت کی ہیں، یہ ساری زبوں حالی کی ہیں اور یہ یہودیوں کے متعلق ہیں۔ اُدھر دوسری طرف یہ چیز ہے کہ جنہوں نے غلط عقائد پیدا کر لیے اور غلو میں محبت اور عقیدت کے جوش میں، بندوں کو خدا بنا لیا، وہ تمام کی تمام عیسائیوں کے لیے ہیں۔ اور تیسری

طرف یہ چیز ہے کہ صاحب! ''یہ جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کی پرستش کرتے ہیں' اوروں کے احکام مانتے ہیں'' یہ آیات مشرکینِ قریش کے متعلق ہیں۔ پھر پوچھو کہ ''تمہاڈے متعلق کی اے؟ کہ جی! جنت ساہڈے واسطے ہے جی' اے سارا قرآن ہوراں دے متعلق ہے'' (تمہارے متعلق کیا ہے؟ کہ جی! ہمارے لیے جنت ہے جی! یہ سارا قرآن دوسروں کے لیے ہے)۔ ذرا سوچیے تو سہی وہ جو کہہ رہا ہے کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ** (2:8) ان لوگوں کو دیکھو جب پوچھو کہتے ہیں کہ الحمد للہ صاحب! ہم ایمان لائے ہوئے ہیں لیکن **وَ مَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ** (2:8) انہیں وہ منافق کہتا ہے۔ تو یہ کیا ہوا؟ یہ کہ چودہ سو سال پہلے ایک جماعت ہوتی تھی' پھر اس کے بعد وہ مر مرا گئی' ان کی نسل بھی ختم ہوگئی' یہ قصہ ختم ہوا۔ کیا پھر آگے کوئی نہیں ہے؟ لیکن اسے تسلیم کرنے کے لیے تو بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر وہ ایمان کے یا اس نظام کے دعویدار جو اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت اپنے اعمال سے نہیں دیتے' منافقین کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ معذرت اور چیز ہے' کسی وقت کوئی کوتاہی ہوگئی ہے' کوئی خطا ہوگئی ہے' کوئی نسیان ہوگیا ہے' لغزش ہوگئی ہے' اس کا اعتراف تو فوراً کیا جاتا ہے۔ اگر روشِ زندگی یہ ہو کہ جب کہیے اس وقت زبان سے یہ اقرار ہو کہ صاحب! ہاں' ہم مسلمان ہیں اور اعمال سے کبھی اس کی تصدیق نہ ہو' تو یہ تھا وہ گروہ جس کا ذکر ہمیشہ آتا ہے۔

## مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں بٹی ہوئی قوم کی نفسیاتی کیفیت اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

اب ان کے متعلق بڑی عجیب چیز آ رہی ہے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے' چھوٹے چھوٹے پیمانے پر جماعتیں بنتی ہیں' آرگنائزیشن ہوتی ہیں' تنظیمیں ہوتی ہیں' ان میں اس قسم کے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ اگر ان کے متعلق بات ہوتی ہے کہ صاحب! یہ تو بڑا تخریبی سا آدمی ہے' یہ کچھ ہے۔ اس وجہ سے آپ کے اندر دو گروہ ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ جو کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! یہ ٹھیک ہے' یہ بڑا خطرناک گروہ پیدا ہو گیا ہے' ہمیں ان کو کاٹ کر الگ کر دینا چاہیے' اسی سے ہم سلامت رہیں گے۔ دوسرا گروہ وہ ہوگا جو کہتا ہے کہ نہیں نہیں صاحب! اس معاملے کے اندر ایسا متشدد تو نہ ہو جائیے' کچھ مفاہمت کرنے کی' کچھ Compromise (مصالحت) کرنے کی کوشش کیجیے' کچھ تھوڑا بہت جو ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' اٹھا لینا چاہیے۔ آپ نے دیکھا کہ ہمیشہ یہ دو گروہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ کیفیت تھی۔ یہ گروہِ منافقین ہے۔ ان منافقوں کا دعویٰ مصلحت کوشیوں پر مبنی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **فَمَا لَکُمۡ فِی الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِئَتَیۡنِ** (4:88) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس قسم کا گروہ بن گئے ہو کہ جس کے متعلق تمہاری جماعت کی ایک ہی رائے ہونی چاہیے' اب ان کے متعلق دو رائے ہوگئیں۔

عزیزانِ من! منافق کے متعلق تو قرآن کریم دو آراء کی اجازت بھی نہیں دیتا چہ جائیکہ ان سے مفاہمت کی اجازت دیدے۔ یہ کافر سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے' یہ مارِ آستین ہوتا ہے اور کافر کھلا ہوا دشمن۔ آپ کو معلوم ہے کہ کافر دشمن ہے' اس سے آپ مدافعت کا سامان پیدا کیجیے لیکن یہ جو دوست بن کر آپ کے ساتھ ہے' جتنا یہ نقصان پہنچائے گا' اتنا وہ کھلا دشمن کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اور

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کافر کو جہنم کے پست ترین درجے میں نہیں کہا ہے' منافق کے متعلق کہا ہے کہ **درک اسفل**❶ جہنم کے اندر منافق ہوتا ہے۔ یہ بدترینِ خلائق ہوتا ہے' Characterless (بے کردار) ہوتا ہے۔ کافر کھلا ہوا دشمن ہے' اس کا اپنا ایک کیریکٹر ہوتا ہے' کھل کر سامنے آتا ہے' کھل کر آپ کے ساتھ مخالفت کرتا ہے۔ یہ شخص اپنی مخالفت کے اندر کمینہ ہے' دوست داری کا دعویٰ کرتا ہے مگر منافقت کرتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ان کے متعلق دو رائے نہیں ہونی چاہئیں۔ یہ بڑی اہم آیت آ گئی ہے۔ منافقین کے متعلق کہا ہے کہ **وَ اللّٰہُ اَرۡکَسَہُمۡ بِمَا کَسَبُوۡا** (4:88) اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا سر جھکا دیا' انہیں ذلیل وخوار کر دیا' انہیں سخت مصیبت میں ڈال دیا۔ کہا ہے کہ یہ منافقین اس سمت کو جا رہے ہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ **الرکس** ''اس کو کسی معاملے میں اوندھا کر دینا'' کہتے ہیں کہ ''مت ماری جائے' جس کی عقل وفکر ماؤف ہو جائے' جو سمجھ بوجھ سے کوئی کام نہ لے''۔

## ''چاندی کی انگوٹھی پہ سونے کا جھول'' آخر کار ظاہر ہو ہی جاتا ہے

حقیقت میں منافق بنتا تو بہت چالاک ہے لیکن قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں دھوکا دے کر کام نکالا جا سکتا ہے۔ تھوڑے سے وقت کے لیے تو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن یہ ہے ''چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول''۔ آپ کو یاد بھی ہے یا نہیں کہ بچپن میں کیسے عمدہ نصاب (Curricula) ہوتے تھے' مولانا اسماعیل میرٹھی (1844-1917ء) کی یہ نظم ''ملمّع کی انگوٹھی'' صاف سادہ چھوٹے چھوٹے سے پیمانے پہ ہے' یہ نظم تیسری چوتھی جماعت کی کتابوں میں ہوتی تھی۔ چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا ملمع چڑھا تو وہ اترانے لگی' کہنے لگی بڑا بول❷' اور یہ کہ ''چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہونگی' وہ اور ہے میں اور یہ ذلت نہ سہوں گی''❸۔ وہ بڑی عمدہ نظم تھی۔ اور اس کے بعد اس نے پھر یہ کہا کہ نہیں نہیں کوئی بات نہیں ''جب تاؤ دیا جائے گا' ہو جائے

---

❶ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ (4:145) یقیناً منافقین' جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق ہیں۔ یہ وہیں رکھے جائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔225)۔

❷ چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول — اوچھی تھی لگی بولنے اترا کے بڑا بول

❸ چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہوں گی — وہ اور ہے میں اور یہ ذلت نہ سہوں گی

میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانہ — وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اس کا ٹھکانا

میری چمک اُس میں' نہ میری سی دمک ہے — چاندی ہے کہ ہے زانگ مجھے اس میں بھی شک ہے

میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ — وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ

اے دیکھنے والو! تمہیں انصاف سے کہنا — چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا

یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل — اللہ رے ملمّع کی انگوٹھی تیرے چھل بل

سونے کے ملمّع پہ نہ اِترا میری پیاری — دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائے گی ساری

کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا — جھوٹوں نے جو بچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا

گا منہ فق''❶۔ بات ساری اتنی ہے' تھوڑا سا تاؤ آنا چاہیے' بس آگ پہ رکھی جاؤ گی' پتہ چل جائے گا کہ یہ کیا ہے۔ یہ منافقت کا خول جو اوپر چڑھ جاتا ہے بڑی جلدی اتر جاتا ہے۔ اگر ادھر صداقت ہو' جرأت ہو' ان کے متعلق دو رائے نہ ہوں' یہ جو دوسری رائے والے ہوتے ہیں' یہ منافقت کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ قرآن مُبین اس لیے دو رائے نہیں کرنے دیتا۔ کہتا ہے کہ وہ بظاہر تمہارے دوست بنتے ہیں لیکن بباطن تمہاری تخریب چاہتے ہیں۔ ان کی پوزیشن ایسی واضح ہے کہ ان کی بابت دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

## تقدیر کے مسئلے کی وضاحت: اللہ' اعمالِ انسانی' گمراہی اور قانون کی کڑیاں

سنیے! قرآن حمید کیا کہہ رہا ہے کہ یہ جو اس طرح سے ''اوندھے منہ جا رہے ہیں'' یہاں ان کے لیے بِمَا كَسَبُوْا (4:88) آیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بات بڑی اہم آ گئی ہے۔ جسے آپ مسئلہ تقدیر کہتے ہیں' قرآن حمید اسے ایسی عمدگی سے حل کر گیا ہے۔ یہاں By the way (یونہی ضمناً) بات آئی ہے۔ دیکھیے صاحب! کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (4:88)۔ یہاں اللہ فاعل ہے۔ ''اللہ نے ان کو اوندھا کر دیا''۔ اب جھٹ سے ہمارے ہاں وہ بات آ جاتی ہے کہ صاحب! پھر ان کا قصور کیا ہے' اللہ نے ان کو کر دیا؟ قرآن حمید کہتا ہے کہ بِمَا كَسَبُوْا (4:88) ان کے اعمال کے نتیجے میں اللہ نے یہ کر دیا۔ دیکھا! وہ قانونِ خداوندی اپنی جگہ پہ رہا۔ اللہ نے کیا ہے اور ساتھ ہی کہا کہ بِمَا كَسَبُوْا ان کے اپنے اعمال ہی کے' کسب کی' وجہ سے یہ ہوا۔ یہ بِمَا كَسَبُوْا بڑا اہم ہے جو قرآن حمید یہاں لایا ہے۔ آگے دیکھیے! کہا ہے کہ اَتُرِيْدُوْنَ (4:88)۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (4:88) اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ''کیا تم چاہتے ہو کہ جنہیں خدا نے گمراہ کر دیا ہے ان کو تم صحیح راستے پہ لے آؤ؟'' وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَلَهٗ سَبِيْلًا (4:88) جس کو خدا گمراہ کر دے تُو اس کے لیے کوئی صحیح راستہ نہیں پائے گا۔ اب اگر صرف اتنے ٹکڑے لیے جائیں تو بات صاف ہو گئی کہ جسے خدا گمراہ کر دے صاحب! اسے کون راہِ راست پہ لا سکتا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جسے خدا نے گمراہ کر دیا' تم اسے راہِ راست پر لے آؤ۔ یہ سلسلۂ رشد و ہدایت کا ہونا' یہ انبیا کا آنا' یہ کتابوں کا آنا' یہ ان کا تبلیغ کرنا' ہدایت کے راستے پہ بلانا' یہ تو ساری بات ختم ہو گئی' جو ہدایت پر نہیں چلتا' گمراہ ہے ان کے لیے عذابِ جہنم کا یہ سارا سلسلہ ہی بیکار نظر آتا ہے۔ اس ایک آیت کے یہ معنی لینے سے کہ ''جسے چاہے خدا گمراہ کر دے'' یہ ہوتا ہے۔

---

❶
مت بھول کبھی اصل کو اپنی اری احمق! — جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائے گا منہ فق
سچے کی تو عزت ہی بڑھے گی جو کریں جانچ — مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ
کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا — چھوٹے کو بڑا بن کے ابھرنا نہیں اچھا

میں نے کہا ہے کہ قرآن حکیم تو عجیب کتاب ہے صاحب! یہ جو درمیان میں بِمَا کَسَبُوْا (4:88) ہے' اس نے ساری بات واضح کردی کہ یہ سارا کچھ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو ہو رہا ہے۔ خدا اس لیے آتا ہے کہ وہ ہر ایک کے اعمال کا صحیح نتیجہ مرتب کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سنکھیا کھاؤ اور مصری کی ڈلی کا اثر پیدا ہو جائے۔ اسے یوں کہہ لیجیے کہ خدا ہلاک کر دیتا ہے اس شخص کو جو سنکھیا کھا جاتا ہے۔

یہ جو بِمَا کَسَبُوْا (4:88) آیا ہے' دیکھیے اس نے بات کو واضح کر دیا ہے' سارا مسئلہِ تقدیر اس میں آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! انسان اپنے سارے انجام و عواقب کا خود ذمہ دار ہے' یہ سب اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خدا اپنی طرف اس لیے نسبت کرتا ہے کہ اس نے ہر چیز کے اندر' ایک قانون کے ذریعے یہ تاثیر رکھی ہوئی ہے۔ 'خدا فصل اگاتا ہے' حالانکہ وہ کسان اگا رہا ہوتا ہے' اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ اس طرح سے بیج ڈالو' ایسی زمین ہو' ایسے پانی دو' ایسے رکھوالی کرو تو فصل اگ آئے گی۔ اس اعتبار سے تو وہ خدا کی طرف سے ہے لیکن بِمَا کَسَبُوْا (4:88) کہتے ہیں کہ فصل تمہاری اپنی ہمت اور محنت کے نتیجے میں پیدا ہوگی۔ قانون اس کا ہے' اس کے مطابق عمل کرنا انسان کا کام ہے۔ جب وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ دیکھا! ہم نے تمہاری محنت میں کتنے کتنے پھل دیئے۔ جب وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ہلاکت ہو جاتی ہے تو اس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھا! خدا کے خلاف چلنے سے تمہیں کیا ہوا۔ آپ بِمَا کَسَبُوْا پر نگاہ رکھیے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ یہ چیز تمہارے ذہن میں آ سکتی تھی کہ غلط راستے پہ چل رہے ہیں' ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں کوشش کرنی چاہیے لیکن یہ ہوا کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (4:88) انہوں نے غلط روش اختیار کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ یہ جو ہے کہ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَلَهٗ سَبِيْلًا (4:88) جسے خدا گمراہ کر دے' اس کے لیے تُو کوئی راستہ نہیں پا سکتا ' اس کے معنی یہ ہیں کہ جو خدا کا تجویز کردہ راستہ چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرلے' دنیا کا کوئی شخص' کوئی دوسرا راستہ تجویز کر کے صحیح منزل تک لے جا ہی نہیں سکتا' اسی راستے کے اوپر لانا پڑے گا جو خدا نے تجویز کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ لَنْ تَجِدَلَهٗ سَبِيْلًا (4:88) اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں پا سکتا۔ غلط راستے پہ چلتا جائے' ساری عمر چلتا جائے' ایک غلط راستہ چھوڑ کر آپ اس کو کسی دوسرے غلط راستے پہ ڈال دیجیے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل پر پہنچنے کے لیے تو اسی راستے سے آنا پڑے گا جس صحیح راستے کو چھوڑ کر اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ صحیح راستہ چھوڑ کر جو غلط راستہ اس نے اختیار کیا' اس صحیح راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے پہ چل کر منزل پہ پہنچ جائے تو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ معنی ہیں اس کے جسے آپ کہتے ہیں کہ جسے خدا گمراہ کرے اس کو کبھی صحیح راستہ نہیں مل سکتا۔ بہ الفاظِ دیگر جو خدا کے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کرے وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ اسی راستے پر نہ آ جائے جو اس کے لیے خدا نے تجویز کیا تھا۔

عزیزانِ من! یہ ہے سارا مسئلہ۔ کہا ہے کہ اس لیے ان منافقوں کے متعلق تم دو رائے کیوں قائم کرتے ہو! ان سے کہو کہ بِمَا کَسَبُوْا اپنے کسب کو بدلیں۔ یہ کسب تو ایسا نظر آتا ہے جیسے ''پنجابی دا ہونداائے اوئے کی کسب کرنا پیا ایں؟'' (جیسے وہ پنجابی میں ''کسب'' کا کہتے ہیں کہ اب! تم کیا کرتُوت کر رہے ہو؟) آپ کو پتہ ہے کہ یہاں کسب کے کیا معنی ہوتے ہیں ''اینان نے کسب ای ایہو جئے کتے سی'' (انہوں نے کرتوت ہی ایسے کیے تھے)۔ یہ ہے بِمَا کَسَبُوْا (4:88)۔ لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ یہ صحیح طریقے پہ آئیں تو ان سے کہو کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں ورنہ اگر تم یہ چاہو کہ یہ کسب تو یہی کرتے رہیں اور یہ تمہاری جماعت کے رفقاء اور شرکاء بھی ساتھ ہی رہیں تو یہ غلط ہے' تم اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو' یہ نہیں ہوگا۔ ان کی تو یہ کیفیت ہے۔

## منافق کی انتہائی کوشش دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے کی ہوتی ہے

تم چاہتے ہو کہ یہ مخلص بن کر' صداقت کے ساتھ' تمہارے نظام میں شریک ہوں' تمہارے ساتھ ہوں مگر ان کی کیفیت تو یہ ہے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا (4:89) ان کے ارادے یہ ہیں کہ جیسے یہ کافر ہوئے ہیں تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ' دینِ حق کو چھوڑ دو۔ یہ جو جماعت کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں' ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ یہ ہمارے جیسے ہو جائیں' یہ ہمارا راستہ اختیار کریں۔ کہا ہے کہ بتاؤ تو سہی کہ جو غلط راستے پہ چل رہے ہیں اور جن کی کوشش یہ ہو کہ جو صحیح راستے پہ چلتا ہے انہیں بھی کسی طرح سے ورغلا کر اپنے ہی راستے پر لے آئیں تو ان کے متعلق دو رائے کس طرح سے ہو سکتی ہیں۔ وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ کسی طرح یہ صورت پیدا ہو کہ فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:89) تم اور یہ دونوں برابر ہو جائیں۔ برابر ہونے کی مثال' میں عام طور پہ دیا کرتا ہوں اور وہ بڑی صحیح مثال ہے۔ حق اور باطل میں' غلط اور صحیح میں Compromise (مفاہمت)' نہیں ہو سکتی' یہ ہے ہی ناممکن۔ قرآن کریم نے یہ بڑی چیز کہی ہے کہ فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:89) تم اور یہ ایک ہی لیول پہ آ جاؤ' ایک سطح پہ آ جاؤ' ایک جیسے ہو جاؤ۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ صاحب! دو اور دو چار ہوتے ہیں' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' دو اور دو پانچ ہوتے ہیں' ان میں جھگڑا ہو گیا' اختلافی بات ہو گئی۔ اب آ گئے راستے چلتے ہوئے ثالث۔ انہوں نے کہا کہ ''چھوڑو چھوڑو! جھگڑا نئیں کریدا' لڑائی نئیں کریدی' بڑی بری بات ہیگی اے'' (چھوڑو' ہٹو' جھگڑا نہیں کیا کرتے' لڑائی نہیں کرتے' یہ بڑی بُری بات ہے) کہ جی میں کہتا ہوں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں' یہ کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ بھائی صاحب! جب تک آپ دونوں اپنی ضد پہ اڑے رہو گے آپس میں اتفاق کی کوئی صورت نہیں ہو گی' جھگڑا رہے گا صاحب! شریف آدمی کا قاعدہ یہ ہے کہ کچھ تم گھٹو' کچھ یہ بڑھے' یوں ہو گا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! میں تو دو اور دو چار کہتا ہوں' کہنے لگے پھر تمہاری ضد کا کیا علاج کیا جائے' صاحب! یہ نہیں باز آتا' وہ تو تیار ہے۔ یعنی وہ دو اور دو پانچ کہنے والا بالکل بھلا مانس شریف بن گیا' جھگڑا مٹانے والا ہو گیا' یہ دو اور دو چار کہنے والا ضدی فسادی بنا کہ مانتا

ہی نہیں ہے' سب اس کو منا رہے ہیں' یہ چلتا ہی نہیں ہے۔ اب آپ اُس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

## دو جمع دو چار کا کم ہونا اگر باطل ہے تو زیادہ ہونا بھی باطل ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:89) کے معنی یہ ہوئے کہ اگر تم نے ان کی بات مان لی کہ اچھا بھئی! کچھ تھوڑا سا تم گھٹو' وہ کہنے لگا کہ اچھا جی' دو اور دو ساڑھے چار ہوتے ہیں۔ کہا کہ بھئی! کچھ تم گھٹو تھوڑا سا' اچھا جی! دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ اُس نے اگر دو اور دو پانچ کی بجائے ساڑھے چار بھی کہا تو وہ تو وہیں کا وہیں رہا' اس نے اگر چار کی بجائے ساڑھے تین کہہ دیا تو یہ باطل ہو گیا۔ یہ ہے فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:89)۔ دونوں باطل پہ ہو جاؤ گے۔ کیا بات ہے صاحب قرآن حکیم کی! تم نے ذرا سی بھی مفاہمت کی تو تم نے وہی کچھ کیا کہ دونوں ایک جیسے ہو جاؤ گے۔

عزیزانِ من! میں اس کے بعد کیا عرض کروں' میں تو اپنے ہوش میں نہیں رہتا جب اس فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:88) پہ آتا ہوں۔ آگے کہا ہے کہ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ (4:89) اس لیے ان سے دوستی کے متعلق کوئی بات ذہن میں نہ سوچ لینا' دوستی ان سے کرنی ہوگی تو اس شرط پر کہ وہ دو اور دو چار مانتے ہوں تو پھر تم سے دوستی ہوگی اور جونہی تم نے دو اور دو پونے چار بھی کہا تو تم فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (4:89) انہی کی سطح کے برابر آ گئے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ نہیں! یہ ساڑھے چار پہ نہیں مانا' یہ تو پونے چار پہ رہا ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ برابر نہیں ہے۔ کیا بات ہے صاحب! حق اپنے مقام سے ایک انچ کے 100 ویں حصے کے برابر سرک گیا تو باطل کے مقام پر آ گیا' خواہ حساب و کتاب کی رو سے دونوں کے اندر ہزاروں کا فاصلہ کیوں نہ ہو' دونوں باطل کے اوپر آ گئے: فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً دونوں ایک مقام پہ آ جائیں گے۔ اس کے لیے یہ کوشش کہ ان کے ساتھ کچھ Comprimise (مفاہمت) کر لی جائے' سر تا پا غلط ہے' باطل ہے اور اسی کو کہا ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا (4:89) ان کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح یہ خود باطل پہ ہیں' کوئی Compromise (مفاہمت) کی شرط ان سے پیدا کر کے تمہیں بھی کفر پر لے آئیں۔ برادرانِ عزیز! حق سے ذرا سا انحراف کفر ہو جاتا ہے فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً دونوں ایک سطح پہ آ جائیں گے۔ لہٰذا فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ (4:89) ان سے دوستی والی بات کرنے سے' Compromise (مفاہمت) کرنے سے' دوستانے کے اندر Compromise (مفاہمت) کرنے سے دونوں باطل پر آ جاؤ گے۔ اُس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' وہ تو پہلے بھی باطل پہ تھا' اب بھی باطل پہ ہے ''تہاڈے ہتھ پلے لکھ نئیں رہنا'' (تمہارے پلّے کچھ نہیں رہے گا)۔ حق والا باطل پہ چلا گیا تو اس کے پاس کیا رہا! یہ کبھی نہ کرو' خواہ اس کی کوئی شکل بھی ہو' ہاں البتہ ایک شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:89)۔

## لفظ ہجرت کا بنیادی مفہوم

یہاں (4:89) میں لفظ یُھَاجِرُوْا آیا ہے۔ہم اس کے معنی ہجرت کرتے ہیں اوراس کا مفہوم ایک ہی لیتے ہیں یعنی مکے سے مدینے چلے جانا۔اس کے تو معنی ہوتا ہے ''چھوڑ دینا' ترک کر دینا''۔اس میں سب چیزیں آ جاتی ہیں' ایک آخری وقت وہ بھی آتا ہے جہاں حق کی خاطر وطن بھی چھوڑنا پڑتا ہے لیکن وہی چیز ہجرت نہیں ہے۔یہاں کہا ہے کہ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (4:89) تا آنکہ یہ خدا کے راستے میں اپنی ضد پہ اڑی ہوئی جو بات ہے' جو اپنا مطالبہ ہے جس چیز کو یہ خود کہتے ہیں' اس کو نہ چھوڑ دیں' اس وقت تک تم ان کے ساتھ نہیں چل سکتے۔یہ ترک کریں' یہ اپنے مقام سے ہٹیں۔یہ ہٹیں گے تو حق پہ آ جائیں گے' پانچ والا اگر چار کہہ دے گا تو حق پہ آ جائے گا' تم نے اگر چھوڑ دیا تو تم باطل پہ چلے جاؤ گے۔لہٰذا ان کے ساتھ دوستی کا طریقہ یہ ہے کہ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (4:89) تم نہیں' یہ اپنا مقام چھوڑ کر خدا کی راہ کے اندر اس مقام پہ آ جائیں۔اوراس میں یہ چیز بھی ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے کہ فَاِنْ تَوَلَّوْا (4:89) اگر ایسا کرنے کے بعد یہ دوبارہ جائیں تو پھر بار بار یہ Risk (خطرہ) نہیں لیا جا سکتا' یہ تماشا نہیں بنایا جا سکتا' یہ تجربہ ہو گیا۔جو ایک چیز پر تجربہ کرنے کے بعد دوبارہ اس پہ تجربہ کرتا چلا جاتا ہے' اس کو ندامت ہوتی ہے۔کہا ہے کہ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَ اقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ (4:89) پھر اُن کے ساتھ جو اس قدر شرارت اور فتنے پر ابھرے ہوئے ہیں' کھلے بندوں سامنے بھی نہیں آتے ہیں' مارِ آستیں بنے ہوئے ہیں' اسی طرح سے جنگ کرو جیسا کہ تم کفار کے ساتھ' مخالفین کے ساتھ' جنگ کرتے ہو' جہاں پاؤ ان کو قتل کر دو۔وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (4:89) اور کبھی ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار بھی نہ سمجھو' یہ مددگار بھی نہیں ہونگے' یہ مارِ آستیں ہیں' پھر تمہیں دھوکا دے جائیں گے۔کہا ہے کہ جہاں بھی ان کو پاؤ' ان کے خلاف ایسی عالمگیر جنگ چھیڑو کہ یہ جہاں بھی جائیں تم ان کا پیچھا کرو۔

## قرآنِ حکیم کے ہاں معاہدہ کی پاس داری کے سنہری اصول کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ قرآن حکیم ہے۔کہا ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ (4:90) بجز اس کے کہ یہ اس قوم کے ساتھ جا ملیں جن کے ساتھ صلح کا تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے۔آ ہاہاہا! معاہدوں کا احترام اسے کہتے ہیں۔کھلا ہوا دشمن بھی ان کے ساتھ جا ملے' جس قوم کے ساتھ معاہدہ ہے' پھر تم اس کے خلاف بھی کچھ نہیں کر سکتے۔اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَھُمْ (4:90) یا یہ آ کر تھک کر کہہ دیں کہ صاحب! ہم جنگ سے باز آئے' ہم تھک گئے' وہ اپنی شکست تسلیم کر لیں اور کہیں کہ اب ہم تمہارے خلاف جنگ نہیں کریں گے' اب ہماری کیفیت یہ رہے گی کہ ہم Neutral (غیر جانبدار) رہیں گے' جس قوم کے ساتھ جنگ کرو گے ہم تمہارے ساتھ مل کر ان کے ساتھ بھی جنگ نہیں کریں گے اور تمہارے خلاف بھی جنگ نہیں

کریں گے' یہ نیوٹرل رہنے کا معاہدہ کرلیں' اس صورت میں تم ان کو چھوڑ دو' ان سے کچھ مواخذہ نہ کرو۔

## دشمن پر اعتماد تو کرو لیکن احتیاط کو ہمیشہ پیش نظر رکھو

آ گے کہا ہے کہ **وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ** (4:90) [1]۔اصل چیز یہ ہے کہ ان کے پاس اتنی قوت نہیں تھی۔ اگر ان کے پاس اتنی قوت ہوتی تو ایسا نہیں کہ یہ کسی احترام کی وجہ سے تمہارے ساتھ آ کر یہ معاہدے کر رہے ہیں' ان کے پاس قوت نہیں رہی اس لیے یہ ایسا کر رہے ہیں۔ جس کے پاس قوت نہیں رہی' اس کے ساتھ بھی قرآن حمید حسنِ سلوک کا کہتا ہے حالانکہ کہا جا سکتا تھا کہ اب تو ان کے پاس قوت نہیں رہی ہے' جھکے ہوئے ہیں' ان کے پاس ایسا ہے ہی نہیں کہ مقابلے پہ آ سکیں' اس لیے اب ان کو کچل دو' ختم کر دو۔ یہی تو کچلنے کا مقام ہوتا ہے۔ کہا کہ نہیں! اگر یہ اس بنا پہ کہ اب تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے' تمہارے ساتھ صلح پر آ گئے ہیں تو ان کے ساتھ صلح کرو۔ آ گے کہا کہ **فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ** (4:90) تم سے اگر وہ اس معاہدے کے ساتھ الگ ہو جائیں' کنارہ کش ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں' صلح کی درخواست کریں تو پھر ان کے ساتھ کوئی جنگ نہیں' ان کے خلاف کچھ کرنے کی اجازت نہیں۔ **وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ** (4:90) جب بھی کوئی جنگ کرنے والی قوم صلح کا پیغام تمہارے پاس پہنچائے تو فوراً صلح کے لیے آمادہ ہو جاؤ اس لیے کہ نظامِ خداوندی میں مقصود کسی سے انتقام لینا نہیں' بلکہ ان سرکش قوتوں کا زور توڑنا ہے جو دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کی مخالفت کریں۔ دوسری جگہ غالباً سورۃ توبہ میں یہ بھی ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ فریب دینے کے لیے یہ تمہیں سفید جھنڈی دکھا دیں۔ کہا ہے کہ تم نے ان کے دل کو چیر کر نہیں دیکھ لیا۔ ٹھیک ہے' دھوکا دے سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سچے دل سے کہیں۔ پہلے ہی ان پر فیصلہ نہ کر لو۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! وہاں ہے کہ اگر بعد میں پتہ چلے کہ تم کو دھوکا دے رہے ہیں تو اس کے لیے اپنے ہاں پہلے تدبیر کر رکھو کہ اگر انہوں نے دھوکا دیا تو ہم نے کیا کرنا ہے لیکن اس بنا پہ صلح کی درخواست کو مسترد نہ کر دو کہ صاحب! یہ دھوکا دے رہے ہیں۔ **فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡهِمۡ سَبِیۡلًا** (4:90) سو جب ان کا زور ٹوٹ جائے' صلح کی جھنڈی دکھا دی اب تم ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی آیت 90 تک ہم آ گئے 91 ویں آیت سے اگلی دفعہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

---

[1] اس لیے کہ اگر ان کے پاس' خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق' تم پر غالب آنے کی قوت ہوتی تو یہ ضرور تم سے جنگ کرتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔208)۔

# اکیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 91 تا 96)

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ
يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا
لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ
خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿٩٣﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ
كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾ لَا يَسْتَوِى
الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1970ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 91 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:91)۔

## سابقہ درس کے سلسلہ میں تجدیدِ یادداشت

یہ آیت، سابقہ آیت میں جو مضمون چلا آ رہا تھا، کے تسلسل میں ہے اور اس سے اگلی آیت میں پھر ایک اور بات شروع ہوتی ہے۔ تسلسل کے اعتبار سے اور تجدیدِ یادداشت کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ پیچھے یہ بات چلی آ رہی تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کے سلسلے میں یہ کہا گیا تھا کہ جب یہ صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں تو پھر جنگ روک دینی چاہیے۔ اس لیے کہ تمہارا منشا یا خدا کا پروگرام یہ نہیں ہے کہ

انسانوں میں جنگ ہوتی رہے بلکہ جنگ کا مقصد تو یہ ہے کہ جیسا قرآنِ کریم نے سورۃ محمدؐ میں کہا ہے کہ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (47:4) جنگ سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں جنگ خود اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ بڑی عظیم چیز کہی گئی ہے کہ یہ جنگ تو جنگ کو مٹانے کے لیے ہے' جنگ کو روکنے کے لیے جنگ ہے۔ اس لیے جب بھی ایسی صورت پیدا ہو کہ مخالف کا جو فریق ہے' وہ جنگ روک دینے کے لیے آمادہ ہو جائے تو پھر تمہیں اسی وقت جنگ روک دینی چاہیے کہ مقصد ہی یہ تھا کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ پھر ایسے دوست بھی درمیان میں آ جائیں گے جن کی کیفیت یہ ہو گی کہ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ (4:91) ایسے لوگ بھی ہونگے جو یہ چاہیں گے کہ تمہارے ساتھ بھی بنائے رکھیں' امن میں رہیں اور اپنی قوم کے ساتھ بھی بنائے رکھیں اور امن میں رہیں۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ یہ "يَاْمَنُوْا" کا لفظ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو مومن کا لفظ بھی ہے' یہ ایمان لانے والی جو بات ہے' اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تو مادہ ہی امن (ا م ن) ہے۔ مومن کے معنی ہیں "امن کا ذمہ دار"۔ اور خدا کی ایک صفت بھی المومن ہے۔ اگر مومن کے معنی ہم صرف ایمان لانے والا لیں تو جب خدا کی صفت المومن کہا ہے تو یہاں پھر اس کے کیا معنی ہونگے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ عالمِ انسانیت کے امن کا ذمہ دار ہے۔ یہی صفت جب مومن کی ہو جائے گی تو مومن بھی وہ ہے جو دنیا میں امن کا پیامبر اور امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ اسی اعتبار سے جہاں بھی اس لفظ کے افعال وغیرہ آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے معنی امن ہی کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معنی ہیں۔ کہا ہے کہ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ (4:91) جو یہ چاہے کہ تمہارے ساتھ بھی امن میں رہے' اپنی قوم کے ساتھ بھی امن میں رہے تو کہا ہے کہ یہاں تک تو بالکل ٹھیک ہے' یہ بہت اچھی بات ہے' امن ہی تو ہمارا مقصود تھا لیکن ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا (4:91) جونہی ان کی قوم تمہارے خلاف کسی فتنہ وفساد کی چنگاریوں کو بھڑکاتی ہے تو یہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے بلکہ فوراً اس میں جا کودتے ہیں۔ یعنی یہ جو چیز تھی کہ تمہارے ساتھ بھی امن میں رہیں' ان کے ساتھ بھی امن میں رہیں تو پھر یہ Neutral (غیر جانبدار) رہیں لیکن یہ Neutral (غیر جانبدار) نہیں رہتے' یہ اس وقت تک خاموش رہتے ہیں جب تک کہیں سے تمہارے خلاف کوئی فتنہ برپا نہیں ہوتا۔ جونہی کسی جگہ سے یہ صورت ہوتی ہے' یہ فوراً اس میں کود جاتے ہیں۔

## کسی فتنہ پرور کے ساتھ جنگ کرنے کی مشروط اجازت

یہاں پھر کہا ہے کہ جب ایسی صورت ہو تو فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (4:91) سو اگر یہ لوگ' اس قسم کی فتنہ پردازی کے بعد' نہ تو تم سے کنارہ کش ہوں' نہ صلح کی درخواست

کریں اور نہ ہی اپنی دست درازیوں سے باز آئیں تو پھر ان کے خلاف جنگ کرو' انہیں گرفتار کرو تا کہ یہ فتنہ رک جائے لیکن اگر وہ تم سے جنگ کریں تو ان سے جنگ کرو اور جہاں بھی تم انہیں پاؤ انہیں تہہ تیغ کر دو۔ اس کے لیے بھی آپ دیکھیے کہ اس نے پہلے کیا شرائط مقرر کی ہیں؟ یہ کہ اگر یہ اس فتنے سے الگ نہ ہو جائیں' اگر یہ تمہاری طرف صلح کا ہاتھ نہ بڑھائیں' اگر یہ ظلم و زیادتی سے رک نہ جائیں' تو پھر ان کے خلاف تم جنگ کرو۔ آپ دیکھیے یہ کتنی چیزیں پہلے کہی گئی ہیں کہ اگر یہ رک جائیں تو پھر جنگ نہیں ہے۔ جنگ اسی صورت میں ہے جب یہ اپنی اس سرکشی سے باز نہ آئیں' یہ فتنہ پردازی میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اُس صورت میں اسے روکنے کے لیے تم پھر ان کے خلاف جنگ کرو۔ کہا ہے کہ **وَ اُولٰٓـئِکُمۡ جَعَلۡنَا لَکُمۡ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِیۡنًا** (4:91) یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف اس قسم کی کاروائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے لیکن یہ اُس صورت میں ہے جب یہ فتنہ فساد کی آگ بھڑکاتے چلے جائیں' اس سے الگ بھی نہ ہوں' Neutral (غیر جانبدار) بھی نہ رہیں' عہد شکنی بھی کریں' اعلانیہ تمہارے خلاف جنگ میں شامل بھی ہو جائیں' فتنہ و فساد سے رکیں بھی نہیں' صلح کے لیے ہاتھ بھی نہ بڑھائیں تو کہا ہے کہ اس صورت میں جب تم ان کے خلاف ہتھیار اٹھاؤ گے تو پھر یہ چیز تمہارے خلاف کوئی جرم نہیں ہوگی' پھر تو تم حق بجانب ہوں گے' اس کے لیے Fully Justified (کلی طور پر حق بجانب) ہوں گے کہ تم ان کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہو۔

## فی سبیل اللہ جنگ کا مفہوم

میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا' اس سے پہلے بھی کہا تھا کہ جب قرآن کریم نے جنگ کی ''فی سبیل اللہ' شرط قرار دی ہے تو فی سبیل اللہ سے مراد کیا ہے۔ قرآن کریم نے خود ہی متعدد مقامات پر اس کی تشریح کر دی کہ جنگ' جنگ کی خاطر نہیں' جوع الارض کی تسکین کے لیے نہیں' کمزور قوموں کو کچلنے کے لیے نہیں' دوسروں کی مملکتوں پر تغلب حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لیے' مظلوم کی مدافعت کے لیے' دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ہے۔ بس یہ ہیں وہ چیزیں جنہیں فی سبیل اللہ کہا ہے اور اگر ان مقاصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے جنگ کی جائے تو قرآن نے اسے ''فی سبیل الطاغوت'' کہا ہے۔ جنگ کی یہ بات یہاں تک آ گئی۔

## جماعتِ مومنین کی بنیادی خصوصیات اور ان کا پروگرام جو سرتا پا یک نگہی کا حامل ہو

اس سے آگے کہا ہے کہ **وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ وَّ دِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّصَّدَّقُوۡا ؕ فَاِنۡ کَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّکُمۡ وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ ؕ وَ اِنۡ کَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ فَدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ وَ تَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَهۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ ۫ تَوۡبَۃً مِّنَ اللّٰهِ**

وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا (4:92)۔ یہ آیت اور اگلی آیت یعنی یہ دو آیات بڑی اہم آتی ہیں۔ ذکر ان قوموں کا آ رہا تھا جو جنگ کے لیے تمہارے خلاف کھڑی ہوں' متحارب ہوں' تمہارے اس نظام کو قائم نہ ہونے دیں' فتنہ وفساد برپا کریں۔ اب اس کے بعد یہ اپنی جماعت ہے' اپنی سے مراد یہ نہیں ہے جیسے یہ ہمارے ہاں آج کل سیاسی پارٹی کا سلسلہ ہوتا ہے کہ یہ ہماری پارٹی ہے' وہ غیر کی پارٹی ہے بلکہ دنیا میں یہ وہ جماعت ہے جو ان تمام مقاصد کو لے کر اٹھی ہے' ان اقدار کے مطابق نظام قائم کرنا چاہتی ہے' خود بھی اسی طرح سے زندگی بسر کرنا چاہتی ہے' دنیا میں بھی اسی طرح سے امن' فلاح اور بہبود کو عام کرنا چاہتی ہے یہ اس قسم کی فکر کو لیے ہوئے لوگ ہیں' اس قسم کی ذہنیت کو لیے ہوئے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ یہ اس قسم کے مقصدِ زندگی کو لیے ہوئے لوگ ہیں' یہ وہ ہیں جنہیں جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اور چونکہ یہ مقاصد اجتماعی طور پر حاصل ہو سکتے ہیں' انفرادی طور پر نہیں ہو سکتے' اس لیے ان مومنین کو اس اعتبار سے ایک جماعت کہا جائے گا۔ اس میں سیاسی پارٹی والی بات نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کو' اس ایک مشترکہ نصب العین کو سامنے رکھ کر' اجتماعی کوشش کے لیے کسی ایک مرکز پر جمع ہو جانا ہے' یہ ہے جسے آپ جماعتِ مومنین کہتے ہیں یا جسے خدا نے حزب اللہ کہا ہے یعنی اللہ کا لشکر یا اللہ کی پارٹی۔

عزیزانِ من! اس آیت (4:92) میں کہا یہ ہے کہ یہ جو اس قسم کی مومنین کی جماعت ہے' اس میں باہمی جنگ وجدل کا تو تصور ہی نہیں ہو سکتا لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے کہ کہیں انفرادی طور پر کوئی ایک شخص' دوسرے کے ہاتھوں سے مارا جائے۔ اس مارنے کے متعلق کہا ہے کہ وَ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (4:92) یہ چیز تو مومن سے ہو ہی نہیں سکتی' یہ تو کسی مومن کے لیے سزاوار ہی نہیں کہ یہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے' ہاں البتہ سہو وخطا سے ایسی چیز ہو سکتی ہے' نادانستہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اب دیکھیے کہا یہ ہے کہ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ (4:92) یہ کسی مومن کے لیے سزاوار ہی نہیں ہے۔ جس انداز سے قرآن کریم نے یہ بات شروع کی ہے' اس میں یہ چیز ہے کہ یہ تو مومن کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' یہ اس کے شایانِ شان ہی نہیں ہے' وہ مومن مومن ہی نہیں کہلا سکتا جس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ دوسرے مومن کو جا کر عمداً قتل کرنا شروع کر دے۔ کہا ہے کہ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (4:92) ہاں البتہ نادانستہ اس قسم کی بات ہو سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے۔ اور اگر کوئی اس طرح سے نادانستہ کسی مومن کو قتل کر دے تو نادانستہ کے لیے بھی قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ ہاں چلو جاؤ' اس وقت اس کو کہو کہ توبہ فی سبیل اللہ کرے' معاف کر دے۔ کہا یہ ہے کہ وہ کچھ کفارہ ادا کرے۔

## لفظ لغو کا مفہوم اور قتلِ عمد میں کفارے کا مقصد

کفارہ اس لیے ہوتا ہے کہ آئندہ کے لیے اسے احتیاط برتنی پڑے کہ نادانستہ بھی اس قسم کا کام نہ ہو۔ دیگر مقامات میں بھی قرآن کریم نے کہا ہے مثلاً یہ کہ کسی معاملے میں لغو قسم کی قسم کھا بیٹھے۔ لغو کے معنی کے لیے اس نے یہ کہا ہے کہ اس کا دل کا قوی ارادہ شامل نہ ہو

بلکہ یونہی ایک بات زبان سے نکل جائے۔اس یونہی بات نکل جانے کے لیے بھی کہا ہے کہ اس کے لیے اسے کچھ کفارہ دینا ہوگا۔اور وہ اس لیے دینا ہوگا کہ اس طرح سے نادانستہ لغویت میں یونہی یہ باتیں کرتے جانا کوئی شریف آدمیوں کا شعار نہیں ہے' اس پہ بھی چیک ہونا چاہیے' اس کی بھی روک تھام ہونی چاہیے۔اس کی روک تھام کے لیے اگر اسے کچھ جرمانہ کر دیا جائے (کفارے کے معنی جرمانہ کہہ لیجیے) تو پھر آئندہ یہ احتیاط برتے گا ورنہ یہی روش اگر معاشرے میں عام ہو جائے تو اس معاشرے کے اندر یہی چیز آخر میں جا کر ایک اخلاقی برائی ہو جائے گی۔قرآن کریم اس کو بھی روکتا ہے۔

اب یہ جو قتل خطا ہے' اس کے لیے یہ کہا ہے کہ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ (4:92) پہلی چیز تو یہ ہے کہ اسے ایک غلام آزاد کرانا ہوگا۔یہاں یہ ٹھیک ہے کہ جس کو مارا گیا ہے' اس کی جان چلی گئی ہے۔اس کی تلافی تو نہیں ہو سکتی' یہ تو ناممکن ہو گیا' اس کو تو یہ زندہ نہیں کر سکتا' اپنے آپ کو بھی مار دے تو اسے زندہ نہیں کر سکتا لیکن اس کی تلافی یہ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ (4:92) ہے کہ ایک غلام آزاد کرائے۔یہاں یہ چیز بھی خوب کہی ہے کہ ایک انسان مار دیا گیا' مر گیا' ایک انسان زندہ ہے لیکن وہ ساری عمر موت کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔یہ وہ ہے جسے Slave یا غلام کہا جاتا ہے۔اس نے کہا ہے کہ اس کی تلافی کی اب' بر سبیل تنزل' یہ شکل ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے اور وہ یوں زندگی میں ہی موت کے ہاتھوں گرفتار ہے' اسے اس موت کے پنجے سے چھڑا دیا جائے۔اس لیے کہا ہے کہ جاؤ اور کوئی غلام' جو کسی کے پاس ہے' اس کی قیمت دیدو' اس کا فدیہ دیدو اور اس سے اس غلام کو چھڑا دو۔اس کو تو تم زندہ نہیں کر سکتے لیکن کم از کم ایک ایسے انسان کو تم نے زندگی دی جو طبعی طور پر زندہ ہونے کے باوجود زندگی سے محروم تھا' اسے چھڑاؤ۔

## قرآنی تعلیم کے برعکس غلامی کے تصور کی آبیاری کے لیے مذہبی پیشوائیت کا تصور

غور فرما رہے ہیں آپ! بظاہر ایسا ہے کہ یہ کچھ سزا کے طور پر ہے لیکن قرآن حمید میں سزا کے اندر بھی کتنی گہرائیاں ہیں۔اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ یہ جو ہمارے ہاں کہنے کو صاحب! مستشرقین نے ہمارے خلاف یہ ساری چیزیں کیں۔انہوں نے تو جو کچھ کیا تھا چھوڑ دیجیے' آج بھی جو بڑے بڑے اسلام کے اجارہ دار ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ جنگ میں دشمن کے مردوں اور عورتوں کو جو قید کیا جائے گا تو مردوں کو غلام بنایا جائے گا اور عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا۔آج بھی یہ کہہ رہے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ اسلام کا یہ حکم ہے اور اس کے ماتحت چودہ سو سال میں آپ کے ہاں غلام اور لونڈیوں کی جو بھرمار نظر آتی ہے' آپ کے ہاں کے نہایت مقدس سلاطین اور خلفا جن کو کہا جاتا ہے' ان کے ہاں بھی ایک ایک حرم میں دو دو تین تین ہزار لونڈیاں بتائی جاتی ہیں' بقول اسلام کے ان اجارہ داروں کے یہ ساری شرعاً جائز ہیں' اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ لوگوں کو غلام بنایا جائے۔

عزیزانِ من! اگر اتنی سی بات ہی سمجھ لی جائے تو غلامی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ سارے قرآن حکیم میں یہ حکم ہے کہ غلام کو چھڑاؤ' غلام کو چھڑاؤ' غلام کو چھڑاؤ۔ اب سوچیے کہ جو نظام قدم قدم پر یہ کہتا ہے کہ غلام کو چھڑاؤ' کیا وہ کہے گا کہ ادھر سے لا کر آزاد لوگوں کو غلام بناؤ اور پھر اس کے بعد غلام کو چھڑاؤ۔ اور دلیلیں تو چھوڑ دیجیے' میں کہتا ہوں صرف یہی ایک منطقی دلیل دیجیے کہ کوئی نظام ایسا بھی ہوگا جو یہ کہے کہ ذرا سی غلط قسم کھائی اور غلام جا کر چھڑاؤ' ذرا سی چیز نادانستہ ہوئی' غلام چھڑاؤ۔ اور سارے قرآن حکیم میں ''غلام چھڑاؤ'' ہے' قرآن حکیم میں کہیں ''غلام بناؤ'' کا نہیں کہا۔ اور ہو سکتا ہی نہیں تھا صاحب! ایک طرف تو یہ کہتا چلا جائے کہ چھڑاؤ چھڑاؤ چھڑاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ کن غلاموں کو چھڑاؤ؟ وہ جو Already (پہلے سے) وہاں موجود تھے۔ اس زمانے میں غلامی کا رواج تھا' عربوں میں بھی تھا' دوسری قوموں میں بھی تھا۔ قرآن مجید نے آ کر پہلی دفعہ یہ کہا کہ یہ جو آزاد انسان ہیں' ان کے پاس اگر پیسے ہیں' ان کا فریضہ یہ ہے کہ جہاں کوئی شخص کسی کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے' اسے جا کر چھڑاؤ۔ اپنے ہاں تو جو معاشرے میں پہلے سے چلے آ رہے تھے' انہیں چھوڑ دو۔ سارے قرآن حکیم میں غلام چھوڑ دو کی آیتیں ہیں' سارے قرآن حکیم میں غلام چھڑانے کی آیتیں ہیں' کہیں غلام بنانے کی نہیں ہیں۔

## جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنی احکام اور ہماری متضاد خیالی اور متضاد عملی

باقی رہے یہ جنگ کے قیدی' ان کے متعلق سورۃ محمدؐ کے اندر (47:4) میں بالتصریح حکم ہے کہ جو جنگ کے قیدی آپ کے ہاں آئیں گے' انہیں چھوڑنا ہوگا یا فدیہ لے کر یا اپنے قیدیوں کے بدلے میں قیدی دے کر اور اگر یہ بھی صورت نہ ہو تو ان کو احساناً چھوڑ دو۔ انسانیت پر یہ تمہارا احسان ہوگا۔ قرآن کریم میں یہ تو ایک ہی جگہ ہے اور یہ حکم ہے کہ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (4:92) غلام چھوڑ دو لیکن اُدھر ہماری کیفیت یہ ہے کہ صاحب! غلام بناتے چلے جاؤ اور اُدھر یہ تاکید ہے کہ انہیں چھوڑتے چلے جاؤ' چھڑاتے چلے جاؤ' اس سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔ اور وہ جو بنانے والی بات ہے اس سے بھی ثواب ہوتا ہے۔ سوچیے تو۔۔۔۔ ذرا۔۔۔

قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ میں (2:85) میں یہ کہا ہے کہ یہودیوں کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے یہ اپنے ہاں کے لوگوں کو جو کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں' گھروں سے نکال دیتے ہیں۔ جب انہیں دوسرے لوگ جو دشمن اور قوی ہیں' گرفتار کر لیتے ہیں تو پھر یہ خیرات کا فنڈ اکٹھا کرتے ہیں کہ ان کا فدیہ دے کر چھڑا لائیں اور کہتے یہ ہیں کہ قیدیوں اور لونڈیوں کو چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ یہ جو انہوں نے پہلے گھروں سے نکال دیا تھا تو کیا یہ بہت بڑا فریضۂ خداوندی تھا جو انہوں نے ادا کیا تھا' جواب ان کو چھڑانے کو کہتے ہیں کہ یہ بڑا ثواب کا کام ہے؟ اب ثواب کمانے کے لیے چندے اکٹھے کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حمید

نے اس کے بعد کیا کہا ہے۔ اب وہ الفاظ سن لیجیے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) کتاب کے اس حصے پہ تو ایمان ہے کہ غلاموں کا چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے اور اس سے انکار کتنا بڑا جرم ہے کہ غریبوں اور محتاجوں کو گھروں سے نکال دو۔ ذہن میں یہ طے کیے بیٹھے ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ ثواب کا کام تو ہمارے کریڈٹ میں لکھا ہی جائے گا' اس میں 50% نمبر تو آ ہی جائیں گے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ** (2:85) جو بھی تم میں سے یہ روش اختیار کرے گا' اس کے سوا اس کا اور کوئی نتیجہ یا بدلا نہیں ہوگا کہ **اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) بجز اس کے کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ قوم ذلیل وخوار ہوگی **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) اور قیامت میں پھر اس سے بھی زیادہ شدید عذاب میں مبتلا ہوگی یعنی پہلے اپنے ہاں یہ حالت پیدا کرنا کہ جس میں انسانوں کی یہ کیفیت ہوجائے اور پھر اس کے بعد اس Condition (حالت) سے ان کو نکالنے کے لیے' اس میں کچھ آسانیاں پیدا کرنے کے لیے' ان کی بہبود کے لیے' چندے اکٹھے کرنا' خیرات دینا' فطرانے دینا۔ پھر کہہ دوں کہ ذہن میں یہی تھا کہ اس کا تو ثواب ملے گا ہی۔ وہ کہتا ہے کہ ایسی قوم کی یہ کیفیت ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے یہ جو روز آپ کے ہاں یہ ایک دلیل دی جاتی ہے کہ صاحب! اگر معاشرے میں معاشی نظام ایسا قائم ہوجائے کہ یہاں کوئی بھوکا نہ رہے' کوئی ننگا نہ رہے' کوئی محتاج نہ رہے' تو پھر یہ جو خیرات صدقہ زکوٰۃ فطرانہ دیا جاتا ہے' یہ جو احکام ہیں' ان پہ عمل کیسے ہوگا۔ اور یہ دینے والوں کو جو پھر یہ ثواب ملتا ہے' یہ ثواب کہاں سے کمائیں گے! ٹھیک ہے جی! ان احکام پر عمل کرنے کے لیے' ثواب کمانے کے لیے' ضروری ہے کہ معاشرہ ایسا رکھو جس میں بھوکے ننگے گداگر' محتاج بیچارے موجود رہیں۔ یہ نہ رہیں تو ثواب کہاں سے کمائیں گے۔ یعنی انہیں جنت میں بھیجنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ طبقہ جہنم میں ضرور رہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن مبین ایسا معاشرہ چاہتا ہے جس میں کسی ضرورت مند کی ضرورت رکی نہ رہے' یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرے تو اس کے خلاف دلیل یہ دی جاتی ہے کہ صاحب! پھر یہ صدقہ خیرات زکوٰۃ وغیرہ کے جو احکام ہیں' ان پہ عمل کیسے ہو اور پھر جو اس سے ثواب ہوتا ہے تو یہ تو ثواب کمانے کا راستہ ہی بند ہوگیا۔ اس وقت تو صورت یہ ہوتی ہے کہ اُدھر ساری چور بازاری اور بلیک میلنگ کیجیے اور یہ کچھ کرنے کے بعد دھڑا دھڑ کمائیے اور اس میں سے پھر ان کو اڑھائی فیصد دے دیجیے اور بقیہ اللہ کے ساتھ بیلنس پورا کر لیجیے اور جنت میں چلے جائیے لیکن اگر آپ نے یہ صورت پیدا کر دی کہ یہاں کوئی بھوکا محتاج نہ رہے تو یہ بیچارے کیا کریں گے' کس طرح سے جنت میں جائیں گے' اس لیے ایسا اسلامی معاشرہ ہو نہیں سکتا جس میں بھوکے ننگے نہ ہوں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو قرآن حکیم نے کہی ہے کہ پہلے Situation (صورتِ حال) ایسی Create (پیدا) کرتے ہیں جس میں تمہارے ہاں یہ محتاج فقیر بھوکے ننگے رہیں اور پھر اپنے ہاں لوگوں کو تلقین کرتے ہیں کہ بھئی! خیرات صدقہ زکوٰۃ کا فنڈ جمع کرو تاکہ ان بیچارے غریبوں

کی مدد کی جائے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ جو معاشرہ بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں ذلیل وخوار ہوگا اور قیامت میں اس سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔ اس میں کسی منطقی دلیل کی بھی ضرورت نہیں ہے' ''صورت ببیں حالش مپرس''❶۔ کتنا روپیہ آپ کا زکوٰۃ اور خیرات اور صدقہ سے اکٹھا ہو کر خرچ ہوتا ہے اور اس کے باوجود دنیا کی ذلیل ترین قوم مسلمان کی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اور نظریہ ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ صورت کہ ایک طرف تو آپ یہ کہیں کہ غلام بناتے چلے جایئے اور دوسری طرف تلقین کرتے چلے جائیں کہ غلاموں کو چھڑانے میں بڑا ثواب ہوتا ہے' کس قدر غلط ہے۔

## غلامی کے نتیجے میں یو این او کے چارٹر کو تسلیم کرنے سے انکار اور پھر اقرار

میں عرض کروں کہ جو غلاموں کو چھڑانے کی بات ہے' یہ اس زمانے میں جو غلام موجود تھے' خواہ عربوں کے ہاں ہوں یا دوسری اقوام میں ہوں یا اس کے بعد بھی مسلمانوں کے معاشرے میں ہوں' قرآن حمید کی رو سے تو غلام رہ نہیں سکتا تھا' جہاں کہیں بھی ہوں انہیں چھڑانا ہے۔ اٹھارویں صدی تک دنیا میں اتنے غلام موجود تھے۔ وہاں غلامی کو مٹانے کے لیے ان لوگوں نے اتنا بڑا❷ جہاد کیا اور آپ کے ہاں جو یہ شریعتِ حقہ کا فیصلہ ہے' اس کی رو سے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' کل تک ابھی آپ کے ہاں یہ کیفیت تھی کہ یو این او کے چارٹر میں یہ شرط رکھی کہ غلامی کو مٹا دیا جائے گا۔ یو این او کے جتنے ممبر تھے انہوں نے اس چارٹر پر دستخط کیے اور سب سے بڑی اسلامی مملکت' مملکتِ سعودیہ' حجاز والوں نے انکار کر دیا کہ یہ ہمارے دین کے خلاف ہے' ہم دستخط نہیں کریں گے۔ یہ تو اب جا کر وہاں تبدیلی آئی' یہ انقلاب ہوا ہے' اس کے بعد اب انہوں نے اس کو Abolish (ختم)❸ کیا ہے ورنہ مکے کے اندر غلاموں کی منڈی تھی۔ ہمارے حاجی وہاں دیکھ کر آتے تھے کل تک یعنی 1928ء تک کا تو مجھے پتہ ہے۔ میں تو نہیں گیا' علامہ اسلم جیراجپوریؒ (1955-1879ء) وہاں گئے' انہوں نے آ کر یہ بتایا اور لکھا کہ وہاں یہ منڈی تھی جہاں ابھی بھی غلام بیچے اور خریدے جاتے تھے۔ بہر حال قرآن حکیم نے کہا ہے کہ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (4:92) دنیا کے اندر جہاں بھی غلام ہوں ان کو چھڑاؤ۔

## کسی کے قتل ہو جانے یا چوری ہونے پر قرآنِ حکیم کا نظامِ عدل

عزیزانِ من! قرآن حکیم کا جو نظامِ عدل ہے یہ بڑا ہی غور طلب ہے مثلاً وہ شخص مارا گیا' اس کو تو زندہ نہیں کیا جا سکتا' اس کی

---

❶ صورت دیکھ لو' حال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

❷ بنجامین فرینکلن وید (Benjamin Franklin Wade) نے 1800ء میں پہلا غلامی کی منسوخی کا بل پیش کیا۔

❷ مملکتِ سعودیہ نے نومبر 1962ء کی 6 تاریخ کو غلامی کو منسوخ کیا۔

بجائے اس طرح غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک شخص کو زندگی دی جائے۔ اس کے مرجانے سے اس کے پسماندگان کو نقصان پہنچا' اس کی بھی تلافی ہونی چاہیے۔ اگر آپ مجرموں کو دس سال کی قید کر دیں' ان کو پھانسی پہ بھی چڑھا دیں' ان بیچاروں کا جو ایک ہی کمانے والا تھا' وہ تو باقی نہ رہا' اس کی تلافی تو نہیں ہو جاتی۔ دنیا کا نظامِ عدل یہ ہے کہ جس کے ہاں چوری ہو جاتی ہے' اس کا مال چلا جاتا ہے' اس کے بعد عدل کے مطابق اگر یہ فیصلے ہوں تو اس میں ہوتا یہ ہے کہ صاحب! چور کو پکڑ کر چھ مہینے کے لیے قید کر دیا مگر ان بیچاروں کے ہاں ایک پائی تک گھر میں نہیں رہی' ان کی کوئی تلافی نہیں ہوئی۔ قرآن کریم کے نظامِ عدل کی رو سے' جس کے ہاں یہ چوری ہوئی ہے' اگر اس کی اپنی غفلت وتساہل کی وجہ سے نہیں ہے' تو یہ شخص حکومت کے خلاف دعویٰ دائر کرے گا کہ میرا اتنے کا نقصان ہوا ہے' تم نے مجھے جان اور مال کی حفاظت کی ضمانت دی تھی' تم اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہے ہو' تم مجرم ہو' میرے نقصان کی تلافی کرو۔ حکومت کے اوپر فریضہ ہوگا کہ اس کی تلافی کرے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ دیکھے کہ معاشرے میں کس نے یہ کچھ کیا تھا۔ اس نے حکومت کے خلاف کچھ کیا ہے' اس فرد کے خلاف نہیں کیا' اس فرد کے خلاف حکومت نے کیا ہے کہ اس نے اس کو امن کی ضمانت دی تھی' مال کی حفاظت کی اور جان کی حفاظت کی بھی' وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکی' وہ مجرم ہے۔ حکومت کے خلاف استغاثہ ہوتا ہے۔

یہاں قرآنِ کریم کی اس آیت (4:92) میں بھی یہ ہے کہ جن کی یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ نقصان ہو رہا ہے تو وہاں کہا ہے کہ **دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ** (4:92) یہ جو اس کے پسماندگان ہیں' ان کو کفارہ دینا ہوگا۔ **اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا** (4:92) ان دونوں کے درمیان اگلی بات یہ ہوگی کہ اگر مقتول کے وارث اسے کہہ دیں کہ نہیں' ہم خون بہا چھوڑتے ہیں تو یہ اور بات ہے مگر جو قانون ہے' وہ ان کو خون بہا دلا کر رہے گا۔ اب آگے چلیے۔ قرآن مجید کا عدل تو آپ کو معلوم ہے کہ کہاں تک جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ** (4:92) اگر یہ مومن جو مارا گیا ہے' وہ کسی ایسی قوم کو Belong (تعلق) کرتا ہے جو تمہاری دشمن ہے تو اس صورت میں وہ جو پہلا جرم ہے کہ ایک جان تم نے لے لی تھی' اس کی تلافی کے لیے جو غلام آزاد کرانا ہے' وہ تو تم کراؤ لیکن اب اس کا یہ جو دیت ہے' اس کا خون بہا ہے' وہ تو تمہاری دشمن قوم ہے' یہ اس دشمن قوم کو نہیں دیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کا یہ انتظام ہو کہ یہ جو خاندان والے ہیں' ان تک کسی طرح سے براہِ راست پہنچ سکے تو اور بات ہے لیکن اگر Difficulties (مشکلات) وہی ہوں جو آج کل ہو رہی ہیں مثلاً یہ کرنسی وغیرہ کی بھی' تو پھر تو وہ اس حکومت کے پاس چلا جائے گا۔ کہا ہے کہ اس صورت میں تم غلام آزاد کرا دو' یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اس کے اہل وعیال تک رقم پہنچا سکو لیکن **وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ** (4:92) اگر وہ ایسی قوم سے متعلق تھا جس کے ساتھ تمہارا صلح کا عہدنامہ ہے' ان کے ساتھ معاہدہ ہے' تو پھر اس صورت میں یہ غلام بھی آزاد کرنا ہوگا اور وہ دیت بھی دینی ہوگی کیونکہ وہ اس کے پسماندگان تک پہنچ جائے گی۔

## ذاتی جرم کی تلافی کے سلسلہ میں ایک دوسری صورت: دو ماہ کے روزے رکھنے ہونگے مگر کیوں؟

اب اگلی چیز یہ ہوگئی صاحب کہ قتل کی یہ خطا جو سہواً ہوگئی' اتنی توفیق نہیں ہے کہ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (4:92) غلام کو آزاد کرا سکے یا غلام ہی نہیں رہے ہیں' مالی توفیق بھی نہیں رہی تو پھر کفارہ یہ ہے کہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے۔ قرآن کریم کی رو سے جو جرم ہوتا ہے اس کی دو حیثیتیں ہیں۔(1) ایک جرم دوسرے شخص کے خلاف ہوتا ہے اور (2) جرم جو تم دوسرے کے خلاف کرتے ہو وہ تم اپنی ذات کے خلاف بھی تو کرتے ہو۔ یہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بار بار کہا ہے کہ وہ اپنے آپ پہ ظلم کرتے ہیں۔ اس طرح جرم کی دو نوعیتیں ہیں۔(1) ہر جرم کا اثر انسان کی اپنی ذات پہ پڑتا ہے۔ یہ جو عدالت کی رو سے عدل ہوتا ہے اس میں اُس کی تو تلافی ہو جاتی ہے جو دوسرے کو نقصان پہنچا ہوتا ہے' (2) مگر یہ جو اس کی اپنی ذات کو نقصان پہنچا ہے' اس کی تلافی تو ایسے نہیں ہو سکتی اس کے لیے تو اسے کچھ اور کرنا ہوگا۔ یہ جو چیز کہی گئی ہے کہ وہ نہ ہو تو پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے' ان سے ہر دن اسے یہ یاد رہے گا کہ مجھ سے یہ بھول ہوگئی ہے۔ یہ خطا میں نے کی ہے' یہ جو نادانستہ کیا گیا ہے یہ مجھ سے بھول ہوگئی تھی' میں یہ کر بیٹھا تھا۔ دو مہینے مسلسل جس کو یہ یاد دہانی کراتے رہیں تو وہ تو چوتھے دن کہے گا کہ یا اللہ! توبہ میری ''اگے توں میری توبہ' میرے وڈیاں دی توبہ'' (آئندہ کے لیے میری توبہ' میرے بڑوں کی بھی توبہ)۔ کیا نظامِ عدل ہے یہ! یہ چیز جہاں بھی آئے گی' میں آپ کو واضح کر دونگا۔

## خدا کے ہاں توبہ کی قبولیت کی نوعیت اور جرائم کے محرکات کو ختم کرنے کا شافی علاج

قرآن کریم نے جہاں بھی جرم کے متعلق کہا ہے' اس میں جو جرم کا حصہ ہے' جو اپنے خلاف انسان جرم کرتا ہے' اس کی تلافی کے لیے اس پہ زیادہ زور دیا ہے۔ اس لیے کہ اصلاح اسی سے ہوگی۔ یہ جو اس قدر جرائم کی بہتات ہوتی چلی جا رہی ہے' ٹھیک ہے' لوگ پکڑے بھی جاتے ہیں' جرمانے بھی ہوتے ہیں' یہ سب کچھ ہوتا ہے' اس کے باوجود جرائم میں کمی کیوں نہیں ہو رہی۔ اس لیے کہ جرائم کے وہ محرکات جو انسان کے اندر ہوتے ہیں' ان کی اصلاح نہیں ہو رہی۔ قرآن کریم ان کی اصلاح ساتھ کرتا ہے۔ اسی لیے یہ کہنے کے بعد کہا ہے کہ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (4:92) آہاہاہا!! ایک تو وہ توبہ تھی جو تم کو عدالت سے مل گئی' ابھی اللہ کے ہاں سے باقی تھی۔ کہا ہے کہ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (4:92)۔ خدا کے ہاں سے کسی چیز کا لوٹ آنا' ویسا ہو جانا جیسا تم پہلے تھے' تمہاری ذات میں ایک کمی آ گئی تھی' کمزوری ہوگئی تھی' تمہارے اس جرم سے اس میں ناسور پیدا ہو گیا تھا حالانکہ نادانستہ کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ نادانستہ بھی تم سے کیوں ہوا تھا۔ ایک نشوونما یافتہ ذات کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جرائم کے معاملے میں' اس میں نسیان بھی نہیں ہوتا' بھول بھی نہیں ہوتی۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ اس میں کمی ہے' اس کو پورا کر لیجیے۔ انسان اپنی ذات کے خلاف جو جرم کرتا ہے' ظلم کرتا ہے' قرآن کریم اس کی اصلاح کرتا

چلا جاتا ہے اور اس طرح سے جرائم کی تکرار نہیں ہوتی۔ یہ ہے تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (4:92) ۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے۔

وہ جو میں نیٹشے (1900-1844ء) کا ایک قول دہرایا کرتا ہوں کہ ''تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے' اسے تو میں معاف کر سکتا ہوں لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنے خلاف کیا ہے' اسے کون معاف کرے گا''۔ یہ ہے تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (4:92) ۔ اپنے خلاف جو جرم درمیان میں ہو گیا' اس کے متعلق یہ چیز کہی گئی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:92) اب یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے علم میں بھی نہ آئے کہ اس نے قتل کیا ہے' ایسی صورتیں تو پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ نہ سمجھو کہ پولیس کی گرفت میں نہیں آیا' معاشرے کے نوٹس میں نہیں آیا' اس واسطے یہ چیز چلی گئی' ختم ہو گئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا کو پتہ ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے۔ اور یہ جو سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں' یہ کسی مستبد ظالم حاکم کا استبداد نہیں ہے' یہ حَكِيْمًا ہے' یہ بات بڑی حکمت پر مبنی ہے جو ہم نے کہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے معاشرہ میں حقیقی امن پیدا ہو جائے گا۔

## قتل خطا کے بعد دانستہ قتل کا معاملہ اور اس کی وضاحت

یہ تو ہو گیا قتلِ خطا۔ اب عمداً یا دانستہ قتل ابھی باقی ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (4:93) اللہ اکبر! اور جو کسی مومن کو دانستہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا' اس پر اللہ کا غضب ہوگا' لعنت ہوگی اور اس سے بھی زیادہ عظیم عذاب اس کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ دانستہ ایک مومن کا قتل ہوا ہے۔ قتل تو کسی انسان کا بھی ہو' وہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک انسانی ذات کی قیمت اتنی بڑی ہے۔ کہتا ہے کہ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ (5:32) کسی دوسرے کی جان لینے کی دو صورتیں تو ہو سکتی ہیں کہ عدالت کی طرف سے جرمِ قتل کی سزا میں اس کو قتل کیا جائے یا بغاوت یا فساد پھیلانے کی سزا کے طور پر عدالت اسے قتل کرے۔ اس کے سوا کسی اور شکل میں کوئی شخص کسی شخص کو' اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے' کوئی انسان بھی ہو' اس کو اگر قتل کر دیا ہے تو فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (5:32) یوں سمجھو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (5:32) جس نے کسی ایک انسان کی بھی جان بچالی تو یوں سمجھو کہ پوری عالمِ انسانیت کو اس نے زندگی عطا کر دی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے انسانی جان کی قیمت۔ اس لیے یہ سوال نہیں ہے کہ غیر مسلم کا قتل قرآن مجید کے نزدیک بہت Lightly (ہلکے پھلکے انداز میں) لینے کی چیز ہے' کچھ ایسی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید تو اسے بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اور قتل مومن کا ہو یا کافر کا ہو' یہ جو عدالت کی طرف سے سزا ملتی ہے اس کے لیے تو قرآن مجید نے خود تجویز کر دیا ہے کہ وہ سزائے موت

ہے۔کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (2:178) اے جماعتِ مومنین! قتل کی صورت میں سزا کا قانون ہے کہ معاشرہ یا نظام ملزم کا پیچھا کرے' اس کی گرفت کرے' اسے سزا دے۔ یہ جرم معاشرہ یا اس نظام کے خلاف ہوا ہے' افرادِ متعلقہ کے خلاف نہیں ہوا۔ سزا کے سلسلہ میں عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

آگے کہا ہے کہ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (2:178) ۔قرآن کریم نے یہاں یہ بتا دیا ہے کہ اس کی سزا قتل ہے' موت کی سزا موت ہے اور اس موت میں بھی یہ صورت ہے کہ وہاں اس زمانے میں جو عام رواج ہوتے تھے کہ کسی بڑے وڈیرے نے قتل کر دیا ہے تو اس کے خلاف مقدمہ بھی ثابت ہو گیا تو اس کے کسی نوکر کو پھانسی دیدی جائے۔ اس نے کہا ہے کہ اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ مقتول یا قاتل کی کوئی پوزیشن کا سوال ہی نہیں ہے' جو قاتل ہے' اسی کو اس کی سزا ملے گی' اس کے بجائے دوسرا سزا نہیں بھگتے گا۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اُس کا عورت ہونا اُسے سزا سے نہیں بچا سکے گا' اُسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ یہ ہے قتلِ عمد۔

جرمِ قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قتل بالارادہ (قتلِ عمد) یا سہواً (نادانستہ) قتل۔ اب قتلِ عمد میں سزائے موت ہے' زرِ فدیہ نہیں ہے لیکن اگر قتل عمداً نہیں کیا گیا یونہی سہواً ہو گیا ہے تو اس قتلِ خطا میں یہ چیز ہے کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (2:178) اس کے اندر جو خوں بہا ہے اس کی صورت دوسری ہے کہ آپ اس کو راضی کر لیں' اُس صورت میں پھر وہ بھی تم نے نہایت عمدگی سے' حسن کارانہ انداز سے' اس کو ادا کرنا ہے۔ اس دیت کی رقم سے اگر مقتول کا وارث برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے تو ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (2:178) یہ سزا میں تخفیف ہے جو خدا نے تمہارے لیے کی ہے۔ یہ قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں' اس نے تمیز اور تفریق کر دی۔ قتلِ خطا میں یہ تمہارے لیے تخفیف ہے' ورنہ قتل تو قتل ہی تھا۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے قتل کسی کا بھی ہو' قتلِ عمد کی سزا موت ہے' اس میں مومن اور کافر کا کوئی امتیاز نہیں' کوئی انسان بھی ہو لیکن ایک چیز خصوصیت سے بیان کی جاتی ہے کہ یہ تو بہت ہی زیادہ ظلم ہو گیا کہ تمہاری اپنی جماعت جو دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے اٹھی تھی' تم نے اپنے ہی اندر ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ قرآن کریم میں ایسے احکام ہیں جس میں عام طور پر ایک چیز معیوب یا جرم ہوتی ہے لیکن خاص حالات میں جرم بڑھ جاتا ہے' جیسے اس نے کہا کہ حج کے دوران تو باہمی جنگ وجدل' گالی گلوچ' لغویات قطعاً منع ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حج کے علاوہ ہر جگہ کرو بلکہ یہ ہے کہ وہاں کے تو حالات کا تقاضا ہے' خصوصیت سے تم اس کی احتیاط برتو۔ یہ جو آیت ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قتل جرم ہے لیکن بالخصوص یہ جماعت جو دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے اٹھی

تھی' ان میں ایسی شکل پیدا نہ ہو جائے کہ آپس میں ہی جنگ و جدل شروع کر دو اور ایک دوسرے کی گردنیں مارنی شروع کر دو۔ اس کی سزا سیدھا جہنم ہے' اللہ کا غضب ہے۔ لَعَنَهُ (4:93) میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''کسی کو کسی چیز سے محروم کر دینا''۔ میری بصیرت نے یہ سمجھایا ہے کہ قرآن کریم نے جہنم اور اللہ کا غضب اور یہ جو چیزیں بیان کیں' مثلاً یہ لعنت وغیرہ کی چیزیں' اس کی ایک حکمت ہے۔

## قتل عمد کی نوعیت' اس کا تدارک اور پھر قتلِ عمد میں خوں بہا کی وضاحت میں پیدا کی جانے والی الجھن

عزیزانِ من! معاشرے کے اندر یہ ہو سکتا ہے کہ ہو تو وہ قتل عمد' ارادتاً قتل ہو لیکن اس میں بھی بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جن کو Aggressive (جارحانہ) کہتے ہیں۔ مثلاً فوری جذبے میں آ کر' کسی شخص نے غصے میں آ کر' کسی پر حملہ کر دیا۔ ایک Murder (قتل) تو Cold-Blooded (بے رحمانہ) ہوتے ہیں' وہ سمجھی سوچی اسکیم کے مطابق کرتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے کہ فوری طور پر جذبات میں آ کر کسی نے کوئی ایسی چیز کر دی' عمد میں تو اس میں بھی آ جاتا ہے لیکن دونوں میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ جو اگلی چیزیں تجویز کی ہیں' غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ اسے حقوقِ شہریت سے محروم کیا جا سکتا ہے: وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (4:93) اس کے لیے خدا نے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ مزید سزائیں بھی ہیں جو معاشرہ سمجھتا ہے کہ دی جائیں وہ معاشرے کے اوپر ہے لیکن قتلِ عمد میں دیت یا خوں بہا نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ شرعی قوانین نے اس چیز کو اور بھی الجھا دیا ہے' وہ ہر قسم کے قتل میں خوں بہا کی اجازت دیتے ہیں اور اس سے ایسے ایسے کیس سامنے آتے ہیں کہ افسوس ہوتا ہے کہ قتل سے کہیں زیادہ وہ جرم ہو جاتا ہے۔ مثلاً مقتول کے جو وارث ہیں' وہ آپس میں قاتل کے ساتھ کچھ سمجھوتہ کر کے' کچھ پیسے دے کر اسے معاف کر دیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کی زمین ہتھیانے کے لیے اپنے ہی کسی نوکر کے ہاتھوں اس کو قتل کرا دیتا ہے' اب اس کا بھی وارث یہی ہوتا ہے تو یہ مقتول کے وارث کی حیثیت سے قاتل کے ساتھ سمجھوتہ کر رہا ہے' اسی کے ساتھ جس کے ہاتھوں اس نے اسے خود قتل کرایا ہے۔ ہزار پانچ سو روپیہ' دس ہزار روپے کے اوپر بھی ہوا' تو دس ہزار تو اس نے اس کو آپ ہی دینا ہے تو خود اس نے مقرر کیا تھا اور وہ سزا سے بھی چھوٹ گیا' اس نے راستے سے کانٹا بھی نکال دیا۔

## قرآن کریم نے قتلِ عمد میں خوں بہا کی اجازت نہیں دی

یہ جو چیز ہے کہ موجودہ شرعی قوانین میں ہر قسم کے قتل میں خوں بہا کی اجازت ہے' اس سے تو اتنی زیادہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جتنی قتل سے بھی نہیں ہوتیں۔ قرآن کریم نے قتلِ عمد میں خوں بہا یا دیت کی اجازت نہیں دی۔ اسی سے روک تھام ہو سکتی ہے۔ اور یہ جو ایک

مومن کے قتل کی چیز ہے اس کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (4:93) اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہے۔ یہ تو بہر حال قرآن حمید نے متعین طور پر کہا ہے۔

## ہماری تاریخ میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا تذکرہ: 10 ہزار اور 70 ہزار صحابہ کے باہمی قتل کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے

بات تو یہاں جرم اور سزا کی آ رہی ہے لیکن جا رہی ہے یہ بہت دور' اور وہ ہے ہماری تاریخ' جس کا چھیڑنا بڑا ہی نازک ہے۔ پہلے بھی یہ چیز آ گئی ہے' میں نے بھی بیشتر مقامات میں لکھا ہوا ہے۔ ہماری اسی کنونشن کے مذاکرہ[1] میں ہماری ایک طاہرہ بیٹی نے اپنا موضوع ہی یہ قرار دیا تھا کہ قرآن کریم کی آیت ہے اور اس کے بعد ہماری مروجہ تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ یہ مومن بھی عام نہیں ہیں یہ صدر اول کی مروجہ تاریخ میں جانسوز منظر ہیں کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں' ہماری تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اپنے پورے صحابۂ کبارؓ ہیں اور ان میں باہمی جنگ ہوتی ہے کہ صحابۂ کبارؓ کی آدھی تعداد ایک طرف ہے اور آدھی اس کے سامنے دوسری طرف ہے اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے وار کر رہے ہیں۔ یہ جو جنگ جمل تھی اس میں (بقول ان کے) حضرت علیؓ (600-661ء) اور صحابۂ کبارؓ ایک طرف ہیں اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ تھے۔ یہ جنگ ہوتی ہے جس میں سارے صحابۂ کبارؓ دو جماعتوں میں' دو لشکروں میں' بٹے ہوئے ہیں' ایک دوسرے کے خلاف میدانِ کارزار میں کھڑے ہیں۔ اور مروجہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس جنگِ جمل کے اندر کم از کم دس ہزار صحابۂ کبارؓ کا قتل ہوا۔ یہ مومن کا قتل' مومن کے ہاتھوں ہو رہا ہے خواہ اِدھر کے ہوں' خواہ اُدھر کے ہوں۔ یہ مومن بھی وہ ہیں جنہیں قرآن کریم مومن حقا قرار دیتا ہے۔ ان سے بہتر مومن دنیا میں کون ہوسکتا ہے! قرآن کریم نے ہمیں کہا ہے کہ سبیل المؤمنین اختیار کرو' جن کا ایمان ہمارے لیے وجۂ دلیل ہے۔ وہ صحابۂ کبارؓ ' قرآنِ کریم جن کی منکبت میں' شان کے قصیدے لکھتا ہے' ان میں سے آدھے صحابہؓ ایک طرف ہیں' اور آدھے دوسری طرف' ایک دوسرے کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ جنگِ جمل میں دس ہزار کا قتل ہو رہا ہے۔ یہ مومن کا قتل عمد نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور چار ہی دن کے بعد آگے جا کر جنگ صفین ہوتی ہے' اس دن ساری امت اس کے اندر شامل ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس جنگ کے اندر (معاذ اللہ' صد بار معاذ اللہ) ستر ہزار کے قریب صحابۂ کبارؓ قتل ہوئے۔ اس مرّوجہ تاریخ کی اور چیزوں کو تو چھوڑ دیجیے اس ایک ہی آیت کو سامنے لائیے۔ کیا یہ قتل' قتل عمد نہیں تھا؟ اور پھر یہ ایسا دل خراش و دلسوز نقشہ پیدا ہو گیا تھا۔ عزیزانِ من! یہ سب افسانے ہیں جو ہماری تاریخ میں ایک گہری

---

[1] اس کے لیے دیکھیے بزم مذاکرہ طلوع اسلام کنونشن' منعقدہ اکتوبر 1970ء۔ تفصیل کے لیے ہے طلوع اسلام جنوری 1971ء ص ص۔ 57 تا 76

سازش کی رو سے داخل کر دیئے گئے اور ہم انہیں اپنا مقدس ورثہ سمجھ کر سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔

## مسلمانوں کے دو گروہوں میں اگر الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کا تدارک

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں بھی آپس میں جھگڑ پڑیں' اس چیز کا امکان ہے۔ کہا ہے کہ وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ (49:9) دو گروہ مسلمانوں کے کہیں لڑ جھگڑ پڑیں تو تم فوراً جا کر ان کے اندر صلح کراؤ' حق اور انصاف کے ساتھ ان میں فیصلہ کراؤ' پھر اس کے بعد بھی اگر ان کی کوئی جماعت اس فیصلے کی خلاف ورزی کرے' سرکشی کرے' بغاوت پہ اتر آئے' تو پھر تم اس جماعت کو طاقت سے روکو کہ وہ ایسا نہ کرے اور ان کے باہمی فیصلے عدل اور انصاف سے کرو۔ خدا عدل کرنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔ گویا قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ ایک جماعت' ایک نظام' ایسا موجود رہے گا کہ اگر کہیں دو جماعتوں میں' مسلمانوں کے دو گروہوں میں' کسی وقت بھی آپس میں مجادلہ ہو جائے' لڑائی جھگڑا بھی ہو جائے تو وہ فوراً جا کر روکے۔

اب ہماری مروّجہ تاریخ ہمارے سامنے یہ منظر پیش کر رہی ہے کہ یہ دونوں جنگیں (جنگ جمل اور صفین) جو ہمارے سامنے آ رہی ہیں' وہ سارے ہی مومنین تھے' آدھے اِدھر تھے اور آدھے اُدھر تھے۔ تیسری جماعت کوئی نہیں جو وہاں صلح کرادے۔ یعنی جس جماعت کا وجود قرآن حکیم نے اسلامی نظام کے لیے لاینفک قرار دیا ہے' وہ جماعت ہی وہاں نہیں ہے۔ بعض کے متعلق' بعض کی عقیدت مندیاں' یہاں تک پہنچیں کہ کیا کریں تو وہ دو چار ایسے نام لے لیتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم نہ ان کا ساتھ دیتے ہیں' نہ اُن کا ساتھ دیتے ہیں' وہ چپکے سے گھر میں چلے گئے۔

## ہماری مروّجہ تاریخ کی زبوں حالی کی کیفیت

یہ ہے منظر جو آپ کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے' اس کا جواب ہماری طاہرہ بیٹی نے دیدیا تھا اور وہی چیز ہے جو میں نے اس کے متعلق لکھی ہے۔ اور بات دو منٹ میں حل ہو جاتی ہے کہ صاحب! آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ یہ سارے صحابۂ کبارؓ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے کو یوں قتل کر دیا تھا؟ آج آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ سیدھی سی بات ہے صاحب! تاریخ میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ کونسی تاریخ ہے جس میں لکھا ہوا دیکھا ہے؟ آپ کے ہاں سب سے پہلی تاریخ' طبری کی تاریخ ہے جسے ''ام التواریخ'' کہا جاتا ہے' بعد کی ساری تاریخیں اس کے مطابق لکھی ہوئی ہیں۔ ابوجعفر محمد بن جریر

طبری(225-311/838-923A.D ھ) کی تاریخ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے تین سو سال بعد لکھی گئی اور لکھی اس طرح سے گئی کہ اس سے پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ (Written Record) ہی نہیں تھا۔ساری چیزیں زبانی روایتوں کی بنا پر لکھی گئیں اور وہ بھی یوں کہ میں نے اس سے سنا' اُس نے اُس سے سنا' اُس نے اُس سے سنا۔اور ''میں نے سنا'' والی بات بھی تو یہ نہیں کہ طبری کے سامنے اس وقت کوئی موجود تھا اور اس نے کہا تھا بلکہ اس سے پہلے جن سے سنا تھا' وہ تو سارے مر مرا گئے تھے۔ذرا سوچیے تو سہی کہ اورنگزیب (1618-1707ء) کے زمانے کے واقعات ہوں' تاریخ کوئی نہ ہو' Written Record (تحریری ریکارڈ) کوئی نہ ہو' لکھا ہوا کہیں کچھ نہ ہو' اگر آج کوئی شخص اس زمانے کی تاریخ' بغیر کسی قسم کے Written Record (تحریری مواد) کے' سنی سنائی باتوں پر مرتب کرنے بیٹھے تو پھر وہ اس کے اندر لکھے گا کہ جب تک یہ سوا من زنار توڑ نہیں لیتا تھا' کھانا نہیں کھاتا تھا ''فیر آ تاریخ بنے گی ناں'' (پھر یہ تاریخ بنے گی )۔کوئی سوچے گا نہیں کہ جو سوا من زنار ہیں وہ کتنے انسانوں کے پہنے ہوئے بنتے ہیں۔زنّار وہ تاگا ہوتا ہے جو ہندوؤں نے اپنے گلے میں پہنا ہوا ہوتا ہے ''کوئی چار رتی اوہدا وزن ہونداے۔سوا من روز روٹی تو پہلاں' ہے نا سردار ہوراں دی تاریخ لکھی ہوئی''(اس کا وزن کوئی چار رتّی ہوتا ہے۔کھانے سے پہلے وہ روز سوا من زُنّار توڑ لیتا تھا۔بس یہی تو ہے ''سردار جی'' کی لکھی ہوئی تاریخ)۔عزیزانِ من! ''اے سردار ہوریں سکھاں اچ ای نئیں ہوندے ہیگے ہر قوم اچ ہوندے ہیگے''(یہ سردار جی سکھوں میں ہی نہیں ہوتے' یہ ہر قوم میں ہوتے ہیں)۔آپ کی تاریخ تین سو سال کے بعد بغیر Written Record (تحریری رکارڈ) ایک شخص بیٹھ کر لکھ جاتا ہے صاحب! اس کی تیرہ جلدیں ہیں۔اسے خیال ہونا چاہیے تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں' میرے پاس سند کیا ہے' میرے پاس اتھارٹی کیا ہے۔وہ تو داستانِ امیر حمزہؓ بیٹھا ہوا مرتب کر رہا ہے۔اور پھر اس کے بعد امت کی کیفیت یہ ہے کہ اسے سینے سے لگائے پھر رہی ہے۔کوئی سوچتا نہیں ہے کہ آیا قرآن حکیم کی یہ آیات ان کے سامنے تھیں یا نہیں تھیں۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابۂ کرامؓ کا کردار اور ان کے درجات کا معاملہ

قرآن حکیم ان صحابۂ کبارؓ کے متعلق کہتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دشمن کے مقابلے میں تو چٹان کی طرح کھڑے ہوتے تھے لیکن آپس میں ان کی بے حد محبت تھی۔قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی تالیف ڈال دی' ایک دوسرے کے دلوں کو جوڑ دیا۔اور کہا ہے کہ یہ ہماری وہ رحمت ہے کہ تُو ساری دنیا کی دولت خرچ کر دیتا تو یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتا تھا۔جن کے باہمی دلوں کی الفت اور تالیف کی شہادت قرآن حکیم ان الفاظ میں دے رہا ہے' جن کے متعلق یہ Certificate (سند) قرآن حکیم میں موجود ہے کہ یہ انصار اور مہاجرین سارے کے سارے

مومن حقا ہیں' ہم نے ان کو بخش دیا ہے' ان کے لیے جنت تیار رکھی ہے' یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب قرآن حمید اتر رہا تھا' اس زمانے میں تو ایسے تھے' بس اس کے بعد پھر یہ سارے پھر گئے تھے۔ چلیے صاحب! اس زمانے میں انسانوں میں سے تو کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ بعد میں کیا کریں گے' جس خدا نے انہیں یہ کہا کہ ہم نے ان کے لیے جنت تیار رکھی ہے تو پھر کیا اس کے بعد یہ کہے گا ''ایناں فرشتیاں نوں کہ نہ اونہ' میں ایویں پاس کردتے سن' اے سارے کینسل کردیو ایناں نوں لنگن نہ دینا' او کہن گے: جی' تسی تے ایناں نوں جنت دا Certificate (سرٹیفکیٹ) دے دتا ہویا اے؟ میں جو کہنا ہیگاں کہ نہ لنگن دینا'' (ان فرشتوں سے کہے گا کہ نہیں بھئی! نہ دینا۔ میں نے تو یونہی (یہ ری مارکس) پاس کردیئے تھے' یہ سارے کینسل کردو' انہیں (جنت میں) نہ جانے دینا۔ وہ کہیں گے کہ آنجناب نے تو انہیں جنت کا Certificate جاری کردیا ہوا ہے۔ ہاں وہ دے تو دیا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ انہیں نہ جانے دینا)۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ عزیزانِ من! آج یہ ساری چیزیں سکھوں کی سی ہو رہی ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ بخشے جا چکے ہیں' ان کے لیے جنت ہے' اس لیے کہ مومن حقا ہیں۔ یہ ان کے مرنے تک کی شہادت ہے جو قرآن مجید دے رہا ہے۔ قرآن مجید کی یہ شہادت ان کے متعلق موجود ہے۔ یہ جسے آپ ان کے زمانے کی صحابہ کبارؓ کی Contemporary History (ہم عصر تاریخ) کہتے ہیں اس کا لکھنے والا خدا ہے۔ یہ شہادت دے رہا ہے' ان کی موت تک Certificate (سند) دے رہا ہے کہ بخشے جا چکے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں ہمارے پاس تین سو سال کے بعد ایک شخص طبرستان سے آتا ہے' وہ بیٹھ کر اور لوگوں کی باتیں سن سن کر کہ ''میں نے اس سے سنا' میں نے اس سے سنا'' سے تاریخ لکھتا ہے۔ آج کی عدالت میں کسی گواہ کا یہ بیان قابل قبول شہادت نہیں ہے' اسے نہ تو علم کہا جاتا ہے' نہ ہی شہادت تسلیم کی جاتی ہے۔

## شہادت کے سلسلہ میں علم کی اہمیت

علم کے متعلق تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ (17:36) جس چیز کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگا کرو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِکَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36) ہم تمہاری سمع اور بصر اور فواد کے پیچھے ہیں کہ تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر ان معلومات کی بنا پر' اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح صحیح نتائج پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گم ہوگئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ علم تو یہ ہے اور شہادت کی یہ کیفیت ہے کہ آج بھی عدالت میں جا کر کوئی گواہ کہہ دے کہ صاحب! مجھے اپنے طور پر تو کچھ پتہ نہیں' لا الہ اللہ محمد رسول اللہ ''میں بری الذمہ ہیگاں' خدا نوں جان دینی اے' میں سُنیا سی پئی اینے اوہنوں قتل کیتا

ہیگا' اونوں گنّوں پھڑ کے باہر کڈ دیندے نیں'' (میں بری الذمہ ہوں' خدا کو جان دینی ہے' میں نے اس سے سنا تھا کہ قتل کیا ہے۔ اسے کان سے پکڑ کر عدالت سے باہر نکال دیں گے)۔ یہاں آپ کے ہاں اس چیز کو معتبر شہادت قرار دیا جاتا ہے ''میں سنیا سی' اوہنے پیو توں سنیا سی' اوہنے اوہدے کولوں سنیا سی' اوہنے اوہدے کولوں سنیا سی' اوہناں نے کیا: بلاؤ اوہناں نوں' کہن لگے: اے تے قبرستان چلے گئے نیں' سدیئے کینوں؟'' (میں نے سنا تھا۔ اس نے باپ سے سنا تھا۔ اس نے اُس سے سنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بلاؤ۔ کہنے لگے کہ وہ تو قبرستان میں دفن ہیں بلائیں کیسے؟) یہ آپ کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں عقیدت مندوں کو چھوڑ یئے' دنیا کے کسی Historian (مورخ) سے کہیے کہ آپ دنیا کی ہسٹری کے معیار کے مطابق' اس ہسٹری کے متعلق کیا فتویٰ دیتے ہیں' ذرا ان سے پوچھ لیجیے لیکن وہ فتوے کیوں دیں صاحب! جب آپ ان کے پیچھے پڑ جائیں؟ ان میں سے اگر کوئی مستشرق کسی چیز کے خلاف لکھتا ہے تو آپ اس کی کتاب Ban (ممنوع) کر دیتے ہیں کہ ''اے ساڈے دھونے کیوں دھون آیا اے؟'' (یہ ہمارے پاپ دھونے کیوں آیا ہے؟) ان کو کیا پڑی ہے صاحب!

عزیزانِ من! یہ ہے آپ کی وہ تاریخ جس کے اندر یہ چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ بات یہاں سے طاہرہ بیٹی نے چھیڑی تھی۔ وہ بات بڑی اہم ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ اردن کے میدان میں ''یاسر عرفات'' کی اور ''شاہ حسین'' کی فوجیں آپس میں لڑی ہیں' پچھلے دنوں جو واقعہ ہوا ہے' اس میں مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ ہمارے اخبارات میں سرخیاں آئی ہیں۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اخبار میں یہ سرخیاں لکھنے والے بھول گئے کہ ان کی تاریخ کی تو ابتدا ہی یہاں سے ہوتی ہے۔ یہ تو پھر بھی ان کو بیچارے گنہگار مسلمان کہتے ہیں' تمہاری تو تاریخ کی ابتدا ہی ان مسلمانوں سے ہوتی ہے' ان واقعات سے ہوتی ہے تو تم اپنے ہاں اپنی تاریخ میں امن کیسے قائم کر سکتے ہو۔ اور بات بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کی تاریخ کا کوئی ورق ایسا نہیں جس کے اندر اس قسم کے خون کی رنگینیوں کے چھینٹے نہ پڑے ہوئے ہوں۔ بڑے فخر سے اپنی تاریخ ہم دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

عزیزانِ من! محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے متعلق قرآن کریم کی تاریخ کے علاوہ اور کوئی تاریخ قابل اعتماد نہیں' جو شہادت قرآن کریم ان کے متعلق دیتا ہے' ایک طبری نہیں' سو طبری کی کتابوں کے اندر بھی اس کے خلاف اگر کچھ آئے گا تو ہم اس لیے مسترد کر دیں گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ اس لیے مسترد کر دیں گے کہ خدا کی شہادت کے مقابلے میں کسی انسان کی کوئی سند قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری اس لیے مسترد کر دیں گے کہ دنیا کے عام علمِ تاریخ کی رو سے بھی جو تاریخ اس طرح سے مرتب کی گئی ہو' وہ کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا قرآن مبین کی یہ آیت کہ جو مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے' اس کی سزا جہنم ہے' اللہ کا غضب ہے' اس کی لعنت

ہے' عذابِ عظیم ہے۔(معاذ اللہ معاذ اللہ) صحابۂ کبارؓان سے بہت بلند تھے کہ ان پر اس چیز کا انطباق ہو جائے۔ان پر اس کا انطباق کر دیں گے تو پھر دنیا میں آپ کہاں سے ایمان ڈھونڈ لائیں گے۔عزیزانِ من! یہ ہے مومن کے ایک دوسرے کے قتل کے متعلق۔آج تو یہ چیزیں محض وعظ کہنے کی رہ گئی ہیں۔یہاں کس کو یہ بتایا جائے کہ ہر صبح یہاں جتنے قتل ہوتے ہیں آپ دیکھ لیجیے گا وہ مسلمان' مسلمان کو قتل کر رہے ہیں لیکن سوال ہی نہیں ہے کہ کسی کے سامنے یہ آیتیں پیش کی جائیں۔قرآن حکیم نے قتل عمد کو جرمِ عظیم قرار دیا ہے۔

اب پھر جنگ کی بات شروع ہوئی۔جنگ کے سلسلے میں یہ اس لیے لائے ہیں کہ ایسا امکان تھا کہ کہیں آپ نے دشمن کے خلاف حملہ کیا ہے' ان کے اندر کوئی گروہ ایسا بھی ہے یا کوئی ایسے افراد بھی ہیں' جو مسلمانوں کے ہیں اور نا دانستہ وہ آپ کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ یہ ان چیزوں کے لیے تھا۔اس نے کہا ہے کہ مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کرے تو مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ (4:92)۔کیا بات ہے قرآن حکیم کے انداز کی! کہ ''او مومن ای نئیں ہوندے'' (وہ مومن ہی نہیں ہوتے)۔

## میدانِ جنگ میں بھی صلح کے لیے ضروری ہدایات موجود ہیں

آگے پھر وہ بات آ گئی' کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا (4:94) اے جماعتِ مومنین! جب تم خدا کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے باہر نکلو تو پہلے تحقیق کر لو کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔یونہی ہر ایک کو دشمن تصور کر کے اس پر حملہ نہ کر دو۔کیا ضوابط ہیں قرآن حمید کے! صلح کے میدان میں' بزم کے اندر کے جو ضوابط ہوں گے' ان کو تو چھوڑیئے' میدانِ جنگ میں جہاں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے برسرِ پیکار ہوتی ہیں اس کے متعلق بھی فَتَبَيَّنُوْا (4:94) آیا ہے کہ آنکھیں بند کر کے نہ چلا کرو' آنکھیں کھول کر چلا کرو' ہر طرف دیکھ بھال کر چلا کرو' تحقیق کیا کرو کہ کہاں جا رہے ہیں' کون دشمن ہیں کون دوست ہیں۔

## معاشرتی طور پر دوسرے فریق کے متعلق پہلے ری ایکشن کی وضاحت

اگر کہیں قیاس سے تم نے معلوم بھی کر لیا کہ شاید یہاں کوئی مخالفت کا پہلو ہے تو سنو! ایک چیز فرسٹ ری ایکشن' پہلا Impression (تاثر) ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ تمہارے اندر کیا ہونا چاہیے۔ہمارے اس معاشرے کے اندر تو ہر شخص کے متعلق پہلا ری ایکشن یہی ہے کہ اس سے بچنا ہے۔فرسٹ ری ایکشن یہ ہو گیا ہوا ہے یعنی ہجوم کے اندر بھی آپ جایئے' ہر پاس سے چلنے والے کے متعلق آپ کو یوں کرنا پڑتا ہے۔اور اگر کہیں آپ ایسے راستے پر جا رہے ہیں' جہاں تنہا کوئی آ رہا ہے' اس سے متعلق پوچھیے نہیں کہ آپ

کا فرسٹ ری ایکشن کیا ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں قانون کا احترام اٹھ جائے تو اس میں یہی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم فرسٹ ری ایکشن کی یہ بات کرتا ہے کہ تم کہیں جاؤ تو **وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا** (4:94) اگر کوئی تمہاری طرف امن وسلامتی کا پیغام بھیجے تو اس کے متعلق تمہارا پہلا ردّعمل یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایمانداری سے ایسا نہیں کر رہا' منافقت برتتا ہے۔ عزیزانِ من! اس آیت کے معنی بھی عام سے لیے جاتے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی جیسا کہ اوپر بتایا ہے اس سے بہت آگے چلے جاتے ہیں۔ عام معنوں میں کہا یہ جاتا ہے کہ جو بھی تمہیں ''سلام علیکم'' کہے' اس سے یہ نہ کہو کہ وہ مومن نہیں ہے۔ یہ ''سلام علیکم'' والی بات نہیں ہے' سلام کی یہ چیز تو پیچھے سے چلی آرہی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ تم گئے ہو' تمہارا انداز یہ دیکھنے کے لیے ہے کہ آیا یہ گروہ' یہ جماعت' مخالفین کی ہے یا موافقین کی ہے' ہمارے دشمن ہیں یا دوست ہیں یا نیوٹرل (غیر جانبدار) ہیں۔ تم گئے اور انہوں نے دور سے ہی کہا کہ امن اور سلامتی ہو' سفید جھنڈا پیغام صلح کا ہے' ہم دشمن نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ تمہارا فرسٹ ری ایکشن (پہلا ردِعمل) یہ نہیں ہونا چاہیے کہ نہیں صاحب! یہ بے ایمان ہے' ہم نہیں مانتے اور تم ان پر چڑھائی کردو۔ یہ بات نہیں ہے۔ یعنی منافقت سے بھی اگر وہ کہہ رہا ہے کہ ہم صلح چاہتے ہیں تو تمہارا فرسٹ ری ایکشن Positive (مثبت) ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے اس کہنے کے اندر یہ ایک فیصد دیانتدار ہوں۔ تو ایسے لوگوں کے اوپر تم نے ہاتھ اٹھا دیا۔ وہاں مومن کے معنی اگر آپ صرف وہی جماعت نہ لیں جو ایمان لائی ہوئی ہے' بلکہ وہ ہے جو امن کا خواہاں ہے' تو یہ تو امن کے خواہاں ہونے کے اعتبار سے مومن ہوجائیں گے۔ کہا ہے کہ ان کے اوپر یوں نہ ہاتھ اٹھاؤ۔ تمہارا فرسٹ ری ایکشن (پہلا ردِعمل) یہ نہیں ہونا چاہیے کہ نہیں! یہ مومن نہیں ہیں' یہ سچ مچ امن نہیں چاہتا' یہ پہلا ردّعمل نہیں ہونا چاہیے۔

## مالِ غنیمت کے سلسلہ میں نفسیاتی تبدیلی کے لیے جنگ کو فی سبیل اللہ قرار دے دیا گیا

اگلا سوال یہ ہے کہ کیا بس اتنی سی بات ہے کہ انہوں نے سلام کر دیا' یا کہہ دیا کہ ہم امن چاہتے ہیں تو بس اس کے بعد پھر تم مطمئن ہوجاؤ کہ نہیں صاحب! یہ اپنے ہیں۔ پہلے تو یہ کہا کہ تمہارا فرسٹ ری ایکشن (پہلا ردِعمل) یہ کیوں ہونا چاہیے؟ کہا کہ تم جوری ایکشن (ردِعمل) نہیں قائم کرتے ہو اور کہتے ہو کہ چڑھ دوڑیئے **تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (4:94) اس زمانے میں جنگ مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے ہوتی تھی تو اس کے لیے تو ذرا سا بہانہ چاہیے' پھر ایسی جگہ جہاں تم دیکھو کہ ان کے اوپر ہم جھپٹے اور دو منٹ کے اندر ہم ان کو مغلوب کرلیں گے' مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ آجائے گا تو کہا کہ کیا اب بھی تمہارے ذہن میں جنگ کی غرض وہ مالِ غنیمت حاصل کرنا ہی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حمید نے اس قسم کے عربوں میں نفسیاتی ذہنیتوں کے اندر' قلب ودماغ کی سب سے

بڑی تبدیلی پیدا کی تھی۔ ان کے ہاں جنگ کا جذبہ ہی مالِ غنیمت ہوتا تھا۔ وہاں تنخواہ دار سپاہی تو ہوتے نہیں تھے' سپاہیوں کو جو کچھ جنگ میں ملتا' وہ لوٹ لے وہ ہر سپاہی کا حصہ ہوتا تھا۔ اس لیے بھی وہاں جنگ ہوتی رہتی تھی کہ جہاں ذرا سی محتاجی آئی' کوئی ضرورت مندی ہوئی' انہوں نے چار آدمی ساتھ لیے' دوسرے پر حملہ بول دیا اور جا کر ان کو لوٹ لیا اور مالِ غنیمت لے آئے۔ کہا ہے کہ تمہاری یہ ذہنیت ختم کر دی ہے' اب یہ جنگ فی سبیل اللہ ہے۔

## جذبہ محرکہ تو انسانی زندگی کے تصور کو بدل دیتا ہے

میں نے جو عرض کیا ہے کہ قرآن حمید نے کتنا بڑا انقلاب پیدا کیا' وہ یہ تھا کہ یہ مالِ غنیمت قرآن حمید نے سپاہیوں کے ہاتھ نہیں لگنا قرار دیا تھا' وہ ایک سوئی نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ انہی عربوں کو لڑانے کے لیے چلے جا رہے ہیں' ان کے لیے جو جذبۂ محرکہ' وجۂ کشش تھی اس کو حرام قرار دیدیا ہے۔ اور اس کے باوجود یہ اس طرح جا رہے ہیں کہ پہلے تو شاید کوئی بہانہ کر لیتا ہوگا' اس کے بعد تو ''سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'' میدانوں میں لڑنے کے لیے یوں جاتے تھے۔ دیکھا قرآن کریم نے جذبۂ محرکہ کیسے بدلا۔ یہاں یہ کہا کہ یہ سچ مچ کی صلح کے خواہاں نہ ہوں' کیا تمہارے دل میں یہ آرزو مچل رہی ہے کہ مالِ غنیمت ہاتھ آ جائے گا؟ **فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ** (4:94)۔ اب یہاں **مَغَانِمُ** آیا ہے اس نے لفظ وہی Use (استعمال) کیا ہے جو وہ اپنے ہاں استعمال کیا کرتے تھے' معنی بالکل بدل گئے۔ عربوں کے ہاں استعمال ہونے والے لفظ مال غنیمت کا مادہ بڑا عجیب ہے' یہ ''غ ن م'' ہے۔ یہ غنم کیا ہوتا ہے؟ یہ ہیں بھیڑیں بکریاں۔ عرب تو مال کہتے ہی بھیڑ بکری کو تھے' ہمارے ہاں بھی یہ مال مویشی' اپنی گائیوں کو' بھینسوں کو کہتے ہیں۔ یہ غنیمت میں بھیڑ بکریاں آ سکتی تھیں' پھر ہر قسم کی دولت کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگ گیا۔ کہا یہ ہے کہ اگر یہ چاہتے ہو تو یاد رکھو! خدا کے پاس اس سے بہت زیادہ دولت تمہارے لیے ہے' وہاں سے لو' انسانوں سے چھین جھپٹ کر کیوں لیتے ہو' ہم تمہیں دیں گے۔ **كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ** (4:94) اسلام سے پہلے تو تمہارے ہاں یہی جذبۂ محرکہ ہوا کرتا تھا تو کیا مومن ہونے کے بعد بھی وہی جذبۂ محرکہ ہے؟ دیکھیے کیسی عمدگی سے روکا ہے کہ تم وہی ہو گئے جو پہلے تھے۔ **فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ** (4:94) خدا نے تمہاری نفسیاتی تبدیلی کا جو اتنا بڑا احسان کیا ہے' یہ رسول بھیجا' یہ ہدایت بھیجی' یہ نظام قائم کیا' اس احسان کا بدلا یہی ہے کہ تھوڑی سی جاذبیت تمہارے سامنے آئی تو اسی روشِ کہن پر تم پھر لوٹ گئے' یہ تو ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ ری ایکشن (ردِعمل) نہیں ہونا چاہیے۔

## پہلے ردِعمل کے ساتھ ساتھ تحقیق کے عمل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے

اب اگلی بات یہ ہوگئی کہ جب انہوں نے اتنی سی بات کہہ دی تو ہم مطمئن ہو گئے کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ تو دوست ہیں۔ کہا کہ یہ

بات نہیں ہے فَتَبَيَّـنُوْا (4:94) اس کے متعلق تحقیق کرو۔ فرسٹ ری ایکشن (پہلا ردِعمل) یہ رکھو لیکن اسی پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جاؤ۔ دیکھیے! یہ لفظ دوسری دفعہ آیا ہے' پہلے بھی فتنبوا کا ہی لفظ تھا' لیکن اس کے بعد فرسٹ ری ایکشن (پہلا ردِعمل) ہونے کے بعد اسی طرح سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جاؤ' فَتَبَيَّـنُوْا پوری تحقیق کرو۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ تھا قرآن کریم کا وہ ارشاد' جس کے مطابق حضرت عمرؓ (581-644/45ء) کا تاریخ میں وہ قول ہے جو جلی حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

## مومن کی خصوصیت کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کا قولِ زریں

یہ تو ہم میں سے ہر ایک نے سنا ہوگا اور ان کے سامنے بھی کسی نے دہرایا ہوگا۔ انؓ (حضرت عمر فاروقؓ) سے کسی نے کہا کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا' حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس فقرے کو پورا کرو (ہمارے ہاں پورا فقرہ تو یہی ہوتا ہے اور بہت بڑی چیز ہے کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا)۔ آپؓ نے کہا کہ پورا فقرہ یوں ہے کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا اور کسی سے دھوکا کھاتا بھی نہیں ہے۔ یہ ہے مومن کی خصوصیت۔ مومن کے اندر تو خدا کی صفات ہوتی ہیں۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ تم ہم کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ مومن بھی وہ ہے کہ جس کے اندر خدا کی صفت منعکس ہوتی ہے' وہ دھوکا دیتا نہیں ہے' دھوکا کھاتا بھی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے کہا ہے کہ فَتَبَيَّـنُوْا (4:94) تحقیق کرو۔ دین جب مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے تو وہاں کا ضابطۂ اخلاق منفی ہو جاتا ہے۔ یہ اتنا حصہ منفی ہے کہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا' زندگی کے مثبت پہلو اس کے بعد آتے ہیں کہ کسی سے دھوکا کھاتا بھی نہیں۔ مومن کا یہ فَتَبَيَّنُوْا شعار ہے۔ وہ دھوکا کیوں نہیں کھاتا ہے؟ اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (4:94)۔ خدا کی صفت یہ ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے باخبر رہتا ہے' تمہاری بھی یہ صفت ہونی چاہیے کہ جو کچھ دوسرے کرتے ہیں تم اس سے باخبر رہو۔ باخبر رہو گے تو دھوکا نہیں کھا سکتے' دھوکا تو انسان بے خبری میں کھاتا ہے۔

## قرآنِ حکیم نے مومن کی ایک خصوصیت خبیر بھی بیان کی ہے

آیت کے آخر میں خدا کی جو صفت ہے' میں نے کہا ہوا ہے کہ اس سے یوں نہ گزر جایا کرو۔ قرآن حمید عجیب صفت لاتا ہے۔ کہا ہے کہ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (4:94) اسلامی نظام' اس کے معاشرے کی خصوصیت' مومن کی خصوصیت' یہ ہے کہ اسے خبیر ہونا چاہیے۔ وہ ایسا نظام ہو جس میں ہر شخص خبیر ہو۔ اس کی ایک مثال پھر حضرت عمر فاروقؓ کے دور (634-644/45ء) میں ملتی ہے۔

## جھونپڑی کی ایک بڑھیا نے حضرت عمر فاروقؓ پر کپکپی طاری کر دی

آپ کو یاد ہے کہ دشتِ شام کی اس بڑھیا نے حضرت عمرؓ (581-644/45A.D.) سے جو کہا تھا' اس نے کپکپا کر رکھ دیا تھا'

آپؓ ساری عمر یاد کیا کرتے تھے' آنسو آ جایا کرتے تھے۔ حسبِ معمول شام سے واپسی پر جوان کا قاعدہ تھا کہ رات کی تنہائیوں میں' وہ خیموں میں گھوما کرتے تھے تاکہ افرادِ معاشرہ کی' جسے اب رعایا کہتے ہیں' ان کو براہِ راست انفارمیشن ہو کہ ان کے حالات کیا ہیں' واقعات کیا ہیں' وہ کیا باتیں کرتے ہیں' ان پر کیا گزرتی ہے۔ دیکھا کہ وہ ایک تنہا سا خیمہ تھا' جھونپڑی تھی' وہاں گئے' بوڑھی سی ایک عورت تھی' اس سے جا کر یہ پوچھا کہ کیا حال ہے مائی تمہارا؟ اس نے کہا کہ مسافر! تمہیں میرے حال سے کیا؟ جس کو میرے حال معلوم کرنے کی ذمہ داری تھی' اس نے معلوم نہیں کیا' تو تم کون ہو معلوم کرنے والے! انہوںؓ نے کہا کہ کس نے معلوم نہیں کیا؟ کہنے لگی کہ خلیفۃ المسلمین ہیں' اس نے معلوم نہیں کیا کہ مجھ پہ کیا بیت رہی ہے۔ انہوںؓ نے کہا کہ مائی! تم نے اس تک اپنی تکلیفوں کو پہنچایا؟ اس نے کہا کہ یہ میرا فریضہ نہیں ہے کہ میں اپنی تکلیفیں اس کو پہنچاؤں۔ خیمے کی اس بڑھیا کا فقرہ یہ تھا کہ وہ خدائے خبیر کا نمائندہ بننے کا دعویٰ کرتا ہے' تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ باخبر رہے کہ معاشرے میں کیا ہو رہا ہے' اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس سے جا کر کہہ دو کہ تمہیں حق نہیں ہے کہ تم خلیفہ بنو اور خدا کی نمائندگی کرو۔ آپؓ کانپ اٹھے تھے۔

## حضرت عمر فاروقؓ نے خاندانی خلافت کو ختم کر کے رکھ دیا

(اسی طرح تاریخ ہی کی ایک دوسری بات سنیے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے وقت) کسی نے کہا کہ آپؓ کا بیٹا عبداللہ ہمیں بڑا معقول معلوم ہوتا ہے' اس کو خلیفہ بنائیں' تو انہوںؓ نے کہا کہ خطاب کے خاندان میں بھینٹ کا ایک بکرا تھوڑا ہے تمہارے لیے' جو میں نے خلافت قبول کر لی' بابا! خدا کے لیے انہیں معاف کر دو' تمہیں پتہ ہے یہ بار کتنا وزنی ہے؟ مجھے تو اس مائی کا قول ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ میں نے دانستہ کسی کی ضرورت نہیں روکی۔ یہ اور بات ہے' اس نے تو یہ کہا ہے کہ خدائے خبیر کے نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ عذر پیش کرتے ہو کہ مجھ تک تمہاری اطلاع نہیں پہنچی۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (4:94)۔ یاد رکھو! اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ یعنی یوں اپنا نظام استوار کرو۔

## انسانی صلاحیتوں کی بنیاد پر افراد کا تعین اور جہاد کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ ہے اسلامی نظام اور اسلامی مملکت۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اپنے آئین میں چند الفاظ رکھ لیے' قانون کے ضابطے کے اندر بڑی بات کی تو شرعی ضابطے کی سزائیں رکھ لیں اور اس کے بعد کہا کہ صاحب! ہم نے اسلامی نظام قائم کر لیا۔ اسلامی نظام ان چیزوں کا نام نہیں ہے' یہ الفاظ کا نام نہیں ہے۔ یہ تو

جہادِ زندگانی میں ہیں مردوں کی یہ شمشیریں

قرآن کریم اب اس معاملے میں آگے آتا ہے۔ یہ معاشرے میں افراد اور افراد کے اندر فرق کر کے بتا دیتا ہے۔ معاشرے میں مختلف صلاحیت کے، مختلف استعداد کے، لوگ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ **لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ** (4:95) ۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔ عام طور پر اس کے معنی لیے جاتے ہیں کہ ''مومنوں میں وہ لوگ جو جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو پیچھے بیٹھے رہنے والے ہیں، وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ **فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً** (4:95) خدا نے ان مجاہدین کا اُن لوگوں کے مقابلے میں ایک درجہ بڑھا دیا ہے جو پیچھے بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ ایک تو ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے جہاد یا مجاہد کے معنی جنگ ہی کے لے لیے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ قرآنِ کریم تو زندگی کے ہر سانس میں جدوجہد کی تلقین کرتا ہے، جسے ہم جدوجہد یا سعی و کاوش و عمل کہتے ہیں، اسی کے لیے قرآن کریم میں لفظ جہاد ہے۔ جہاد کے معنی ہیں ''زندگی کے قدم قدم پر، ہر وقت مصروفِ تگ و تاز رہنا، مشغولِ جدوجہد رہنا''۔ ایسا رہنے والا مجاہد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ساری زندگی میں اس کے لیے موقعہ ہی نہ آئے کہ اس کو اس جدوجہد میں، میدانِ جنگ میں بھی جانا پڑے لیکن اس جدوجہد میں ایک مقام ایسا آ سکتا ہے جسے آپ میدانِ جنگ کہتے ہیں، اُسے قرآن قتال کہتا ہے۔ جہاد کی یہ ایک آخری کڑی ہے جسے قتال کہا جاتا ہے، جنگ کہا جاتا ہے لیکن سارا جہاد، جنگ نہیں ہے، یہ ساری زندگی کی تگ و تاز کا نام ہے۔ مجاہدین صرف وہ نہیں ہیں جو میدانِ جنگ میں جا کر شمشیر سے لڑتے ہیں۔ جہادِ زندگی جسے قرآن کریم نے کہا ہے، اُس جہادِ زندگی کے اندر جو جدوجہد کرنے والا ہے، وہ مجاہد ہے، ہر مومن اسی لیے مجاہد ہے۔ اور جہاد کا آخری درجہ یہ ہے کہ جب جنگ ہو تو پھر جہاد میدانِ جنگ میں بھی ہو لیکن قرآن کریم کی ہر آیت میں جنگ ہی معنی نہیں لیے جاتے۔ یہاں بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہاں معنی جنگ کے نہیں ہیں، وہ اس وجہ سے کہا کہ جنگ یا جہاد کا اعلان ہو چکا ہو اور تمام مومن، مجاہدوں کا روپ دھارے میدان میں جا چکے ہوں اور یہ گھر میں بیٹھے رہیں تو کیا قرآن کریم ان کے لیے اتنی سی بات ہی کہے گا کہ صاحب! ان دونوں کے درجے برابر نہیں ہو سکتے؟

## میدانِ جنگ میں قصداً پیچھے رہ جانے والوں کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد نیز سورۃ التوبہ کا ایک واقعہ

مومن (A Soldier) کو War (جنگ) کے لیے بلایا گیا ہے، آواز دی دی گئی ہے، چلے بھی گئے ہیں۔ اور ان کے علاوہ جو ہیں جنہیں **غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ** (4:95) کوئی کسی قسم کی بیماری نہیں ہے، کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے، کوئی معذوری نہیں ہے، بغیر عذر کے بیٹھے رہے ہیں، تو اس کے بعد صرف یہی ہے کہ ان دونوں کے درجات میں بس ذرا سا ایک درجے کا فرق ہوگا۔ یہ بات تو نہیں ہو سکتی۔

اس لیے نہیں ہوسکتی کہ قرآن کریم میں آگے چل کر سورۃ التوبہ میں ہمارے سامنے جنگ تبوک ❶ کا ایک واقعہ آتا ہے جب حضورﷺ تشریف لے گئے تو انہی مومنین میں سے کچھ وہ تھے جو پیچھے رہ گئے' ان میں سے تین ❷ کی کیفیت خود قرآن کریم بیان کررہا ہے کہ وہ پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ جماعتِ مومنین کے اندر پہلا واقعہ تھا۔ اور اتنا اہم معاملہ تھا کہ قرآن کریم نے خود سورۃ التوبہ کے اندر اس واقعہ کا پورا ذکر کیا ہے۔ اس دوران میں حضورﷺ نے معاشرے کو کہہ دیا تھا کہ ان سے قطع تعلق کرو' یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ اور پھر ان کی کیفیت حیرت زا تھی۔ ان میں سے ایک حضرت کعب بن مالکؓ ہیں۔ ان کے واقعات تاریخ میں آگئے ہیں۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ''زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پہ تنگ ہوگئی تھی' وہ اپنی جان تک سے تنگ آ گئے تھے'' (9:118)۔ آپ نے سوچا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا' صرف ان کے مقاطع کا حکم ہوا ہے اور یہ کیفیت ہے۔ حضرت کعب نے یہ کہا ہے کہ میرے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت تھی کہ میں جا کر مسجد میں جماعت مومنین اور رسول اللہﷺ کے لوگوں کو سلام کرتا تھا' سلام کا جواب تو حضورﷺ دیتے تھے لیکن آنکھ اٹھا کر یہ میری طرف نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر خودکشی جرم نہ ہوتی تو میں پہلے ہی دن خودکشی کر لیتا۔ یہ قرآن حمید نے کہا کہ وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری کیفیت یہ ہوگئی تھی۔

عزیزانِ من! جماعت مومنین سے مقاطع کی سزا تو از خود دی تھی۔ ان کے متعلق کہا کہ انہوں نے آ کر اپنی Defence (دفاع) پیش کی تھی' معذرت پیش کی تھی لیکن معذرت یہی تھی کہ شروع کے دو تین دن تو واقعی مصروفیت کی وجہ سے رکے رہے' پھر یہ بات ہوگئی کہ صاحب! لشکر بڑی دور چلا گیا ہے' کیسے ملیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! یہ عذر ہی ہے جو ہم پیش کرسکتے ہیں' میں اب کہہ نہیں سکتا کہ مجھے کیا ہوا تھا کہ میں کیوں نہیں گیا تھا' میں کچھ نہیں کہہ سکتا' ہر سزا جو آپ دینا چاہیں' اس کے لیے ہم تیار ہیں اور اس کے ہم سزاوار ہیں۔ قرآن کریم نے یہ چیز کہی تھی کہ پہلا واقعہ ہوا ہے اور انہوں نے اس قدر اپنی معذرت پیش کی ہے اور اتنی سزا تمہاری طرف سے بھگت لی ہے اس لیے اس واقعہ کی بنا پر ان کو معاف کیا جاتا ہے ورنہ یہ جرم ایسا نہیں تھا۔ جنگ کے اعلان کے بعد پیچھے بیٹھے رہنے والوں

---

❶ غزوۂ تبوک رجب 9ھ مطابق نومبر 630ء میں ہوا۔ یہ مقابلہ بازنطینی شاہنشاہیت سے تھا۔ اس لیے نبی اکرمﷺ تیس ہزار کا لشکر جرار لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے جن میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ تبوک کے مقام پر جا کر معلوم ہوا کہ اگرچہ رومیوں میں کھچڑی پک رہی تھی لیکن ان کی طرف سے فوری حملے کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے حضورﷺ نے وہاں بیس دن تک قیام کیا اِدھر اُدھر کے عیسائی سرداروں نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کی اور آپﷺ واپس تشریف لے آئے تو پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ پیش ہوا۔ یہ قریب اسی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی اور حضورﷺ نے اسے قبول کرلیا لیکن تین صحابہؓ ایسے تھے جن کے لیے وحی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی 1949' ص ص۔ 589 تا 590)۔

❷ ان میں ایک کعب بن مالکؓ تھے اور باقی دو بلالؓ بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی 1949' ص ص۔ 590)

کے متعلق تو قرآن کریم یہ کہتا ہے۔ کیا قرآن کریم یہ کہہ کر چھوڑ دے گا کہ یہ بیٹھے رہنے والے ہیں' بس اتنا ہی ہے کہ صاحب! ذرا سا ان کے اندر مدارج کا فرق آ گیا ہے ورنہ **وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى** (4:95)؟ عزیزانِ من! جنگ کا اعلان ہونے کے بعد تو آج بھی یہ کیفیت ہے کہ Soldier (سپاہی) اگر چھٹی پہ ہوتا ہے تو چھٹی Cancel (رد) ہو جاتی ہے' جو ریٹائر لوگ ہیں ان کو بھی آنا پڑتا ہے اور یہ تو مومن اور مجاہد تھے۔

## جدوجہدِ زندگی میں مختلف افراد کی تگ و تاز کے مطابق درجات کے تعین کا معاملہ

یہاں جدوجہد کے معنی جنگ نہیں ہے' زندگی کی جدوجہد ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں کہا ہے کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ قٰعِدُ کے معنی عربی زبان میں صرف بیٹھا رہنے والا ہی نہیں ہوتا' ہر وہ شخص جو کسی کام میں سستی برتتا ہے' تساہل انگیز ہے' غفلت شعار ہے' اس کے لیے بھی یہ لفظ **قٰعِدُ**[1] آتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ **الْقٰعِدِيْنَ** ہیں۔ ان کے مقابل **الْمُجٰهِدِيْنَ** (4:95) ہیں۔ یہ **الْمُجٰهِدُوْنَ** تو بڑے ہی جوش و خروش سے' کسی کام کے اندر آگے بڑھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس میں کچھ غفلت' کچھ سستی' کچھ تساہل' برتتے ہیں۔ کہا کہ یہ تو وہ میدان ہے کہ اس کے اندر جو بھی تساہل برتتا ہے' کرتا تو وہ بھی ہے لیکن وہ تھوڑی سی سستی سے کرتا ہے' کسمساتا ہوا اٹھتا ہے۔ کہا ہے کہ ان دونوں کے اندر بھی خدا کے نظام میں مدارج کا فرق ہے لیکن یہ سن لیجیے کہ **وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى** (4:95) یہ جو معاشرے کے اندر خوشگواریاں آئیں گی' ان میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا جائے گا' ان سب کے ساتھ خدا کا یہ وعدہ پورا ہوگا ورنہ ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ ایسے لوگ جب جنگ کا اعلان ہو رہا ہے' مجاہد ہیں' گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں یعنی ان کو کسی قسم کا ضرر بھی ہو تو معذرت کریں' Permission (اجازت) کے لیے Application (درخواست) بھیجیں' اجازت لیں مگر وہ ہیں کہ یونہی بیٹھے رہے۔

## خدا کے ہاں درجات کا فرق تو ہوگا لیکن حسنات میں نہیں

کہا ہے کہ **كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى** (4:95) یاد رکھو! یہ دو باتیں ہیں: ایک تو انسانی ذات کی نشوونما کی رو سے خدا کے ہاں مدارج ہیں' ان میں تو فرق ضرور ہوتا ہے۔ پھر یہ جو مدارج ہیں۔ اگر ''درجہ'' کے معنی سمجھ لیے جائیں تو بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ''درجات'' سیڑھی کے وہ زینے (Steps) ہوتے ہیں' جو ایک کے اوپر دوسرا ہوتا ہے۔ ان میں جو اوپر کو لے جانے والے ہوتے ہیں' ان کو ''درجات'' کہتے ہیں۔ اور زینے وہی ہوتے ہیں' جب وہ نیچے کی طرف اترنے والے ہوتے ہیں' تو ان کو

---

[1] امام راغب نے یہ کہا ہے۔

''درکات'' کہتے ہیں۔''ڈنڈے اوہی ہوندے ہیگے نیں'' (ڈنڈے (Steps) وہی ہوتے ہیں)۔ یہ ''درجہ'' کے معنی ہیں ''او پوہڑی دے ڈنڈے جناں تے اُتے تریا جان ڈیا ہیگا اے' چڑھدا تے اے وی ہیگا اے' اے ساہ لے لے کے چڑھدا اے' اوجھٹ دی چڑھ جاندا ہیگا اے' ایس واسطے سیدھی جی گل ہیگی اے ناں اونہے کہیا پئی تسی دیکھو گے ناں اوا وپر دے ڈنڈے تے' تے اے ذرا تھلے دے ڈنڈے تے' بس اینا ای ہے درجہ ❶''۔کہا ہے کہ **وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى** (4:95) یہ جو معاشرے میں خوشگواریاں آئیں گی' ان میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا جائے گا اور تم نے بھی معاشرے کے حسنات میں فرق پیدا نہیں کرنا۔**وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا. دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً** (4:95-96) یہ جو انسانی ذات کے اوپر اثرات مرتب ہوتے ہیں' یہ ہیں جن کو وہ ''منہ'' کہتا ہے۔ایک وہ چیزیں جو معاشرے کی طرف سے ملتی ہیں' وہ ٹھیک ہے اس میں وظائف بھی ملیں گے' اس میں خوشگواریاں بھی ہونگی' ان میں حصہ بھی ہوگا' وہ سب کے لیے برابر برابر ہونگی۔ایک وہ چیز ہے جو ہم پورا کرتے ہیں' بس اس میں فرق آجائے گا صاحب! اور اس پہ بھی **وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (4:96) حفاظت کا سامان ہمارے پاس ہے' مرحمت کا سامان بھی ہے۔انہیں ہم یہ کہیں گے کہ بھئی! اب تو کیا ہے' آئندہ کے لیے ذرا ''ڈنڈ بیٹھک کڈ کے جایا کرو' سستی بڑی بری گل اے'' (تیار ہو کر چاک و چوبند ہو کر جایا کرو' سستی بڑی بری بات ہے)۔یہ چیز بھی ہمارے پاس ہے۔

اب یہ جو چیز ہے کہ **كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى** (4:95)۔میں کہتا ہوں اللہ اکبر! یہ صحابہ کبارؓ کی کہنے کی بات ہی نہیں ہے' ان کی کتنی نگاہ تھی قرآن کریم کے اوپر! سنیے! کہا ہے کہ مال خانے سے ان کے لیے آٹا دال راشن دیا جائے' ان کے وظائف مقرر کر دیئے جائیں۔سوال پیدا ہوا کہ وظیفے کا معیار کیا ہو۔یہ ایک Suggestion (تجویز) آئی کہ صاحب جو سب سے پہلے اسلام لائے انہوں نے بڑی مشکلیں جھیلیں' مصائب برداشت کیے' بڑے جہاد کیے' جنگیں کیں' ان کی بڑی خدماتِ جلیلہ ہیں' ان کو زیادہ دیا جائے اور یہ جو بعد میں آئے ہیں ان کو کم دیا جائے۔آپ دیکھیں گے کہ یہ چیز بڑی معقول نظر آتی ہے لیکن یہ وہ مومن تھے جن کی قرآن کریم پہ بڑی گہری نگاہ تھی۔اس پہ حضرت ابوبکر صدیقؓ (573-634ء) نے کہا کہ تم نے غور نہیں کیا' ہم اس دنیا کی طبعی ضروریات کا اہتمام کر رہے ہیں' اسلام کی خدمات سے طبعی ضروریات کے اندر فرق نہیں آجاتا' وظیفہ ہر شخص کی ضروریات کے مطابق مقرر ہوگا کہ اس کو کتنا چاہیے' باقی رہیں ان کی خدامت تو اس کا اجر تو خدا کے ہاں سے ملا کرتا ہے: **كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى . دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً** (4:96) یہ تو وہاں سے لیں گے ''تے ایتھے گل ہوندی اے بھائی صاحب! روٹی دی۔ایتھے تے بکھ دے مطابق روٹی دتی جائے

---

❶ سیڑھی کے وہ ڈنڈے جن کے اوپر وہ چلا جا رہا ہے' چڑھتا تو یہ بھی ہے مگر یہ ٹھہر ٹھہر کر' آرام آرام سے چڑھتا ہے اور وہ جھٹ سے چڑھ جاتا ہے اس لیے سیدھی سی بات ہے کہ اس نے کہا کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ اوپر کے ڈنڈے (زینے) پہ ہے اور یہ ذرا نچلے زینے پہ ہے بس یہ اتنا ہی درجہ ہے۔

گی'' (یہاں تو بات بھائی صاحب! روٹی کی ہوتی ہے۔ یہاں تو بھوک کے مطابق روٹی دی جاتی ہے)۔ اللہ اکبر! یہ جو تاریخ میں واقعات آتے ہیں کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا' افسوس یہ ہے کہ ہماری تاریخ بھی ایسے نہیں لکھی گئی' احادیث بھی ایسے نہیں آئیں کہ جن سے یہ چیزیں وہاں بتائی جائیں کہ یہ اس طرح سے اس سوچ پر پہنچے تھے۔ قرآن کریم کی یہ آیات ان کے سامنے تھیں جن کی بنا پہ وہ یہ فیصلے کرتے تھے۔ قرآن کریم نے جو دوسری جگہ کہا ہے کہ معاملات منطبق ہو سکتے ہیں' تمہارے سامنے Confusion (الجھن) ہو سکتی ہے لیکن مومن قرآن کریم کی شرح صدر اس طرح کر دیتا ہے کہ صحیح بات فوراً اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ یوں آتی تھی کہ جب کوئی معاملہ آتا تھا' قرآن کریم کا حکم ان کے سامنے فوراً آ جاتا تھا' اور وہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ **دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ** (4:96) وہ تو وہ دے گا اور **كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰى** (4:96) یہ جو حسن کارانہ انداز سے طبعی خوشگواریاں ہیں' یہ ہمارے ذمہ ہیں اس لیے تقسیم یوں ہو گی۔ یہ تھی قرآن کریم پر ان کی نگاہ!

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی 96ویں آیت تک آ گئے' 97 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ**

❀......❀......❀

# بائیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 97 تا 103)

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ
قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ﴿۹۷﴾ إِلَّا
الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿۹۸﴾ فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ
أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۹۹﴾ وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن
يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا
رَّحِيمًا ﴿۱۰۰﴾ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ
الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿۱۰۱﴾ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ
مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ ۖ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا
فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ
فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضٰىٓ أَن تَضَعُوٓا
أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۱۰۲﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا
وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿۱۰۳﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1970ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 97 سے ہو رہا ہے: (4:97)۔

## جہادِ زندگی کا رازتکبیرِ مسلسل میں ہے

سابقہ آیات میں بات جہاد کی ہو رہی تھی اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے جہاد صرف جنگ کا نام نہیں ہے۔ یہ تو زندگی کی جدوجہد کا نام ہے' سعی وکاوش کا نام ہے' تگ وتاز کا نام ہے۔ یہ ساری زندگی پہ محیط ہے' ہر حالت میں مومن کی زندگی پیہم جدوجہد کی زندگی ہے اور اسی کو جہاد کہا گیا ہے۔ اسی پروگرام کی آخری کڑی ہے' جسے قتال کہا جاتا ہے اور وہ ہے جنگ۔ گویا جہاد میں قتال بھی شامل ہے لیکن جہاد صرف قتال کا نام نہیں ہے۔ یہ جدوجہد کا نام ہے۔ قرآنِ کریم میں آپ کو نظر آئے گا کہ اس نے دین کے

کے دو اہم ستون جہاد اور ہجرت بتائے ہیں۔ جہاد کی نسبت سے مجاہدین ہے اور ہجرت کی نسبت سے مہاجرین ہے۔ جہاد کے متعلق تو ہم نے یہ دیکھا کہ یہ جدوجہد کا نام ہے۔ یہ ہجرت کیا ہے؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر انہی دو اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح سے ذہن میں رکھ لیا جائے تو مذہب اور دین میں فرق نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

## زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ

پہلی چیز تو جدوجہد ہے۔ مذہب میں اس کی کوئی خاص ضرورت ہی نہیں پڑتی' اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے آرام سے' آسائش سے' آپ پرستش' بندگی' بھگتی' یہ نماز جو ہم پڑھتے ہیں' وظائف جو جی میں آئے' کیجیے۔ اس میں آپ کو کونسی جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ شروع شروع میں تو کچھ تھوڑی سی کوشش کرنی پڑتی ہے پھر تو اسکی عادت ہو جاتی ہے لیکن بہر حال آپ اپنے ہاں' آرام سے' اطمینان سے' پرستش کر سکتے ہیں' بھگتی کر سکتے ہیں' نمازیں پڑھ سکتے ہیں' اس میں کسی جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آپ اطمینان سے روزہ رکھ لیجیے۔ اس میں بھی آپ کو کسی جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اپنے مال سے کچھ پیسے دیدیجیے' کسی کو کچھ خیرات کر دیجیے' کونسی جدوجہد ہے جو اس کے لیے آپ کو کرنی پڑ رہی ہے۔ جدوجہد تو وہ ہے کہ سامنے سے موانعات ہوں' سنگ راہ ہوں' مخالفین ہوں' ان کے خلاف آپ کو کچھ کرنا پڑے تو یہ جدوجہد ہے' جہاد ہے۔

## تصوف کے نزدیک جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کی نوعیت اور اس کی فضیلت کا خود ساختہ تصور

مذہب میں تو آپ کو یہ کچھ نہیں کرنا پڑتا لیکن آگے چل کر مذہب میں اس کی جو سخت صورت سامنے آئی جسے تصوف کہتے ہیں تو انہیں اس میں خیال گزرا کہ اس شریعت میں تو بہر حال پھر بھی کہیں باہر نکلنا پڑتا ہے' نماز باجماعت ہی سہی' ادا تو کرنی پڑتی ہے' اُس میں تو اس کی قطعاً ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ تو حجروں میں' خلوتوں میں' جنگلوں میں' غاروں میں' پہاڑوں میں' الگ تھلگ بیٹھے ہوئے کی جا سکتی ہے۔ جتنا زیادہ کوئی دنیا سے الگ ہوگا' اتنا ہی زیادہ خدا کے قریب ہوگا۔ اس میں تو کسی قسم کے جہاد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ جب یہ چیز ان کے سامنے آئی تو انہوں نے پھر جہاد کی دو قسمیں بتائیں۔ ایک جہادِ اصغر ہے' شریعت میں جو کچھ کرنا پڑتا ہے' حتیٰ کہ اس میں اگر جنگ بھی کرنی پڑتی ہے' تو ان کے نزدیک یہ جہادِ اصغر ہے' چھوٹا جہاد ہے۔ اور جہادِ اکبر ہے جو آپ کو اپنے خلاف کرنا پڑے۔ اب آپ نے دیکھا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کے ساتھ کسی قسم کے تصادم' تزاحم' ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہادِ اکبر ہے جو اپنے نفس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور جہاں تک قتال کا تعلق ہے' جنگ کا تعلق ہے' وہ اس میں یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ میدانِ جنگ میں خدا کے لیے جہاد کرتے ہوئے اگر کوئی شخص مارا جاتا ہے تو وہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ جو جہادِ اکبر کا مجاہدہ اپنی ذات کے ساتھ کر رہا

ہے اور اس میں جو اس کا قتلِ نفس ہے' یہ جہاد' جہادِ اکبر ہے۔ اور اس کے لیے جب شاعری آتی ہے تو یہ تصوف میں ایک چمک پیدا کر دیتی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جنگ جو ہے

او کشتۂ دشمن است' ایں کشتۂ دوست

میدانِ جنگ کا مجاہد اور شہید تو دشمن کے ہاتھوں سے مارا ہوا ہے اور یہ اس کے دوست کے ہاتھوں کا مارا ہوا ہے۔ یہ ہے جہادِ اکبر!

## دین میں جہاد کی نوعیت

میں عرض کر رہا تھا کہ مذہب میں جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی' جدوجہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچھ آداب ہیں جنہیں اپنے اندر راسخ کر لیجیے' اطمینان سے' آرام سے' بیٹھے آپ ان تمام رسومات کو ادا کرتے چلے جائیں گے لیکن جب دین سامنے آئے گا اور دین کے معنی ہوں گے ''باطل کے ہر نظام کو الٹ کر' اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنا'' تو آپ نے دیکھا اس کے لیے کس قدر سعی و کاوش کی ضرورت پڑے گی' کتنی مسلسل جدوجہد کی ضرورت پڑے گی۔ اور یہی وہ جدوجہد یا جہاد ہوگا جو آخر میں ایسا بھی وقت آ جائے گا کہ آپ کو میدانِ جنگ میں بھی جانا پڑے گا۔ دین میں اس کی ضرورت پڑتی ہے' مذہب میں اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ جہاد دین کا ایک گوشہ' فریضہ ہے' مذہب میں جہاد کیا وہاں پھر فریبِ نفس ہے' اسے جہادِ اکبر کہہ لیجیے بلکہ اس سے بھی بڑا نام رکھ لیجیے' یہ صرف نام رکھنے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23) یہ نام ہیں جو تم نے رکھ لیے' تمہارے بڑوں نے رکھ لیے۔ ویسے نام تم رکھتے چلے جاتے ہو' ان میں حقیقت کیا؟ مذہب میں جدوجہد کی ضرورت نہیں پڑتی' جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی' یہ دین کا گوشہ ہے کہ جس میں مسلسل سعی و کاوش اور جدوجہد اور جہاد اور قتال تک کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ غلط نظام کی جگہ صحیح نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسے دین کہتے ہیں۔ اب یہ جدوجہد کسی ایک خاص خطۂ زمین میں ہی شروع ہوگی۔

## قرآنی نظام کی تکمیل کے لیے ہجرت کا عمل اور اس کے مدارج

قرآن کریم کا پروگرام یہ ہے کہ جہاں بھی اس قسم کی بات ہو' وہ پہلے کوشش کرے کہ وہیں اس قسم کا نظام قائم ہو جائے لیکن اگر وہ دیکھے کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے تو پھر وہ سوچے کہ کیا دوسری جگہ فضا زیادہ سازگار ہے اور اگر دوسری جگہ سازگار فضا ہو تو اس فضا کو چھوڑ کر اس فضا کی طرف چلے جانا تاکہ وہاں جا کر یہ نظام قائم کیا جائے' اسے فی سبیل اللہ ہجرت کہیں گے۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے' یہ ہجرت فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد اور جدوجہد اور کوشش تو انسان اپنے مفاد کے لیے بھی کرتا ہے لیکن ایک جہاد یا جدوجہد یا کوشش فی سبیل اللہ ہے۔ یہ انسانیت کے مفاد کے لیے کرنا ہے' یہ حق کا نظام قائم کرنے کے لیے کرنا ہے۔ اسی طرح سے یہ ہجرت بھی ہے۔ یہ تارکِ وطن تو

ہمارے ہاں سینکڑوں لاکھوں کی تعداد میں اپنے اپنے ملک سے دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں' وہاں جا کر بس بھی جاتے ہیں' آتے جاتے بھی رہتے ہیں' یہ تو اپنے لیے ہجرت ہوئی۔ اور دوسری ہجرت ہے جسے فی سبیل اللہ کہتے ہیں کہ دین کا نظام قائم کرنے کے لیے جب دیکھا جائے کہ یہ فضا ساز گار نہیں ہے تو یہاں سے اٹھ کر کسی ساز گار فضا کی طرف چلے جانا تا کہ وہاں خدا کا نظام قائم کیا جا سکے۔ اب پہلی شکل تو یہ ہے کہ السابقون الاولون ہی یہاں سے جائیں کہ وہاں نظام کے قیام کی شکل ابھی کوئی نہیں ہوئی' بنیاد ہی نہیں رکھی گئی لیکن انہیں وہاں جا کر اس نظام کے قیام کا امکان زیادہ نظر آتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ یہاں سے وہاں چلے جائیں اور اسی جدوجہد کو وہاں جا کر جاری کریں۔ اور اس سے اگلا قدم ان کے بعد جانے والوں کا ہے کہ یہ بھی جب دیکھیں کہ وہاں اس کا قیام ممکن ہو رہا ہے' فضا واقعی ساز گار ہے' تو پھر ان پر یہ لازم آ جاتا ہے کہ یہ یہاں سے اٹھ کر وہاں چلے جائیں اور ان کا ساتھ دیں اور وہاں یہ نظام قائم کریں۔

## مذہب کی دنیا میں ہجرت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دین میں ہوتا ہے

اگر کہیں نظام قائم ہو گیا ہے تو پھر تو اس کے کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ صاحب! ہم یہاں جیسے بیٹھے ہیں' بس ٹھیک ہے' ہم یہاں اللہ اللہ کر لیا کریں گے' یہاں نمازیں پڑھ لیا کریں گے' وہ وہاں اسی طرح سے پڑھ لیا کریں گے' فرق کیا پڑتا ہے؟ مذہب میں کچھ فرق نہیں پڑتا' مذہب ہر قسم کی حکومت کے اندر پرستش' بندگی' پوجا' بھگتی' عبادت کر لینے کا نام ہے۔ اس میں کہیں ہجرت کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کوئی بھی کسی کو نہیں روکتا کہ تم نماز نہ پڑھو یا بھگتی نہ کرو یا پوجا پاٹ نہ کرو۔ اس مقصد کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن دین جس کے معنی ایک خاص نظام کے تابع زندگی بسر کرنا ہیں اس کے لیے جہاد ہے' وہاں جہاد کی ضرورت ہے اور وہاں اگر اس کا امکان نہیں ہے تو پھر وہاں سے منتقل ہو کر' دوسری جگہ جانا ہے جہاں اس کا امکان ہے۔ یہ فریضہ ہو جاتا ہے' یہ لازم ہو جاتا ہے یعنی یہ چیز نہیں ہے کہ خواہ جی چاہے تو چلا جائے' جی چاہے تو یہیں بیٹھا رہے' پھر یہاں بیٹھے رہنے کا سوال نہیں۔ پہلی آیات میں اس جہاد کی اس جدوجہدِ زندگی کی بات آئی تھی۔

## دین میں حالات کے مطابق ہجرت کرنا لازم قرار دیا ہے

اب اس کے بعد اگلی آیت آتی ہے۔ اس میں کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ** (4:97) اب رہے یہ لوگ کہ جو اس بات کے باوجود کہ دوسری جگہ ہجرت کرنا لازم ہو چکا تھا' نظامِ خداوندی کے قیام کے امکانات زیادہ روشن تھے' اس کے باوجود وہ غیر خداوندی نظام کے تحت پاؤں توڑ کر ایسی جگہ بیٹھے رہے' جہاں نظامِ خداوندی قائم نہیں ہو رہا تھا اور اس طرح اپنی ذات کا نقصان کرتے رہے اگر اسی حالت میں ان کی موت آ جائے تو کہا ہے کہ کیا موت کے بعد فرشتے آئیں گے' وہ ان

سے یہ پوچھیں گے کہ کیوں صاحب! تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم پاؤں توڑ کر غیر خداوندی نظام کی محکومی میں یہیں بیٹھے رہے۔ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ (4:97) وہ کہیں گے کہ کیا کرتے! ہم بڑے کمزور تھے' اس لیے ہم یہاں کا نظام نہیں الٹ سکتے تھے' اسی غلط' باطل نظام کے غیر قرآنی نظام میں' زندگی بسر کرتے رہے۔ قَالُوْا (4:97) وہ (فرشتے) کہیں گے کہ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (4:97) یہاں تو تم کمزور تھے' کیا خدا کی اتنی وسیع زمین نہیں تھی کہ تم یہاں سے وہاں چلے جاتے اور وہاں جا کر صحیح نظام قائم کر کے اس کے اندر زندگی بسر کرتے؟ یہ کیا عذر ہے کہ ہم کمزور تھے۔ یہاں تو ٹھیک ہے تم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی' نہ ہی تم سے اس پہ مواخذ کیا جا سکتا ہے کہ تم نے یہاں کا نظام کیوں نہیں بدلا' کمزور تھے' ٹھیک ہے' نہیں بدل سکتے تھے لیکن تمہیں کیا ہو گیا تھا: فِيْمَ كُنْتُمْ (4:97) ''کی موت پے گئی سی'' (کیا ہو گیا تھا) کہ یہاں سے اٹھ کر وہاں نہیں گئے' خدا کی زمین بڑی وسیع تھی۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اسے خدا نے ہجرت فی سبیل اللہ کہا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہی جو الفاظ یہاں آئے ہیں کہ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً (4:97) خدا کی زمین اس قدر وسیع تھی۔ آگے یہاں کہا ہے کہ فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (4:97) تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے۔ دوسرے مقام پہ یہی الفاظ آئے ہیں کہ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (29:56) اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے ہو اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ (29:56) میری زمین بڑی وسیع ہے۔ اس زمین کی وسعت کے لیے تو یہ کہا تھا کہ ایک مقام پہ ہی پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ جاؤ' دوسری جگہ چلے جاؤ' کس لیے جاؤ؟ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاؤ تا کہ وہاں اطاعت و محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکے' جہاں ایسی زندگی بسر کرنا ممکن ہو' وہاں چلے جاؤ۔ دیکھیے! یہی لفظ میں کہتا ہوں' یہیں سے مذہب اور دین کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں بیٹھے ہوئے اگر بندگی' بھگتی' عبادت' پرستش ہی اسلام کا مقصود ہے' اور جو لفظِ عبادت ہے وہی میں استعمال کرونگا کہ یہاں یہی لفظ آیا ہے تو اس کے لیے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ میری زمین بڑی وسیع ہے' یہاں سے اٹھ کر وہاں چلے جاؤ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) تا کہ تم صرف میری ہی محکومیت اختیار کر سکو۔ عبادت کے یہ معنی ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے برعکس ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ساری رات عبادت میں گزارتا ہے' ساری رات نفل پڑھتا رہتا ہے' کھڑا کھڑا تھک جاتا ہے تو بیٹھ کر تسبیح پھیرنے لگ جاتا ہے' بیٹھا ہوا تھک جاتا ہے' پھر نفل پڑھنے لگ جاتا ہے۔ عبادت کا اور کیا مفہوم ہو گیا؟ پھر یہی کہ روزہ رکھ لیا' نفل پڑھ لیے' تسبیح پھیر لی۔ بڑا عبادت گزار ہے' پوچھو کہ کیا کرتا ہے؟ بس یہی کچھ کرتا ہے۔ اس کے لیے اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ (29:56) کی ضرورت کیا ہے؟ اس کے لیے وسیع زمین کیا ہے؟ ''مصلے جنی زمین چاہیدی اے تہانوں'' (تمہیں

تو جائے نماز بچھانے کے لیے ہی تھوڑی سی زمین چاہیے )۔خدا کی بڑی وسیع زمین ہے' کہا ہے کہ وہاں کیوں نہیں چلے گئے؟ کا ہے کے لیے صاحب! ہم وہاں جاتے؟ اس لیے کہ فَـاِیَّـایَ فَـاعْبُدُوْنِ (29:56) تا کہ صرف میری محکومیت اختیار کر سکتے' یہاں تم نہیں کر سکتے تھے۔غیر اللہ کی محکومیت میں اطمینان سے جو بیٹھا رہے تو پھر اس کے متعلق تمہارے پاس کیا عذر ہے۔عزیزانِ من! قرآن کریم کی کیا بات ہے! کہا ہے کہ فَـاِیَّـایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) وہ خدا کی زمین کو وسیع اس لیے بتا تا ہے کہ یہ جو فَاعْبُدُوْنِ کی کیفیت ہے' ہر گوشے' ہر خطے کے اندر یہ بات نہیں ہو سکتی۔ جہاں دیکھو کہ یہ نہیں ہو سکتا' اس جگہ کو چھوڑ دو اور وہاں چلے جاؤ' جہاں کہا ہے کہ فَـاِیَّـایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56)۔یہی اِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ایک اور مقام پر بھی آیا ہے' وہاں بات اس سے بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

## مسلمان کے نزدیک آزادی اور آزاد میں فرق کی نوعیت

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت' کس لیے چاہیے؟ ہندوستان میں جب تحریکِ پاکستان جاری ہوئی ہے تو وہاں یہی مسئلہ تھا۔حضرات علمائے کرام کی جماعت جنہیں نیشنلسٹ مسلمان کہتے ہیں' وہ یہ کہتے تھے کہ کس کے لیے ایک الگ خطۂ زمین مانگتے ہو۔ ہندوستان کے اندر حکومت ہے' انگریز کو نکال دو' آزادی مل گئی۔آزادی سے مفہوم تھا کہ اپنے ملک میں' اپنے ملک والے حکومت قائم کریں تو آزادی ہے اور دوسرے آ کر حکومت قائم کریں تو غلامی ہے۔ان کو نکال دو' آزادی مل گئی' مقصود تو آزادی ہے۔اب تم کہتے ہو کہ نہیں صاحب! ہم مسلمانوں کو بھی آزادی ملنی چاہیے' انہوں نے کہا کہ اکثریت کی قوم آپ کو اس کی گارنٹی دیتی ہے کہ تمہارے مذہب کی آزادی ہم دیدیں گے۔یہ وہ آزادی ہے جو انگریز نے بھی اپنی غلامی میں دی ہوئی تھی! نماز روزے کی آزادی تھی' جسے آپ عبادات کہا کرتے تھے ان کی آزادی تھی' Freedom of Religion (آزادیٔ مذہب) تھی ۔ یہ تو جو ملکہ وکٹوریہ (1819-1901ء) کا Magna Carta (منشورِ عظیم)[1] تھا' اس کے اندر اس نے یہ اعلان لکھ دیا تھا اور اس نے آپ کو مذہب کی Freedom (آزادی) دے دی تھی۔ہمارے علمائے کرام یہی کہتے تھے' ان کے ذہن میں دین تو کبھی آتا ہی نہیں' کہ انہوں نے مذہب کی' نماز روزہ حج زکوٰۃ کی آزادی دی ہوئی ہے' جو مرضی کرو۔پھر آپ کے ہاں نکاح طلاق مرنا جینا آپ کی جتنی رسومات ہیں' وہ آپ ادا کرتے رہیے جسے Personal Laws (شخصی قوانین) کہا جاتا ہے' شخصی قوانین کی بھی آزادی ہے' عقائد کی بھی آزادی ہے' عبادت کی بھی آزادی ہے۔وہ کہتے تھے کہ پھر اور کیا بات ہے جس کے لیے تمہیں الگ خطۂ زمین کی ضرورت پڑ گئی کہ وہاں

---

[1] It is the great charter of English political and civil liberties granted by King John (1167-1216A.D) at Runnymede on June 15,1215

مسلمانوں کی اپنی حکومت ہونی چاہیے۔ یہ تھے ان کے اعتراضات۔

چہ بے خبر ز مقام محمد ﷺ عربی است ❶

یہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا تھا۔ اور یہ چیز تھی جو ہم ان سے کہتے تھے۔ بہرحال میں تو کبھی اپنی ذات کو درمیان میں لایا نہیں کرتا۔ یہ چیز تھی جو کہا کرتے تھے۔

## قرآنی حکومت یا نظامِ خداوندی کے لیے خطۂ زمین کا حصول ایک لازمی شرط ہے

مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلی چیز جو پوچھی تھی' وہ اس آیت کے اوپر تھی جو میں نے لکھی۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور وہ آیت یہ ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) خدا کا یہ وعدہ ہے ان پہ جو ایمان لائیں اور اس کے بعد اعمالِ صالحہ کریں تو ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔ یہ پھر کبھی تفصیل سے بتاؤنگا کہ ایمان اور عمل کا تعلق کیا ہے اور یہ بات بھی چھڑی تھی۔ وہاں یہ بات کہی گئی تھی کہ (موہن داس کرم چند) گاندھی (1948-1869ء) جیسی شخصیت نے بھی مذہبی آزادی کا کہا ہے۔ مسلمان سچائی کا مجسمہ ہے' نیک' پرہیزگار ہے' جھوٹ نہیں بولتا' فریب نہیں دیتا' چوری نہیں کرتا' یہی چیزیں ہیں جو وہ کہتے تھے کہ مسلمان کے لیے ضروری ہیں' اسلام انہی کی تاکید کرتا ہے تو پھر محض اس لیے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا' اس لیے وہ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ ایمان کی اس میں کہاں ضرورت پڑتی ہے! بادی النظر میں آپ دیکھیں گے کہ یہ بڑے وسیع اعتراض نظر آتے تھے' اس زمانے میں یہ عام بحثیں تھیں' آج بھی یہ چیز موجود ہے۔ کسی وقت میں عرض کرونگا کہ اگر ایک شخص یہ چیزیں کرتا ہے تو اس پر یہ شرط کیوں لگائی جاتی ہے کہ ایمان بھی ہونا چاہیے۔ میں پھر گزارش کرونگا کہ ایمان کو قرآن کریم نے ان اعمال کی بنیاد کیوں قرار دیا ہے جنہیں آج آپ Universal Code of Ethics (عالمگیر ضابطۂ اخلاقیات) کہتے ہیں' یہی عالمگیر سچائیاں (احمد محی الدین) مولانا ابوالکلام آزاد (1958-1888ء) کے الفاظ میں ہیں۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ایمان کی بنیادوں پر یہ چیز ہو تو پھر یہ چیزیں واقعی Ethics (اخلاقیات) کہلاسکتی ہیں' سچائیاں کہلاسکتی ہیں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ دوسرا گوشہ ہے اور اس کو میں انشاءاللہ کسی دوسرے وقت میں ضرور لاؤنگا' یہ اہم سوال ہے اور آج کل بھی کیا جاتا ہے۔

---

❶ یہ مصرعہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے 'حسین احمدؒ' کے عنوان سے ''ارمغانِ حجاز'' میں یوں دیا ہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں' ورنہ — ز دیوبند حسینِ احمدؒ! ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر ممبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمد ﷺ عربی است
مصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی' تمام بولہبی است

بہرحال قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکومت اور مملکت ہوگی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ہماری سنت ہے' یہ شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہم نے ایسا وعدہ کیا ہے ہم یہ پورا کریں گے۔ تم ایمان اور اعمالِ صالحہ کی شرط کو پورا کرو تو تمہیں یہاں زمین پر حکومت ملے گی' مملکت ملے گی۔ اسے استخلاف فی الارض کہا جاتا ہے۔ یہ کاہے کے لیے ملے گی؟ وہ جو بات میں نے چھیڑی ہے میں اس پہ آ رہا ہوں۔ ایک آزاد مسلمانوں کی مملکت ملے گی' باقی دنیا کو بھی ملتی رہتی ہے' ان کو بھی ملے گی' کاہے کے لیے ملے گی؟ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضٰى لَهُمْ (24:55) تاکہ وہ دین جو ہم نے ان کے لیے منتخب کیا ہے اسے تمکن حاصل ہو جائے۔

## مذہب کے تمکن کے لیے آزاد مملکت ضروری نہیں ہوتی مگر دینِ اسلام کے لیے از بس ضروری ہے: پاکستان کی کہانی

ہم ان نیشنلسٹ علما سے یہ کہتے تھے کہ قرآن کریم نے تو دین کے تمکن کے لیے' مسلمانوں کی آزاد مملکت کو' لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے بغیر دین کا تمکن ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی آیت موجود ہے۔ مذہب تو پھل پھول سکتا ہے' دین کو تمکن حاصل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ اور دوسری چیز اس کے Reverse (خلاف) یہ ہے کہ جسے قرآن کریم نے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ کہا ہے' وہ وہی ہے جس میں دین کو تمکن حاصل ہو۔ اگر اس میں دین کو تمکن حاصل نہیں ہوا' تو پھر یہ مسلمان قوم کی ایک مملکت ہے جیسی اور اقوامِ عالم کی مملکتیں ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے یہ بھی ایک چیز ہے' آزاد مملکت کا ملنا بجائے خویش ایک بڑی چیز ہے' انسان کا انسان کی غلامی میں رہنا تو لعنت ہے لیکن یہاں تک تو یہی چیز ہے جو باقی قوموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں تک یہ صرف دنیا کی آزاد قوموں کے ہم دوش ہوئے' اِس میں دین یا اسلام کا کوئی سوال نہیں ہوا۔

برادرانِ عزیز! مسلمانوں کے لیے یہ آزاد مملکت مقصود بالذات چیز نہیں ہے' یہ باقی قوموں کے لیے مقصود بالذات ہے۔ ہندوستان سے انگریز کا نکال دینا اور ہندوستانیوں کی حکومت قائم کرنا' ہندو کے لیے مقصود بالذات تھا۔ مسلمان کے لیے انگریز کو نکال کر اپنی مملکت قائم کرنا یہاں مقصود بالذات نہیں تھا' یہ مملکت ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ اور وہ مقصد کیا تھا؟ یہ کہ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضٰى (24:55) دین کا جو تمکن ہے اس کے لیے قرآن حکیم کی نصِ صریح سے یہ آزاد مسلمانوں کی مملکت ذریعہ تھی۔ کہا ہے کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) اور اس کے ساتھ یہ چیز بھی کہ خوف کے بعد ان کو امن حاصل ہو جائے گا۔ اور آگے یہ دیکھیے استخلاف فی الارض کس کے لیے ہے' یہ مملکتِ آزاد کس مقصد کے لیے ہے؟ کہا ہے کہ یہ دین کے تمکن کے لیے ہے

یعنی یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا (24:55) تاکہ تم صرف میری عبادت (محکومیت اختیار) کرسکوٗ کسی اور کو شریک نہ کرو۔

پوچھا جائے کہ مذہب میں تو اپنی آزاد مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ عبادت کے معنی اگر پرستش ہی ہیں جو ہم کرتے ہیں تو اس کے لیے قرآن حمید نے یہ کیوں کہا کہ آزاد مملکت چاہیے؟ یہ اس لیے کہا کہ تم صرف میری عبادت کرسکو اور کسی اور کو اس میں شریک نہ کرسکو۔ یہ دونوں ہی چیزیں ہر مملکت میں' ہر حکومت میں' ہر ملک میں' ہر گوشے میں' ممکن ہیں یعنی مذہب کے نقطۂ نگاہ سے اس کی بھگتی کرو' کسی اور کی نہ کرو' بتوں کو نہ پوجو۔ کون مجبور کرتا ہے تمہیں کہ تم ضرور بتوں کو پوجو' اس طرح سے نماز نہ پڑھو۔ آزاد مملکت کی ضرورت' قرآن حمید نے دین کے تمکن کے لیے بتائی اور صرف خدا کی عبادت کے لیے کہا۔ اس شرط کا اطلاق تب تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اپنی آزاد مملکت حاصل نہ ہو۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُوۡلٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (24:55) جو اس طرح مملکت ملنے کے بعد بھی کافر کا کافر ہی رہے' وہ جہنم میں جائے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم ہے۔ اف! یہ کس مقام پہ ہم کھڑے ہیں کہ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُوۡلٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (24:55) جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد اس سے عملاً انکار کریں اور احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں' تو یہ لوگ شاہراہ حیات کو چھوڑ کر' جو انہیں صحیح منزل کی طرف لیے جا رہی تھی اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے۔ اور یہ ہے وہ آزاد مملکت' یہ ہے وہ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ جس کے بعد یہ کہا ہے کہ اس کے لیے یہاں وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (24:56) ہوگا۔ اب دیکھ لیا کہ یہاں اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کا کہا ہے۔ کیا یہ وہی ہے جسے آج ہم' نماز پڑھنا اور اڑھائی فیصد رقم دیدینا کہتے ہیں؟ اپنی آزاد مملکت کے اندر یہ چیز ممکن ہوسکتی ہے' خدا کی عبادت وہیں ممکن ہوسکتی ہے' تمکن دین وہیں ممکن ہوسکتا ہے۔ جب نظام دوسرا ہو تو اس کے اندر یہ ممکن ہی نہیں۔

## مسلم اور غیر مسلم مملکتوں میں فرق

اور جو دوسرا اور اپنا نظام ہے' اس کی بنیاد ہی یہی ہے۔ اس کی تمیز کیا ہے' اس کا امتیاز کیا ہے؟ اس کے لیے کہا ہے کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُوۡلٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جہاں بھی قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور نظامِ حکومت قائم ہے' قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ کافروں کی مملکت ہے۔ جو بھی قرآن مجید کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا' وہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی کہا ہے کہ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُوۡلٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (24:55) جو اس کے بعد بھی کہ ان کو اپنی مملکت مل جائے' وہ کافر کے کافر ہی رہیں گے۔ کافر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن مجید کے مطابق اگر حکومت قائم نہیں ہوتی تو پھر کسی دوسرے راستے میں نکل جانا

۔فسق کے معنی ہوتا ہے ''جس خول کے اندر پھل پکتا ہے اس کو توڑ کر باہر نکل جائے یعنی جو صحیح راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جائے'' تو ''اوسڑیا ہویا ہونداائے'' (وہ گل سڑ جاتا ہے)۔

میں کہہ رہا تھا کہ قرآن مجید نے جو یہ چیز کہی ہے کہ اگر تمہارے لیے ایک جگہ یہ ممکن نہیں کہ تم دین کا تمکن کر سکو' خدا کی عبادت کر سکو' تو اس کے لیے پھر ضروری ہے کہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلے جاؤ جہاں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لیے فضا زیادہ سازگار ہو۔ یہ ہیں ہجرت کے معنی۔ یہ جیسے ہم نے صلوٰۃ کے معنی نماز لیا' عبادت کے معنی پرستش لیا' تو میں نے عرض کیا ہے کہ مذہب کی دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

## حضرت شعیبؑ کے نظامِ حکومت میں صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم

یہی وہ چیز ہے جسے دوسرے مقام پہ بڑے عمدہ انداز میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم میں پیدا ہوئے' ابھی وہیں تھے' ہجرت نہیں کی تھی۔ قومِ شعیبؑ نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوںؑ نے کہا کہ چاہتا کیا ہوں! یہ صلوٰۃ ہے اس کی آزادی چاہتا ہوں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ٹھیک ہے' ہم گھنٹیاں وٹیاں بجا کر بھگتی پوجا کر لیتے ہیں' یہ اسے اس طرح سے کھڑا' بیٹھا' رکوع' میں کر لیتا ہے تو اس سے بگڑتا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے صلوٰۃ کی اجازت ہے۔ اس کے بعد جب انہوںؑ نے صلوٰۃ کو قائم کرنا شروع کیا تو وہ ان کے پاس آئے اور آ کر کہنے لگے کہ شعیبؑ! یہ کیا کر رہے ہو؟ شعیبؑ بولے یہ صلوٰۃ ہے! انہوں نے کہا کہ لو ہم نے تو تمہیں اجازت دی تھی کہ اپنے طور پر تم نماز پڑھ لیا کرو۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11:87) وہ کہتا ہے کہ تمہاری یہ صلوٰۃ کیا ہے' تم تو کہتے ہو کہ میری صلوٰۃ تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ جو کچھ تم کماؤ' اس کو بھی اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتے۔ اوبابا! ہم تو کہتے تھے کہ بھگتی' پوجا' بندگی' کر لیا کرو' یا نماز پڑھ لیا کرو' تم یہ کہتے ہو کہ میری صلوٰۃ تمہیں حکم دیتی ہے کہ تم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کر سکتے۔

## ہجرت کا بنیادی مقصد باطل نظام کے برعکس حق کے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ پھر اس کے لیے ہجرت کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ تم صرف میری عبودیت اختیار کر سکو' تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہاں تو زندگی کے ہر نظام کو الٹ کر حق کے مطابق بنانا ہوگا۔ اس کے معنی ہونگے کہ یہ اس مقصد کے لیے ہجرت ہوگی۔ کہا ہے کہ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَةً (4:97) تو ان سے وہ فرشتے کہیں گے کہ اچھا! تم کہہ رہے تھے کہ صاحب! ہم بہت کمزور واقع ہوئے تھے' اس لیے ہم یہاں بیٹھے رہے' کمزور تھے اس لیے یہاں کا نظام الٹ نہیں سکتے تھے۔ کہا جائے گا کہ ٹھیک ہے' یہاں کا نظام نہیں الٹ سکتے تھے' تو وہ جو خدا کی وسیع زمین پڑی ہوئی تھی' جہاں اس سے زیادہ

سازگار حالات تھے' اس کا تمہارے لیے امکان تھا تو تم وہاں کیوں نہ چلے گئے۔ غور فرمائیے! مسلمان ہیں' انہی سے یہ بات کہی جائے گی کہ تم نے ہجرت کیوں نہ کی' ان کفار سے تو نہیں کہی جائے گی۔ کہا ہے کہ **فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا** (4:97) یہ لوگ جو یوں اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تابع قانع اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں' ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہی لوگ ہیں جو یہاں بھی جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے کہ یہاں بھی وہ طاغوتی نظام کی غلامی میں اور وہاں بھی جہنم' کہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما ہی نہیں ہوئی۔

## مومن کے لیے' غیر قرآنی نظام میں سانس لینے کی کیفیت

غیر قرآنی نظام کے اندر مومن کی زندگی جہنم کی زندگی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس بات پہ ہی کہا ہے کہ **مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا** (4:97) کتنی بُری جگہ ہے' جہاں کوئی زندگی بسر کرتا ہے' یہ کتنا بُرا ٹھکانہ ہے کہ غیر قرآنی نظام کے اندر زندگی بسر کرے۔ مچھلی کو پانی سے باہر پھینک دیجیے آپ دیکھیے کہ وہ کیسے تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے' دم گھٹ جاتا ہے۔ کہا گیا کہ اگر یہاں یہ کچھ نہیں کر سکتے تھے' تو اٹھ کر کیوں نہیں چلے گئے لیکن جواباً کہا کہ بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں' اس قسم کے لوگ فی الواقعہ ہوتے ہیں جو ایسے معذور ہوتے ہیں۔

## غیر قرآنی معاشرے میں مجبور لوگوں کے لیے انتظام کی نوعیت

ایسے معذوروں کے لیے کہا ہے کہ **اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَایَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَایَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا** (4:98) البتہ ان میں وہ کمزور و ناتواں مرد' عورتیں اور بچے شامل نہیں ہیں جو فی الواقعہ اس قدر معذور ہو چکے تھے کہ نہ تو انہیں وہاں تبدیلیٔ حالت پر کوئی قدرت حاصل تھی اور نہ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ کھلا تھا۔ عزیزانِ من! ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ جہاں اس قسم کے لوگ گھر جائیں اور نہ ہی ان کو اس قسم کا کوئی پاسپورٹ اور ویزا مل سکے کہ وہ وہاں سے نکل کر کہیں اور جا سکیں۔ اگر حالات اس قسم کے ہوں تو اس کے لیے کیا کیا جائے؟ یہاں تو کہا ہے کہ **فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ** (4:99) اس قسم کی' نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی حالت قابلِ معافی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ کوئی بات نہیں' عنقریب ایسی صورت ہوگی کہ خدا کی ان پہ جو ذمہ داریاں پڑتی ہیں' وہ ان سے ذرا آگے بڑھ جائے گا ابھی یہ دیکھیے خدا اس کے لیے کیا کرتا ہے۔ یہاں ''یَعْفُوَ'' آیا ہے۔ صرف معاف کر دینا اس کے معنی نہیں ہوتے' اس سے ذرا آگے بڑھ جانا ہے اور کچھ اور حفاظت عطا کرنا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ انہی سے یہ کہا جاتا کہ نہیں! تمہیں جانا پڑے گا۔ عزیزانِ من! یہ کس قدر Matter of Fact (معاملاتِ حقائق) کی کتاب ہے' یہ خالی

جذبات کی کتاب نہیں ہے ورنہ اگر ہمارے ہاں کا کوئی ملّا ہوتا تو ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا' وہ کہتا کہ نہیں! ہم بکواس نہیں سنتے' جب شریعتِ حقہ نے یہ فرض قرار دیدیا ہے تو تمہیں اٹھ کر جانا ہوگا اور اگر نہیں جاتے تو تم جہنم میں جاؤ گے' تم سب کے سب مرتد ہو' کافر ہو' ملحد ہو۔

یہاں وہ ان **مُسْتَضْعَفِیْنَ** کی دو کیٹگری (شقیں) بناتا ہے۔ ایک وہ جن کے لیے کم از کم جانے کا راستہ کھلا تھا۔ ایک دوسری کیٹگری ہے کہ **مُسْتَضْعَفِیْنَ** ہیں' وہ بھی ہیں جو کمزور ہیں' یہاں ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی کہ غیر خداوندی نظام کو الٹ دیں۔ انہیں تو جانے کا راستہ بھی نہیں مل سکتا۔ تو یہ ان کے لیے کہا ہے کہ **عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ** (4:99) کوئی بات نہیں' تم دیکھو گے ہم ذرا ان کے لیے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان سے تو یہ غیر خداوندی نظام کے الٹنے کی بات نہیں کی جاتی۔ کہا ہے کہ **وَ کَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا** (4:99) خدا وہاں سے ذرا آگے بڑھ کر حفاظت کا سامان پیدا کر دیا کرتا ہے۔ یہ کیا چیز تھی جو ان کے لیے پیدا کی؟ یہی الفاظ دیکھیے اور (4:75) پہ آ جایئے۔ وہاں کہا ہے کہ **الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ** (4:75) مکے کے کمزور و ناتواں مرد' عورتیں اور بچے تھے جو وہاں رہ گئے تھے۔ باقی جو مکے کے مسلمان تھے وہ ہجرت کر کے مدینے چلے گئے' وہاں جا کر انہوں نے اپنا نظام قائم کیا' مملکت قائم کی' ان کے پاس قوت تھی۔ مکے میں یہ لوگ ایسے گھر کر رہ گئے کہ نہ تو ان کے پاس قوت تھی کہ وہاں کا نظام الٹ کر اس کی جگہ صحیح قرآنی نظام قائم کرتے اور نہ ہی وہاں سے وہ ان کو نکلنے دیتے تھے۔ یہ وہ کیٹگری آ گئی جس کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اور یہاں کہا ہے کہ ان کے لیے دیکھیے' ہم ان پہ زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتے' آگے بڑھ جاتے ہیں۔

## خدا کی طرف سے کمزور و ناتواں رہ جانے والوں کی مدد کا طریق

آگے بڑھ کر قرآن کریم نے کیا کیا؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا**(4:75) مدینہ کے مسلمانو! تم میں اتنی قوت آ گئی ہے' تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کس طرح فریاد کر رہے ہیں' وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! ہمارے لیے بھی کوئی صورت پیدا کر' یہاں ہم کمزور ہیں' نظام بدل کر صحیح قرآنی نظام میں زندگی بسر نہیں کر سکتے' یہ اتنے طاقتور ہیں کہ یہاں سے باہر نہیں نکلنے دیتے تو ہمارے لیے بھی تو کوئی صورت پیدا کر' اپنی استعداد اپنی کاوش پر کھڑے رہنے سے تو بات نہیں بنے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ٹھہرو! ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اب مدینے والوں سے کہا جاتا ہے کہ تمہیں کیا ہوا ہے' اٹھ کر ان کے خلاف جنگ کیوں نہیں کرتے اور کیوں نہیں اپنے ان بھائیوں کو وہاں سے چھڑا کر لاتے۔ یہ ان کے لیے

راستہ پیدا کیا۔

## ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کا ایک بنیادی اصول

عزیزانِ من! آج یہاں کیا بات کی جائے۔ تحریک پاکستان میں یہ دونوں چیزیں ہمارے سامنے تھیں۔ معاف رکھیے گا' میں نے پھر 'ہمارے' کہہ دیا' میں بھی اس تحریک کے اندر برابر کا حصہ لے رہا تھا وہاں بھی ہمارے سامنے یہ اسکیم تھی کہ یہ اتنا خطۂ زمین حاصل کر کے یہاں صحیح قرآنی نظام رائج کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد اگلا قدم ہمارے سامنے یہ تھا' یوں کہیے کہ ان لوگوں کے سامنے جو نظم ونسق کے ذمہ دار تھے یہاں جو آئے تھے' اگلا قدم یہ تھا کہ مملکت کی سطح پر ہندوستان والوں سے یہ کیا جائے گا کہ وہ تبادلۂ آبادی کی اسکیم کے اوپر راضی ہوں اور Per Head (فی کس) ان سے یہاں کی زمین لے کر' یہاں کے غیر مسلموں کو ادھر منتقل کیا جائے گا اور وہاں کی مسلمان آبادی کو یہاں منتقل کر دیا جائے گا۔ اور اس طرح سے ان مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ کے لیے یہ نظام قائم کیا جائے گا۔ یہ اس اسکیم کے اندر موجود تھا۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا علم تھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) کے ساتھ یہ چیزیں Discuss (زیرِ بحث) ہوئی تھیں' وہ خود اس اسکیم کو لے کر نکلے ہوئے تھے' انہیں بھی پتہ تھا کہ اس کے سوا یہاں کوئی اور علاج نہیں ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ان کے لیے ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ دوسرا راستہ ان کے لیے ہم یہ سوچیں گے۔ راستہ سوچا۔ مدینے والے اٹھے' انہوں نے جا کر واقعی ان کے لیے راستہ پیدا کیا۔ پہلے راستے پیدا کیے اور اس کے بعد جب یہ دیکھا کہ اس سے بات نہیں بنتی تو پھر قریش کی قوت کو اس طرح سے توڑا کہ وہ بھی اس مملکت اور اس نظام کے اندر شامل ہو گئے۔ یہ ہے وہ طریقہ۔ یہ ہے جسے آپ ہجرت کہتے ہیں۔

## ''تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا'' ورنہ گلشن میں؟

کہتا ہے کہ وَ مَنۡ یُّھَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّسَعَۃً (4:100) خاکِ وطن کی جاذبیت محض جذباتی چیز ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وطن اور نظامِ خداوندی کے کسی تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو اُس وطن کی جاذبیت کو اس بلند مقصد کی خاطر قربان کر دینا چاہیے۔ جو شخص اس مقصد کی خاطر وطن کو چھوڑ دے گا اسے دوسرے مقامات میں بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش کی راہیں کھلی ملیں گی۔ اس لیے کہا ہے کہ اٹھ! باہر نکل کر دیکھ تو سہی۔ یہاں پاؤں توڑ کر بیٹھے ہوئے ہو' نکلو تو سہی اور نکل کر دیکھو کہ کتنی وسیع زمین پڑی ہے' کتنی کشائشیں ہیں' کتنی وسعتیں ہیں' تمہیں کس قدر عمدہ پناہ گاہیں مل سکتی ہیں۔ باہر نکلو تو سہی۔ آگے کہا ہے کہ وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ (4:100) جو شخص' اس طرح ''خدا اور رسول'' کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہو تو اس کا یہ عزم ہی فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (4:100) اتنے بڑے اجر کا موجب بن جاتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں دو الفاظ ''اَللّٰہِ اور رَسُوۡلِہٖ'' آئے ہیں جو کہا ہے کہ جو کوئی بھی ہجرت کرتے ہوئے ''اللہ اور رسول'' کی طرف جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ اب یہاں ہجرت اور ہجرت میں فرق ہو گیا جو میں نے عرض کیا تھا کہ ایک اپنے مفادات کے لیے اور دوسری قومی مفادات کے لیے بھی ہجرت کی جاتی ہے۔ یہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اتنی وسیع زمینیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ ہجرت کرسٹوفر کولمبس (1506-1451ء) نے کی تھی تو اس کو پورا برِ اعظم مل گیا۔ پھر اس کے بعد یورپ کی ان آبادیوں نے اس طرح ہجرت کی۔ عزیزانِ من! قوموں کی زندگی میں یہ جو ایک خاص زمین میں 'درختوں کی طرح' کھڑے رہنا ہے کہ ہل ہی نہیں سکتے ' نہیں ہے۔ ایسی قومیں دنیا میں کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ قومیں وہ ہیں جن کے لوگ ایک مقام پہ پیدا تو ہوتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ کس طرح وہ ساری دنیا میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

## قرآنی ہجرت اور دورِ حاضر کی استعماریت میں فرق

اسی وجہ سے قرآن کریم نے جماعت مومنین کا سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (6:11) کا یہ فریضہ قرار دیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ یہ قومیں جو صرف National Basis (قومی سطح) پر ایسا کرتی ہیں' وہ دوسری جگہ جا کر کالونیز بناتی ہیں' اس کو استعماریت کہتے ہیں۔ وہاں ان کو محکوم رکھتی ہیں' حکومت کرتی ہیں' ان کی دولت کو سمیٹتی ہیں' Exploit (سلب ونہب) کرتی ہیں' مال و دولت اپنے گھر بھیجتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن نتیجہ تو اسی کا ہوتا ہے کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر وہ وہاں جاتے ہیں اور اس کے لیے جوان کو ابتدا میں تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں ذرا آپ ان کی تاریخ تو پڑھ کر دیکھیے پھر معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کتنی مشقتیں' تکلیفیں اٹھاتے ہیں' کتنی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں' اس کے بعد یہ چیزیں ان کو حاصل ہوتی ہیں لیکن یہ ساری چیز تو انسانوں کا ایک گروہ خون چوس کر دوسرے گروہ کو پہنچانے کے لیے ہوتا ہے لیکن بہرحال یہاں کے مقابلے میں وہاں جا کر قوتیں تو وہ مزید حاصل کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم نے مومن کی زندگی کا فریضہ قرار دیا ہے کہ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (6:11) چلو پھرو زمین میں۔ لیکن ان کا سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ یا ان کی جو ہجرت ہے' وہ ان کے مقابلے میں ایک بنیادی فرق رکھتی ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ (4:100) وہ ''خدا اور رسول'' کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

## نوعِ انسانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت بطور اسوۂ حسنہ ہے

عزیزانِ من! یہ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىۡ کیا ہے؟ یہ وحی کے الفاظ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ نے کہے تھے۔ قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرم ﷺ دو ہی ہستیاں ہیں جن کے اسوہ کو بالتصریح ہمارے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی یہ ہے کہ جس

گھر میں آپؑ پیدا ہوئے وہاں کے غلط نظام کے خلاف سب سے پہلے‘ باپ کے خلاف‘ مجاہدہ شروع کیا‘ پھر قوم کے ساتھ ٹکرا ؤ لیا‘ پھر ملک کے بادشاہ (نمرود) کے خلاف ٹکراؤ لیا‘ صحیح نظام کے قیام کی کوشش کرتے رہے۔اور جب یہ دیکھا کہ وہاں اس کا امکان نہیں ہے تو اس کے بعد وہاں سے اٹھے اور قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ (29:26) میں چلا اپنے رب کی طرف۔دوسری جگہ کہا ہے کہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) میں چلا اپنے رب کی طرف۔

رب کے متعلق تو قرآن حمید نے کہا ہے کہ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (50:16) ہم تو ہر فرد کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔تو جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب بیٹھا ہے‘ یہ اٹھ کر اس کی طرف ملنے کے لیے کہاں جا رہے ہیں‘ یہ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ کیا ہے؟ یہ وہی چیز ہے کہ میں اس زمین کی طرف چلا جہاں میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔اور یہاں تو قرآن حمید نے اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ‘ دونوں چیزیں کہہ دی ہیں کہ وہاں یہ نظام قائم ہو گیا تھا۔جہاں دین کا نظام قائم ہو گیا‘ اسے قرآن حمید نے ہمیشہ ”اللہ اور رسول“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے‘ یعنی خدا کے قوانین‘ جو اس کے اس رسول کی وساطت سے اس نظام میں کارفرما ہو رہے ہیں۔اور جہاں بھی حکومت قرآن مجید کے مطابق قائم ہوگی‘ اسے خدا اور رسول کا Substitute (متبادل) یا نمائندہ کہا جائے گا۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ مَنۡ یُّهَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِیۡرًا وَّسَعَةً ؕ وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ثُمَّ یُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ (4:100) اور جو شخص اس طرح ”خدا اور رسول“ کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اس کے بعد قبل اس کے کہ وہاں وہ نظام قائم کرتا یا شاید وہاں پہنچ بھی پاتا‘ راستے ہی میں مر گیا‘ اس نظام سے پہلے ہی مر گیا تو اس کے بعد کیا ملا؟ اوپر قرآن کریم نے دو چیزیں مُرٰغَمًا كَثِیۡرًا وَّسَعَةً ؕ (4:100) کہی ہیں کہ بڑی کشائشیں نصیب ہونگی‘ بڑی خوشحالیاں ملیں گی۔یہاں یہ کہا ہے کہ وہ شخص اس حالت میں یہاں سے نکلا اور اسی حالت کے اندر مر گیا تو یہ کچھ تو اسے نصیب نہیں ہوا۔پھر وہ کیوں نکلے؟

## مادی نظریہ زندگی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کے تقاضوں کے حصول کا طریق اور اہمیتِ ہجرت

عزیزانِ من! یہاں بڑی عجیب چیز آ جاتی ہے۔چند الفاظ تمہید کے طور پر مجھے کہہ دینا چاہئیں۔زندگی کا نظریہ اگر صرف طبعی زندگی یا Physical Life ہی ہے‘ جسے Materialistic Concept (مادی تصور) کہتے ہیں کہ یہ جسم کی زندگی ہے‘ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے تو پھر جب بھی آپ یہ آسائشیں‘ خوشحالیاں‘ مرفع الحالیاں‘ اجر‘ معاوضہ‘ صلہ کہیں گے تو وہ ہمیشہ Material (مادی)

شکلوں میں سامنے آئے گا' اس سے اگلی کوئی شکل اور ہو ہی نہیں سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اگر کوئی شخص نکلا ہے' راستے میں اُسے موت آ گئی' اسے کچھ نہیں ملا تو قصہ ختم ہو گیا لیکن ہجرت کرنے والے کے پیشِ نظر زندگی کا یہ تصور نہیں ہے۔ زندگی کے دو Concepts (تصورات) ہیں۔ ایک طبعی زندگی ہے' یہ اس جسم کی پرورش ہے جو یقینی طور پر نہایت ضروری ہے۔ یہ ایک مادی تصور ہے اور اس کے بعد دوسرا انسان کی ذات کی نشوونما ہے جو اصل مقصود ہے' جسے آپ حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔

مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کے اندر ایک چیز پیدا ہوتی ہے' اس دوسری چیز کو آپ صلہ یا معاوضہ یا بدلا کہیں گے۔ مومن کو دو بدلے ملتے ہیں' رحمت میں اِثْنَيْنَ ❶ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے: ایک تو طبعی زندگی کی کشائشیں ملتی ہیں اور دوسری انسان کی' ذات کی نشوونما کے لیے یہ چیزیں ملتی ہیں۔ اب اگر خالص مادی زندگی کا نظریہ لیے ہوئے اس طرح سے وطن سے نکل گیا' دوسری جگہ جانے سے پہلے مرگیا تو اس کو تو کچھ بھی نہیں ملا۔ کہا کہ یہ شخص جو اس نظریئے کو لے کر نکلا تھا' یہ اگر راستے میں مرگیا ہے یا اس نظام کے قیام سے پہلے اس کو موت آ گئی ہے تو یہ مُرٰغَمًا ❷ وغیرہ چیزیں تو نہیں ملیں گی لیکن وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (4:100) اس کا صلہ' اس کا بدلا' اس کا معاوضہ' اللہ کے ذمہ واجب ہو گیا' وہ ملے گا۔ دیکھا! کہ اس کو ناکامی نہیں ہوئی۔ قرآن کریم ہے' عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ بات اتنی وضاحت سے ہر جگہ نہیں Explain (بیان) کرتا جاتا کہ زندگی کی دو سطحیں ہیں اور اس میں یہ ہے اور وہ ہے بلکہ جہاں جہاں ضمناً' راستے میں' کوئی چیز آتی ہے' آپ دیکھیے گا کہ وہاں کس طرح اپنے اس اصول کے مطابق چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اس محور کے گرد گردش کرتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم کے یہ بنیادی Concepts (تصورات) سمجھ لیے جائیں تو باقی ساری چیزیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات ویسے سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ یہاں فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (4:100) کیا بات ہوئی؟ یہ ہے وہ اجر جو واقع ہوتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (4:100) وہ سامان حفاظت بھی دیتا ہے' سامانِ نشوونما بھی دیتا ہے' یہ دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ چلا' یہ کارواں جہاد کے لیے نکلا' دین کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے اسے شاید میدانِ کارزار میں بھی آنا پڑا۔ اب بات یہ ہوئی کہ جو شخص' اس طرح ''خدا اور رسول'' کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا تو اس کا یہ عزم ہی اتنے بڑے اجر کا موجب بن جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہ بھی پہنچے اور اُسے راستے میں ہی موت آ جائے تو خدا کے ہاں سے

---

❶ ابن فارس نے کہا ہے کہ اثنین کے مادہ ''ث ن ی'' کے بنیادی معنی (1) ایک کام کو دوبارہ (مکرر) کرنا اور (2) ایک چیز کی دو الگ الگ چیزیں بنا دینا ہیں (پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص۔406)

❷ تاج العروس میں ہے کہ مرٰغما کے معنی ہیں ''قلعہ نیز راستہ اور وسعت اور فراخی''۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ''پناہ گاہیں ہیں جہاں وسعت اور فراغی نصیب ہو''۔

اسے پورا پورا اجر مل جاتا ہے۔ خدا کے قانون میں حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ہجرت ایسے مقام کی طرف ہوگی جہاں نظامِ خداوندی قائم ہو یا اس کے قیام کے امکانات روشن ہوں۔ اس کو ''خدا اور رسول'' کی طرف ہجرت کہا جائے گا' یونہی ترکِ وطن کا نام ہجرت نہیں ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ صلوٰۃ کا مفہوم اور صلوٰۃ کے لیے اجتماعات کا مقصد

قرآنِ کریم کی رو سے صلوٰۃ کا نظام قائم کرنے کے معنی کیا ہیں؟ یہ بات تفصیل سے پہلے آ چکی ہے۔ اس نظام کی جو اقامت ہے یہ اس کا قائم کرنا ہے اور نظام کا مطلب یہ ہے کہ ''پورے کا پورا معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے' خدا کے پیچھے پیچھے چلتا جائے''۔ دین کے پورے نظام کو قرآن حمید اقامتِ صلوٰۃ قرار دے رہا ہے لیکن اس کی عملی شکلیں یہ ہیں جن کو آپ اجتماعاتِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ صلوٰۃ کے لیے اجتماعات بھی قرآن حمید ضروری قرار دیتا ہے۔ آپ صلوٰۃ کے لیے یہ اجتماعات دیکھتے ہیں چونکہ یہ چیزیں بیشتر مواقع پہ پہلے آ چکی ہیں' اس لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا' اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ کہا یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38)۔ یہاں مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کون ہیں؟ کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38) خدا کی ہر آواز پر لبیک کہنے والے ہیں۔ ہر آواز پہ لبیک کہنا کیا ہے؟ یہ کہ جو بھی وہاں سے حکم ہو' جو بھی اس کا قانون ہو' جو بھی اس کا تقاضا ہو' اس کا یہ نظام جس چیز کا بھی متقاضی ہو' جو بھی اس کی آواز آئے' اس پر لبیک کہو۔ یہ مومن کا شعار ہے۔ اس کے لیے یہ کرتے کیا ہیں؟ کہا ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38) ان کے ہاں کی اقامتِ صلوٰۃ ہوتی ہے' اس میں اجتماعاتِ صلوٰۃ بھی آ گئے ہیں' یہ کا ہے کے لیے ہیں؟ اس لیے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں۔ ہمارے سامنے یہ قرآن حکیم کی صریح آیت ہے جو ان اجتماعات کا مقصد بتا رہی ہے۔ اگر آپ صلوٰۃ کے اجتماعات کی بجائے صلوٰۃ کے لیے اجتماعات کہیں' تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

## تاریخ کی روشنی میں صلوٰۃ کے لیے اجتماعات کا بنیادی مقصد

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (62:9) اجتماع کے وقت' جب تمہیں صلوٰۃ کے لیے آواز دی جائے۔ یہ ہے اجتماعِ صلوٰۃ کہ ان کے معاملے باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں۔ اب جو نظامِ صلوٰۃ ہے یہ بہت بڑا ہے' یہ پورے کا پورا نظامِ مملکت ہے' دین کا نظام ہے' اس میں جو روزمرہ کے معاملات سامنے آئیں گے' وہ مشاورت سے طے ہونگے۔ اس مشاورت کے لیے آپ کو میٹنگ کرنا پڑیں گی' یہ اجتماعات ہیں۔ یہ آپ کی جو کشتیوں کے ٹوٹے تختوں سے بنائی ہوئی تاریخ ہے' اس میں

کہیں کہیں کچھ اس قسم کی چیزیں آ جاتی ہیں' جن سے کچھ جھلک پڑتی ہے کہ اس زمانے میں کیا ہوتا تھا۔ اس میں یہ چیز ہے کہ جب کبھی بھی کوئی ایسا اہم معاملہ آ پڑتا' باہر سے کوئی سفیر آتا' جنگ کی کوئی خبریں آتیں' صوبوں کے معاملات کی کوئی اہم چیزیں سامنے آتیں' تو اس وقت مدینے میں مرکز کی طرف سے' سنٹرل گورنمنٹ کی طرف سے' خلیفہ کی طرف سے' جو مشیر مقرر تھے' اس زمانے میں تو ریڈیو نہیں تھے' لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں تھے' اناؤنسمنٹ کی اور شکلیں نہیں تھیں' تو تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت یہ اناؤنسمنٹ (اعلان) کرنے کے لیے ''الصلوٰۃ الجامع' الصلوٰۃ الجامع' الصلوٰۃ الجامع'' کے یہ الفاظ تھے کہ چلو اٹھو' صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ' صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ۔ یہ اس کے لیے نہیں تھا' کہ یہ پانچ وقت کے لیے آپ کو اذان ملتی ہے۔ وہ جو اہم معاملہ آتا تھا' اس کے لیے جو آواز دی جاتی ہے' اس کے لیے الصلوٰۃ کہا جاتا تھا۔

عزیزانِ من! دیکھا اس سے ہمارے ذہن میں جھلک پڑ جاتی ہے کہ اس زمانے میں بات کیا تھی۔ پھر جو ان کی مجلسِ شوریٰ تھی' وہ مسجد میں جمع ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی دین میں ثنویت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ مسجد نماز کے لیے ہے اور دنیاوی معاملات کے لیے آپ کو باہر نکلنا پڑتا ہے۔ وہاں تو وحدت تھی۔ اسی مسجد میں سب کچھ ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ کے جو اجلاس ہیں' وہ مسجد میں ہوتے تھے' ان سے مشاورت ہوتی تھی۔ مسجد کے اندر آپ کے ہاں ان اجتماعات کی تفصیلیں درج ہیں لیکن کیونکہ یہ سارے اجتماعات' وہ مقاصد جن کے لیے اجتماعات منعقد ہوتے تھے' ان کی ساری زندگی کا نصب العین دین کا قیام تھا' خدا کے احکام کی اطاعت تھی' اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا تھا' اس کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ جب یہ اجتماعات ہوں تو ان اجتماعات کی ابتدا اس شکل میں کی جائے کہ محسوس شکل میں معلوم ہو جائے کہ یہ وہ لوگ جمع ہوئے ہیں' جن کا کھڑے ہونا' جن کا جھکنا' جن کا سرِ تسلیم خم کرنا تو گویا اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) ہمارا یہاں جمع ہونا' ہمارا مشورہ کرنا' ہمارا قانون بنانا' قانون کی اطاعت کرنا' قانون کی اطاعت کروانا' یہ سارا کچھ جو تھا' یہ خدا کے لیے تھا۔ اس کی محسوس شکل یہ تھی کہ اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا بڑا منتخب کیا جائے' جسے امام کہتے ہیں۔ اس کی بات سنی جائے۔ سننے کے بعد اگر وہ کہے کہ جھکو تو جھک جاؤ' اگر وہ کہے کہ اٹھو تو اٹھ جاؤ' جب یہ اجتماعِ صلوٰۃ ختم ہو جائے اور وہ آخر میں کہے کہ ہاں صاحب! ختم ہوا تو فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ (62:10) پھر جہاں جی چاہے جاؤ۔ جب تک وہ ایسا نہ کہے' بیٹھے رہو۔ ایک صف' ایک امام' ایک حکم' سب اس حکم کی اطاعت کرنے والے' اس کی آواز پہ اٹھنے والے' اس کی آواز پہ جھکنے والے ہیں۔ یہ ایک محسوس شکل میں نقشہ تھا آپ کے صلوٰۃ کے نظام کا: ایک مملکت' ایک قانون' ایک سربراہ' ایک امت' ایک حکم' ایک ہی طرح سب کی طرف سے اطاعت۔ کوئی باہمی قسم کا انتشار نہیں' کوئی افتراق نہیں' کوئی اختلاف نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس میں بنیادی چیز کیا تھی؟ وہ ایک امام' وہ مرکزی قوت تھی۔ یہ بنیادی چیز تھی۔

## امام کے بغیر اسی مسجد میں انفرادیت کی دوسری شکل وصورت نے جنم لیا

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جب باجماعت نماز میں امام سامنے ہوتا ہے تو اب بھی رسمی طور پر ہی سہی' اس میں وحدت ہوتی ہے کہ صفیں سیدھی ہیں' ایک آواز کے اوپر جھکنا ہے' ایک آواز پہ اٹھنا ہے اور اس کے بعد جب دو رکعتیں فرض کے بعد سلام پھیرا' اور بیچ میں سے امام بھی اٹھ کر پیچھے آیا' امام کی جگہ خالی ہوگئی اور اسی امت نے' انہی صفوں نے' اسی جماعت نے' پھر اس کے بعد سنتیں پڑھنی شروع کیں تو مسجد میں جا کر اس کا نقشہ دیکھو کہ کوئی کھڑا ہے' کوئی جھکا ہے' کوئی سجدے میں ہے' کوئی باہر نکل رہا ہے ''کسے دی جوتی کوئی لے گیا اے'' (کسی کا جوتا کوئی لے گیا ہے)۔

عزیزانِ من! وہی امت ہے' یہ دو نقشے کس طرح سے آپ کے سامنے آئے۔ ایک نقشہ ہے جس میں کامل وحدت ہے' جس میں ڈسپلن ہے' جس میں نظام ہے' یہ کس چیز کے لیے ہے؟ نماز تو وہی تھی' ایک امام موجود تھا۔ ایک امام بیچ میں سے غائب ہوا' وہی نماز ہے' وہی رکعتیں ہیں' وہی رکوع ہے' وہی سجود ہے' وہی قیام ہے' وہی تسبیح ہے مگر وحدت نہ رہی۔ کیا یہ وہی قوم رہی ہے؟ یہ بڑا ہی چبھتا ہوا ایک سوال ہے۔

## دین اور مذہب کے انمٹ نقوش کی نشاندہی اور مذہب کی دیرینہ بیماری کا شافی علاج

آج ان ستر کروڑ ❶ مسلمانوں کے انتشار کی حالت ہے کہ کسی گروہ کی باتیں آپس میں نہیں ملتیں۔ اس کی ساری وجہ یہ ہے کہ آپ کے ہاں امام نہیں رہا' نظام کا مرکز نہیں رہا' نظام نہیں رہا' اسلام کی مملکت نہیں رہی' قرآن حکیم کا دین نہیں رہا۔ عزیزانِ من! ان نمازیوں کا کچھ نہیں بگڑا' انہی نمازیوں کو پھر کھڑا کر لیجیے اور ایک امام مقرر کر دیجیے' سارے اختلاف مٹ جائیں گے۔ جب ایک امام کے پیچھے جماعت ہوگی' اس کو دین کہیں گے۔ جب وہ بیچ میں سے نکل جائے گا' مذہب کی عبادت ہو جائے گی۔ یہ ہے اجتماعِ صلوٰۃ' یہ ہے جسے باجماعت کہتے ہیں۔ اب کیا نقشہ رہ گیا ہے چھوڑو یہ باتیں۔ میں نے کہا ہے کہ اس سے دل خوں ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! بات بڑی صاف تھی' اس میں دو رائے ہی نہیں ہیں۔ آج آپ کے سامنے نقشہ موجود ہے' دین کی صلوٰۃ کی دو رکعتیں امام کے گم ہو جانے سے اور پھر اسی صلوٰۃ کی چار رکعتیں ہوئیں' آپ کے سامنے نقشہ ہے۔ یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ اتنے اہم تھے کہ جنگ میں بھی اگر جا رہے ہیں' وہاں بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں' وہاں تو ان کی اور زیادہ Frequently (اکثر و بیشتر) ضرورت پڑتی ہوگی۔ اس وقت یہاں بھی صلوٰۃ کے اجتماع کی ضرورت پڑتی ہے تو کہا ہے کہ وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ

---

❶ یاد رہے مسلمانوں کی یہ تعداد نومبر 1970ء کی 22 تاریخ کو بتائی گئی تھی۔ آج اس سے کہیں زیادہ ہے۔

**فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوةِ** (4:101) اور جب تم (جنگ کے لیے ) باہر نکلو تو وہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حالات کے تقاضے کے مطابق تم نے اس کی ایک شکل متعین کی تھی' اس میں کمی کر لیا کرو۔ کیوں کمی کر لیا کرو؟ اس لیے کہ **اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَكُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا** (4:101) اگر تمہیں خطرہ ہو کہ مخالفین کوئی فتنہ کھڑا کر دیں گے' کوئی شرارت کر دیں گے' تو اس وقت پھر اس میں زیادہ وقت نہ لگاؤ' اس کو کم کر لو۔ اب دیکھیے کہ کم کرنے کی شکل کا کہا ہے کہ **اِنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ كَانُوۡا لَـكُمۡ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا** (4:101) یہ مخالفین تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں' تمہاری گھات میں ہیں۔ اب نماز پڑھنے کے لیے اگر تم سارے کے سارے کھڑے ہو گئے تو انہیں تو موقع مل جائے گا' حملہ کر دیں گے' ایسا نہ کرو۔

عزیزانِ من! پہلی چیز تو میں یہ عرض کروں' یہ جو قصرِ صلوٰۃ اصطلاح ہے یہ ہمارے ہاں آج بھی ہے' نہ وہ جہاد ہے' نہ وہ جنگ ہے' نہ وہ امام ہے مگر قصرِ صلوٰۃ پر ہمارے ہاں والے بڑے ہی شدت سے پابند ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟ یہ کہ مسافر اپنی نماز آدھی کر سکتا ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا تھا کہ اگر تمہیں خطرہ ہو کہ دشمن تمہارے خلاف کوئی حملہ کر دے گا تو اس صورت میں یہ کرو۔ اب اس سے ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ نہایت مزے سے ٹرین کے سیکنڈ کلاس میں بیٹھے ہیں' ریل چل رہی ہے اور اس کے لیے فاصلہ مقرر ہے' پتہ نہیں تیس میل یا پینتیس میل ہے کہ وہاں گھر سے اتنے فاصلے پہ ہو تو مسافر ہے۔ ان کے نزدیک وہ بتیس میل یا چھتیس میل ہے' اس کے بعد پھر وہ مسافر ہو جاتا ہے اور اس میں پہلی چیز یہ ہے یعنی یہاں سے گوجرانوالے جا کر ہوٹل میں بیٹھا ہو یا دوست کے مکان میں بیٹھا ہو' نماز آدھی ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَكُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا** (4:101) شرط یہ ہے کہ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے یعنی وہاں بھی یہ نہیں کہ جنگ میں نکلو تو ہر جگہ تم قصرِ صلوٰۃ کرو' **اِنۡ خِفۡتُمۡ** وہ بھی پھر واجب نہیں ہے فریضہ نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ** (4:101) اس میں کوئی حرج کی بات نہیں اگر تم اس کو کم کر لو۔ یہاں **اِنۡ خِفۡتُمۡ** کی شرط تو موجود ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ كَانُوۡا لَـكُمۡ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا** (4:101) وہ لوگ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ وہ تو ایسے مواقع کی گھات میں رہتے ہیں۔

## قصرِ صلوٰۃ کی قرآنی تفصیل

اب یہ جو قصرِ صلوٰۃ ہے' اس کی تفصیل قرآن حکیم نے دی ہے کہ وہ کیسے کی جائے گی۔ کہا ہے کہ **وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ** (4:102) اور اے رسول! جب تُو خود اپنی جماعت کے ساتھ ہو۔ یہاں امام کی شرط دیکھ لیجیے کہ جب تُو خود ان کے اندر ہو **فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ** (4:102) ان کے لیے پھر صلوٰۃ قائم کیا کر۔ پہلی شرط تو اس میں یہ ہو گئی کہ امام کا ہونا تو ضروری ہو گیا۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ **فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡۤا اَسۡلِحَتَهُمۡ** (4:102) ان میں سے یہ سارے کے سارے ہی نہ اکٹھے ہو جائیں بلکہ یہ کرو کہ

ان میں سے ایک گروہ تو تمہارے پیچھے کھڑا ہو جائے اور وہ بھی اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو اور جو دوسرا گروہ ہے' وہ پیچھے کھڑا پہرہ دے رہا ہو۔ یہ قصرِ صلوٰۃ کی شکل ہے۔ قصر یہ ہے کہ جو پہلا گروہ ہے' یہ دو رکعتیں پوری نہ کرے۔ **فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ** (4:102) تو پھر یہ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد' سجدے کے بعد' پیچھے ہٹ جائیں' اور جو پچھلے والے ہیں' یہ آ کر تمہارے پیچھے کھڑے ہو جائیں' یہ پہرہ دیں اور وہ سجدہ کریں۔ **وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً** (4:102) یہ اس لیے ہم نے کہا ہے کہ تمہارے مخالفین گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ تمہیں انہوں نے تمہارے ہتھیاروں کی طرف سے' ساز و سامان کی طرف سے' ذرا غافل پایا اور انہوں نے تمہارے اوپر یکبارگی یورش کی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم ہتھیاروں کو حالتِ صلوٰۃ میں بھی الگ نہ کرو۔ کھڑے ہو تو اس وقت بھی اپنے ہتھیار باندھے رکھو۔ کہا ہے کہ **وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ** (4:102) اگر فرض کرو' بارش ہو گئی ہے' کپڑے بھیگ گئے ہیں' تو ان کے اوپر پھر ہتھیاروں کی پٹیاں باندھے رکھنا بڑا دشوار ہو جائے گا یا مریض ہو گئے ہو' تو پھر ہتھیاروں کو الگ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن **وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ** (4:102) اپنی احتیاط اور حفاظت کی طرف سے اس وقت بھی غافل نہ ہو' حفاظت ہر وقت سامنے رکھو۔ **اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا** (4:102) تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ تمہارے جو مخالفین ہیں تمہارے سامنے نامراد ہونگے' ذلیل و خوارہ ہونگے' ہم نے ان کے لیے یہ عذاب تیار کر رکھا ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم یہ ڈسپلن قائم رکھو۔

## خدا اپنے وعدے انسانوں کے ہاتھوں پورے کراتا ہے' جنگ احد میں غفلت کا نتیجہ اور ذکر اللہ

آپ نے دیکھا کہ خدا کے وعدے کس طرح پورے ہوتے ہیں۔ یہ وعدے انسانوں کے ہاتھوں پورے ہوتے ہیں۔ جنگ احد[1] میں ایک مقام آیا تھا جہاں ان سے ذرا سی غفلت ہو گئی تھی' کمانڈر کے حکم سے ذرا سی سرتابی برتی تھی۔ وہی جماعت مومنین' مجاہدین کی جماعت' خود رسول اللہ ﷺ وہاں سپہ سالار کی حیثیت سے کھڑے تھے۔ یہ ذرا سی غفلت ہوئی تو فتح مبدل بہ شکست ہو گئی۔ وہاں ان کا اتنا نقصان ہوا' خود حضور ﷺ کو اس میں زخم آئے۔ یہ جن کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا تھا' آپ نے دیکھا ہے کہ وہاں یہ کیسے غیر محفوظ رہ گئے۔ وہاں یہ کہا ہے کہ یہ جو تمہارے ڈسپلن میں ذرا سا فرق آیا ہے' اس کی وجہ سے یہ چیز پیدا ہو گئی۔ خدا کے وعدے انسانوں کے ہاتھوں سے پورے ہوتے ہیں اور یہ وہ انسان ہیں جو اس کی تلقین' تعلیم' ہدایات' احکام' قوانین' اصول کے مطابق زندگی بسر کرتے

---

[1] جنگِ احد (14۔شوال 3ھ مطابق 29۔مارچ 625ء)

چلے گئے' صلوٰۃ کی یہ صورت ہوگئی۔آ گے کہا ہے کہ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (4:103) اور جب صلوٰۃ سے یعنی اس اجتماعِ صلوٰۃ سے تم فارغ ہو جاؤ تو یہ نہ سمجھ لو کہ فریضۂ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے۔صلوٰۃ تو تمہاری ساری زندگی کو محیط ہے۔جو کچھ تم نے اس وقت کیا ہے وہ مؤقت اجتماع میں شرکت ہے جو کلّی صلوٰۃ کا ایک جزو ہے۔اس لیے تم اس کے بعد بھی اٹھتے' بیٹھتے' لیٹے' ہر وقت اور ہر حال میں قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو۔

## ہمارے ہاں کاروبار اور نماز کے باہمی رابطے کی نوعیت

عزیزانِ من! اب تو یہاں یہ ہے کہ جب یہ نماز سے فارغ ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے جوتے پہنے' باہر نکلے تو پھر اپنا کاروبار شروع کر لیا۔نماز کے وقت میں نماز' کاروبار کے وقت میں کاروبار۔یہ ہے روشِ زندگی۔اور کاروبار کی شکل بھی۔وہ بات تو اس سے پہلے بھی سامنے آئی ہوئی ہے' اسے دہرا دینے سے ذرا مضمون واضح ہو جاتا ہے۔یہ مثال اس پر ہے کہ کاروبار کا اور نماز کا تعلق کیا ہے؟ دکاندار باپ نے جا کر اپنے بیٹے سے کہا کہ میں یہ سودا کر آیا ہوں۔بیٹے نے کہا کہ اس میں تو بڑا نقصان ہو جائے گا' آپ غلط کر بیٹھے۔اس نے حساب کر کے بتایا تو باپ نے بھی دیکھا کہ ہاں واقعی غلطی ہوگئی۔بیٹے نے کہا کہ یہ تو بڑا نقصان ہوا۔وہ کہنے لگا کہ ''نئیں' نقصان والی گل کوئی نئیں' بچے میرے! توں تجربہ کار نئیں ہیگا' نپٹ لواں گے ایس گل نوں۔او کہن لگا کہ کی کرلو گے؟ کہن لگا کہ اسی رپھڑ پا دیاں گے۔او کہن لگا: جے رپھڑ اپانا ہیگا تے جا' ہنے ای جا کے پا کے آ۔او کہن لگا کہ نئیں سویرے جاواں گا۔او کہن لگا کہ ہون کیوں نئیں جاندا؟ کہن لگا کہ عصر دا ویلا اے' سورج تھلے ہوندا جاندا ہیگا۔عصر پڑھنی ضروری' تے رپھڑ پانا وی ضروری ہیگا۔نماز اپنے تھاں اے رپھڑ اپنے تھاں'' (نہیں' نقصان والی ابھی کوئی بات نہیں ہے۔تم تجربہ کار نہیں ہو۔ہم اس معاملے کو نپٹ لیں گے۔وہ کہنے لگا کہ کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ ہم بکھیڑا ڈال دیں گے۔وہ کہنے لگا کہ اگر یہ بکھیڑا ہی کرنا ہے تو ابھی کر لو۔اس نے کہا کہ نہیں' صبح سویرے کریں گے۔وہ کہنے لگا کہ اب کیوں نہیں کرتے؟ اس نے کہا کہ نمازِ عصر کا وقت ہے۔سورج غروب ہوا چاہتا ہے' نمازِ عصر پڑھنا ضروری ہے اور یہ بکھیڑا کرنا بھی ضروری ہے۔نماز اپنی جگہ اور یہ بکھیڑا اپنی جگہ)۔قرآن کریم کہتا ہے کہ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ (4:103) جب یہ اجتماعی شکل ختم ہو جائے تو یہ نہ سمجھ لو کہ بس وہ جو خدا کا معاملہ تھا وہ معاملہ ختم ہوا اور اس کے بعد ''اپنے ہن رپھڑ پوندے رہو'' (آپ اپنے بکھیڑے ڈالتے رہو)۔

## ذکر اور ہمارا عمل

فرمانِ خداوندی یہ ہے کہ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (4:103) اور اس کے بعد کھڑے' بیٹھے' لیٹے

فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کرو۔ یہاں فَاذْکُرُوا اللّٰہَ آیا' ترجمہ ہوگیا ''اللہ کا ذکر'' کرو اور ذکر میں اگر آپ شریک نہیں ہوتے تو اس کی آوازیں تو اب آپ کو گھر لیٹے ہی آتی ہونگی۔ عشاء کے بعد ''او جیہڑ یاں ضرباں لگدیاں نیں قلب اتے'' (وہ جو قلب پہ ضربیں لگتی ہیں)۔ اس کا مفہوم ہی یہ رہ گیا ہے۔ اگر وہ ذکر جلی نہیں ہے تو وہ گھر میں مصلے پہ بیٹھے ہوئے تسبیح کے دانے پہ بھی ضرب لگتی ہے۔

قلندر ہر چہ می گوید دیدہ گوید

یہ ہے ذکر اللہ کا۔ کہتا ہے کہ اس کے بعد فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ (4:103) یہاں تو صرف اتنا ہی تھا لیکن اب وہ جو ذکر ہے' اس میں کچھ وسعت پیدا ہوگئی ہے' اس کی شکل ذرا اور آگے پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے' یوں کہیے اس میں Intensity (شدت) تھی' اب اس میں Extensity (وسعت) پیدا ہوگئی ہے اور وسیع پیمانے پہ ذکر ہے۔

## قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور ذکر اللہ کی ایک مثال

کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے؟ یہاں کہا ہے کہ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ (4:103)۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مقام پہ جو بات آئے' دیکھیے کہ قرآن کریم میں اس کے متعلق اور کہاں کہاں بات آئی ہوئی ہے۔ اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیے کہ ذکر کس کو کہتے ہیں؟ کہا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) یقیناً تخلیق کائنات میں' لیل و نہار کی گردشوں میں' صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی ان کی ریسرچ مقصود بالذات نہیں ہے' یہ کسی بڑے Truth (صداقت) کی طرف پہنچنے کے لیے راستے کی نشانیاں (Sign Posts) ہیں۔

کیا بات ہے قرآن کریم کی! یہ ریسرچ بڑی ضروری ہے۔ یہاں لِّاُولِی الْاَلْبَابِ آیا ہے۔ یہاں عقلمند نہیں کہا ہے' الباب کہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ لب لباب کہتے ہیں ''عقل دا وی تت کڈیا ہویا جنوں کیندے نیں'' (جسے عقل کا بھی نچوڑ نکالا ہوا کہتے ہیں) ۔عربی زبان میں یہ وہ لفظ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ان کے لیے اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں یعنی الَّذِیْنَ یہ وہ لوگ ہیں جو یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (3:191) کھڑے' بیٹھے' لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ آگے کہا ہے کہ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191) اور ہر حال میں ارض و سما کی تخلیق پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ ذکر اللہ کے معنی کیا ہیں! یہ وہی الفاظ ہیں کہ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (3:191)۔ یہ ہے ذکر اللہ کہ زندگی کے ہر گوشے میں' ہر معاملے میں قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو۔

## کائنات کی کوئی شے بھی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے پیدا نہیں کی

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (3:191) وہ ارض وسما میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اور پھر وہ بات ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں لیکن نہایت ضروری ہے۔ سب کچھ کرنے کے بعد کس نتیجے پہ پہنچتے ہیں؟ اس پر کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اور اس پوری تحقیق وتفتیش کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! تُو نے کائنات کی کسی شے کو بھی باطل پیدا نہیں کیا' تخریبی نتائج کے لیے پیدا نہیں کیا''۔ یہ ہے یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ ۔ یہاں کہا ہے کہ فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذۡکُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ (4:103) جب تم اس طرح صلٰوۃ کو ختم کر چکو' تو اس کے بعد بھی اٹھتے' بیٹھتے' لیٹے' ہر وقت اور ہر حال میں قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھو۔ یہاں سے نکلو' تفکر' تدبر' شعور' عقل' فہم' تحقیق کرو جو کہا گیا ہے۔ یہ اس غرض کے لیے کرو کہ کائنات کی کوئی شے باطل نہیں ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (4:103) جب پھر یوں اطمینان ہو جائے تو پھر وہ جو امن کی حالت کا عام طریقہ تھا اسی پر جو اجتماعاتِ صلٰوۃ ہیں ان کو پورا کیا کرو' پھر قصرِ صلٰوۃ کی ضرورت نہیں ہے۔

## وقت کی میزان کا دوسرا نام زندگی ہے

عزیزانِ من! ویسے تو انفرادی معاملات میں بھی وقت کی پابندی کی بڑی ہی اہمیت ہے۔ ہمارے ہاں وقت کی قیمت نہیں ہے۔ جب وقت ہی کی قیمت نہیں تو وقت کی پابندی کی کیا اہمیت ہوگی! عزیزانِ من! آپ سوچتے نہیں کہ جسے آپ زندگی کہتے ہیں' یہ ہوتی کیا ہے' یہ وقت کی میزان کا نام ہوتا ہے۔ اسی کو زندگی کہتے ہیں' آخری لمحوں میں کہتے ہیں کہ ''صاحب! اگر دو دن بھی مجھے اور مل جاتے' اگر اس کو زندہ رہنے کے لیے دو گھنٹے بھی اور مل جاتے''۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ وہ جو سارے دن گھنٹے وغیرہ ہیں' اسی کا نام زندگی ہے۔ اگر زندگی کی اہمیت ہے تو وقت کی اہمیت ہونی چاہیے۔ یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ وقت ضائع کر دیا' زندگی کا اتنا حصہ ضائع کر دیا اور اس کے بعد جب معاملہ دو میں آ کر پڑتا ہے' آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میں چار بجے آؤں گا اور اس کے بعد چار بجے آپ نہیں آتے۔ آپ دیکھتے ہیں اس میں ان لوگوں کا کتنا حرج واقع ہوتا ہے جن کے ساتھ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ یہ مسلمان قوم وہ قوم تھی' جن پر ان چیزوں کی یہ اہمیت واضح کی تھی۔

## وقت کا قرآنی تصوّر اور ہماری حالت

کہا یہ تھا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا (4:103) یاد رکھو! یہ چیز ایسی نہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے اس

وقت پڑھ لی اُس وقت پڑھ لی۔اب تو ہمارے ہاں یہ ہے کہ جی وہ ظہر کا وقت ''او خاصا لمبا ہوندا ہیگا'' (جی وہ خاصا لمبا ہوتا ہے) مثلاً تین چار بجے تک وقت ہی وقت ہوتا ہے صاحب! کافی وقت ہوتا ہے' وہ عشاء کا تو پوچھو ہی نہیں۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103) یہ نہیں کہ بڑا لمبا وقت ہوتا ہے' یہ تو ایک فریضہ ہے' کتاب کے معنی فریضہ ہوتا ہے' Appointed Time (مقررہ وقت) پر اس کو تو پورا کرنا ہے' اس کے لیے وقت متعین ہے۔یہ اجتماع ہے' اس میں آپ نے شریک ہونا ہے' اس کے اندر مشاورت کرنی ہے۔اب اگر آپ نے یہ کہہ دیا کہ ''جی کوئی گل نئیں' ظہر توں عصر اچ کوئی دو تین گھنٹے دا وقت ہوندا ہیگا اے' جدوں مرضی چلیا جاواں گا۔ٹھیک ہے' ولیمے دی دعوت اچ تے لکھیا ہویا ہونداا ے' ایس واسطے لکھیا اے' کوئی وقت تے اوندا ای نئیں ❶''۔ ابھی بھی ان کفار کے ہاں (مغرب میں) یہ صورت ہے کہ انہوں نے جو لنچ کا ٹائم مقرر کیا ہوا ہے' اس سے پندرہ منٹ بعد اگر باپ بھی آجائے گا' تو فاقے سے رہے گا۔قرآنِ کریم نے کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103) کہا ہے۔اور یہی مؤقت آپ کے ہاں فریضہ ہوتا ہے کہ ایک منٹ پر وہاں پہنچنا ہے' جو اس کے لیے ٹائم مقرر ہے' تو آپ کو اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔اور اب تو ہمیں عادت یہ پڑی ہوئی ہے کہ جب بھی کسی سے وقت مقرر کیا جائے ''کنے وجے آئیں گا؟ چار وجے' اوہنوں پچھدے نیں کہ پاکستانی ٹائم؟ اوہدے معنی ہوندے ہیگے نیں کہ چار توں چھ وجے تیکر جس طراں ظہر دا ویلا ایسے طراں تہاڈے وعدیاں دا ویلا[1]''۔یہاں قرآنِ کریم نے کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4:103) کہا ہے۔قرآن مجید کی رو سے ٹائم کی کیفیت یہ ہے۔اگر تمہیں اس کی ہی عادت ہو جائے تو اس سے آپ دیکھیے گا کہ وقت کی اہمیت بھی ہو جائے گی اور جو آپ کسی سے ٹائم پہ پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں اس کی بھی اہمیت آپ کے ہاں ہو جائے گی۔یہاں بات تو اس صلوٰۃ کی ہو رہی ہے۔آپ دیکھیے تو سہی کہ زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا اطلاق ہو رہا ہے۔کہا یہ ہے کہ جب تم اسی طرح صلوٰۃ کر چکو تو یہ نہ سمجھ لو کہ تم فریضہ زندگی سے سبکدوش ہو گئے۔صلوٰۃ تو تمہاری ساری زندگی کو محیط ہے۔جو کچھ تم نے اس وقت کیا ہے وہ مؤقت اجتماع میں شرکت ہے جو کلّی صلوٰۃ کا ایک جزو ہے اس لیے تم اس کے بعد بھی اٹھتے بیٹھتے لیٹے ہر وقت اور ہر حال میں قانونِ خداوندی کو اپنے ساتھ رکھو۔

اس میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔پہلا یہ کہ ''ذکر اللہ'' نماز تک محدود نہیں ہے یہ مومن کی ساری زندگی کو محیط ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہ ذکر نہیں جس سے قلب پر ''ضربیں'' لگائی جاتی ہیں۔اس سے مراد زندگی کے ہر گوشے میں' ہر معاملے میں'

---

❶ جی! کوئی بات نہیں! ظہر اور عصر کے درمیان کوئی دو تین گھنٹے کا وقت ہوتا ہے۔جب مرضی ہوگی چلے جائیں گے۔ٹھیک ہے ولیمے کی دعوت میں بھی تو لکھا ہوتا ہے کوئی وقت پہ آتا ہی نہیں ہے۔

قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا ہے' اس میں وقت کی یہ اہمیت ہے۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ النسآء کی آیت 103 تک آئے' 104 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

---

❶ کتنے بجے آؤ گے؟ کہ جی! چار بجے۔ اس وقت اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آیا یہ پاکستانی وقت ہے؟ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ چار سے چھ بجے تک' جس طرح یہ وقتِ ظہر ہے اسی طرح آپ کا یہ وقتِ وعدہ ہے۔

# تیئسواں باب: سورۃ النسآء (آیات 104 تا 115)

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۱۰۴ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ
خَصِيْمًا ۱۰۵ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۰۶ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ
خَوَّانًا اَثِيْمًا ۱۰۷ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۱۰۸ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ
عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۱۰۹ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۱۰ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا
يَكْسِبُهٗ عَلٰي نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۱۱۱ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا
مُّبِيْنًا ۱۱۲ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْھُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ
مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۱۱۳ لَا خَيْرَ فِيْ
كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۱۱۴ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا
تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵

عزیزانِ من! آج دسمبر 1970ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 104 سے ہو رہا ہے: (4:104)۔

گزشتہ دو اتواریں مسلسل درس کے ناغہ میں گزریں۔ 29 نومبر کو جشنِ نزولِ قرآن کے سلسلہ میں خصوصی درس تھا اور 6 دسمبر کی اتوار کو الیکشن کے عواقب کے سلسلہ میں ناغہ رہا۔ اس لیے تجدید یادداشت کے طور پر عرض کر دوں کہ سابقہ آیات میں موضوع جنگ کے اصول و معانی اور قواعد و ضوابط کا تھا۔ آج بھی یہ پہلی آیت اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے اور اس میں ایک بڑی اہم بات سامنے لائی گئی ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَاتَھِنُوْا فِی ابْتِغَآئِ الْقَوْمِ (4:104) اور دشمن کا پیچھا کرنے میں کمزوری مت دکھاؤ۔ اس کا سامنا کرنے میں تو یہ صورت تھی کہ ہمت سے کام لو لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا پیچھا کرنے میں بھی کمزوری مت دکھاؤ۔ اب اس کے بعد ہے کہ اِنْ تَکُوْنُوْا

**تَـأْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا** (4:104)۔ بڑی اہم چیز ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قرآنِ کریم بار بار اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ جہاں تک انسان کی طبعی زندگی کا تعلق ہے' اس کے لیے طبعی اسباب اور سامان اور ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض کسی کا نیک ہونا' اسے طبعی سامان اور ذرائع کی طرف سے غیر محتاج نہیں بنا سکتا' اس کی طرف سے مستغنی نہیں کرسکتا۔ یہ جو ہمارے ہاں روز کہا جاتا ہے کہ صاحب! ہم تو بڑی دیانتداری کی زندگی بسر کرتے ہیں' ایمانداری سے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود دیکھیے بڑا نقصان ہوتا ہے' کاروبار میں گھاٹا پڑ جاتا ہے' لوگ بددیانت ہیں' بددیانتی سے یہ کچھ کر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ طبعی زندگی سے متعلق ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے کہ غلط ذرائع سے کام لینا چاہیے لیکن یہ ضروری ہے کہ جتنی چیزیں آپ کی حفاظت کے لیے ضروری ہوں' تدابیر ضروری ہوں' جتنا عقل و فکر سے کام لینا ضروری ہو' ان تمام ذرائع کو استعمال کرنا چاہیے۔ محض اس بنا پر کہ ہم بڑے نیک ہیں' نیکوکار ہیں' خداترس ہیں' ایماندار ہیں اور اگر عقل و فکر سے کام نہیں لیتے' حفاظتی تدابیر اختیار نہیں کرتے' تو محض آپ کا نیک ہونا ان چیزوں سے آپ کو بچا نہیں سکے گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب چور آتا ہے تو جو گھر والے ہیں' وہ تو ظالم نہیں ہوتے' بددیانت نہیں ہوتے اور چور بہرحال ظالم ہوتا ہے' زیادتی کر رہا ہوتا ہے لیکن چور کے ہاتھوں یہ کیوں لٹ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس حفاظتی تدابیر نہیں ہوتیں۔ یہ جو چیز ہے' اس کو Advantageous Position (افادی حیثیت) میں رکھتی ہے کہ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہو کر آتا ہے اور گھر والے اپنی مدافعت کے سامان کی طرف سے بےخبر ہوتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ گھر والے تو ظالم نہیں ہیں' وہ تو مظلوم ہیں' مظلوم ظالم کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے کیونکہ ظالم کے مقابلے میں حفاظتی تدابیر نہیں کرتا۔

## خود کو ظالم کے ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے شمشیرِ خارہ شگاف کا ہونا نہایت ضروری ہے

قرآن کریم اسی لیے مومنین کو اتنی بڑی تاکید کرنے کے باوجود' یہ کہتا ہے کہ اپنی سرحدوں کو' اپنی فوجوں کے ذریعے سے مضبوط رکھو تاکہ تم اپنے اور خدا کے دشمن سے محفوظ رہ سکو۔ سرحدوں کا مضبوط رکھنا نہایت ضروری ہے۔ محض جماعتِ مومنین کا جو مومن ہونا ہے' وہ کافی نہیں ہے۔ اسی لیے خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے کتابیں نازل کیں اور ان کے ساتھ **وَ اَنْـزَلْنَا الْحَدِيْدَ** (57:25) ہم نے شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی۔ ان کتابوں کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف کی ضرورت ہے۔ دنیا میں ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے آپ کا پنجہ فولادی ہونا نہایت ضروری ہے۔

برادرانِ عزیز! میں کہہ رہا تھا کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے اس میں جب آپ کا مقابلہ دوسروں سے ہوگا تو محض اس لیے

کہ آپ حق پر ہیں' ان کی زد سے نہیں بچ سکیں گے' آپ کو بھی نقصان پہنچے گا۔ جنگِ احد ❶ کا واقعہ اسی لیے قرآنِ کریم نے تفصیل سے ہمارے سامنے مذکور کیا ہے کہ اس میں عام نیکوکار تو ایک طرف' صحابہؓ کی جماعت تھی' خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ موجود تھے۔ حفاظتی تدبیر میں ذرا سی کوتاہی سے اتنا جانی اور مالی نقصان ہوا' خود نبی اکرم ﷺ بھی اس میں زخمی ہوئے۔ اگر محض صداقت اور دیانت ہی کسی کی حفاظت کے لیے کافی ہو تو اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ سے زیادہ صداقت و امانت کا پتلا کون ہو سکتا تھا' طبعی تیر کے ہاتھوں سے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس کا بچاؤ تو ڈھال سے ہو سکتا تھا' حسنِ تدبیر سے ہو سکتا تھا۔ اس اعتبار سے اگر کہیں دوسروں کے ہاتھوں سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز کہ صاحب! ہم تو حق اور انصاف پر تھے' یہ نقصان ہمیں کیوں پہنچ گیا۔ ہمارے ہاں روز یہ باتیں ہوتی ہیں اور پھر ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چاہیے تھا کہ ہماری مدد کرتا' ہم تو حق اور انصاف پر تھے اور اس کے باوجود پٹ گئے۔ یہاں یہی چیز قرآن کریم نے کہی ہے۔

عزیزانِ من! عجیب موازنہ ہے' اور یہ بڑی بات ہے اور قرآن کریم کی کونسی بات ہے جو بڑی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا تَاۡلَمُوۡنَ (4:104) ٹھیک ہے اگر تمہیں نقصان پہنچا ہے' انہیں بھی نقصان پہنچا تھا' انہیں نقصان پہنچا ہے' تمہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو میدانِ جنگ ہے۔ یہاں تو قوت' ہمت' اسلحہ' تدبیر کام آئیں گی۔ جہاں کہیں کوتاہی ہو گی' اس کا نقصان پہنچے گا' تمہیں بھی پہنچے گا' اگر ان کی طرف سے ایسا ہوا تو انہیں بھی نقصان پہنچے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں قرآن حکیم دونوں کو ایک سطح پہ لا رہا ہے' مومن اور کافر کو ایک سطح پہ رکھ رہا ہے۔ ہل اگر سوندھا سنگھ چلا رہا ہو تو' اور عبدالرحمٰن چلا رہا ہو تو' دونوں کی نوک (پھالا) ایک ہی طرح جاتی ہے۔ اس نے اگر زمین کے ہموار کرنے میں' زمین کو فصل کے لیے موزوں بنانے میں کمزوری دکھائی ہے تو اس کی فصل کم ہو جائے گی' اُس نے اگر اس میں زیادہ محنت کی ہے' فصل زیادہ ہو جائے گی۔ طبعی اسباب کے اندر یہ فرق نہیں ہے۔ کہا ہے کہ تمہیں نقصان پہنچا ہے' انہیں بھی نقصان پہنچے گا' انہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے' تمہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہاں تک تو تم دونوں ایک سطح پہ ہو۔

## مردِ مومن اور کافر کے نصب العین میں فرق کی نوعیت

برادرانِ عزیز! اور اب آگے آئی بات کفر اور ایمان کی' صداقت اور بددیانتی کی۔ کہا ہے کہ وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ (4:104) لیکن حق پر ہوتے ہوئے تم جو خدا سے توقعات رکھتے ہو یہ توقعات وہ نہیں رکھتے۔ یہاں آ کر فرق پڑ گیا۔ سوال یہی ہے کہ

---

❶ 14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء

اگر بلند نصب العین' جس کے لیے تم میدانِ جنگ میں نکلے ہو' وہ تمہارا اپنی ذات کی نشو ونما کا بلند ترین مقصد ہے جس کی خاطر یہ ساری قربانیاں تم کر رہے ہو' تو یہ وہ مقصد ہے' یہ وہ نصب العین ہے جو ان کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے یہاں پہنچنے میں تمہاری پوزیشن Advantageous (افادی) ہو جائے گی' طبعی نقصانات تو تمہیں ہونگے' شکست بھی کھا سکتے ہو' زخمی بھی ہو سکتے ہو' یہ سب کچھ ہوسکتا ہے' اس میں جسے برابر سرابر کہتے ہیں یہ ہوسکتے ہو لیکن یہ جو نصب العین کی بنا پر تمہارا مقام ہے' یہ مقام انہیں حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہاں پہنچنے پر تم ان سے آگے جاؤ گے۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو نقصان اٹھانے پر بھی ایک مومن کو مایوس نہیں ہونے دیتی کہ نقصان طبعی طور پر ہوا ہے' طبعی نقصان کو پورا کرنے کے لیے اس کو کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا کہ کہاں نقص واقع ہوگیا' کہاں کمزوری پیدا ہوگئی لیکن اس سے وہ بددل اور مایوس نہیں ہوگا اس لیے کہ وہ بلند نصب العین' جس کے لیے وہ یہ کچھ کر رہا تھا تو اسی طرح سے وہ اس کے سامنے ہے۔ وہ جو اس سے اس کو اپنی ذات کا فائدہ پہنچا ہے' اسے تو کوئی دوسرا اس سے چھین نہیں سکتا۔

## صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاویدانہ

میدان جنگ میں کسی تدبیری کمزوری یا سامان کی کمی کی وجہ سے بھی اگر نقصان پہنچا ہے تو وہ فائدہ جو اس کو اپنی ذات سے پہنچا ہے' اس کا تو نقصان نہیں ہوا ہے۔ قرآن کے الفاظ کیا ہیں! وہ توقعات جو تم نے خدا سے باندھ رکھی تھیں' وہ تو پوری ہو رہی ہیں اس لیے تمہارا مقام ان سے آگے ہے۔ شکست کھانے کے باوجود تم مایوس نہ ہو جاؤ' ہمت نہ ہارو' جہاں کہیں تدبیر کی' سامان کی کمی واقع ہوئی ہے اس کو پورا کرو اور یہ جو تمہیں صلہ مل رہا ہے' یہ صلہ ایسا ہے جو اس شکست کے باوجود تمہیں ملے گا۔ اس نے [1] کہا ہے کہ صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاویدانہ۔ یہ حیاتِ جاوید جو اس کو مل رہی ہے' یہ اُس کے حصے میں نہیں آ رہی ہے۔ فوج کو شکست کے باوجود شہید' وہ شہید ہے۔ قرآن کریم نے تو یہ کہا ہے کہ اس راستے میں میدانِ جنگ میں شہادت تو ایک طرف' اگر راستے میں موت آ جائے تو بھی تم شہید ہو۔ نصب العین کی بلندی' یہ ہے صداقت' یہ ہے امانت' یہ ہے وہ مومن کا مقام جو وہ دوسروں سے آگے لے جاتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:104) حَكِيْمًا تو یہ ہے کہ جہاں تک حکمت کا تعلق ہے' تدابیر کا تعلق ہے' وہ بھی تمہیں کرنی چاہئیں۔ اور یہ جو دوسری چیز ہم نے کہی ہے' اس کا وہ علم رکھتا ہے جس سے تم نے توقعات باندھی تھیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ اس کی بے خبری رہے اور یہ ہو کہ صاحب! یہاں بھی نقصان ہوگیا' پتہ نہیں! اس کو بھی پتہ ہے یا نہیں کہ اس کی خاطر ہم کیا کر رہے ہیں۔ کیا انداز ہے بات کہنے کا! اس کی خاطر جو تم کر رہے ہو تو اسے ایک ایک چیز کا پتہ ہے اس لیے گھبراؤ نہیں' وہ مل کر رہے گا جو اس نے تم سے کہا ہوا ہے۔ اور یہ

---

[1] یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

جو تمہاری Advantageous (افادی) پوزیشن ہوئی ہے' یہ کس بنا پہ ہوئی ہے؟ اس بنا پہ کہ اِنَّـآ اَنۡـزَلۡـنَـآ اِلَيۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ (4:105) تمہاری طرف یہ کتاب نازل ہوئی ہے' تمہیں ایک ضابطۂ حیات دیا گیا ہے' جو زندگی کے ہر گوشے میں تمہاری راہنمائی کرے گا۔ اے رسول! یہ تمہیں اس لیے دیا گیا ہے کہ لِتَـحۡـکُـمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮکَ اللّٰهُ (4:105) تا کہ تم اس علم کی بنا پر جو خدا نے تمہیں دیا ہے' لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو۔

## جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں

عزیزانِ من! جیسا کہ بار بار آپ کے سامنے آ گیا ہے کہ قرآنِ کریم نے کافر اور مومن میں خطِ امتیاز یہ کہہ کر کھینچا ہے کہ مَـنۡ لَّـمۡ يَـحۡـكُـمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ بہت بحثیں چلتی ہیں' بہت شور اٹھتا ہے کہ اسلامی نظام کیا ہوگا' اسلامی مملکت کسے کہیں گے اور اب تو آئین سازی کا مرحلہ سامنے آ رہا ہے کہ اسلامی آئین کے بنیادی خطوط کیا ہونگے؟ ارے خطوط کیا' وہاں تو ایک ہی بنیادی خط ہے اور وہی قرآن کریم کی رو سے خطِ امتیاز ہے۔''اگر بِـمَـآ اَنۡـزَلَ اللّٰهُ کے مطابق ضابطۂ آئین ہے تو اسلامی ہے' اگر یہ اس کے مطابق نہیں ہے تو کافر بنے ہوئے ہیں''۔ اس نے ایک فقرے میں' ایک آیت میں' بات صاف کر دی ہے۔ اور یہاں بھی یہی کہا ہے کہ اِنَّـآ اَنۡـزَلۡـنَـآ اِلَيۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮکَ اللّٰهُ (4:105) حق کے ساتھ' صداقت کے ساتھ' کتاب نازل کی تا کہ تم اس کے علم کے مطابق' جو خدا نے تمہیں دیا ہے' لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو۔

## لفظ خَصِيۡمًا کا مفہوم جھگڑنا نہیں بلکہ طرفداری کرنا ہے

اس سے آگے ہے کہ وَ لَا تَـكُـنۡ لِّلۡـخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا (4:105)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے ان کے Cause (مدّعا) کی Plead (وکالت) کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ یہاں لفظ خَـصِـيۡـمًا آیا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ جھگڑنا کیا جاتا ہے۔ یہ جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔ کسی کے Cause (مقصد) کی' کسی کے مقدمے کی' کسی کے نکتۂ نظر کی طرفداری کرنا' اس کی طرف سے اس مقدمے کو جا کر لڑنا۔ یہ ہے خَـصِـيۡـمًا۔ اس میں ایک تو یہ کہا کہ تم خیانت نہیں کرو اور دوسری چیز یہ ہے کہ جو خائن ہے' اس کی طرفداری مت کرو' اس کی تائید مت کرو' اس کے حق میں مت بولو' اس کی بات کو Plead (وکالت) نہ کرو' اس کے Cause (مدّعا) کی Plead (وکالت) نہ کرو ''اور ایسا کبھی نہ کرو کہ دغا باز اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو''۔ یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔

## موجودہ نظامِ عدالت میں شعبہ وکالت کے کردار کی کیفیت

یہ جو ہمارے ہاں' اس نظام عدالت میں وکالت کا شعبہ ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ کہاں جا کر اس کی زد پڑ رہی ہے۔آج کا جو وکیل ہے' وہ تو یہ بات نہیں کہ مقدمہ اس کے سامنے آئے' تو پہلے وہ یہ دیکھ لے کہ صاحب! یہ خائن ہے یا امین ہے۔اگر میرا مؤکل خائن ہے تو وہ کہہ دے کہ میں تمہارا مقدمہ نہیں لے سکتا۔یہ تو بات نہیں ہوتی بلکہ جو خائن ہوتا ہے اس سے تو زیادہ چارج کیا جاتا ہے کہ تمہارا مقدمہ کمزور ہے' بڑی محنت کرنا پڑے گی۔اور کوئی بھی فریقین میں سے ایسا نہیں ہوتا جسے آپ کے ہاں وکیل نہ ملے۔جتنا زیادہ اس کا کیس کمزور ہوتا ہے' وہ اتنا ہی بڑا وکیل کرتا ہے۔فریقین میں سے بہرحال ایک امین ہوگا' دوسرا خائن ہوگا۔اور اگر آپ کے نظامِ عدالت میں یا وکالت کرنے والوں میں یہ چیز ہو کہ وَ لَا تَـكُنۡ لِّلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا (4:105) تو جس کے متعلق اس کو معلوم ہو جائے اور وکیل کو تو مقدمے کی نوعیت سے ہی دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حق پر نہیں ہے' معلوم ہو جائے کہ یہ خائن ہے تو پھر اس کا کیس وہ نہیں لے۔

## اسلامی نظامِ عدل کی نوعیت جہاں حکومت کی طرف سے قانون دان ہوتے تھے

یہی وجہ تھی کہ جب اسلامی نظام تھا تو اس زمانے میں یہ وکالت نہیں ہوتی تھی' اس زمانے میں صرف مفتی ہوتے تھے' آج کل والے مفتی نہیں ''ایہدے معنی تے مفت دیاں کھان والے ہوندے نیں'' (اس کے معنی تو مفت کی کھانے والے ہوتے ہیں)۔خود نظام حکومت کی طرف سے قانون دان لوگ ہوتے تھے اور لوگ ان کے پاس آتے تھے' ان کی فیس نہیں ہوتی تھی۔انہیں آ کر بات بتا دیتے تھے کہ یہ ہے میرا کیس۔آپ بتا دیجیے کہ قانون کی رو سے یہ میرا حق بنتا ہے یا نہیں بنتا۔اب انہیں تو کوئی لالچ نہیں ہوتا تھا۔وہ بتا دیتے تھے کہ بھئی! قانوناً تمہارا حق نہیں بنتا تو وہ پھر اپنا حق چھوڑ کر گھر چلا جاتا تھا۔خائن کی طرف سے خَصِيۡمًا یعنی جھگڑنے والا Plead (وکالت) کرنے والا' وکالت کرنے والا' اس دور میں نہیں مل سکتا تھا۔آپ سوچیے کہ آپ کی مقدمہ بازی کے اندر ذرا سی اصلاح سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔خائن کی طرف سے Plead (وکالت) کرنے والا کوئی نہ ہو' خود خیانت تو ایک طرف رہی' خیانت کی تائید بھی نہ کرو۔

## خائن کا لفظ بڑا غور طلب لفظ ہے

یہ جو خائن کا لفظ ہے یہ بھی غور طلب ہے۔ہمارے ہاں تو اب خیانت کی ایک ہی شکل رہ گئی کہ کسی کے پاس کچھ روپیہ بطور امانت رکھا اور مانگنے پر اس نے نہ دیا یا کم دیا' اسے امانت میں خیانت کرنا کہتے ہیں لیکن نہ تو امانت کے یہ محدود معنی ہیں اور نہ اس کے خلاف خیانت کے۔یہ اس قدر سکڑے ہوئے معنی ہیں' یہ اس سے وسیع چیز ہے۔امانت کسی پر ایسا بھروسہ کرنا ہے کہ جس بھروسے کے بعد آپ امن اور

اطمینان میں ہو جائیں۔ایک شخص کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں! تم اس معاملے کے اندر چلو' جہاں تمہیں تکلیف پہنچے گی' میں تمہارا ساتھ دوں گا۔اب اس کے اس وعدے سے آپ امن اور اطمینان میں ہو گئے۔امانت کا مادہ امن (ام ن) ہے' جس سے آپ کو امن ہو' ادھر سے بے فکری ہوگئی ''جنوں اسی کینے آں'' (جسے ہم کہتے ہیں) کہ ہاں بھئی! اگر وقت تم پہ آ پڑے گا تو میں تمہاری مدد کرونگا' اس طریقے سے مدد کرونگا۔اب آپ امن میں ہو گئے' اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔میں چار بجے آؤں گا' کوئی بات نہیں' آپ کو امن ہو گیا ٹھیک ہو گیا۔یہ سب چیزیں امانت کہلاتی ہیں' ہر وہ چیز جو دوسرے کی طرف سے آپ کو اطمینان دلا دے' آپ بھروسہ کر لیں' اعتماد کر لیں اور پھر ادھر سے تو امن میں ہو گیا۔آگے آپ نے کیا دیکھا کہ صاحب! جہاں تک پیسے کا تعلق ہے' اس کے متعلق اب مجھے بے فکری ہوگئی' انہوں نے کہہ دیا ہے کہ جتنی بھی ضرورت ہوگی میں تمہیں دونگا' اب یہ امن ہو گیا۔آپ کا کوئی راز ہے' وہ کسی کے پاس چلا گیا' اُس نے کہا کوئی بات نہیں! میں تمہارے راز کا امین ہوں یعنی تمہیں اس کی طرف سے بے فکری ہونی چاہیے' پریشانی نہیں ہونی چاہیے' تم امن میں رہو' یہ راز افشا نہیں ہو گا۔آپ امن میں ہو گئے۔اور اگر اس بھروسے اور اس ایمان کو اس نے کسی طرح توڑ دیا تو یہ خیانت ہوئی۔

## عربوں کے ہاں خیانت کے مفہوم کو سمجھنے کی ایک عملی شکل

آپ کو تو معلوم ہے کہ عربوں کے ہاں یہ جو الفاظ تھے' ان کے معنی سمجھانے کے لیے وہ جس طرح سے لفظ کو استعمال کرتے تھے اس کی تصویر سامنے آ جاتی تھی کہ معنی کیا ہیں۔اب تو ہمارے ہاں یہ نل لگ گئے ہیں' کنویں ہیں ہی نہیں ورنہ کنوؤں کے اوپر چرخڑی ہوتی تھی' آپ یہ سوچیے کہ وہ چرخڑی تھی' نیچے وہ ڈول یا بوکا تھا' اب وہ پانی کا بھرا ہوا ڈول ہے' آپ اسے کھینچ رہے ہیں' بھاری ڈول بڑی محنت سے کھینچا جاتا ہے اور پھر اس چرخڑی کے اوپر پورا زور ہوتا ہے۔یہ جو ڈول اوپر آ رہا ہے' اس رسی کے اوپر بھروسہ کیے ہوئے چلا آ رہا ہے' عین درمیان میں آ کر یا اور ذرا اونچے آ کر جب آپ کو معلوم ہو کہ ڈول آ رہا ہے' اس وقت اُدھر سے آپ زور سے اس کو پکڑ کر ادھر کھینچ رہے ہوں اور درمیان میں سے وہ رسی ٹوٹ جائے۔آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد کیفیت کیا ہوتی ہے' آپ کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔عرب اس کو خیانت کہتے تھے۔میں کہتا ہوں کیا خیانت کی تشبیہ کا کچھ بھی شائبہ رہ جاتا ہے؟ کبھی اس رسی کو ٹوٹتے ہوئے دیکھیے کہ اس سے ہوتا کیا ہے' پانی کا ڈول ہی نہیں جاتا' میں نے جیسا کہا ہے کہ اکثر اوقات اسکی جان کا خطرہ ہوتا ہے' یہ اس زور سے پیچھے جاتا ہے کہ کھینچنے والا کنویں میں گر جاتا ہے۔اسے وہ کہتے تھے کہ رسی خیانت کر گئی۔''رسی پہ اتنا بھروسہ کہ وہ ڈول کو لیے ہوئے چلی آ رہی ہے' آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اوپر تک آ جائے گی اور عین جب کہ وہ قریب آ رہی ہو اس وقت وہ ٹوٹ جائے تو پھر جو آپ کے اطمینان کو اور

بھروسے کو دھچکا لگتا ہے' یہ خیانت کہلاتی ہے''۔

یہ صرف روپے کا معاملہ نہیں ہے' میرے بھائی! یہ روزمرہ کی باتیں جن کو ہم بڑا ہی Lightly (ہلکے پھلکے انداز سے) لیتے ہیں صاحب' ہاں جی' ہاں جی! ہو جائے گا' کوئی بات نہیں ''میں جے تیرے نال ہیگاں'' (میں جو تمہارے ساتھ ہوں) دونوں کو پتہ ہوتا ہے' اُسے پتہ ہوتا ہے کہ میں بھی یونہی جھُل دلا رہا ہوں' اُسے پتہ ہے چور ہے' یونہی باتیں کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی امانتیں کہیں باقی نہیں رہیں' امن آپ کو کہیں نہیں رہا' کسی پہ امن نہیں رہا' کسی کی بات پہ بھروسہ نہیں' کسی کی طرف سے اطمینان نہیں' پتہ نہیں یہ جو اتنا بڑا دوست بنا پھرتا ہے یہ کس وقت خنجر گھونپ دے۔ آپ کو کچھ اعتبار نہیں ہے کہ جو باہر اتنے آپ کے ووٹر آپ سے وعدہ کر گئے ہیں' وہ کس کے ڈبے میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسی لیے ہمارے ہاں معاشرے میں تو عام روش ہو گئی ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے' سب کچھ میں نے کر لیا ہے' وہ پیسے بھی دے دیئے ہیں' بھروسہ بھی پکا کر لیا ہے' Calculation (حساب کتاب) میں بھی یہ آ رہا ہے لیکن پھر پتہ نہیں کہ آخر میں نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ پھر کیوں پتہ نہیں ہے؟ کہ جی' اس لیے پتہ نہیں ہے ''ڈول دی رسی کس ویلے ٹٹ جاندی ہیگی اے'' (ڈول کی رسی کس وقت ٹوٹ جاتی ہے)۔

## خدا کی رسی ایک ایسی رسی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتی

عزیزانِ من! ایک رسی ایسی ہے جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ نہیں ٹوٹ سکتی۔ **وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا** (3:103) خدا کی رسی' ایک ایسی رسی ہے کہ ایک تو ایک طرف رہا' سارے کے سارے بھی اس کو پکڑ کر لٹک جاؤ گے' تو کبھی نہیں ٹوٹے گی صاحب! یہ ہے امانت۔ اس نے جو اپنے آپ کو **هُوَ الۡمُؤۡمِنُ** امن دینے والا کہا ہوا ہے' تو امن دینے والے کی مثال بھی اس نے **حَبۡلِ اللّٰهِ** کہہ کر دی ہے' خدا کی رسی ایک ایسی رسی ہے اس کو تھام لو گے تو **لَا انۡفِصَامَ لَهَا** (2:256) یہ ٹوٹے گی نہیں' یہ دغا نہیں دے جائے گی۔ یہ ہوتی ہے خیانت اور یہ ہوتی ہے امانت۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تَكُنۡ لِّلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا** (4:105) لہٰذا جو خیانت کر جانے والا ہو' اس کے Cause (مدّعا) کو کبھی Plead (وکالت) نہ کرو۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ خیانت کرنے والا کون ہوتا ہے۔ **وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ** (4:106) ہمیشہ ایسے لوگوں کی طرف سے خدا کی پناہ میں رہو' اس سے سامانِ حفاظت طلب کرتے رہو۔ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا** (4:106) خدا سامانِ حفاظت بھی دے گا' سامانِ نشوونما بھی دے گا' خائنین کی طرف سے بڑے چوکس اور چوکنے رہنے کی ضرورت ہے۔

## خدا پر ایمان کے بغیر بنیادی صداقتوں پر ایمان رکھنے کا نتیجہ

اب ایک قدم آگے آیئے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے اور ہماری نئی نسل جن بیچاروں کے ذہنوں میں یہ نہیں ہے کہ بنیادی صداقتوں پر ایمان اور ایمان کے معنی کیا ہوتے ہیں' وہ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! درمیان میں ایمان کہاں آتا ہے۔ اگر ایک شخص جھوٹ نہیں بولتا' چوری نہیں کرتا' فریب نہیں دیتا تو یہی ہیں جنہیں آپ اچھے اعمال کہتے ہیں۔ اور پھر جو آپ کہتے ہیں کہ اس کا خدا کی ذات پر' آخرت پر' ایمان ہونا چاہیے اگر یہ نہ ہو اور وہ یہ چیزیں کرے تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے' انہیں تو ایمان اتنا ہی سمجھایا گیا کہ جب کوئی غیر مسلم اسلام لاتا ہے تو مولوی صاحب اس کے سامنے عربی کے چار فقرے اپنے منہ سے بولتے جاتے ہیں' اور اسے کہتے ہیں کہ انہیں دہراتے چلے جاؤ' اگر غلطی کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں' ابھی پہلی بار ہے۔ نہ انہیں پتہ ہے کہ میں کیا کہلوا رہا ہوں' نہ اُسے پتہ ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے یہ پورے کیے تو کہا کہ مبارک ہو جی! الحمدللہ اسلام لے آیا' مشرف بہ اسلام ہو گیا' ان کے دست حق پرست پر اس نے بیعت کر لی۔ انہیں معلوم نہیں کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ ایک شخص دیکھتا ہے کہ ذرا سے جھوٹ بولنے سے مجھے یہ دس ہزار روپیہ مل جائے گا' کوئی Detect (شناخت) نہیں کرے گا' اس چیز کو پولیس نہیں پکڑ سکے گی' یہ کسی کے علم میں نہیں آئے گا تو وہ فوراً لے لیگا۔

## خدا پر ایمان کا مفہوم کیا ہے اور پھر یہ کیوں ضروری ہے؟

سوال یہ ہے کہ اس سے پوچھا جائے کہ تم ایسا کیوں نہیں کرو گے۔ زیادہ سے زیادہ جو لوگ کہہ سکے ہیں وہ یہی ہے کہ صاحب! اگر یہ عام روش ہو جائے تو پھر کسی کا کچھ محفوظ نہیں رہے گا یعنی سوسائٹی کا ایک نظام ہے جس کی وجہ سے یہ ہے کہ میں کسی کو دھوکا اس لیے نہیں دیتا کہ اس طرح سے لوگ مجھے دھوکا دینے لگ جائیں گے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ اگر انسان ایسا انتظام کر لے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تو پھر جو جی میں آئے یہ کرے۔ یہ جو بڑے بڑے چوہدری' گاؤں کے سردار اور وڈیرے' اتنے مظالم کرتے ہیں' ایسا وہ کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے اس کا انتظام کر رکھا ہوتا ہے کہ مقابل میں کوئی شخص ان کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ غریبوں اور کمزوروں اور شریفوں کی لڑکیوں کو اغوا کرلو' انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہماری بیٹی کو کوئی اغوا نہیں کر سکتا۔ ان کے ڈھور ڈنگر جانور جو ہیں' ان کو نکلوا دو' ان کو یقین ہوتا ہے کہ ہمارا یہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جس سے مخالفت ہو' چار آدمی بھیجے اور ان کو مروا دیا' انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہمارے آدمی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یعنی جو اس چیز کا اطمینان کر لے' انتظام کر لے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا' پھر وہ بے باک ہو جاتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ میں اس لیے نہیں فریب دیتا کہ دوسرا مجھے فریب نہ دے' بڑی ہی کمزور دلیل ہے۔ یہ تو پھر Battle of

Wits (جنگِ عقول) ہے' جنگ میں جو زیادہ چالاک ہوتا ہے دوسرے کو فریب دے جاتا ہے' جو فریب نہیں دے سکتا ''عصمت بی بی از بیچارگی'' وہ شریف اس لیے ہوتا ہے کہ بدمعاش بننے کے لیے بہت بڑی چالاکی کی ضرورت ہے' بہت بڑے انتظام کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں کیوں نہیں کرتا؟ اس کیوں کا جواب صرف ایمان دے سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں' اس مقام پر قرآن کریم آیا ہے' اس ''کیوں'' کا جواب دیا ہے اور اسے کہیں گے ایمان۔ کہا ہے کہ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (4:107) اس بات کو بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایک دوسرے سے یا خود اپنی ذات سے خیانت کرتے ہیں' ان کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہو' ان کی طرفداری کرنے کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہو۔

## اپنی ذات سے' اپنے آپ سے' خیانت کرنا جرم ہے مگر یہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں آتا

یہاں پہلے خیانت کا ذکر آیا تھا اور ہمارے ذہن میں یہی چیز تھی کہ میں کسی دوسرے کی خیانت کر رہا ہوں۔ ہمیشہ دو فریق ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ کسی دوسرے کو دھوکا دینا' کسی دوسرے کے اعتبار کو ٹھیس پہنچانا یعنی کسی دوسرے کی خیانت کر دینا ہے۔ یہاں کہتا ہے کہ یاد رکھو! جو لوگ اپنی ذات سے خیانت کرتے ہیں' ان کے معاملے میں Plead (وکالت) نہ کرو۔ ارے! یہ اپنے آپ سے خیانت کیا ہوا؟ یہ بڑی چیز ہے صاحب! کہ اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں۔ یہ خیانت کیا ہوتی ہے؟ ٹھیک ہے' جی چوری کرنا بری بات ہے' نہیں کرنی چاہیے۔ کسی کے ہاں جا کر آپ بیٹھے ہیں' کوئی چیز سامنے پڑی ہے' جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے آنکھ بچا کر اس کو جیب میں ڈال لوں' بیٹھے ہوئے یہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ اور اتفاق ایسا ہے' آپ کی بدقسمتی ہے کہ وہ اٹھتا ہی نہیں ہے' اس کی آنکھ اس کے اوپر لگی رہتی ہے' بہتیرا آپ اپنی گفتگو کو لمبا کرتے ہیں' کام بنتا ہی نہیں ہے' آپ اٹھ کر چلے آتے ہیں۔ دنیا کے کسی قانون کی رو سے آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ تم نے اپنے ساتھ خیانت کی ہے۔ یہ دنیا کا' دنیا کے نظام عدل کا' دنیا کے نظام معاشرت کا' کونسا قانون ہے جو اسے جرم قرار دیدے' جو اسے خیانت قرار دیدے؟ آپ نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ آپ کی Intention (نیّت) آپ کا ارادہ' جب تک عمل میں نہیں آتا' وہ قانون کی زد میں نہیں آتا۔ بیٹھے ہوئے اپنے دل میں آپ لاکھ کرتے رہیے کہ میں اس شخص کو مار دونگا' کبھی میرے قابو میں آ جائے' اتفاق ہے کہ آپ کے قابو میں نہیں آتا۔ یہ جرم نہیں ہے۔ اگر آپ کی بد دیانتیاں' آپ کے فریب' معاشرے کے علم میں نہیں آتے' آپ سوسائٹی میں معتبر بنے رہتے ہیں' یہ بات سوسائٹی کی اقدار کے خلاف نہیں جاتی۔

## سب سے پہلے انسان اپنی ذات کے ساتھ خیانت کرتا ہے

برادرانِ عزیز! اب یہاں اگلی بات شروع ہوتی ہے کہ نہیں! بات تو کہنے کے لیے یوں ہوتی ہے کہ صاحب! خدا تو ایسے وقت میں دیکھتا ہے' یہ سمجھانے کی بات یہی ہے۔اصل چیز کیا ہے؟ اصل چیز وہ ہے جہاں سے بات شروع ہوئی تھی کہ یہ بات صرف طبعی سامان تک نہیں ہے' اس کے علاوہ تمہارے اندر ایک اور شے ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں حقیقی نفع اور نقصان تو اس کا ہے۔یہ چیزیں' تمہارے ارادے' جو اس قسم کے ہیں' ان کی خیانتیں جو ہیں' یہ دنیا کے قانون کی زد میں تو نہیں آتیں' وہاں سے آپ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا' نہ پولیس' نہ عدالت' نہ معاشرہ لیکن اس سے تمہاری اپنی ذات کو ایک نقصان پہنچ رہا ہے اور اس کے لیے نہ کسی پولیس' نہ عدالت' نہ معاشرے کی ضرورت ہے' وہ نقصان تو خیالات سے پہنچ جاتا ہے' ارادوں سے پہنچ جاتا ہے۔اسے کہتے ہیں اپنے ساتھ خیانت کرنا' جسے خودفریبی کہا جاتا ہے۔یہ مقام کہ جہاں ارادے تک کے اوپر گرفت ہو جائے' وہ مقام ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ایمان یہ نہیں ہے کہ عمل میں کوئی چیز خلاف قانون آئے گی تو اس پہ گرفت ہوگی' ایمان یہ ہے کہ ''اگر اس کا ارادہ تک بھی ہوگا تو اس کی بھی مجھے سزا بھگتنی پڑے گی''۔اسے یوں کہہ لیجیے کہ یہ ایمان ہے۔

یہ خیانت کا لفظ آپ کے سامنے آیا تھا' جتنے بھی معاشرے میں قانون کے معیار ہیں ان میں خیانت وہی ہوگی کہ جو دوسرے کی کسی چیز میں آپ نے خیانت کی لیکن اپنے خلاف جو خیانت ہے اس کا سوال نہیں آتا۔اور یہاں ایمان یہ کہتا ہے کہ یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ (40:19) وہ اس قسم کا محاسب ہے جو نگاہ کی خیانتوں کو جانتا ہے' دل کے ارادوں سے واقف ہے۔سوچیے آپ! یہ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ کا! دیکھیے! یہاں لفظ خآئنۃ آ گیا ہے' نگاہ کی خیانت' دل کے چھپے ہوئے ارادے۔عزیزانِ من! یہ ہے وہ مقام جہاں ایمان کی ضرورت ہے۔

## ہزاروں انتظامات کے باوجود دنیا بھر میں بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام میں ناکامی کی وجہ جواز

آج ساری دنیا میں پولیس کے' Detections (شناخت) کے' عدالت کے' اس قسم کے نظام ہیں' کہا جاتا ہے کہ یہ Perfection (اکملیت) پہ پہنچائے ہوئے ہیں' Protection (حفاظت) نہ بھی ہو' اتنے وسیع ہیں کہ اس سے پیشتر کبھی تصور میں نہیں آ سکتا تھا۔آپ کے ہاں اس (وقت کے) West Pakistan (مغربی پاکستان) کے اندر پینتالیس ہزار پولیس کے سپاہی [1] پھرتے ہیں اور یہ وردی والے ہوتے ہیں' اس کے علاوہ جو دوسرے ہوتے ہیں' ان کا پوچھیے نہیں۔اور ساری دنیا میں پوچھو نہیں صاحب! کتنا انتظام ہوتا ہے۔اس کے باوجود جرائم ہیں کہ روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں' رکتے ہی نہیں ہیں۔یہ کیا چیز ہے؟ زندگی

کے متعلق ایمان یہ ہے کہ بس یہ طبعی زندگی ہے' کھایا پیا مر گئے' معاملہ ختم ہوا۔ جب کسی کا یہ ایمان ہو تو پھر یہ سوال نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو سوچ لے کہ مجھے یہ چیز نہیں کرنی چاہیے۔ سوچتا وہ یہ ہے کہ جو میرے فائدے کی چیز ہے اسے کر گزرنا چاہیے' بس اطمینان مجھے چاہیے کہ گرفت میں نہ آسکوں' گرفت میں آجاؤں تو عدالت میں چھوٹ جاؤں۔ اور جب ان چیزوں کی طرف سے وہ اطمینان کر لیتا ہے' پھر کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو اس کو جرم کی طرف سے روک دے۔ جرائم اس لیے بڑھتے چلے جا رہے ہیں' بارہ کروڑ [1] کے اندر یہ پینتالیس ہزار پولیس کیا کرے گی۔

## قانونِ مکافاتِ عمل کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا

ایک ہی چیز ہے کہ جس سے امن رہ سکتا ہے اور وہ حَبْلِ اللّٰہِ ہے۔ یہ ایمان ہے کہ **يَعْلَمُ خَـآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ** (40:19) (40:19) وہ نگاہ کی خیانتوں کو جانتا ہے' دل میں چھپے ہوئے ارادوں پہ بھی اس کا محاصرہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے لیے نہ کسی پولیس مین کی ضرورت ہے' نہ کسی Detective (شناخت کرنے والے) کی ضرورت ہے' نہ عدالت میں کسی دوسرے شاہد کی اور گواہ کی ضرورت ہے' نہ کسی مدعی یا مستغیث کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اس نے کہا ہے کہ اس مجرم سے کہا جائے گا جب وہ اس کی عدالت میں حاضر ہوگا' یہ سمجھانے کی بات ہے کہ جو ہمارے ہاں کا نظام ہے اسی ٹرم (اصطلاح) میں قرآن کریم بات سمجھاتا ہے' وہاں کوئی عدالت یا اس میں جا کر کھڑے ہونے والی بات نہیں' کہا کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی تو یہ صورت ہے کہ وہ مجرم کہیں جا کر کہے کہ صاحب! کون ہے مستغیث' کس نے میرے خلاف دعویٰ کیا ہے' شہادت کیا ہے یا پولیس والا کون ہے جس نے مجھے دیکھا تھا؟ کہا جائے گا کہ **اِقْـرَاْ كِتٰبَكَ** (17:14) یہ فردِ جرم تمہارے پاس ہے' تمہارے ہاتھ میں ہم نے دے دی ہے' کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا' خود اس کو پڑھو۔ کر لیا جی۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ اب نہ کسی گواہ کی ضرورت' نہ کسی مدعی کی حاجت۔ **كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا** (17:14) آج تُو خود اپنے خلاف گواہیاں دے گا اور اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دے گا۔ **كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا** (17:14) تیرے خلاف خود تیری اپنی ذات حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

## دنیا بھر سے جرائم کو مٹانے کا ایک طریق۔۔۔ کہ انسان اپنی ذات سے خیانت نہ کرے

عزیزانِ من! یہاں پڑتی ہے ایمان کی ضرورت۔ اس کے بغیر کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ آپ دنیا سے جرائم کو مٹا سکیں اور خیانتوں

---

[1] یاد رہے کہ یہ تعداد ستمبر 1970ء کی 13 تاریخ تک کی ہے۔ اب یہ نفری اور آبادی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ آج اکیلے صوبہ سندھ کی پولیس نفری 82,769 ہے اور کُل آبادی کا تخمینہ 18 کروڑ ہے۔

سے محفوظ رہ سکیں۔ کہا ہے کہ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ (4:107) دوسروں کی خیانت کرنے والے تو ایک طرف' وہ اپنی ذات سے خیانت کرتے ہیں' کہا ہے کہ ان کے Cause (مدّعا) کی بھی Plead (وکالت) نہ کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا (4:107) نگاہِ خداوندی میں اس قسم کے خیانت کرنے والے کیسے پسندیدہ قرار پا سکتے ہیں؟

## اپنی ذات سے خیانت کا نتیجہ اپنی ذات میں اضمحلال پیدا کرنا ہے

اب وہاں تو صرف خائن کہا تھا' یہاں خَوَّانًا کہا ہے۔ یہ مبالغے کا صیغہ ہوتا ہے' جسے ہم بہت زیادہ کہتے ہیں۔ کیا بات ہوئی؟ خائن تو وہ تھا جس نے دوسرے کی خیانت کی ہے لیکن جو اپنے آپ سے خیانت کرتا ہے' وہ خائن نہیں ہوتا وہ خَوَّانًا ہوتا ہے۔ اس سے ہوتا کیا ہے؟ یہ ہوتا ہے اَثِیْمًا۔ ہمارے ہاں تو سب ترجموں میں گناہ ہی اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں تو اس قسم کے بہت الفاظ آئے ہیں جس کا ترجمہ ہر جگہ گناہ کر جاتے ہیں۔ ہر مقام پہ اس لفظ کی خاص Significance (اہمیت) ہوتی ہے جو وہ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ چیز وہ ہے جس سے دوسرے نے خیانت کیا' کچھ مال تم نے لے لیا' اپنے آپ سے خیانت کی تو بظاہر نظر آ گیا کہ کچھ بگڑا تو ہے نہیں لیکن اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو! نگاہ کی خیانتیں' دل کے مخفی ارادے' بظاہر تمہیں کوئی طبعی نقصان تو نہیں پہنچا سکتے مگر اس سے تمہاری ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اَثِیْمٌ کے معنی ہوتا ہے ''اضمحلال پیدا ہو جانا' افسردگی پیدا ہو جانا' تکان پیدا ہو جانا''۔ عرب ناقة الأثمة اس اونٹنی کو کہتے تھے جو چلتے چلتے تھک جائے اور باقی قطار کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے' اس سے پیچھے رہ جائے' تھکی ہوئی اونٹنی جو ساتھیوں کے ساتھ نہ چل سکے' وہ قوم جو مصافِ زندگی میں دیگر اقوامِ عالم کے ہمدوش نہ رہ سکے۔ کہا ہے کہ جو شخص اپنے آپ سے فریب کرتا ہے' اپنی خیانت کرتا ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا' درحقیقت وہ شے جو حقیقتاً اس کی ذات ہے' اس کی انسانیت ہے' اس کا شرف ہے' اس میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے' وہ تھک جاتی ہے' اس میں افسردگی آ جاتی ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔

## ذاتِ خداوندی تو بڑی خبیر اور بصیر واقع ہوئی ہے

کہا ہے کہ یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ (4:108) یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم اپنے جرائم لوگوں سے چھپا سکتے ہیں اس لیے ہم پر کیا گرفت ہوگی؟ لیکن یہ خدا کے قانون کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ جرائم کی روک تھام یہ ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' یہ لوگ جو Detective (سراغ رساں) ہیں ان کی نگاہوں سے تو یہ چھپ سکتے ہیں کہ پولیس والے کی نظر نہ پڑ جائے' محلے والوں میں سے کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو جائے' بس اگر اطمینان ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ کہا ہے کہ ان سے تو یہ لوگ چھپ سکتے ہیں مگر وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ (4:108) اللہ کی نگاہ سے چھپ کر کہاں چلے جائیں گے وَ ھُوَ مَعَھُمْ اِذْ

يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ (4:108) جب یہ تنہائیوں میں بیٹھ کر تمہارے اس نصب العین' مشن کے خلاف چپکے چپکے باہمی مشورے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کوئی غیر تو اس وقت نہیں بیٹھا ہوا' نہیں! سارے آدمی قابلِ اعتماد ہیں' دروازہ لگادو ذرا' کنڈی بھی لگادی اور مطمئن ہیں کہ اب تو کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ هُوَ مَعَهُمْ (4:108) انہیں معلوم نہیں کہ یہ اگر تین ہیں تو ایک یہاں چوتھا اور ہے' اگر یہ چار ہیں تو یہاں پانچواں اور ہے' اس کی نگاہوں سے یہ چھپ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ پھر عرض کردوں کہ یہ جو بات ہے یہ سمجھانے کی ٹھیک ہے' خدا تو ہر مقام پر ہے' اس سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں لیکن وہ جو بات کہہ گیا ہے وہ خدا کی جو بات ہے اس کو یوں سمجھ لو کہ خود تمہاری اپنی ذات اُسے ریکارڈ کرتی چلی جارہی ہے' زبان سے تم کہہ رہے ہو' اندر ایک چیز بیٹھی ہوئی ہے' وہ تو لکھتی چلی جارہی ہے۔

## انسانی ذات ہر انسانی عمل کو ریکارڈ میں محفوظ کر لیتی ہے

یہ ہے وہ تین کی جگہ چوتھا' یہ ہے وہ چار کے مقابلے میں پانچواں' ہر ایک کے ساتھ وہ ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ''دوہاں موڈھیاں تے کرامن کاتبین ہوندے ہیگے'' (دونوں کندھوں پر کراماً کاتبین ہوتے ہیں) وہ سینے میں ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا(17:14) تیری اپنی ذات تیرے خلاف گواہیاں دینے والی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا (4:108) یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت دیکھنے والا کوئی نہیں ہے' یہ تو تمہارے اوپر چاروں طرف سے چھایا ہوا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں ایمان کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ جو خلافتِ اول میں ہی ہمارے ہاں ایک مجسٹریٹ کی پوسٹ Create (پیدا) کی گئی تھی اور اس پہ (حضرت عمر فاروقؓ کو) لگادیا گیا تھا' تو سال بھر کے بعد انہوںؓ نے آکر کہہ دیا تھا کہ صاحب! مجھے کوئی اور کام دیجئے' خواہ مخواہ بیکار بٹھا رکھا ہے' سال بھر کے اندر کوئی جرم کا مقدمہ ہی نہیں آیا۔ عزیزانِ من! آئے کیسے؟ ہر ایک کو معلوم تھا کہ پکڑا جاؤں گا۔ عزیزانِ من! یوں جرائم بند ہوتے ہیں۔

## یومِ مکافاتِ عمل مجرموں کی طرف سے کون پیش ہوگا

کہا ہے کہ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا (4:109) اے وہ لوگو! جو مجرموں کی طرف سے جانتے ہوئے بھی کہ وہ مجرم ہیں ان کے مقدمات لڑتے ہو' ان کی طرف سے آکر جھگڑتے ہو' ان کی سفارشیں کرتے ہو۔ ٹھیک ہے اس دنیاوی زندگی کے اندر تو تم نے یہ کچھ کرلیا' ہوسکتا ہے کہ تم اس کو چھڑا کر بھی لے جاؤ' بری بھی قرار دلوادو' تم یہ سب کچھ کرسکتے ہو لیکن فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (4:109) مکافاتِ عمل کے دن

کون ہے وہ جو خدا کے ساتھ ان کی طرف سے جھگڑے گا اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا یا ان کا وکیل بن کر آ سکے گا۔ وہاں نہیں آ سکے گا۔ وہی چیز جو میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' اگلی آیت آ جائے گی تو پھر عرض کرونگا۔ کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (4:110) دیکھیے! دو باتیں یہاں قرآن حمید نے کہی ہیں۔ جو جرم کرتا ہے' کوئی برائی کرتا ہے' یہ جرم اور برائی تو وہ ہے' جو دوسروں کے خلاف کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کہتا ہے کہ اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (4:110) یہ خود اپنی ذات پر زیادتی کرتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک توبہ اور غفور ورحیم کا مفہوم اور ہمارا عمل اور پیش کردہ روایات

جرم کی دونوں شکلیں سامنے آ گئیں: (1) کسی دوسرے کے خلاف' اسے فریب دینا' اس سے خیانت کرنا یا (2) خود اپنی ذات کے خلاف زیادتی کرنا۔ یہ کر بیٹھا ہے' اب سوال یہ ہے کہ بس یہ ہو گیا تو سزا لازم آ گئی' اب کیا اس کی باز آفرینی کی کوئی صورت ایسی نہیں ہے؟ کیا اس کی اصلاح ممکن نہیں ہے؟ کہا ہے کہ نہیں! اصلاح ممکن ہے۔ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (4:110) اب پھر وہ خدا سے اس نقصان کی اگر پناہ مانگتا ہے' خدا سے چاہتا ہے کہ اس کی مدافعت ہو جائے' جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ہو جائے' تو ایسا ہو سکتا ہے۔ عام الفاظ میں خدا غفور ورحیم ہے۔

اب خدا کی ''غفور ورحیمی'' کا تصور جو ہمارے ہاں موجود ہے' وہ اس مذہب کی رو سے ہے' دین کی رو سے نہیں ہے۔ مذہب کی رو سے وہ تصور یہ ہے کہ خدا غفور ورحیم ہے' وہ بخش دینے والا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ کے لیے صبح اٹھ کر صبح کی نماز کے بعد' 33 مرتبہ ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ'' کہو' بس 33 مرتبہ یہ یہ پڑھا' تو یہ ہو گیا يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یعنی استغفار۔ یا جب کوئی بات اچانک ہوئی تو آپ نے استغفراللہ پڑھا تو یہ استغفار ہو رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا غفور ورحیم ہے صاحب! ''او بخشنہارائے'' (وہ بخشنے والا ہے)۔ وہ جو آپ کے ہاں صحیحین گنی جاتی ہیں' وہ دو کتابیں ہیں' جنہیں صحیح حدیثیں کہا جاتا ہے۔ ان میں یہ ہے کہ خدا رسول سے کہہ رہے ہیں کہ اپنی امت سے کہو کہ گناہ کیا کرو' اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو خدا تمہیں مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا تا کہ وہ گناہ کرے اور خدا کی جو بخشش اور مغفرت ہے' اس کا ظہور ہے۔ اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اس کی غفور ورحیمی تو ویسی کی ویسی رہ جائے گی۔ یہ ہے جو خدا کی غفور ورحیم کا تصور دیا جا رہا ہے۔

## اصل میں گناہ کا ترجمہ تو جرم ہے اور کرنے والا مجرم

عزیزانِ من! کیا سن رہے ہیں آپ! چہرے پہ ہنسی کے آثار نہ لائیے' آنکھوں سے خون کے آنسو روئیے' صحیح حدیث کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ''نہ گناہ کرو گے تو وہ ایک اور قوم لائے گا''۔ گناہ کا ترجمہ جرم کیجیے یعنی جرائم نہ کرو گے تو وہ جرائم پیشہ قوم کو پیدا کرے

گا' کاہے کے لیے پیدا کرے گا؟ تاکہ اس کی جوغفور و رحیمی ہے' اس کا ظہور ہو جائے۔ یہ ہیں جنہوں نے آپ کی جرأتیں جرائم کے لیے اتنی بیباک کر دی ہیں۔ اس کے بعد' آپ کے ذہن میں کوئی جرم کرتے وقت یا کوئی گناہ کرتے ذرا سی رکاوٹ بھی نہیں آئے گی۔ اب یہ ہوگا کہ یہ حکمِ خداوندی ہے اگر میں نہیں کرونگا تو خدا مجھے مٹا دے گا۔ اور پھر یہاں' اس کی' بے پروائیاں دیکھیے کہ اللہ بے پروا ہے۔ اور پھر وہ بات شاعروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور وہاں آکر وہ جھوم کر کہتا ہے کہ

اوتھے کی پروا اے راقب اوتھے بے پروائیاں

پھڑ لے عملاں والیاں نوں' چھڈ دیئے اوگن ہارنوں

(اے راقب! خدا بڑا بے پروا ہے۔ اس کی بے پروائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں)۔ چل بھئی! یہاں اتنے میں تو غنیمت ہے کہ ابھی عمل والے نہیں پکڑے جاتے تھے۔ بے پروائیوں میں تو یہ بھی ہوتا ہے' بے پروائیوں کے تو فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جب مہاراج رنجیت سنگھ (1839-1780ء) کے سامنے مقدموں کا' مثلوں کا' ڈھیر لگ گیا تو انہوں نے کہا کہ سرکار! اب تو دینا چیخ اٹھی ہے' ان کا کچھ فیصلہ ہونا چاہیے' اتنا ڈھیر لگ گیا ہے' اس میں تو کوئی برس لگ جائیں گے۔ اس نے کہا ''لے ورے لگ جان گے؟ ایہہ ہنے فیصلہ ہو جاندا اے'' (اچھے! کیا کہتے ہو کہ سالہا سال لگ جائیں گے؟ لو یہ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے)۔ انہوں نے کہا او اتنے مقدمے کی اتنی مثلیں ہیں۔ ان کا فیصلہ کیسے ہو جائے گا؟ اس نے آدھا ڈھیر ادھر رکھا' آدھا ڈھیر ادھر رکھا۔ کہنے لگا ''ایہہ منظور' تے اے نامنظور' چک لے۔ جیہڑا بے پرواہ اے اوہنوں فیصلے کرن اچ دیر کی لگدی ہیگی اے'' (کہنے لگا کہ یہ منظور اور یہ نامنظور' لو اب انہیں اٹھا لو۔ جو بے پرواہ ہے اسے فیصلے کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے)۔ مقدموں کے فیصلے ہو گئے ''ایویں ای اتھے رٹا پائی رہندے ہیگے'' (یونہی لوگ اس پر جھگڑتے رہتے ہیں)۔

## قرآنِ حکیم کے تراجم نے ملت کو تباہ کر دیا ہے' دیکھیے! اخوت اور استغفار کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (4:110)۔ کیا طریقہ ہے استغفار کا؟ میں نے کہا تھا کہ قرآن حکیم کی اصطلاحوں کے یہ جو ترجمے آپ کے ہاں ہوئے ہیں، انہوں نے آپ کو تباہ کیا ہے۔ جب آپ نے اس کا بخشنے والا ترجمہ کر دیا اور اُدھر بخشش آپ نے کہہ دی' پھر تو ہر وقت بخشش کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ بخشش کیا ہوتی ہے؟ یہ ہے بخششیں' یہ کسی کے کام کے نتیجے میں نہیں کچھ ملنا ''آ بخشش جیہڑی ملدی ہوندی ہیگی اے'' (یہ وہی ہے جو یہ ''بخشش'' ملا کرتی ہے)۔ جنت بھی آپ بخشش کے طور پر لیتے ہیں

بهشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

یہ اقبالؒ (1938-1877ء) کہتا ہے۔یہی چیز ہے جس ''مغفرت'' کا ترجمہ آپ نے ''بخشش'' کرلیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہے جس سے مغفرت ملتی ہے؟ مغفرت کے معنی ہیں ''حفاظت کا سامان''۔مغفر کہتے ہیں ''اس ہیلمٹ کو' اس لوہے کی چوٹی کو' جو سر کے اوپر پہنی ہوئی ہوتی ہے''۔وہ جو ملٹری والے موٹر سائیکلوں کے اوپر ہوتے ہیں' ان کے سر کے اوپر جو خول ہوتا ہے یا یہ پولیس جاتی ہے' جب ٹکراؤ ہوا کرتا تھا' تو اس میں سر پہ جو وہ پہنتے تھے' وہ اس کو مغفر کہتے ہیں۔یہ اسی سے مغفرة ہے۔یہ ملتی کیسے ہے؟ سنیئے' عزیزانِ من! یہ جو کہیں غلطیاں ہوجاتی ہیں' سہو ہوجاتا ہے' خطا ہوجاتی ہے' اس قسم کی چیز ہوجاتی ہے' اسے آپ سیاٰت کہتے ہیں۔اس کے ازالے کی شکل کیا ہے؟ اس کی مغفرت کی شکل کیا ہے؟ قرآنِ کریم کے یہ الفاظ جلی حروف میں ہر جگہ لکھے ہونے چاہئیں کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) ۔عزیزانِ من! یہ چار ہی الفاظ ہیں اور کتنا عظیم فلسفہ ہے جو بیان کر کے رکھ دیا ہے۔چوٹ لگ گئی' بہت سا خوں نکل گیا' کمزوری ہوگئی۔کیا کروں؟ صاحب! اتنی اچھی غذا کھایئے کہ جو خون نکلا ہے' وہ بھی پیدا ہوجائے اور اس کے بعد اور خون پیدا ہوجائے۔دو لفظ ہوگئے یعنی جو نکل گیا ہے اس کا ازالہ ہوجائے' تلافی ہوجائے' اتنا تو واپس آجائے اور اس کے بعد اور توانائی آجائے۔

## لفظ غفور کا اور رحیم کا قرآنی مفہوم

غفور کے معنی ہیں اتنے حصے کی مدافعت کرنے والا' جتنا خون نکل گیا' رحیم کے معنی ہیں اور خون پیدا کردینے والا تاکہ آئندہ کے لیے بھی تمہیں نقصان نہ ہو۔اسے کہتے ہیں غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۔بیمار کو روزمرہ سے اچھی غذا کیوں دیتے ہیں؟ اس لیے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) یہ جو کمزوری واقع ہوگئی ہے' اس کا ازالہ تو اس سے ہوگا کہ معلوم سے بھی زیادہ اچھی غذا اور احتیاط اور تدبیر برتو' اس طرح سَیِّاٰتِ جو ہیں حسنات سے جاتی ہیں۔سپلیمنٹری میں آنے والے بچے کو آپ کہا کرتے ہیں کہ دیکھو میاں! تم نے اس مضمون میں کچھ کمی کی ہے' اب دو مہینے تمہیں مل گئے ہیں' دن رات محنت کرنا پڑے گی یعنی اگر پہلے اتنا تھا کہ دن ہی دن میں محنت کرو تو کام چل سکتا تھا' اب کمزوری اتنی ہوگئی ہے کہ دن رات محنت کرنی پڑے گی کیونکہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) یاد رکھو! ناہمواریاں دور کرنے کا طریق ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہمواریاں پیدا کردی جائیں۔تخریبی کاروائیوں کے نقصان رساں اثرات مٹتے ہی تعمیری کاموں سے ہیں۔عزیزانِ من! یاد رکھیے! قرآن حکیم کی رو سے کوئی اور طریقہ مغفرت کا نہیں ہے' کوئی اور مفہوم توبہ کا نہیں ہے۔خود ہی آپ نے اپنے آپ سے یہ کرلیا۔اور یہ تھی وہ چیز جو میں کہا کرتا ہوں۔

## ہر وہ شخص جو دوسرے کے خلاف کوئی جرم کرتا ہے دراصل وہ اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا ہے

سنیے! آگے قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے' اسے پھر جلی حروف میں لکھیے۔ یہاں دو باتیں کہی تھیں کہ دوسرے کے خلاف تم نے کوئی جرم کیا ہے اور وہ اپنی ذات کے خلاف ہوا ہے' اب آگے پہنچتا ہے قرآن مجید۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ** (4:111) اور یہ جو تم نے سمجھا ہے کہ کسی دوسرے کے خلاف جرم کر کے تم نے اس کو نقصان پہنچایا ہے' سمجھا تو تم نے یہی ہے' دنیا بھی یہی کہے گی لیکن یاد رکھو! جو بھی کسی دوسرے کے خلاف کوئی جرم کر کے اسے نقصان پہنچائے وہ خود اپنی ذات کے خلاف جرم کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چل بھئی! ایک تو براہِ راست اپنے خلاف کرنا وہ خود فریبی ہے جسے ساری دنیا کہتی ہے کہ یہ دوسرے کے خلاف کوئی جرم کیا ہے' یہ اپنے خلاف جرم کیا ہے۔ اللہ اکبر! یہ ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! خدا کہتا ہے یہ جرم تو تم نے اس کے خلاف نہیں کیا' یہ جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے۔ سنیے الفاظ! **وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ** (4:111) جس کسی نے بھی کسی دوسرے کے خلاف' کوئی جرم کیا' تو وہ جرم صرف اس کے خلاف ہی نہیں' اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ وہ اپنی ذات کے خلاف بھی جرم کر رہا ہے۔ قرآن حکیم اسے ایمان کہتا ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ یہ لکھتے ہیں کہ ایمان کی کہاں ضرورت پڑتی ہے' میں پوچھتا ہوں کہ اس ایمان کے بغیر دنیا کے اندر سے جرائم مٹانے کا کیا کوئی اور بھی طریقہ ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ اگر میں کسی دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہوں جسے کوئی نہیں دیکھتا یا کوئی نہیں جانتا کہ یہ میں اسے نقصان نہیں پہنچا رہا ہوں بلکہ وہ تو میں اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو تو کوئی عقل مند بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ پاگل تو کہتے ہی اسے ہیں کہ صاحب! پاگل ہو گیا ہے اس کو اپنا نفع نقصان بھی یاد نہیں۔ عزیزانِ من! کوئی صاحبِ ہوش اپنے آپ کو تو نقصان نہیں پہنچاتا۔

قرآن مبین کا ارشاد ہے کہ **وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ** (4:111) ۔ قرآن کریم کے الفاظ دیکھیے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے اور یقیناً حقیقت یہ ہے جسے Fact (حقیقت) کہا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیا ہے بلکہ یوں کہیے کہ نقصان نہیں وہ تو علٰی نفسہ اپنے خلاف اس نے یہ جرم کیا ہے۔ یہاں وہ فقرہ ہے جو میں نیٹشے (1900-1844ء) کا دہرایا کرتا ہوں جو اس نے کہا تھا کہ ''تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے' اسے تو میں معاف کر دونگا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے' اسے کون معاف کرے گا''۔ یہ قرآنِ کریم کے الفاظ **یَکۡسِبُ عَلٰی نَفۡسِہٖ** (4:111) کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اور قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ کوئی الگ بات نہیں ہے' ایک تو خود اپنی ذات کے خلاف جو تم نے کیا' وہ تمہاری نگاہ کی خیانتیں ہیں' اور دل کے

ارادے ہیں' ایک جو تم نے بظاہر دوسرے کے خلاف کیا ہے مثلاً بُرے ارادے سے دوسروں کے خلاف اسکیمیں وغیرہ بنائیں وہ بھی درحقیقت تم نے اپنے خلاف کیا ہے۔ تم دنیاوی قانون کی گرفت میں آ ؤ یا اس سے بچ جاؤ' قانونِ خداوندی کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے کیونکہ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:111) وہ جانتا ہے کہ کس کے خلاف یہ جرم ہوا ہے لیکن وہاں دھاندلی نہیں ہے' ساری چیز انصاف پہ ہے' حکمت پہ ہے' اس لیے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

## خدا کی طرف سے رحمت کا حقیقی مفہوم

کہا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53)۔ ہمارے ہاں ایک لفظ تَقْنَطُوْا آتا ہے کہ ''اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو' صاحب! جو جی میں آئے' کرتے جایئے' ناامیدی کفر ہے' وہ غفور و رحیم ہے' وہ تو بخشنہار ہے' وہ تو بخشے گا' مایوسی کفر ہے۔ چل بھئی! یہ کہا اور بات ہوئی ختم۔ سنیے! مایوسی اس اعتبار سے کفر ہے کہ اگر یہ سمجھے کہ یہ جو مجھ سے غلطی ہوگئی اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تو یہ ہے مایوسی۔ اور اگر یہ ہے کہ نہیں! خدا کہتا ہے کہ ہم نے تلافی کا سامان مہیا کر دیا ہے تو سنو! کہ تلافی کا سامان کیا ہے؟ یہ ہے کہ تم نے نقصان کیا ہے تو اس کی تلافی یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اس سے کہیں زیادہ فائدے مند کام کرو' یہ نقصان بھی پورا ہو جائے گا' تمہیں اور بھی پونجی مل جائے گی اس لیے کہ وہ غفور و رحیم ہے۔

## جرم خود کرنا اور دوسروں کے گلے ڈال دینا دہرا جرم ہے

اب آگے جرم کی ایک چیز آئی ہے۔ اپنے خلاف یہ سب کچھ ہو رہا ہے' اس بنیادی حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد تم سوچو کہ وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا (4:112) اگر کوئی شخص جرم یا خطا خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر' تو یہ بجائے خویش کتنا بڑا جرم ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اوپر دہرا بوجھ لاد لیتا ہے۔ ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس سے سرزد ہو گیا اور دوسرا اس بہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے پر لگایا۔ اب اگر یہ ایک کیٹگری (شق) آتی ہے کہ جرم خود کیا' اس کا بہتان دوسرے کے سر لگا دیا۔ کہا ہے کہ ذرا سوچو تو کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے! اس شخص نے دہرا جرم کیا ہے۔ یہ خود مجرم ہے' جھوٹ بول کر اپنے آپ کو اس نے Innocence (معصوم) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' دوسرا بے گناہ ہے' غلط الزام سے اسے مجرم بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہا ہے کہ سوچو تو سہی کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے!

برادرانِ عزیز! ان چیزوں سے بچنے کے لیے وہی ہے جو ہم نے کتاب اللہ نازل کی تھی' اس کے اتباع سے تم ان چیزوں سے بچ سکتے ہو ورنہ روز یہی کچھ ہوتا ہے اور آج کے اس نظام عدل میں تو یہ مشکل نہیں ہے' روز یہ چیز ہے کہ قتل ایک کرتا ہے' ذمے دوسرے کے

لگ جاتا ہے' چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے' روز بے گناہ پھانسی لگ جاتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو کسی کو ان چیزوں سے بچا سکتی ہے؟ یہ صرف ایمان بچا سکتا ہے' کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ پوچھتے ہیں ایمان کی کہاں ضرورت پڑتی ہے۔ کہتا ہے کہ **وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ وَ رَحۡمَتُہٗ لَہَمَّتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّضِلُّوۡکَ وَ مَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَضُرُّوۡنَکَ مِنۡ شَیۡءٍ وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا**(4:113) یہ تو خدا کا خاص فضل اور رحمت ہے کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات دیدیا جس پر ان تمام امور کے متعلق واضح ہدایت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانینِ خداوندی کی لم اور حکمت کیا ہے اور اس طرح تمہیں وہ کچھ سکھا دیا جو تم تنہا عقل کی رُو سے کبھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔ اگر تم پر خدا کا فضل نہ ہوتا تو منافقین کا ایک گروہ اس کا تہیہ کر چکا تھا کہ تمہیں صحیح راستے سے بھٹکا دے۔ اب اس قسم کے ارادوں سے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' خود اپنے لیے سامانِ ہلاکت بہم پہنچاتے ہیں۔

## مجرم کا ساتھ دینے والوں کی حالت

برادرانِ عزیز! اب بات یوں ہوئی ہے کہ ایک جرم کر بیٹھے' جھٹ سے اِدھر اُدھر سے بہی خواہ آ جاتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے' صاحب! اس کا انتظام میں کر لوں گا' کوئی بات نہیں ہے۔ خرچ ہوگا کچھ تھوڑا سا۔ اور اگر پکڑا بھی گیا تو کوئی بات نہیں ہے' بہت بڑا وکیل ہے' اس کو جا کر کرتے ہیں' گواہوں کو توڑنا کونسی مشکل بات ہے صاحب! یہ ہو جائے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کمزور ایمان کا انسان ان باتوں میں آ جاتا ہے لیکن جو یہ ایمان رکھتا ہے کہ اگر میں ان باہر کی عدالتوں سے اس سزا سے بچ بھی جاؤں گا تو وہ سزا جو مجھے اپنی ذات سے مل رہی ہے' وہ جو خدا کی طرف سے مل رہی ہے' اس سے تو میں بچ نہیں سکتا' صرف یہ ایمان بچائے گا۔ کہا ہے کہ اگر تم میں یہ ایمان نہ ہوتا تو ایسے وقت میں' جب یہ جرائم یوں کیے جاتے ہیں' یہ لوگ تمہیں پتہ نہیں کتنا گمراہ کر دیتے۔

عزیزانِ من! روز یہ ہوتا ہے' وہ جرم کر بیٹھتا ہے' پھر اس کے بعد وہ ہمدرد آ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تو تباہ کر کے رکھ دیتے لیکن اگر تم یہ ایمان رکھو تو پھر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا[1] کیونکہ **وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ**(4:113) خدا نے تو تمہاری طرف یہ ضابطۂ قانون نازل کیا ہے اور پھر قانون بھی مہاراج رنجیت سنگھ والا نہیں ہے کہ یہ منظور اور یہ نامنظور' اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہے' اس میں The why of it (اِس کی وجہ جواز) ہوتی ہے' تم پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے' وہ کہتا ہے ہم تمہیں جواب دیں گے۔ بے پرواکو تو کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ ایسا کیوں کیا ہے' (مہاراج) رنجیت سنگھ (1839-1780ء) سے کوئی نہیں

---

[1] روسی قلمکار' دوستووسکی (Destoevesky) نے کہا ہے کہ ''تم خدا کا انکار کردو تو ہر چیز جائز قرار پائے گی''۔ یہ اس نکتے کی بڑی عمدہ وضاحت ہے۔

پوچھ سکتا تھا کہ صاحب! یہ کیوں منظور اور یہ کیوں نامنظور؟ نازک مزاجِ شاہاں' تابِ سخن ندارد۔ بادشاہوں کا مزاج کیا پوچھتے ہو!

گاہے بہ سلامے بدنجد اور گاہے بہ دشنام خلعت بخشن

کبھی مزاج بدآیا ہوا ہو' سلام کرو تو پھانسی دیدیں' کبھی کیفیت یہ ہے کہ گالی دو تو تمہیں جاں بخش دیں۔ یہ مزاجِ شاہاں ہے۔

کہا ہے کہ کتاب کے ساتھ حکمت نازل کی ہے یعنی ہم نے ہر قانون کے متعلق بتایا ہے کہ یہ ایسا قانون کیوں نافذ کیا ہے' اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اللہ اکبر! وہ خدا اتنا بڑا قادرِ مطلق ہے' وہ ''کیوں'' بتا رہا ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ تم پوچھ سکتے ہو۔ رسول سے کہا ہے کہ ان کو صرف ہماری کتاب (قانون) ہی کی تعلیم نہ دو کہ یہ قانون ہے' انہیں اس قانون کی حکمت' لِمْ' غرض و غایت کی بھی تعلیم دو۔ ہمارے ہاں تو یہ صرف سارا تعزیراتِ (پاکستان)' ضابطۂ فوجداری' شائع ہوتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ ایسا قانون کیوں بنایا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں اس حکمت کی بھی تعلیم دو کہ یہ خدا کا قانون ہے اور اُسے اس نے ایسا کیوں بنایا ہے' یہ بھی ان کو تعلیم دو۔ اس کو قانون کی حکمت کہتے ہیں کہ یہ کیوں ایسا ہے' اس پر عمل کرو گے تو کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ **وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ** (4:113) اس طرح تمہیں وہ کچھ سکھا دیا جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

## خیر و شر کے سلسلہ میں اس کیوں کا جواب سوائے قرآنِ حکیم کے اور کوئی نہیں دے سکتا

اب یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ جھوٹ برا ہے' فریب نہیں دینا چاہیے' لیکن یہ فریب کیوں نہیں دینا چاہیے' کیوں برا ہے' دوسرے کی خیانت کیوں نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ضابطۂ فوجداری ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتے۔ ''کیوں'' کا جواب ہماری کتاب دے گی' جس نے قانون دے کر ''کیوں'' بھی بتایا ہے کہ کیوں ایسا کرنا چاہیے۔ اب آپ نے دیکھا جو بات میں نے شروع کی تھی کہ اس ''کیوں'' کا جواب کوئی نہیں دے سکتا کہ میں کیوں نیک بنوں' میں کیوں دوسرے کو فریب نہ دوں۔ اس ''کیوں'' کا جواب صرف خدا کی کتاب دے سکتی ہے' یہ ایمان دے سکتا ہے جسے اس نے تمام اعمالِ انسانی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ کَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا** (4:113) سوچو تو سہی یہ خدا کی کتنی نوازش ہے کہ اس نے تمہیں ہر جرم کے متعلق بتا دیا کہ یہ کیوں نہیں کرنا چاہیے۔

## خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا قانون اور پھر اس کی حکمت دونوں خدا کی رحمتیں ہیں

برادرانِ عزیز! یہاں تو اتنا ہی بڑا احسان ہوتا ہے اگر کوئی مملکت ہو' جس میں قانون کی حکمرانی ہو' یہی بڑی بات ہوتی ہے صاحب! بڑی Creditable (قابلِ قدر) چیز ہے کہ یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں بنا ہوا ہے؟ اس کے متعلق نہ کوئی پوچھ سکتا ہے' نہ ان کو بتانے کے لیے کوئی مکلّف ہے۔ کہا ہے کہ یہ خدا کی کتنی بڑی نوازش ہے کہ تمہیں قانون دیا اور

اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ تمہیں ایسا قانون کیوں دیا ہے۔

خدا کا یہی فضل اور رحمت تھی جس نے اس جماعت مومنین کو منافقین کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ اندازیوں سے محفوظ رکھا ورنہ یہ حربہ ایسا تھا جس کی مدافعت انتہائی مشکل تھی۔ ان کی ان سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (4:114) یہ منافقین جماعت مومنین سے الگ ہوکر باہمی مشورے کرتے ہیں اور یہ مشورے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی۔ مشورے وہی اچھے ہوتے ہیں جو رفاہِ عامہ کے کسی کام کے لیے عطیات دینے کے لیے ہوں یا معاشرے کے ان کاموں کے متعلق جنہیں قانون صحیح تسلیم کرے یا لوگوں کی اصلاح کی خاطر ہوں۔ جو لوگ ایسا کریں' اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس میں ذاتی مفاد کا خیال نہ ہو' خالصتاً لوجہ اللہ ہو تو ایسے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ خوشگوار ہوگا اور انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔

## باہمی مشوروں کے سلسلہ میں ضروری ہدایات اور پھر لفظ ''صدقہ'' کا مفہوم

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ باتیں کھلی کھلی کرو لیکن بعض اوقات اس قسم کی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ تم ایسے بھی باہمی مشورے کرو جن کا قبل از وقت افشا تم اچھا نہ سمجھتے ہو۔ اس کی تو ضرورت پڑتی ہے' آپ نے کئی پلان ایسے کرنے ہوتے ہیں لیکن کہا ہے کہ یہ یاد رکھو! کہ برائی کی باتوں کے لیے اس قسم کی پلاننگ یا مشورے یا خفیہ باتیں نہ کرو۔ وہ تو کھلے بندوں بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتے' چہ جائیکہ تم اس طرح سے خفیہ طور پر یہ کرو۔ تمہیں اپنے نظام میں ان باتوں کی ضرورت پیش آئے تو یہ صَدَقَةٍ کرو' یاد رکھو! صَدَقَةٍ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (1) اپنے اس نظام کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے' جو کچھ بھی کیا جائے' اسے صَدَقَةٍ کہتے ہیں' اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے جو کام کیا جائے اسے بھی صدقہ کہتے ہیں اور (2) صدقہ ان عطیات کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں کی مدد کے لیے دیئے جائیں۔ وہ بھی صدقہ کہلاتے ہیں۔ دونوں معنوں میں یہ چیز آ سکتی ہے کہ ایسے امور کے لیے تم کر سکتے ہو مگر شرط یہ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (4:114) ہے یعنی نوعِ انسانی کے اصلاح کے کاموں کے لیے تم یہ کر سکتے ہو اور أَوْ مَعْرُوفٍ (4:114) یا ان چیزوں کے لیے جو قرآن کریم کی رو سے Recognize (جائز و معروف) کی گئی ہیں کہ یہ اچھی باتیں ہیں۔ یاد رکھیے! جو معروف اور منکر ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ جن امور کو خدا کا ضابطۂ قانون صحیح Recognize (تسلیم) کرتا ہے' وہ المعروف ہے اور جن کو وہ ایسا نہیں کہتا' وہ منکر ہیں۔ کہا ہے کہ ان باتوں کے لیے ایک پلاننگ کی ضرورت ہے جو تم کر سکتے ہو اور اس کو بھی یاد رکھو کہ مَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ (4:114) اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ بات نہیں ہے بلکہ صرف نظامِ خداوندی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے یہ کرنا چاہیے۔

## لفظ رضی اللہ عنہم کا قرآنی مفہوم

یہ جسے مرضی کہتے ہیں' آپ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ کہتے ہیں' اس کے معنی ہیں کہ جو خدا کی مرضی ہے' اس کے مطابق چلنا چاہیئے' راضی برضا ہونا چاہیے۔ یہ بات پھر کبھی آئے گی' جب تقدیر کا مسئلہ آئے گا۔ کون کونسی بات ہے جو نہیں سامنے آنی چاہیئے' عزیزانِ من! وہ تو ایک ایسی بوسیدہ پرانی عمارت ہوگئی ہے کہ ''ذرا جناں وچوں کریدو' تے ساری تھلے آ پیندی ہیگی اے'' (اندر سے تھوڑا سا کریدو تو دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے)۔ اور مذہب کی عمارتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ سب سے بڑے جو مقرب ہوتے ہیں' ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ راضی برضائے خداوندی ہے' صاحب! کہ خود کچھ نہ کیا جائے' بس جو اللہ کی مرضی ہو۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس کے بنیادی لفظی معانی ہوتے ہیں ''کسی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا' جیسا وہ ہے ویسا ہو جانا' جو قانونِ خداوندی کا منشا ہے اس کے مطابق جو کچھ کیا جائے گا وہ اللہ کی رضا کے مطابق ہوگا''۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے اس نظام' اس قانون کے ساتھ ہم آہنگ کیا' اس قانون نے اپنے نتائج کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا' یہ ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ یہ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ یہ ہے' جس کا مروج ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کی خوشنودی کے لیے۔

## خوش ہونا یا ناراض ہونا تو انسانی نفسیات ہے' خدا کی نہیں ہے اور لفظ ''ہدایت'' کا مفہوم

برادرانِ عزیز! اندازہ لگایئے کہ ان ترجموں نے ہمیں کیا سے کیا کر دیا ہے۔ خوشنودیٔ باری تعالیٰ آیا کہ گویا اللہ خوش بھی ہوتے ہیں' اللہ ناراض بھی ہو جاتے ہیں' مہاراج جو ہوئے !! یاللعجب۔ یہ خوش ہونا' ناراض ہونا' جسے ہم کہتے ہیں یہ تو انسانی جذبات ہیں' عزیزانِ من! وہ تو اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی تو یہ صورت ہے کہ لاکھ آدمی اگر نماز پڑھنے چلے گئے تو کیا ہوا' کہا کہ خدا تعالیٰ خوش ہوگئے صاحب! اتنی سی خوشنودی ہم نے Win (جیت کر حاصل) کر لی' آج بہت خوش ہیں' کیا ہوا صاحب! یہاں دو لاکھ آدمی کے مجمع میں نماز پڑھنے چلا گیا۔ خوشنودی اور ناراضگی کے یہ سارے تصورات ہمارے یہاں کے بادشاہوں کے ہیں' یہ سب ہم اپنے لیے کرتے ہیں۔ وہ اس وقت بھی اسی قسم کا خدا تھا' جب ہم میں سے کوئی پیدا نہیں ہوا تھا' وہ ویسا ہی خدا رہے گا جب ہم میں سے کوئی نہیں رہے گا۔ سورج آنکھوں والے کا محتاج نہیں ہوتا' سورج نے تو چڑھنا ہے خواہ دنیا میں سارے اندھے کیوں نہ ہو جائیں۔ خدا کی خوشنودی اور اس کی ناراضگی کا سوال نہیں ہے۔ اس کے دیئے ہوئے قانون سے ہم آہنگی کا سوال ہے' اس سے اپنا بھلا ہوتا ہے۔ لہٰذا مرضات اللہ کے معنی یہ ہوتے ہیں ''کسی دنیاوی منفعت کے خیال کے بغیر' صرف اس لیے مجھے ان جرائم سے الگ رہنا ہے' کیونکہ خدا کے قانون کا تقاضا یہ ہے' اس کا نظام ایسا چاہتا ہے' میری ذات کی منفعت اس میں ہے''۔ کہا ہے کہ قُلۡ اِنَّ

صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) ان سے کہہ دو کہ میری صلوٰۃ' میرے مناسک' میرا جینا' میرا مرنا' کسی اور مفاد کے لیے نہیں ہے' صرف خدا کے بتائے ہوئے نصب العین کے حصول کی خاطر' میں یہ کر رہا ہوں۔ یہ ہوتی ہیں مَرْضَاتِ اللّٰہِ (4:114)۔

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (4:114) تم دیکھو گے کہ تمہیں اس کا کتنا بڑا بدلا ملتا ہے! کہتا ہے کہ وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا (4:115) اور جو شخص ایسی واضح راہنمائی کے بعد بھی الرسول یعنی اسلامی نظام کی مخالفت میں شریک ہو جائے اور جو راستہ جماعتِ مومنین یعنی اسلامی نظام باہمی مشورے سے طے کرے اس کے خلاف جائے اور مخالفین کی راہ اختیار کرے تو جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ جس منزل تک پہنچائے گی' وہ وہیں پہنچے گا یعنی جہنم میں' جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ دیکھا قرآنِ کریم نے کتنی وضاحت سے یہ باتیں تمہارے سامنے کر دیں' راستہ ابھر اور نکھر کر تمہارے سامنے آ گیا۔

''ہدایت'' کے معنی کسی راستے کا یوں سامنے آنا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ہموار ہوتا ہے۔ یہ بڑا عجیب لفظ ہے۔ ''کسی چیز کا جو ابھر کر سامنے آنا ہے'' عرب یہ لفظ وہاں بولتے تھے حالانکہ یہ صحرا کے رہنے والے تھے' پتہ نہیں یہ کیا قوم تھی۔ یہاں ہم لوگ جان ہی نہیں سکتے' جنہوں نے سمندر نہیں دیکھا۔ سمندر کے کنارے آپ کھڑے ہوں' دور تک دیکھیں تو کچھ نظر نہیں آئے گا' وہاں جو کشتی دور سے آپ کو نظر آتی ہے' تو آپ دیکھیں گے کہ پہلے وہ یوں ابھری ہوئی سامنے سے نمودار ہوتی ہے۔ یعنی آپ کو وہ بلندی کی طرف سے نظر آتی ہے' سطح کے اوپر نظر نہیں آتی' یوں نظر آتی ہے کہ یہ بلندی کی طرف آ رہی ہے۔ جہاز بھی جب وہاں سے آتے ہیں تو پہلے ان کے جو Masts (مستول) ہیں' وہ سامنے یوں آتے ہیں۔ ''کوئی ایسی چیز جو یوں سطح سے ابھر کر سامنے آ جائے'' اسے عرب ہدایت کہتے تھے۔ جسے میں نکھر اور ابھر کر کہا کرتا ہوں' اس میں وہ یہ چیز ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ چیزیں واضح کی گئی ہیں کہ نکھر کر' ابھر کر' تمہارے سامنے آ گئیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب اس طرح سے ہدایت سامنے آ جائے اور اس کے بعد بھی جو یہ راستہ دکھا رہا ہے اس کی مخالفت کرے۔ آگے بتاتا ہے کہ اس کا جانچنے کا عملی طریقہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ (4:115) اور وہ اس جماعتِ مومنین کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

## مذہب کی دنیا میں قدم قدم پر انفرادیت کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے مگر سبیل المومنین اجتماعی ہے

عزیزانِ من! اب یہ چیز آ گئی جو میں کہا کرتا ہوں کہ مذہب انفرادی چیز ہے۔ اس میں ہر فرد اپنی اپنی جگہ بیٹھا ہوا' اپنے اپنے

کمرے میں، اپنے مصلے پر، اپنی مسجد میں، اپنے آپ میں، وہ جیسا کہتے ہیں کہ نجات حاصل کرنے کا سامان کرسکتا ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ تم صادقین کے ساتھ رہو، یہ جو جماعت ہے، اس جماعت کے ساتھ رہو، اس کا ایک فرد بنو، یہ اجتماعی نظام ہے، انفرادی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ (9:119) صادقین کی جماعت کے ساتھ رہو یعنی سفر زندگی، دیگر افرادِ کارواں کی معیّت میں طے کرو اور فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ. وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ (89:29-30) میرے ان بندوں کی جمات میں شامل ہو جاؤ تو جنّت میں جا سکو گے۔ یہ دوسرا موضوع آ گیا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:115) وہ جماعتِ مومنین کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ سبیل المومنین میں چلے جاؤ یعنی جماعتِ مومنین کے ساتھ چلو۔

اب آپ سبیل المومنین تلاش کیجیے، اب آپ کو انہی کی اپنی اپنی سبیل ملے گی۔ سبیل کے معنی راستہ، روش، مسلک ہے۔ یہ سبیل المومنین سنّیوں کی ملے گی، حنفیوں کی ملے گی، اہلِ حدیث کی ملے گی، بریلویوں کی ملے گی، دیوبندیوں کی ملے گی، نقشبندیوں کی ملے گی، چشتیوں کی ملے گی۔ قرآن حکیم نے کہا یہ ہے کہ یہ سبیل المومنین ہے ہی نہیں۔ اب جو بھی سبیل المومنین کے علاوہ کسی اور راستے پہ چلتا ہے، سنیے عزیزانِ من! اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (4:115) جن کے ساتھ وہ ملنا چاہتا ہے، ہم اس کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔ ختم ہوا قصہ ''تہاڈے وچوں نئیں او ہووے گا'' (وہ تم میں سے نہیں ہوگا)۔ ٹھیک ہے جی حنفی ہوتے ہیں، تو چلو حنفیوں میں، دیوبندی ہو، تو چلو دیوبندیوں میں۔ کہتا ہے کہ مومنین کی جماعت میں تو نہیں ہو سکتے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (4:115) جس کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے جس کے ساتھ تو ملنا چاہتا ہے، اسی کے ساتھ ہم اس کو ملا دیں گے۔ مگر یہاں سبیل المومنین کہا ہے، عزیزانِ من! اس سبیل المومنین میں کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اسلام دین کی حیثیت سے صرف اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک سبیل المومنین ہوتی ہے، کسی فرقے کی سبیل نہیں ہوتی۔ جونہی فرقے ہوئے، ہر فرقے کی اپنی اپنی سبیل ہے، سبیل المومنین غائب ہے۔ اور یاد رکھیے! نہ تو نظام اسلامی ہو سکتا ہے، نہ کوئی مملکت اسلامی ہو سکتی ہے، نہ کوئی دستور اسلامی ہو سکتا ہے، جب تک فرقوں کا وجود موجود ہے۔ سبیل المومنین ہوگی تو آپ کے ہاں اس وقت اسلام آئے گا۔ آج سبیل الشرک تو ہے، اس میں اسلام کا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ قرآن کریم تو اس کو شرک قرار دیتا ہے، قرآن کریم تو رسول اللہ ﷺ سے کہتا کہ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو فرقے بنا لیں۔ وہ تو سبیل المومنین بتا رہا ہے۔ اب یہ کہا جائے گا کہ اس میں سے ہر فرقہ کہتا ہے کہ صاحب وہ مومنین ہیں، ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ سنو! جب یہ ہو جائے تو كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) اس کے بعد تم دیکھو گے کہ ہر فرقہ یہ کہے گا کہ وہ ہم ہیں، جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق وصداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ سارے جو اپنے آپ کو سبیل المومنین

کہتے ہیں یہ بھی اور وہ بھی' تو یہ تو سُبل ہو گئی' یہ راستے ہو گئے' مگر وہ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ والا راستہ نہ رہا اس کے خلاف گیا تو اُس کا تعلق' اے رسول! تم سے نہیں۔ وہ تمہارے مخالفین کا ہو گیا۔ قرآن کریم تو سبیل المومنین کہتا ہے کہ ایک جماعت مومنین ہے' ایک ہی ان کا راستہ ہے' جو اختیار کیا جائے گا❶۔

[برادرانِ عزیز! دین کا راستہ صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے صراطِ مستقیم یعنی امتِ واحدہ۔ اس لیے جو یہ راستہ اختیار نہیں کرتا اُس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا جن سے اس نے اپنا ناطہ جوڑا۔ اس پر کہا ہے کہ وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا (4:115) اُس کی یہ روش اسے سیدھا جہنم کی طرف لے جائے گی اور وہ بہت بری جگہ ہے جانے کی۔]

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

---

❶ ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔

# چوبیسواں باب: سورۃ النسآء (آیت 116: شرک کے خدوخال کی وضاحت)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۱۱۶

عزیزانِ من! آج دسمبر 1970ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 116 سے ہو رہا ہے: (4:116)۔

## ہماری وہ مروجہ اصطلاحات جن کا قرآنی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے

یہاں اب دین کی بنیادی آیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ آیت اس سے پہلے بھی اسی سورۃ میں ایک مقام پہ آئی تھی لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ تصریفِ آیات سے اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے' پھیر پھیر کر ایک چیز کو بیان کرتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے اگرچہ اس مقام پہ بھی میں نے اس کی شاید پورے درس میں تشریح کی تھی' تو میں اس پہ ریفرنس دے کر آگے نہیں بڑھنا چاہتا۔ دوبارہ اس کی تشریح اس لیے دیتا ہوں کہ جو احباب اس درس میں موجود تھے' ان کے لیے یہ تجدید یادداشت کا باعث ہو جائے گی اور جو نو واردان ہیں' ان کے سامنے پہلی دفعہ اس کے مطالب آ جائیں گے۔ آیہ جلیلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (4:116)۔ عام ترجمے کے اعتبار سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا' اس کے سوا ہر گناہ کو بخش دیتا ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہمارے ہاں جو یہ بخش دینا وغیرہ کی اصطلاحات مروج ہیں' یہ مغفرت کا قرآنی مفہوم نہیں ہے۔ قرآنی مفہوم تو یہ ہے کہ ''تمہاری غلطیوں سے' تمہارے سہو و نسیان سے' یا ویسے ہی غلط راستے اختیار کرنے سے' جو نقصانات تمہیں ہوتے ہیں ان میں اور چیزوں کے نقصانات کی تلافی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ شرک ایک ایسی چیز ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی' جس سے سامانِ حفاظت نہیں مل سکتا''۔ مغفرت کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہیں کہ اللہ یہ نہیں بخشتا' باقی سب کچھ بخش دیتا ہے۔ اور جب آگے شرک کا وہ مفہوم لیا جائے جو ہمارے ہاں مروج ہے تو پھر تو کچھ اور ہی تصور آتا ہے یعنی خدا کی بجائے کسی اور کی پرستش کرنا۔ تو آپ سوچیے کہ صاحب! خدا یہ تو نہیں بخشے گا کہ تم نے کسی اور کی پرستش شروع کر دی' سب کچھ بخش دونگا مگر یہ بات نہیں بخشونگا۔ می نہ سزد خدائے را۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (3:97) وہ تو ان چیزوں سے مستغنی ہے' جب کوئی بھی اس کی

پرستش کرنے والا نہیں تھا تو وہ اس وقت بھی بایں ہمہ شان جمعیت خدا تھا' جب کوئی نہیں ہوگا پھر بھی وہی خدا ہوگا۔ اس کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ تم اس کی پرستش کرتے ہو یا نہیں کرتے' اور اس سے کیوں غصہ کھا جائے کہ صاحب! یہ دیکھو' ہمارے سامنے اوروں کی پرستش کرنی شروع کردی۔ یہ تو وہ ہیں جن کی بادشاہتیں لوگوں کی اطاعت پر موقوف ہوتی ہیں' جوان کے ووٹوں سے صاحبِ اقتدار ہوتے ہیں' انہیں تو یہ ہر وقت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کہیں اوروں کے ساتھ تو نہیں جاملا۔ انہیں تو اس چیز پر غصہ آتا ہے کہ بے ایمان کہیں کا' کل تک ہمارے ساتھ تھا اور آج دیکھیے صاحب! دوسروں کے ساتھ مل گیا۔

## بادشاہت میں سب سے بڑا جرم ''سجدے'' کی بجائے ''قیام'' کی شکل اختیار کرنا ہوتا ہے

بادشاہتوں میں تو ان کو بہت ہی زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا' کسی کے ساتھ ملنا تو ایک طرف' ذرا سی سازباز بھی کوئی کرتا تھا تو پھانسی پہ چڑھا دیتے تھے' وہ اس لیے تھا کہ ان کی اپنی حکومت' اقتدار' طاقت' اختیار' ان لوگوں کی اطاعت کا رہینِ کرم تھا۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا ست

یہ خدا (بُت) وہ ہیں کہ ان کے سامنے سجدہ کرتے رہو تو یہ خدا ہیں اور

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

(زبورِ عجم)

جونہی تم سجدے سے کھڑے ہو گئے' رک گئے' یہ ختم ہو گئے۔

جن کی بادشاہت تمہارے سجدے کی رہینِ کرم ہو' انہیں تو اس کی احتیاط رکھنی پڑتی ہے کہ یہ کہیں سجدے سے قیام میں نہ آ جائے۔ اور جتنے بھی اس طرح سے اقتدار حاصل کیے ہوتے ہیں' ان کی تعزیر میں سب سے بڑا جرم کسی کا سجدے سے اٹھ کر قیام میں آ جانا ہے۔ خدا کو تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

## شرک سے خدا تعالیٰ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ انسان اپنے مقام سے ناآشنا ہو جاتا ہے

قرآن کریم نے شرک کو اتنا جرمِ عظیم کیوں قرار دیا ہے اور اسے ظلمِ عظیم کیوں کہا ہے؟ دراصل ظلم کے معنی ہیں کہ ''جس مقام پر کسی کو ہونا چاہیے' وہ اس مقام پہ نہ رہے''۔ خدا کے متعلق یہ نہیں ہے کہ جس مقام پہ خدا کو ہونا چاہیے وہ اس مقام پہ نہ رہے' بلکہ انسان کے متعلق ہے کہ جس مقام پہ انسان کو ہونا چاہیے وہ اس مقام سے نیچے گر جائے' یہ ہے ظلمِ عظیم اور یہ انسانیت کے لیے وجہِ تذلیل ہے۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اس محور کے گرد گھومتی ہے کہ انسان کو وہ اس کے حقیقی مقام سے آشنا کراتا ہے' جہاں وہ مقامِ انسانیت سے گرتا

ہے، وہیں وہ اس کو تھامتا ہے۔ اور اگر اس کے باوجود وہ باز نہیں آتا تو وہ کہتا ہے کہ یہ ظلمِ عظیم ہے، تم نے اپنے آپ کو گرا لیا ہے، یہ انسانیت کی تذلیل ہے، تحقیر ہے اور یہی شرک ہے۔ عزیزانِ من! بنیادی چیز یہ ہے کہ جب تک آپ ''عبادت'' کا ترجمہ پرستش کرتے رہیں گے ''الٰہ'' کا ترجمہ، اس معنی میں معبود کرتے رہیں گے، بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس مفہوم کے اعتبار سے شرک کے معنی صرف بت پرستی رہ جاتے ہیں، مشرک کے معنی ہی ''بتوں کو جو پوجتے ہیں وہ ہیں'' عبادت، پوجنا پرستش کرنا ہے، یہ خدا کی پرستش کرتے ہیں، وہ بتوں کی پرستش کرتے ہیں، یہ توحید ہے، وہ شرک ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ غلط تصور ہے۔

## دین کے بنیادی تصورات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر قرآنی تعلیم سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا

دین میں پرستش کا تصور نہیں ہے، دین میں تصور ''محکومیت'' کا ہے۔ عبادت کے معنی ہیں ''کسی کی محکومیت اختیار کرنا''۔ معبود یا الٰہ وہ ہے جس کی محکومیت اختیار کی جائے، اطاعت اختیار کی جائے۔ جسے کسی کے سامنے جھکنا کہتے ہیں، جھکنے کے معنی یہ ہیں۔ یہ محاورہ ہے۔ یہ سرِ تسلیم خم کر دینا کیا ہوتا ہے؟ یہ اطاعت کرنا ہے۔ اب اس اعتبار سے پہلے تو آپ دیکھیے کہ جو میں نے کہا ہے کہ جب تک یہ بنیادی تصورات (Basic Concepts) درست نہیں ہوتے، نہ قرآن کریم سمجھ میں آ سکتا ہے، نہ دین کے متعلق کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ ہے کیا بالآخر۔ بنیادی Concept (تصور) یہ ہے کہ خدا تو خدا ہے اور خدا کے بعد پھر انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے اور جونہی انسان اپنے اس مقام سے گرا، یہ وجۂ تذلیلِ انسانیت ہوا، یہ ظلم عظیم ہوا، یہ شرک ہوا۔ ''یہ گرا'' کے کیا معنی ہیں؟ مقام سے گرنے کے معنی کیا ہیں؟

## انسان کے عہدِ طفولیت میں اشیائے کائنات کے متعلق انسان کی ذہنی سطح

انسان جب اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس میں شعور نہیں تھا، یہ تاریخ کا پہلا دور تھا، علم نہیں تھا، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسے Cause & Effect (علت و معلول) کا پتہ نہیں تھا۔ انسان بالکل نہتا تھا، یہ اتنا نہتا کہ ہر جانور سے زیادہ نہتا تھا، نہ شیر کے سے پنجے تھے، نہ عقاب کی سی چونچ تھی، نہ ہرن کی سی تیز رفتاری تھی، نہ عقاب کی سی اڑان تھی، نہ مچھلی کی سی تیراکی تھی یعنی یہ اس کی کیفیت تھی کہ بالکل نہتا تھا۔ اور پھر ابتدائی دور میں جو یہاں جغرافیائی Condition (حالت) تھی، آج تو اتنا بڑا مہیب سیلاب اب آتا ہی نہیں، جو اس زمانے میں آیا کرتا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ تھے، بڑے بڑے سیلاب تھے، جھکڑ آندھیاں، زلزلے، شہاب ثاقب تھے، یہ درندے، سانپ، شیر اور چیتے تھے، جنگل بڑے بڑے مہیب تھے۔ ان سب کے مقابلے کے لیے اس کو تو ایک ہی چیز عقل انسانی دی تھی۔ عقل انسانی ابھی بچپن میں تھی۔ آپ سوچیے کہ ایک بچے کو اگر ان حالات میں چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت کیا ہوگی، انسان ہر چیز پہ لڑتا

تھا' سہم جاتا تھا' ایک ہی حربہ آتا تھا کہ مہاراج کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔ یہ جو ڈر کے مارے ہاتھ جوڑنا ہے' یہ ہے پرستش۔ سانپ بھی دیوتا تھا' شیر بھی دیوتا تھا' حتیٰ کہ بہت بڑا درخت پیپل بھی دیوتا تھا' دریا بھی دیوی تھی' اگنی بھی دیوی تھی' اندر بھی دیوتا تھا۔ یہ دیوتے کیا ہیں؟ یہ انسان کے اپنے اندر کے ڈرنے کی چیز ہے۔کیا انسان کی کیفیت یہ تھی؟

## کائنات کے معاملے میں انسان کا مقام ملائکہ کی سجدہ ریزی اور پھر جذباتِ انسانی کی سرکشی کا تمثیلی قصہ

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق تھا' اس نے اس سے کہا ہے کہ **سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا** (45:13) کائنات کی ہر قوت تمہارے لیے تابع تسخیر ہے۔اس تمثیل میں تو جب اسٹیج سے پہلا ہی پردہ اٹھتا ہے تو وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ آدم کے سامنے ملائکہ سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ''وہ تو جی' فرشتہ ہے''۔اور فرشتے اس کے حضور گرے ہوئے ہیں۔ پہلا تعارف آدم کا یہ کہہ کر ہو رہا ہے کہ کائنات کی ہر قوت اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ مقامِ انسانیت ہے۔اب باقی صرف انسان رہ جاتا ہے۔کہا ہے کہ **وَ لَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسان' انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ برابر والے کے سامنے تو کوئی نہیں جھکتا' وہ تو ساری چیزیں اس انسان کے لیے ساجد ہیں' سارے انسان یکساں واجب التکریم ہیں۔اب ان میں سے کونسا ایسا ہے جس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرا انسان جھکے۔ خارجی کائنات میں کسی شے کے سامنے جھکنا بدترین قسم کی تذلیل ہے' انسانوں میں سے کسی انسان کے سامنے جھکنا بھی باعثِ تذلیلِ انسانیت ہے۔لیکن یہ جھکنا تو ضروری ہے تو اس جھکنے کے کیا معنی ہیں؟ ڈسپلن کے بغیر تو زندگی قائم نہیں رہ سکتی' اطاعت تو ضروری ہوتی ہے۔اب کس کی اطاعت ہوگی؟ یہاں یہ جتنی قوتیں تھیں' وہ تو ساری کی ساری اس کے لیے ساجد ہوگئیں' انسان یکساں برابر ہو گئے' اب اطاعت کس کی ہے؟ بس ایک ہی چیز ہے' جسے قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ **اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ** (12:40) اطاعت صرف خدا کے قوانین کی ہے۔اسے کہتے ہیں توحید۔اور اگر خدا کے قوانین کے علاوہ اس نے کسی اور کی اطاعت اختیار کر لی تو اسے شرک کہتے ہیں' عزیزانِ من! یہ اپنے مقام سے گرا۔اور یہی چیز ہے کہ جو عبادت کے معنی قرآن کریم نے بتائے ہیں۔

## قیدخانے میں حضرت یوسفؑ کا کلمۂ حق کے سلسلہ میں کلمۂ توحید

عبادت اور حکومت کا لفظ مرادف معنوں میں قرآن حکیم نے استعمال کیا ہے' وہ خود اسے سورۃ یوسف میں واضح کرتا ہے اور کیا بات ہے اس وعظِ یوسفی کی! وہ جو خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا' اس کی تو قیدخانے میں بھی کیفیت یہ ہے کہ **يٰصَاحِبَىِ السِّجۡنِ** (12:39) اے میرے قیدخانے کے رفیقو! سوچو تو سہی کہ **ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَيۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ** (12:39) فرعونِ

مصر کی بادشاہت کے قیدی لوگ جو اس کے ملازم تھے' ان سے یہ وعظِ یوسفی کیا جا رہا ہے۔ مقام دیکھیے کہ فرعون ہے' اس کے دو ملازم ہیں' اور پھر وہ خود ملزموں کی حیثیت سے قید خانے میں ہیں۔ اس کا کتنا مقام ارفع ہے! اور ان کا مقام کتنا گرا ہوا ہے! وہاں یہ خدا کا پیغامبر' ان سے یہ کہتا ہے کہ اس سجدے سے اٹھو' تم کیا کر رہے ہو۔ یہ تمہارے اپنے ذہنوں کے گھڑے ہوئے' تراشے ہوئے' بڑے بڑے حاکم ہیں جن کے سامنے تم سجدہ ریز ہوتے ہو' سوچو تو سہی! کیا یہ بندگی کی اچھی شکل ہے کہ ایک ایک ضرورت' ایک ایک حاجت کے لیے' ایک ایک دروازے پہ دستک دی جائے ان میں ہے کوئی ایک جو فی الحقیقت صاحبِ قوت ہو' صرف اس کے سامنے جھکا جائے۔ تم بتاؤ دونوں میں سے کونسی شکل اچھی ہے؟

## ایک ملازم اور کئی آقا یا صرف ایک آقا جو تمام ضروریات پوری کرے؟

چھوٹی سطح پر ملازم ہیں' ان سے کہا جاتا ہے کہ بتاؤ تو سہی کہ اگر تمہیں دس کا ملازم کر دیا جائے اور دس ایسے ہوں کہ ہر ایک کا مزاج الگ الگ ہو' ہر ایک کے تقاضے الگ الگ ہوں' ایک ملازم ہو اور دس ہوں اس کے آقا' یہ ایک ملازم تو ''آ گھر دے نوکر دی' بچے تے مت ماردیندے ہیگے'' (گھر کے نوکر کی بچے مت مار دیتے ہیں)۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے اسکول چھوڑ کر آؤ' وہ کہہ رہا ہے میرے لیے بازار سے پان لے کر آؤ' یہ کہتا ہے کہ جلدی سے چائے دؤ' وہ کہتا ہے میرا جوتا پالش کرؤ' او میں کیا کروں کیا نہ کروں' جس کا کام نہیں کرتا وہ روٹھ جاتا ہے' شکایت لگا دیتا ہے' وہ نوکر مصیبت میں آ جاتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (12:39) ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے اور دوسرا شخص بیک وقت بیس مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ان میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ ظاہر ہے کہ اُس کی زندگی اچھی ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔ سوچو تو سہی۔ اور پھر ان ارباب نے یہ نہیں کہا کہ چلو' ان دس میں سے ایک چن لو' ایک کے نوکر ہو جاؤ' وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے' ان دس میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہے کہ تم اس کی ملازمت کرو۔ وہ اس سے بلند و بالا ہے۔ اور پھر اس کا تعلق ہمارے ساتھ شخصی اور Personal (ذاتی) نہیں' صرف قانون کے اعتبار سے ہے۔ وہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ شخصی اطاعت نہیں ہو رہی۔ کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) یاد رکھو! حق حکومت تو صرف اس کو حاصل ہے' کسی دوسرے کو نہیں۔ یہ ''ارباب'' کہہ کر پھر یہ حق حکومت کی بات کرنا' کتنی گہری چیز ہے!

## بھوک کی احتیاج شیر کو اشاروں پر ناچنے پر مجبور کر دیتی ہے

کوئی کسی کی اطاعت نہیں کرتا' کسی کی بات نہیں مانتا تاوقتیکہ اس کی احتیاج نہ ہو' وہ اس کا محتاج نہ ہو۔ حکومت اس طرح سے قائم

رکھی جاتی ہے کہ پہلے محتاج کیا جاتا ہے، پھر حکم منوایا جاتا ہے۔ یہ سرکس کا شیر آپ کے اشاروں پر کیوں ناچتا ہے؟ اس لیے کہ اسے بھوکا رکھا جاتا ہے، یہ راز ہے۔ یہاں **اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ** (12:39) کہا ہے۔ قرآن کریم ہے، عزیزانِ من! یہاں الٰہ نہیں کہا، اس نے ارباب کہا ہے۔ یہ احتیاج ہے جو تمہیں دوسروں کے دروازے پہ لے جاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا حکم مانتے ہو۔ اگر ربوبیت اس کے ہاتھ میں رہے تو حکومت تو اسی کی ہوگی۔ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** (12:40) یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ آپ دیکھیے جو میں کہہ رہا تھا کہ وہاں تو عبادت کے معنی ہی ''حکومت'' ہیں۔ ''حکم'' کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ **اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ** (12:40) ''اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔ یہاں حکم اور عبادت دونوں اکٹھے آ رہے ہیں۔ یہاں سے آپ کی نگاہوں کا رخ پھیرا تو دین مذہب میں تبدیل ہوا، عبادت کے معنی پرستش ہو گئے۔

## مذہب سراپا محتاجی ہے، دینِ خداوندی انسان کو اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ** (12:40)۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں یہ **"اِيَّاهُ"** کہاں آیا کرتا ہے اور یہ وہی ہے جو آپ دن میں چوالیس بار کہتے ہیں۔ یہ تو کم از کم نماز کی ہر رکعت میں کہتے ہیں کہ **اِيَّاكَ نَعْبُدُ**(1:4) کسی اور کا حکم نہیں صرف تیرا ہی حکم مانتے ہیں۔ اب اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ صاحب! اسلام کیا ہے، اس کی تفصیل کیا ہے، اس کی جزئیات کیا ہیں۔ ٹھیک ہے تفاصیل میں جائیے تو کتابوں پہ کتابیں لکھی ہیں:

تفصیل معنیٔ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

اس نے کہا ہے کہ **ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ**(12:40) یہ ہے دینِ قیم۔ بات ختم کر دی ہے۔ کہا ہے کہ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ**(12:40)۔ قیم وہ ہوتا ہے جو اپنے مقام پہ خود قائم ہو اور دوسرے کے قیام کا ذریعہ بنے۔ اے انسان! تیرے قائم کرنے، تیرے کھڑا رکھنے کا طریقہ یہ دین ہے، یہ نظام ہے۔ وجۂ قیامِ انسانیت نظام یہ ہے کہ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ** (12:40) اختیارات و اقتدارات کا مالک خدائے واحد ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کو حقِ حکومت دے کر ان کے احکامات ماننا شرک ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! جسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے شرک کی مختلف نوعیتیں بتائی ہیں اور یہ وہ ہیں جو اس سے پیشتر عام طور پر

---

❶ ایا ۔اس میں تخصیص کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ تنہا نہیں آتا بلکہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً ایاک نعبد(1:4) ہم تیری ہی محکومی اختیار کرتے ہیں۔

مذہب کی دنیا میں رائج تھیں۔ کہا ہے کہ وَلَا تَـكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا (30:31:32) دیکھنا کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کیے اور خود بھی ایک فرقہ بن بیٹھے۔ یہاں پھر وہ ''شرک'' آیا ہے یعنی دین میں فرقے نہ پیدا کر لینا۔

## متضاد احکامات کی عمل داری باہمی تفریق کو جنم دیتی ہے جو شخصیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے

بظاہر نظر نہیں آتا کہ یہ جو فرقہ ہے' یہ شرک کیسے ہوا۔ وہ جو ایک کا ملازم ہے' ایک ہی کا حکم مانتا ہے' اسے معلوم ہے۔ اس کے برعکس وہ جو دس کا ملازم ہے اس کے سامنے دس مختلف قسم کے احکام آئیں گے۔ یہ فرقہ ہوتا کیا ہے؟ یہاں تو یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) محکومیت صرف اس کی ہے' ایک حاکم ہے' ایک ہی اس کا ضابطہ قوانین ہے۔ گھر کے اندر دس ملازم ہوں' ایک آقا ہو وہ ان کو احکام دے' ان میں کبھی کسی قسم کا تفرقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تقسیم عمل تو ہو سکتی ہے' مختلف کام تو وہ کرتے ہیں' مختلف آقا نہیں ہوتے۔ اگر ایک ہی ضابطہ قانون ہو' ایک ہی کی محکومت ہو' تفرقے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس نے اس طرح سے امت واحدہ بنائی تھی کہ ایک ہی کی محکومیت اختیار کرنے والے ہوں' ان میں اختلاف وافتراق نہیں ہو سکتا۔ جہاں فرقہ ہے' آپ دیکھیں گے کہ جب بھی ان کو اس مذہب کی سند پر لے جائیں گے' کسی نہ کسی انسان پہ جا کر سند رُکے گی' جبھی تو مختلف فرقے بنتے ہیں' فرقہ ہمیشہ کسی شخصیت کا جا کر منتہا ہوتا ہے ورنہ ایک خدا کے احکام ماننے والے اگر دس کروڑ چھوڑ' سو کروڑ انسان بھی کیوں نہ ہوں' ایک ہی کا حکم ماننے والے ہوں تو ان میں فرق کیسے آئے گا' افتراق کیسے ہوگا' تفرقہ کیسے ہوگا' ان میں اختلاف کیسے ہوگا؟ آپ کہیں گے کہ صاحب! وہ جس چیز کا حکم مان رہے ہیں' اسی کے اندر وہ مختلف قسم کے فرق ہوں' پھر تو ٹھیک ہے۔ اور اس نے قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ جس چیز کی اطاعت کرائی جا رہی ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں تو یہ جو اطاعت کرنے والے ہیں' ان میں پھر اختلاف کیسے ہو جائے گا۔

## اگر پرستش کے لفظ کو محکومیت میں بدل دیں تو فرقے ختم ہو جائیں گے

برادرانِ عزیز! آج اختلاف آپ کے سامنے موجود ہے' فرقے آپ کے سامنے موجود ہیں' اس کے بعد کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم ایک کی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہیں؟ پرستش میں تو یہ چیز ہو سکتی ہے کہ کوئی بات نہیں صاحب! گنگا ایک' گھاٹ بہتیرے' وہ ایک گنگا بہہ رہی ہے' گھاٹ کا فرق ہے' کوئی یہاں ہے کوئی وہاں ہے۔ پرستش میں تو یہ ہے کہ صاحب! اس طرح سے نماز پڑھ لو جب بھی ہو جاتی ہے' ویسے پڑھ لو پھر بھی ہو جاتی ہے لیکن جب اس کے معنی محکومیت کے ہو جائیں گے تو پھر تو یہ نہیں ہوگا کہ کسی کا حکم یوں

مان لیا جائے پھر بھی ٹھیک ہے' دوسرا مان لیا جائے' پھر بھی ٹھیک ہے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا۔

عزیزانِ من! آپ ایک مملکت میں دو قانون نہیں چلا سکتے' وہ تو بغاوت ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس نے فرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے کہ یہ ایک خدا کی محکومیت نہیں ہوتی' یہ ارباب متفرق ہوتے ہیں' مختلف خداؤں کی محکومیت ہوتی ہے۔ سمٹ سمٹا کر اسلامی نظام بنانے والے دعویٰ کر کے یہاں لے آئے کہ صاحب! فقہ حنفی کی پیروی ہوگی۔ جھٹ سے اہل حدیث نے کہہ دیا کہ تم کون ہوتے ہو ہم سے فقہ حنفی کی پیروی کرانے والے۔ دیکھا آپ نے شرک کیسے آیا! ہر فرقے نے Protest (احتجاج) کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا صاحب! اس کی نہیں' پھر کیا تمہارے فرقے کی فقہ کو مان لیا جائے' کیا یہ وہی بات نہ ہوئی یعنی بات الگ چل ہی نہیں سکتی' شرک مٹ ہی نہیں سکتا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) یاد رکھو! حقِ حکومت اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ یہاں جا کر شرک مٹتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس نے فرقے کو شرک قرار دیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جو بت پرستی ہے یہ شرک ہے اور وہ جو تفرقہ ہے یہ بھی شرک ہے' قرآن مجید نے ان دونوں کے درمیان فرق کر کے دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں میں کونسا شرک ایسا ہے جو شرکِ عظیم ہے۔ یہ چیز بڑی غور طلب ہے اور پہلے بھی آ چکی ہے۔

## ملت میں نئے نئے فرقوں کے بتوں کو جنم دینے کے لیے قوم کا زیور ہی استعمال ہوتا ہے

حضرت موسیٰؑ چند دنوں کے لیے قوم سے الگ ہو کر جاتے ہیں' اپنے بھائی (حضرت ہارونؑ) کو جو خود نبیؑ ہے انچارج بنا جاتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں سامری قوم ہی کا زیور لیتا ہے' ان کے لیے ایک بت گئو سالہ بنا دیتا ہے۔ یہ سامری سارے زیور قوم سے ہی لیتے ہیں ''سارا فنڈ ایناں کولوں کٹھا کر دے نیں'' (تمام فنڈ انہی سے اکٹھا کرتے ہیں) پھر پرستش کراتے ہیں۔ اب انہوں نے تو اس گئو سالہ کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت موسیٰؑ نے واپس آ کر دیکھا' انہوں نے کہا کہ ستیاناس ہوا! اس قوم پر اتنی محنت کی اور یہ تو پھر بچھڑا بنا کر پوج رہی ہے' بت پرستی کر رہی ہے۔ حضرت ہارونؑ پر غصہ آیا کہ میں تمہیں انچارج بنا کر گیا تھا' تم ان میں بیٹھے ہوئے تھے' تمہارے سامنے یہ کچھ ہوا' تم نے ان کو روکا نہیں ہے۔ ایک نبیؑ دوسرے نبیؑ سے پوچھ رہا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جواب کیا دیا حضرت ہارونؑ نے؟ انہوںؑ نے کہا کہ میرے سامنے یہ ہو رہا تھا' میں دیکھ رہا تھا کہ یہ بت پرستی کر رہے ہیں' میں نے اس لیے نہ روکا کہ روکنے سے ان کے اندر اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا تو میں ڈرتا تھا کہ تم مجھ سے آ کر کہو گے کہ تم نے اس قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ میں نے ان کی جو بت پرستی تھی' اس کو قبول کر لیا' میں نے تفرقہ نہیں پیدا ہونے دیا' کہو ٹھیک کیا یا غلط کیا؟ نبیؑ کا جواب سنا' نبیؑ مطمئن ہو گیا کہ ٹھیک کیا۔ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ یہ بت پرستی جہالت ہے' ان کو ذرا سی بھی بصیرت سے بات کی جائے گی تو سمجھ

میں آ جائے گی کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔ اور تفرقہ شرک ہے' ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو مٹا ہی نہیں کرتا۔

## آج ہم فرقہ بندی کی گرہوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے میں مصروف ہیں

عزیزانِ من! فرقہ پرستی یہ چیز ہے۔ بت پرستی کا شرک یہ شرک نہیں۔ سارے فرقے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ ان کی گرہیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن ہم بت پرستی نہیں کرتے۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو فخر سے بت شکن کہتا ہے' ہر فرقہ پرست اس چیز پر فخر کر رہا ہے۔ ہر روز اہل حدیث کی یا جو وہابی کہلاتے ہیں اور یہ جن کو بدعتی کہتے ہیں' کی سر پھٹول ہو رہی ہے۔ یہ کس بات کے اوپر ہے؟ مزاروں پہ جا کر تم دونوں فرقے سجدہ کرتے ہو۔ یہ ان کو مطعون کر رہے ہیں کہ تم شرک کر رہے ہو' وہ ان کو مشرکین کہتے ہیں' خود فرقے پر پابند ہیں' ہمارا فرقہ یہ نہیں کرتا' سبحان اللہ!!! کیا توحید پرستی ہے صاحب!!! یہ تو صرف قبروں پہ جانے کی بات کہہ رہے ہیں' وہاں تو کیفیت یہ ہے کہ گئو سالے کی پرستش ہو رہی ہے' (حضرت ہارونؑ) کہتے ہیں کہ میں نے اس چیز کو برداشت کر لیا کہ یہ ہونے دیجئے' کوئی بات نہیں' جہالت ہے' قوم کو سمجھالیں گے' میں نے تفرقہ نہیں پیدا ہونے دیا' کہیے بھائی صاحب! غلط کیا یا ٹھیک کیا؟ یہ ہے تفرقہ جس سے شرک بنتا ہے۔

## نبی اکرم ﷺ کے الفاظ میں شرک کرنے والوں کی نشاندہی

یہ کون ہیں جو شرک بناتے ہیں؟ قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ احبار و رہبان' علما اور مشائخ ہیں۔ **اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (9:31) یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو' خدا سے ورے ہی' اپنا خدا بنا لیتے ہیں اور ان کی خود ساختہ شریعت کو دینِ خداوندی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ یہاں وہی ارباب کا لفظ آیا ہے۔ یہ اہل کتاب' اپنے علما اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیتے ہیں۔ یہ ہے شرک۔ روایت میں یہ آیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے یہ کہا تو یہودیوں میں سے ایک نے کہا کہ ان سے پوچھیے کہ یہ ہمارے خلاف کیا الزام لگا رہے ہیں' غلط ہے جو یہ کہہ رہے ہیں' ہم تو اپنے علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ان سے پوچھیے کہ کیا یہ بات نہیں کہ جس چیز کو وہ حلال قرار دیتے ہیں' یہ حلال سمجھتے ہیں' جسے وہ حرام کہتے ہیں' یہ حرام سمجھتے ہیں' کیا ان کی بنائی ہوئی شریعت کے اوپر نہیں چلتے؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے' تو کہنے لگے دین میں اس سے بڑا شرک پھر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ اکبر!

## فقہ کے نزدیک ایک دشواری کا حل

مذہب میں کوئی مسئلہ آپ ان سے پوچھیے اور فتویٰ لیجیے تو وہ بتائیں گے کہ صاحب! فقۂ حنفی کی رو سے اس میں یہ چیز ہے۔ اور اگر کہیں ان کو دشواری پیش آتی ہے۔ دشواری کی مثال آپ کو بتاؤں۔ فقۂ حنفی میں یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند مفقود الخبر ہو جائے یعنی

پتہ نہ چلے کہ کہاں چلا گیا ہے' گم ہو جائے تو سوال یہ ہے کہ وہ کب تک اس کا انتظار کرتی رہے کہ آئے یا نہ آئے وہ پھر کیا کرے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! یہ بات نہیں ہے کہ وہ انتظار ہی کرتی رہے' اسے صرف نوے برس انتظار کرنا چاہیئے' بس اس کے بعد وہ شادی کر سکتی ہے۔ اس میں اُنہیں دشواری آ پڑی۔ ان کے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کہیں ایک امام کی فقہ[1] میں کوئی دشواری پیش آئے تو انہوں نے کہا کہ امام مالکؒ (93-179/709-795ھ) کی فقہ کی رو سے فیصلہ کرلو' انہوں نے چار سال کہا ہوا ہے۔ یعنی آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ایک امام کی فقہ میں دشواری آئی تو یہ نہیں کہ خدا سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کہا کہ یہ نہیں! امام مالکؒ سے پوچھ لو کہ وہ کیا کہتا ہے' وہاں نہیں تو امام حنبلؒ (164-241/780-855ھ) کے ہاں چلے جاؤ' پھرتے رہوا نہی بتوں کے اندر' نہ جانا اس کے اوپر جس نے کہا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:40)۔ صحیح بخاری میں یہ آیا ہے' صحیح مسلم میں یہ لکھا ہے' ترمذی کا یہ حکم ہے' امام ابوحنیفہؒ (80-150/699-767ھ) کا یہ ارشاد ہے۔ یہ سارا کچھ کہتے چلے جائیں گے' نہ زبان پہ آئے گا تو صرف یہ کہ خدا کا یہ ارشاد ہے۔ آپ ان کے فتوے میں کبھی یہ لکھا ہوا نہیں دیکھیں گے کہ اس بات کے اندر خدا نے یہ کہا ہے۔ عزیزانِ من! اس کے بعد بھی کوئی اور شرک ہوسکتا ہے۔ خود جھکتے ہیں' ساری امت کو جھکاتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کن کے سامنے جھکاتے ہیں؟ انسانوں کو انسانوں کے سامنے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ پوچھوان سے اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (9:31) اور ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے' یہ احبار و رہبان' عیسائیوں کے متعلق ہے' شرک ہندوؤں کے متعلق ہے صاحب! یہ جو سارا قرآن کریم ہے یہ اُن کے متعلق ہے پھر تمہارے متعلق کیا ہے؟ کہ جی یہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت' خدا کی مغفرت' جنت فی سبیل اللہ! ''ایناں نوں پاس Issue (جاری) ہوگئے ہیگے نیں تھیٹر دے'' (انہیں تھیٹر کے داخلہ پاس مل چکے ہوئے ہیں)۔ قرآن کریم میں ان کا اتنا ہی حصہ ہے۔ کیا کہا جائے!

---

[1] ائمہ فقہا: چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لیے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی:

1۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ (کوفی)۔ (80-150/699-767A.D ھ): فقہ حنفی

2۔ امام مالکؒ بن انس (یمنی' مدنی)۔ (93-179/709-795A.D ھ): فقہ مالکی

3۔ امام شافعیؒ ابوعبداللہ محمد بن ادریس (عسقلانی۔ مکی)۔ (150-204/767-820A.D ھ): فقہ شافعی

4۔ امام احمد بن حنبلؒ' بغدادی۔ (164-241/780-855A.D ھ): فقہ حنبلی

اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہیں۔ (پمفلٹ فقہی قوانین کی دینی حیثیت' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ص۔ 9)

## شرک کے معاملے میں حق وباطل کی جنگ کے دوران جذبات کی کیفیت

عزیزانِ من! احبار ورہبان یہ ہیں جہاں سے فرقے بنتے ہیں۔اور پھر شرک کا کیا پوچھتے ہیں' قرآن حمید تو بہت دور جاتا ہے۔ ایک طرف خدا کا حکم ہے' ایک طرف میرے اپنے جذبے کا تقاضا ہے۔کہیں بڑی خوبصورت قیمتی چیز رکھی ہے' بہت جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھالوں' کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' ایک طرف سے یہ تقاضا ہے' دوسری طرف اس کا حکم ہے کہ نہیں! باطل کا مال ناجائز ہے' اسے نہیں لینا حتیٰ کہ اس نے کہا ہے کہ دل میں اس کا خیال تک بھی نہ کرنا' اس کا ارادہ بھی نہ آئے۔دو خداؤں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی' عزیزانِ من! اس میں سے کس کی اطاعت کی جائے۔یہی ہے خدائی۔اِس کی اطاعت کی جائے یا اُس نے کہا ہے' اس کی اطاعت کی جائے۔دیکھیے! وہ جو توحید کی تعلیم دیتا ہے' وہ کیا کہتا ہے۔کہتا ہے کہ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا' جو اپنے ہی جذبات کو خدا بنا کر بیٹھ گیا۔یہ باہر کے خداؤں سے تو آزادی حاصل کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے یعنی بہر حال حاصل ہوسکتی ہے' مشکل کے بعد ہی سہی مگر یہ جو اس نے اپنے اندر خدا رکھا ہوا ہے' یہ سب سے بڑا خدا ہے اور سب سے بڑی مشکل اس کی خدائی سے چھوٹنا ہے۔اچھا بھلا عقلمند آدمی' صاحب فکر' دانا' بینا' سوچ سمجھ رکھ رہا ہے' اس کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا حرکت کر بیٹھتا ہے۔ایسی حرکت کہ اس کے بعد دوسرے تو ایک طرف کہ او تمہیں کیا ہو گیا تھا' تم اتنے سمجھدار اور ہوش رکھنے والے آدمی ہو' یہ کیا کیا تم نے' خود اپنے متعلق اس کے بعد کہا کہ صاحب! یہ مجھ سے کیا حماقت ہوگئی' پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔

## کائناتی خدا سے ہٹ کر اپنے جذباتی خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نتیجہ

یہ کیا ہوا؟ قرآن کریم سے پوچھیے۔کہتا ہے کہ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ (45:23) کیا تُو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی خواہشات کا تقاضا ہے۔تم نے دیکھا کہ علم رکھنے کے باوجود کہ یہ بات غلط ہے جو میں کر رہا ہوں' وہ اس خدا کی ایسی اطاعت کرتا ہے اور غلط راستوں پر چلے جاتا ہے۔علم رکھنے کے باوجود اس سے مغلوب ہوا جا رہا ہے' وہ ایسا جہالت میں نہیں کر رہا' جانتے بوجھتے' علم رکھنے کے باوجود یہ کر رہا ہے۔کہا ہے کہ کیا ہو جاتا ہے اس کو؟ آگے قرآن کریم کہتا ہے کہ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) یوں نظر آتا ہے گویا اس کے کانوں اور دل پر مہریں لگ چکی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اسے نہ کچھ سنائی دیتا ہے' نہ دکھائی دیتا ہے۔اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جونہی آپ نے اس خدا کی پرستش کی' آپ سجدے میں گرے' آپ کے کان بھی بند' آپ کی آنکھیں بھی بند' آپ کے دلوں پہ بھی مہر' سمجھنے سوچنے کی ساری قوتیں مفلوج اور اس خدا کے پیچھے آپ نے جھک ماردی صاحب!

اس سے جذبے کی تسکین ہوئی' جب عقل وفکر پھر لوٹ کر واپس آئی تو آپ خود اپنے کیے پہ نادم ہو رہے ہیں کہ میں نے یہ کیا کیا ہے۔ ساری دنیا آ کر کہتی ہے کہ اتنے سمجھدار آدمی ہو کر تم نے یہ کیا کیا۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا۔ کہا ہے کہ **فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ** (45:23) ذرا سوچو کہ جو شخص اس طرح اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وحی خداوندی کے علاوہ وہ کونسی طاقت ہے جو اس کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کر سکتی ہے؟ جو یوں جانتے بوجھتے اس طرح سے دوسری روش اختیار کر لے' خود اپنے اندر ایک خدا بنا کر رکھ لے' اسے کون راستے پہ لائے؟ دیکھتے ہیں قرآن حمید کہاں تک شرک کو لے جا رہا ہے!

## انسان کی انسانیت کا تحفظ اس میں ہے کہ وہ اپنے سامنے بھی سرِ تسلیم خم نہ کرے

عزیزانِ من! اس نے خارجی قوتوں سے چھڑایا کہ ساری کائنات کی قوتیں تیرے سامنے سجدہ ریز ہیں' انسانوں سے چھڑایا کہ ہر انسان یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس سے آگے تو کسی کا ذہن نہیں جا سکتا تھا' اس سے آگے خدا ہی تھا جو کہہ سکتا تھا کہ تم اپنے سامنے بھی نہ جھکو۔ اف!! یہ بہت بڑا مقام ہے' عزیزانِ من! آپ سوچیے تو سہی۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس مقام سے گر گیا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو قرآن حمید نے کہا ہے۔ کتنے خوبصورت الفاظ میں کہا ہے! کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ یہ جو شرک کا مرتکب ہو جاتا ہے' وہ مقامِ انسانیت سے گرتا ہے۔ شرک میں کیا کیفیت ہو جاتی ہے؟ اللہ اکبر! سنیے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ **وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ** (22:31) جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا' وہ مقام انسانیت سے گرا۔ کہا ہے کہ اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ وہ انسان کہ جس کے تابع فرمان فطرت کی ساری قوتیں ہیں' فرشتے بھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں' کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ اس سے اپنی اطاعت کرائے جو اس مقام سے گرنے والا ہے' پھر قرآن حمید کہتا ہے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ **فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ** (22:31) یوں سمجھو کہ وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گیا۔

## انسان کا شاہین جب جذبات کے کرگسوں میں الجھ جائے تو پھر اس کی پرواز میں کوتاہی واقع ہو جاتی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں خدا کا کچھ نہیں بگڑ رہا' وہ تو اپنے مقام پر ہے' اسی کے متعلق کہا ہے کہ جس نے خدا سے شرک کیا' یوں سمجھو کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا۔ **فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ** (22:31) یہ اتنا بڑا شہباز اور شاہین ہے' یہ ان فضاؤں کے اندر اڑنے والا ہے' ہر پرندہ اس سے ڈرتا ہے' خوف کھاتا ہے' اس کے متعلق کہا کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ ''جونہی اس نے کسی اور خدا کو' کسی اور قوت کو' خدا بنایا اور اس کے آگے جھکا' تو اس کی کیفیت یہ ہو گئی کہ جیسے چڑیا کے چھوٹے سے بچے کو عقاب اچک کر لے جاتا ہے''۔ اسی طرح جس قوت کے جی میں آئے وہ اس کو اچک کر لے جائے۔ اور باہر کی قوتیں تو ایک طرف رہیں' یہ کم

بخت اندر کے عقاب بھی اس کو اچک کر لے جاتے ہیں۔ کیا تشبیہ دی ہے! ''چڑیا دا بچہ' بوٹ کیندے نیں پنجابی اچ'' (چڑیا کا بچہ جسے پنجابی میں ''بوٹ'' کہتے ہیں) ایک دن کا جو نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے' وہ کتنا بے کس و بے بس ہوتا ہے' جس میں خود اڑنے کی قوت تھی' اس کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ جس پرندے کا جی چاہے اس کو اچک کر لے جائے۔ یہ کیفیت ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے قرآن کریم سمجھا تا سمجھا تا تھکتا نہیں ہے۔ کہا ہے کہ ایسے شخص کی مثال یوں سمجھو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ گر گیا اور ایسا بے کس اور بے یارو مددگار رہ گیا جیسے ایک نوزائیدہ بچہ ہے اور جسے عقاب اچک کر لے جائے۔ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ (22:31) یا یہ کہ ایسا کمزور و ناتواں ہو گیا کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے پر کاہ کی طرح اڑائے پھرے اور کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے۔ پھر سنیے کہ یہ خس و خاشاک گھاس کا ایک تنکا جھکڑ کے سامنے ہے اور ہے ایسے جیسے وہ اس کو اڑائے چلا جا رہا ہے کہ جدھر سے زور کی ہوا چلی' یہ اس طرف اڑ گیا صاحب! کہا ہے کہ شرک میں یہ ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ! کہ انسان اپنے مقام سے گر رہا ہے' خدا کا کچھ نہیں بگڑ رہا۔ یہ ہے شرک۔

## صدیوں سے دنیا بھر کی لاکھوں مساجد میں پانچ مرتبہ کئی کئی بار حی علی الفلاح کا مقصدِ عظیم اور ہماری حالتِ زار

عزیزانِ من! اس کے بعد پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ کہا کہ پھر لوگ اس شرک میں اتنے راسخ ہو جاتے ہیں' وہ ان چیزوں کے اندر لذت لینے لگ جاتا ہے۔ پھر وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ (39:45) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں کہا جائے کہ بھئی! ایک خدا ہے' صرف اس کے قوانین کے سامنے جھکو' کیوں ایک ایک آستاں کے اوپر دستکیں دیتے ہو اور جھولیاں پھیلاتے ہو' کیوں اپنی ذلت کرتے ہو' کیوں اپنی تحقیر کر رہے ہو؟ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل مسوس کر رہ جاتے ہیں' انہیں یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ان خداؤں کی عظمت اور عقیدت اس طرح مستولی ہوتی ہے کہ وہ یہ سن نہیں سکتے' آپ اس کو بلا بلا کر لا رہے ہیں کہ آؤ' ایک خدا کے سامنے جھکو' چھوڑ وان آستانوں کو' چھوڑ وان خداؤں کو۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے یہ دلگرفتہ ہو جاتے ہیں' جرأت نہیں کر پاتے۔

اتنے ہی ٹکڑے کے اوپر آیئے' عزیزانِ من! خدا کرے کہ آپ تو ان بندھنوں میں نہ پھنسے ہوئے ہوں۔ جو کوئی پھنسا ہوا ہے' اس سے پوچھیے۔ حضرت صاحب کے متعلق اسے کہہ کر دیکھیے کہ صاحب! وہاں نہ جانا' ان کے ہاں جا کر سجدہ نہ کرنا' یہ تو بڑی بُری چیز ہے بلکہ آپ یہ کہیے کہ تمہارے حضرت صاحب کیا قوت رکھتے ہیں' ان کو کیا اقتدار ہے' جواب یہ ہوتا ہے کہ ارے توبہ کرو' صاحب! اللہ سے معافی مانگو' یا اللہ! مجھے اس شیطان کے فریب میں نہ لے آنا۔ اور وہ وہیں بیٹھا ہوا' اس سے ڈر رہا ہے۔ ''حضرت صاحب! میں

نے آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی''۔خواب میں کہیں اگر حضرت صاحب کی جوتی جو رہ گئی ہے وہ انہیں نہیں دی تو صبح اٹھ کر صاحب! سجدے میں گرا ہوا ہے' حضرت صاحب سے معافیاں مانگ رہا ہے کہ حضور گستاخی ہو گئی' معاف کر دیجیے۔اور یہ تو معلوم نہیں کہ آپ نے دیکھا ہے یا نہیں کہ وہاں گئے ہیں سلام کیا ہے' انہوں نے بغیر ہاتھ ملائے ہوئے جواب دیا ہے' اتنے میں ہی صاحب! گڑ گڑا رہے ہیں کہ یا حضرت! میں مارا جاؤں گا' کہیں کا نہیں رہوں گا' مجھے نہ دھتکاریئے' مجھے راندۂ درگاہ نہ بنایئے۔حضرت صاحب ہیں کہ وہ سو من مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں' ہڈیاں بوسیدہ ہو رہی ہیں' وہاں جاتے ہیں' جا کر پہلے سجدہ کرتے ہیں' پھر اٹھنے کے بعد آپ کو پتہ ہے' پچھلے پاؤں لوٹتے ہیں' ڈر رہے ہیں' کانپ رہے ہیں۔انسان اس کا اتنا خوگر ہو جاتا ہے۔اس کی مثال بالکل وہ ہوتی ہے جو پنجرے میں پڑا ہوا تیتر ہوتا ہے' صبح کے وقت جب اسے سیر کرانے لے جاتے ہیں گویا کہ یہ مانا پہلوان ہے' وہ پنجرہ ہوتا ہے' اس میں تیتر لے جاتے ہیں' باہر جاتے ہیں' پنجرے کا دروازہ کھول دیتے ہیں' تیتر پیچھے پیچھے ہوتا ہے' پنجرہ آگے آگے ہوتا ہے۔ درختوں کے آزاد جانور چہچہا رہے ہیں' اسے آوازیں دے رہے ہیں کہ چھوڑ ان بندھنوں کو' اس قید خانے سے نکلو' آزادی کی فضا دیکھو' وہ آوازیں دے رہے ہیں' یہ ڈر کر' بھاگ کر' پنجرے کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔اس کا دروازہ بند ہے تو چونچیں مار مار کر کھولتا ہے اور جونہی وہ پنجرے کا دروازہ کھلا' اندر گیا۔پھر بس یوں ہے کہ تین نوافل پڑھو شکرانے کے۔

نے تیر کماں میں ہے' نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(غالبؔ)

''حضور کے دامنِ پناہ میں آ گیا ہوں تو سارے خطروں سے مامون ہو گیا ہوں''۔یہ کیفیت ہوتی ہے۔شرک یہاں لے جاتا ہے۔

## غیر قرآنی سوچ انسان کو فکری طور پر نہایت پست سطح پر لے جاتی ہے

اب قرآن حکیم کہتا ہے کہ انہیں جب یہ دعوت دو کہ بابا! وہ ایک ہے جس کے سامنے جھکنا ہے اور کسی کے سامنے نہیں جھکنا' کہتا ہے کہ وہ دل گرفتہ ہو جاتا ہے' کہتا ہے کہ اوتوبہ کرو' حضرت صاحب کی شان میں کیا کہہ رہے ہو۔قرآن حکیم بتاتا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) خدا کے بعد جب ان کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ سبحان اللہ! اللہ خوش رکھے تمہیں' آج آپ نے بات کہی۔میں کہتا تھا کہ تم ایک دن یہاں آؤ گے صاحب! چلے جاؤ منکر ہو کر' حضرت صاحب نے مجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی بات نہیں اس کو ہم لے آئیں گے' دیکھو تم! ایک دن کیسے آتا ہے! اس پہ خوش ہو رہے ہیں' شیرینی بانٹ رہے ہیں حضرت

صاحب۔ جب خدا کے علاوہ ان معبودوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو سن کے بہت خوش ہوتا ہے ''یارہویں والے دی نیاز اں دین ڈیا ہے' ستارہویں والے دی دیگ چڑھان ڈیا ہے' دیوے بالدا پیا ہیگا❶ ''۔خدا کے علاوہ جب کسی کا ذکر کیا جاتا ہے تو یوں بلیوں اچھلتا ہے۔ یوں خوگر ہوجاتا ہے انسان ان باطل کے خداؤں کی پرستش کا۔اور پھر عرض کردوں کہ صاحب! ان خداؤں کی پرستش کو چھوڑ دیجیے۔آپ کے اپنے جذبے کے الٰہ کا کوئی حکم ہو یا آپ کا جو تقاضا ہے' وہ کتنا ہی ان قوانین کے خلاف کیوں نہ ہو' جب آپ کا ہر نا جائز حربہ استعمال کرنے کے بعد مقصد حاصل ہوجاتا ہے' تو پوچھیے نہیں آپ کی خوشی کا۔یہ ہے اِذَا ھُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (39:45)۔قرآن کریم کہتا ہے کہ باچھیں کھل جاتی ہیں۔''ہاں! آج تو ریس میں ہمارا نمبر نکل آیا صاحب! ماردیا صاحب!''۔اور پھر اس کے بعد خدا کی نیاز بٹتی ہے' او تیرا ستیاناس!! کبھی آ جاتا ہوگا اس میں کہ وہاں تو یہ پولیس والا تھا' پانچ اس کو تھمائے' او پر وہاں بیٹھا ہوا تھا' پانچ سو اس کو بھی بھیجا' گھر آ جاتا ہے تو ''لےتوں وی پکڑ لے دو دیگاں اونوں وی دیدتیاں نیں'' (لے تُو بھی لے جا' دو دیگیں اسے بھی دے دیں)۔انسان اس چیز کا عادی ہوگیا ہے کہ رشوت دینے سے بچ جاتا ہے۔یہاں وہاں سب کو رشوت دی' پھر دربار داتا صاحب پہ جا کر دی اور اس کے بعد پھر صاحب ''نذر اللہ نیاز حسین'' ان کو بھی بیچ میں لیا ''ہن بولو بچو کس طراں بولدے او اوس دن کھادا سی پُلا❷ ''۔اللہ کو بھی پُلاؤ کھلا کر راضی کرتے ہیں۔عزیزانِ من! کس مقام پہ ہیں!! اور اس سے بھی آگے ان کے جو جی میں آیا' یہ کرتے ہیں۔یہ ہے شرک۔

## فارمولا اگر صحیح ہو تو اس کا نتیجہ ہر جگہ ایک ہی نکلے گا

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ علم کی دنیا میں' میں کہا کرتا ہوں کہ اگر فارمولا صحیح ہو اور اس فارمولے کے مطابق عمل کیا جائے تو اس کا نتیجہ یقیناً نکلتا ہے اور ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔میں یہاں کروں' کوئی دوسرا شخص جسے میں جانتا بھی نہیں ہوں' لندن میں بیٹھا ہوا کرے تو' قطب شمالی میں بیٹھا ہوا' صحرا میں بیٹھا ہوا' ایک دوسرے سے واقفیت بھی نہیں ہے' جانتے بھی نہیں ہیں' فارمولا سب کے پاس ایک ہے' اگر اس فارمولے میں انہوں نے کوئی آمیزش نہیں کی تو اس کا نتیجہ ہمیشہ وحدت ہوگا۔یہ قانون فطرت ہے کہ آگ پہ پانی چڑھا دیجیے تو پانی گرم ہوتا ہے' ایک خاص دباؤ پر' خاص سطح سمندر پر سو ڈگری کے اوپر ابلنے لگتا ہے۔یہاں ہو' وہاں ہو' کہیں ہو' میں کروں' آپ کریں' ہندو کریں' مسلمان کریں' کوئی بھی کرے' ایک نتیجہ ہر جگہ ہر شخص کو ملے گا۔قانون کی پابندی ہے' دیکھا اس کے اندر وحدت کیسے پیدا ہو رہی ہے۔اگر اس فارمولے کے اندر آپ نے کوئی اور آمیزش کر دی مثلاً اتنے قطرے ہائیڈرو کلورک ایسڈ کے'

---

❶ گیارھویں والے کی نیاز دے رہا ہے' ستارھویں والے کی دیگ چڑھا رہا ہے' دیئے جلا رہا ہے۔

❷ اب بولو بچّو! کس طرح بولتے ہو' اُس دن پلاؤ کھایا تھا۔

اتنے نائٹرک ایسڈ کے' یہ ایک فارمولا ہے' ایسا کیجئے' اور اس کے بعد دیکھیے کہ اس کا یہ رنگ ہوگا' اس کا یہ اثر ہوگا' ٹھیک بات ہے۔ یہ سارا فارمولا ہے لیکن اس میں' اپنی طرف سے' آپ ایک مزید چیز اس فارمولے کے خلاف بڑھا دیجیے تو پھر کیا کبھی وہ نتیجہ نکلے گا؟ نہیں' اس نتیجہ کے نکلنے کا سوال ہی نہیں۔ اور پھر یہاں آپ کوئی چیز بڑھایئے' لندن والا اپنے طور پر بڑھا دے' صحراوالا اپنے طور پر بڑھادے' تو جن کے نتائج یکساں تھے اب کسی کا نتیجہ دوسرے کے ساتھ نہیں ملے گا۔

## ہمارے فارمولے اس لیے نتیجہ خیز نہیں ہوتے کہ ہم نے جگہ جگہ اس میں فقہی آمیزش کر رکھی ہے

دیکھا شرک کیسے پیدا ہو رہا ہے' وحدت کیسے ٹوٹ رہی ہے! اور یہ ساری محنت آپ کریں' کسی بہت بڑے فارمولے کے مطابق' کسی پلان کے مطابق' کسی ستون کے مطابق' کسی پیمانے کے مطابق' ذرا سی بھی حساب میں غلطی ہو جائے یا اس میں کوئی آمیزش کر دے تو یہ شرک ہے۔ باقی جتنا کچھ ہے' کیا اس کا کوئی نتیجہ نکلے گا؟ دس چیزیں اس کے اندر ہوں' نو چیزیں آپ نے بالکل صحیح ڈالیں' دسویں چیز بجائے اس کے جو فارمولے میں لکھی ہے اگر کوئی چیز اپنی طرف سے آپ نے Add (جمع) کر دی تو اس کا Result (نتیجہ) یہ نہیں نکلے گا کہ 90% ٹھیک ہوگا' 10% غلط ہوگا' یہ 100% غلط ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! اس میں تو یہ چیز Ingredients (اجزائے ترکیبی) کی ہے' ان میں کوئی دوسری چیز ڈال دیجیے تو یوں ہو جاتا ہے۔ اس کے حساب میں اگر تھوڑی سی غلطی ہو جائے' اس میں شرک ہو جائے' جو اس نے حساب کہا ہے' اس کی بجائے اپنی طرف سے کوئی حساب کر کے آپ اس میں ڈال دیں' اس میں 100% نقصان ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! بات دوسری طرف چلی جائے گی اور میں عرض کر رہا تھا کہ یہ بڑی لمبی بحث ہے' وسیع موضوع ہے' کبھی ان چیزوں کو لاؤں گا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! پھر اس میں ایمان کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔ جس کے اعمال اچھے ہیں' جو کوئی جھوٹ نہیں بولتا' چوری نہیں کرتا' فریب نہیں دیتا' وہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ اس پر یہ شرطیں لگا رہے ہیں کہ ایمان ہونا چاہیے' یہ کیوں ضروری ہے؟ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس فارمولے کے اندر وحدت ہونی چاہیے۔ ان کے بقول اس میں اگر اتنی چیزیں اچھی ہیں' یہ نیکیوں کی ہیں' چلیے! ٹھیک ہے' 50% مارکس اس نے حاصل کر لیے' پاس مارکس تو اس کو مل گئے' ٹھیک ہے۔ قرآن کریم اس شرک کے متعلق کہتا ہے کہ لَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:105) یہ جو باتیں آ رہے ہیں ان کے متعلق تو یہ ٹھیک ہے' کہیں غلطی سہو نسیان کی جو بات ہے' یہ ہو' جو اس طرح سے شرک کرتا ہے' اس فارمولے میں ہی اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیتا ہے' ''اس کے اعمال تولنے کے لیے کہیں میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی''۔ ''آ ووٹاں اچ جیہڑا جماعت اسلامی نال ہو یا ہیگا اے' گنن دی لوڑ ای

نئیں پئی'' (ان ووٹوں میں جو جماعت اسلامی کے ساتھ ہوا ہے گننے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی)۔

## آج کے مسلمان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت کے اہل کتاب کی سی ہے

کہا ہے کہ لَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:105) ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یوں جب انسان اپنے مکافاتِ عمل کے جال میں گھرتا ہے' میں سمجھتا ہوں' وہ اپنا جال آپ لے جاتا ہے تو پھر اس کے اعمال تولنے کے لیے کسی میزان کے کھڑے کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ مذہب حقائق کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ دین نہیں تھا عزیزانِ من! پکار پکار کر کہتے چلے جارہے ہیں کہ صاحب! اسلام کی شکست ہوگئی (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ میں کہہ رہا تھا کہ شرک میں باقی بچ جانے والا صحیح عمل بھی پھر کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا' فارمولے کا جو ایک جزو ہے' وہ آپ نے اپنی طرف سے آمیزش کردیا۔ کیسی عمدگی سے قرآن حمید بات بتاتا ہے! پہلے (2:85) میں بھی یہ آیتیں آئی ہوئی ہیں لیکن ہر بار سامنے آنی چاہئیں' وہ بڑی عمدہ بات ہے۔ ہر اہل کتاب یہ کرتا ہے' ہم بھی تو اہل کتاب ❶ ہیں۔ یاد رکھیے! آج کا مسلمان اسی مقام ہے جس پہ ظہورِ اسلام کے وقت سے پہلے اہلِ کتاب تھے' اس کے پاس دین نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کی کتاب بھی محرف ہوگئی تھی' اِن مسلمانوں کے پاس کتاب (قرآنِ کریم) تو ہے لیکن ان کے ہاں تو ایسے ہی کتاب ہے جیسے پارٹیشن (تقسیمِ ہند) سے پہلے یہاں سنتھ سنگھ جسونت سنگھ تاجران کتب کشمیری کے نام پر لاہور میں ایک بہت بڑی دکان تھی۔ آپ کو اس زمانے کی بات یاد ہو کہ وہ قرآن شریف چھاپا کرتے تھے ''ساری دکان قرآن شریفاں نال بھری ہوئی ہوندی سی' تے اودوویں سکھ دے سکھ سن۔ ساڈی ساری قوم دے گھر قرآن بھرے ہوئے ہیگے نیں ❷''۔ عمل ان کا بھی احبار و رہبان کے اوپر تھا' زندگی ان کی بھی احبار و رہبان کے اتباع میں گزر رہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اُن کی کتاب تو محفوظ شکل میں نہیں تھی' اِنہوں نے کتاب اپنے ہاں محفوظ رکھ لی ہے۔ سنتھ سنگھ جسونت سنگھ کا بھی دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہمارے قرآن شریف میں کوئی ایک غلطی نکالے گا تو ایک غلطی کی ایک اشرفی دیں گے۔ اُنہوں نے' اہل کتاب نے' بھی احبار و رہبان ہی کو اپنا خدا بنالیا ہوا تھا' ہماری بھی یہی کیفیت ہے۔ جو کچھ وہ کرتے تھے' وہی کچھ ہم کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے یہ جو ان کے تذکرے بیان کیے ہیں' وہ تو بات یہ ہے کہ ''دھی اے نی گل سن' نوں اے نی کن کر'' (اے بیٹی! تم ذرا میری بات سنو اور اے بہو! ذرا ادھر کان دھرو)۔ بات وہ بیٹی کو سنا کر کہتی ہے کہ حقیقت میں بہو کو بتانا ہوتا ہے۔ یہ جو یہود اور نصاریٰ کی' امم سابقہ کی داستانیں بیان ہو رہی ہیں وہ

---

❶ یہاں اہلِ کتاب' حاملینِ قرآنِ کریم کے لحاظ سے کہا ہے۔

❷ وہ ساری دکان قرآن شریف (کے نسخوں) سے بھری ہوتی تھی مگر وہ دونوں رہے تو سکھ کے سکھ ہی۔ ہماری ساری قوم کے گھر قرآن شریف بھرے ہوئے ہیں۔

باتیں ان کی کررہا ہے' کہہ ہم سے رہا ہے۔

## عملی طور پر یہودیوں کی کیفیت

کہا ہے کہ ان یہودیوں کی کیفیت یہ ہوچکی تھی کہ پہلے اپنے ہاں سے' اپنے ہی لوگوں' غریبوں' ناداروں کو' ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے۔اور پھر اس کے بعد جب دوسرے لوگ ان کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور قیدی بنا لیتے تھے تو ان کے ہاں کے مصلحین پھر اٹھ کر کھڑے ہوجاتے تھے کہ اولوگو! دیکھو قیدی کو جو قید و بند سے چھڑانا ہے' یہ بڑا کارِثواب ہے۔اور اس کے لیے آؤ چندے اکٹھے کرو' خیرات کے پیسے دو' عطیے دو' فنڈ قائم کرو' ان کو چھڑانا بڑا ضروری ہے اور یہ بڑا ثواب ہے۔اور اس میں آ کر پھر عطیے دیتے ہیں اور پھر یہ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا' ہم نے ایک قیدی چھڑا دیا' یہ سب کچھ کیا۔قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85) اور یہ جو تم ثواب کا کام کررہے ہو' وہ جو تم نے ان کو پہلے گھروں سے خود نکالا تھا' یعنی وہ کتنا ثواب کا کام تھا' خود ہی ان کو نکال رہے ہو اور جب یہ دوسرے پکڑ کر لے جاتے ہیں تو ان کو چھڑانے کے لیے ثواب کما رہے ہو۔گویا یہ ہمارے ثواب کمانے کے ذریعے بنے ہوئے ہیں۔اگر تم ان کو نہ نکالو' وہ نہ پکڑ کر لے جائیں' نہ تم چندے اکٹھے کرو' تو تم ثواب کیسے کماؤ۔

اب یہ جو چیز ''قیدی کو چھڑانا'' ہے' یہ حقیقت میں بہت بڑے ثواب کا کام ہے' قرآن کریم نے بڑی تاکید کی ہے۔کہا ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ(90:13) غلام آزاد کرو۔قرآنِ کریم نے مومن کی' جماعت مومنین کی یہ بنیادی صفت قرار دی ہے۔پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی' ہمارے ہاں اب کہتے ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے غلام نہیں رہے' فَكُّ رَقَبَةٍ(90:13) کیا۔ان کو پتہ نہیں ہے' دنیا کی جتنی قومیں ایسی ہیں کہ جن کو خود اختیاری کے حقوق حاصل نہیں ہیں' Freedom (آزادی) حاصل نہیں ہے' استعماریت کے اندر ہیں' دنیا میں جتنی غلام قومیں ہیں' وہ ساری رَقَبَةٍ کے اندر آتی ہیں۔جماعت مومنین کا' اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہوگا کہ دنیا میں جہاں محکومی اور غلامی ہے' جس جس قوم کو جس جس قوت نے محکوم بنا رکھا ہے' وہ اس محکوم کی طرف سے ان کے خلاف لڑائی کرے اور ان کو آزادیاں دلائے' اسے فَكُّ رَقَبَةٍ(90:13) کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! غلام آزاد کرو قرآن حکیم کا حکم ہے۔فَكُّ رَقَبَةٍ(90:13) کو قرآن حکیم نے بہت بڑے اجرِ عظیم کا باعث قرار دیا ہے۔انہوں نے یہ غلام تو چھڑائے ہیں' قیدی چھڑائے ہیں تو اس کا ثواب ملنا چاہیے' انہوں نے ان کو گھروں سے نکالا ہے' وہ گناہ ہونا چاہیے۔یعنی منطق کی رو سے یہ نظر آتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے' اس کا ثواب ملنا چاہیے' اُس کا گناہ ہونا چاہیے۔وہ کہتا ہے کہ اچھا! یہ ہے

تمہارے ذہن میں تصور کہ اس فارمولے کے اندر 50% اگر تم نے صحیح چیزیں ڈالیں اور 50% اپنی طرف سے یہ کچھ کیا تو پھر چاہتے یہ ہو کہ اس کا جو رزلٹ ہے' وہ کم از کم 50% تو صحیح نکل آئے۔ وہ کہتا ہے کہ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) کیا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اس فارمولے کے بعض اجزا کے اوپر تمہارا یقین ہے کہ ٹھیک ہے قیدیوں کو چھڑانا ثواب کا کام ہے اور دوسرا حصہ جو اسی فارمولے کا ہے' اس سے انکار کرتے ہو کہ ان کو گھروں سے نکالنا جرم ہے۔ اور اس کے بعد کہتے ہو کہ سرکار! آدھا جواب تو میرا ٹھیک ہے اس کے تو نمبر دیدیجیے۔ کہتا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ** (2:85) تم میں سے جو بھی یہ روش اختیار کرے گا' سن رکھو! پچاس فیصد مارک کی توقع کرنے والو اور مطالبہ کرنے والو! جو بھی تم میں سے یہ روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ **اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) اس دنیا میں بھی ذلت اور خواری ہوگی **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) اور قیامت کے دن اس کے لیے اس سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔

## دوسروں کی کمائی کی بنیاد پر نیک عملی کے نتیجے میں جنت کے حصول کا تصور

یہاں جس سے سنو' وہ کہتا ہے کہ ''بھئی! سارے قرآن شریف تے کن عمل کیتا' جنے جوگا کوئی ہووے کرلوے' او چوری کیتی او اپنے تھاں رہئی' اے دیگ دتی نیاز دی اے اپنے تھاں رہئی' ایہدا تے ثواب ملے گا ای ناں اونوں ❶''۔ یہ ساری دھاندلیاں' یہ ڈاکا' یہ راہزنیاں' یہ غریبوں کے پسینوں کو نچوڑ نچوڑ کر اتنی اتنی بڑی انڈسٹریز اور کارخانے بنانا اور مزارعت کرنا' پھر اس سے بے مہابہ دولت سمیٹنا اور اس کے بعد صاحب! اس دولت کو حلال قرار دینے کے لیے کچھ کرنا کہ مسجد بنا دی' انہوں نے دیکھیے پنکھے لگوا دیئے صاحب۔ خانہ کعبہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے' وہاں بھی ان کے پنکھے تھے' دیکھیے! کیسا اپنے لیے جنت کا سامان کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ کہ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) اور یہ جو چیز ہے صاحب! کہ اس صدقہ اور خیرات سے غریبوں کو کپڑے بنوا کر دے رہے ہیں' ان غریبوں کے لیے گشتی دواخانے چل رہے ہیں' یہ کچھ کر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ ان یہودیوں نے کیا کیا تھا؟ یہی کہ پہلے اپنے ہی بھائیوں کو اس حالت میں پہنچا دیا کہ وہ مدد کے محتاج ہو گئے' مدد کا محتاج بنا کر پھر ان کی مدد کرنے کے لیے چندے کیے' خیرات کیا' صدقہ دیا' یہ سب کچھ کیا کہ اس کا ثواب کمائیں۔ پہلے آپ ایک ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں آپ کی اَسی فیصد آبادی بھوکی مرے' پھر بھوکوں کے لیے نیاز کی دیگیں دے کر ثواب کما رہے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ**

---

❶ سارے قرآن شریف پہ کسی نے عمل نہیں کیا۔ جس لائق آپ ہیں اتنا ہی کرلیں۔ جو چوری کی وہ اپنی جگہ پر اور جو یہ نیاز کی دیگ دی ہے یہ اپنے مقام پہ۔ اسے اس کا تو ثواب ملے گا ہی۔

عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85) انہیں اس حالت میں پہنچانا کہ یہ محتاج ہو جائیں' یہی کم بختو! تمہارے اوپر حرام تھا۔اب ہمارے ہاں سے ثواب کمار ہے ہو اسی لیے کہا ہے کہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) قیامت کی بات تو وہاں رہے گی یہیں انہیں مارو جوتے۔

## ذات خداوندی پر یہ الزام کہ وہ انسان کو ذلیل کرتا ہے سب سے بڑا ظلم ہے

عزیزانِ من! کوئی معاشرہ جس میں ایسا نظام ہو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس میں ایک فرد بھی کسی کا محتاج ہو جائے' اس کے بعد اس کے مداوا کے لیے ہزار خیراتیں بانٹو اور لاکھ زکوتیں دو اس میں خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) دنیا میں بھی ذلت وخواری ہے۔وہ نظام باطل ہے' جس نظام میں ایک انسان کی بھی' محض انسان ہونے کی جہت سے' عزت نہیں ہوتی' اس معاشرے کی' اس قوم کی خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) کوئی عزت نہیں کرے گا کیونکہ اس میں ایک فرد انسان ہونے کی جہت سے' تکریم سے محروم رہ گیا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ جب قوم ذلیل ہوتی ہے تو پھر یہ ہمیں کوسنے لگتی ہے کہ دیکھو جی! اللہ میاں نے خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ہمیں ذلیل کر دیا۔قرآن حمید کہتا ہے کہ کیا تمہیں خواہ مخواہ ذلیل کر دیا؟ سنو! ہم خواہ مخواہ ذلیل نہیں کیا کرتے' ہم کسی پر ظلم نہیں کیا کرتے' قطعاً نہیں۔تم الزام دے رہے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی ذلیل کر دیا' تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کرتے تھے؟ سنو! بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17) معاشرے میں جو جتھے والا نہیں ہوتا تھا' تنہا ہوتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے تو خدا کے قانونِ مکافات نے تمہاری ذلت کر دی۔

## درخت کے ایک پتے کا بیمار ہونا پورے درخت کے بیمار ہونے کی نشاندہی کرتا ہے

معاشرے میں ایک فرد کو ذلیل کرتے ہو' خدا کا قانونِ مکافات پوری قوم کو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔عزیزانِ من! یہاں فرد اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔درخت سے اگر ایک پتہ بھی سوکھ کر گرتا ہے تو وہ اس ایک پتے کا جرم نہیں ہوتا' جڑ سے لے کر شاخوں تک' ہر پتہ اس کا مجرم ہوتا ہے' جو اس نے ایک پتے کو خشک کر کے گرا دیا۔اور سائنٹسٹ سے پوچھو تو وہ آپ کو تجزیہ کر کے بتا دیں گے کہ یہ جو ایک پتہ خشک ہوا ہے' کہاں سے اس کی Cause (علت) شروع ہوئی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جڑ سے اس کی بنیاد شروع ہوئی ہے۔پورا درخت جو سرسبز وشاداب ہے' اس کا ایک پتہ اگر خشک ہو گیا ہے اور گر گیا ہے تو سارا درخت مریض ہو گیا ہے۔یہ پوچھو Agriculture (زراعت) والوں سے' وہ ایک پتے کے مرجھانے سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں صاحب! اس کے اندر کوئی کیڑا لگ گیا ہے یا اس میں یہ یہ چیزیں ہیں جن سے مرض پیدا ہو گیا ہے۔اگر تم نے ابھی نہ سنبھالا تو یہ سارا درخت جڑوں سے نیچے چلا آئے گا۔یہ ہے خِزْیٌ فِی

الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85)۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ تم نے ایک تنہا مظلوم کی' ایک یتیم کی' عزت نہیں کی ہے۔ کہا تھا کہ بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ (89:17) تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت و توقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جاتے تھے۔ دیکھا! قرآن کریم اس میں کیسے ایک دوسرے کے سامنے بات لاتا ہے۔ رَبِّیْٓ اَھَانَنِ (89:16) ہمارے رب نے ہمیں ذلیل کر دیا۔ سنو! رب نے ذلیل کر دیا؟ کہا کہ تم نے ایک فرد کو ذلیل کیا' ہمارا قانونِ مکافات اس قوم کو ذلیل کرتا ہے۔ کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (2:85) ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل جانتا ہے کہ تم صدقے اور زکوٰۃ اور دیگیں اور نیازیں دے کر اور مسجدیں بنا کر پنکھے لگوا کر' جنت کے طلبگار بنے پھرتے ہو۔ ہم اتنا ہی نہیں دیکھتے' ہم وہ بھی دیکھتے ہیں کہ وَ ھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ (2:85) ان کو اس حالت میں جو پہنچانا ہے' وہ جو تمہارا جرم ہے' ہم اس سے غافل نہیں ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ آ کر ہمیں دیگوں کی رشوت دے کر سمجھو گے کہ ہم چشم پوشی کر لیں گے؟ ہم جانتے ہیں کہ انہیں کس نے اس حالت میں پہنچایا تھا۔ اسے قرآنِ کریم شرک قرار دیتا ہے۔

## شرک کا حقیقی مفہوم اپنے اندر قرآنِ حکیم کا پورا نظامِ حیات بیان کر رہا ہے

عزیزانِ من! وقت کے لحاظ سے میں نے اتنی ہی جزئیات گنائی ہیں۔ اگر قرآن حکیم سے یہی متعین کر لیا جائے کہ وہ شرک کسے کہتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے تو اس کے بعد یہ بات سمجھ میں آئے گی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اب اس آیت کو سمجھیے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (4:116) یہ نقصان ناقابلِ برداشت ہے' یہ جو تمہاری تحقیر ہے بخشی نہیں جا سکتی' اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو کچھ بھی تم کرو' وہ کچھ سہو ہوگا' نسیان ہوگا' خطا ہوگی' فارمولے کے اندر غلطی ہو سکتی ہے کہیں Measurement (پیمائش) میں کچھ تھوڑی سی غلطی ہوگئی' کوئی Ingredient (جز) اچھا نہیں آیا' کہیں اس میں تھوڑی سی حرارت زیادہ پہنچا دی گئی' غلط ہوا' دوسری دفعہ پھر کرو گے' وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر صورت یہ ہے کہ آپ خود اس کے اندر کچھ Ingredients (اجزائے ترکیبی) کی آمیزش کر رہے ہو' ان کی وجہ سے شرک کر رہے ہو' تو جتنی دفعہ اسے دہراؤ گے' اتنی ہی دفعہ تمہارا حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (2:217) ہوگا۔ ساری عمر دہراتے چلے جاؤ' تم اس معاشرے کے اندر نیکیاں کرتے چلے جاؤ' یہ چیزیں اور زیادہ بڑھتی چلی جائیں گی' ذیابیطس کا مریض شکر کھاتا چلا جائے تو اس کا ذیابیطس بڑھتا چلا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے شرک' یہ ہے توحید' یہاں پرستش کی بات نہیں ہے یہ تو زندگی کے عملی مسائل ہیں۔ یہاں تو اگر آپ کسی ایک

ڈاکٹر کا علاج کر رہے ہیں' اس کے نسخے کے اندر اگر اپنی طرف سے تھوڑی سی تبدیلی کر رہے ہیں کہ صاحب ٹھیک ہے اتنی چیزیں تو میں نے یہ لے لی ہیں اور اس کے ساتھ ''اطریف الکثیر'' تھوڑا سا میں نے کھا لیا ہے۔ پوچھیے اس کا نتیجہ کیا ہوگا' آرام آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

## پوری کی پوری کائنات ریاضیات کے تحت وحدت کے غیر متبدل اصول پر قائم ہے

کائنات میں توحید چل رہی ہے' یہاں ہر فارمولا مبنی بر وحدت ہے' ہر پراجیکٹ کا' ہر اسکیم کا جو Basic Theme (بنیادی موضوع) ہے' سارا ریاضی کا' ان سب عمارات کا جو آسمان تک جا رہی ہیں' اور ان کا جو چاند پہ سوار ہو رہے ہیں' کس چیز کی بنا پہ ہے؟ سنیے! یہ Mathematical (ریاضیاتی) ہے' یہ ساری چیز ریاضیات پہ قائم و دائم ہے۔ یہ ریاضیات کیا ہے؟ فطرت کے قوانین کا تجزیہ کر کے انہوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ اس طرح سے کارفرما ہے' ان قوانین کے مطابق' یہاں بیٹھے ہوئے' چاند کے اوپر ان کی گاڑی جس میں آدمی بھی کوئی نہیں ہے' آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس گاڑی سے' وہاں اپنی منشا کے مطابق کام کرایا جا رہا ہے' وہ وہاں سے خبریں بھیج رہی ہے۔ اس میں انسان بھی کوئی نہیں ہے' جب جی چاہتا ہے اسے چلا دیتے ہیں' جب جی چاہتا ہے روک دیتے ہیں' جب جی چاہتا ہے اس کو اوپر لے آتے ہیں' نیچے زمین پہ لے آتے ہیں' آسمان پہ بھیج دیتے ہیں' یہ سب کچھ کس چیز کی بنا پر ہو رہا ہے؟ یہ ہے فارمولا۔

عزیزانِ من! یہ ایسی محیر العقول باتیں ہیں' جو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آسکتیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ اتنی سی لائن ہوتی ہے' وہ ایک دو تین چار Symbols (علامات) ہوتے ہیں' وہ بات بہت پیچھے رہ جاتی ہے' بس وہ اتنی سی Symbol (علامت) ہوتی ہے' اس فارمولے کے مطابق یہاں کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا انسان چاند گاڑی کو کنٹرول میں لے آ رہا ہے۔ فارمولا تو یہ ہوتا ہے۔ اور جو پچھلا جہاز بھیجا تھا جو راستے میں پھٹا ہے' ذرا سا اس کے اندر فرق رہ گیا تھا' شرک ہو گیا تھا اس کے اندر ذرا سا۔ یہ نہیں ہوا کہ اس میں 1% شرک تھا تو اس کا ایک پیچ ڈھیلا ہو' پورے کا پورا ہل جاتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ (2:217)۔ یہ کیا الفاظ ہیں' قرآن کریم کے صاحب! مویشیوں کو ایک بیماری ہو جاتی ہے۔ جس میں ان کا پیٹ بڑا پھولا ہوا سا نظر آتا ہے۔ بظاہر دیکھیے تو بڑا فربہ ہوتا ہے لیکن کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اس کو غذا دی جاتی ہے' وہ جزو بدن نہیں بنتی' وہ ساری Undigested (غیر ہضم شدہ) غذا اجناس وغیرہ' اسی طرح سے نکل جاتی ہیں' اس کے جسم میں توانائی نہیں آتی۔ اس بیماری کی وجہ سے اندر کچھ پانی جمع ہو جاتا ہے جس سے وہ بڑا پھولا نظر آتا ہے' وہ تندرست نظر آتا

ہے' موٹا تازہ فربہ نظر آتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اسے عرب حبط اعمال کہتے تھے کہ بظاہر تو نظر آئے کہ بڑے نیک کام ہور ہے ہیں' بڑے ثواب کمانے کے کام ہور ہے ہیں لیکن درحقیقت یہ وہ جھوٹی فربہی جو نظر آ رہی ہو مگر اندر سے کھوکھلا ہو۔ یہ ہے **فَاُولٰٓـئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ** (2:217)۔

## شرک کا ماحصل ہمیشہ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (2:217) کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من! یہ **اَعۡمَالُهُمۡ** بڑی گہری چیز ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو کرتے ہی کچھ نہیں' ان کے لیے تو میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے **حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ** (2:217)۔ میں کہتا ہوں یہی مسلمانوں کی ایک قوم ہے' یہ مذہب کے نام پہ جتنا کچھ کر رہی ہے' اگر یہی کچھ توحید میں ہو اور یہ اس سے بھی کچھ کم کریں تو دیکھیے! کہ اس سے نتائج کتنے نکلتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ ایک حج کی تقریب ہی دیکھ لیجیے۔ ساری دنیا کانفرنسیں کرنے کے لیے ٹکریں مار کر مر جاتی ہے کہ اس قسم کا کوئی عالمگیر اجتماع ان کے ہاں ہو جائے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دکھ اٹھا کر' تکلیفیں اٹھا کر' حتیٰ کہ فریب دے کر قرعے نکلواتے ہیں' رشوتیں دے کر' کروڑوں اربوں روپیہ خرچ کر کے' اب تو پھر بھی آسانیاں ہو گئی ہیں' اونٹوں پہ سفر کر کے دس بارہ پندرہ لاکھ انسان جمع ہو رہا ہے۔ مصیبتیں جھیل رہے ہیں' مشقتیں اٹھا رہے ہیں' روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد آخر میں یہ ہے **فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ** (2:127) اعمال بے نتیجہ ہیں۔

## آج تک حج کے اجتماع میں لاکھوں مسلمانوں کی دعائیں اسرائیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں

جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں' کہ حج کے اجتماع میں یہ جتنے جمع ہوتے ہیں اور اس کے بالمقابل جنہوں نے اپنی اسرائیلی حکومت قائم کر رکھی ہے ان کی آبادی اتنی نہیں جتنے یہ عرفات کے میدان میں کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ وہاں کرتے کیا ہیں؟ کہ جی' امام صاحب مانگ رہے ہیں' اور یہ آمین کر رہے ہیں کہ یا اللہ! ان کا بیڑہ غرق کر' یا اللہ! ان کی توپوں میں کیڑے ڈال دے' یا اللہ! ان کو برباد کر دے' یا اللہ! ان کی بستیاں اجڑ جائیں۔ یہ دس لاکھ آدمی' چودہ لاکھ آدمی کہہ رہے ہیں۔ اور آمین کہتے ہیں۔ ایسا کرتے کرتے مطمئن ہو کر صاحب! پھر ہاتھوں کو منہ پہ مل لیتے ہیں اور اس کے بعد ''حاجیاں دا حج قبول ہو گیا'' (حاجیوں کا حج قبول ہوا)۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہے **حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ** (2:217)۔ کروڑوں روپے آپ کے صدقے خیرات زکوٰۃ ہو رہے ہیں لیکن محتاجی ہے' غریبی ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور کیا ہو رہا ہے یہ؟ یہ ہے جی **حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ** (2:217)۔ ستر کروڑ میں سے' میں کہتا ہوں کہ اگر دس کروڑ بھی' یہ روزے رکھتے ہوں گے' مئی جون کے دنوں کے اندر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے رضا کارانہ طور پر' پانی کا ایک قطرہ حلق میں نہیں ٹپکایا جا رہا ہے'

حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں' تڑپ رہا ہے' کمرے کے اندر پانی موجود ہے' کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' ایک پانی کا قطرہ نہیں پی رہا۔ اللہ اکبر! میں کہہ یہ رہا ہوں کہ کیا یہ کوئی چھوٹے اعمال ہیں! پورا قرآن کریم ساری رات میں سنتے ہیں' صاحب! دن میں یہ اتنی بڑی مشقت کرتے ہیں' یہ سارا کچھ کرنے کے بعد ہوتا کیا ہے؟ ''عید والے دن ڈاکٹراں نوں سدنا پین ڈیا ہوندا ہیگا اے'' (عید کے دن ڈاکٹروں کو (علاج کے لیے) بلانا پڑتا ہے)۔ یہ ہے **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (2:217) کا نتیجہ۔

## شرک اور توحید کے قرآنی مفہوم کے خلاف کی گئی سازش کا نتیجہ

عزیزانِ من! اس سے **خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا** (5:33) دنیا کی زندگی ذلت اور خواری کی ہوتی ہے۔ وہ یہ نتائج قیامت پہ تو اٹھا نہیں رکھتا' وہاں کی بات تو وہاں کرے گا۔ اور وہاں کی بات کے متعلق تو یہیں کہہ دیا کہ **وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (17:72) جو قوم یہاں ذلیل وخوار ہے' وہ وہاں بھی ذلیل وخوار ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! شرک اور یہ ہیں شرک کے نتائج۔ اور پھر جب اس قوم سے سازش کی گئی تو' توحید کے معنی ہو گئے صرف ایک خدا کی پرستش' شرک کے معنی ہو گئے بتوں کو پوجنا۔ یہ کتنا آسان ہو گیا! اور اس کے بعد پھر **خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا** (5:33) ان کے لیے دنیا میں ذلت اور رسوائی ہے کیونکہ ان کے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں شرک آتا ہے۔

عزیزانِ من! آج کے اس درس میں ایک ہی آیت ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم میں آپ کو سمجھا سکا ہوں۔ یہ ایک ہی آیت ہے۔ اس کے دو الفاظ ہی اگر عملاً ہماری زندگی میں آ جائیں تو قوموں کی تقدیریں بدل جائیں۔ یہ سارا راز شرک اور توحید کے اندر ہے۔ یاد رکھیے! اسی لیے اس نے کہا ہے کہ باقی چیزیں تو ان عام الفاظ میں' بخشی جا سکتی ہیں مگر شرک نہیں بخشا جا سکتا۔

سورۃ النسآء کی آیت 116 ہم نے آج لے لی' 117 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**

❀......❀......❀

# پچیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 117 تا 126)

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ
وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُھُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُھُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا
غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ
اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَھْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ
وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى
وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ
وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1970ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 117 سے ہو رہا ہے: (4:117)۔

## لفظ شرک کی مزید قرآنی وضاحت اور اس کو اختیار کرنے کا نتیجہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ شرک سے ایسا نقصان ہوتا ہے جو قابل تلافی ہی نہیں ہوتا۔ عام زبان میں' جسے کہتے ہیں کہ یہ ایک ناقابل معافی جرم ہوتا ہے۔ اور وہ پورا درس شرک کی وضاحت میں ہی صرف ہو گیا تھا اور میں نے یہ بتایا تھا کہ شرک کا یہی مفہوم نہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں مروج ہے کہ بتوں کی پرستش کو ہم شرک قرار دیتے ہیں اور اس کے علاوہ شرک کے دوسرے گوشوں کی طرف ہماری کبھی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ قرآنِ کریم کی رو سے قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور انسانوں کے بنائے ہوئے قانون

کی اطاعت شرک ہے۔امت میں فرقہ بندی' گروہ سازی' پارٹی بازی' شرک ہے نیز علما اور مشائخ' احبار ورہبان کو دین کی سند ماننا شرک ہے۔اوراس سے بھی بہت آگے خود اپنے جذبات کا اتباع' جو حدود خداوندی سے تجاوز کر جائے' شرک ہے۔شرک وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔اس سے انسان اپنے مقام سے گرکر' پستیوں پہ آ جاتا ہے۔پھراس میں خوف پیدا ہوتا ہے' اس میں انسان کی اپنی محکمیت ختم ہوجاتی ہے' وہ یا تو بیرونی قوت کے خوف سے یا اپنے ہی جذبات کی اطاعت سے پرکاہ کی طرح اڑتا رہتا ہے' کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔وہ جھکڑ میں پھنسا ہوا گھاس کا تنکا ہے جیسے بگولے کے اندر محبوس ہوا ریت کا ذرہ ہے۔یہ کیفیت ہوجاتی ہے شرک سے۔

اسی ضمن میں قرآنِ کریم اب شرک کی کچھ ان شکلوں کو بھی سامنے لاتا ہے جو جہالت کی بناپر' توہم پرستیوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔اور یہ وہ مقام ہے جہاں مذہبی پیشوائیت خواہ وہ شریعت کے رنگ میں ہو یا طریقت اور معرفت کی شکل میں' علما کا مقام ہو یا آپ کے ہاں کے پیرانِ طریقت کی گدیاں ہوں' وہ انسان کی جہالت کو Exploit (ناجائز فائدے میں استعمال) کرتی ہیں' ان میں عجیب عجیب قسم کی رسومات رائج کرتی ہیں۔اوراب قرآنِ کریم اس طرف آتا ہے لیکن اس کے آنے سے پہلے ایک چیز اصولاً کہتا ہے کہ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا (4:117) ۔اس کا عام ترجمہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ ''خدا کو چھوڑ کر یہ جن چیزوں کو اپنی حاجت روائی کے لیے بلاتے ہیں' وہ دیویاں ہیں'۔بنیاد کے اعتبار سے ہر کمزور قوت کو "انث" کہا جاتا ہے اور خدا کے مقابلے میں اور کونسی قوت ایسی ہوسکتی ہے جسے اس کے برابر کی قوت کہا جائے۔اصل یہ ہے کہ خدا کے متعلق چونکہ ہمارے ذہنوں میں شروع سے تصور ہی ایسا ہے جس میں قانون کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لیے خدا کے تصور کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔

## طبعی قوانین کو مادہ پرستی کے روپ میں پیش کرنے کا نتیجہ اور سرسیدؒ کے خلاف نیچری ہونے کا فتویٰ

قانون کی قوت کا محسوس مظاہرہ ہمارے ہاں طبعی قوانین میں ہوتا ہے اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ طبعی قوانین کو ہم نے مادہ پرستی کا نام دیا' اسے ہم نے الحاد اور کفر قرار دیا۔مذہبی پیشوائیت کیا کچھ کرتی ہے اس کا اندازہ ذرا سرسیدؒ (1898-1817ء) سے لگائیے کہ اسے کیا کیا کہا گیا۔سرسیدؒ نے یہ کہا تھا کہ مسلمان قوم کی کمزوری اور پستی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا۔اقوامِ یورپ قوانینِ فطرت کے مطالعے اور مشاہدہ سے اور پیہم تجربات کے بعد آہستہ آہستہ Nature (فطرت) کی قوتوں کو مسخر کیے چلے جارہے ہیں اور وہ ساری کائنات پہ چھا جائیں گے۔اس لیے انہوں نے اس دور میں مسلمان سے یہ چیز کہی کہ تمہیں Natural Sciences (طبعی سائنسوں) کی طرف توجہ دینی چاہیے' قوانینِ فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

عزیزانِ من! Nature (فطرت) کی قوتیں وہ ہیں جن سے تمہیں وہ طاقتیں حاصل ہوجائیں گی کہ تم یورپ کی اقوام کا مقابلہ

کر سکو گے اور اس زمین پر تمہیں تسلط اور تغلب حاصل ہو جائے گا۔ جب یہ کہا تو آپ کو پتہ ہے کہ ادھر کیا ہوا؟ یہ کہ آپ کے مفتیانِ کرام نے کہا کہ سر سیدؒ نیچری ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر نیچری کے معنی ملحد اور بے دین ہو گئے۔ سر سیدؒ کے خلاف جو فتویٰ لگا تھا' جس کی سندیں وہ مکے مدینے سے جا کر لائے تھے' اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ نیچری ہے۔ ان سے پوچھو کہ نیچری ہوتا کیا ہے؟ کہنے لگے کہ نیچری نیچری ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے!! سر سیدؒ نیچری ہے۔ اب جس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ جو شخص انہیں یہ دعوت دے کہ نیچر کی قوتوں کو' فطرت کی قوتوں کو مسخر کرو' قرآن کریم نے یہ کہا ہے' خدا نے تو نیچر کی یہ قوتیں بنائی ہی اس لیے تھیں' اس سے جو نیچری ہے وہ ملحد اور بے دین کے معنوں میں استعمال ہوا' اس کے اوپر فتویٰ لگا۔ اور جس نے بھی اس کے بعد کوئی عقل کی بات کی' کسی نے قوانین فطرت کی طرف توجہ دلائی' کہا گیا کہ یہ نیچری ہے۔ لفظ نیچری کہا اور اس کے بعد اسے مانا گیا کہ وہ ملحد اور بے دین ہے' فتویٰ تو پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ یورپ نے نیچر کی قوتوں کو مسخر کیا۔ ہمارے ہاں کہا گیا کہ یہ مادہ پرستی ہے اور مادہ پرستی اور لادینیت تو پھر ہمارے ہاں مرادف الفاظ ہو گئے۔

## مادہ پرستی کی تعریف' لفظ آخرت کا مفہوم اور قوانینِ فطرت

وہ مادہ پرستی یا Materialism تو یہ تھا کہ دنیا کو اسی دنیا کی زندگی مانتے تھے' اس سے آگے حیات آخرت کے منکر تھے۔ حیاتِ آخرت جو ہے ذرا سوچیے تو سہی کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ ایک شخص مانتا ہے کہ صاحب! دنیا یہیں کی زندگی ہے' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ دونوں میں فرق کیا پڑتا ہے؟ اصل چیز قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ انسان کے ہر ارادے' ہر آرزو' ہر کام کا' ایک متعین نتیجہ مرتب ہوتا ہے' نتیجہ اس کے سامنے آ کر رہتا ہے۔ اگر اس زندگی میں نہیں آ سکتا تو کوئی بات نہیں' زندگی اسی سانس کی آمد و شد کا نام نہیں' اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس لیے ان اعمال کے نتائج انسان کے سامنے آ کر رہیں گے۔ یہ ہے حیاتِ آخرت جسے آپ قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یورپ کی مادہ پرستی کے معنی یہ تھے کہ انہوں نے زندگی کو اسی طبعی زندگی تک محدود سمجھا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں کسی طرح سامنے نہیں آتے وہ بیکار ہو کر رہ گئے۔ اور اس قسم کی کوئی ایسی گرفت نہ رہی جس سے انسان جرائم سے باز رہ سکیں۔ اس خیال سے کہ یہاں ان کی گرفت ہو یا نہ ہو' بہر حال انسان سے اس کا مواخذہ ضروری ہے۔ یہ ہے وہ چیز جسے مادہ پرستی (Materiality) کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں مادہ پرستی یا Materialism کے معنی یہ لیے گئے کہ یہ Matter (مادہ) سے متعلق' Physical Laws (قوانینِ فطرت) ہیں' اس نظامِ فطرت کے متعلق کسی قسم کی تگ و تاز' کدو کاوش' غور و فکر کرنا' الحاد اور بے دینی ہے۔ ان کے ہاں اس کا نام مادہ پرستی ہے۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ جنہیں قوانینِ خداوندی کا اتباع کہا جاتا ہے' یہ جو فطرت میں قوانین رائج ہیں' جنہیں آپ Natural Laws (قوانینِ فطرت) کہتے ہیں' اگر یہ خدا کے قوانین نہیں ہیں تو کیا یہ کسی انسان نے بنائے ہوئے ہیں؟

انہوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ کس کے بنائے ہوئے قوانین ہیں؟ یہ قوانینِ خداوندی کیوں نہیں ہیں؟ ان پر غور وفکر کرنا' ان کا اتباع کرنا دین کا حصہ کیوں نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ دین کامل نہیں ہیں آپ انہیں دین کا حصہ کہیں گے کیونکہ اس سے آگے وہ قوانین شروع ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی انسانی زندگی سے ہے۔ وہ قوانین وحی کی روسے ملے اور قرآن کریم کے اندر موجود ہیں۔ یہ دونوں قوانین جمع ہونگے تو پھر پوری زندگی کو محیط ہونگے' یہ دونوں دین کا حصہ ہیں یعنی قوانین فطرت بھی دین کا حصہ ہیں اور انسانی زندگی کے متعلق جو قوانین وحی نے قرآنِ کریم میں دیئے ہیں وہ بھی دین کا حصہ ہیں اور دونوں کو اکٹھا کریں گے تو پھر آپ کے ہاں دین کی تکمیل ہوگی۔

## ذہنی طور پر خدا کی قوت اور جبروت کا مشاہدہ قوانینِ فطرت کو سمجھے بغیر ہو ہی نہیں سکتا

ہمارے ہاں تو جیسے وہ نیچری' ملحد اور بے دین ہوگا' اسی طرح سے مادے (Matter) یا فزکس کے متعلق جو Laws (قوانین) ہیں ان کا مطالعہ (Study)' ان پہ کدوکاوش' ان کا اتباع' یہ سارے کا سارا الحاد اور بے دینی ہے' مغرب کی مادہ پرستی ہے صاحب! میں کہہ یہ رہا تھا کہ خدا کی قوت اور جبروت کا تصور تو یونہی ذہنی سا ہی ہے' آپ اس کا صحیح مشاہدہ نہیں کر سکتے جب تک قوانین فطرت آپ کے سامنے نہ ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں آپ کو معلوم ہے کہ خدا کی قوت کے مظاہرے کی باتیں کرتے ہیں مثلاً یہ ایک سیلاب آ گیا صاحب! آدھے گھنٹے کے اندر کہتے ہیں' دس لاکھ کی آبادی تباہ ہوگئی۔ ہمارے ہاں مُلّا کہے گا کہ دیکھا! خدا کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے' زلزلہ آ گیا صاحب! دیکھا خدا کی قوت! یعنی جہاں فطرت کی طرف سے یہ تباہیاں آتی ہیں' انہیں اس میں تو خدا کی قوت نظر آتی ہے لیکن جہاں کوئی شخص یا قوم خدا کے قوانین کے اتباع سے' اس زمین سے اڑ کر چاند پہ جا پہنچتی ہے' تو وہاں ان کو الحاد اور بے دینی نظر آتی ہے۔

## ہمارے مقابلہ میں کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے والی قوموں کا معیارِ زندگی اور شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ کا مذاق

یہ جو سیلاب آتے ہیں' زلزلے آتے ہیں یا اس قسم کے جتنے ایسے حوادث ہوتے ہیں' ان کے متعلق بھی ان کے ہاں اتنی سی بات ہوتی ہے کہ دیکھیے! یہ سب انسانوں کے گناہوں کا اثر ہے' وہ فحش کاریوں سے' بداخلاقیوں سے باز نہیں آگے۔ یعنی وہ ساری گناہگاری کی زندگی ہے' فسق وفجور کی زندگی ہے' وہ سمندر کے ساحل پہ بسنے والے جو غریب تھے انہوں نے سب کچھ کیا تھا' آپ بڑے پاکباز اور نیک فطرت واقع ہوئے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ گناہ ہم کر رہے ہیں بھگتنا ان کو پڑ رہا ہے۔ اور وہ جو ہالینڈ [1] میں بستے ہیں'

---

[1] It is Netherland, often known as Holland. It is a low-lying area, much of it reclaimed from the sea, with 40% of the land below sea-level. It is heavily agricultural state, but its economy has come to depend increasingly on industry and commerece (Reader's Digest: Universal Dictionary (1990). P.1036).

سمندر ان سے اونچا ہے' وہ نیچے ہیں' انہوں نے اس کے اوپر بند لگائے ہوئے ہیں اور وہ ہر سال سمندر کو پیچھے دھکیلتے چلے جاتے ہیں' اس سے زمین چھینتے چلے جاتے ہیں' ان کا ملک وہاں آباد ہے۔سب سے زیادہ پا کباز' پاک فطرت تو وہ لوگ ہوئے کیونکہ وہاں تو سمندر کا پانی بھی نہیں آتا۔اور یہاں آپ نے بند نہیں بنائے ہوئے اور جو اس کے بعد سیلاب سے تباہیاں آتی ہیں تو آپ کو خدا کی قدرت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ فسق وفجور کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔اس لیے کہ نہ قانون فطرت ان کی نگاہوں میں ہے' نہ اس کی قوت کا انہیں اندازہ ہے۔ یہ ایک انجن آپ دیکھتے ہیں' چالیس چالیس ڈبے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور کس تیز رفتاری سے وہ نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا ہے' کونسی قوت ہے جس سے چل رہا ہے؟ یہ یہی بھاپ' یہ یہی دیگچی میں سے جو آپ کے ہاں بخارات نکلتے ہیں' یہ ان کے علاوہ کچھ اور نہیں۔دیکھتے ہیں اس کی قوت! کہ کس قدر ہے۔یہ راکٹ زمین کی کشش ثقل کا مقابلہ کر کے اس سے اوپر چلا جاتا ہے' یہ کیا چیز ہے؟ یہی کہ ایک ذرے کے اندر' ایک شعلے کے اندر' قوت پنہاں ہے۔ایٹم (Atom) کو تو ذرہ بھی نہیں کہا جا سکتا' یہ تو مزید ناقابلِ تقسیم شے ہے۔یہ ہے اس خدا کی قوت۔خدا کے قوانین سے اس کی قوت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

اب یہ ان قوتوں کا استعمال ہے جو اسے ''گناہ اور ثواب'' بنا دیتا ہے۔انسانیت ساز کاموں کے لیے قوت کو استعمال کیجیے تو یہ دین کے مطابق ہے' اس کی خلاف ورزی کیجیے تو یہ الحاد و بے دینی ہے۔یہ خدا کی قوتیں ہیں۔اس نے جو کہا ہے کہ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا (4:117) اس کے سوا کسی کو بھی اگر تم پکارو گے تو وہ اس کے مقابلے میں کمزور ہوگا۔قوت کا سرچشمہ لَهٗ مُلۡکُ (5:40) ہے یعنی خدا ہی ہے۔ہمارے سامنے خدا کی جو قوت اور جبروت اور جلال ہے' وہ اس کے قوانین کی شکل میں آتا ہے۔توحید تو خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع ہے۔ذرا آگے چل کر میں عرض کروں گا کہ قرآن کریم نے خود کہا ہے کہ شرک کرنے والے' خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہیں اور ان کے پیچھے چلتے ہیں' خواہ وہ ان کے اپنے جذبات ہوں یا مذہبی پیشوا ہوں' وہ بے حد بودے ہوتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ کسی قوت کو تم پکارو گے وہ کمزور ہوگی یعنی وَ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا (4:117) جس کو بھی تم پکارو گے وہ کیا ہوگا؟ یہاں ایک بات شیطان کہی ہے' اس کے ساتھ قرآن کریم مرید کا لفظ لایا ہے۔ہمارے ہاں ان لوگوں کو تو معلوم نہیں' یہ جو مُرید ہوتے ہیں' وہ اسے بھی م کی زبر کے ساتھ مَرید ہی کہتے ہیں۔اس کے معنی ''لعنتی'' کے ہوتے ہیں۔یہ شیطان کیا چیز ہے؟ قرآنِ کریم نے شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ کہا ہے۔وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا (6:112) ۔شیاطین اور جن تو میں پھر عرض کرونگا۔پہلے یہ کہوں گا کہ یہ شیاطین اور انس تو انسانوں میں ہی شیاطین ہیں۔کہا یہ ہے کہ ہر نبی کی مخالفت ان کی طرف سے ہوتی ہے۔یہ کیا کرتے ہیں؟ یہ بڑی خوشنما' بڑی دلفریب' داستانیں وضع کرتے ہیں۔آپ کوئی بھی وعظ سن کر دیکھیے تو یہ افسانے ہونگے' یہ وضع کی ہوئی باتیں ہونگی اور پھر جب وہ کارِ ثواب کی تفصیلات بیان

کریں گے تو کہیں گے کہ ایک ایک کام کے بدلے میں کتنی کتنی نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور کس طرح پھر وہ وہاں جنت کی نعماء کا ذکر آتا ہے جو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاں پٹا لکھا گیا ہے۔ یہ اتنی خوشنما باتیں ہیں' اتنی فریب انگیز باتیں ہیں۔ بس داستانیں ہی داستانیں ہیں' افسانے ہی افسانے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم کہتا ہے کہ ہر نبی کی امت کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ اس کے اندر یہ **شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ** (6:112) پیدا ہوئے' جو افسانے وضع کرتے تھے' فریب دیتے تھے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ فریب دہی ہے' یہ جنت کے متعلق کتنی بڑی فریب دہی ہے۔ سب سے بڑا افسانہ' سب سے بڑی دلکش باتیں تو یہی ہوتی ہیں جو یہ جنت کے متعلق گناتے ہیں۔ یہ **شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ**(6:112) **شَیٰطِیۡنَ الۡجِنِّ** قرآن حکیم کے الفاظ ہیں۔ یہ **شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ** (6:112) تو قرآن حکیم نے شروع میں' ابتدا میں' سورۃ البقرۃ میں' کہا ہے کہ **وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ** (2:14) جماعت مومنین کے افراد سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب اپنے شیاطین کی طرف جاتے ہیں تو ان سے یہ کہتے ہیں کہ ہم درحقیقت آپ ہی کے ساتھ ہیں' ہم تو ان کو فریب دے رہے ہیں' ہم تو مذاق کر رہے ہیں' ان سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ ہم ان کے ساتھ ہیں' بالکل نہیں۔ یہ باہر ووٹنگ والے' ہر پارٹی والے' سمجھتے تھے کہ لاکھوں کی تعداد میں ہمارے ساتھ ہیں' جونہی وہ بوتھ کے اندر گئے جہاں پردہ لٹکا ہوا تھا' انہوں نے کہا کہ **نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ** (2:14) ہم تو تمہارے ساتھ مذاق کرتے تھے پرچی (ووٹ) دوسرے کے ہاں ڈالی ہے۔ اور یہی وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں سے ان کے نام کی چار پرچیاں نکل رہی ہیں۔

## قرآنِ حکیم نے نگاہوں سے اوجھل دلوں کے اندر چھپے سرکش جذبات کو شیطان کہا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے مذہبی پیشوائیت کو خواہ وہ شریعت کے رنگ میں یا طریقت کی شکل میں ہو **شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ**(6:112) کہا ہے۔ اور پھر دوسرے چھپے ہوئے شیاطین ہیں' جنہیں جن کہا ہے۔ جن کہتے ہیں ہر اُس شے کو جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ ہم نے دیکھا تھا کہ قرآن حکیم نے انسان کے اپنے جذبات کو جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کریں انہیں بھی شیاطین کہا ہے' اسے شرک قرار دیا تھا' یہ چھپی ہوئی خواہشیں ہیں' دل کے اندر چھپے ہوئے ارادے ہیں' توہم پرستیاں ہیں' باطل کے اعتقادات ہیں' یہ ساری چیزیں نگاہوں سے چھپی ہوئی ہوتی ہیں' محسوس شکل میں سامنے نہیں آتیں وہ سب **شَیٰطِیۡنَ الۡجِنِّ** ہیں۔ اور ان کے لیے کہا ہے کہ **لَّعَنَہُ اللّٰہُ** (4:118)۔

## لفظ لعنت کا لغوی اور قرآنی مفہوم تو زندگی میں خوشگواریوں سے محروم ہونے کا ہے

ہمارے ہاں لعنت کے معنی تو کچھ گالی سی ہوتی ہے۔ عربی مبین میں لَّعَنَهُ (4:118) کے معنی ہوتا ہے ''خوشگواریوں سے محروم رہ جانا''۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان کے اتباع کا نتیجہ' توہم پرستیوں کے ثمرات ہیں اس کے سوا کچھ نہیں ہے' پہلے اس کو مَّـرِيْدًا (4:117) کہا ہے کہ ایسا درخت جس کا پھل تو ایک طرف' اس کے پتے بھی جھڑ چکے ہوں۔ وہ خزاں دیدہ درخت جو ٹنڈ منڈ ہوکر رہ جائے۔ یہ کیسی عمدہ مثال ہے اور اسی کو پھر لَّعَنَهُ اللّٰهُ (4:118) سے اس کی تشریح کر دی کہ جو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا(4:118)۔ دیکھیے یہ شیطان کا دعویٰ کیا بتایا ہے' چیلنج اس کا کیا ہے؟ یہ کہ وہ خدا سے کہتا ہے کہ تم دیکھو کہ میں تمہارے ان بندوں سے اپنا حصہ کس طرح سے الگ رکھوالیتا ہوں۔

## خدا کے نام پر مذہبی پیشوائیت کی شکم پروری کا سلسلۂ دراز

ساری مذہبی پیشوائیت کا مدار ہی اس پہ ہے کہ وہ تم سے اپنا حصہ الگ رکھوالیتے ہیں۔ یہ فطرانے' یہ صدقے' یہ خیرات' یہ زکوٰۃ' یہ نذر' یہ نیاز' یہ سب کیا ہیں؟ یہ آپ کی کمائی میں سے اپنا حصہ الگ رکھوالیتے ہیں۔ ان حصوں کے متعلق بھی قرآن کریم نے دوسری جگہ بڑی عجیب چیز کہی ہے۔ کہا ہے کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (6:136) یہ جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! یہ تمہاری کھیتی ہو یا تمہارے مویشی جو کچھ بھی تمہارے ہاں پیداوار ہو' اس میں سے ہمارا حصہ الگ کر دو۔ اب حصے الگ کرنے میں یہ کہتے ہیں کہ فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (6:136) اچھا بھئی! دیکھیے یہ خدا کا حصہ ہوا' یہ نذر اللہ ہوا۔ وہ جو ایک فقرہ ہے کہ نذرِ اللہ' نیاز حسین۔ یہ تو خدا کا حصہ ہو گیا یعنی بِزَعْمِهِمْ (6:136) وہ اللہ کا حصہ نہیں ہوتا' بزعم خویش ان کو دھوکا دے کر کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو ہو گیا اللہ کا حصہ۔ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (6:136) اور یہ جو اس کے اولیاء اللہ ہیں (یعنی وہ شرکا جن کو کہتا ہے کہ خدا کے شریک ہیں) جنہوں نے تمہیں یہ کچھ دلایا ہے' یہ ان کا حصہ ہے۔ یہ تو ہوئے دونوں الگ الگ حصے۔ قرآن کریم کہاں جا کر بات کرتا ہے' کہتا ہے کہ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ (6:136) یہ جو ان کا' بتوں کا' اولیاء کا' حضرت صاحب کا حصہ نکالتے ہیں تو سیدھی بات یہ ہے کہ وہ وہاں موجود ہوتے ہیں' یہ ان کے نمائندے موجود ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جو حصہ ہوتا ہے وہ تو ان تک ہی رہتا ہے' سیدھی سی بات ہے کہ وہ لے لیتے ہیں۔ اب رہا یہ اللہ کا حصہ تو سنو! وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (6:136) اللہ تو سامنے ہوتا نہیں' تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو ہمارا ہو گیا' اب یہ حصہ ہم اللہ کو پہنچا دیں گے اور وہ حصہ بھی لے جاتے ہیں۔ یہ جتنی چیزیں نذر اللہ ہیں تو کیا کبھی اللہ بھی اس نذر کو لینے کے لیے آتا ہے' کیا کبھی اسے بھی کسی نے

دیکھا؟ یہ حصہ کہاں جاتا ہے۔ایک تو Directly (براہِ راست) یہ لے لیتے ہیں یعنی یہ تو ہوا ہمارا اور یہ ہے اللہ کا۔ اللہ کا حصہ اللہ کو کیسے پہنچے گا؟ وہ کہتے ہیں کہ تم تو پہنچا نہیں سکتے' ہم وہیں جا رہے ہیں۔ان سے پوچھیے یہ مثال دیتے ہیں کہ ہم تو پوسٹ آفس ہیں' منی آرڈر جو ہمارے پاس تم لاؤ اس میں ہم تو چونی لیتے ہیں' یہ تو ہمارا حصہ ہے اور باقی جو روپیہ ہے وہ جس کے نام ہوتا ہے ہم اسے پہنچا دیتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ صورت یہ ہے کہ اپنی چونی تو الگ لی اور وہ جو اس کے نام کا سو ہے' چونکہ وہ کہیں ہوتا نہیں اس کے لیے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم لے جاتے ہیں' اسے پہنچا دیں گے۔قرآن حمید بتاتا ہے کہ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (6:136) کیا عجیب فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ بیٹھے ہوئے!! آپ نے دیکھا عزیزانِ من! یہ سارے نذر و نیاز کے قصے کس طرح سے بٹوارہ ہوتا ہے غریب کی محنت کی کمائی کا' کہاں کہاں وہ رکھوایا جاتا ہے۔

## برہمنوں کے ہاں دیوی دیوتا کے نام پر حصے حاصل کرنے کا طریق اور ہماری توہم پرستیاں

یہاں تو آپ لوگوں نے دیکھا نہیں ہے' مگر برہمنوں کے ہاں اگر آپ دیکھیں کہ جب وہ دان لینے کے لیے آتے تھے تو کس کس شکل میں انہوں نے یہ الگ الگ ''پوتھیاں بنوائیاں ہوندیاں سن'' (پوٹلیاں بنائی ہوئی ہوتی تھیں) یہ اس دیوتا کا' یہ اس دیوی کا' یہ برہما کا' یہ شیو کا' وہ سارے کا سارا ان کے اندر الگ الگ ڈلواتے تھے اور پھر یہ ساری لے جاتے تھے' وہ ساری اپنی جھولی میں پڑ جاتی تھیں۔یہی تو ہم پرستیاں آپ کے ہاں رائج ہیں۔یہ بیسیوں قسم کی ہیں۔کہیں پیروں کے نام کی مندریاں ڈالی ہوئی ہیں' کہیں کانوں میں بالیاں ڈالی ہوئی ہیں' کہیں گلے میں ہنسلیاں ڈالی ہوئی ہیں' پاؤں میں کڑے ہوتے ہیں' عجیب عجیب قسم کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔پھر کہیں ان کو درگاہوں کے اوپر لے جایا جاتا ہے بکرے ساتھ جا رہے ہیں' کہیں نیازوں کی دیگیں پک رہی ہیں۔یہ سارے کا سارا اللہ کے نام پر جا رہا ہے۔اور جو قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ اپنے ہاں لے جاتے ہیں۔وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (4:118) یہ ان کا خدا کے لیے چیلنج ہے کہ تم دیکھو یہ تمہارے ہی بندے کہلائیں گے اور ہم ان سے اپنا حصہ کس طرح وصول کرتے ہیں' دیکھیے گا ذرا' کیا کیا طریقے ہیں!! تمام تو ہم پرستی سے ہونگے۔

## کسی کی جیب کا مال اپنی جیب میں ڈلوانے کے لیے دوسرے کی عقل کو ماؤف کرنا پڑتا ہے

عزیزانِ من! کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا کس قدر مشکل کام ہے' جب تک آپ اس کی عقل و فکر کو ماؤف نہیں کریں گے آپ اس کی جیب سے پیسہ نکال ہی نہیں سکتے' کیا یہ کوئی آسان بات ہے؟ نہیں' بالکل نہیں۔پاگل کسے کہتے ہیں؟ جسے اپنے نفع نقصان کا خیال نہ ہو۔جس کی جیب سے آپ نے کچھ نکالنا ہو' پہلے اس کے عقل کے دیئے کو گل کیجیے' یہ سوئچ آف کیجیے' سوچنے سمجھنے کی قوتوں کو

مفلوج کیجیے تو پھر وہ دیتا ہے۔ تنگ دھڑنگ راستے میں کھڑا ہوا فقیر کس طرح آپ کی جیب سے روپیہ نکالتا ہے؟ آپ پاس گئے اور اس نے سرخ سرخ آنکھیں آپ کی طرف کیں اور کہا کہ کھڑے ہو جاؤ دیکھو! میں تمہارے لیے کیا کرتا ہوں' کبھی وہ سانس لے گا تو منہ سے شعلہ نکلتا ہے' اس نے منہ میں فاسفورس رکھی ہوتی ہے' کبھی وہ اپنے بالوں کو نچوڑتا ہے' اس میں سے دودھ کے قطرے نکلتے ہیں اور اس کے بعد وہ اس سے کہتا ہے کہ دیکھتے ہو میری قوتوں کو' وہ سامنے جو کھڑا ہوتا ہے اس کی عقل وفکر ماؤف ہو جاتی ہے' کانپنے لگ جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ نکال تیری جیب میں کیا ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے' نکال کر دیدیتا ہے۔ تو ہم پرستی کے راستے سے یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں جو لوگوں سے لیتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ (4:119) چیلنج ہے یہ شیطان کا خدا کو کہ دیکھو! میں تیرے بندوں کو کس طرح گمراہ کرتا ہوں۔ کہتا ہے کہ پہلی چیز یہ ہے کہ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ (4:119) ان کے کام رک جائیں اور انہیں میں پھر امیدیں دلاؤں کہ میں تمہاری مرادیں پوری کرونگا۔

## معاشرے میں ہر سو پھیلی ہوئی لاقانونیت انسانی عقل کو توہم پرست بنا دیتی ہے جبکہ شیطان کا خدا کو یہی تو چیلنج تھا

انسان درگاہ پہ جاتا ہی اس وقت ہے جب کام رکتا ہے۔ کامیابی کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کے بتائے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق چلو لیکن جہاں معاشرے میں لاقانونیت عام ہو جاتی ہے' وہاں رکے ہوئے کام میں قانون کی طرف نگاہ اٹھتی نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی پیر صاحب کے ہاں جایئے' کہیں سے تعویذ کرا لیجیے' کسی قبر پر چلے جایئے' کہیں منت مان لیجیے۔ قاعدے قانون محنت کسب و ہنر سے نہیں' لاقانونیت کے ذریعے سے مرادیں بر آئیں گی۔ غور کیجیے یہ بات کتنی دور کی ہے۔ اسی کا نام تو توہم پرستی ہوتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ شیطان' خدا کو چیلنج دے رہا ہے کہ تم دیکھو میں تمہارے بندوں کو کیسے گمراہ کرتا ہوں۔ پہلی چیز یہ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ (4:119) ہے۔ ان کی جو مرادیں ہیں' ان کی جو کامیابیاں ہیں' وہ یوں نہیں حاصل ہوتیں' ان کے لیے میں ان کے دلوں کے اندر آرزوئیں بیدار کرونگا' پھر جو کچھ ان سے کہونگا وہ بغیر سوچے سمجھے کرتے چلے جائیں گے۔ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (4:119) پھر کبھی میں ان سے کہونگا کہ یہ جو پیر منڈا کے نام کا بکرا ہے اس کو کسی دن چیر دو' یہ پیر کے نام کا بکرا ہو گیا۔ یہ جو تمہارے ہاں مویشی پیدا ہوا ہے' اس کو اس انداز سے بنا دو' یہ فلاں قبر کے نام ہو گیا۔ یہ ساری توہم پرستیاں ہیں۔

## قانون کا احترام کرنے والی کسی قوم کی کوئی مراد ہی نہیں رکتی

اس کی جڑ یہ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ (4:119) ہیں۔ میں مرادیں بر آنے کی توقعات ان کے دل میں پیدا کرتا چلا جاؤں گا۔ عزیزانِ من!

یہ ساری توہم پرستیاں' مرادیں برلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ جو قومیں قاعدے اور قانون کے مطابق چلتی ہیں ان کی مرادیں رکتی ہی نہیں ہیں' جہاں رکتی ہیں ان اقوام کے افراد کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ کہاں غلطی ہوگئی۔ جہاں سے قدم غلط سمت کی طرف اٹھتا ہے وہاں کھڑے ہو کر پھر وہ قدم صحیح سمت کی طرف کر لیتے ہیں تو مراد بر آتی ہے۔ جہاں قانون کا تصور نہیں ہوتا وہاں توہم پرستیاں آتی ہیں' بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کے بعد یہی ہوتا ہے کہ فلاں حضرت صاحب نے بددعا دی تھی' فلاں شاہ صاحب کے مقبرے کی طرف میں پیٹھ کر کے چلا آیا تھا۔ یعنی نگاہ اس طرف جاتی ہے' اس وجہ سے مجھ پہ عذاب ہوا ہے اور اس کے لیے یہ ہے کہ فلاں قبر پہ چراغاں کیجیے' فلاں جگہ جا کر منت مانیے' وہاں یہ نذر دیجیے' نیاز دیجیے۔ چلا ہوا ہے یہ قصہ' عزیزانِ من! قرآن حمید کی حامل قوم اب کیا کر رہی ہے!! خدا کہتا ہے کہ شیطان نے یہ چیلنج دیا تھا کہ دیکھو! میں کیا کرتا ہوں۔ وَ مَنۡ یَّتَّخِذِ الشَّیۡطٰنَ وَلِیًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا (4:119) جس نے بھی خدا کو چھوڑا اور انہیں اپنا کارساز بنا لیا انہوں نے اپنا کتنا بڑا نقصان کیا! یہ ایک ایسا واضح نقصان ہے لیکن بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ وہ پہلے تو سمجھنے کی قوتوں کو ہی مفلوج کرتا ہے۔ یہ ہے خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا (4:119) کھلی ہوئی تباہی۔

عزیزانِ من! عقیدت مندی کے جذبے کو الگ کر کے کبھی غور و فکر کے ساتھ سوچیے کہ وہ چونے اینٹیں اور مٹی کا ایک ڈھیر کیا قوت رکھ سکتا ہے۔ وہ بے قوت لاش ہے کہ جس کے متعلق محاورہ یہ ہے "مردہ بدست زندہ"۔ آپ اپنے ہاتھوں اس لاش کو اس زمین کے نیچے دفن کرتے ہیں۔ یہ اتنی کمزور اور بے قوت ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں کہتی کہ میرا دم گھٹ رہا ہے' میرے اوپر اتنی مٹی ڈال رہے ہو' ذرا تھوڑا سا تو اس میں خلا رکھ دیجیے۔ یہ اتنی بے قوت' بے حس و بے حرکت لاش ہے! انہی مُردوں کے متعلق آپ عقل و فکر کی بات دیکھیے۔ قرآن حکیم کے ارشادات دیکھیے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سن ہی نہیں سکتے' یہ بے حس ہوتے ہیں' بے شعور ہوتے ہیں' ان کو تو اپنے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے۔ اور بے جان جسم تو جمادات کی طرح کی ایک چیز ہو جاتا ہے لیکن یہ زندہ انسان اپنی کامیابیوں کے مرکز اور محور اس مردہ لاش کو قرار دیتے ہیں' اس کی قبر کو قرار دیتے ہیں' یہاں حضرت صاحب بیٹھ گئے تھے' یہاں ان کا قدم شریف پڑا تھا۔ دھرم شالے سے ایک سنگ چلتا تھا صاحب' ایک کونے سے' ڈیرہ غازی خان کے اس گاؤں میں پہنچتا تھا۔ سخی سرور کا سنگ چلا آرہا ہے' جھنڈے لیے ہوئے ہیں' ڈھول لیے ہوئے ہیں۔ راستے میں وہ قیام کرتے جاتے تھے' جہاں قیام کرتے تھے' جہاں وہ کہتے تھے کہ حضرت صاحب یہاں بیٹھے تھے' جہاں جہاں انہوں نے قدم دیا وہاں خانقاہیں بنی ہوئی ہیں۔ راستہ بھر سینکڑوں میل کی مسافت اور ہر مقام کے اوپر اردگرد کے لوگ اس سنگ میں ساتھ مل جاتے تھے۔ یہاں سے وہاں تک یہ سنگ پیدل چلا جاتا تھا اور وہاں تک جا رہا ہوتا تھا۔ صرف یہ قانون' قانون کی قوت' یہ ایک چیز نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو اس قوم کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے خُسۡرَانًا

مُّبِیْنًا (4:119) کھلا ہوا نقصان۔

## عیسائیت میں Protestant (پروٹسٹنٹ) اور کیتھولک تصورات کا تجزیہ

دیکھ لیجیے' ان قوموں کی حالت جو اس قسم کی توہم پرستیوں کے اندر جکڑی ہوئی ہیں وہ ابھر ہی نہیں سکیں' وہ ہندوؤں کی توہم پرستی ہو یا عیسائیوں کی۔ عیسائیوں میں دو گروہ ہیں: (1) یہ Protestant (پروٹسٹنٹ) پھر بھی معتدل قسم کے ہیں وہ ان توہم پرستیوں میں بہت کم ہیں۔ (2) ان کے ہاں کیتھولک خالص توہم پرستیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ عیسائیت کے ان دونوں گروہوں کے اندر بڑا فرق ہے۔ ان میں کیتھولک جہاں جہاں بھی ہیں وہ پست ہیں۔

## قانون کی قوت کو نظر انداز کر کے مرادیں پوری کرانے کا تصور شیطان کے پروگرام کی تکمیل ہے

قرآن مجید کہتا ہے کہ یَعِدُھُمْ وَ یُمَنِّیْھِمْ (4:120) سارا چکر اس پہ چلتا ہے کہ وہ ان کے دلوں کے اندر مرادیں برلانے کی آرزوئیں بیدار کرتا ہے اور پھر انہیں جھوٹے دعوے دیدیتا ہے بس' کہتا ہے کہ راز یہ ہے۔ وَ مَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (4:120) حالانکہ وہ جو وعدے کرتا ہے' وہ جو مژدے سناتا ہے وہ فریب ہی فریب ہوتا ہے۔ فریب کا مدار کیا ہوتا ہے؟ یہ اس ماننے والے کی عقیدت ہے۔

## پیر اپنی خدمت اسی سے تو کرواتا ہے جو اسے اپنا پیر تصور کرتا ہے

وہ جو میں پنجابی کا محاورہ دہرایا کرتا ہوں جو ایک بڑی عظیم حقیقت کا حامل ہے' ان میں کچھ نہیں ہوتا بجز اس کے کہ وَ مَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (4:120) یہ تو بالکل ایک فریب ہوتا ہے۔ یہ فریب خوردہ اسے اپنا سب کچھ سمجھتا ہے۔ وہ محاورہ یہ ہے کہ ''پیر مَندِیاں نُوں کھانداا ے'' جو اسے پیر مانتا ہے اس کے لیے وہ ساری قوتوں کا محور ہوتا ہے' وہ کھاتا ہی اسے ہے اور جو اسے اپنا پیر مانتا ہی نہیں ہے' وہ تو اُسے کہتا ہے کہ ''چل او چل جا کے کم کر'' (چل بے! اپنی راہ لے)۔ ''پیر مَندِیاں نُوں کھانداا ے'' یہ اس ماننے والے کی عقیدت ہوتی ہے جو اسے تمام قوتوں کا مرجع بنا دیتی ہے ورنہ ان کی اپنی حیثیت تو اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

خدا وہ ہے کہ اس کے سامنے سجدے میں پڑے رہو تو اس کی خدائی قائم ہے

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

(زبورِ عجم)

تم اس کے سامنے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ تو اس کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔

## مرید کی طرف سے نیاز مندی' عقیدت اور جنت کے حصول کی روایات

ان کی خدائی' ان کا جبروت' ان کا جلال' سجدہ کرنے والوں کی اپنی نیاز مندی اور عقیدت کا رہین کرم ہوتا ہے' ان کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت خدا کے عطا فرمودہ' وضع کردہ قوانین کے اندر ہوتی ہے' عزیزانِ من! اسی کو خدا کی قوت کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِیْصًا (4:121) ان اقوام کا' ان اشخاص کا' انجام جہنم کی تباہی ہے اور جو اس طرح اپنے آپ کو جہنم کے اندر گرا لے تو کہا کہ پھر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہیں مل سکتا۔ عقل و فکر کی رو سے غلطی ہو جائے' اس پہ غور کیجیے تو اس سے نکلنے کی راہیں آپ کو نظر آ جائیں گی۔ تو ہم پرستیوں کے جال میں پھنسا ہوا انسان نکل ہی نہیں سکتا۔ ذرا آپ ان کو اس سے نکال کر دیکھیے کہ جو ان مزاروں پہ جمعرات کی شام کو جا رہے ہوتے ہیں' ان سے بات کر کے دیکھیے ان کی شان میں اتنا سا بھی کہنا کہ ''بھئی! وہ تو ہماری تمہاری طرح کے انسان تھے'' گستاخی سمجھی جاتی ہے۔ کانپ رہا ہے' ڈر رہا ہے' کہتا ہے کہ ''توبہ کرو' ارے بھئی! تم جو کچھ کہتے ہو' خدا کے لیے میرے سامنے تو یہ نہ کہو' تم تو مردود منکر ہوئے ہو' مجھے بھی کیوں ایسا بناتے ہو' ڈر وان کے عذاب سے' ڈر وان کے جلال سے' بھسم کر دیتے ہیں حضرت صاحب!'' ان کے دل و دماغ سے یہ خوف نکل ہی نہیں سکتا' تو ہم پرستی کے جال میں پھنسا ہوا نکل ہی نہیں سکتا۔ کہا ہے کہ وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِیْصًا (4:121) اس تباہی سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں۔ کیا چیز قرآن کریم کہہ جاتا ہے! اور ان کے مقابلے میں کہا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (4:122) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین محکم ہے' وہ ان کے مطابق ایسے صلاحیت بخش کام کریں جو انسان کی صلاحیتوں کو بیدار کرتے چلے جائیں تو ان کاموں کا نتیجہ خوشگواریوں کی جنتیں ہے' جن میں ایسے ثمر آور درخت ہیں جن کے اوپر کبھی خزاں نہیں آ سکتی۔

عزیزانِ من! اُدھر یہ کہا تھا کہ شیطان کا ہر وعدہ غرور ہے' فریب ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (4:122) خدا جو وعدہ تم سے کرتا ہے وہ حق ہے۔ حق کے معنی یہی نہیں ہوتا کہ وہ سچا ہے' آپ کو اب معلوم ہوگا کہ حق کے معنی ہیں کہ جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے۔ حقیقت کہتے ہی ٹھوس' ثابت' مرئی' محسوس شے کو ہیں۔ یہاں وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا کہا ہے کہ یہ صرف ذہنی چیز نہیں ہے' اعتقادی چیز نہیں ہے' یہ تو ٹھوس نتیجے کی شکل میں سامنے آنے والی بات ہے۔ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا (4:122) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔ اس کی صداقتیں تو اس کے قوانین پر عمل کرنے سے سامنے آتی ہیں۔ سائنٹسٹ کی جو لیبارٹری ہے اس

میں ایک ایک منٹ کے بعد' اس کے وعدے' اس کے حق ہونے کی دلیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کچھ خارجی کائنات میں ہورہا ہے۔ اور اُدھر انسانی زندگی کے اندر یہ ہے کہ جس روش کے مطابق جو قوم جس قسم کا نظام وضع کرتی ہے' اس کے نتائج خدا کے قوانین کی صداقت کی زندہ دلیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے خدا کے وعدوں کا حق ہونا اور یہ ہے ان کی صداقت کا ثبوت۔

ہمارے ہاں نہ قوانینِ فطرت ہیں' نہ ہماری تمدنی زندگی میں وحی کے دیئے ہوئے قوانینِ خداوندی ہیں تو ہمیں کیا معلوم کہ خدا کے جو وعدے ہیں وہ کس طرح سچ ہوتے ہیں۔ جب ان سے پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ بالکل! قیامت میں جا کر تمہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ بالکل سچے وعدے ہیں۔ یعنی یہاں تو ان کی صداقت اور سچائی کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا' وہاں جا کر تمہیں یہ ثبوت ملے گا۔ اب یہ بات کہی کہ اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ جنت کے متعلق یہ جو ہمارے ہاں کے احبار و رہبان ہیں' ان کے دیئے ہوئے تصورات یہ ہیں کہ ہم خدا کے محبوب کی امت ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ! پہلے تو اسی جنت کے لیے' اگر میں وہ روایات آپ کے سامنے پیش کروں تو پھر آپ کو حیرت ہو کہ جنت کتنی ارزاں بک رہی ہوتی ہے۔ دو مسلمان جب آپس میں مل کر السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ جی' مصافحے سے ان کے ہاتھ الگ ہونے سے قبل ہی ان کے لیے جنت لکھ دی جاتی ہے۔ ''سویر توں شام تیکر 30, 30, 20, 20 جنوں کیندے نیں جنتاں' اک رکھ لینی اے تے باقی گہنے پا دینیاں فیر'' (صبح سے شام تک 30,30,20,20 جنہیں کہتے ہیں جنتیں ہیں۔ ان میں سے ایک رکھنی ہے اور باقی تحفہ دیدینا ہے)۔ مسجد میں جا کے دایاں قدم اگر پہلے رکھ دیا جائے تو جنت اس کے لیے وقف ہے۔ صبح کی نماز کے بعد 33 دفعہ استغفر اللہ والی بات پڑھ لی جائے تو صبح کی جنت ہے۔ اور شہادت کا درجہ تو پوچھو نہیں کہ یہاں ہمارے ہاں کیسے بٹتا ہے۔ قرآنِ کریم نے سب سے بلند درجہ ان کو دیا ہے جو خدا کی راہ میں جان دیدیتے ہیں' انہیں شہید کہا جاتا ہے یعنی خدا کی راہ میں جان دینے والے۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئی تھیں ان جنگوں میں کوئی ایک ہزار کے قریب ہیں جو شہید ہوئے تھے اور پھر اس کے بعد جنگوں کا سلسلہ (جزیرۂ عرب میں) نہ رہا۔ روایت میں یہ ہے کہ پھر صحابہؓ نے یہ پوچھا کہ حضور ﷺ! ایک تو ہمارے ہاں پہلے ہی شہدا کی تعداد کی اتنی کمی تھی اور اس کے بعد موقع ہی کوئی نہیں رہا تو کیا حضور ﷺ کی امت میں شہید بس اتنے ہی تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! تم غلط سمجھتے ہو' شہادت کے لیے یہی ایک شرط نہیں کہ میدانِ جنگ میں جا کر فی سبیل اللہ جان دیدو تو شہید ہے' جو شخص ڈوب کر مر جائے وہ بھی شہید ہے ''پنجابی اچ کیندے نیں اوڈوب کے مر'' (پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''اے! ڈوب مرو'') جو شخص آگ میں جھلس کر مر جائے وہ بھی شہید ہے' جو شخص ہیضے سے مر جائے' دستوں کی بیماری سے' وہ بھی شہید ہے اور آپ کے ہاں شہادت کی ایک لمبی لسٹ بنی ہوئی ہے۔ اور جنت ملنے کا تو پوچھو ہی نہیں' جو اتنا کچھ بھی نہ کرے اس کے لیے بھی پھر ضرورت کچھ نہیں ہے۔

## جنت کے اندر داخلے کے سلسلہ میں صحاح ستہ کی ایک روایت اور قرآنِ کریم کا انتباہ

آ گے جو آپ کے ہاں بخاری میں بڑی لمبی روایت آتی ہے اور تمام صحاح ستہ کے اندر ہے کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو جائے گا' جنت والے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے' جہنم والے جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے' عدالت کا وقت ختم ہو جائے گا' دفتر بند کر دیا جائے گا' رجسٹر سنبھال لیے جائیں گے' کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اللہ میاں اٹھ کر جانے کی تیاری کر رہے ہونگے تو نگاہ ماریں گے تو حشر کے میدان میں ایک شخص سجدے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے کہ سارا میدان تو صاف ہو گیا تھا' یہ کچہری کے احاطے میں کون شخص باقی ہے اور کیا صورت ہے کہ یہ اس طرح سجدے میں گرا ہوا ہے' جاؤ اس کو اٹھا کر لاؤ۔ وہ جا کر اٹھائیں گے تو وہ کہیں گے کہ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ سجدے سے نہیں اٹھ رہے۔ اللہ میاں خود ان کے پاس جائیں گے کہ کیا بات ہے' دیکھیں گے تو وہ حضور سرور کائنات ﷺ سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ' آپ ﷺ کو کہیں گے کہ آپ ﷺ کیوں جنت میں نہیں گئے' آپ ﷺ کے جانے کے لیے سب سے پہلے یہ بات طے ہوئی تھی' آپ ﷺ فرمائیں گے کہ میں جنت میں کیسے چلا جاؤں جبکہ میری امت جہنم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ آپ ﷺ کو تو جنت میں ہم نے بھیجنا ہے تو کہیں گے پھر اس کے لیے شرط ماننا پڑے گی' پہلے میری امت کو جنت میں بھیجیے پھر جاؤنگا۔ اللہ تعالیٰ جہنم میں ہاتھ ڈالیں گے اور اس طرح سے ''اک پرا گا اوہدے اچوں کڈن گے' جیویں مچھیرے دے جال اچ مچھیاں پھنسی ہوئی ہوندیاں نیں'' (اس میں سے غلہ چھٹنے کے ایک چھاج کے دانوں کے مساوی نکالیں گے۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے مچھیرے کے جال میں مچھلیاں پھنسی ہوتی ہیں)۔ اور وہ انہیں کرین کی طرح یہاں جنت میں لٹکا دیں گے۔ کہیں گے کہ اٹھو' آپ ﷺ کہیں گے کہ نہیں صاحب! اتنے سے کیا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! کیا سن رہے ہیں ان کہانیوں کو! آپ نے دیکھا جو کہا تھا کہ یہ پھر بڑے دلکش افسانے وضع کرتے ہیں۔ ہاں تو پھر اس کے بعد آپؐ اور ہاتھ ڈالیں گے' پھر اور چلا جائے گا' اٹھو! ابھی بھی نہیں صاحب! اور اس پہ پھر مولوی جو جھوم کر وہ نظم پڑھتا ہے جس کا نہ کافیہ ہوتا ہے' نہ ردیف ہوتا ہے کہ پھر وہ محبوب بنے ہوئے ہیں وہ عاشق بنے ہوئے ہیں' وہ منتیں کر رہے ہیں وہ اٹھتے نہیں ہیں' یہ ایک ایک چیز ان کی پوری کر رہے ہیں محبوب جو ہوئے صاحب! نکالتے چلے جائیں گے' نکالتے چلے جائیں گے' حتیٰ کہ وہ جو آخری امت ہے' اس کو بھی نکال کر جنت میں بھیج دیں گے اس کے بعد پھر آپ ﷺ اٹھ کر آخر میں جنت میں جائیں گے اور پھر اللہ میاں واپس تشریف لے جائیں گے۔ غور فرمایئے آپ! یہ کچھ آپ کے لیے کہا ہے۔ قرآن حمید ہے' عزیزانِ من! یہاں جو یہ کہا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (4:122) جو لوگ قوانینِ خداوندی پہ یقین

رکھتے ہیں اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو یہ لوگ ابدی شادابیوں کی جنت کی زندگی بسر کریں گے۔
اور اس کے بعد کہا ہے کہ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ (4:123) یاد رکھو! خالی آرزوؤں سے' نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق' نہ ان اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق' یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ان اہل کتاب نے بھی یہ عقائد وضع کر رکھے تھے۔

## جنت میں داخل ہونے کے لیے مختون ہونے یا کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت اور خدائے علیم کا ارشاد

یہودی مختون ہوتے تھے یعنی اپنے بچوں کا ختنہ کرتے تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ قیامت میں صرف یہی ایک چیز ہے جو وہاں دیکھی جائے گی اور جس سے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔ عزیزانِ من! آپ ان کی بات پہ ہنستے ہیں' آپ اپنی بات پہ روتے کیوں نہیں؟ بس انہوں نے یہ معیار مقرر کیا تھا۔ یہ ہے اَمَانِيِّكُمۡ اپنے ہی ذہن سے ایک معیار مقرر کر دینا۔ اَمَانِيِّكُمۡ کے معنی یہ ہیں۔ بات تو آگے چلی جاتی ہے' یہاں بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوتی ہیں' میں کیا کیا بتاؤں۔ جو پھر الٰہیات کے مسائل پیدا ہوتے ہیں' پھر ان کو حل کیسے کیا جائے۔ سوال ان کے ہاں یہ پیدا ہوا کہ بعض بچے پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں' ان کا ختنہ ابھی نہیں کیا جاتا تو اگر یہ معیار ہوا کہ یہ دیکھ کر ہی جنت اور جہنم میں بھیجنا ہے تو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے یہودیوں کے بچے جو غیر مختون ہونگے ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ان کے لیے یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ اس طرح سے پیدا ہونے والے بچوں کا ختنہ کریں۔ اور آگے فلسفہ آتا ہے۔ یہ Semitic (سامی النسل) اقوام تھیں۔ یہ یہودیوں کے ہی ہاں نہیں' یہ سامی اقوام میں ختنے کی رسم آ گئی تھی۔ اُدھر عرب بنی اسماعیل والے بستے تھے انہوں نے بھی اپنے ہاں ختنہ شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو گھپلا ہو جائے گا' انہوں نے بھی ختنہ شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! یہ بات ایسی نہیں ہے خدا کو کون دھوکا دے سکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ان بچوں کا ختنہ کر کے' میری بیٹیاں معاف رکھیں' تو جو غیر بنی اسرائیل مختون ہو جائیں گے وہ ان کی یہ کھالیں ان پہ لگا دیں گے۔ معیار وہی اَمَانِيِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ (4:123) ہوگا۔ عیسائیوں کے ہاں سیدھی سی بات ہے کہ جو بھی حضرت مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لے آئے گا' جنت میں چلا جائے گا۔

برادرانِ عزیز! قرآن کریم نے کہنا تو یہ تھا کہ جنت یوں نہیں بٹا کرتی' یہ اپنی اپنی پیدا کردہ آرزوؤں کے مطابق نہیں ملا کرتی لیکن ان کی بات کہنے سے پہلے کہا کہ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ (4:123) اہل کتاب کی ان امانی کا ذکر بعد میں کیا ہے' کہا کہ نہ تمہاری ان آرزوؤں کے مطابق' نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق ہوگا۔ اللہ اکبر! فوراً ہی کہا ہے کہ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ (4:123) تم ہو یا وہ ہو' جو بھی خدا کے قانون کے خلاف کوئی کام کرے گا اس کا بدلہ' پاداش اس کو مل کر رہے گی' اس میں کسی کے ذاتی جذبات کا سوال ہی نہیں ہے۔ وَ لَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيۡرًا (4:123) خدا کے قوانین کے علاوہ پھر کوئی اس کا والی وارث اور حامی اور ناصر نہیں ہوگا خواہ تم ہو یا یہ اہل کتاب ہوں' کسے باشد۔ وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ

مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ ھُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا (4:124) اور جو بھی تم میں سے ان صداقتوں پر یقین رکھے گا اور پھر اس کے اعمال صالحہ ہونگے' وہ عورت ہو یا مرد ہو' ایسے لوگ زندگی کی شادابیوں سے بہریاب ہونگے اور ان کی محنت کے ماحصل میں سے ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ ایسا کرنا ظلم ہوگا اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ عیسائیت کے ہاں یہ چیز بھی تھی کہ عورت جنت کے اندر نہیں جا سکتی۔ قرآن کریم نے کہا کہ ''کسے باشد'' اس میں مرد اور عورت کا کوئی امتیاز نہیں ہے' جو بھی ان صداقتوں کا یقین رکھ کر ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا' وہ جنت میں جائے گا۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک جنت میں داخل ہونے کا معیار

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ جہاں میں کہا کرتا ہوں کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کو جلی حروف میں لکھ کر اپنے سامنے رکھنا چاہیے ان میں یہ آیت بھی ہے کہ لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ (4:123) اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں' نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق مل سکتی ہیں' نہ اہلِ کتاب کی۔ ہمارے دلوں کی یہ خوش آئند آرزوئیں' یہ خوش اعتقادیاں' یہ غلط قسم کے نظریات وشفاعت' یہ ہیں جنہوں نے قوموں کو تباہ کیا ہوا ہے۔ لوگ ان کی بارگاہوں کے اندر کیوں جاتے ہیں؟ یہ جاتے ہیں دعائیں کرانے کے لیے' بخشش مانگنے کے لیے۔ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے مقربین ہیں' وہ ہماری نہیں سنتا' ان کے Through (ذریعے) بھیجنے سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

برادرانِ عزیز! آیات تو بہت ہیں' دو ایک مثال کے طور پر سامنے لائیے کہ جنت کیسے ملتی ہے۔ کہا ہے کہ لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ (4:123) پھر سامنے لائیے کہ یہ تمہاری خوش اعتقادیوں کے مطابق نہیں ملتی۔ آگے کہا ہے کہ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ (2:214) آہاہاہا!! قرآن کریم کیسے بات شروع کرتا ہے! کیا تم یہ ذہن میں خیال کیے بیٹھے ہوئے ہو کہ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ (2:214) تم جنت میں پہنچ جاؤ گے وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡھُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ (2:214) تم ذہن میں یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ بس ہم نے اپنے آپ کو اس کے محبوب کی امت میں شمار کیا تو جنت میں چلے گئے۔ سنو! ایسے نہیں ہوگا۔ یہ راستہ تو بڑا دشوار گزار ہے' اس میں تو قدم قدم پر مخالفت کی قوتوں کے ساتھ مقابلہ ہوتا ہے' ٹکراؤ ہوتا ہے' تصادم ہوتا ہے' یہ تو میدانِ کارزار میں جانا پڑتا ہے' جہاد کا میدان ہوتا ہے۔ اس میں کیفیت یہ ہے۔ کہا کہ تم سمجھے بیٹھے ہو کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے ''حالانکہ ابھی تو وہ مقامات آئے نہیں جن مقامات سے اس سے پہلے جنت میں جانے والے گزرے۔ جن کی کیفیت یہ تھی کہ سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا' مشکلات کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے' مقابلے میں دشمنوں کی افواجِ قاہرہ ان کے سامنے آئیں' جنگ وجدل ہوا' تلواریں چلیں' نیزوں اور ڈھالوں کی جھنکار رہوئی۔ اس قسم

کے وہاں جان دینے کے مراحل پیش آئے' اس قدر سختیوں کے پہاڑ ٹوٹے کہ زمین ان کے نیچے کانپ اٹھی اور رسول ﷺ اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کہ اے خدا! تیری نصرت کب آئے گی؟ اس موقع پر آواز آئی کہ ہاں! ہماری نصرت آئی سمجھو' جانیں دو اور دیکھو جنت میں پہنچ گئے''۔ یوں جنت میں جایا کرتے ہیں۔ اور یہ کہا ہے کہ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ (2:214) تم سمجھتے ہو کہ یونہی بیٹھے ہوئے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔

## نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہوتی ہے

برادرانِ عزیز! کہا یہ ہے کہ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ (4:123) تمہاری خودفریبیوں کی رو سے جنت نہیں ملا کرتی! کس قدر درخشندہ ہے حضور ﷺ کی وہ روایت' وہ حدیث کہ تلواروں کے سائے کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ ڈوب کر مرنے سے یا جل کر مرنے سے شہادت نہیں ملتی۔ کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو اَمۡ حَسِبۡتُمۡ (2:214)؟ کہا ہے کہ لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ (4:123) تمہاری خوش عقیدیوں کے مطابق جنت نہیں ملا کرتی۔ دوسرے مقام پہ یہ ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ هُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ (29:2) کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم مسلمان ہیں' جنت میں بھیج دیئے جائیں گے اور وہ ان بھٹیوں میں سے نکالے ہی نہیں جائیں گے کہ جن سے نکلنے کے بعد ایک جھوٹی دھات کندن بنا کرتی ہے۔ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا (29:2) یہ ہے زعم کہ بس کہہ دیا کہ ہم مسلمان ہیں اور پھر اس کے بعد سمجھ لیا کہ جنت کے وارث ہو گئے' اس ﷺ کے محبوب کی امت ہیں وہ خود بخشوا لے گا۔

## قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کا اپنی ذاتِ خاص کے متعلق اعلان اور جنگِ احزاب کا ذکر

جس ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ وہ بخشوا لے گا' اس ﷺ سے خود قرآنِ کریم میں انہیؑ کی زبانِ مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ میں بھی اگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرونگا تو میں بھی اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ یہ خود اس سے نہیں بچ سکتے تو کیا وہ ان کروڑوں کو جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کی پاداش میں جہنم میں گئے' ان کو بخشوا کر لے جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ میں بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ کہا ہے کہ وَ هُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ (29:2)۔ پھر بھٹیوں میں سے گزارا جائے گا۔ یہ کس قسم کی بھٹیاں آئی تھیں اس کی ایک مثال جنگ احزاب[1] کا قصہ ہے' میدانِ جنگ میں سامنے دشمن ہے' ادھر یہ رسول اللہ ﷺ کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے ہیں' صحابہ کبارؓ لشکر کی حیثیت سے ہیں' کیفیت یہ ہے۔ وہاں گھمسان کا اتنا معرکہ پڑا ہے کہ اِذۡ جَآءُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ (33:10)

---

[1] ذیقعدہ 5ھ۔ قریش اور یہود کی تمام طاغوتی قوتیں اپنے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر حق کے مقابلہ کے لیے یکجا ہو گئیں کہ الکفر ملة واحدة۔ اس جہت سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں یعنی مختلف جماعتوں کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ!

ادھر سے بھی لشکر جرار آ گیا' ادھر سے بھی ایک فوج تمہارے مقابلے میں اُمڈ کر آ گئی۔ کیفیت یہ ہوگئی کہ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ (33:10) تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (33:10) دل دھڑک کر حلقوں تک آ پہنچے۔ کیفیت یہ ہوگئی۔ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (33:10) تم میں کمزور دل کے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے یہ سمجھا کہ صاحب! یہ وعدے جو تھے وہ تو کچھ غلط ہوتے نظر آتے ہیں۔ کہتا ہے کہ هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا (33:11) اس طرح سے ہم واقعات کو گردش دے کر سامنے لایا کرتے ہیں اور اس طرح سے زلزلہ انگیز قیامتیں ٹوٹا کرتی ہیں کہ تم یہ پہچان سکو کہ تمہارے اندر تمہاری خودی کتنی بیدار ہوئی ہے' تمہارے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں کتنی پختہ ہوئی ہیں۔ اس طرح سے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اور جوان بھٹیوں سے گزر کر اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے کہ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی' وہ جنت میں جایا کرتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست [1]

ایک بہشت تو یہ ہے۔ یہ صاحب عزم و ہمت کے لیے ہے۔

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش [2]

ان مسلمانوں سے کہو کہ خوش ہو جاؤ

بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست! [3]

(ارمغانِ حجاز۔ ص۔ 210)

''اللہ واسطے وی جنت ملدی ہوندی ہیگی اے'' (ایک بخشش میں بھی جنت ملا کرتی ہے)۔

## خدا کی طرف سے یہ پوری کائنات تو بغیر کسی معاوضے کے مل سکتی ہے لیکن جنت کی یہ صورت نہیں ہے

جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ ان کے ہاں جنت کے متعلق لفظ ہی بخشش ہے' یا اللہ بخش دے ''بخشیش ای منگدے رہندے نیں''

---

❶ بہشت حرم (کعبہ) سے نسبت رکھنے والے پاک لوگوں کے لیے ہے (وہ غیر اللہ کے گھر کا طواف نہیں کرتے)۔ بہشت ہمت والے لوگوں کے لیے تھے۔

❷ ہندوستان کے مسلمان سے جو نہ پاکانِ حرم میں سے ہے اور ارباب ہمت میں سے ہے کہہ دو کہ وہ بھی خوش ہو جائے۔

❸ ایک بہشت وہ بھی ہے جو اللہ کی مہربانی سے مل جائے گی۔ مفت مل جائے گی (یہ ہندی مسلمان پر طنز کیا ہے کہ اللہ تم بے عملوں کو بھی بہشت سے محروم نہیں کرے گا آخر تم مسلمان تو ہو' چاہے نام کے سہی)۔

(بخشش ہی مانگتے رہتے ہیں)۔گداگروں کی طرح جنت بخشیش کے طور پہ نہیں ملتی۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ ❶

بہشت بھی اگر یہ خدا سے بخشش کے طور پر لیتا ہے تو قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔

تا جزائے عملِ تست' چناں چیزے ہست ❷

تیرے اپنے اعمال کے بدلے میں یہ ملتی ہے تو پھر اس قابل ہے کہ اسے قبول کیا جائے گا۔ یہ ہے دونوں جنتوں کا فرق۔

## اعمال کے بدلے ملنے والی جنت اور مفت میں ملنے والی جنت میں فرق

آپ کو پتہ ہے کہ تمثیلی انداز میں قرآن حمید نے کہا ہے کہ آدم کو جو پہلی جنت تھی' وہ ویسے ہی دیدی گئی تھی۔اس جنت کی کیفیت یہ تھی کہ ایک معصیت ہوئی' کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔اور اس کے بعد اس سے کہا گیا کہ اپنے اعمال کے صلے میں یہی جنت دوبارہ حاصل کرو۔یہ جو جنت ہے اس کے متعلق کہا ہے وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(43:72) یہ وہی جنت ہے' اب تم اس کے وارث بنائے گئے ہو اعمال کے بدلے میں خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ (4:122) اب تمہیں کوئی یہاں سے نہیں نکال سکے گا۔خون دے کر خریدی ہوئی جنت ہے' اس کو کون چھین سکتا ہے۔وہ تو اللہ واسطے کی خیرات میں ملی ہوئی ہوتی ہے کہ سخی کا دل چاہا تو اس نے دیدیا' جی چاہا تو چھین لیا۔لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ (4:123) نہ ان اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق' نہ تمہاری خود فریبی کے لحاظ سے' جنت یوں نہیں ملا کرتی۔

## دین خداوندی اگر نظامِ زندگی کو حسن عطا کرتا ہے تو دوسری طرف وہ ذاتِ انسانی کو بھی ایک نئی منزل سے روشناس کراتا ہے اور وہ ہے خدا کو اپنا دوست بنانا

اس کے بعد کہا ہے کہ وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ (4:125) یہ ہے نظامِ زندگی' اس سے زیادہ حسین نظامِ زندگی اور کون سا ہوسکتا ہے۔کیا نظام زندگی ہے؟ کہا ہے کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (4:125) جس میں آپ کو تمام وکمال Surrender (سرنگوں) کر کے قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا۔وَ هُوَ مُحْسِنٌ (4:125) اس طرح سے اس نے اس کائنات کے حسن کو بھی سنوارا' اپنی ذات کو بھی حسین بنالیا۔یہ ہے وہ دین جس سے بہتر دین اور کوئی نہیں ہوسکتا۔اس کا عملی نمونہ

---

❶ وہ بہشت جو خدا تجھے بخشے بالکل بے معنی ہے' ہمہ ہیچ ہے' اس لائق نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

❷ ہاں اگر یہ تیرے عمل کی جزا ہے تو پھر یہ کوئی چیز ہے کہ اسے قبول کرلیا جائے۔

وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا (4:125) اس ابراہیمؑ کے راستے پر چلا کہ جس نے اپنے سامنے خدا کی توحید کا ایک نصب العین رکھا تھا' اِدھر اُدھر اس نے کن اکھیوں سے بھی نہیں دیکھا' سیدھا اس کی طرف چلتا رہا۔ وَ اتَّخَذَاللّٰهُ اِبۡرٰهِیۡمَ خَلِیۡلًا (4:125) اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کو خدا اپنا دوست بنایا کرتا ہے۔ کہا کہ یہ دین ہے کہ خدا کے قوانین کے سامنے ہمہ تن تسلیم بن کر جھک جانا' اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا۔

## قوانینِ خداوندی کے تحت کائنات کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے: انگور کا دانہ بھی اور ببول کا بیج بھی

عزیزانِ من! اس دین کی مثال قرآنِ کریم ہمیشہ خارجی کائنات کی دیا کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (4:126) تم دیکھتے نہیں خارجی کائنات میں ہمارا دین کس طرح کارفرما ہے! کائنات کی ہر شے ہمارے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلتی جارہی ہے' کسی کا ایک قدم بھی ان قوانین کے خلاف نہیں اٹھتا۔ قانون کی کتنی بڑی قوت ہے! دیکھیے کہ اتنا سا ایک ذرے کے برابر بیج ہے جسے مٹی کے اندر دبا دیا جاتا ہے۔ یہاں آپ انگور کی بیل کا بیج دباتے ہیں' اُدھر ببول کے درخت کا ایک بیج دباتے ہیں۔ اب وہی مٹی ہے' وہی پانی ہے' وہی ہوا ہے' وہی سورج کی روشنی ہے' ذرا سے ایک بیج کے اندر' ذرا سا ایک دانہ ہے جس میں پھوٹنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اب دیکھیے قانون کی قوت۔ یہ سب کچھ یکساں ہے۔ وہ جو ذرا سا ابتدائی ذرہ ہے' اس کے اختلاف سے اسی زمین سے یہ انگور کی بیل کا بیج وہی غذائیں حاصل کرتا ہے اور اُدھر وہ ببول کے درخت کا بیج بھی اسی قسم کی غذائیں حاصل کیے چلا جاتا ہے۔ قوت انتخاب کی یہ کیفیت ہے کہ یہ ابھرتا ہوا' نشوونما پاتا ہوا' بڑھتا ہے تو اس میں انگور کے خوشے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ اور اُدھر وہ ببول کا بیج بھی اسی قسم کی غذائیں حاصل کیے چلا جاتا ہے' قوتِ انتخاب کی یہ کیفیت ہے کہ یہ ابھرتا ہوا' نشوونما پاتا ہوا' انگور کے خوشے اس میں لٹک رہے ہیں' اُس ببول میں کیکر کے کانٹے اگ رہے ہیں۔ کسی انسان کی قوت ان میں کوئی تمیز پیدا نہیں کر رہی۔ اس کے اندر یہ کتنی بڑی قوت ہے! اس کے قوانین کے سامنے کائنات کی ہر شے جھکی ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ کَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطًا (4:126) اور کوئی شے بھی کائنات کی ایسی نہیں جو اس کے قانون کے دائرے سے باہر ہو۔ اسی کو دوسری طرف قرآن نے ایمان کہا ہے۔ اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ یَبۡغُوۡنَ (3:83) کیا یہ لوگ نظامِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی چاہتے ہیں۔

## کائنات اور انسان میں کرہاً اور طوعاً کے فرق کی وضاحت

سوال پیدا ہوا کہ صاحب! وہ دین اللہ کیا ہے' دین خداوندی کیا ہے؟ کہتا ہے کہ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا (3:83) کائنات کے اندر تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہر شے اس کے قانون کے مطابق جھکی ہوئی ہے اور دینِ خداوندی کسے کہتے ہیں! پھر الفاظ کو دیکھ لیجیے۔ کیا یہ دین خداوندی کے علاوہ کوئی اور دین بھی چاہتے ہیں؟ دینِ خداوندی کیا ہے؟ کہا ہے کہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی ہر شے اس کے قوانین کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ یہاں مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ (3:83) کہا ہے' یہ عجیب چیز ہے۔ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا (3:83) کہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کائناتی قوتیں جتنی ہیں کرہاً اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں' انہیں اختیار و ارادہ نہیں ہے' وہ اس بات کے لیے مجبور پیدا کی گئی ہیں کہ وہ اس کے دیئے ہوئے قوانین کے تابع زندگی بسر کریں۔ انسان کے لیے یہ ہے کہ وہ یہی کچھ طوعاً کرے' اپنے اختیار و ارادے سے' اپنی مرضی سے ایسا کرے' بس دونوں کے اندر یہ فرق ہے۔ وہ کرہاً یہ کچھ کر رہے ہیں اور انسان کو یہی چیز طوعاً کرنی چاہیے۔ لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ (2:256) انسانوں کا جہاں تک تعلق ہے دین کے معاملے میں جبر نہیں ہے' جبر تو کائنات کی دوسرے اشیا کے اندر ہے۔

## خارجی کائنات کے قوانین ہوں یا انسانی زندگی کے لیے ضابطہ حیات' ان دونوں کے لیے دین ہی کہا گیا ہے: خدا کا دین پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے

دین کے یہی معنی ہیں کہ ''خدا کے مقرر کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے چلے جانا''۔ خارجی کائنات میں طبعی قوانین (Laws of Nature) کارفرما ہیں۔ وہ بھی قوانین خداوندی کا ایک حصہ ہیں' دیکھتے نہیں کہ خدا نے اس کو بھی دین خداوندی کہا ہے۔ تو کیا اس دین کا علم حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہو جائے گا' وہ نیچری ہو جائے گا؟ جیسا میں نے شروع میں آپ کو بتایا ہے' اسے قرآن کریم خود دین خداوندی کہتا ہے کہ یہ ہمارا دین ہے' جس کے مطابق خارجی کائنات کی ہر شے زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہی قوانین انسانی زندگی کے متعلق ہیں جو وحی کے ذریعے مل گئے ہیں۔ فرق تو صرف قوانین کے دینے کے طریقے میں ہے اور یہ فرق بھی اس لیے رکھا گیا ہے کہ جب قانون کو کسی کے اندر ودیعت کر کے از خود رکھ دیا جائے تو وہ چیز اس کی فطرت کہلاتی ہے' وہ اس کے مطابق مجبوراً زندگی بسر کرتی ہے' وہ شے جس کے اندر ہدایت رکھ دی گئی ہو۔ انسان کے اندر قوانین کو نہیں رکھا گیا' اس کے اندر بھی رکھ دیا جاتا تو یہ بھی اسی طرح روبہ عمل ہوتا جس طرح مرغی کے چوزے خشکی پہ زندگی بسر کرتے ہیں' بط کے بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی پانی کے اندر کود جاتے ہیں' بکری کا بچہ گھاس کھاتا ہے' شیر کا بچہ گوشت کھاتا ہے' نہ ان کی طرف کوئی انبیائے کرامؑ آتے ہیں' نہ کتاب نازل ہوتی ہے' نہ کسی

استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کے کسی ایک بچے کو' بچے کو ہی نہیں' اس کے کسی انڈے کو لے جا کر دور تین ہزار میل کے فاصلے پر کسی دوسرے ملک کے اندر چھوڑ دیجئے' وہاں بچہ نکلے گا' وہی کچھ کرے گا جو یہاں کا بچہ کر رہا ہے' وہ مجبوراً ایسا کرے گا کیونکہ ان کے اندر قوانین رکھ دیئے گئے ہیں۔انسان کو چونکہ صاحب اختیار وارادہ بنایا ہے' اس کے اندر قانون کوئی نہیں رکھا گیا۔اسے یہ کہا گیا ہے کہ **هَدَيۡنٰـهُ النَّجۡدَيۡنِ** (90:10) دونوں راستے اس کے سامنے ہم نے رکھ دیئے' دو ممکنات اس کے سامنے ہیں اور اسے کہہ دیا ہے کہ **فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ** (18:29) جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کر لے اور اس راستے کا انکار کر دے۔جس قسم کا راستہ اختیار کرے گا اس کے مطابق اس کا انجام ہوگا' نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔اسے یہ چیز طوعاً' بطیبِ خاطر' اپنے اختیار وارادے' سے اختیار کرنا ہوگی۔کائنات کی قوتیں مجبوراً ان طریقوں پر چل رہی ہیں۔طوعاً وکرہاً کا فرق یہی ہے۔اسی لیے کہا ہے کہ **وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ مُّحِيۡطًا** (4:126) اس کا قانون پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔

## کائناتی قوانین کے ذکر کے بعد عائلی زندگی کی مزید وضاحت

عزیزانِ من! ابھی درس کے خاتمے میں تو چار پانچ منٹ باقی ہیں' مضمون ایک دوسرا شروع ہوتا ہے۔ابتدا میں عائلی قوانین دیئے گئے تھے: گھر کی زندگی کے متعلق۔یہاں پہنچنے کے بعد قرآن کریم انہی کا ایک اور حصہ پھر سامنے لایا ہے۔اس لیے کہ جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے' اس کی ابتدا گھر کی زندگی سے ہوتی ہے۔قرآن کریم اسی لیے گھر کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ وہاں جس قسم کی آپ کی زندگی ہوگی' بچوں کی بھی اسی قسم کی زندگی ہوگی' آپ بچوں کی جیسی تعلیم وتربیت کریں گے' اسی قسم کے وہ بچے بنیں گے۔انسان کے بچے کی یہ کیفیت نہیں ہے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ بکری کا بچہ ازخود وہی کچھ بن جاتا ہے جو بکری ہوتی ہے' اس نے بکری ہی بننا ہوتا ہے' اس سے آگے کہیں نہیں جانا ہوتا' کچھ اور نہیں بننا ہوتا۔انسان کا بچہ ازخود کچھ نہیں بن سکتا' وہ اَن گھڑت سا ایک Raw Material (خام مواد) ہوتا ہے جو کائنات میں آتا ہے' اسے آپ نے کچھ بنانا ہوتا ہے۔تو اب سیدھی سی بات ہے کہ جس ورکشاپ کے اندر اس خام مسالے کو بھیجا گیا ہے اس کے لیے قاعدے' قوانین' ضابطے' کالج' ماڈلز وہاں رکھنے چاہئیں تاکہ ان کے اندر ڈھل کر وہ اس قسم کا بنے جیسا وہ بننا چاہتا ہے۔یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے گھر کی زندگی کو بڑی اہمیت دی ہے' اتنی اہمیت کہ بڑے بڑے زندگی کے جو معاملات ہیں ان کے لیے صرف حدود اور اصول دیئے ہیں' ان کی جزئیات نہیں دیں لیکن عائلی زندگی کے متعلق قرآن کریم نے چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی خود دی ہیں۔تو زندگی کے نظام کا' معاشرے کا' دارومدار ہی گھر کی زندگی کے اوپر ہے۔اور یہاں یہ ہے کہ رفتہ رفتہ گھر کا تصور ہی غائب ہوتا جا رہا ہے یعنی اب ہمارے گھر Homes (گھر وکنبہ) نہیں رہے ہیں'

Houses (مکانات) بن گئے ہیں۔اور House (مکان) کے متعلق تو وہ اکبر (1846-1921ء) تہذیب کی یہ نشانی کہہ گیا ہے کہ

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

اور اگر گھر بھی ہے تو گھر بھی ہاسٹل ہی ہو چکا ہوتا ہے' باپ دفتر میں ہے' ماں کلب میں ہے' بچہ بیرے کی گود میں ہے' دودھ کی جگہ بوتل ہے اور گلیکسو کا ڈبہ ہے' جو کچھ آیا (استانی) اس کو پڑھا دے وہ پڑھ لے' جس قسم کے اسکول کے اندر بھیج دیا' جیسی وہاں سے تعلیم ملی وہ تعلیم ہوگئی۔پھر اس کے بعد ماں بھی رو رہی ہے' باپ بھی رو رہا ہے کہ دیکھیے! آج کل کے بچوں کو صاحب! آگے سے جواب کیسے دے رہا ہے۔ماں باپ کے ساتھ بچے کا تعلق اتنا ہی ہے جیسا آپ کا بینک کے منیجر کے ساتھ ہوتا ہے' اتنا سا ہی تعلق باقی ہوتا ہے۔جس دن وہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! تمہارا بینک بیلنس ختم ہو گیا تو اسی دن سامان لے کر بچہ باہر نکل جاتا ہے۔اور اس سے توقع کرتے ہیں کہ ہماری صالح اولاد ہوگی۔

عزیزانِ من! انسانی بچہ پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا بڑی مشکل بات ہے' یہ کام بڑا اہم ہے۔یہ تو پوری زندگی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔اَن گھڑت مسالے کو انسانی پیکر عطا کر دینا اور اس کی سیرت کو انسانیت کے قالب میں ڈھالنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔یہ کام ہے ماں باپ کا بچے کے لیے۔''اوناں نے اپنے وی بکری دے بچے ای سمجھے ہوئے ہیگے نیں ایناں نوں گھاہ پائی جاؤ آپے پل جان گے'' (انہوں نے اپنے بچے بھی بکری کے بچے ہی سمجھے ہوئے ہیں کہ انہیں گھاس ڈالتے جاؤ تو وہ پروان چڑھ جائیں گے)۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی آیت 126 تک آ گئے' 127 ویں آیت سے پھر وہی عائلی قوانین شروع ہونگے' انہیں ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# چھبیسواں باب: سورۃ النسآء (آیات 127 تا 132)

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا
تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ
اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا
كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ
اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 127 سے ہو رہا ہے: (4:127)۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک عائلی زندگی کی اہمیت اور اس کے لیے اصولوں کی تدوین

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخری چند الفاظ میں بتایا تھا قرآنِ کریم عائلی زندگی کو جسے گھر کی زندگی کہتے ہیں' جسے Family Life کہتے ہیں' بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے زندگی کے بڑے بڑے اہم مسائل کے متعلق صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کیا ہے حتیٰ کہ امورِ مملکت کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے وہ یوں کہیے کہ کچھ حدود بیان کی ہیں' کچھ اصول بیان کیے ہیں' ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں لیکن Family Life (عائلی زندگی) کے متعلق بڑی تفصیل سے کام لیا ہے' اس کی جزئیات تک بھی خود متعین کی ہیں اور ایک بار ہی نہیں بتائیں' بار بار ان کا اعادہ بھی کیا ہے۔ فیملی لائف سے مفہوم صرف میاں بیوی کی زندگی نہیں' میاں بیوی کی ازدواجی زندگی مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کے نزدیک یہ ایک بڑے اہم بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور درحقیقت اس کے سامنے وہ مقصد ہے جس کے پیشِ نظر وہ اس شعبہ میں اتنی تفصیلی راہنمائی سے کام لیتا ہے۔ انسانی طبعی زندگی یا

اور درحقیقت اس کے سامنے وہ مقصد ہے جس کے پیشِ نظر وہ اس شعبہ میں اتنی تفصیلی راہنمائی سے کام لیتا ہے۔ انسانی طبعی زندگی یا Physical Life کو لیجیے تو یہ زندگی کی ایک ارتقایافتہ شکل ہے' حیوانات کے جسم میں اور انسان کے جسم میں طبعی مشینری کی حیثیت سے کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ اناٹومی میں اگر دیکھا جائے تو جو کچھ ایک انسان کے جسم میں ہوتا ہے' وہ کچھ ایک حیوان کے جسم میں ہوتا ہے۔ Mammals (ممالیہ) جنہیں ہم دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں' ان کی ذمہ داریاں بھی وہی ہوتی ہیں جو انسان کی ہوتی ہیں' ان کی موت بھی اسی طرح سے واقع ہوجاتی ہے' ان کے ہاں افزائشِ نسل کا قاعدہ بھی وہی ہے جو انسانوں کے ہاں ہے۔

## انسان کا حیوانی سطح سے بلند خلقِ جدید کی طرف سفر اختیار وارادہ سے سرفراز ہونے کی نعمت کا ملنا ہے

اس اعتبار سے انسانوں کی زندگی اور حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن قرآنِ کریم نے جہاں زندگی کی یہ طبعی کڑیاں گنائی ہیں' انسانی بچہ یا جنین کے متعلق بھی اس نے کہا ہے کہ وہ رحمِ مادر میں بھی جن منازل سے گزرتا ہے وہ وہی منازل ہیں جن منازل سے ایک حیوان کا بچہ رحمِ مادر میں گزرتا ہے۔ یہاں تک تو دونوں مشترک ہیں لیکن قرآن کریم نے کہا ہے کہ آخر میں جا کر پھر انسان کی صورت میں ہم نے اس کو خلقِ جدید میں تبدیل کر دیا' بالکل ایک نئی مخلوق میں بدل دیا۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے پچھلی کڑیاں' جتنی بھی وہ ارتقا (Evolution) کی تھیں' ان کا تسلسل وہاں ختم ہوتا ہے اور وہاں سے بالکل ایک نئی مخلوق کی ابتدا ہوتی ہے۔

یہ کیا چیز ہے جو اس کے اندر بالکل نئی بات بن کر آئی ہے؟ پہلی چیز تو وہی ہے جسے اس نے خود خدائی توانائی کہہ کر تعبیر کیا ہے۔ یہ مِنۡ رُّوۡحِنَا (21:91) ہے یعنی وہ شے جو اس سے پیشتر صرف خدا کو حاصل تھی' کسی اور کو حاصل نہیں تھی۔ اور کسی مخلوق کے لیے یہ نہیں کہا ہے کہ خدا نے اس میں سے کچھ حصہ اسے بھی دیا یا اس توانائی میں وہ بھی مشترک ہوگئی۔ یہ صرف انسان کے لیے کہا گیا ہے۔ اور یہ توانائی ہے اختیار وارادے کی۔ اس سے پہلے جتنی کڑیاں گزری ہیں ان میں ساری مخلوق مجبور ہے۔ جس نہج پر زندگی بسر کرنے کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے' وہ مجبور ہوتے ہیں اس نہج پر زندگی بسر کرنے کے لیے۔ فلسفے کی اصطلاح میں ان کے سامنے Two Possibilities (دو امکانی چیزیں) نہیں ہوتیں' وہ دوراہے پہ نہیں کھڑی کر دی جاتیں کہ دو راستوں میں سے جو راستہ وہ چاہیں اپنے لیے اس کا انتخاب کرلیں۔ ان کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور اس راستے پر چلنے کے لیے وہ مجبور پیدا کی جاتی ہیں' ان کے چوائس یا انتخاب کا سوال نہیں ہوتا۔ اختیار وارادہ' جو انتخاب ہی کا دوسرا نام ہے' اختیار وارادہ کی بڑی قوت ہے اور یہ قوت اس سے پیشتر صرف خدا کے لیے مخصوص تھی اور اس نے پھر انسانوں کو کچھ حصہ دیا۔ اختیارِ مطلق تو نہیں لیکن بہرحال اسے صاحبِ اختیار وارادہ کیا۔ ایک بڑی چیز تو یہ ہے۔ اور دوسری اہم تبدیلی جو تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسی کی ایک شاخ ہے' وہ یہ ہے کہ حیوانات کا بچہ پیدا ہونے کے

ساتھ ہی اپنے اندر وہ ساری راہنمائی لے کر پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنا ہوتی ہے' اسے کوئی سکھاتا نہیں ہے' پڑھاتا نہیں ہے' بتاتا نہیں ہے لیکن انسان میں یہ نہیں ہے۔ بات لمبی چلی جائے گی ورنہ میں اب بتاتا کہ مشاہدات اور تجربات کی صورت میں انسانوں کے سامنے کیا چیزیں آئی ہیں۔

## پرندوں اور مچھلیوں کا اپنے اپنے ماں باپ سے ملاپ کی خاطر ہزاروں میل کا انوکھا سفر اور انسانی بچہ؟

ایسی صورتیں بھی ہیں کہ پرندے' جو خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں' وہ ایک جگہ انڈہ دیدیتے ہیں' اس کے بعد وہ نر اور مادہ یا ان میں سے کوئی پرندہ وہاں موجود نہیں رہتا' وہ اس جزیرے سے اڑ کر ہزار میل کہیں دور چلے جاتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ان انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں اور وہ بچے پیدائش کے ساتھ ہی یعنی ان بچوں نے اس قسم کا کوئی پرندہ بھی نہیں دیکھا ہوتا چہ جائیکہ اپنے ماں باپ کو دیکھا ہو' وہ پیدائش کے ساتھ وہ ساری خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں جو ان کے ماں باپ میں تھیں۔ یہاں تک کہ وہ جب اڑنے کے قابل ہوتے ہیں تو وہاں سے اڑ کر انہی راستوں سے جن راستوں سے ان کے ماں باپ آئے تھے اور واپس گئے تھے انہی راستوں سے ہزاروں میل کا سمندری سفر فضا میں طے کر کے ان مقامات پہ جا پہنچتے ہیں جہاں ان کے بڑے بوڑھے بستے تھے۔ سمندر کی ایسی مچھلیاں دو دو تین تین ہزار میل کی مسافت طے کر کے نئے سمندروں میں چلی جاتی ہیں۔ وہاں جا کر انڈے دیتی ہیں اور اس کے بعد وہ کہیں کی کہیں چلی جاتی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں انڈوں سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور وہ مچھلیاں انہی راستوں کو طے کر کے حتیٰ کہ انہی ندی نالوں میں سے گزرتے ہوئے وہاں جا پہنچتی ہیں جہاں ان کا ماں باپ ہوتا ہے۔ یہ جو Migratory Birds (مہاجر پرندے) ہیں ان کے متعلق انسان نے بڑی معلومات حاصل کی ہیں اور وہ بڑی ہی Interesting (دل چسپ) ہیں۔

کہہ میں یہ رہا تھا کہ جس کے لیے آپ کو نہ تو بحر الکاہل کے جزیروں میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے' نہ افریقہ کے صحراؤں میں۔ اپنے گھر میں مرغی کے نیچے بط اور مرغی کے انڈے رکھ دیجیے' دونوں میں سے جس دن بچے نکلیں گے مرغی کو الگ کر دیجیے اور دونوں کو چھوڑ دیجیے۔ مرغی کے بچوں کو دھکیل کر پانی کی طرف لائیے تو وہ بھاگ کر پیچھے کی طرف چلے جائیں گے۔ بطخ کے بچوں کو خشکی پر رکھیے' وہ اڑ کر پانی میں جا پہنچیں گے۔ کس معلم نے انہیں یہ سکھا دیا؟ ماں باپ نے کوئی تربیت نہیں دی' ان کو کسی اسکول میں نہیں بھیجا' انہوں نے کسی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا نہیں ہے۔ یہ چیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ بظاہر انسانی بچے سے انہیں بڑی Advantageous Position (افادی حیثیت) حاصل ہے' ان کو بہت بڑا افائدہ حاصل ہے لیکن یہی چیز ان کے لیے پا بہ زنجیر ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ بچہ جن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوا ہے' انہیں خصوصیات کے مطابق زندگی بسر کر کے مر جاتا ہے' ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔ یہ صرف

ایک بچے ہی کی مثال نہیں ہے۔آپ تین ہزار سال پہلے کے گھوڑے کو بھی لے لیجیے اور آج کے گھوڑے کو بھی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ وہ ایک منجمد نوع ہوتی ہے' اسی قسم کا گھوڑا ہے وہی اس کی آج بھی خصوصیات ہیں۔یعنی انہیں اپنے ماں باپ سے آگے بڑھنا نہیں ہے بلکہ وہ جس نوع سے متعلق ہیں اس میں ہزاروں سال بھی گزر جائیں' وہ انہی خصوصیات کو لیے ہوئے آتا ہے' انہی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور انہی کے مطابق مرجاتا ہے' وہی کا وہی رہتا ہے' آگے ایک قدم نہیں اٹھتا۔لیکن انسان کے بچے کو پیدا ہونے کے ساتھ آپ دیکھیے کہ وہ اس قسم کی خصوصیات بھی اپنے اندر نہیں لے کر آتا جتنا بکری کا بچہ یا بلی کا بچہ یا مرغی کا چوزہ لے کر آتا ہے۔وہ اتنی سی چیز ہے کہ جس سے قدرت نے اس کی زندگی باقی رکھنی ہے' اسے زندہ رکھنا ہے یعنی بھوک کے لیے لپک کر اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف جانا۔بس اتنا تو اس کو معلوم ہوتا ہے' اس سے زیادہ وہ بالکل کورا ہوتا ہے۔

برادرانِ عزیز! ابھی میں نے کہا ہے کہ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف لے جایئے تو وہ وہاں سے بھاگ جاتے ہیں' اگر چیل کا سایہ بھی وہاں سے گزر جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح دوڑ کر ماں کے پروں کے نیچے چلے جاتے ہیں۔انہیں خطرے کا پتہ ہوتا ہے' انہیں احساس ہوتا ہے کہ کونسے مقام میں ہمارے لیے تباہیاں ہیں لیکن جس گھر میں بچہ ذرا گھٹنوں چلنا سیکھے' آپ دیکھیے کیا مصیبتیں وہاں پیدا ہوتی ہیں: ''او پکڑنا دیکھنا! او پانی میں گر گیا' اس نے چولہے میں ہاتھ ڈال دیا' مرچیں لگالیں سر کے اوپر''۔یہ سارا گھر ایک بچے کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔''یہاں سے بچاؤ' وہاں سے بچاؤ' اب یہ کر گزرا' اب منہ میں کوئلہ ڈال لیا''۔اسے یہ بھی تمیز نہیں ہوتی کہ ''سنکھیا ہے یا مصری کی ڈلی ہے' آگ میں ہاتھ ڈالنا ہے یا نہیں' مرچیں آنکھوں میں لگیں گی تو کیا ہوگا''۔بکری کا بچہ یہ کبھی نہیں کرتا' کبھی بلی کا بچہ یہ نہیں کرتا۔

## انسان چھ ہزار سال سے بتدریج شعوری طور پر ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہے

یہ اشرف المخلوقات ہے جو بچے کی ذہنیت ہے اور اس کے ساتھ ہی اتنا کورا کہ میں نے کہا ہے کہ بکری کا بچہ وہ ساری خصوصیات لے کر پیدا ہوتا ہے جو اس کے ماں باپ میں تھیں۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ ماں بھی ایم اے ہو' باپ بھی ایم اے ہو' بیٹا الف ب بھی نہیں جانتا' اس کو الف ب پڑھانا پڑتا ہے۔وہ بالکل کورا ہے لیکن اس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو بیٹا ہے اگر اس کو مواقع بہم پہنچ رہے ہیں' اپنے ماں باپ سے دس گنا آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے' نئی نئی خصوصیات کا حامل ہے' نئے نئے علوم کا پیکر ہے۔اور یہ چیز اپنے ہی ماں باپ سے نہیں' میں نے ابھی عرض کیا ہے تین ہزار سال' چھ ہزار سال پہلے کا گھوڑا بکری اور ہرن لیجیے' آج کا ہرن اور وہ ہرن ایک ہی بات ہے۔قریباً چھ ہزار سال سے انسان کی تاریخ ہمارے سامنے آسکی ہے۔ چھ ہزار سال پہلے کے انسان کسی نہ کسی شکل میں جو غاروں

میں بستا تھا اس انسان میں اور آج کے انسان میں دیکھیے تو بس انسان ہونے کی جہت سے وہ یکساں ہیں ورنہ بالکل نئی مخلوق بن چکے ہیں۔ ہر آنے والی نسل پہلی نسل سے ایک قدم آگے جا رہی ہے' کس قسم کا یہ ارتقاان کے اندر جاری ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ جانے والی نسل اپنے تجربات کو' اپنے علوم کو' اپنی صلاحیتوں کے ماحصل کو آنے والی نسل کو منتقل کرتی ہے۔ یہ آج کی نسل ہمارے ہاں کی غاروں میں رہنے والے انسانوں سے جواتنی بڑھی ہوئی آپ کو نظر آتی ہے' یہ ان کی اپنی ذاتی کاریگری نہیں ہے' انفرادی کاریگری نہیں ہے۔ یہ چیز ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو' علوم کو' قابلیتوں کو' استعداد کو اگلی نسل کی طرف منتقل کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ آگے منتقل کرتی ہے اس طرح سے جو Accumulative Knowledge (مجموعی علم) ہے' یہ مجموعی طور پر منتقل شدہ ہے جس کی یہ اگلی نسل وارث بنتی ہے۔ یہ دراصل چھ ہزار سال کے انسانوں کا ماحصل ہوتا ہے جو اسے حاصل ہو جاتا ہے۔

## صلاحیتوں کے لحاظ سے انسانوں کے مابین پائے جانے والے فرق کی وجوہات اور پھر نوعِ انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات

سوال یہ ہے کہ کیا یہ مجموعی طور پر منتقل شدہ علم ہر انسان کو حاصل ہو جاتا ہے؟ کیا ہر انسان ایک ہی طبیعت کا مالک ہوتا ہے؟ کیا ایک ہی استعداد کا مالک ہوتا ہے؟ ایسا تو نہیں ہو رہا' بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ یہ فرق شروع ہوتا ہے اس ماحول سے جس میں بچہ آنکھ کھولتا ہے' جس میں وہ جھولنا جھولتا ہے' جس میں ابتدائی پرورش پاتا ہے' جس میں ابتدائی تربیت پاتا ہے۔ ہر نئی نسل وہ کچھ بنتی ہے جو کچھ اس کے گھر میں اس کو بنایا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ وجہ ہے جو قرآنِ حکیم گھر کی زندگی کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ یہ میاں بیوی کا مسئلہ نہیں ہے' یہ تعمیر انسانیت کا سوال ہے۔

## آج کا بچہ کل کی قوم اور آج کی قوم کل کی نوعِ انسانی

خدانکردہ اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ہماری ایک نسل ساری ٹھگوں کی' چوروں کی' قزاقوں کی ہو جائے' ہو تو یہی رہا ہے اگر یہی شکل باقی رہی تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ پوری کی پوری نوعِ انسانی کی نسل چوروں اور ڈاکوؤں کی نسل ہو جائے گی۔ چور اور ڈاکو وہ نہیں جو محدود پیمانے پہ چوری کرتے ہیں بلکہ جو بڑے وسیع پیمانے پر راہزنی اور قزاقی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کبھی ایسی صورت ہو جائے تو اس کے بعد پیدا ہونے والی جو نسل ہو گی' آپ دیکھیں گے کہ وہ جتنا بھی شرف انسانیت' جتنا بھی مجد انسانیت تھا سب سے عاری ہو جائے گی' آپ کے ہاں چور اور ڈاکو پیدا ہو جائیں گے۔ جس قسم کا آج کا بچہ ہے اسی قسم کی کل کی قوم ہے۔ اور جسے ہم کل کی قوم کہتے ہیں' یہ اسی قسم کی انسانیت کی اگلی کڑی ہے۔ اور اگر اس قسم کی کڑی وہی ہے جس قسم کا ہم نے ان بچوں کو بنایا ہے' اگر یہی کڑیاں

آ گے منتقل ہوتی چلی جائیں اوران کی یہی خاصیتیں Accumulative Knowledge (مجموعی علم) بنتا چلا جائے' آپ سوچیے کہ پھرانسانیت کیا بن کررہ جائے گی۔

## گھریلوزندگی صرف میاں بیوی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو عالمگیر سطح پرنوعِ انسانی کا معاملہ ہےاور بچوں کی نفسیات

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک میاں بیوی کا مسئلہ نہیں ہے' محض چارحیوانی بچوں کی پرورش نہیں ہے' یہ سوال انسانیت سازی کا ہے۔انسانیت کی تعمیر گھر کے ماحول میں ہوتی ہے۔اور یہ چیز قرآن کریم نے تو چودہ سوسال پہلے کہی تھی۔آج جوانسانی سائیکولوجی Human Psychology آپ کے ہاں چلی ہے' اس میں Child Psychology (بچوں کی نفسیات) ایک خاص شعبہ ہے' اس پر بڑی ریسرچ ہورہی ہے۔اسی سے اگلی نوعِ انسانی ابھرتی ہے۔

## قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ تباہ حال قوموں کی آنکھیں ہمیشہ ماضی کو دیکھتی ہیں' مستقبل ان کے سامنے ہی نہیں آتا

وہ زندہ قومیں جنہیں یہ پتہ ہے کہ ہر نیا سورج انسان کوایک قدم آگے کی طرف لے جاتا ہے' وہ اس میں یہ کچھ کررہی ہیں جبکہ وہ قومیں جو مذہب زدہ اورانسانیت گزیدہ ہوتی ہیں ان کے نزدیک تو قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ جہنم والوں کی آنکھیں پیچھے کی طرف گدی میں لگی ہوئی ہونگی' ان کا Future (مستقبل) تاریک ہوگا اوران کا ماضی درخشندہ۔جب بھی ان قوموں سے بات کروتو ہزارسال پہلے کی بات کردیں گے کہ وہ دیکھیے ہم نے کیا' ہمارے بڑوں نے کیا' وہ ہے ہمارے ہاں کا درخشندہ دور۔اس میں یہ سب کچھ تھا۔اوراس کے بعد ٹھنڈی آہیں بھر کرکہیں گے کہ بیٹا! جس زمانے میں ہم پیدا ہوگئے وہ تو بڑا ہی تاریکیوں کا فسق وفجور کا زمانہ ہے۔غنیمت سمجھیے کہ آپ نے یہ تصوف کی کتابیں نہیں پڑھیں۔جوں ہی ہم نے یہ پڑھنا شروع کیا' ایک حضرت صاحب کے ملفوظات کو دیکھا تو وہ اپنے مرید سے کہہ رہے ہیں کہ بیٹا! ہم جس دور میں پیدا ہوئے ہیں یہ بڑا ہی تاریک زمانہ ہے' فسق وفجور کا زمانہ ہے' زمانہ تو فلاں حضرت صاحب کا تھا' ان سے پہلے جو تھے میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا کہ تخصیص ہوجائے گی' ان کا زمانہ کتنا اعلیٰ تھا۔بڑے شوق سے ہم نے یہ ختم کیااور پھران حضرت صاحب کے ملفوظات کولیا کہ صاحب! دیکھیں تو سہی وہ نورانیت کا زمانہ کیا ہے۔وہ سارا کچھ کہنے کے بعد اِن سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ بیٹا! ہم جس دور میں پیدا ہوگئے وہ تو سارا ہی فسق وفجور کا تھا' دور تو حضرت صاحب کا تھا۔ اورآج تک یہ سلسلہ پیچھے تک پہنچا جوآخری یا پہلے حضرت صاحب تھے' وہ بھی یہی رونا رورہے تھے کہ ہمارادورتو اس قسم کا دور ہے' دورتو پیچھے کا تھا۔ان کواپنا دور' آنے والا دور' سارا تاریک نظر آئے گا' گزرا ہوا جو ماضی ہے وہ ان کو بڑا شاندار نظر آئے گا' گدی میں

آنکھیں لگی ہوں گی۔

## قوموں کی زندگی کا مستقبل ماؤں کے تصورات کو بدلنے پر موقوف ہے

زندہ قومیں ماضی کے تجربات کا Accumulative Knowledge (مجموعی علم) لے کر پیدا ہوتی ہیں' اس کی وارث ہوتی ہیں اور اسے مستقبل کو درخشندہ اور شاندار بنانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں کہ جنہوں نے Child Psychology (بچوں کی نفسیات) پر اتنی تحقیقات کیں اور انہوں نے یہ کچھ کیا ہے' اپنے ہاں یہ کلینک کھولے' جہاں پیدا ہونے کے ساتھ بچے کو لے لیتے تھے۔ انہوں نے تو بچے جب رحم مادر میں تھے' اس زمانے سے تحقیق شروع کی۔ ان کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ وہاں بھی Impressionable Age (قابل تاثر عمر) شروع ہو جاتی ہے۔ ماؤں کے تصورات انہوں نے بدلے' ان کے سامنے مختلف قسم کی تصویریں رکھیں' انہوں نے دیکھا کہ رحم مادر میں تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہونے کے بعد تو انہوں نے بتایا کہ تین سال کی عمر جس میں بچہ بولنا سیکھتا ہے' اس سے پیشتر وہ ذہنی طور پر وہ کچھ بن چکا ہوتا ہے جو کچھ اس نے بننا ہوتا ہے۔ یہ تو الگ بات ہے کہ اس کے اندر ایک بڑی قوت بھی رکھی ہوئی ہے جو ان چیزوں کو تبدیل کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے بڑی Struggle (کوشش) کرنا پڑتی ہے' بڑی کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں سائیکولوجی میں Complexes (الجھنیں) کہتے ہیں' ان کے خلاف بڑی جنگ کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ تو ہزاروں میں سے شاید ایک آدھ ایسا ہوتا ہے جو اس کشمکش میں' اس جنگ میں کامیاب ہو جاتا ہے ورنہ بیچارے بچے ان الجھنوں (Complexes) میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو انسانیت کی اس اعتبار سے بڑی خوش بختی تھی کہ اس قسم کے علوم کا ہمارے دور میں آ کر اضافہ ہوا۔ یورپ کی بنیادی طور پہ بدبختی یہ تھی کہ اس دور کا جو نظریہ زندگی تھا جسے تہذیب مغرب کہتے ہیں اس کے تحت 19 ویں صدی کے یورپ کے انسان کو انہوں نے حیوان سے آگے سمجھا ہی نہیں' زندگی کو طبعی زندگی سمجھا اور یہیں ختم ہو جانے والی بات ہوگئی۔ اس لیے ان علوم کے جو خوشگوار نتائج مرتب ہونے تھے وہ نہ ہو سکے لیکن علوم کی حیثیت سے جو اضافے انہوں نے کیے ہیں وہ یقیناً قابلِ قدر اور باعث تحسین ہیں اور وہ یہ چیز ہے کہ قوم کو آپ نے جس نہج پہ چلانا ہے' پانچ سال کی عمر تک بچے کو اس نہج پہ چلا دیجیے' قوم از خود اس روش پر چلتی جائے گی۔

## بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے اختیار کردہ معیار کی نوعیت

بچے کی اس ابتدائی زندگی کو اتنی اہمیت ہے جسے ہم کا کا' کا کا کہہ کر گزار دیتے ہیں یعنی اس کے متعلق سوائے اس کے کہ دودھ دے دیا اور اس کی یہ نگہداشت کر دی' اس سے زیادہ کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی' کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ یہ عمر بھی اس کو کچھ سکھانے کی ہے۔

ہمارے بقول تو سکھانے کی عمر اس وقت ہوتی ہے جب وہ پانچ سال کا ہوتا ہے۔ وہ عمر تو اسکول بھیجنے کی ہے۔ اسکول تو مذبح ہوتا ہے' وہ تو قتل گاہ ہوتی ہے' وہاں تو انسانیت ذبح ہوتی ہے۔ بچے کو ان اسکولوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ صاحب! اسکول بہت اچھا اسکول ہے۔ کیا اسکول ہے صاحب! تیس روپے پہلے سال میں وہاں بچے کی فیس ہے۔ چل بھئی!!۔ جیسے سب سے بڑے ڈاکٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی فیس 25 روپے ہوتی ہے اور اگلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نسخہ ایسا لکھتا ہے کہ اول تو دوائی ملتی نہیں ہے' اگر ملے تو پچاس روپے کی ہوتی ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ بہت اعلیٰ درجے کا اسکول ہے' ڈریس نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں' یونیفارم مانگتے ہیں' بچوں کو صاف ستھرا دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں تیس روپے نرسری ❶ کی فیس ہوتی ہے۔ ہوتا وہاں کیا ہے' کسی ماں باپ کو اس کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ ایسا ہے کہ ''سیاپا مکے۔ سویرے سویرے اینوں اوتھے بھیجو۔ اوایس واسطے بھیجو کہ میں فارغ ہوواں۔ بڑا تنگ کرداا ے جی اے'' (سر سے مصیبت ٹلے۔ صبح سے ہی اسے وہاں بھیج دو۔ اس لیے بھیجو کہ مجھے لمحاتِ فرصت میسر آ جائیں۔ یہ تو بڑا ہی وبالِ جان ہے جی!)

عزیزانِ من! انسان کے بچے کا پیدا کر دینا تو خیر ایک فطری عمل (Biological Process) ہے۔ یہ حیوان اور انسان میں قدرِ مشترک ہے لیکن انسان کے بچے کی تربیت کرنا اور پرورش کرنا بہت مشکل کام ہے' یہ انسانیت کا بہت بڑا فریضہ ہے۔ ماں باپ اپنے بچے کو یہ کچھ نہیں بنا رہے' وہ انسانیت میں کچھ اضافہ کر رہے ہیں۔ کس قسم کا اضافہ کر رہے ہیں؟ یہ ہے وہ چیز جو قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ اس کی باز پرس ہوگی کہ تم نے نسلِ انسانی میں کس قسم کا اضافہ کیا۔ اور یہ وجہ ہے کہ وہ گھر کی زندگی کے متعلق اتنی تفصیل سے ہدایات دیتا ہے' جزئیات تک خود پہنچا تا ہے۔ اس لیے کہ گھر میں یہ جو جوڑا ہے' جسے ماں باپ کہا جاتا ہے' ان کے آپس کے تعلقات کا غیر شعوری طور پر اس بچے پر اثر پڑ رہا ہے جس نے ابھی آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔ انہیں کیا پتہ کہ ان کا آپس کا جو جھگڑا ہے' وہ اس بچے کی سادہ لوح جبیں پر کتنے گہرے نقوش مرتسم کرتا چلا جا رہا ہے۔ انہیں کیا پتہ ہے کہ ماں جب بڑی بیٹی کو کہتی ہے کہ ''دیکھنا! ابا جی نوں نہ دسیں آ کے'' (خبردار! ابو جی کو آ کر نہ بتانا)۔ انہیں کیا پتہ ہے کہ وہ بچہ جو یہ الفاظ سن رہا ہے' اس کی سیرت اس کے مطابق ڈھل رہی ہوتی ہے کہ ایسے کام بھی کرنے چاہئیں جس میں باپ کو نہ بتایا جائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ جو ایک جوڑے کے تعلقات کو اس طرح خوشگوار اور صحیح خطوط پر متشکل کرتا ہے' یہ ان دونوں کی زندگی کے متعلق نہیں کر رہا' وہ تو یوں کہیے جیسے وہ پراڈکٹ (ماحصل) ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے ان کی زندگی بھی خوشگوار ہو جاتی ہے لیکن ان کے متعلق تو وہ کہتا ہے کہ اگر خوشگوار ہونے کا امکان نہ رہے تو الگ ہو جاؤ۔ یہ مسئلہ تو حل ہو جاتا ہے کہ الگ ہو جاؤ' وہ جو اتنی بڑی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر پہ لے لی تھی اس کا تو حل ہی کوئی نہیں ہوتا۔

---

❶ یاد رہے یہ بات جنوری 1971ء کی 3 تاریخ کو کہی گئی تھی اور آج تو نرسری کی یا اولیول کی فیس کم از کم شہر لاہور میں 5000 روپے ماہانہ سے کہیں زیادہ ہے اور پھر یہ ہے وہ قتل گاہ جہاں کتنی خطیر رقم لے کر انسانیت کو ذبح کیا جاتا ہے۔

## سورۃ النسآء کی تو ابتدا ہی اُن بچوں سے ہوتی ہے جنہیں قرآن مجید یتیم کہتا ہے اور ان کے لیے کوئی الگ یتیم خانہ نہیں کھولنا پڑتا

برادرانِ عزیز! یہ جو سورۃ النسآء کی ابتدا ہوئی تھی' یہ ابتدا ان بچوں کے متعلق ہوئی کہ جن کا حل کوئی معاشرہ نہیں بتا رہا تھا' وہ جنہیں یتیم بچے کہا جاتا ہے وہ عورتیں جو بغیر خاوند کے رہ جاتی ہیں' وہ لڑکیاں جو جوان ہو جاتی ہیں اور ان کی شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ سورۃ النسآء کی ابتدا ان مسائل سے ہوئی تھی۔ یہ صرف ان کی Protection (حفاظت) کا سوال نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اول تو کسی کی توجہ ادھر نہیں آئی' آتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ صاحب! یتیم خانہ کھول دیا جائے۔ میں کہتا ہوں معاف رکھیے گا اس سے تو بہتر ہے کہ ان بچوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اور پھر ان بچوں کی حفاظت اور Protection (مامونیت) کے لیے الگ یتیم خانہ نہیں کھلتا' جب ان عورتوں سے شادی کر کے ان کو لے آیا جاتا ہے تو اس گھر کے اندر یہ جو سوتیلی اولاد ہوتی ہے' جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہوتا ہے' وہ یتیم خانے سے بدتر ہوتا ہے۔ یہ وہ بچے ہیں جن بیچاروں نے کوئی جرم نہیں کیا' باپ مر گیا۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے انسانی نسل میں اضافے کا موجب بننا ہے' بلکہ یوں کہیے کہ موجب کیا بننا ہے وہ تو آنے والی نسل کا ایک حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔

## اہل کتاب عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کا مسئلہ اور حضرت عمرؓ کے ہاں اس اجازت کی منسوخی

قرآنِ کریم جہاں ماں باپ اور ان کے بچوں کے متعلق جو ذمہ داریاں اُن کے سامنے رکھتا ہے وہاں اس مسئلے کو بھی سامنے رکھا ہے کہ اگر معاشرے میں یہ شکل پیدا ہو جائے اور جنگ کے دوران تو یہ شکل عام طور پہ پیدا ہو جاتی تھی' اور پھر اس کمیونٹی میں تو یہ شکل ضرور پیدا ہوتی تھی جس کے ہاں فیصلہ یہ تھا کہ ان عورتوں کی شادی کسی غیر مسلم سے ہو نہیں سکتی اور اس کے اندر بڑی عجیب لم ہے صاحب! یہ جو ایک خاص سوسائٹی کی عورتیں تھیں' لڑکیاں تھیں' ان کی شادیاں اسی سوسائٹی کے اندر قرآنِ کریم کرانا چاہتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ماں کے خیالات کا اثر تو آگے منتقل ہو کر چلنا ہے' یہ تو اولاد تک چلنا ہے۔ اگر یہی غیر اسلامی ماحول کے اندر رہیں تو ان کے آگے آنے والی نسل تو خود بخود اسی پٹڑی پر چلے گی۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت تھی' یہ صرف اجازت تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس اجازت کو بھی دوسرے ہی خلیفہ حضرت عمرؓ (581-645/46ء) نے منسوخ کر دیا تھا۔ انہوںؓ نے کہا تھا کہ حالات نے یہ چیز بتائی ہے کہ یہ لوگ اپنی لڑکیوں کو مسلم معاشرے میں بھیج کر فتنہ پیدا کر رہے ہیں اس لیے اب اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ انہیں ان گھروں کے ماحول کا اتنا خیال تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ یہیں سے بچوں نے اس ماحول کا حصہ بننا تھا۔

## جنگ کی شکل میں عورتوں اور بچوں کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل

ایسی سوسائٹی میں جہاں عورتیں اپنی سوسائٹی کے باہر کسی سے شادی نہ کر سکیں' سوسائٹی کے اندر یہ حالات پیدا ہو جائیں' مسلسل جنگیں ہوں جیسے 2 ہجری سے لے کر 7 ہجری تک ہوئیں' اتنی مختصر سی کمیونٹی ہو۔لڑائیوں میں تو نوجوان جاتے ہیں' بچے اور بوڑھے پیچھے رہ جاتے ہیں۔تو اب معاشرے کے لیے یہ پرابلم پیدا ہوئی اور پھر مکے کے دوسرے قبائل کی عورتیں جو اسلام لے آئیں وہ وہاں سے ہجرت کر کے' اپنا سب کچھ چھوڑ کر' خاوندوں کو چھوڑ کر' اس نئے ماحول میں آ گئیں۔اور عورتوں کی تعداد بڑھ گئی' ان کے ساتھ بچے تھے۔یہ جو مسئلہ تھا' یہ انفرادی نہیں تھا' یہ ان عورتوں کا نہ تھا' نہ ان کے بچوں کا تھا۔کہنے کو تو یہ ایک معاشرے کا یا سوسائٹی کا مسئلہ تھا' دراصل یہ انسانیت کا مسئلہ تھا کیونکہ اگر ان بچوں کی صحیح تربیت نہ ہوئی تو انسانیت میں کس قسم کا اضافہ ہو جائے گا یہ بھی واضح تھا۔یہ ہے اس مسئلے کی اہمیت جو قرآنِ کریم نے خاص طور پہ اس کو مرکزِ توجہ بنایا اور ایک سورۃ کا نام ہی سورۃ النسآء رکھا۔

## لفظ یتیم کا قرآنی مفہوم اور اس کا مقام

عزیزانِ من! وہاں سے اس چیز کی ابتدا کی کہ **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی** (4:3)۔اگر کبھی معاشرے کے اندر ایسے حالات پیدا ہو جائیں' جیسا کہ ہونا چاہیے ویسا ان کا انتظام نہ ہو سکے۔یہ ہیں **تُقْسِطُوْا** کے معنی۔**یَتٰمٰی** کا لفظ یہاں آیا ہے اور آج کا درس جس آیت سے شروع ہوتا ہے' وہاں انہی کے متعلق بات ہے۔میں نے عرض کیا تھا ویسے تو یتیم کے معنی ''تنہا'' کے ہیں لیکن ہمارے ہاں عام طور پہ یتیم ان بچوں کو کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ مر چکے ہوں۔عربی زبان میں یتیم ان بچوں کو بھی کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ مر چکے ہوں اور یتیم ان لڑکیوں کو بھی کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ موجود ہوں' وہ شادی کے قابل ہوں مگر شادی نہ ہو سکی ہو' اور یتیم ان بیوہ عورتوں اور مطلقہ کو بھی کہا جاتا ہے جن کے خاوند نہ ہوں۔لڑکیوں کے معاملے میں جن کے خاوند نہ ہوں وہ یتیم ہیں' صرف لڑکوں کے معاملے میں وہ لڑکے کہ جن کے ماں باپ مر جائیں وہ یتیم ہیں۔اور قرآنِ کریم کی رو سے معاشرے میں ہر فرد جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے وہ یتیم ہے۔وہ جو قرآنِ حمید نے کہا تھا کہ جب معاشرہ دوسروں کی نگاہوں کے اندر ذلیل ہوتا ہے تو اس وقت پھر یہ پکارتا ہے کہ صاحب! ہم نے تو کچھ نہیں کہا تھا' یونہی خدا نے ہم کو ذلیل کر دیا۔پوری ڈانٹ کے ساتھ وہاں کہا گیا کہ تم کیا کہہ رہے ہو! خدا کے متعلق کیا تمہارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ ہم یونہی کسی کو بلاوجہ ذلیل کرتے ہیں' ہم ایسا نہیں کرتے۔

## نسل انسانی کو ذہنی طور پر اگر مفلوج کرنا ہو تو اس کے لیے یتیم خانے کھول دو۔ دیکھیے کہ قرآن حکیم اس مسئلہ کا کیا حل پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ ہم یونہی کسی کو بلاوجہ ذلیل نہیں کرتے' ہم کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتے۔ بلاوجہ تم دنیا کے اندر ذلیل نہیں ہوئے' آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ تم کیوں ذلیل ہوئے ہو' اس لیے کہ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17) جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا تھا تم ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ تم نے ان کی عزت نہیں کی' دنیا کی نگاہوں میں تم ذلیل ہو گئے۔ عزیزانِ من! یہ ہے فردِ انسانیت کا مقام' اللہ اکبر! دین تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ وہ انسان کو اس کا صحیح مقام دیتا ہے۔ یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے' سارا معاشرہ ذلیل ہو گیا۔ یہاں بات ان یَتٰمٰی کی ہو رہی تھی جن کا باپ مر چکا' بچے رہ گئے' نوجوان لڑکیاں رہ گئیں' بیوہ عورتیں رہ گئیں' معاشرے میں صحیح انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔

عزیزانِ من! یتیم خانے کھولنے سے انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے جو' اب ہمارے ہاں نئے نئے Houses (مکانات) کھل رہے ہیں' یہ کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی سماجی پرابلم معاشرے کی نہیں ہے میں نے عرض کیا ہے یہ انسانیت کی اتنی بڑی پرابلم ہے۔ کہا ہے کہ اصول تو وہی ہے کہ فَوَاحِدَةً (4:3) گھر میں ایک ہی بیوی ہو۔ لیکن یہ ہے کہ جنہیں اس قسم کے ماحول کی ضرورت ہے اور وہ اس ماحول سے محروم رہ گئے ہیں کہ جس میں انسانیت کی تعمیر ہونی ہے' انہیں وہ ماحول دیا جانا ضروری ہے۔ یہ ایک پرابلم تھی جس کے حل کے لیے قرآن کریم نے یہ تجویز کیا کہ ان میں سے جو اس کی استعداد رکھتا ہو' وہ سمجھ سکے کہ گھر کے اندر ایسا انتظام ہو سکے گا۔ اور یہ ان گھروں کی بات ہو رہی ہے جن گھروں کے اندر جو پہلی بیویاں موجود ہیں' وہ بھی اس کا احساس کریں کہ ٹھیک ہے جس طرح سے ہمیں یہاں Protection (تحفظ) نصیب ہے' ہمارے بچوں کے لیے یہ فضا نصیب ہے' یہ بچے بھی ہمارے ہی بچے ہیں' یہ بہنیں بھی ہماری ہی بہنیں ہیں' ان کو بھی یہ کچھ نصیب ہونا چاہیے' مل کر دونوں مومن مرد اور مومن عورتیں اس چیز کو سوچیں کہ بڑی ضروری چیز ہے کہ ان کو اس قسم کا ماحول ملے۔ کہا ہے کہ یہ صورت پیدا ہو تو پھر ان کو یہ ماحول دینے کے لیے لے آؤ۔ اور جوان عورت کو لانے کے لیے تو یہی صورت ہے کہ فَانْكِحُوْا (4:3)۔ انہیں اگر تم نے خیرات پر لا کر رکھا تو پھر بھی شرفِ انسانیت کے خلاف ہو جائے گا۔ انہیں اس شکل میں لا کر رکھو کہ وہ As of right (بطور حق) سمجھیں کہ اس گھر پر ہمارا حق ہو گیا۔ اور آگے جا کر پھر یہی شرط ان پہ عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے پہلی شرط تھی کہ اِنْ خِفْتُمْ (4:3) اور اس کے بعد شرط تھی کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) لیکن اگر تم یہ دیکھو کہ ذرا سا خدشہ پیدا ہو کہ اس سے بات عدل کی نہیں رہ سکتی' پھر یہ بات نہیں ہے۔ ہم نے تو ان کو وہ ماحول دینا ہے اور اگر صورت یہ

پیدا ہوئی کہ انہیں ماحول دیتے دیتے جو پہلا ماحول ہے وہ بھی بگڑ جائے تو یہ اس مشکل کا حل تو نہ ہوا بلکہ مشکل کا حل دریافت کرتے ہوئے نئی مشکل پیدا کر دی۔ایسا نہیں ہے بھئی!

## قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا بیان کردہ طریق ایک اعجاز ہے

یہاں یَتٰمٰی کا لفظ کہا ہے' جو میں نے عرض کیا ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں۔قرآنِ کریم کے سمجھنے کا میں نے طریقہ بتایا تھا کہ قرآن کریم میں جو ایک مسئلہ کسی ایک مقام پہ آئے' قرآن کریم میں دیگر مقامات میں اس کے متعلق بہت کچھ دیا ہوا ہوتا ہے' کہیں اس کی وضاحت ہوتی ہے' کہیں اس میں اضافہ ہوتا ہے' کہیں اس میں استثنا ہوتی ہے۔اسے قرآن ''تصریف آیات'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔طریقہ یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق قرآن کریم کی جتنی آیات ہوں' ان کو بیک وقت سامنے لایئے اور ان میں اس آیت کو رکھ کر دیکھیے۔آپ حیران ہونگے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں رہتی جو واضح نہ ہو جائے۔یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے۔

## ''تبویب القرآن'' کی تدوین کے سلسلہ میں پرویزؒ کی سعی و کاوش اور اس کی افادیت کا ذکر

اس میں' میں ضمناً عرض کر دوں' کہ زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کتنی ہے۔میری تو ساری عمر قرآنِ حکیم پہ غور کرنے اور اسی طرح سے سمجھنے میں بیتی ہے۔خود میں نے قرآن کریم کو اسی طرح سے سمجھا ہے اور اب یہ ساری چیزیں میرے پاس تیار ہوتی ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ ذہن میں یہ چیزیں آ گئی ہوئی ہیں اور میں نے قرآن کے متعلق لکھا بھی اسی انداز سے ہے۔اور اس کے بعد' جواب کئی برسوں سے میرے سامنے ہے' وہ یہ ہے جسے قرآنِ کریم کی Classification (تبویب) کہتے ہیں' یہ اس شکل میں قرآنِ کریم کو کرنا ہے کہ ایک موضوع سے متعلق سارے قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے' وہ تمام آیات اس موضوع کے تابع ایک جگہ اکٹھی ہوں تاکہ قرآنِ کریم سمجھنے کے راستے میں وہ آسانی پیدا ہو جائے جسے خود قرآن نے تجویز کیا ہوا ہے۔میں اس کام میں مصروف ہوں۔اسے اصطلاح میں ''تبویب القرآن'' کہتے ہیں یعنی باب باب کرنا' Subject wise (مضمون و موضوع وار) کرنا' اس کو اس طرح سے Classify (تبویب) کر دینا۔بہرحال اگر خدا نے مہلت اور توفیق دی اور یہ چیز تیار ہو گئی تو قرآن سمجھنے کے لیے بڑی مفید ہو جائے گی [1]۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔وہاں یَتٰمٰی کہا تھا' اب دیکھیے یہاں قرآن نے لفظ یَتٰمَی النِّسَآءِ (4:127) کہا ہے اور کس طرح بات واضح کر دی! ہمارے ہاں یتیم عورت کہا ہی نہیں جاتا' ہماری زبان میں یہ لفظ ہی نہیں ہے۔''یتیم

---

[1] یہ مفید چیز بار اول 1977ء میں ''تبویب القرآن'' کے نام سے تین جلدوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

عورتیں' کے کیا معنی ہیں؟ کہا ہے کہ وَ یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ فِی النِّسَآءِ(4:127) اے رسول! تجھ سے یہ لوگ عورتوں کے متعلق پھر ایک بات پوچھتے ہیں۔ بات تو وہاں بتائی تھی لیکن اس کی کچھ مزید وضاحت چاہتے تھے۔

## لفظ فتویٰ کا مفہوم اور عربی زبان کی بلاغت کا ذکر

ضمناً بات سامنے آ گئی ہے۔ کہا ہے کہ یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ (4:127)۔ فتویٰ یہیں سے لفظ ہے۔ کیا بات ہے اس قوم کی صاحب! میں سمجھتا ہوں' جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی دو شاخیں ہیں۔ ایک بنی اسرائیل کے اندر ہے۔ اس میں حکومت بھی رہی' نبوت بھی رہی' شان و شوکت بھی رہی' شام کی سرداریاں بھی رہیں۔ دوسری خطہ عرب میں بے برگ و گیاہ ہے' یہ اس زمین کے اندر ہے' یہ بنی اسماعیل کی ہے جو یہاں آ کر بسے۔ یہ سارے دو تین ہزار سال کے عرصے میں' کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے وہاں کیا کیا۔ وہی صحرا کا صحرا ہے۔ اس میں وہی چار گھروں والا مکہ ہے' اس کے اندر ایک کعبہ ہے۔ یہ وہاں کیا کرتے رہے؟ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ اس کتابِ عظیم کے لیے استقبالیہ تیار کرتے رہے یعنی یہ وہ زبان بناتے رہے' وضع کرتے رہے' مانجھتے رہے جو ان ابدی حقائقِ خداوندی کی متحمل ہو سکتی ہو۔ ہر زبان ان حقائق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور علم اللسان کے جو ماہر ہیں' ان کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ جو قوم بظاہر تہذیب و تمدن کے اس مقام پہ تھی' وہ بالکل تاریکیوں کا جسے کہا جاتا ہے کہ جس میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا' یعنی جس زبان میں جس قوم کے ہاں قرآنِ کریم پہلی کتاب ہو یعنی اس سے پہلے کتاب ہی نہ ہو وہ قوم اس قسم کی زبان کیسے بنا لے۔

برادرانِ عزیز! اس کی ایک مثال لیجیے۔ یہ فتویٰ ''فتۃ'' سے ہے ''فتۃ'' اس نوجوان کو کہتے ہیں جس میں بھرپور توانائیاں ہوں اور اس میں دوسری شرط جدتِ افکار ہو۔ اگر کوئی نوجوان انہی فرسودہ راہوں پہ چلتا ہے تو وہ کتنا توانا بھی کیوں نہ ہو' وہ ''فتۃ'' نہیں ہوتا' ''فتۃ'' وہ ہوتا ہے جو نئی نئی راہیں تلاش کرے جن میں جدتِ فکر ہو۔ وہ کہتے تھے کہ بات پوچھنی ہو تو کسی ایسے سے جا کر پوچھو جس میں بھرپور توانائیاں ہوں اور اس کے اندر جدتِ افکار ہو۔ یہاں سے ''فتویٰ'' کا لفظ نکلا تھا۔ ''ساڈے تے جیہڑا ڈگا پرانا کسے کم دا نہ رہوے او مفتی صاحب ہو جاندا اے'' یعنی سب سے زیادہ فرسودہ' بیکار' کہنگی کا جو مارا ہوا ہو' وہ مفتی صاحب ہو جاتے ہیں۔ خصوصیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کو پرانی سے پرانی کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں' ان کے ہاں جدت حرام ہوتی ہے۔ فتوے کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ کل بدعة ضللة کُلَّ ضَلٰلَةٍ فِی النَّارِ ہر نئی بات گمراہی ہے' ہر گمراہی جہنم میں۔ نام فتویٰ ہے مگر ذہن میں نہیں ہے کہ ''فتۃ'' سے یہ لفظ فتویٰ نکلا ہوا ہے۔ یہ عجیب قوم تھی صاحب! کہا ہے کہ وَ یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ فِی النِّسَآءِ (4:127)۔ قرآن کریم کیا لفظ یہاں لایا ہے! نظر آیا کہ جس سے وہ فتویٰ پوچھتے تھے' اس میں یہ چیزیں موجود تھیں وہ بڑی

جدت افکار کا مالک تھا' وہ اساطیر الاولین دہرانے کے لیے نہیں آیا تھا' وہ زندگی کی نئی راہیں روشن کرنے کے لیے آیا تھا۔ قرآنِ کریم لفظ وَ یَسْتَفْتُوْنَکَ کا کہتا ہے ورنہ یَسْـئَلُوْنَکَ بھی کہہ سکتا تھا۔ پھر فتوے کے متعلق ان کے ہاں دوسری شرط یہ ہوتی تھی کہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ ہو جو عام طور پہ حل نہ ہوتا ہو' اس میں بھی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے' سنگلاخ زمینیں ہوں جن کے اندر چلنے کی ضرورت ہو۔ اس کے متعلق جو پوچھا جائے تو اسے وہ فتویٰ کہتے ہیں ہر سوال کو فتویٰ نہیں کہتے۔

یہاں (4:127) میں کہا ہے کہ اے رسول! لوگ تجھ سے نسآء کے متعلق مزید باتیں پوچھتے ہیں۔ کہا ہے کہ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ (4:127) ان سے کہہ دو کہ یہ بات وحی کی رو سے بتانے کی ہے اس لیے یہ فتویٰ پوچھتے ہیں' تو اس معاملے کے اندر ہم مفتی بنتے ہیں۔ خدا فتویٰ دے رہا ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ (4:127) اور قرآنِ کریم کے اندر جو کچھ پہلے دیا گیا ہے وہ تو اسی سورۃ کی ابتدائی آیات میں موجود ہے یَتٰمَى النِّسَآءِ کے متعلق تھا۔ دیکھیے وہ تصدیق آ گئی۔ وہاں صرف یَتٰمَى کہا تھا' یہاں یَتٰمَى النِّسَآءِ (4:127) کہہ دیا کہ وہ ان کے متعلق ہے۔ تو کہا ہے کہ وہاں تو یہ تھا کہ جس انداز کا انتظام ہونا چاہیے' اگر اس انداز کا کوئی اور انتظام نہیں ہو سکتا تو اس کے لیے پھر طریقہ یہ ہے کہ ان کو اپنے گھروں کے اندر اس قسم کی Protection (حفاظت) دو اور ایسا ماحول پیدا کرو لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے۔ یہ اس سے قبل کا جو معاشرہ تھا اور آج بھی جو عام طور پہ معاشرہ ہے' کہا ہے کہ اس میں کیفیت یہ ہے کہ

ہر گُرگ کو ہے بَرّۂ معصوم کی تلاش ❶

یہ جو بیچاری عورت بے سہارا رہ جاتی ہے' یہ جو بچے اس قسم کے رہ جاتے ہیں' وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے آنے سے ان کے ساتھ جائیداد بھی ہے' اتنے پیسے بھی ہیں' مال بھی ہے' اس کی طرف ہر ایک شخص اپنا رخ کرتا ہے۔ اس کو دامِ تزویر میں پھنسا کر لے آتے ہیں۔ جو کچھ ان کا ہوتا ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ کہا کہ اس کا یہ مقصد نہیں تھا۔ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ (4:127) تم ان کا وہ حق تو دیتے نہیں ہو جو قانونِ خداوندی نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اور چاہتے یہ ہو کہ انہیں اپنے نکاح میں لے آؤ۔ آگے کہا ہے کہ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ (4:127) یہ غلط ہے۔ ان کے واجبات انہیں ضرور دو اور اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (4:127) یہی حکم ہے' عورتیں ہوں' لڑکیاں ہوں یا لڑکے ہوں ان سب کے لیے ہے کہ ان سب کے ساتھ ہمیشہ

---

❶ غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گُرگ کو ہے بَرّۂ معصوم کی تلاش
(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

انصاف کرو۔ مقصد ہمارا یہ تھا کہ جو اِن حالات میں گھِر کر رہ جائیں' ان کے لیے اس قسم کا انتظام کیا جائے کہ بالکل وہی ماحول جو تمہارے گھر میں تمہاری بیویوں کا تمہارے بچوں کا ہوتا ہے' وہی انہیں Provide (مہیا) کیا جائے۔ یہ تھا مقصد ہمارا۔ یہاں قِسۡطِ آیا ہے کہ اتنا ہی کیا جائے۔ آگے کہا ہے کہ وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا (4:127) اس سے بھی آگے کوئی اور بات کرو' وہ اس سے بھی زیادہ مستحسن ہوگی' خدا اس چیز کو جانتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت (4:3) کی تشریح کی۔ آپ نے دیکھا کہ تصریفِ آیات سے یہاں بات کتنی صاف ہوئی۔

## وقتی طور پر گھریلو کشمکش کا علاج اگر نہ ہو سکے' طول پکڑ جائے تو اس کے متعلق راہنمائی

(4:34) میں ایک بات اس نے اور کہی ہے کہ گھر کی جو زندگی ہے اس میں اگر میاں بیوی کی باہمی کشمکش یونہی کسی عارضی سی بات پہ ہوئی ہے اور یہ چیزیں تو ہو جاتی ہیں تو اس کے لیے بھی اس نے طریقے بتائے ہیں۔ یہ چیز باہمی مفاہمت سے صحیح ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے وقت کے بعد خود ہی وہ مسئلے بھی حل ہو جاتے ہیں لیکن معاشرے سے کہا ہے کہ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا (4:35) اگر تم ان میں اس قسم کی کشمکش دیکھو کہ ان دونوں کی آپس میں مفاہمت سے وہ بات طے نہیں ہوتی تو ایسا نہیں کہ ان دونوں کا یہ باہمی مسئلہ ہے' خود طے کرتے رہیں گے' نہ طے کریں گے تو بھاڑ میں جائیں' جہنم میں جائیں' ہمیں اس سے کیا غرض ہے کہ خواہ مخواہ سر کھپاتے پھریں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ چیز غلط ہے۔ مسئلہ ان دونوں کا ہے اور یہ پورے معاشرے سے کہہ رہا ہے کہ اگر تمہیں ڈر ہو کہ یہ جو ان کی باہمی کشمکش ہے' یہ بڑھتی چلی جا رہی ہے تو یہ نہ کہو کہ یہ ان دونوں کا معاملہ ہے' ہمیں کیا ہے۔ سنو! یہ تمہارا معاملہ ہے' تمہاری قوم کا معاملہ ہے' انسانیت کا معاملہ ہے' اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اور ہاتھ میں لینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو دو فریقین ہیں' وہ اپنے معاملے کو خود حل کرنے کے قابل نہیں ہوتے' جب مسئلہ یہاں تک پہنچ جائے تو کوئی ایک Third Person (تیسرا فرد) ہونا چاہیے۔ تم وہ ثالث مقرر کرو' وہ اس میں مصالحت اور مفاہمت کی شکل پیدا کریں' دونوں کے گھر والوں کو بلائیں' بات کریں' اصلاح کریں' مفاہمت کی شکل پیدا کریں۔

## گھریلو سطح پر ایک بچے کی غلط تربیت پوری انسانیت کو متاثر کرتی ہے

گھر کے اندر یہ جو کشمکش کا نقشہ ہے' اس سے اولاد پہ اثر پڑتا ہے' اس سے انسانیت پر اثر پڑتا ہے۔ ایک بچے کی غلط تربیت' عزیزانِ من! پوچھیے نہیں' وہ تو انسانیت کے جسد میں پھانس بن جاتی ہے۔ عام طور پر لوگوں نے محسوس ہی نہیں کیا کہ ایک فرد کا پوری انسانیت کے ساتھ تعلق کیا ہوتا ہے۔ فرد تو ایک طرف رہا' یہ باہر کی کائنات کی صورت یہ ہے کہ James Jeans (1877-1946)'

جوعلم الافلاک کا ہمارے دور میں بہت بڑا ماہر ہے' اس کا ایک فقرہ بڑا دلچسپ ہے کہ تم ان کُرّوں میں باہمی ربط کے متعلق پوچھتے ہو کہ کیا ہوتا ہے' کُرّوں کا ربط تو بڑی چیز ہے۔ وہ اس وقت کلاس میں لیکچر دے رہا تھا۔ کہا کہ سنو! ''یہ جو تمہیں سمجھانے کے لیے میں انگلی اٹھا رہا ہوں اس کی جنبش بھی ثریا تک پہنچتی ہے''۔ اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

## ایک پتّے کے خشک ہونے یا سرسبز رہنے میں پورے کے پورے درخت کا حصہ ہوتا ہے

یہ تو ربطِ باہمی ہے' جس سے کائنات کا سلسلہ قائم ہے۔ میں نے جو اگلے دنوں مثال دی تھی کہ اگر درخت کا ایک پتہ خشک ہو کر گرتا ہے تو یہ اکیلے اس پتے کا قصور یا اس شاخ کا قصور نہیں ہے جس کے ساتھ وہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جڑ سے لے کر اوپر تک اس کے خشک کرنے میں ہر ایک کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جس طرح پتے کی تازگی میں درخت کا ذرہ ذرہ حصہ لے رہا ہوتا ہے' اس پتے کو خشک کرنے میں بھی ایک ایک ذرہ حصہ دار اور ذمہ دار ہوتا ہے۔

## آج قوم کے بچوں کی حالت زار ناگفتہ بہ ہونے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے: گھر کا جہنم

یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ایسے معاملات میں اُن افراد کی ذمہ داری قرار نہیں دیتا' وہ پورے معاشرے کی' پوری انسانیت کی' ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ ایک غلط تربیت یافتہ بچہ جب انسانیت میں آئے گا تو جیسا میں نے کہا ہے وہ تو پھانس بن جائے گا۔ پھانس کہنے کو تو بہت ہی بال کے برابر شے ہوتی ہے لیکن آپ کو پتہ ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیتی۔ یہ غلط تربیت یافتہ بچے جو آج ہماری قوم بن رہے ہیں' پھانس نہیں' یہ تو جسد انسانیت کے اندر ناسور بن گئے ہوتے ہیں لیکن ہم عجیب قوم واقع ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق تو زور سے چیختے رہتے ہیں کہ صاحب! بچے یہ کرتے ہیں' وہ کرتے ہیں' آوارہ ہوگئے' جرائم عام ہوگئے اور اس کے چیخنے چلانے کے بعد جو آنے والی نسل ہے' ان کو اسی طرح سے تیار کرتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلتی رہے۔ اس لیے اس نے کہا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ (4:35) یہ ان لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے' یہ معاشرے سے کہتا ہے کہ تمہیں اس سے خوف پیدا ہونا چاہیے' تمہیں اس خطرے کو محسوس کرنا چاہیے کہ اس گھر کے اندر ہو کیا رہا ہے' اس گھر کے بچوں کے اوپر اس کا کیا اثر پڑے گا' بچے بڑے ہونگے قوم کیسی بنے گی' قوم ایسی ہوگی' انسانیت کس انداز پہ چلے گی۔ اٹھو! اس خطرے کو سنبھالو' باہمی مصالحت کی شکل پیدا کرو اور اگر مصالحت نہیں ہوتی' اس کی کوئی صورت باقی نہیں تو پھر تو بس یوں ہے کہ آپ چولہے میں ان لکڑیوں کو رکھ دیں جو جلیں تو نہیں مگر دھواں دیتی چلی جائیں۔ قرآنِ حکیم نے اس گھر کو جہنم کہا ہے۔ میاں بیوی کی ہم آہنگی سے جو گھر ہوتا ہے' اس کے متعلق کہا ہے کہ ہم تمہیں جنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور

جس میں کشمکش رہتی ہے اس کے متعلق کہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں جہنم کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔اس نے کہا کہ گھر میں مستقل جہنم رکھنے سے جو اگلی نسل تیار ہوگی' وہ تو بڑی انسانیت سوز ہوگی۔اٹھو! یہ باعثِ خطرہ ہے' اس کو سنبھالو' اس کو Lightly (ہلکے پھلکے انداز سے) نہ لو۔یہاں یہ صورت تھی۔یہاں نظر آتا تھا کہ یہ کہا گیا ہے کہ **وَ الّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ** (4:34) اگر تمہیں عورتوں کی طرف سے یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ وہ بلا کسی معقول وجہ کے ذرا سرکش ہو رہی ہیں تو **فَعِظُوۡھُنَّ** (4:34) اربابِ حل وعقد کو چاہیے کہ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔یہاں مسئلہ یہ تھا' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ لیجیے صاحب!

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد

وہ بھی کم بخت! ترا چاہنے والا نکلا

## ایک غلط فہمی کی بنا پر عورت کا قرآنِ حکیم پر اعتراض اور قرانِ کریم کا جواب

ایک دفعہ اسی آیت کو لے کر کسی کی بیوی نے آ کر مجھے کہہ دیا تھا کہ عورتوں کی طرف سے یہ خطرہ ہو تو وہ کر وہ کرو' اس پر وہ کہنے لگی کہ ''فیرہ پتہ لگدا اے کہ اللہ میاں وی تے مردای ہے ناں' ایس واسطے اس نے مرداں واسطے قانون بنایا' کوئی عورت بناندی قرآن شریف' تے ساڈے حق اچ وی گل کردی ناں'' (اللہ تعالیٰ بھی تو مرد ہی ہے اس لیے اُس نے مَردوں کے لیے قانون بنایا ہے۔اگر کوئی عورت قرآن شریف بناتی تو ہمارے حق میں بات کرتی)۔یہ اس لیے ہے کہ اس کے سامنے ایک ہی آیت ہے' دوسری آیت تو اس کے سامنے آنے ہی نہیں دیتے کہ نہ جی! یہ سامنے نہ لاؤ۔اجی آیت تو ایک طرف رہی' روز کی بات آپ دیکھیں گے' نکاح میں جو خطبہ پڑھ رہے ہوتے ہیں یہ وہی آیت ہے جو ابھی میں نے (4:3) آپ کے سامنے رکھی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ آیت شرطیہ شروع ہوتی ہے۔کہا ہے کہ **وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ** (4:3) اگر تمہیں اس کا ڈر ہو تو۔۔۔۔۔۔تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ آیت یوں ہے **وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی** (4:3)۔اس آیت کا اتنا حصہ نہیں پڑھا جاتا بلکہ یہاں سے پڑھا جاتا ہے کہ **فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3) حسبِ منشا نکاح کرو دو دو سے' تین تین سے' چار چار سے۔

عزیزانِ من! اگلے دن ایک دوست کے ہاں نکاح ہو رہا تھا' لڑکا بیٹھا ہوا ہے' لڑکی کا باپ بھائی بہن' سب بیٹھے ہوئے ہیں' میں نے کہا کہ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ عربی نہیں جانتے ورنہ یہ جوان کی بیٹی کا نکاح پڑھا رہا ہے' وہ دولہا کے کان میں کہہ رہا ہے کہ تم دو دو تین تین چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔میں نے کہا کہ اگر یہ عربی جانتے ''تے دند باہر کڈ دین سارے' بھوتنی دے آ' اپنی کڑی دا جتھے ویا کرنا ایں' اوتھے جا کے کہوے گل'' (بتیسی باہر نکال دیں کہ اے نالائق! جہاں اپنی بیٹی کا نکاح کرنا ہے وہاں جا کر یہ بات

کہو)۔تو میں نے کہا ہے کہ وہ بھی تبرکاً پڑھ رہا ہوتا ہے' یہ بھی کر رہا ہوتا ہے۔لیکن یہ سازش دیکھیے کہ یہ پہلے چار الفاظ اس میں نہیں ہوتے۔اور حیرت یہ ہے کہ ان کے ہاں کا چھپا ہوا جو نکاح نامہ ہوتا ہے' اس نکاح نامے میں بھی یہ پہلے الفاظ نہیں ہوتے' فَانْكِحُوْا ہوتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے ہی غلط ہے۔یعنی ''اگر'' نہ کہا جائے تو ''تو'' کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔

قرآنِ کریم کے ساتھ تحریف کرنے کی جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ یہ آیت لے کر آئیں گے' جس میں کہا ہوا ہو کہ اگر عورتوں کی طرف سے خطرہ ہو تو یہ کرو' وہ آگے یہ بھی بتائیں کہ قرآن کریم نے کچھ اور بھی کہا ہوا ہے۔یہ تو بہر حال اس بی بی کی بات تھی کہ اللہ میاں بھی تو مرد ہیں لیکن یہ مفتی صاحبان تو سارے مرد ہوتے ہیں ''ایناں نے عورت نوں کدی مفتی بنن ای نئیں دتا ہیگا'' (انہوں نے عورت کو کبھی مفتی بننے ہی نہیں دیا)۔لیکن یہ تو خدا کا کلام ہے۔یہاں اگر اس نے (4:35) میں یہ کہا تھا تو (4:128) اسی سورۃ النسآء میں آگے جا کر کہا ہے کہ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا (4:128) اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے بھی سرکشی کا ہی نہیں' وہاں (4:34) میں عورت کی سرکشی کہی تھی یہاں (4:128) میں تو ایک اور فقرہ ہے کہ خاوند کی طرف سے سرکشی کا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عورت سے اعراض برتے یا پہلوتہی برتے۔آہاہا! گھر کے اندر تو سوال ہی ایک ہو جانے کا ہے نہ سرکشی کا' نہ اعراض برتنے کا' نہ پہلوتہی کرنے کا۔کہا ہے کہ اگر خاوند کی طرف سے کسی عورت کو یہ خدشہ پیدا ہو کہ یہ کچھ سرکشی برتے گا' یا یہ اعراض برت رہا ہے تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا (4:128) ۔پہلی چیز یہ ہے کہ کوشش اسی طرح سے کرنی چاہیے کہ ان میں باہمی مصالحت ہو جائے۔اور کوشش کا وہ طریقہ قرآن کریم نے وہاں بتا دیا ہے کہ ایک ثالث ہو' پھر اس کے گھر والوں سے کچھ لوگ لائیں' حالات کو معلوم کریں' پھر یہ کیفیت پیدا کریں' کوشش کریں کہ ان میں صلح ہو جائے: وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128) مصالحت بہر حال اچھی چیز ہے۔اب اگر یہ شکل پیدا نہیں ہوتی تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا یہ کیا جائے کہ یہ جو ثالث ہیں وہ یہ کہہ کر اٹھ جائیں کہ اچھا بھئی! ہم نے تو اپنی طرف سے کوشش کر لی' یہ نہیں ہوتا'' تے کھاؤ کھسماں نوں جاکے'' (جاؤ بھاڑ میں)! نہیں' بات یہ نہیں ہے۔وہ جسد انسانیت میں کسی قسم کی پھانس کو گوارا ہی نہیں کرتا۔

## تنسیخِ نکاح کے دوران عورت کے راستے میں پیدا کی جانے والی رکاوٹیں اور نیلام گھر کی طرح تین طلاقوں کی گردان کے عمل کی نوعیت

پہلے تو یہ کہا کہ اس صلح میں' اس مصالحت کے معاملے کے اندر بھی اگر اس نتیجے پہ بھی پہنچو کہ ان میں مفارقت نہیں ہونی چاہیے تو اس مفارقت میں بھی وہ یہ چیز کہتا ہے کہ یہاں بھی جو انصاف اور عدل ہے' اس کو ملحوظ رکھنا ہے۔اس مفارقت کے راستے میں کیا چیز حائل ہوا

کرتی ہے' وہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ لکھنے کو تو میاں صاحب اس وقت مہر لکھ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے جی! پچاس ہزار روپیہ مہر۔ جب ان سے پوچھیے کہ صاحب! اتنا مہر کیوں؟ کہتے ہیں ''کنے دینا ہیگا اے'' (یہ تو دینا ہی کسی نے نہیں ہے)۔ اور اس کے بعد جب مفارقت کی یہ شکل پیدا ہوتی ہے تو راستے میں یہی چیز حائل ہو جاتی ہے کہ اتنا مہر دینا پڑے گا۔ اب یہ باطل نظام کے باطل قوانین ہیں کہ اس عورت بیچاری کو' اس کی بالادستیوں سے اور استبداد اور مظالم نشوز سے' اعراض سے' پیچھا چھڑانے کے لیے' عدالتوں کے دروازوں پر دستکیں دینا پڑتی ہیں۔ یعنی یہ معاہدہ جو فریقین کی رضامندی سے ہوا تھا' اس میں تو دونوں کی حیثیت ایسی برابر کی تھی کہ دونوں کی رضامندی شرط تھی اس کے بغیر تو ایجاب وقبول کا معاہدہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک یہ فریقین راضی نہ ہوں۔ اور فریقین میں بھی عام ہمارے ہاں یہ روایت چلی آتی ہے کہ پہلے لڑکی کی رضامندی لو' اس کی رضامندی شرط ہے۔

لیکن جب اس عہدنامے کے توڑنے کا موقعہ آتا ہے تو اس وقت قانون یہ ہے کہ اس ایک فریق کو تو اس کی پوری اجازت ہے کہ جب جی چاہے' جہاں جی چاہے' کھڑے بیٹھے اٹھے' تین دفعہ اس نے نیلام کرنے والے کی طرح ون ٹو تھری کہا' معاملہ ختم ہوا کہ تین دفعہ طلاق پڑی۔ اور یہ فریق ثانی جس کی اس قسم کی رضامندی سے معاہدہ استوار ہوا تھا' اس نے اگر اس کی تنسیخ کرنی ہے تو وہ بیچاری عدالتوں میں دھکے کھاتی پھرے' عورت تو یہ کچھ کرے اور جو مرد ہیں ان کی یہ کیفیت ہے۔ وہاں جا کر پھر اس کو یہ کچھ ثابت کرنا پڑتا ہے اور یہ میاں صاحب' کیا عرض کروں بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوتی ہیں' اس قانون کی رو سے اگر وہ یہ ثابت کرے کہ صاحب! اس میں یہ اخلاقی بدچلنی پیدا ہوگئی ہے تو اس مرد کو مہر دینے کی بچت ہو جاتی ہے۔ یہ الزام پھر اس عفت مآب کے سر پر عائد کرتے ہیں محض اس لیے کہ یہ جو معاہدہ کیا تھا اور اس میں مہر دینے کی شرط لکھی تھی یہ نہ دینا پڑے۔ بیچاریاں یہ شریف زادیاں سسک سسک کر گھروں کے اندر مر جاتی ہیں کہ عدالت کے کٹہرے میں اس نے یہ کہہ دیا تو کہیں کی بھی نہ رہی۔

## مصالحت کے سلسلہ میں دل کا بخل بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے

یہ قرآنِ کریم ہے' عزیزانِ من! ذومعنی میں تو یہ باتیں نہیں ہوتی ہونگی۔ کہا ہے کہ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ (4:128)۔ اس مصالحت کے معاملے میں سب سے بڑی چیز' یہ جو دل کا بخل ہوتا ہے' یہ مانع ہوا کرتا ہے' اس کو درمیان میں نہ آنے دینا۔ کیا بات ہے صاحب! یہ جو خود سمیٹ لینے کی ہوس ہوتی ہے' یہ انسان کے عدل کے راستے میں آڑے آیا کرتی ہے۔ یہ ''شح'' بڑا عجیب لفظ ہے۔ گرمی کے زمانے میں ہمارا جو کارپوریشن کا نظام ہے' اس کی دریا دلی کے صدقے میں وہ جو ایک ایک قطرہ ٹپکا کرتا ہے نلکے میں ترس ترس کے اور وہ برتنوں کی قطار ہوتی ہے' یہاں سے وہاں تک لگی ہوئی' روز اخباروں میں آیا کرتا ہے کہ پانی کے نل کے اوپر چھرا چل گیا۔

وہ ہوتا کیا ہے؟ جو ذرا سا بالا دست ہوتا ہے' ذرا سا جو طاقتور ہوتا ہے' وہ کمزور کی بالٹی یا مٹکے کو دھکیل کر آگے پھینکتا ہے' اپنا آگے کر دیتا ہے۔ یہ شکل تو ہمارے ہاں پانی کی کہیں کہیں ہوتی ہے مگر عرب جیسے ملک کے اندر تو پانی پہ جان چلی جاتی ہے۔ وہاں یہ صورت ہوتی ہے کہ اپنی باری پہ کوئی کمزور آیا ہے اور دوسرا بالا دست پیچھے سے اس کو دھکا دے کر' ایک طرف نکال کر' اپنا برتن آگے کر کے جو بھر لے' اس کے لیے ان کے ہاں لفظ شُحَّ تھا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ (4:128) حق تو اس کا وہ ہے لیکن تم چونکہ بالا دست بن چکے ہوئے ہو اس لیے تم اسے دھکا دے کر اس کو اس کے حق سے محروم کرنا چاہتے ہو۔ یہ چیز راستے میں حائل ہو جائے گی۔ یاد رکھو! اسے حائل نہیں ہونے دینا۔

## باہمی تعلقات کی علیحدگی میں بھی خوبصورتی کا رنگ شامل کرنا ہوگا

آگے کہا ہے کہ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (4:128) یاد رکھو! باہمی تعلقات میں مفارقت بھی ہونے لگی ہے' اس میں بھی حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اس معاشرے سے جو اس قدر حق کی مخالفت کر رہا تھا' پیہم باعث آزار بنا ہوا تھا' جنہوں نے لڑائیاں لڑیں' جنہوں نے تکلیفیں بہم پہنچائیں جب یہ کہا ہے کہ اب ان میں اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا' ان کو چھوڑ دو تو وہاں بھی یہ کہا کہ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا (73:10) انہیں چھوڑ و تو بھی بڑی خوبصورتی سے چھوڑو ورنہ چھوڑتے وقت معاشرے میں جو کچھ ہوا کرتا ہے وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ وہ تو ہمارے ہاں ''پنجابی بولی اچ جیہڑا کیندے نیں' گل بالکل صحیح ہیگی اے کہ میری لگدی کسے نہ ویکھی' ٹٹدی نوں جگ جاندا۔ بالکل دہائی پئی ہوئی ہیگی اے سارے محلے اچ'' (پنجابی زبان میں جو کہتے ہیں وہ بات بالکل صحیح ہے کہ میری جب دل لگی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور جب ٹوٹی تو دنیا میں' سارے گلی محلے میں خوب خوب چرچا ہوا)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو دوسرے کے حق کو دھکا دے کر' الگ کر کے' آپ آگے بڑھ جانے کا مسئلہ ہوتا ہے' اس راستے میں یہ چیز حائل ہو جائے گی اس لیے کہا ہے کہ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا (4:128) نہیں! ایسا نہیں کرنا۔ یہ تو حسن کارانہ انداز سے الگ ہونا ہے' قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔

## ہماری معاشرتی زندگی کا ذکر

اگر تمہیں ڈر ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر یوں نہیں ہے۔ بھئی! اس عدل میں ہمارے ہاں تو کوئی الٹی سیدھی سی شکل ہوتی ہے۔ یہ جو نئی آنے والی بیوی ہوتی ہے تو اس صورت میں ہمارے ہاں ان شرائط کے ماتحت عدل میں یوں ہوتا نہیں۔ یہ جو نئی بیویاں لائی جاتی ہیں' وہ ہمیں پتہ ہے کہ کس طرح لائی جاتی ہیں۔ ہر جگہ ہوتا یہی ہے کہ یہ جو نئی آنے والی ہوتی ہے' یہ بڑی چہیتی ہوتی ہے' یہ غالب

آ جاتی ہے اور وہ جو بیچاری پہلی ہوتی ہے' وہ اور اس کی اولاد جس طرح سے وہاں دب کر گزارہ کرتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ یوں کہیے کہ ان کو بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ شکل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں (اسلام کے صدرِاوّل میں) یہ شکل نہیں تھی' وہاں یہ صورت تھی کہ بہرحال جو پہلی بیوی ہے' اور جو اس کی اولاد ہے' وہ گھر بالکل جنت کا نقشہ ہے' یہ جو دوسری آنے والی ہے' اس کو ان احساسات کے ماتحت' ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے ماتحت' گھر میں لایا جاتا ہے۔ اب جذباتی طور پر ان دونوں کا جو یکساں ہونا ہے' یہ ممکن نہیں ہوسکتا' جذباتی عدل کوئی کر نہیں سکتا۔

## قرآنی تعلیم یہ ہے کہ دشمن سے محبت تو نہیں ہوسکتی البتہ عدل کرنا ضروری ہوتا ہے

قرآنِ کریم تو کوئی ایسی چیز جو غیر فطری ہو یا ناممکن ہو' بغیر فریضے کے عائد نہیں کرتا' وہ ان انسانی احساسات اور جذبات کا خیال رکھتا ہے کہ ایسی صورت نہ پیدا ہو۔ اگر اس نے یہ چیز عائد کردی ہوتی کہ جذباتی طور پر بھی تمہیں عدل کرنا پڑے گا تو یہ ناممکن تھا۔ جذباتی طور پر وعظ کہہ لینا تو آسان ہے کہ دشمن سے بھی محبت کرو' یہ شاعری ہے' یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس پر تو عیسائیت کی دنیا خود پکار اٹھی ہے کہ یہ ناممکن ہے' یہ Psychological Impossibility (نفسیاتی طور پر ناممکن) ہے کہ کسی دشمن سے محبت ہو۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ دشمن سے بھی عدل کرو' یہ ہے تعلیم جو ممکن ہے' آپ دشمن سے محبت نہیں کرسکتے' عدل کرسکتے ہو۔ قرآنِ کریم نے بھی عدل کے معاملے میں یہ کہا ہے۔ عدل کے اندر' مقدمے کا عدل اور چیز ہے' میاں بیوی کے درمیان تعلقات اور قسم کے ہوتے ہیں ان میں جذباتی عدل نفسیاتی طور پر ناممکنات میں سے ہے۔

## معاشرتی عدل اور جذبات کے عدل میں بنیادی فرق ہے

ایک عدل تو یہ ہے کہ ٹھیک ہے' دوسرے بچے آئے ہیں یا دوسری بیوی آگئی ہے' یہاں پر معاشرتی عدل ہے' ضروریاتِ زندگی کا عدل ہے' برتاؤ کا عدل ہے۔ یہ ٹھیک ہے یہ ہوسکتا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جذبات اور محبت کا عدل ہو' تو یہ ترازو میں بانٹنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نقطہ ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جس نے یہ بات کہہ دی کہ وہاں تو قرآنِ حمید نے یہ کہا ہے کہ ان حالات میں ایک سے زیادہ بیویاں لاسکتے ہو۔ اگر تم دیکھو کہ عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی ہے۔ تو قرآنِ کریم میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ (4:129) اگر تم چاہو بھی تو عدل نہیں کرسکو گے۔

## قرآنِ حکیم کی بات میں تضاد نہیں بلکہ ہماری سمجھ کا فرق ہے

ہمارے ہاں ان دونوں چیزوں کو ملا کر وہ کہتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! قرآنِ کریم نے کیسا حسین انداز اختیار کیا ہے! وہاں یہ کہا

ہے کہ ہاں ہاں دو دو تین تین چار چار کرلو بشرطیکہ تم عدل کرسکو اور یہاں یہ کہا ہے کہ عدل تو تم کرہی نہیں سکو گے۔ کہا ہے کہ دیکھا! قرآنِ حکیم نے اجازت بھی دی اور روک بھی دیا۔ کیا کہنے ہیں ان کے!!! اجازت بھی دی اور روک بھی دیا۔ کہا جائے کہ صاحب! وہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو کہا کہ ہاں' ہم نے کہا تو ہے کہ ایک سے زیادہ کرلو' عدل ہی شرط لگائی ہے۔ کرنا شروع کیا تو کہا کہ نہیں! عدل تم کرہی نہیں سکتے:

می نہ سزد خدائے را

## جذبات کے سلسلہ میں یہاں حرصتم کا لفظ قابلِ غور ہے

عزیزانِ من! عام قانون کی کتاب بھی اس کو برداشت نہیں کرسکتی چہ جائیکہ خدا کی کتاب یہ کچھ کہے۔ بات اس نے یہ کہی ہے اور خود ہی اس نے واضح کردیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَ لَوۡ حَرَصۡتُمۡ (4:129)۔ یہ حَرَصۡتُمۡ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ جذباتی چیز ہے۔ دیکھیے قرآنِ حکیم! میں اسے خود نہیں کہہ رہا کہ یہاں یہ حَرَصۡتُمۡ کیوں لایا ہے؟ یہ خالص جذباتی چیز ہے۔ کہا ہے کہ یہ عدل تو نہیں کرسکو گے۔ جو عدل مطلوب و مقصود ہے وہ یہ ہے کہ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡہَا کَالۡمُعَلَّقَۃِ (4:129) گھر کے اندر ایسا نہ ہو کہ تم سارے کے سارے ایک ہی بیوی اور اس کے بچوں کی طرف جھکے رہو اور یہ بیچاری دوسری جو آئی ہے' اس کو آدھی لٹکی ہوئی چھوڑ دو۔ نہ تو یہ ایسی ہے کہ اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ یہ ایسی ہے کہ گھر میں اس کو یکساں عدل کا ثبوت مل رہا ہے۔ کہا ہے کہ اس کی یہ کیفیت نہ پیدا کرلو۔ وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا (4:129) اس کے باوجود یہی چیز کہی ہے کہ اگر کشمکش پیدا ہوتی ہے تو ٹھیک ہے' مصالحت کی کوشش کرو۔ وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا (4:130) ''ایناں نوں بن کے نہ رکھو'' (انہیں مجبوراً نہ رکھو' باندھ کر نہ رکھو)۔ اگر دیکھو کہ یہ معاملہ یوں نہیں چل سکتا تو ان کی مفارقت پیدا کرو۔

## ہمارے ہاں کی معاشرتی زندگی کی ناگفتہ بہ حالت

اب یہاں معاشرے کی ذمہ داری آتی ہے۔ ہمارے ہاں کے اس باطل نظام کے اندر' آپ کے علم میں بھی یہ اکثر Cases (مقدمے) آئے ہونگے اور میرے علم میں تو آتے رہتے ہیں۔ یہ بیچاری مظلوم بیویاں ہیں' ان کے بچوں پر بے حد ظلم و ستم ہوتا ہے مردوں کا' خاوندوں کا اور اولاد کے باپ کا۔ یہ اس خیال سے برداشت کیے جارہی ہیں' سہتی چلی جارہی ہیں کہ صاحب! یہ سہارا نہ رہا تو اس کے بعد دنیا میں ہمارا تو کوئی سہارا ہی نہیں رہے گا۔ ہمارے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ رات کی روٹی بھی ہمیں کہیں سے میسر آجائے' اس لیے جو کچھ ہوتا ہے' اسے ہمیں برداشت کرنا ہوگا۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے کہ ایسے حالات میں وہ یہ کہے کہ ٹھیک ہے' مفارقت ہوجانی چاہیے' الگ ہوجانا چاہیے ان کو بھی اور بچوں کو بھی۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ اگر مفارقت کی یہ بات سمجھو کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے

تو اس سے مت ڈرو۔ کہا ہے کہ يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا (4:130) ۔یخاف کے تو یہی معنی ہیں کہ اس سے مت ڈرو، خدا تمہارے لیے معاش پیدا کرے گا، وہ تمہیں اس چیز سے مستغنی کرے گا، تمہیں احتیاج نہیں ہوگی، محتاج نہیں ہوگی، وہ بڑی وسعتوں والا ہے، حکمت والا بھی ہے۔

## خدا تعالیٰ اپنی ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں اپنے نظام کے تحت پوری کراتا ہے

اب یہاں سے وہی سوال آیا کہ صاحب! وہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے بیچارے یتیم بچے، ایسی مطلقہ عورتیں، ان کے بچے، ایک وقت کی روٹی کماتے ہیں، خدا تو دیتا ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم تو تمہیں مستغنی کردیں گے۔ وہ آپ کو معلوم ہے کہ میں اس چیز کو بڑی وضاحت سے کئی ایک مقامات پہ بیان کرچکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے متعلق جتنی ذمہ داریاں خود لی ہیں، وہ ذمہ داریاں اس نظام کی رو سے پوری ہوتی ہیں جو اس کے نام پہ قائم ہوتا ہے۔ جسے حکومتِ خداوندی، اسلامی مملکت، اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے Constitution (آئین) پر 786 لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان انسانوں کے متعلق جتنی ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لی ہیں، یہ مملکت ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے پھر یہ اسلامی بنتی ہے۔ جب یہ ان لوگوں سے خدا کے نام پہ اطاعت لیتی ہے تو اس نے جو ذمہ داریاں لے رکھی ہیں، وہ بھی تو اس کو پوری کرنا ہونگی۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر Right (حق) جو ہے وہ کسی ذمہ داری کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ خدا کو بھی حق حکومت اس لیے حاصل ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔ اس کے نام پہ جو حکومت قائم ہے اس کو بھی اطاعت کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ ربوبیت کا فریضہ ادا کرے۔ قرآنِ کریم نے اسی لیے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ اس کی اطاعت مت کرو جو ہماری اطاعت سے غافل ہوگیا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ کسی دن میں یہ موضوعِ درس بناؤں گا کہ یہ اطاعت کن حالات میں کی جاتی ہے اور کہاں قرآنِ حکیم اس کے لیے اجازت دیتا ہے کہ نہیں! تم ان کی اطاعت نہیں کرو، یہ تمہارے قانون کی طرف سے غافل ہوگئے ہیں۔ یہ قرآنِ حکیم نے کہا ہے۔ سرکشی تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔

## خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نظام کی شکل یہ ہے کہ خارجی کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہوتی

عزیزانِ من! یہ جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ڈرنا نہیں چاہیے، ہم ان کو محتاج نہیں رہنے دیں گے تو اس کے لیے یہ ہے کہ یہ نظام ایسا ہوگا جو ان کی ذمہ داریاں پوری کرے گا۔ تو وہ جو محتاج نہ ہونے کا ہم نے کہا تھا وہ یہ تھا کہ ان کو اس قسم کا ماحول ملے یا یہ سب کچھ ملے گا۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ سب نہیں مل سکا لیکن بر سبیل تنزل پھر معاشرہ یہ انتظام کرے گا کہ یہ محتاج نہ رہنے پائیں۔ اور اس کے لیے

کہا کہ یہ کس قسم کا معاشرہ ہوگا' کیسے یہاں انتظام ہوگا۔ کہا ہے کہ وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (4:131) تم دیکھتے نہیں ہو کہ خارجی دنیا میں' ہمارا نظام کس طرح سے قائم ہے' وہاں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہاں کبھی کوئی پھل جڑ سے بھیک نہیں مانگتا کہ مجھے اتنا سامانِ نشو ونما دو' تب میں پکوں گا اور بڑا ہوں گا اور میرے اندر یہ خاصیت پیدا ہوگی۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی بھی صبح اٹھ کر ہمیں سورج کی منت نہیں کرنا پڑتی کہ نکلو میاں! کچھ تپش دو' کچھ روشنی دو۔ وہاں کوئی دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا۔ کہا یہ ہے کہ بس یہی نظام تمہارے اندر بھی ہے۔

## خدا کی حاکمیت انسانوں کے سجدوں کی محتاج نہیں بلکہ انسان ہی اس کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کا محتاج ہے

اور کہا ہے کہ یہ جو چیزیں' احکام کی باتیں' ہم نے تمہیں عائلی زندگی کے متعلق کہی ہیں تو سنو! وَ لَقَدۡ وَصَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ (4:131) یہ بات تمہیں ہی نہیں کہی گئی' یہ تو انسانیت کے بنیادی مسائل میں سے ہے' اس لیے اس سے پہلے بھی جن قوموں کو ہم نے کتاب دی تھی' انہیں بھی ہم نے یہی کچھ کہا تھا' تمہیں بھی یہی کچھ کہہ رہے ہیں اور وہ یہ چیز ہے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ وَ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا (4:131) اور اگر تم اس سے انکار کرو گے تو کیا اس سے ہماری مملکت' ہمارا جو نظام ہے' اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی؟ نہیں' ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (4:131) ہماری کائنات' ہماری مملکت' ہماری حکومت' اسی طرح سے چلتی جائے گی' تمہارا ہی کچھ بگڑے گا' ہمارا کیا بگڑتا ہے! وَ کَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیۡدًا (4:131)۔ دیکھا آپ نے کہ آیت کے آخری الفاظ کیا آتے ہیں کہ وہ تمہارا محتاج نہیں ہے۔ یہ نہیں آیا ہے کہ تم لاکھ آدمیوں نے وہاں جا کر سجدہ کرنا شروع کیا' چودہ لاکھ نے وہاں جا کر حج کرنا شروع کیا تو خدا کی مملکت میں توانائی اور تقویت آ گئی اور تم نے نماز روزہ چھوڑ دیا تو اس نے کانپنا شروع کر دیا۔ اس نے تو کہا ہے کہ کَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیۡدًا (4:131) ایک تو غنی وہ ہوتا ہے جو کسی طرح سے دھاندلی سے روپیہ سمیٹ لیتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ میں تمہارا محتاج نہیں ہوں۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ''میں کسے دا دتا کھانا ایں'' (میں کسی کا دیا ہوا کھاتا ہوں) یہ بڑا تکبر ہوتا ہے۔

## خدا کا دیا ہوا نظام ہی انسانیت کا آخری سہارا ہے۔ خدا تو غنی بھی ہے اور رحیم و کریم بھی

عزیزانِ من! یہاں آیا ہے حَمِیۡدًا (4:131)۔ آہاہاہا!! اس کا استغنیٰ باعثِ حمد وستائش ہے۔ یہ ایسا مستغنی ہے کہ اس کو دیکھ کر یہ کلماتِ توصیف زبان سے نکلتے ہیں کہ ''کیا بات ہے تیری وڈے ہون دی'' (کیا بات ہے تمہارے بڑے ہونے کی!) اللہ اکبر!

وَ غَنِيًّا حَمِيْدًا (4:131) وہی غنی ہے جو باعثِ حمد وستائش ہے‘ جس کے استغنیٰ کو دیکھ کر لب پہ بے ساختہ تحسین کے جذبات آ جائیں کہ کیا بات ہے تمہاری! ’’اللہ تینوں ایدے توں وی زیادہ دوے‘‘ (اللہ تمہیں اس سے بھی کہیں زیادہ سے!)۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (4:132) خدا کے نظام کو کسی اور کارساز و کارفرما کی ضرورت نہیں۔ اور اس حقیقت پر کائنات کی پستیاں اور بلندیاں شاہد ہیں۔ وہی محکم سہارا ہو سکتا ہے جو اس قسم کا غنی ہو کہ غنی بھی ہو اور حمید بھی ہو‘ وہی وکیل ہو سکتا ہے‘ وہی سہارا ہو سکتا ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی آیت 132 تک آ گئے‘ 133 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**

❀......❀......❀

# ستائیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 133 تا 143)

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿١٣٣﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ
الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿١٣٤﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ
بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ
اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ ﴿١٣٨﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ
فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا
تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ
جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ ﴿١٤٠﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ
لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ
وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿١٤٣﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 133 سے ہوتا ہے: (4:133)۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے انسانی عقل وفکر کو جلا بخشنے کے لیے خارجی کائنات کے نظم ونسق کی محسوس مثال

جیسا کہ سابقہ درس کی آخری آیت میں کہا گیا تھا کہ قرآنِ کریم میں جہاں یہ بتانا مطلوب ہوتا ہے کہ اگر زندگی قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے تو پھر یہ کارگہ حیات کس حسن وخوبی سے چل سکتا ہے' اس کے لیے خارجی کائنات کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہے

ہے کہ وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (4:132) تم دیکھو کہ خارجی کائنات میں ہر شے خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے تو یہ کائنات کا نظام کس حسن وخوبی کے ساتھ چلتا ہے۔ یہاں سے اکثر یہ سوال دلوں میں ابھرا کرتا ہے اور آپ نے کئی دفعہ سنا ہوگا کہ مظلوم خاص طور پر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ صاحب! دنیا میں مستبد اور ظالم قوتیں اور بالا دست افراد اس قدر مظالم ڈھاتے ہیں' اس قدر زیادتیاں کرتے ہیں مگر ضعیف' کمزور' نادار اور مفلوج کچھ نہیں کرسکتا تو یہ آسمان پہ خدا بیٹھا ہوا کیا کرتا رہتا ہے۔ کیا وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ ظلم وستم کرتے رہیں' یہ مظلوموں پہ قیامتیں ڈھاتے رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کرتا؟ اس کو چاہیے کہ ان کو روک دے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ظالم کا جو ہاتھ مظلوم کا گلا دبانے کے لیے اٹھتا ہے' وہ وہیں پتھر کا ہو جائے' خدا کیوں نہیں ان کو روک دیتا؟ اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ مظلوم اپنی بے بسی میں' بے کسی میں' چاہتا یہ ہے۔ اور پھر جب اس کی مایوسی کی انتہا ہو جاتی ہے تو وہ یہاں تک کہنے لگ جاتا ہے کہ پھر بالآخر اس خدا کو ماننے کا فائدہ کیا ہے جو ہماری مدد کے لیے نہیں آتا۔ یہ ہیں وہ سوالات جو ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔

## انسان کے لیے اختیار وارادہ کی نعمت ایک ایسا گوہرِ تابدار ہے جو کسی اور کو عطا نہیں ہوا

ان کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تم خود ذرا سوچ کر فیصلہ کرلو کہ کائنات کی جتنی چیزیں ہیں' انہیں تو مجبور پیدا کیا گیا ہے' انہیں صاحبِ اختیار وارادہ نہیں پیدا کیا گیا۔ جس قانون کے تابع انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے وہ ان کے اندر موجود ہے اور وہ اس کے مطابق چلنے کے لیے مجبور ہیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے' اس کو راہنمائی دیدی گئی ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ تمہارا جی چاہے تو اس کے مطابق چلو' جی چاہے اس کے خلاف چلو۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی جی چاہے تو اپنے معاشرے کو ان قوانین کے مطابق متشکل کرلو' جی چاہے ان کے خلاف کرو' یہ تمہارے اختیار وارادے پہ ہے۔ تو جس قسم کی روش تم اختیار کرو گے اس قسم کے نتائج تمہارے سامنے آجائیں گے۔ انسان کی صورت میں یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے جو لایا گیا' یہ خارجی کائنات اور انسان کی زندگی کے اندر بہت بڑی بنیادی تبدیلی ہے۔ اب اگر خدا Intefere (مداخلت) کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے اس اختیار وارادے کو سلب کرلے' وہ انسان کو بھی مجبور کردے کہ وہ اس خاص روش پر اپنی مرضی سے نہیں' مجبوراً اس روش کے اوپر چلے جس پہ تم چاہتے ہو کہ انہیں چلنا چاہیے۔ وہ اسے یہ کہتا ہے کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔

## خدا کی طرف سے عطا کردہ نظام' اجتماعی حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے جس میں کسی کے اختیار کو مفلوج نہیں کیا جاتا

یہ تو ٹھیک ہے کہ مظلوم یہ چاہتا ہے کہ ظالم کے ہاتھ کو کوئی مافوق الفطرت قوت روک دے اور وہ ظلم نہ کرے لیکن پھر یہ بات کسی ایک

فردیاایک معاشرے تک نہیں رہے گی' پوری نوعِ انسانی کو یوں پیدا کرنا ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کرسکے۔اسے بھی خدا کی مرضی اور خدا کے قانون کے تابع' کرہاً' جبراً چلنا پڑے گا۔کہا ذرا سوچو توسہی کیا تم اس کو پسند کروگے کہ تمہیں بھی پتھروں کی طرح مجبور پیدا کردیا جائے' حیوانات کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلنے کے لیے تمہارے اختیار کو سلب کرلیا جائے؟ یہ ٹھیک ہے کہ مظلوم اپنی بے کسی میں تو پکار اٹھتا ہے لیکن اگر وہ بھی ٹھنڈے دل سے سوچے تو وہ بھی کہہ دے گا کہ نہیں صاحب! ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔وہ یہی کہے گا کہ صاحب! ظالم کا ہاتھ تو روک دینا چاہیئے' اس کا ارادہ تو سلب کرلینا چاہیے۔سوال اس میں انفرادی تخصیص کا نہیں ہوگا کہ کسی کا ارادہ تو خدا سلب کرلے اور کسی کو صاحبِ ارادہ رہنے دے۔ایک نوع (Species) ' ایک جنس' ایک مخلوق کے لیے ایک ہی قانون کارفرما ہوگا۔تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ میرا اختیار اور ارادہ سلب کرلیا جائے۔یہ جسے آپ آزادی کی جدوجہد کہتے ہیں' یہ کیا ہوتی ہے؟ یہ ہے حقِ خود ارادیت۔کسی کے ارادے پر جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اسے غلامی کہا جاتا ہے۔انسان کی ساری جدوجہد کی تاریخ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے پر کسی قسم کی خارجی پابندی کو گوارا نہیں کرتا اس کے لیے لمبی لمبی جنگیں ہوتی ہیں' لڑائیاں ہوتی ہیں' یہ لوگ جانیں دیدیتے ہیں۔یہ حریت کی' جنگ آزادی کی' لڑائیاں کیا ہیں؟ پھر وہی الفاظ دہراتا ہوں کہ یہ حق خود ارادیت ہے تاکہ میرے ارادے پر کوئی دوسرا شخص جبر نہ کرے' کوئی پابندی نہ عائد کرے۔

## اختیار و ارادہ پر پابندی انسان میں نفسیاتی طور پر سرکشی کے جذبات پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! انسان کبھی بھی نہیں چاہتا کہ اس کا ارادہ مفلوج کردیا جائے۔یہ جو گھر میں نظر بند کردیتے ہیں' یہ کیا ہوتا ہے؟ میری اپنی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ میں ہفتوں گزر جاتے ہیں' اس پھاٹک سے باہر کہیں نہیں جاتا' یہیں رہتا ہوں لیکن اگر ایک دن کے لیے' باہر کے پولیس اسٹیشن کا تھانے دار یہ کہدے کہ صاحب! آپ کو آج حکم ہے کہ آپ گھر سے باہر نہیں نکل سکتے' آپ دیکھیے دو گھنٹے کے بعد کیفیت کیا ہوتی ہے۔یہ کون ہوتے ہیں صاحب! ایسا کرنے والے' انہیں کیا حق حاصل ہے ایسا کرنے کا۔انسان برداشت نہیں کرسکتا۔یہ کیا ہوا؟ یہ کہ خارج سے میرے ارادے کو سلب کیا جارہا ہے' یہ میری آزادی میں روڑے ہیں' کوئی انسان اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔چھوٹے چھوٹے بچوں کو آپ دیکھ لیجئے' وہ جو کر رہے ہوتے ہیں ذرا ان کو روک کر دیکھیے' مجبور ہوتے ہیں' کمزور ہوتے ہیں' محتاج ہوتے ہیں' مان تو لیتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے ان کے اندر بھی کتنے سرکشی کے جذبات ابھرتے ہیں' باپ منع کرتا ہے تو وہ امی سے جا کر کہتے ہیں کہ ابا جان ہم کو ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں کہ صاحب! یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' گڈی نہ اڑاؤ' چھت پہ نہ جاؤ گر جاؤ گے' ہمیں تو کوئی کھیلنے بھی نہیں دیتا۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہماری آزادی کو سلب کیا جارہا ہے۔کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔کہا ہے کہ تم یہ

خیالات دل میں لاتے ہو۔

## خارجی کائنات کی مانند انسان کو مجبور پیدا کرنا خدا کی مشیّت میں نہیں تھا

جب ہم باہر کی کائنات کی' مثال پیش کرتے ہیں کہ دیکھیے وہ کس نظم وضبط سے چل رہی ہے تو اس وقت یہ چیز تمہارے ذہن میں آتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے بھی یہی شکل کیوں نہ اختیار کر لی گئی کہ ان میں سے بھی ہر ایک مجبوراً ایک ہی ڈگر اور ایک ہی روش پر چلتا جاتا۔ تو کہا کہ ہمارے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ اِنْ يَّشَـاْ يُـذْهِبْـكُـمْ اَيُّهَـا النَّـاسُ وَ يَـاْتِ بِـاٰخَرِيْنَ وَ كَـانَ اللّٰـهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (4:133) اگر ہماری مشیت میں ہوتا' ہماری مشیت کے پروگرام میں یہ بات ہوتی کہ نوعِ انسانی کی تخلیق بھی کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح ہوتی' تو ہم اس کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا ہی نہ کرتے۔ اور ہمارے لیے کسی وقت بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ جو ایک قسم کی نوع ہے' اس کو ختم کر کے دوسرے ٹائپ کی نوع کو پیدا کر دیا جائے۔ یہ ہوسکتا ہے مگر ہماری مشیّت میں یہ نہیں تھا۔ اِنْ يَّشَـاْ کے معنی یہی ہیں کہ اگر یہ ہوتا تو ہم کرتے۔ یہ ہماری مشیت میں نہیں تھا۔

ضمناً یہ چیز سامنے آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ اپنا جو خدا کا احاطۂ مشیت تھا جس کو عالم امر کہتے ہیں' جہاں اشیائے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے' ان کے لیے قوانین بنتے ہیں' وہاں تو اس نے کہا ہے کہ يَـفْـعَـلُ مَا يَشَآءُ (3:40) جو کچھ وہ چاہتا ہے' وہ وہاں کرتا ہے' اپنی مشیت کے مطابق کرتا ہے' کسی اور کو اس میں دخل نہیں دیتا۔ اور انسانوں کی دنیا کے متعلق اس نے کہا ہے کہ اِعْـمَـلُـوْا مَاشِئْتُمْ (41:40) یہاں تمہاری مشیت چلتی ہے تم اپنی مشیت اور مرضی کے مطابق جو چاہو کرلو' وہاں تم دخل نہیں دے سکتے' یہاں ہم دخل نہیں دیں گے' اگرچہ دے سکتے ہیں۔

## قرآنی آیات کے آخر میں دی گئی صفاتِ خداوندی بڑی پُر معنی ہوتی ہیں

کہا ہے کہ وَ كَـانَ اللّٰـهُ عَـلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (4:133) یہاں دیکھیے یہ قدیر جو کہا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی کسی آیت کے آخری الفاظ کی! جو میں کہا کرتا ہوں کہ آیت کے آخر میں خدا کی جو صفت آتی ہے وہ بڑی غور طلب ہوتی ہے۔ یہ جو فَـعِيْلًا کے وزن کے اوپر قَـدِيْـرًا ہے' یہ صفت وہ ہوتی ہے جو مسلسل ہوتی ہے۔ کسی ایک وقت میں اگر کوئی بات کرنی ہو تو ٹھیک ہے وہ فاعلون کے وزن کے اوپر آتی ہے' وہ قَـادِرُوْنَ آ جاتا ہے لیکن وہ شے جو اس میں ہمیشہ کے لیے موجود ہے اس کے لیے قَـدِيْـرًا یہاں کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ آج ہم میں وہ قدرت نہیں رہی' قدرت تو آج بھی ہماری وہی ہے۔ اور پھر لفظ قدرت بھی عربی زبان کا ہے۔ اس میں ظلم وستم کو روکنے کی تو بات نہیں' وہ تو پیمانے مقرر کرنا ہوتا ہے۔ قدیر کے معنی ہیں ''پیمانے مقرر کرنے والا''۔ خارجی کائنات کے پیمانے

یہ تھے کہ ان کو اختیار و ارادہ نہیں ہے‘ تمہارے لیے پیمانہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے دو امکانات ہوتے ہیں‘ ان میں سے جونسا جی چاہے تم اختیار کر سکتے ہو‘ یہ پیمانہ تمہارے لیے ہے۔

## خدا کی ذات قادرِ مطلق ہے‘ وہ اپنے کسی قانون کو بدل سکنے کے باوجود بدلتی نہیں اور قصہ مفادِ دنیا و آخرت کا

یہ پیمانے مقرر کرنے کی ہمارے ہاں جو قدرت ہے‘ یہ سلب نہیں ہوگئی‘ ہم قدیر ہیں‘ جب جی چاہے وہ پیمانے مقرر کر سکتے ہیں لیکن ہم کرتے نہیں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خدا اگر قادرِ مطلق ہے تو پھر اب وہ اس چیز کے لیے مجبور کیوں ہے۔ وہ مجبور نہیں ہے۔ جو اپنے اوپر خود کوئی پابندی عائد کر لیتا ہے‘ وہ مجبور نہیں ہوتا۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے‘ میں ہفتوں اس چار دیواری سے باہر نہیں جاتا‘ مجبور نہیں ہوتا‘ اپنی مرضی سے یہ کرتا ہوں لیکن اگر کوئی باہر سے یہ کہہ دے کہ تم نے یہاں سے باہر نہیں نکلنا‘ اس وقت مجبور ہو جاتا ہوں۔ خدا نے اپنے قادرِ مطلق ہونے کے اوپر خود کچھ پابندیاں عائد کی ہیں اور وہ عائد ایسی کی ہیں کہ اس قدرت کے باوجود کہ وہ ان کو توڑ سکتا ہے‘ ان کے خلاف کر سکتا ہے‘ وہ کہتا ہے کہ ہم کرتے نہیں ہیں‘ ایسا کریں گے نہیں۔ قدیر ہے وہ لیکن جو اس کی مشیت نے طے کر دیا ہے وہ اس کے مطابق کرتا ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ تم یہ چیز ذہن میں نہ رکھو کہ خدا Interfere (مداخلت) کر کے تمہاری مرضی کے مطابق اس کا ہاتھ روک دے‘ اس کا گلا کاٹ دے‘ اس کو پھانسی آ جائے۔ اگر تمہارے متعلق بھی یہی کچھ کہا جائے گا تو تم اسے تو پسند نہیں کرو گے۔

اب دیکھیے بات جو ہو رہی ہے وہ انسان کے اختیار و ارادے کی ہو رہی ہے۔ جونہی یہاں کہا ہے کہ ذٰلِکَ قَدِیۡرًا (4:133) ہم قدیر ہیں۔ اگلے الفاظ یہ ہیں کہ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا (4:134)۔ اب تمہارے ارادے کی بات ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت سے ہی جو انسانی ارادہ ہے‘ اس کا یہاں لفظ آ گیا۔ ان آیات کے اندر کیا بات ہے ربط کی! اب تم یہ جو کچھ کر سکتے ہو‘ وہ یہی صورت ہے کہ تمہارے سامنے مفادِ عاجلہ ہوتا ہے‘ تم اس کے پیچھے لپکتے ہو۔ پھر نہ حق‘ نہ انصاف‘ نہ قاعدہ‘ نہ قانون‘ تمہارے ذہن میں کوئی چیز نہیں رہتی اور جو رہتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ بھی مل جائے‘ یہ بھی مل جائے‘ تمہیں یوں لگتا ہے کہ مفاد قریب ہی پڑا ہوا ہے‘ تم طبعی زندگی کے مفادات کے پیچھے جاتے ہو اور ہم تمہیں ایک نظام دیتے ہیں۔ اس نظام میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ قریبی مفادات تمہیں حاصل نہ ہوں‘ وہ نظام ہم ایسا دیتے ہیں کہ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیۡعًا بَصِیۡرًا (4:134) تم جو اپنے لیے تجویز کرتے ہو تو اس میں صرف مفادِ عاجلہ ہوتا ہے‘ جو مستقبل ہے اس کا مفاد تمہارے پیشِ نظر نہیں ہوتا‘ Long Term Business (طویل المیعاد کام) تمہارا نہیں ہوتا‘ جلدی سے کچھ کر لینا چاہتے ہو۔ اور ہم تمہیں ایک ایسا پروگرام دیتے ہیں جس میں

یہ مفاد عاجلہ بھی حاصل ہوجائیں اور پھر اگلی' مستقبل' کی جو تمہاری زندگی ہے' وہ بھی درخشندہ ہو۔ تو کہو ان دونوں میں سے کونسی چیز اچھی ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان جذبات سے مغلوب نہیں ہے تو وہ یہی کہے گا کہ یہ بھی مل جائے اور وہ بھی ٹھیک ہو۔ سروس میں اور خاص طور پر سروس کے آخری دوران آدمی بڑا محتاط ہوا کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا احساس ہوتا ہے؟ یہ کہ اس کے بعد پنشن ملنے والی ہوتی ہے۔ ہر ماہ یہ تنخواہ تو ملتی جاتی ہے' احساس تو پہلے دن سے ہی ہونا چاہیے لیکن آخر میں جا کر بیدار ہوجاتا ہے کہ باقی عمر کے لیے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن ملنی ہے تو بھئی! زیادہ محتاط ہونا چاہیے' کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس کا اثر پنشن پہ جا کر پڑے۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ ہر ماہ کی تنخواہ کا مفاد عاجلہ (قریبی مفاد) ہے تو اس کو ملتا رہتا ہے لیکن پھر ذرا جو مفادِ آخرت ہے' اس پہ اس کی نگاہ ہوتی ہے کہ بھئی! جو ساری عمر ہے' وہ اس پر گزارنی ہے اس لیے ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے جس کا اس پر اثر پڑ جائے۔ انسان یہ سوچتا ہے لیکن اس کی بھول ہے کہ یہ اپنی زندگی کو صرف یہاں کی موت کے بعد سمجھتا ہے کہ ریٹائرمنٹ نہیں بلکہ سروس ختم ہوگئی۔ اگر معلوم ہو کہ اس موت کے بعد مفادِ آخرت کی پنشن کی ضرورت ہے تو وہ اپنے ذہن میں رکھے۔ وہ کہتا ہے کہ سوچو تو سہی' یہ پروگرام اچھا ہے کہ یہیں بات ختم ہوجائے یا یہ اچھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد پھر ساری عمر پنشن بھی ملے اور وہ اس تنخواہ سے دوگنی ملے۔ کونسا پروگرام اچھا ہے؟ ہر Sensible (سمجھدار) آدمی یہی کہے گا کہ صاحب! یہی پروگرام اچھا ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ **من کان یرید** دیکھیے۔ یہ جو کائنات کی اشیا ہیں جن کو مجبور پیدا کیا گیا ہے' ان کے لیے آخرت نہیں ہے' ان کے لیے صرف مفادِ عاجلہ ہے۔ تمہارا اختیار و ارادہ' جسے تم نہیں چاہتے کہ سلب ہو' اس کے ساتھ یہ لازم ہے کہ مفادِ عاجلہ کے بعد مفادِ آخرت بھی تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے اس لیے جو یہ چاہتا ہے کہ ہمارے پاس جو پروگرام ہے' وہ یہ بھی دیدیتا ہے لیکن اس میں دو چار ذرا سخت مقامات آتے ہیں اور پہلا سخت مقام یہ ہے کہ اس میں معاشرے میں عدل اور انصاف برتنا پڑے گا۔ اپنے لیے یہ چاہتے ہو کہ یہ بھی ملے اور وہ بھی ملے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کسی دوسرے کا حق سلب نہ کرو۔ جس کے سامنے صرف مفادِ دنیا ہے' وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے لیے کونسا طریقہ جائز ہے اور کونسا ناجائز ہے۔ جائز و ناجائز ہر چیز وہ استعمال کرتا ہے۔ صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹی کے قانون کی گرفت میں نہ آئے اور اگر آ جائے تو اس سے چھوٹنے کے لیے کوئی تدبیر کر لی جائے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ مفادِ دنیا بھی ملے گا' مفادِ آخرت بھی ملے گا لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تمہیں عدل کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنا پڑے گی' تم کسی کی حق تلفی نہیں کرو گے پھر تمہیں یہ سب کچھ ملتا چلا جائے گا۔

## قانونِ شہادت کے متعلق قرآنی آیت کی اہمیت اور جائزہ

نظامِ عدل کے معاملے میں قرآنِ کریم نے یہاں یہ ایک آیت دی ہے' عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ اگر اس ایک آیت پر کسی طرح سے عمل شروع ہو جائے تو آپ دیکھیے کہ پھر نہ اس پولیس کی ضرورت ہو' نہ اس لمبے چوڑے عدالتی نظام کی اتنی بڑی ضرورت ہو' نہ بے انصافیاں ہوں' نہ بے گناہ پھانسیوں پہ چڑھیں' نہ گنہگار دندناتے پھریں' ایسی کوئی صورت نہ ہو۔ یہ ایک آیت ہے اور وہ آیت ہے قانون شہادت کے متعلق۔ قانون دان احباب کو یہ علم ہوگا کہ اس نظام عدل میں سب سے مشکل قانون' قانونِ شہادت ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ ہے' بڑا مشکل ہے اور اس کے باوجود اس کا اعتراف ہے کہ یہ قانون مکمل نہیں ہے۔ ایک جج کس چیز پہ فیصلہ کرتا ہے؟ وہ ہیں شہادتیں جو اس کے سامنے پیش ہوتی ہیں' اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ اور عدالتوں کے اندر یہ جو کچھ اوپر نیچے ہوتا ہے' وہ کس Basis (بنیاد) پہ ہوتا ہے؟ وہ شہادات کی Basis (بنیاد) پہ ہوتا ہے۔ اب پہلی چیز اس کے سامنے لائی جاتی ہے' جسے ہم وکیل کہتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو اس کے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شہادتوں کے متعلق کیا کیا جائے۔ یوں یہاں سے وہ شہادتیں بگڑنا شروع ہوتی ہیں' وہ آخر تک بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ اسی پہ دارومدار ہے یعنی نظامِ عدل کا مدار شہادت پر ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی یہ جو ایک آیت ہے' اس میں وہ شہادت کے متعلق کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (4:135) نظامِ عدل کے اوپر قائم رہو۔ اس کا مدار شہادت پر ہے۔ ہر مقدمے میں گواہ یا Prosecution کے ہوتے ہیں' استغاثہ کے ہوتے ہیں یا Defence کے ہوتے ہیں' صفائی کے ہوتے ہیں یا مدعی کی طرف سے ہوتے ہیں یا مدعا علیہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جونہی گواہ کسی پارٹی کی طرف سے گیا' اسے اس پارٹی کے مفاد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ جو گواہ منحرف ہو جاتا ہے اس کے لیے پولیس والوں کی اصطلاح اور ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ تم ضمانتیں لیتے چلے جاتے ہو اور وہ جو Main (اصل) گواہ ہے اس کو تم کیوں پیش نہیں کرتے؟ کہ جی! پھر پیش کر دیں گے۔ وہ کہنے لگا کہ آخری بار ہے' پھر میں نہیں سنوں گا' اس کو پیش کرنا ہوگا۔ پھر اگلی تاریخ کے لیے آیا تو انہوں نے گواہ پھر نہ پیش کیا۔ کیوں نہیں پیش کر رہے؟ کہنے لگے کہ جی! وہ گواہ اصل میں بے ایمان ہو گیا ہے۔ ''اونہے پوچھیا: او بے ایمان کی ہو گیا' کی کہندا اے؟ کہ جی او کہندا اے میں سچ سچ کہہ دیاں گا'' (اس نے پوچھا: وہ کیا بے ایمان ہو گیا' وہ کیا کہتا ہے؟ کہ جی! وہ کہتا ہے کہ میں سچ کہہ دونگا)۔ یہ آخری وقت میں جو گواہ بے ایمان ہوتے ہیں تو یہ وہ ہوتے ہیں جو باہر کہتے ہیں کہ نہیں بھئی! میں تو سچ سچ کہہ دونگا۔ اب سوال یہ ہے کہ شہادت کے متعلق قرآنِ حکیم کیا کہتا ہے؟

## قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ شہادت صرف خدا کی طرف سے ہو' جذبات کی بات درمیان میں آ گئی تو عدل نہیں کر سکو گے

ایک لفظ ہے' عزیزانِ من! سنیے! روح وجد میں آ جاتی ہے۔شہادت کے متعلق کہتا ہے کہ پہلی چیز یہ ہے کہ نہ استغاثہ ہو' نہ صفائی کی شہادت ہو' نہ مدعی کی طرف سے ہو' نہ مدعا علیہ کی طرف سے ہو بلکہ یہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (4:135) صرف خدا کی طرف سے ہو۔اب یہاں جڑ کاٹ کر رکھ دی۔اوراس سے اگلی بات تو وہ ہے کہ اس سے تو واقعی روح کپکپا اٹھتی ہے۔کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے شاہدین بن کر شہادت دو اور جو شہادت آ کر دو اس طرح سچی سچی شہادت دو کہ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (4:135) خواہ وہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ ہو جائے۔اب سوچ لیجیے کہ اگر مجرم خود سچی بات کہہ دے' خواہ وہ اس سے خود پھانسی پہ کیوں نہ چڑھ رہا ہو' یہ نظامِ عدل کتنا آسان ہو جائے گا۔یہ مدعی اور مدعا علیہ تو ایک طرف رہا تھا' یہ مجرم جو شہادت پیش کر رہا ہے یا شاہد یا گواہ بن کر آ رہا ہے' یہ اپنی طرف سے نہیں بن رہا' ''اپنی طرف'' کے معنی اپنے ''حق میں'' کے ہیں۔یہ لَانْفُسِكُمْ نہیں ہے' یہ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ہے یعنی خواہ وہ شہادت تمہاری ذات کے خلاف بھی کیوں نہ جائے' تمہارے اپنے خلاف بھی کیوں نہ جائے' تم آ کر خدا کی طرف سے سچی شہادت دو۔یہ تو ہے جہاں خود وہ مجرم ہے اور جہاں صرف گواہ کی حیثیت سے پیش آنا ہے۔

آگے کہا ہے کہ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (4:135) تمہارے ماں باپ کے خلاف کیوں نہ جائے' تمہارے عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔تو یہ ہو گئی خاندانی اعزہ داری کی محبت۔ہمارے اس نظامِ عدل میں بھی جن کو Interested Witnesses (مفاد پسند گواہان) کہتے ہیں' وہ یہی ہوتے ہیں کہ صاحب! یہ تو اس کا چچا ہے' یہ تو اس کا ماموں ہے' ان کی شہادت زیادہ ثقہ نہیں قرار دی جاتی۔وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ ماں باپ یا اعزہ ہی کے خلاف کیوں نہ ہو مگر سچی بات کہو' سچی شہادت دو۔اب اگلی بات چلی' معاشرہ میں آئے' محلّہ کا چوہدری دولتمند آدمی ہے' اس کے خلاف شہادت کون دے' مقابلے میں غریب ہے' غریب کے حق میں شہادت کون دے؟ کہ جی مصیبت میں پھنسنا ہے۔کہا ہے کہ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا (4:135) وہ دولتمند ہے یا غریب ہے' اس کا سوال ہی نہیں ہے۔تم اس طرح کی شہادت دے کر کسی کے طرف دار بننا چاہتے ہو' کسی کے حق کی نگہداشت کرنا چاہتے ہو۔تو سنو! فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (4:135) تم سے زیادہ خدا کو ان کے حقوق کا پتہ ہے' وہ قریب تر ہے' وہ جانتا ہے کہ کس کا حق ایسا ہے جس کو محفوظ کرنا چاہیے' جناب! اس کے متعلق اس طرح سے نہ سر کھپایئے جو صاف صاف سچی سچی بات ہے وہ کہہ دیجیے۔ہم جانتے ہیں کہ حق پہ کون ہے اور کس کا حق زیادہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔تم سے زیادہ ہم ان کے قریب ہیں۔پھر اس

شہادت میں کہا ہے کہ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى (4:135) تمہارے اپنے جذبات بھی تمہیں کسی طرف نہ لے جائیں' ان کا بھی اتباع نہ کرو۔ دیکھ رہے ہیں شہادت کے متعلق' قرآن کریم کہاں تک احتیاط برت رہا ہے۔ کہتا ہے کہ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (4:135) جذبات کی بات درمیان میں آ گئی تو عدل نہیں کر سکو گے۔

## عدل کا لغوی مفہوم

عدل تو آپ کو پتہ ہے کہ عرب اس لفظ کو کس وقت بولتے تھے! یہ جو خچروں یا گدھوں کے دونوں طرف بوریاں لاد دیتے ہیں۔ کبھی آپ نے اس قسم کا گدھا بھی دیکھا ہوگا کہ اس پہ بوجھ اس قسم کا لدا ہوا ہو اور وہ بوری ایک طرف ذرا سی جھکی ہوئی ہو تو وہ چلنے والا گدھا کس مصیبت میں ہوتا ہے۔ اگر وہ دس پندرہ قدم اس طرح سے چلتا جائے تو اس کے بعد پھر ''اوجھٹ تھلے ہوندی اے' کھوتا اتے ہوندا ہیگا' تے دانے سڑک تے وکھرے ہوندے ہیگے'' (وہ بوری فی الفور نیچے گری پڑی ہوتی ہے' گدھا اس کے اوپر ہوتا ہے اور دانے سڑک پہ بکھرے پڑے ہوتے ہیں)۔ ذرا سے بوجھ میں' اِدھر اور اُدھر کے وزن میں کسی ایک طرف سے کمی ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ ایسا مساوی وزن ہو کہ ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہ ہو تو بڑی آسانی سے وہ چلا جا رہا ہوتا ہے۔ دونوں اطراف بوریوں کی کیفیت کہ اس میں ذرا وزن کا فرق نہ ہو' اسے عرب عدل کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ذرا بھی اپنے جذبات کی طرف جھک گئے تو ادھر یہ جو بوری ہے' یہ جھک جائے گی' پھر اس بوجھ کو لے کر چلا نہیں جائے گا۔ یہ بھی نہ کرو۔ عدالت میں آ گئے ہو' بات تو پھر سچی کہنی ہے لیکن پھر بھی اندر سے تمہیں کوئی چیز گرفت کر رہی ہے' تو پھر وہ کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ کچھ ذومعنی سی بات کی۔

## ذومعنی بات تو پیاز کے چھلکے کی طرح ہوتی ہے' نیچے سے کچھ بھی نہیں نکلتا

دورِ حاضرہ کی تہذیب میں ایک چیز ہے جسے Diplomatic Language (ڈپلومیسی کی زبان) کہتے ہیں' اس میں بڑی کاریگری سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پہ یورپین نیشن اور ان میں سے خاص طور پہ انگریز Diplomatic Language (ڈپلومیسی کی زبان) کے ماسٹر ہیں' گھنٹوں ان سے بات کرتے چلے جائیے' کوئی ایسا سوال نہیں' جس کا جواب نہ دیں' کوئی ایسا جواب نہیں جس میں آپ پکڑ سکیں۔ سب کچھ کر کے اٹھ جائیں گے۔ پیاز کی طرح چھلکے اتارتے اتارتے چلے جائیے' نیچے سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔ وہی الفاظ جہاں جی چاہے' جن معنوں میں جی چاہے' استعمال کر لیتے ہیں۔ ان کے کسی Statement (بیان) کو' کسی ریزولیشن کو' کہیں چیلنج کر کے دیکھیے اور ملاحظہ کیجیے اس کی Interpretation (توضیح وتشریح) یہ کیا دیتے ہیں۔ آپ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے Diplomatic Language (ڈپلومیسی کی زبان)۔ یہ ہے اِنْ تَلْوٗا (4:135) نہ کوئی پیچدار بات کرو' نہ ہی اٹکل

بچو بات بناؤ۔ کہا ہے کہ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا (33:70) بات کروتو ایسی سیدھی' جیسے وزیر خان کی مسجد کی پچھلی دیوار ہے' نیچے سے اوپر تک مجال ہے جو آپ کو ایک سینٹی میٹر کا بھی فرق نظر آ جائے۔ اور یہ دوسری زبان Diplomatic Language (ڈپلومیسی کی زبان) ہے' قطعاً یہ بات نہیں کرو۔ صاف واضح غیر مبہم الفاظ میں بات کرو' ذومعنی الفاظ بھی Use (استعمال) نہیں کرنا۔ اور آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ''سمن ای نہ ایشو ہون دیوو'' (سمن ہی نہ جاری ہونے دو)۔ چلو بھئی! بات ہوئی پوری۔ مدعی کی طرف سے بھی راضی' مدعا علیہ کی طرف سے بھی خوش اور کہتے یہ سنا گیا ہے کہ جی! اپنے ضمیر کی طرف سے بھی مطمئن تھے' خلافِ ضمیر تو کچھ نہیں کہا۔ گویا! یہ خلافِ ضمیر کچھ نہیں ہو رہا۔

## سچی شہادت کے لیے بغیر کسی سمن کے خود حاضر ہو جاؤ

آگے کہا ہے کہ اَوۡ تُعۡرِضُوۡا (4:135) شہادت دینے سے اعراض بھی نہ برتو۔ تمہیں تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارے پاس سمن آتا ہے' جس بات کے متعلق پتہ ہے' خود جا کر تیار ہو کر وہاں کھڑے ہو جاؤ۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے' کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (4:135) یہ جو واقعہ ہوا ہے اس کی سچی سچی رپورٹ تو پہلے پہنچ چکی ہے۔ وہ جو اس نے مقرر کر رکھے ہیں' اپنے ہاں کے سی آئی ڈی والے' وہ تو ہر واقعہ کی رپورٹ وہاں پہنچا دیتے ہیں لہٰذا اس سے کیا فائدہ ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ یہ غلط بیانی' ذومعنی سی بات' اعراض برتنا' جذبات کے پیچھے چلنا' کچھ نہیں ہوتا۔ آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی' مفہوم بتا دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں یہ بات آ رہی ہے کہ صاحب! یہ ناممکن ہے' یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہے نا یہی بات جو جی میں آ رہی ہے کہ کون ہے جو اور تو چھوڑ دیجیے' خواہ اپنے خلاف جا کر شہادت دے کر پھانسی پہ چڑھ جائے۔

## سچی شہادت سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ کرتی ہے

صاحب! کیا باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ناممکن ہے؟ یہ وہی ہیں جو اس چیز کے دعویدار ہیں کہ ہمارا ایمان ہے اس کتاب پر' خدا پر' رسول پر' قیامت پر' آخرت پر۔ ہم وہی لوگ ہیں پھر کیوں اسے ناممکن کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! میں گزارش کرونگا کہ قرآنِ کریم کے اس ربط کو دیکھیے اور سر دھنیے۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیوں ہمارے ذہنوں میں یہ آ رہا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ چلیے! ایک ہندو جو قرآنِ کریم کو قرآن نہیں مانتا' وہ یہ کہہ دے کہ صاحب! یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ دے' یہ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ کیوں یہ کچھ ہو رہا ہے؟ کہا ہے کہ یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ تم اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہو' تمہارا اس پر یمان نہیں ہے۔ اگر یہ سمجھنا ہے کہ یہ ممکن ہے تو کہا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ

(4:136) اے اپنے آپ کو مسلمان کہنے والو! پہلے ایمان لاؤ۔عزیزانِ من! عظیم آیت ہے۔ایمان لاؤ' ممکن ہو جائے گا جو کچھ کہہ رہے ہیں۔اس لیے یہ بے یقینی پیدا ہو رہی ہے' یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان نہیں ہے۔یہ غیر مسلموں سے نہیں کہا جارہا۔ان آیات پہ کبھی غور کیجیے گا۔عزیزانِ من! تلاوت ثواب کے لیے نہ کر لیجئے' ان مقامات پہ کھڑے ہو کر سوچیے کہ قرآنِ حکیم کہہ کیا رہا ہے۔

## ہمارے ہاں مسلمان اور کافر کی پہچان کا معیار اور قرآنِ حکیم کی وضاحت

ہم نے تو مسلمان اور کافر کی پہچان یہ بنا رکھی ہے کہ مسلمان کون؟ کہ جی! مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے' کافر وہ جو مسلمان کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے۔قرآنِ حمید کی رو سے پیدا ہونے والا بچہ نہ مسلمان ہوتا ہے' نہ کافر ہوتا ہے' اسے اس کے بعد زندگی میں مسلمان ہونا پڑتا ہے' کافر بننا پڑتا ہے۔یہ وجہ ہے کہ قرآنِ حمید نے کفر اور ایمان کے لیے فعل کے صیغے استعمال کیے ہیں مثلاً اِنَّ الَّـذِیْنَ اٰمَنُوْا' اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔آپ نے کبھی غور کیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ تو ایسی چیز ہے جو کرنی پڑتی ہے۔وہ کچھ پیدائشی چیز نہیں ہوتی' وہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔جب وہ کچھ کرتا ہے تو پھر وہ ویسا ہوتا ہے۔کسی کو کوئی مارتا ہے تو اسے مارنے والا کہتے ہیں' کسی کو کچھ دیتا ہے تو اسے دینے والا کہتے ہیں' جو دیتا ہے یہ Verb (فعل) ہوتا ہے' پھر اس سے وہ دینے والا کہلاتا ہے۔وہ اِنَّ الَّـذِیْـنَ اٰمَنُوْا کہتا ہے' و ان یؤمن کہتا ہے۔جو ایمان لاتا ہے اسے مومن کہتے ہیں۔اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا جو کفر کرتا ہے' فھو کٰفرون اسے کافر کہتے ہیں۔یہ دو نظریاتِ حیات ہیں۔یہ دو Attitude of Lines (رویوں کے خطوط) ہیں' یہ کچھ مثبت کام ہیں۔ایک طرزِ زندگی' ایک نظریۂ حیات' عقل و فکر کی رو سے' علم و بصیرت کی بنیاد پر' اختیار و ارادے سے' سوچ سمجھ کر' جب اختیار کیا جاتا ہے تو اسے ایمان کہتے ہیں۔جو ایسا کرنے والا ہے اسے مومن کہتے ہیں۔اس کے برعکس ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ زندگی اسی زندگی کا نام ہے' طبعی حیات ہے' اس سے آگے کچھ نہیں' نہ وحی کی ضرورت' نہ مستقل اقدار کی ضرورت تو اس طرح سے زندگی کے متعلق جو یہ Attitude (روّیہ) اختیار کرتا ہے' اسے کافر کہتے ہیں' ایسا کرنے کو کفر کہتے ہیں۔کفر کو تو آپ چھوڑیئے مومن کی طرف آجایئے۔ہم جو مسلمان ہیں' خدا لگتی کہیے کہ کسی نے ہم میں سے آج تک اس طرح ایمان اختیار کیا ہے۔

## مسلمان کا لفظ تو قرآنِ حکیم میں ہی نہیں ہے

یہ ٹھیک ہے کہ قومی حیثیت سے تو ہم سب مسلمان ہیں۔آپ یہ دیکھیے کہ یہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خطاب کیا جارہا ہے۔ اٰمَـنُـوْا اس لیے کہا ہے کہ مسلمان کا لفظ تو قرآنِ حکیم میں ہے نہیں۔اس انداز سے ہم پیدائشی ہیں' عربوں کے کچھ قبائل تھے۔جب یہ

مملکت وجود میں آئی' ان کی عظمت اور شوکت اور حشمت اور شان اور قوت اور جبروت کو دیکھ کر کچھ قبائل تھے کہ جنہوں نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر سیدھی سی بات ہے کہ انہوں نے اَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کہہ دیا ہوگا اور اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مومن کہنا شروع کیا۔ قرآن حکیم میں یہ چیز ہے کہ ان سے کہو کہ تم اپنے آپ کو مومن نہ کہو' یہ کہو کہ اَسۡلَمۡنَا (49:14) ہم نے اپنے آپ کو اس مملکت کے سامنے سرنڈر کر دیا ہے۔ کیوں نہ مومن کہو؟ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ (49:14) ایمان ابھی بھی تمہارے دل کے اندر نہیں اترا۔ وہ تو انہیں بھی مومن کہنے سے روکتا ہے جن کے قلب کی گہرائیوں میں ابھی ایمان نہیں اترا' انہوں نے کچھ تو کیا ہے لیکن ابھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ انہوں نے بورنگ شروع کی ہے لیکن وہ بورنگ پانی کی سطح تک نہیں آئی ''اوہنوں اجے نلکا نہ کہو' (اسے ابھی نلکا نہ کہو)۔ ٹھیک ہے یہ کہو کہ ہم بور کر رہے ہیں۔

## مومن کہلانے کے لیے پہلے دلی طور پر ایمان لانا ضروری ہے

یہ تو وہ تھے جو بور کر رہے تھے ''اسی جیہڑے ایتھے بیٹھے ہوئے ہیگے آں'' (ہم جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں) ' ہم نے اتنا بھی نہیں کیا لیکن کہلاتے مسلمان ہیں۔ اور اگر یہ مسلمان کی ٹرم نہ ہمارے ہاں ہوتو وہی يَـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا کہا ہے کہ اے وہ ''جیہڑے ایویں ای بدو بدی مومن بنڑے پھردے ہیگے او' (اے وہ جو خواہ مخواہ مسلمان بنے پھرتے ہیں)۔ يَـاَيُّهَا الَّـذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اے وہ جو بزعم خویش اپنے آپ کو فریب میں رکھے ہوئے ہو یا بہر حال مردم شماری کے رجسٹر میں قومی حیثیت سے لکھتے ہو یہ کہتے ہو' ووٹ کے لیے یہ کہہ رہے ہو۔ یہ کہا کہ يَـاَيُّهَا الَّـذِيۡنَ اٰمَنُوۡا یہ جو تم نے سمجھا ہے کہ جو ہم نے کہا ہے' یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ممکن ہو جائے گا۔ اس کے لیے کیا کرو؟ کہا ہے کہ اٰمِنُوۡا بِـاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ الۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ (4:136) ایمان لاؤ: خدا پہ ایمان لاؤ' رسول پہ ایمان لاؤ' اس کتاب پر جو ہم نے اس پر نازل کی ہے ایمان لے آؤ گے تو یہ ناممکن ممکن ہو جائے گا۔ یہ ممکن تھا ان کے لیے جو ایمان لائے تھے' تاریخ میں یہ واقعات ہمیں ملتے ہیں۔

## ایمان لانے والوں کے متعلق ایک تاریخی واقعہ

صحرا کی تنہائیوں میں ایک جرم ہو جاتا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے اور وہاں سے بلبلاتی ہوئی وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آ جاتی ہے کہ حضور ﷺ! مجھے اس جرم کی سزا دیجیے' مجھ سے یہ لغزش ہوگئی۔ یہ ہے وَ لَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ (4:135) اپنے خلاف شہادت دینے کے لیے تیار۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ یہ کوئی مافوق الفطرت چیز نہیں تھی' فرشتے نہیں تھے' یہ انسان ہی تھے' وہ ساری کمزوریاں جو ہم میں بھی ہیں' ایک ہی چیز تھی جو ان میں تھی کہ وہ ایمان لائے تھے۔ ایمان اس بات پہ تھا کہ جب کوئی نہیں دیکھتا تو پھر بھی ایک دیکھتا

ہے اور جب دنیا کی کسی عدالت سے سزا نہیں ملتی' پھر بھی ایک عدالت ہے جہاں سے اس کی سزا ملنی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہاں جا کر سزا ملے' عدالت ماتحت سے ہی سزا کیوں نہ لے لی جائے کہ اپیل کی گنجائش تو رہے گی۔ خود آ کر اس کا اقرار کیا جاتا ہے۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ آج ممکن ہے جبکہ ہم نے یہاں سو فیصد کہہ دیا تھا کہ ممکن نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آج ستر کروڑ❶ کی مسلمان کی آبادی ہے' اس میں جا کر حساب تو کرو اور پوچھو کہ کیا یہ ممکن ہے؟ اگر کسی خطۂ ارض میں بھی یہ چیز ممکن ہوتی' عزیزانِ من! تو ہماری حالت یہ نہ ہوتی' آج انسانیت کی حالت بھی یہ نہ ہوتی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے آپ کو مومن کہتے ہو۔ قرآن کریم میں تو ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ ........... (4:136) اے جماعتِ مومنین! تم ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو۔ وہ بنیادی اصول ہیں اللہ پر ایمان............

## ایمان لانے والے اپنی شہادت تو خود آپ بن جاتے ہیں

عزیزانِ من! یہ جو ہم ہیں کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے اور ہم نے اپنے آپ کو مسلمان یا قرآنِ کریم کی اصطلاح میں مومن سمجھ لیا ہے' کہا ہے کہ ان کو جو واقعی مومن تھے دھوکا دے رہے ہو' تم خدا کو دھوکا دے رہے ہو۔ سنو! تم کسی کو دھوکا نہیں دے رہے' تم دھوکا دے رہے ہو اپنے آپ کو۔ اور دھوکا تو کھل جاتا ہے۔ ایمان لانے والا تو اس پہ ایمان لاتا ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کہ جا کر سچی شہادت دو' خود وہاں جا کر کہ خدا کی طرف سے گواہ بن جاؤ' انتظار نہ کرو کہ تمہیں سمن آئے گا تو عدالت میں جاؤ گے' اپنے خلاف جا کر شہادت دیدو کہ مجھ سے یہ جرم ہو گیا ہے' سزا چاہتا ہوں۔ یہ ممکن ہو جائے گا اگر تم ایمان لے آؤ گے۔ یہ ناممکن اس لیے ہے کہ ایمان نہیں ہے' آپ نے اپنا نام مسلمان رکھ لیا ہے' نام کا سوال ہی نہیں ہے' جو مرضی نام رکھ لو۔ آپ نے غور فرمایا کہ کہاں یہ آیت آئی ہے۔ یہ تو بڑی عظیم چیزیں ہیں جو قرآن حمید نے کہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہیں۔

## انسانی سوچ کے لیے انسانی خودفریبی کی ایک بین مثال انسانی فطرت کا تصور ہے

جب بھی کسی سے کہا جائے کہ صاحب! اس کا نظام یہ ہے کہ ایک شخص جان مار کر محنت کرے' اس میں سے کم از کم اپنے لیے لے' زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لیے دیدے تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ یا اللہ! جس قسم کے اپنے جذبات ہیں' اپنے مفادات ہیں' اپنی آرزوئیں اور خواہشات ہیں' یہ اسے انسانی فطرت کہہ رہے ہیں۔ یہ جتنے لوگ ہیں جنہوں نے اتنے ایثار کیے' دوسروں کے لیے جانیں تک دیدیں' تو گویا انہوں نے' سب نے' غیر فطرتی عمل کیے' سب کچھ فطرتِ انسانی کے خلاف کیا اور

---

❶ یاد رہے یہ بات جنوری 1971ء کی 10 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج اس سے کہیں زیادہ ہے۔

انہیں یہ سب سے مقدس ہستیاں قرار دیتے ہیں۔ عجیب قسم کی خود فریبی ہے یہ' کرنا تو خود نہیں چاہتے' کہتے ہیں کہ یہ خلافِ فطرت ہے صاحب! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں آدمی یہ کرے' سارا کچھ محنت کر کے اپنے لیے کمائے' اس کے بعد دوسرے کے لیے جا کر دیدے؟ یہ خلاف فطرت ہے۔ اچھا جی!! انسان کی یہ فطرت ہی نہیں۔ فطرت یہ ہے کہ سمیٹتا چلا جائے اور اس کے لیے یہ ہے کہ جناب! اسلام دین فطرت ہے یعنی وہ یہ سکھاتا ہے کہ سمیٹے جاؤ۔ اور یہیں تک نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا** (30:30) خدا نے اپنی فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے۔ ''او تہاڈا ستیاناس'' (تمہارا ستیاناس ہو)۔ یعنی اپنے حیوانی جذبے کی تسکین کا نام پہلے تو فطرت ہو گیا' پھر اس دین کے متعلق دینِ فطرت ہوا پھر اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو یہ جس فطرت پہ ہم ہیں یہ خدا کی طرف ہے۔ ''او وی چار سووی کردا ہیگا (معاذ اللہ)' فٹے منہ تہاڈا'' (وہ بھی جعل سازی کرتا ہے' معاذ اللہ۔ تُف! لعنت تم پر)۔

## شروع سے آج تک لکھی گئی ہماری تفسیروں کا بیان

عزیزانِ من! دیکھیے کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اور پھر آپ کے ہاں ہزار برس سے تماشا یہ ہے۔ آپ سب سے پہلی تفسیر اٹھا کر دیکھیے' آج تک چلے آئیے' آپ دیکھیں گے گویا یہ چیز کبھی قابلِ اعتراض نظر نہیں آئے گی کہ اسلام دین فطرت ہے اور خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا گیا ہے۔ آپ مسلمات کے طور پہ دیکھیں گے کہ یہ لفظ دہرائے جاتے ہیں۔ کبھی کوئی غور ہی نہیں کرتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ چیز کہ جا کر اپنے خلاف شہادت دیدو' ان کے نزدیک تو خلافِ فطرت ہے۔ تو کیا قرآنِ حکیم سارا خلاف فطرت ہی آپ کو تعلیم دے رہا ہے؟ جان مارو اور دوسرے کو دیدو۔ جان کی حفاظت کو سب سے بڑا فطری تقاضا قرار دیا جاتا ہے اور وہ اس کے لیے جان دینے والے کے متعلق کہتا ہے کہ اسے مردہ نہ کہو' زندہ تو یہ ہے' جسے تمہاری فطرت کا تقاضا مردہ کہہ رہا ہے۔

فطرت مجبور کی ہوتی ہے' عزیزانِ من! فطرت کہتے ہیں اس روش کو جو خدا کی طرف سے کسی کے لیے مقرر کی ہے اور وہ اس کو بدلنے پر قطعاً اختیار نہیں رکھتا۔ پانی کی فطرت ہے کہ نشیب کی طرف بہے' آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچائے' سورج کی فطرت ہے کہ وہ اپنے وقت پر نکلے اور روشنی اور حرارت دے۔ یہ اس کے خلاف کر نہیں سکتے۔ اسے فطرت کہتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہیں آپ (قوانینِ فطرت) Natural Laws کہتے ہیں' یہ اس کا ترجمہ ہے۔

## انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی بلکہ اس کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے

جو صاحب اختیار ہے اس کی فطرت نہیں ہوتی' اس کا فیصلہ ہوتا ہے' اس کا انتخاب ہوتا ہے' اس کا چوائس ہوتا ہے۔ اگر اسلام دین فطرت ہے تو اشیائے کائنات کے لیے ہے۔ کہا ہے کہ **لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:83) ارض وسما کے اندر جو کچھ

ہے اس کے سامنے طوعاً وکرہاً جھکے ہوئے ہیں۔ انسان کے متعلق کہا ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40)۔ جسے یہ کہا ہو کہ جیسا تمہارا جی چاہے کرو تو کیا اسکی فطرت ہوتی ہے؟ اس کی فطرت نہیں' اس نے ہر قدم پہ خود فیصلہ کرنا ہے اور وہ فیصلہ یہ کر سکتا ہے کہ ایسا جرم جس کی کوئی شہادت دینے کے لیے موجود نہیں ہے اور اس کی سزا موت ہے' وہ جا کر اقرار کرے کہ میں نے یہ جرم کر دیا ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ اے وہ جو تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ قرآن کریم اس قسم کا تقاضا کر رہا ہے اور یہ تو ممکن نہیں ہے یہ تو انسانی فطرت کے خلاف ہے' قرآن کریم نے کہا کہ یہ فطرت کے خلاف نہیں' تجھے یہ اس لیے ناممکن نظر آتا ہے کہ ایمان نہیں۔ اس لیے یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ الۡکِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰہِ (4:136)۔ دیکھیے یہاں بھی Verb (فعل) ہے جو اس کے خلاف روش اختیار کرے' وہ Positively (مثبت طور پر) یہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ کہتا ہے' ایمان تو کسی حقیقت کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دل اور دماغ کی پوری رضامندی سے تسلیم کرنے کا نام ہے اور وہ ایمان اس وقت ایمان کہلاتا ہے جب اس کا مظاہرہ انسان کی سیرت اور کردار اور روزمرہ کے واقعات سے ہو۔ لہٰذا ارشاد یہ ہے کہ ظہور نتائج کے وقت اس شخص کا ایمان کسی کام نہیں آئے گا جس نے اپنے ایمان کے ساتھ اعمال کو شامل نہیں کیا ہوگا۔ اس کا ایمان کسی کام نہیں آئے گا جس نے اس ایمان کے مطابق کام نہیں کیے ہونگے۔ کام آنے والی چیز تو اصل میں اعمال ہیں۔

## لفظ ایمان اور عمل کی حقیقت اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کی ایک محسوس مثال

ایمان کیا ہے؟ یہ اس چیز پہ یقین ہے کہ (مثلاً) اگر نومبر کے مہینے میں کھیت کو صحیح طور پر تیار کیا جائے' اس میں اس قسم کا بیج ڈالا جائے' اس طرح سے قانونِ زراعت کے مطابق کھیتی باڑی کی جائے' تو اس سے اتنا گیہوں پیدا ہو جائے گا۔ یہ جو علم ہے' یہ جو قانونِ زراعت کے متعلق معلومات ہیں' یہ جو ان معلومات پر یقین ہے کہ ایسا ہو جائے گا' تو یہ ایمان ہے۔ اور اگر یہ ساری معلومات ہوں اور آپ کو یقین بھی ہو کہ ایسا ضرور ہو جائے گا صاحب! میرا اس پر ایمان ہے اور آپ باغ میں بیٹھے رہیں' حقہ پیتے رہیں' نہ کھیت کو تیار کریں اور نہ ہی قانونِ زراعت کے مطابق صحیح قسم کا بیج ڈالیں تو فصل نہیں ملے گی۔ آپ نے صرف یہ سوچا کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس پر میرا ایمان ہے تو سنو! اس پر ایمان کسی کام نہیں آئے گا' فصل کاٹنے کے وقت جس نے یہ بوئی نہیں ہوگی اس کا ایمان کسی کام نہیں آئے گا۔ یہ جتنے آپ کے ہاں یہ بڑے بڑے ڈپٹی ڈائریکٹر یا ڈائریکٹر محکمہ زراعت کے ہوتے ہیں' یہ قانونِ زراعت کے قاری ہوتے ہیں ''گھر ایناں دے سٹائیں اگدا'' (ان کے گھر میں ایک بالیں تک نہیں اگتی)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اس چیز کا یقین ہو کہ یہ قابلِ عمل ہے اور یہ نتیجہ پیدا کرے گی اور یہ ہو سکتا ہے۔

برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ اسے کہ یہ ہوسکتا ہے۔ یہ ہے ایمان۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ پھر اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ ہے **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** سارے قرآنِ حکیم میں یہ اکٹھی چیز آتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ حمید میں یہ ہے کہ اس کا ایمان کچھ فائدہ نہیں دے گا جس نے اس ایمان کے مطابق کام نہیں کیا ہوگا۔ تو جہاں یہ **مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ** (4:136) ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو زبان سے یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! میں خدا کو نہیں مانتا' میں اس کو نہیں مانتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا عمل اس کی شہادت دے کہ میں یہ چیز نہیں کرتا' یہ کفر ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا** (4:136) (جس کا عمل یہ شہادت دے کہ میں یہ چیز نہیں کرتا' وہ) منزلِ مقصود سے بہت دور چلا گیا۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ جسے ہم نے کہا تھا کہ ناممکن ہے' وہ کس طرح سے ممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایمان کے لیے یہ بھی شرط ہے اسی لیے **قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا** (41:30) کہا کہ جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا' اللہ ہے' وہ پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

## پہلی شرط ایمان' دوسری اس پر عمل اور پھر عملِ پیہم کی کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پختہ شعور اور بلند ہمتی

عزیزانِ من! یہ ہے کہ یقین پیدا کر لیا' ٹھیک ہے' یہ ہوسکتا ہے اور اس کے بعد پھر اس پر جم کر کھڑے ہوگئے۔ یہ ہے **قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا** (41:30)۔ یہ نہیں ہے کہ آج تو وہ فصل بو دی اور دو مہینے کے بعد اس فصل میں گیہوں کے پودے اتنے اتنے اونچے ہوگئے اور اس وقت یہ ہوا کہ پتہ نہیں صاحب! میں یہ خواہ مخواہ محنت کر رہا ہوں' یہ فصل پکے نہ پکے یا اگے نہ اگے۔ کیا کرتا پھر وہ؟ وہ کاٹ کے بیلوں کو ڈال دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگلی فصل میں پھر خیال آیا کہ نہیں صاحب! یہ کچھ پیدا ہوسکتا ہے پھر فصل بو دے۔ پھر درمیان میں تذبذب آ گیا کہ پتہ نہیں یہ ہو یا نہ ہو۔ تو آپ سوچیے کہ ایسے انسان کی کیا کیفیت ہوگی۔ وہ جو ہر دوسرے دن مریض کا علاج کرتے ہیں یہ کیفیت تذبذب کی ہے۔ ایک وقت میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایمان لایا ہے' دوسرے وقت میں اس سے انکار کر رہا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا** (4:137) جس کی یہ کیفیت ہو کہ یہ ٹھیک ہے بھئی! ٹھیک ہے یعنی کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا علاج ٹھیک ہے' میں سمجھ گیا ہوں' پیوں گا بھی۔ اس کے بعد یہ ہو کہ پتہ نہیں صاحب! آرام آئے یا نہ آئے' چل بھئی! کام ختم ہوا۔ پھر کیا یہ کہ ''اے نتھو کولوں جا کے دم کرا آ او بڑا چنگا ہوندا ہیگا' فیر نئیں ہٹی تے حکیم صاحب کول چلے گئے'' (نتھو سے دم درود کرا آؤ' وہ بڑا اچھا ہوتا ہے۔ پھر نہیں آرام آیا تو پھر حکیم صاحب کے پاس چلے گئے)۔ یہ ہے **اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا** (4:137)۔ ہم میں سے جو ذرا نیکوکاری کی زندگی بسر

کرتے ہیں' ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے اور جب پوچھو تو کہتے ہیں کہ صاحب! سارے قرآنِ کریم پہ کس نے عمل کیا ہے "جتنے جوگا کوئی ہیگا کرلوے' جے فائدہ نظر آوے تے قرآن شریف دے مطابق' نہ آئے تے وی بندہ بشر ہے"(جس لائق کوئی ہے وہ اس کے مطابق کرلے۔اگر فائدہ نظر آئے تو قرآن شریف کے مطابق' اگر نہیں ہے تو بھی بندہ بشر ہے)۔

## آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مثل کوئی فارمولا جزوی طور پر صحیح نتائج پیدا نہیں کرتا اور منافقت بھی درکِ اسفل میں

جیسا کہ میں مثال میں کہا کرتا ہوں' عزیزانِ من! فارمولے کو تو پورے کا پورا لینا پڑے گا' اس میں اگر ایک جزو بھی رہ گیا یا ایک جزو کی جگہ دوسرا جزو آ گیا تو وہ کبھی نتیجہ نہیں پیدا کرتا۔ یہاں تو ان کے اجزا بھی وہ ہوں اوزان بھی وہی ہوں' نسبتیں بھی وہی ہوں حتیٰ کہ بعض فارمولے میں تو یہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے بعد یہ چیز ملایئے' اس کے بعد وہ چیز ملایئے' اگر وہ ذرا پہلے ملا دی جائے' پھر بھی وہ نتیجہ نہیں پیدا کرتا۔ یہ تو ایسی چیز ہے۔لہٰذا یہ کیفیت ہے کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا (4:137) کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ایمان نہیں ہے۔ کہا ہے کہ ان کے لیے سامانِ حفاظت مل ہی نہیں سکتا۔ یہ اس قسم کے کوئی کریڈٹ بیلنس والی بات نہیں ہے کہ آج آپ نے بیس روپے جمع کرا دیئے' پندرہ نکال لیے' پھر دس جمع کرا دیئے بیس نکال لیے' دونوں سائیڈ میں آپ کے ہاں یہ ہوتا ہے' ایمان کی یہ کیفیت نہیں ہے۔انہیں سامانِ حفاظت نہیں مل سکتا۔کہا ہے کہ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ وَ لَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا (4:137) منزل مقصود کی طرف ان کی راہنمائی نہیں ہو سکتی' وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔تھوڑا سا راستہ اس طرف کو چل دیا' پھر بائیں ہاتھ کو چل دیئے وہاں سے چلا' پھر کچھ تھوڑا سا دائیں ہاتھ کو ہو لیے' چلتے رہیے۔پھر سفر اور آوارہ گردی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ سارا دن دونوں چلتے رہتے ہیں' شام کو ایک شخص منزل مقصود پہ ہوتا ہے' دوسرا جو ہے سوائے اس کے کہ تکان اس کے حصے میں آئے' اس کو کچھ نہیں ملتا۔ان کے متعلق کہا ہے کہ بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِيۡنَ (4:138) یہ ہیں منافقین' یہ کسی ایک چیز پہ ٹِک کر نہیں رہتے۔استقامت سے ٹِک کر نہیں رہے تو عزیزانِ من! کفر پر بھی آدمی اس طرح سے رہے' پیش پا افتادہ مفاد ہی سہی' مفاد عاجلہ ہی سہی' طبعی مفاد زندگی ہی سہی' کچھ حاصل تو ہوتا ہے یعنی اس کو ثواب الدنیا تو مل جاتا ہے۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ایمان سے یہ دونوں حاصل ہونگے' کفر سے اتنا حاصل ہوگا۔اور ان میں جو نہ ایمان ہے' نہ کفر ہے' کسی میں بھی پختہ نہیں ہے' وہ منافق ہے' اور اس کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔اسی لیے ابھی آگے آتا ہے کہ درکِ اسفل کے جہنم میں منافق ہوگا۔کہا ہے کہ بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِيۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمَا (4:138) منافقین کو بڑا دردناک عذاب ہوگا' ان کی اس روش کی سزا بڑی دردناک ہوگی۔اب دیکھیے یہ منافقت کا ایک ایسا گوشہ ہے جس کی طرف عام طور پہ کبھی دھیان نہیں جاتا۔

عزیزانِ من! اس کی مثال کچھ یوں سمجھیے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ آپ ہوں تو یہاں کے رہنے والے اور ساز باز آپ کی ہندوستان کے رہنے والوں سے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنی خطرناک چیز ہے۔ یہاں اس چیز پر بڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہ جن کے متعلق پچھلے سال میں چھ مہینے میں روز ایک جلوس نکلتا تھا کہ یہ غیر ممالک سے امداد حاصل کرتے ہیں' ان کے جو تعلقات ہیں وہ باہر کی قوموں سے ہیں۔ باہر کی قوموں سے مراد جو دشمن قومیں ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات ہیں' یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:139) جماعت مؤمنین کو چھوڑ کر' یہ جو اس کے خلاف چلنے والے ہیں' کفر کی روش اختیار کرنے والے ہیں' یہ انہیں اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔ فقط کفر کی روش اختیار کرنا ہی نہیں بلکہ وہ جو روش اختیار کیے ہوئے ہیں' یہ ان کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔ ''اولیاء'' کا لفظ آیا ہے' اس میں سرپرستی بھی آ جاتی ہے۔ یہ بھی جرمِ عظیم ہے۔

## عزت کے حصول کے لیے انسان کے عمل دخل کی نوعیت اور غیر مسلموں سے تعلقات

یہ دوستی' یہ ان کے ساتھ Alliance (اتحاد) کے تعلقات سے کچھ تو جذبات ان کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں یا کم از کم کچھ مفاد ہی ان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ معاشرے میں جہاں کہیں یہ لوگ اکٹھے ملے جلے ہوئے ہوں اس میں ان لوگوں کے ساتھ جو ساز باز ہے تو پھر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ کتنی خطرناک چیز ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہے؟ کہا ہے کہ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ (4:139)۔ یہ عزت کا لفظ ہمارے ہاں عام عام طور پہ Respect کے معنی میں لیتے ہیں۔ دراصل اس میں' قوت' اقتدار' غلبہ' یہ کچھ بھی ہوتا ہے' اس میں Respect (تعظیم) بھی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ دشمن کے ساتھ دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں' ساز باز رکھتے ہیں تو کیا یہ ان کے ہاں عزت تلاش کرتے پھرتے ہیں؟ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (4:139) جبکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو صحیح قوت غلبہ اقتدار Respect (تعظیم) احترام عزت ہے وہ صرف قوانینِ خداوندی کے ساتھ وابستہ رہنے میں ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) سب سے زیادہ واجب الاحترام وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ یہ چیز کئی دفعہ اس سے پہلے بھی آ چکی ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی مملکت کے' امورِ مملکت میں' غیر مسلم شریک ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک Nation (قوم) نہیں بن سکتے۔ قرآنِ حکیم تو ان کے ساتھ جو دوستانہ تعلقات ہیں' اس کی بھی اجازت نہیں دیتا چہ جائیکہ ان کو اس قوم کے اجزا تصور کیا جائے۔ یہ آیتیں پہلے سورۃ آلِ عمران میں آ چکی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو کبھی ایسی پوزیشن نہ دو کہ یہ تمہارے امورِ مملکت کے رازوں میں شریک ہو جائیں۔ اور بات بڑی صحیح ہے' آج تو آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جتنی مملکتیں بھی Faith Ideology (عقیدے کے نظریہ) کی بنا پر وجود میں آتی ہیں' خاص

نظریئے کے تحت بنتی ہیں' جو لوگ اس نظریئے کی صداقت میں Believe (عقیدہ) نہیں کرتے ہیں' وہ ان کے شریکِ حکم ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو بڑی Clear Cut Line (صاف اور واضح لکیر) ہے' یہ دو الگ الگ نظریاتِ حیات ہیں۔ ہمارا تو چونکہ اس نظریۂ زندگی پہ ایمان نہیں' اس لیے ہمیں اس کی اہمیت کا پتہ نہیں ہے۔ جو لوگ کسی نظریئے پہ ایمان رکھتے ہیں' یقین رکھتے ہیں' ان سے پوچھیے وہ دنیا میں کتنے Clear Cut Line (صاف اور واضح لکیر) پر چلتے ہیں۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا ..... (4:140) فریق مخالف کے ساتھ دوستی کے تعلقات تو ایک طرف رہے' خدا نے اپنے ضابطۂ قوانین میں' اس باب میں' حکم یہ دیا ہے کہ جب تم کہیں دیکھو کہ آیاتِ خداوندی کا انکار ہو رہا ہے تو

## تعمیری سوچ سے ہٹ کر ہمارے ہاں کی مخلوط آبادی کی حالتِ زار اور نوجوان نسل کی طرزِ زندگی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا فرمان

عزیزانِ من! اس آیت (4:140) میں کہا ہے کہ ہم نے تو تم سے یہاں تک کہہ رکھا ہے' مخلوط آبادی کے اندر ٹھیک ہے ملنا جلنا تو ہوتا ہے۔کہا ہے کہ اس ملنے جلنے میں جب تم کہیں کسی مجلس میں یہ دیکھو کہ قوانینِ خداوندی سے انکار کی باتیں ہو رہی ہیں' وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا (4:140) یا ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔عزیزانِ من! آج بھی' کفار کے ہاں نہیں' ہمارے ہاں بھی بدقسمتی سے ہماری نئی جنریشن کی جو محفلیں ہوتی ہیں' یہ ہمارے کافی ہاؤسز وغیرہ ہیں' ان میں بھی عام طور پر ان بچوں کی گفتگو ایسی ہی ہوتی ہے جس میں ان چیزوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔میں انہیں موردالزام نہیں قرار دیتا' اس لیے کہ ان بیچاروں کو تو دین کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی' یہ سچے ہیں' ان کے سامنے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے یا جس اسلام کا نمونہ ان کے سامنے آتا ہے' وہ واقعی ایسا ہوتا ہے جس کا استہزا کیا جائے۔ان کی غلطی یہ ہے کہ یہ اس کی کوشش نہیں کرتے کہ معلوم کر لیں کہ واقعی اسلام یہی ہے جو ان کو بتایا جاتا ہے اور جس کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں یا وہ کوئی اور چیز ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسی کو صحیح اسلام سمجھ کر' پھر اسلام پہ' خدا پہ' رسول پہ' جو یہ اعتقادات ہیں' یہ جو زندگی کے نظریات ہیں' ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ ایک عام بات ہے۔قرآن حکیم نے کہا یہ ہے اور وہ یہ تو تسلیم ہی کبھی نہیں کر سکتا کہ مومنوں کی ایک مجلس ہو اور اس میں خدا کی آیات کا انکار ہو یا ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔وہ تو یہی کہتا ہے کہ یہ جو دوسرا نظریۂ زندگی رکھنے والے ہیں' جنہیں کفار کہا جاتا ہے' ان کی طرف سے یہ کچھ ہوگا۔

## غیر سنجیدہ محفلوں میں بیٹھنے کا نتیجہ اور قرآنی راہنمائی اور منافقین کا روّیہ

کہا ہے کہ ہم نے تو تم سے یہاں تک کہہ رکھا ہے کہ اگر کسی مخلوط مجلس میں تم ایسا سنو کہ ان چیزوں سے انکار ہو رہا ہے یا ان کا مذاق

اڑایا جارہا ہے اور تمہاری ایسی کیفیت نہ ہو کہ تم اس کو روک سکو تو فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ (4:140) وہاں سے اٹھ کر چلے آؤ' ان کے پاس نہ بیٹھو تاوقتیکہ پھر وہاں کوئی اور موضوع پر گفتگو چلے۔ یہاں تک بھی وہ اجازت دیتا ہے چہ جائیکہ تم دوست داری کے تعلقات ان کے ساتھ قائم کرو کیونکہ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (4:140) اگر تم ان میں بیٹھے رہے اور ان چیزوں کو سنتے رہے تو یاد رکھو! تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے' ان چیزوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا (4:140) یہ جو منافقین ہیں' جو صرف زبان سے کہنے والے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' اصل میں ان کی کیفیت یہ ہے۔ یہ جو ہیں' ان کا اتحاد' ان کی جامعیت' تو کفار کے ساتھ ہونا ہے' مومنین کے ساتھ تو نہیں ہے' ان کا شمار تو ان میں ہوتا ہے۔ تم ان کی محفلوں میں اس طرح سے بیٹھ کر شریک گفتگو ہو جاتے ہو تو کیا اپنا شمار ان میں چاہتے ہو؟ نہیں! ان کا شمار کفار کے ساتھ ہے' تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:141) ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ تمہارے متعلق ہمیشہ انتظار میں رہتے ہیں۔ اگر بفضل ایزدی تمہاری فتح ہو تو یہ جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تمہارے ساتھ تھے اور اگر فریقِ مخالف کے حصے میں کامیابی آ جائے تو ان سے جا ملیں گے کہ یہ سب ہمارے طفیل ہے ہم نے ہی تمہیں ترغیب دلا کر مسلمانوں پر حملہ کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ہم ہی نے تمہاری ہمت بڑھائی تھی اور ہم ہی نے جماعتِ مومنین سے تمہاری حفاظت کی تھی۔ اسے یوں کہو کہ یہ سیکرٹ بیلٹ (Secret Ballot) ہے' ووٹ ڈالتے وقت پتہ نہیں چلتا کہ کس کے حق میں ووٹ دیا' ووٹ ڈالنے کے بعد خاموش رہتے ہیں' جو پارٹی جیتی ہے اس کے لیے کہتے ہیں کہ ہم نے تمہارے لیے ووٹ ڈالا تھا۔

## تعلیم وتربیت سے محروم مشرکانہ سوسائٹی کی تصویر کشی

کیفیت ان کی یہ ہے کہ وہ جو قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یہ On the Fence (حفاظتی باڑ پر) بیٹھے رہتے ہیں' کنارے پہ ہیں' نہ ادھر نہ اُدھر' دیکھتے رہتے ہیں اس چیز کو کہ کونسی پارٹی ہے جس کی طاقت ذراسی زیادہ ہو رہی ہے۔ یہ اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کہا کہ جب تمہیں کہیں فتح ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہی تو تھے۔ آپ کہاں تھے؟ ''اسیں پچھے پچھے ترے اوندے ہیگے ساں' نال ای ساں تہاڈے۔ شام ویلھے اک پنڈ وچ اک دے گھر آ گیا۔ آن کے کہیا سلام علیکم۔ وعلیکم السلام' اوہنے کہیا کہ بیہہ جاؤ' کہن لگا کہ میں تینوں پچھانیاں نئیں۔ کہن لگا: اومینوں پچھانیاں نی ہیگا توں؟ کہن لگا کہ عجیب گل ہیگی اے۔ کہن لگا کہ پچھلے سال اوتھے میلہ سی ناں شاہ چراغ عا۔ کہن لگا: جی آہو آہو۔ کہن لگا: اوتھے توں اک آدمی نال کھوتی دا سودا کر داسیں ناں۔ کہن لگا: آہو۔ کہن

لگا: میں او تھے نال ای تے کھلوتا ہیگا ساں ❶''۔ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہی تو تھے اس لیے اس میں سے حصہ لاؤ۔ کہا ہے کہ وَ اِنۡ كَانَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نَصِيۡبٌ (4:141) اگر وہ مخالفین کامیاب ہو گئے' ان کو کہیں سے لوٹ کا مال مل گیا تو اب یہ ان کے ساتھ یوں تو نہیں گئے تھے' چلے گئے وہاں' کہنے لگے کہ جی ہمارا حصہ؟ کہنے لگا کہ تمہارا حصہ کس طرح؟ کہنے لگا کہ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَيۡكُمۡ (4:141) کہا کہ ہمیں نے تو تم سے کہا تھا کہ ضرور ان کے اوپر چڑھ جاؤ' کامیاب ہو جاؤ گے۔''اساں ای تے راہ دسیا سی تہانوں'' (ہم نے ہی تو تمہیں راستہ بتایا تھا)۔

## نظریۂ حیاتِ قرآنی پر ایمان نہ لانے والوں کی منافقانہ طرزِ زندگی کا عمل

ساتھ دینے کے انداز ملاحظہ فرمائیے۔اور پھر یہ کہ ہم نے تو حفاظت کی تھی' تمہیں خبریں لا کر دیا کرتے تھے۔ان سے ہم نے کہہ دیا تھا کہ نہ نہ ایسا نہ کرو! ان کی بڑی طاقت ہے' ان کے خلاف ایسا مت کرنا تو ہم نے کہا تھا' اس واسطے ہمارا حصہ دو۔کہا یہ کیفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی۔یعنی سوال یہ ہے کہ کسی طرح ہمارا حصہ دو۔یہ پارٹی جیتی ہے' اس کے پاس چلے گئے کہ ہمارا حصہ دو ''اسی تہاڈے ووٹ پائے سن'' (ہم نے تمہارے ووٹ ڈالے تھے) وہ جیتی ہے تو اُن کے پاس چلے جاؤ کہ میں تو صاحب بیس ووٹر لے کر تمہارے پاس آیا تھا' لے کر نہیں آیا تھا وہ جو اس کے ہاں بیلٹ ووٹ ڈالنے کے لیے آئے تھے میں نے ان کو ورغلا دیا تھا آپ کے لیے۔بعینہٖ یہی چیز ہے جو قرآن مجید کہہ رہا ہے۔پھر یہ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک نظریۂ زندگی پر پختگی سے ایمان نہیں لاتے' وہ اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ (41:30) نہیں ہوتے ہیں۔

## یقین محکم' عمل پیہم میں مومنین کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

اوپر (41:30) میں کہا ہے کہ جنہوں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہاں! ہمارا نشوونما دینے والا خدا ہے اور اس کے بعد پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے' ان پہ فرشتے نازل ہونے شروع ہو گئے۔ان کے اوپر ملائکہ کا نزول ہو جاتا ہے۔ایمان کے ساتھ استقامت ہے تو وہی ایمان آخر تک فائدہ دے گا کہ آخر تک اس فارمولے کے اوپر آپ کو یقین رہے۔وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ آج ایک کسان تخم ریزی کرتا ہے' بیج بوتا ہے' چھ مہینے کے لیے ہر صبح اٹھ کر ایک درانتی ہاتھ میں لے کر' ایک رسی لے کر' چلا جاتا ہے' دن بھر محنت کرتا ہے' شام

---

❶ ہم پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے' ہم تمہارے ساتھ ہی تھے۔شام کے وقت' ایک گاؤں میں ایک کے گھر گیا' آ کر کہا السلام علیکم۔وعلیکم السلام۔کہا کہ بیٹھ جائیے۔کہنے لگا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔وہ کہنے لگا کیا مجھے نہیں پہچانا ہے؟ عجیب بات ہے۔پچھلے سال وہاں شاہ چراغاں کا میلہ تھا۔کہنے لگا کہ ہاں تھا۔وہ کہنے لگا کہ وہاں آپ ایک آدمی سے ایک گدھی کا سودا کر رہے تھے۔کہنے لگا کہ ہاں۔اُس پر وہ کہنے لگا کہ میں وہاں ساتھ ہی تو کھڑا ہوا تھا۔

کو خالی ہاتھ واپس آ جاتا ہے' یہ چیز بڑی ہمت طلب ہے۔عزیزانِ من! یہ کونسی چیز اسے چھ مہینے کے لیے اس پہ آمادہ رکھتی ہے کہ پھر دوسری صبح وہاں چلا جائے' شام کو خالی ہاتھ واپس آ جائے' پھر دوسری صبح وہاں چلا جائے بلکہ سردی کی راتوں میں بھی وہاں جا جا کر پانی دے کر آئے۔کونسی چیز اسے اس استقامت پر آمادہ کرتی ہے؟ یہ ہے ایمان کہ اس ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے اگیں گے۔راستے میں کہیں بھی اس ایمان میں ذرا سی کمزوری بھی واقع ہو جائے' دوسری صبح پھر وہ نہیں جاتا۔یہ جو کہا ہے کہ اِنَّ الَّـذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ (41:30) یہ جو ایمان کے ساتھ استقامت ہے اس سے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔کہا ہے کہ فَـاللّٰـهُ یَـحۡـکُـمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ (4:141) ان سے کہہ دو کہ یہ دورخی چالیں کب تک چلتے ہیں؟ عنقریب وہ آخری انقلاب آنے والا ہے اس وقت تمہارے متعلق بھی کھلم کھلا فیصلہ ہو جائے گا۔ٹھیک ہے آج تو جو روش تم جی چاہے اختیار کر لو اور خوش ہوتے رہو کہ ہم بڑے کامیاب ہوئے صاحب! انہیں بے وقوف بنایا' وہاں سے بھی لے آئے' ان سے بھی لے آئے۔ٹھیک ہے۔ظہورِ نتائج کے وقت نکھر کر بات سامنے آ جائے گی' دوٹوک فیصلہ ہوگا۔۔۔۔۔۔تمہاری یہ روش نہیں چل سکے گی۔

## جغرافیائی افادیت کے لحاظ سے سطح ارض پر مسلمانوں کے جم غفیر کے باوجود پس ماندگی کی وجہ

اور ہماری قیامت تو ہزار برس سے آئی ہوئی ہے' عزیزانِ من! ہمارے فیصلے تو روز ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور یہ مسلمان کہلانے والی قوم اتنی عظیم قوم ہے۔یہ جو اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۔۔۔۔۔۔۔اٰمَنُوۡا (4:137) والی بات ہے جو آگے ہے' وہ اس میں نہیں ہے۔یہ اتنی عظیم قوم ہے' اس کی جغرافیائی پوزیشن یہ ہے کہ ایک بیلٹ ہے' یہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار ہے جو تلاطم انگیز ہے' یہ ایک Solid Block (ٹھوس و محکم بلاک) ہے' دعویٰ یہ ہے کہ ہم ایک نظریۂ زندگی پہ یقین رکھتے ہیں' ایمان یہ ہے کہ اسلام رنگ نسل زبان وطن کی حدود سے بالا ہو کر ایک امت واحدہ بنا دیتا ہے۔اور کیفیت یہ ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ متحد نہیں ہے۔آج ساری دنیا میں یہ سب سے ذلیل قوم ہے۔کہا ہے کہ فَـاللّٰـهُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ (4:141) انہوں نے تو یہ کہہ دیا کہ قیامت مرنے کے بعد ہی آئے گی' جو قیامتِ موجود ہے' اس پہ یہ نگاہ نہیں رکھتے یعنی جب فیصلے محسوس شکل میں سامنے آ جائیں۔عزیزانِ من! ہمارے فیصلے تو ہر روز سامنے آتے ہیں۔

## مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ دنیا بھر میں کسی طرح بھی دوسروں کا محتاج نہیں ہوگا

اب سوال پیدا ہوا کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ یہ "یٰٓاَیُّهَا الَّـذِیۡـنَ اٰمَنُوۡا" ہی ہیں یا امنوا والی بات بھی انہوں نے پوری کر لی ہوئی ہے۔عزیزانِ من! یہ ایک آیت کا ایک ٹکڑا ہے اس کے اندر چار پانچ الفاظ ہیں' یہ معیار ہے یہ پہچاننے کے لیے کہ واقعی یہ قوم مومن ہے

یا نہیں۔ معیار یہ نہیں کہ جو قیامت کے دن جا کر پتہ چلے' معیار یہ ہے جو آج پتہ چلے' ہر وقت اس کا پتہ ہو۔ ٹھیک ہے کہ اگر ایسا معیار سامنے آ جائے تو پھر تو انسان کسی دھوکے میں نہیں رہتا۔ سنیے! وہ معیار کیا ہے؟ معیار یہ ہے کہ **وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا** (4:141) یہ ہو نہیں سکتا کہ دنیا میں غیر مسلم' کافر' مومنوں پر غالب آ جائیں۔ چل بھئی! اب فیصلہ کر لیجیے۔ یہ آج مثلاً ستر کروڑ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کس کیٹگری (شق) میں شمار ہو رہا ہے؟ یہ **وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ** (4:141) الفاظ ہیں کہ کبھی یہ ہو ہی نہیں سکتا' خدا ایسا کرے گا ہی نہیں **وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا** (4:141) یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے جی معیار۔ اب خود پرکھ لیجیے۔ بالکل گنجائش ہی نہیں۔ یہ کوئی نظری شے نہیں ہے' یہ کوئی ایسی اعتقادی شے نہیں ہے' یہ محسوس مرئی واقعاتی شے ہے۔ یہ ہے وہ کیفیت۔ لہٰذا اس نے جو کہا تھا کہ **یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ** (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو یہ سمجھ کر دھوکے میں رکھ رہے ہو کہ ہم مسلمان ہیں' مومن ہو گئے ہیں' تم ایمان لاؤ۔ پہچان یہ ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غلط نظریاتِ حیات رکھنے والی قو میں اس نظریۂ زندگی پر ایمان رکھنے والوں کے اوپر غالب آ جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

## خدا کی ذات کسی انسان کو دھوکا نہیں دیتی بلکہ انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے

یہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے' جن کو ابھی منافقین کہا ہے' ان کے متعلق کہا ہے کہ **اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ ھُوَ خَادِعُھُمۡ** (4:142) یہ بزعم خویش خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہاں یہ جو لفظ **وَ ھُوَ خَادِعُھُمۡ** ہے۔ اس کا عام ترجمہ (معاذ اللہ) یہ کر لیا جاتا ہے کہ خدا ان کو دھوکا دیتا ہے (معاذ اللہ)۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ **وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَھُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** (2:9) یہ خدا کو دھوکا نہیں دیتے' اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ایسا کرتا ہے کہ یہ خود اپنے دھوکے کے اندر مبتلا رہتے ہیں' یہ ان کا دھوکا ہے۔ یہ ہے **وَ ھُوَ خَادِعُھُمۡ** (4:142) یہ اپنی اس روش سے' خود اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔

## اُن نمازیوں کا ذکر جو خدا کو دھوکا دیتے ہیں

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ جب ہم قرآن کریم میں ان چیزوں کو (مثلاً) یہودی' نصرانی' کافر' منافق دیکھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ ٹھیک ہے جی' ابتدائے اسلام میں' مدینے کی زندگی میں' یہ کچھ لوگ ہوا کرتے تھے' یہ ان کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اب بھی جب ان کی بات ہوتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق گفتگو نہیں ہو رہی' کوئی اور گروہ ہے' یہ اس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ تو کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ مسلمانوں کے متعلق یہ بات ہو رہی ہے لیکن قرآنِ کریم تو کہیں بھاگنے کی گنجائش ہی نہیں دیتا۔ سنیے! کن کے متعلق یہ گفتگو ہو رہی ہے؟ کہا ہے کہ **اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ** (4:142) یہ "اِنَّ" یقینی بات ہے۔ یاد رکھو! یہ جو منافقین ہیں' یہ بظاہر

خدا کو دھوکا دے رہے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ کہا ہے کہ **اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ** (4:142) جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کون ہیں جو نماز میں کھڑے ہوتے ہیں؟ یہ مسلمانوں کی باتیں ہو رہی ہیں' عزیزانِ من! وہ جو **اٰمَنُوْٓا** والے ہیں' یہ وہ نہیں ہیں' یہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** کہنے والے ہیں۔ کہا ہے کہ **اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ** (4:142) جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! اب تو گنجائش نہیں ہے ''کہ جی ساڈے متعلق تے ئیں نہ گل ہورہی'' (کہ جی ہمارے بارے میں تو بات نہیں ہو رہی ہے)۔ اور بات کوئی ہے بھی ٹھیک ''بے نمازی گھٹ ای منافق ہونداا ے'' (بے نمازی شاذ ہی منافق ہوتا ہے)۔ اس میں وہ **یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ** والی بات نہیں ہوتی ہے' یہ خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتا' یہ پھر بھی کبھی محسوس کرتا ہے کہ یا اللہ! میں بڑا گنہگار ہوں۔

بہرحال بات یہ ہورہی ہے کہ یہ **اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ** (4:142) کہہ رہا ہے' ان کے متعلق کہہ رہا ہے کہ **اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ** (4:142) جب یہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا کرتا ہے؟ کہا ہے کہ **قَامُوْا کُسَالٰی** (4:142) ۔ یہ **کُسَالٰی** کیا چیز ہوتی ہے؟ میں پھر کہتا ہوں کہ ''وارے وارے جایئے اینا ں عرباں دے'' (ان عربوں کے لیے کلماتِ تحسین و آفرین زبان پہ لایئے کہ) کیا خوب زبان دے گئے ہیں! نماز میں کھڑے ہیں' قیام ہو رہا ہے' رکوع ہو رہا ہے' سجود ہو رہا ہے اور اس قدر Particular (مخصوص) ہیں کہ اگر ہاتھ یہاں تک اٹھتے ہیں' حنفی ہے تو ان لوؤں کو ہاتھ چھوتا ہے۔ ہاتھ بالکل اس مقام پہ ہیں' پاؤں میں اتنا فاصلہ ہے' سجدے میں جاتے ہیں پانچوں رُکن زمین پہ ٹکتے ہیں۔ یعنی یہ ساری چیزیں اس طرح سے ہو رہی ہیں۔ بڑے سے بڑا فقیہہ بھی کھڑا ہو تو وہ یہ کہے گا کہ بالکل صحیح نماز ہے مگر ہو کیا رہا ہے؟ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور چیز ملنی چاہیے' وہ چیز نہیں مل رہی۔

برادرانِ عزیز! ایک تشبیہ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ جو روئی دھننے والا ہے' اس کے پاس وہ روئی دھننے والی ہوتی ہے' ایک تو لکڑی کی کمان ہوتی ہے' ایک اس میں تانت ہوتی ہے۔ اگر کیفیت یہ ہو کہ وہ لکڑی (کمان) الگ رکھ دی جائے اور تانت اتار کر الگ رکھ دی جائے اور روئی کا ڈھیر رکھا ہوا ہو' دھنیا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ کیا نتیجہ نکلے گا جی؟ **کُسَالٰی** اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں تانت اور کمان دونوں موجود ہوں لیکن الگ الگ رکھی ہوئی ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ **قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی** (4:142) یہ وہ دھنیا ہے' جس کے پاس تانت بھی ہے کمان بھی ہے مگر تانت کو کمان سے الگ رکھ کر روئی دھننے کو بیٹھا ہے۔ اب کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا میں تو قرآن کریم کے الفاظ کے انتخاب پہ خدا پہ ایمان لایا ہوں' اس کے سوا کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ مثال ایسی ہے کہ کُھب جاتی ہے۔ یہ ہے جسے ادب میں تشبیہ تامہ کہتے ہیں۔ ساری عمر وہ آ کر بیٹھا یہ کچھ کرتا رہے' روئی کا ایک پھایا

نہیں ڈھل سکتا۔ کوئی چیز غیر موجود نہیں ہے' بندوق بھی ہے' کارتوس بھی ہیں' اکٹھا نہیں کر سکتا۔ لیکن مثال وہی ہے کہ کمان بھی ہے' تانت بھی ہے مگر الگ الگ کیے ہوئے ہیں۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تُو باقی نہیں ہے
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اور دوسری جگہ کہا ہے کہ

صفیں کج' دل پریشاں' سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

## صلوٰۃ کی اصل حقیقت

صلوٰۃ میں وہ شے جو ان دونوں کو ملا دے' وہ نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ دونوں چیزیں بڑی ضروری ہیں' یہ محسوس شکل جو اس صلوٰۃ کی' نماز کی ہے' یہ نہایت ضروری ہے: آواز دینا' اکٹھے ہونا' ایک صف میں کھڑے ہونا' اپنے میں سے ایک کو اپنا لیڈر منتخب کرنا' اس ایک کی آواز پہ سب کا جھکنا' سب کا اٹھنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں ڈسپلن کی یہ کیفیت ہے کہ پاؤں میں ایک جیسا فاصلہ ہے' ایک جیسے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' ایک جیسا جھکاؤ ہے' یہ ساری چیزیں' جتنی بھی ہیں' یہ ساری کی ساری ضروری ہیں لیکن اس کے اندر ایک اور چیز بھی تو ضروری ہے۔ وہ ہے مقصد جس کے لیے یہ کیا جاتا ہے۔ مقصد کو الگ رکھ دیا جائے' یہ ساری چیزیں اسی طرح سے رکھ دی جائیں تو تانت اور کمان الگ الگ ہو گئیں۔ کہا ہے کہ کیفیت ان کی یہ ہے کہ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ (4:142) یہ سب چیزیں وہ کرتے ہیں جو دیکھی جا سکیں۔ یہ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے ہیں کہ ہم بھی تمہاری جماعت میں شامل ہیں۔

## تباہی ان نمازیوں کے لیے جو رزق کے سرچشموں کو روک لیتے ہیں

عزیزانِ من! وہ جو سورۃ الماعون میں ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ . الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4-5) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز کے مقصد سے بے خبر ہیں۔ یہ هُمْ يُرَآءُوْنَ کے لیے ہے' اس میں کیفیت یہ ہے کہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو مرئی ہے' جو Visible (دکھائی دینے کے لیے) ہے' جس کو دوسرے دیکھ سکتے ہیں' وہ تو سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ کرتے

کیا نہیں ہیں؟ کہا ہے کہ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اس رزق کو جو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے دروازے کے سامنے سے گزرنا چاہیئے روک لیتے ہیں ''مسیتے نماز پڑھن آ جاندے نیں'' (دکھاوے کے لیے مسجد میں نماز پڑھنے آ جاتے ہیں) یہ یُرَآءُوۡنَ النَّاسَ (4:142) کے لیے ہے۔ وہ کچھ کرتے ہیں جو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو یہ ساتھ ملاتے نہیں ہیں؟ یہ کیا نہیں کرتے؟ یہ کہ وَ لَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ (4:142) قانونِ خداوندی سامنے نہیں ہوتا کہ اس کی یاد تازہ کر لی جائے۔ یہ صرف لوگوں کے دکھاوے کے لیے ہے۔ یہ ہے جو یہ نہیں کرتے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ (4:142) یہ ہیں وہ منافقین جو خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس سے اجر مانگتے ہونگے۔ یہ دھنیا جو تین چار گھنٹے بیٹھ کر یہ کہے کہ ''مائی جی لیاؤ روپیہ جیہڑا کتا سی میرے نال۔ او کہے: اوویرا! توں کہیا سی دھونی لاؤ نگا۔ لے میں گھنٹہ بھر تے بیٹھا رہیاں تیرے کول' تانت وی ہیگی اے میرے کول' کمان وی ہیگی اے میرے کول' ہن سٹ پیسے ❶'' کوئی نہیں دے گا میرے بھائی! اس کو پیسے۔ یہ اس نماز کا معاوضہ اجر صلہ نتیجہ مانگ رہے ہیں خدا سے۔ کہا ہے کہ یُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَ لَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیۡلًا مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ (4:143) (یہ اجتماعِ صلوٰۃ میں اس لیے شریک نہیں ہوتے کہ) اس سے قوانینِ خداوندی کی یاد تازہ کر لی جائے۔ یہ محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ ان کی اس روش سے انہیں وہ اطمینان حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو یقینِ محکم کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ پریشان خاطر' حواس باختہ' درمیان میں لٹکے رہتے ہیں' نہ اِدھر کے' نہ اُدھر کے۔ کم بخت! اس تانت اور کمان کو لے کر بیٹھنے کی بجائے اگر تو بازار میں کسی کا بوجھ اٹھا لیتا تو پھر تجھے چار پیسے تو مل جاتے۔ اب نہ تُو اُدھر کا ہے' نہ تو اِدھر کا ہے۔ خالصتاً ادھر کا ہی رہ:

تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

آگے کہا ہے کہ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ سَبِیۡلًا (4:143) جو یوں خدا کے صحیح راستے سے گمراہ ہو جائے تو دنیا میں کون ہے جو اس کو صحیح راستہ دکھا دے۔ اسے صحیح راستہ کوئی نہیں دکھا سکتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی آیت 143 تک آ گئے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**

❀......❀......❀

# اٹھائیسواں باب: **سورۃالنسآء** (آیات 144 تا 155)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا
يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا
مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ
وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ
فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا
عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 144 سے ہو رہا ہے: (4:144)۔

## کافر اور منافق کے علاوہ مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت

پچھلے اتوار کو الیکشن کی پابندیوں کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا۔ اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ بات منافقین کی چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے منافقین اور کفار کو یوں تو ایک ہی کیٹگری (شق) میں رکھا ہے لیکن جیسا کہ ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے بات آئے گی' وہ منافقین کو کافروں سے بھی زیادہ بدتر مخلوق قرار دیتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو دین ہے' وہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے' یہ پوجا پاٹ' گیان دھیان اور پرستش ہے' بس اتنا

چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے منافقین اور کفار کو یوں تو ایک ہی کیٹگری (شق) میں رکھا ہے لیکن جیسا کہ ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے بات آئے گی' وہ منافقین کو کافروں سے بھی زیادہ بدتر مخلوق قرار دیتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو دین ہے' وہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے' یہ پوجا پاٹ' گیان دھیان اور پرستش ہے' بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے اور اسے ہر فرد الگ الگ' اپنی اپنی جگہ' انفرادی طور پر کر سکتا ہے بلکہ اس میں جتنی زیادہ انفرادیت ہو' تنہائی ہو' خلوت ہو' علیحدگی ہو' وہ اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے سادھو ہوں' سنیاسی ہوں' بن باسی ہوں' عیسائیوں کے Saints (صوفی) ہوں' مسلمانوں کے صوفی اور اولیاء اللہ ہوں' یہ آبادیوں سے بھی دور بھاگتے ہیں' جنگلوں میں چلے جاتے ہیں' اگر آبادی میں رہتے ہیں تو خلوتوں میں رہتے ہیں' حجروں میں رہتے ہیں' خانقاہوں میں رہتے ہیں' زاویوں میں رہتے ہیں۔ گویا جتنا زیادہ کوئی تنہا ہوتا چلا جائے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اتنا ہی خدا سے تعلق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی شکل ہوتی ہے۔ یہ انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ جیسا ذہن نے تصور کر لیا اس کے مطابق راستے اختیار کر لیے لیکن دین اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ وہاں تو کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) ہونا پڑتا ہے یعنی سفرِ زندگی صادقین افرادِ کارواں کی معیت میں طے کرنا پڑتا ہے اور جنت میں جانے کے لیے ضروری ہے کہ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ (89:29) میرے بندوں میں داخل ہو پھر جنت میں جا سکتا ہے۔ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اب اس اجتماعیت کی پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اس نظریئے پر ایمان رکھیں' اس تصورِ حیات پر یقین رکھیں تو یہ جنہیں جماعت مومنین کہا جاتا ہے' وہ دوسروں سے الگ ایک جماعت بنے گی۔

## مذہب کی بنیاد سیکولرازم پر استوار ہوتی ہے اور دین کی دو قومی نظریئے پر

مذہب میں یہ تمام امور مشترک ہوتے ہیں۔ کافر ہوں' مومن ہوں' ہندو ہوں' مسلمان ہوں' سکھ ہوں' عیسائی ہوں' یہ جسے سیکولر نظام کہتے ہیں اس میں ان تمام دنیاوی امور کے فیصلے وہ مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں اور اپنی پوجا پاٹ' ایشور کی بھگتی' پرستش' عبادت کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کو سیکولر نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں دنیاوی امور کے فیصلے مومن اور کافر کا امتیاز کیے بغیر' اکٹھے ہو کر' باہمی مشورے سے ہی سہی' یوں طے کر لیے جاتے ہیں اور Personal (شخصی) معاملات میں ہر ایک کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے دین اور دھرم یعنی مذہب کے مطابق ان کے فیصلے کرلے لیکن جب دین آئے گا تو اس میں تو یہ ایک منفرد جماعت بنے گی' جو صرف انہی لوگوں پر مشتمل ہوگی جو اس نظریۂ حیات پر یقین اور ایمان رکھیں جو قرآن کریم نے دیا ہے۔ اسی چیز کو آج کی اصطلاح میں دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ واضح طور پر کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا' ان میں سے ایک جماعت مومنین کی ہوتی

ہے' دوسری کفار کی ہوتی ہے۔اپنے ذہن میں جب ہم کفار کہتے ہیں تو غیر مسلم بھی اس لفظ کو ایسے سمجھتے ہیں جیسے گالی دیدی ہو۔ یہ کوئی گالی کی بات نہیں' یہ تو وہ ہے جسے کسی سوسائٹی کا Member & Non-Member کہتے ہیں۔ یہ بالکل وہی چیز ہے۔اس سوسائٹی میں کچھ اس کے ممبرز ہوتے ہیں اور دوسرے نان ممبرز ہوتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی سوسائٹی' کوئی انجمن' کوئی اجتماعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں ممبرز اور نان ممبرز دونوں اکٹھے ہو جائیں اور آپ اس کو سوسائٹی کہہ دیں۔رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا اور جتنے رشتہ دار' عزیز تھے وہ دوسری قوم کے افراد تھے' قومیت کی تشکیل کی بنیاد دین نے یہ دی کہ نظریہ زندگی میں اشتراک ہو' ایمان پر اشتراک ہو ۔جیسا میں نے کہا اس چیز کو دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔

## دوقومی نظریہ کے بنیادی لوازمات جن کو پیش نظر رکھے بغیر اسلامی مملکت کا خواب پورا نہیں ہوسکتا اور بنیاد پاکستان

پاکستان کا تصور خالص اسلام اور دین کی بنیادوں پہ علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔اس مطالبے کی پہلی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر' ایک الگ قوم ہے۔کوئی غیر مسلم اس قوم میں شریک نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی دوسری قوم کے ممبر نہیں ہوسکتے۔اور دوسری چیز یہ کہ یہ جو الگ قوم بنتی ہے' اگر انہوں نے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے' تو ان کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ضروری ہے۔اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا تاوقتیکہ اس امت کو' اس ملت کو' یہ کامل اختیار و اقتدار نہ ہو کہ وہ خدا کے احکام کو نافذ کرسکیں۔ یہ تھی بنیاد پاکستان کے حصول کی۔ یہ جو چیز ہے کہ یہ ایک الگ منفرد قوم ہے تو اس کی مملکت میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا' انصاف کیا جائے گا' عدل کیا جائے گا' انہیں انسانوں کے حقوق دیئے جائیں گے لیکن جو چیزیں اس قوم کے ساتھ مختص اور مخصوص ہیں' ان میں وہ شریک نہیں کیے جاسکتے۔اور سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس مملکت میں جو اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر متشکل ہوتی ہے جو نان ممبرز ہیں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں قائم کیے جاسکتے' رازدارانہ تعلقات قائم نہیں کیے جاسکتے۔اسی لیے کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (4:144) ۔یہاں منفی اور مثبت دونوں چیزیں آ گئیں۔یہ جو رفاقت کے' دوستداری کے' سرپرستی کے' دم سازی کے' ہم آہنگی کے باہمی تعلقات ہیں یہ صرف اس جماعت کے ممبرز کے ساتھ ہوں گے جنہیں مومنین کہا ہے' نان ممبرز کے ساتھ یہ تعلقات قائم نہیں ہوسکیں گے۔اس آیت میں کہا ہے کہ ایسا کبھی نہ کرو کہ مومن سے ورے ہی تم ان غیر ممبران (غیر مسلم) کو اپنا دوست رازدار بنالو۔

## کوئی غیر مسلم جماعتِ مومنین کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔کیوں؟ اور مسلم مملکت کے دولوازمات

یہاں تو صرف اتنی سی چیز ہی کہی ہے' اس سے پہلے تو بڑی ہی تفصیل سے اس کے متعلق چیزیں آ چکی ہیں۔سورۃ ال عمران میں

آپ دیکھ چکے ہیں' درس میں وہ آیت آ چکی ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ** (3:118) اے جماعت مومنین! اپنوں کے علاوہ کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ' اپنے راز داروں میں شریک نہ کرو۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی نان ممبر یا کوئی غیر مسلم آپ کے شریکِ حکم ہوتا ہے' شریکِ حکومت ہوتا ہے' آپ کی مملکت کے امور کے اندر برابر کا شریک ہوتا ہے تو اس سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں رہ سکتا' اور کوئی راز چھپایا بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن مجید کا یہ حکم ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا** (3:118) یاد رکھو! یہ کتنے ہی تمہارے اپنے کیوں نہ بنیں' وہ تمہاری تباہی میں' تمہاری تخریب میں' کوئی کمی نہیں کریں گے۔ اور بات ٹھیک ہے۔ آپ کو ایک زندگی کا نظریہ پسند ہے' اس کے مقابلے میں وہ جو دوسرے ہیں' آپ سے متضاد نظریۂ حیات کے قائل ہیں' اب دو متضاد کششیں یک جا جمع کر رہے ہیں۔ آپ کے دین کا تقاضا ان کے تقاضوں سے بالکل مختلف و متضاد ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ **وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ** (3:118) جو چیز تمہارے لیے وجہ تکلیف اور باعثِ مصیبت ہوتی ہے' اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جب دو مفادات میں ٹکراؤ ہوگا تو ایک کے لیے جو چیز مفاد کا باعث ہوگی دوسرے کے لیے تکلیف کا موجب ہوگی۔ اس قسم کے متضاد عناصر کو ملا کر قوم نہیں بنایا جا سکتا' ان عناصر کو شریکِ حکم کیا ہی نہیں جا سکتا' ان کے بنیادی مقاصد الگ الگ ہیں' متاع الگ الگ ہیں' نصب العین حیات جداگانہ ہیں' ایک مشرق کی طرف جانا چاہتا ہے' دوسرا مغرب کی طرف جانا چاہتا ہے' آپ انہیں یکجا اکٹھا کیسے کر دیں گے۔ کہا ہے کہ **قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَ مَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ** (3:118) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو بے ساختگی کے عالم میں ان کے منہ سے وہ باتیں نکل جاتی ہیں جن سے تمہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کیسے دشمن ہیں لیکن جو کچھ تمہارے خلاف یہ دلوں میں چھپا کر رکھتے ہیں' تمہیں ان کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ سارے قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ یہی حقیقت چلی آئے گی اور یہی بنیاد تھی۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس مملکتِ پاکستان کے حصول کی دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک یہ دو قومی نظریہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کی بنیاد پر' ہر غیر مسلم سے الگ ایک قوم ہے' غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا اور دوسری یہ کہ اس مملکت کی ضرورت اس لیے ہے کہ یہاں خدا کے قوانین کو نافذ کیا جائے۔

## مملکتِ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہماری نظریاتی زندگی کی زبوں حالی

ہم نے مملکت تو حاصل کر لی لیکن یہ دونوں چیزیں اس طرف سے نظر انداز ہوئیں نسیًا منسیًا ہوئیں کہ آج انہی پر حرف گیری ہو

رہی ہے۔ یہ تو دہرایا جاتا رہا کہ اسلامی مملکت بنے گی اور آج تک وہ الفاظ تو بہرحال دہراتے چلے گئے' تیئیس سال ❶ ہو گئے ہیں ہم سنتے چلے آرہے ہیں لیکن یہ جو دوسری چیز تھی کہ مسلمان ان سے الگ ایک قوم ہیں' یہاں پہنچنے کے بعد اس کا تو نام ہی کسی نے نہیں لیا۔ یہ جو اقامت دین کے اتنے بڑے مدعی بنے پھرتے ہیں انہوں نے بھی اس تیئیس سال ❶ میں اپنے ہاں کبھی یہ نہیں کیا کہ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم' مسلم قوم کا فرد نہیں ہو سکتا۔ مسلم اور غیر مسلم سارے اکٹھے ہو کر جمہوریت لیے پھر رہے ہیں بلکہ انہوں نے تو پچھلے الیکشن کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ ہم مسلم لیگ کے کسی ممبر کے مقابلے میں ایک ہندو کو ترجیح دیں گے۔ یہ اسلامی مملکت بنانے کے دعویدار ہیں اور جو اس کے مدعی نہیں تھے بہرحال نام وہ بھی یہ لیتے تھے۔ جتنے آپ کے ہاں یہ آئین بنے ہیں' کسی میں یہ بنیادی شرط نہیں تھی کہ یہاں پاکستان کے اندر جو قوم ہے وہ مسلمان کی قوم ہے' نان مسلم اقوام کے افراد نہیں ہیں۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو آئے دن کفر کے فتوے لگتے رہتے ہیں' آج تو وہ مذاق بن کر رہ گئے ہیں' ان کا کوئی عملی مفہوم ہی نہیں رہ گیا۔

## اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی حیثیت کے تعین کی وضاحت

کسی کو کافر قرار دینے کے سلسلہ میں اسلامی مملکت کے اندر یہ بہت بڑی چیز ہوتی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ وہ اس قوم کا ممبر فرد نہیں ہے۔ اس میں ایک تو یہ تھا کہ یہ کسی ملاّ' مولوی' مفتی کا کام نہیں تھا کہ کسی کو مسلم اور کسی کو کافر قرار دیدے۔ یہ تو مملکت کا کام تھا کہ یہ Constitutionally (آئینی طور پر) بتائے کہ کون اس قوم کا فرد ہو سکتا ہے' کون نہیں ہو سکتا۔ اور جو نہیں ہو سکتے' ان کے معنی آج کی اصطلاح میں یا Constitutionally (آئین کے لحاظ سے) یہ تھے کہ وہ فرد Disfrenchise (نمائندگی یا حق رائے سے محروم) ہو جاتا تھا' وہ Disqualify (نااہل) ہو جاتا تھا' وہ آپ کی پارلیمان کا ممبر نہیں بن سکتا تھا' وہ آپ کا ووٹر نہیں ہو سکتا تھا' وہ آپ کی حکومت کے امور میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جس کو آپ کفر کا فتویٰ لگا دینا کہیں وہ اس لیے تھا کہ وہ نان ممبر ہو جاتا تھا۔ کفر کے فتوے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اس کو اپنی سوسائٹی سے خارج کر دیتے ہیں لیکن یہاں تو کسی Constitution (آئین) میں بھی یہ بات نہیں آئی' آج کسی کی زبان پہ یہ بات نہیں آئی۔ پہلی بنیاد یہ تھی۔ اور اسلامی مملکت بنانے کی دوسری جو بنیاد تھی ابھی وہ آیت بھی آتی ہے تو میں عرض کرونگا۔ یہاں بہرحال یہ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:144) اے جماعت مومنین! تمہارے رفیق صرف وہی ہونے چاہئیں جو تمہاری جماعت کے افراد ہوں۔ اس لیے تم ایسا کبھی نہ کرو کہ کفار کو مومنین سے ورے ہی اپنا دوست اور کارساز بنا لو۔ یاد رکھو! یہ خالصتاً آئیڈیالوجی کی Basis (بنیاد) پہ جماعت بنتی ہے' جو اس

---

❶ یاد رہے یہ بات جنوری 1971ء کی 24 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

آئیڈیالوجی میں Believe (یقین) نہیں کرتا' وہ تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھلا ان سے کیا واسطہ جو تجھ سے نا آشنا ہے۔

## دوقومی نظریئے کی قرآنی آئیڈیالوجی کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کو وارننگ

برادرانِ عزیز! آگے دیکھیے کہ اس کی تہدید کتنی بڑی ہے! کہا ہے کہ **اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا** (4:144) کیا تم ایسا کرنا چاہتے ہو' ایسا کرو گے تو اس کے بعد پھر خدا کو تمہارے اوپر اپنا غضب اور عذاب نازل کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہے گی' تنہا یہ ایک دلیل کافی ہو جائے گی کہ تم نے اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا دوست' راز دار' شریک حکم' شریک مملکت بنایا' اپنی قوم کا فرد تسلیم کرلیا۔ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ غور کیجیے عزیزانِ من! لیکن آپ کا قرآنِ حکیم تو آج صرف جان❶ نکالنے کے لیے رہ گیا ہے۔

یہاں ذکر منافقین کا آ رہا تھا اور میں نے گزارش کیا تھا کہ اگرچہ قرآنِ حکیم کافروں اور منافقوں دونوں کو ایک کیٹگری (شق) میں رکھتا ہے لیکن جو منافقین ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ **اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ**(4:145)۔ ذہن میں یہ آتا ہے کہ جہنم میں جو سب سے بڑا عذاب ہے' وہ بہر حال کفار ہی کو ہوگا لیکن یہاں (4:145) میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجے کے اندر منافق ہوگا۔ غور فرمائیے! آج تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی' اس لیے کہ ہمیں پتہ نہیں کہ مومن کون ہوتا ہے' تو منافق کا کیا پتہ چلے۔ اور ابھی ابھی یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہاں مومن ہے کون۔ قرآن کریم نے کہا یہ تھا کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8)۔ یہ تھی قرآن کریم کی رو سے منافق کی Definition (تعریف)۔ ان لوگوں سے جب پوچھیے کہ صاحب! آپ کون ہیں' وہ کہیں گے کہ الحمدللہ مسلمان ہوں من یقولوا کبھی اس سے انکار نہیں کریں گے کہ نہیں صاحب! میں مسلمان نہیں ہوں۔ سوچیے تو سہی کہ ہم میں سے کوئی بھی' کبھی بھی' یہ انکار کرتا ہے' یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ کیفیت یہ ہو چکی ہے' وہ لوگ یہاں موجود ہیں' ہمارے سامنے جو تنہائیوں میں بیٹھے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ کیا خدا' کیا رسول ﷺ' کیا ایمان! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ یہ بالکل نہیں مانتے' دہریئے ہیں اور ان چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب بھی مردم شماری کے رجسٹر والا آتا ہے تو مسلمانوں کے خانے میں نام رکھاتے ہیں۔ کبھی باہر ان سے پوچھ لیجیے' کبھی نہیں کہیں گے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ منافق میں جرأت نہیں رہتی۔ کفر اور الحاد اور دہریّت کے لیے تو بہت بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ معاشرہ میں علی الرغم اٹھ کر کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم تم میں سے نہیں ہیں' اس کے لیے جرأت کی ضرورت ہے لیکن ان کی کیفیت یہ ہے۔

---

❶ سورۃ یٰسین اس آخری وقت پڑھنے کی رسم اس بات کی غماز ہے

## منافق کے سلسلہ میں نفسیاتی طور پر ہر آن جہنمی کیفیت میں مبتلا رہنے کی ایک قرآنی مثال

یہ آیات ذرا آگے چل کر آ رہی ہیں جہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ لوگ بھی تمہیں ملیں گے جو ظاہر یہ کریں گے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ آگے اس نے بتایا ہے کہ پھر ٹیسٹ کونسا ہے جہاں سے پتہ چلے کہ یہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہاں تو منافق کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ جہنم کے عذاب کی پست ترین گہرائیوں میں ہونگے' جہنم کے سب سے عمیق غاروں کے اندر ہونگے' ہر وقت مسلسل جہنم میں ہونگے۔ عام مثال کے مطابق یوں کہیے کہ اگر ایک اسامی کے لیے بی اے ہونے کی شرط ہو تو ایک Candidate (امیدوار) فی الحقیقت بی اے ہے' وہ آیا' وہ سلیکٹ ہو گیا' وہ آ گیا' اطمینان ہو گیا۔ اس کے برعکس ایک امیدوار بی اے نہیں ہے' اس نے کہا کہ میں بی اے نہیں ہوں' انہوں نے کہا کہ تم نہیں لیے جا سکتے' ملازمت نہیں ملی' وہ چلا گیا' معاملہ ختم ہوا۔ اس ملازمت کی جو مراعات یا مفادات ہیں ان سے تو وہ محروم ہوا' دل میں کوئی آگ تو نہیں رہی۔ اب ایک امیدوار ہے' وہ بی اے نہیں ہے' آ کر کہتا یہ ہے کہ میں بی اے ہوں' وہ سلیکٹ (منتخب) ہو جاتا ہے۔ آپ سوچیے کہ یہ جو ملازمت کے (مثلاً) تیس سال ہی نہیں' اس کے بعد بھی اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ قرآن حمید کہتا ہے کہ یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَۃٍ عَلَیۡہِمۡ (63:4) کہیں پتا کھڑکا اور اس کی جان گئی کہ پکڑا گیا' پتہ چل گیا کہ میں بی اے نہیں ہوں۔ ملازمت کی مراعات تو ملی ہوئی ہیں' ہوسکتا ہے کہ بہت بڑے عزت کے مقام پہ بھی ہو' اس میں پھنّے خاں بھی بن چکا ہو❶ لیکن ہر وقت دھڑکا لگا ہے کہ ذرا کسی کو پتہ چل گیا تو پوچھو نہیں پھر کیا ہوگا۔ یہ ہے مسلسل جہنم۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ. الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ (104:6-7) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ جہنم کا یہ ہے درک اسفل۔ میں نے (اوپر مثال میں) کہا ہے کہ کافر کی صرف محرومی ہے' اس کو صرف یہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں۔ ایک دفعہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں نے یہ اسامی نہیں لینی' بہر حال وہ نہیں ہے' کچھ اور سوچ لے گا۔ یہ جو بی اے نہیں تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں ہوں' اس کی ساری زندگی جہنم کے عذاب کے اندر گزرتی ہے۔

## ہندوؤں کے بالمقابل آزادی کے بعد نظریاتی طور پر ہم مسلمانوں کی پیچیدہ صورت حال کی بنیادی وجہ اور اس کا حل

ذرا سوچیے کہ کس عذاب میں ہماری قوم جکڑی ہوئی ہے۔ آزادی ہندو کو بھی ملی' ہمیں بھی ملی۔ اس نے پہلے دن سے یہ فیصلہ کر لیا کہ مذہب کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہاں سیکولر نظام ہوگا' مذہب ذاتی پرائیویٹ معاملہ ہے' ہر ایک کو اپنے اپنے پرائیویٹ

---

❶ آج (2011ء میں) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں اس کی مثالیں موجود ہیں لیکن سوچے کون؟

معاملے کی آزادی ہوگی' جس طرح سے جی چاہے وہ کریں' ہم اس میں دخل نہیں دیں گے لیکن امورِ مملکت کے اندر مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ دوسرے ہی سال Constitution (آئین) بھی بن گیا اور وہ اس نظام پر چلے جا رہے ہیں' کوئی پیچیدگی نہیں' کوئی مشکل نہیں' کوئی دشواری نہیں' کوئی Demonstration (مظاہرہ) نہیں' کوئی تحریک نہیں' کچھ نہیں۔ یہاں آپ کے ہاں تیئیس سال ❶ ہوگئے آئین سازی کے مسئلے میں' بھنور میں' آپ کی امت پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ہے' آگے ایک قدم ہی نہیں چل سکتے۔ کیا ہوا؟ يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْاٰخِرِ (2:8) انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت بنے گی۔

## ماڈرن طبقے پر مذہب پرست طبقہ کا اعتراض اور پھر ان کی اپنی کارگزاری کی روداد

اب اس کے بعد دونوں کیٹگریز (شقیں) ہیں' مذہب پرست طبقہ' ماڈرن طبقے کو ہمیشہ کوستا رہتا ہے کہ یہ اسلامی مملکت نہیں بننے دیتے۔ چلیے ! ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ یہ نہیں بننے دیتے' اگر ان کی طرف آ جایئے جو اسلام کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں اسلامی مملکت بنا کر رہیں گے' تیئیس (۲۳) سال ❶ تک یہ کہتے چلے آئے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اس میں کتاب وسنت کے مطابق قوانین نافذ کریں گے۔ کچھ تو وہ تھے کہ جنہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ مذہب پرست طبقے میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ہوتا چلا آ رہا ہے' کرتے چلے جا رہے ہیں' وہ تو یوں ہوتا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (43:22) متواتر ماں باپ سے ایک روش چلی آ رہی ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس روش پر چلتے دیکھا ہے وہ اسے دہرائے چلے جا رہے ہیں لیکن وہ بھی تھے جنہیں اس کا پتہ تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور وہ مسلسل کہتے چلے جا رہے تھے۔ قرآنِ کریم ان کے بارے میں کہتا ہے کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:9) خدا کو اور جماعت مومنین کو بھی دھوکا دے رہے تھے۔ جب بھی کبھی ایسا موقعہ آیا' ٹیسٹ کیس آیا' بنانے کی بات آئی' وہیں سے جھُل دے کر کسی طرف سے نکل گئے۔ منافق تو بنیادی طور پہ کہتے ہی اس کو ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ''ن ف ق'' اس کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ جو جنگلی چوہا ہوتا ہے' یہ ایک طرف سے بل بناتا ہے اور اس کے اندر جا کر اسی وقت دوسرا راستہ' پہلے سے کھود کر رکھ لیتا ہے کہ کہیں اِدھر سے خطرہ ہوا تو جھٹ سے اُدھر سے نکل گیا۔ منافق کے معنی ہوتے ہیں ''کسی جگہ داخل ہونے کے ساتھ ہی یہ سوچ لے کہ باہر جانے کا راستہ کونسا ہے''۔ ''او پہلاں ای فیصلہ کرلوے ایس چیز دا کہ کوئی گل نئیں نکل جاواں گا'' (وہ پہلے ہی اس چیز کا فیصلہ کرلے' انتظام کرلے کہ کوئی بات نہیں' میں نکل جاؤں گا)۔ یہ جو ان چیزوں کے مدعی بنے پھر رہے تھے انہوں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔

---

❶ یہ بات جنوری 1971ء کی 24 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ یہ یاد رہے۔

## قرآنی قوانین کی بجائے فرقہ بندی کی بنیاد پر فقہ حنفی رائج کرنے کی تجویز

اب جو وقت آیا' ٹیسٹ کیس آیا کہ صاحب! اب نئے آئین بننے والے ہیں اور اب تو راستے کی کوئی چیز روک نہیں ہے' نہ کوئی ڈکٹیٹر ہے' نہ کوئی آمریت ہے' نہ کوئی اس قسم کے لوگ ہیں' جمہوریت کی بنا پہ تم خود حکومت بناؤ' اب آؤ اسلامی قوانین بناؤ۔ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ نہیں صاحب! کتاب وسنت کی بنیادوں پہ تو آئین نہیں بن سکتا۔ ارے! کیا کہہ رہے ہیں آپ!!! تیئیس سال تک تو تم نے دہائی دے رکھی تھی' پھر اب کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ صاحب! فقۂ حنفی رائج کر لیجیے۔ انہیں معلوم تھا کہ جو غیر حنفی لوگ ہیں' وہ اس کو Accept (قبول) نہیں کریں گے۔ کیا آپ نے کبھی ان چیزوں پر غور کیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ یہاں اسلامی آئین نہیں بننے دینا چاہتے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اس میں مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی۔ کون ایسا ہے جو اپنا کاروبار بند کرا دے گا۔ آپ غور کیجیے کہ یہ کیا چیز ہوئی؟ کہ صاحب! کوئی نہیں ہے' یہاں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لیے کہا کہ فقۂ حنفی رائج کر دی جائے گی۔ انہیں معلوم ہے کہ جونہی یہ بات کہی تو غیر حنفی اٹھ کھڑے ہونگے اور ہوا بھی یہی کہ باقی اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم اس کو اسلامی مانتے ہی نہیں ہیں۔ آپ ہم سے یہ اسلامی منوا کس طرح سکتے ہیں۔ یہ بھی جانتے تھے کہ نہیں منوا سکتے۔ ان سے کہا کہ پھر کیا بات ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی فقہ آجائے۔ ان کی فقہ اپنی ہے' وہ فقۂ حنفی کیسے مان سکتے ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ انہوں نے کس مقام پہ کھڑا کیا ہوا ہے۔ اب یہ جو تیسرا آئین آپ کے ہاں زیر تشکیل ہے' اس میں پہلا ایشو یہ آنا ہے۔ اگر کوئی یہ نہ لائے تو سارے ملک میں آگ لگا دی جائے کہ مملکت کو اسلامی بننا ہے' ہم نے اس کو اسی چیز کے لیے حاصل کیا تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے حاصل کیا تھا حالانکہ یہ سب سے زیادہ مخالفت کر رہے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اسی مقصد کے لیے حاصل کیا تھا کہ اسلامی بنے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ یہ حاصل ہی اسی لیے کیا گیا تھا۔ اور اگر وہ اس کو رکھ لیں تو اس کے بعد کیا رکھیں گے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے یہ درک اسفل کتنا بڑا ہے! آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے' سچ تو یہ ہے کہ یہ چلنے ہی نہیں دے رہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن اور کافر کی تخصیص

قرآنِ حکیم نے تو ایک ہی بات کہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مومن اور کافر میں فرق کیا ہے۔ آپ سوچیے۔ کہا ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8) اس نے تو تخصیص کی ایک ہی لائن کھینچی تھی کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) سیدھی سی بات ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کا آج بھی نام لیجیے تو آپ دیکھیے آپ کے خلاف کیا کچھ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو مومن کی Definition

(تعریف) یہ کی ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرنے والے مومن ہیں۔ اس کو چھوڑ کر اس کے علاوہ کچھ دوسرا جو کرنے والے کافر ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ آج بھی کہہ کر دیکھ لیجئے' یہ کبھی نہیں آنے دیں گے۔ سوچیے تو سہی کہ پھر اس ملک کا کیا بنے گا۔ کہا ہے کہ **مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** (2:8) جو دعویٰ کرتا چلا جائے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اسلامی مملکت بنانے کے لیے جو خدا نے ایک بنیادی شرط قرار دی ہے' اس سے انکار کرتا چلا جائے اور کہے نہیں' میں انکار کر رہا ہوں۔ آپ ہر وقت ان کی زبانوں پر کتاب اللہ' قرآنِ حمید' ماانزل اللہ دیکھیں گے' یہ **مَنْ يَّقُوْلُ** ہے' یہ کہے چلے جائیں گے لیکن **وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8)۔ انفرادی طور پر تو میں نے اوپر مثال میں عرض کیا تھا کہ اپنی ایک چیز کو چھپا کر' کچھ بن کر' دوسری چیز لینے والا' وہی جو نان گریجویٹ تھا جس نے بی اے بن کر اسامی حاصل کر لی' وہ ملازمت کے سارے دورانیے میں کس جہنم میں گزرا۔ اور اجتماعی طور پر آپ دیکھ لیجیے کہ ہماری یہ مثال ہے۔ اس چیز کا دعویٰ ہے اور ایمانداری سے اس پر کوئی نہیں آ رہا۔ یہ نہیں ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس آیت کے معنی کس کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ چار ہی تو الفاظ ہیں۔ یہ کہا ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم بھگولے کے رقص کی طرح بکھری ہوئی ہے' کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ اس مشکل کے اندر پھنسی ہوئی ہے۔ غالب (1869-1797ء) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

ہے دلِ شوریدہ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

## اگر کسی نے دنیا بھر میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار کرنا ہو تو اپنے قول و عمل میں تضاد پیدا کر لے

کہا ہے کہ **اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا** (4:145)۔ اپنی یہ حالت ہے اور یاد رکھو! جو بھی کسی اپنے قول و عمل میں مخلص نہیں ہے' دنیا میں اس کا کوئی مددگار نہیں ہوا کرتا۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآنِ پاک! بھکاری کی طرح خیرات کے ٹکڑے تو تمہاری جھولی میں کوئی ڈال دیں گے' وہ بھی اپنے مقاصد کی خاطر ہونگے۔ دوست کوئی نہیں ہوگا' مددگار کوئی نہیں ہوگا' ناصر کوئی نہیں ہوگا۔ (جواہر لال) نہرو (1964-1889ء) جیسے کافر نے یہ بات لوٹا کر کہہ دی تھی جب اس نے اس وقت کہا تھا جب آئے دن آپ کے ہاں حکومتیں بدلا کرتی تھیں۔ اس سے کہا تھا کہ جا کر Treaty (معاہدہ) کرو تو اس نے کہا تھا کہ کس کے ساتھ Treaty (معاہدہ) کروں۔ معلوم نہیں کہ وہ کل کہاں ہو' ان کے تو قول و فعل کا اعتبار نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا** (4:145) ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہو سکتا۔ اپنے کون ہو سکتے ہیں۔ سنیۓ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے چار

الفاظ میں بات کی ہے۔کہا ہے کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا (4:146) اپنے وہ ہیں جو اپنی روش سے باز آ جائیں۔

## صحیح منزل پر پہنچنے کا طریق

پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم نے اس دوراہے سے جو غلط قدم اٹھایا تھا تم وہاں لوٹ کر واپس آ ؤ۔اسی راہ پر چلتے چلے جاؤ گے تو ہر قدم تمہیں منزل سے دور لیتا جائے گا۔اس دوراہے کے اوپر واپس جاؤ جہاں سے تم نے غلط قدم اٹھایا تھا۔کہو' اس بات کو تسلیم کرو کہ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہ کافر ہیں۔یہی بنیاد ہے ۔وہاں واپس آ جاؤ۔کیا اس دوراہے پہ واپس آنے سے منزل تک پہنچ جاؤ گے یہ کہہ کر کہ صاحب! چار گھنٹے کا سفر تھا' چار گھنٹے تو ہم نے چل لیا' بلکہ ہم نے تو آٹھ گھنٹے چل لیا' واپس بھی تو آئے ہیں۔کہتا ہے کہ نہیں! یہ تو صرف غلطی کی تلافی ہوئی جو تم نے کی تھی۔بات اب یہاں سے شروع ہوئی ہے۔کہا ہے کہ وَ اَصۡلَحُوۡا (4:146) آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لو۔اب صحیح سمت کی طرف قدم اٹھاؤ۔ اس نفاق سے نہیں کہ تُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (2:85) ان میں سے جو چیزیں اپنے مفیدِ مطلب ہوئیں وہ لے لیں اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔

## مذہب کی افیون کا علاج دین کو مضبوطی سے اپنانے ہی میں ہے

کہا ہے کہ وَ اعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰہِ (4:146) حبل اللہ کو محکمیت سے' مضبوطی سے تھامو۔وَ اَخۡلَصُوۡا دِیۡنَھُمۡ لِلّٰہِ (4:146) اپنی اطاعت اور فرماں پذیری کو اپنے نظامِ سلطنت اور نظامِ حکومت کو' اپنے دین کو' خالص اللہ کے لیے کرو۔یہ کرو گے تو فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (4:146) پھر تم مومنین کی جماعت میں شامل ہو سکو گے۔اور جب یہ ہو گا تو وَ سَوۡفَ یُؤۡتِ اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (4:146) پھر تم دیکھو گے کہ اس اجرِ عظیم میں شریک ہو جائیں گے جو قانونِ خداوندی کی رو سے عنقریب جماعتِ مومنین کو ملنے والا ہے۔یہاں سَوۡفَ ہے' یہ کوئی لمبی تاریخ یہاں نہیں پڑے گی کہ عاقبت میں ہی جا کر تمہیں کچھ ملے گا' کہا ہے کہ اس کے فوراً بعد تم دیکھو گے کہ اس کا کتنا بڑا عظیم اجر ملتا ہے! یہ جو تم اس عذاب میں مبتلا ہو اور اس کے لیے پھر تمہیں یہ افیون پلا دی جاتی ہے کہ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (29:21) اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ (48:14) جسے چاہتا ہے مغفرت کر دیتا ہے۔پھر یہ وعظ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو اللہ کی شان ہے جسے چاہے عذاب دیدے' جسے چاہے مغفرت کر دے:

اوتھے کی پرواہ اے راکب! اوتھے بے پروائیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں' چھڈ دے اوگنہاراں نوں

یہاں پہنچنے کے بعد یہ چیز ہے کہ قوم اگر ذلت اور عذاب کے اندر ہے تو اس میں کسی کا بس نہیں ہے بھئی! یہ تو یہ **یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ** ہے اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ** (4:147) اگر تم اس طرح سے ایمان لاؤ اور اقدار کی قدر دانیاں کرو تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔

## دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا ایک خطرناک نفسیاتی مرض ہے

سائیکولوجی میں ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے' اسے Sadism (اذیت پسندی) کہتے ہیں یعنی دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا۔ یہ جتنے مستبد چنگیز اور ہلاکو اور یہ اس قسم کی شخصیتیں تاریخوں میں ملتی ہیں' ان کا Analysis (تجزیہ) یہ ہے کہ وہ Sadistic (اذیت پسند) تھے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونے کی اور اگر چنگیز اور ہلاکو کا قوت اور اختیار حاصل ہو جائے تو پھر تو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ کیا کچھ کریں گے۔ وہ جو پہلے بادشاہوں کی باتیں سنتے ہیں کہ کوئی ان کے خلاف ہوا تو ٹھیک ہے بھئی! اس کو قتل کرا دیجیے' وہ یوں قتل نہیں کراتے تھے۔ جس جس عذاب سے اس کو قتل کراتے تھے وہ تھا کہ اندھے کنویں میں ڈالے ہوئے ہیں' بڑے بڑے چوہے وہاں چھوڑے ہوئے ہیں' بچھو اور سانپ چھوڑے ہوئے ہیں' بھوک سے بھی مار رہے ہیں' ہاتھیوں کے پاؤں تلے ان کو روندوایا جا رہا ہے' کھالیں کھنچوائی چلی جا رہی ہیں' الٹا لٹکوایا ہوا ہے۔ ایسے بادشاہ گزرے ہیں جو اپنا تخت اس جگہ بچھواتے تھے جہاں ارد گرد اندھے کنوؤں کے اندر ان دشمنوں کو ڈالا ہوتا تھا اور ان کی سسکیاں اور آہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ جس دن یہ آوازیں کم ہو جاتی تھیں' اس دن داروغے کو حکم ہوتا تھا کہ یہ کیا ہوا' آج آوازیں کم آ رہی ہیں' اس کے اندر اس قسم کے لوگ نئے تازے ڈالو[1]۔ یہ ایک ذہنیت ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! اب سوچیے کہ اگر یہ ذہنیت ہو تو میں تو ہلاکو اور چنگیز تک ہی رہتا ہوں کہ قوت وہ ہو' قوت ہو خدا کی اور معاذ اللہ معاذ اللہ ہو وہ کالی دیوی۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ہاں کالی دیوی ہوتی ہے۔ اس کے گلے میں انسان کی کھوپڑی کے ہار ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے Sadistic Mentality (اذیت پسند ذہنیت)۔ ان کی نفسیات میں یہ کیفیت تھی کہ ان کے ورن کا ہندو' نیچے ورن کے ہندو کو دبا کے' گلا گھونٹ کے' خوش ہوتا تھا' ان کا خدا جو تھا وہ کالی دیوی ہوتا تھا' کالی بھیرو ہوتا تھا۔ یہاں تو اب نہیں ہیں' پتہ نہیں' انڈیا میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سرخ رنگ کی اس کی زبان نکلی ہوئی ہوتی تھی' اس کی بھیانک ڈائن جیسی شکل ہوئی تھی' اس کے چار پانچ ہاتھ ہوتے تھے اور گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار یا وہ انسان کی لاش کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے ہاتھ میں کنڈی سی تھی' اس

---

1. آج بھی طاقتور قومیں اپنے مخالفین سے یہی سلوک کرتی ہیں صرف انداز مختلف ہے' ذہنیت تو وہی ہے۔

میں اس کو چبھویا ہوا ہے' خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں' دیوی یا دیوتا خوش ہو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ہو نفسیاتی کیفیت' کسی کی Mentality (ذہنیت) کی اور قوت اور اقتدار ہو لا منتہا' تو توبہ توبہ ہی بھلی!

## اللہ تعالیٰ کی کبریائی تو ان تصورات سے کہیں بلند ہے

خدا کے صحیح تصور کے بارے میں کہا ہے کہ **مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ** (4:147) تم اگر ان چیزوں کی قدر دانی کرو جو ہم نے تم سے کہی ہیں تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ آ ہاہاہا! یہ بڑی عجیب چیز ہے! یہ ہے وہ خدا۔ کہا ہے کہ **مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ** (4:147)۔ یہ کچھ کہنے کا کتنا حسین انداز ہے! اوسوچو تو سہی' تمہیں تکلیف پہنچا کر ہمیں کرنا کیا ہے مگر یہاں تو مرے کو مارے شاہ مدار۔ سچ یہ ہے کہ جو خود ہی مر رہا ہے اس کو اگر مارا تو کیا مارا۔ کہا ہے کہ **اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ** (4:147) صحیح اقدار حیات پہ ایمان لاؤ اور اس کے لیے بھرپور کوششیں کرو۔ **وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيۡمًا** (4:147) تم شکر گزار بنو تو ہم تمہارے لیے شاکر بنیں گے۔ کیا بات ہے!

## دوسروں کے سابقہ Career (پیشے' کام) کو معاشرے میں مت پیش کرو

اب آگے ایک اور بات آئی۔ یہ منافقین کا ذکر آ رہا تھا' ان سے کہا تھا کہ اگر یہ اپنی روش چھوڑ کر یہ کچھ باتیں اختیار کر لیں تو پھر تمہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے بعد ان کا جو Past Career (عہد ماضی کا پیشہ' کام) ہے' اس کے متعلق تشہیر کرتے پھرو کہ ہاں! ہمیں وہ دن یاد ہیں' ان کی کیفیت یہ تھی' یہ لوگ ایسے تھے۔ کہا ہے کہ **لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الۡجَهۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ** (4:148) ہم قطعاً اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم ان چیزوں کا چرچا کرتے پھرو۔ اور انہی کے متعلق نہیں' خود معاشرے کے متعلق بھی یہ چیز کہو کہ انفرادی طور پہ کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ جس چیز کو ناپسند سمجھتا ہو اس کے متعلق Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دے۔ دہائی دینا شروع کر دے' نہیں' ہم قطعاً اسے پسند نہیں کرتے۔

## اپنی پسند کو دوسروں سے باور نہ کروانے کی شکل میں انہیں بدنام نہ کیا جائے

یہ ٹھیک ہے کہ **اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ** (4:148) ہاں' البتہ جس پر ظلم ہوا ہو' وہ ظلم کی تو فریاد کر سکتا ہے لیکن اگر اس پر ظلم نہیں ہوا ہے' کوئی بات ہے' جو اسے ناپسند ہے تو یہ بات غلط ہے کہ تم دوسروں کے خلاف ان کی تشہیر کرتے پھرو۔ معاشرے کے اندر تو قرآنِ کریم نے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کو کہا ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے کہا ہے کہ **وَ اِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ** (4:83) معاشرے میں فتنہ پروری کی ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا مقصد اور منصب یہ رہ جاتا ہے کہ کسی طرح معاشرے میں خلفشار

پیدا کرتے چلے جائیں' انتشار پیدا کرتے چلے جائیں' فساد برپا کرتے چلے جائیں' نہ کسی کو سکون سے بیٹھنے دیں' نہ کسی کو معاشرے میں چین سے بیٹھنے دیں۔ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

## بغیر تصدیق کیے کسی کی بات کو آگے مت پھیلاؤ

عزیزانِ من! ان کی کیفیت یہ ہے کہ جونہی کوئی بات' کہیں سے' پہنچی تو انہوں نے دہائی دینا شروع کردی۔کہا کہ ہوسکتا ہے کہ فی الواقعہ وہ بات صحیح ہو' اس کے نتائج وعواقب معاشرے کے لیے بڑے ہی نقصان رساں ہوں۔ہاں! **وَ لَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ** (4:83) کرو یہ کہ اگر کوئی ایسی بات آئے تو جو اربابِ اختیار واقتدار ہیں' جو ذمہ دار لوگ ہیں' ان تک جا کر رپورٹ کرو تاکہ وہ تحقیق کرلیں' پھر کسی صحیح نتیجے پہ پہنچیں' اس کے مطابق مناسب اقدامات کریں۔کہا کہ یہ طریقہ ہونا چاہیے۔اب یہاں تو یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ ''اک پَر دیاں ڈاراں بناندے ہیگے نیں'' (ایک ہی پَر کو بڑھا چڑھا کر پرندوں کا غول بنادیتے ہیں) یعنی کسی چڑیا کو دیکھا' کہا کہ وہ ڈار ہوتی ہے۔وہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بناتے ہیں' ذرا سی چیز ہوتی ہے وہ اسے اتنا بڑا ابھار دیتے ہیں۔ہم اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں کہ ''پروی نئیں ہوندا' تے ڈاراں بن دیاں ہویاں ہوندیاں نیں'' (ایک پر بھی وہاں نہیں ہوتا مگر ان کے نزدیک غول کے غول بن رہے ہوتے ہیں)۔کل ہی آپ نے یہ تماشا دیکھا جو ہمارے ہاں ہوا تھا۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضور ذات رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس واعظم ﷺ اتنی بلند ہے کہ حضور ﷺ کی تعظیم وتکریم واحترام کے لیے تو اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہے گا کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' حضور ﷺ کی ذات اقدس میں کسی قسم کی جو اہانت وگستاخی ہے' وہ کبھی مومن برداشت نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی تو خدا کا حکم ہے کہ اگر کوئی ایسی چیز آئے تو اس کے متعلق' جو ذمہ دار ارباب ہیں' ان تک وہ بات پہنچایئے' وہ مناسب تحقیق کریں' وہ پھر اقدامات کریں جو کچھ کرنا ہے۔اور اگر کیفیت یہ ہوجائے کہ جس کا جی چاہے وہ اس چیز کو لے اڑے اور پھر تخریبات کی یہ کیفیت ہو کہ توڑ پھوڑ کرو' آگ لگاؤ' یہ کرو وہ کرو۔اس طرح معاشرے میں کبھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ ہونے کے بعد' کل کے اخبار میں جو نکلا ہے وہ آپ احباب نے پڑھا ہوگا۔وہ ایک ''کتاب'' ہے جس کے متعلق ساری دہائی دی گئی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ کوئی چار سو سال ہوئے' ترکی میں ایک شخص تھا' اس نے یہ کتاب لکھی تھی' وہ اسی زمانے میں مر بھی گیا' اور یہاں یہ ہو رہا تھا کہ کوئی کہتا تھا کہ مصنف انڈین نیشنل ہے' کوئی کہتا تھا کہ برٹش نیشنل ہے' اس کو پکڑو۔میں یہ نہیں کہتا کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق کہیں سے گستاخی کا کلمہ سننے سے ہمارا دل تڑپ کیوں نہ اٹھے لیکن دل کی تڑپ کے یہ معنی نہیں کہ ہم خود خنجر ہاتھ میں لے لیں۔قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ جب کبھی ایسی بات ہو تو اسے ذمہ دار احباب تک پہنچایئے' وہ بھی تو وہی

ہیں جن کے سینوں میں وہی دل ہے جو اس بات پہ ہم سے بھی زیادہ تڑپ اٹھے گا لیکن اس سے جو کیا جائے گا اس سے معاشرے کا نظام نہیں بگڑے گا اور جو اقدام کیا جائے گا وہ Effective (مؤثر و کارآمد) ہوگا۔ اور اگر یہ نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنا معاشرہ تو تباہ ہو جاتا ہے اور وہ جو اصل مقصد ہوتا ہے وہ اس کے بعد مفقود ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو ہمیں اس کی تلقین کی ہے۔

عزیزانِ من! دوسری جگہ ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا (49:6) جب بھی کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو یونہی اس کے پیچھے نہ جاؤ' اس کی چھان بین کرو۔ اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (49:6) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یونہی اٹھ کر جذبات میں یہ فساد انگیزیاں شروع کر دو' اپنی تباہیاں کر لو اور اس کے بعد افسوس ہو کہ ہم نے یہ کیا کر دیا۔ اسی ضمن میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) خدا یہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ جو چیز تمہیں ناپسند ہو' ناگوار گزرے' تم اس کی تشہیر شروع کر دو' دہائی دینی شروع کر دو' Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دو' فساد برپا کرو۔ نہیں' قطعاً ایسا نہیں کرو۔ جس پہ ظلم ہوا ہے' وہ اپنے ظلم کی فریاد کرے اور اگر اس قسم کی کوئی خبر پہنچی ہے تو ذمہ دار ارباب تک پہنچائیے۔ ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آگے کہا ہے کہ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) یہ جو اللہ ہے' جس کے نام پہ حکومت قائم ہوتی ہے' اس کے یہ فرائض ہو جاتے ہیں' وہ حکومت سمیع و علیم ہوتی ہے' صحیح تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس بہت سے ذرائع ہوتے ہیں' انہیں صحیح تہہ تک پہنچنے دو۔ باقی رہا یہ کہ کسی کے متعلق جو اچھی بات ہے' ٹھیک ہے کہ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ (4:149) اس کا تم چرچا بھی کر سکتے ہو' اس کو تم ویسے بھی رہنے دے سکتے ہو لیکن جو چیز معاشرے میں فساد کا موجب بنتی ہے' تم اس کا چرچا نہیں کر سکتے۔ یہ بھی چیز ہے کہ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ (4:149) کبھی کوئی برائی تمہارے خلاف ہوئی ہے' اسے درگزر کر کے تم آگے بھی بڑھ سکتے ہو۔ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا (4:149) یاد رکھو! خدا میں دونوں چیزیں موجود ہیں' وہ قدیر بھی ہے کہ اس نے اس کے لیے قانون بھی بنا رکھا ہے' وہ عَفُوًّا (4:149) بھی ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ یونہی اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر وہ یونہی آگے بڑھ جاتا ہے۔

## لفظ عَفُوًّا کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''درگزر کرنا'' ہے اور بابا جی دی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا

یہ عَفُوًّا عجیب لفظ ہے' اسے ہم معافی کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں ''کسی بات سے آگے بڑھ جانا' جسے درگزر کہتے ہیں''۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے نظام میں یہ دونوں چیزیں ہونگی کہ اگر وہ ایسی فتنے کی صورت نہیں ہے اور اس میں اصطلاح کا امکان ہے تو اس میں وہ معاف کر دے گی' اگر ایسی صورت نہیں ہے تو قانون کے شکنجے میں لے آئے گی لیکن انفرادی طور پہ' تم اس طرح سے Law (قانون) کو اپنے ہاتھ میں مت لو۔ یہاں وہ بات آئی ہے۔ یہ منافق یا کافر کی بڑی اہم چیز آئی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ

یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ (4:150) جولوگ خدااوراس کے رسولوں کاانکارکرتے ہیں یا خدا کوتو مانتے ہیں کہ کارگہ کائنات میں اس کے قوانین جاری وساری ہیں لیکن جہاں تک انسانوں کی دنیا کاتعلق ہے وہ اس قانون سے انکارکرتے ہیں یااس کے قانون کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ کسی ایک رسول کی طرف نازل شدہ قانون کے من جانب اللہ ہونے کوتسلیم کیا اور دوسروں کی تکذیب کر کے اللہ اوراس کے رسول میں تفریق پیدا کی اوراس طرح یہ صرف ''اللہ اور رسول'' پرایمان ہے۔ یہ قرآن حمید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔

عزیزانِ من! جب جھکڑ آتا ہے تو انسان کپڑوں کواپنے ساتھ سمیٹ لیتا ہے۔ جب خاموشی سے حرارت آتی ہے تو خود انہیں اتار کررکھ دیتا ہے۔ معاشرے میں جھکڑ نہیں پیدا کرنے چاہئیں' سورج کی سی خاموش حرارت پیدا کرنی چاہیے۔ مثلاً ''ان'' کا یہ مکالمہ سنیے۔ صبح اتنی ٹھنڈ تھی' ہم نے وہ سائبان نہیں لگایا' انہوں نے کہا کہ بابا جی! بارش نہیں ہورہی ''فصلاں سُک گیاں حال براہوریااے'' (فصلیں خشک ہوگئیں' بُرا حال ہورہا ہے)۔'' کہن لگے اچھا! اے ساڈی جھلی جیہڑی ہیگی اے کل دھوتی سی' ایہنوں باہر دھپے پادیو' (کہنے لگے کہ اچھا! یہ جو ہماری گدڑی ہے' اسے کل دھویا تھا اسے خشک ہونے کے لیے دھوپ میں ڈال دو)۔'' کہن لگے: پتہ نئیں باہر دھپے اوہدے نال کی تعلق اے' آیا بدل' کڑاکڑ مینہ وسنا شروع ہویا' اوہناں نے کہیا کہ بابا جی! ایہدے اچ کی راز اے؟ کہن لگے: آج کل ساڈی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا❶ ''۔ یہ اندازوں کی غلطی ہے' عزیزانِ من! اس کے ہاں تو ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

## انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کوتو مانتا ہے لیکن وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو تسلیم نہیں کرتا

کہاہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ (4:150) ۔عزیزانِ من! میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پہ یہ ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ زمین وآسمان کو کس نے بنایا ہے تو کہیں گے کہ خدا نے بنایا۔ ان سے کہو کہ اس خارجی کائنات کے نظام پر کس کی قدرت ہے' سورج کون چڑھاتا ہے' ہوائیں کون چلاتا ہے؟ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ یہاں تک تو تم خدا کو مانتے ہو اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی دنیا میں خدا کے قوانین کو مانو تو اس کے بعد کہا ہے کہ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ (43:87) ''تہانوں فیر کی موت پے جاندی اے ایتھے آکے'' (یہاں

---

❶ کہنے لگے: معلوم نہیں کہ باہر دھوپ میں' اس کا' اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ بادل آیا کڑاکے دار' بارش برسنا شروع ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ بابا جی ! اس میں یہ کیا راز ہے؟ کہنے لگے: آج کل ہماری اللہ میاں سے لگی ہوئی ہے' اللہ میاں سے چل رہی ہے۔

آ کر پھر تمہیں کونسی موت پڑ جاتی ہے )۔ یہ ہے خدا کا ماننا۔عزیزانِ من! اگر خدا کے قانون کو نہیں ماننا ہے تو خدا پہ ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ وہ دہریہ جو بالکل ہی نہیں مانتا' وہ بھی قوانینِ فطرت کو مانتا ہے اور یورپ کا مادہ پرست تو ہم سے بھی زیادہ خدا کو مانتا ہے' وہ توان قوانین کی صداقت پر اس طرح سے علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے' اس چیز کا روز مشاہدہ کرتا ہے' نام چاہے کچھ اور رکھ لے۔اور جو اس طرح سے وہاں انکار نہیں کرتے وہ سب خدا کو مانتے ہیں' بڑے بڑے سائنٹسٹ کی کم از کم آخری عمر کی کتابوں کو دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر خدا کو مانتے ہیں۔وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کو ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔خدا کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میری جو زندگی ہے' وہ خدا کے قوانین کے تابع چلے گی' خدا کا ماننا خدا کے قوانین کو ماننا ہے۔

## خدا کے ماننے یا نہ ماننے کا تمام تر دارومدار حیات انسانی کے لیے دی گئی راہنمائی پر ایمان لانے پر موقوف ہے

اور یہ قوانینِ خداوندی انسانوں کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں ہیں' وہ رسول ﷺ کی وساطت سے ملتے ہیں اس لیے رسول ﷺ پہ ایمان نہیں لایا جاتا تو خدا پر ایمان بے معنی ہوتا ہے۔یہ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ اور ان تمام لوگوں کو جو خدا کو مانتے تھے' اپنے اپنے نبیوں کو بھی مانتے تھے' کیوں تاکید کر رہا ہے کہ تمہیں اس رسول ﷺ پر ایمان لانا ہوگا اور اس کتاب پر ایمان لانا ہوگا۔اس لیے کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو ضابطۂ حیات دیا ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے ورنہ یونہی خارجی کائنات کے اندر آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کی کارفرمائی کو مان لینا' نہ مان لینا' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ایک کہتا ہے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ خود وجود میں آ گئی۔کیا فرق پڑتا ہے؟ فرق یہ پڑتا ہے کہ ایک کہتا ہے کہ میری زندگی' میرے فیصلوں کے تابع چلے گی بلکہ یوں کہیے کہ میرے فیصلوں نہیں' پارلیمنٹ کے فیصلوں کے تابع چلے گی' قوم کے' عوام کے' فیصلوں کے تابع چلے گی اور اس کے باوجود جا کر مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے۔ایمان وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ میری ساری زندگی خدا کے دیئے ہوئے قوانین کے تابع چلے گی' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ملے گی۔یہ ہے خدا پر ایمان۔

## برہمو سماجی طریق کا پروگرام اور اس کا نتیجہ

مختلف مذاہب کے باہمی سر پھٹول کو دیکھ کر ہمارے ہاں برہمو سماجی [1] ایک فرقہ پیدا ہوا تھا اس کا بانی راجہ رام موہن رائے تھا۔ اس نے یہ بات کہی تھی کہ صاحب! یہ سب چیزیں اس لیے ہو رہی ہیں کہ تم الگ الگ مذاہب رکھے ہوئے ہو۔اس نے کہا تھا کہ تمام

---

[1] ہندوؤں کا مکتبۂ فکر جس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں رکھی تھی۔

مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو اکٹھا کرلیا جائے۔ گویا یہ کہ مذاہب میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں' بری بھی ہوتی ہیں۔ مذاہب میں تو یہ ہوتا ہی ہے اس لیے کہ وہاں تو خدا کے پیغامات میں تحریف ہوچکی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو جمع کرلیا جائے اوراس کواپنے لیے ضابطہ بنالیا جائے' باقی رہا خدا سے تعلق تو کسی نے مندر میں گھنٹی بجالی تو کیا' کسی نے گرجے میں بل (Bell) بجالی تو کیا' کسی نے اذان دے لی تو کیا۔ یہ بات تو ذاتی خدا سے تعلق کی ہے۔ اچھی اچھی باتیں اکٹھی کرلی جائیں۔ اس کا بڑا چرچا ہوا کہ صاحب! یہ بہت اچھا ہے۔ یہ چار دن بھی نہیں چل سکا۔ اور یہ بات صاف ہے۔ ہم کم ازکم جتنے مسلمان ہیں یا دنیا بھر کے جتنے بھی صاحب شعور لوگ ہیں' ان میں یہ جتنے بھی جنہیں ہم Universal Moral Laws (عالمگیر ضابطۂ قوانین) کہتے ہیں' آپ عالمگیر ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں مثلاً سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' فریب نہ دو' چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' کسی کو نہ ستاؤ' یہ ساری دنیا میں Common (مشترک) ہیں۔ اس کے باوجود ساری دنیا میں یہ ہو کیا رہا ہے؟ یہ اس چیز پہ ایمان نہیں ہے کہ یہ چیزیں مستقل اقدار ہیں جن کے تابع زندگی بسر کرنا میرا ایمان ہے۔

## قرآنی ضابطۂ حیات پر ایمان زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا

عزیزانِ من! اسے ایمان بالرسالت کہتے ہیں جس میں خدا کی کتاب پہ ایمان شامل ہوتا ہے۔ خدا کو ایک Personal God (تجسیمی خدا) مان لینا' اس کے ساتھ میرا ذاتی تعلق ہے اور جو اعمال حیات ہیں ان کو اپنے قانون کے تابع' اپنی مرضی کے تابع' ملک کے قانون کے تابع' رکھ لینا' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے' یہ تفریق بین اللہ وبین الرسل ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم اللہ میں اور اس کے رسولوں میں تفریق کرتے ہو حالانکہ جس کو رَسُوْلَـهٗ کہا ہے' خدا کا پیغامبر کہا ہے تو پیغام بھیجنے والے میں اور اس پیغام میں فرق کرنا یعنی وہ جو بھیجنے والا ہے' اس کو آپ نے مانا کیا ہے؟ اس کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پیغام کو' پیغام لانے والے کو' مانیئے۔ یہ اس طرح کا Personal God (شخصی سا خدا) ہے' یہ اس کا تصور ہی وہاں پیدا ہوا تھا جب سیکولر نظام حکومت اپنے ہاں رائج کیا کہ جو Personal (شخصی) معاملات ہیں ان کے اندر تو تم جانو' تمہارا خدا جانے اور دوسری طرف جتنے بھی امور دنیاوی ہیں' جو امور مملکت ہیں وہ ہمارے اپنے باہمی مشورے سے طے ہونگے اور اس کا انہوں نے نام رکھا ہے خدا پر ایمان۔

## تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں مخالفت کرنے والے علما کے متعلق علامہ اقبالؒ کا ارشاد

وہاں انڈیا کے اندر یہی چیز تھی جو پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں اور اس کی مخالفت کرنے والے مسلمان علما میں مابہ النزاع تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ہندوستان میں مذہب کے عقائد کی' رسومات کی' عبادات کی' اجازت ہے مگر جو ملکی قوانین ہیں وہ ملک کے

ہونگے۔اس کہنے والے (اقبالؒ) نے اس کے خلاف کہا تھا کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ اللہ اور رسولﷺ کے اندر تفریق تھی۔مسلمانوں کے معاشرے کے اندر بھی جو لوگ تھے وہ اس کی جرأت تو نہیں کرتے کہ وہ اعلانیہ یہ کہہ دیں کہ خدا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں' ہم نہیں مانتے۔میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے یہ کہنے کی بڑی جرأت ہے۔یہ جرأت یہاں کس کو نصیب ہے۔یہاں وہ لوگ موجود ہیں جو فی الواقعہ خدا کے ان قوانین کے تابع' قرآنِ کریم کے تابع' نہیں رہنا چاہتے' وہ قرآنِ حکیم کو مانتے ہی نہیں ہیں کہ یہ بھی کوئی وحی کی چیز ہے' اس میں ابدی حقائق ہیں' ابدی قوانین ہیں' اس پر ان کا ایمان نہیں ہے مگر ان کی دشواری یہ ہے کہ نہ کر نہیں سکتے۔آپ کو پتہ ہے کہ وہ خدا پرستی کی شہادتیں کس طرح سے دیتے ہیں؟ عُرسوں پہ چلے جائیں گے' داتا صاحب کے مزار پہ چلے جائیں گے' بلھے شاہ کے ملنگ بن جائیں گے۔یہ سارا کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ معاشرے کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم دہریئے نہیں ہیں۔لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے کہ وہ تو عقیدت مندی کی بڑی انتہا ہوتی ہے جو ان قبروں پہ چلا جاتا ہے' وہاں چلا جاتا ہے۔یہی فرار (Escapism) تو تصوف ہے۔نظامِ دنیا کو چھوڑ دینا کہ جس قسم کے جی چاہے یہاں قوانین نافذ ہوتے رہیں' اپنا تعلق خدا کے ساتھ یوں وابستہ کر لینا۔

کہا ہے کہ **یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (2:9)۔یورپ کا ہر بڑا سائنٹسٹ جو خارجی دنیا میں خدا کو مانتا چلا جا رہا تھا' آپ دیکھیں گے کہ آخر میں آکر ان میں سے ہر ایک اس کا نسچت (منکر) ہوگیا۔یہ کیا چیز ہے؟ یہ ہے خدا کو ماننے کا عملی ثبوت۔آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن کی عام زندگیاں ہر قسم کے عیوب میں' ہر قسم کے معائب میں ہوتی ہیں' جو قانون شکنیوں کے اندر ہوتے ہیں' جو اسمگلر ہوتے ہیں' جو جوئے باز ہوتے ہیں' وہ سب سے زیادہ قبروں پہ جانے والے ہوتے ہیں' وہ اس طرح خدا پر اپنے ایمان کا ثبوت دے رہے ہوتے ہیں۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ اللہ اور رسولﷺ میں تفریق کفر ہے۔

عزیزانِ من! کیا کہنے ہیں اس کتاب کے! یہ تو کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتی۔اللہ اور رسولﷺ کا ماننا کیا ہے؟ رسولﷺ کے ذریعے جو پیغام ملا ہے' اس کو زندگی کا عملی ضابطۂ حیات قرار دینا ہے۔یہ ہے اللہ پر ایمان۔جب اس نے کہا تھا کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ** (2:8) وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے۔وہ یہ لوگ تھے جو **اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ** (4:150) **بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ** فرق کرتے ہیں اور اس طرح اقرار اور انکار کے بین بین ایک تیسری راہ اختیار کرنے کی

سوچتے ہیں۔

## ہرامت رسول کی نسبت سے تشکیل پاتی ہے

اب آگے اس میں دو تین باتیں کہی ہیں' کہیں تو یہ صورت ہے کہ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) ان رسولوں میں سے جو آتے رہے' ان میں سے بعض پر کہتے ہیں ہم ایمان لائے' بعض کو کہتے ہیں کہ ہم انکار کرتے ہیں۔ یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک کے نبیوں پہ ایمان لانے کے لیے مطمئن ہے' یہودی' عیسائی ہوجاتا ہے جب وہ حضرت عیسیٰؑ پہ بھی ایمان لے آتا ہے۔ وہاں پھر وہ مطمئن ہوگیا۔ ٹھیک ہے' وہاں تک تو ٹھیک تھا' اس کے بعد نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔ نبی اکرم ﷺ سے انکار مگر پہلے تمام انبیاء پر ایسے اقرار کو قرآنِ کریم اقرار نہیں مانتا۔

## آخر پھر ختم نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

یہاں سے ضمناً ایک اور بات سامنے آ گئی۔ بڑا آسان مسئلہ ہے کہ جو روز ہمیں درپیش ہوتا ہے کہ آیا یہ مرزائی مسلمان ہیں یا نہیں' یہ امت محمد ﷺ کے افراد ہیں یا ان کو الگ امت کے افراد قرار دیا جائے؟ یہ بڑی آسان سی بات ہے۔ امت بنتی کس طرح سے ہے؟ ایک یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے تمام نبیوں کو مانتا ہے' وہ موسوی امت کا قائل ہے' حضرت موسیٰؑ کو اپنا نبی مانتا ہے' جس دن وہ حضرت عیسیٰؑ کو نبی مان لیتا ہے' وہ عیسائی ہوجاتا ہے' یہودی نہیں رہتا' اس آخری نبی جس کو اس نے مانا ہے' اس پہ ایمان لانے سے اس نبی کی امت کا فرد ہوجاتا ہے۔ عیسائی' عیسائی رہتا ہے جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا' جس دن وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی نہیں رہتا' مسلمان ہوجاتا ہے یعنی وہ اب امت عیسوی کا فرد نہیں رہا' امت محمدیہ ﷺ کا فرد ہوگیا۔

یاد رکھو! رسول کی نسبت سے امت بنتی ہے۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور نبی پر ایمان لے آیا تو جس طرح عیسائی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے عیسائی نہیں رہتا اسی طرح مسلمان آپ ﷺ کے بعد کسی نبی پہ ایمان لانے سے' آپ ﷺ کی امت میں تو نہ رہا بلکہ اس نئے نبی کی امت میں سے ہوگیا۔ بات تو صاف ہے کہ جی! ہم رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں' قرآنِ کریم کو مانتے ہیں۔ یہ بے بنیاد۔ اور جب تک کوئی اس رسول کی امت کا فرد نہیں ہوتا تو اس کے لیے خدا پر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عزیزانِ من! یہ فریب ہے' فرار ہے' گریز ہے' قرآنِ حکیم اسے کفر کہتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) وہ کہتے ہیں کہ ہم ضابطۂ قوانین کی ایک بات پر ایمان لاتے ہیں اور دوسری سے انکار کرتے ہیں۔ پھر یہ ایک ہی رسول یا ایک ہی رسول کی کتاب میں سے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے انکار ہے۔

## مسلمان ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کو من حیث الکل تسلیم کیا جائے

قرآنِ حکیم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) کیا اس کتاب کی بھی تم یہ کیفیت کرتے ہو کہ اس کے کچھ حصے پر ایمان لے آؤ اور کچھ حصے سے انکار کر دو یعنی اسے بھی آپ کو من حیث الکل لینا ہوگا۔ کچھ حصہ تو ایک طرف اگر آپ پاکستان کے ضابطۂ قوانین میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہہ دیں کہ میں اس سے سرکشی (یعنی جرم اور چیز ہے کہ اس کی خلاف ورزی آپ سے ہو جائے) اختیار کرتا ہوں' اگر آپ یہ کہیں کہ میں اس حکومت کو اس کا Competent (مجاز) نہیں مانتا کہ وہ اس قسم کا قانون بنا سکے اور نافذ کر سکے تو یہ بغاوت ہے۔ آپ اس مملکت کے نیشنل (شہری) نہیں رہ سکتے جس کے قانون کے متعلق آپ یہ چیلنج کر دیں کہ اس باب میں یہ میری مملکت نہیں رہی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ کیا کرتے ہو کہ ضابطۂ قوانین کے ایک حصے پہ ایمان لاتے ہو' اور دوسرے سے انکار کرتے ہو۔ کہا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) ایسی روش اختیار کرنے والے جو دو غلے ہیں' ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری ہوگی' عاقبت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگا۔ ضابطۂ حیات کو تو کلی ماننا ہوگا یا کلی انکار ہوگا۔ کہا ہے کہ **اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً** (2:208) پورے کا پورا اس میں داخل ہونا ہوگا۔ منافق یہ کرتے ہیں کہ **نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا** (4:150) بین بین کی راہ اختیار کی جائے' نہ تو پورے کا پورا انکار کیا جائے' نہ پورے کا پورا اقرار کیا جائے۔ صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ عزیزانِ من! یہ جو چلمنی پردہ ہے یہ منافقت ہے' اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہاں Percentage (فی صد) کا حساب نہیں ہے کہ کوئی نہیں صاحب! 33% تو حاصل کر لیے' پاس مارکس ہو گئے۔ یہاں تو ہر Subject Compulsory (مضمون لازمی) ہے۔ سارے Optional (اختیار مضامین) سے آپ 100% مارکس لے کر ایک Compulsory Subject (لازمی مضمون) میں' ایک نمبر سے فیل ہو جایئے' آپ پورے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ضابطۂ ہدایت کا ہر مضمون Compulsory (لازمی) ہے۔

## صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر بین بین راستے پر چلنے والا مسافر کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا

کہا ہے کہ **اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا** (4:150) بین بین کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سنیے! عزیزانِ من! کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا** (4:151) خدا کو مان رہے ہیں' بعض رسولوں کو بھی مان رہے ہیں' کچھ حصہ جو ہے اس پہ ایمان بھی ہے' کچھ حصے پر کچھ عمل بھی ہے' باقی ماندہ کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ میں نے جیسا کہا تھا کہ ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ چلیے بہر حال اتنے

Percent(فی صد) مارکس تو مل ہی جائیں گے۔ وہ کافر ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ کہہ رہا ہے کہ **هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا** (4:151) ۔اس میں فریب کی گنجائش تھی اس نے فریب کو توڑنے کے لیے یہ **حقًا** کہہ کر ''ایہڈا وڈا ودان ماردتا اے۔تہاڈی ایسی دی تیسی'' (اتنا بڑا ہتھوڑا ماردیا ہے۔تمہیں ملامت کردیا ہے)۔کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا** (4:151) اس قسم کی روش اختیار کرنے والے جو کافر ہیں' ان پہ جو عذاب آتا ہے' وہ رسوا کن ذلت آمیز ہوتا ہے۔یہاں عذاب مھین کہنا کیا بات ہے صاحب! ذلت اور وہ بھی منافقت کی ذلت کا کیا پوچھنا ہے! کہا ہے کہ **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (4:152) ان کے برعکس وہ لوگ جو خدا پر یوں ایمان لاتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغام رسانوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔رسول اور اس کی رسالت' اس کے پیغامات پر ایمان لانا' یہ ہے خدا پہ ایمان لانا' وہ اس میں کوئی فرق نہیں کرتے۔یہ ہیں جنہیں تم دیکھو گے کہ بہت جلد ان کی محنتوں کا معاوضہ دیا جائے گا۔معاوضہ یوں ہوگا کہ ان کی کچھ کمزوریاں' کچھ کوتاہیوں کی حفاظت بھی ہو جائے گی' سامان نشوونما بھی ملتا جائے گا' قوم آگے بڑھتی چلی جائے گی۔

## ایمان کی منزل تک پہنچنے کا طریق اور ایمان کے سلسلہ میں اکراہ کا مفہوم

اب یہ رہا کہ ایمان کیسے لایا جائے۔قرآنِ کریم نے یہ چیز بتائی ہے کہ ایمان کے معنی ہیں ''قلب اور دماغ کو امن نصیب ہو جانا' کامل اطمینان ہو جانا' علیٰ وجہ البصیرت کسی چیز پہ غور وفکر کرنا' اور اس طرح سے اس نتیجے پہ پہنچنا کہ یہ واقعی حق ہے' اس کا نام ہے ایمان''۔اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں ہے۔اکراہ وہ ہے جسے ہم زبردستی کہتے ہیں۔ذہن میں اکراہ ایک ہی آتا ہے کہ کسی نے ہاتھ میں تلوار لی اور کہا کہ پڑھو کلمہ اور اس کے اس تلوار کے ڈر سے جو کلمہ پڑھ لیا' اسے کہتے ہیں کہ اکراہ ہوا یعنی کسی سے زبردستی کرالیا۔یہ تو اکراہ کی بڑی معمولی سی چیز ہے۔

برادرانِ عزیز! اکراہ وہ ہے کہ آپ کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' آپ سے کوئی بات منوالی جائے اور پھر ایسا چکر رکھا جائے کہ آپ اس سے نکلنے ہی نہ پائیں۔یہ ہے صحیح اکراہ۔یہ وہ اکراہ ہے جس کا تعلق قلب و دماغ سے ہے۔یہاں سے بہت کم نکلا جا سکتا ہے۔تلوار بزورِ بازو تو محسوس اکراہ ہے۔اس میں تو آپ دیکھیں گے کہ لوگ نکلے' انہوں نے سر دیدیا لیکن غلط بات نہیں مانی۔اس قلب ونگاہ کو ماؤف کرنے میں آپ دیکھیں گے کہ قدم قدم پر نظر آرہا ہے کہ غلط بات ہو رہی ہے مگر عقیدت ہے کہ آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں۔کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! آپ نہیں جانتے' یہ بڑے دور کی باتیں ہیں' یہ باتیں عالم بالا کی ہیں' وہ اس کے متعلق خوب جانتے ہیں۔یعنی کامیابی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں' ناکامی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں۔ایک پروگرام کی ناکامیوں کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ جو

متبعین کی جماعت ہے' وہاں کھڑے ہو کر یہ سوچے گی کہ نہیں صاحب! وہ پروگرام غلط تھا' اس میں ناکامیاں ہوئیں' وہاں پہنچ کر بھی ان کو وہ اس قسم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے کہ وہ ناکامیوں کو کامیابیاں سمجھنے لگ جاتے ہیں ''ایویں ای لوگ رولا پوندے رہندے ہیگے نیں جی' اینوں جتیاں پیاں جتیاں پیاں۔ لوکاں نوں گل کرن لگیاں شرم وی نئیں کتھے اوندے' او جتیاں سن' اپنے اپنے تے بچگانے سن ❶'' لیکن قربان جایئے ماننے والوں کے' وہ بھی مانتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! واقعی ''اوہنوں جتیاں نئیں سن پیاں پروپیگنڈہ ہوریا اے جناب سب کچھ'' (اسے جوتے نہیں پڑے تھے۔ یہ تو جناب! سب کچھ محض پروپیگنڈہ تھا)۔ یہ چیز ہے کہ جس سے قلب و دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر لیا جائے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اکراہ' جہاں قوم کو تباہ کیا جاتا ہے۔

کہا ہے کہ **يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ** (4:153) ہم نے کتاب دی' کہا کہ غور و فکر کرو' دیکھو تو سہی کہ کس طرح سے ان چیزوں پہ پورا اترتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ایسے نہیں' ہم ایمان لائیں گے کہ یہ جو کتاب ہے یہ آسمان سے لکھی لکھائی اترے ''جلد بنی بنائی اتوں تری اون ڈئی ہووے'' (جلد بنی ہوئی اوپر سے نازل ہوئی آ رہی ہو) یعنی ایسے کتاب اتارو تو پھر ہم ایمان لائیں گے۔ دیکھا ذہنیتیں! کرامات کے زور پر تو خدا کو مانیں گے کہ آسمان سے یوں کتاب اتارو۔

## حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں کا مطالبہ کہ آسمانوں سے خدا کو ہمارے سامنے لاؤ اور آسمانوں سے کتاب اتارو

بعض اوقات تو قرآنِ مجید ایسا جواب دیتا ہے کہ صاحب! پوچھو نہیں' طبیعت میں بشاشت آ جاتی ہے۔ یعنی اس کے متعلق بیسیوں چیزیں اور جگہ آئی ہیں' جواب دیا ہے' یہاں دیکھو۔ یہودیوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آسمان سے کتاب اتارو **فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ** (4:153) تم سے تو انہوں نے اتنی سی بات کہی کہ آسمان سے کتاب اتارو مگر اپنے رسول سے تو اس سے بھی زیادہ مطالبے پیش کیا کرتے تھے یعنی کہا کرتے تھے کہ **فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً** (4:153) خدا کو سامنے بٹھا کر ہمیں دکھاؤ۔ میں نے کہا ہے کہ بعض اوقات تو قرآنِ کریم ایسی عجیب بات کرتا ہے یعنی ان کی ذہنیت بتانا تھا کہ کیا ہے۔ تم سے تو یہ اتنا ہی کہہ رہے ہیں' اپنے پیغمبر سے تو یہ اس سے بھی بڑی بات کہتے تھے' اس سے کتاب ہی نہیں مانگتے تھے' کہتے یہ تھے کہ خدا اوپر سے ہمارے سامنے آ کر یوں کھڑا ہو جائے' پھر تو ہم خدا کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے۔ پھر ہوا کیا؟ کہا کہ **فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ** (4:153)۔ ظلم کے معنی ہیں کہ ''جو شے جہاں ہونی چاہیے' وہاں نہ رکھیں''۔ کتاب کے متعلق یہ نہ سمجھنا کہ یہ عقل و فکر کو اپیل کرنے والی چیز ہے' نبی کے متعلق یہ نہیں کہنا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات لا کر اس کو چلائے گا' بس یہ سمجھنا کہ کرامات دکھاتا پھرے گا' شعبدے بازیاں دکھاتا پھرے

---

❶ لوگ یونہی شور مچاتے رہتے ہیں کہ اسے جوتے پڑے جی! لوگوں کو بات کرتے ہوئے کہیں شرم بھی نہیں آتی۔ وہ جوتے تھے' سنو! وہ تو بچگانے تھے!

گا۔اسے قرآنِ کریم نے ظلم کہا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی توہم پرستیاں یا اس قسم کے مطالبات جو تھے اس کی وجہ سے اس قوم پر ایک گرفت آئی۔ پھر ہوا کیا؟ آخراس قوم کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوا؟

## واضح دلائل اور روشن تعلیم کو ٹھکرا کر کرامات دیکھنے والی قوم کا حشر

عزیزانِ من! سوچیے! یہ بات ان یہودیوں کی نہیں ہو رہی' جنہوں نے یہ مطالبے کیے کہ اس قسم کے معجزے دکھایئے۔وہ معجزات والی بات ختم ہوگئی تو کرامات تک اتر آئے۔انہوں نے کیا یہ کہ **ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ** (4:153) ایسے واضح دلائل آنے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ سامری نے ایک بچھڑا سا بنایا' اس کے گلے میں ذرا سی خلا رکھی کہ اس میں ہوا جاتی تھی تو وہ سیٹی بجایا کرتا تھا یا آواز نکالا کرتی تھی اور وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔میں نے کہا ہے کہ جب عقل وفکر ماؤف ہو جائے تو وہ خدا کو اپنے سامنے دیکھنا تو ایک طرف رہا' جب وہ نظر نہیں آتا تو اگر کوئی اتنی سی چیز بھی ان کے سامنے کر دے' وہ اسی پر ایمان لے آتے ہیں' اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔وہ حضرت صاحب جو ہیں' وہ تو بڑی کرامت کے مالک ہیں' ہم نے دیکھا صاحب! کہ انہوں نے ہمارے سامنے یہ بالوں کو پکڑا اور یوں نچوڑا اور اس میں سے دودھ کے قطرے نکل آئے۔''اوبکری دے دودھ دا پکھانا ہوندا اے ہتھ اچ رکھیا ہویا'' (بکری کے دودھ کا غبارہ ہاتھ میں رکھا ہوا ہوتا ہے)۔بس ہوئے ہیں گرویدہ۔''سٹے دے نمبر' جناب! بڑے صحیح دسدا پیا ہیگا'' (سٹے کے نمبر بڑے صحیح بتا رہا ہے)۔

## قرآن کریم کی تعلیم انسانوں کی ذہنیت کو تبدیل کر دیتی ہے

قرآنِ حمید ذہنیت کی بات کرتا ہے کہ اتنے اتنے بڑے مطالبوں سے نیچے اترتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سا خلاف معمول کوئی واقعہ سامنے آیا اور سجدے میں گرے۔عزیزانِ من! کیا یہی حالت اس قوم کی نہیں ہوگئی ہوئی جنہیں قدم قدم پہ یہ کہا گیا تھا کہ یہاں ذہنی اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟ کیا یہ قوم وہاں آتی ہے جہاں عقل وبصیرت کی بنیادوں پہ ذہن میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے یا وہاں جاتی ہے جہاں عقل وبصیرت کے تمام سرچشموں کو مفلوج کیا جاتا ہے؟ ہر خانقاہ پہ جانا' ہر قبر پہ جانا' ہر فقیر کے ہاں جانا' ہر صاحبِ کرامات کی باتیں ماننا' ہر حضرت صاحب کے پاؤں جا کر چومنا' یہ کیا چیز ہے؟ یہ گوسالہ پرستی ہے۔کہا ہے کہ **ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ** (4:153) اگر وہ بات نہیں دکھائی گئی تو کوئی بات نہیں صاحب! ہم اسے پوچھ لیں گے۔کہا ہے کہ **مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ** (4:153) او! اس قدر واضح دلائل وبصیرت کی چیزیں تمہارے سامنے آئیں اور اس کے بعد بھی تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اپنے سامنے تمہارے سامری نے یہ گوسالہ بنایا تھا اور صرف اتنی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاحب!

آواز کیسے نکل رہی ہے اور تم اس کے سامنے جھک گئے ۔ پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے ۔ وہ صاحبِ شرف انسان کہ جس کے لیے کہا ہے کہ **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا** (45:13) ساری کائنات تابع تسخیر ہے' وہ انسان پتھر اور چونے کی عمارت پر جا کر سر جھکا رہا ہے جس کے لیے کہا تھا کہ سارے ملائکہ نے اس کے سامنے سر جھکایا۔ یہ مسجودِ ملائک' پتھروں کے سامنے جا کر ان کا ساجد بنتا ہے۔ اس سے زیادہ ذلت کیا ہو گی۔

## ہماری پوری تاریخ قومِ بنی اسرائیل سے مماثل دکھائی دیتی ہے

کہا ہے کہ **مِنْ بَعْدِ**

**مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ** (4:153)۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ قوم میں کچھ صلاحیت ہے تو **فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ** (4:153) ہم نے ان کی اس حماقت سے بھی درگزر کیا۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ یہ معاملہ بھی ہو گا یا نہیں ہو گا۔ یہاں کہا ہے کہ پھر ہم نے ان کو ایک موقع دیدیا۔ شاید ہندوستان کے مسلمان کو یہ آخری موقع تھا جو پاکستان کی شکل میں ملا۔ عزیزانِ من! بنی اسرائیل کی داستان قدم بقدم ہماری داستان سے ملتی ہے۔ فرعون کی غلامی سے نجات کے بعد سینا کے صحراؤں کے اندر تو اس نے ہمیں لا کر بٹھا دیا اور اب کیفیت یہ ہے کہ ہم نے پھر اپنی پرستش کے لیے گوسالے تراش لیے ہیں' ان کی شکلیں کچھ ہوں' وضع قطع کوئی ہو' شاید اس کے بعد یہ کیفیت ہو کہ جو قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ موسٰی! اس قوم کو چالیس سال تک ان صحراؤں کے اندر سرگرداں پھراؤ تا کہ ان کا نام ونشان مٹ جائے اور یہ جو آنے والی نسل ہے اس کی تعلیم و تربیت کرو۔ اس کی تعلیم صحیح کی تو اس نے ایک جھپٹا مارا' وہ سرزمین جس کے متعلق کہا تھا کہ ہم نے ان کے نام لکھ دی ہے وہ اس قوم کے نصیب میں نہ ہوئی۔ اُنہوں (نئی نسل نے) نے آ کر یہ کچھ لیا۔ یہ تھا جو کہا ہے کہ **عَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ** (4:153)۔ اور ہم تو آنے والی نسلوں کی بھی تربیت نہ کر سکے۔ کہا ہے کہ **فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا** (4:153) ہم نے موسیٰؑ کو بڑے کھلے ہوئے دلائل دیئے تھے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا** (4:154) وہ تو ایک عہد و پیمان کر کے آئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یا اس سے پہلے ہمارے عہد و پیمان کو دیکھیے ہم اس سرزمین کو اس لیے حاصل کر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہاں تیری بادشاہت کا تخت جلال بچھے' تیرے قوانین کی حکومت ہو' ہم اس کے تابع چلیں۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ ایک طرف طور جیسی ایک آہنی دیوار ان کے پیچھے حفاظت کے لیے ہے کہ ادھر سے کوئی حملہ آور نہ آ جائے' حفاظت کا سامان دیا' وہاں ان سے عہد و پیمان لیا۔ کہا یہ ہے کہ یہ نئی سرزمین' نئی مملکت' تمہیں دی جا رہی ہے' اس میں تم قدم رکھو۔ اس لیے کہ **ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا**

قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے آؤ۔اس کا یہ مقصد تھا۔کہا ہے کہ ہم نے انہیں اخلاقیات یا ضوابط یا (4:154) پابندیوں کے متعلق کہا۔عزیزانِ من! آزادی نام ہے ان پابندیوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔کہا ہے کہ ان سے تجاوز نہ کرنا' ان سے سرکشی اختیار نہ کرنا۔شروع میں چھوٹی چھوٹی سی باتیں کہیں مثلاً یہ کہ ہفتے میں ایک دن ناغہ کرلیا کرو' سوچو تو سہی کہ یہ کونسی ایسی قیامت ہے یا پابندی ہے۔

## اخلاقی لحاظ سے چھوٹی چھوٹی پابندیوں کے سلسلہ میں ہماری بدعملی کا تذکرہ

آپ کو پتہ ہے کہ گوشت کے ناغے والے دن بازار کی طرف جو دروازہ ہوتا ہے اُسے تو بند کر دیا جاتا ہے مگر پچھلی طرف کی جو کھڑکی ہے اسے کھلا رکھا جاتا ہے۔کہا تھا کہ ایک دن ناغہ کرلیا کرو۔ان کی کیفیت یہ تھی کہ اس میں بھی چور بازاری کیا کرتے تھے۔**وَ اَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا** (4:154) یہ وہی قوم تھی جو ابھی کل یہ قسمیں کھا کر آئی تھی کہ ہم تیرے قانون کے سامنے جھکیں گے' کیفیت ان کی یہ ہوگئی۔کہا کہ **فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَ كُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّ قَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ** (4:155) ان کے یہ جرائم تھے وہ عہد و پیمان انہوں نے توڑا' خدا کے قوانین سے انہوں نے سرکشی برتی' انبیا جو حق بات کہنے والے تھے ان کو ناحق انہوں نے قتل کیا۔جب بھی کسی نے ان سے کہا کہ بھائی! یہ سوچ سمجھ کی بات ہے' اسے سنو تو کہا کہ او جاؤ جاؤ بابا! ہمیں سب معلوم ہے' ہمارے پیالے بھرے ہوئے ہیں' اس میں پانی کا ایک قطرہ اور نہیں پڑ سکتا' ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہم کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

## دلوں پر تالے پڑنے کی وجہ جواز اور پھر انہیں کھولنے کا طریق

کہا ہے کہ **بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ** (4:155) ان کا یہ انکار تھا جس کی وجہ سے ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے۔اور **فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا** (4:155) شاید ان میں سے کچھ ایسے نکل آئیں گے جو ایمان لائیں ورنہ ان سے تو کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی آیت 155 تک ہم آ گئے' آئندہ 156 ویں آیت سے لیں گے۔اس کے بعد مضمون بھی دوسرا شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔اسے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ**

❀......❀......❀

# انتیسواں باب: سورۃالنسآء (آیات 156 تا 159)

وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ۝١٥٦ وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ
رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ ؕ مَا لَهُمۡ
بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۝١٥٧ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۝١٥٨ وَاِنۡ مِّنۡ
اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُـؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۝١٥٩

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 31 تاریخ ہےاور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃالنس آء کی آیت 156 سے ہو رہا ہے: (4:156)۔

## قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرنے کا مقصد

سلسلۂ کلام چلا آ رہا تھا کہ یہودیوں میں جو قومی جرائم پیدا ہو چکے تھے قرآنِ کریم ان کی تصریح کرتا چلا آ رہا تھا اور حقیقت میں مقصود یہ تھا کہ اس قوم کو جس کی طرف یہ قرآن کریم اولیں طور پر نازل ہوا' یہ بتانا تھا کہ جو قومیں یہ کچھ کیا کرتی ہیں' ان کے ساتھ یہ ہوتا ہے ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) وہ قومیں دنیا میں ذلیل وخوار ہو جایا کرتی ہیں' تم ایسا نہ کرنا۔اقوام سابقہ کی جتنی داستانیں قرآنِ کریم میں بیان ہوئی ہیں' ان سے مقصود یہی ہے ورنہ وہ ہسٹری کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی خاص قوم کو خواہ مخواہ مطعون کرنا مطلوب ہے۔ یہودیوں کے دیگر جرائم کے علاوہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ کے متعلق' جو خیالات عام کر رکھے تھے' ان کی تردید بھی مقصود تھی۔پہلی چیز یہ کہی ہے کہ وَبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ( 4:156) حق وصداقت سے انکار' اور نخوت وخودستائی پر اصرار سے ان کی حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مریمؑ جیسی پاکباز خاتون کے خلاف بہتان عظیم باندھ دیا تھا۔

## حفاظتِ عصمت میں حضرت مریمؑ کے خلاف بہتان تراشی کا ذکر اور اس کی اہمیت

حضرت مریمؑ نہیں' بلکہ یوں کہیے کہ قرآنِ کریم میں دو ہستیاں ایسی ہیں' جن کی Personal (شخصی) سرگزشت قرآنِ کریم نے تفصیل سے بیان کی ہے۔ایک حضرت یوسفؑ ہیں اور دوسری یہ حضرت مریمؑ ہیں۔وہ نبیؑ ہیں' یہ نبی تو نہیں ہیں۔اس نسبت کو چھوڑ دیا

جائے کہ یہ ایک نبی کی والدہ ہیں۔ خدا کے نظام میں تو یہ نسبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آ ذر' حضرت ابراہیمؑ کے باپ تھے' ابولہب [1] تو رسول اللہ ﷺ کے چچا تھا' حضرت لوطؑ کی بیوی کی بھی نسبت کوئی معنی نہیں رکھتی کہ دریں رافلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ اس لیے یہ چیز کہ آپؑ حضرت مسیحؑ کی والدہ تھیں کوئی وجہ تخصیص نہیں ہے۔ یہ دو ہستیاں ایسی ہیں جن کا قرآنِ کریم میں ذکر آیا ہے اور یہ بڑی غور طلب چیز ہے کہ ان دونوں میں بات ایک کہی گئی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔

## عصمت کی حفاظت میں حضرت یوسفؑ کا ذکرِ خیر

حفاظت عصمت قرآن حمید کی رو سے اتنی ہی اہم بنیادی چیز ہے کہ وہ دو ہستیوں کا ذکر کرتا ہے' ایک مرد کا ذکر کر رہا ہے کہ جس کے لیے سازشوں کے وہ تمام جال بچھائے گئے جن میں کمزور کردار کا انسان آسانی سے گرفت میں آ جاتا ہے اور وہاں حضرت یوسفؑ نے اپنی پختگی کردار کا ثبوت دیا اور بات کیا ہوئی؟ یہ کہ عصمت کی حفاظت تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رو سے یہ کتنی بڑی چیز ہے۔ اور اسی کے مقابل میں حفاظت عصمت میں عورت کا بھی ذکر ضروری تھا اس لیے حضرت مریمؑ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی جو حالات تھے وہ بھی قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے' انتہائی شدت اختیار کر چکے تھے۔ ایک بہت بڑے صاحب منصب کی بیوی تھی' مصر کی جو Highest Society (بلند ترین معاشرت) تھی اس کی بیگمات' اس کی عورتیں اس سازش میں شریک تھیں' وہ زمانہ بھی یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے زمانے جیسا مہذب سا زمانہ تھا کہ وہ جان بھی رہا ہے' اس شاہد نے بتا بھی دیا ہے کہ قصور تمہاری بیوی کا ہی ہے اور اس کے باوجود وہ بیٹھ کر جب مشورہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سب ٹھیک ہے' مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے۔ مصلحت کے تقاضے اور سب سے بڑی مصلحت تو یہ کہ گھر میں بیوی صاحبہ یہ کہہ رہی ہیں کہ ایسا کیا جائے تو جو صاحبِ اقتدار' صاحبِ منصب' میاں صاحب ہیں ان میں جرأت کہاں ہو سکتی ہے کہ ان کے خلاف کیا جائے۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بے گناہ ہے حضرت یوسفؑ' اور یہ سب کچھ جانتے ہیں' وہ یہ چیز کہتے ہیں کہ یا اللہ! جس چیز کی طرف مجھے یہ بلا رہی ہیں' اس کے مقابلے میں مجھے جیل جانا زیادہ منظور ہے۔ یعنی انہیں پتہ تھا کہ اس کا جو انکار ہے اس سے میں جیل چلا جاؤں گا اور اقرار کی صورت میں تو آپ دیکھتے ہیں کہ عیش سامانیاں' کتنے ہی کھلے ہوئے دروازوں میں ان کے سامنے تھیں۔ آپؑ اس کشش کو بھی ٹھکراتے ہیں' اس خوف پر بھی قابو پاتے ہیں' دامن عصمت کو بھی چاک نہیں ہونے دیتے۔ اور ادھر ایک عورت (حضرت مریمؑ) ہے جو میں سمجھتا ہوں اس سے بھی زیادہ سنگین حالات میں' ان سے بھی زیادہ دشواریوں کے اندر' گھری ہوئی ہے۔

---

[1] اصل نام عبدالعزی بن عبدالمطلب تھا' کنیت ابی لہب غالباً اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے تھی۔ وہ بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض۔ چیچک۔ میں مر گیا۔ اس کی بیوی کا نام ام جمیل تھا۔

## کلیسا میں پریسٹ کے اختیارات کی وسعت تھی' انہیں صرف موت کی سزا کی توثیق کی ضرورت ہوتی تھی

ٹیمپل (گرجا) میں' معبد میں' یہ آج کل جو Nuns (راہبات) ہیں' ان سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے اگرچہ اب وہ کلیسا کی گرفت اتنی سخت نہیں رہی' یہودیوں کے کلیسا میں' ان کے ٹیمپل میں' یہ جو پریسٹ تھے' ان کو ہر قسم کی سزا دینے کے قانونی اختیارات حاصل تھے حتیٰ کہ وہ موت کی سزا بھی سنا سکتے تھے۔ صرف اس سزا کی کنفرمیشن (توثیق) کی ضرورت ہوتی تھی یعنی رومن امپائر سے' رومن گورنر سے' صرف اس سزا کی کنفرمیشن کی ضرورت ہوتی تھی' اس کے لیے وہ ان کو وہاں بھیجتے تھے ورنہ کلی اختیارات ان کو اپنے ٹیمپل میں حاصل تھے۔ ان کی ایک سلطنت' ایک ریاست قائم تھی۔

## ٹیمپل میں راہبہ (Nun) کے سلسلہ میں خود ساختہ شریعت کی کیفیت اور حضرت مریمؑ کی تربیت

اس ٹیمپل میں' اس معبد میں' ایک لڑکی ہے جو ان کی خود ساختہ شریعت کے مطابق' نن (راہبہ) کی حیثیت سے' آئی ہوئی ہے جس سے پہلے ہی دن اس چیز کا عہد لیا جاتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عہد کی بھی ضرورت نہیں۔

ٹیمپل کی راہبہ کی حیثیت سے دو شکلیں تھیں یا تو یہ کہ وہ عمر بھر کنواری رہے گی' شادی نہیں کرے گی اور اس کے بعد یہ تھی کہ ٹیمپل کے راہبوں میں سے جو چاہے وہ اس نن (راہبہ) کے ساتھ شادی کرے گا اس کے ساتھ شادی کرے گی' اس سے باہر نہیں جاسکے گی۔ اسے انہوں نے مذہب کا تقدس دے رکھا تھا' یہ شریعت کا حکم بتاتے تھے۔ آپ سوچیے کہ اتنے اختیارات کی مالک مذہبی پیشوائیت ہے' اس ٹیمپل کے اندر یہ لڑکی ہے۔ جہاں اس نے اس چیز کو دیکھا۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ وہ اس تعلیم پہ کیسے پہنچی' میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ذکریاؑ کی جو کفالت تھی' اس سے وہ اس نتیجے پہ یا اس تعلیم پہ پہنچی تھی کہ یہ خدائی تعلیم نہیں ہوسکتی جو یہ لوگ دے رہے ہیں' یہ ان کی خود ساختہ تعلیم ہے۔ لڑکیوں کو یہ ٹیمپل میں لاتے ہیں' معبد میں لاتے ہیں اور اس کے بعد پھر یہ ایک قانون ہے کہ کسی اور جگہ وہ شادی نہیں کرسکتیں' ان میں سے جو چاہے وہ اس کے تصرف میں جاسکتی ہے' یہ خدا کا قانون نہیں ہوسکتا۔ ان کی ذہنیت کی کیفیت' قرآنِ حکیم نے ایک لفظ میں کہہ دی کہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب وہ اس لڑکی کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے ایک دوسرے کی مخاصمت کر رہے تھے' جھگڑ رہے تھے' اندر لڑائی ہو رہی تھی۔ ان کے پنجے کے اندر' یہ ایک معصوم لڑکی گرفتار ہے' گھرانہ بڑا مذہب پرست ہے جبھی تو اس کی ماں نے لاکر ٹیمپل کی نذر کردیا تھا۔ یہ مذہب پرست گھرانہ ہے' خود وہ سارا علاقہ ان یہودیوں کی مذہب پرستی کی رنگینی میں جکڑا ہوا ہے' ٹیمپل کے اندر ایک مظلوم معصوم لڑکی ہے اور وہ جو یہ کہا ہے کہ

ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

(اقبالؒ)

## ٹیمپل کے مذہبی پیشواؤں کی گرفت اور حضرت مریمؑ کا کردار

ان بھیڑیوں کی' ان آلودہ نگاہوں کو وہ روز دیکھ رہی ہے' ان کی سازشوں کو بھانپ رہی ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اُسے یہ پختہ یقین ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا قانون نہیں ہے' انہوں نے خود اس چیز کو بنایا ہے کہ معصوم لڑکیوں کو اس طرح سے اپنے قابو میں رکھا جائے' اسے اس چیز کا یقین کامل ہے لیکن آپ سوچتے ہیں کہ اس قسم کے ٹیمپل میں یا اس قسم کے کلیسا میں' اس قسم کی جو مذہبی گرفت ہے' اس کے بندھنوں سے نکل جانا کتنی بڑی جرأت چاہتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے جب یہ کہا ہے کہ دیکھیے! اس لڑکی طرف کہ اس نے ان حالات میں اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ یہ تھے وہ حالات جن کے اندر حضرت مریمؑ گھری ہوئی تھیں۔ اور واقعی اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت تھی۔ ٹیمپل کی گرفت سے نکلنا اور پھر نکل کر جانا کہاں ہے؟ اس معاشرے میں جانا جہاں اس چیز کو عین شریعت خداوندی کہا جاتا تھا' اس کو وہ معاشرہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا' گھر والے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ کہیے تو کسی کمزور سے' کلیسا کی نن (راہبہ) کو بھی کہ وہ کلیسا کی ان رسوم کو توڑ کر' خانقاہیت کی رسوم کو توڑ کر' ذرا عیسائیوں کے معاشرے میں آ کر بتائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیا کچھ ہوا کرتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک حفاظتِ عصمت کی قیمت اور اہمیت

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دو ہستیاں ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم نے Personal (شخصی) کیا ہے اور دونوں میں ایک ہی چیز ہے جو اشتراک کی ہے۔ وہ ہے حفاظتِ عصمت۔ عام حالات میں تو قریباً یہ ہر ایک کر ہی لیتا ہے' عام طور پہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن اگر حالات اُس قسم کے ہوں جو قرآنِ کریم بتاتا ہے اور ان میں حفاظت عصمت ہو تو پھر یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ قرآنِ کریم نے ان ہستیوں کے تذکارِ جلیلہ کو قیامت تک کے لیے اپنی لوح میں محفوظ کر لیا ہے۔ حضرت مریمؑ کی خصوصیت یہ نہیں ہے کہ وہ ایک نبی کی ماں تھیں' انہیں قرآنِ کریم نے اس حفاظتِ عصمت کی حیثیت سے پیش کیا ہے' وہ نبی کی ماں ہونا تو ثانوی چیز تھی۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس قسم کی پاکیزہ سیرت بچی کے خلاف جو بہتان لگانا تھا اسے قرآنِ حکیم نے بِکُفْرِهِمْ (4:156) کہا ہے۔ یہ کاہے کے لیے کہا ہے؟ سوچیے عزیزانِ من! کہ آج ہمارے ہاں ہو کیا رہا ہے' کتنی معصوم لڑکیاں ہیں جن کے خلاف دریدہ دہن جو جی میں آئے بکواس کرتے ہیں' کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہوتا' اس معصوم کی ساری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اس معاشرہ کے اندر لڑکے دن رات آوارگی کرتے پھرتے رہیں' ماں باپ بھی زیادہ سے زیادہ مسکرا دیتے ہیں' بیوی بھی جب خاوند سے کہتی ہے کہ دیکھتے نہیں ہو بچے کی حالت کیا ہے' راتوں کو اکثر باہر رہتا ہے' سوسائٹی کے اندر یہ چلا جاتا ہے تو خاوند ہنس دیتا ہے' کہتا ہے کہ جوانی کے زمانے میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ اور اس کے

مقابل میں لڑکی کے متعلق کہیں سے اگر کوئی خط آ جائے' خواہ اس بیچاری کے کسی بھائی کا ہی کیوں نہ ہو اور محلے میں مشہور ہو جائے کہ یہاں پرچہ نویسیاں ہونی شروع ہو گئیں تو اس کے بعد بچی کا مستقبل ختم ہے۔ معصوم لڑکی کے متعلق بہتان' اس کو ذبح کر دینے سے زیادہ ظلم ہے۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ وَّ بِكُفْرِهِمْ (4:156) انہوں نے حق وصداقت سے انکار کیا۔ یہ چیز تھی کہ مریمؑ کے خلاف بہتانِ عظیم لگایا۔ یہ بات آگے آتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان یہودیوں کی یہ چیز ہے کہ ہم نے ان کو پکڑ لیا' ہم نے ان کو صلیب کی موت مار دیا۔ یہودیوں کے ہاں صلیب کی موت لعنت کی موت تصور کی جاتی تھی۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ یہ جو نبی ہونے کا دعویٰ کر کے تمہارے ہاں آیا ہے ہم نے ان کو پکڑ کر ایک لعنتی کی موت مار دیا۔ یہودیوں میں عیسائیوں کی جو رقابت تھی' ان کی جو مخاصمت تھی' وہ اس حد تک بڑھ گئی کہ ان کے رسول کے متعلق یہ چیز کہہ دی' مشہور کر دی' فخر سے دعویٰ کیا کہ ہم نے ان کو پکڑ کر ایک لعنتی کی موت مار دیا ہے۔ نبی کے متعلق یہ بہتان بھی کچھ کم نہیں تھا۔ یہ دو چیزیں قرآنِ حمید اکٹھی کرتا ہے۔

عزیزانِ من! قبل اس کے کہ میں اس چیز پہ آؤں' ایک چیز کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے اس درس میں آپ احباب آتے ہیں' انہیں معلوم ہے مگر جو نو وارد ہیں' انہیں ان چیزوں کے متعلق علم نہیں' ان کی معلومات کے لیے میں یہ عرض کر دوں کہ یہ آتے ہیں' تو پہلے سے اعتقادات نظریات خیالات تصورات اور تعلیم کے سارے تصورات دلوں میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں' میرے درس قرآن سے مقصود یہ ہے' میں نے عمر بھر قرآنِ مجید پہ کچھ غور کیا' جو کچھ بھی میں نے اس سے بصیرت حاصل کی' میں قرآنِ حمید کی اس تعلیم کو آپ احباب کے سامنے پیش کرتا ہوں' اپنی تحریروں میں اس قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں کہ انسان قرآنِ حمید ہاتھ میں لے اور کسی عقیدے' نظریئے' تصور کے متعلق اس کے ذہن میں جو کچھ پہلے سے ہے اس کی تائید یا تردید جو پہلے سے مقصود ہو وہ یہ کرے۔ یہ شرک ہے۔

## قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کا طریق کہ انسان پہلے سے ذہنی طور پر کوئی تصور لے کر نہ بیٹھ جائے

قرآن حکیم سمجھنے اور سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کے اندر Preconceived (پہلے سے سمجھا ہوا) کوئی Emotion (جذبہ) نہ ہو۔ خالص توحید یہ ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) جو مطہر نہیں ہوتے ان کا قرآنِ کریم کو پانا اور سمجھنا تو کیا وہ قرآنِ حکیم کو مس نہیں کر سکتے۔ وہاں تطہیر سے مراد یہ نہیں ہے کہ جب تک وہ غسل کر کے باوضو ہو کر نہ بیٹھیں' یہاں تطہیر کے معنی یہ ہیں کہ ''قلب و دماغ کو جب تک غیر قرآنی خیالات وتصورات سے پاک اور صاف نہ کیا

جائے''۔قرآنِ کریم بڑا غیور ہے' اگر پہلے سے غیر قرآنی تصورات وخیالات ذہن میں رکھے جائیں تو یہ سمجھ میں آتا ہی نہیں ہے۔یوں کہیے کہ جب تک کعبے سے بتوں کو باہر نہ نکالا جائے' خدا اس کے اندر جاتا نہیں ہے۔عزیزانِ من! قرآنِ حکیم قطعاً سمجھ میں نہیں آتا اگر پہلے سے آپ کے ذہن میں کوئی خیالات موجود ہوں۔مذہب زدہ معاشرے میں یا مذہب کے تواتر میں' وراثت میں' یہی مرحلہ مشکل ہے کیونکہ جو خیالات ہمارے ہاں آتے ہیں' ان کو ذہن سے نکالنے کے بعد قرآنِ مجید میں آنا ہوتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی حقیقی تعلیم تک پہنچنے کے سلسلہ میں پرویزؒ کی اپنی کیفیت اور اس کا ماحصل

ذاتی بات ہو جائے گی لیکن کہنا ضروری ہے' پتہ نہیں کب تک جیوں' زندگی کا اعتبار نہیں ہوتا۔میری آدھی زندگی سے بھی زیادہ زندگی ان تمام معتقدات وخیالات میں گزری ہے جو متوارث ہمارے ہاں مذہب کی رو سے آتے تھے اور سارے قرآنِ حکیم کے خلاف تھے۔آپ سوچیے کہ ان سب کو نکالنا کتنا دشوار تھا۔میں تو قدم قدم پہ اس خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہوں' جس نے مجھے وہ توفیق دی۔وہ جو عہد جاہلیت کا ایک ایک عقیدہ تھا وہ قرآن پاک نے صاف کر کے رکھ دیا۔میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقے سے ہے' نہ کسی خاص خیالِ فکر سے ہے۔اس طرح سے پہلے سلیٹ کو دھو کر' پھر قرآنِ حکیم کی طرف آیا ہوں' اللہ کا فضل ہے اور اس کا شکر ہے۔لہٰذا جب قرآنِ مجید میرے سامنے آتا ہے تو جو کچھ یہ مجھے سمجھاتا ہے' ہوسکتا ہے کہ اس میں میرے سمجھنے کی غلطی ہو' دیانتداری سے جو کچھ سمجھتا ہوں بغیر اس امر کے لحاظ کے کہ کس کے عقیدے کے خلاف جاتا ہے' کس نظریئے کی تردید کرتا ہے' مجھے قطعاً اس کی پروا نہیں ہوتی' میں وہ کہہ دیتا ہوں۔

## ''مباحثوں اور مناظروں کے لیے میرے پاس کوئی وقت نہیں'': پرویزؒ

عزیزانِ من! جس نے اپنے عقائد ونظریات کو جو انسان کی عزیز ترین متاع ہوتی ہے' اس طرح ایک ایک کر کے چھوڑ دیا ہو' اسے قرآنِ مجید سمجھ میں آتا ہے۔اس کے برعکس اگر یہ رعایت رکھ لی جائے کہ صاحب! قرآنِ کریم کی بات جو سمجھ میں آئی ہے' اسے نہ کہا جائے کیونکہ وہ فلاں کے عقیدے کے خلاف جائے گی تو میرے نزدیک یہ شرک ہے۔مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ ان جرائم میں اپنے آپ کو مبتلا رکھوں۔عزیزانِ من! یہ میرا پروفیشن (پیشہ) نہیں ہے' لہٰذا یہاں جو کچھ میں عرض کروں گا اگر وہ پہلے کے کسی عقیدہ' خیال یا نظریہ کے خلاف جاتا ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک کہا ہے تو وہ اسے تسلیم کرلے۔اگر اسے اس سے اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کو برقرار رکھے اور اگر برداشت نہیں کرسکتا تو یہاں نہ آئے۔یہاں تو یہ صورت ہوگی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔یہ اس لیے کہنا پڑا کہ میں دیکھتا ہوں کہ نو واردوں کے ساتھ یہ ہو رہا ہے' کوئی چیز ان کے عقیدے کے خلاف ہوئی یا تو وہ آکر جھپٹ پڑتے ہیں' صاحب! وہ میرا وقت ضائع کر دیتے ہیں یا وہ چٹھیاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔پھر وہی مباحثے' وہی مناظرے ہیں جن کی خوگر

بے عمل قوم ہوتی ہے۔عزیزانِ من! میرے پاس اس کے لیے وقت نہیں ہے۔

## ''قرآنِ کریم ہاتھ میں لے کر اس کو پیش کرنے کی ذمہ داری میری کمر توڑ دیتی ہے'': پرویزؒ

اگر قرآنِ حکیم کی کوئی بات آپ کے سمجھ میں نہ آئے' میری تشریح تشنہ رہ جائے آپ ہزار بار آیئے' ہزار بار سمجھاؤں گا' قرآنِ مجید کی بات سمجھاؤں گا' یہ نہ کہیے گا کہ یہ چیز میرے عقیدے کے خلاف جاتی ہے' مسلمانوں کے اس عقیدے کے خلاف جاتی ہے اس لیے تم یہ کیوں کہتے ہو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تو جب قرآنِ کریم ہاتھ میں لے کر آپ کے سامنے آتا ہوں' آپ کو کیا پتہ ذمہ داریوں کا جو بوجھ ہے وہ میری کمر توڑ دیتا ہے۔عزیزانِ من! ایک ایک لفظ کے متعلق مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں قرآنِ کریم کے خلاف نہ چلا جائے۔ آپ بھی اس کی احتیاط رکھیے گا۔اس قسم کے آنے والے حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے' لکھنے والوں سے عرض کرونگا کہ میں ان چیزوں کا جواب نہیں دونگا۔قرآنِ کریم سمجھنا ہو تو ہزار بار آیئے۔ یہ کہنا اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ بات حضرت عیسٰیؑ کے متعلق آ رہی ہے۔

## حق بات کو سمجھنے اور حق کو پیش کرنے والی قوم کی کیفیت اور اس کا مقام

مسلمان ایک ایسی امت آئی جس سے کہا گیا کہ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ(2:143)۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال پہ نگہداشت رکھو' نگرانی کرو کہ کون صحیح راستے پہ جا رہا ہے' کون غلط راستے پہ جا رہا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ امت کتنی بڑی انقلابی امت ہے۔جس کے ذمہ پوری نوعِ انسانی' تمام اقوامِ عالم' کے اعمال کی نگرانی کرنا ہو' اس کا مقام کیا ہوگا' وہ کتنی باعمل قوم ہوگی! عزیزانِ من! یہ انقلابی قوم تھی جو انقلاب کو سامنے لے کر اٹھے' وہ باتیں نہیں کیا کرتے' وہ کام کیا کرتے ہیں۔ یہ قوم حق کو لے کر اٹھی تھی۔ آج تو ہمارے ذہن میں نہیں آتا کہ حق کہتے کس کو ہیں۔ قرآنِ حمید تو ایک طرف رہا آپ یہ عربی لغت سے ہی پوچھیے کہ حق کس کو کہتے ہیں۔انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ Truth کر دیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے۔صداقت کا ترجمہ Truth ہے۔حق کا ترجمہ Reality جو کیا جاتا ہے تو انگریزی جاننے والے سمجھیں کہ قرآنِ حمید بات کیا کہہ گیا ہے۔

## حق وہ ہوتا ہے جو حقیقت بن کر محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔عہدِ فاروقیؓ میں بائیس لاکھ مربع میل کا زیرِ کنٹرول علاقہ دینِ حق کا ثبوت ہی تو تھا

ایک چیز محض تصوراتی ہوتی ہے' نظری ہوتی ہے' Theoretical ہوتی ہے۔اسے حق نہیں کہا جاتا۔حق وہ ہوتا ہے جو اپنے

دعوے کو ٹھوس حقیقت میں سامنے لے آئے۔ جب وہ تعمیری طور پر ٹھوس شکل میں سامنے آتا ہے' عرب اس وقت اسے حق کہا کرتے تھے۔ حق کے معنی ہی ہیں ''دعوے کا محسوس' ٹھوس شکل میں سامنے آجانا' اس کے نتیجے کا محسوس شکل میں سامنے آجانا''۔ اسے Real کہا جاتا ہے' یہ چیز Imaginary (تخیّلاتی) نہیں ہوتی' وہ اعتقادی نہیں ہوتا' نظری نہیں ہوتا' Theoretical نہیں ہوتی۔ حق اس وقت حق ہوتا ہے جب آپ کا دعویٰ ایک حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے (634-645/46AD) کا ذکر ہے کہ جب مسلمانوں کی یہ مملکت پھیل کر بائیس لاکھ مربع میل تک چلی گئی تھی کہ اس وقت ایک عیسائی نے پوچھا تھا کہ ہر قوم کی ایک حقیقت ہوتی ہے جس کو وہ لے کر اٹھتی ہے' وہ تو مذہب پرست تھا' اس کے نزدیک تو یہی اعتقادی چیزیں تھیں' تو اس عیسائی نے کہا تھا کہ تم جو کلمہ لے کر اٹھے ہو' اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سپاہی ❶ نے یہ کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے' جو ہم نے فتح کیے ہیں' یہ سارے اس کلمے کی حقیقت نہیں ہیں تو اور حقیقت تم کہاں سے تلاش کرو گے۔ یہ تھی حقیقت اس کلمے کی۔ باطل کے نظام کو الٹ کر' اس کی جگہ حق کا نظام قائم کر دینا۔ یہ تھی اس کلمہ کی حقیقت۔ تو یہ سیدھی سی بات ہے کہ اس قوم کو فرصت کہاں تھی کہ وہ مباحثوں اور مناظروں میں اپنا وقت ضائع کرے یا وہ الٰہیات جسے آپ Meta-Physical Problems (مابعد الطبیعاتی مسائل) کہتے ہیں ان میں الجھے۔ اسے تو آج اتنی اہمیت دی جاتی ہے جیسے کہ بڑے مسند پر بیٹھے ہوئے' یہ جو نظری عقائد ہیں ان پہ بحث ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہزار برس سے آپ کی قوم نظری مسائل میں الجھی ہوئی ہے۔

## عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے مسلم قوم کو بے عمل کرنے کی ایک گہری سازش جو آج تک ہم پر پوری طرح اثر انداز ہے

برادرانِ عزیز! آخر ہوا کیا تھا؟ یہ قوم یکسر عمل تھی یہ جو مقابلے کی قومیں تھیں ان میں ایرانیوں کو تو انہوں نے جھپٹ لیا اور اس نے اسے تسلیم کر لیا اور وہ ان کے زیرنگوں آ گیا۔ یہ جو عیسائی اور یہودی وغیرہ تھے انہوں نے اس طرح سے سرِ تسلیم خم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک طریقہ سوچا' ایک سازش سوچی کہ اس ہمہ تن عمل قوم کو عمل سے کس طرح سے بیگانہ کیا جائے۔ انہوں نے آپ کے سامنے یہ جسے Meta-Physical کہتے ہیں' الٰہیات کی چیزیں' عالم بالا کی چیزیں کہتے ہیں' وہ مسائل شروع کر دیئے کہ بتایئے صاحب! خدا کی جو صفات ہیں وہ اس کی ذات سے الگ ہیں یا یوں عینِ ذات ہیں' قرآنِ حکیم کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم ہیں' مرنے کے بعد کی زندگی کی ماہیت اور نوعیت کس قسم کی ہے' کائنات میں اگر خدا کا وجود ہے تو یہ جو ساری چیزیں ہیں' ان کا وجود بھی ہے یا نہیں ہے؟ یہ مسائل چھیڑے' یہ بحثیں چلائیں۔ یہ تمام نظری بحثیں تھیں۔ اس قوم کو اس کے اندر الجھایا۔ اور اس کے بعد جو یہ اپنی پڑی

---

❶ یہ اشارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے۔

سے دوسری پٹڑی پہ پڑی تو وہ جو اس قوم کے کردار اور عمل کی صورت تھی' وہ نگاہوں سے گم ہوگئی۔ وہ تو پہلے کا دھکا لگا ہوا تھا جو وہ مملکتیں اتنا عرصہ چلتی رہیں۔ آپ دیکھا کرتے ہیں کہ جو شفٹ کرتی ہوئی گاڑیاں ہیں' انجن انہیں دھکا لگا دیتا ہے تو وہ بغیر انجن کے کتنی دور تک چلی جاتی ہیں۔ یہ تو ہمیں پہلے کا دھکا لگا ہوا ہے' جو یہ مملکتیں اور سلطنتیں چلی آ رہی ہیں ورنہ اس قوم کو ان نظری اور مابعد الطبیعاتی بحثوں نے بیکار کر کے رکھ دیا۔

## خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے شاہ اسماعیل کی تحریک اور سر سیدؒ کی ولولہ انگیز سوچ

آپ اپنے ہاں کی کتابیں دیکھیں' جس نے کبھی وہ لٹریچر دیکھا ہے' وہ جانتے ہیں۔ کتابوں سے کمرے بھرے ہوئے ہیں' کیا مسئلہ ہے صاحب؟ کہ یہ ذات اور صفات کا تعلق کیا ہے۔ اور پھر ان مسائل کے اوپر خوں ریزیاں ہو رہی ہیں' جنگیں ہو رہی ہیں' قتل ہو رہے ہیں' خون بہہ رہے ہیں۔ آپ کے ہاں یہ سازش ہوئی۔ یہاں کچھ تحریکیں پیدا ہوئیں کہ انگریز کی حکومت کے خلاف کوئی جذبے ابھارنے چاہئیں' کچھ تنظیمیں بھی یہاں بنیں۔ شاہ اسماعیل (1831-1779ء) کی تحریکیں اٹھیں' یہ جسے عام طور پر انہوں نے غدر کہہ کر مشہور کیا' کچھ آزادی کے جذبات نے کروٹ لی۔ یہ تحریکیں اٹھی تھیں۔ اس کے بعد سر سیدؒ (1898-1817ء) نے یہ محسوس کیا کہ یہ قوم افراد بن گئی ہے' قوم نہیں رہی' ان کی اجتماعیت گم ہوگئی ہے' ان کو ہندوستان کی غیر مسلم آبادی سے الگ ایک قومیت کے سانچے کے اندر ڈھالنا نہایت ضروری ہے' اسی صورت میں یہ چیز ان کے اندر زندہ رہ سکتی ہے۔ وہابی موومنٹ ❶ جو چلی تھی وہ بہت عظیم تحریک تھی' بڑی انقلابی موومنٹ تھی۔ اس کے ذہن میں یہ چیز تھی' اُس تنظیم کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ یہاں خالص اسلام کی حکومت قائم کی جائے۔

## مسلم تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے انگریزوں کی طرف سے مناظروں کی خاطر پادریوں کی یلغار: وفات وحیات مسیحؑ اور پھر نبوت کا دعویٰ

یہ تمام تحریکیں چلی آ رہی تھیں۔ انگریز تو بہت دانشمند تھے انہوں نے دیکھا کہ ان تحریکوں کو زور سے' قوت سے' نہیں کچلا جا سکتا۔ مسلمان قوم کی جو دکھتی ہوئی رگ تھی اس نے اس کو پکڑا۔ انگلینڈ سے وفد در وفد' گروہ در گروہ' پادری آنے شروع ہوئے۔ انہوں نے یہاں آ کر مناظرے شروع کر دیئے' قوم کو اس طرف الجھایا' اس نے ان کی توانائیاں' ان کا وقت' ان کا روپیہ' اس میں صرف کرانا شروع کیا۔ جب تک یہاں سے کوئی تائید شامل نہیں ہوتی تھی' یہ کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں ایک تحریک ابھاری گئی۔ مسئلہ کیا ہے؟

---

❶ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ''وہابی تحریک'' جو جناب سید احمد بریلویؒ (1831-1786ء) اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ (1831-1779ء) کے خونِ گرم اور جذبۂ صادقہ کی رہینِ منت تھی' ہندی مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی ایک حیات آور کوشش تھی۔

یہ وفاتِ وحیاتِ مسیحؑ کا مسئلہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مر گئے یا زندہ ہیں۔

عزیزانِ من! قوم کے پریکٹیکل (عملی) پروگرام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔اس چیز کو اتنی اہمیت دی' اہمیت ان پادریوں نے آ کر دی تھی۔اس چیز کو اتنی اہمیت دی کہ ایک شخص (مرزا غلام احمد قادیانی: 1908-1835ء) نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ارے کاہے کے لیے خدا نے یہ نبی بھیجا؟ اس نے کہا کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حضرت عیسیٰؑ وفات پا گئے ہیں۔جو عقیدہ متوارث چلا آ رہا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ زندہ ہیں۔اب یہاں ٹکراؤ شروع ہوا۔وہ جو پہلے پادریوں' عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی چپقلش تھی' وہ آپس میں ٹکراؤ کی تھی وہ تو رہی دور اور اس بھس میں آگ لگا دی۔

## حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں شب وروز ہونے والے مناظروں کی روداد میں علامہ پرویزؒ کا عمل دخل

اب یہ مسئلہ کہ کیا حضرت مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے یا ان کا باپ تھا' وہ آسمان پہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ اس نے اس قدر اہمیت حاصل کی کہ آج آپ اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے۔اگرچہ وہ جو پچھلا 19 ویں صدی کا آخری دور تھا' وہ تو میں نے نہیں دیکھا لیکن ابتدائی بیسویں صدی کا دور تو دیکھا اور یہ ہماری خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہیے کہ ہم بٹالے (ضلع گورداسپور) کے رہنے والے تھے۔ وہ ریلوے اسٹیشن تو قادیان سے سات میل کے فاصلے پر ہے۔آپ کو حیرت ہوگی کہ ہم لوگوں کی فرصت کا ایک ایک لمحہ انہی مباحثوں کی نذر ہو جاتا تھا۔اور یہ جسے آپ ❶ دیکھ رہے ہیں' جو کہہ رہا ہے کہ بھائی! میرے پاس فرصت نہیں ہے کہ میں اب ان میں وقت ضائع کروں' یہ سب سے جہادِ عظیم' یہ آپ کے سامنے جو بیٹھا ہے' اسی میں سمجھا کرتے تھے کہ مناظرہ ہو رہا ہے' بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں' سر پہ کتابوں کا بستہ رکھا ہوا ہے' وہاں ٹکراؤ ہو رہا ہے' یہاں یہ ہو رہا ہے اور فاتح قادیان بن کر چلے آ رہے ہیں اور نعرۂ تکبیر ہو رہا ہے۔عزیزانِ من! پوچھو نہیں کیا ہو رہا تھا' ساری قوم پاگل ہو رہی تھی۔یہ تو غنیمت سمجھیے وہ جو سعدیؒ (1291-1184ء) نے کہا تھا کہ

چناں قحط سال شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کروند عشق

روٹی کا مسئلہ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ لوگوں نے اس کو بھلا دیا۔

## علامہ اقبالؒ کی طرف سے پیش کردہ طویل نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' قابل فہم ہے

برادرانِ عزیز! یہ مناظرے وغیرہ اس لیے ختم ہو گئے ہیں لیکن الجھانے والوں نے تو الجھا دیا تھا۔وہ دور یہ تھا کہ جس میں ہندو تو

---

❶ یہ اشارہ باباجی (غلام احمد پرویزؒ) کا اپنی ہی طرف ہے۔

اپنی تنظیم میں لگا ہوا تھا' انگریز چاہتا ہی یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اتنا مضبوط محکم بنا لے اور خود ہندو بھی چاہتا تھا کہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام تنہا اس قوم سے لیا جائے۔ پادریوں نے مباحثے چھوڑ دیئے اور انگریز نے کہا کہ صاحب! ہم تو مذہبی آزادی دیتے ہیں ہم Interfere (مداخلت) نہیں کرتے۔ بالکل ٹھیک ہے کیوں Interfere (مداخلت) کی جائے۔ اور قوم لگی ہوئی ہے۔ ہندو اپنی تنظیم میں لگے ہوئے ہیں اور مسلمان ان مباحث کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ کیا بات تھی اس شخص اقبالؒ (1877-1938ء) کی جسے اللہ تعالٰی نے اتنی فراست قرآنی دی تھی۔ کبھی فرصت ہو تو اقبالؒ کی ''ارمغانِ حجاز'' میں جو ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' ہے' اسے غور سے پڑھیے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس شخص کی فکر اور کاوش کا نچوڑ ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا نہایت حسین انداز میں کہا ہے اور کہا اس طرح سے Dramatically (ڈرامائی انداز سے) ہے کہ اس میں آپ بور نہیں ہوتے' کوئی فلسفیانہ مباحث نہیں لے کر آیا۔ اس کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی مجلس ہے' اس میں اس نے اپنے سارے منسٹرز کو بلایا ہوا ہے اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کہاں کہاں فیل ہو رہے ہیں' کیا کیا خطرات ہمارے سامنے ہیں۔ وہ اپنی ساری مشکلیں اور Difficulties (مصائب) پیش کر رہے ہیں۔ یہاں یہ ہو رہا ہے' وہاں یہ ہو رہا ہے' وہ ان کا جواب دیتا ہے۔ آخری شخص جسے پریزیڈنٹ یا وزیر اعظم کہہ لیجیے' وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس مسلمان قوم کے اندر دیکھ رہا ہوں کہ کچھ شعور بیدار ہو رہا ہے اور اس سے بڑا خطرہ نظر آ رہا ہے۔ اسی نے نہیں کہا' خود ابلیس نے یہ چیز کہی کہ تمہاری نگاہ اس تک نہیں گئی' اس قوم کے اندر کچھ شعور بیدار ہو رہا ہے اور سب سے بڑا خطرہ اس قوم سے ہے۔

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے! ❶

جس نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہ کمیونزم ڈرا رہی ہے کہ یہ ہمارا نظامِ سرمایہ داری تہ و بالا کر دے گا' ہم نے ہزاروں سال سے جو اس طرح سے جال بنے ہیں' یہ توڑ کے رکھ دیں گے۔ اس نے بڑی عمدہ دلیلیں دیں۔ یہ ابلیس نے کہا تھا کہ غلط کہتے ہو۔

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے!

یہ ہے خطرے کا موجب کہ اس قوم کی بیداری سے ڈرو' دیکھو! کہیں یہ بیدار نہ ہونے پائے۔

---

❶ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (1936) میں' ابلیس نے اپنے مشیروں سے یہ کہا

جانتا ہے' جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے

مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے!

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)

## ابلیس کی نظر میں مسلمانوں کی بیداری کے سدِ باب کی خاطر ایک موثر ترین نسخہ

اس کے بعد انہوں نے پوچھا تھا کہ صاحب! اس کے لیے پروگرام کیا ہے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہم کوئی پروگرام نہیں دینا چاہتے' ہماری نگاہیں وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتیں جہاں تک تمہاری نگاہیں پہنچتی ہیں۔ اس پرابلم (مسئلہ) کا حل ابلیس نے بتایا کہ یہ کچھ مشکل نہیں ہے' پہلے بھی میں نے آزمایا تھا' یہ نسخہ بڑا کارگر ہوا تھا' درمیان میں تمہاری کچھ کوششیں ڈھیلی ہوگئیں تو ان کا رخ کچھ بدل گیا۔ اب یہی کچھ کرنے کی بات ہے کہ ان کے اندر اس قسم کے مسائل کی اہمیت کو عام کردو کہ

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جُدا یا عینِ ذات؟

اور سنو!

آنے والوں سے مسیحِ ناصری مقصود ہے

یا مجدّد' جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دَور میں

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

یہ خدا کی طرف' اس کی عبودیت کے لیے چلے ہیں' ان کے راستے کے اندر یہ الٰہیات کے' یہ میٹا فزیکل پرابلمز (مسائل) کے بت کھڑے کردو' ان مسائل کو ان کے سامنے لاؤ۔ اور اس طرح سے

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

## ابلیس کا وہ پروگرام جس پر آج بڑی چابکدستی کے ساتھ بڑے زور شور سے کام ہو رہا ہے

یہ تھی اسکیم جو اس نے سُجھائی تھی۔ عزیزانِ من! یہ اسکیم تھی جس پہ یہاں عمل ہوا۔ نبی ❶ تک ہمارے ہاں بنتے آرہے ہیں۔ یہ کیا بتانے کے لیے ہیں؟ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ مر گئے ہیں یا زندہ ہیں۔ کہتا ہے کہ چھیڑو مسئلے کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے تھے یا باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کو مسائل کے اندر الجھاؤ۔ اس دَور میں ہندو اپنی تنظیم کے استحکام میں لگا ہوا ہے' انگریز اپنی سازشوں میں لگا ہوا ہے

---

❶ یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف ہے۔

اور مسلمان ان مسائل کے اندر الجھے ہوئے ہیں۔عزیزانِ من! آپ کو معلوم نہیں' ہم سے پوچھیے کہ کیا ہوتا ہے۔کچھ دین دنیا کی فکر نہیں ہے' اس مسئلے پر چلے ہوئے ہیں' لکھا جا رہا ہے' بولا جا رہا ہے' جو ساری قوم ہے اس کے کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

یہ تو پتہ نہیں کہ اُسے ہمارے لیے کیا منظور ہے کہ ہمیں اس نے زندہ رکھنا تھا کہ اس وقت یہ اقبالؒ (1877-1938ء) جیسا دیدہ ور پیدا ہو گیا' محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) جیسا مردِ کردار ہم کو مل گیا اور اس طرح سے آپ کو یہ وہاں سے بچا کر لے آیا ورنہ آپ ختم ہو چکے تھے۔یہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اس لیے ہے کیونکہ یہ آیت میرے سامنے آئی ہے' اس لیے میں پہلے ہی آپ سے عرض کر دوں کہ اس کو اتنی اہمیت کیوں دی ہوئی ہے؟ وہ اس لیے کہ عیسائیوں کو اس کی ضرورت تھی' وہ حضرت مسیحؑ کو بشر نہیں مانتے' وہ اسے الوہیت کا درجہ دیتے ہیں' خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور ایک عقیدے کی رو سے خود خدا جو ہے یعنی باپ بیٹا روح القدس' وہ الوہیت کے اندر تینوں شریک ہوتے ہیں' وہ خدا مانتے ہیں یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔اب ضرورت تھی کہ جسے وہ اس طرح سے فوق البشر (Superhuman) مانیں' بلکہ Supra Physical (مافوق الطبیعاتی) مانیں' اس کے لیے ضرورت تھی کہ بتایا جائے کہ نہ اس کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش ہے' نہ اس کی وفات عام انسانوں کی وفات ہے' جبھی تو وہ اس کو انسانوں سے اونچا ثابت کریں گے۔

## مسلمانوں کے ہاں وضعی روایات کے تحت پیدا ہونے والے عقائد کے اثرات

انہیں تو اس کی ضرورت تھی۔یہ اس لیے کہ اپنے اس نبی کو وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ انسان نہیں' انسانوں سے ماورا تھا۔مسلمان نے اس کی تردید کرنی تھی۔جو اِن کے ہاں کی تکنیک تھی' انہوں نے اس قسم کی روایات وضع کیں' جو ان کے حق میں جاتی تھیں مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے' حضرت عیسیٰؑ آسمان پہ زندہ ہیں۔انہوں نے یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں پہلے خاموشی سے داخل کیں' اس وقت تک کوئی چیز ابھی مباحثے کی نہیں ہے۔جب یہ داخل ہو گئیں تو آپ کے ہاں یہ حدیثیں صحیح تریں احادیثِ رسول اللہ ﷺ قرار پا گئیں تو پھر یہودیوں نے عقیدہ یہ دیا کہ وحی دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک تو قرآن کے اندر آ گئی اور دوسری قسم کی وحی آپ کے ہاں احادیث میں ہے چنانچہ اس طرح یہ وحی خداوندی ہو گئی۔

## عباسیوں کے دور میں مذہبی مناظروں کی نوعیت اور یہودیوں کے دعوے

یہ کچھ کرنے کے بعد پھر وہ آئے صاحب! یہ عباسیوں کے دور (750-1258ء) کے جو دربار تھے' ان میں یہ مناظرے ہوتے

تھے۔ پھر وہ اس مناظرے کو لے کر آئے کہ ہاں صاحب! فرمائیے تو! آپ جسے اپنا رسول کہتے ہیں' وہ ہمارے رسول سے کس طرح فائز ہے۔ ہمارے نبی کی صورت یہ ہے کہ وہ فوق البشر ہے' عام انسانوں کی طرح پیدا نہیں ہوا' آپ کا نبی عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے اگر کہا کہ صاحب! آپ یہ کیسے کہتے ہیں تو انہوں نے جھٹ سے حدیث پیش کر دی۔ چلو کہاں جاتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نبی کی عام انسانوں کی طرح موت نہیں ہوئی' وہ زندہ ہے' تمہارا جو نبی ہے' وہ وفات پا گیا ہے' وہ اس کی قبر ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ چیزیں پہلے حدیث میں داخل ہو چکی ہوئی ہیں۔ قدم قدم پہ وہ ان کو مات دیتے تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق بہت کچھ سوچا کہ کیا کریں' کیسے کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش کے متعلق وہ روایات ہیں کہ حضور ﷺ تو پھر بشر تھے ہی نہیں' وہ تو نور تھے' وہ نور کی سی کیفیت تھی۔ بات چلتی نہیں صاحب! حضرت عیسیٰؑ انہوں نے کہا کہ آسمان پہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ گئے' تب کیا ہوا:

رہ گئے چرخِ چہارم پہ جناب مسیحؑ
طے کیے حق سماوات کے بیاباں تُو نے

چل بھئی! انہوں نے کہا کہ دیکھیے! ہمارے جو رسول اللہ ﷺ تھے' وہ عرش پہ گئے تھے' تمہارے نبی صرف چوتھے آسمان پہ ہیں۔

## ملت اسلامیہ کو الٰہیات کے گرداب میں الجھا دینے کی سازش

انہوں نے کہا کہ ہمارے رسولؐ زندہ ہیں تو انہوں نے حیات النبی ﷺ کا عقیدہ وضع کیا کہ وہ بھی زندہ ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ جس انداز میں ان کی زندگی اور ان کی پیدائش کا ذکر ان کی احادیث میں تھا' اس طرح کا تو ان چیزوں کے اندر موجود نہیں' یہ تو Abstract (غیر محسوس) چیزیں تھیں' وہ ٹھوس چیزیں تھیں۔ اس سے تو انہوں نے ان کو ''جنوں گھمن گھیری کیندے ہیگے نیں'' اس گرداب میں الجھایا اور یہ جوں جوں انہوں نے سلجھانے کی کوشش کی' یہ الجھتا چلا گیا۔ یہ عقائد اس طرح سے پختہ ہو گئے' ان کے ہاں گرہ گیر ہو گئے' قلب کی گہرائیوں میں اتر گئے کہ عیسائیوں کے ایسے فرقے موجود ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ عام انسانی بچوں کی طرح پیدا ہوئے' عام انسانوں کی طرح وفات پائی' وہ مانتے ہیں' اس کے باوجود عیسائی ہیں۔ عیسائی یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے ہمارے ہاں ایسے فرقے بھی ہیں جو ان کو مانتے ہیں لیکن آپ کے ہاں اگر کوئی یہ کہہ دے کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا نہیں ہوئے یا وہ وفات پا گئے تو یہ کفر کی وجہ ہو جاتی ہے یعنی اس سے آپ کے ہاں کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ وہ جن کے نبی ہیں' وہ تو ان کو مانیں تو عیسائی کے عیسائی رہیں اور آپ اگر اتنی سی بات کہہ دیں تو آپ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ دیکھا! سازش کتنی گہری جاتی ہے! یعنی وہ تو پلا چھڑا گئے آپ پھنسے ہوئے ہیں۔ اب بھی آپ یہ بات کہیں کہہ کر دیکھیے۔ ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے' وہ یونہی چوراہے میں

کھڑے ہوئے جن کو مجذوب کہتے ہیں' خدا تک کو وہ گالیاں دیتے ہیں (معاذ اللہ)' اس پہ ان کی غیرت کا طوفان نہیں ابھرتا لیکن جو نہی کسی نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰؑ باپ کے ساتھ پیدا ہوئے تھے' وہ اسی طرح وفات پا گئے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! مذہب یہ کرتا ہے۔

## کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے اور کیا وہ آسمانوں پر زندہ ہیں؟

یہ اس لیے کہنا پڑا کہ یہ آیتیں آ رہی ہیں۔ اگرچہ سورۃ آل عمران میں پہلے بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق یہ آیات گزر چکی ہیں۔ میں نے وہاں کئی درسوں میں اس کی تشریح بیان کی تھی کہ میری بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم نے نہ تو یہ کہا ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے' نہ یہ کہ وہ آسمان پہ موجود ہیں۔ میں نے تفصیل سے یہ بتایا تھا' تاریخ سے بتایا تھا' عیسائیوں کے ہاں کی جتنی تحقیقات ہیں ان سے بتایا تھا' یہ ساری چیزیں میں پیش کر چکا ہوں لیکن جب بھی پھر کوئی آیت آتی ہے' مجھے معلوم ہے کہ ''رام نکلدا ای نکلے' رحیم وڑدا ای وڑے' جنوں کیندے ہیگے نیں'' (رام دیر سے نکلتا ہے اور رحیم بمشکل داخل ہوتا ہے' وہ یہ چیز ہے)۔ پھر وہ جو چیز ہے دل کے اندر گھسا ہوا وَ اُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ (2:93)۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ بچھڑے کی محبت دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ایسے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے ہوتے ہیں' میں جانتا ہوں کہ یہ بات یہاں کرتا ہوں' تمہیں پتہ ہے کہ یہاں ہی وہ جیسے ''کھکھر اچ وٹا ماردینے نیں ناں'' (جیسے وہ چھتے میں ڈھیلا مار دیتے ہیں) یہ چیز ہو جائے گی کہ پھر وہی بات صاحب! وہی کفر' وہی بہتان' وہ سب کچھ ہوا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ ہم لوگ کہاں پہنچے ہوئے ہیں! یہ ہے وہ چیز جو ہمارے ساتھ کر دی گئی ہے۔ کوئی اس مسئلے پہ آ کر نہیں پوچھتا کہ قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بھی غیر قرآنی حکومت قائم کرتے ہیں یا جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' وہ کافر ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! آج تک کسی نے آ کر کفر اور ایمان کے مسئلہ پہ مجھ سے بات نہیں کی لیکن حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور ان کی وفات اور یہ عذابِ قبر' پوچھو نہیں پھر آگے کیا کچھ کرتے ہیں۔ یہ کیا ہے ہمارے ساتھ' ورنہ اگر اس کو اتنی سی اہمیت دی ہوتی کہ نہیں بھئی! قرآنِ کریم تو کافر اور مومن کا امتیاز یہ بتاتا ہے کہ جو قرآنِ مجید کے مطابق فیصلے کرتا ہے وہ مومن ہے' جو اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے تو ہماری قسمت آج کچھ اور ہی ہوتی۔ عزیزانِ من! میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ اس قسم کے نظری مسائل سے دلچسپی نہ رکھیے۔ اگر کسی نے یہ دیانتداری سے سمجھ لیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے ہی پیدا ہو گئے تھے' چلیے! ہماری اجتماعی زندگی' ہمارے انفرادی کردار' پہ بھی اس کا کیا اثر پڑا جی! کیا کچھ ہمارے کردار کو سنوارنے میں بھی اس نے کوئی اس قسم کا Part Play (کردار ادا) کیا؟ یا اگر کسی

نے یہ کہہ دیا کہ نہیں! وفات پا گئے تھے تو کیا اس چیز سے دنیا بھر کے عیوب اور مصائب اس کے اندر داخل ہو گئے؟ ان چیزوں کا کردار سے تعلق نہیں ہے اور یہ بڑی سازش ہے' جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

## وہ ایمان جو عمل کے ساتھ منسلک نہ ہو وہ ایمان ہی نہیں کہلاتا

عزیزانِ من! بات ساری یہ ہے کہ دین کچھ کرنے کا نام ہے۔ اسے سمجھا اس لیے جاتا ہے کہ غلط کام نہ کیا جائے۔ جس چیز کا تعلق آپ کے ہاں آخر میں کرنے سے نہیں ہوتا سمجھ لیجیے کہ یہ دین کی بات نہیں ہے' مذہب کی بات ہے۔ مذہب اپنے آپ کو محض عقیدے تک رکھتا ہے۔ دین کا اظہار اور اس کا مظاہرہ یعنی دین کے نظریات کا' دین کے عقائد کا' جسے ہم ایمان کہتے ہیں' مظاہرہ عمل سے ہوتا ہے۔

مردہ آ ایں ما کہ ناید در عمل

جس ایمان کا مظہر آپ کی سیرت اور کردار نہیں ہوتے وہ ایمان ایمان نہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس شخص کا ایمان ہم اپنے ہاں قابل قبول ہی نہیں سمجھیں گے جس کے ایمان کے ساتھ عملِ خیر نہ آیا ہوا ہو۔ تو یہ جو ایمان ہے کہ وہ مر گئے یا زندہ ہیں' بن باپ کے پیدا ہوئے یا باپ کے ساتھ پیدا ہوئے' آپ کے کردار کے ساتھ اس کا تعلق کچھ بھی نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کہہ لیجیے کہ صاحب! یہ قرآنِ کریم کا ایک مسئلہ ہے چلیے! کسی نے یوں سمجھ لیا' کسی نے یوں سمجھ لیا۔

## مسیحؑ کو صلیب کی موت دینے کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد اور موجودہ تحقیق

یہ ہوا کیا تھا؟ ان یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے مسیحؑ کو صلیب کی موت دے کر ایک لعنتی کی موت مارا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ (4:157) نہیں' نہ انہوں نے اسے قتل کیا اور نہ ہی صلیب پر چڑھا کر بزعمِ خویش ذلت کی موت مارا۔ خدا کا نبی لعنتی نہیں ہو سکتا۔ بات پکڑ لی۔ کہا ہے کہ صاحب! یہ سب مانتے چلے آ رہے ہیں کہ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (4:157) ان پر حقیقت مشتبہ رہی' انہیں اشتباہ رہا۔ یہ وہاں کیا Confusion (الجھن) ہو گئی تھی' یہ اشتباہ کس طرح سے رہا تھا' قرآنِ کریم اس کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ وہ نہ تو کوئی تاریخ کی کتاب ہے' نہ وہ اس زمانے کے یہودیوں کے افسانے نقل کر رہا ہے' نہ حضرت عیسیٰؑ کی پوری زندگی اس نے دینی تھی۔ مقصد تو یہ ہے کہ یہ بات ایسے نہیں ہے جیسے یہ کہتے ہیں۔ پھر جو کچھ افسانے انہوں نے بنا رکھے ہیں کہا ہے کہ ان پر حقیقت مشتبہ ہو گئی تھی۔

عزیزانِ من! اس کے لیے بہت کچھ تاریخوں میں ملتا ہے کہ کس طرح سے یہ حقیقت ان پر مشتبہ ہوئی تھی۔ خود ان کے ہاں کی

تحقیقات کے مطابق بھی یہ چیز آئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ گرفتار ہی نہیں ہوئے تھے' وہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے۔ وہ تو جس طرح سے کہ تمام انبیائے کرامؑ ایسے Critical Moments (نازک لمحات) کے اندر اس مقام کی طرف ہجرت کر جاتے تھے جہاں ان کے پروگرام یا ان کے دین کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوتے تھے۔ خود ان کی تحقیق اب یہ ہے کہ وہ یہاں سے اس طرح ہجرت کر گئے تھے۔ یہاں کس طرح کا اشتباہ ہوا؟ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ ایسا اشتباہ کہ نبی اکرم ﷺ ہجرت کی رات تشریف لے گئے اور یہ لوگ سمجھتے رہے کہ گھر کے اندر ہیں' گھیرا ڈالے رکھا۔ کیا تدابیر اختیار کی گئی تھیں' کس طرح سے یہ ہوا تھا' قرآنِ کریم ان Details (تفاصیل) میں جاتا نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے تو ہمیں ماننا ہے کہ صاحب! نہ انہیں قتل کیا گیا' نہ انہیں صلیب دیا گیا بلکہ معاملہ ان پہ مشتبہ رہا۔ باقی یہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ عیسائی اس باب میں یہودیوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ (4:157) اصل بات کا انہیں بھی علم نہیں۔ وہ بھی محض ظن و قیاس کی بنا پر باتیں کرتے ہیں۔ خود یہودیوں کی یہ کیفیت ہے اور یہ جو عیسائی ہیں وہ بھی اس معاملے میں اختلاف کرتے ہیں۔

## عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور ان کی تاریخ میں تضاد ہے

اس معاملے کے اندر آپ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے عقائد پڑھ کر دیکھیے ایک سے دوسرا ملتا ہی نہیں ہے۔ اس دور کی کوئی مستند تاریخ ہی ان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے ہاں کی اناجیل تو بالکل ہمارے ہاں روایات کے مجموعوں کی طرح ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے کتنے ہی عرصہ بعد ان لوگوں نے مرتب کیں۔ دنیا میں کوئی انجیل ایسی نہیں جو اس زبان میں ہو جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان تھی۔ ان کی وہ زبان ارامک تھی' ان کی ارامی Language (زبان) تھی جو کہ Hebrew (عبرانی) کی ایک برانچ (شاخ) ہے' Hebrew (عبرانی) میں بھی بالکل نہیں ہے۔ یونانی زبان میں' ان کے ہاں کی جو اور یجنل تو اریخ لکھی گئیں وہ بھی کوئی تاریخ نہیں ہے' آگے ان کے ترجمے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ کی تو یہ کیفیت ہے ان کے ہاں بھی لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ (4:157) ہے کہ وہ بھی شک میں ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (4:157) او! یہ سارے قیاس کے پیچھے بھاگتے چلے جاتے ہیں' ان کے متعلق یقینی علم' ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم نے اس زمانے میں یہ بات کہی جب ابھی تاریخی تحقیقات نہیں آئیں تھیں۔ یہ خود عیسائیوں کی جو تاریخی تحقیقات ہیں' آپ ان کو پڑھ کر دیکھیے' یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہمارے ہاں عقائد چلے آرہے ہیں یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ عزیزانِ من! یہ الفاظ ان کے اندر

آئے ہوئے ہیں آپ عیسائی مؤرخ رینان (Renan: 1823-1892) کی اپنی تاریخ کی کتاب [1] The Life of Jasus (حیاتِ مسیحؑ) دیکھ لیجیے' اس میں آپ کو نظر آئے گا۔ یہ ابھی حال ہی میں میرے پاس ایک اور کتاب آئی ہے۔ یہ ایک اٹالین (اطالوی) [2] محقق ہے' اس نے اتنی موٹی کتاب لکھی ہے۔اس نے جو Latest (جدید ترین) تحقیق کی ہے' اس میں اس نے یہ چیز بتائی ہے کہ وہاں کس طرح یہ معاملہ مشتبہ ہوا تھا اور کس قسم کی تدبیریں تھیں جو اس سلسلے میں اختیار کی گئیں' اور ان کا رخ اسی طرف پہنچتا ہے کہ وہ گرفتار ہی نہیں ہوئے تھے: نہ وہ اور نہ ان کے حواری جن کے متعلق ان کی انجیلیں کہتی ہیں کہ وہ بارہ حواری تھے' ان میں سے ایک نے تو حضرت مسیحؑ کو تیس روپے کے عوض بیچ دیا اور باقی گیارہ کے گیارہ چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ تنہا ہی رہ گئے۔ ان کی اناجیل میں ان کے متعلق یہ ہے۔ان کی اناجیل میں حواریوں کے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ ان کو Apostles مانتے ہیں۔ آپ نے رسولوں کے اعمال سنا ہوگا۔ وہ ان کو رسول مانتے ہیں۔

عزیزانِ من! ان کے ہاں تو یہ ہے جبکہ قرآنِ کریم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا کہ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (3:52) کون ہے تم میں جو خدا کے پروگرام کے لیے میری مدد کے لیے اٹھے؟ انہوں نے کہا کہ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ (3:52) ہم اٹھتے ہیں تمہاری مدد کے لیے' تم اکیلے نہیں ہو۔ اللہ اکبر! قرآنِ مجید ہے۔ ان کے حواریوں کے متعلق تو وہ اپنا یہ عقیدہ رکھتے ہیں جبکہ قرآنِ حمید ان کا یہ کردار پیش کر رہا ہے۔ اور حواری تو ایک طرف' انہوں نے تو اپنے مسیح کے متعلق یہ کہا ہے کہ جب ان کو صلیب پہ دیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اے میرے اللہ! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ گیارہ نے ان کو چھوڑ دیا اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے خدا نے چھوڑ دیا۔

## قرآنِ کریم ان کے ان تمام عقائد کی تردید کرتا ہے

برادرانِ عزیز! ہمیں اس سے غرض نہیں۔ یہ اُن کے عقائد ہیں۔قرآنِ کریم ان کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپؑ بڑے عظیم انقلابی پروگرام کے لانے والے تھے۔ نبی کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ کسی وقت خدا سے یہ کہے کہ تُو نے مجھے چھوڑ دیا۔ قرآنِ کریم ان کے ہاں کے جتنے غلط اعتقادات ہیں' غلط معتقدات ہیں' ان کی تصحیح کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور ان کو وہ مقامِ بلند دیتا ہے جو نبی اور نبی کے ساتھیوں کا ہونا چاہیے۔ مناظرے کی بات آ گئی' وہاں یہ اعتراض بھی مسلمانوں کی طرف سے ان پر ہوتا تھا کہ دیکھو! تمہارے

---

[1] اسکا حوالہ یہ ہے: Renan , Ernest: The Life of Jesus , Project Gutenberg NY ۔ یہ کتاب ابتدا میں 1935ء میں Watts & Co. سے طبع ہوئی تھی۔

[2] یہ اٹلی کے مشہور مصنف Marcello Craveri (1914-?) (مارسیلو کریوری) کی کتاب The Life of Jasus (حیاتِ مسیح) ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1966 میں شائع ہوا اور اس کا انگریزی ترجمہ 1967ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔

رسول کے سارے ساتھی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے ہاں بھی تو یہ حدیث موجود ہے۔

## صحابہ کرامؓ کے متعلق ایک خودساختہ حدیث

عزیزانِ من! آپ کے ہاں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیامت میں دیکھیں گے کہ گروہ در گروہ فرشتے ان (صحابہ) کو جہنم کی طرف لیے جا رہے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ نقل کفر کفر نہ باشد) اور رسول اللہ ﷺ ان کی طرف دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو میرے صحابہؓ ہیں' یہ تو میرے صحابہؓ ہیں' ان کو جہنم کی طرف کیوں لیے چلے جا رہے ہو؟ تو خدا جواب دے گا کہ جب تک تم ان میں تھے' یہ تمہارے ساتھی تھے' تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کے بعد یہ سب جہنمی ہوگئے۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے جو یہاں گھڑا گیا۔ اس کو ہم سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں' بڑے خوش ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم ان کے حواریوں کے عقیدے کے خلاف یہ کہتا ہے کہ رسول ﷺ اور اس کے صحابہؓ ایسے نہیں ہوا کرتے۔ حضرت مسیحؑ کے صحابہ کی حریت اور فکر و نظر اور قربانی و ایثار اور صداقت کے لیے مر مٹنے کے جذبات کی شہادتیں دے رہا ہے' آپ اپنے رسول ﷺ کے صحابہؓ کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں کہ جب تک آپ ﷺ تھے تو اس وقت تک یہ مسلمان تھے' اس کے بعد سب جہنمی ہوگئے۔ آپ کے ساتھ یہ کچھ ہوا ہے۔

قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (4:158) تم کہتے ہو کہ لعنتی ہو' خدا نے اس کے مراتب کو بڑا بلند کیا' رفعتِ منازل عطا کی تھی۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (4:158)۔ اور یہاں قرآنِ مجید دو لفظوں کے اندر بات کہہ گیا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ خدا اس قدر بے دست و پا نہیں ہے کہ اس کے رسول کو یہ پکڑ کر یوں کر دیں اور وہ اُن کا ساتھ دیدے' وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے وہ حَكِيْمًا ہے یعنی غلبہ یوں ہی نہیں سامنے آیا کرتا بلکہ حکمت اور تدبیر کے ساتھ اس کا غلبہ سامنے آیا کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (4:159) اور عیسائیوں کا تو یہ عالم ہے کہ (باوجودیکہ حقیقت حال کا انہیں بھی یقین طور پر علم نہیں) وہ مسیحؑ کے صلیب پر جان دینے اور اس طرح ان کے گناہوں کا کفارہ بن جانے پر ایسا محکم یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت کے وقت اس کا اقرار کرتا ہے۔

## عیسائیوں کے اپنے گناہوں کے کفارے کا عقیدہ' ان کے نزدیک خاصی اہمیت کا حامل ہے

اس عقیدے کی کیفیت ایسی گہری ہوگئی ہے کہ ہر عیسائی مرنے سے پہلے اس Confession (کفارے) کو ضروری سمجھتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پہ جان دی اور اس طرح ان کا خون میرے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی نجات اعمال سے نہیں ہوتی' صرف حضرت مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ تو اس چیز کی اہمیت اتنی ہے جتنی آپ کے ہاں

مرتے وقت سورۃ یٰسین کی ہے کہ اسے یہ سناتے ہیں یا کلمۂ شہادت پڑھاتے ہیں۔آپ کو پتہ ہے کہ عیسائیوں کے ہاں بھی یہی ہے Cell (موت گھاٹ) میں جسے پھانسی لگنی ہوتی ہے' پادری اس کے پاس بھی جاتا ہے' مرنے سے پہلے ہر عیسائی کے پاس پادری آتا ہے اور وہ اس کے سامنے Confession (تسلیم) کرتا ہے کہ میں اس پہ ایمان رکھتا ہوں کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پہ جان دی اور ان کا خون میرے گناہوں کا کفارہ بنے گا۔جس نے یہ کہہ دیا وہ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں چلا گیا۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ چیز تو قیاس پہ مبنی ہے' حقیقت ان کو بھی معلوم نہیں ہے۔یہ چیز اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ مرنے سے پہلے ہر عیسائی اس ایمان کو دہراتا ہے۔کہتا ہے کہ ان کی تو یہ کیفیت ہے' ان کے ہاں مسیحؑ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیں بخشوا دے گا۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا (4:159) وہ نبی' ان کے خلاف' قیامت میں گواہی دے گا کہ صاحب! میں نے ان سے یہ کبھی نہیں کہا تھا۔وہ ان کے خلاف شہادت دے گا۔نبی کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کی امت ایسے عقائد پیدا کر دیتی ہے جو اس نے نہیں دیئے ہوتے تو وہ بھی قیامت میں شہادت دیتا ہے کہ یہ میری دی ہوئی تعلیم نہیں تھی۔

## قرآنِ حکیم کے بیان کرنے کا تمثیلی انداز نیز بچیوں کو زندہ درگور کر دینے کا معاملہ

قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پہ آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ میری اور میری ماں کی پرستش کرنا؟ وہ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) کیا میں اس قسم کی تعلیم ان کو دیتا؟ نہیں' تُو جانتا ہے۔یعنی اس قسم کی بات یوں نہیں ہوتی کہ واقعی وہاں یہ پوچھے گا اور یہ جواب ہے۔وہ تو قرآنِ حکیم کا ایک انداز ہے اور ہر لٹریچر میں بات بیان کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! اس کا انداز تو بڑا عجیب ہے۔بات میں سے بات نکلتی ہے' یہ جو بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے اُف! زندہ درگور کر دیا کرتے تھے جب اس بچی کا ذرا بھی احساس بیدار نہیں ہوتا تھا اور ہم اِس وقت درگور کرتے ہیں جب وہ صاحبِ شعور اور صاحبِ احساس ہوتی ہے۔ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآنِ حکیم کا انداز یہ ہوتا ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے مقدمہ پیش ہو رہا ہے' وہ مقتول و مجبور جو معصوم ہے' وہ بھی سامنے ہے' اس کا یہ جو قاتل باپ ہے وہ بھی کٹہرے کے اندر کھڑا ہے۔عام عدالت میں یا عام لکھنے والا بھی یوں کہے گا کہ اس قاتل سے پوچھا جائے گا کہ تُو نے اسے کس جرم میں قتل کیا تھا۔عام انداز یہی ہوتا ہے لیکن قرآنِ حکیم کا انداز ملاحظہ فرمائیے اور پھر دیکھیے کہ زیادہ زور سے جو بات کہی ہے' وہ کیا ہے۔کہا ہے کہ وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ. بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ (81:8-9) اس معصوم و مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں اس نے کس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا تھا۔آہاہا! اس مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے اس نے تمہیں قتل کر دیا۔

## روزِ محشر عیسائیت کے غلط عقائد کے متعلق حضرت عیسٰیؑ کی تردید کا انداز

کیا انداز ہے یہ پوچھنے کا! قرآنِ مجید بات کرتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان کو یہ تعلیم دی تھی کہ میری اور میری ماں کی پرستش کرنا؟ وہ کہیں گے کہ تُو مجھ سے بہتر جانتا ہے کہ کیا میں ان کو اس قسم کی تعلیم دے سکتا ہوں؟ میں نے یہ تعلیم نہیں دی تھی۔ کہا جائے گا کہ یہ تو پھر اسے مانتے ہیں۔ وہ یہ کہیں گے کہ پھر اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں' میرے آنے کے بعد جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس کے ذمہ دار یہ خود ہیں۔ میں کیسے ذمہ دار ہو سکتا ہوں۔ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَكُوۡنُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا (4:159) قیامت کے دن پھر ان کا یہ رسول' جس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے اور مرتے وقت اس کو Confession (تسلیم) کرتے ہیں کہ اس کو صلیب دیا گیا' اس کا خونِ ناحق ہمارے گناہوں کا کفارہ بنے گا' وہ رسولؑ ان کے خلاف وہاں شہادت دے گا کہ صاحب! یہ جھوٹ بولتے ہیں' ان کا عقیدہ بھی غلط ہے اور میں نے تو کبھی ان سے یہ بات نہیں کی۔

## اس قسم کے خلافِ قرآن عقائد پیدا کرنے کی وجہ

یہ بات تھی جسے کہنے کے لیے قرآنِ کریم نے اس چیز کو دہرایا کہ یہ بات ہی سرے سے غلط تھی کہ انہوں نے اسے صلیب دیا۔ یہودیوں کا یہ طعن غلط ہے کہ ہم نے اسے لعنت کی موت مارا' عیسائیوں کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ اس نے صلیب پہ جان دے کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہ دونوں چیزیں تھیں جن کی تردید مقصود تھی اور کس انداز میں قرآنِ کریم تردید کر جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ہم نے ملعون کیا۔ اس کے برعکس قرآنِ حمید نے کہا ہے کہ بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیۡهِ (4:158) خدا نے تو اس کو اپنا مقرب بنا لیا۔ یہ ان کے اس کفارہ کے عقیدے کی تردید ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ صلیب پہ جان دی' ہمارے گناہوں کا کفارہ بن گیا جبکہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَكُوۡنُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا (4:159) خود مسیحؑ ان کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ان سے اس قسم کے عقائد رکھنے کا نہیں کہا تھا۔ یہ عقائد سب ان کے وضع کردہ ہیں۔

یہ عیسائی اس قسم کا جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کے متعلق حضرت عیسٰیؑ قیامت کے دن کہہ دیں گے کہ یہ غلط کہتے ہیں صاحب! یہ عقیدہ بھی باطل ہے اور میں نے کبھی انہیں اس کی تلقین اور تعلیم نہیں دی۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جس کے لیے قرآنِ کریم ان چیزوں کو دہراتا ہے۔ یہ چیزیں تو کبھی پیش نہیں کی جاتیں جب یہ مسئلہ حیات و وفاتِ مسیحؑ کی بات کرتے ہیں یا یہ بات کرتے ہیں کہ ان کی پیدائش بن باپ کے ہوئی یا ویسے ہوئی۔ یعنی اس کی اہمیت اتنی ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ کے ہاں یہ بات وجہِ تکفیر ہو جاتی ہے' اس چیز کے اوپر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ اسے الجھائے رکھو:

مست رکھو ذکر و فکرِ صُبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ اسی ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (1936)'' کا آخری شعر ہے۔اس قوم کو اس قسم کے ان نشوروں کے اندر بدمست رکھو کہ

تا بساط زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات ❶

اس کے بعد کہا کہ

خیر اسی میں ہے' قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اَوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

اوپر یہ بھی ہے کہ پھر یہ اس دنیا کو بے ثبات گنیں' کہیں کہ اس کا جو چاہنے والا ہے' وہ کتا ہے اور یہ دوسروں کی خاطر چھوڑ دیں اور آپ اپنی نجات کے لیے اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں میں الجھے رہیں کہ

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عین ذات؟

## وقت کے تقاضوں کے تحت ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا علاج اور اس کا طریق

عزیزانِ من! یہ ہے ان مسائل کی حقیقت قرآنِ حکیم کی رو سے اور یہ ہے وہ لم جس کی وجہ سے آپ کے ہاں ان کو اتنی اہمیت دی دی گئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو میں Quoted (استناد اور تصریح سے) کہتا ہوں کہ میرے مقدر کے جتنے مباحث ومناظرے تھے' وہ تو میں نے اپنے جاہلیت کے زمانے میں ختم کر دیئے' اب وہ تو جسے اکبر (1846-1921ء) نے کہا تھا کہ ''فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں'' اب' عزیزانِ من! ان چیزوں کے لیۓ اس قوم کے پاس فالتو وقت توانائی اور روپیہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو اب اس قدر سخت امتحاں گاہ آ گئی ہے کہ دنیا کے مسائل اس قدر سنگین اور Serious (سنجیدہ) ہوگئے ہیں کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

---

❶ تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز اردو حصہ)

یہاں پہ اب تو اتنی محتاط زندگی گزارنی پڑے گی' اس قدر چوکنا رہنا پڑے گا کہ اپنا وقت توانائی اور پیسہ' اس کا جو ایک ایک لمحہ ہے' وہ اس میں صرف کرنا پڑے گا کہ یہ ملت کیسے زندہ رہ سکتی ہے' یہ وطن کیسے سالم رہ سکتا ہے تا کہ اس کے اندر دوبارہ خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر آپ یہ کرتے ہیں تو یہ ''ثواب'' کا کام بھی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے آپ کہہ لیجیے کہ مغفرت بھی ہوگی۔ مغفرت کے معنی سامانِ حفاظت کے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو دین کی خدمت بھی ہے۔ اور مخالف قوتیں آپ کو ان عقائد میں اور ان مباحث اور مناظر میں الجھاتی چلی جائیں گی' آپ الجھتے چلے جائیں گے' دوسری قومیں جس فکر میں لگی ہوئی ہیں وہ کامیاب ہوتی چلی جائیں گی اور بساطِ زندگی پہ آپ کے سب مہرے مات ہوتے چلے جائیں گے۔ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلو۔ عزیزانِ من! ان الٰہیات کے مناظروں میں الجھانے کی جو چیزیں ہوتی چلی جاتی ہیں یہ بڑی گہری سازش ہے۔ سوچ رکھیے اس بات کو بھی کہ یہ انگریز کی بڑی گہری سازش تھی جو یہ کر گیا ہے' ہم اس وقت تک اس کے اندر الجھے ہوئے ہیں' اس میں سے ہمیں نکل جانا چاہیے۔

## ایک عظیم مقصد کے حصول کی خاطر حج کے پُرشکوہ اجتماع کی غرض وغایت اور ہماری سوختنی قربانیوں کا تذکرہ

صاحب! یہ بڑی عید آ رہی ہے جسے عید قرباں کہا جاتا ہے۔ عام انداز یہ ہے کہ ایسی تقریبوں سے پہلے ایک درس ہم مخصوص کر لیا کرتے ہیں اور میں ان کے متعلق قرآنی تصریحات پیش کر دیا کرتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس چیز کا احساس نہیں ہوا کہ یہ عید سے پہلی اتوار ہے' ذہن میں تھا کہ شاید عید سے پہلے اتوار ہوگی اس طرح میں اس اتوار کو اس خاص درس کے لیے مخصوص کرسکوں گا جس میں' میں حج کے متعلق عرض کروں لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ حج تو نہیں' کم از کم قربانی کے متعلق آپ احکام بیان کر دیجیے۔ میں تو حیران ہوں کہ قربانی کا لفظ ہی قرآنِ کریم میں نہیں ہے تو میں اس کے احکام کہاں سے بیان کروں۔

دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

قربانی کا لفظ یا تو وہ سوختنی ❶ قربانیوں کے ضمن میں قرآنِ مجید میں آیا ہے' یہ وہ ہے جو اقوامِ سابقہ کے ہاں کچھ رواج تھا' وہ ان کے بتوں کے آستانوں کے اوپر جانور ذبح کیا کرتے تھے' پھر ان کو جلایا کرتے تھے اور وہ کہتے یہ تھے کہ یہ بُت کھا تو نہیں سکتے' چلو اور کچھ نہیں تو سونگھ ہی لیں۔ وہ کبابئے کے پاس جو آدمی بیٹھا کرتا ہے ''پتہ ہے ناں او ہدا دھواں جیہڑا ہونداائے'' (آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جو دھواں ہوتا ہے)۔

ضمناً عرض کروں کہ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) کو کباب بہت پسند تھے۔ آخری عمر میں ان کا مرض اتنا شدید ہوگیا تھا کہ ان

---

❶ سوختنی: (ف۔ صفت) جلنے یا جلانے کے لائق۔

کو منع کر دیا گیا تھا کہ کباب نہ کھایا کریں۔ وہ اکثر یہ کیا کرتے تھے کہ وہ اس خلیفہ کبابئے کو اپنے ہاں بلا لیا کرتے تھے' اس کو بھی بڑی عقیدت تھی۔ تو وہ احباب کو کباب کھانے کے لیے جمع کر لیتے اور آپ اس رخ میں پلنگ بچھا لیا کرتے تھے جس رخ کا دھواں آیا کرتا تھا۔ ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ وہ دیوتاؤں کو کباب کے دھویں سے خوش کرنے کے لیے سوختنی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ ایک تو قرآنِ کریم میں اس سوختنی قربانی کا ذکر ہے اور یہی ہے جو آدم کے دو بیٹوں کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں جو جھگڑا ہوا تھا تو وہ ایک کی قربانی قبول ہوئی۔ وہاں یہ لفظ ہے۔ مسلمانوں کے لیے قرآنِ حکیم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا ''تسی انتظار کر رہے ہو کچھ ہور کہواں میں' جی بھرا نئیں اپنی گل نال تہاڈا! مینوں پتہ ہیگا اے'' (آپ انتظار کر رہے ہیں کہ میں کچھ اور بھی کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا جی اتنی سی بات سے نہیں بھرتا)۔ قرآنِ کریم نے کہا یہ تھا کہ یہ اتنے اتنے قصے اور معجزے اور اتنے اتنے دلائل مانگتے ہیں' ان سے کہو کہ کیا تمہارے لیے قرآنِ حکیم کافی نہیں ہے؟ حج کا درس ہی نہیں مخصوص کیا' میں عرض کروں کہ یہ نوعِ انسانی کو ایک مرکز میں جمع کرنے کی عملی تدبیر ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے امتِ مسلمہ صرف اس کی Convener (کنوینر) ہے' اس کی دعوت تمام اقوامِ عالم کو دی جائے گی۔ کاہے کے لیے دعوت دی جائے گی؟ تقریریں سنانے کے لیے نہیں بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:28) آ کر دیکھو ہم نے تمہارے فائدے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ سمجھنا چاہتے ہو کہ ہمارا پروگرام نوعِ انسانی کے لیے کس قدر منفعت بخش ہے تو بحثوں سے' دلائل سے' لفظوں سے نہیں بھائی! یہاں آؤ اور خود دیکھ لو کہ ہم تمہاری خاطر کیا کر رہے ہیں۔ کہا ہے کہ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:28) آہاہاہا! یہ تھا مقصد اس حج کا کہ وہ یہاں اس لیے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی یعنی نوعِ انسان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔

کہا ہے کہ اس حقیقت کو' اس سلسلے میں پھر سمجھ لو کہ تم جن جانوروں کو اس اجتماع میں کھانے پینے کے لیے ذبح کرو گے ان کے متعلق یہ تصور نہ کر لینا کہ یہ بھی اُسی قسم کی قربانی ہے جیسی عام پرستش گاہوں میں کی جاتی ہے اور یہ جانور مقدس ہو گئے ہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ عام جانور ہیں کہ لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (22:33) راستے بھر ان سے کام لیتے جاؤ۔ یہ چلتا پھرتا غذا کا اسٹور ہے۔ یہ اونٹ یا اسی قسم کے یہ جانور چلتے جا رہے ہیں' اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (22:33)۔ عزیزانِ من! یہ کس قدر زمین کی بات کرتا ہے' راستے میں ان سے کام لو' سامانِ تجارت لا دو جس کو یہاں بیچ دینا ہے۔

## حج کے موقع پر جانوروں کو ذبح کرنے کا مقصد لیکن ہمارے ہاں اس کی نوعیت

اور اس کے بعد کہا کہ ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ (22:33) جب مکے میں' کعبے میں' پہنچو تو پھر کرو کیا؟ کہا کہ

**فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ** (22:36) انہیں ذبح کرو' خود بھی کھاؤ اور خود ہی نہیں یہ جو یہاں کے رہنے والے ہیں' ان کو بھی ساتھ شریک کر لیا کرو' ان کو بھی کھلایا کرو۔ کہا کہ **فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ** (22:28)۔ سورۃ الحج میں ساتھ ساتھ یہ تین آیتیں موجود ہیں۔ خود کھاؤ' ان کو ساتھ کھلاؤ۔ یہ جو عرفات کے میدان میں ان کا اجتماع ہوتا ہے' جو امام ہوتا ہے' جو امیر ہوتا ہے' جو لیڈر ہوتا ہے' وہ ان کو پروگرام دیتا ہے' تمام دنیا کی رہنے والی اقوام وہاں جمع ہوتی ہیں' مسلمان ان کو پروگرام دیتا ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ مِنا کے میدان میں جاؤ' جہاں تین دن تک رہتے ہیں' وہاں قربانیاں کرتے ہیں' اور کہا کہ وہاں جا کر اس پروگرام کو Discuss (موضوع بحث) بناؤ کہ تمہاری آپس میں Co-ordination (ہم ربطی) کیسی ہوگی' ہم یہ کریں گے' تم کیسے کرو گے۔ تمام اقوام کے نمائندے وہاں جمع ہوں اور وہاں باہمی ڈائیلاگ کرو' وہاں کھاؤ پیئو بھی' مکے والوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا کرو' ان کو بھی کھلایا کرو۔

عزیزانِ من! سارے قرآن کریم میں یہ ہے جو لکھا ہوا ہے۔ اب آپ سمجھ لیجیے کہ اس کے بعد وہاں جو ہر ایک کی طرف سے کم از کم دو قربانیاں دی جاتی ہیں اور پتہ نہیں کہ کتنے جانور اس کے بعد کاٹ کاٹ کر پھینکے چلے جا رہے ہیں اور اس اسلامی مملکت کا فریضۂ مقدسہ یہ ہے کہ وہ ٹرکوں میں بھر بھر کے یہ گوشت گڑھوں میں دفن کرتی چلی جائے ❶۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ یاد رکھو! کہیں تم نے ہلاکت حرث اور ہلاکت نسل نہ کر دینا۔ کہتے ہیں کہ دس بارہ لاکھ ❷ کے قریب آدمی تو ایک حج میں ہوتا ہے۔ اگر یہ دو دو کی بھی قربانی کریں تو آپ گن لیں اس حساب سے کم از کم بیس پچیس لاکھ جانور تو وہاں ہوتا ہے اور پھر ساری دنیا میں' ہر گلی محلے کے اندر یہی کچھ ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! ذرا سوچو کہ پوری دنیا کی کبھی Census (آدم شماری) لو یہ تو Census (مردم شماری) لینے والی قوم ہی نہیں' یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں حساب داں ہوتا ہی نہیں۔ ٹھیک ہے' اگر حساب کرنے والا ہوتو اس کی اس ایک حساب کے اوپر آنکھیں پھٹ جائیں۔ یہاں یہ سب کچھ وہی تین دن کے لیے ہو رہا ہے' جس کا کہیں ذکر نہیں لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

## قربانی کے واجب ہونے کا فتویٰ

آپ کو معلوم ہے کہ پھر جو اس میں زور دیا جاتا ہے کہ قربانی سنت بھی نہیں' واجب ہے' واجب بھی ایسا ہے جس کا ترک کرنے والا بہت بڑا گنہگار ہوتا ہے۔ اس پہ اتنا زور دیا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہے؟ عزیزانِ من! یہ مُلّا اپنے دس روپے کی کھال کی

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات جنوری 1971 کی 31 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❷ یاد رہے یہ تعداد 1971 کی ہے جبکہ اس وقت 2011ء میں ایک اندازے کے مطابق یہ جمِ غفیر 30 لاکھ سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے۔

خاطر' آپ کا دوسو روپے کا بکرا ذبح کرا دیتا❶ ہے۔ اتنے فخر سے کہا جاتا ہے کہ اس سال ہم نے جناب تین لاکھ روپے کی کھالیں[1] اکٹھی کیں۔ ان سے اگر کہا جائے کہ صاحب! یہ جو چیز ہے یہی جو قربانی کا روپیہ ہے اسے غریبوں کو کیوں نہ نقد دیدے' یتیم خانے میں بھیج دے' کسی مدرسے میں دیدے' یہ بچے جو اس قدر ننگے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے پھر رہے ہیں ان کو کپڑے بنوا دے۔ کہتے ہیں کہ صاحب! ٹھیک ہے' یہ جو خیرات ہے' اس کا ثواب الگ ہے۔ اس لیے کہ اگر نقد دو گے تو ان کو تو کھال نہیں ملے گی۔ یہ جو قربانی ہے اس کا تو خاص ثواب ہے۔ یعنی تمہیں نہیں ہمیں خاص ثواب ہے۔

عزیزانِ من! میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ میرا منصب قرآنِ حکیم تک رہنا ہے' مجھ سے یہی پوچھا گیا تھا کہ قرآن کریم میں قربانی کے احکام کیا ہیں؟ قرآنِ کریم میں قربانی کے متعلق یہی ہے' اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ حمید ہی کافی ہے تو ٹھیک ہے اور اگر آپ نہیں سمجھتے تو میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

---

❶ یاد رہے کہ یہ رقوم جنوری 1971ء کی 31 تاریخ کو کہی گئی تھیں۔ آج یہ اس سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

# تیسواں باب: **سورۃالنسآء** (آیات 160 تا 161)

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ کَثِیۡرًا﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَکۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا﴿۱۶۱﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1971ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 160 سے ہو رہا ہے: (4:160)۔

پچھلے اتوار کو عید الاضحیٰ کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کے ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا جن کی پاداش میں' پاداش کا لفظ ہم بولتے ہیں کہ ہماری زبان میں یہی لفظ ہے' ورنہ اصل میں تو یوں کہیے کہ جس کے فطری نتائج کے طور پر' اس قوم پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی' وہ تباہی اور بربادی کے عمیق گڑھوں میں جا گری' صدیوں تک وہ دوسروں کی غلامی اور محکومی کے چنگل میں جکڑی رہی۔ ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی تسلسل میں قرآنِ کریم نے ایک اور بات کہی ہے جو آج کی اس آیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

## لفظ حلال' حرام اور طیّب کا قرآنی مفہوم اور اس کے استعمال کی وضاحت

کہا ہے کہ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ (4:160) ان کے جرائم کی وجہ سے ایک اور سزا جو ان کو ملی' وہ یہ تھی کہ حلال اور طیّب چیزوں میں سے بعض چیزیں مثلاً تمام ناخن دار جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام قرار دی گئی تھیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآنِ حکیم نے یہاں کہی ہے۔ حلال اور طیّب چیزوں کا حرام قرار دینا' جرائم کی سزا کی بنا پہ قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ یہاں سے بڑا اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حلال اور حرام کا اصول کیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے حلل کے معنی ہوتا ہے ''رسیاں کھول دینا' رسیوں کے بند کھول دینا' آزاد کر دینا' پابندیاں اٹھا دینا''۔ اور اس کے برعکس دوسری چیز ہے جسے حرام کہا جاتا ہے جو ''ح ر م'' ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی تک پہنچنے سے روک دینا' حفاظت پیدا کر دینا' پابندی عائد کر دینا' ممانعت عائد کر دینا''۔ ممانعت کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کی عزت وعظمت وتحریم وتکریم کی بنا پر اس تک ہاتھ بڑھانے سے کسی کو روک دیا جائے۔ یہ جو لفظ احترام ہے' اس کا مادہ بھی وہی ''ح ر م'' ہے جہاں سے لفظ حرام ہے۔ اور لفظ حرام بھی دو

معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کعبہ کے لیے مسجد الحرام میں تو قرآنِ مجید میں آیا ہے' ابھی محرم الحرام ہمارے ہاں مہینہ آنے والا ہے۔ حرمات کے جو چار مہینے ہیں' وہ اسی میں ہیں۔ احترام کی وجہ سے کسی چیز تک نہ آنے دینا یا کوئی شے نقصان کا باعث ہے' نفرت کا موجب ہے' اس سے باز رہنا۔ تو گویا اس کی وجہ سے یہ دونوں ہوسکتی ہیں یعنی تعظیم واحترام بھی اور اس سے نفرت اور نقصان بھی۔ ان میں سے کسی وجہ سے' کسی چیز کا روک دینا' نہ پہنچنے دینا' مثلاً یہ کہ ماں یا بہن یا بیٹی سے نکاح حرام ہے' یہ جو حرمت ہے' ان کے احترام کی بنا پر ہے۔ اور یہ چیز کہ لحم خنزیر حرام ہے' یہ حرمت اس کے نقصانات کی بنا پہ ہے' نفرت کی بنا پہ ہے' احترام کی بنا پہ نہیں ہے۔ تو یہ حرام کا لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے: عربی زبان میں بھی' قرآنِ کریم میں بھی' احترام کے لیے بھی اور حرام ہونے کے لیے بھی۔ یہاں یہ چیز کہی ہے کہ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (4:160) وہ خوشگوار چیزیں (میں ابھی عرض کروں گا کہ حلال کے ساتھ طیّب بھی کیوں قرآنِ مجید نے کہا ہے) جو حلال تھیں ان کے بعض جرائم کی بنا پر وہ ان پر حرام قرار دی گئیں۔ کسی کو کسی شے سے روک دینا' یہ اس پر پابندی عائد کرنا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا گیا ہے اور تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی غلامی اور محکومی میں نہ رہے۔

## کسی انسان کو کسی انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں

کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی پر از خود من مانی پابندیاں عائد کرے۔ پابندیاں عائد کرنے کا نام ہی تو غلامی ہوتا ہے۔ اس کے لیے جو قرآنِ کریم نے اصول بیان کیا ہے وہ بڑا بنیادی ہے' بڑا اہم ہے' دین کا نقطۂ ماسکہ (Focal Point) ہے۔ کہا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' دیکھیے! کس قدر حتم ویقین یا تحدی کے ساتھ یہ آیت آئی ہے' کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اسے قانون سازی کا اختیار حاصل ہو' خواہ اسے حقِ حکومت حاصل ہو' خواہ اسے نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بن جاؤ۔ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے' صاحبِ حکومت' صاحبِ کتاب ہونا تو ایک طرف رہا' جو صاحبِ نبوت ہوتا ہے اس سے بھی یہ اختیار کسی کو نہیں ملتا کہ وہ کسی شخص کو اپنی غلامی' محکومی کے اندر اور پابندی کے اندر لے آئے۔ میں کہتا ہوں کہ حریت انسان کا اس سے بڑا منشور دنیا میں کہیں نہیں آیا۔ دیگر مقامات میں تو خیر پھر بھی Freedom & Independence (آزادی وحریت) کی یہ چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر یہ چیز کہ جسے نبی مانا گیا ہو' جس پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن کہلا سکے' اس کے متعلق بھی یہ کہا جائے کہ اسے بھی یہ حق حاصل

نہیں ہے کہ وہ کسی شخص پر از خود کوئی پابندی عائد کرے۔

## پیرومرشد کی غلامی تو انسان کے دل و دماغ کے اطراف نہیں ہوتی' بیل کی طرح چھائی ہوتی ہے

کہا ہے کہ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)۔عزیزانِ من! کتنی عجیب چیز ہے اور یہ آیت بڑی ہی غور طلب ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہ کہے کہ تم سب ربانی بن جاؤ۔ اب جو ربانی بننا ہے' قرآنِ کریم نے ایک بڑی Abstract (غیر محسوس) سی چیز کہی کہ کیسے ربانی بن جاؤ۔ ہماری خانقاہیت میں پیرومرشد کے آستانوں پر انکی بیعت سے بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں ربانی بنا رہے ہیں۔ اور اس میں جس قسم کی غلامی اور محکومی ہوتی ہے' اتنی گہری غلامی تو یہ Physical (جسمانی) غلامی بھی نہیں ہوتی' ان کا تسلط و تغلب تو انسانوں کے قلب اور دماغ پہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ کہیں گے کہ تمہیں چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ۔

## کسی انسان کی بجائے خدا کے حضور ربانی بن جانے کا طریق صرف خدا کی کتاب کی ہی پیروی ہے

سوال یہ ہے کہ آخر ربانی بننے کا ذریعہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ ہے اہم چیز۔ قرآنِ حکیم ان چیزوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا' وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں اس چیز کا امکان ہوسکتا ہے کہ اس کے ذرا سے غلط مفہوم سے بات کہیں سے کہیں چلی جائے۔ کہا ہے کہ تم ربانی بن جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سے ربانی بن جاؤ؟ کہا کہ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) یہ جو خدا نے کتاب نازل کی ہے اس کتاب کی تعلیم سے' اس کتاب کی درس و تدریس سے' تم ربانی بن جاؤ۔ یعنی اب دنیا میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا جو ذریعہ ہے وہ اس کی یہ کتاب ہے۔ ربانی بننے کا ایک ہی ذریعہ اس کتاب کی تعلیم و تدریس ہے' کوئی باطنی علم نہیں ہے' کوئی اور ریاضتیں نہیں ہیں' کسی قسم کے مشائخ کی بیعتیں نہیں ہیں۔ صاحب نبوت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ کسی کو اپنی غلامی اور پابندی میں جکڑے' وہ بھی صرف تعلیم و تدریس کرنے کے لیے آتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ دنیا میں بہت بڑا آزادی کا منشور ہے۔ پابندی صرف وہ پابندی ہے جو خدا نے عائد کی ہے اور وہ جو پابندی ایسی نہیں کہ کوئی شخص اپنی طرف سے کہہ دے کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہ پابندی عائد کرو بلکہ خدا نے خود اپنی کتاب میں اس پابندی کی تصریح کر دی ہے۔ تو سمٹ کر بات یہاں آ گئی کہ ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے' پابندی صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب نے اس پر عائد کی۔ آزادی' بلا پابندی سرکشی کہلاتی ہے جیسے سفر بلا تعینِ مقصد آوارگی کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی ضابطے کی پابندی نہ ہو تو وہ آزادی نہیں ہوتی' وہ سرکشی ہوتی ہے۔ یہ وہی ہے جو آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

## خودساختہ شریعت کی طرف سے وضع کردہ پابندی کی نوعیت اور اثرات

عزیزانِ من! پابندیاں مختلف قسم کی ہوسکتی ہیں: بیمار پہ ڈاکٹر پابندی عائد کرتا ہے کہ فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرو' یہ تم نے نہیں کھانی۔ یہ غلامی نہیں ہے' یہ محکومیت نہیں ہے۔ یہ پابندی اس کے حق میں منفعت بخش ہے۔ پابندی جو حکومت کے قوانین عائد کرتے ہیں کہ بائیں طرف چلنا ہے' دائیں سے نہیں جانا' وہ غلامی نہیں ہے' یہ ان کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس قسم کی پابندی کہ برسات کے موسم میں جب ہیضے کا خطرہ ہوتا ہے تو ہیلتھ آفیسر کہہ دیتا ہے کہ امرود اور کھیرے نہیں کھانے' یہ پابندیاں آپ کی منفعت کے لیے ہیں۔ اس چیز کی پابندی کہ ہفتے میں دو دن گوشت کا ناغہ رہے گا' نہیں پکے گا' نہیں کھایا جائے گا' یہ تمدنی پابندیاں ہیں' وقتی پابندیاں ہیں' مصلحت کے تابع عائد کی جاتی ہیں لیکن اگر کسی پہ کوئی شخص یہ پابندی عائد کرے یعنی کسی ایک پر نہیں بلکہ یہ پابندی مسلمان قوم پر عائد کر دی جائے کہ فلاں چیز کا کھانا تم پر حرام ہے تو ذرا اس پابندی کی گہرائیوں اور وسعتوں پر غور کیجیے کہ اگر ایک شخص نے آج سے ہزار برس پہلے یہ بات کہی اور یہ مان لیا گیا کہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ بات کہے' جسے آپ شرعی پابندی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ وہ اپنے سامنے کے مخاطب لوگوں سے ہی نہیں کہہ رہا' کسی ایک فرد سے نہیں کہہ رہا بلکہ وہ پوری قوم سے کہہ رہا ہے اور قیامت تک کے لیے آنے والے انسانوں کے اوپر پابندی عائد کر رہا ہے۔ ارے اس سے گہری اور بڑی غلامی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کا فیصلہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے اوپر سخت زنجیروں کی طرح عائد کر دیا جائے کہ وہ اس سے رتی بھر تجاوز نہ کرسکیں' تبدیل نہ کرسکیں' اس سے ہل نہ سکیں۔ اس کے لیے پاداش اور اس سے انحراف کی سزا اس دنیا میں اس قوم کے سامنے جو بھی تجویز کریں' اور یہ کہ قیامت میں وہ جہنم میں بھی جائے۔

## انسان کی آزادی اور پابندی کی حدود صرف اور صرف خدا کی کتاب متعین کرتی ہے

ظاہر ہے کہ کسی انسان کو قرآنِ حکیم یہ حق نہیں دے سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں اصول ہی عجیب بیان فرمایا ہے۔ عام طور پر یہودیوں کی شریعت میں بھی' ہندوؤں کے ہاں بھی' کہا یہ جاتا تھا کہ فلاں فلاں چیز تم کھا نہیں سکتے ہو یعنی عام پابندی ہوتی تھی' عام چیزیں حرام تھیں' ان میں سے فلاں فلاں چیز کی اجازت دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بالکل اس کے برعکس بات کہی۔ اس نے یہ کہا کہ جو کچھ بھی خدا نے پیدا کیا ہے سنو! يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (2:172) جو کچھ بھی خدا نے یہ سامانِ زیست پیدا کیا ہے' اسے تم کھاؤ پیؤ۔ گویا اس کا جو عام حکم ہے وہ حلال ہونے کا ہے۔ جن چیزوں پہ زندگی کا دار و مدار ہے' جسے قرآنِ مجید میں سامانِ زیست کہا جاتا ہے' جسے رزق کہہ کر پکارتا ہے' وہ حلال ہیں' کھاؤ پیؤ اس پہ خدا کی

سپاس گزاری کرو۔اور یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (2:172) اگر صرف اس کی غلامی کا طوق تم نے ڈالا ہے' صرف اس کے محکوم رہنا چاہتے ہو' چاہتے ہو کسی اور کی پابندی اور محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑے جاؤ' تو اس کے لیے یاد رکھو! جو کچھ سامانِ زیست پیدا کیا ہے اس کو مزے سے کھاؤ پیؤ۔اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ (2:173) بس یہ سمجھ لو کہ یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔یعنی یہاں جو عام حکم ہے' وہ حلت کا ہے حلال ہیں' صرف یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک حرام چیزوں کی تعداد کا معاملہ اور ہمارا شب و روز کا عمل

کہا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) حرام صرف یہ چیزیں ہیں: بہتا ہوا لہو' یہاں صرف ''دمٌ'' (خون) کہا ہے' دوسرے مقام پہ سورۃ الانعام میں ''دَمًا مَّسْفُوْحًا'' (6:145) کہا ہے اور وہ ہے بہتا ہوا لہو یعنی وہ لہو جو ذبح کرنے کے بعد بھی جانور کے بعض حصوں کے اندر باقی رہ جاتا ہے تو وہ بہتا ہوا لہو نہیں ہوتا' اس لیے اس کی تخصیص کر دی گئی۔لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ (2:173) سور کا گوشت۔یہ حرام ہے۔یہ جسے آپ کھانے پینے کی طبعی چیزیں کہتے ہیں وہ یہ تین ہیں: (1) مردار' (2) بہتا ہوا لہو اور (3) خنزیر کا گوشت۔یہی تین طبعی چیزیں ہیں جنہیں قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا ہے۔ایک مقام پہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے اور یہی تین طبعی چیزیں ہیں۔چوتھی چیز ایک اور بھی ہے اور اس کا تعلق عقیدے سے ہے۔وہ ہے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے وہ بھی حرام ہے۔تو یہ چیزیں حرام ہو گئیں: مردار' بہتا ہوا لہو' سور کا گوشت اور ہر حلال چیز جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔یہ ہیں حرام قطعی۔یہ چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جو گنائی ہیں۔پہلی تین چیزوں کے متعلق تو ہم میں سے ہر ایک کو علم ہے۔مردار تو خیر کوئی کھاتا نہیں' نہ ہی وہ لہو پیتا ہے اور خنزیر کے گوشت کے متعلق تو مسلمان کے دل میں جتنی نفرت ہے' وہ ہمیں معلوم ہے۔جس چیز کے متعلق آپ نے حتمی طور پر یہ کہنا ہو کہ آپ اس کو چھوتے نہیں آپ کہتے ہیں کہ میں تو اس کو خنزیر سمجھتا ہوں۔کیا اس چوتھی چیز کے متعلق بھی کبھی آپ کی توجہ گئی ہے کہ قرآنِ مجید یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ روز جو آپ کے ہاں گیارھویں والے کی نیازیں اور ساتویں والے کی نذریں ہوتی ہیں' یہ میر مجو کے بکرے ہوتے ہیں اور فلاں قبر کے اوپر یہ کچھ چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے' یہ کیا ہے؟ یہ ہے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) ہر حلال اور طیّب شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔عزیزانِ من! سوچیے' سور کھانے کے نام پر جن کو ابکائی آ جاتی ہے' وہ نہایت مزے سے بیٹھے ہوئے یہ سارا کچھ کھا رہے ہوتے ہیں۔اور اتنا ہی نہیں بلکہ جو عام کھانا ہے اس کی تو کبھی بے حرمتی ہو جائے تو کہتے ہیں کہ خیر' کچھ مضائقہ نہیں مگر اس میں یہ قبول نہیں ہے۔

## علامہ پرویزؒ کے بچپن کی گستاخی کا ایک واقعہ جو نیاز کے تبرک کی بے حرمتی کا نتیجہ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے

ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ نیاز کے دانے میں تقدیس آ جاتی ہے۔ مجھے آج تک یہ گال پر طمانچہ یاد ہے' بچپن میں یہ گستاخی ہوگئی تھی کہ ایک جگہ نیاز کا تبرک بٹ رہا تھا تو اس کے لینے کے لیے ہم نے یہ ہاتھ آگے کر دیا' حضرت صاحب نے اُدھر سے ایک طمانچہ مارا' کہا کہ ''نیاز قبول کرنے کے آداب بھی تمہیں پتہ نہیں ہیں' ایک ہاتھ میں نیاز لیتے ہو! دونوں ہاتھ کرو'۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ تھی **مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ** (2:173) ۔قرآن کریم نے جسے حرام قطعی قرار دیا ہوا تھا' اس کا واجب الاحترام ہونا اتنا ہو گیا کہ اسے ایک ہاتھ میں لینا اس نیاز شریف کی اتنی بڑی گستاخی سمجھی گئی۔ یہ عجیب قوم ہے۔ دیگیں پک رہی ہیں' نیاز بٹ رہی ہے اور اس میں ایک تقدیس ساتھ شامل ہوتی ہے۔قرآنِ حکیم نے یہی چوتھی حرام قرار دی ہے۔

## اضطراری حالت میں حرام چیز کے استعمال کی اجازت

عزیزانِ من! یہی چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جنہیں حرام کہا۔اس میں بھی آگے قرآنِ مجید کی یہ استثنا عجیب چیز ہے۔کہتا ہے کہ **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (2:173) اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ اضطراری حالت پیدا ہو جائے' کچھ اور کھانے کو نہ ملے اور ڈر ہو کہ بھوک کی وجہ سے موت واقع ہو جائے گی۔ یہ اضطراری حالت قرآنِ مجید نے کہی ہے' اس کو خود اس نے تفصیل سے نہیں بتایا' ہر شخص اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی حد ہے جہاں پہنچ کر اضطراری حالت ہو سکتی ہے۔ اگر اضطراری حالت ہو جائے تو کہا ہے کہ یوں نہیں صاحب! ہم کھائیں گے' دیکھو کون ہمارا کیا کر لیتا ہے' ہم تو لذت کے لیے کھائیں گے' سرکشی کی بنا پہ کھائیں گے۔ کہا ہے کہ یہ کیفیت نہ ہو۔اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں اتنے حصے تک (کہ موت واقع نہ ہونے پائے) ان حرام چیزوں کی بھی اجازت دی جا سکتی ہے۔قرآنِ کریم میں ان چیزوں کے حرام قرار دینے کے متعلق یہ اصول بیان کیا' یہ تصریح بیان کی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات پہ آیا ہے جہاں یہی چار چیزیں حرام ہیں اور یہی اس کے اندر استثنا ہے۔

اب یہ چیز کہ اس حلال وحرام کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے' غور فرمایئے کہ کس قدر تحدی سے' حتمی طور پر' یہ بات قرآنِ حمید نے کہی ہے کہ **قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ** (6:145) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا نے میری طرف جو وحی کی ہے' اس وحی میں' میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پا رہا۔آپ نے غور کیا کہ کس قدر یقین سے یہ بات

کہی جارہی ہے کہ وہ پوری وحی جو میری طرف کی گئی ہے' اس میں صرف یہ چار چیزیں ہیں جن کو میں حرام پا رہا ہوں' ان کے علاوہ اور کوئی شے نہیں ہے جنہیں میں حرام پا رہا ہوں۔ **اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ** (6:145) وہی چار چیزیں ہیں یعنی جو بھی میری طرف وحی ہوا ہے' اسمیں ان کے سوا کسی اور چیز کو میں حرام پا ہی نہیں رہا' یہی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور جو شے بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے۔ آگے کہا ہے کہ **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ**(6:145) وہی استثنا ہے کہ اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس میں اتنی سی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ تم ان چیزوں میں سے کسی کو اس حد تک کھا سکتے ہو۔

## چار چیزوں کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی شے کو حرام قرار نہیں دے سکتا

عزیزانِ من! یہاں یہ چیز یقین کے ساتھ کہہ دی گئی' صراحت کے ساتھ کہہ دی کہ خدا کی طرف سے جو وحی آئی ہے' اس میں یہی چیزیں حرام ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شے کو کسی کے لیے حرام قرار دیدے۔ آپ دیکھیے کہ کس تحدی سے یہ کہا گیا ہے کہ **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ** (7:32) اے رسول! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لیے حلال قرار دیا ہے' خواہ وہ زینت کی چیزیں ہوں اور خواہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں۔ زینت و زیبائش کی چیزوں کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ جنہیں خدا نے حرام قرار نہیں دیا' **قُلْ مَنْ حَرَّمَ** (7:32) کہہ دو کہ وہ کون ہے' وہ ذرا اٹھے بتائے' یہ کسے اختیار حاصل ہے کہ خدا جن چیزوں کو حلال قرار دے' وہ ان چیزوں کو حرام قرار دیدے' کسے یہ حق حاصل ہے! خواہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا زیب و زینت کی چیزیں ہوں' کون ہے جو انہیں حرام قرار دیتا ہے؟ ابھی یہ بات سامنے آئے گی کہ خدا کے اس چیلنج کو کون قبول کر کے دھڑلے سے کہتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ کون ہے جو ایسا کہتا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ اس نے تو چار چیزیں کہیں جن میں تین طبعی ہیں جبکہ ہم نے وہ فہرستیں مرتب کی ہیں کہ اس کے اندر سینکڑوں شامل کر دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ **مَنْ حَرَّمَ** (7:32) انہیں کون حرام قرار دیتا ہے! یہ کہتے ہیں کہ ہم حرام قرار دیتے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ صاحبِ نبوت کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی اس قسم کی پابندی انسانوں پر عائد کرے۔

## حلال چیزوں میں کسی چیز کا کھانا یا نہ کھانا ہر انسان کی مرضی پر منحصر ہے

(66:1) میں آپ دیکھیے کہ خود ذات رسالت مآب ﷺ کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ**

(66:1) اے نبی! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے' تُو اپنے لیے بھی اسے کیوں حرام قرار دے رہا ہے۔اس تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ بات تو قرآن کریم نے یہ کہی ہے کہ اور تو اور نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے۔اس نے دوسروں کے اوپر وہ پابندی نہیں عائد کی' اپنے لیے کسی چیز کے متعلق کوئی پابندی عائد کرلی کہ مثلاً میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز انسان کی اپنی مرضی پہ چھوڑی گئی ہے کہ حلال چیزوں میں کونسی چیز وہ کھائے' کونسی چیز نہ کھائے لیکن کسی چیز کو اس طرح سے ابدی طور پر اپنے اوپر حرام قرار دینا اور نبی کے اس طرح کے عمل کے نتائج بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کسی چیز کو محض اس لیے کہ طبیعت نہیں چاہتی' ناخوشگوار سمجھتی ہے' مزاج کے موافق نہیں ہے' پسند نہیں ہے' وہ اس چیز سے احتراز برتتا ہے' اجتناب برتتا ہے' نہیں کھاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی امت یہ سمجھ لے کہ یہ چیز تو ہے ہی حرام۔اور اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا اس لیے قرآنِ کریم کو خاص طور پر یہ چیز کہنا پڑی' خود ذات رسالت مآب ﷺ سے یہ کہا گیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے تُو اسے اپنے لیے بھی حرام قرار کیوں دے رہا ہے' تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے نتائج کتنے دوررس ہونگے!

## کسی چیز کو نہ کھانے کے سلسلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک واقعہ

جیسا میں نے ابھی عرض کیا اور پہلے بھی یہ بات ہو چکی تھی۔حضرت یعقوبؑ کو اسی طرح سے کوئی چیز ناپسند ہوگی' اسؑ نے اسے کھانا چھوڑ دیا۔ یہودیوں نے سمجھ لیا کہ یہ چیز حرام ہے۔کہا ہے کہ **كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ** (3:93) تمام چیزیں حلال تھیں بجز اس کے کہ حضرت یعقوبؑ نے خود اپنے لیے کسی ایک چیز کو چھوڑ دیا' اُسے کھانا چھوڑ دیا تو اس کے بعد بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ یہ چیز بھی حرام ہی ہوگی جو ہمارے نبی نے اسے کھانا چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے اوپر حرام قرار دیدیا۔اس بنا پہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ خواہ آپ ﷺ نے اس چیز کو اس لیے چھوڑا ہو کہ یہ طبیعت پہ کچھ ناگوار گزرتی ہے آپ ﷺ اسے کھانا نہیں چاہتے لیکن آپ ﷺ کے اس عمل کا اثر بڑا دوررس ہوگا۔اس سے پہلے ایسا ہو چکا ہے کہ ایک نبی نے محض اپنی طبیعت کی خاطر کسی چیز سے اجتناب کیا اور اس کی امت نے اسے حرام قرار دیدیا۔کہا ہے کہ یہ چیز نہ کرو۔

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ حرام اور حلال کا مسئلہ' قرآنِ حکیم کی رو سے کتنا اہم ہے! وہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ انسانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کردے جو ابدی پابندی بن کر رہ جائے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔خدا نے اس کے متعلق اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں تصریح کردی ہے کہ کون کونسی چیز ابدی حرام' ہمیشہ کے لیے حرام' ہر حالت میں حرام' قرار دیدی بجز اس کے کہ اضطراری حالت کے لیے قرآنِ حکیم نے اس کے اندر کچھ Relaxation (رعایت) کردی۔خدا نے ان

چیزوں کی تصریح اپنی کتاب (قرآنِ مجید) میں کردی۔ تو دوسری چیز یہ ہوگئی کہ کتاب اللہ کے اندر جن چیزوں کے متعلق تصریح آ گئی ہے خدا نے صرف انہیں حرام قرار دیا ہے۔ اگلی چیز یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہہ دیا گیا کہ آپ ﷺ کسی چیز کے لیے عادتاً بھی ایسا نہ کریں کہ مبادا بعد میں جو آنے والے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ شے بھی حرام کی فہرست میں داخل ہو جائے گی کیونکہ آپ ﷺ نے اسے نہیں کھایا۔ اور قرآنِ مجید نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ ہر جگہ یہی تین طبعی چیزیں ہیں: (1) مردار (2) بہتا ہوا لہو (3) لحم خنزیر اور چوتھی چیز عقیدے کی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف جسے منسوب کیا جائے' وہ شے بھی حرام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز قرآنِ کریم کی رو سے حرام نہیں قرار دی گئی۔

## حلال کے ساتھ طیّب کی شرط کا مقصد

اب جنہیں قرآنِ کریم نے حلال قرار دیا ان کے متعلق ایسا نہیں کہ یہ ہر ایک کے اوپر فرض ہے کہ ہر حلال چیز کو ضرور کھایا جائے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم عجیب کتاب ہے۔ عام طور پر جہاں بھی حلال کا لفظ آیا' قرآنِ حکیم نے اس کے ساتھ طَيِّبًا کا لفظ کہا ہے۔ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (2:168) جو کچھ بھی زمین پہ سامانِ رزق ہے جسے حلال قرار دیا گیا ہے یعنی اس کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا' اس کے ساتھ یہ حَلٰلًا طَيِّبًا آیا ہے۔ یہ دوسری شرط ہے کہ اس حلال میں سے جو تمہیں پسند ہو' خوشگوار ہو' مزاج کے مطابق ہو' تکلیف نہ دیتا ہو' طیّب کے اندر یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں' انہیں کھاؤ۔ حلال میں سے بھی اب یہ تمہاری اپنی چوائس ہے' بعض چیزیں طبعاً کسی کے لیے' مزاج کے اعتبار سے' طبع کے اعتبار سے' نقصان دہ ہوتی ہیں' بعض چیزیں کسی کے ذوقِ لطیف پہ گراں گزرتی ہیں۔ وہ انہیں نہیں کھاتا' بعض چیزوں سے یونہی غیر شعوری طور پر نفرت سی ہو جاتی ہے اور بعض چیزوں کے نام سے کسی کو چڑ ہو جاتی ہے۔ آپ نے ایسے دیکھے ہونگے کہ ان کے سامنے کریلا کہیے تو وہ نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ کچھ چیزیں غیر شعوری طور پر بھی پیدا ہو جاتی ہیں' وہ طیّب نہیں رہتیں' حلال تو ہوتی ہیں مگر طیّب نہیں۔ اب یہ جتنی چیزیں حلال چیزوں میں سے ہیں یعنی جو قرآنِ مجید نے حرام قرار نہیں دیں' آپ دیکھیں گے کہ وہ لہو اور مردار جو ہے' وہ تو ہر ایک کے اوپر آ گیا یعنی ذبح کیا ہوا جو بکرا بھی ہے' بکرا بھی حلال ہے پھر آپ نے اس کو خدا کے نام پہ ذبح کیا وہ حلال ہوا' اس کا بھی جو بہتا لہو ہے' وہ حرام ہے۔ مردار کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

خنزیر کے متعلق یہ چیز' جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' چلی آ رہی ہے کہ اس کا تو نام بھی مسلمان نہیں سن سکتا لیکن اس کے علاوہ جتنی حلال چیزیں ہیں' ان حلال چیزوں میں سے آپ دیکھیے۔ ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے (مثلاً) کتے کا نام لیجیے' ذہن میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ حلال ہے' اسی طرح یہ چھپکلیاں' یہ گرگٹ' یہ چوہیاں ہیں حالانکہ ہمارے ساتھ اور علاقے اور قومیں ہیں' وہ انہیں مزے

لے لے کر کھاتی ہیں اور اس میں ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جو گھن والی چیز ہے وہ یہ کھا جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی ہندو بستا ہے' آپ کس مزے سے گائے کا گوشت کھا جاتے ہیں' وہ اتنی سی چیز پر نہ صرف یہ کہ اس کی طبیعت اِبا کرتی ہے بلکہ اس پر وہاں فساد ہوتے ہیں۔ اور انہی کے ہاں کا جینی تو کسی قسم کے گوشت کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ نان جینی ہندوؤں کے ہاں بھی یہ ویشو بھگت ہوتے ہیں' وہ سبزی کھاتے ہیں' گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کسی قوم میں ایک عقیدے کا متوارث چلے آنا ہے کسی مسئلے کا چلے آنا ہے' اسی طرح تواتر سے کوئی روایت کسی معاشرے کے اندر چلی آتی ہے' روایت سے میرے معنی عام معاشرے کی پوزیشن ہے۔

## حلال کے ساتھ طیّب ہونے کا تصور ہر جگہ مختلف ہوتا ہے اور طبعی ری ایکشن کا نتیجہ ہے

ہمارے گھروں کے اندر بچپن سے ہی ہر بچے کو معلوم ہے کہ چوہیا سے نفرت ہے' گرگٹ اور چھپکلیاں بلیاں اور کتے تو خیر کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں چلی آ رہی ہیں' یہ ہمارے لیے طیّب نہیں رہیں' طبعاً ہمارے اندر سے ان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ طیّب نہیں رہیں۔ اب اگر کوئی یہ چیز کہے کہ صاحب! ٹھیک ہے کہ آپ نے تو کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' سنیے! میں نے نہیں کہا قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' تو کیا یہ کتا حلال ہے جی؟ اب کسی سے کہہ دیجیے کہ صاحب! کتا حلال ہے' پھر آپ دیکھیے کہ تماشہ کیا بنتا ہے کہ لو جی! ''او کتا وی حلال اے'' (کتا بھی حلال ہے)۔ پھر اگلا کہتا ہے کہ صاحب! حلال ہے' اسے کہو کہ ذرا اس کو کھائے۔ انہیں وہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے حلال کے ساتھ طیّب بھی کہا ہے۔ اب یہ حلال ہے مگر طیّب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی کوئی قوم کوہستان میں رہتی ہو' ان کے نزدیک یہ طیّب بھی ہو۔ وہ اگر قوم مسلمان ہو تو آپ کو اس کے لیے حق حاصل نہیں ہے کہ آپ انہیں کہیں کہ آپ کتا نہیں کھا سکتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں برا لگتا ہے۔ تمہیں لگتا ہوگا۔ تمہاری تو یہ بھی کیفیت ہوسکتی ہے کہ تم بینگن نہ کھاؤ۔ کیا آپ پڑوسی کو یہ کہہ دیتے ہو کہ صاحب! اپنے ہاں بینگن نہ پکایئے' ہمیں تو اس کی بو آ جائے تو اُبکائی آ جاتی ہے۔ آپ نے غور کیا کہ کسی چیز کے حلال ہونے میں اور طیّب ہونے میں کیا فرق ہے اور اس کے طیّب نہ ہونے میں اور حرام ہونے میں کیا فرق ہے۔ جس جس قوم میں کوئی چیز طیّب ہے اور قرآنِ کریم نے حرام قرار نہیں دیا' وہ مسلمان ہو کر بھی اس چیز کو کھا سکتی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں' کسی قوم پہ کوئی ایسا وقت آ کر پڑے۔ یہ گھوڑے کا' گدھے کا گوشت عام طور پر ہم نہیں کھاتے البتہ جنگ کے زمانے میں جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہاں اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ خچریں ذبح کی جاتی ہیں' گھوڑوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قوم میں ایسا وقت آ جائے اور ایک نسل اس کو کھانا شروع کر دے تو جو اگلی نسل ہے اس کے نزدیک یہ چیز طیّب ہو جائے گی۔ یہ طیّب و ناطیّب ہونا جو ہے' خوشگواری اور ناخوشگواری ہونا جو ہے' یہ تو انسان کا طبعی ری ایکشن

ہے۔ یہاں طبعی ری ایکشن کا سوال نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے کتنی بڑی رعایت برتی ہے۔ حرام قطعی تو صرف یہی چیزیں قرار دی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو اور خنزیر۔ عقیدے کی چیز میں نے الگ بیان کی ہے یہ ہر حلال چیز ہے جس پہ خدا کے علاوہ کسی کا نام لیا گیا ہو' وہ تو آپ کہیں گے کہ یہ بار بار کیوں دہرا رہا ہے' آپ کی طبیعت میں بھی آتا ہوگا کہ صاحب! روز کھاتے ہیں' ابھی جا کر کھائی ہے' محلے میں دیگ پک رہی ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے بار بار کہے جا رہا ہے' کہے جا رہا ہے لیکن وہ کیا کیا جائے یہاں قرآنِ کریم میں حرام آیا ہے۔ تین طبعی چیزیں وہ ہیں اور چوتھی یہ عقیدے کی چیز ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ یہ چیزیں جو ہیں تو یہ تو ابدی طور پر حرام ہوگئیں بجز اس کے جس میں قرآنِ حکیم نے Relaxation (رعایت) کی اضطراری حالت میں اجازت دی۔ یہ تو ابدی ہوگئیں ہر زمانے میں ہر قوم میں ہر ملک میں ہر فرد کے لیے۔ باقی چیزیں جتنی بھی ہیں وہ حرام نہیں ہیں' وہ حلال ہیں' ان میں سے جس جس کو کوئی فرد' کوئی قوم' کوئی گروہ' کوئی ملک' اپنے لیے طیّب سمجھتا ہے وہ اسے کھائے اور اگر طیّب نہیں سمجھتا تو پھر بالکل نہ کھائے۔

## آنے والے دور میں حلال اور طیّب کی وسعت اور تقاضے

عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن کریم نے حلت اور حرمت کے متعلق بیان کیا ہے۔ کتنی عظیم چیز ہے جو اس نے بیان کر دی ہے! اتنی کھلی ہوئی گنجائش ہے جو اس نے دیدی۔ ابھی تو ان چیزوں کے متعلق اس کی اہمیت ہمارے ذہن میں نہیں ہے کہ قرآنِ مجید نے جو اس طرح سے حلال کی رسیاں کھولی ہیں' یہ انسانیت پر کتنا بڑا احسان ہے' کل کو اس کے متعلق پتہ چلے گا۔ بہت سی ایسی چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہیں شاید ختم ہوتی چلی جائیں کہ جو عام طور پہ کھائی جاتی ہیں' اس کے بعد انسانوں کے لیے کھانے پینے کے لیے یہ چیزیں باقی نہیں رہیں گی۔ وہ چیزیں باقی رہیں گی جنہیں آج ہم نہیں کھاتے' باقی قومیں جنہوں نے اپنے اوپر پابندیاں عائد نہیں کیں' وہ تو آسانی سے ان چیزوں کو کھائیں گی۔ یہ گدھے ہونگے' یہ گھوڑے ہونگے' یہ کتے ہونگے' یہ تمام چیزیں ہونگی۔ اگر آپ نے اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کیں یا خدا کی طرف سے یہ سب پابندیاں عائد ہوگئی ہوتیں تو اتنی سی چیزیں جو ختم ہو جاتیں اس کے بعد کچھ کھانے کو ہی نہیں مل سکتا تھا۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ چیزیں اگر اضطراری حالت میں بھی کسی پر ختم ہوگئیں اور وہی کھانی پڑیں جو ہم نہیں کھاتے' اس لیے کہ وہ ہمارے نزدیک طیّب نہیں ہیں' اگر کسی مجبوری کے عالم میں بھی وہ چیزیں ہمیں کھانی پڑیں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ان سے وہ ناگواریت اور نفرت ہے' وہ جذبہ مٹ جائے تو وہ طیّب میں آجائے گی لیکن جن قوموں نے ان چیزوں کو اپنے اوپر ابدی طور پر حرام قرار دیا ہوا ہے آپ ان کی مشکلات سوچیے۔ گوشت نہیں کھانا' ایسے مقامات میں وہ چلے جائیں جہاں سبزیاں نہیں ہوں' یہ بحرِ منجمد شمالی وغیرہ کے اندر جہاں برف ہی برف ہوتی ہے' صحراؤں کے اندر' سمندر میں گزارا کرنا پڑے مہینوں تک برسوں تک' کیا کیا جائے گا وہاں؟

وہاں پتہ چلے گا کہ یہ صرف دو تین چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی کو جو حلال قرار دینا ہے یہ انسانیت کے لیے کتنی بڑی منفعت بخش چیز ہے۔

## حرام وحلال کے سلسلہ میں ہمارے وضع کردہ فقروں کی نوعیت

عزیزانِ من! یہ تو قرآنِ کریم نے کیا ہے۔ اب اس کے بعد اسے چھوڑ یئے کہ آپ طبعاً کن چیزوں کو ناگوار سمجھتے ہیں۔ اب آپ اپنے ہاں کے مفتیانِ کرام سے پوچھیے۔ وہ حرام کی اتنی اتنی لمبی فہرستیں آپ کو بتائیں گے کہ آپ حیران ہو جائیں گے کہ پھر حلال کیا رہا۔ آپ کے ہاں فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں جن میں درج ہے کہ یہ بھی حرام' یہ بھی حرام۔ اور پھر بعض چیزوں کے اوپر بحثیں چلی آ رہی ہیں۔ آپ کے ہاں ہزار برس سے کوا حلال ہے یا حرام ہے' اس پر اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہوئی ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا جو میں نے ابھی کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) اے رسول! پوچھو ان سے کہ کون ہے وہ جو یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ یہ ہیں ہمارے ہاں شریعت کے وہ ارباب جو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر' بجا کر' کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ان چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہاں (7:32) میں قرآنِ حکیم نے دونوں چیزیں کہی تھیں: زینت کی چیزیں بھی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ اب ہمارے ہاں ان فہرستوں میں یہ ہے کہ ریشم پہننا حرام ہے' چاندی سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو ہو جائے گا۔ جنت میں ریشم کے کپڑے ہیں' چاندی سونے کے برتن ہیں ''اے سارے فیر اوتھے آپ حرام کھان گے'' (یہ تمام پھر وہاں حرام کھائیں گے)۔ دراصل انہوں نے یہ سب کچھ اپنے آپ پہ خود ہی حرام قرار دے لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جنت تو وہاں ہوگی جہاں یہ نہ ہوں ورنہ ''اوتھے وی جاکے رولا پادین گے'' (یہ وہاں بھی جا کر خوب گھپلا کریں گے' شور شرابا کریں گے)۔ یعنی وہاں جنت میں سبزیوں کا ذکر نہیں ہے' اناج کا بھی ذکر نہیں ہے' گوشت ہی گوشت کا ذکر ہے۔ دیکھیے! قرآنِ حکیم وہاں ریشم کے مختلف قسم کے لباس کا کہتا ہے جس میں حریر و اطلس بھی ہے' اس کے اندر ریشم بھی ہے' ایسے ایسے ریشمی کپڑے ہیں جو دبیز ریشم کے ہیں اور وہ باریک ریشم کے بھی ہیں۔ اس قسم کی چیزیں قرآنِ مجید گنا تا چلا جاتا ہے۔ اور یہ کنٹر [1] بلوری اور چاندی اور سونے کے زیورات تو وہاں جنت میں ایک طرف رہے' وہ برتن بھی وہاں چاندی اور سونے کے گنا رہا ہے۔ جبکہ یہاں ان کا استعمال تک حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ ''میرا خیال ہیگا اے کہ ایناں اوتھے جاکے فتویٰ وی بدل لینا ہیگا'' (میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہاں جا کر اپنا فتویٰ بھی بدل لینا ہے)۔ میں کہہ یہ رہا تھا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ کہو' کون ہے جس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان زینت کی چیزوں کو اور کھانے پینے کی چیزوں کو حرام قرار دیدے۔

---

[1] کنٹر۔ یہ انگریزی لفظ Deconter کا معّد ہے' واحد اور مذکر ہے۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس جاری کردہ فتوے

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہوئے ہیں۔فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں آپ کے ہاں حرام اور حلال کی۔اسے آپ کے ہاں فقہ کہا جاتا ہے۔قرآنِ کریم نے رسول اللہﷺ سے کہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ خدا نے وحی کیا ہے' اس میں تو میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پاتا اور خدا نے کہا تھا کہ ان سے پوچھو پھر کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے۔یہ اس دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں حرام قرار دی ہیں۔یہ ''حرام قرار'' دینے کے درس کی بات شروع ہوئی تھی' یہ کہاں سے یہ چیزیں حرام قرار دی گئیں؟

## خودساختہ فتوؤں کے باعث امت پر وارد ہونے والا عذاب

کہا ہے کہ **فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ** (4:160)۔ان کے جرائم کی سزا میں یہ چیز کی گئی تھی کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔یہ جو آپ کے اوپر' امتِ مسلمہ کے اوپر' مسلمانوں کے اوپر' یہ اتنی فہرستوں کی فہرستیں ہیں جو ان چیزوں کی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں یہ بھی تو اس امت کے جرم کی سزا میں ہی کچھ ہو سکتا ہے۔یہ سزا ہے جو اس امت کے اوپر وارد ہوئی ہے ورنہ قرآنِ کریم نے تو تاکید کی تھی کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (5:87) اے ایمان والو! **لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ** (5:87) خدا نے جن چیزوں کو تمہارے لیے حلال طیّب قرار دیا ہے انہیں حرام نہ قرار دے لینا۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا تاکیدی حکم ہے۔آگے کہا ہے کہ **وَ لَا تَعْتَدُوْا** (5:87) جو حد سے گزر جانے والی بات ہوگی وہ نہ کرنا۔حدیں ہم نے مقرر کی ہیں بس یہ ہے لائن' اس سے تجاوز نہ کرنا۔عزیزانِ من! ان چیزوں کے اندر کسی ایک چیز کا بھی جو اضافہ ہے' خدا کی جو لگائی ہوئی حد ہے' وہ اس سے تجاوز ہے۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ **لَا تُحَرِّمُوْا** (5:87) جنہیں ہم نے حلال قرار دیا ہے' انہیں تم حرام نہ قرار دے لینا۔اور اس کے بعد اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس قسم کے لوگ بھی ہیں جو **فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ** (16:114)۔یہاں پھر وہی الفاظ آئے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور تم ان کو نعمت سمجھتے ہو' وہ طیّب ہیں' ان میں سے انہیں کھاؤ پیؤ اور خدا کے سپاس گزار رہو کہ اس نے خواہ مخواہ تمہارے اوپر پابندیاں نہیں عائد کر دیں۔یہ بہت بڑی چیز ہے۔کہا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ محکومی اور غلامی صرف خدا کی ہو سکتی ہے' کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔کہا ہے کہ **اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ** (16:114)۔قرآن کریم اس کو شرط قرار دیتا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ بندوں کو' انسانوں کو' کسی کے اوپر پابندیاں عائد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے یہ صرف خدا کو حق حاصل

ہے۔ اگر تم صرف اس کی عبودیت اختیار کیے ہوئے ہو تو جو چیز ہم نے حلال قرار دی ہے' اسے حرام نہ قرار دے لینا۔ آگے کہا ہے کہ **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (16:115)۔ یہ وہی الفاظ ہیں۔ پھر سن لو کہ حرام یہ چیزیں ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور خدا کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کردہ چیزیں۔ یہ ہیں حرام۔

## قرآنِ حکیم کے مقرر کردہ قوانین میں ردوبدل کرنا خدا پر افترا ہو جائے گا

آگے کہا ہے کہ **وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ** (16:116)۔ کہتا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے' زبان درازیوں سے' چکنی چپڑی باتیں کرتے کرتے' یہاں تک نہ پہنچ جاؤ کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ وہ تو ہم نے بتا دیا کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ کہا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے اپنی چرب زبانی کے اعتبار سے جھوٹ بولتے ہوئے' فہرستیں نہ مرتب کرنے لگ جانا۔ اور **لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ** (16:116) انہیں خود حرام قرار دو اور ان کو شریعتِ خداوندی بنا کر لوگوں کے اندر رائج کرو' یہ خدا کے اوپر افترا ہو جائے گا' ایسا نہ کر دینا۔ **اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ** (16:116) یاد رکھو! خدا کے خلاف جو افترا بازی ہے' اس کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ کرنے لگ جانا۔ عزیزانِ من! دیکھیے تو سہی کہ اس قوم میں اس قرآنِ مجید کی تلاوت کتنی ہوتی ہے! ان کے ہاں تلاوت کے معنی صرف اس کا پڑھنا ہے حالانکہ عربی زبان میں تلاوت کے معنی ''پیروی کرنا'' ہوتا ہے۔ اس کی تلاوت کتنی ہوتی ہے اور ہمارا عمل اس کے خلاف کس قدر ہے! چھوٹی چھوٹی چیزیں تو ایک طرف رہیں' حلت وحرمت کے متعلق' حرام وحلال کے متعلق ہماری کیا کیفیت ہے! جن چیزوں کو بالفاظ صریح قرآنِ حمید نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرنا لیکن ہم نے ان چیزوں کو شریعت مقدسہ بنایا ہوا ہے۔

## حرام چیزوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی شریعت کا عمل دخل جو سرا سر احکامِ قرآنی کے منافی ہے

ہم نے درس کی ابتدا اس آیت سے کی تھی کہ یہودیوں پر یہ چیزیں یعنی ناخن دار پرندے اور گائے اور بکری کی چربی ان کے جرائم کی وجہ سے حرام قرار دی گئی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہ جو شریعت حقہ بیان کی جاتی ہے' اس میں بھی سارے ناخن دار پرندے حرام ہیں۔ آپ کے اربابِ شریعت کی فہرستوں کے اعتبار سے اس قسم کی چونچ جیسی طوطے کی ہوتی ہے یا جن پرندوں کے پنجوں میں ناخن ہوتے ہیں حرام ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ یہودیوں پہ دس چیزیں ان کے جرائم کی بنا پر حرام قرار دی گئی تھیں اور ان میں بتایا یہ تھا کہ **وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ** (6:146) یہ جتنے ناخن دار پرندے ہیں' یہ حرام قرار دیئے تھے جو ہم نے ان

کو ان کے جرم کی بنا پر سزا دی تھی۔ آپ نے یہ سب اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہیں۔ انہیں تو جرائم کی سزا میں یہ چیزیں حرام ہوئی تھیں' آپ نے ازخود اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ یہ ہے تماشا۔ قرآنِ حکیم تصریح کر رہا ہے کہ ہم نے ان کو ان کے جرائم کی بنا پہ یہ چیز بطور سزا دی تھی لیکن ہمارے لیے اس نے حلال قرار دیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب! ''تے ساڈے بھرا لگدے ہیگے نیں اوُ نال ای اوناں دے اسی وی حرام کر لیا کہ ساہنوں سزا کیوں نئیں ملدی پئی'' (ہمارے بھائی لگتے ہیں تو ہم نے ان کے ساتھ یہ حرام قرار دے لیا کہ ہمیں سزا کیوں نہیں مل رہی)۔ ہم نے ازخود اپنے اوپر ان سزاؤں کو وارد کر لیا ہے۔

## بیان کردہ چار چیزوں کو حرام قرار دینے کی وجہ جواز

اب وہ سوال باقی رہ جاتا ہے جو عام طور پہ کیا جاتا ہے کہ صاحب! قرآنِ مجید نے یہ چیزیں حرام کیوں قرار دیں۔ یاد رکھیے! بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' خود قرآنِ حکیم نے بتا دیا ہے' بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' جو ہے' وہ انسانی بصیرت' علم تجربہ مشاہدہ مطالعہ کے اوپر منحصر ہے کہ وہ ان کی بنا پر اس چیز کو پرکھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ حرام ہیں' یعنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں آئے تو حرام ہیں اور وجہ سمجھ میں نہ آئے یا ہم کہہ دیں کہ نہیں صاحب! اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے' یہ حلال ہو جائے۔ وہ تو طیّب چیز جو حلال میں سے ہے' اس میں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس نے جسے حرام قرار دیا ہے' اس میں یہ صورت نہیں ہے' وہ بہرحال حرام ہے۔

''کیوں'' کی بات کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ڈاکٹرز' غذائیات کے متعلق جنہوں نے تحقیقات کی ہیں' وہ اپنے نقطۂ خیال سے ان چیزوں کے متعلق کچھ آپ کو بتائیں۔ سائیکولوجسٹ (ماہر نفسیات)' سوشیالوجسٹ (ماہرِ سماجیات)' انتھروپالوجسٹ (ماہر بشریات) اپنے اپنے علمی نقطۂ نگاہ سے ان چیزوں کے متعلق کچھ بیان کریں لیکن ایک چیز ایسی ہے جو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کیا تھی۔ پوری انسانیت کی تاریخ آپ دیکھیں۔ جب سے وہ ہمارے سامنے آئی ہے' وہ کسی ملک کی تاریخ ہو' کسی قوم کی تاریخ ہو' اس میں آپ دیکھیں گے کہ مردار خور' خون پینے والا' خون آشام' یہ الفاظ دنیا کی ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زمانے میں' تاریخ کے ہر دور میں' بڑی قابلِ نفرت قرار دی گئی ہیں یعنی ان چیزوں کے خلاف ایک عالمگیر نفرت ہے۔ کسی کو آج کہہ دیا کہ یہ خون پینے والا ہے' یہ جو خون پیتا ہے' یہ بڑا ہی قابلِ نفرت قرار پاتا ہے۔ اور جو مردار خور ہے' آپ دیکھیے سوائے ان قبائل کے جو بالکل ہی وحشت اور درندگی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہوں' ان میں یہ چیزیں رائج ہوتی ہیں لیکن جہاں بھی انسان ذرا تمدن اور تہذیب کے دائرے میں آیا ہے' وہاں آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے' کسی زبان کا لٹریچر اٹھا کر دیکھیے' اس کے اندر یہ چیزیں ہمیشہ نفرت کے پہلو میں بیان کی جائیں

گی' محاورے ہونگے' تمثیلات ہونگی' تشبیہات ہونگی۔ باقی رہا یہ خنزیر تو اس کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ''کیوں'' حرام ہے لیکن ہمارے ہاں انسانیت کی تاریخ کسی قوم کے بارے میں پہلے صفحے ہی پر خنزیر کو ہمیشہ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ آج بھی یورپ کی یہ اقوام جو مزے لے لے کر کھاتی ہیں' وہیں ٹیبل پہ بیٹھے ہوئے اس کا گوشت کھا رہی ہیں اور گالی پھر بھی اس کو دے رہی ہیں اور منہ میں اس کا ٹکڑا بھی ہوتا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے ان کے ہاں بھی یہ چیز گالی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو یہ تھا ہی حرام۔ عیسائیوں کے ہاں بھی حضرت عیسیٰؑ نے کہا ہے کہ میں تو جو شریعتِ موسوی ہے' اسی کو زندہ کرنے کے لیے آیا ہوں عیسائیوں کے ہاں بھی یہ حرام تھا۔

## یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی وجہ جواز

یہودیوں سے نفرت' دشمنی اور انتقام کی بنا پر یہ ایک عجیب المیہ ہوا تھا' یاد رکھیے! عیسائیوں کے یہودیوں کے خلاف بڑے ہی انتقام اور نفرت کے جذبات تھے اس لیے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم نے عیسیٰؑ کو صلیب کیا تھا' ایک تو مریمؑ پر انہوں نے تہمتیں باندھی تھیں' حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے ان کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مارا ہے' عیسائی تو ان کے جانی دشمن تھے۔ عیسائیوں میں ایک گروہ پیدا ہوا' جنہوں نے کہا کہ جو چیز یہودیوں کے ہاں ہوتی ہے' علی الرغم ہم اس کی مخالفت کریں گے' یہودیوں کے ہاں ختنہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا' انہوں نے اس کو چھوڑا۔ عیسائیوں کے ہاں شروع میں حضرت عیسیٰؑ جس مسلک کے تھے' اس میں ختنہ بھی ضروری تھا' وہی بنی اسرائیل کی جو رسم تھی اس کے اوپر وہ پابند تھے۔ اور ان کے ہاں یہ سور بھی حرام تھا' ان لوگوں نے یہ جو دو چیزیں تھیں ان دونوں کو یہودیوں کے علی الرغم ان سے انتقام کی وجہ سے اپنے ہاں جائز قرار دیا۔ یوں ان کے ہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی اور جب کہیں سے ابتدا ہوئی تو پھر بات آگے چل نکلی' پھر وہ قوم مذہب کی بنا پر ان سے Indifferent (لاتعلق) ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں یہ چیزیں جائز قرار پاگئیں ورنہ ان کے لیے بھی سور حرام ہی قرار دیا گیا تھا۔ اور میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ گوشت کھانے کی حد تک تو انہوں نے یہ جائز قرار دے لیا' گالی اب بھی سور کی دی جاتی ہے اور انجیل میں تو یہ گالی ہے ہی کہ ''موتیوں کو سوروں کے آگے تو نہ ڈال دو'' وہاں قابل نفرت انسانوں کو سور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ جو انسانیت کا عالمگیر جذبہ ان چیزوں کے خلاف چلا آ رہا تھا' میں نے کہا ہے کہ بعض چیزیں تو لوکل ہیں مثلاً ہمارے ہاں چھپکلی' مینڈک یا چوہیا وغیرہ جو ہیں' ان سے نفرت ہے' ساتھ ہی ہمارے دوسری قومیں ہیں' جن کو نفرت نہیں ہے۔ ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں' ساتھ ہی ہندو ہے' انہیں گائے کے گوشت سے نفرت ہے' وہ اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن یہ سور ایسی چیز ہے جس کے متعلق عالمگیر انسانیت میں شروع سے نفرت پائی جاتی ہے۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر انسانیت کے جذبات کی قدر و منزلت کا مقام

میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حکیم نے عالمگیر انسانیت کے ان جذبات کا احترام کیا کہ جس کے خلاف طبع Revolt (بغاوت) کرتی ہو' اِبا کرتی ہو' اسے قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا۔ اور جسے آپ اقدار مشترک کہیں گے' ایسی چیزیں جو ہر جگہ' ہر زمانے میں' ہر قوم میں' مشترکاً قابلِ نفرت پائی جاتی ہیں یہ ان کے متعلق قرآنِ حکیم نے کہا ہے۔

## باہمی رشتہ داری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت

میں نے کہا ہے کہ دیگر زاویوں سے جو اس کے متعلق تحقیق کریں گے وہ آپ کو اپنی اپنی نگاہ کی چیزیں بتائیں گے' یہ ان کا احاطہ ہوگا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس نے ماں اور بہن اور بیٹی کے رشتوں کے متعلق نکاح حرام قرار دیا ہے' انہیں اگر آپ پوچھیں تو ہوسکتا ہے کہ ہم شاید Biologically (حیاتیاتی لحاظ سے) اس کے متعلق کچھ نہ بتاسکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض قوموں کے اندر یہ جو Cousin ہیں' یہ چچا کی لڑکی ماموں کی لڑکی' ان کے آپس کے رشتوں کو مقامی طور پر حرام قرار دیا تھا' یہ عالمگیر بات نہیں تھی۔ عالمگیر انسانیت میں آپ دیکھیں گے کہ ماں بہن بیٹی وغیرہ جو ہیں ان میں یہ نکاح حرام چلے آ رہے ہیں۔ ان کی ابتدا کیسے ہوئی' کیوں یہ ہوا' ابھی تک تو اس کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ یہ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ ان تمام عقائد کو جو ابتدا سے انسانوں کے اندر چلے آ رہے ہیں وہ دیکھیں کہ یہ کیسے پیدا ہوئے تھے' کیا حالات تھے لیکن تاریخ میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو پوری عالمگیر انسانیت کے اندر بطور مشترک قدر کے چلی آ رہی ہیں' یہ ان چیزوں میں سے ہیں' ان میں استثنا تھا کہ جیسے یہ چیزیں جو حرام قرار دی ہیں' ایسے ہیں' ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو اس قسم کی چیزیں کھا جاتے ہیں۔

## بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں رومنز اور ایرانیوں کے ہاں استثنا کا معاملہ پایا جاتا تھا

اسی طرح سے نکاح کے معاملے میں بھی ایسی استثنا پائی جاتی تھی۔ رومنز (رومیوں) کے ہاں بھی یہ کیفیت تھی کہ بیٹی سے شادی کر لیتے تھے' ایرانیوں کے ہاں بیٹیوں بہنوں سے شادی کر لیتے تھے' ان میں استثنا تھی کہ صرف Royal Family (شاہی خاندان) والے کر سکتے تھے' بادشاہ کر سکتا تھا' عوام میں یہ اجازت نہیں تھی لیکن عالمگیر انسانیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کو شروع سے ہی حرام قرار دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو رشتے حرام ہیں' یہ احترام کی وجہ سے ہیں' نفرت کی وجہ سے نہیں ہیں لیکن کسی وجہ سے بھی ہوں' یہ عالمگیر چیز تھی۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے' تحقیق کے بعد اور وجوہات بھی اس کی نکلیں گی یہ چار چیزیں ہیں جنہیں قرآن مجید نے حرام قرار دیدیا ہے' وہ بجز ان حالات کے جیسے اس نے کہا ہے کہ اضطراری حالت میں اس کی اجازت

ہے اور کسی صورت میں وہ جائز قرار نہیں پاسکتیں۔ جنہیں حلال قرار دیا ہے ان حلال میں سے آپ کے مزاج طبیعت اور ذوق پر منحصر ہے' جسے آپ اچھا سمجھیں' خوشگوار سمجھیں' طبع کے مطابق سمجھیں' اسے استعمال کریں' اسے کھائیں پئیں اور جسے آپ پسند نہ کریں اسے چھوڑ دیں۔

## رشتوں کے معاملہ میں قرآن حکیم کا ابدی اصول

رشتوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ کہا ہے کہ **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3) جن سے نکاح حلال ہے' جائز ہے' ان میں سے بھی اپنی طبیعت' انتخاب' پسند خوشگواری سے لاؤ۔ یہ انتخاب دونوں کے لیے ہے' مرد کے لیے بھی یہ چیز ہے کہ عورتوں میں سے جو طیّب ہوں ان میں سے لاؤ' عورتوں کے متعلق بھی یہ ہے لیکن آگے جا کر کہا ہے کہ **لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا** (4:19) یہ قطعاً حلال نہیں ہے کہ تم عورت کی مرضی کے خلاف اس کو مجبوراً اپنے نکاح میں لے آؤ' اُس کے لیے بھی انتخاب کا حق ہے' وہاں بھی حلال کے ساتھ طیّب ہونا قرآنِ کریم نے قرار دیا ہے۔ اس لیے جو حلال ہے اس کا طیّب ہونا ضروری ہے' جو آپ کے لیے طیّب نہیں ہے' آپ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ جسے اس نے حرام قرار دیا ہے' اسے آپ حلال نہیں قرار دے سکتے اور جسے حلال قرار دیا ہے' ناخوشگواری کی بنا پر اسے آپ اپنے لیے چھوڑ سکتے ہیں' اسے حرام نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ہے جو آپ کے ہاں غلط ہوا کہ اس کا حق قرآنِ حکیم نے اپنے سوا کسی اور کو نہیں دیا۔

یہودیوں کے متعلق ذکر ہو رہا تھا' یہ تاریخ میں ذلیل ترین قوم چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ حکیم نے وہ جرائم گنائے ہیں جن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ کہا ہے کہ **وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا** (4:160) عزیزانِ من! بہت بڑا جرم یہ تھا کہ خدا کے راستے سے روکتے تھے' وہ لوگوں کو خدا سے روکنے کے لیے روک بن جاتے تھے۔

## امریکا اور یورپ کے اہلِ دانش اور پادریوں کے استفسارات کی نوعیت اور ہماری حالتِ زار کے پیشِ نظر ان کا اعتراض

یہ روک بن جانا کیا چیز ہے؟ وہ کیسے روک بنتے تھے' اسے چھوڑیئے' ہم آج کیسے روک بن رہے ہیں اس کا تجربہ تو آپ کو بھی ہوتا ہوگا اور مجھے تو اکثر اسکا تجربہ ہوتا ہے۔ امریکا اور یورپ کے اکثر مفکرین' فلاسفرز' سائنٹسٹ میرے پاس آتے ہیں' وہ مجھ سے متعارف ہیں کہ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے یہ بھی اس معاملے میں کچھ فرق رکھتا ہے۔ میں تو اسلام کو قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کرتا ہوں' علم و بصیرت کی رو سے اس کی تائیدات پیش کرتا ہوں۔ میں اس میں بلا استثنا عرض کروں گا اور اس میں ان کے ہاں اچھے اچھے بڑے

بڑے پادری بھی شامل ہیں۔ لمبی چوڑی دنوں کی نشست نہیں ایک ہی نشست میں تھوڑے سے وقت کے اندر اس کی صداقت پہ وہ قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر قرآنِ حمید کا دعویٰ ہے کہ یہ انسانیت کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے تو آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی ایسی ذلیل حالت کیوں ہے؟ اس کا کوئی جواب ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہم کس طرح خدا کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔ اگر ہم آج دنیا کے سامنے نہ ہوں' ایسی ذلیل وخوار قوم' جو اپنی روٹی تک کے لیے ان کے دروازوں پر جھولیاں پھیلانے کے لیے مجبور ہے' جنہیں یہ کافر اور ملحد اور بے دین کہہ رہی ہے' اور یہ اسلام کی مدعی ہے۔ وہ ہماری حالت کو دیکھ کر اس طرف آتے ہی نہیں' وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تمہارے ہاں یہ اس قدر شفا بخش نسخہ ہے تو تم اس قدر ان مرضوں کے اندر کیوں مبتلا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کوئی ڈاکٹر بھی دیکھیں جو تپ دق کا مارا ہوا کھانستا ہے' زرد رنگ کا ہے' ہڈیاں نکل رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے کہ تپ دق کے مریضو! میرے پاس آؤ' میرا نسخہ آزما کے دیکھو' چند دنوں کے اندر اندر ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ارے! نسخہ تمہارے پاس ہے تو تم خود اچھے کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہ قرآنِ حکیم کی تعلیم' یہ اسلام کے اتنے بلند اصول' نظری طور پر اگر آپ لوگوں کو سمجھائیے تو اقوام عالم سمجھتی ہیں اور اس کے بعد وہ یہ کہتی ہیں کہ پھر تمہاری حالت ایسی کیوں ہے' اگر فی الواقعہ یہ اس قابل ہے تو تمہیں کیوں یہ شفا نہیں دیتا۔ اور پھر آج کی حالت نہیں ہے' صدیوں سے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اب یہ چیز کہے جانا کہ صاحب! ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے تو اس واسطے ایسا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب تم خود اس کے مدعی ہو کہ اس میں اتنی منفعت بخش چیزیں ہیں تو تمہیں اپنا نفع نقصان بھی یاد نہیں آتا یعنی کونسی وجہ ہے جو تمہیں مجبور کر رہی ہے کہ اتنی منفعت بخش چیز کو چھوڑ کر' اتنی ذلت آمیز حالت تم نے اختیار کر رکھی ہے' عجیب قوم ہو تم۔ وہ اس کو باور نہیں کرتے۔ آہستہ آہستہ کیفیت ہماری بھی یہ ہوگئی ہے۔

## ہماری نئی نسل میں پیدا ہونے والی مایوسی اور خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان

عزیزانِ من! ہماری اگلی نسل میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ کسی زمانے میں' چودہ سو سال ہوئے' تھوڑے عرصے کے لیے' اس نے حرکت پیدا کی تھی اور عربی قوم نے یہ کچھ حاصل کر لیا تھا لیکن اب یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو زندگی اور سرفرازی عطا کر سکے۔ خود اسلام کی طرف سے ہماری آنے والی نسل مایوس ہو رہی ہے۔ یہ ہے خدا کے راستے میں کھڑے ہو جانا' حائل ہو جانا۔ عزیزانِ من! غیروں کو دعوت دینا تو ایک طرف رہا' ہماری اپنی آئندہ نسل آگے نہیں بڑھ رہی' ہمیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ آپ کی ساری تاریخ ان چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ کیا جواب دے سکتے ہیں آپ ان کو سوائے اس کے کہ وہ جواب جو حضور سرورِ کائنات ﷺ نے دیا جو قرآنِ کریم نے بات مھجورا بیان کی ہے کہ قیامت میں جب اس قسم کی یہ ذلیل وخوار قوم

آ ئے گی' قرآنِ مجید کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے ماننے والے دنیا میں اعلون ہونگے اور یہ ذلتوں اور خواریوں کے پیکر جب وہاں سے آئیں گے تو یہ اس قوم کو گزرتے ہوئے' یوں قرآنِ حکیم نے ایک انداز میں بات کی ہے' رسول اللہ ﷺ خدا سے کہیں گے کہ یا اللہ! یہ ہے وہ قوم جس نے قرآنِ حکیم کو چھوڑ دیا تھا۔تو مصیبت یہ ہے ہماری منافقت کی کہ ہم اس کا بھی تو اعتراف نہیں کرتے کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔آج بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کتاب اتنی زیادہ نہیں پڑھی جاتی' جتنا قرآنِ حمید پڑھا جاتا ہے۔اس قرآنِ حمید کے متعلق کہیں سے ذرا بے حرمتی کی آواز آتی ہے تو کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔فلاں جگہ صاحب! قرآنِ حمید کے ورق پھاڑ دیئے' فلاں جگہ کسی نے قرآنِ کریم کی ایک سطر جلا دی' قیامت برپا ہو جاتی ہے۔اور کیفیت ہماری یہ ہے کہ اس کی صداقتوں کے راستوں میں ہم حائل ہیں۔

## قرآنی حقائق کو عملی شکل دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا معاشی نظام ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ بِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا (4:160) اور یہ لوگ ہمیشہ نظامِ خداوندی کی راہ میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔اور حائل ہونے کی سب سے بڑی وجہ جو قرآنِ کریم نے کہی ہے وہ وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا (4:161) ہے۔انہوں نے ایسا معاشی نظام قائم کر رکھا ہے کہ جس میں سرمایہ روپے کو کما کر لاتا ہے' اس میں معاوضہ محنت کا نہیں' سرمائے کا ہوتا ہے۔ربوٰ کے معنی یہ ہیں۔ربوٰ کے متعلق تو بہت دفعہ یہ چیزیں آچکی ہیں یعنی سو روپیہ آپ کے ہاں بکس میں رکھا ہوا ہے' دس دن رکھا رہے' دس برس رکھا رہے' سو برس رکھا رہے' جب نکالو گے سو کا سو ہی ہوگا' زنگ لگ جائے تو اور بات ہے ورنہ ہوگا اتنے کا اتنا ہی۔اس میں اس کی استطاعت نہیں ہے کہ وہ ایک سو ایک ہو جائے لیکن اسی کو اٹھا کر جب آپ کسی دوسرے شخص کو دیدیتے ہیں' اس کے بعد' سال کے بعد' وہ ایک سو دس' ایک سو بیس' ایک سو تیس' ایک سو پچاس' ہوتا چلا جاتا ہے' جس میں خود پیدا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ہمارا غلط نظام اس میں یہ صلاحیت دیدیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ پیدا کر کے لائے۔ Capital (سرمائے) کے اوپر اس قسم کی جو بڑھوتی یا زیادتی ہے' وہ کسی شکل کے اندر بھی ہو' وہ ربوٰ ہے۔

## یہودیوں کے ہاں ربوٰ کی Definition (تعریف) ہمارے ہاں کے سود کی سی ہے

یہودیوں کو اس سے منع کیا گیا تھا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ (4:161) اس سے روکا گیا تھا۔آپ کو پتہ ہے انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اس ربوٰ کی اپنے ہاں Definition (تعریف) خود کرنی شروع کر دی بعینہٖ جو آپ نے ربوٰ کی جگہ سود کا لفظ رکھا ہے۔اب آگے سود کے متعلق بحثیں چلیں۔آپ کو پتہ ہے بڑے زور و شور سے بحثیں چلتی ہیں کہ Commercial Interest (تجارتی سود) جائز

ہے یا نہیں' یہ زرعی انٹرسٹ' کمرشل انٹرسٹ' بینک کا انٹرسٹ' انشورنس پہ انٹرسٹ' یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ ارباب شریعت دوسری طرف بڑھے' انہوں نے کہا کہ صاحب! ٹھیک ہے' سود حرام ہے یہ مضاربت حلال ہے۔ کوئی شخص کاروبار کرتا ہے' آپ نے اس کو اپنے دو ہزار روپے دیدیئے اب وہ اس سے محنت کر رہا ہے' کام کاج کر رہا ہے' جو نفع آرہا ہے اس نفع میں آپ کو دو ہزار کے اعتبار سے دیئے چلا جارہا ہے' یہ حلال ہے۔ ارے! کیا یہ ربوٰ نہیں ہے؟ کہ جی نہیں' کیا ہے جی؟ کہنے لگے جی! یہ تو مضاربت ہے۔

## قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا نظام

غریب کسان آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا صاحب! یہ زمین کا ایک ٹکڑا ملتا ہے' مجھے آپ کسی طرح سے پانچ سو روپیہ دیدیں' میں یہ لے لوں' محنت کروں گا' اس میں فصل آئے گی' بال بچوں کا پیٹ پالوں گا آپ کا پانچ سو بھی ادا کردوں گا۔ اب اگر آپ اس سے کہتے ہیں کہ صاحب! پانچ سو کا پانچ سو کیوں' دس روپے سال کے بعد اس پہ دوں گا' پچاس روپے اس کے اوپر اور دوں گا۔ وہ کہے گا لاحول ولاقوۃ لوگ کیا کہیں گے کہ ''آ بیاج کھاندا اے جی اے'' (یہ سود کھاتا ہے جی)۔ سود حرام ہے۔ اس نے کہا کہ میاں! کہاں سردردی کرتے پھرو گے' کچہریوں میں جاؤ گے' رجسٹریاں کراؤ گے' پتہ نہیں کوئی دھوکا کرلے۔ کوئی بات نہیں! یہ زمین میں لے لیتا ہوں' تم جاؤ اس پہ کھیتی باڑی کرو' جو کچھ فصل پیدا ہوگی آدھی تمہاری' آدھی میری۔ یعنی یہ کوئی ربوٰ نہیں ہے۔ دس فیصد ربوٰ مگر یہ آدھی فصل لے آنا' کہنے لگے کہ یہ مزارعت ہے۔

## دین کی جگہ مذہب نے ہمیشہ ہر سطح پر کٹ حجتی سے کام لیا ہے

یہ اُس زمانے کی بحثیں تھیں' جب یہ بنک اور انشورنس نہیں تھے' یہ ہمارے دور کی ہیں' ہم نے اس میں ایک یہ کمرشل انٹرسٹ لگایا' اس کو Sleeping Partnership (غیر کارگزار شریک) کہہ دیا۔ سوچیے تو سہی۔ انہوں (یہودیوں) نے بھی یہ کچھ کیا تھا۔ جہاں بھی دین مذہب میں آتا ہے اور یہ جو مذہبی پریسٹ ہڈ ہے' وہ اس کی اجارہ دار بنتی ہے تو وہ یہ سب کچھ کرتی ہے۔ یہ سارے آپ کے قوانین' یہ فقہیں' اس کی تشریحات آپ کے دورِ ملوکیت میں ہوئی۔ وہی آپ کے ہاں جاگیرداری کا' فیوڈل ازم کا دور' سرمایہ داری کا دور بنا۔ ان کے ہاں شریعت میں انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں صاحب! ربوٰ ہی حرام ہے' مضاربت تو حرام نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ یہ تھے وہ جرائم جس کی وجہ سے اس قوم کی یہ حالت ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (4:161) یہ بغیر کسی تعمیری کام یا کام میں حصہ لیے لوگوں کا مال کھا جانا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ یہ کرتے کیا ہیں؟ صبح کی نماز پڑھائی صاحب! نماز پڑھانے کے بعد پھر مہینے کے بعد کہتے ہیں کہ ''سٹو پیسے میرے' او کاہدے پیسے؟ نماز پڑھائی سی جی' او توں آپ نماز نئیں سی

پڑھنی؟''(پیسے ادا کرو میرے۔ارے بھئی! کس چیز کے پیسے؟ جی! میں نے نماز پڑھائی تھی۔ارے کیا تُو نے خود نماز نہیں پڑھنی تھی؟)

## نماز پڑھانے کا معاوضہ

عزیزانِ من! سوچیے یہ جو امامت کی تنخواہ ہے' وہ کس چیز کی ہوتی ہے؟ یہ ہے نماز پڑھانے کی۔یعنی یہ کہ مسجد میں اور کسی کے لیے جگہ نہ ہو' لوگوں کو دھکے پڑ رہے ہوں' باہر سڑک پہ بارش میں دھوپ میں کھڑے ہوں' ان حضرت صاحب کے لیے سب سے آگے جگہ ہے' ان صاحب کے لیے ایک مقام متعین کیا جاتا ہے۔یہ سب سے آخر میں آئیں سب سے آگے ان کو کھڑا کیا جاتا ہے۔وہ نماز جو انہوں نے پڑھنی تھی' جو ان کے اوپر فریضہ تھا' اس نماز کی ادائیگی کے لیے اتنی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔وہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ''سٹ پیسے۔او کسے نیں اوہنوں کہیا سی نا اوگرمی دے موسم اچ دھپے کھلوتا ہویا ہیگا ایں چھاویں ہو جا' کہن لگا کی دیں گا'' (رقم ادا کرو۔کسی نے اسے کہا تھا کہ گرمی کے موسم میں دھوپ میں کھڑے ہو' ذرا سائے میں آ جاؤ تو وہ کہنے لگا کہ کیا دو گے)۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (4:161) ۔عزیزانِ من! یہ باطل کا لفظ دیکھیے قرآنِ کریم میں اور لغتِ عرب میں کہ کہاں استعمال ہوتا ہے: ''بغیر تعمیری نتیجہ پیدا کیے ہوئے کوئی مال کھا جانا''۔پریسٹ ہڈ تو ہوتی ہی یہ ہے صاحب! کوئی تعمیری کام کرتی ہی نہیں' کھائے چلے جا رہے ہیں۔کہا ہے کہ یہ یوں کرتے تھے' ایسے کرتے تھے۔کہا کہ ہم بھی کچھ کرتے تھے۔ہم کیا کر رہے تھے؟ کہا ہے کہ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (4:161) ان کے لیے دردانگیز عذاب ہے۔

## ذلیل و خوار قوم کے ہاتھوں ذلیل ترین شکست

اب تو یہودیوں کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔عزیزانِ من! وہ تو ایسا دردانگیز عذاب آپ پر مسلط کر رہے ہیں کہ آپ ساٹھ ستر کروڑ کی چیخیں نکل رہی ہیں' اور عذاب ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے جنہیں آپ ہزار برس سے ذلیل ترین قوم کہہ رہے تھے' اس قوم کے ہاتھوں سے ذلت کی انتہا یہ ہے۔خواجہ حافظ [1] کے مفہوم میں ''کسی کا غلام و نوکر بننا ہے تو اس کا تو بن جس کی دنیا میں کچھ آن ہو۔وہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے' وہ لاہور کا وہ پہلوان' وہ شاگرد چلا تھا پہلی کشتی لڑنے کے لیے' تو اسے اس نے کہا تھا کہ بیٹا! ایک دعا مانگنا' پہلی کشتی لڑنے جا رہے ہو ''کہن لگا جی! کی دعا منگاں' او دعا اے منگ کہ یا اللہ! اگر میں ڈھنا ہیگا اے تے

---

[1] مسلمانوں میں خواجہ حافظ شیرازی کو ایک شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا' انہیں بہت بڑا صوفی' ولی اللہ اور مقرب بارگاہِ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔اب تو اس کا اتنا چرچا نہیں رہا لیکن جس زمانے میں علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تھی' دیوانِ حافظ سے لوگ فال لیتے تھے اور یہ فال انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ نکالی جاتی تھی (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص۔291)

کسے ایسے کولوں جنے پہلے وی کسے نوں ڈھایا ہووے" (کہنے لگا جی! کیا دعا مانگوں؟ (کہا کہ) وہ یہ دعا مانگ کہ اے اللہ اگر میں نے ڈھے جانا ہے تو مجھے ایسے آدمی سے نیچا دکھانا جس نے پہلے بھی لوگوں کو نیچے دکھایا ہو)۔ یہ وہ قوم ہے جسے آپ خود ہزار برس سے ذلیل وخوار کہتے چلے آ رہے ہیں۔ جونہی آپ نے سورۃ الفاتحہ میں **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ** (1:7) کہا اور آپ کے ہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ مغضوب علیہ یہودی ہیں۔ اس قسم کی ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں سے جوتے پڑ رہے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** (4:161) اس سے زیادہ دردانگیز عذاب اور کونسا ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تھے ان کے جرائم جو قرآنِ حکیم نے گنائے تھے:

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہم ہیں کہ **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (7:45) انسانیت کو خدا تک پہنچنے کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئے ہیں' ہم نہ ہوتے تو یہ انسانیت واقعی خدا کے راستے کے اوپر آ گئی ہوتی۔ ہم نے یہ ربوٰ کے نظام رائج کیے ہوئے ہیں اور یہ **اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ** (4:161) کے بھی۔ عذاب الیم کے اندر ہم گرفتار ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی آیت 161 تک ہی ہم آئے' آئندہ ہم 162 ویں آیت سے لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**

❀......❀......❀

# اکتیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 162 تا 170)

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ
الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٦٢﴾ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ
وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَي
اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ
يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ
ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧٠﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1971ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 162 سے ہو رہا ہے: (4:162)۔

## قرآنِ حکیم میں تاریخ کے سابقہ واقعات کو پیش کرنے کا مقصد

سلسلۂ کلام یہودیوں کے جرائم کے متعلق چلا آ رہا تھا۔ یہ ان کے جرائم کا فطری نتیجہ تھا' جسے سزا کہا جاتا ہے' یہ دنیاوی زندگی میں ان کی ذلت و مسکنت' تباہی اور بربادی ہے اور اُخروی زندگی میں عذاب شدید ہے۔ بات تو یوں چلی آ رہی ہے لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں' وہ ایک مقصد کے لیے سابقہ واقعات کو دہراتا ہے اور پھر حقائق کی طرف رخ موڑ دیتا ہے۔ سطح بین نگاہوں والے کہتے ہیں کہ صاحب! اس میں ربط نہیں ہے۔ انہیں ربط اس لیے نظر نہیں آتا کہ وہ کہانی کی طرح' ایک قصے کی طرح' کسی بات کو سننا سمجھنا چاہتے ہیں مگر قرآنِ کریم کا مقصود ان حقائق کو بیان کرنا ہے جس کے لیے وہ عندالضرورت اُن سابقہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے یہودیوں کے خودساختہ عقائد کی نفی اور پھر صراطِ مستقیم کی نشاندہی

سوال یہ تھا کہ کیا یہودیوں پہ ابدی تباہی آ گئی؟ اور دوسری چیز یہ کہ یہودیوں کے ہاں تو دین عائلی تھا جو بنی اسرائیل کے گھر میں

پیدا ہو‘ وہ کہتے تھے کہ دین اسی کو مل سکتا ہے اور نجات بھی اسی کی ہو سکتی ہے‘ غیر بنی اسرائیل کی طرف نہ دین آتا ہے‘ نہ ان کی بات ہو سکتی ہے۔ اب قرآنِ کریم نے ان دونوں غلط خیالات کا ازالہ اور تردید کرنی تھی کہ بات یہ نہیں ہے۔ نہ ہی تو یہ ہے کہ کوئی نسل ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو جاتی ہے اور نہ یہ چیز ہے کہ خدا کا دین کسی خاص خاندان‘ قوم‘ قبیلے یا ملک‘ تک محدود ہے۔ ان کے جرائم اور ان کی سزا کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ **لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا** (4:162)۔ یہ نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے اور ان کے لیے اصلاح اور باز آفرینی کی کوئی شکل ہی باقی نہیں‘ کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔ یہ چیز کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہر فرد کے لیے ہر وقت اس کا دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ جو بھی اصلاحِ خویش چاہتا ہے اسے اپنے غلط راستے سے منہ موڑ کر صحیح راستے کی طرف قدم اٹھا لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ تائب ہوتا ہے تو ہم ''توّاب'' ہوتے ہیں‘ وہ ایک قدم ادھر کو بڑھ کر آتا ہے تو ہم دو قدم اس کی طرف بڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس میں نہ افراد میں کوئی تخصیص ہے‘ نہ اقوام میں کسی قسم کی تمیز لیکن اس کے لیے ایک پہلی شرط ہے۔

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ وہ شرط کیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جن غلط عقائد اور خیالات پر چلے آ رہے ہیں‘ انہوں نے انہیں سوچ سمجھ کر علیٰ وجہ البصیرت‘ علم و برہان کی بنیاد پر اختیار نہیں کیا۔ ماں باپ سے‘ اسلاف سے‘ متوارث یہ خیالات چلے آ رہے ہیں اور انہی پر عمل پیرا ہیں۔ اگر وہی روش جاری رکھیں تو پھر تو اصلاح کی کوئی صورت رہ نہیں سکتی کیونکہ غلط کی سند اگر یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلاف سے متواتر چلا آ رہا ہے‘ اس لیے ہمیں ضرورت ہی نہیں کہ اس کے متعلق کوئی تحقیق اور کاوش کریں تو پھر تو غلط غلط رہے گا۔ اور غلط راستے کے اوپر تو جتنے قدم آگے کی طرف اٹھیں گے‘ اتنا ہی منزل سے انسان دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کہیں رک کر سوچیں‘ سمجھیں‘ دیکھیں‘ بھالیں‘ پرکھیں کہ جس راستے پہ ہم چل رہے ہیں آیا یہ صحیح راستہ ہے؟ اور یہ چیز تو علم کی بنا پر ہو گی اور علم بھی بڑا گہرا چاہیے‘ سطحی سا علم نہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ** (4:162) ان میں سے لوگ اس تقلید کی اندھی روش کو چھوڑ کر علم کی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں‘ سمجھ سوچ سے کام لیتے ہیں‘ علم و بصیرت کی بنیاد پر اپنی روش کو پرکھتے ہیں‘ یہ ہیں وہ لوگ جو پھر ایمان لاتے ہیں۔ کتب سابقہ پر تو یہ ایمان لائے ہوئے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو اے رسول ﷺ! تیری طرف نازل کی گئی ہے۔

## نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

ایمان کی شرط یہ ہے کہ یہ جو آخری نبی ہے' اس کی نبوت اور رسالت پر ایمان لایا جائے' اس کا نبی ہونا اور اس کے بعد جو کتاب اس پہ نازل ہوئی ہے' اس کتاب پر ایمان لانا۔ اس صورت میں اسلام کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور وہ جو میں نے ایک دن ضمناً بات کہی تھی' یہاں پھر اسے دہرا دوں کہ یہ جو آخری نبی ہوتا ہے' جس پہ کوئی انسان ایمان لاتا ہے' امت کی تشکیل اس کی نسبت سے ہوتی ہے۔ ایک عیسائی تمام انبیائے سابقہؑ پر ایمان رکھتا ہے' وہ ان کے ہاں جو عہد نامۂ عتیق ہے' جسے بائبل کا پہلا حصہ یعنی Old Testament (عہد نامۂ عتیق) کہتے ہیں' وہ اسے بھی مانتا ہے' ان انبیاء تک حضرت عیسیٰؑ سمیت ایمان لاتا ہے تو وہ عیسائی ہوتا ہے۔ تو جس دن وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبوت پہ ایمان لے آتا ہے یعنی نبوت محمد ﷺ پر' تو اس دن پھر وہ عیسائی نہیں رہتا' وہ ایک نئی امت کا فرد بن جاتا ہے اور پھر وہ اس آخری نبی ﷺ پر ایمان لانے کی بنا پر امتِ محمد ﷺ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ اگر نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی شخص کسی اور نبی پر ایمان لاتا ہے تو اسی قاعدے کی رو سے وہ پچھلی امت سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ مَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ (4:162) اس کے اوپر تو ایمان رکھتے ہی ہیں لیکن یہ جو دین اب اس شکل میں سامنے آیا ہے' اپنی آخری' غیر متبدل' پاکیزہ اور مکمل شکل میں' تو یہ ہے وہ دین جو نبوت محمد ﷺ یا رسالت محمد ﷺ کی وساطت سے امت کو ملا' ان کے لیے اس پر یمان لانا ضروری ہے۔ اور پھر اس نظام کے دو بنیادی ستون ہیں جن کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس کو ہمیشہ دہرایا ہے۔ یہ کیا ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے' ماہیت کیا ہے' یہ چیزیں بار بار' کئی بار سامنے آ چکی ہیں اس لیے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ الصلوٰۃ معاشرے کا وہ نظام ہے کہ جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے اور اس کا مقصد ایتائے زکوٰۃ ہے' تمام نوعِ انسانی کے لیے نشو ونما کا سامان بہم پہنچانا۔ وہ ہے طریق' اور پروگرام یہ ہے' اس کی غایت اور مقصد یہ ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے ان دو چیزوں کو بار بار دہرایا ہے اور اس کی اہمیت کو وہ سامنے لاتا ہے۔ یہ کریں گے اور پھر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں گے۔ اللہ پر ایمان تو یہ ہے کہ جو اس نے انسانی زندگی کے لیے وحی کے ذریعے قوانین دیئے ہیں ان پر ایمان ہو۔ اور اصل بنیاد ہے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان' جسے وہ ایمان بالآخرت کہتا ہے۔

## لفظ آخرت کا مفہوم

ابتدائی چیز تو یہ ہے کہ ہر عمل کے بعد اس کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ خود عمل کا جو مستقبل یا آخرت ہے' وہ بھی آخرت کہلاتی ہے۔ زندگی میں ہر نیا سانس جو پچھلے سانس کے بعد آتا ہے' وہ اس کا مستقبل ہوتا ہے' ہر نیا دن مستقبل ہوتا ہے' ہر قوم کے بعد دوسری نسل اس کی مستقبل ہوتی ہے اور اس دنیا کی زندگی کے بعد جو اگلی زندگی ہے' اسے بھی آخرت یا مستقبل کہا جاتا ہے۔ آخرت میں یہ جو ساری اُخروی

چیزیں ہیں' وہ شامل ہوتی ہیں اوران کی آخری کڑی مرنے کے بعد کی زندگی ہے۔عزیزانِ من! آپ سوچیے۔ضمناً عرض کروں کہ جس قوم کے متعلق اس کے ضابطۂ حیات کے پہلے ہی صفحہ پر یہ کہا گیا تھا کہ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (2:4) وہ مستقبل پر ایمان رکھتے ہیں' اسے سامنے رکھتے ہیں' اس قوم کی آج کیفیت یہ ہے کہ کبھی مستقبل کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اُٹھتی' وہ ہمیشہ پیش پا افتادہ مسائل اور معاملات پر ہی رہتے ہیں' ان پر جھپٹ پڑتے ہیں' جو کچھ سرِ دست جلدی سے ہاتھ آجائے' اسی پر چلتے ہیں۔جسے آپ Future (مستقبل) کہتے ہیں اس پہ ان کی نگاہ کبھی نہیں ہوتی۔اور ابھی میں نے جو عرض کیا ہے کہ Future (مستقبل) صرف مرنے کے بعد کی زندگی کا نام نہیں ہے' آج کے بعد دوسرا دن بھی انسان کے لیے Future (مستقبل) ہے' موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسل بھی اس کے لیے Future (مستقبل) ہے۔جس قوم کو Future (آخرت) پر ایمان کی اتنی تاکید کی گئی تھی' اس کی اب نگاہ Future (مستقبل) پر اُٹھتی ہی نہیں ہے' اس کی نگاہ عاجلہ پر رہتی ہے اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

## زندہ قوموں کے نزدیک آخرت اور قانون مکافاتِ عمل کی اہمیت

زندہ رہنے والی قومیں تو بہت دور تک سوچتی ہیں۔ان کی سوچ Future (مستقبل) کی سوچ ہوتی ہے۔اگرچہ مادی نظریۂ حیات کے اعتبار سے یہ Future (مستقبل) اس زندگی کے آخری سانس تک ختم ہو جاتا ہے لیکن بہرحال ان کے مقابلے میں تو وہ اس دنیا میں بہتر رہتے ہیں کہ جو صرف عاجلہ پہ نگاہ رکھتے ہیں' Present (حال) پہ ہی نگاہ رکھتے ہیں' Future (مستقبل) ان کی نظروں میں نہیں ہوتا جبکہ قرآنِ کریم Future یا آخرت پر ایمان پر بڑا زور دیتا ہے اور یہ کاہے کے لیے زور دیتا ہے؟ قانون مکافاتِ عمل کے لیے۔جو کام انسان کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے نزدیک جو ارادہ بھی دل میں آتا ہے' وہ بھی اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے' اس کا نام ہے ایمان بالآخرت اور وہ یہ چیز ہے کہ عمل کے بعد وہ جس وقت بھی نتیجہ پیدا کرے گا' وہ اس عمل کی آخرت ہے۔اور وہ اعمال بھی ہیں کہ جو مرنے کے بعد کی زندگی میں نتیجہ پیدا کرتے ہیں یعنی اس کے نزدیک زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی اس لیے آخرت یہیں تک محدود نہیں ہے' آخرت ایک جوئے رواں ہے جو آگے بھی چلتی ہے۔بس یہ ہے وہ چیز جسے ہم مرنے کے بعد کی زندگی یا آخرت کہتے ہیں۔وہ حقیقت میں یہاں کی آخرت کا تسلسل ہے۔اس لیے وہ قانونِ مکافاتِ عمل ہی کا نام ہے' جسے قرآن آخرت کہتا ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔تمدنی زندگی کے اندر تو وہی عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے جو قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔اگر پکڑنے والا سپاہی نہ ہو' پکڑے جانے کے بعد عدالت ایسی ہو کہ جس پہ انسان اثر انداز ہو سکے تو اس کے بعد تو پھر ان چیزوں کے نتائج سے بچ سکتا ہے لیکن جسے قانون مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے' اس کی رو سے تو کسی عمل کے نتیجے سے انسان بچ ہی نہیں سکتا خواہ وہ یہاں اس کے سامنے آئے یا وہ اس کے بعد کی

آخرت میں اس کے سامنے آئے۔

## انسان کے ہر عمل کا نتیجہ انسان کی انتظار میں چوکس رہتا ہے

عزیزانِ من! ہر عمل کی ایک آخرت ہوتی ہے یعنی اس سے بعد میں پیدا ہونے والا نتیجہ ہوتا ہے۔اوراسی لیے قرآنِ کریم نے عمل کے ساتھ جو نتائج ہیں انہیں بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ (8:51 ;3:182) کہا ہے یعنی تمہارے ہاتھوں یہ پہلے سے بھیج رکھا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی بڑی عجیب اصطلاح ہے یعنی تم تو یہاں کھڑے ہوتے ہو لیکن جو کام تم نے کیا ہے' اس کا نتیجہ تمہارے راستے میں آگے تمہارا انتظار کر رہا ہے' جب تم وہاں پہنچے وہ جھٹ سے تمہارے سامنے آ جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جسے وہ آخرت کہتا ہے۔اور وہ کسی اور کا مرتب کردہ نہیں ہوتا' کوئی اور وہاں اس خطرے کو' اس تباہی کو' لا کر کھڑا نہیں کرتا' تم نے خود اپنے لیے پہلے بھیج دیا ہوتا ہے' تم بعد میں وہاں پہنچتے ہو' وہ پہلے سے وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوتا ہے' بھیجا ہوا تمہارا اپنا ہی ہوتا ہے' کسی اور کی طرف سے وہاں کھڑا نہیں کیا گیا ہوتا ۔ کتنے عجیب بلیغ حسین دلکش انداز میں قرآنِ مجید بات کو واضح کرتا ہے۔ یہ پہلے سے بھیجی ہوئی تمہاری تباہیاں ہیں جو تمہارا انتظار کر رہی ہیں یا تمہاری پہلے سے بھیجی ہوئی خوشگواریاں ہیں جو وہاں ہار لیے کھڑی ہیں کہ تم وہاں پہنچو تو سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (16:32) سے تمہارا استقبال کریں' تمہارے گلے میں نویدِ جاں فزا کے ہار ڈال دیں۔ سنیے! یہ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ (3:182) ہے۔ نہ وہ سزا کہیں باہر سے آ رہی ہوتی ہے' نہ خوشگواریوں کے یہ جو استقبالات ہیں' اس کے لیے کوئی Reception (استقبالیہ) کمیٹی مقرر ہوتی ہے۔ یہ تم نے اپنے ہاتھوں سے پہلے بھیجا ہوا ہوتا ہے' تم بعد میں وہاں پہنچتے ہو' ان اعمال کے نتائج پہلے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے قرآنِ حکیم ایمان بالآخرت کہتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اس پہ بڑا زور دیتا چلا جاتا ہے کہ یہی دین کی اصل لم غایت بنیاد ہے۔ دین کے تو معنی ہی جزا اور سزا کے ہیں اور قانون کے ہیں۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:162) ان میں سے بھی جو لوگ تقلید کا راستہ چھوڑ کر علم کی بنیادوں پہ حقائق کو سمجھیں گے' پھر وہ ایمان لائیں گے۔ پہلی کتابوں پہ تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اس کے بعد اس کتاب پہ بھی ایمان لائیں گے' جو اَب آخر میں نازل کی جا رہی ہے۔ اس نظام میں داخل ہو جائیں گے جو اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لیے متشکل کیا جاتا ہے اور وہ Future پر' آخرت پر' مستقبل پر' قانونِ مکافاتِ عمل پر' یقین رکھیں گے۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو خواہ کسی قوم سے ہوں' کسی نسل سے ہوں' کہیں کے رہنے والے ہوں' یہود ہوں' نصاریٰ ہوں' کسے باشد جو بھی ایسا کرے گا' اسے سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:162) ہم بہت بڑا اجر دیں گے اور ان کو ہم بہت جلدی اجر دیں گے۔ ہمارے ہاں تو اجر قیامت پر اٹھا رکھا جاتا ہے کیونکہ اس کے محسوس نتائج ہمارے سامنے نہیں آتے لیکن قرآنِ حمید تو یہ کہتا ہے کہ

بہت جلدی اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اگر اعمال قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیے جائیں تو ان کے نتائج بہت جلد اسی دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان نتائج کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا چلا جاتا ہے' مرنے کے بعد تک بھی وہ جاری رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے وہ اسی زندگی میں بھی بہت جلد سامنے آتے ہیں لیکن وہ انفرادی طور پر سامنے نہیں آتے' قرآنِ کریم تو اجتماعی زندگی سکھاتا ہے' اجتماعی زندگی کے اندر اعمال کے نتائج اس طرح بہت جلد سامنے آجاتے ہیں۔ اور اگر یہ صورت نہ ہو' انفرادی زندگی ہو' تو پھر اس میں دیر کے بعد سامنے آتے ہیں۔ دین اور مذہب میں فرق یہی ہے۔ کہا کہ یہ ہم نے جو تم سے کہا ہے کہ کوئی قوم' کوئی نسل' کوئی فرد' کسی جگہ' کسی قوم کا جو بھی ان حقائق پہ ایمان لے آئے گا' جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں' انہیں اس کا اجر ملے گا۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ہمارا سلسلۂ رشد و ہدایت شروع سے چلا آ رہا ہے۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ کَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ (4:163) ۔ یہ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سے بات بڑی عمدہ ہمارے سامنے آئی۔

## قدرت کی طرف سے نورِ ہدایت کا سورج تو حضرت نوحؑ سے ہی روشن ہے

(4:163) میں کہا ہے کہ اے رسول! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح ہم نے انبیائے سابقہؑ پہ کی اور بات شروع کی کہ جیسا ہم نے نوحؑ کی طرف وحی کی اور وہ انبیاء جو نوحؑ کے بعد آئے ان کی طرف وحی کی۔ تو یہاں یہ بتایا کہ انبیاء کے سلسلے میں سب سے پہلے جو نبی تھے وہ حضرت نوحؑ تھے کیونکہ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں عام تصور ہے کہ ہم ایک حضرت آدمؑ کو نبی مانتے ہیں اور ان کو چونکہ ابو البشر مانتے ہیں انہیں پہلا نبی مانتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ تصریح کر کے حضرت نوحؑ کے مِنۡ بَعۡدِہٖ (4:163) کہہ کر یہ کہا ہے کہ انبیاء کا سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور ان کے بعد انبیاء آئے۔ اس سلسلہ کی جو پہلی کڑی تھی وہ حضرت نوحؑ تھے ان سے پہلے کوئی نبی نہیں تھا۔

## آدم کا بت بنانا اور پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی کا پیدا کرنا تورات کا بیان ہے' قرآن کریم کا نہیں

آدم کے متعلق میں سورۃ البقرہ کے شروع میں ہی بیان کر چکا ہوں کہ قصۂ آدم سے مراد کسی فرد کا قصہ نہیں ہے' وہ تمثیلی رنگ میں خود انسان کی' آدمی کی' داستان ہے۔ آدم کی جگہ آپ آدمی کہیں تو بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور حضرت آدم کے متعلق' پہلی چیز تو یہ کہی جاتی ہے کہ خدا نے پہلے ایک پتلا' ایک فرد' اس طرح سے مٹی سے بنایا' پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی۔ یہ قرآنی تصور نہیں ہے' تورات کا قصہ ہے جو ہمارے ہاں مشہور ہے۔ اور پھر اسی فرد کے متعلق یہ چیز ہے کہ وہ نبی تھے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ مجید نے تو ان کو کہیں نبی کہا ہی نہیں ہے۔ اور یہاں یہ کہا ہے کہ انبیاء کے سلسلے میں حضرت نوحؑ سے بات شروع ہوئی اور ان کے بعد یہ

سلسلہ جاری رہا اس لیے ان سے پہلے تو قرآنِ مجید نے نبی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یہاں سے بھی یہ بات غلط ثابت ہوئی لیکن ہمارے ہاں تو کیفیت یہ ہے کہ پہلے کسی طرح ایک غلط عقیدہ وضع کیا جاتا ہے پھر اس کی مشکلات پیش آتی ہیں۔ حضرت آدمؑ نبی تھے۔ یہ عقیدہ ہے۔ دشواری یہ پیش آئی کہ نبی ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ خدا اس کو یہ کہہ رہا ہے کہ وَ لَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (7:19) حکم دے رہا ہے کہ تم نے اس کے قریب نہیں جانا۔ نبی کو حکم دیا جائے اور اس کے بعد وہ اس سے معصیت کرے' یہ تو نبی کی شایانِ شان نہیں ہے۔ نبی سے تو تدبیرات کے متعلق' پروگراموں کے متعلق' اسکیموں کے متعلق' کہیں کوئی سہو' کسی قسم کی کوئی جسے آپ اجتہادی تدبیری غلطی کہہ سکتے ہیں' یہ چیزیں تو اس کی بشریت کا تقاضا ہے' اس سے ہو سکتی ہیں لیکن یہ چیز کہ وہ خدا کے کسی حکم کی معصیت کرے اور پھر وہ معصیت ایسی ہو جس کی اتنی بڑی سزا ملے کہ اس کو جنت سے ہی نکال دیا جائے' یہ نبی کی شایان شان ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ جو قصۂ آدم ہے' اس میں انہیں پہلا نبی تصور کرنا قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ پھر اس پہ یہ اعتراض وارد ہونا اور پھر اس اعتراض کے بعد اس اعتراض کی الجھن کو سلجھانے کے لیے وہ کتابوں پہ کتابیں لکھتے چلے جانا۔ ارے وہ خشتِ اول ہی غلط تھی جو تم نے اس کے اوپر رکھ دی تو ''تا ثریا می رود دیوار کج'' دیوار اٹھاتے چلے جایئے ہر دوسری اینٹ جو اس پہ رکھیں وہ ٹیڑھی اٹھے گی۔ یہ سیدھی دیوار ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ حکیم نے ایک لفظ مِن بَعۡدِهٖ سے بات صاف کر دی ہے کہ سلسلۂ انبیاء کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ ہم نے یہی دین جو' تیری طرف نازل کیا ہے' یہی حقائق اصولی طور پر تمام انبیا کو دیئے گئے تھے۔

## قرآنِ حکیم کی کشادہ نگہی یہ ہے کہ وہ تمام قوموں کے انبیا کو تسلیم کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ۚ وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَ اَيُّوۡبَ وَ يُوۡنُسَ وَ هٰرُوۡنَ وَ سُلَيۡمٰنَ‌ وَ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا (4:163)۔ آپ دیکھیے' میں عام الفاظ میں کہوں گا کہ قرآنِ حکیم کی یا اسلام کی کشادہ نگہی دیکھیے کہ وہ دوسری قوموں کے انبیا کا ذکر کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى .... (4:163) یعنی ان میں فرق ہی نہیں۔ جس طرح سے ہم نے ان قوموں کے انبیا کی طرف وحی کی تھی' اے رسول! تیری طرف ویسی ہی وحی کی۔ اور کہا کہ انبیا کا یہ سلسلہ انہی تک محدود نہیں ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زمانے میں' انبیا آتے رہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ عام نقطۂ نگاہ سے کتنا وسعتِ ظرف ہے کہ ساری دنیا کی قوموں کے انبیا کو نبی تسلیم کرنا اور اس کے بعد یہ کہنا کہ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ (2:285) ایمان لاؤ اس بات پر کہ ہم ان میں سے کسی میں رسول ہونے کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ کتنی بڑی

رواداری ہے‘ کتنی Tolerance (برداشت) ہے‘ میں نے کہا ہے کہ یہ ہم عام نقطہ نگاہ سے بات کرتے ہیں‘ اگر دین کی لم سمجھ لی جائے تو اس میں خصوصیت کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔ وہ کہتا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے انبیائے کرامؑ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے یہ نبی بھیجے‘ کوئی مصر میں بھیجا‘ کوئی شام میں بھیجا‘ کوئی عراق میں بھیجا‘ کوئی ہندوستان میں بھیجا‘ کوئی چین میں بھیجا‘ مختلف قوموں کی طرف اسی ایک سر چشمۂ ہدایت سے یہ راہنمائی لے کر آتے رہے‘ اسی کی طرف سے یہ تھے‘ اسی کی طرف سے راہنمائی ملی‘ یہ انسانوں کی طرف راہنمائی تھی۔ تو ایک ہی خدا کا سلسلہ جب مختلف اقوام میں آیا تو ان میں تفرقے کی کونسی بات ہے کوئی کسی قسم کی تخصیص اور تمیز نہیں ہے۔ اس سے پیشتر انگریزوں کے زمانے میں کنگ کا جو Representative (نمائندہ) تھا وہ وائسرائے بن کر آیا کرتا تھا‘ اس سو سال‘ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں وہ جتنے وائسرائے آئے وہ سب کے سب اسی حکومت کے نمائندے تھے‘ ان سب کو ایک ہی حیثیت حاصل تھی۔ جو بھی آتا تھا‘ اپنے سے پہلا جو پیشرو ہوتا تھا‘ اس کے احکام کو اسی طرح سے نافذ کرتا تھا بجز ان کے کہ جن احکام کو وہاں سے ان کا بادشاہ منسوخ یا تبدیل کر دیتا تھا۔ یہ مجازی سی مثال ہے جو میں نے دی ہے۔ ایک ہی خدا کی طرف سے سلسلۂ ہدایت لے کر آنے والے مختلف انبیائے کرامؑ‘ مختلف قوموں کے اندر‘ مختلف ممالک میں‘ مختلف زمانوں میں‘ آئے۔ وہ کہتا ہے کہ ان میں تفریق کی کونسی بات ہو سکتی ہے لہٰذا ان سب کو ماننا ہوگا۔ جو ایک کو مانتا ہے‘ اسے سب کو ماننا ہوگا کہ وہ بھی خدا کی ہی طرف سے آئے تھے۔ اس کے بعد جب اس نے کہا کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ پر یہ سلسلہ ختم کر دیا ہے تو اس کے بعد دنیا کی کسی قوم‘ کسی ملک‘ کسی جگہ‘ انسان کی طرف کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ عرب کے اندر تو ہم نے یہ سلسلہ ختم کر دیا مگر ایران اور ہندوستان میں ہم انبیا کا سلسلہ جاری رکھیں گے‘ اس نے جاری تو کیا انبیا کے سلسلے کو ہی ختم کر دیا۔ اس لڑی میں پہلے سے پروئے ہوئے موتی تھے‘ وہ تسبیح کے دانوں کی طرح تھے۔ ان پر ایمان لانا ہوگا۔ اور ان کی شان میں گستاخی تو ایک طرف‘ ان میں سے کسی ایک کو ایمان لائے بغیر چھوڑ نہیں سکتے‘ ان میں سے کسی ایک پر بھی ایمان ہم نہ لائیں تو ہم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔

## تمام انبیا پر ایمان لانا عالمگیر برادری کی تشکیل کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے

عزیزانِ من! کتنی عجیب چیز ہے کہ آپ صرف محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے مسلمان نہیں ہو سکتے۔ آپ سوچیے کہ دنیا میں عالمگیر اخوت اور عالمگیر برادری کی تشکیل کے لیے یہ کتنی بڑی محکم بنیاد ہے جو قرآنِ حکیم نے دی دی۔ یہ ہے صحیح Tolerance (رواداری)۔ یہ ہے اس قوم کی کیفیت۔

## دنیا بھر کو عالمگیر برادری کا سبق دینے والی قوم کی عملی زندگی کی کیفیت

عزیزانِ من! وہ تو تمام دوسری قوموں کے مذاہب اور انبیا کے متعلق یہ Attitude (رویہ) دیتا ہے مگر یہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر آپ حنفی ہیں تو شافعیوں کے متعلق لٹھم لٹھا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی قوم کے' اپنی ہی امت کے افراد کے ایک فرقے کے امام' دوسرے فرقے کے جو امام ہیں' ان کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں۔ کہاں وہ وسعت نگاہ ہے اور کہاں یہ تنگ نظری ہے اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ تمام انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا** (4:163) اور یہی ضابطۂ حیات دیگر انبیاء کو بھی دیا گیا تھا۔ یہاں یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف ایک نبی کو ''زبور'' دی۔ زبور کے معنی ''کتاب'' ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی کتاب کو جو زبور ہے' الگ کہا جاتا ہے۔ اصل میں ''زبور'' ہر کتاب کو کہا جاتا ہے' ضابطۂ حیات کو کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ انبیائے کرامؑ کو کتابیں ملیں حضرت داؤدؑ بھی نبی تھے' اسے بھی کتاب' ضابطۂ حیات ملا۔

## دین میں بغیر کسی تحقیق کے ہر قوم کے ہر بزرگ کا احترام فرض ہے

کہا ہے کہ **وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡکَ** (4:164) یعنی یہی نہیں کہ جن انبیائے کرام کا ہم نے قرآنِ کریم میں نام لیا ہے یہی انبیا تھے' انہی پر ایمان لانا ہے۔ کہا ہے کہ نہیں! ان میں سے بعض ہیں جن کا ہم نے نام لے کر' ذکر کر دیا اور دوسرے وہ ہیں جن کا ہم نے اس طرح سے نام لے کر ذکر نہیں کیا لیکن نبی ہم نے ہر قوم میں بھیجے۔ اب یہ دیکھیے اس میں کتنی بڑی وسعت' کتنی بڑی گنجائش نکل آئی کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجے' تخصیص طور پر ذکر قرآنِ حکیم میں نام لے کر نہیں آیا۔ پھر اس کے بعد ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں بھی جو لوگ اپنے بزرگوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہمارے دھرم کے بانی تھے' جو بھی ان کا نام لیتے ہیں' ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیا میں ان کا شمار ہو سکتا ہے کہ جن کا ذکر نام لے کر قرآنِ حکیم نے نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ حدِ نگاہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا' یہ افق کتنی آگے چلی گئی کہ کچھ وہ ہیں جن کے ہم نے نام لیے ہیں' باقی وہ ہیں جن کے ہم نے نام نہیں لیے۔ نام لیے ہیں یا نام نہیں لیے' انہیں ہر قوم کے ایسے واجب الاحترام ہستی کے متعلق نام لیا ہے تو آپ بالتخصیص کہیں گے کہ وہ نبی تھے' نام نہیں لیا تو آپ کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے نبی ہوں۔ آپ ان کے لیے بھی گستاخی نہیں کر سکتے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہوں۔ دنیا کی کسی قوم کے کسی واجب الاحترام شخصیت یا بانی یا جنہیں وہ اپنا بزرگ مانتے ہیں' کے متعلق آپ کے دل میں کبھی بھی نفرت اور حقارت اور گستاخی اور سوءِ ادبی کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان انبیا میں سے ہوں جن کا نام قرآنِ مجید نے نہیں لیا۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ہم نے ہر قوم کی طرف ہدایت دینے والے بھیجے تھے۔ سوچیے کہ جو دین یہ نظریہ پیش کر رہا ہو' وہ دنیا کے اندر کتنی بڑی عالمگیر اخوت اور رواداری کا دین ہوگا لیکن جیسا میں نے عرض کیا کہ ہم تو مذہب کی سطح پر اتر آئے ہوئے ہیں' جہاں ایک ہی

نبی کے' ایک ہی کتاب کے ماننے والے' آپس میں سر پھٹول کررہے ہیں۔ کہا ہے کہ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (4:164) ان کا ذکر نہیں کیا۔

## خدا تعالیٰ نے ہر نبی کو کتاب کی نعمت سے نوازا تھا

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ❶ (4:164) ۔قرآنِ حمید میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہ چیز آئی ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خاص کسی ایک نبی کی ہو۔ابھی ابھی آپ نے دیکھا کہ یہ کہا ہے کہ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (4:163) داؤدؑ کو زبور کی کتاب دی' یہ نہیں کہ حضرت داؤدؑ کو ہی کتاب دی' باقی نبیوں کو کتاب نہیں دی گئی۔قرآنِ کریم نے تو کہا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جسے کتاب نہ دی گئی ہو۔

ضمناً عرض کروں کہ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ صاحب! رسول وہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے کتاب یا شریعت لے کرآتا ہے اور نبی وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا۔جیسا میں نے کئی بار کہا ہے کہ وہ نبی آتا ہے' قاصد آتا ہے' چٹھی رسان آتا ہے اور چٹھی ساتھ لاتا نہیں ہے تو یہ سوال ہی نہیں ہے۔قرآنِ کریم کی تصریح موجود ہے۔ (2:213) میں ہے کہ ہر نبی کے ساتھ ہم نے کتاب بھیجی۔ بات مکمل نہیں ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے پیغامبر آئے اور پیغام نہ لائے۔میں کہہ رہا تھا کہ حضرت داؤدؑ کو کتاب دی گئی باقیوں کو بھی کتاب دی گئی۔ اسی طرح یہ چیز ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کلام کرنے کی بات یہ وحی ہے اور ہر نبی سے خدا نے کلام کیا ہے یعنی اس کو وحی بھیجی ہے۔ یہ بات ذرا نازک سی ہے۔

## نبی کے علاوہ وحی کی ماہیت سے کوئی بھی شخص واقف نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! خدا کا اور نبی کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟ وحی کیسے آتی ہے؟ اس کی کیفیت' کنہ اور ماہیت کیا ہوتی ہے؟ یہ وہ چیز ہے جو نبی کے بغیر کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ یہ انسانوں کی اپنی محنت' اپنے اکتساب سے پیدا کردہ چیز نہیں ہوتی' یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ آہستہ آہستہ اطاعت کرنے سے' فرماں برداری کرنے سے' خدا کے احکام ماننے سے یا ان کے الفاظ میں محبت پیدا کرلینے سے' منزل بہ منزل انسان پہلے ولی ہوتا ہے' پھر غوث ہوتا ہے' پھر قطب ہوتا ہے' پھر ابدال ہوتا ہے' پھر کرشن ہوتا ہے' پھر اس کے بعد نبی ہوجاتا ہے' قطعاً یہ صورت نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں اُس انسان میں ہوتی ہیں جو اپنے کسب و ہنر سے ایسا کرتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی مشق کرتا چلا جاتا ہے' وہ قوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ جسمانی قوت پہلوانی کے ذریعے سے بڑھتی ہے' فکری قوت کسی خاص فن کی خصوصیت سے جو مہارت حاصل

---

❶ خود یہودیوں کے پیغمبر موسیٰ سے بھی خدا نے یہی باتیں کی تھیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 231)

ہو جاتی ہے' Specialization (اختصاص) ہو جاتی ہے اس سے تو ایسا ہوتا ہے لیکن نبوت اس قسم کی چیز نہیں ہے۔ قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہتا ہے کہ تمہیں تو کل تک اس کا علم بھی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے۔ جسے کل تک اس کا علم نہ ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے Gradually (بتدریج) آہستہ آہستہ اپنے اندر یہ چیز پیدا کر لی اور ایک دن نبی بن گیا۔

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ﷺ است ❶

نبوت کی ماہیت کا ان کو علم نہیں' اس کی خصوصیات کا علم نہیں' نبی کو خود اس کا علم نہیں ہوتا کہ میں کل نبی بن جاؤں گا۔ یہ تو نازل کردہ شے ہوتی ہے' خارج سے کوئی چیز آتی ہے' اندر سے باہر نہیں آتی' یہ Subjective (داخلی) نہیں ہوتی' یہ Objectively (خارج سے) ہے۔ اسی کو وحی کہتے ہیں' اسی کو خدا کا کلام کہتے ہیں' ہر نبی کے ساتھ یہ کیفیت ہے۔ یہ کیسے تھا؟ کوئی غیر از نبی اسے نہیں جان سکتا۔ اور نبوت کا سلسلہ چونکہ ذات رسالت مآب ﷺ پر ختم ہو گیا اس لیے اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی بھی اس کو جان سکے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے جو وحی کے ذریعے سے ملا اور جواب قرآنِ حکیم کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ یہ وحی ہے' اس پہ غور کیا جائے گا' تدبر کیا جائے گا' عقل سے' فکر سے' بصیرت سے' دلیل سے' برہان سے' مشاہدے سے' مطالعہ سے' اس کو سمجھا جائے گا۔ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ کیسے ملا تھا' وحی کی ماہیت کیا تھی' رسول اور خدا کا تعلق کیا تھا' اسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ یہ جو میں کہہ رہا تھا' اسے سمجھ لیجیے کہ خدا کی وحی ہی کو کلام کہا جاتا ہے' قرآنِ کریم کو اس نے کلام الٰہ کہا ہے' یہ بھی تو خدا کا کلام ہے۔ اس لیے خدا جو وحی دیتا تھا تو خدا اس نبی سے کلام کرتا تھا۔

## نزولِ وحی کے تین طریقے

قرآنِ کریم نے ایک مقام پر خدا کی طرف سے پیغام آنے یا وحی آنے کے تین طریقے بتائے ہیں' وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ پہلے بھی یہ بات آ چکی ہے۔ اب اس کا (42:51) میں ذکر آ گیا ہے' اس واسطے اسے دہرانا ضروری ہے۔ کہا ہے کہ **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا ....** (42:51) کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے بجز اس وحی کے طریق سے......

---

❶ یہ چیز ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) نے ''ارمغانِ حجاز۔ اردو حصہ۔'' میں ''حسین احمد'' کے عنوان سے کہی تھی:

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد ﷺ عربی است

### 1۔ پہلا طریقہ ''وحی'' سے: وحی کا آغاز ہمیشہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ نبی سے

عزیزانِ من! پہلے تو سمجھ لیجیے' قرآنِ حکیم میں جہاں بھی آیا ہے کہ خدا نبی سے بھی کلام کرتا ہے تو خدا پہل کرتا ہے' وہ اس سے بات کرتا ہے' ایسا نہیں ہے کہ یہاں بیٹھا کوئی شخص جب جی چاہے خدا سے باتیں کرنا شروع کر دے۔ آپ کو اولیائے کرام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں' ان کی صورت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہر روز اس سے باتیں کرتے ہیں۔ یعنی وہاں بات کی جو Initiative (پہل) ہے وہ انسان کی طرف سے ہے' یہ خدا سے بات کرتا ہے پھر خدا جواب دیتا ہے یعنی نبی سے بھی آگے (معاذ اللہ)۔ نبی کے متعلق تو قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ خدا اس سے بات کرتا ہے جب وہ وحی دینا چاہتا ہے تو وہ اس سے بات کرتا ہے' یہ الگ ایشو ہے کہ اس کے جواب میں یہ کچھ اور کہے لیکن ایسا نہیں کہ وہ اس سے یہ کہے کہ دیکھیے صاحب! ذرا ادھر متوجہ ہوئیے گا' ایک معاملہ ہمارے سامنے آ گیا ہے ہیلو ہیلو! (معاف رکھیے گا) یہ صورت نہیں ہے۔ حضورﷺ سے معاملات کے متعلق پوچھا جاتا ہے' خود آپﷺ یہ کہتے ہیں کہ ابھی تک تو خدا کی طرف سے اس کے متعلق کوئی وحی نہیں آئی' یہ وحی آئے گی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے کہا ہو کہ ذرا ٹھہر جائیے' میں ابھی پوچھ کر تمہیں بتاتا ہوں۔ ایسی کیفیت ہرگز نہیں۔ یعنی یوں نہیں کہ اپنے کسب و ہنر سے نبی بن جائے' نبی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کسی مقام پر بھی اپنے تقاضے کے مطابق خدا سے وحی نہیں لے سکتا' اسے انتظار کرنا پڑتا ہے' خدا اپنے پروگرام کے مطابق جب چاہے اس کو وحی دیتا ہے۔ اس لیے یہ جو ہمارا تصور ہے کہ خدا ان بزرگوں سے ہم کلام ہوتا ہے ہم کلامی کی بات اگر آپ کہیں تو' بزرگوں کی تو بات چھوڑ دیجیے' خدا صرف نبی سے ہمکلام ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! ہم کلام کے معنی ہیں ''خدا کی طرف سے وحی ملنا'' صرف نبی سے خدا ہم کلام ہوتا تھا' کسی اور انسان سے نہیں۔ اور ابتدا اس کی طرف سے ہوتی تھی' وہ اس سے بات کرتا تھا' اس کی طرف وحی بھیجتا تھا' یوں نہیں تھا کہ نبی جب جی چاہے خدا سے بات کرے۔ سمجھ لیا آپ نے جو میں نے فرق بتایا ہے!

اب قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اس کے لیے اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ (42:51) اس کے سوا کوئی ذریعہ اور طریقہ ہی نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے یعنی خدا کا انسان سے بات کرنے کا بھی یہی طریق ہے۔ کہا ہے کہ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) یہ دو چیزیں نبیوں کے متعلق اس نے کہی ہیں۔ وحی عربی زبان میں ''ایک سریع سا' تیز سا اشارہ'' ہوتا ہے' بنیادی طور پر' لغوی طور پر' اس کے لیے یہ لفظ ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ چیز کہی ہے کہ وہ نبی کے قلب کے اندر نازل کیا جاتا ہے۔

## 2۔ دوسرا طریقہ ''پردے کے پیچھے سے'': خدا کی ذات کا حضرت موسیٰؑ سے گفتگو کا تمثیلی انداز'

## تشبیہات کی شکل میں

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ہم نہیں جان سکتے کہ یہ کیا ہے۔ایک تو یہ ہے۔اب **من ورآی حجاب** (42:51) کی بات یہ ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ پسِ پردہ اس قسم کا ہی پردہ ہے جیسا ہمارے ہاں دوانسانوں کے اندر ہوتا ہے اور وہ پردہ بھی ایسا جیسے اگر ہم اپنے انداز سے‘ اپنے تصور کے مطابق‘ سمجھیں کہ خدا پردے کے پیچھے بیٹھا ہے‘ نبی ادھر بیٹھا ہے اور آپس میں وہ باتیں کر رہے ہیں‘ پردہ اٹھاتے نہیں ہیں۔یہ جو چلمنی بات ہے کہ

کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں‘ سامنے آتے بھی نہیں

وہ جو حضرت موسیٰؑ کا تمثیلی رنگ ہے‘ یہ وہی تھا کہ شدت شوق میں جب آپ نے یہ کہا تھا کہ

آواز تو فردوس گوش بنتی ہے
اپنے دیدار سے بھی تو جنت نگاہ بنیے !

یہ بات نہیں ہے کہ خدا ایک مجسمہ (Embodiment) ہے‘ اس کو کہیں اس طرح سے کان میں آوازیں آتی ہیں‘ پھر اس کو سامنے دیکھنے کا شوق ہوتا ہے تو کہے کہ

بے حجابانہ آ سر کاشانہ ما

عزیزانِ من! یہ چیزیں وحی کی ہیں‘ خدا اور اس کے نبی کی ہیں۔بات یہ ہے کہ جب بھی قرآنِ کریم نے اس قسم کے مسائل کو سمجھانا ہے تو وہ تو اس نے لسان عربی مبین میں ہی سمجھانا تھا‘ اب بات انسانوں کی زبان میں سمجھائی جائے گی۔انسانوں کی زبان میں تشبیہات کے ذریعے سے بات سمجھائی جاتی ہے‘ یہ جو Abstract Truth (غیر محسوس صداقتیں) ہوتے ہیں‘ ان کو آپ مجازی الفاظ میں نہیں سمجھا سکتے‘ انہیں تشبیہات میں سمجھایا جاتا ہے۔وہ جو قرآنِ حکیم نے متشابہات کی آیات کہی ہیں‘ ان کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جنہیں تشبیہات کے ذریعے سے سمجھایا جاسکتا ہے‘ ان الفاظ کے جو مجازی معنی ہیں اس کے ذریعے نہیں سمجھایا جاسکتا۔اس لیے خدا کا کسی نبی سے باتیں کرنا‘ وہ براہِ راست اس کے قلوب کے اندر کوئی چیز ڈال دینا ہو یا **مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ** (42:51) کسی طرح سے بات کرنا ہو‘ یہ چیزیں تشبیہی رنگ میں سمجھائی جاسکتی تھیں۔اور ہم تشبیہات سے ان کے اصل مقصد تک‘ ان کے مقصود تک‘ تو پہنچ سکتے ہیں لیکن ان کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے۔عزیزانِ من! یہ چیزیں محسوسات کے دائرے میں آ نہیں سکتیں‘ خدا اور اس کی وحی تو بڑی چیز ہے‘

شاعر کو تو دقت یہ پیش آتی ہے کہ

کسے بتلائے کوئی کہ خون آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خونِ آرزو کا رنگ و بو دیکھنا چاہتے ہیں' یہ کیسی حسین Term (اصطلاح) ہے! وہ اگلے دن ٹی وی کے اوپر کچھ ہو رہا تھا' گانے والا سامنے تھا' پوچھنے والے اس سے پوچھتے تھے کہ صاحب! یہ آواز کی بات تو آپ نے بتائی' یہ جو دل ٹوٹنے کی آواز ہوتی ہے اس کے لیے سرگم میں یہ کونسا سر ہوتا ہے۔ آواز تو اسے کہا گیا ہے مگر دل کے ٹوٹنے کی آواز یہ نہیں ہوتی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اس دنیا میں' ہماری زبان میں بھی وہ چیزیں ہیں جو محسوسات کے انداز میں سامنے نہیں آتیں' انہیں بھی ہم تشبیہات کے رنگ میں بیان کر دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس قسم کے مابعد الطبیعاتی بلند ترین حقائق' جو کبھی بھی محسوسات کے دائرے میں نہیں آ سکتے تھے' سمجھانے کے لیے بہرحال تشبیہات کا رنگ اختیار کیا ہے۔ اس لیے مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) جو نبی کے ساتھ ہوتا ہے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حجاب کیا تھا' دونوں میں فرق کیا تھا لیکن یہ خاصائے نبوت تھا' ہم اس کے لیے مکلّف ہی نہیں ہیں کہ ہم خواہ مخواہ ریسرچ کرتے پھریں' جانتے پھریں' پہچانتے پھریں۔ یعنی جس چیز کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا' اس کی خواہ مخواہ تحقیق کیا! آپ دیکھیں گے ہمارے ہاں الٰہیات کے اندر کتابوں پہ کتابیں لکھی ہوئی ہیں کہ ماہیت نبوت کیا ہوتی ہے۔ سوچیے تو سہی! یہ آپ سمجھ نہیں سکتے۔ کسی بچے کو یہ سمجھانا کہ بلوغت کے بعد کی مردانیت (Manhood) کیا ہوتی ہے' جوانی کا دور کیا ہوتا ہے' معاف رکھیے گا یہ یونہی ایک مثال کی بات ہے' یہ آپ نہیں سمجھا سکتے۔ غیر از نبی کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ ماہیت نبوت' کیفیتِ وحی کیا تھی' خواہ مخواہ ان چیزوں پہ سر مارنا ہے جو تمہارے حیطۂ امکان میں ہی نہیں ہے۔

## 3۔ تیسرا طریقہ: خدا کا انسان کے ساتھ بات کرنا

اگلی بات یہ ہے جو ہمارے ساتھ ہے۔ کہا ہے کہ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ (42:51) جہاں تک غیر از انبیا ہیں' عام انسان ہیں سو ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے جو ان تک وہ وحی پہنچاتا ہے جسے خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق اس رسول کو دیتا ہے۔ کوئی غیر از نبی خدا سے براہِ راست ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ تیسرا طریقہ ہے۔ اوپر کہا تھا کہ کسی بشر کے ساتھ خدا جو کلام کرتا ہے' وہ یہ (ملی ہوئی وحی کے ذریعے سے) ہے اور نبیوں کے ساتھ وہی کیفیت ہے جو اوپر کہی گئی ہے۔ اب جو غیر از نبی ہیں' ان کے ساتھ بات کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ وہ وحی جو نبی کو دی جاتی ہے' جب وہ دوسرے انسانوں کو پہنچا دیتا ہے' تو خدا اس وحی کے ذریعے سے عام

انسانوں سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم کو اس نے کلام اللہ کہا ہے۔

## لفظ کلام کے علاوہ لفظ عَلٰی اور عَلَیْکَ میں فرق کی نوعیت

ہم جب قرآنِ مجید پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے' ہم پھر بھی نہیں کر رہے ہوتے' خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اور میں کہوں گا کہ یہاں ہم کو یہ کلام کہنا بھی غلط ہو جائے گا کیونکہ یہاں تو یک طرفہ ٹریفک ہے' ہم تو باتیں نہیں کر رہے ہوتے۔ ٹھیک ہے ہمارے دلوں میں آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں' جسے ہم دعا کہتے ہیں۔ کلام اور چیز ہوتی ہے۔ یہ کلام خدا کا ہے اور اس کے اندر ایک بڑا لطیف سا نکتہ ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کتاب یا خدا کی طرف سے وحی نازل' کرنے کا ذکر کیا ہے' اس کے لیئے' نبی کے لیئے' علٰی کا لفظ آیا ہے یعنی عَلَیْکَ کہ تیرے اوپر نازل کیا۔ اور یہ جو انسان ہوتے ہیں' جو اس کے ماننے والے ہوتے ہیں یہ دوسرے ہوتے ہیں لہٰذا ان کے لیے الیک اور اِلَیْکُمْ کا لفظ آیا ہے یعنی تمہاری طرف نازل کیا۔ یہ عام انداز ہے لیکن یہ چیز کہ قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کے بعد اس کی ماننے والی امت کے اوپر بھی یہ وحی نازل ہوا ہے' قرآنِ حکیم ماننے والوں کے متعلق' "عَلَیْکُمْ" کا لفظ "عَلٰی" سے بھی قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ (2:231) ختم نبوت کے بعد یہی جو کتاب ہے میں Qouted (استناد و تصریح سے) کہونگا کہ یہ ہمارے اوپر بھی نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں' خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔

## انسان تو خدا سے کلام کر ہی نہیں سکتا

سیدھی سی بات ہے جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کا حکم ہے کہ یہ کرو' یہ کرو' یہ کرو' وہ ہم سے بات ہی تو کر رہا ہوتا ہے۔ یہ وحی اب قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہے۔ یہ ہے وہ تیسرا طریقہ جو اس نے بتایا ہے۔ کہا ہے کہ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (42:51) انسانوں کی طرف ہم رسول بھیج دیتے ہیں اور وہ خدا کی مشیت سے جو وحی لیتے ہیں وہ ان انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ یہ وحی جو انسانوں کی طرف پہنچتی ہے' یہ خدا کا کلام ہوتا ہے' خدا انسانوں سے اس وحی کے ذریعے پھر کلام کرتا ہے' اس کے علاوہ خدا سے کلام کرنے کا کوئی اور ذریعہ اور طریقہ نہیں ہے۔ انسان خدا سے کلام نہیں کر سکتا۔ اور کلامِ خداوندی وحی کو کہا جاتا ہے۔

## کشف' الہام اور بشارات کا تصور تو نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

یہ جو آپ کے ہاں بعد میں کشف اور الہام اور بشارات وغیرہ کی اصطلاحات وضع کی گئیں' یہ فریب نفس ہے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں یہ کشف' الہام اور بشارات لفظ تک نہیں۔ خدا انسانوں سے جو بات کرتا تھا' جسے اس نے کلام کہا ہے'

خدا کی وہ وحی تھی' وحی کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں تھا اور وحی کا آنا حضور ﷺ کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا۔ اب انسانوں کے پیدا کردہ' یہ قیاسات و تصورات ہیں' ان کا جو نام جی میں آئے' رکھ لیجیے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ نبی کی تو یہ کیفیت تھی کہ خود بھی کوئی معاملہ ایسا آجاتا تھا' جس کے متعلق ابھی وحی نہیں آئی ہوتی تھی' تو نبی اکرم ﷺ کو انتظار کرنا پڑتا تھا کہ خدا کی طرف سے اس معاملے میں کیا فیصلہ ہوتا ہے' میں نہیں کہہ سکتا۔ فیصلہ ہوتا تھا' آپ ﷺ کی طرف وہ نازل کیا جاتا تھا' تو پھر آپ ﷺ اس کا اعلان کرتے تھے کہ خدا نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ خدا سے فیصلہ وہ خود مانگ کر بھی نہ لے سکتے تھے [1]۔ اور یہاں تو یہ کیفیت ہے جناب! کہ یہ جو مقربین کے دعویدار بنے پھرتے ہیں یوں نظر آتا ہے "جس طراں اللہ میاں نال گلی ڈنڈا کھیلن ڈئے نیں" (جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں)۔ مذاق بنا رکھا ہے۔

## خدا تعالیٰ نے اپنی گویائی کی لازوال نعمت کو تو قیامت تک کے لیے عام کر رکھا ہے

کہا ہے کہ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ (37:159) ان توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کے سارے حقائق منطقی توجیہات ہیں کہ ہاں صاحب! اب تو خدا نے بولنا ہی بند کر دیا ہے لو!! گونگا ہی ہو گیا ہے۔ یعنی ہم صبح اٹھ کر جو کہتے ہیں کہ چلو اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کرو تو کیا یہ خدا کا بولنا نہیں ہے؟ ان کے نزدیک کیا یہ خدا کا کلام نہیں' کیا خدا باتیں نہیں کرتا ہم سے؟ وہ کہتے ہیں کہ خدا گونگا ہو گیا۔ پوچھیے تو ان سے کہ خود حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان کا عرصہ' جو پانچ سو سال کا ہے' یہ مانتے ہیں کہ اس دوران میں وہاں کوئی نبی نہیں آیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس پانچ سو سال کے عرصہ میں کیا پھر خدا گونگا ہو گیا (معاذ اللہ)؟ یعنی یہ کتنی سطحی دلیلیں ہیں جو دی جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! اب تو قیامت تک کے لیے خدا کے گونگے ہونے کا سوال ہی نہیں کیونکہ کلام کو محفوظ کر کے رکھ دیا اور وہی اس کی گویائی ہے اور وہ ختم ہی نہیں ہوتی اور وہ محفوظ ہے۔

## انسانوں کے لیے رسولوں یا نبیوں کے آنے کا مقصد

عزیزانِ من! بات یہاں سے چلی تھی کہ تمام انبیا پر ہمیں ایمان لانا ہوگا' ہمیں انہیں ماننا ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک پر کتاب آئی۔ جن کا ذکر قرآنِ حکیم نے بالتخصیص کیا ہے' انہیں نام لے کر مانا جائے گا' جن کا نام نہیں لیا ہے ان کے متعلق اجمالی طور پر ماننا ہوگا کہ وہ بھی خدا کے نبی تھے اور ہم کسی رسول کے رسول ہونے کی جہت سے کسی رسول میں فرق نہیں کرتے۔ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ (3:84) ہم ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے ہم ان تمام انبیاء کو دینِ خداوندی کا پیامبر سمجھتے ہیں اور رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ

---

[1] وحی کے متعلق مزید نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۃ الرحمٰن کا جنوری 1983 کی 7 تاریخ کا (پرویزؒ) باباجی کا درسِ قرآن۔

وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ (4:165) ان رسولوں کا مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ نظامِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کیا کیا خوشگوار نتائج مرتب ہونگے اور اس کے خلاف جانے سے کیا کیا تباہیاں آئیں گی۔ یہ رسول اس لیے بھیجے جاتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں صحیح راستہ تو بتایا نہیں گیا اور تبدیلیاں یوں مسلط کر دیں۔

عزیزانِ من! دو چیزیں میرے سامنے آ رہی ہیں' وجد میں آ جایئے۔ سوال یہ ہے کہ رسول کاہے کے لیے آتے تھے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ دین کی بنیاد' اصل و غایت' قانون مکافات عمل ہے۔ رسول کیا کرنے آتے تھے؟ اس لیے کہ وہ مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ (4:165) تھے۔ وہ یہ بتانے کے لیے آتے تھے کہ اگر اس قسم کے کام کرو گے تو پھر تمہارے لیے یہ خوش خبریاں ہیں' یہ تمہیں خوش گواریاں ملیں گی۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو میں تمہیں آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اس قسم کے خطرات تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ بشارت ہے' وہ انداز ہے۔ وہ انسانی اعمال کے نادیدہ نتائج سے آگاہ کرنے کے لیے آتے تھے۔

## وحی کی تعلیم یہ ہے کہ بدعملیوں کے نتائج ہر وقت جانوروں کی دم کی طرح انسان کے ساتھ چپکے ہوتے ہیں

آپ نے دیکھا کہ دین کی غایت کیا ہے۔ نتائج تو ان اعمال کے اندر پوشیدہ تھے چونکہ محسوس طور پہ سامنے نہیں آئے تھے' اس واسطے انبیائے کرامؑ یہ بتانے کے لیے آتے تھے کہ یاد رکھیے! یہ نتائج تم پہلے بھیج دیتے ہو' اِدھر تم کھڑے ہوتے ہو' اُدھر نتائج ہوتے ہیں۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم اس راستے پہ وہاں پہنچے تو وہ جو کہتے ہیں کہ ''اگے ڈین ای کھلوتی ہووے گی'' (آگے ڈائن ہی کھڑی ہوگی)۔ وہاں تمہارے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اس سے بچ جاؤ' یہ اس چیز کی وارننگ دیتے تھے۔ جن اعمال کے طبعی نتائج ہمارے سامنے فوراً آ جاتے ہیں' انبیا کی تعلیم ان سے متعلق نہیں تھی مثلاً کسی نبی نے یہ نہیں کہا کہ دیکھو بھئی! سنکھیا کھاؤ گے مر جاؤ گے' اس کے لیے آسمان سے وحی آنے کی ضرورت ہی نہیں' کسی نے یہ نہیں کہا کہ انگلی آگ میں ڈالو گے تو جل جائے گی اور تمہیں درد ہونے لگ جائے گا۔ یہ طبعی قوانین (Physical Laws) ہیں ان کے وہ طبعی' محسوس' مرئی نتائج سامنے آ جاتے ہیں' ان کے لیے وحی کی ضرورت نہیں ہے یعنی یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سنکھیا کھاؤ گے تو یاد رکھو! ہلاک ہو جاؤ گے' تباہ ہو جاؤ گے۔ وہ یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ اگر رزقِ حرام کھاؤ گے تو تمہاری ذات کی تباہی ہو جائے گی۔ یہ وہ نتیجہ تھا جو انسان محسوس طور پر نہ دیکھ سکتا تھا' نہ کسی لیبارٹری میں ٹیسٹ کر سکتا تھا' اس کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔

## وحی کی راہنمائی اور عقل کے تجرباتی طریق میں فرق

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اپنے تجربات کے بعد آہستہ آہستہ' ان حقائق کی طرف آ رہا ہے جو نتائج وحی نے اس سے اتنا عرصہ پہلے بتا دیئے تھے۔ وہ جب اپنی زندگی پہ تجربے کر رہا ہے' عقل کا طریقہ تجرباتی ہوتا ہے' وہ ایک چیز کو اختیار کرتی ہے اور اس وقت جھوم جاتی ہے کہ ہاں صاحب! ہم نے وہ فردوس گم گشتہ پالیا جس کی تلاش میں آدم مارا مارا پھرتا تھا' وہ ہمارے سامنے آ گیا۔ برسوں بلکہ صدیوں کی خوں ریزیوں کے بعد' ہڈیاں تڑوانے کے بعد' محسوس ہوتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ تو بڑا غلط طریق تھا' بات نہیں بنی۔ پھر عقلِ انسانی ایک اور طریقہ اختیار کرتی ہے' پھر دوسرا طریقہ اختیار کرتی ہے یہ اس کا Process of Trial & Error (سعی وخطا کا طریقہ کار) ہے' ناکام تجارب کے بعد کہیں صدیوں میں جا کر' پتہ نہیں ہزار ہزار سال کے بعد جا کر' کسی ایک حقیقت تک وہ پہنچتی ہے اور جس حقیقت تک پہنچتی ہے وحی نے وہ پہلے بتا رکھی ہوتی ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ وحی' انسان کی ناکام کوششوں کی جو تلخیاں ہیں اور اتنا وقت لگتا ہے' اتنی انرجی ضائع ہوتی ہے' اس کو Economize (سمٹایا) کرتی ہے۔ یہ ہے جسے اس نے مبشرین اور منذرین کہا ہے۔ یعنی ایک دن جو اجتماعی عقل انسانی ہے' اپنے انہی ناکام تجارب کے بعد مسلسل Pragmatically (استنتاجی طور پر) اور Experimentally (تجرباتی طور پر' تجربات کرتی ہوئی) چلتی جائے گی' چلتی جائے گی اور اس کے نتائج آگے منتقل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک دن یہ جو وحی کے ذریعے حقائق دیئے گئے ہیں' وہ ان حقائق تک پہنچ جائے گی۔ عقل نے ان حقائق کو ایجاد نہیں کیا' Discover (بے نقاب) کیا ہے' اس کے Discover (بے نقاب) کرنے کا Process (طریقہ) بڑا لمبا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا' پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اگر کسی ایک Truth (صداقت) کے Discover (بے نقاب) کرنے میں عقل کو ایک دن بھی لگ جائے' تو ہمارے حساب وشمار سے ہزار سال لگ گئے۔ اور ہزار سال میں جتنے خون کے دریا تیرنے پڑے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑیں' وہ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ انسانوں کو خالص عقل کی رو سے تو اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے کہ یہ نظامِ مملکت باہمی مشاورت سے طے پانا چاہیئے' کم از کم ہزار سال کا عرصہ لگ گیا۔ اور اس دوران میں ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی تباہیاں جو انسانیت کے ساتھ گزری ہیں' وہ ہمارے سامنے ہیں' وحی نے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں۔ یہ ہے فرق۔ کیسے حسین انداز میں اقبالؒ بات کہہ جاتا ہے۔ اس کا تو انداز ہی اور ہے' اس نے قرآنِ حکیم پہ بہت غور کیا تھا۔ کہا ہے کہ

ہر دو بمنزل رواں' ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

دونوں ہی اس منزل کی طرف جا رہے ہیں' دونوں ہی امیر کارواں ہیں' فرق یہ ہے کہ عقل ان اسباب و علل کے مطابق جاتی ہے جو طبعی دنیا میں ہوتے ہیں۔ حیلہ کے معنی یہاں فریب نہیں ہیں' بلکہ وہ ذرائع ہیں جو طبعی ہوتے ہیں۔ اس لیے بڑی سست رفتار ہوتی ہے ''او گڈے تے بیہہ کے جاندی اے'' (وہ بیل گاڑی پہ بیٹھ کر جاتی ہے)۔ عشق بردکشاں کشاں اور جو وحی ہے وہ ہوائی جہاز کے ذریعے سے پہنچا دیتی ہے۔ اتنا فرق ہے۔ اور انسان کی' ایک فرد کی' زندگی تو بڑی تھوڑی سی ہے۔ وہ تو آہِ سرد بھر کر کہتا ہے کہ

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اتنا لمبا انتظار کیوں کرتے ہو' فوراً اس طرف آ جاؤ' دوسری سواری بھی تو تمہارے پاس ہے۔ وحی یہ کرتی ہے۔

## ڈکٹیٹر شپ میں قانون کی حکمت سے آگاہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ کیوں دیا؟ بات یہ تھی جو یہاں سے چلی ہے۔ بڑی عظیم چیز سامنے آ رہی ہے۔ کہا ہے کہ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔ آپ کو پتہ ہے کہ کسی معاملے کے متعلق جو قانون بنایا جاتا ہے' اس کا اعلان ہوتا ہے Proclamation (اعلامیہ) ہوتا ہے۔ قانون بنانے کے بعد اسے اگر Publish (شائع) نہ کیا جائے' خفیہ رکھا جائے تو اس قانون کی خلاف ورزی سے آپ اس کے اوپر گرفت نہیں کر سکتے۔ جب آپ اس کا اعلان کر دیتے ہیں تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ Ignorance of Law is no Excuse (قانون کا نہ جاننا کوئی عذر نہیں ہے)' پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ صاحب! ہمیں بتایا نہیں گیا تھا۔ جسے آپ ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں' وہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ وہ اپنے حکم کو پہلے سے نہیں بتاتا' اسی وقت حکم دیتا ہے' اسی وقت گرفت کر لیتا ہے۔ جسے آپ قانون کی حکومت کہتے ہیں' وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ وہ قانون کو پہلے سے Announce (اعلان) کر دیتی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا اور اس کے متعلق تمہیں اطلاع دیدی جاتی ہے۔ اگر صورت ایسی ہو کہ یہ خطرات ہوں اور کسی کو آگاہ نہ کیا جائے کہ اس کی خلاف ورزی کرو گے تو ایسا ہوگا اور اس پہ گرفت کر لی جائے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے تو بتایا نہیں گیا' مجھے بتایا جاتا تو پھر تو یہ ٹھیک تھا' میں اس کے بعد خلاف ورزی کرتا تو اس کے نتائج بھگتتا' مجھے تو بتایا نہیں گیا۔ دیکھتے ہیں دونوں میں فرق کیا ہے۔ وہ جو اس طرف گرفت کرنے والا ہے' وہ جابر ہے' ظالم ہے' ڈکٹیٹر ہے' مستبد ہے۔ قانون کی رو سے Announce (اعلان) کرنے والا آپ دیکھتے ہیں آپ اسے قانون کی حکومت کہتے ہیں کہ تمہیں بتا دیا گیا تھا۔ کہا کہ اس لیے ہم نے رسول بھیجے اور وہ نبی بھیجے کہ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165) تاکہ رسول بھیجنے کے بعد انسانوں کی طرف سے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ واہ!! عزیزانِ من! جو میں کہہ رہا تھا کہ دو لفظ سامنے آئے ہیں۔ آپ کے سامنے قرآنِ مجید ہے تو دیکھیے قرآنِ مجید نے کیا کہا ہے۔

میں پھر عرض کردوں' میں کہا کرتا ہوں کہ جو آیات خدا کی صفات پہ ختم ہوتی ہیں وہ بڑی غور طلب ہیں۔سوچیے قرآنِ مجید کیا کہتا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے سے اس کی گرفت کے لیے قوت کی ضرورت ہے' غلبے کی ضرورت ہے۔کہا ہے کہ **وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا** (4:165) اس میں بڑی قوت ہے کہ خلاف ورزی کرنے والے کی گرفت کرے لیکن کہا ہے کہ **عَزِيْزًا حَكِيْمًا** (4:165) وہ قانون کی رو سے گرفت کرتا ہے' حکمت کی بات پہلے تمہیں بتا دیتا ہے' ایک ظالم' جابر کی طرح صرف عزیز (طاقتور) نہیں ہے' وہ حکیم بھی ہے۔اف!! عزیزانِ من! پوچھیے نہیں میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔

## خدا اگر عزیز کے ساتھ حکیم ہے تو وہ غالب بھی ہے لیکن مستبد نہیں

خدا کا یہ کہنا کہ ہمارا یہ سارا سلسلۂ رشد و ہدایت اور انبیا اور رسولوں کا بھیجنا صرف اس لیے ہے کہ تمہیں قانون سے آ گاہی ہو' تم یہ نہ کہہ سکو کہ صاحب! ہمیں پتہ تو تھا نہیں اور خواہ مخواہ ہمیں پکڑا گیا۔کہنے لگے کہ یاد رکھو! ہمارا قانون ایسا ہے' ہماری گرفت اتنی سخت ہے کہ وہ تمہارے تمدنی عدالتی قانون کی طرح ایسی نہیں ہے کہ اس میں کوئی پکڑا بھی جاتا ہے تو چھوٹ بھی جاتا ہے' ہم بڑے صاحب غلبہ واقع ہوئے ہیں لیکن ہم مستبد حاکم واقع نہیں ہوئے' ہمارے قانون کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں پہلے بتا دیا جائے کہ ایسا کرو گے تو ایسا نتیجہ نکلے گا۔یہ ہے جس کے لیے ہم نے انبیا کا سلسلہ جاری کیا۔یہ **عَزِيْزًا حَكِيْمًا** (4:165) ہے یعنی اس کا قانونِ مکافات جہاں اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا' وہ وہاں اس قدر پُرحکمت بھی ہے کہ یونہی اندھا دھند تباہیاں نہیں لے آتا۔یہ ہے قرآنِ کریم۔سوال پیدا ہوا کہ صاحب! یہ کرو گے تو یہ ایسا ہوگا' وہ صرف ہم نے کہہ ہی دیا ہے یا جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی کوئی شہادت بھی ہے؟ قانون دینے والا شہادتیں پیش کر رہا ہے۔یعنی ایک تو یہ کہ قانون کا قبل از وقت اطلاع دیدینا' اسے Publish (شائع) کردینا' دوسرا یہ کہ خود قانون بھی حکمت پر مبنی ہو۔ٹھیک ہے ڈکٹیٹر بھی تو ایسا کرسکتا ہے کہ ایک حکم دیدے قبل از وقت اس کا اعلان بھی کردے لیکن اس کی The why of it (وجۂ جواز) نہیں بتاتا' وہ یہ نہیں کہتا کہ ایسا کیوں ہوا' ہماری مرضی ہے کہ جو ہم یہ کہتے ہیں' ہم چاہتے ہیں کہ ایسا ہو' یہ ہمارا حکم ہے۔

## قانون کی تعریف

جسے قانون کہا جاتا ہے' جسے Law (قانون) کہا جاتا ہے' وہ Law (قانون) جو عدالتی Law (قانون) ہے' یہ تو بعد میں بات آتی ہے۔Law (قانون) تو آپ کو پتہ ہے کہ قانون فطرت کو بھی کہتے ہیں اور میں اس کی Definition (تعریف) کئی دفعہ پہلے بھی کرچکا ہوں کہ Law (قانون) اس وقت Law (قانون) ہوتا ہے جب اس میں یہ ہو کہ If , Then ,

Always یعنی اگر (If) ایسا کرو گے تو (Then) اس کا یہ نتیجہ نکلے گا' ہمیشہ (Always) ایسا ہوگا۔ اسے قانون کہتے ہیں۔ حکم وقتی ہوتا ہے' بدل بھی سکتا ہے' ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس کا وہی نتیجہ نکلے۔ چٹھی بھیجی جا رہی ہے' یہ حکم ہے لیکن اسی ملازم سے جب بخار کی حالت میں یہ کہا جائے کہ یہ دوائی پیو' بخار اتر جائے گا' یہ Law (قانون) ہے' Law (قانون) نتیجہ مرتب کرتا ہے' یہی اس کی غایت ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم جو کہتا ہے کہ لِئَلَّا یَکُوْنَ (4:165) یہ کرو تا کہ یہ ہو جائے' اگر یہ کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ یہ ہے جہاں قرآنِ مجید Law (قانون) کی حیثیت سے احکام دیتا ہے۔ اب یہ کہہ دیا کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا۔ سوال پیدا ہوگا کہ صاحب! اس کی کوئی شہادت بھی ہے یہ جو آپ نے کہہ دیا؟

## خارجی کائنات کا ایک ایک ذرہ حق ہونے کی شہادت فراہم کرتا چلا جائے گا

خدا جیسا کہ وہ عظیم' صاحبِ قوت و غلبہ ہے وہ یہ قوانین دے رہا ہے اور کتنی بڑی حکمت ہے اس کے ساتھ جو وہ بتائے جا رہا ہے۔ لٰکِنِ اللّٰهُ یَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ (4:166) پہلی شہادت تو ہم تمہیں اس بات کی یہ دیتے ہیں کہ جو کچھ ہم نازل کر رہے ہیں یہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (4:166) دھاندلی نہیں ہے' یہ علم پر مبنی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ پھر اس کی شہادت لینا چاہو تو سنو! وَ الْمَلٰٓئِکَةُ یَشْهَدُوْنَ (4:166) کائناتی قوتیں تمہیں اس کی شہادت دیں گی' جاؤ! خارجی کائنات میں جا کر تحقیق کرو' تفتیش کرو' تمہیں نظر آ جائے گا کہ وہاں قانون کی حکمرانی ہو رہی ہے۔ وہاں اگر گیہوں کا دانہ بوؤ گے' گیہوں پیدا ہوگا' اگر کھاد ڈالو گے تو فصل زیادہ ہوگی' آگ میں انگلی ڈالو گے تو وہ جل جائے گی۔ کہتا ہے کہ یہ دیکھنا ہو کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ قانون ہے' اس کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے' جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اگر اس کی شہادت چاہتے ہو' تو سنو! اس کا نتیجہ ذرا دیر میں مرتب ہونا ہے لیکن اگر تم اس کی شہادت چاہتے ہو تو خارجی کائنات میں جاؤ' ساتھ کے ساتھ لیبارٹری ٹیسٹ کرتے چلے جاؤ' اسی وقت تمہیں اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ وَ الْمَلٰٓئِکَةُ یَشْهَدُوْنَ (4:166) تم سمجھنا چاہتے ہو کہ یہ جو ہم کہہ رہے ہیں' یہ حق ہے' کہا کہ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) خارجی کائنات میں بھی' خود تمہاری اپنی دنیا میں بھی' اس قسم کے تغیرات' اس قسم کے یہ حوادث رونما ہوتے چلے جائیں گے۔ الفاظ یہ ہیں کہ باہر کی دنیا میں بھی' انسانوں کی اپنی دنیا کے اندر' اقوامِ عالم کے اندر' ان کی نفسیات کے اندر' ہم تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ آہستہ آہستہ یہ نشانیاں بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی تا آنکہ تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ حق ہے۔ قرآنِ کریم کے حقیقت ثابتہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خارجی کائنات میں' انسان کی تاریخ میں' اس کی سائیکولوجی ہے' انسان ان آیات اللہ کے اندر غور کرے۔ اور اس کے آگے ہے کہ ہم

کیوں اس حتم ویقین کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں؟ کیوں اس دھڑلے سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ان چیزوں کا مطالعہ یا مشاہدہ کروگے تو تمہیں قرآنِ مجید کے جو حقائق ہیں وہ واقعی حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ جائیں گے؟

## یہ خالقِ کائنات علیم وخبیر بھی ہے اور بصیر ونظیر بھی' اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہی نتیجہ پیدا کردے جو نتیجہ اس کے اندر مضمر ہے

کہا ہے کہ اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ(41:53) جو کہنے والا' وہ ہے جو ہر شے کا علم رکھتا ہے' اس پہ نگران ہے۔ کہا کہ تمہیں یہ پتہ ہے کہ شہادت دینے والا کون ہے؟ وہ کہ جس کی نگاہوں میں کوئی شے غائب نہیں ہے' وہ دیکھ رہا ہے اور بتا تا چلا جا رہا ہے۔ تمہیں تو معلوم نہیں کہ جو دانہ تم خاک کے اندر دبا دیتے ہو' تو بظاہر تو وہ دانہ ختم ہو گیا' ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ اس میں سے کتنا بڑا درخت اگ کر اس میں کیسے عجیب خوشے لگ رہے ہوتے ہیں۔ تمہاری نگاہوں سے یہ چیز غائب ہے مگر ہمارے سامنے ہے۔ کہا ہے کہ جس کے سامنے ہو رہا ہو' کیا اس کی شہادت کافی نہیں ہوتی؟ ہم نیچے بیٹھے ہوئے' اگر باہر پٹاخے کی آواز آتی ہے تو دیوار کے اِدھر بیٹھے ہوئے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیا ہے' ہم قیاس کریں گے کہ یہ ہوا ہے۔ وہاں جو بیٹھا ہوا ہے وہ کہے گا کہ جی! یہ ہوا ہے' اس کی شہادت معتبر ہے' ہمارے لیے یہ غائب تھا اس کے لیے یہ چیز شہادت ہے' وہ دیکھ رہا ہے۔ ہم اتنی ہی مثال دے سکتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو ہم میں سے یہ دیکھ سکتا ہے' کہ کل کیا ہو گا' وہ یقین سے بتائے گا۔ ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہو گا یعنی ٹائم کے متعلق ہم پہلے سے یہ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے یہ مثال خدا کی شہادت کے لیے دی تھی' ہمارے لیے غائب تھی۔ کہتا ہے کہ جس خدا کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا ہے' ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے' اس کے سامنے شہادت ہے۔ جو تمہارے لیے غائب ہے' اس کے لیے وہ بھی مشہود ہے۔ کہا ہے کہ اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ(41:53) وہ جو اس دھڑلے سے شہادت دیتا ہے تو کیا اس کے لیے اس سے زیادہ کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ اس کے سامنے تو یہ چیز واضح ہو رہی ہے! اسی لیے یہاں کہا ہے کہ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا (4:166) خدا کی شہادت جو ہوتی ہے وہ شہادت کافی ہوتی ہے کیونکہ وہ دیکھی ہوئی بات کہتا ہے۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے یہ بزرگ بھی تو کہتے ہیں کہ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید یعنی قلندر جو کچھ کہتا ہے' آنکھوں سے دیکھ کر کہتا ہے۔ ''ساڈے تے قلندراں نوں باندرای نظر اوندے ہیگے نیں'' (ہمارے ''قلندروں'' کو تو بندر ہی نظر آتے ہیں)۔ انہیں قلندر نچاتے ہیں' یہ ''قلندر'' بندروں کو نچاتے ہیں۔ بندر نقل ہی کرتا ہے' عقل سے کام نہیں لیتا۔ جو کچھ اس کے سامنے ہوتا ہے وہی کچھ کرتا ہے۔ یہ ہمارے ''قلندر'' بھی اُن کو نچاتے ہیں جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' وہ ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ بہر حال اس

نے کہا کہ جو دیکھ کر کہتا ہے' اس کی شہادت معتبر نہیں ہوسکتی تو اور کس کی شہادت معتبر ہوگی!

ہم اس چیز کو کہہ رہے ہیں کہ ہمارے قانون کے نتائج یہ ہونگے اور وہ یہ ہوگا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (4:167) جو اس قسم کے واضح قوانین سے انکار کرتا ہے' نہ خود اس طرف آتا ہے' نہ دوسروں کو اُدھر آنے دیتا ہے تو کہا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور بھی کوئی راہ گم کردہ ہوسکتا ہے! اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا. اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (69-4:168) جو ان قوانین سے انکار کرے' جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہاں نہ رکھے' الٹ پلٹ کردے تو کہا ہے کہ وہ جس طریق پہ چلے گا' وہ سوائے اس کے کہ اس کو جہنم کی تباہیوں میں پہنچادے وہ طریقہ اور کہاں لے جائے گا۔وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (4:169) اور اس کے لیے یہ کچھ کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔

اسے یوں سمجھو کہ آگ کے لیے یہ مشکل نہیں کہ تمہاری انگلی جلا دے' سنکھیے کے لیے کچھ دشوار نہیں کہ وہ تمہیں ہلاک کردے۔ قانون کے لیے یہ مشکل نہیں کہ اپنا وہی نتیجہ پیدا کردے جو نتیجہ اس کے اندر مضمر ہے۔اس لیے کہ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (4:169) قوانین کے نتائج پیدا کردینا' ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔قانون کو تو قانون کہا ہی اس وقت جائے گا جب وہ ایسا نتیجہ مرتب کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھے گا۔آگ آگ نہیں اگر وہ جلاتی نہیں ہے۔اسے آگ نہیں کہا جائے گا' راکھ کا ڈھیر کہا جائے گا۔لہٰذا وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (4:169) اس کے لیے یہ چنداں مشکل نہیں ہے۔

اب یہ کچھ کہنے کے بعد عظیم چیز آئی ہے۔کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (4:170) اے نوعِ انسانی! اس پس منظر میں سن رکھو کہ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ (4:170) تمہارے رب کی طرف سے' تمہاری طرف' ان قوانین کو لے کر یہ پیغامبر آ گیا ہے۔وہ کیسے انداز سے بات کرتا ہے! یہ سارا کچھ پیچھے سے کہتا چلا جا رہا ہے' کہا ہے کہ یہ تمہارے سامنے آ گیا۔یہ تمہارے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے' تمہارے پاس آ گیا ہے' ہمارا اپنا اس میں کوئی مقصد نہیں' اس کی بھی کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں۔

## انسان کا ہر عمل جو خیر کا پہلو لیے ہوئے ہو اس کی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے ہوتا ہے

کہا ہے کہ فَاٰمِنُوْا (4:170) اس پر تم ایمان لاؤ کیونکہ خَيْرًا لَّكُمْ (4:170) اس میں تمہارا ہی بھلا ہوگا۔واہ واہ واہ! تمہارا ہی بھلا ہوگا خَيْرًا لَّكُمْ (4:170) یہ سارا کچھ تمہارے لیے ہے۔مالک اور آقا کی حیثیت سے جو کچھ وہ حکم دیتا ہے' اس میں نوکر کا بھلا نہیں ہوتا۔نوکر بیچارے کو تو اس میں تنخواہ یا روٹی ملتی ہے' وہ سارا کچھ تو تم سے اپنے بھلے کے لیے کرا رہا ہوتا ہے۔آپ نے غور فرمایا! ہمارے ہاں جو تصور ہے کہ وہ مالک ہے ہم اس کے غلام ہیں' وہ جو چاہے ہم کو حکم دے' جو چاہے کرالے' جس طرح سے چاہے

یہ ہمیں کہے۔یعنی اس کا کوئی کام ہے جس کے لیے وہ ہمیں حکم دیئے چلا جا رہا ہے کہ تم اِدھر جاؤ' تم اُدھر جاؤ' جیسے ہم اپنے ملازموں سے' زیردست سے' جو کام کرنے والے ہیں ان سے' کہتے ہیں کہ تم یہ کرو جی! انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہم یہ کیوں کریں۔مثلاً وہ صبح جاتا ہوا یہ کہہ جاتا ہے کہ یہاں گڑھا کھود رکھنا۔وہ دن بھر گڑھا کھود رہا ہے۔اس سے پوچھو کہ گڑھا کیوں کھود رہے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ جاتے وقت میاں جی کہہ گئے تھے۔وہ شام کو آتا ہے' وہ آکر کہتا ہے کہ اوہو! اچھا! تم نے گڑھا کھود دیا؟ ''ہاں ہُن اینوں پُوردے'' (اب اسے بند کردو) وہ گڑھے کو بھرنے لگ جاتا ہے۔اس سے پوچھو کہ گڑھا بھر کیوں رہے ہو؟ کہتا ہے کہ جی! میاں جی کہہ گئے ہیں گڑھا بھر رہا ہوں یہ خَيْرًا لَّكُمْ اس کے لیے نہیں ہوتا' اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔قرآنِ حکیم کہہ رہا ہے کہ یہ جو کچھ ہم تمہیں کہہ رہے ہیں' اس کی حیثیت مالک اور نوکر والی نہیں ہے۔آگے کہتا ہے کہ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا (4:170) اور اگر تم ایسا نہ کرو گے مثلاً اگر وہ دن میں گڑھا نہ کھودے تو اس کا تو شام کا کام رک گیا یعنی اس کو یہ ڈانٹے' گالیاں دے' جرمانہ کرے' جو کچھ بھی چاہے کرے۔اگر وہ ایسا کام تھا کہ اس نے اس سے آگے کچھ کرنا تھا تو وہ اس سے رک گیا یعنی اس کے انکار سے' سرکشی سے' معصیت سے' عدم تعمیل سے' اس کا کام رک گیا۔

## انسانی ہاتھ کائناتی نتائج کو جلد ظہور پذیر ہونے میں مدد دیتے ہیں

کہا ہے کہ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا (4:170) اگر یہ نہ کرو گے تو فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (4:170) اس کا کام کرنے کے لیے یہ سب کچھ وافر پڑا ہوا ہے۔خود جس مقصد کے لیے تمہیں کہا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر تم کرتے تو ایک دن میں وہ کام ہو جاتا۔ یہ جو مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (4:170) ہے' ہمارا کارگۂ کائنات کا سلسلہ ہے' اگر تم نہیں کرو گے تو وہ سلسلۂ کائنات یہی کچھ کر دے گا۔فرق صرف یہ ہے اگر تم کرتے تو یہ چند دنوں میں ہو جاتا۔وہ کرے گا تو ہمارے حساب وشمار سے ہوسکتا ہے کہ کہیں پچاس ہزار سال میں جا کر ہو لیکن ہمارا تو کچھ بگڑتا نہیں ہے۔وقت کے متعلق اضطراب تو ہمیں اس لیے ہوتا ہے کہ ہم نے مرجانا ہوتا ہے۔اس چیز پہ غور فرمایئے کہ آرزو کا جو بھرآنا ہے اس کے لیے جوں جوں عمر بڑھتی ہے' آپ دیکھتے ہیں' آدمی جلدی کرتا ہے کہ یہ جلدی برآئے' یہ بچہ جوان ہو جائے اور یہ نوکر ہو جائے' میری آخری عمر ہے' پتہ نہیں میں اس کے لیے کچھ کرسکوں یا نہ کرسکوں۔یہ جس نے مرنا ہوتا ہے' اس کو یہ اضطراب ستاتا ہے۔خدا تو الحی القیوم ہے' اس نے مرنا ہی نہیں ''ایہو جئی کاہدی کال پئی ہوئی ہیگی اے پئی اے آج ای ہو جائے۔سوواری نئیں ہوندا نہ ہووے'' (اس طرح کی عجلت کیا پڑی ہے کہ یہ کام آج ہی ہو جائے۔صد مبارک! اگر نہیں ہوتا تو نہ ہو)۔ہو کر تو یہ رہے گا ہمیں تو اس کی چنتا نہیں ہے کہ یہ کب ہوتا ہے۔جب بھی ہوگا ہم تو زندہ ہیں' تم نے مرنا ہے' کوشش کرو تا کہ

تمہاری زندگی میں ہوجائے۔کہا ہے کہ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ (4:170) ایمان لے آؤ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''ساڈا تے کچھ نئیں وگڑن لگا'' (ہمارا تو کچھ بگڑنے والا نہیں ہے)۔ہوگا' ہمارے سامنے ہوگا' ہمیں اضطراب کا ہے کا' تمہیں اس لیے اضطراب ہے کہ تم نے مرجانا ہے سوا پنے سامنے یہ کچھ ہوتا دیکھ لو۔اوراس کا طریقہ ہم نے بتادیا ہے کہ اگر کائنات کا سلسلہ ہماری رفتار سے چلے گا تو ہزاروں سال میں اس کا نتیجہ برآمد ہوگا' تم اس کے ساتھ دست و بازو بن جاؤ گے تو وہی نتیجہ دنوں میں مرتب ہوجائے گا۔تم خود فیصلہ کرلو۔اگر یہ دیکھنا چاہتے ہوتو دیکھ لو' نہیں چاہتے ہوتو جاؤ مرو' ہم تو بیٹھے ہیں' ہمیں تو اس کا اضطراب نہیں ہے ہم تو هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ہیں۔یہ جو موت کی چیز ہے اس سے اضطراب ہوتا ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ؟

(غالب)

وہ مزااس لیے ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کس وقت چلے جائیں۔

## موت کے وارد ہونے کی اطلاع نہ ہونے میں بھی ایک حکمت ہے

اور یہ جواس نے اپنے ہاتھ میں موت والی بات رکھی ہے کہ موت کے متعلق علم نہیں کہ کب آجانی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایک دن بھی ضائع نہ کرے یعنی یہ بھی اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ کوئی بات نہیں' سو سال تو یقیناً ہم نے جینا ہے' تو پھر بھی ہم یہ کہیں کہ صاحب! یہ چھوڑ دیجیے' اسے کرلیں گے' ابھی ہمارے پاس خاصا وقت ہے۔ہمارے اندر یہ جو آرزو کی شمع کو روشن رکھنا ہے یہ اس لیے ہے کہ ہمیں موت کے متعلق پہلے سے نہیں بتادیا کہ تم نے کب مرنا ہے' انسان کو ہر وقت یہ بیتابی رہتی ہے کہ جلدی جلدی یہ کچھ کرلے' پتہ نہیں ہے کہ موت نے کس وقت آجانا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ہماری طرف نہ دیکھو' ہمیں یہ اضطرابات نہیں ستاتے' تم یہ سوچو کہ ایسی ایسی خوشگواریاں اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہوتو اس کے لیے جلدی کرو' جلدی اس لیے کرو کہ تمہیں پتہ نہیں کہ کتنے عرصے تک تم نے جینا ہے' کل کا کیا کرتے' آج ہی کیوں نہ ہوجائے۔کہا ہے کہ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (4:170) تم نے دیکھا کہ ہم نے کہا تھا کہ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (4:166) ہم نے یہ کچھ علم کی بنیادوں پہ نازل کیا ہے۔ہم نے جو گفتگو تم سے کی ہے' دیکھتے ہو وہ کیسی علمی بصیرت پر مبنی ہے! اور پھر جو دوسری بات کہی تھی کہ وہ حَكِيْمًا (4:170) ہے۔دیکھ رہے ہو اس میں حکمت کتنی بڑی بات ہے' کرو گے تو یہ چیز ہوجائے گی' نہ کرو گے تو ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا! کرنا ہے تو جلدی کرو' پتہ نہیں

تمہیں کب موت آ جائے' آخری وقت میں یہ حسرت تمہارے دل میں نہ رہے کہ اوہو! میں نے یہ کیوں نہ کرلیا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النسآء کی آیت 170 تک آ گئے' 171 ویں آیت سے ہم اگلی دفعہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# تیسواں باب: سورۃ النسآء (آیات 171 تا 174)

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ‌ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ
وَكَلِمَتُهٗ‌ ۚ اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ‌ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ‌ ؕ اِنْتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ‌ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ
اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ‌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ۱۷۱ لَنۡ يَّسۡتَـنۡكِفَ
الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓـئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ‌ ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَـنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ
اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ۱۷۲ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ‌ ۚ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ
اسۡتَـنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَيُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا  ۙ وَّلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ۱۷۳ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ
قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِيۡنًا ۱۷۴

عزیزانِ من! آج فروری 1971ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 171 سے ہو رہا ہے: (4:171)۔

اس آیہ جلیلہ میں ایک ایسی چٹان کا ذکر ہے جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے لیکن دین کی کشتی اس سے ٹکرا کر چکنا چور ہوجاتی ہے۔ آپ سوچیے کہ اسکی اہمیت کتنی ہے جس کا ذکر اس میں آیا ہے۔ آئے دن آپ دیکھتے ہیں اور سنتے رہتے ہیں کہ فلاں کتاب میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس واطہر پر حملے کیے گئے' اس کے خلاف احتجاجات ہوتے ہیں اور پھر وہ بعض اوقات ہنگامہ خیزیوں تک پہنچ جاتے ہیں' فسادات بھی ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ بہت بری بات ہے۔ کسی مذہب کے بانی اور بانی ہی نہیں' کسی اہل مذہب کی واجب الاحترام ہستیوں کے خلاف گستاخی کی کوئی بات' ان کی شان میں کسی قسم کی سوءِ ادبی' یقیناً سطحِ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے۔ یہ کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ ان واجب الاحترام ہستیوں کا تعلق انسان کے نازک ترین جذبات سے ہوتا ہے' ان کے خلاف کچھ کہنے سے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ اس باب میں تو ان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ کسی مذہب کے بانی کے خلاف یہ گستاخی کے کلمات کہہ سکیں۔ جہاں تک ان کے معبودانِ باطل کا تعلق ہے' قرآنِ حکیم نے بالتصریح کہا ہے

کہ مسلمان ہونے کے لیے ہر رسول پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور رسولوں کے متعلق کہا ہے کہ ہر قوم کی طرف رسول بھیجے گئے تھے' ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے قرآنِ مجید میں کر دیا ہے اور باقی وہ ہیں جن کا ذکر تو بالتصریح نہیں کیا لیکن اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (13:7) ہر قوم کی طرف ایک ہادی آیا تھا۔ تو اس لیے مسلمان ان کے خلاف گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ کسی مذہب کے بانی یا اس کی واجب الاحترام ہستی یا معبودانِ باطل کے خلاف کوئی گستاخی کی بات نہ کہو۔ قرآنِ کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ جو اپنے بزرگ ہیں' ان کے خلاف کچھ نہ کہو' اس لیے کہ اپنے بزرگوں کے خلاف کوئی کچھ کہتا ہی نہیں ہے' کوئی بھی اپنے بزرگوں کے خلاف ان کی شان میں گستاخی نہیں کرتا' کوئی سوءِ ادبی نہیں کرتا لیکن ان کے متعلق ایک ایسی بات کہی ہے جس سلسلے میں' میں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ وہ ایسی غیر مرئی چٹان ہے' نگاہوں سے تو اوجھل رہتی ہے لیکن اس سے ٹکرا کر دین کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے۔

کہا یہ ہے کہ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (4:171) ان کے متعلق مبالغہ نہ کیا کرو' اپنے دین میں غلو مت کیا کرو۔ آپ دیکھیے کہ کتنی اہم بات ہے جو قرآنِ حمید کہہ گیا ہے۔ یہ جسے ہم گستاخی یا سوءِ ادبی کہتے ہیں اس سے وہ ہستیاں اپنے مقام سے نیچے آ جاتی ہیں۔

## غلو اور غلاء کا لغوی مفہوم

دوسروں کے متعلق تو قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ کسی بزرگ کے خلاف' کسی مذہب کے بزرگ یا بانی کے خلاف' ایسی بات نہ کہو جس سے وہ اپنے مقام سے نیچے آ جائے۔ اسے گستاخی کہا کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں یا رسول یا نبی یا دین کے متعلق کہا ہے کہ ان کے لیے مبالغہ مت کرو' انہیں ان کی شان سے زیادہ نہیں بڑھاؤ۔ گویا ان کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ اس کے تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی' یہ نہیں کہا گیا مگر انہیں ان کی شان سے زیادہ بڑھانے سے روکا گیا ہے۔ یہ جو غلو ہے' یہ عربی زبان کی رو سے یوں ہے کہ ''اگر چیزوں کی مقدار یا قیمت میں حد سے تجاوز کیا جائے' قیمت میں ان کو ان کی حد سے بڑھایا جائے تو اسے غلاء کہتے ہیں اور اگر کسی کو اس کی قدر و منزلت میں' اس کے مقام سے بڑھایا جائے تو اسے غلو کہتے ہیں''۔ کہا ہے کہ انہیں ان کے مقام سے بڑھاؤ نہیں۔ یہ جتنے لوگ حضور نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والوں کے خلاف ہنگامہ آرائیاں کرتے ہیں' احتجاجات کرتے ہیں' انہیں اس گستاخی کو ذمہ دار ہستیوں کی طرف لوٹانا چاہیے اور احتجاج کرنا چاہیے اور جیسا میں نے کہا ہے کہ احتجاج کرنا چاہیے مگر ہنگامہ آرائیاں کرنا تو غلط چیز ہے' قانون کو اپنے ہاتھ میں کبھی نہیں لینا چاہیے' جو ذمہ دار ہستیاں ہیں' حکومت ہے' مملکت ہے' ان کی طرف اس بات کو لوٹانا چاہیے لیکن بہرحال احتجاج کرنا چاہیے کہ جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔

## قرآنی تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے مختلف اجتماعات اور مساجد میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق مبالغہ آمیزی کا چرچا

میں کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ اس باب میں جتنا تشدد برتتے ہیں' ہنگاموں تک پہنچ جاتے ہیں' فسادات کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کی گئی ہے' انہیں ان کے مقام سے گرایا گیا ہے۔ آپ ان کی محفلوں میں جایئے' ان کی مجلسوں میں جایئے' مسجدوں میں جایئے' وعظ کے اجتماعات میں جایئے' میلاد کی محفلوں میں جایئے اور وہاں جا کر یہ دیکھیے کہ اسی رسول ﷺ کی شان میں کتنا مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اور اس میں جتنا زیادہ مبالغہ کیا جائے' اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اسے بہت بڑا ثواب کا کام' انتہائی عقیدت کی بات' تقدس کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ بڑی محبت کے ثبوت میں یہ کچھ کہا جاتا ہے حالانکہ یہی وہ چیز ہے' جس کے متعلق قرآنِ کریم تصریح سے اور اتنی شدت سے کہتا ہے کہ مبالغہ نہ کرو اس لیے کہ مبالغہ کرنے سے آپ انہیں اس مقام سے آگے بڑھاتے ہیں' دین باقی نہیں رہ سکتا۔ کہا ہے کہ **لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ** (4:171) اپنے دین کو اسی مقام پہ رہنے دو۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں ظلم کے معنی ہوتے ہیں ''جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیئے' اسے اس مقام پہ نہ رہنے دینا''۔ اب جس شے کو اس مقام سے آپ ہٹاتے ہیں' تو ایک یہ ہے کہ اس سے آپ اسے نیچے لے آتے ہیں' اسے تو میں نے کہا ہے کہ یہ سوءِ ادبی ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ نہیں کہا کہ اپنے بزرگوں سے بے ادبی کیا کرو کہ یہ کوئی کرتا ہی نہیں ہے۔ دوسرا یہ ظلم ہے کہ ان کو ان کے مقام سے بڑھا کر آگے لے جائے' اونچا لے جائے۔ یہ ہے جسے مبالغہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے بڑی تاکید کی ہے کہ ایسا نہ کرو۔

## مذاہب عالم کی تاریخ میں مبالغہ آمیزی کے سلسلہ میں انبیائے کرامؑ اور دیگر ہستیوں کے متعلق عقائد کی شکل وصورت

اب آپ مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ ان کے ہاں جس قدر اعتقادات' تصورات' نظریات' کی خرابیاں نظر آئیں گی وہ مبالغے کی وجہ سے آئیں گی۔ کسی مذہب کے بانی کو لیجیے' ان کے متعلق ان کا جو عقیدہ ہوگا مثلاً ہندو دھرم میں انہوں نے اوتار بنا لیے۔ اوتار کے معنی ہوتے ہیں ''خدا ہی بشکل انسانی دنیا میں آ گیا''۔ وہاں سے انہوں نے آگے بڑھایا۔ عیسائیت میں آیئے تو انہوں نے ذاتِ مسیحؑ کو' حضرت مسیحؑ کو' تصلیب کی رو سے خدائی کا حصہ دار بنایا' خود خدا بنایا' خدا کا بیٹا بنایا' ان کے مقام سے آگے بڑھایا۔ مجوس میں زرتشتیوں کے ہاں بھی مترا کا یہی مقام انہوں نے رکھا۔ بدھ مت والے خدا کے تو قائل نہیں ہیں' بدھ کی پرستش کرتے ہیں' اسے

(انہوں نے متیا) معبود بنالیا۔

## معراجِ انسانیت کے مقامِ بلند پر سرفراز ہستی نبی اکرم ﷺ کے متعلق غلو اور مبالغہ آمیزی کے تصورات

دنیا کے ہر مذہب والے نے اپنے مذہب کے بانی یا اپنے بزرگوں کو' ہمیشہ ان کے مقام سے آگے بڑھایا اور اسی سے دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو ایک اور رسول بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ اس لیے تھا کہ انہوں نے اپنے مذہب کے بانی یا رسول کو اس کے اصل مقام سے آگے بڑھا دیا تھا' اس میں مبالغہ کیا تھا۔ اب آپ اپنے ہاں دیکھیے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے' ان مجالس میں جائیے' ان محافل میں جائیے' جہاں بڑے ہی احترام اور تقدس سے نبی اکرم ﷺ کا تذکارِ جلیلہ ہو رہا ہو اور وہاں دیکھیے آپ ﷺ کی شانِ اقدس میں کتنا غلو اور مبالغہ کیا جاتا ہے! رسول' شرفِ انسانیت کے معراجِ کمال پہ ہوتا ہے' اسے اگر اس مقام سے ذرا آگے بڑھایا جائے تو ظاہر ہے وہ الوہیت کے مقام پہ پہنچ جائے گا۔ انسان کے مقام سے اونچا کیا جائے تو اس سے آگے تو پھر خدا کا ہی مقام آتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں بھی حضور ﷺ کی شان میں' ان نعتوں میں' منقبتوں میں' ان کے ذکر میں' جہاں بھی اس شدتِ محبت سے' جس کا نام شدتِ محبت رکھا جاتا ہے' ذکر آئے گا' آپ ﷺ کو اس مقام سے آگے بڑھایا جائے گا تو اس کے بعد خدائی صفات کے اندر آپ ﷺ شامل ہو جائیں گے۔ یعنی رسول کو اصل مقام سے آگے بڑھانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کو خدائی صفات میں شامل کیا جائے اور کونسا مقام ہے جو اس سے آگے بڑھایا جائے گا۔ انسانیت کے کمالات میں تو اپنے انتہا پہ وہ پہلے ہی پہنچا ہوا ہوتا ہے' اسے جب اس کے اصلی مقام سے آگے پہنچائیں گے' آگے ذرا بھی بڑھائیں گے تو مقامِ الوہیت ہے' خدا ہی کا مقام ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اسے خدا کے مقام یا اس کی حدود میں آپ شامل کر دیتے ہیں۔ اسی کو تو شرک کہا جاتا ہے۔ سوءِ ادبی کے ایک لفظ کے اوپر اس طرح سے آتش بہ پیراہن ہونے والوں کے ہاں دیکھیے کہ اس قسم کی نعتیں' منقبتیں عام طور پہ پڑھی جائیں گی' آپ وجد میں آئیں گے' سر دھنیں گے' انگوٹھے چومیں گے' آنکھوں سے آنسو رواں ہوں گے' نہایت جذب و کیف کے عالم میں ان چیزوں کو کہیں گے بھی' سنیں گے بھی۔ کبھی ذہن میں نہیں آئے گا کہ اس کے متعلق تو قرآنِ حکیم نے اتنی شدت سے روکا ہوا ہے۔ آپ سنیں گے کہ بڑے فخر اور جوش سے کہا جائے گا کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا مدینے میں مصطفیٰ ﷺ ہو کر

(معاذ اللہ)

اور اس کے بعد جھومیں گے' صاحب! آپ اندازہ لگائیے کہ ذرا سا بھی آپ نے' اس مقام سے آگے بڑھایا تو وہ تو خدائی کے مقام پہ

پہنچے۔اور اس قسم کی نعتیں کوئی عامی شاعروں کی نہیں ہیں' یہ بڑے بڑے بزرگوں کے کلام ہیں۔اور پھر اس قسم کے تلازمے ❶ ہیں کہ

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں ع۔رب (عین رب) ہے

وہ ''عرب'' کو دیکھیے تو ''ع'' اور''رب'' بنتا ہے۔

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں ع۔رب (عین رب) ہے

اب آپ اس سے آگے اور کیا کہیں گے۔پھر اور آگے بڑھے' اگر کوئی چیز شاعروں کے ہتھے چڑھ جائے' پوچھو نہیں پھر کیا ہوتا ہے۔یہاں تو ''عرب'' تھا یعنی ''ع'' اور ''رب'' تھا' اُدھر ''احدِ خدا'' احمد نبی اکرم ﷺ میں حرف کے اعتبار سے ''م'' زائد ہے۔شاعروں کے نزدیک یہ جو حضور ﷺ جس پیکر میں یہاں ہیں' وہ خدا ہی ہے' بس ایک ''م'' کا پردہ ہے جو درمیان میں لٹک رہا ہے۔یہ ''م'' کا پردہ ہے جسے اٹھا دیا جائے تو ''احد'' میں اور ''احمد'' میں کوئی فرق نہیں رہتا ❷۔ہمارے ایک بہت بڑے جلیل القدر شاعر ❸ کہتے ہیں کہ

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ م کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر ❸

اس پر آوازیں اٹھتی ہیں کہ آہاہا! سبحان اللہ' سبحان اللہ! جھوم رہے ہیں' وجد میں آ رہے ہیں کہ کیا بات کہہ دی۔اگر کہا جائے' روکا جائے' ٹوکا جائے کہ یہ کیوں ہے تو سنیے! جواب کیا ملتا ہے۔کہا یہ جاتا ہے کہ

نجف میرا مدینہ ہے

یاد رہے یہ ''نجف'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقبرہ ہے۔ہاں تو کہا یہ جاتا ہے کہ

نجف میرا مدینہ ہے' مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں' امتِ شاہِ ولایت ❸ ہوں ❹

---

❶ مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال۔

❷ جب ''م'' کا پردہ پنجابی صوفیا کے ہاتھ میں آیا تو انہوں نے اسے نوچ کر الگ پھینک دیا۔بابا بلّھے شاہ (1758-1680ء) کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔
ارشاد ہے کہ احد' احمد وچ فرق نہ بلّھیا اک رتی بھر مروڑی دا
(احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔یہ جو تم فرق دیکھتے ہو' وہ ایک ذرا سی ''مروڑی'' (پیچ) ہے اور بس۔

❸ شاہِ ولایت حضرت علیؓ کا متصوفانہ لقب ہے

❹ یہ اشعار علامہ اقبالؒ کے ہیں جو انہوں نے کسی زمانے میں کہے تھے لیکن انہیں بعد میں اپنے مجموعۂ کلام سے حذف کر دیا تھا۔چونکہ انہوں نے انہیں خود ہی حذف کر دیا تھا اس لیے اب ہم انہیں بطورِ سند ان کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ان اشعار کے درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب کوئی شخص وحدت الوجود کا قائل ہو تو وہ ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق کس قسم کے عقائد رکھتا ہے (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992 (بلا ترمیم)' ص ص۔98-96)۔

یعنی رسول ﷺ کی امت نہیں ہوں' حضرت علیؓ کا امتی ہوں اور رسول کا بندہ ہوں۔ ''میں بندہ اور کا ہوں' امتِ شاہِ ولایت ہوں''۔ آگے کہا ہے کہ

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

مجھے معذور رکھ! میں مست صہبائے محبت ہوں

ان سے پوچھیے کہ جو باقی مذاہب والوں نے اپنے اپنے رسول کو خدا بنایا تھا' اوتار بنایا تھا' شانِ الوہیت کا پیکر بنایا تھا' ابن اللہ کہا تھا' تو کیا انہوں نے نفرت کی اور عداوت کی بنا پہ کہا تھا؟ وہ اگر کہیں گے کہ ''میں مستِ صہبائے محبت ہوں'' تو شرک ہے لاحول ولاقوۃ! کرشن کو اوتار مانتے ہیں' خدا مانتے ہیں' مسیح کو ابن اللہ مانتے ہیں اور ''جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو'' تو مجھے معذور رکھ۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں مستِ صہبائے محبت ہوں۔ اور کرشن کو جو اوتار کہنے والا تھا کیا وہ مستِ صہبائے محبت نہیں تھا؟ مسیحؑ کو خدا ماننے والے مستِ صہبائے محبت نہیں ہیں؟ ہاں! مجھے معذور رکھ! سنو! انہیں معذور نہ رکھو' انہیں تو مشرک کہو' کافر کہو' جہنم میں جانے والے کہو' اور مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں۔ کیا تضاد ہے!

## قرآنی تعلیم کے برعکس غلو کے متعلق ہماری تفاسیر کی نوعیت

عزیزانِ من! وہ شے کبھی کبھار آتی ہے' جسے میں نے حضور ﷺ کی شان میں سوءِ ادبی کہا ہے۔ اس سے تو اس قدر ہنگامے برپا ہو جاتے ہیں اور یہ چیزیں آپ کے ہاں ہر مقدس مجلس اور ہر مطہر محفل کے اندر روز ہوتی ہیں' بانگ دہل ہوتی ہیں' لاؤڈ اسپیکرز پر ہوتی ہیں' جھومتے ہیں' سر دھنتے ہیں۔ پوچھا جائے کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہتے ہیں کہ

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہ اس قرآنِ حکیم کو ماننے والے ہیں جس میں پڑھتے ہیں کہ **لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ** (4:171) کسی کو اس کے مقام سے آگے نہ بڑھاؤ' ہر ایک کو اس کے اپنے اپنے مقام پر رکھو' خدا کو خدا کے مقام پہ' اس کے رسول ﷺ کو اس کے مقام پہ' بزرگوں کو ان کے مقام پہ' اپنے اپنے مقام پہ رکھو' اس سے انہیں جھکاؤ نہیں کہ ان کی شان میں گستاخی ہو' بڑھاؤ نہیں کہ یہ غلو ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اپنے بزرگوں کی شان میں گستاخی کوئی نہیں کرتا' یہ غلو تھا اپنے اپنے رسول' نبی یا بزرگوں کی شان میں' جو ہر ایک کرتا تھا جس سے قرآنِ مجید نے اس طرح سے روکا کہ یہیں آ کر دین اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ غلو سے روکا گیا اور آپ حضور ﷺ کی سیرت کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے' تذکار کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے' یہ کثرت سے ملے گا۔

## قرآنِ حکیم کے نزدیک نبی اکرمﷺ کا مقام

قرآنِ حکیم بار بار خود نہیں کہتا بلکہ حضورﷺ کی زبانِ اقدس سے کہلواتا ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (41:6) ان سے کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ "اِنَّمَا" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہ کہ اس کے سوا کوئی حقیقت ہی نہیں جو میں کہہ رہا ہوں۔ بات صرف یہ ہے کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (41:6) او! میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں مگر يُوحَى اِلَيَّ (41:6) فرق صرف یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی ہوتی ہے، غیر از نبی پر وحی نہیں ہوتی۔ میں وحی وہاں سے لیتا ہوں اور اسے تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اب جب وحی مل گئی تو آگے اس باب میں سب مومن برابر ہو گئے، خدا کی طرف سے اس مقام میں برابر ہو گئے اس کے علاوہ جو حیثیت ہے وہ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی ہے۔ اگر کہا جائے کہ صاحب! یہ دیکھیے یہ کچھ قرآنِ مجید میں بار بار آیا ہے، تو کہتے ہیں کہ جی! یہ تو ذرا منکسر المزاجی ہے، جس کی وجہ سے یہ کہا گیا ہے! یہ بندۂ ناچیزﷺ طبعاً ایسا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم کہہ رہا ہے۔ کیا یہ کوئی شاعری ہو رہی ہے؟ کیا یہاں کوئی لکھنوی سلام ہو رہے ہیں؟ اور ایک دفعہ نہیں، قرآنِ کریم نے بار بار حضورﷺ کے متعلق کہا ہے کہ اعلان کر دو، ان سے کہہ دو اس لیے کہ خدائے علیم کو یہ معلوم تھا کہ اس کے نام لینے والوں نے بعد میں کیا کرنا ہے۔ اسی لیے اسے بہ تکرار دہرایا گیا اور اقراراً اعلان کرایا گیا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى اِلَيَّ (41:6) لیکن لاکھ چیزیں قرآنِ کریم میں آئیں، ہزار بار اس کی تاکید کیجیے، یہ کہنے والے اتنا کچھ بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا مدینے میں مصطفیٰﷺ ہوکر

(معاذ اللہ)

کہو تم ان کا کیا کر لو گے!؟

## وہ صفاتِ خداوندی جو انسان میں علیٰ حدِ بشریّت پیدا ہو سکتی ہیں

یہ غلو وہیں تک نہیں ہے کہ ذات رسالت مآبﷺ تک ہی ہو، خدا کی کسی صفت میں کسی کو شریک کرنا یعنی وہ چیز جو صرف خدا کے لیے ہے، اس میں کسی انسان کو شریک کرنا، یہ ہے جسے شرک کہا جاتا ہے۔ بعض صفاتِ خداوندی تو وہ ہیں جنہیں انسان، عبد، مومن، علیٰ

حدِّ بشریّت اپنے اندر منعکس کرسکتا ہے۔مثلاً خدا رحیم ہے' رؤف ہے' رزاق ہے' علیم ہے' خبیر ہے' یہ ایسی صفات ہیں کہ انسان بشریّت کی حد تک' اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔اور دین کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر پیدا کیا جائے۔یہی **صِبۡغَةَ اللّٰهِ** (2:138) ہے' جسے خدا کا رنگ کہا گیا ہے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ صفات بھی انسانیت کی حد کے اندر ہی پیدا کی جائیں گی۔خدا کی صفات لامنتہا ہیں' وہ Infinite (لامنتہا) ہے' انسان ہر چیز میں Finite (محدود) ہے' اس لیے حدّ بشریت کے اندر ان صفات کا انعکاس' اپنی ذات' پہ کیا جائے گا۔

## خدا تعالیٰ کی وہ صفات جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مختص ہیں

کچھ صفات وہ ہیں جو صرف خدا کی صفات ہیں' ان میں شریک ہی نہیں ہوا جاسکتا (مثلاً) قرآنِ حمید نے جب کہا ہے کہ **هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ** (57:3) تو اس میں تو کوئی شریک ہی نہیں ہوسکتا۔کچھ چیزیں ایسی ہیں جو صرف خدا کے لیے ہیں مثلاً **اَلۡحُكۡمُ لِلّٰهِ** (40:12) حکومت کا حق صرف خدا کو ہے' محکومیت صرف اس کی اختیار کی جاسکتی ہے۔حکومت کے معنی ہیں جسے Sovereignty اقتدارِ مطلق' آخری سند' آخری فیصلہ' آخری اتھارٹی کہتے ہیں۔خدا کی اتھارٹی کو جو نافذ کرنے والے ہیں' ان کو تو آپ عام اصطلاح میں حاکم یا حکومت کہہ سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو **بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ** (95:8) کہا ہے۔صرف اس اعتبار سے یہ حاکم ہوسکتے ہیں کہ یہ خدا کے فیصلوں کو نافذ کرنے والے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! فیصلے کا حق' آخری حجت' آخری سند' آخری اتھارٹی' کسی انسان کو حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے' اپنا قانون منوائے تو یہ شرک ہوجائے گا۔ خدا کی اس صفت میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہوسکتا۔

## کوئی رسول بھی اپنی طرف سے دین نہیں بناتا جبکہ تمام فقہی قوانین کسی نہ کسی انسان پر ختم ہوتے ہیں

عزیزانِ من! دین خدا کی طرف سے ملتا ہے' رسول دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے' دین بناتا نہیں ہے' دین رسول کا بنایا ہوا نہیں ہوتا۔خدا کی طرف سے جو دین دیا جاتا ہے' اسے وہ انسانوں تک پہنچاتا ہے۔قرآنِ حکیم بار بار رسول سے یہ کہتا ہے کہ تیرے ذمہ **الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ** (16:35) اس دین کا پہنچانا ہے۔دین صرف خدا دیتا ہے' کوئی دوسرا اس کے اندر شریک نہیں ہوسکتا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جب ہم حکمِ شریعت' احکامِ شریعت کہتے ہیں تو خدا تک تو ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچتا۔آپ دیکھیں گے کہ وہ بات کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے۔فقہ کی بات ہوگی تو کسی نہ کسی فقہ کے امام تک جائے گی کہ مثلاً فلاں امام کا یہ فتویٰ ہے' فلاں امام نے یہ حکم دیا ہے' یہ ان کا فیصلہ ہے' یہ ان کا مذہب ہے مثلاً مذہب ابوحنیفہ' فقہ حنفی۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ بات انسان تک جا کر رک گئی۔یہ لوگ اپنے آپ کو

جو حدیث کا پیروکار کہتے ہیں' وہ بھی دیکھیں گے کہ روایت تک آئیں گے کہ امام بخاریؒ نے یہ کہا ہے' مسلم نے یہ کہا ہے' وہاں بھی یہ چیز ہو جائے گی۔ خدا نے جو دین دیا ہے' اس نے جو شریعت دی ہے' وہ تو اس کتاب کے اندر ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ جو آپ کے ہاں مروجہ شریعت ہے' اس میں خدا کا نام نہیں آئے گا' کسی نہ کسی انسان تک جا کر بات رک جائے گی۔

## فقہی قوانین کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے وارننگ

اور اب اس بارے میں دیکھیے کہ جن کی طرف اتنے فخر سے یہ اپنی شریعت کی نسبت کرتے ہیں خدا انہیں کیا کہہ کر پکارتا ہے۔ کہتا ہے کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (42:21) کیا انہوں نے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں جو انہیں دین کی شریعت دیتے ہیں حالانکہ خدا نے اس کا کوئی حکم نہیں دیا تھا' کبھی اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ خدا نے اس کی اجازت ہی نہیں دی کہ کوئی انسان دوسرے انسان کے لیے دین کا راستہ تجویز کرے۔ الدین صرف خدا کی طرف سے ملتا تھا اور ختم نبوت ﷺ کے بعد وہ قرآنِ کریم کے اندر ہے' یہی خدا کا دیا ہوا دین ہے۔

قرآنِ حمید یہاں (42:21) میں شُرَكٰٓؤُا کہتا ہے کہ انہوں نے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں یعنی وہ لوگ جو ان کے لیے دین میں راستہ بتاتے ہیں' شریعت تجویز کرتے ہیں حالانکہ خدا نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی تھی۔ خدا نے رسول کے متعلق' جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (16:35) کہا ہے۔ یہ ہے فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (3:20) وہ دین کو پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد جو آپ کے ہاں نظام قائم ہوتا ہے' وہ خدا کے دیئے ہوئے دین کو نافذ کرتا ہے' دین بنانے کی اجازت کسی کو نہیں ہے' یہ شرک ہے۔ اگر کسی انسان کو بھی یہ مقام دیدیا جائے تو قرآنِ حمید کی رو سے شرک ہو جاتا ہے۔ یہاں تو کہا ہے کہ شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ (42:21) دوسرے مقام پہ اس کی اور وضاحت کر دی ہے جب کہا ہے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ (40:12) یہ اس لیے کہ جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے' بلایا جاتا ہے' کہا جاتا ہے کہ یہ دین جو خدا نے دیا ہے' اس کی طرف آ ؤ تو یہ اس سے کفر کرتے ہیں' اس سے انکار کرتے ہیں۔ آگے کہا ہے کہ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو شریک کر لیا جاتا ہے تو پھر یہ ایمان لاتے ہیں۔ اگر صرف خدا کے دین کی طرف دعوت دو تو وہ نہیں آتے' ساتھ اوروں کو شریک کر و تو آتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ شرک کیا ہے۔

اگلے الفاظ دیکھیے ان میں کیا ہے؟ وہی جو میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ جسے حکومت کہتے ہیں' جسے آخری فیصلہ دینا کہتے ہیں جسے Sovereignty کہتے ہیں' جسے کسی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہیں' قرآنِ کریم میں اسے ہی حکم کہا گیا ہے۔ اس میں کسی اور کو

شریک کرنا قرآنِ حمید نے شرک قرار دیا ہے۔ شرک کے لیے کہا ہے کہ وَاِنۡ یُّشۡـرَکۡ بِـہٖ تُـؤۡمِنُوۡا (42:12) اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرلیا جائے تو آگے کہا ہے کہ فَالۡـحُـکۡـمُ لِلّٰـهِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ (40:12) حکم تو صرف خدا کا ہے' وہی صاحب اقتدار ہے یعنی الۡـعَـلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ہے۔ کیا الفاظ ہیں! جسے اقتدار کہتے ہیں' وہ علی سے ہے' جسے بلندی و کبریائی حاصل ہے' جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے' جو آخری اتھارٹی اور سند اور حجت ہوسکتی ہے وہ اسے حاصل ہے۔ وہ صرف خدا کا حکم ہوسکتا ہے کسی اور کا حکم نہیں ہوسکتا۔ جس اصطلاح میں حکومت کہتے ہیں' وہ خدا کے حکم کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے' ایجنسی ہوتی ہے' خود نہیں حکم کرسکتی۔ یہ ہے الدین جو خدا نے دیا ہے لیکن آج آپ یہ بات کسی کو کہہ کر دیکھیے تو جواب ہوگا کہ یہ فلاں امام صاحب کا فیصلہ ہے' فلاں امام صاحب کا قول ہے' فلاں صاحب کا فتویٰ ہے' فلاں صاحب کی شریعت ہے' فلاں صاحب کا مذہب ہے' فلاں صاحب کی فقہ ہے۔ اور ان سے کہیے کہ صاحب! یہ تو شرک ہے' فیصلہ تو صرف خدا کا ہوگا۔ سنیے! اس کے بعد ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ آپ تو اس کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اگر تجربہ نہ ہو تو کسی سے کہہ کر دیکھ لیجیے لیکن ''اوکہن توں پہلاں ذرا ٹھاٹھا بن لینا۔ پتہ اے ٹھاٹھا کی ہونداا ے؟ ہُن تے ساڈے سرتے ٹوپی وی نئیں ہیگی' ٹھاٹھے دا تہانوں کی پتہ ہیگا؟ اوجنوں مڑا ساوی کیندے ہیگے''❶ پھر کسی سے بات کہنا۔ کہا ہے کہ وَاِذَا ذُکِـرَ الـلّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ (39:45) جب ان لوگوں کے سامنے جو واقعی آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' صرف اکیلے خدا کی بات کی جائے تو کیفیت یہ ہے کہ تلملا اٹھتے ہیں' اضطراب کا یہ عالم ہوتا ہے' سینہ بھنچ جاتا ہے' ماتھے پہ تیوریاں آجاتی ہیں' منہ بسور لیتے ہیں' ان کی بری حالت ہوجاتی ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے' تڑپتے ہیں' تلملاتے ہیں۔ یہ سارے معنی اِشۡـمَـاَزَّتۡ قُـلُوۡبُ الَّذِیۡنَ (39:45) میں آجاتے ہیں۔ یہ عجیب لفظ ہے' اسے (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1869-1797ء) نے طلسمِ پیچ و تاب کہا تھا:

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

وہ یہ مشکل جو ہوتی ہے' قرآنِ حکیم کا یہ لفظ ہے کہ اِشۡـمَـاَزَّتۡ قُـلُوۡبُ الَّذِیۡنَ (39:45) بھنچا ہوا' گھٹا ہوا' عجیب اضطراب کے عالم میں ہے۔

---

❶ مگر یہ کہنے سے پہلے ذرا ''ٹھاٹھا'' باندھ لینا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ''ٹھاٹھا'' کیا ہوتا ہے؟ اب تو ہمارے سر پہ ٹوپی بھی نہیں ہوتی۔ ''ٹھاٹھے'' کا آپ کو کیا معلوم ہوگا؟ یہ وہی ہے جسے ''مڑاسا'' بھی کہتے ہیں۔

## خدا کے علاوہ دوسروں کے ذکر سے ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے

جب صرف تنہا خدائے واحد کی بات کی جاتی ہے تو ان کی یہ کیفیتیں ہو جاتی ہیں۔کہا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) اور جب اس کے سوا باقیوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں' بڑے خوش ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ بات ہوئی ناں۔پھر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! اس کے دل میں بزرگوں کی بڑی عقیدت ہے۔اور جو پہلے والا ہے' اس کے خلاف یہ ہر محفل میں طعن ہوگا کہ جی' وہ خدا کے سوا کسی کو مانتا ہی نہیں ہے۔یہ بڑا جرم ہے صاحب۔یہ کیا ہے؟ یہ غلو ہے۔اسے ان کی شان میں گستاخی سمجھا جاتا ہے یعنی مبالغے سے انہیں جس اونچے مقام پہ بٹھا دیا ہے' آپ انہیں اگر اس سے نیچے اتار کر ان کے صحیح مقام پہ لاتے ہیں تو اسے گستاخی سمجھا جاتا ہے۔

## اگر کسی کو اس کے مقام سے اونچا لے جانا غلو ہے تو اس کو اس کے مقام سے نیچے لے جانا گستاخی ہے

قرآنِ مجید یہ کہتا کہ تم انہیں ان کے مقام سے کیوں اونچا لے جاتے ہو؟ انہیں اپنے مقام پہ رکھو' پھر جو اس مقام سے ان کو نیچے کوئی اتارے تو یہ ہے گستاخی لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ یہ خدا کے ماننے والے یہ توحید پرست' یہ اس چیز کے مدعی کہ ہم شرک نہیں کرتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ (12:106) ان میں سے اکثریت کو تم دیکھو گے ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ خدا پر تو ایمان رکھیں گے مگر اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) اس طرح کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ شرک بھی کرتے چلے جائیں گے۔

## شرک کے مفہوم کی دوٹوک وضاحت

عزیزانِ من! یہاں خدا کو نہ ماننے والوں کی بات نہیں آ رہی' یہاں Atheist (دہریہ) کا ذکر نہیں ہو رہا' یہاں ذکر ہو رہا ہے ایمان کے مدعیوں کا' اپنے آپ کو مومن کہنے والوں کا کہ خدا کو مانتے ہیں لیکن اس طرح سے مانتے ہیں کہ اس کے ساتھ شرک بھی کیے چلے جا رہے ہیں۔اب کسی مسلمان سے کہو تو وہ کہتا ہے کہ لاحول ولاقوۃ' شرک تو بتوں کے سامنے سجدہ کرنے کو کہتے ہیں۔بس شرک کی ایک ہی شکل انہوں نے اپنے سامنے رکھ لی ہے کہ بتوں کو سجدہ نہیں کرتے اس لیے ہم تو توحید پرست ہیں۔بھئی! اس سے پوچھو کہ وہ توحید کی Definition (تعریف) کیا دیتا ہے۔اس نے تو یہ کہا تھا کہ کسی بزرگ کو اپنے مقام سے اونچا لے جانا' اس کی شان میں غلو کرنا ہے' یہ شرک ہے' یہ کہنا کہ کوئی انسان تمہیں دین کی شریعت دے سکتا ہے یہ شرک ہے' یہ کہنا کہ خدا کے سوا کسی اور کا حکم ہے یہ شرک ہے۔یہی جو (12:106) میں' میں نے یہ بات آپ کے سامنے کہی' اسی سورۃ میں چند ہی آیات پیچھے' وہ وعظِ یوسفؑ یعنی حضرت یوسفؑ کا قید خانے کا وعظ ہے کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (12:40)۔کیا بات ہے

صاحب! یہ عجیب وعظ ہے! قید خانے کے اندر وعظ ہو رہا ہے کہ یہ جنہیں خدا کے سوا معبود بنایا جا رہا ہے' جن کی محکومیت اختیار کی جا رہی ہے' ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے ان کے کچھ نام رکھ لیے ہیں' ان کی حیثیت اور کچھ نہیں ہے۔ تھیٹر کے ڈرامے میں جسے آپ بادشاہ کہتے ہیں' وہ بادشاہ ہوتا نہیں ہے' اس کا نام بادشاہ رکھ لیا ہوتا ہے۔ کہتا ہے صرف نام تم نے رکھ لیا ہے۔ وہاں کوئی جلاد ہوتا ہے' کوئی بادشاہ ہوتا ہے' کوئی خاکروب ہوتا ہے' سب نام رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جسے آپ ادھر بادشاہ کہتے ہیں ''پردے پیچھے جاؤ جتیاں پین ڈیاں ہوندیاں نیں'' (پردے کے پیچھے جاؤ تو انہیں جوتیاں پڑ رہی ہوتی ہیں)۔ ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم نے صرف ان کے یہ نام رکھ لیے ہیں۔ ان نام رکھنے سے یہ' یہ نہیں ہو سکتے۔

## ہمارے ہاں شرک کے معاملے میں توحید کی عملی شکل

کہا ہے کہ مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ (12:40) خدا کی طرف سے تو اس کے لیے کوئی اتھارٹی نہیں نازل ہوئی۔ اور آگے بتایا ہے کہ توحید کسے کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے' کسی اور کو نہیں ہے۔ باقیوں کے متعلق جو کچھ تم کہتے ہو وہ صرف تم ان کا ایسا نام رکھ لیتے ہو' کسی اور کو ان کا اختیار نہیں ہے۔ قرآنِ مجید تو کہتا ہے کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) خدا کے سوا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اب خدا پرستوں کی حالت کیا ہے صاحب؟ بڑے دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ اقتدار اور طاقت کا حامل کوئی ڈکٹیٹر نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نہیں ہو سکتا۔ کون ہو سکتا ہے؟ یہ کہ امام اقتدار کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اللہ اکبر!!! وہاں تو ایک خدا تھا یہاں بارہ کروڑ خدا بن گئے۔ کوئی نہیں سوچتا' کوئی نہیں پوچھتا کہ کہہ کیا رہے ہیں اور اسی سانس میں یہ ہے کہ اسلامی حکومت بھی ہوگی ہمارا جو آئین ہے وہ کتاب وسنت پہ مبنی ہوگا' اس کے خلاف کوئی بات' کوئی قانون نہیں بنے گا۔ قانون تو کوئی نہیں بنے گا ہمیں اس کے لیے کھلی چھٹی ہے کہ ہم بارہ کروڑ خدا یہاں بنا لیں' اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ان الیکشنوں کے بعد یہ اس قدر گتھم گتھا ہو رہے ہیں' بہت سے نقاط آ رہے ہیں' بہت سی باتیں ہو رہی ہیں' تشریحات ہو رہی ہیں' یہ سارا کچھ ہو رہا ہے' اس میں خدا کا نام کہیں کبھی آتا ہی نہیں ہے۔

## خدا بطور ظھریہ کا مفہوم

الیکشن سے پہلے صاحب! سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے' اسلام اسلام' خدا اور رسول کہا جاتا تھا۔ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر خدا کو ظِهۡرِيًّا (11:92) بنا رکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا' میں نے سمجھایا تھا کہ یہ ظِهۡرِيًّا (11:92) کیا ہوتا ہے۔ عرب جب سفر میں جاتے تھے تو جتنے اونٹوں کی ضرورت ہوتی تھی فی الواقعہ اس سے زائد ایک دو اونٹ اور رکھ لیتے تھے کہ

راستے میں کوئی اونٹ بیمار پڑ جاتا ہے' کوئی حادثہ ہی ہو جاتا ہے' جب وہ اصلی نہ رہے تو اس کی جگہ جو اونٹ وہ زائد لے آتے تھے اور اس سے کام لیتے تھے' اسے ظِھْرِیًّا کہتے تھے کہ ایسے وقت میں کام آئے جب کوئی اور صورت باقی نہ رہے' جیسے آج کل آپ کے ہاں Extra کہتے ہیں' وہ کرکٹ کی ٹیم میں ساتھ لے جاتے ہیں اور فلموں میں تو Extra کا آپ کو پتہ ہی ہوگا وہ اسی کو ظِھْرِیًّا کہتے تھے۔ قرآنِ حمید کہتا ہے کہ انہوں نے اللہ میاں کو ایک Extra رکھا ہوا ہے' جہاں الیکشن میں باقی ساری چیزیں بیکار ہو جاتی ہیں' وہاں اسے سامنے لے آتے ہیں کہ اسلام کے نام پہ ہوگا۔ یہ کیفیت آپ کے ہاں کی ہو جاتی ہے کہ جب وہ ظِھْرِیًّا کا وقت ختم ہو گیا اور الیکشن کے بعد اپنی اصلیت پہ آئے اب اس Extra کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے ''او Extra ویسے رکھیا ہویا اے ایناں نے سانبھ کے کہ خبر اے کدوں لوہڑ پے جاوے' او ہوندا اے ناں کہ کھوٹا پیسہ وی کدی کم آ جاندا اے۔ اے ایناں دے کھوٹے پیسے نیں'' (وہ Extra انہوں نے ویسے ہی سنبھال رکھا ہوتا ہے' معلوم نہیں کہ کب اس کی ضرورت آ پڑے۔ وہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے۔ یہ ان کے کھوٹے سکے ہوتے ہیں)۔ اب جو اقتدارِ اعلیٰ ہے وہ ڈکٹیٹر کا نہیں' ہم نے سوچا تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ شاید اس کے بعد یہ آ جائیں مگر خدا کہاں ان کے مقدر میں ہے! اب جو اقتدار اعلیٰ ہے' وہ (ان کے قول کے مطابق) عوام کو حاصل ہے۔ یہ عوام کا اقتدار کیا ہوتا ہے؟ مگر شعر ہے فارسی کا' بات ہے بڑی مزے کی۔ کہا ہے کہ

حکایت قدِ آں یار دلنواز کنم

اس محبوب کے لمبے قد کا ذکر بار بار میں کرتا ہوں

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اصل میں اس بہانے سے' میں اپنی عمر بڑھاتا ہوں صاحب!

## مغربی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کے ہاتھوں عوام کی کسمپرسی کی عملی تفسیر

عزیزانِ من! یہ کہتے ہیں کہ عوام کا اقتدارِ اعلیٰ ہے' اس کا منطقی نتیجہ دیکھیے' جس کے پیچھے عوام کی زیادہ کثرت ہے' اقتدار اعلیٰ اس کا ہے۔ یہ جو Majority Party (اکثریت کی پارٹی) ہوتی ہے' وہ بارہ کروڑ سمٹ کر اس میں آ جاتے ہیں' کہیں ایک سو اسی میں ہے اور کہیں دو سو میں ہے جتنی بھی Majority Party (اکثریت کی پارٹی) ہے' اقتدار ان کا ہے صاحب! ان کا اقتدار سمٹ کر پھر ان کے لیڈر میں آ جاتا ہے ''آخر اچ آ کے او بھیڑ جیہڑا اے او بھیڈ واں رہ جاندا اے''۔ ان میں سمٹ سمٹا کر آخر میں یہی تگ و تاز ہے کہ ایک رہ جائے' وہ ڈکٹیٹر تو جائے جہنم میں' ڈکٹیٹر شپ نہیں چلے گی' جناب! ''تے آ کی ہون ڈیا اے'' (یہ کیا ہو رہا ہے)۔ عزیزانِ

من! آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کس قدر بچپن میں ہے' کیا کھیل کھیل رہا ہے۔یہی کہ یہ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ (12:40) ہیں' یہ صرف Terminology (اصطلاح) کا فرق ہے' صرف اسمآء کا فرق ہے' تم نام دوسرے رکھ لیتے ہو حقیقت وہی رہتی ہے۔ اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگر چہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات ومنات
(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

## انسان کی انسان پر حکومت کا نتیجہ: ہر سُو درندگی

عزیزانِ من! یہ وہی ڈکٹیٹر شپ ہے' انسان کا دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا وہی جذبہ بےنقاب ہو جائے تو ہلاکو اور چنگیز ہے' نقاب پوش آ جائے تو جمہوریت میں اکثریت کا لیڈر ہے' بات وہی انسان کی انسان کے اوپر حکومت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ شیر انسان کو اس لیے کاٹتا ہے کہ اس کے خون میں نمکینی ہوتی ہے' بڑی لذت ہوتی ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کہ شیر اس لیے اس کو کاٹتا ہے کہ اس کے خون میں لذت ہوتی ہے' انسان تو انسان کا خون اسی لیے پیتا ہے کہ کسی اور شکار میں اسے اتنی لذت نہیں مل رہی جتنی اس میں ملتی ہے۔اور ساری انسانیت کی تاریخ اسی خون آشامی اور درندگی کی تاریخ ہے بجز ان چند لمحات کے جہاں فی الواقعہ خدا کا حکم نافذ کرنے والے اس دنیا میں آئے۔جس حکم نافذ کرنے والے نے یہ کہہ دیا کہ میں بھی ڈرتا ہوں کہ اگر خدا کے حکم کی نافرمانی کرونگا تو مجھ پہ بھی عذاب آ جائے گا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

## حصولِ پاکستان کا مقصد قائداعظمؒ کے الفاظ میں

عزیزانِ من! ان کے اسماء جتنے جی چاہے بدل لیجیے۔نام کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔آپ نے دیکھا ہے کہ یہ بدقسمت ملک (پاکستان) کس مصیبت میں گرفتار ہے۔اور اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کہ آپ نے حق حکومت انسانوں کو دے رکھا ہے۔جس بنیاد پر آپ نے یہ مملکت حاصل کی تھی کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہوگا' اس مملکت کے حصول کے لیے کوشش کرنے والے قائداعظمؒ محمد علی جناح (1948-1876ء) نے کہا تھا۔''زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا!''۔اگر وہ پرچہ طلوع اسلام (مارچ 1971ء) کا آ گیا ہے تو اس کے ٹائٹل پہ آپ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ارشادات دیکھیے۔عزیزانِ من! فقط دو فقرے ہیں' ان کے اندر دین کا نچوڑ آ گیا ہے' جو اِن سے پوچھا گیا ہے۔ یہ حیدر آباد دکن میں' 1941ء کی بات ہے۔ پوچھا یہ گیا کہ جسے آپ اسلامی

مملکت کہتے ہیں اس میں اور دوسری حکومتوں میں فرق کیا ہوگا۔ دیکھیے وہاں جو چار الفاظ انہوں نے کہہ دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت' خدا کے احکام کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے' بس اس سے زیادہ اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

## قرآن فہمی کے سلسلہ میں قائداعظمؒ سے علامہ پرویزؒ کی رفاقت

حیرت ہے کہ دین کی اتنی گہری لم اس فرنگی مآب داڑھی منڈھے مسٹر ❶ کے پاس کہاں سے آ گئی۔ عزیزانِ من! یہ باتیں قرآنِ حمید سے آئی تھیں۔ میں یہ باتیں کہا نہیں کرتا کیونکہ اس میں' میں آ جاتی ہے لیکن یہ امر مجبوری کہنی پڑتی ہیں۔ مجھے دس برس تک ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل تھی' خالص قرآنِ مجید سے انہوں نے دین کو سمجھا تھا۔ اور یہی وہ شخص کہہ سکتا تھا' جس کے سامنے قرآنِ حمید ہوتا کہ اسلامی مملکت کا امتیاز صرف یہ ہے کہ اس میں اس کی حیثیت خدا کے احکام کو نافذ کرنے کی ہوتی ہے جو قرآنِ حکیم میں آ چکے ہیں۔ وہ شخص Abstract Talk (غیر محسوس گفتگو) نہیں کیا کرتا تھا' اسے پتہ تھا کہ حکومت خداوندی کہہ کر' پھر وہ اپنی ڈکٹیٹر شپ ہوگی' جو تھیوکریسی کی شان میں منائی جائے گی۔ اس نے کہا تھا کہ تھیوکریسی ہمارے ہاں نہیں ہوگی' اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حکومت ہوگی اور حکومت صرف خدا کے احکام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ اللہ اکبر! اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:40) یہ ہے اصلِ دین۔

## قرآنِ حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو انسان کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دو

عزیزانِ من! ہماری نگاہیں صرف مذہب کے دائرے تک ہی محدود رہیں' جنہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ صاحب! کسی کو بھی اپنے مقام سے آگے نہ بڑھنے دو' کسی نے کہا کہ اپنے فقیہہ کو نہ بڑھنے دو' یہ بھی کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی شان سے بھی مبالغہ نہ کرو' کسی نے بزرگوں کے متعلق کہا کہ یہ نہ کرو۔ ٹھیک ہے' وہ سب ٹھیک ہے لیکن یہ ہے وہ مقام' جہاں قرآنِ مجید کہتا ہے کہ تمہاری نگاہ وہاں نہیں جائے گی کہ حق حکومت میں بھی انسان کو اس کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دو' کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اب کسی رنگ میں انسان کو تم لے جاؤ گے' شریعت کے احکام میں ہوگا خواہ وہ فقیہہ ہونگے یا راوی ہونگے' طریقت کے دائرے میں ہوگا تو آپ کے اولیاء اللہ ہونگے یا مرشدان کامل ہونگے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں تک تو تمہاری نگاہیں جائیں گی لیکن یہ چیز کہ حکومت میں کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو' خواہ اسے پارلیمنٹ کہیں' خواہ اسے جمہوریت کہیں' خواہ اسے اکثریت کی پارٹی کہیں' کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:40) ہے۔ یہ ہے جس چیز کو کہا ہے

---

❶ بابا جی (جی۔اے۔پرویزؒ) کا یہ اشارہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی طرف ہے۔

کہ **ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ** (98:5) یہ ہے دینِ قیم۔کہا ہے کہ **وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ** (7:187) مصیبت یہی ہے اکثریت لوگوں کی ہے جو اس بات کو نہیں سمجھتی۔عزیزانِ من! قرآنِ مجید نے کہا تھا **لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ** (4:171) دین میں مبالغہ مت کرو' غلو مت کرو' حدِ اعتدال سے تجاوز مت کرو' کسی کو اس کے مقام سے نہ بڑھاؤ۔اور یہ تو کسی انسان کو اس مقام سے آگے بڑھانے والی بات ہے۔قرآنِ حمید میں تو ذرا گہرائی سے سوچا جائے تو وہ بات کو بہت آگے لے جاتا ہے۔

## خدا کی صفت رحمانیت کے سلسلہ میں عیسائیت کی بنیادی غلطی کی وضاحت

عزیزانِ من! میں نے اس سے پہلے ابھی جو آیاتِ خداوندی پیش کیں' ان تک تو نگاہیں عام طور پر پہنچ سکتی ہیں لیکن آپ یہ دیکھیے کہ قرآنِ حکیم کہاں تک انسان کو لے جاتا ہے۔عیسائیت کی بنیادی غلطی کیا ہے؟ یہ کہ God is Mercy (خدا رحم ہے) ' ان کے ہاں رحم کا تصور ہے۔قرآنِ مجید میں خدا کو رحیم کہا گیا ہے' پھر قرآنِ کریم ان کی اتنی تردید کیوں کرتا ہے؟ اس میں کیا جرم ہے؟ یہ کہ God is Mercy' خدا کی یہی صفت نہیں ہے' خدا عادل بھی ہے' عدل بھی کرتا ہے' خدا رحیم بھی ہے۔

## خدا کی صفت رحیم کے ساتھ عادل کی صفت: کیا یہ تضاد نہیں ہے؟

یہاں تک پہنچا ہوں تو پھر ایک کھٹک پیدا ہوگئی کہ عدل اور رحم تو بظاہر متضاد چیزیں ہیں' یہ دونوں اکٹھی کیسے ہونگی۔بڑا اہم سوال ہے اور یہ اس لیے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے رحیم یا رحمت کا لفظ استعمال کیا ہے' اس کا قرآنی مفہوم ہمارے سامنے نہیں ہوتا' ہمارے سامنے وہی عیسائیت والا Mercy (رحم) ہوتا ہے۔اور ہم بھی جب یہاں کہتے ہیں کہ جسے پھانسی کی سزا مل جائے' وہ رحم کی درخواست کرتا ہے' Petition for Mercy کرتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ عدل کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس کو جرم قتل کی سزا موت ملے' وہ عدل کے اس فیصلے کے خلاف Petition (اپیل) نہیں ہوتی' وہ تو ہوتی ہے کہ سیشن جج کے فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل' ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل۔یہ عدل کے متعلق ہوتا ہے کہ اس کورٹ نے عدل نہیں کیا' میں تم سے عدل چاہتا ہوں۔یہاں تک عدل ہوتا ہے' اس کے آخر میں جا کر جب عدل کی آخری حد ختم ہو جاتی ہے تو وہاں پھر Mercy (رحم) کی Petition (اپیل) آتی ہے۔آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہاں بھی Mercy (رحم) کا جو لفظ ہے یا جو تصور ہے' وہ عدل کے نقیض جاتا ہے کہ عدل کے خلاف ایک چیز ہوتی ہے۔اگر خدا بیک وقت عادل بھی ہے اور وہ رحیم بھی ہے تو پھر یہ کیا بات ہوگئی۔یہاں جسے آپ رحم کی Power (قوت) کہیں گے' سپریم کورٹ کو بھی نہیں دی گئی' وہ صرف عدل تک ہے۔ Mercy (رحم) کی Power (قوت) صدر کو دی جاتی ہے' صدر کو عدل کی پاور نہیں دی جاتی۔گویا یہ الگ الگ Powers (اقتدارات) ہیں۔یہاں خدا ہی کے

متعلق کہتے ہیں کہ وہ رحیم بھی ہے اور عادل بھی ہے اس لیے کہ رحمت کا یا رحم کا تصور ہمارے ہاں قرآنی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! رحم کا تصور قرآنِ مجید نے یہ بتایا ہے کہ آگ میں انگلی ڈالیے تو وہ جل جاتی ہے' اس سے بڑی سخت تکلیف ہوتی ہے' یہ عدل ہے' ایک قانون ہے' قانون کی خلاف ورزی کی' اس کی سزا مل گئی' یہ عدل ہے' اس حد تک خدا عادل بھی ہے لیکن جس خدا نے آگ میں یہ چیز رکھی تھی کہ اس میں انگلی ڈالو تو جلا دیتی ہے اور جلنے سے آپ کو سوزش یا تکلیف ہوتی ہے' اسی خدا نے اس قسم کی دوائیاں بھی ساتھ بنا کر بھیج دی تھیں کہ جو جل جائے اگر وہ اس دوائی کا استعمال کر لے تو پھر جلن ہٹ جاتی ہے۔ اپنی غلطی سے اپنا نقصان کرنا' اس نقصان کی تلافی کے سامان اور ہدایات مہیا کرنا' یہ خدا کا رحم ہے' اس کو رحمت کہتے ہیں۔ اس کے قانون کی خلاف ورزی کرو گے تو عدل ہوگا' اس کے بعد جو اس نے مرہم مہیا کر رکھی ہے ان کی طرف آ جاؤ گے تو یہ رحم ہوگا' اسے توبہ کہتے ہیں۔ خدا نے رحمت کا لفظ وہاں استعمال کیا ہے۔

## خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا حقیقی مفہوم

جب کبھی اس بات پر آؤں گا تو میں عرض کرونگا' یہ جسے کہتے ہیں کہ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ (39:53) اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے' اس کے معنی ہمارے ہاں یہی ہیں کہ ٹھیک ہے' جو جی میں آئے گناہ کرتے جائیے' جرم کرتے چلے جائیے' اس کے بعد اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ رَبِّیۡ ایک تسبیح پڑھ لیجیے اور اس کے بعد یہ ہے کہ صاحب! خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو' وہ بخش دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے' یہ غلط ہے۔ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ کسی دوراہے پر تمہارا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا ہے' چلے گئے ہو' تھوڑی دور جانے کے بعد محسوس ہوا کہ اوہو! یہ تو غلط راستہ ہے' ادھر مجھے نہیں آنا چاہیے' وہاں سے واپس لوٹو' پھر اسی دوراہے پہ پہنچو' اسے تاب کہتے ہیں' پچھلے پاؤں وہیں آ جانا جہاں سے غلط سمت کی طرف قدم اٹھ گیا تھا۔ آگے اس کے ہے کہ مَنۡ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا (25:71) پھر صحیح راستے کی طرف چلو تو یہ جو غلط کی طرف چلنے کی وجہ سے تمہیں نقصان ہونے والا تھا' اس کی تلافی یوں ہو جائے گی۔ اسے خدا نے اپنی رحمت کہا ہے' بازآفرینی کی گنجائش رکھنا کہا ہے' نقصان کی تلافی کا امکان ہونا کہا ہے' اس کی گنجائش رکھنا کہا ہے۔

## یہودی شریعت اور ہندو دھرم میں تلافی کا تصور مفقود ہے

یہودی شریعت میں یہ بات نہیں ہے۔ وہاں توبہ نہیں ہے۔ جو کسی سے لغزش سرزد ہو گئی اس کی سزا مل کر رہے گی۔ ہندو دھرم کے اندر بھی یہ بات نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ پچھلے جنم کے کرموں سے جو حالت انسان کی اس جنم میں ہو گئی ہے' اسے بدلا نہیں جا سکتا' اب جو اگلے جنم میں جا کر اچھے کام کرو گے' اس کا بدلا ملے گا۔ قرآنِ حمید نے آ کر یہ کہا کہ نہیں! غلط قدم اٹھتا ہے' اس سے نقصان ہوتا ہے تو

اس کے بعد تلافی کا امکان ہم نے رکھ دیا ہے' تلافی کا جو امکان ہے اسے خدا نے رحمت کہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سے عدل اور رحمت دونوں بیک جگہ کیسے آتے ہیں۔ یہودیت کے اندر عدل ہے اور ہندو دھرم کے اندر بھی صرف عدل ہے' وہ بھی ایک طرف نکل گئے' انسان کے لیے گنجائش ہی نہیں رہی۔ آپ دیکھیے کتنی مایوسی ہے انسان کے لیے' ایک جرم ہو جائے اور اس کی تلافی کے لیے امکان ہی نہ ہو۔ یہ ہے مایوسی۔ عیسائیت آئی وہ دوسری طرف نکل گئی۔ اس نے کہا کہ خدا کے ہاں عدل نہیں ہے' صرف رحم ہے' God is Mercy. انہیں یہ کیوں کہنا پڑا؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

## عدل اور رحم کے سلسلہ میں عیسائیت کے غلط عقیدے کی وضاحت

پہلے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پہ لادے دنیا میں آتا ہے۔ (بابا) آدم اور (اماں) حوّا نے' جو وہ کہتے ہیں کہ گناہ کیا تھا اور یہ گناہ کی آلائش انسان اپنے اعمال سے کسی طرح سے دھو ہی نہیں سکتا۔ چل بھئی! جو گناہ ہی اپنا کیا ہوا نہیں ہے' وہ پیدائش میں ساتھ لاتا ہے' دھو سکتا نہیں ہے' اس کو ساری عمر بھی دھوتا رہے تو یہ نہیں دھلتا۔ یہ عقیدہ پیدا کیا اور اس کے بعد پھنس گئے کہ یہ کیا ہوا' یہ تو سارے ہی گنہگار ہو گئے۔ پھر کیا ہوا؟ پھر انہوں نے کہا کہ جب خدا نے انسانوں کی یہ حالت دیکھی' یعنی خود ہی پہلے ان کی یہ حالت کی لیکن جب اس کو دیکھا' تو پھر خدا تو اس پہ بڑا اکسمسایا کہ ہیں! یہ کیا ہو گیا ''جنت تے خالی دی خالی رہ جائے گی۔ تے اے کینوں کرائے تے دیاں گا' سوچ ریا سی بیٹھا ہویا (معاذ اللہ نقل کفر کفر نہ باشد) تے پتر نے پچھایا ابا جی! گل کی اے آج تسی بڑے غمگین بیٹھے او؟ کہن لگا: بچہ! کی دساں' گل تے نہ تیرے وس دی اے' نہ میرے وس دی اے' آ ہو گیا جے تے آ بنا بیٹھا واں پورا گلبرگ جنت''❶ وہ جنت جس کی وسعت ارض وسما پہ بیٹھی ہوئی ہے اور اس میں جانے کے لیے اب ایک بھی آدمی نہیں رہتا' کیا کیا جائے؟ بیٹا تھا بڑا فرماں بردار' اس سے باپ کی یہ حالت دیکھی نہ گئی' اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں ابا جان! غلطی بہت بڑی ہے' اس کا کفارہ بہت بڑا دینا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا ایک ہی بیٹا ہے' ایک بیٹے کو اس طرح سے قربان کرنا بڑا دکھ ہوگا لیکن آپ کو کرنا ہی پڑے گا' غلطی بھی تو کوئی چھوٹی نہیں ہے۔ کہنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ کہنے لگے: مجھے دنیا میں بھیج دیجیے' میں صلیب پہ اپنی جان دیدوں گا' میرا جو خوں بہا ہے اس کے صدقے میں آپ انسانوں کو بخش دیجیے۔ خدا کو انسانوں کی حالت پہ رحم

---

❶ جنت تو خالی کی خالی رہ جائے گی' یہ میں کسے کرائے پہ دوں گا۔ یہ سوچ ہی رہا تھا بیٹھا ہوا (معاذ اللہ نقل کفر کفر نہ باشد) اس پر بیٹے نے پچھوایا کہ ابا جان! کیا بات ہے' آج آپ اس قدر غمگین بیٹھے ہیں؟ کہنے لگا کہ اے میرے لختِ جگر! کیا بتاؤں! بات تو اب نہ تمہارے اختیار کی ہے اور نہ ہی میرے اختیار کی۔ یہ ہو گیا ہے اور اِدھر دیکھو! یہ پورا گلبرگ جنت بنا بیٹھا ہوں۔ (اب کیا کروں؟)

آیا۔ یہ ہیں انجیل کے الفاظ۔ اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیجا کہ وہ اپنا خون دے اور وہ اس خوں بہا میں انسانوں کو اس طرح سے بخش دے۔ God is Mercy (خدا رحم ہے) ' یہاں عدل نہیں ہے۔ یہاں صرف Mercy (رحم) ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا ہوا؟ خدا کی عدل کی صفت تھی۔ وہ افراط میں کچھ اس طرف نکل گئے' دوسروں نے محسوس کیا کہ یہ تو غلط روش ہے' چناں چہ دوسری طرف رحم کی صفت تھی' کچھ اس طرف نکل گئے۔

## خدا کی صفات الحسنیٰ کا قرآنی مفہوم: توازن کو برقرار رکھنا ہے

اب اس پس منظر میں اس آیت کو لیجیے۔ کہا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (7:180) جو صفات خداوندی ہیں' یاد رکھیے! وہ الْحُسْنٰى ہیں۔ حسن کہتے ہیں ''جس میں پورا پورا توازن ہو''۔ اس کی صفات کے اندر پورا پورا توازن رکھو' کوئی بھی صفت اپنے مقام سے گھٹ گئی یا ذرا بڑھ گئی تو حسن باقی نہیں رہے گا۔ کسی حسین ترین چہرے میں کبھی کسی ایک چیز کو ذرا سا بڑھا دیجیے' پھر کسی تصویر میں الْحُسْنٰى نہیں رہتا۔ کہا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (7:180) اسمآء ہیں اور ان کے اندر ٹھیک ٹھیک توازن ہے۔ فَادْعُوْهُ بِهَا (7:180) اس طرح سے اس کو پکارو' صفات میں ٹھیک توازن رکھتے ہوئے عدل اپنے مقام پر' رحم اپنے پر رکھو۔ اور سنیے! وَذَرُوا الَّذِيْنَ (7:180) ان لوگوں سے قطع تعلق کر لو' ان کو چھوڑ دو جو يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (7:180) اس کی صفات میں سے کسی ایک صفت کو لے کر ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ یہ يُلْحِدُوْنَ کا لفظ تو ہمارے ہاں ہے۔ اس سے الحاد کا لفظ بنا لیا۔ اب یہ الحاد بے دینی ہے۔ یہ قبر میں پہلے ایک طرف کو لحد بنائی جاتی تھی' اب تو سیدھا ہی گڑھا کھود دیتے ہیں' وہ پہلے قبری بنائی جاتی تھیں اور یوں گڑھا کھودتے تھے اور اس کے طرف بطن میں' پیٹ میں ایک جانب کو ایک اور گڑھا کھودتے تھے' اسے لحد کہتے تھے اس لیے کہ وہ ایک طرف کو نکلا ہوا ہوتا تھا۔

## خداوندی صفات میں توازن کو پیشِ نظر رکھنے کا نتیجہ

عربی زبان میں لحد یا الحاد کہتے ہیں ''کسی شے میں ایک طرف نکل جانا''۔ کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ تم یہی نہیں کہ یہ نہ کرو بلکہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھو جو خدا کے اسمآء میں سے' اس کی صفات میں سے' کوئی ایک صفت لے کر اس میں افراط برت لیتے ہیں' تفریط میں چلے جاتے ہیں' کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو۔ عزیزانِ من! آپ نے کیا کیا؟ خدا کے متعلق جس سے سنیے! وہ کہتا ہے کہ صاحب! بڑا بخشنہار ہے' بڑا غفور و رحیم ہے جی' بس اتنی صفت ہمیں خدا کی معلوم ہے۔ اس کا قانون' اس کا عدل' اس کی صفات یہ کہتے ہیں کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12) خدا کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے' وہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

(2:202) ہے' کسی کے ذہن میں خدا کی یہ صفت نہیں ہوتی۔ بس صرف یہی صفات سامنے ہوتی ہیں کہ وہ بڑا غفور رحیم ہے' صاحب! بخشنہار ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہی جو عیسائیوں کے ہاں تھی' وہی صفتِ خدا ہمارے ہاں آ گئی ہے۔ اس نے یہاں کہا تھا کہ **سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (7:180) یاد رکھو! جو کچھ کوئی کرے گا اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

## دین میں مبالغہ کرنے کی صورت میں صراطِ مستقیم نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ حکیم نے جو کہا ہے کہ **لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ** (4:171) دین کے معاملے میں مبالغہ نہ کرو تو مبالغے میں یہی نہیں ہے کہ ہم نے اس کے رسول ﷺ کو' علما کو' آئمہ کو' بزرگوں کو' حکام کو' اپنے اپنے مقام پہ نہیں رہنے دیا' انہیں ان کے مقام سے آگے لے گئے۔ یہی نہیں کیا بلکہ خود خدا کے متعلق بھی ہم نے یہ کیا کہ اس کی کوئی ایک صفت جو ہمیں Suit (مطمئن) کرتی تھی اس میں ہم نے مبالغہ شروع کر دیا۔ یہ بھی غلو ہے۔ اسے اس نے الحاد کہا ہے۔ کیا بات ہے قرآنِ کریم کی! غلو کی بات تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ لاانتہا ہے جو Infinite (لامحدود) ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ حد سے آگے بات چلی گئی' یہ نہیں کہا۔ بلکہ یہ کہ اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اس سے لے کر بجائے اس کے کہ صراطِ مستقیم پہ جاؤ' ایک طرف کو چل پڑتے ہو۔ اس لیے کہا ہے کہ اسمائے خداوندی میں الحاد نہ کرو۔

## خدا کی ذات اور معاشرتی اور تمدنی زندگی میں ہر فرد کو اس کے مقام پر رکھنا نہایت ضروری ہے

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے' مفہوم کے اعتبار سے یہ بھی دین میں غلو ہے۔ کہا ہے کہ یہ نہ کرو۔ صفاتِ خداوندی کو بھی اپنے اپنے مقام پہ' اس Proportion (تناسب) کے ساتھ رکھو جہاں اس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ اس کے بعد جتنے اور انسان ہیں' رسول سے لے کر نیچے تک' ہر ایک کو اس کے اپنے اپنے مقام پہ رکھو۔ تم ان کو نیچے نہیں اتارو گے۔ ہمیں پتہ ہے یہ سوءِ ادبی ہوتی ہے' اگر کوئی بھی یہ کرے گا تو اس پہ تم بھڑک اٹھو گے' اب یہ ہے کہ تم ان کو ان کے مقامات سے بڑھاؤ گے غلو کرو گے' اس میں یہ نہ کرنا۔ بات اس نے عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہی تھی مگر تعلیم ہے ہمارے لیے۔ ہم نے بھی تو کچھ کم نہیں کیا ہے۔

عزیزانِ من! آپ نے سوچا کہ یہ جو ہماری تباہیاں آئی ہوئی ہیں' یہ اس لیے نہیں ہیں کہ ہم نے ان بزرگوں کو ان کے مقام سے نیچے گرا دیا ہے' ہم نے انہیں ان کے مقام سے آگے بڑھا رکھا ہے۔ اور اسی سے قرآنِ مجید نے کہا تھا کہ محتاط رہنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے' دین اپنے مقام پہ نہیں رہے گا۔ **لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ** (4:171) خود تم یہ مبالغہ کرتے ہو' یہ نہ کرو۔ **وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ** (4:171) اور خدا کے خلاف جو صرف الحق ہے' صرف وہ کہو' اس کے سوا کچھ اور مت کہو' ہر ایک کو اپنے مقام پہ رکھو' یہ الحق ہے۔ اور

انہیں پھر یہ کہا کہ تم یہ کیا کرتے ہو؟ اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ۚ اَلۡقٰہَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡہُ (4:171) یاد رکھو! حضرت عیسٰیؑ جنہیں تم نے خدا بنا دیا' تثلیث کے اندر لائے' تو وہ خدا باپ بیٹا روح القدس' تین میں ایک' ایک میں تین بنایا۔ بہر حال مجھے ضرورت نہیں کہ اس گتھی کو سلجھاؤں۔ یہ ان کے اپنے ہاں نہیں سلجھتی۔ یہ نہ کہو' الوہیت کا مقام نہ دو' ابن اللہ نہ کہو' خدا کے ہاں نہ کوئی بیٹا ہو سکتا ہے نہ اس کی الوہیت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے' ایسا نہ کرو۔ یہ غلو ہے' دین کے اندر مبالغہ ہے' آگے بڑھانے والی بات ہے۔ یہ جو وہاں حضرت عیسٰیؑ کے متعلق کَلِمَتُہٗ رُوۡحٌ مِّنۡہُ (4:171) الفاظ آئے ہیں یہاں مجھے ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ سورۃ الِ عمران میں پیدائش حضرت مسیحؑ کے متعلق میں تین چار درسوں میں تشریح کر چکا ہوں' ہر مقام پہ اگر میں یہ شروع کرونگا تو پھر موضوع دوسرا آ جائے گا تو اصل موضوع ذہن سے اوجھل ہو جائے گا' اس لیے یہ تو وہاں تفسیر وتشریح میں آ چکا ہے اور آپ نے دیکھنی ہو تو ''مفہوم القرآن'' میں دیکھیے یا میری کتاب ''شعلۂ مستور'' میں دیکھیے۔ مجھے آگے بڑھ جانا چاہیے کیونکہ یہ چیزیں پہلے آ چکی ہیں۔

## جب کوئی انسان کسی کے متعلق غلو سے کام لیتا ہے تو وہ دراصل اپنے مقام سے خود نیچے آ جاتا ہے

کہا ہے کہ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَۃٌ (4:171) تثلیث کی بات نہ کرو' ایک میں تین' تین میں ایک نہ کرو۔ اِنۡتَہُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ (4:171) اس سے باز آ جاؤ' یہ تمہارے لیے بھی بہتر ہے۔ کیا بات کہہ دی! کسی انسان کو اس کے اپنے مقام سے آگے بڑھانے سے اتنا ہی تم مقام انسانیت سے نیچے آ جاتے ہو۔ انسانیت کا مقام متعین ہو' تو اس سے تو ماپ سکتے ہو کہ تم خود کہاں ہو۔ اور اسے جو تم آگے لے جاؤ تو آپ آج دیکھتے ہیں کہ جتنے حضرت صاحب ہیں' ان کی درگاہوں میں جا کر آپ کانپتے۔ گڑگڑاتے کیوں ہیں' ان کی قبروں پہ جا جا کر آپ لرزتے ہیں' ڈرتے ہیں۔ کیا ہوا؟ یہ کہ انہیں ان کے مقام سے آگے بڑھایا' خود اپنے مقام سے نیچے گر گئے۔ کہا ہے کہ اِنۡتَہُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ (4:171) چھوڑ دو یہ مبالغہ' تمہارے اپنے لیے یہ بہتر ہوگا۔ ان کو بڑھانے سے تم نے اپنے ذہن اور عقیدے میں ان کو بڑھا دیا' وہ ویسے فی الحقیقت تو نہیں بڑھ گئے' وہ تو اپنے مقام پہ ہی رہے' تم اپنے مقام سے نیچے گر گئے۔

## عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسٰیؑ کے متعلق خدا کا بیٹا ہونے کا تصور

عزیزانِ من! اس قرآنِ کریم کے متعلق میں کیا عرض کروں! خَیۡرًا لَّکُمۡ نے یہاں کیا بات کہہ دی ہے!۔ دونوں چیزوں کی نفی کر دی۔ کہا ہے کہ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (4:171) پہلی چیز تو تثلیث کے خلاف یاد رکھو! الہ واحد صرف خدا ہے' اس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا' تثلیث غلط ہے۔ کہا ہے کہ سُبۡحٰنَہٗۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہٗ وَلَدٌ (4:171) ابنیت جو تم کہتے ہو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے' خدا

اس سے بہت دور ہے' خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ بیٹے کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ عصائے پیری ہوتا ہے' بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے' اس سے انسان کو تقویت پہنچتی ہے' کہا ہے کہ **لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** (4:171) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب کچھ اس کا ہے' اسے کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کے سہارے ڈھونڈتا رہے۔ وہ بیٹا ہو یا وہ عیسائیوں کا عقیدہ ہو کہ انسانوں کی تخلیق کے سلسلہ میں جو کچھ خدا کر چکا تھا کہ اب اس کی وجہ سے انسان جنت میں نہیں جاسکتا' اس کے لیے اس کا جو بیٹا تھا وہ اس کا سہارا بنا کہ نہیں میں آپ کی تقویت کا موجب بنتا ہوں' میں جان دیدیتا ہوں' آپ اس سے بچ جائیں گے۔ اس نے کہا کہ یہ کیا عقائد تم لیے بیٹھے ہو۔ سنو! **لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** (4:171) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے' **لہ** اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے۔ یہ ہے مفہوم **لہ** کا۔ تو اس کے پروگرام کی تکمیل تو یوں ہو رہی ہے۔ کیا ضرورت تھی کہ ایک بیٹا اپنے لیے پیدا کرتا' تاکہ وہ اس کے بگڑے ہوئے کام سنوار دے۔ انسان کو تو اسی لیے اولاد کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کے کام آتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ اس کو ضرورت نہیں ہے' یہ تو منفی چیز تھی کہ اس کو ضرورت نہیں' کہا ہے کہ **وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا** (4:171) وہ ہر ایک کے لیے سہارا بنتا ہے' اس کو کسی اور سہارے کی کیا ضرورت ہے' وہ ہر ایک کا سہارا بنتا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! ضرورت ہوتی ہے۔

## عبدالقادر جیلانیؒ پیر دستگیر کی طرف ایک منسوب کردہ واقعہ

آپ کو پتہ ہے کہ یہ عبدالقادر جیلانیؒ (1166-77-561/1-470ھ) کو پیر دستگیر کہتے ہیں۔ یہ پیر دستگیر کیوں کہا جاتا ہے؟ مشکل یہ ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ احباب ان صوفیائے عظام کی محفلوں میں نہیں جاتے۔ یہ معرفت کی باتیں' وہیں پتہ چلتی ہیں۔ ان کے ہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ اور حضرت پیر گیارھویں شریف والے' پیر دستگیر' عرش پہ دونوں ٹہل رہے تھے' اللہ میاں اس جانب آپ دوسری جانب باتوں میں مصروف ہوگئے' جذب ہوگئے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ میں کہہ رہا ہوں یہ تو بزرگوں کی باتیں ہیں' ہم تو بندے بشر ہیں صاحب! گنہگار کی تو زبان بھی ایسی ہوتی ہے' میں کیوں ایسے نام لوں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ کہہ کر کہتا ہوں کہ وہ ٹہلتے رہے' کسی بات میں وہ جذب تھے' اللہ میاں کا پاؤں پھسلا' اس طرف وہ کنارے پہ تھے' وہ گرے تو حضرت پیر دستگیر نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اوپر اٹھا کر عرش پر لے آیا اس لیے دستگیر کہا گیا۔

عزیزانِ من! خدا کو پتہ تھا کہ یہ کچھ ہونا ہے جہاں اس نے یہ کہا کہ مجھے کسی سہارے کی کیا ضرورت ہے' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے میرے پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروف عمل ہے۔ ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ **وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا** (4:171) میں تو

ہر بے سہارا کا سہارا ہوں' مجھے سہارے کی کیا ضرورت ہے۔ دستگیر وہ ذات ہے' اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوسکتا ہے لیکن جب ان کی محفلوں میں یہ ذکر ہوتا ہے تو سبحان اللہ کے ولولے سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ ساتھ سبحان اللہ کہتے ہیں' یعنی اللہ بہت دور ہے' اس سے یہ بھی کہتے ہیں ''پتہ ای نئیں سبحان اللہ دے معنی کی نیں'' (معلوم ہی نہیں کہ سبحان اللہ کے کیا معنی ہیں)۔ سبحان اللہ کہتے ہیں اس کے بعد۔ عزیزانِ من! سوچیے یہ قوم کہاں بس رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ اس سے بہت دور ہے جو تم نے بکواس کی اور اس پہ سر بھی دھنتے ہیں۔

## اپنی سوچ کی بناء پر انسان دوسروں کے متعلق غلط تصورات قائم کر لیتے ہیں

کہتا ہے کہ لَنۡ یَّسۡتَنۡکِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّکُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ (4:172) تم مسیحؑ کو یا جبریل کو یہ اونچے مقام اسی لیے دیتے ہو کہ اگر حضرت مسیحؑ کو کہہ دیا کہ وہ صرف خدا کا ایک بندہ ہے اور جبریل صرف پیغام لانے والے ہیں تو یہ تو کچھ گھٹیا سا مقام ہے' انہیں تو اس سے شرم آئے گی۔ یعنی ان کو اس مقام پہ اس لیے نہیں رکھتے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے ان کو ندامت محسوس ہوگی' شرم سی آئے گی' کچھ عار سی آئے گی کہ بڑا گھٹیا سا مقام ہے۔ کہا یاد رکھو! تم اپنے ذہن میں جو جی میں آئے سوچو' نہ مسیحؑ کو اس کی عار آئے گی کہ میں خدا کا عبد کیوں ہوں' نہ جبریل کو اس سے ندامت ہوگی کہ میں خدا کا پیغامبر کیوں ہوں۔ انہیں تو یہ نہیں ہوگا اور تم ہو کہ مدعی سست گواہ چست' تم کہتے ہو کہ انہیں اگر یہ مقام نہ دیا گیا تو ان کو تو اس سے بڑی عار محسوس ہوگی۔ کہا ہے کہ نہیں! عار کی اس میں کوئی بات نہیں ہے' اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَنۡ یَّسۡتَنۡکِفۡ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یَسۡتَکۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُہُمۡ اِلَیۡہِ جَمِیۡعًا (4:172) جو خدا کا عبد ہونا ہے' جو اس سے عار کرتا ہے' اسے اس کی ندامت ہوتی ہے کہ میں اس کا عبد کیوں بنوں۔ و یستکبر کہا تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنے مقام میں تکبر کرتا ہے۔ عبد بنتے ہیں' جسے عار ہے' یہ تکبر ہے' اپنے مقام سے اونچا ہونا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے ان سب نے اکٹھے ہو کر ہماری طرف آنا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے گا کہ کس کو تم نے اس کے مقام سے اونچا بنا دیا اور کون تھا جو خود اس مقام سے اونچا چلا گیا۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق متعین کیا ہوا رتبہ زیادہ قابل فخر ہے

عبد ہونا خدا کے نزدیک اتنا بلند مقام ہے کہ ہر نبی اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تو خاص طور پہ کہا ہے کہ اَنۡ یَّکُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰہِ (4:172) میں خدا کا عبد ہوں۔ ذات رسالت مآب ﷺ کہ جن کے مقام کی یہ کیفیت ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی' قصہ مختصر'' اس سے بلند مقام تصور میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ انہوں نے بھی فخر سے کہا' قرآنِ حکیم نے یہ چیز کہی ہے کہ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا (2:23) ہمارا عبد ہے جس کے اوپر ہم نے یہ کچھ کیا۔ حضور ﷺ کو بھی فخر سے یہ چیز کہی اور ہمیں تعلیم یہ دی۔ غور

فرمایئے کہ جونہی ہم خدا کی الوہیت کی' اس کے الٰہ ہونے کی شہادت دیں کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اس شہادت کے ساتھ انسان مومن ہوسکتا ہے' خدا پر ایمان لاتا ہے لیکن اتنی شہادت کے بعد اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ رسول ﷺ کے متعلق ممکن ہے' ان کے ذہن میں مقام کچھ اور آ جائے۔ کہا ہے کہ یہ شہادت تم نے دی' اسی سانس میں یہ بھی شہادت دو کہ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یہ دو شہادتیں اکٹھی ہوں تو انسان مومن ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! رسول ﷺ کی طرف رسالت کی شہادت یہاں نہیں دلائی گئی' اس کی عبدیت کی شہادت بھی یہاں دلائی گئی ہے کہ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

## روزِ قیامت خدا کے حضور حضرت مسیحؑ کا بیان

یہ ہے وہ مقام جن کے لیے کہا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا (4:173) یاد رکھو! کہ جو عبد ہونے میں عار محسوس کرے گا تو وہ استکبار کرے گا' اپنے مقام سے اونچا بننا چاہے گا' اس کے لیے عذاب الیم ہے' وہ اگر خود ایسا چاہے گا لیکن اگر تم بناؤ گے تو اس میں تو اس کا کوئی جرم نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ قیامت میں ہم مسیحؑ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے ان لوگوں سے یہ کہا تھا کہ میری اولاد اور میری ماں کی پرستش کرنا۔ آپؑ کہیں گے کہ یا اللہ! آپ کو تو معلوم ہے' میں بھلا اس کی جرأت کرسکتا تھا! میں تو تمہارا عبد ہوں۔ لہٰذا وہ اس میں بری الذمہ ہونگے لیکن جو لوگ انہیں اس مقام پہ اٹھائیں گے' ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ اور کہا ہے کہ پھر خدا کے علاوہ وہ کوئی اپنا حامی اور ناصر نہیں پائیں گے۔ انہیں جو اپنا حامی اور ناصر سمجھتے تھے کہ وہ ہر معاملے میں مدد کرنے والے' دستگیری کرنے والے واقع ہوئے ہیں' خدا کے علاوہ کوئی اور ان کا حامی اور ناصر نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! اس کے بعد بتایا ہے کہ خدا کی نصرت اور حمایت کس طرح سے آیا کرتی ہے۔

## صوفیائے کرام کے متعلق بیان کردہ حوالوں کے معاملے کی وضاحت

ایک صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ پیر دستگیر والے واقعہ کا جو میں نے کہا ہے' اس کا حوالہ دیدیجیے۔ میں عرض کروں کہ یہ صوفیائے کرام یا ان بزرگوں کی محفلیں ہوتی ہیں' ان میں جو چیزیں بیان کی جاتی ہیں ان کے حوالے نہیں دیئے جاتے' حوالہ وہ کہتے ہیں کہ رات اللہ میاں سے یہ سن کر دیکھ کر آئے ہیں' حوالہ آپ کیا مانگیں گے۔ ان کے ہاں جو کچھ کہا جاتا ہے' ان کی کتابوں میں لکھا ہو' ان کی محفلوں میں اور مجلسوں میں' یہ واقعات بیان ہو رہے ہوں' وہ اس کی سند اور حوالہ نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں یہ تو اربابِ شریعت ہیں' دنیا دار ہیں' یہ ان کی باتیں ہیں' ان کا علم' علم لدنی ہوتا ہے۔ "آ اک ہور گل نویں آ گئی علم لدنی دی" (یہ علم لدنی کی ایک اور نئی بات آ گئی)۔ براہِ

راست خدا سے علم حاصل کیا ہوا ہوتا ہے۔اب جو خدا براہِ راست ان کو علم دیدے تو اس کا وہ حوالہ دیں' اس کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔وہ کہتے ہیں یہ تو ہماری کسر شان ہے جو ہم سے حوالہ پوچھا جا رہا ہے۔اور پھر اس کی تصدیق اگر انہوں نے کرنی ہوتو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہر رات وہاں ہوتے ہیں' براہ راست ان سے یہ تصدیق جا کر کرا لیتے ہیں۔اور جس Document (مسوّدے) پہ ضرورت ہوتی ہے کہ خدانہ (معاذ اللہ) مکر جائے تو اس کے بھی دستخط کرانے ہوتے ہیں اور ''روشنائی داڈوبالے کے جس طراں ہولڈر چھڑکدا ہیگا اے تے اوہدے چھٹے میری قمیص تے پے جاندے نیں او قمیص ہن تیکر ٹنگی ہوئی ہیگی اے'' (روشنائی میں ڈبو کر جیسے ہولڈر کو چھڑکتا ہے تو اس کے چھینٹے میری قمیص پہ پڑ جاتے ہیں اور وہ قمیص ابھی تک لٹکی ہوئی ہے)۔

عزیزانِ من! ان کی محفلوں میں' ان کی کتابوں میں' صوفیائے کرام کے حوالے نہیں دیئے جاتے' یہ علم لدنی ہوتا ہے۔اسی طرح سے یہ ان کی محفلوں میں یہ ذکر ہوتا تھا اور میری چونکہ آدھی عمر وہاں گزری ہے' اس لیے یہ چیزیں یاد ہیں۔میں نے اس لیے معاذ اللہ معاذ اللہ بھی کہا تھا' اس کے ساتھ حوالہ ہوتا تو پھر میں عرض نہیں کرتا' یہ لوگ حوالے نہیں دیا کرتے۔

عزیزانِ من! سورۃ النسآء کی آیت 174 تک ہم آ گئے' 175 ویں آیت سے آگے ہم آئندہ لیں گے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

# تینتیسواں باب: **سورۃ النسآء** (آیات 175 تا اختتام)

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَاعۡتَصَمُوۡا بِهٖ فَسَيُدۡخِلُهُمۡ فِىۡ رَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَفَضۡلٍ ۙ وَّيَهۡدِيۡهِمۡ
اِلَيۡهِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ؕ﴿۱۷۵﴾ يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡـكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَـيۡسَ لَهٗ
وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ كَانَـتَا اثۡنَتَيۡنِ
فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنۡ كَانُوۡۤا اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ؕ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَـكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1971ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 175 سے ہو رہا ہے: (4:175)۔

سورۃ النسآء کی یہ آخری آیات ہیں اور قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے Chapter (باب) یا سورۃ کے آخر میں بات کو سمٹا کر سمجھاتا ہے جسے انگریزی میں Sum-up (خلاصہ) کرنا کہتے ہیں اور اس سمٹانے کا بھی اس کا انداز بڑا ہی نرالا' بڑا ہی معجزانہ ہوتا ہے۔ آخر میں بات یہ کہی گئی تھی کہ قوموں کی تباہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دین کے معاملے میں غلو کرتے ہیں' مبالغہ کرتے ہیں۔ پچھلے درس میں یہ بات سامنے آچکی تھی کہ دین اپنے مقام سے اس وقت گرتا ہے' جب اس میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور مبالغہ یہ ہے کہ جس مقام پر کسی کو رکھنا چاہیے اسے اس مقام سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ مذہب کے معاملے میں کوئی اہلِ مذہب بھی اپنے کسی بزرگ کی شان میں گستاخی نہیں کرتا یعنی وہ اسے اس کے مقام سے نیچے نہیں گراتا۔ وہ کرتا یہ ہے کہ اسے اس مقام سے اونچا لے جاتا ہے اور اسی کو غلو کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ بس یہ وہ غلو ہے جس میں وہ شے اپنے مقام پر نہیں رہتی۔ دین تعدیل کا نام ہے یعنی ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کا نام۔ ظلم کسی شے کو اس کے مقام پر نہ رہنے دینے کا نام ہے۔ تو اس میں تنقیص ہو یعنی کسی کو نیچے اتار دیا جائے' اس میں غلو ہو' اس کے مقام سے آگے بڑھا دیا جائے تو غلو ہو' دونوں صورتوں میں دین باقی نہیں رہتا' تباہیاں آجاتی ہیں۔

## غلو کا تمام دارومدار انسانی جذبات پر ہوتا ہے جبکہ دین اپنے ہاں دلائل وبراہین کو اہمیت دیتا ہے

اب آپ دیکھیے! غلو کا مدار خالص جذبات پر ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے غلو کے لیے جو ایک شعر پڑھا تھا کہ

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

# تینتیسواں باب: سورۃ النسآء (آیات 175 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج مارچ 1971ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی آیت 175 سے ہو رہا ہے:(4:175)۔

سورۃ النسآء کی یہ آخری آیات ہیں اور قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے Chapter (باب) یا سورۃ کے آخر میں بات کو سمٹا کر سمجھاتا ہے جسے انگریزی میں Sum-up (خلاصہ) کرنا کہتے ہیں اور اس سمٹانے کا بھی اس کا انداز بڑا ہی نرالا' بڑا ہی معجزانہ ہوتا ہے۔ آخر میں بات یہ کہی گئی تھی کہ قوموں کی تباہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دین کے معاملے میں غلو کرتے ہیں' مبالغہ کرتے ہیں۔ پچھلے درس میں یہ بات سامنے آ چکی تھی کہ دین اپنے مقام سے اس وقت گرتا ہے' جب اس میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور مبالغہ یہ ہے کہ جس مقام پر کسی کو رکھنا چاہیے اسے اس مقام سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ مذہب کے معاملے میں کوئی اہلِ مذہب بھی اپنے کسی بزرگ کی شان میں گستاخی نہیں کرتا یعنی وہ اسے اس کے مقام سے نیچے نہیں گراتا۔ وہ کرتا یہ ہے کہ اسے اس مقام سے اونچا لے جاتا ہے اور اسی کو غلو کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ بس یہ وہ غلو ہے جس میں وہ شے اپنے مقام پر نہیں رہتی۔ دین تعدیل کا نام ہے یعنی ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کا نام۔ ظلم کسی شے کو اس کے مقام پر نہ رہنے دینے کا نام ہے۔ تو اس میں تنقیص ہو یعنی کسی کو نیچے اتار دیا جائے' اس میں غلو ہو' اس کے مقام سے آگے بڑھا دیا جائے تو غلو ہو' دونوں صورتوں میں دین باقی نہیں رہتا' تباہیاں آ جاتی ہیں۔

## غلو کا تمام دارومدار انسانی جذبات پر ہوتا ہے جبکہ دین اپنے ہاں دلائل و براہین کو اہمیت دیتا ہے

اب آپ دیکھیے! غلو کا مدار خالص جذبات پر ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے غلو کے لیے جو ایک شعر پڑھا تھا کہ

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

اگلی بات یہ تھی کہ اس کے لیے تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ تو اس نے دلیل کی بجائے کہا یہ تھا کہ

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یعنی یہ خالص جذباتی چیز ہوتی ہے اس کے لیے دلیل نہیں ہوتی۔ جو زیادہ پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو وہ شے ہے کہ جو نشہ پینے سے ہی آ سکتا ہے' دوسرے کو سمجھایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ چیز جذبات سے متعلق ہے۔ اب قرآنِ حکیم اس چیز کی تردید کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ عزیزانِ من! دیکھیے ایک لفظ جو اس نے اس کے بعد استعمال کیا ہے کہ یہ چیزیں تم نے اپنے خیالات سے وضع کیں' اپنے ذہن سے تراشیں' ان میں تمہارے جذبات کا تعلق تھا۔ دین میں تو یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (4:174) اے نوعِ انسانی! خدا کی طرف سے تمہارے پاس دلائل آتے ہیں۔ آپ غور کر رہے ہیں کہ بات تو یوں نظر آئی جیسے قرآنِ کریم کی ایک صفت بیان کی گئی ہے۔ اس کے متعلق کس مقام پر قرآنِ مجید برہان لایا ہے۔ غلو کے لیے تم صرف جذبات پیش کر سکتے ہو' تمہارے پاس برہان نہیں ہوتی اور دین کی بنیاد برہان پر ہوتی ہے۔ غلو کی تردید میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کے بعد آپ دیکھیے کہ ایک لفظ میں قرآنِ کریم نے اس کو مٹا کر رکھ دیا۔ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (4:174) دین کی بنیاد دلائل پر ہوتی ہے' عقل پر ہوتی ہے' علم پر' بصیرت پر' فکر پر' تدبر پر' شعور پر ہوتی ہے۔ وہ دوسروں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ' میں بھی یہ دلیل پیش کرتا ہوں۔ کہا ہے کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیۡرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ (12:108) ہم جو خدا کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں تو وہ علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں' علم و بصیرت کی بنیاد پر دعوت دیتے ہیں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے جو متبع ہونگے' وہ بھی ایسا کریں گے' وہ اپنے آپ کو مست صہبائے محبت نہیں کہیں گے' جو کچھ کہیں گے اس کی دلیل دیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم جو تمہارے پاس لے کر آئے ہیں' تو برہان لے کر آئے ہیں' دلیل لے کر آئے ہیں' Reason (عقل و فکر) لے کر آئے ہیں اس لیے ہماری دعوت کی بنیاد برہان پر ہوگی۔

## ''تاریکی کے پردے''پر قرآن کریم کی دلیل و برہان کرتی کیا ہے؟ بس دیدۂ بینا کو دیکھنا قرآن کریم کی روشنی میں ہے۔

ایک چیز تو یہ برہان ہوئی' اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر یہ برہان کرتی کیا ہے؟ اگلے الفاظ ہیں کہ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا (4:174) یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں برہان والا قرآنِ مجید دیا ہے تو یہ ہے کیا؟ تاریکی میں' اندھیرے میں' ہوتا کیا ہے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریکی ایسی چادر ہے کہ جو اس طرح سے ہر شے کو ڈھانپتی ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔ یہ

عجیب قسم کا ایک پردہ ہوتا ہے۔ کمرے میں مختلف چیزیں پڑی ہوں' ان کے اوپر اگر آپ کوئی موٹا سا پردہ ڈال دیں' اگر کوئی چادر' کوئی بہت بڑی دری' ڈال دیں پھر بھی پتہ لگتا ہے کہ کوئی شے اونچی ہے' کوئی شے نیچی ہے' اس کا کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو جاتا ہے لیکن جب تاریکی چھا جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں نشیب و فراز بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ ایک ایسا سمندر رہوتا ہے جس کے اندر یہ سب چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔ کسی شے کے متعلق علم نہیں رہتا کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ظلم تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ ''جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ ہو''۔ غلو میں یہی ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے کہ کوئی شے اپنے مقام پہ نہیں رہتی؟ وہ کہتا ہے کہ تاریکیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ نظر نہیں آتی۔ اور پھر تاریکی کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اندھیرے میں تو رسی بھی انسان کو سانپ بن کر ڈراتی ہے' اب آپ تاریکی میں فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ سانپ ہے یا رسی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہر چیز اپنے مقام پہ ہے یا نہیں اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس شے کی اصلیت کیا ہے' وہ رسی ہے یا سانپ ہے' کرتے آپ کیا ہیں؟ آواز دیتے ہیں کہ ذرا دیا لانا بھئی! چراغ لانا' موم بتی لانا' ماچس جلانا۔ روشنی ایک ایسی چیز ہے کہ جو ہر شے کی حقیقت اور اصلیت بتا سکتی ہے کہ آیا یہ رسی ہے یا سانپ ہے اور پھر یہ کہ ہر شے اپنے مقام پر پڑی ہوئی ہے یا نہیں۔ روشنی کا یہ کام ہے۔

اس نے جب کہا کہ ہم نے جو تمہیں دین دیا ہے' اس کی بنیاد برہان پر ہے' دلیل پر ہے۔ کہا ہے کہ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا (4:174) ہم تمہارے پاس روشنی لائے ہیں۔ خود روشنی کی ایک صفت بیان کی ہے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ حمید کا اعجاز اس کے الفاظ کے انتخاب میں ہے۔ قرآنِ کریم نورًا مبین ہے' خود واضح روشنی ہے اور دوسری چیزوں کو واضح کرتی ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔

یہ پہلی چیز ہے جو قرآنِ حکیم نے اپنے متعلق کہی ہے۔ یہ بھی بڑی اہم ہے۔ اگر کہیں چراغ جلتا ہو تو اس کے لیے آپ کو کوئی دوسرا چراغ لانے کی ضرورت نہیں ہوتی جو بتائے کہ یہاں دیا رکھا ہے۔ روشن چراغ جسے ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کہتے ہیں کہ روشن چراغ یا روشنی جو ہے' لائٹ جو ہے' وہ اپنی ذات کے بتانے کے لیے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی' وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے خارج سے کہیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی' یہ ایک جگمگاتا ہوا دیا ہے' چراغ ہے' یہ قرآنِ کریم نے خود اپنے متعلق کہا ہے۔ اپنی نمود کے لیے اس کو کسی دوسری روشنی کی ضرورت ہی نہیں' یہ اس کا محتاج ہی نہیں ہے' یہ جگمگاتا ہوا چراغ ہے۔ یہ غلط ہے کہ صاحب! قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے یا یہ ناقص ہے یا یہ غیر مکمل ہے' اس کی تکمیل فلاں چیز سے ہوتی ہے۔ قطعاً نہیں۔ روشنی فی ذاتہٖ مکمل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نمود کے لیے' اپنے ظہور کے لیے' کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسا میں نے پہلے مثال کے طور پہ کہا ہے کہ جلتے ہوئے روشن چراغ کو ہم کسی دوسرے دیئے سے جا کر نہیں ڈھونڈتے' وہ اپنا پتہ دیتا ہے

کہ میں یہاں ہوں۔

عزیزانِ من! قرآنِ حمید اپنے سمجھنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔علم وفکر کی رو سے اسے سمجھا جاتا ہے' جیسے چراغ کو دیکھنے کے لیے روشن آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے' اندھی آنکھ سے جلتا ہوا دیا بھی نظر نہیں آسکتا۔ادھر دیدۂ بینا ہونا چاہیے۔ جسے علم و بصیرت اور فکر وتدبر کہا جاتا ہے' یہ دیدۂ بینا کے لیے روشن چراغ ہے اس میں پھر کسی تیسری چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چراغ روشن نہیں ہے تو بینا آنکھ کچھ کام نہیں دے سکتی۔روشن چراغ ہو اور دیدۂ بینا ہو' قرآنِ کریم ہو' فکر انسانی کے لیے بس یہ کافی ہے' دنیا میں حقائق کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے۔یہ نُوْرًا مُّبِيْنًا (4:174) ہے' یہ خود روشن ہے اور ہر شے کو روشن کرتا ہے۔لہٰذا جب اس کی روشنی میں دیکھا جائے کہ کس شے کا کونسا مقام ہے تو اس کے بعد پھر توہم پرستی کی کہیں گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ جہاں جہاں آپ نے ان لوگوں کو' ان انسانوں کو' ان قوتوں کو' خواہ فطرت کی ہوں یا انسانوں کی ہوں' ان کے مقام سے آگے لے گئے' تو آپ نے غلو کیا ہے' یہ توہم پرستی ہے' آپ نے قرآنِ کریم کی روشنی سے ان چیزوں کے مقامات کا تعین نہیں کیا۔قرآنِ حکیم کی روشنی میں تعینِ مقام یہی ہے۔خدا سب سے بڑی قوتوں کا مالک ہے' کائنات کی ہر شے اس کے قانون کے تابع مسخر کردی گئی ہے۔انسان' خدا کے دیئے ہوئے اختیار و ارادہ کا مالک ہے۔وہ ان اشیائے کائنات کا علم حاصل کر کے' قوانین کا علم حاصل کر کے' ان کو مسخر کرسکتا ہے۔لہٰذا خدا کے نیچے انسان کا مقام ہے۔انسان کسی اور شے کے سامنے جھکنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔

## انسان کا انسان کے سامنے جھکنے کا تصور انسان کو اس کے اپنے مقام سے گرادیتا ہے

جہاں کسی انسان کے دل میں' کسی دوسرے انسان کا' کسی قسم کا خوف یا حزن طاری ہوگا' انسان اپنے مقامِ انسانیت سے گر جائے گا۔قرآنِ کریم انسان کو اس کے اپنے مقام سے آگاہ کرنے کے لیے آیا ہے۔کہتا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ** (59:19) ان میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے خدا کو بھلادیا۔خدا کو بھلادیا تو کیا ہوا اور اسے یاد رکھ لیا تو کیا ہوا۔کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ** (59:19) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقام کو بھول جاتا ہے' اس کا نتیجہ خود فراموشی ہوتا ہے۔انسان اپنے مقام کو فراموش کردیتا ہے۔خدا کو فراموش کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔

## شمعِ قرآنی تو ہر شے کا مقام متعین کردیتی ہے

جسے آپ خدا کا ذکر کہتے ہیں یعنی خدا کو ہر وقت سامنے رکھنا تو قرآنِ مجید ہی اس کا ذریعہ ہے اور قرآنِ حکیم کو ہی خدا نے ذکر کہا ہے۔اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہ وہ انسان کو اس کے مقام سے آگاہ رکھتا ہے۔اسے بھلادیا جائے تو انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔غلو

کی طرف جائے تو پھر فرعون ہو جاتا ہے اور یا اگر یہ چیز نیچے کی طرف آئے ''تے فیر او کھ مسیت دا ہو جاندا اے' جیہدا جی چاہے آکے لتاڑ دا تریا جاوے'' (وہ مسجد کا پرِ کاہ بے قدر و منزلت ہو کر رہ جاتا ہے جس کا جی چاہے وہ اسے روندتا چلا جائے)۔ یہ بہت بڑا مقام ہے آپ کے ہاں ''ہو جا ککھ مسیت دا جنوں کیندے نیں'' (جسے مسجد کا بے قدر و منزلت تنکا کہتے ہیں)۔ یہ شرفِ انسانیت سے گری ہوئی چیز ہے۔ قرآنِ کریم انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اس میں تمہارا اپنا ذکر ہے اور عربی زبان میں ذکر شرف و مجد کو کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس لیے اس نے اس کو نُوۡرًا مُّبِیۡنًا کہا ہے کہ خود روشن ہے' کسی دوسری روشنی کا محتاج نہیں ہے اور ہر روشنی کا قاعدہ ہے کہ وہ ہر شے کا مقام متعین کر دیتی ہے مثلاً خدا کا مقام' کائنات کی چیزوں کا مقام' انسان کا مقام' رسول کا مقام' ہر شے' ہر شخصیت کا مقام متعین کر دیتا ہے۔ یہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے۔

پہلے سے قرآنِ حکیم غلو کے متعلق بات کرتا چلا آ رہا تھا۔ دونوں طرف کی چیزیں تھیں' عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنایا' یہودیوں نے انہیں مقامِ رسالت سے نیچے گرا کر ان کے خلاف عجیب عجیب قسم کی تہمتیں لگائیں اور کہا کہ ہم نے ان کو لعنت کی موت مار دیا ہے۔ ان کے صحیح مقام سے گرایا۔ قرآنِ حمید نے آ کر کہا کہ وہ عبد تھا' وہ خدا کا رسول تھا۔ یہ ہے اس کا صحیح مقام۔ کہا اس قسم کے مقامات کے تعین کے لیے خدا کی طرف سے جگمگاتا ہوا چراغ آ گیا ہے' اب تو ہم پرستیوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

## قرآنِ حکیم کی روشنی سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے ہم نے خود کو محروم کر رکھا ہے

دیا تو یہ اب بھی روشن ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دیئے کی روشنی سے فائدہ وہ اٹھاتا ہے جس کی آنکھ روشن ہو' اندھا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ دیا تو روشن ہے' ہم اندھے ہو چکے ہیں۔ جہاں جہاں ہم نے انسانوں کو ان کے مقام سے بلند کیا ہوا ہے' مبالغے کیے ہوئے ہیں' یہ ہماری آنکھ کی نابینائی کا اثر ہے' قرآنِ حکیم تو ان کا صحیح مقام متعین کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَاعۡتَصَمُوۡا بِہٖ فَسَیُدۡخِلُہُمۡ فِیۡ رَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَ فَضۡلٍ (4:175) جو قرآنِ حکیم کی حقیقت پہ ایمان لاتا ہے' دیا لے کر کمرے میں چیزوں کے مقامات کا تعین کرتا ہے' وَ اعۡتَصَمُوۡا بِہٖ (4:175) صرف ایمان لانے کی بات نہیں' یہ تو ایک دفعہ صداقت کو مان لیا اور اس کے بعد اعتصام بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ کسی چیز کو لازم پکڑنا' استقامت اور ثبات کے ساتھ اس کے ساتھ چمٹے ہوئے رہنا ہے' اس لیے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30)۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر جم کر اس بات کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں تو تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30)۔ یہ ہیں جن کے اوپر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ وَ اعۡتَصَمُوۡا بِہٖ (4:175) اس کے ساتھ اعتصام ضروری ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَسَیُدۡخِلُہُمۡ فِیۡ رَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ

وَفَضْلٍ (4:175)۔عزیزانِ من! غور کرتے چلے جایئے کہ قرآنِ حمید کس ایجاز سے بات کہتا جاتا ہے۔ان کو کیا چیز ملے گی؟ یہ کہ فضل اور رحمت ملے گی۔

## فضل کا لفظ اگر رزق کی فراوانی کے لیے ہے تو رحمت کا لفظ انسانیت کی نشو ونما کے لیے مختص ہے

قرآنِ کریم نے ''فضل'' تو دنیاوی زندگی کی جو معاشی سہولتیں ہیں' جسے آپ رزق کہتے ہیں' جسے سامانِ زیست کہا جاتا ہے جسے معیشت یا معاشی چیزیں کہا جاتا ہے' اس کے لیے ''فضل'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔معاشی سہولتیں' انسان کی طبعی زندگی کے لیے ضروری ہیں لیکن قرآنِ کریم کا مقصود صرف انسان کی طبعی نشو ونما تو نہیں' طبعی زندگی کی ضروریات کا ہی سامان بہم پہنچانا تو نہیں' یعنی صرف یہی ضروری نہیں ہے' اگرچہ یہ بھی ضروری ہے اسی لیے تو قرآنِ مجید نے فضل بھی تو کہا ہے۔طبعی نشو ونما کے ساتھ انسان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما بھی اس کا فریضہ ہے' اس کا نصب العین ہے' اس کے پروگرام میں سے ہے۔یہ چیزیں جن سے انسانیت کی نشو ونما ہوتی ہے' اسے وہ رحمت سے تعبیر کرتا ہے۔وہ یہ کہتا ہے کہ قرآنِ مجید سے اعتصام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رحمت بھی ملے گی' فضل بھی ملے گا' معاشی سہولتیں بھی ملیں گی اور انسانیت کی جتنی صلاحیتیں ہیں' جن سے اس نے آگے ارتقائی منازل طے کرنا ہیں یہ بھی اس کے ساتھ ملتی چلی جائیں گی۔یہ ہے جسے کہتے ہیں کہ دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی ملے گی حالانکہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں' یہ تو ایک ندی کا تسلسل ہے۔بہرحال قرآنِ کریم کہتا ہے کہ معاشی سہولتیں بھی ملیں گی' انسانیت کی نشو ونما کے لیے جس سامان کی ضرورت ہے' وہ بھی انہیں حاصل ہو جائے گا۔

## لفظ صراطِ مستقیم کا مفہوم اور ذاتِ خداوندی کے مقام کا تعین

آگے کہا ہے کہ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا (4:175) اور انہیں خدا ایسے سیدھے اور متوازن راستے پہ چلائے گا' جس میں نشیب وفراز نہ آئیں۔مستقیم سیدھا ہی نہیں ہوتا بلکہ توازن بدوش راستہ ہوتا ہے۔کہا ہے کہ انہیں خدا اس قسم کے راستے پہ چلائے گا۔یہاں یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ آیا ہے۔اس کے عام لفظی ترجمے کے اعتبار سے کہا جائے گا کہ وہ انہیں اپنی طرف آنے والے راستے کے اوپر چلائے گا۔

اگرچہ بات اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آچکی ہے لیکن چونکہ بڑی اہم ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جہاں بھی اس قسم کی چیز آئے' مختصر الفاظ میں ہی سہی' اس کی طرف اشارہ ضرور کر دوں۔خدا کے متعلق ہمارے ذہنوں کے اندر' اور انسان کا محدود ذہن کچھ ایسا ہی تصور کر سکتا تھا' یہی ہے کہ وہ کہیں کسی اور جگہ موجود ہے۔اس زندگی میں اگر کچھ تصور کرتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ خدا عرش پر' آسمان پر' وہاں

کوئی عرش ہے اس پر براجمان ہے۔ کسی وقت بھی آپ اپنے ذہن میں لائیے' آپ دیکھیں گے کہ ذہن میں کچھ اس قسم کا تصور ہی آتا ہے۔ محدود ذہن مجبور بھی ہوتا ہے۔ اصل میں وہ Time & Space (زمان ومکان) کی حدود سے آگے جا نہیں سکتا۔ اور اس کا اوپر ہونا تو یہ ہے کہ جب ہم کچھ بھی نہ کہیں' آپ دیکھتے ہیں کہ اتنا انگلی کا اوپر کی طرف جو اشارہ ہے تو اس کے معنی ہی خدا ہوتا ہے۔ ہم روز کہتے ہیں کہ اوپر والا دیکھتا ہے تو گویا اس زندگی میں بھی جب ہم ذہن میں خدا کا تصور لاتے ہیں تو وہ کسی خاص مقام میں آتا ہے۔ اور مرنے کے بعد کا تصور تو آپ دیکھیے' اب بھی آپ ذرا ذہن میں' آنکھیں بند کر کے لائیے تو مرنے کے بعد کا تصور یہ ہے کہ کوئی ایک مقام ہے' ایک بہت بڑا سا میدان ہے' اس میں سارے جمع ہونگے' وہاں خدا ہوگا۔ جب بھی قرآنِ حکیم میں کہیں یہ چیز ''الیہ'' کے لفظ سے آتی ہے مثلاً یہ اِنَّـا لِـلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) تو اس کے معنی ذہن میں یہ آتے ہیں کہ وہ کہیں ہے اور ہم نے اس کی طرف جانا ہے' ہم کہیں اور ہیں وہ کہیں اور ہے اور مرنے کے بعد ہم نے اس کی طرف جانا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ محدود ذہن (Finite) اس تصور میں گھرا رہتا ہے۔ خدا کا یہ تصور نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ هُـوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے یہاں تک کہ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50:16) وہ تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے' اس کی اپنی جان سے زیادہ قریب ہے۔ کہیے کہ انسان کے لیے جان سے کوئی شے قریب ہو سکتی ہے۔ یہ جسے آپ زندگی کہتے ہیں' وہ تو ہے ہی جان۔ اور یہاں ایک بڑا لطیف اشارہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم بھی جب جان کا ذکر کرتے ہو تو حالانکہ یہ ایک Abstract (غیر محسوس) چیز ہے' کوئی محسوس مادی (Material) شے نہیں ہے' تم یہ نہیں بتا سکتے کہ جان میرے یہاں ہے' یہاں جان ہے' یہ جان ہے۔ جان کے متعلق آپ کہہ ہی نہیں سکتے کہ یہ جسم میں کہاں ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کے باوجود تم نے اپنی زبان میں' اصطلاح میں' رگِ جان ایک چیز قرار دے رکھی ہے۔ اسی طرح سے تم نے خدا کے متعلق بھی یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بھی اسی طرح سے کسی چیز میں محدود ہے۔ کہا ہے کہ خدا تو تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تو اس لیے جو ایسا ہے کہ جو ہر جگہ موجود ہے' رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے' اس کے لیے یہ تصور کہ وہ کسی اور مقام میں ہے' غلط ہے۔

## تصوف کی دنیا میں انسانی ذات اور خدا کی ذات میں فرق کی نوعیت

اصل میں' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ محدود ذہن کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس تصور کو تصوف نے آ کر بہت زیادہ تقویت دی۔ ان اہلِ تصوف نے یہ چیز کہی کہ انسانی روح' جان' انسان کی ذات' جو کچھ بھی ہے' یہ خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے۔

یہ وہاں سے الگ ہوگئی' وہ وہاں رہ گیا اور اس میں سے چھینٹا اڑا اور نیچے انسان کے اندر گرا۔ یہ سارے انسانوں کے اندر جو کچھ بھی ان کی روح یا جان ہے' یہ خدا کی اس ذات کا ایک حصہ ہے جو یہاں ہے۔ اب وہاں سے یہ الگ تو ہوگئی' اب رو رہی ہے۔ یہ ہے تصوف کی بنیاد۔ مادی دنیا کے اندر گھر کر انسان کی ذات' چونکہ اپنی اصل سے الگ ہوگئی ہے' اس لیے رو رہی ہے۔ ''جس طراں میلے اچ بچہ گواچ جاندا اے ناں' ماں پیو توں وکھرا ہو جاندا اے'' (جس طرح میلے میں بچہ گم ہو جاتا ہے' ماں باپ سے بچھڑ جاتا ہے)۔ یہ سارا تصوف اس پہ ہے جو مولانا (جلال الدین) رومیؒ (1240-1165/638-560ھ) نے کہا ہے کہ

بشنو از نے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

تصوف کا تو سارا راز ہی تمثیلات میں ہے' مثالوں کے ذریعے سے ہے' ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تصوف میں صرف مثالیں ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ بانسری کیوں رو رہی ہے ''لے! بنسی رون ڈئی ہیگی اے'' (لو بھئی! بانسری آہ و فغاں کر رہی ہے)۔ اسے اندر ہی چھوڑ یئے لیکن بات تو شاعری کی ہے۔ صاحب ❶ نے جو کہا تھا کہ

تصوف برائے شعر گفتن خوب است

سچ تو یہ ہے کہ تصوف ہے ہی شعر کہنے کے لیے! پوچھا ہے کہ بانسری کیوں رو رہی ہے؟ ''اس لیے کہ جنگل سے کٹ کر الگ ہوگئی''۔ چلیے صاحب! مسئلہ طے ہوگیا کہ انسانی ذات' خدا کی ذات سے کٹی ہوئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیوں؟ جواب یہ ہے کہ جو بانسری رو رہی ہے' اب انسان کی تگ و تاز کا منتہا یہ ہے کہ یہ جو اس سے الگ ہوگئی ہے' یہ شے اپنی اصل کے ساتھ جا کر مل جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اسی لیے یہ بزرگوں کی موت کو موت نہیں کہتے' وصال کہتے ہیں۔ وصل کے معنی ہی ''کسی شے سے جا کر مل جانا'' بلکہ ان کو عرس کہتے ہیں۔ اسی سے عروس ہے یعنی شادی ہو جانا' جیسے دلہن دلہا کے پاس چلی جائے۔ انہوں نے یہ جو تصور دیا کہ یہ انسانی روح' خدا کی روح سے الگ ہو کر مادی دنیا میں' مادی کائنات کے اندر' مادے کے پیکر میں' انسان کے اندر آ گئی' یہ جو علیحدگی کا تصور ہے اس نے اس چیز کو تقویت دی کہ وہ کہیں اور ہے اور یہ انسان کہیں اور ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ خدا کہیں اور ہونے کے تصور سے ماورا ہے' منزا ہے وہ تو **ھو مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ** (57:4) ہے' جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس لیے جہاں قرآنِ مجید میں یہ الیہ راجعون آئے گا کہ اس کی طرف جانا ہے تو یہ نہیں ہے کہ وہ کسی مقام میں ہے کہ جہاں جا کر اس کو کسی طرح سے ہم نے ملنا ہے۔ اور یہ وہ بنیادی غلط فہمی تھی' جو

---

❶ ''صاحب'' کا یہ اشارہ شیخ علی حزیں کی طرف ہے جو 1140ھ مطابق 1734ء میں ایران سے ہندوستان آئے جہاں ان کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی (سکینہ رام بابو مترجم مرزا محمد عسکری: تاریخِ ادب اردو (باتصویر)' گلوب پبلشرز' لاہور' 1986' ص۔ 110)۔

نبی اکرم ﷺ کے معراج کے سلسلے میں' اس عقیدے میں' یہ چیز آئی کہ ایک انسان اپنے اس جسم کے ساتھ' یہاں سے اٹھ کر کسی مقام میں جا کر خدا سے مل کر آیا ہے۔ اس کے لیے خدا کو مقام کے اندر محدود کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ تصور کیا جائے کہ آپ ﷺ یہاں سے اٹھ کر' عرشوں کے اوپر جا کر' خدا سے مل کر' آئے ہیں تو جو قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ وَّ یَهۡدِیۡهِمۡ اِلَیۡهِ (4:175) اور قرآنِ حکیم میں بے شمار مقامات میں یہ ہے۔ یہ الیہ راجعون والی جو چیز ہے اس کے معنی خدا کسی مقام پہ نہیں کہ وہاں جا کر اس کو ملنا ہے یا اس کی طرف جانا ہے۔

## اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ کا حقیقی مفہوم: خدا کے مقرر کردہ نصب العین کی طرف رجوع کرنا ہے

جہاں جہاں یہ اِلَیۡـهِ رٰجِعُوۡنَ چیز آئے گی اس کے معنی ہوں گے ''تمہیں اس کے مقرر کردہ نصب العین کی طرف جانا ہے''۔ وہی وہ چیز ہے جو آپ کو معلوم ہے جہاں وہ اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّـآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) آیا ہے اس پر تو میں نے تین درس ❶ دیئے تھے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ وہاں وہ آیا ہے کہ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155) وہ ہے کہ دنیا کے اندر جب حق و باطل کا مقابلہ آئے گا تو وہاں ٹکراؤ ہوگا' تمہیں مشکلات کا سامنا ہوگا' تصادمات ہونگے' تمہارا قدم قدم پر مقابلہ ہوگا' جو لوگ کمزور ہونگے وہ تو ان مقابلوں سے ڈر کر کسی اور طرف نکل جائیں گے لیکن جن لوگوں کے سامنے وہ صحیح واضح نصب العین ہوگا' وہ ہر مقابلے کے وقت اس سے ٹکرا کر' اس کو شکست دینے کے بعد' اس سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر' یہ کہیں گے کہ تم کیا کہتے ہو کہ تمہارے سامنے آنے سے' تمہاری روک سے' مقابلے سے' مزاحمت سے' ہم اپنا رخ کسی دوسری طرف کر لیں گے؟ ہم نے اپنے سامنے خدا کا مقرر کیا ہوا نصب العین رکھا ہے۔ وہاں کہا ہے کہ اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّـآ اِلَیۡـهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا' تم ہمارے راستے میں آ کر دیکھو تو سہی۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے صاحب!

## ہمارے تراجم میں انا للہ وانا الیہ راجعون کے متعلق پایا جانے والا مفہوم

عزیزانِ من! اب وہی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ہے کہ جہاں کوئی بدشگونی آتی ہے' بدخبری آتی ہے' آپ کے اوپر مصیبت کی بات آتی ہے تو اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّـآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) کہہ دیا جاتا ہے۔ اس سے تو بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ کہا ہے کہ الیہ راجعون یعنی لو! چلے ہم اس کی طرف! انداز ہے کہ جہاں سخت سے سخت مقابلہ آئے' اس مقابلے کے ساتھ' اس کے گریباں

---

❶ اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ البقرۃ (جلد 2)، ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2011، ص ص۔

میں ہاتھ ڈالو' دھکا دے کر ایک طرف کرو' اور اس کو کہو کہ لو! میں چلا اس کی طرف' کرلو کیا کرتے ہو! یہ **اِنَّـا لِلّٰهِ وَ اِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ** (2:156) ہے کہ جارہے ہیں ہم اس کی طرف۔ اس کی طرف جانے کے یہ معنی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ عظیم چیز ہے۔ یہ ہے یہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھنا' اور وہ نصب العین خدا کا مقرر کردہ ہو۔ وہ جو اقبالؒ (1938-1877ء) نے ایک مصرعہ میں یہ کہا ہے کہ قرآنِ مجید کرتا کیا ہے:

آں چہ حق می خواہد' آں سازد ترا

جس قسم کا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ' یہ تمہیں اس قسم کا بنا دیتا ہے۔ یہ ہیں الیہ کے معنی۔

## قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نصب العین کی وضاحت کے باوجود ہماری حالت

عزیزانِ من! وہ اس کا مقرر کیا ہوا نصب العین ہے' وہ اس کی طرف جانے کے لیے تمہارے سامنے راستے روشن کر دیتا ہے' تمہیں راہنمائی دیدیتا ہے۔ یہ نصب العین کیا ہے؟ یوں تو سارا قرآنِ حکیم ہی اس نصب العین کی شہادت دیتا چلا جارہا ہے اور قدم قدم پہ اُسے متعین کرتا چلا جارہا ہے مگر چند الفاظ میں اگر آپ یہی آیات جو گزر چکی ہیں' ان میں دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سب سے پہلے ایک عالمگیر برادری بناتا ہے۔ کہتا ہے کہ **كَـانَ الـنَّـاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213)۔ غور کیجیے یہ نصب العین ہے۔ یہ سارے تفرقے مٹا کر' سارے اختلافات مٹا کر' انسانیت کی عالمگیر برادری بناتا ہے۔ یہ اسلام اور خدا کے نام پہ حاصل کردہ جو مملکت ہے' اس میں ہم دو خطّوں[1] کو ایک نہیں بنا سکے مگر وہ عالمگیر برادری بناتا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ **اعتصام بحبل اللہ** نہیں رہا' قرآنِ حکیم کا نصب العین سامنے نہیں رہا۔ پوری انسانیت کو وہ ایک برادری بناتا ہے۔ ہم دو مسجدوں میں نماز پڑھنے والے نمازیوں کو ایک صف میں کھڑا نہیں کرسکتے۔ پہلا نصب العین **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:214) ہے۔ پھر اس قسم کی مخلوق بنتی ہے جس میں **لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ** (2:38) ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! نصب العین دیکھیے: نہ کوئی بیرونی خطرہ' نہ دل میں حزن اور افسردگی اور ملال۔ اللہ اکبر! اندازہ لگائیے۔ اگلا نصب العین یہ ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحُكۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے' خواہ اسے حکومت کیوں نہ مل جائے' اس کو آئین سازی اور قوانین سازی کے اختیار کیوں نہ مل جائیں اور آخری چیز یہ ہے کہ کسی کو نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ تم میرے فیصلے کے تابع چلو گے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ قرآنِ مجید کے کیا کیا معنی روشن

---

[1] یہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی طرف اشارہ ہے۔

ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس نے الکتاب کہا ہے۔ یہاں اس نے **الحکمۃ** اور الکتاب الگ الگ کہا ہے' یہ انتقال اقتدار تو بعد کی چیز آئے گی' پہلے تو آئین سازی کی چیز آئے گی' الکتاب آئین سازی ہے' قانون سازی ہے۔

## سیاسی لحاظ سے موجودہ بے لگام جمہوریت کا خاصہ یعنی اکثریت کی حکمرانی کی ساخت

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ نے یہ فیصلے کر لیے کہ جس کو زیادہ ووٹس مل جاتے ہیں' اس کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ دوسروں سے منوائے۔ کس قدر غلط ہیں آپ کے ہاں کے یہ تصورات! آپ یہ جمہوریت لیے پھر رہے ہیں جبکہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کسی انسان کو اس چیز کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے یہ کہے کہ میرا فیصلہ مانو۔ وہ صرف یہ کہے گا کہ **وَ لٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ** (3:79) تم نے بھی اور میں نے خدا کا حکم ماننا ہے۔ اس کے لیے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق حکم اور فیصلہ نہیں کرتے' وہ ہیں جن کو کافر کہا جاتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ نصب العین کیا سامنے رکھتا ہے!

## رزق کے معاملے میں فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور زندگی کے رواں دواں رہنے کا تصور

عزیزانِ من! پھر اس نے کہا ہے کہ کوئی شخص رزق کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ اس نے جنت کی زندگی یہ کہی ہے کہ جس زندگی کے اندر کسی شخص کو بھوک اور پیاس' سردی اور گرمی' لباس کے متعلق کسی دوسرے کی احتیاج نہ ہو یعنی **اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡہَا وَ لَا تَعۡرٰی** (20:118)۔ اور پھر یہ اتنی سی چیز ہی نہیں ہے کہ یہ زندگی یہاں ختم ہو گئی' قطعاً نہیں' اس نے نصب العین رکھا ہے۔ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ کہتا ہے کہ **لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ** (84:19) اس طرح سے **طَبَقًا طَبَقًا** آگے بڑھتی چلی جائے گی' جو زندگی ہے وہ بلند ہوتی چلی جائے گی۔ یعنی یہ اسی دنیا کی آپ کی تمدنی زندگی' معاشی' معاشرتی' سیاسی زندگی کے متعلق ہدایات نہیں ہیں' بلکہ انسانیت کی صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح سے کی جائے کہ زندگی **طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ** آگے بڑھتی چلی جائے۔ اور اسی لیے اس نے خدا کو **ذِی الۡمَعَارِجِ** (70:3) کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ اور یہ کہا ہے کہ خدا بھی صراط مستقیم پر جا رہا ہے: **اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ** (11:56) میرا رب صراط مستقیم پہ جا رہا ہے۔ تم اس کا اتباع کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ اور رب کونسا ہے؟ وہ جو ذی المعارج ہے جو جا رہا ہے تو یوں صراط مستقیم ہی نہیں ہے بلکہ سیڑھیوں والا ہے' اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے چلے جاؤ۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ حکیم انسان کے سامنے کیا نصب العین رکھ رہا ہے۔ زندگی تو ختم ہونے والی شے نہیں

ہے لیکن جہاں اس میں جمود آ جاتا ہے وہ جہنم ہوتا ہے اسی لیے قرآنِ کریم نے جہنم کو جحیم کہا ہے' جہاں کوئی شے آگے بڑھنے سے رک جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ حکیم نے جہاں کہا ہے کہ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ (4:175) تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کسی مقام پہ ہے' اس کے مقام کی طرف وہ تمہاری ہدایت کرتا ہے کہ وہاں چلے جاؤ اور جاؤ گے تو وہاں اللہ میاں مل جائے گا بیٹھا ہوا۔ اِلَیْهِ کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو نصب العین تمہارے لیے مقرر کیا ہے' اس نصب العین کی طرف جانے کے لیے وہ تمہاری راہنمائی تمہیں دیتا ہے۔ یہ ہے قرآنِ کریم جو کچھ کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ آخری آیات میں کس طرح سے وہ ساری چیزوں کو Sum-up (نچوڑ) کر کے سامنے لے آتا ہے۔

## قرآنِ حکیم کی طرف سے راہنمائی کا طریق

عزیزانِ من! اب اس کے بعد بالکل آخری آیت آتی ہے۔ سورۃ النسآء کے ابتدا میں گیارھویں بارھویں آیت میں قرآنِ کریم نے وراثت کے احکام دیئے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ حمید نے خود کہا ہے کہ میرے سمجھنے کا جو طریقہ ہے وہ تصریفِ آیات ہے' وہ تصریف آیات سے بات کرتا ہے یعنی اس کی کیفیت انسانی تصنیفوں جیسی نہیں ہے کہ ایک موضوع پہ ایک کتاب ہو' اس کے تو موضوعات کا ہی پوچھیے نہیں کہ کتنے کثیر التعداد ہیں' پھر یہ بھی نہیں ہے کہ ایک جو Chapter (باب) ہے وہ Self Sufficient (خود مکتفی) ہو۔ اس کے اندر ساری چیزیں' جتنی بھی ہیں' وہ ایک Chapter (باب) میں مربوط طریقے پہ آ جائیں' پھر اگلا Chpater (باب) ہو' پھر اگلا Chapter (باب) ہو کہ یوں کتاب ہو جائے۔ اس کا انداز یہ نہیں ہے۔ وہ ایک بات کو ایک جگہ بیان کرتا ہے' اس کی تشریح دوسرے مقام پہ کرتا ہے' اس کی استثنا کہیں اور کرتا ہے' اس میں اضافہ کسی اور جگہ جا کر ہوتا ہے' کہیں وہ الفاظ میں یعنی محکمات کے ذریعے سے اس کی وضاحت کرتا ہے' کہیں تشبیہی انداز سے باتیں بیان کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ انداز ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ یہ انداز کیوں ہے۔ ایک ایسی کتاب' جس نے قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے روشنی اور ضابطۂ ہدایت رہنا تھا اس کا انداز یہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔ جب میں قرآنِ کریم پہ آ ؤں گا تصریف آیات کے موضوع پہ' وہاں میں یہ عرض کروں گا کہ یہی اس کا صحیح انداز ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس کا انداز یہ ہے۔

### وراثت کے اصولوں کی وضاحت

اب وہاں اس نے وراثت کے احکام بتائے تھے۔ ایک بات یہاں اور آ گئی کہ یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ (4:176) اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خدا خود بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے'

اس کا نہ ماں باپ ہو نہ اولاد ہو۔ اب وراثت کے احکام میں جس کے اولاد نہ ہو اس کی وراثت کے متعلق وہاں بھی یہ بات تھی۔ کہا ہے کہ اِنِ امْرُؤٌا هَلَکَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَکَ(4:176) اگر کوئی شخص مر جائے۔ اس کی اولاد کوئی نہ ہو' وہ متوفی مرد ہو اور اس کی بہن ہو تو ترکہ میں اس کا حصّہ نصف ہوگا۔ میں نے وہاں بھی یہ عرض کیا تھا' یہ وراثت کے قوانین ہیں' اس کے لیے کچھ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ان چیزوں سے معاملہ یا واسطہ پڑے گا' قانون کی حیثیت سے ان چیزوں کو وہ خود سمجھ لیں گے۔ اور اس کا ایجاز یہ ہے کہ یہ تین ساری آیات ہیں: (4:11,12,13) ان میں قرآنِ مجید نے مکمل وراثت کا قانون دیدیا ہے۔

## ہمارے ہاں وراثت کے اصولوں میں پائی جانے والی بے ربطی کی وجہ

جب اس میں انسانی ذہنوں کی آمیزش ہوئی ہے تو اب یہی قانونِ وراثت دنیا میں سب سے زیادہ ناقص قانون بنا۔ اور یہ ناقص اس طرح سے ہے کہ کسی شخص نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے' ایک اکائی ہے' ایک یونٹ ہے' تو کچھ اس کے وراث ہیں' آدھا اس کو ملے' چوتھا اس کو ملے' 1/3 اس کو ملے' 1/8 اس کو ملے تو سیدھی سی بات ہے کہ جب ان کو جمع کیا جائے تو ایک آنا چاہیے۔ یہ اس کے قانون ہونے کا ایک بڑا بنیادی سا تقاضا ہے' کوئی چیز بھی آپ بانٹیے' اس کو کہیے کہ مثلاً 1/2 اس کا' 1/3 اس کا' 1/8 اس کا' اب چوتھی جماعت کے طالبعلم سے بھی کہو' جب جمع کرے تو ایک آئے گا۔ اور یہ جو فقہ کے اندر ہمارے ہاں کا قانونِ وراثت ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جمع کرو تو اس کا حاصل جمع ایک آتا ہی نہیں۔ اس کے لیے ان کے ہاں اصطلاح ہے کہ عول پڑ گیا۔ پھر وہ کرتے کیا ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ اس میں اتنا سا بڑھاؤ' اس میں اتنا سا گھٹاؤ' کسی طرح سے اس کی جمع ایک کرو۔ یعنی وہ جو مقرر کیے ہوئے حصے ہیں' پہلے ان کے مطابق کر کے دیکھتے ہیں تو وہ ایک آتا نہیں تو پھر اس میں گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ یہ دیکھیے عول کا قانون کتنے بڑے کسی فقیہ کا ہے اب دیکھیے ایک ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ میاں کے حصے کیے ہوئے ہیں (معاذ اللہ) اس کی تو جمع ایک نہیں آتی ''آ اے عول والا جیہڑا اوچ آ گیا اے ناں'' (یہ جو عول والا درمیان میں آ گیا ہے) اس نے آ کر یہ حساب کا سوال ٹھیک کیا ورنہ وہ تو فیل ہو گئے ہوئے تھے' حاصل جمع ایک آتی ہی نہیں۔ اتنی اتنی ضخیم کتابیں ہیں اس کے اوپر لکھی ہوئی۔ بہر حال یہ تو دوسری بات تھی۔

قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ وہ لاولد ہو تو اس کی یہ صورت ہے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَکَ(4:176) تو ترکہ میں اس کا نصف ہوگا یعنی وہ جو کچھ بھی چھوڑ گیا ہے' اس کو یوں تقسیم کرو کہ ترکہ میں اس بہن کا نصف (1/2) ہوگا۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ یہ چیز غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ معاشی مسائل کا آج کل بہت چرچا ہے' بڑا ذکر آتا ہے' اس میں

جب قرآنِ مجید کا معاشی نظام لایا جائے تو اس میں یہ ہے کہ وہ کسی کے پاس جمع شدہ دولت نہیں رہنے دیتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ **یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ** (2:215) آپ کے معاشی نظام کی انتہا یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا نظام کے ذمے ہے' افراد کے ذمے کام کرنا ہے' زائد از ضرورت کسی کے پاس رکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ پوچھتے ہیں کہ کتنا دوسرے کے لیے اس مملکت کو دیدیں' اس نے کہا کہ تمہاری ضرورت سے زائد جتنا ہے' سب کا سب دیدو'' تمہیں رکھ کر کرنا کیا ہے' ضرورتیں تو ہماری طرف سے پوری ہوتی چلی جارہی ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا** (11:6) روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو یعنی رزق تو ہم دیتے ہیں۔ تو یہ تھا وہ نظام۔ اب آپ دیکھیے کہ اس سے نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے' سارا قصہ تو ضرورت سے زائد جو بچتا ہے اس سے آگے چلتا ہے۔ اگر یہ Surplus Money (فالتو پیسہ) نہ ہو تو یہ Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری) چل ہی نہیں سکتا۔ قرآنِ حکیم Surplus Money (فالتو دولت) کہیں رہنے ہی نہیں دیتا۔ اس سے نظام سرمایہ داری ختم ہو جاتا ہے۔ اور آپ کا یہ جتنا مذہب چل رہا ہے' دین نہیں' یہ انسانوں کا خود ساختہ ہے۔ جسے اسلام کا مذہب کہہ رہے ہیں' یہ سارا اس زمانے کا وضع کردہ ہے جب سرمایہ داری آپ کا معمولِ زندگی تھا۔ اس کی بنیاد ہی سرمایہ داری پہ ہے۔

## کیا وراثت کے قوانین قرآنِ حکیم نے اس لیے دیئے تھے کہ سرمایہ داری نظام کی آبیاری ہوتی رہے؟

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے جہاں اور دلیلیں دی جاتی تھیں یا دی جاتی ہیں کہ یہ جو تصور دیا جا رہا ہے یعنی قرآن کا **قُلِ الۡعَفۡوَ** والا' یہ تصور تو لوگوں سے نہیں کہتے بلکہ وہ لوگوں سے یہ کہتے ہیں' دلیل یہ دی جاتی ہے کہ صاحب! اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی کے پاس زیادہ رہتا ہی نہیں تو جو قانون وراثت ہے' پھر وہ دیکھیے سارا ختم ہو جاتا ہے۔ وراثت کے قانون کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ داری کا نظام رکھا جائے کیونکہ اگر کسی کے پاس کچھ نہ رہے تو یہ جو قانون وراثت ہے' یہ پھر بیکار ہو جاتا ہے۔ دلیل آپ نے دیکھی۔ ضروری ہے کہ لوگ چوری کریں کیونکہ اگر یہ چور نہ رہے تو چور کے متعلق قرآنِ کریم کا جو قانون ہے وہ سارا معطل ہو جائے گا۔ ''ایتھے نہ رہے تے امپورٹ کرنے پینے نیں۔ اول تے سوال ای نئیں ایتھے نہ رہیے۔ میں سمجھنا ایتھوں ایکسپورٹ کرنے پیندے ہون گے' بڑی ترقیاں کیتیاں نے ایس قوم ایناں 30[1] وریاں دیوچ[2]''۔

---

[1] اگر یہاں نہ رہے تو درآمد کرنے پڑیں گے۔ پہلے تو یہ سوال ہی نہیں ہے کہ یہاں نہ رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں سے برآمد کرنے پڑیں گے۔ اس قوم نے ان تیس سالوں میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔

[2] یادرہے یہ بات مارچ 1971ء کی 7 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

وہ کہتے ہیں کہ زرمبادلہ نہیں کمایا جاسکتا۔کمایا کیوں نہیں جاسکتا؟ چور اچکے بددیانت اسمگلر' بلیک میلئے' یہ سارا کچھ کرنے والے اتنی افراط سے ہیں جتنی جی چاہے کوئی لے لے۔مصیبت یہ ہے کہ ان کی منڈیاں بھی بھری ہوئی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اگر چور نہ رہے تو یہ جو قرآنِ حمید کا چور کی سزا کا قانون ہے' یہ معطل ہوجائے گا۔کہتے ہیں اگر یہ چیز ہو کہ ہر ایک کی ضرورتیں پوری ہوتی جائیں تو قرآنِ حکیم نے جو کہا ہے کہ ان محتاجوں کو' فقیروں کو' دیا کرو تو پھر یہ چیز باقی نہ رہے صاحب! اور پھر امیروں کے لیے نیکی کمانے کا ذریعہ ہی کوئی نہ رہے۔وہ تو یہ ذریعہ ہے کہ مزدور کی جیب سے دس روپے لو اور اس کے بعد اس میں سے آپ اڑھائی فیصد نکال کر اس محتاج کو دو جسے تم نے خود محتاج بنایا ہے یعنی یہ عجیب دلیلیں ہیں۔وراثت کے قانون میں بھی وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کسی کے پاس نہ رہے تو ترکہ چھوڑ کر ہی نہ مرے تو قانون وراثت باطل ہوجائے گا۔اور اس کے ساتھ ہی ہمیں بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنے ترکے میں کچھ نہیں چھوڑا تھا۔کیا کہہ رہے ہو تم؟ (معاذاللہ) سب سے پہلے تو گویا جس نے اس طرح ترکے میں سے کچھ نہ چھوڑ کر قانونِ وراثت کو باطل کردیا وہ تو آپ کا رسول ﷺ ہے۔

عزیزانِ من! ساری چیز تو قرآنِ کریم نے کہی ہے کہ مِمَا تَرَکَ(4:176) وہ کچھ چھوڑ جائے تو۔ان میں سے جو نظام میں ایسے ہیں کہ ابھی وہ چیز ان کے پاس ہے' وہ چھوڑ جاتے ہیں یا اس نظام میں بھی جن چیزوں کے متعلق وہ اجازت دے کہ یہ چیزیں تم اپنے ذاتی صرف میں لاسکتے ہو' یہ روزمرہ کی زندگی کی ضروریات کی چیزیں سہی۔اس نے کہا ہے کہ مِمَا تَرَکَ(4:176) اگر وہ کچھ چھوڑ کر گیا ہے اور اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وصیت نہیں کرسکا۔آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں قرآنِ مجید نے وصیت کرنا فرض قرار دیا ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ ..... حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180)۔ایک ہی آیت میں قرآنِ کریم نے کہا ہے۔اور ان مذہب والوں کے ہاں یہ جو وصیت ہے یہ منسوخ ہے' انسان کرہی نہیں سکتا۔کیا کیا چیزیں میں عرض کروں! بہرحال مِمَا تَرَکَ(4:176) کچھ چھوڑ گیا تو اس کے لیے یہ چیز ہے۔اور اگر آپ کا نظام ایسا ہے کہ وہ اس میں افراد کے پاس کچھ چھوڑنے کے لیے رہتا ہی نہیں تو یہ مِمَّا تَرَکَ جب نہیں ہے تو وراثت ہی نہیں ہے۔اب بھی تو غریب مرتا ہے جس کا ترکہ ہی کچھ نہیں ہے' اس پہ قانون وراثت منطبق ہی نہیں ہوتا' اس کا اطلاق ہی نہیں ہوتا تو کیا وہ جہنم میں چلا جائے گا کہ کچھ چھوڑ کر کیوں نہیں مرا۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ جب انسان اس دین کو یا اس قرآنِ حمید کو چھوڑ کر انسانوں کی خودساختہ چیزوں کی طرف آتا ہے اور پھر اس میں اس کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا ہے تو کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔بہرحال اس نے یہ قانون دیا ہے کہ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ(4:176) ترکہ سے وہ اگر مرجائے' مرد ہو' لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ(4:176) اولاد نہ ہو وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ (4:176) بہن ہو تو فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ(4:176) اس کو ایک نصف دیدیا جائے گا' وَهُوَ يَرِثُهَآ (4:176) اور وہ بھائی' بہن کا وارث ہوگا یعنی اگر متوفیہ عورت ہو تو اس

کا بھائی وارث ہو جائے گا اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهَا وَلَدٌ (4:176) اگر اس بہن کی اولاد نہ ہو فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ (4:176) اگر اس کی دو بہنیں ہوں یعنی ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ (4:176) ترکہ سے ان کے لیے 2/3 ہوگا وَ اِنْ کَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (4:176) اور ملے جلے ہوں تو وہی جو اصول اس کا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (4:176) یہ چیزیں واضح طور پہ خدا بیان کرتا ہے تا کہ تم ان معاملات میں Confuse (الجھ) نہ ہو جاؤ' وہ وضاحت کرتا ہے۔ وہ تین آیتوں میں وضاحت کرتا ہے قانون وراثت کی' یہ ہزار ہزار صفحات کی کتاب اس کے بعد لکھتے ہیں ''اوہدے اچ گڈ مڈ کرن واسطے'' (اس میں التباس پیدا کرنے کے لیے)۔ کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (4:176) اور یہ اس نے بنایا ہے جس کو ہر شے کا علم ہے۔ اور یہ جو خدا کی طرف دین منسوب کرتے ہیں اس کے علم کی کیفیت میں نے عرض کیا ہے (معاذ اللہ) چوتھی جماعت کے طالبعلم کی نہیں ہے' وہ جو بٹوں (Fraction) کا سوال ہے اس کی حاصل جمع ایک آتی نہیں ہے اور وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (4:176) ہے۔ اللہ اکبر! یا للعجب !!

عزیزانِ من! سورۃ النسآء یہاں ختم ہوتی ہے اس کے بعد سورۃ مآئدہ شروع ہوتی ہے۔

**رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)